۸

جولائی اگست ستمبر ۱۹۳۵ء

ادبی مرکز میرٹھ کا سہ ماہی رسالہ

ایشیا

اڈیٹر

ساغر

مولانا شوکت علی

۱۹۳۸ء مسلمان قوم کیلئے ایک منحوس سال ہے جس [illegible] کے بعد تین عظیم شخصیتوں کی زندگیوں کا ستارہ غروب ہوا۔ اقبال کی موت کا زخم ابھی مندمل بھی نہ ہوا تھا کہ مصطفےٰ کمال کی موت نے [illegible] کا دل چیر کر رکھ دیا۔ [illegible] دنیا اس انسان اعظم کی موت پر دیوانی ہو گئی۔ ابھی تاب اور بدحواس دلوں کو چین کی ایک گھڑی بھی نصیب نہ ہوئی [illegible] کا خوفناک عقاب شوکت جیسے شاہین نظر جنگجو پر جھپٹا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ اقبال مافوق البشر [illegible] ان کا پیشنگو تھا، اور [illegible] کے خواب کی تعبیر، لیکن شوکت بھی نہتی قوم کا ایک ایسا سپاہی تھا جو آزادی کے مورچہ پر پہنچا تھا۔ جو اپنے شیر [illegible] بھائی کے ساتھ آزادی [illegible] بڑھ کر نمایاں ہوا۔ وہ ملک اور قوم کا جانباز سپاہی تھا جس کا بدل اس خاک سے پیدا ہونا محال ہے۔

شوکت سب سے پہلے علی گڑھ کے ایک [illegible] میں نمودار ہوئے، علی گڑھ کالج میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس تعلیم و تربیت نے وہ اثر چھوڑا کہ ساری عمر [illegible] سے ان کو گہری محبت [illegible] بارہ سال اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے۔ بالآخر اپنی مساعی سے اسکی ایک شاندار عمارت تعمیر [illegible] وہ برطانیہ [illegible] کے آلہ کار نہیں تھے بلکہ ان کی آزادی پرست فطرت انہیں حکومت کا دشمن بنا چکی تھی۔ ایک دن ایسا آیا کہ [illegible]

شوکت علی نے [illegible] لاکھ روپیہ جمع کیا، لیکن علی گڑھ کی انگریزی [illegible]

"پابدستے دگرے دست بدستے [illegible]

۱۸۵۷ء کی جنگ [illegible] نے سرسید نے تعاون کی پالیسی وضع کی اور علی گڑھ کالج [illegible] انگریزی ملازمتیں اور مغربی انداز پر زندگی بسر کرنا ہی معراج خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ شوکت [illegible] ان و شوکت اطمینان و صاحبیت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ سرسید کے شاگرد کی حیثیت سے [illegible] و ترقی کا ذریعہ [illegible] کرتے تھے۔

لیکن ظاہری شان و شوکت [illegible] طیف تھے اور ان کا احساس قوی تھا، چنانچہ ایک ہی جھٹکے میں ان کی اور انگریزوں کی دوستی کا رشتہ ٹوٹ گیا [illegible] جنگ بلقان [illegible] میدان میں نکل آئے، انجمن ہلال احمر کا قیام، ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد شوکت اور محمد علی ہی کی [illegible] کوششوں کا نتیجہ تھا۔

انگریز یہ خیال [illegible] کو اس قدر کچل دیا ہے کہ اب یہ سر نہیں اٹھائینگے۔ لیکن اسلامی روح نے ایک بار پھر مسلمان کے مردہ پیکر میں [illegible] نگاہ کرم ہوئی اور ان کو جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی نظر بند کر دیا گیا، شوکت انگریزوں کی طرف سے [illegible] ان کی رہی سہی امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔

جنگ عظیم کے بعد [illegible] دونوں بھائی [illegible] گرما چکا تھا، انگریزوں نے ان وعدوں کو پورا نہیں کیا جو انہوں نے کئے تھے اتحادی ٹرکی کے ٹکڑے [illegible] حادثہ۔ کانگریس کی کروٹ اور خلافت تحریک کا آغاز، یہ تھا وہ پُر آشوب زمانہ جس میں شوکت و محمد علی [illegible] دروازے ان پر بند، دوستوں کے دل ان کے لئے تنگ، عزیز انکے ملنے جلنے سے

لف، آمدنی صفر، جائداد ضبط اور حکومت دشمن۔ لیکن بی اماں کے ان بہادر سپوتوں نے کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھا اور آزادی و خدمت کے میدان میں بڑھتے چلے گئے۔ ان کے استقلال نے قوم میں ایک جان پیدا کردی۔ گویا مُردہ میں روح آگئی، مدقوق چلنے پھرنے لگا، آخر انہیں ۲ برس کی قید ہوئی۔ لیکن ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کے نام اور کام نے گونج پیدا کردی۔

تحریکِ خلافت میں ان دونوں شیر دل بھائیوں نے جس قدر کام کیا کسی شخص نے نہیں کیا۔ سیاسیات ہند کی تاریخ ان مہر و ماہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ترکِ موالات کی تحریک کے رُک جانے کے بعد وہی ہوا جو غلط بُنیاد کاموں کا حشر ہوا کرتا ہے۔ غدر کے بعد مسلمانوں میں خلافت کی تحریک خالص اسلامی تحریک تھی۔ جس کی بُنیاد ترکوں کی محبت پر قائم تھی، جیسے ہی مصطفےٰ کمال نے خلافت کو ختم کیا۔ ہندوستانی مسلمان سر پکڑ کر بیٹھ گئے اب تیسری طاقت کو اپنی فتنہ پردازیاں دکھانے کا موقع ملا، تمام ملک میں فرقہ پرستی کا زہر دوڑا دیا گیا۔ اور فضا کو یکلخت تبدیل کرکے ہندو مسلمانوں کو پارہ پارہ کردیا۔

اس موقع پر بھی ان دونوں بھائیوں نے اپنے استقلال کا شاندار ثبوت دیا۔ بلوے ہوئے فساد ہوئے۔ مذہب کے نام پر ایک طوفان اُٹھایا گیا شدھی، تبلیغ کی ایک طوفانی آندھی تھی جو سینکڑوں قوم پرستوں کو اُڑا لے گئی۔ لیکن شوکت اور محمد پہاڑ کی طرح اپنی جگہ اٹل کھڑے رہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں نمایاں ہستیاں علی برادران کی تھیں، اور اس زمانے تک وہ کانگریس کے شریک اور ساتھی تھے لیکن اب کچھ شکوک بھی ان کے دل میں پیدا ہو گئے۔

"علی برادران" جس وقت کی پیداوار تھے، وہ سیاسی شعور کا اوّلین دور تھا، مسلمانوں میں سرسیّد کے بعد محمد علی سب سے پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ایک خاص مسلک سیاسی خود سرسیّد کے اصولِ سیاسی کے خلاف مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں نے کوئی تعمیری کام نہیں کیا، تنظیم و تبلیغ کی فرقہ پرستانہ تحریکوں نے اس کا موقع بھی نہیں رکھا تھا، اس بے راہ روی اور جمود نے ایک عام تعطّل کی سی صورت پیدا کردی۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو خصوصاً کانگریس نے تعمیری کاموں اور سیاسی ترقی کی طرف نگاہ رکھی، اک اُٹھتی ہوئی قوم تھی۔ اس میں نامحسوس اور محسوس دونوں طریقے سے ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود اعتمادی کی دولت بھی مل گئی جس کو اگر اندازہ سے استعمال نہیں کیا جاتا تو دوسری شکل اختیار کرلیتی ہے۔ وہ ذرّے جو دبے ہوئے تھے، اُبھر آئے۔ بوڑھوں کا دور گیا۔ جوانوں کی بنسی بجنے لگی، نئے نئے لوگ کانگریس میں بھی پیدا ہو گئے اور ملک میں بھی۔ ان نئے لوگوں کا عروج و اقبال شوکت و محمد کو قدرتی طور پر اس لئے پسند نہیں آسکتا تھا کہ ان کو قوم میں جو جگہ مل گئی تھی وہ تنہا انہی کا حق تھی۔ یہ مقام علی برادران کی نفسیات کا نازک مقام ہے، وہ بڑے جذباتی تھے، مگر جذباتی کون نہیں ہوتا۔ اور اپنے عروج و زوال سے کون متاثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ قومی مقصد کے مقابلے میں پست اور کمزور بات ہے مگر ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں "مقابلہ" کی اسپرٹ ہر طرف کارفرما ہے۔

بہرحال محمد علی یا شوکت علی کا خمیر اس مٹی سے ہوا ہی نہیں تھا جس سے بنے ہوئے انسان کسی کے سامنے اپنا سر جُھکا سکیں، وہ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ عروج دیکھنے والی آنکھوں سے اپنا زوال دیکھیں۔ اگر کانگریس آخر زمانہ میں ان کی دلدہی کرتی تو شاید اس وقت نقشہ دوسرا ہوتا، مگر اسکے بعد دلدہی کا سوال بھی نہیں رہا بلکہ واقعی عقائد کا سوال پیدا ہوگیا۔

نئے سیاسی خیالات، سیاسی دُنیا میں نئے نئے آدمیوں کا عروج، ان تمام باتوں نے پُرانوں کو سچ مچ قدیم بنا دیا، اور وہ جدید سے چڑنے لگے یہ ایسی منزل تھی جہاں وہ مرکز تلاش کرنا بہت مشکل ہوگیا جس پر قدیم و جدید دونوں مل سکتے تھے۔ چنانچہ محمد علی کے بعد شوکت علی کس رو میں بہ گئے۔ اس پر مجھے روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، گو شوکت علی کی کشتیٔ حیات کنارے جا لگی، مگر دھارا ابھی موجود ہے۔

لیکن بہرحال شوکت علی ایک پُرجوش بہادر، تند وتیز، غیر معمولی کام کرنے والے آزادی کے شیر دل سپاہی تھے۔ ہندوستان کو دوسروں کی غلامی سے آزاد کرانے والوں کی جب فہرست بنیگی تو شوکت علی کا نام سرنامہ پر سنہری حروف میں لکھا جائیگا۔ جس وقت شوکت علی زندہ [illegible] علی زندہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن شوکت علی کے مرجانے کے بعد علی برادران کے شاندار ڈرامہ کا آخری پردہ گر جاتا ہے۔ رحمت ہو ان [illegible] ول بھائیوں کی روح پر جن کی لاتعداد قومی خدمات ہیں، اور مسلمان جن کے احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔"

ایک پروفیسر دوست کا خط

"ایشیا" (جون ۱۹۳۸ء) کا پہلا، اکثر مضامین پڑھے، "ہندوستان کی مشکلیں" عنوان قائم کرکے جو آپ نے شذرات لکھے ہیں، ان میں سے بعض میں تو آپ نے ایسی حکومت پروری کی ہے کہ ظلم کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کے منظم کرنے والوں کو جاہل اور فسادی کہنا سراسر ظلم ہے۔ یہ لوگ ایک خاص اقتصادی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقہ کی بالائی طبقوں سے ازلی جنگ ہے کانگریس والے کہتے ہیں کہ "کانگریس سب کی ہے" یہ بات ہے تو کسانوں اور مزدوروں کی امیدگاہ نہیں ہو سکتی۔ یا تو شیر کی ہو کر رہے یا بکری کی، یہ سمجھوتا سا جو آج کل رائج ہے سرتاسر لغو ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کو پہلے تو مذہب کی افیون پلائی جاتی تھی اب "شاعر حریت" دیش بھگتی کا زہر پلا رہا ہے۔ ! یہ تو بتائیے کانگریس نے آزادی کی کوشش کب کی اب تک تو چند اونچے طبقے والے آزادی کے نام پر اپنے طبقے کی ہوا خواہی کرتے رہے۔ سول نافرمانی بھی اسی کا شاخسانہ تھی۔ گذشتہ الیکشن میں پھر آزادی، آزادی چلانا شروع کیا۔ عوام سے ووٹ حاصل کرنے تھے ان کی چاپلوسی کی، یہ بے وقوف تھے دھوکہ کھا گئے وہی جو کل تک عوام کے بڑے دردمند بن رہے تھے۔ آج انہیں نہ دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے میں باک ہے نہ گولیاں چلانے اور بیدیں مارنے میں۔ وہی جبروت و قہرمانی ہے جو کبھی فرنگی میں تھی۔ وزارت کی گدی سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہر طرف حکومت، وزارت، وزارت حکومت کا زور زورہ ہے نہ آزادی ہے نہ روٹی!

(آپ کی باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریسی پبلسٹی آفیسر پس پردہ بول رہا ہے۔

اچھوتوں کے متعلق جو لکھا ہے وہ بھی پرلے درجہ کی حکومت پرستی ہے۔ ہر ظالم حاکم مظلوم حق طلب سے یہی کہتا ہے کہ پہلے مستحق بنو پھر مانگو جو برسوں سے انگریز ہندوستانیوں سے کہہ رہے ہیں، وہی الفاظ آپ نے ہریجنوں کے سامنے دہرا دئے ہیں۔ دھرمی کی بات چھین کلچر، خصوصیات نتیجہ ہیں ہزاروں برس امیدواری کرے پھر کہیں اسے شرف قبول نصیب ہوگا۔ ادھرمی دھرمی بن جائیگا۔ اللہ اللہ کیا سعادت دارین ملیگی۔

مشکلات کا جو حل بتایا ہے وہ بھی عجیب وغریب ہے، کانگریس ادب کی تنظیم کرے۔)

تو کارِ زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں نیز پرداختی

(آزادی اور روٹی کے میدان میں بڑا تیر چلایا ہے جواب ادب کی طرف رُخ کیا۔ اس پر توجہ کریں۔ ادب کو دیش بھگتی سے کیا واسطہ! یہ تو دیش دھرم سب سے اونچا ہے، جرمنی اور روس میں دیش بھگتی ادب کا تجربہ ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا وہاں ادب کا کیا حشر ہوا روس والوں کو عقل آچلی ہے۔ جرمنی ادب معطل ہو کر رہ گیا۔ کیا آپ بھی ہندوستان میں ہٹلر گردی رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب کے تحکم سے تو ابھی چھٹکارا نہیں ملا تھا یہ دیش بھگتی کی مصیبت اور نازل ہوئی۔ ایشیا کے صفحات الف ۸ و ۹ پر اقبال کے سلسلے میں آپ نے جن آرا کا اظہار فرمایا ہے انہیں دیکھئے اور پھر اس دیش بھگتی والی تجویز پر نظر ڈالئے۔ تضاد نظر آیا؟ افسوس ہے جب یہ مضمون لکھا تھا میرٹھ میں نہیں تھا۔ سیاسیات کے گھنٹے میں،

۳

اس پر خوب بحث کرتا ۔ قطعاً روک دینے میں کامیاب نہ ہوتا تو کم سے کم اس کا "بے تشدد" تو ضرور دسیا کرا دیتا "۔

یہ میرے ایک سچے دوست کا ذاتی خط ہے لیکن نام ظاہر نہیں کرتا اس کو صفائی بنا کر شائع کر رہا ہوں : اپنے دوست کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے اور میرے خیالات کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ میرا عقیدہ محض "ملکی کامل آزادی" تک محدود نہیں ہے، بلکہ میں آزادی کے بعد ایسے ملکی نظام کا آرزو مند ہوں جو ہندوستان کے جملہ باشندوں کو وہ آرام و راحت بخش سکے جو انسانی زندگی کو بھوک اور پستی سے محفوظ کر دے ۔

یہ جانتے ہوئے میرے دوست کو شک ہوا ہے تو کوئی گوشہ میری تحریر میں ایسا ضرور رہ گیا ہے جو شک اور اس غلط فہمی کا ذمہ دار ہے کہ میں سامراجی نظام اور طریقۂ کار کا قائل ہوں ۔ آئیے اس مسئلہ پر ذرا وسیع الخیال ہو کر .. غور کریں کہ ہمارا ملک آزادی، ترقی، آرام اور راحت کی منزلوں تک کیونکر پہنچ سکتا ہے ۔

برطانیہ نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ حکومت میں ہندوستان کو حقیقی طور پر پنپنے کا کبھی موقع نہیں دیا ۔ اسکے طرزِ حکومت میں اس قسم کی ترقی کے امکانات ہی نہیں ہیں ۔ اور قدرتی طور پر کبھی غالب، مغلوب و محکوم کے لئے وسیع الخیال نہیں ہوا کرتا ۔ لیکن ایسی مثال بھی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی کہ غلام قومیں زیادہ دیر تک غلام رہی ہیں لہذا، برطانوی حکومت کے آہنی پنجہ کی شدید گرفت کے باوجود ہندوستان نے کروٹ لی ۔

چیمسفورڈ اصلاحات کی ایک قسط ملی اس کھلونے سے ہندوستانی کھیلے اور اکتا کر رہ گئے، آزادی کے تقاضہ نے پھر انگڑائی لی اور شاندار قربانیوں کے بعد برطانیہ نے پھر ایک کھلونا عنایت فرمایا جس کو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کہتے ہیں اور اسکے متعلق نیشنل کانگریس نے کتنی منزلیں طے کر کے وزارتیں قبول کیں اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ کانگریس نے انڈیا ایکٹ کو اعتقادی طور پر قبول کیا ہے وہ زیادتی کرتا ہے ۔ کانگریس نے قوم کی آواز پر بطور تجربہ وزارتیں قبول کیں، اور ان کو نامعلوم وقت تک چلائیگی ۔ اس نے سول نافرمانیوں کے تجربوں کے بعد خاموشی اور بے عملی کی زندگی بسر کرنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر سمجھا کہ انڈیا ایکٹ سے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کہ جب خود کانگریس میں ایک سیکشن ایسا موجود ہے جو کانگریس کی پارلیمینٹری جماعت کی روک تھام ہر وقت کرتا رہتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کانگریس اپنے نصب العین سے منحرف ہو سکے ۔ کیونکہ اپنے نصب العین سے انحراف کرنا ان لوگوں کی موت ہے جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت کانگریسی حکومتوں کی زمام ہے اور جن کو شاید غلطی سے آپ کانگریس سمجھے ہوئے ہیں ۔

اس تجربہ میں جس قدر آئینی گنجائشیں ہیں وہ انہیں کی مطابقت سے ملک کا کاروبار چلا سکتی ہے اور اتنی ہی ملک کی خدمت بھی کر سکتی ہے ۔ اگر آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کا یہ قدم خالص قومی اور ہندوستان کے مفاد و حق میں ہے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکانے مناسب نہیں ۔

صرف میرا مقصد اس قدر تھا لیکن روا روی میں اگر الفاظ ناگوار استعمال ہو گئے ہیں تو میں ان کو واپس لیتا ہوں اور مجھے انکے استعمال پر افسوس ہے ۔

میرا مذہب بغاوت ہے، نہ صرف حکومت سے بغاوت، بلکہ زندگی کی جملہ قدامتوں سے بغاوت، اور اس افتادِ مزاج سے میرے دوست واقف ہیں تو پھر میں کیوں "حکومت پروری" کے الزام سے ناراض ہوں !؟

ہندوستان جیسے عظیم الشان مگر غلامی، افلاس، بھوک، بے چارگی، جہالت اور بے حسی میں جکڑے ہوئے بیمار براعظم کا علاج اس قدر آسان نہیں ہے جتنا کہ ہمارے پروفیسر دوست خیال کرتے ہیں ۔ سیاست کے کتابی نظریات اور عملی سیاسیات میں بڑی دوری ہے، مشکلوں کا ایک خوفناک خلا نظریات اور عملی سیاسیات کے درمیان حائل ہے ۔ سب سے پہلی منزل ہندوستانیوں میں "شعور" پیدا کرنے کی ہے "دیش بھگتی" کے زہر نہیں ۔ مسرت ہی نے اتنا شعور قوم میں پیدا کر دیا کہ اس وقت ۱۱ صوبوں میں سے ۸ صوبوں میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس کو ہم کم از کم رجعت سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔

میں خود اپنے دوست سے دریافت کرتا ہوں کہ کانگریس نے نہیں تو کس سیاسی انجمن نے ملک کو آزادی کا مفہوم بتایا۔ اور غیر ملکی حکومت کے خلاف کس نے ایک سچا جذبہ قوم میں پیدا کیا؛ یا جو نام نہاد تحفۂ آزادی اس وقت برطانیہ نے ہندوستان کو دیا ہے وہ کس کے دباؤ سے دیا ہے؛ یہ بھی نہیں؛ کسان کو کسان، مزدور کو مزدور، اور غریب کو اس کی اصلی پوزیشن معلوم کرنے کی نگاہ کس کی سیاسی جدوجہد نے پیدا کرائی ——!؟ ظاہر ہے کہ کانگریس اور صرف کانگریس نے۔!! تو پھر آپ کا یہ بے بنیاد الزام کیا وقعت رکھ سکتا ہے کہ کانگریس نے کبھی آزادی کی کوشش ہی نہیں کی!؟

آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ وزارت کی گدی، کانگریس کے لئے کانٹوں کا بستر ثابت ہوئی!؟ یہ محض اس لئے کہ کانگریس کو ملک کی جملہ رجعت پسند طاقتوں اور فتنہ پردازیوں کا مقابلہ کرنا پڑا؛ اور وہ تمام طبقے جو یکایک زوال کی نذر ہوئے تھے، زخمی گیدڑوں کی طرح کانگریس پر ٹوٹ پڑے، اگر کانگریس وزارت کی گدی پر نہ ہوتی تو جواب دے سکتی تھی۔ لیکن حکومت کی حیثیت میں اُس نے بہت کم جواب اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو دیا ہے؛

کانگریس وزارتوں کے بعد برطانیہ پرست ہندو اور مسلمانوں کا توازنِ دماغی ہی باقی نہیں رہا اور صاف کھل گیا کہ ان لوگوں کا مقصود آزادی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا مقصود اسکی اپنی "ذات" ہے۔

آزادی اور روٹی کا سوال اسقدر آسان اور سرعت سے حل نہیں ہو سکتا؛ کانگریس اسکے حل کی طرف منزل بہ منزل قدم اُٹھا رہی ہے؛ اور باوجود ایکٹ کی بنیادی خامیوں کے اس قدر کم وقت میں اس نے جو کچھ کیا ہے اس سے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نصب العین کو فراموش نہیں کیا ہے۔

یقیناً میرے دوست کو اس سے انکار نہیں ہوگا کہ نسبتاً ملک میں سب سے زیادہ قومی ثقاہت اور انسانی نقطۂ نظر، یعنی زندگی کا ترقی یافتہ اور سادہ زاویۂ نگاہ رکھنے والی جماعت صرف کانگریس ہے؛ ورنہ ملک کے جملہ ہندو مسلمان باشندے تو غریب و امیر، کاشتکار و زمیندار، قوی و کمزور سب کو "منجانب اللہ" سمجھنے والے ہیں۔ اور اسپر ایمان رکھتے ہیں کہ "غریب کیا تو خدا نے کیا، امیر کیا تو خدا نے کیا"؛ مگر کانگریس میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتی ہے کہ یہ باتیں برسوں کے قدیم نظام جاگیردارانہ کی لعنتیں ہیں، اور سب کچھ انسان ہی کا ظلم ہے۔

ایسے انسانوں کے ملک میں میرے دوست درجہ بدرجہ انقلاب کے قائل نہیں، اور ایک ساتھ چوٹی پر جا بیٹھنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے اس چھلانگ کی کامیابی کے امکانات بتائیں۔!؟

۵

جو بھی نظام، یا اصول، نظریہ، یا قانون، بنتا ہے وہ فرد کی طرف سے جماعت کیلئے ہوتا ہے۔ میرے پیش نظر کبھی گاندھی ازم اور سوشلزم نہیں ہوتا، میں تو ملک کی ضرورت اور آزادی و آرام کو پیش نظر رکھتا ہوں؛ میرے دوست جانتے ہیں کہ ہم جب کسی اصول کا پرچار کرتے ہیں تو ہم اس پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ درست اصول ہے۔ اور کس کے لئے درست ہے؟ انسانوں کیلئے، تو گویا ہم اصول اور انسانی ضرورت کے باہمی ربط اور اسکی نیک انجامی پر مکمل اعتقاد رکھتے ہوئے اصول کی تبلیغ کرتے ہیں۔ یعنی ہمارا مقصد اصول کے اختیار کرنے کے بعد پیدا ہونے والی اچھائیوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے؛

اور ایسا ہم ایک قوم، ایک ملک اور ایک جنس کے لئے کرتے ہیں۔ اسکے بعد گاندھی ازم ہو کہ سوشلزم، کمیونزم ہو کہ نازی ازم، نیشنل سوشلزم ہو کہ کوئی لامکانی مذہب، یہ تمام اصول اور مذاہب اپنے اپنے دائروں میں انسان کی فلاح اور نیکی ہی کے لئے ہیں؛ اور اس نیکی کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا ترقی و زندگی کی راہ میں بھٹکنے نہ پائے اور چلتی رہے جیسے انسان نے ہزاروں برسوں کی کوششوں کے بعد متمدن اور مہذب کیا ہے —!

اس لمبی چوڑی دُنیا میں کوئی ملک آزاد ہے اور کوئی غلام، کوئی نیم غلام ہے، کوئی نیم آزاد، کہیں کوئی اصول جاری ہے کہیں کوئی قانون زیر عمل لیکن سب کا مقصد انسانی فلاح و آسائش ہے، یہ دوسری بات ہے کہ بنی آدم کی جبلی اور فطری درندگی نے کو اس وقت تک انسان کو کامیاب نہ ہونے دیا ہو مگر جماعت کے بننے کے بعد ہر فرد کا قدرتی طور پر مقصود یہی ہو سکتا ہے جس کا میں نے ذکر کیا۔

اس لئے ہندوستان میں کسی خاص نظریّہ اور اصول کی تبلیغ و روشناسی سے بھی یہی مقصد ہو سکتا ہے کہ پرانے نسخہ آزما چکے اب نیا نسخہ آزماؤ، مگر ظاہر ہے کہ آزمانا نہیں بلکہ مریض کی صحت ہمارا اصل مقصود ہے۔

میں اور سوشلزم کا مخالف! میں تو مانتا ہی سوشلزم کو ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی نجات سوشلزم میں پوشیدہ ہے، تاہم سوشلزم کے تفصیلی پروگرام میں ان تقاضات اور خصوصیات کو جگہ دینی پڑے گی جو اس ملک کی زندگی کا نہ مٹنے والا جزو ہیں۔

ہندوستان میں سوشلزم کا اطلاق ویسا ہی ہے جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی باندھ دی جائے! ارتقاء کے وہ ضروری مدارج طے کرنے ہی پڑینگے جو جاگیرداری، شہنشاہیت، سرمایہ داری اور سوشلزم کی حدّ فاصل ہیں۔

اس وقت تو اک طوفان ہے جس میں ملک کی نیا ہچکولے سے لے رہی ہے، اور اس کو بچانے کے لئے ایک جماعت کشتی ہی میں بیٹھ کر نکلی ہے خود بھی اس کو بچنا ہے اور بچانا بھی ہے، ظاہر ہے کہ وہ احتیاط سے نہیں بڑھے گی تو خود بھی موجوں کی نذر ہو سکتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کانگریسی وزارتوں کے بعد جو نرم سے نرم طرزِ عمل اختیار کیا ہے اسکی بنا پر بھی اس کو "شدید انقلابی"۔ "ملاحدہ کی جماعت" اور "بے دین و کافر" اور مقلدِ روس کہا گیا۔ اگر واقعی وہ کسانوں کی نمائندگی میرے دوست کے نقطۂ نگاہ سے کرے تو وہ وزارت چلا ہی نہیں سکتی، کانگریسی پبلسٹی آفیسر کہنے کا میں بُرا نہیں مانتا۔ میرے تمام نوٹ "ہندوستان کی مشکلیں" (مطبوعہ جون ۱۹۳۸ء) کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی سچی آگ روشن نہیں ہوئی ہے۔ ہر شخص تول مول کرنا چاہتا ہے۔ اس کو کانگریس پرستی سے تعبیر کیا گیا۔ حالانکہ کئی مسائل میں میں کانگریس سے ضمنی اختلافات رکھتا ہوں۔ مگر میرا یقین ہے کہ جملہ اقوامِ ہند کی وہ تنہا نمائندہ سیاسی جماعت ہے اس لئے اس کے شیرازہ کو ہمیشہ قوی کرنا ہی سچی وطن پرستی ہے۔

اچھوتوں کے متعلق کہتے ہوئے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ طبقاتی ترقی کر لیں تو ان کو ان کے حقوق دئے جائیں۔ یقیناً اچھوتوں کی تعلیم و تربیت حکومت کی طرف سے ہونی چاہئے۔ اور حکومت وقت کو ان کی ترقی و تہذیب کے جملہ سامان فراہم کرنے چاہئیں۔

کانگریس کو ادب کی تنظیم کا مشورہ دینا ہرگز مضحکہ انگیز نہیں ہے۔ ہر ملک میں خصوصاً روس میں اس کا تجربہ بہرحال کیا گیا۔ تجربہ ناکام ہوا یا کامیاب اس سے بحث نہیں، لیکن ہوا۔ میں ہندوستان میں ہٹلر گردی نہیں چاہتا۔ لیکن معاف کیجئے گا، نیشنل سوشلزم اتنی معمولی چیز نہیں ہے کہ آپ اس کو ٹھکرا دیں، ہٹلر نے اقوامِ عالم کی صف میں جرمنی کو ممتاز تر کر دیا ہے اور اس وقت یورپ اسکے اشاروں پر متحرک رہا ہے۔

کیونکہ میرے نزدیک ملکی آزادی اور غریبوں کے لئے روٹی اور مسرّت اصلی مقصود ہے، اگر نیشنل سوشلزم سے یہ مقصد حاصل ہو سکے تو سبحان اللہ مگر میں جانتا ہوں کہ نیشنل سوشلزم یا نازی ازم جو حقیقت میں فاسزم کے عملی طور پر دو نام ہیں۔ اصولِ جمہوریت کے منافی ہیں۔ اور ہندوستان جیسا وسیع ملک جہاں وسیوں اختلافات اپنی شدید ترین صورت میں موجود ہیں۔ علاوہ جمہوری حکومت کے کسی دوسرے نظام کو برداشت نہیں کر سکتا۔

ادب کو دیش بھگتی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے دوست اپنے مرکز سے ایک انچہ ہٹ کر باتیں نہیں کرتے، یہاں تک کہ بعض "ناگفتنی اشیا" کی سائنٹفک تحلیل بھی وہ "اقتصادی" نقطہ نگاہ سے کرتے ہیں ——!؟

دیش بھگتی ہی نے ترکی اور ایران، عراق اور حجاز کو آزاد کیا، دیش بھگتی ہی فلسطین میں آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے، اور جس وقت تک ہندوستانی وطن سے محبّت نہیں کرینگے، ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔

تضاد آپ کو اس لئے نظر آیا، کہ دونوں جگہ میرا مفہوم و مقصد مختلف ہے۔ نوٹ میں میں بنیادی طور پر وطنی ادب کی پیدائش چاہتا ہوں اور اقبال کا ادب اس سے اعلیٰ ہے اس لئے اس کے ادب کو ادب کی وسیع اور حقیقی تعریف کے ماتحت دیکھتا اور دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وطنی ادب کی پیدائش، تعمیری ضرورتوں کی بنا پر ضروری ہے، ورنہ یہ صحیح ہے کہ:-

"شاعر" و (ادیب) سے ایسی توقع رکھنا کہ وہ عالمگیر نمائندگی اور فطرت کی ترجمانی کے مقابلے میں محض ایک قوم اور ایک وطن کے حدود میں محدود ہو جائے اسکی شعریت کو کچلنا ہے اور اس خاندان میں منافقت پیدا کرنے کے مترادف ہے جو تمام انسانوں پر مبنی ہے"۔)
لیکن یہ شاندار تعریف آزاد قوموں کے لئے جو تعمیری عہد سے گذر چکی ہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا خط

پروفیسر دوست کے علاوہ دوسرا خط ایک فوجی افسر نے اڈیٹر آیشیا کو لکھا ہے جس کی چند سطریں یہ ہیں:۔
"آیشیا دراصل گوناگوں رنگینیوں سے مزین ہے اور بہت دلچسپ ہے، کاش اس میں یہ تکلیف وہ بات نہ ہوتی یعنی وہ پرو کانگریس (Pro-Congress) نہ ہوتا معاف فرمائیے گا میں اپنے خیالات کے اظہار میں کچھ بے تکلف سا ہوں، کانگریس دراصل ایک متعصب ہندو جماعت کا دوسرا نام ہے جو اسلام، مذہب، مفادِ اسلام اور کلچر غرضکہ ہر اسلامی شئے کو نیست و نابود دیکھنا چاہتی ہے، پراونشیل وزارت جو دراصل ایسی زیادہ مستقل طاقت اور حکومت نہیں کہی جاسکتی (گورنر جنرل کے قلم کے اک اشارہ پر ختم کی جاسکتی ہے) ملنے پر جو کچھ مسلم کشی کانگریسی صوبجاتی گورنمنٹ کر رہی ہے ظاہر ہے، خدانخواستہ اگر مکمل طاقت اس کو نصیب ہوگئی اس وقت مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی"
یہ خطوط میں نے اس نمبر میں اس لئے شائع کئے ہیں کہ ایک طرف کانگریس کو یہ معلوم ہو جائے کہ "کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا"؟ اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو بتایا جائے کہ وہ کانگریس کے متعلق کس قدر تاریکی میں ہیں۔!؟
جہاں تک آیشیا اور اسکی پالیسی کا تعلق ہے، بارہا اس حقیقت کو دُہرایا جاچکا ہے کہ آیشیا کسی سیاسی جماعت کا پروپگنڈا نہیں کرتا بلکہ وہ علمی طور پر سیاسیات پر رائے زنی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رجعت سے نافر اور قومی ارتقاء کا حامی ہے؛ کوئی شک نہیں کہ ملک میں جس سیاسی انجمن کو قومی ارتقا سے تعلق ہے وہ کانگریس ہے، یہ تصوّرات جن کو میرے فوجی دوست نے اپنے خط میں دُہرایا، پراونشل اٹانومی سے پہلے بھی مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں پائے جاتے تھے لیکن جب سے کانگریس نے وزارتیں قبول کیں، فرقہ پرست انجمنوں کی طرف سے ان خیالات کو عوام میں وسیع کرنے کی جی توڑ کوشش کی گئی؛ لیکن یہ خیالات اتنے ہی باطل ہیں جتنا ہندو مہاسبھا کا کانگریس کو "مسلم نواز" کہہ کر متہم کرنا۔
جہانتک تعصب کا تعلق ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ کانگریس کی جملہ سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تمام ہندوستان اور یہاں بسنے والی قوموں کی فلاح و آسودگی پر منتج ہوتا ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ اسلام کے خلاف کانگریس نے کیا قدم اُٹھایا۔ شاید یہ کہ وہ برطانوی سامراج سے ہندوستان کے لئے جنگ کر رہی ہے جس کی آزادی فلسطین اور جملہ مشرقی اسلامی سلطنتوں کو آزاد و مطمئن کر دینے کے ہم معنی ہے۔!؟
مذہب!؟ میں ذاتی علم اور مکمل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کانگریسی ہندو ہوں یا کانگریسی مسلمان دقیانوسی قسم کے مذہبی انسان ہیں! اور کانگریس کا بایاں بازو جو زندگی کو مذہب سے بلند خیال کرتا ہے ان پنڈتوں اور مولویوں سے سخت نالاں ہے۔
اب رہا کلچر، یہ نہایت فرسودہ بحث ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی اسلامی کلچر نہیں، اسلام کسی ایک تہذیب اور کسی ایک کلچر کا پابند نہیں ہے۔ چینی مسلمان اور بدھ کے ماننے والے چینی میں سوائے عقیدہ کے کوئی لباس اور تمدنی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ چینی تو چینی، ہندو کشمیری اور مسلم کشمیری عوام کے لباس اور رہن سہن میں ایسا فرق نہیں ہے جس کو فرق کہا جاسکے۔
کلچر اور اس قسم کی بحثیں، آزادی کے اعلیٰ مقصد کے مقابلے میں پست اور فضول درجہ رکھتی ہیں۔ اس وقت ہمارا کلچر "اینگلو انڈین"

کلچر ہے، نہ بلکل مغربی، نہ خالص مشرقی، جس کو ہرگز اسلامی کلچر نہیں کہا جا سکتا۔ اسلامی کلچر ابن سعود کی قوم کا ہے* اور وہ ہندوستان میں رائج نہیں، سچ
پوچھا جائے تو وہ بھی اسلامی نہیں، بلکہ وہ بھی عربوں کا خالص اپنا قومی کلچر ہے۔

ان مسائل پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کیسا ہندو کلچر اور کیسا مسلم کلچر دونوں باقی ہی نہیں ہیں، ہندوؤں کا چھ ہزار برس قبل کا کلچر اس زمانے میں کہاں ہے!؟ یا اسکے زندہ رائج ہونے کا کیا امکان ہے!؟ اگر ہندو چاہیں بھی تب بھی...... ترقی کی بڑھتی ہوئی موج کو دیکھتے ہوئے ایسا ممکن نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جیسے ہندوستان کو خود مختاری ملتی جائیگی۔ ہم مغربی کلچر کو قبول کرتے جائینگے اب بھی ہم نے بہت بڑی حد تک اس کو قبول کر لیا ہے۔

صوبجاتی حکومتیں قائم ہونے کے بعد کانگریس نے جو بھی قدم اُٹھایا ہے وہ صوبے کے جملہ باشندوں کے لئے یکساں مؤثر ثابت ہوا ہے کسی سیاسی پارٹی کی حکومتی پوزیشن کو نظر انداز کر دینے کے بعد سوچئے کہ تیسری طاقت اور اسکے سیاسی مکر و فریب کو جانتے ہوئے کوئی نیشنل باڈی ایسا قدم اُٹھا سکتی ہے جو خود اسکے زوال و تباہی کا باعث ہو؟!

اردو اور ہندی کی رفتار ترقی

کسی زبان اور اسکے ادب کی ترقی کا اندازہ اُس میں چھپنے والی کتابوں اور رسالوں ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ آئیے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے متعلق معلوم کریں کہ ۱۹۳۸ء کی اوّل سہ ماہی میں دونوں میں کتنی کتنی کتابیں شائع ہوئیں۔ اُردو ادب کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ دو سال سے ایک خاص بیداری ملک میں پیدا ہو گئی ہے، خاص کر کانگریسی وزارتوں کے بعد تو اُردو کے اس سوال نے مذہبی سوال کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور فرقہ پرست جماعتیں کلچر و زبان کے تحفّظ کے متعلق گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاّتی رہی ہیں، ان اُردو کی بیچاری جماعتوں نے اُردو کے لئے کیا کیا یا کم از کم ان کی حمایت و سرپرستی میں اُردو زبان و ادب کے لئے کونسا اور کتنا تعمیری کام کیا!؟ شاید اس کا تجزیہ کرنے کے لئے ہم حق بجانب ہونگے۔ ہندی زبان کی ترقی کی رفتار کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ اُن فرقہ پرست جماعتوں کی آنکھیں کھُلیں کہ جو شور و شر اور جلسہ و جلوس ہی کو تعمیری کام سمجھتی ہیں، جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، تعمیری کام جس جماعت کے پیش نگاہ ہوتا ہے وہ چُپ چاپ اپنی دھن میں لگی رہتی ہے اور براہِ راست اپنے کام کا دباؤ ان حلقوں پر ڈالتی ہے جن کے ہاتھوں میں سیاسی اجارہ داری ہوا کرتی ہے۔ اس حقیقت کو کتنی مرتبہ سمجھایا جائے کہ سیاسیات میں وعدوں اور معاہدوں کی کوئی قیمت اور عمر نہیں۔

ذیل کے نقشے اور اعداد و شمار سے اس تعداد کا اندازہ کیجئے:۔

۱۹۳۸ء کی پہلی سہ ماہی میں اُردو اور ہندی میں شائع ہونے والی کتابیں

صوبہ	اُردو	ہندی	موضوع	تعداد	مذہب	شاعری	افسانہ و ڈرامہ	زبان	قانون	سیاسیات	سوانح	طب
پنجاب	اُردو			۱۹۰		۱۵	۴۰	۳۰		۴	۷	۴
پنجاب		ہندی		۵۴								
یو۔پی	اُردو		زیادہ تر اسکولی مطبوعات تھا	۷۰	۶	۷	۵	۲۴	۴	۳۰		
یو۔پی		ہندی		۵۳۶								

قوموں کی سیاسی زندگی میں ان کی جد و جہد ہی ان کی بقا و استحکام کا باعث ہوا کرتی ہے؛ کسی زبان کا مٹنا اور نہ مٹنا محض اسکے بولنے والوں کے ان ذریعوں سے تعلق رکھتا ہے جو وہ تعمیری طور پر اختیار کرتے ہیں۔ مندرجۂ بالا نقشے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اُردو داں پبلک میں مطالعہ کا ذوق بہت ہی کم ہے؛ اور ہندی زبان میں کتابوں کی زیادہ تعداد نے اس حقیقت کا روشن ثبوت دیا ہے کہ ہندی داں پبلک میں مطالعہ کا ذوق دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ کسی زبان کے مصنّفین کی ہمتیں اس وقت ہی بڑھتی ہیں جب لوگ ان کی کتابیں خریدیں، اور جب ناقدری کا یہ عالم ہو جو اُردو کے متعلق اُردو پڑھنے والوں میں ہے تو کس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ کسی تصنیف میں اپنا وقت ضائع کرے۔

اُردو داں پبلک جو محض مسلمانوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے افراد اس میں شامل ہیں متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے لوگوں سے بنتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ طبقہ کے افراد کتابوں پر سب سے زیادہ کم روپیہ صرف کرتے ہیں؛ وہ اپنے روپیہ کو اوڑھ لیتے ہیں پہن لیتے ہیں اور عیش و تفریح پر اُڑا دیتے ہیں؛ یاد رکھیے یہی وہ لوگ ہیں جو سیاسی اسٹیج پر "اُردو زبان خطرے میں ہے" کی چیخ بلند کرتے ہیں اب رہا متوسط طبقہ جو سوسائٹی کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور جس سے سماج کا سارا نظام اور کاروبار قائم ہے؛ اسکے افراد ۵ فی صدی مطالعہ سے ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن سو فیصدی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے عادی ہیں؛ !؟

تاہم یہ لوگ بھی لٹریچر کو زندگی کی پہلی ضرورت نہیں سمجھتے؛ اور جو لوگ سمجھتے ہیں، وہ مالی طور پر معذور ہیں؛ ان حالات میں ادب و زبان کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے۔ امرا سرشار و بے فکر، ان کی کیا ہے؛ انگریز حکومت ہوئی تو انگریزی پڑھنے اور بولنے لگے، اور حکومت میں کسی دوسرے عنصر کی زیادتی ہو جائے گی تو اسکی زبان پڑھنے اور بولنے لگیں گے۔ یہ نہیں جانتے کہ قومی لسانی اور ادبی خصوصیتیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں جب ان کے متعلق ذی حِسی کا ثبوت دیا جائے۔ اور کوئی ٹھوس تعمیری کام کیا جائے۔

جہانتک اُردو کتابوں کے طباعت و اشاعت کے ذریعوں کا تعلق ہے سینکڑوں روکاوٹوں کے علاوہ سب سے بڑی روکاوٹ خود لیتھو پریس ہے۔ جبتک کسی نہ کسی صورت میں نستعلیق ٹائپ رائج نہیں ہوگا، اچھی کتابوں کی طباعت تجارتی طور پر ناممکن ہے۔ .... جبتک شریف اور خوش معاملہ پبلشر اُردو زبان میں پیدا نہیں ہوں گے؛ اُردو کی ترقی ناممکن ہے اور جبتک اُردو کے اہلِ قلم کی ہمت افزائی اجتماعی طور پر نہیں کی جائیگی؛ اچھے ادب کی تخلیق اور زبان کی زندگی ممکن نہیں۔

لاکھوں روپیہ مسلم لیگ نے اس وقت تک جماعتی پروپگنڈے پر صرف کر دیا۔ اگر اس سے آدھا روپیہ صرف کرکے وہ ایک عظیم الشان مرکز اُردو قائم کرکے اُردو زبان کے تمام کام کرنے والوں کو ایک نقطہ پر دعوتِ عمل دیتی اور اعلیٰ پیمانہ پر نشر و اشاعت، تصنیف و تالیف اور ایک وسیع نظام کے ماتحت اُردو زبان کی ترقی و زندگی کے بُنیادی سامان کرتی تو کیا اسکے بعد اُردو کو بچانے کی التجاؤں کی ضرورت ہوتی !؟

لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ اور وہ اس مسئلے کو صرف کانگریس کے خلاف جذبہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتی رہی؛ اور اس سے براہِ راست چاہتی رہی۔ کہ وہ اپنی نہیں پوری ہندو قوم کی قلبِ ماہیّت کر ڈالے۔ یہاں بحث کے بہت سے گوشے نکلتے ہیں۔ مگر میں تفصیلات میں نہیں اُلجھنا چاہتا۔ کانگریس ایک معتدل نقطے پر ہے، اور وہ مزید بدل سکتی ہے، لیکن ایک وسیع تعداد ہندو قوم کی ہندی زبان کو لکھتی ہے اور اب کچھ بولتی بھی ہے۔ اس کا دل آپ کیونکر اُلٹ سکتے ہیں؛ !؟

اس تبدیلی کیلئے ظاہر ہے کہ اُردو داں پبلک کو اپنی بُنیادیں مضبوط کرنی پڑینگی، اور اُردو زبان کے لئے تیزی سے بہت کچھ کرنا پڑیگا۔ ہر اُس شخص کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو کہ پارسی جو اُردو زبان پر ایمان رکھتا ہے اس کا فرض ہونا چاہئیے کہ وہ اس زبان کی کتابیں خریدے۔ اسی طرح کانگریس حکومتوں کا اوّلین فرض ہے کہ وہ اُردو زبان کی سرپرستی دوسری زبانوں کی طرح کریں۔

صوبہ اُردو کانفرنس ناگپور

۲۳ ر ۲۴ ر ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ناگپور میں ایک عظیم الشان اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جو صوبہ متوسط و برار کی تاریخ میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ اس کی کامیابی کا اندازہ کانفرنس میں شریک ہونے والوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔ دس ہزار آدمی ہر نشست میں پورے جوش و خروش کے ساتھ موجود رہے۔

یہ کانفرنس انجمن ترقی اُردو ناگپور کے اہتمام میں اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوئی جسکی استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری حکیم اسرار احمد صاحب کریوی اور صدر نواب صدیق علی خاں صاحب ایم ایل اے (سینٹرل) تھے۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر مولانا عبدالحق بی اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو دہلی تھے۔

نواب صدیق علی خاں صاحب نے ایک بلیغ اور قیمتی خطبۂ صدارت پڑھا جس میں ودیا مندر کی اسکیم نام اور صوبہ متوسط میں دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کی زبوں حالی پر روشنی ڈالی۔ مولوی عبدالحق صاحب کی صدارتی تقریر نہ صرف حلّ مقصد کی ایک کلید تھی بلکہ اُردو ادب کا دلنواز نمونہ تھی۔

جو تجویزیں اس کانفرنس نے پاس کی ہیں، وہ معتدل جائز اور واقعی ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ صوبہ کی حکومت ان کو تسلیم نہ کرے:

۲۔ یہ کانفرنس ودّیا مندر اور ودّیا مندر اسکیم کی تفصیلات سے جو اُردو پڑھنے والے طلبہ کے حق میں مضر ہیں۔ اپنی بیزاری کا اظہار کرتی ہوئی حسب ذیل مطالبات کرتی ہے۔

الف۔ ہندوستانی زبان کی تعلیم کا انتظام جس طریقے پر حکومتِ مدراس نے کیا ہے اسی نہج پر اس صوبہ میں بھی کیا جائے۔

ب۔ جس گاؤں یا علاقہ میں اُردو پڑھنے والے لڑکے ہیں، وہاں ایک اُردو اسکول کھولا جائے اور جہاں اُردو پڑھنے والے چھ لڑکے فراہم ہوں وہاں انہیں اُردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ یہ کانفرنس صوبہ متوسط و برار کی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ صوبہ کی تسلیم شدہ زبانوں میں اُردو کو بھی شامل کیا جائے اور جس طرح صوبہ کی اسمبلی کے مسودے، تقریریں، اور تجویزیں انگریزی، ہندی اور مرہٹی میں شائع کی جاتی ہیں اسی طرح اُردو میں بھی شائع کی جائیں۔

۴۔ یہ کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ناگپور یونیورسٹی کے تحت میں جتنے سرکاری کالج ہیں ان سب میں اُردو پڑھانے کا بندوبست کیا جائے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ صوبہ کی تمام ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپلٹیوں کو ہدایت کرے کہ وہ اپنے ہائی اور مڈل اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کریں۔

۵۔ یہ کانفرنس لوکل گورنمنٹ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ صوبہ کی تمام میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کو ہدایت کرے کہ وہ اُردو اسکولوں میں رجسٹروں کو اُردو میں لکھنے اور اُردو اسکولوں کے ماسٹروں کو دفتری مراسلت اُردو میں کرنے کی اجازت دیں۔

۶۔ یہ کانفرنس اس طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے کہ اُردو اسکولوں میں ہندی اور مرہٹی اسکولوں سے ایسے ماسٹروں کو تبدیل کر دیا جائے جو اچھی طرح اُردو نہیں جانتے اور اُردو میں ٹرینڈ نہیں ہوتے۔ اس قسم کے جتنے ماسٹر اُردو اسکولوں میں ہوں، لوکل گورنمنٹ کا فرض ہے کہ جلد سے جلد ایک سرکلر کے ذریعہ سے اُردو اسکولوں سے ان کی تبدیلی کا حکم نافذ کرے۔

۷۔ یہ کانفرنس اُردو سکولوں کو ہندی اور مرہٹی اسکولوں میں ضم کرنے کو اُردو اسکولوں کو ختم کر دینے کے مترادف سمجھتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ابتک جتنے اُردو اسکول ہندی اور مرہٹی اسکولوں میں ضم کر دئے گئے ہوں ان سب کو پھر علیحدہ قائم کیا جائے اور آئندہ

کے لئے اس پالیسی کا مکمل انسداد کیا جائے۔

۸۔ اُردو اسکولوں کی دیکھ بھال کے لئے یہ کانفرنس حکومت، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں سے اُردو داں نگرانوں کے تقرر کا مطالبہ کرتی ہے۔

۹۔ پچھلے دس سال میں جتنے اُردو اسکول بند کردیئے گئے ہیں، یہ کانفرنس حکومت سے ان کے دوبارہ اجراء کا مطالبہ کرتی ہے نیز حسب ضرورت نئے اُردو اسکولوں کے قیام کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

۱۰۔ امریڑ ضلع ناگپور کی میونسپل کمیٹی نے یکم نومبر ۱۹۳۵ء کو اپنے یہاں کے اُردو اسکول کے بند کردینے کا حکم دیدیا ہے جو حکومت کے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کے سرکلر کی کیونک کی صریح خلاف ورزی ہے کہ موجودہ اُردو اسکول علیٰ حالہ قائم رکھے جائینگے۔ یہ کانفرنس لوکل گورنمنٹ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ امریڑ میونسپلٹی کو جلد سے جلد ہدایت کرے کہ وہ اُردو اسکول کے بند کرنیکا حکم واپس لے۔

۱۱۔ یہ کانفرنس، حکومت، ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپلٹیوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے لئے اُردو کتابیں، اخبارات اور رسائل بھی خریدے۔

۱۲۔ یہ کانفرنس، حکومت، ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپلٹیوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اعلانات و اشتہارات اُردو اخبارات و رسائل کو بھی عطا کرے۔

۱۳۔ یہ کانفرنس صوبہ کے تمام اسلامی اداروں سے عموماً اور انجمن حامی اسلام ناگپور سے خصوصاً درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنے اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اُردو زبان رکھیں۔

۱۴۔ یہ کانفرنس صوبہ کے اُردو بولنے والوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنی ساری خط و کتابت اور منی آرڈر فارم کی خانہ پری اُردو میں کریں، دُکانوں کے سائن بورڈ اُردو میں لکھوائیں، جا بجا اُردو شبینہ مدارس، کتب خانے اور دارالمطالعے قائم کریں۔

زبان کا سوال ہر دم فرسودہ اور ہر دم تازہ ہے اور کانگریسی حکومتوں کیلئے تقریباً ناقابلِ حل سا ہو گیا ہے، حالانکہ اگر کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے مطالبہ کو واقعی طور پر تسلیم کرلیں تو وہ بہت کچھ اثر مسلم عوام پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

اس وقت یہ بین حقیقتیں ہمارے سامنے ہیں:-

(۱) ہندو قوم کا فطری تقاضہ ہے کہ ناگری رسم الخط ملک میں ترقی کرے اور بولی میں ہندی و سنسکرت عنصر بڑھے اور فارسی عنصر کم ہو۔

(۲)۔ مسلمانوں کو اُردو کا نام "ہندوستانی" منظور ہے۔ مگر ان کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ جس قدر الفاظ فارسی و عربی کے زبان میں داخل ہو چکے ہیں، وہ بحالہٖ باقی رہیں۔ اب پہلے کے مقابلے میں اُردو کے ادیبوں نے سادہ اور عام فہم زبان لکھنی شروع کردی ہے، یہ تو ہوا، مگر مسلمان کسی شرط پر رسم الخط کی موت گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(۳)۔ سب سے زیادہ بین حقیقت یہ ہے کہ وہ بولی جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے، ہر جگہ کامیاب ہے، اور اُس کتابی ہندی کو جسے بعض سیاسی لیڈر بولتے اور لکھتے ہیں، عوام نہیں سمجھ سکتے۔

(۴)۔ یہ بات بھی بحث طلب نہیں رہی کہ ہندی اور اُردو دونوں کی ترقی کو اب روکا نہیں جا سکتا، کوئی قوم یہ سوچا ہے کہ ملک میں صرف اس کا رسم الخط اور صرف اس کی زبان بولی جائے، یہ قطعی ناممکن ہے، اس لئے اُردو والوں کو ہندی اور ہندی والوں کو اُردو کی مخالفت سے گریز کرنا چاہئے۔

(۵)۔ یہ دشواری بھی اپنی جگہ بڑی حقیقت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے بعض صوبے اپنی صوبائی (مادری) زبان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں

بنگال کے مشہور شاعرِ انقلاب قاضی نذر الاسلام نے مسلم لیگ سے محض زبان کے مسئلہ پر علیحدگی اختیار کی ہے اور وہ بنگال کے لئے بنگالی زبان کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

ان حالات کی بنا پر ایک قومی زبان بنانے کا خیال اتنی جلدی صورت نہیں پا سکتا جتنی جلد کہ بعض لوگ چاہتے ہیں؛ اگر وہ لوگ ایمانداری سے غور کریں جو ملی جلی زبان پر عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کو ماننا پڑے گا کہ اُردو زبان سے بڑھ کر وہ اُس نئی خیالی زبان کا اعلیٰ اور کامیاب نمونہ چار صدیوں میں بھی پیش نہیں کر سکتے، اس لئے قومی ارتقاء، ہندوستان کی آزادی، امن اور راحت، محبت اور اتحاد، بھوک اور افلاس، اور اونچے قومی نصب العین کے نام پر میں کانگریس اور ہندو قوم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ زبان کے معاملہ میں انفرادی و جماعتی طور پر وہ طرزِ عمل اختیار کریں جو مسلمانوں کے شک اور ان کی غلط فہمیوں کو ختم کر دے۔ اُردو زبان میں فارسی اور عربی کی طرف سے خود ایک ردِّ عمل پیدا ہو رہا ہے اور لوگ اُس ادب اُس شاعری اور اُس زبان کو پسند کرتے ہیں جو سادہ بے ساختہ اور نازک ہوتی ہے۔ لیکن ہندی زبان میں عام طور پر اس ردِّ عمل کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ دونوں بولیوں کی زمین اور بُنیاد ایک ہی ہے، سنسکرت نہ جاننے والے اس بولی کو نہیں سمجھ سکتے جو آجکل تقریروں یا تحریروں میں استعمال کی جا رہی ہے!؟

مسئلہ فلسطین

فلسطین کے متعلق ہندوستانی مسلمان کوئی کارگر قدم نہ اُٹھا سکے، ہندوستان ہی نہیں دُنیا کے تمام مسلمان احتجاج کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکے، اگر کچھ کیا تو خود فلسطین کے عربوں نے جو اپنے وطن کی آزادی کی اہمیت کو ہم سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ یعنی بارہ سال سے فلسطین کے ۱۲ لاکھ مجاہد عربوں نے اپنے وطن کو آزاد کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیا ہے؛ یہودی قومی توطن کا سوال جو برطانیہ نے اپنے عالمگیر سیاسی مفاد کے لئے اُٹھایا تھا آج تک کامیاب نہیں ہوا؛ یہی نہیں بلکہ برطانوی سیاست فلسطین میں عام امن بھی قائم نہیں رکھ سکی؛

برطانیہ نے ظلم و ستم کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں چھوڑا جو فلسطین کے جانباز اور جذبۂ وطنیت سے سرشار بہادر عربوں کو کچلنے کیلئے استعمال نہ کیا ہو۔ ابھی میں نے نئی دلی میں پردہ ظاہر پر (News of the day) کے سلسلہ میں فلسطین کے اندر برطانیہ کے ظلم و ستم کا ایسا دلخراش منظر دیکھا کہ بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح فلسطین کے عرب باشندوں کو گھیر کر ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا، ان کے چہروں پر بھوک پیاس، بے عزتی اور تباہی برس رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں موت کی بھیانک اور ڈراونی تصویر گردش کر رہی تھی۔ بھوکے اور پیاسے عربوں کو ایک ٹامی اُس ٹین سے پانی پلا رہا تھا جس سے شاید برطانیہ کے گھوڑے بھی مُنھ پھیر لیتے ہونگے۔

رسولِ فطرت محمد (صلعم) جیسے اعلیٰ اخلاق رکھنے والے کامل انسان کی امت کی یہ توہین دیکھ کر دل پاش پاش ہو گیا، اور میرے دل میں اُن ذلیل غلامی پسند ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف آتشیں جذبہ پیدا ہوا جو ہندوستان کی سیاست کو اپنی وطن فروش حرکتوں سے تہ و بالا کئے ہوئے ہیں اور جن کی ...... کوششیں ہندوستان کو نہ ختم ہونے والی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے دیتی ہیں؛

خدا کی پناہ! جو یہاں تک جری اور نڈر ہو گئے ہیں کہ علی طور پر ہندوستانی سیاست کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کی تشریح و توجیہ از روئے قرآن و سنت کرتے ہیں اور یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہمسایہ قوموں سے اتحاد اور سیاسی اشتراک کرنا اسلام کے منافی ہے؛ کلچر، تمدن، مذہب، عقائد، جان و مال سب اُس دن سے خطرہ میں پڑ گیا ہے جس دن سے ہندوستان میں صوبہ جاتی وزارتیں قائم ہوئی ہیں؛

لیکن وہ نہیں جانتے کہ اسلام عزت اور آبرو، طاقت اور حکومت کے ساتھ زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رکھنے کا نام ہے، مسلمانوں نے زور

بازو سے اپنے لئے وہ مقام حاصل کیا جو قوموں، ملتوں اور مذاہب کا رفیع ترین مقام ہوتا ہے۔ اور آج بھی وہ جہاں جہاں سربلند ہیں اپنی طاقت اور اجتماعیت کی اس روح کی وجہ سے سربلند ہیں جس نے ان کو دُنیا میں اونچا کر دیا تھا لیکن ان مثالوں "پدرم سلطان بود" کی رٹ سے ہم سلامت نہیں رہ سکتے

ہندوستان کے تاجر اور اسلام فروش مسلمانوں کی طرح آزاد اسلامی ملکوں کے مسلمان مذہب اور عقائد کی تجارت نہیں کرتے، بلکہ ظلم اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پنجہ کشی کرتے ہیں۔ چنانچہ فلسطین کے عربوں کے سامنے آج شیر برطانیہ نے...... کیسے کمال کر گھٹنے ٹیک دئے ہیں۔ اور برطانوی مدبرین اعتراف کرنے لگے ہیں کہ اعراب فلسطین کی قومی تحریک اپنی جگہ ایک حقیقت رکھتی ہے۔

"میں اس پر یقین نہیں رکھتا کہ عرب کا مزاج قومی بھی جرائم کا عادی ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ عربوں کی قومی تحریک موجود ہے اور ایک حقیقت رکھتی ہے" (لارڈ سیموئل)

لارڈ سیموئل کے ان الفاظ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، برطانیہ کے اُس "پیمانۂ سیاست انداز" کا جب وہ دوسروں کے سامنے ہتھیار ڈالا کرتا ہے۔ اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ عربوں کی قومی تحریک جو درصل ہندوستان کی وطنی تحریک کی طرح مذہبی نہیں، خالص قومی و وطنی تحریک ہے کس درجہ اور کس وسعت کا جہاد ہے۔

ظاہر ہے کہ برطانیہ کے ساتھ بہ حیثیت ایک اعلیٰ اسوشل اور مہذب قوم کے کسی کو نفرت نہیں ہو سکتی، دُنیا اس کی انفرادی و قومی بلندیوں اور خوش اخلاقیوں کی قائل ہے مگر سیاسی طور پر وہ بد اخلاقی اور بہیمیت کے جس درجہ پر نظر آتا ہے وہ اس کو اپنی انفرادی تہذیب کے درجہ سے بھی گرا دیتا ہے اور انسانی دل میں محبت کے بجائے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ جرمن اور عربی اخبارات نے جو شرمناک اور دل ہلا دینے والی خبریں ہندوستان پہنچائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

"انگریز سپاہیوں کی زیادتیوں سے عرب عورتوں کے حمل ساقط ہو گئے"

اس سے بھی زیادہ شرمناک خبریں اخباروں نے شائع کی ہیں لیکن ان کا ذکر کر کے ہم ہندوستانی مسلمانوں کی بے حمیتی کا امتحان نہیں لینا چاہتا، مختصر یہ ہے کہ ظلم و ستم، دنائت و درندگی کی کوئی حد باقی نہیں رہی ہے۔ گو برطانیہ نے ان تمام باتوں کی تردید بھی کر دی ہے۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی یہ تردید بھی محض دروغ بافی ہو۔

بہرحال اعراب فلسطین نے اپنی مجاہدانہ اور مدافعانہ کوششوں سے برطانیہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نگاہ اور اعمال میں تبدیلی پیدا کرے۔

قیدیوں کی رہائی۔ عام دعوت نامے، عرب حکومتوں کی شرکت کی جدوجہد مفتیٔ اعظم کے نمائندوں کی قبولیت، حکمرداری میں معقول تبدیلی، اعلانِ بالفور میں ایسی ترمیم جو عربوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو بتاتی ہیں کہ فلسطین کے متعلق جملہ سیاسی صورتِ حال سے برطانیہ متاثر ہوا ہے اور اپنی پالیسی تبدیل کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کچھ ایسا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے فلسطین کے متعلق غور و فکر کے بعد کوئی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔

فلسطین کے عرب مجاہد ہر طرح مبارکباد کے قابل ہیں کہ انہوں نے اتنی بڑی طاقت سے کامیاب مقابلہ کیا اور اس کو سپر انداز کر دیا۔ اب برطانیہ کو چاہئے کہ وہ فلسطین میں قتل و غارتگری اور قید و بند کا سلسلہ قطعی بند کر دے، عام امن قائم کرے اور گول میز کانفرنس کو کامیاب بنائے جس کی کامیابی پر مشرقِ ادنیٰ میں اسکی طاقت کے قیام کا راز پوشیدہ ہے۔

اب بھی اسکے لئے وقت ہے کہ وہ اس حقیقت پر غور کرے کہ یہودیوں کی دوستی کے مقابلے میں عربوں کی دوستی اس کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۴

اگر ایشیا ہیں اپنی پالیسی کی اُلجھی ہوئی گُتھی کو سلجھانا اس کا مقصود ہے تو اس کو وہی کرنا پڑے گا جس کا فلسطین کے عرب مطالبہ کر رہے ہیں۔

مسئلہ چین و جاپان

اسپین میں جمہوریت اور فسطائیت کی جنگ اور چین و جاپان کی آویزش برابر جاری ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہندوستانیوں کیلئے بیحد سبق آموز ہیں خصوصاً اُن رجعت پسند غلاموں کے لئے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ "قومی انفرادیت" اور آزادی کے لئے ہو رہا ہے حقائق سے اغماض کرتے ہیں۔ اسپین میں قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے۔ چین نے اپنے لاکھوں سپوت وطن کی قربان گاہ پر چڑھا دئے۔ یہ کس لئے؟ صرف اپنی قومی انفرادیت کو باقی رکھنے کیلئے، اصول آزادی کی خاطر۔ لیکن ہندوستان غلام ہندوستان میں باہمی کشمکش اور نفرت کی سُرخ آندھیاں چل رہی ہیں۔ جس سے افق آزادی تاریک تر ہوگیا ہے۔

آزادی کے جذبہ میں دراصل قومیت کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اور جب تک ایک متحدہ قومیت اپنے پورے جلال کے ساتھ ایک مرکز پر نمایاں نہیں ہوتی۔ آزادی کا جذبہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا۔ آزادی کے لئے اتحاد اور اتفاق لازمی اور ضروری ہے۔ جس ملک کی قومیں اور فرقے آپس میں متحد نہیں ہو تے انھیں قیامت تک اصلی آزادی نصیب نہیں ہوسکتی۔ مقصد کی یگانگت اور ہم رنگی قومی آزادی کی حقیقی بنیاد ہے۔

جب جاپان نے چین پر حملہ کیا، چین اپنی روایتی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھا لیکن جاپان کے مقابلہ میں اس نے تمام جماعتی اختلافات ختم کردئے اور اپنی مجموعی طاقت جاپان کے مقابلہ میں منظم کرلی۔ یہاں تک کہ جاپان کو معلوم ہوگیا وہ چین کو لقمۂ تر کی طرح نہیں نگل سکتا۔ چند ماہ کی تو بات ہی ہے کہ ہانکو پر جاپان کا قبضہ اس قدر یقینی ہوگیا تھا کہ چینی حکومت مرکز حکومت تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جاپان اپنی تمام وسیع و زبردست فوجی طاقت کے دریائے یانگی کے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ اور اب چین کی کامیابیوں کی خبریں آرہی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ چین کی ان کامیابیوں کا کیا مستقبل ہے!؟ گو چین و جاپان کی جنگ میں چین کو سخت جانی و مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن جاپان بھی دیوالیہ سا ہوگیا ہے۔ جاپان چین کے مقابلہ میں بہت کم آبادی رکھتا ہے، مگر چین کے پاس لاکھوں آدمی مقدس وطن پر قربان کردینے کے لئے موجود ہیں۔ جاپان کو چین کا سودا اتنا مہنگا پڑا ہے کہ وہ اقتصادی تباہی میں گرفتار ہوگیا ہے اس نے معمولی معمولی اشیاء کے استعمال پر بھی پابندی لگادی ہے تاکہ سامانِ جنگ مہیا کرنے میں آسانی ہو۔ جاپان کی ساکھ دُنیا میں ختم ہوگئی ہے اور یہ سب کچھ چین کے اس شریف جذبہ کے نتائج ہیں جو جاپان کے پنجہ سے "آزاد" رکھنا چاہتا ہے۔ اور دُنیا میں اپنی قومی انفرادیت باقی رکھنا جس کا اعلیٰ ترین اور اوّلین مقصد ہے۔

چین نے حیرتناک طور پر جاپان کا مقابلہ کیا اور اب بظاہر یہ خدشہ نہیں ہے کہ جاپان چین کو مکمل طور پر فتح کرسکے گا۔!؟ چنانچہ اس سلسلہ میں تو جاپان کے قونصل جیرد سکا نے واشنگٹن میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جاپان ہرگز اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہے کہ وہ تمام چین کو فتح کرسکے گا۔ ہمارا یہ خیال کبھی نہ تھا اور نہ اب ہے اور نہ چار لاکھ باشندوں کی حکومت پر آپ کی مرضی کے خلاف جبر کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا اصل مقصد جاپان سے اس گندگی کو دور کرنا ہے جس نے جاپان اور چین کے تعلقات کو کشیدہ کردیا ہے۔ جاپان کسی ملک کے مقابلہ میں مشرق وسطیٰ میں وہاں کے کلی اقتصادی ذرائع پر بھی قابض ہونا نہیں چاہتا جس سے کہ ایک نئے عزم کا شبہ پیدا ہو جو کہ جاپان وہاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

اس بیان کا رُخ کچھ ہی ہو مگر بڑی حد تک ان دقتوں اور موانع کی تصدیق ضرور ہوجاتی ہے جو چین کے سلسلہ میں جاپان کو درپیش ہوئے یا ہورہے ہیں۔

دُنیا چین پر جاپان کے جارحانہ حملوں اور ان کے تسلسل کو انسانیت کے خلاف خیال کرتی ہے اور یہ اس خیال کو ظاہر کر رہی ہے۔ خاص کر ہندوستانیوں کی ہمدردیاں چین ہی کے ساتھ رہی ہیں۔ کیونکہ کسی ملک اور کسی قوم کو دوسرے ملک اور کسی آزاد قوم کی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

بین الاقوامی سیاسیات

موجودہ بین الاقوامی سیاسیات کو سمجھنا اور کوئی قطعی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یورپ اخلاقی پستی کی اسی زوال میں مبتلا ہے جو تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے بعد لازمی ہوتا ہے۔ مگر ہاں اس قدر جلد نہیں جس قدر کہ اس کی نمود یورپ میں ہوئی ہے۔

ہٹلر اور مسولینی کی فوجی فتنہ پردازیوں نے یورپ کے امن اور جمہوری حکومتوں کو شدید دغدغے میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسپین میں مسولینی کی کارپردازیاں، زیکوسلاویہ پر نازی ازم کا قبضہ، جرمنی کا مطالبہ نوآبادیات، یورپ کی دوسری چھوٹی حکومتوں کا مطالبہ آزادی، فرانس کی کشمکش اور برطانیہ کی صلح فرمائیاں ایک عجیب صورت حال دُنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

ایشیا میں چین و جاپان کی آویزش اور اس کے خطرناک اثرات جاپان اور روس کی ہر دم پیدا ہونے والی کشمکش کا خدشہ فلسطین میں مجاہد عربوں کی تحریک، یہ تمام حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہندوستان ان کے اثرات مابعد سے محفوظ رہ سکے۔ لہٰذا ہمارے سامنے مسئلہ یہی نہیں ہے کہ ہم "اقلیت اور اکثریت" کے بزدلانہ و تنگدلانہ تصورات میں الجھے رہیں بلکہ اہم سوال بھی ہے کہ اس محشر میں ہمارا مقام عافیت کہاں ہے۔!؟

ہر ملک کی سیاست میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو رہا ہے، جو سو رہے تھے وہ جاگ رہے ہیں، جو جاگ رہے تھے وہ دوڑ رہے ہیں۔ کمزوروں کو اپنی کمزوری کا احساس اور قوی کو قوی تر بننے کی فکر ہے۔ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ اور تمام عالم انسانیت ایک بھک سے اُڑ جانے والے میگزین کی حیثیت میں آتش فشاں کی طرح گرم و تپاں ہے۔

15

اس بین الاقوامی شدید صورت حال سے ہندوستانیوں کو اندازہ کرنا چاہیئے کہ وہ کہاں ہیں!؟ ہر ہندو اور ہر مُسلمان اور ہر عیسائی اور ہر پارسی، غرضکہ ہر ہندوستانی کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ ایک مشترکہ ملکی مفاد کے مرکز پر متحد و متفق نہیں ہے تو وہ دُنیا میں پہلے سے بھی زیادہ ذلیل اور غلام ہو جائے گا۔ اگر مزید تاریکی نے ان کو گھیر لیا تو پھر عروس آزادی کی ہلکی سی جھلک بھی عمر بھر نصیب نہ ہو سکے گی۔ یہی نہیں بلکہ ان کو شدید بربادی اور تباہی کا مقابلہ کرنا پڑے گا جس کے مقابلہ کی وہ ہرگز تاب نہیں لا سکتے۔

فسطائیت نے یورپ کو ایک دہشتناک منظر میں تبدیل کر دیا ہے اور ایسے ایسے مظالم ہو رہے ہیں جن سے انسانیت لرزہ براندام ہے۔ ہسپانیہ میں عورتوں بچوں کی کراہوں نے اسپین کو ماتم زار بنا دیا ہے۔ نازیت اور فسطائیت نے دُنیا کے امن کو درہم و برہم کر دیا ہے۔

یہ تمام حالات اک شدید جنگِ عظیم کا رنگین اور ہولناک دیباچہ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر جنگ ہوئی تو ہندوستان کو سامراجی مقاصد کا آلۂ کار نہیں بنایا جائے گا۔!؟ اس لئے ہندوستان کی تمام قوموں کو ملکی آزادی کے مقصد سے متفق اور متحد ہو کر سامراجی ارادوں کو خاک میں ملا دینا چاہیئے اور اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان ہرگز کسی ایسی جنگ میں نہیں کود ے گا جس کا مقصد انسانیت کی موت ہے یا جس سے امن عالم کو ادنیٰ سا بھی نقصان پہونچے۔ اگر ہندو مُسلمان اور ملک کے تمام فرقہ آپس میں متحد نہیں ہوئے تو وہ دُنیا کی تمام قوموں میں ذلیل اور نابود ہو جائیں گے اور پچاس سال سے ملکی آزادی کی تحریک کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ بیکار ثابت ہو گی جس کے بعد ہندوستان کی آزادی ناممکن ہو جائیگی۔

اِس لئے ان لوگوں کی باتوں پر کان مت دھرو جو کلچر، مذہب، تمدن، تہذیب، اقلیت، اور اسی قسم کی افیون آمیز اور نفرت انگیز شراب کے جام تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ تمام رجعت پسند ہندوستان، ہندوستانی قوم، ہندوستانی روایات اور ہندوستان کی آزادی

کے دشمن ہیں اور ان کی ساری جد وجہد کا مقصد ہندوستان میں سامراج کے آہنی پنجہ اور اس کی گرفت کو اور بھی شدید کرنا ہے۔ جس نے ملک کو بھوک، ذلت، پستی اور افلاس اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "غلامی" میں مقید کر دیا ہے۔

تم نہیں جانتے کہ آزادی کی کیا عشرتیں اور برکتیں ہیں۔ انسانیت کے نام پر اپنی عظمت کا اندازہ کرو کہ تم چالیس کروڑ افراد چند لاکھ افراد کے اس طرح اسیر ہو کہ آزاد ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تم کتنی بڑی اکثریت ہو۔ تم کتنی عظیم قومی روایات اپنے اندر رکھتے ہو۔ تم کس قدر عظیم انسانی شرف و مجد کے حامل ہو، مگر تم کو دوسروں نے کس قدر ذلیل و بے دست و پا کر دیا ہے۔ اگر اب بھی تمہارا خون نہیں گرماتا تو میں خیال کرتا ہوں کہ محمدؐ۔ کرشن۔ عیسیٰؑ۔ مہاویر۔ اور بدھ، سب کی اخلاقی تعلیمات کو تم نے انڈین اوشن میں غرق کر دیا ہے۔ تم ہرگز بابر و اکبر کی اولاد میں سے نہیں ہو اور تم میں سے ایک نہیں جس کی رگوں میں راجپوتی خون گردش کر رہا ہو۔

انجمن ترقی اردو (حیدرآباد) دہلی میں

انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن، جس کا دفتر اورنگ آباد دکن سے منتقل ہو کر دہلی آگیا ہے ملک کے ان علمی و لسانی اداروں میں سے ایک ہے جو ہندوستانیوں کی ذہنی اور دماغی ترقی اور علم و ادب کی تخلیق و ترتیب میں ایک مخصوص درجہ رکھتے ہیں۔ کوئی ادارہ، کوئی انجمن، اور کوئی انسٹی ٹیوشن یوں تو ایک جماعت کے بل بوتہ پر چلتا نظر آتا ہے مگر کسی ایک فرد کی جنون فرمائی اس کی کامیابی کی حقیقی ضامن ہوا کرتی ہے۔

"انجمن ترقی اُردو" کی ترقی و کامیابی کا راز بھی امام ادب حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحق بی اے آنریری سکریٹری انجمن کی ذات میں پوشیدہ ہے، وہ لیلائے ادب کے سچ مچ مجنوں ہیں۔ ان کے جنون نے اُردو کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو اپنی سچی محبت کے شانے سے سنوارا ہے۔

ان کا استقلال، ان کی ہمت اور ان کا اخلاص، لاثانی ہے، ادب کے میدان میں بلا شرکت غیرے اپنا تسلط جما کر وہ زندگی کے دوسرے گوشوں کو بھی فتح کر سکتے تھے لیکن دُنیائے ادب میں داخلہ کے بعد وہ ایک شریف فاتح کی طرح مملکتِ اُردو کی اصلاح و ترقی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد بنا چکے ہیں۔ ان کے احسانات کو ہندوستانی قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اورنگ آباد میں بیٹھ کر انجمن تمام ہندوستان کی خدمت موزوں و یکساں طور پر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے ایک ایسے مرکز پر اس کے دفتر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جہاں سے تمام ملک کی خدمت کی جا سکے۔ کوئی شک نہیں کہ دہلی اپنی مرکزی حیثیت میں مخصوص درجہ رکھتا ہے۔ اراکین انجمن نے نئی دہلی میں دفتر منتقل کر کے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ یقین ہے کہ اب انجمن کے تمام کاموں کی رفتار میں بھی ترقی ہو جائیگی اور پہلے سے زیادہ عظیم الشان پیمانہ پر اُردو زبان و ادب کیلئے کام ہو سکے گا۔

طلسم جنوں

ساغر نظامی

اسی نمبر میں مندرجہ بالا عنوان سے میرے چند شعر کسی صفحہ پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ کاتب صاحب نے غلطی سے ایک جگہ "ہات" کی کتابت "ہاتھ" کی ہے۔ اور اس شعر کے پہلے مصرعہ کو کہ ؎ حُسن کے دل میں اُتر جاتی ہے سینہ پھونک کر شعر میں وہ سوز جسیات رکھ دیتا ہوں میں" کی صحت اس طرح فرما لیجئے ؎ "حُسن کے دل میں اُتر جاتا ہے سینہ پھونک کر"۔

ادبستان

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

جولائی۔اگست ستمبر ۱۹۳۶ء

کشمکش!

خانہ جنگی؟ یا قتل و غارتگری؟ یا بیرونی حملہ؟

ہسپانوی خانہ جنگی۔ کیوں؟

(از سید سعید جعفری مچھلی شہری (ایم۔ایس۔سی علیگ)

اس مضمون پر میں نے جو کئی عنوانات قائم کئے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ جب کبھی بھی اسپین کی اس خانہ جنگی کی ماہیت او حقیقت پر غور کرتا ہوں تو یہ اور مختلف اس قسم کے او خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ظاہر میں تو یہ صرف ایک خانہ جنگی ہے۔ اس سے پہلے بھی دُنیا میں کئی خانہ جنگیاں ہوئی ہیں۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ خانہ جنگی بہت عرصہ سے جاری ہے اور جنگ ذرا شدّت پذیر ہے مگر کیا یہ نظریہ کلیۃً صحیح ہے؟ کیا یہ محض خانہ جنگی ہے۔ اس کو بھی چھوڑیئے کیا اس کو جنگ کے نام سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ ابھی چند دن ہوئے ایک امریکن فلم "(Blockade)" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری رائے ہے کہ جو شخص اس فلم کو دیکھنے کی استطاعت رکھتا ہے اس کو ضرور دیکھنا چاہئے نہیں تو وہ نہ صرف کفرانِ نعمت کا بلکہ جرم کا مرتکب قرار پائے گا۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم اسپین کی خانہ جنگی کے متعلق ہے اور اس دعوٰی کے ساتھ پردۂ سیمیں پر پیش کی گئی ہے کہ یہ قطعی غیر جانبدارانہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈائرکٹر نے حتی المقدور غیر جانبداری سے کام لیا ہے یہانتک کہ یہ دکھانے کی بے معنی کوشش کی ہے کہ شہر کے باشندوں کی دعاؤں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک جہاز غلّہ اور رسد کا سامان لئے ہوئے کسی نہ کسی طرح بندرگاہ میں وارد ہوتا ہے اور شہریوں کو فاقہ کی مصیبت سے نجات دلاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس جگہ اس فلم پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا لیکن اتنا بیان کرنا غالباً خارج از موضوع نہ ہوگا کہ اس فلم کا مقصد اسپین کی اس خانہ جنگی کے ایک دلدوز رخ کو پیش کرنا ہے۔ ایک بندرگاہ (Castlemena) ہے جس کا محاصرہ غنیم تین جانب سے کئے ہوئے ہے اور جہاں کھانے پینے کی ساری چیزیں ختم ہو چکی ہیں۔ امید محض اس بات پر قائم ہے کہ سمندر کی جانب سے کوئی جہاز مدد کیلئے آ پہنچے مگر غنیم کی آبدوز کشتیاں کئی جہازوں کو بندرگاہ پہنچنے

سے قبل ہی غرقِ آب کر دیتی ہیں۔ مخبری کے نہایت شرمناک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ قصہ مختصر خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایکبار آبدوز کشتیاں اپنے
کام پر نہیں جا پاتیں اور ایک جہاز مدد کے لئے آپہنچتا ہے۔ اس موقعہ پر اس شہر کی فوج کا افسرِ اعلیٰ اپنے ایک نائب افسر کو مبارکباد دیتا ہے
اور کہتا ہے "کاش تم جنگ میں کامیاب ہو اور کاش یہ جنگ جلد ختم ہو" اس کے جواب میں اس نوجوان افسر کے دل کی گہرائیوں سے جو صدائے
دلخراش نکلتی ہے وہ یہ ہے ـــ ٹھیک الفاظ تو مجھے یاد نہیں مگر مطلب کچھ یہ ہے ـــ "جنگ؟ کیا یہ جنگ ہے؟ اس کو جنگ
نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ قتل ہے کھلم کھلا قتل۔ بچوں اور بوڑھوں کی جانوں کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ختم کرنے کو جنگ کہتے ہیں؟
کتنی دلخراش اور افسوسناک حقیقت ہے! ـــ اور پھر کیا یہ "خانہ" جنگی ہے یا بیرونی حملہ؟ جس جنگ میں ایک جانب کی فوج
کی کثیر تعداد زرخرید فوجوں پر اور دوسرے ممالک کی باقاعدہ فوجی دستوں پر مشتمل ہو کیا وہ "خانہ جنگی" کے لفظ سے موسوم کی جاسکتی ہے؟
عدیم الفرصتی کے باعث مجھے سیر حاصل بحث سے قصداً اجتناب کرنا پڑا ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس خانہ جنگی کی شروعات اور اس کی آج تک
کی رفتار پر گہری روشنی ڈالوں مگر فرصت بالکل نہیں مل سکی۔ اور ساغر کے پُرخلوص اصرار سے مجبور ہو کر قلم برداشتہ لکھنا پڑا۔ اور چونکہ اُردو
میں اس موضوع پر سوائے چند ایک رسالوں میں چند سطحی مضامین کے ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس لئے غالباً یہ مضمون فائدہ سے
خالی نہ ہوگا۔ مضمون کا ماحصل محض یہ ہوگا کہ اس سوال کا جواب دیا جائے کہ یہ خانہ جنگی کیوں ہو رہی ہے۔ خانہ جنگی کی دن بدن اور
ماہ بماہ رفتار کا ذکر اس مضمون میں نہیں شامل کیا جاسکتا۔ میکالے نے کہا تھا "دُنیا میں کوئی ملک اس قدر آسانی سے تاخت و تاراج
نہیں کیا جاسکتا جیسے اسپین اور ساتھ ہی ساتھ دُنیا میں کوئی ملک ایسا بھی نہیں جس کو فتح کرنا اسقدر دشوار ہو" اس بیان کی
حقیقت کوئی مسولینی اور فرانکو کے دل سے پوچھے۔ دو برس دو مہینہ سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا، ایک کونے سے دوسرے کونے
تک سارا ملک دستبردِ جنگ سے پامال ہو چکا ہے اور اس ملک کا سارا انتظام درہم برہم ہو چکا ہے لیکن میڈرڈ اور ویلنشیا ہنوز
دور است۔ یہ جنگ اتنے عرصہ سے چل رہی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے، دُنیا کے روزمرّہ نظام کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس
دوران میں چین اور چیکوسلاواکیا کے ہنگاموں نے ظاہراً اسپین کی اس خانہ جنگی کی اہمیت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے مگر سیاسی
محققوں سے یہ راز پوشیدہ نہیں کہ اس جنگ کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ اسپین کی جنگ صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی حیثیت کی
مالک ہے۔ کیونکہ یہاں جس بات کا فیصلہ ہو رہا ہے وہ تنازعہ قدرے تغیّر و تبدّل سے دُنیا کے ہر ملک میں ہو رہا ہے ہو چکا ہے
یا ہونے والا ہے۔ انگلستان کے مشہور سیاست داں ڈزرائیلی (Disraeli) نے کسی موقعہ پر کتنی نپی تُلی بات کہی تھی جس کا
مفہوم یہ تھا کہ "ہر ملک کے اندر دو قومیں آباد ہیں۔ ایک امراء کی اور ایک غرباء کی۔ گویا بہ الفاظ دیگر اسپین میں انہی دونوں قوموں
کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ خیر۔ یہ تو واقعات کا پیش از وقت ذکر کرنا ہے"

۲۰

اسپین دُنیا کے ان خوش نصیب یا بدنصیب ممالک میں سے ہے جن کی زندگی کی تشکیل مختلف اجزاء سے ہوئی ہے۔ اسپین کے باشندوں میں مختلف
نسلوں کا خون موجود ہے۔ مثلاً کلٹی، آئبیری، افریقی، سامی، آریائی وغیرہ۔ اسپین کے تہذیب و تمدن پر جو مذاہب اثر انداز ہوئے وہ عیسائیت اور
اسلام ہیں۔ مؤخر الذکر کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔ اسلام اسپین میں اس وقت وارد ہوا جب اسپین کے اندر ایک عام ابتری پھیلی ہوئی تھی اور لازم
تھا کہ کوئی ایسا انتظام ظہور پذیر ہو جو اس ابتری اور افراتفری کو دفع کرنے میں معاون ثابت ہو۔ مورسل نے اسپین پر قابض ہو کر اس کو ایک نئی زندگی بخش
دی۔ امن عامّہ کے ساتھ ساتھ تجارتی اور زراعتی ترقی کے دروازے کھول دئے اور اسپین تھوڑے ہی عرصہ میں ایک متمدّن اور سرسبز ملک میں تبدیل ہو گیا۔
بہرحال ایک بیرونی حکمران قوم کو ایک نہ ایک دن اسپین کی عنانِ حکومت سے دستبرداری اختیار کرنی تھی۔ لیکن اسپین کی بدنصیبی تھی کہ اسپین بیدار ہوتے
ہی غلط راہ پر گامزن ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ مورسل سے حکومت چھین لی بلکہ ان کو ملک کے باہر نکال دیا۔ خود اختیاری کے نقطۂ نظر سے تو یہ بات خوش

نصیبی سے موسوم کی جائیگی لیکن جب آپ اس تلخ حقیقت پر غور کرینگے کہ اسپین کی حرکت عمل اور تگ و دو کے بیشتر مظاہر ے اسی "مور قوم" کے
. . . . . . دم سے قایم تھے تو اسپین سے مسلمانوں کا نکالا جانا تاریخ کے معیار سے ایک "ناخوشگوار حادثہ" کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ زراعت،
تجارت سب "مور" قوم ہی کے مرہون منت تھے اور ان کے جاتے ہی اسپین میں جمود و تعطل کا دور دورہ ہوگیا۔ یہ پس منظر محض اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ
اس کے بعد کی متاخر صدیوں میں اسپین کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ سترہویں صدی میں اسپین تنزل پذیر ہو چکا تھا، لیکن اندرونی حیثیت سے
ایک متحدہ ملک تھا اور بیرونی لحاظ سے ایک سلطنت کا مالک۔ ظاہر میں تو یہ تھا لیکن اندر ہی اندر اسپین کی مالی اور اقتصادی حالت نہایت سقیم تھی
یہ نہیں کہ زر یا دولت کی کمی تھی بلکہ ان اشیا کی حد سے زیادہ فراوانی ہی اس بات کا باعث تھی کہ اسپین ایک عام بے حسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہی حالت
مابعد صدیوں میں رہی۔

اسپین کی شہنشاہیت بہت خاص اہمیت کی مالک ہے اور تاریخ کے طالب علموں کیلئے نہایت ہی دلچسپ لیکن عبرتناک حقیقت پیش کرتی ہے
ایسے تو ہر جگہ شہنشاہیت کا دارو مدار کلیسا اور فوج پر ہوتا ہے لیکن اسپین میں جس طرح یہ تینوں ادارے ایک رشتہ میں منسلک تھے اس کی مثال دنیا کے
کسی اور ملک میں ملنی آسان نہیں۔ اسپین میں کیتھولک چرچ بہت ہی خاص اور منفرد اہمیت کا مالک رہا ہے۔ "مور" نسل کو اسپین سے خارج کرنے میں حکومت
کا دست راست یہی کلیسا تھا۔ وہاں کیتھولک چرچ اتنا ہی سیاسی ہے جتنا مذہبی، حکومت کی تدوین و ترتیب، تعمیر و تخریب میں کلیسا کا ہمیشہ فیصلہ کن
ہاتھ رہا ہے۔ اس خدمت کے عوض حکومت کی جانب سے مراعات اور مال و دولت کلیسا پر بڑی فیاضی سے نچھاور کئے گئے ہیں۔ امراء کو بھی
اسی قسم کی خدمات کے عوض زمین کا کثیر رقبہ بخشا گیا ہے۔ اور مزید برآں یہی طبقہ اکثر فوج کے افسر مہیا کرتا رہا ہے۔ اسپین کو لوٹنے کے لئے یہ تینوں
طبقے ہمیشہ ایک دوسرے کے دست نگر رہے جس کامیابی اور چالاکی کے ساتھ اس فعل کو سرانجام دیا گیا ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ اس بات سے
ہو سکتا ہے کہ اسپین کی جمع شدہ دولت میں ۸۰ - ۹۰ فی صدی کے مالک کلیسا کے یہ راہب تھے۔ ظاہر ہے کہ عوام میں ایک عام رنجش پیدا ہوگی
چنانچہ ہوئی اور گذشتہ کئی صدیوں کی تواریخ اس بات کی شاہد ہے کہ فوج اور کلیسا کی ان غاصبانہ حرکتوں کے خلاف کئی مرتبہ بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن کلیسا
اور فوج کی بے پناہ طاقت کے خلاف آزادی کا یہ جذبہ اندر ہی اندر سلگتا رہا اور کوئی مہتم بالشان کارنامہ کی صورت میں نمودار نہ ہو سکا۔ مذہب
تعلیم، جمہوریت، زمین اور صوبجاتی ذہنیت ـــــ یہ پانچ سوال ہمیشہ اسپین کی تاریخ میں اضطراب اور شورش کے باعث رہے ہیں موجودہ
خانہ جنگی بھی ایک لحاظ سے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے لیکن کئی وجوہ سے ایک جداگانہ صورت اختیار کر چکی ہے۔

کلیسا کی بے پناہ طاقت کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان تمام پانچوں سوالوں سے کلیسا کا نہایت گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے۔ مذہب
کا تو خیر اجارہ دار رہا ہی ہے لیکن یہ سن کر شاید کچھ لوگوں کو حیرت ہو کہ کلیسا سے انحراف جرم تصور کیا جاتا تھا اور یہ صورت حال ۱۹۳۱ء تک قایم رہی
واقعہ یہ ہے کہ "عدالت استیصال الحاد" باقاعدہ طور سے ۱۸۳۱ء ہی میں موقوف کی گئی۔ تعلیم کا یہ حال تھا کہ سوائے زاری روس کے یورپ کا کوئی اور
ملک تعلیم میں اتنا پیچھے نہیں تھا جتنا اسپین۔ ۴۵ فی صدی آبادی قطعی جاہل تھی اور اس کا الزام بھی کلیسا ہی کے سر آتا تھا۔ کیونکہ تعلیم کا واحد حقدار
بلا شرکت غیرے کلیسا ہی تھا۔ لیکن جس ملک میں چالیس ہزار اہل کلیسا ہوں اور سب کے سب حکومت سے تنخواہ لیتے ہوں۔ وہاں تعلیم کے لئے زیادہ
روپیہ ملنا ممکن نہیں تھا اور اگر ممکن بھی ہوتا تو کوئی جذبہ اس کار خیر کے لئے محرک ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ عوام کی جہالت ہی میں تو کلیسا کی
فوقیت برقرار رکھنے کا راز مضمر ہے۔ فوج کا یہ حال تھا کہ اسپین کے سے چھوٹے سے ملک میں فوجی افسروں کی مجموعی تعداد ۱۹۳۱ء میں اکیس ہزار
تھی۔ واضح ہو کہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے پاس بھی فوج میں اتنے افسر نہیں تھے۔ فوج کے پاس جیسا میں نے اوپر اشارہ کیا ہے جاگیری حقوق بھی
تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء تک غیر فوجی لوگوں کا بھی فوجی عدالتوں میں مقدمہ پیش ہو سکتا تھا۔

زمین کا مسئلہ سارے مسئلوں کا سرتاج تھا۔ چند اعداد و شمار اس مسئلہ کی اہمیت کو روشن کرنے میں مدد دینگے۔ اسپین میں بڑے بڑے زمینداروں

کا گویا راج تھا۔ خیال کیجئے کہ ایک فی صدی آبادی کے پاس زمین کا ۵۱ فی صدی حصہ تھا۔ یا دوسری جانب سے یوں دیکھئے کہ ۴۰ فی صدی آبادی کے پاس زمین کا عشر عشیر بھی نہیں تھا اور یہ اس ملک میں جہاں کی ۷۲ فی صدی آبادی زمین سے روزی کماتی تھی! جس وقت سے کہ مور قوم نے اسپین کو مجبوراً خیرباد کہا اس وقت سے زراعت کے بُرے دن آگئے اور جو ترقی اسپین کی زراعت نے ان کے زمانے میں کی تھی وہ قصّۂ پارینہ ہو کر رہ گئی۔ اسپین میں کاشت بہت چھوٹے چھوٹے سے حصّوں پر منقسم تھی اور اس پر لطف کی بات یہ تھی کہ کسان جو کچھ اصلاح اور درستی کے لئے کرتا اس کے لئے نہ صرف اس کو کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا بلکہ قانونی طور پر بھی اس درستی کا اور اس کی وجہ سے جو فائدہ ہو اس کا حقدار زمیندار قرار دیا جاتا تھا جیسے کہ یہ سب کسان کے خون چوسنے کو کافی نہیں تھا، اس لئے ایک اور قبیح رواج منیجروں کا تھا (کیونکہ زیادہ تر زمیندار اپنی زمین سے دور رہتے تھے) اور جو کچھ بھی کسانوں کے پاس پسماندہ بچتا تھا اس میں سے کافی حصّہ ان منیجروں کے قبضہ میں آتا تھا نتیجہ ظاہر تھا۔ شرمناک غربت اور فاقہ کی شدت —— یہ تھی کسانوں کی قسمت۔

ان سب مشکلات کے ساتھ ساتھ اسپین کی سیاست میں ایک اور جذبہ کارفرما ہے اور وہ ہے کئی صوبجات میں خود اختیاری کا جذبہ جو بہت شدت سے پایا جاتا تھا اور اسپین کی سیاست کی ہنگامی حیثیت میں بہت حد تک اثرانداز ہوا ہے۔ اسکے متعلق آگے چل کر ذکر کیا جائیگا۔

اوپر کی سطور سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اسپین میں جو تنازعہ ہے اس کے فریق ہر دو جانب سے کون کون ہیں۔ اسپین کے سیاسی جسم میں جو افقی اور عمودی درازیں تھیں وہ کئی جذبات اور قوتوں سے اثر پذیر ہوتی تھیں۔ کسی مصنف نے کتنا عمدہ تجزیہ کیا ہے "غریب اور امیر میں تنازعہ تھا، مزدوروں اور فوج میں، کلیسا کے بالائی طبقوں میں اور عوام میں، رضاکاروں میں اور بھاڑے کے سپاہیوں میں، کسانوں میں اور تعلقداروں میں غیر اراضی والوں میں اور زمینداروں میں، جمہوریت میں اور فسطائیت میں —— یہ تمام مجادلے اسپین کی جنگ میں کارفرما ہیں" اور یہ صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کی اس خانہ جنگی نے ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی ہے کیونکہ یہ تمام آویزشیں کسی نہ کسی شکل میں دُنیا کے ہر ملک میں پائی جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اسپین کی اس جنگ نے تمام عالم کی جذباتی اور نفسیاتی دُنیا میں ایک ہلچل ڈالدی ہے۔ اس لئے جب اس جنگ کی یہ بُنیادی حیثیت آشکارا ہوگئی تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دونوں فریق کن جماعتوں پر مشتمل ہیں۔ حکومت کی طرف حکومت تھی اور رفتہ رفتہ حکومت کی جماعت میں جمہوری، لبرل، اشتراکی، اجتماعی، نراجی اور تمام ایسی جماعتیں آگئیں۔ حکومت کی جانب وہ صوبے بھی تھے جو صوبجاتی خود اختیاری کے مویّد تھے۔ یعنی کیٹیلونیا اور باسک کے باشندے، واضح ہو کہ مؤخرالذکر کے رومن کیتھولک باشندے بھی حکومت کے ساتھ تھے، اسی کے ساتھ ساتھ کسانوں اور مزدوروں کا بیشتر حصّہ حکومت کا ہمنوا تھا۔ یہ بات اہمیت سے خالی نہیں کہ اہل الرائے اور علمی آبادی من حیث الجماعت حکومت کی ہمدم تھی، گویا کہ متوسط طبقہ کی اکثریت بھی حکومت کے ساتھ تھی۔ فوج کا کثیر حصّہ حکومت کے ساتھ رہا۔ اور بحری اور ہوائی فوج بھی حکومت کی طرفدار تھی اب دوسری جانب کا بھی جائزہ لیجئے۔ باغیوں کے ساتھ فوج کے افسروں کی کثیر تعداد تھی، زمیندار اور تعلقدار تھے، رومن کیتھولک باشندوں کی اکثریت تھی۔ شاہی پسند جماعت تھی، فسطائی جماعت تھی (جس کا نام اسپین میں فیلنجسٹ ہے) بڑے بڑے تجّار اور سرمایہ دار تھے، پولیس کا کافی حصّہ تھا۔ انکی فوج مشتمل تھی جرمن فوج پر، اٹلی کی فوج پر، بھاڑے کی موری سپاہ پر اور خالص اسپینی فوج کی اقلیت پر۔ منجملہ ان کے کارلسٹ اور فیلنجسٹ تو تھے ہی۔ مذکورہ بالا تشریح سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجانی چاہئے کہ اسپین کی آبادی کے ان دونوں حصّوں میں تصادم ناگزیر تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ خانہ جنگی کی شروعات پر روشنی ڈالی جائے لازم معلوم ہوتا ہے کہ چند غلط فہمیوں کا ازالہ کردیا جائے۔

اسپین کی حکومت کی موجودہ حیثیت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اشتراکی اور اجتماعی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جس وقت خانہ جنگی شروع ہوئی حکومت میں یہ جماعتیں قطعاً شریک نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان جماعتوں کی ہمدردی فسطائی اور رجعت پسند جماعتوں کے خلاف جمہوری اور لبرل حکومت سے تھی اور جیسے جیسے فسطائی اور رجعت پسند جماعتوں کی طاقت بڑھتی گئی جمہوریت خود ان کی زد میں آنے لگی

ویسے ہی متمدن انتہا پسند جماعتیں حکومت کو بچانے کے لئے حکومت میں شریک ہوئیں۔ آج دو سال کے بعد پروپگنڈا کی اصلیت ظاہر ہو چکی ہے اور سب کو یقین ہے کہ یہ بغاوت جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے اشتراکیت اور بالشویزم کے خلاف نہیں ہے۔ جنرل فرینکو کی جانب سے کئی بار اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اس نے بغاوت نہیں کی بلکہ اسپین کو اشتراکی سازش سے نجات دینے کے لئے اپنا علم نصب کیا لیکن یہ پروپگنڈا اپنے مقصد میں ناکامیاب ہو چکا ہے کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس "سازش" کے وقوع کیلئے جو ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ تمام کے تمام جعلسازی پر مبنی ہیں۔ اس سلسلہ میں میری سفارش ہے کہ ہر شخص جو اس جنگ کی اہمیت کو سمجھنا چاہتا ہے وہ ایک کتاب موسوم بہ "اسپین میں نازی سازش" کا مطالعہ ضرور کرے۔ ویسے بھی اب اس بات کا عام اعتراف ہے کہ خانہ جنگی شروع ہونے سے کئی مہینہ پہلے اٹلی اور جرمنی کی جانب سے دخل در معقولات کی پوری تفصیل تیار کی جا چکی تھی۔ وہ طیارے جو فرانکو اور موری افواج کو اسپین لائے اٹلی کے مہیا کئے ہوئے تھے۔ جین مارچ اور اسپین کے دیگر سرمایہ داروں اور اٹلی کے درمیان ایک غیر سرکاری سمجھوتا ہو چکا تھا۔ پہلے ہی سے یہ طے پا چکا تھا کہ وہ جزائر جو اسپین کے مشرق میں ہیں۔ وہ اس مدد کے سلسلہ میں اٹلی کو سونپ دئے جائینگے۔ دراصل شروع میں جرمنی اور اٹلی کے درمیان ایک مقابلہ تھا کہ باغیوں کو کون زیادہ مدد دیتا ہے لیکن اٹلی کا رجحان دیکھ کر اور وسطی یورپ میں اپنے مفاد کی توسیع کی خاطر جرمنی نے "شپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ کر اسپین سے بہت حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی۔

یہ تو ہے وہ پس منظر جس کے بغیر اسپین کی اس جنگ کی حقیقت ہم پر کلیۃً منکشف نہیں ہو سکتی۔ اب پھر ذرا واقعات کو دوسرے پہلو سے دہرائیے اور گذشتہ جنگ عظیم سے لے کر خانہ جنگی کی شروعات کے وقت تک ایک سرسری نظر ڈالئے۔ جیسا کہ اوپر کی تشریح سے ظاہر ہو گیا ہوگا جس وقت ۱۹۱۴ء میں گذشتہ جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس غریب ملک کے تخت پر الفانسو سیزدہم متمکن تھا اور اسکے مددگار اگر ایک طرف رجعت پرست زمیندار اور تعلقدار تھے تو دوسری جانب ان کا آلۂ کار کلیسا تھا اور ان کے پس پشت جاگیرداری فوج تھی۔ اس اتحاد ثلاثہ کے خلاف بغاوت کا روح رواں پروفیسر اور تعلیم یافتہ طبقہ تھا، اس جذبہ میں صوبجاتی خود مختاری کے علمبردار بھی شریک تھے اور منجملہ ان کے مزدوروں کا طبقہ تھا جو کئی پارٹیوں پر منقسم تھا۔ لیکن چونکہ شہنشاہیت کے خلاف یہ جتنے طبقے تھے وہ آپس میں متفق نہیں تھے یہاں تک کہ مزدوروں کا طبقہ بھی متحد نہیں تھا اس لئے بظاہر شہنشاہیت اطمینان سے برسر اقتدار تھی۔ بہرحال شہنشاہیت کے اس اقتدار اور قوت کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ تعلیم یافتہ طبقہ جنگ میں شرکت کے لئے مصر تھا لیکن الفانسو نے اسپین کی پالیسی کو قطعی غیر جانبدارانہ رویہ پر قائم رکھا اس کا نتیجہ ہوا کہ مالی اور اقتصادی لحاظ سے جنگ کے اختتام پر اسپین بہت ہی خوش نصیب تھا۔ ہزاروں لوگ لکھ پتی بن گئے حکومت کا قرضہ ہلکا ہو گیا اور تاوارمزدوروں کی اُجرت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ صورت حال ۱۹۲۰ء تک رہی۔

لیکن اس دوران میں مزدوروں کو اُجرت کے اضافہ کا جو چسکا لگ چکا تھا اور جس جگہ بھی کہ سرمایہ داروں اور مالکوں نے یہ رویہ نہ اختیار کیا وہاں ان کو منہ کی کھانی پڑی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء تک یہ گرم بازاری ختم ہو رہی تھی کیونکہ بیرونی ممالک جنگ سے چھٹی پا کر اپنے اپنے ملک کی تجارتی اور اقتصادی حالت سنوارنے میں سرگرم ہو چکے تھے۔ بہرحال اسپین کی اندرونی سیاست پر اس کا اثر یہ پڑا کہ مزدوروں کی اُجرت میں تخفیف ہونے لگی اور بہت سے مزدور برطرف کر دئے گئے اس سے ایک شورش پیدا ہو چلی تھی۔ لیکن الفانسو شہنشاہیت کے گُر سے واقف تھا چنانچہ اس نے اسی آزمودہ نسخہ کو استعمال کیا جس کا تجربہ نہایت کامیابی سے آج کل ہٹلر اور مسولینی کر رہے ہیں یعنی ملک کی توجہ کو اندرونی مصائب کی طرف سے ہٹانے کے لئے کسی جنگ کی طرف رجوع کرنا۔ چنانچہ ہسپانوی مراقش کے نامور سورما عبدالکریم کے خلاف اس نے یکایک فوج بھیجنے کی تیاری شروع کی اور ساری تیاری اپنی ذاتی قیادت میں کی۔ لیکن عبدالکریم نے اس بیجا حملہ کرنے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ اور ایسی سخت ہزیمت دی کہ اس کی ذلت کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کم از کم ۱۰ ہزار ہسپانوی فوج میدانِ کارزار میں کام آئی اور تقریباً ۱۵ ہزار نے قید ہونے کو ترجیح دیا۔ اور تمام سامانِ جنگ مراقش کے سورماؤں کے ہاتھ لگا۔

اسپین میں اس شرمناک واقعہ کی وجہ سے اضطراب و شورش کی ایک لہر دوڑ گئی اور شہنشاہیت کی عمارت کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ کیونکہ اس شرمناک ہزیمت کا ملزم بادشاہ ہی قرار دیا جا رہا تھا۔ ایسی حالت میں الفانسو نے نہایت ہی شاطرانہ چال چلی یعنی اس شورش کو فرو کرنے کی نہایت ہی

۲۴

عمدہ تدبیر سوچی۔ پرائمو ڈی ریویرا، جو کیٹالونیا کا کپتان جنرل تھا اور جو امراء، سرمایہ دار اور فوج کے طبقوں میں مقبول بھی تھا اور جس کا اس ہزیمت سے کچھ بھی تعلق نہ تھا کے ہاتھ میں اس نے طاقت دیدی اور وزیر جنگ زمورا کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایسی صورت پیدا کی کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء کو ڈی رویرا نے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح الفانسو نے اپنے اختیارات کی تھوڑی سی قربانی سے اپنے وجود کو اور مستحکم کر لیا اور ڈی رویرا کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دے کر ساری لغزشوں اور کمزوریوں کا ذمہ دار بھی اسی کو بنا دیا۔

ڈی رویرا کی آمریت ۶ سال تک قائم رہی۔ سب سے پہلے تو اس نے گزشتہ ہزیمت کے داغ کو دھونے کیلئے مراقش پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور اس کے لئے فرانس سے مدد کا طلبگار رہا۔ فرانسیسیوں کے ذمہ جنگ کا زیادہ بار پڑا بہرحال ان دونوں کی متحدہ طاقت کے سامنے عبدالکریم کو پسپا ہونا پڑا اور ڈی ریویرا ایک قومی ہیرو کی اہمیت کا مالک ہوگیا۔ اس سے نجات پانے کے بعد ڈی رویرا نے اپنی توجہ اصلاحات کی جانب مبذول کی۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اسپین کی تجارتی، مالی اور اقتصادی حالت کو سُدھارنے میں کافی کوشش کی۔ سیاسی حیثیت سے ڈی رویرا کی آمریت مسولینی کی آمریت کے مشابہ تھی۔ چنانچہ اپنی حکومت قائم کرنیکے ایک ہی ماہ بعد وہ اٹلی گیا تاکہ وہاں مسولینی سے سبق سیکھے۔ شاگرد کی ہونہاری اور سعادتمندی اس سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے اُستاد مسولینی کے آئینِ حکومت کا چربہ اپنے یہاں بھی اُتارا۔ (یہ بات اہم ہے اور اس حیثیت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسولینی اٹلی میں بہت زمانہ سے "دلچسپی" لے رہا ہے) یہی نہیں بلکہ اسکی خارجی پالیسی بھی مسولینی کے اثر کی چُغلی کھاتی تھی چنانچہ وہ دو سال تک لیگ سے اپنے تعلقات منقطع کئے رہا۔ بہرحال مسولینی کی ڈکٹیٹرشپ اپنی تائید میں یہ کہہ سکتی تھی کہ قوم اس کی قایل اور بہی خواہ تھی لیکن اسپین میں واقعہ اس کے بالکل برخلاف تھا جیسی کہ امید کی جاسکتی تھی، پروفیسر اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے نفرت رکھتا تھا۔ کیٹلونیا کے باشندے اس کے خلاف تھے۔ عام لوگ اس سخت حکومت کے دل سے متنفر تھے۔ اسی طرح ظاہر ہے کہ اس آمریت کے ہمنوا وہ طبقے ہونگے جو ہر ملک میں رجعت پرستی کے مدّاح اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ یعنی کلیسا اور سرمایہ دار و تجار۔ بہرحال پرائمو ڈی ریویرا کا وقت آن پہنچا اور ۱۹۲۹ء میں اسپین بھی —— سرد بازاری کے سیلاب میں ڈوبنے لگا اور پرائمو ڈی ریویرا کے خلاف جذبہ ترقی پذیر ہوگیا۔ صورتِ حالات مقتضی تھی کہ الفانسو پھر اپنا ہاتھ دکھائے۔ چنانچہ ۲۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو الفانسو نے مجبور کیا کہ وہ مستعفی ہوجائے اور ان ڈکٹیٹر صاحب کا بھی وہی حشر ہوا جو ہر ڈکٹیٹر کا ایک نہ ایک دن ہونا ہے۔ الفانسو نے سب سے پہلے تو یہ کوشش کی کہ حکومتِ ماسبق کی لغزشوں سے اپنے کو بری الذمہ ثابت کرے اور پھر ایک اور حکومت جنرل برگر کی مدد سے بنائی اور اعلان کیا کہ آئین پھر عمل میں آئے گا۔ لیکن لوگ ان حرکتوں سے کافی بیزار ہو چکے تھے اور خود شہنشاہیت معرضِ خطر میں آرہی تھی کیونکہ تمام جمہوریت پسند اجزا اس شہنشاہیت اور ڈکٹیٹرشپ کے خلاف خود بخود ایک متحدہ محاذ کی شکل میں تبدیل ہو رہے تھے مگر حکومت ان خفیہ تحریکوں سے واقف تھی چنانچہ دسمبر میں جب ان جمہوری قائدین کی سرگردگی میں ہڑتالیں وغیرہ شروع ہوئیں تو حکومت نے شروع ہی میں ان کا سر کچلنے کے لئے چوٹی کے تمام لیڈروں کو جیل میں بھر دیا۔ مگر زبردستی معمولی رنجش کو شہادت کا رتبہ دیدیتی ہے یعنی حکومت کی اس زبردستی کا اثر یہ ہوا کہ عوام میں ان لیڈروں کی حمایت کا جذبہ سرایت کر گیا اور ان لیڈروں نے قید میں جو جمہوری سلطنت کیلئے لائحۂ عمل بنایا اس نے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ یہانتک کہ حکومت کو مجبور ہونا پڑا کہ ان لیڈروں سے مصالحانہ گفت وشنید کرے چنانچہ وہ لوگ رہا کر دئے گئے اور یہ طے پایا کہ کارٹس (اسپین کی پارلیمنٹ) کا انتخاب جلد عمل میں آئے اور انتخاب میں زبردستی وغیرہ نہ کی جائے ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ بہرحال اتنے زمانہ کے بعد انتخابات عمل میں آرہے تھے اور یہ واقعہ اسپین کی تاریخ میں نہایت اہم ہے کیونکہ اس نے اسپین کی سیاست کی کایا پلٹ دی اور یہ سچ ہے کہ شہنشاہیت اور استبدادیت کے نقطۂ نظر سے یہ رعایت نہایت ہی گراں ثابت ہوئی۔

بہرحال جون ۱۹۳۱ء میں میونسپل انتخابات عمل میں آئے۔ کہنے کو تو یہ میونسپل انتخابات تھے لیکن ان کی اہمیت مقامی سرحدوں سے پرے نکل چکی تھی کیونکہ عام طور پر یہ احساس تھا کہ اسپین کی آئندہ حکومت کی ہیئت اس شکل میں طے ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ جمہوریت یا شہنشاہیت؟ یہ

سوال جمہوری لیڈروں کی طرف سے نہایت ہی غیر مبہم، صاف اور کھلے الفاظ میں پیش کیا گیا تھا اور اسپین کی قوم نے نہایت ہی واضح ہی وہ ملک واقعہ یہ ہے کہ خود جمہوری لیڈروں کو یہ توقع نہ تھی کہ قوم کی اتنی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ ۲۰۷ ۹ نشستیں جمہوریت کے علمبرداروں کے حصہ میں آئیں اور باقی کسی نہ کسی شکل میں ۵۹۵ کی تعداد میں نشستیں شہنشاہیت کی ہمدرد تھیں۔ قوم اپنا پیام دے چکی تھی؟ کیا بادشاہ اس پیام کی حقیقت کو سمجھے گا؟ اگر کچھ ہچکچاہٹ تھی بھی تو وہ جمہوری لیڈروں کی کھلی پالیسی سے دور ہوگئی کیونکہ مؤخرالذکر نے بادشاہ پر جتا دیا کہ اسپین کے عوام کا فیصلہ ضرور عمل میں آئے گا۔ بادشاہ بھی عجیب مخمصہ میں تھا کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ اگر اب زبردستی کی گئی تو زبردستی انقلاب ہوگا اور اس حالت میں شہنشاہیت کا خاتمہ یقینی تھا۔ چنانچہ ۱۳ اپریل کی شب کو رات کی تاریکی میں شہنشاہیت نے اسپین کو رخصتی سلام کیا اور اسی شب باقاعدہ طور پر اسپین کی تاریخ میں دوسری بار (۱۸۷۳ء میں ایک بار جمہوریت قائم ہو چکی تھی مگر اس کی عمر بھی بہت کم تھی) جمہوریت کی داغ بیل پڑی۔ سارے اسپین میں شادمانی کے شادیانے بجنے لگے اور اسپین ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسرت و بہجت کے سمندر میں غوطے مارنے لگا۔

مگر بادشاہ نے یہ نہیں کیا کہ راج کو تج کر اسپین کی بادشاہت کے دعوے سے دستبردار ہو جائے۔ بلکہ رخصتی کے بعد جو اعلان کیا اس میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ اسپین کے باشندے جلد راہ راست پر آجائینگے اور اس وقت وہ پھر اپنے حق کی حفاظت کے لئے آسکے گا۔ بادشاہ کے جاتے ہی ایک عارضی حکومت وجود میں آئی جو جمہوری طرز کی تھی۔ سینیور زیمورا حکومت کا صدر رہا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ شخص نہ صرف کٹر کیتھولک تھا بلکہ کافی امارت کا مالک تھا۔ اسکے فوراً بعد ایک عام انتخاب عمل میں آیا جس میں جمہوریت پسند جماعتوں کے ۳۱۵ نمایندے کامیاب ہوئے اور شہنشاہیت پسند صرف ۱۹ تھے۔

لیکن اس جمہوریت کی تاریخ نہایت ہی افسوسناک ہے اور خصوصاً اسپین کی تاریخ میں ایک عبرتناک باب سے تعلق رکھتی ہے۔ تمام دنیا میں اس حکومت نے امید کی لہر دوڑا دی کیونکہ اس حکومت کے روح رواں متوسط طبقہ کے علم دوست اصحاب تھے اور حکومت کی باگ ڈور زیادہ تر پروفیسروں، عالموں اور محققوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ حکومت خالی خولی الفاظ کے پیچھے واقعات کی سخت حقیقتوں کو نظرانداز کر گئی۔ لامحالہ یہ صورت پیدا ہوئی تھی کہ یہ قریب قریب سب کو خفا کر دے گی اور کسی کو خوش نہ کر پائے گی۔ اس حکومت نے اس تلخ حقیقت کو فراموش کر دیا کہ بھڑ کے چھتوں کو محض چھیڑنے سے بھڑوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں ان میں ایک انتقامی جذبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ آپ پر تندہی سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ چنانچہ "مستقل حقوق" والوں کے ساتھ اس حکومت کا طرز عمل کچھ ایسا ہی تھا۔ غور کیجئے کہ اسپین کا ایک بڑا گرانڈی (بڑا تعلقدار) ڈیوک آف البا تھا۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے القاب و خطاب کی تعداد اتنی لمبی چوڑی تھی کہ سرکاری گزٹ کے ۲۶ سطور کو محیط تھی۔ اب یہ حکومت صرف اتنا کرتی ہے کہ اس کے خطاب والقاب یک قلم موقوف کر کے اس کا نام سیدھا سادھا سینیور (یعنی مسٹر) قرار دیدیا گیا مگر ڈیوک آف البا بدستور برقرار رہا اور اسکے حقوق اور مراعات بدستور قائم رہے لیکن صرف اتنا ہوا کہ ڈیوک کو خفا کر کے اس کو زیادہ خطرناک بنا دیا گیا۔ لیکن کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ مگر اس قسم کی دفع الوقتی کا رویہ کم نظری اور بیجا خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔

بہرحال یہ حکومت اس بلند بانگ دعوے سے معرض وجود میں آئی "اسپین ایک جمہوری حکومت ہے جو انصاف اور آزادی پر قایم ہے" اس دعوی کے ثبوت میں یہ کوشش تو ضرور کی گئی کہ آئین میں ان ارادوں کا اظہار کر دیا گیا جو ایسی حکومت کا نصب العین ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی خاص عملی کوشش نہیں کی گئی۔ بہرحال جن اصلاحات کے نفاذ کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا ان میں خصوصیت سے قابل ذکر یہ ہیں۔ مذہبی جماعتیں ایک مخصوص قانون سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے کلیسا کا حکومت سے رشتہ منقطع ہونا چاہئے۔ اکثر جائداد سوسائٹی کے مفاد کے لئے حکومت کی طرف سے تصرف میں لائی جائیگی لیکن اس کی تلافی میں اس کا عوض دیا جائیگا۔ کیٹلونیا کو خود مختاری عطا کی جائے گی۔ مجلس قانون ساز صرف ایک ہوگی۔ اور اس کا انتخاب عام بالغ رایوں کے ذریعہ عمل میں آئے گا۔ یہ اور اسی قسم کے اور ارادے تھے جو زیادہ تر

عمدہ تدبیر سوچ کر جبر یہ قرار دی گئی مگر اس میں یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تعلیم کا واحد اجارہ دار کلیسا بنا ہوا تھا۔ زمین اور اراضی کے متعلق ایک کچھ بھی تعلیٰ معتدل اور منصفانہ اسکیم بنائی گئی لیکن اسکے نفاذ میں حد درجہ تساہل اور بے راہ روی برتی گئی جس سے کہ سابقہ حقوق کے مالکوں کے کوڈھیں غیض وغضب کا جذبہ ترقی کر گیا۔ سنیور زمورا کے صدر منتخب ہوجانے پر ڈان ازانا، ایک مشہور مصنف وزیراعظم منتخب ہوا۔

کلیسا کے خلاف عوام میں جذبات نفرت وحقارت اس شدت سے اثر کر چکے تھے کہ اکثر جگہ گرجاؤں کو لوٹنے اور جلانے کے لئے عوام مجتمع ہوئے اور کئی جگہ کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر اس سلسلہ میں جو چیز بھولنے کی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ حکومت نے اس جذبہ کی سخت مخالفت اور مذمت کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اشتراکی جماعت نے تو گرجاؤں کی حفاظت کے لئے اپنے چوکیدار اور محافظ مقرر کئے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اس حکومت کا یہ منشا تھا کہ کلیسا کے پاس جو مستثنیات اور مراعات کی بنا پر دولت اور طاقت کی زیادتی تھی اس کو کم کیا جائے اور کوئی بھی حکومت جو عوام کا فائدہ چاہتی ہے یہی ارادہ رکھتی۔ اوپر اس بات کی تشریح کی جا چکی ہے کہ کس طرح کلیسا سیاست پر، دولت پر، تجارت پر، تعلیم پر اور مختلف دیگر شعبوں پر حاوی تھا۔ حکومت کی جانب سے کلیسا کو جو گرانٹ ملتی تھی وہ بند کر دی گئی، التعلیم ان کے ہاتھ سے لے لی گئی، تجارت پر ان کا قبضہ ہٹانے کی کوشش کی گئی لیکن یہاں بھی وہی غلطی کی گئی جو اس آزاد منش حکومت کے تمام حرکات میں پائی جاتی تھی یعنی ادھورا کام کرنا۔ مذہبی جماعتیں مثلاً ([illegible]) پر کسی قسم کی پابندی نہیں عاید کی گئی اور وہ اپنی حرکات کے لئے آزاد چھوڑ دی گئیں۔

فوج کی طرف بھی اس حکومت نے اپنی توجہ منعطف کی۔ فوج کے جاگیر داری اختیارات بہت کم کر دئے گئے۔ اور جلدی پنشن کی ترکیب سے ۲۲ ہزار افسروں میں سے دس ہزار سے نجات پائی۔

قصہ مختصر، اس حکومت نے ہر طرف اصلاحات کرنے چاہے لیکن زیادہ تر ان کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ مستقل حقوق رکھنے والے اور زیادہ انتقام پر تل گئے۔ البتہ چند ایسی باتیں ضرور ہیں جو اس حکومت کی طرۂ امتیاز ہیں۔ مثلاً تعلیم کی فراوانی اتنے قلیل عرصہ میں حیرت کا باعث ہے تجارتی اور اقتصادی حالت کو بھی سنبھالنے اور سنوارانے میں اس حکومت نے بڑا کام کیا۔ ان کامیابیوں کی اہمیت کا آپ کو اندازہ ہوگا اگر آپ یہ سوچیں کہ ایسے وقت میں جب دُنیا کی دیگر اقوام اسلحہ جات کی تعداد کو توسیع دے رہی تھیں، تنخواہوں اور اُجرتوں پر تخفیف کی کلہاڑی چل رہی تھی — اور بے روزگاری ترقی پذیر تھی، اسپین کی اس حکومت نے اپنی فوج میں تخفیف کی مزدوری اور اُجرت میں عام طور پر اضافہ کیا اور بے روزگاری کی وبا کو کامیابی سے روکا۔ صرف یہی نہیں۔ اسپین نے جمعیت اقوام سے باقاعدہ طور پر اپنا ناتہ جوڑا۔ اور آئین کے اندر جمعیۃ الاقوام کی حیثیت کو تسلیم کیا، جمعیت اقوام کی حمایت کو اپنی خارجی پالیسی کا جزو لاینفک قرار دیا۔ (لیکن صد حیف۔ سیاسی دُنیا میں ستم ظریفی کی اس سے عمدہ مثال دستیاب ہونی ممکن نہیں کہ اسی جمعیت نے بالآخر اسپین کی مدد واعانت سے مُنہ موڑ لیا اور غیر جانبدارانہ کمیٹی قائم کرکے دھوکے کی ٹٹی بنانے کی عمدہ مثال قایم کی)۔

اب یہاں پر ایک دانستہ فروگذاشت کی تلافی لازمی ہے۔ اسپین میں ([illegible]) یعنی جمہوریت پسند جماعتیں کئی ہیں اور آپس میں ان میں زیادہ محبت نہیں۔ خاص خاص چار ایسی جماعتیں ہیں (۱) کسبی اشتراکی (Syndicalists) جماعت۔ اس جماعت کا مدعا یہ ہے کہ کل صنعت وحرفت یعنی پیدائش دولت اور تقسیم دولت اہلِ حرفہ کی انجمنوں کے ہاتھ میں ہو اور سرمایہ داروں کا وجود نہ رہے۔

(۲) (Anarchists) نراجی جماعت۔ اس جماعت کا مدعا غالباً یہ ہے کہ کسی قسم کی حکومت نہ ہو اور جبر وتشدد کی بنا پر قانون نہ قائم ہو بلکہ لوگ خود اپنی تنظیم کریں (یہ ٹھیک طور سے واضح نہیں کہ کیسے؟) (۳) (Socialists) اشتراکی جماعت جس کا مدعا یہ ہے کہ حکومت تمام ذرائع پیدائش وتقسیم دولت وحرفت کی مالک ہو۔ (۴) (Communists) اشتمالی جماعت جو انسانی مساوات کی خواہاں ہے اور جس کا مدعا یہ ہے کہ مال املاک کو قوم کی مشترک ملکیت بنایا جائے اور نظام اس اصول پر قائم ہو کہ ہر فرد کو حسب قابلیت اور حسب ضرورت حصہ

دیا جائے۔ یہ سب جماعتیں عام جمہوریت پسند ([illegible]) جماعت کے علاوہ ہیں جو اس وقت برسر اقتدار تھی۔ اسپین ہی وہ ملک ہے جہاں نراجی جماعت کافی تعداد میں تھی اور کافی منظم (؟) تھی۔ اشتراکی دار الخلافہ میڈرڈ میں طاقت کے مالک تھے اور کمیونسٹ کہیں بھی نہیں۔ مؤخر الذکر اسپین میں کبھی زیادہ ذی اثر نہیں رہے۔ اُس وقت کی حکومت میں ان چاروں جماعتوں میں سے صرف اشتراکی جماعت نے لبرل جماعت سے تعاون کیا۔ لیکن حکومت کی پالیسی کی روح رواں صرف لبرل جماعت تھی اور اس پالیسی کی تشکیل میں اشتراکی جماعت کا رسوخ بہت کم تھا۔ اشتراکی جماعت اس بات کی دعویدار تھی کہ جبتک بُنیادی مسائل نہ طے کئے جائیں گے محض "کھُر چینے" سے کچھ نہیں ہوگا اور حکومت عوام میں مقبول نہ ہو سکے گی کیونکہ ان کے فائدہ کے لئے زیادہ نہ کر سکے گی۔ لیکن حکومت کا لبرل گروپ اس سخت اقدام سے گھبراتا تھا۔ بہرحال حکومت کو اس وقت نہ صرف اس اندرونی کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا بلکہ بیرونی مشکلات سے مقابلہ کرنا تھا۔ اور یہ مشکلات راست و چپ دونوں جانب سے نمودار ہو رہی تھیں۔

چونکہ اشتراکی گروپ حکومت کی پالیسی کو موڑنے میں ناکامیاب رہا اس لئے مزدور جماعت رفتہ رفتہ انارکی (نراجی) اور کمیونسٹ اشتراکی جماعتوں سے اپنے کو منسوب کرنے لگی۔ اوّل الذکر جماعت کسی قسم کی حکومت کے دباؤ کو نہیں مانتی۔ اس لئے ہر قسم کی حکومت کیلئے کانٹا ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال ان دونوں جماعتوں نے حکومت کا ناک میں دم کر دیا اور ان کے ہوش ٹھکانے کرنے کے لئے حکومت کو سختی سے کام لینا پڑا مگر یہ فتنہ تھوڑی دیر کے لئے فرو ہوگیا کیونکہ حکومت پر رجعت پسند جماعتوں کے ایک متحدہ محاذ کا حملہ ہو رہا تھا۔ یہ بات ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔ ستمبر ۱۹۳۲ء میں فوج میں ایک افسر جنرل سنجر جو نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اگرچہ سرمایہ داروں کے طبقہ نے ہمدردی ظاہر کی مگر یہ بغاوت کامیاب نہ ہو سکی اور آسانی سے دبا دی گئی۔ ۱۹۳۳ء میں عام انتخاب عمل میں آنے والا تھا۔ اس وقت رجعت پسند جماعتیں گل ربلس کی قیادت میں منظم ہونے لگیں اور کلیسا، زمینداروں، شہنشاہیت پسندوں اور سرمایہ داروں نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا جس کا نام (C.E.D.A) قرار پایا اور جو اشتراکیت کی مخالف پارٹی کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ عام طور پر اقرار ہے کہ اس جماعت کے پاس جو بے انتہا دولت تھی وہ پروپگنڈا تبلیغ اور رشوت کے اوپر پانی کی طرح بہائی گئی۔ کلیسا کے راہبوں نے جہنم کی آگ کا ڈر دلا دلا کر گاؤں کے رائے دہندگان کو اپنانا چاہا اور عورتوں کے اوپر "مذہب" کا جادو چلایا گیا جو اس فریب میں آنے سے مبتلا ہو جاتی ہیں (عورتوں کو اس جمہوری حکومت نے عام رائے کے حق میں شامل کر لیا تھا)۔ اس پر اضافہ کیجیے یہ بات کہ حکومت بُنیادی مسائل کے حل میں قطعی ناکامیاب رہی اور اس لئے کسی طبقہ کیلئے ممکن نہ تھا کہ وہ سچے جوش و خروش سے حکومت کی پالیسی کے حق میں ہو۔ اور انتخاب میں نراجی اور کمیونسٹ جماعتوں نے کسی قسم کی مدد نہیں دی، نتیجہ یہ ہوا کہ رجعت پسندوں نے بہت سی گم شدہ طاقت واپس حاصل کر لی۔ کیتھولک کلیسا کا سرکاری اخبار کھلم کھلا دھمکی دیتا تھا کہ ہم اپنے حقوق واپس لینگے چاہے خون کی ندیاں بہیں اور چاہے جمہوریت کا قلع و قمع ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسپین کے لئے مشہور ہے کہ اس کے باشندے سیاسی رائے کے معاملے میں بہت "رقیق" واقع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کہانی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ ۱۸۷۵ء میں جب الفانسو دوازدہم تخت پر واپس آیا اور پہلی جمہوریت طفلی ہی میں ختم ہوگئی۔ اُس وقت اس بادشاہ نے ایک شہر کا دورہ کیا۔ وہاں کے باشندوں نے نہایت ہی جوش و خروش سے بادشاہ کا استقبال کیا اور گلے پھاڑ پھاڑ کر خوش آمدید کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بادشاہ نے مشکوک نگاہوں سے اس استقبال کو دیکھا اور ایک شخص کو جو سب سے زیادہ زور سے چلاّ رہا تھا، کہا کہ "خیال رکھو۔ اتنا نہ چلاّؤ کہ تم کو نقصان پہنچے"۔ اس نے جواب دیا "عالیجاہ۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یہ تو میں بیماری کی وجہ سے صرف اتنا ہی چلاّ رہا ہوں۔ آپ مجھ کو اس وقت دیکھتے جب جمہوریت کا اعلان ہوا تھا۔ اس وقت تو چلاّتے چلاّتے میری ایک نس پھٹ گئی تھی"۔ بہرحال جمہوریت کے اختتام کی شروعات ہو چکی تھی اور ۱۹۳۲ء سے جوابی انقلاب کا دروازہ کھُل چکا تھا۔

۲۷

(. [illegible]) وزیرِ اعظم منتخب ہوا اور اس نے بغیر توقف کے اس عمارت کو گرانا شروع کیا جس کی تعمیر ماقبل جمہوری حکومت نے کی تھی۔ ۱۹۳۴ء کے شروع سے معاملات سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جہنم کے خوف سے اور پروپیگنڈے کے زور سے اور روپیہ کے لالچ سے جن لوگوں نے رجعت پسندوں کو منتخب کیا تھا ان کی اب آنکھیں کھلیں۔ اپنی لغزش کا خمیازہ بھگتنے کا وقت آپہنچا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کے پھر بُرے دن آگئے تھے۔ اُجرت اور تنخواہوں میں غیر معمولی طور پر تخفیف ہونے لگی یہاں تک کہ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی اس وقت جو حالت ہوگئی تھی وہ اس سے بھی بُری تھی جو جمہوریت سے قبل ان کی قسمت میں تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگرچہ موجودہ وزیرِ اعظم ([illegible]) وسط کی جماعتوں سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کی حکومت محض رَبلس کی انتہائی رجعت پرست داہنے ہاتھ والی جماعتوں کی مدد سے ظہور پذیر ہوئی تھی کیونکہ انتخاب کے بعد پارلیمنٹ ([illegible]) میں ان جماعتوں کا تناسب یہ تھا۔ داہنے ہاتھ والی جماعتیں ۲۰۷ - وسط کی جماعتیں ۱۶۷ - بائیں ہاتھ کی جماعتیں ۹۹ اور چونکہ داہنے ہاتھ والی جماعتوں نے آئین کے لئے حلف وفاداری لینے سے انکار کیا (آئندہ آنے والے واقعات کی جھلک!) اس لئے مجبوراً وسط ہی کی جماعت کو حکومت بنانی پڑی۔ اب قبل اس کے کہ اس حکومت کے اعمال پر نظر ڈالی جائے دو تین باتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ گِل رَبلس جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے تمام داہنے ہاتھ والی جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ پر لے آیا۔ اس نے اپنا مقصد صاف صاف ظاہر کردیا تھا "ہم مکمل طور پر اپنی طاقت چاہتے ہیں اور ہمارا مدعا یہی ہے۔ اس مدعا کو حاصل کرنے کے لئے ہم دقیانوسی آئینوں کے جھمیلے میں نہیں پڑینگے۔ جمہوریت ہمارے لئے منتہا نہیں بلکہ صرف اپنی حکومت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جب وقت آئے گا تو یا پارلیمنٹ کو ہمارے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا یا ہم اس کو کالنقش فی الحجر کردینگے"۔ اسی طرح ایک اور اہم شخصیت ڈان سٹیلو کی تھی، یہ ڈی ریویرا کی حکومت میں مالیات کا وزیر تھا مگر تغلّب اور غبن کے الزام کی وجہ سے اسپین میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مگر اب تو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی۔ وہ داہنے ہاتھ کی جماعت میں بہت ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس وقت جرمنی کی خفیہ دخل در معقولات زیادہ زوروں سے شروع ہوئی اور رَبلس کو تو جرمنی کا آلۂ کار ہی بتایا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء ہی میں جرمن نازی پارٹی کا ایک بیرونی شعبہ اسپین میں عمل میں آچکا تھا۔ اس کا کام اخباروں، سیاست دانوں، فوجی افسروں اور تجّار کی خفیہ مدد اور ان کو اُکسانا تھا۔ اس کام میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوا۔

بہرحال وسط کی جو حکومت وجود میں آئی تھی اس نے داہنے ہاتھ والی جماعتوں کے ایما اور دباؤ سے جمہوری حکومت کے زمانہ کے اصلاحات کا رُخ پھیر دینا چاہا۔ تعلیم کی فراوانی روک دی گئی۔ ہزاروں اسکول بند کردئے گئے اور کلیسا کو پھر تعلیم کا اجارہ دار بنانے کی کوشش کی جانے لگی۔ کلیسا کو پھر حکومت کا ایک لحاظ سے شعبہ قرار دیا جانے لگا اور حکومت کی جانب سے مالی امداد کا دروازہ پھر کھل گیا۔ قریب قریب چھ مہینہ کے اندر ۱۹ ہزار مزدور بے دخل کر دئے گئے۔ ہزاروں لوگ اپنے کاموں سے الگ کر دئے گئے اور بے روزگاری کی وبا پھر عام ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال آسانی سے قبول نہیں کی جاسکتی تھی اور تعجب ہوتا اگر اس کے خلاف ہڑتالیں اور برگشتگی نہ ہوتی۔ چنانچہ کئی جگہ کسانوں اور مزدوروں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا سر کچل دیا گیا۔ سب سے اہم، سب سے زیادہ شرمناک اور سب سے زیادہ عبرتناک وہ واقعہ ہے جس میں آسٹوریاس کے کانوں کے مزدوروں کو کچلنے کے لئے حکومت کو موری سپاہی اور بیرونی فوج کی مدد لینی پڑی۔ ان کی مدد سے جو حشر برپا کیا گیا اس کا معمولی اندازہ آپ کو اس سے ہوسکتا ہے کہ قریب قریب پانچ ہزار مزدور یا تو قتل کردئے گئے یا زخمی ہوئے۔ اس بیدردی اور ہولناکی نے ساری دُنیا میں غم و غصّہ کی لہر دوڑا دی۔ مگر حکومت صرف اسی سے راضی نہ تھی اور ایک قسم کا مارشل لا کا نفاذ سارے اسپین میں کر دیا گیا۔ مگر اس دوران میں دونوں فریقوں کے درمیان خلیج بہت وسیع ہوگئی تھی۔

جرمنی اور اٹلی دونوں واقعات کی اہمیت سے واقف تھے چنانچہ پتہ چلا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں مسولینی نے اسپین کی شہنشاہیت پسند جماعتوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان جماعتوں کی اس کوشش میں "کہ جمہوریت کو ختم کر کے شہنشاہیت پھر برقرار کی جائے" کسی طرح کی امداد سے دریغ نہ کرے گا

اسی طرح جرمنی نے اسپین کی فسطائی جماعت فیلنجسٹ کو زیادہ سے زیادہ مدد دینی شروع کی۔

مگر بائیں ہاتھ والی جماعتوں کو اب خطرہ کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ ازانا کی سرکردگی میں بائیں ہاتھ والی جماعتوں نے بھی ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ ابھی تک کمیونسٹ پارٹی الگ تھی۔ اس پارٹی کا کچھ زیادہ اثر بھی نہیں تھا جو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء دونوں انتخابات میں صرف ایک کمیونسٹ منتخب ہوا تھا۔ اب بھی چند جماعتیں الگ رہیں اور اس متحدہ محاذ میں شریک نہیں ہوئیں مثلاً نراجی جماعتیں اور کمیونسٹ جماعت کا وہ حصہ جو ٹراٹسکی کے زیر اثر تھا۔

ان ہنگاموں کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور خلل انگیز کیفیت ان صوبوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی جن کو گذشتہ جمہوری حکومت خود مختاری دینے کا وعدہ کر چکی تھی مگر اب وہ وعدہ داستان پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال تمام سیاسی فضا ایسی ابتری کی حالت میں تھی کہ کوئی حکومت ثابت قدم نہیں رہ سکتی تھی اور آئے دن حکومت کا نقشہ بدلتا تھا۔ یہ کیفیت اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جب اکتوبر ۱۹۳۴ء میں وسط کی اس حکومت میں رابلس کی پارٹی کے چند نفوس شامل کئے گئے تھے اور اگرچہ قانوناً وہ اس امر کے مجاز نہ تھے کیونکہ انہوں نے آئین کا حلف لینے سے انکار کیا تھا۔ مگر پریسیڈنٹ زمورا کی تنگ دلی یہاں بھی ان کے کام آئی۔ خیر۔ اس افراتفری کی حالت کو طے کرنے کے لئے ایک عام انتخاب کا ہونا ضروری تھا اور فروری ۱۹۳۶ء میں یہ عام انتخاب ہونا طے پایا۔ اس وقت وزیر اعظم ویلاڈرس تھا۔

اس وقت تک نراجی جماعتوں کو ہوش آ چکا تھا اور وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر اس مرتبہ بھی وہ انتخاب میں شریک نہیں ہوئے تو نتیجہ سنگین ہوگا ٹراٹسکی کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی بائیں ہاتھ والی جماعتوں کے متحدہ محاذ کو مدد دینے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ انتخاب داہنے ہاتھ والی جماعتوں اور بائیں ہاتھ والی جماعتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے ہو رہا تھا۔ [illegible] یعنی بائیں ہاتھ والی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے جو اعلان شائع کیا تھا وہ ایک یادگار چیز ہے اور اس کا تھوڑا بہت ذکر کرنا ضروری ہے۔

"ایک جمہوری حکومت قائم ہوگی۔ تمام سیاسی قیدیوں کو آزادی دی جائے گی۔ اظہار رائے میں پابندیاں نہ عائد کی جائیں گی۔ آئین پر عمل ہوگا۔ قید خانوں کی اصلاح کی جائیگی۔ کسانوں کے مفاد کے لئے قانون بنینگے جن کا مقصد دلالوں کو ختم کرنا، تعلیم کو عام کرنا، اور قانون اراضیات کی سختیوں کو ہلکا کرنا ہوگا۔ ٹیکس کے لئے نئے قانون بنینگے۔ خارجی پالیسی جمعیۃ الاقوام کی حمایت ہوگی۔ بے روزگاری دفع کرنے کی کوشش کیجائیگی تجارت کو ترقی دی جائیگی۔" یہ اور اسی قسم کے اور وعدے تھے مگر ایک بات اہم ہے کہ صاف صاف کھلے الفاظ میں اشتراکی پالیسی کی مذمت کی گئی تھی۔

انتخاب کے بعد جماعتوں کا تناسب یہ تھا۔ بائیں ۲۶۶ ؛ وسط ۶۵ : دائیں ۱۴۲۔ ویلاڈاس پر رابلس اور فرانکو کے (جس کو رابلس نے اپنے دوران وزارت جنگ میں فوج کا افسر اعلیٰ بنا دیا تھا) دباؤ ڈالا کہ وہ مستعفی نہ ہوں بلکہ آئین کو ختم کر کے ان کی دونوں کی مدد سے آمرانہ قسم کی حکومت بنائیں مگر اس نے ملک کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا لیا اور سنیور ازانا نے حکومت بنائی۔

اگرچہ اشتراکی جماعت سب سے اکثریت میں تھی لیکن وہ حکومت میں شامل نہیں ہوئی اور کل حکومت لبرل جمہوری جماعت سے انتخاب کی گئی۔ جس وقت یہ کہا جائے کہ باغیوں نے بالشویک حکومت کے خلاف علم نصب کیا تو یہ نہ بھول جائیے کہ کمیونسٹ تو کجا ایک سوشلسٹ بھی اس حکومت میں شریک نہیں تھا۔ البتہ فسطائیت سے بچنے کے لئے ان جماعتوں نے لبرل جماعت کی حمایت کو ضروری سمجھا۔

سارے اسپین میں بے چینی کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ نئی نئی امیدیں قائم ہوئی تھیں۔ مزدوروں اور کسانوں کے پھر بھاگ کھلے تھے۔ ان کو امید تھی کہ ان کی روزانہ روٹی کا پھر کوئی انتظام ہوگا اور ان کے رہنے سہنے کا پھر کوئی ٹھکانا کیا جائیگا۔ دوسری جانب رابلس اور اس کی ہمنوا جماعتوں کی امید پر پانی پھر چکا تھا۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح وہ موقع کی تاک میں تھے اور سازش کو وسیع اور قوی کرنے کے لئے وہ لوگ تل پڑے۔ کیٹلونیا نے خود مختاری کا اعلان کر دیا

زموراجس کی غداری کافی روشن ہوچکی تھی کرسئی صدارت پر زیادہ قائم نہیں رہ سکتا تھا اشتراکیوں کے ایما سے اُس پر ملامت کا ووٹ پاس ہوا۔ اور اسکی جگہ سینور ازانا نے لے لی۔ مؤخرالذکر کے عملی سیاست سے ہٹ جانے پر سب سے زیادہ بارسوخ لیڈر اشتراکیوں کا رہنما کبیلارو رہ گیا۔ لیکن وزیر اعظم لبرل پارٹی کا ایک رکن سینور کروگا ہوا۔

بہرحال اس وقت سیاسی عکس نما کا منظر بہت جلد جلد بدلتا رہا کیونکہ ایک طرف تو جمہوریت کی زندگی کو ختم کرنے کے لئے فسطائی جماعتیں ہر ممکن تدابیر کو عمل میں لارہی تھیں اور دوسری جانب انتہا پسند جماعتوں نے حکومت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ حکومت کی جان عجیب ضیق میں تھی۔ رجعت پرست اور فسطائی جماعتوں سے جو خطرہ تھا اسکے دفاع کے لئے حکومت کو انتہا پسند جماعتوں کی مدد پر منحصر ہونا پڑتا تھا اور یہ مؤخرالذکر جماعتیں حکومت سے مطمئن نہ تھیں کیونکہ حکومت بہرحال لبرل تھی اور ان جماعتوں کے نکتۂ نظر سے بنیادی مسائل کا حل نہیں کرسکتی تھی۔

واقعات نے اتنی سنگین صورت اختیار کرلی تھی کہ امن قائم رکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ فسطائی جماعتیں اس بے چینی اور شورش کو پھیلانے میں پیش پیش تھیں۔ ان کا منشا یہ تھا کہ اس طرح حکومت کو بدنام کیا جاسکے اور اس کو نکما ثابت کیا جاسکے۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ جماعتیں اس خطرہ سے واقف تھیں چنانچہ وہ اپنے حامیوں کو امن قائم رکھنے کی برابر تبلیغ کرتی رہیں مگر انارکی جماعت نہ ماننا تھی اور نہ مانی۔ فسطائی اور فلینجسٹ جماعتوں نے تو باقاعدہ امن کو ختم کرنے کی ٹھان لی تھی اور یہ بات انکے لئے مناسب تھی کیونکہ اس دوران میں انہوں نے فوج کے افسروں میں کافی شورش پھیلا دی اور ان کی شورش سے یکایک بغاوت پیدا کرنے کے لئے سارے انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ حکومت کو اس سازش کی ٹوہ لگ چکی تھی اور اس نے اس کو دبانے کی کوشش بھی کی۔ جنرل فرانکو کو اسپین سے ہٹا کر ساحلی جزیرہ میں بھیجدیا گیا۔ لیکن ادھر فسطائی جماعتیں اپنے سارے انتظامات مکمل کرچکی تھیں۔ جرمنی سے اسلحہ جات کثیر تعداد میں خفیہ طور پر لائے جاچکے تھے اور اب معلوم ہوا ہے کہ اگست ۱۹۳۶ء میں بغاوت شروع کرنا طے پایا تھا۔ لیکن واقعات نے اتنا موقعہ نہ دیا کہ کیلنڈر کے مطابق سارے کام سرانجام پائیں۔ ۴ر جولائی کو ایک اشتراکی جلسہ ہو رہا تھا۔ وہاں چند لوگ موٹروں پر سے گذرے اور گذرتے ہوئے بندوقیں چلا گئے جن سے کئی آدمی مقتول ہوئے۔ ۱۲ر جولائی کو کیٹیلو کو جو ایک مشہور اشتراکی تھا دن دہاڑے قتل کر دیا گیا۔ لازم تھا کہ اشتراکی اس کا بدلہ لیں اور چنانچہ ۱۳ر جولائی کو سوٹیلو کو جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے اور جو ایک مشہور رجعت پرست لیڈر تھا قتل کر دیا گیا۔ اس قتل نے سارے اسپین میں سنسنی پھیلا دی۔ اگرچہ تمام اشتراکی اور لبرل جماعتوں نے اس کی سخت مذمت کی مگر رابلس وغیرہ اس موقعہ کو کب ہاتھ سے دینے والے تھے۔ انہوں نے یہ شور مچایا کہ بالشویک حکومت قائم کرنے کے لئے یہ سب ہو رہا ہے اور بہت آسانی سے بھول گئے کہ ان کی اپنی جماعت کتنے قتل و غارتگری کا باعث ہوئی۔

بہرحال اگست میں تو فوجی بغاوت ہونا قرار پائی جاچکی تھی اس کو ذرا اور سریع کر دیا گیا اور ۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء کو فسطائی جماعتوں نے فوج کی مدد سے بغاوت کا علم بلند کیا۔ ۱۸ر جولائی کو جنرل فرانکو ساحلی جزیرہ سے ہوائی جہاز پر اسپینی مراکو پہنچا اور بیرونی سپاہ اور زرخرید موری سپاہ کو لیکر اسپین پر حملہ آور ہوا۔ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

(میں اس مضمون کو یہیں ختم کرتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد سے اکثر لوگ واقعات میں دلچسپی لیتے رہے ہیں اور انہیں معلوم ہوگا کہ کس طرح جرمنی اور اٹلی شروع میں مدد کرتے رہے۔ کس طرح جرمنی نے ہاتھ دھو لئے، کس طرح برطانیہ نے غیر جانبداری کا ڈھونگ رچایا، کس طرح یہ خانہ جنگی باقاعدہ حملہ کی صورت میں تبدیل ہوگئی جو اٹلی نے اسپین کی باقاعدہ حکومت پر کیا۔ کس طرح باغیوں نے ظلم اور تشدد سے ہلاکو اور چنگیز کی یاد تازہ کر دی، کس طرح (International Brigade) نے یعنی ساری دنیا کے اشتراکی رضاکاروں نے جان پر کھیل کر آڑے وقت میں دارالخلافہ کو فسطائیوں کے ہاتھ میں آنے سے بچایا۔ کس طرح روس نے کچھ اسلحہ جات بھیجے اور کچھ فن داں آدمی بھیجے تاکہ وہ حکومت کی نوآموز فوج کو تربیت دے سکیں، کس طرح کھلم کھلا مسولینی فخریہ اپنے اسپینی کارناموں کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں

اٹلی کی فوجیں اسپین بھیجی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ کس طرح باغیوں نے برطانوی تجارتی جہازوں کو بین الاقوامی قانون کی پروا نہ کرتے ہوئے ڈبویا، وغیرہ وغیرہ ۔ یہ سب داستان تازہ ہے اور بہت تلخ ہے۔ اس کا اعادہ اس وقت ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس کے بیان کا موقع اس وقت آئے گا جب اسپین کی قسمت کا فیصلہ ہوچکا ہوگا۔ اس وقت اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ باغی ۲/۳ اسپین پر قابض ہو چکے ہیں لیکن حکومت کی اخلاقی و روحانی طاقت بدستور برقرار ہے اور امید ہے کہ اگر وہ آسانی سے شکست نہیں کھاسکیں گے اور اگر کہیں فرانس اور اس ابلہ فریبی سے کنارہ کشی کرکے اسپین کی حکومت کو کچھ نہیں تو اسلحہ جات خریدنے ہی کی اجازت دے دیگا تو پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ لیکن اب تو اگر یہ امید کی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اٹلی مسٹر چیمبرلین سے صاف صاف کہے کہ جس طرح تم نے چیکوسلاویکیا سے بے وفائی کی اور جرمنی کو اسکے کل مطالبات نذر کردئے۔ مجھے بھی اسپین میں جو میں چاہوں کرنے دو ورنہ میں بھی ایک عالمگیر جنگ شروع کردوں گا۔ اور امن کی خاطر مسٹر چیمبرلین یہ بھی منظور کرلیں۔ بہرحال یہ سب تو مستقبل بتلائے گا۔ اس وقت ہمارا آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اسپین کی سرزمین پر جمہوریت اور بین الاقوامی فسطائیت کے درمیان جو جنگ ہو رہی ہے اُس کا مذکورۂ بالا پس منظر کے ساتھ بغائر نگاہ مطالعہ کریں۔ س۔)

نذرِ حُسن

سُنا ہے یہ جب سے کہ وہ آرہے ہیں
دل و جاں دوانے ہوئے جارہے ہیں

معطّر معطّر، خراماں، خراماں
نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں

نگاہیں گلابی، ادائیں شرابی
ہر اک گام پر لغزشیں کھا رہے ہیں

فلک بن گیا میرا دوشِ تخیل
سہارا لئے وہ چلے آرہے ہیں

نظر ان کے جلووں کے طوفاں میں گم ہے
ہجومِ نظر سے وہ گھبرا رہے ہیں

انہیں بڑھ کے کیا نذر دیں ہم الٰہی!
متاعِ دل و جاں پہ شرما رہے ہیں

ابھی بجلیاں تھیں، ابھی لالہ و گل
ابھی ہنس رہے تھے، ابھی گا رہے ہیں

کرم کی یہ مجبوریاں اللہ اللہ!
نظر سے دلاسے دیئے جا رہے ہیں

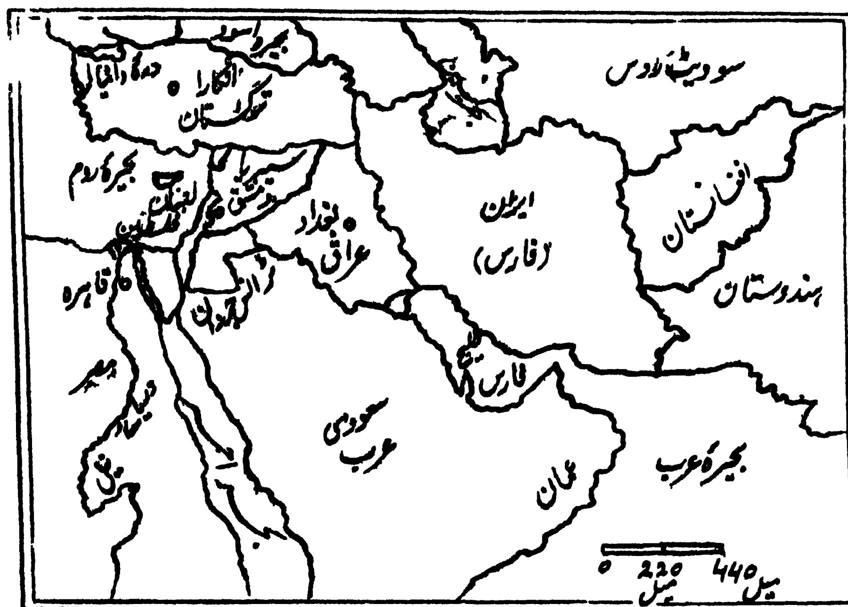
مری روح میں چھپ کے ہر وقت ساغر
وہ اک نغمۂ جاوداں گا رہے ہیں

ساغر

سنہ ۱۹۳۸ء

مشرقِ قریب میں وطنیت کا طوفان

(از - ف - س - ج)



مشرقی بحیرۂ روم کے ساحل، عربستان کے ریگستانی علاقوں اور دریائے نیل کے پہلو بہ پہلو ایک نیا اور انقلابی طوفان اُٹھ رہا ہے جو سیاسیات عالم پر چھاتا جا رہا ہے۔ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان مناقشہ کی بڑھتی ہوئی تلخی کے ساتھ ساتھ وطنیت کا درجۂ حرارت برابر بڑھ رہا ہے۔ شمال میں ترکی کی نوجوں کا سیریا کے شمالِ بعید، سنجک پر قبضۂ جارحانہ، جہاں ہزارہا ترکوں کی بستی ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ جدید ترکی کے طرح نو میں کونسی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ تمام مشرق قریب کے ممالک میں وطنیت کا یہ جذبہ عجیب وغریب، ذہنی، معاشرتی اور سیاسی انقلاب پیدا کر رہا ہے۔

بیس برس پہلے جب مشرقِ قریب میں وطنیت کے جذبہ کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوئے، اسے ذرا بھی اہمیت نہ دی گئی۔ یورپ کی سامراجی طاقتوں نے یہ خیال کیا کہ وہ سامراج شاہی کے مظاہرہ سے اس نئے جذبہ کو پروان نہ چڑھنے دینگے اور وطنیت کی ہوا طوفان نہ بن سکے گی۔ یہ اُن کی بھول تھی۔ بیس برس کے عرصہ میں یورپ کی سامراجی دُنیا کو معلوم ہوگیا کہ مستقبل کے پیغمبرانہ مطالعہ کیلئے ان کے پاس شاہین جیسی تیز اور جوان نظریں تھیں۔ سامراج شاہی کی بوڑھی آنکھوں اور سوئے ہوئے دماغ سے جو کچھ کہ وہ دیکھ اور سوچ سکتے تھے اُسے حالات کی کوندتی ہوئی بجلیوں نے کسی طرح نہ فروغ ہونے دیا۔ اب اشرفیوں کی وہی سوئی ہوئی مورتیں، مشرق قریب کے ممالک پر خوف و اضطراب کی نظریں ڈال رہی ہیں اس لئے کہ جوان سال وطنیت کا ہوشربا شباب نقشۂ عالم

چھاتا جارہا ہے۔

درۂ دانیال سے افغانستان کی پہاڑیوں تک، ہندوستان کے سرحدی علاقے، بحرِ کیسپین کے ایرانی ساحل سے عرب کے ریگستانی علاقوں تک اور بحیرِ قلزم سے دریائے نیل کی وادیوں تک کے علاقے مشرقِ قریب کہلاتے ہیں۔ یہ ممالک ترکستان، ایران، افغانستان، عراق، سیریا، لبنان، فلسطین، ایراسا او مصر کے ہیں جو دُنیا کے نقشہ پر چھوٹے بڑے ستاروں کی طرح چھٹکے ہوئے ہیں۔ انہی ممالک کی پہاڑیوں، ریگستانوں اور مرغزاروں میں تاریخ کے ابتدائی اوراق لکھے گئے اور یہیں دُنیا کے تین بڑے مذاہب، روحانیت کے جال میں لپٹی ہوئی سوسائیٹیوں کے روپ میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔

مشرقِ قریب کا زیادہ حصّہ مختصر آبادیوں پر مشتمل ہے جو معدنیات کیلئے بھی بہت غریب ہے۔ ایران کے جنوبی مغربی علاقہ اور عراق میں تیل ضرور کثرت سے پایا جاتا ہے۔ لیکن مشرقِ قریب کا زیادہ حصّہ آسمان سے آئی ہوئی گرم گرم کرنوں سے تپتے ہوئے ریگستانی علاقوں پر مشتمل ہے۔

جذبۂ وطنیت کے نئے انقلابی طوفان کے تحت ہر جگہ اخبارات، جلسے اور جلوس، کلب، پارلیمنٹ، تہوار وغیرہ دنوں کی قدامت پرستی مٹاتے نظر آتے ہیں اور نئی نئی معاشرتی اور سیاسی کروٹیں لی جارہی ہیں۔

ٹرکی نے اس تعمیرِ نو میں نمایاں حصّہ لیا ہے اور دوسرے ممالک اُس کی جدید روشنی کے تحت برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ صدیوں کے کھنڈر مٹائے جارہے ہیں۔ اور ان پر فلک پیما عمارتیں بن رہی ہیں۔ تنگ و تاریک ریتیلی گلیوں کی چھاتیوں پر چوڑی چکلی سڑکیں بنائی جارہی ہیں۔ دیہاتوں کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور اب وہاں موٹریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ برقی تاروں کے لامتناہی سلسلوں اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی فیکٹریوں کی چمنیوں نے ایک طلسم ہوشربا بنا رکھا ہے، قاہرہ، بغداد، اور انکارہ کی سوئی ہوئی دُنیا میں بیداری کی بجلی دوڑ رہی ہے اور اب یہ شہر تجارت اور صنعت کے بڑے مراکز بن رہے ہیں۔ کیونکہ نیل اور دوسرے دریاؤں کی وادیوں میں جہاں تھوڑی بہت بھی تری ہے، فصلیں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔

دُنیا کے کسی حصّہ میں جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد اس قدر تیز انقلابات نہیں آئے جس قدر کہ ان حصّوں میں موجودہ ٹرکی کی جمہوری حکومت کا بادشاہوں اور سلاطین کے زمانہ کی ترکی سامراج شاہی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ترکی کی سامراج شاہی نے آخری ہچکی لی۔

مصر میں دو ہزار برس کے بعد پہلی مرتبہ ایک آزاد بادشاہ جمہوری قوانین کے شکنجہ میں گرفتار ہو کر حکومت کر رہا ہے۔

اس انقلاب کا دوسرا بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مشرقِ قریب میں مذہب کا بھوت سروں سے بہت حد تک اُتر گیا ہے۔ اور اب مذہبی معتقدات کی کورانہ تقلید میں کافی سرد مہری برتی جارہی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جبکہ مشرقِ قریب کے لوگوں کی معاشرتی زندگی مذہب کے جال میں لپٹی ہوئی تھی، آج مذہب کی جگہ وطنیت نے لے لی ہے۔ بوڑھاپے پر جوانی کا جوبن غالب آتا جارہا ہے۔

ٹرکی میں حکومت کا مذہب اب اسلام نہیں ہے۔ مسلمان اور عیسائیوں کا اشتراک دمشق اور مصر میں ایک سا ہے۔ وطنی تحریک کے لیڈروں میں بڑی تعداد عیسائیوں کی ہے اور عوام کے جلوسوں میں ہلال اور صلیب دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔

اس انقلاب نے عورت کو بھی چار دیواریوں کی قید سے آزاد کر دیا ہے اور برقع اور جلباب میں لپٹی لپٹائی زندہ لاشیں کم نظر آتی ہیں۔ ٹرکی میں عورتوں نے مردوں کے سارے حقوق حاصل کر لئے ہیں۔ مصر اور سیریا کی نسوانی دُنیا نسائی وقار کو بلند معیار پر لانے کے لئے برابر جد و جہد کر رہی ہے۔ ہر جگہ عورتیں وطنی تحریکوں میں مردوں کے برابر دلچسپی لینے لگی ہیں۔

دوڑ دھوپ کے مغربی کھیلوں کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ مغرب کی اختراعی ایجادات سے برابر فائدہ حاصل کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں غرض کہ قدیم کی کینچلی سے جدید کی ناگن نکل رہی ہے اور زندگی انقلاب کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھل رہی ہے۔ اس انقلاب کو یوں بھی محسوس کیا جاسکتا

ہے کہ اُنیسویں صدی کی ترک قوم "بیمار آدمی" سے خطاب کی جاتی تھی اور یہ خطاب کچھ ترکی ہی کیلئے مخصوص نہیں تھا بلکہ ایرانی، مصری اور مشرقِ قریب کی دوسری قوموں پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ اُن کی مرض میں رچی ہوئی چارپائیوں کے گرد یورپ کی بڑی طاقتیں حاسدانہ اور حریصانہ نظروں سے تک رہی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ مریض آخری سانس لے اور مریض کی جائداد پر وہ قبضۂ جارحانہ کریں۔

سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر اُنیسویں صدی تک کی مشرقِ قریب کی دُنیا کو دیمک لگی ہوئی تھی۔ جنتا کے پیٹ بھوکے تھے اور دل و دماغ جاہل۔ مذہبی روایات کا نجی زندگیوں پر بھی پورا قبضہ تھا۔ مسلمان اور عیسائی دو خون کے پیاسے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ شک اور نفرت کے جذبوں نے قوموں کے دل و دماغ سب تقسیم کر دئے تھے۔ اسلام کی رہنمائی روایات کی روشنی میں ہوتی تھی اور عیسائیت صلیب کی جنگی داستانوں کی یاد تازہ کرتی تھی۔

اونچے طبقے کے لوگ مغرب کی عیاشانہ زندگی کی نقالی پر اکتفا کرتے تھے۔ تجارت اور دولت غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کے دستِ کرم پر ملکیوں کے روٹی اور دماغ دونوں تھے۔

اُنیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کے شروع میں ہی انقلاب نے پہلی چند کروٹیں لینی شروع کیں۔ چند تعلیم یافتہ لوگوں نے جنہوں نے مغرب کی آزاد فضا میں تعلیم و تربیت پائی تھی، وطنی تحریک شروع کی اور مغرب کے سامراجی جال کے ڈورے دھیرے دھیرے توڑنا شروع کیا اور نئی نئی اصلاحات کی داغ بیل ڈالی۔ دُنیا کے دوسرے حصوں کے مد و جزر نے مشرقِ قریب کو یوں بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ جاپان کی روس پر فتح (۱۹۰۵ء) نے مشرقِ قریب کو بیداری کی انگڑائی لینے کے لئے اُکسایا۔

مشرقِ قریب کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ مغربی ہتھیاروں اور اصلاحات سے فائدہ لیتے ہوئے مختصر سے جاپان نے یورپ کی اتنی بڑی طاقت کو شکست دیدی تو نیم باز آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اور جماہیاں لیتا ہوا مشرق اُٹھ بیٹھا۔

جاپان کی فتح اور ۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب سے متاثر ہو کر ایرانیوں میں بھی انقلاب کی لہر دوڑ گئی اور شاہ ایران کو جمہوری نظام کی بنیاد ڈالنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ۱۹۰۸ء میں ٹرکی کے نوجوان اور وطن پرست قسطنطنیہ پر چھا گئے اور عبد الحمید کا دور ختم ہو گیا۔ اُس وقت مصر میں مصطفےٰ کامل نے وطنی تحریک شروع کی اور برطانوی تسلط سے مکمل آزادی کی جد و جہد شروع ہو گئی۔ اسی طرح عربستان میں رہنماؤں نے وطن پرستوں کی گروہ بندی شروع کر دی۔

جنگِ عظیم سے پہلے یہ تحریک صرف حکومت کے عہدیداروں، قانون دانوں — ادیبوں اور شاعروں تک محدود تھی۔ جنگ کے ساتھ ہی انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں اور عوام بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لینے لگے۔ اسی وقت سے مصطفےٰ کمال کی سیاسی زندگی شروع ہوتی ہے اور مصطفےٰ کمال کے ساتھ مشرقِ قریب کی بیداری کی صحیح تاریخ۔ مصطفےٰ کمال کی رہنمائی میں ٹرکی کا مغرب کی سامراجی طاقتوں سے آزادی کامل حاصل کر لینا مشرقِ قریب کے دوسرے ممالک کے لئے ایک نئی روشنی تھی جس کی پرچھائیوں میں رضا شاہ پہلوی نے ایران میں اور فیصل ابن حسین اور عبد العزیز ابن سعود نے عربستان میں وطنیت کے پرچم لہرا دئے۔

ٹرکی کے صلح نامہ کے پُرزے پُرزے کر دئے۔ اور یورپ کی تمام بڑی طاقتوں کو (۱۹۲۳ء) مجبور کر دیا کہ لوزین (Lausanne) کی مصالحانہ کانفرنس میں اُسے بھی شریک کیا جائے اور بین الاقوامی صلحناموں پر اُسکے بھی دستخط ہوں۔ دوسری طرف رضا شاہ نے برطانیہ کو ایران کی مکمل آزادی تسلیم کرنے کیلئے مجبور کر دیا۔ تیسری طرف مصر نے بھی مستقل جد و جہد کے بعد (۱۹۳۶ء) آزادی حاصل کر لی۔ چوتھی طرف اُن علاقوں میں جہاں برطانیہ اور فرانس کے سرپرستانہ اثرات تھے، بیداری کی لہر دوڑی۔ عراق (۱۹۳۲ء) لیگ آف نیشنز کا آزاد ممبر بن گیا۔ فرانس نے سیریا (۱۹۳۶ء) کو تین سال کے عرصہ کی قید لگا کر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا اور اب فلسطین میں برطانیہ کو عرب اور یہودیوں کے وطنی جذبوں کی دو طرفہ ٹکروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آج مشرقی ممالک میں بڑا اتحاد ہے۔ ٹرکی، ایران، افغانستان اور عراق ایک دوسرے سے ہر طرح قریب ہو گئے ہیں یہ ایشیائی جمعیت اقوام کی بنیاد ہے جس میں بہت جلد مصر، سودی عرب اور سیریا بھی شریک ہو جائیں گے۔
غرضکہ ایشیا بیدار ہو گیا ہے۔ قدامت کی گود میں وطنیت کی کنواری مچل رہی ہے۔ زمانہ دور نہیں کہ یہی کنواری مکمل جوانی کی بجلی بن کر مغرب کی سامراجی دُنیا پر چھا جائے گی۔

رازِ حیات

(اثر۔ میاں عبدالعزیز بیاراید)

انسان پیدا ہو کر، جوان ہو کر، بوڑھے ہو کر، سب کچھ ہو کر، یا کچھ نہ ہو کر، آخر کار ضرور مر جاتے ہیں قطعی مر جاتے ہیں کبھی نہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ دُنیا ہو گی مگر انسان نہ ہوں گے، اور صرف ہم جیسے بیکار انسان نہ ہونگے بلکہ کسی قسم کی کوئی ایسی ہستی جو سوچ سکے، بول سکے، دیکھ سکے، اگا سکے، اٹھ سکے، کہیں بھی نہ ہوگی، یہ دُنیا ہوگی، اور اسکے خوبصورت پتھر، خوبصورت روشنیاں، تاریکیاں، اور شاید رنگ، جاندار ہستیاں مرینگی، تو غالبًا پانی بھی مفقود ہو گا کیونکہ جبتک پانی ہے زندگی ضرور رہے گی۔

دُنیا اس وقت ضرور حسین ہو گی مگر حُسن پرست کوئی نہ ہو گا دنیا کی نجات ہو جائیگی۔

نجات کتنی مہنگی ہے، پانی نہ ہو، دریا نہ ہوں، قطبین پر برف نہ ہو، ہمالہ پر درخت نہ ہوں، شالامار نہ ہو، پھول نہ ہوں، شملہ میں ساٹھیاں نہ پھڑکیں۔
باوجود اس قدر گراں ہونے کے نجات کس قدر ذلیل چیز ہے، خود دُنیا کو پتہ نہ ہو گا کہ اُسے نجات ہوئی کہ نہ ہوئی، مگر یہ یقین ہے کہ نجات دُنیا کی قسمت میں لکھی ہے۔ اس سے مفر ناممکن ہے۔

کہیں رازِ حیات یہی نہ ہو کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نجات سے بچو، ہم جو آپ ساختہ ہیں کیوں اس سیدھی سی بات کو نہیں سمجھتے! ؟

(فلک پیما)

شاعر کا نغمہ

از۔ ساغر

(وہ نظم جو ۲۰ ؍نومبر ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے موسیقی پس منظر کے ساتھ ساغر نے بذات خود براڈ کاسٹ کی)

مرا نغمہ بنائے کائناتِ ابنِ آدم ہے، کہ آدم خود مرے نغمے کی تصویرِ مجسّم ہے
ربابِ شادی و غم ہے

بہارِ جاودانِ زندگی میرا تبسّم ہے، یہ موجودات کیا ہے میرے نغمے کا تلاطم ہے
تلاطم در تلاطم ہے

ہواؤں کا ترنّم بحر و بر کا شور سب کیا ہے، مرا اک نغمہ ہے جو سَو اداسے کارفرما ہے
ہر اک شے میں تڑپتا ہے

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرا نغمہ بنائے کائناتِ ابنِ آدم ہے

(۲)

ازل اِک گت بھری آواز پا ہے میرے نغمے کی ۔ ابد اک ناشنیدہ سی صدا ہے میرے نغمے کی ۔ ادا ہے میرے نغمے کی

ہیولے میرے نغموں نے بنائے ہیں زمانوں کے ۔ کہ ٹکڑے ہیں زمانے میرے نغمے کے فسانوں کے ۔ گتوں کی داستانوں کے

جوانی کیا ہے نغمہ اور محبّت کیا ہے اک نغمہ ۔ یہ قدرت کیا ہے اک نغمہ یہ فطرت کیا ہے اک نغمہ ۔ مشیّت کیا ہے اک نغمہ

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

ابد اک ناشنیدہ سی صدا ہے میرے نغمے کی

(۳)

لبِ منصور تھی اک موجِ رنگیں میرے نغمے کی ۔ نگاہِ سرمدی پروازِ تمکیں میرے نغمے کی ۔ یہ وسعت میرے نغمے کی!

نوائے عشق کی آغوش کا پالا ہوا ہے یہ ۔ جنوں کے ہاتھ سے پی پی کے متوالا ہوا ہے یہ ۔ گل و لالہ ہوا ہے یہ

مشیّت کا نفس ہے، زندگانی کا تنفّس ہے ۔ دلِ گرمِ حیاتِ جاودانی کا تنفّس ہے ۔ جوانی کا تنفّس ہے

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

لبِ منصور تھی اک موجِ رنگیں میرے نغمے کی

:(۴):

مری صہبائے نغمہ بادۂ جاوید ساقی ہے چھلک کر میرے لب سے ساغرِ عالم میں باقی ہے جو بادہ تھا وہ ساقی ہے

یہ پہنچاتا ہے اپنی روشنی میں حدِ منزل تک یہ جاتا ہے پیامِ شوق لیکر حُسن کے دل تک کسی کی مست محفل تک

پیامِ عشق کا رنگین دفتر ہے مرا نغمہ پیمبر ہے مرا نغمہ پیمبر ہے مرا نغمہ پیمبر ہے مرا نغمہ

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مری صہبائے نغمہ بادۂ جاوید ساقی ہے

:(۵):

میں جب نغمات کا دامِ طلسم آگین بچھاتا ہوں کہاں کا صید میں صیاد کو بھی کھینچ لاتا ہوں دو عالم کو پھنساتا ہوں

مرا نغمہ ہزاروں ہرنیوں کو صید کرتا ہے جو مجکو قید کرتی ہیں یہ اُن کو قید کرتا ہے ہر اک کے دل کو ہرتا ہے

مکاں نغمے کے پھندے میں مکیں نغمے کے پھندے میں زماں نغمے کے پھندے میں زمیں نغمے کے پھندے میں حسیں نغمے کے پھندے میں

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

کہاں کا صید میں صیاد کو بھی کھینچ لاتا ہوں

—————:(٦):—————

شگفتِ گُل اشارہ ہے مرے نغمے کے پھولوں کا نسیمِ صبح خندہ ہے مرے نغمے کے پھولوں کا مرے نغمے کے پھولوں کا

صبوحی[1] پی کے نغمے کو اگر جھپکی سی آتی ہے تو گاگر چھین کر شبنم کی اوشا منہ دُھلاتی ہے ربابِ گُل بجاتی ہے

مرے نغمے کے اُٹھتے ہی چمن بیدار ہوتے ہیں نسیمِ گُل کے نازک قافلے تیار ہوتے ہیں عجب سرشار ہوتے ہیں

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

نسیمِ صبح خندہ ہے مرے نغمے کے پھولوں کا

—————:(٧):—————

مرا نغمہ ہے جنّت یہ بہارِ گُل تو دھوکا ہے کہ میرے گنگنانے سے چمن پر رنگ آیا ہے چمن یوں لہلہایا ہے

کبھی بُلبُل کی صورت میں مرا نغمہ چہکتا ہے کبھی کوئل کے دل میں سوزِ غم بن کر دہکتا ہے کبھی گُل میں مہکتا ہے

پپیہا اور کوئل میرے نغمے کی اُڑانیں ہیں یہ سب آتش نفس شاعر مرے نغمے کی تانیں ہیں مرے نغمے کی تانیں ہیں

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرا نغمہ ہے جنّت یہ بہارِ گُل تو دھوکا ہے

[1] صبح کی دیوی

: (۸) :

مرے نغمے کے زیر و بم میں ہے دنیائے موسیقی | مرے نغمے کی دیوانی ہے خود لیلائے موسیقی | وہی برنائے موسیقی

حبابِ خاک میں انگڑائی لیتا ہے مرا نغمہ | شرارِ سنگ کے پردوں سے پیدا ہے مرا نغمہ | شرارہ ہے مرا نغمہ

مرا نغمہ ہے روحِ حسن جانِ حسن شانِ حسن | مرے نغمے کے شہپر مرکبِ صد کاروانِ حسن | نشانِ بے نشانِ حسن

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرے نغمے کی دیوانی ہے خود لیلائے موسیقی

: (۹) :

۴۰

مرا نغمہ بیانِ روح ہے ایوانِ ہستی میں | مرا نغمہ فغانِ روح ہے پُرشور بستی میں | اسی پُرشور بستی میں

کوئی جب گنگناتا ہے ربابِ دل کے تاروں پر | تڑپ کے روح آجاتی ہے ہونٹوں کے کناروں پر | ترنّم کے اشاروں پر

حیات اک نغمۂ جاری ہے، گوشِ ہوش تو وا کر | نفس میں تار پیدا تار میں آواز پیدا کر | ہزاروں ساز پیدا کر

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرا نغمہ فغانِ روح ہے پُرشور بستی میں

فرشتے وجد کرتے ہیں تو آدم رقص کرتے ہیں   مرے نغمے کی تانوں پہ دو عالم رقص کرتے ہیں   کہ انجم رقص کرتے ہیں

مرے نغمے کی دھن سے سینۂ فطرت دھڑکتا ہے   دلِ قدرت مرے نغموں کی تانوں پہ پھڑکتا ہے   پھڑکتا ہے دھڑکتا ہے

جو دوشِ وقت پر جوشِ تلون سے بکھرتے ہیں   وہ گیسوئے مشیت میرے نغمے سے سنورتے ہیں   سنورتے ہیں نکھرتے ہیں

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرے نغمے کی تانوں پہ دو عالم رقص کرتے ہیں

(۱۱)

مرے نغمے کے جزر و مد کو مرگ و زیست کہتے ہیں   سمندر میں مرے لاہوت ہی لاہوت بہتے ہیں   اجازت لے کے بہتے ہیں

دمِ جبریل سایہ ہے مرے نغمے کی مستی کا   صدائے صور چربہ ہے مرے نغمے کی مستی کا   مرے نغمے کی ہستی کا

مرے نغمے کا گہوارہ تھا لحنِ مستِ داؤدی   مرے نغمے کا آوازہ تھا پریمی کرشن کی بنسی   وہ بنسی پریم کی بنسی

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

مرے نغمے کے جزر و مد کو مرگ و زیست کہتے ہیں

مرا نغمہ ہے طوفانی | تغیّر ہے صدائے بازگشت اک میرے نغمے کی
جنون زار بغاوت سرگزشت اک میرے نغمے کی

زمانہ گھوم جاتا ہے | نظامِ دہر نغمے کے اثر سے جھوم جاتا ہے
مرے نغمے کی دُھن پر وقت پیہم گنگناتا ہے

نہ گردش ہے نہ گردوں ہے | مرے نغمے سے نقارۂ ہستی میں دوں دوں ہے
رگ و پے میں جہاں کے میرے ہی نغمے کا افسوں ہے

مرا نغمہ ——— مرا نغمہ

تغیّر ہے صدائے بازگشت اک میرے نغمے کی

:(ض):

ساغر نظامی

۴۲

جمہوری حکومت کا مذہب

"چونکہ نہ تو کوئی واحد قومی مذہب ہے، اور نہ ہو سکتا ہے اس لئے ان تمام مذاہب کے ساتھ رواداری کا برتاؤ رکھنا چاہئے جو دوسروں کے ساتھ رواداری برتیں تا وقتیکہ ان کے عقائد میں کوئی بات فرائض شہریت کے خلاف نہو، مگر جو کوئی یہ کہنے کی جرأت کرے کہ "کنیسا کے باہر نجات ممکن نہیں" اسے ریاست سے خارج کر دینا چاہئے۔ بشرطیکہ ریاست خود کنیسا نہو، اور سلطان قسیس (مذہبی پیشوا) نہو۔

ایسا عقیدہ، صرف مذہبی حکومت کیلئے موزوں ہو سکتا ہے اور دوسری قسم کی حکومت کیلئے مہلک ہے جس سبب کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ہنری چہارم (شاہ فرانس)، نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا، اسی بنا پر ہر معزز شخص کو چاہئے تھا کہ اسے ترک کر دے بالخصوص ایسے بادشاہ کو جسے عقل سے کام لینا نہ آتا ہو"

روسو

نواب یوسف علیخان ناظم والیٔ رامپور کے کلام پر مرزا غالب کی اصلاحیں

(از محمد مختار احمد صاحب آزاد بدایونی)

ہندوستانی ادب میں باریک بیں اور حقیقی نقادوں کی جس قدر کمی ہے مسلمہ ہے، اس پر زیادہ روشنی ڈالنا اپنے ہی زخموں پر خود ہی نمک چھڑکنا ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ادب ابھی انتقادی دور کے حدود میں داخل ہی نہیں ہوا یا تنگ دلی کا دور دورہ ہے یا مدح خوانی کا ہنگامہ، تمام تنقید، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے محدود دائرہ میں مقید ہے اور بس ؎

واقعہ یہ ہے کہ حقیقی ذوقِ تنقید ابھی ہندوستانیوں میں پیدا ہی نہیں ہوا؛ یہ ضرور ہے کہ بعض طبقوں میں ایسے لوگ ضرور پیدا ہو گئے ہیں جو مغرب کے زاویۂ انتقاد کی بنیادی تشریحیں کر رہے ہیں، اور یہ کافی امید افزا کام ہے۔ کیا عجب ہے کہ چند سال کے بعد ہم اُس نسخہ کے اجزاء کو حاصل کر لیں جس کی صحیح ترکیب ہمارے امراض کا علاج ثابت ہو ؎

عرصہ ہوا کہ اُردو زبان کے مشہور و مستند ادیب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے ناظمِ انجمن ترقیٔ اُردو حیدرآباد دکن اور چند دوسرے نقادانِ فن نے نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ بذاتِ خود شاعر نہیں تھے بلکہ مرزا غالب انہیں غزلیں کہہ کہہ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان غزلیات کا مجموعہ ایک دیوان کی صورت میں مرتب ہو گیا۔ کوئی شک نہیں کہ امراء کے ذوقِ ادب و شعر کی اکثر یہی اوداتنی ہی حقیقت ہوتی ہے کہ ان کے پردے میں کسی دوسرے شاعر و ادیب کا دماغ و دل کام کرتا رہتا ہے لیکن یہ ایسا کلیہ نہیں جس میں استثنار کی گنجائش نہ ہو

مولوی عبدالحق صاحب کے اس اعتراض کو پڑھنے کے بعد مجھے قدرتی طور پر اس مسئلے کی تحقیق و تدقیق کا شوق ہوا اور میری خوش قسمتی ہے کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں مجھے رامپور اسٹیٹ لائبریری میں مولانا عرشی رامپوری ناظمِ کتب خانۂ رامپور کی اعانت سے وہ مسودے دستیاب ہو گئے جن پر مرزا غالب نے اپنے قلم سے اصلاحیں دی ہیں ؎

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کے کلام پر مرزا غالب کی اصلاح، رائے زنی، اور دستخطوں کو دیکھ کر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناظم کے نام سے جس قدر کلام ہے وہ خود ناظم ہی کا کلام ہے اور یہ دعویٰ محض بہتان ہے کہ یہ کلام غالب کے دماغ کی آفرینش ہے؛ ناظم کے مسودات پر بہت کم اصلاح دی گئی ہے، یہ کم اصلاحی یہ ثابت کرتی ہے کہ ناظم ایک خاص مرتبہ کے شاعر تھے جن کے کلام میں زیادہ تراش خراش اور اصلاح کی غالب کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ مرزا غالب نے ودھ ؛ کے نشانات اور ان نشانات کو تعداد سے لگا کر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ

وہ خود ان کے کلام کو پسند کرتے تھے، مرزا غالب جیسے شاعرِ اعظم کی پسندیدگی اگر کوئی درجہ رکھتی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ نواب یوسف علی خاں ناظم غیر معمولی مرتبہ کے شاعر تھے۔

مرزا کو جو شعر اچھا معلوم ہوا ہے اس پر ایک

"ص"

کا نشان لگا دیا ہے جو زیادہ بہتر معلوم ہوا ہے اس پر دو

"ص ص"

بنے ہوئے ہیں اور جو اشعار نہایت پسند ہوئے ہیں ان پر تین

"ص ص ص"

کے نشان بنے ہوئے ہیں۔

اکثر مواقع پر الفاظ میں تبدیلی کی گئی ہے، یا موقع کے مطابق کوئی بات تحریر کر دی ہے اور ان تمام مقامات پر مرزا غالب نے اپنے دستخط ثبت فرما دئے ہیں۔ یہاں تک کہ ناظم کی اُس مشہور غزل پر جسے مکمل طور پر غالب کی غزل کہا جاتا ہے اور جس کے مطلع کا مصرعہ یہ ہے کہ

"میں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط"

غالب نے نہایت مختصر اصلاح کی ہے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی شاعرانہ حیثیت کو متہم کرنے سے پہلے مولوی عبدالحق صاحب یا دوسرے حضرات کے لئے یہ صاف راہ کھلی ہوئی تھی کہ وہ رامپور اسٹیٹ لائبریری میں ناظم کے ان مسودات کو دیکھتے جن پر غالب نے اپنے قلم سے اصلاحیں دی ہیں، اس منزل سے بے گذرے اعتراض کے اس انتہائی مرکز پر آجانا تنقید اور تحقیق کے قطعی منافی ہے، اور ایک قسم کا ادبی تشدد، گذشتہ زمانے میں شاعری کا جو تصور تھا اور شعر کے متعلق جو روحانی نقطۂ نگاہ تھا اس کو تسلیم کرتے ہوئے تو یہ خیال کرنا کہ امارت اور تکمیل فن سے بیر ہے قطعی غیر نفسیاتی بات ہے، امارت او تعیش، عشق اور اسی قسم کی باتوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے یہ خیال کرنا کہ کوئی نواب کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا ہرگز حقیقت پر مبنی نہیں، شاعر بنتا نہیں ہے، پیدا ہوتا ہے، البتہ یہ ضرور ایک حقیقت ہے کہ ماحول کا اس کے دماغ و دل اور ذات پر ایک حد تک اثر ہوتا ہے

آئیے اب ذرا ماضیٔ بعید میں جا کر نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی تعلیم و تربیت پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کی اہلیت علمی کس درجہ کی تھی، اور ان کی قابلیت دماغی نے کس طرح بتدریج اپنی منازل طے کیں۔

آنریبل سید بشیر حسین زیدی چیف منسٹر رام پور اسٹیٹ "مکاتیب غالب" کے مقدمہ میں (جو رامپور اسٹیٹ لائبریری) سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے، تاریخ رام پور کا اجمالی ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

(نواب سید فیض اللہ خاں کے انتقال کے بعد)؎ روہیلوں نے آپ کے فرزند اکبر نواب سید محمد علیخان بہادر کو اپنا حکمراں تسلیم کیا، مگر یہ نیا دور ایک افسوسناک حادثہ کے باعث بہت جلد ختم ہوگیا اور محرم ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں بجائے آپکے نواب عرش منزل کے فرزندِ دوم نواب سید غلام محمد خان بہادر مسند نشیں ہوئے؛ حکومتِ اودھ روہیلوں کی مجتمعہ قوت کو بہمرخائفانہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے اس معاملے میں بیجا مداخلت کی اور نواب سید محمد علی خان بہادر کا خون بہا طلب کرنے کے بہانے سے رامپور پر فوج کشی کردی۔ سوء اتفاق سے روہیلوں کو شکست ہوگئی نواب سید احمد علی خان بہادر ابن نواب سید محمد علی خان بہادر جو ابھی خورد سال تھے صاحبزادہ سید نصر اللہ خان بہادر کی سرپرستی میں والی بنائے گئے اور نواب سید غلام محمد خان بہادر اور ان کی اولاد رامپور سے باہر رہنے پر مجبور ہوئی۔

. . . .

لیکن ان حضرات کی ظاہری محرومیٔ تخت و تاج ان کی آئندہ عظمت و شہرت کا سبب بن گئی ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں نواب سید احمد علی خان بہادر فوت ہوئے اور ان کی اکلوتی صاحبزادی شمسہ تاجدار بیگم صاحبہ کی حکومت تسلیم کرنے سے روہیلہ سرداروں نے انکار کردیا، حکومت انگلشیہ کے تدبر نے نواب سید غلام محمد خان بہادر کے خلف الرشید نواب سید محمد سعید خان بہادر جنت آرام گاہ کو اس وراثتِ آبائی کا حقدار قرار دیا۔

نواب جنت آرام گاہ نے سن شعور کو پہنچ کر حکومتِ انگلشیہ کو شرفِ خدمت بخشا تھا اور اپنی کارروائی و قابلیت انتظامی کی بدولت ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کی عزت افزائی فرما چکے تھے۔ آپ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے ریاست کی تنظیم جدید کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور فوج، پولیس اور محکمۂ مال کے لئے نئے قوانین و ضوابط مقرر فرما کر روہیلوں کے غیر منظم جرگہ کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈھال دیا۔

انتظامی امور سے فارغ ہوکر نواب جنت آرام گاہ نے سرپرستی علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا، مولانا فضل حق خیر آبادی، ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری، اور دیگر علماء و ادبا مختلف کتابوں کی تالیف و ترجمہ پر مامور ہوئے۔ لیکن یہ پودا پروان نہ چڑھنے پایا تھا کہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب جنت آرام گاہ نے وفات فرمائی۔

آپ کے بعد نواب سید محمد یوسف علی خان بہادر (ناظم) فردوس مکان نے تاج ریاست زیب سر فرمایا۔ آپ نواب جنت آرام گاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور میرزا اسد اللہ خاں غالب سے علوم عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔"

اس اجمالی تاریخ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی تعلیم بہترین علماء و شعراء کے زیر تربیت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آپ کی علمی قابلیت کی تعریف مولانا فضل حق خیرآبادی نے ان الفاظ میں اپنے ایک خط میں کی ہے۔

"حالانکہ طبعِ اقدس در علوم عقلیہ و فنونِ حکمیہ آں چناں دقیقہ رس کہ عدیلِ آں در مملکت ہندوستان کہ حال علمائے آں تفصیلا معلوم است کمتر بلکہ معدوم است نظم و شعر و فہم آں و ابداع معانی تازہ و مضامین مبتکرہ و سرد الفاظ فصیحہ و تراکیب بلیغہ بحسب اوزانِ عروض نسبتِ بعلو طبعِ اقدس و بلندیٔ افکار صائبہ از ادنی مراتب است۔ طبعِ عالی و فکرِ صائب در دقائق حکمیہ و معضلات فلسفیہ بجائے میرسد کہ رسیدنِ افہام علام اعلام تا آں مقام معلوم الانتفا است۔

دریں سخن ہیچ مبالغہ اغراق نیست"

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی ہستی اس کی ہرگز محتاج نہیں ہے کہ ان کی تحریر کے لئے کسی تصدیق کی ضرورت ہو۔ ان کی حق گوئی کی غالباً اس سے بہتر تصدیق اور کوئی ہو نہیں سکتی کہ محض حمایتِ حق گوئی کی بنا پر دریائے شور کی صعوبتیں برداشت کیں اور پھر اسی حالت میں جان قربان کردی۔

دراصل نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والیٔ رامپور اپنے عہد کے مسلم الثبوت ادیب اور شاعر تھے اور قدرت نے عطیۂ امارت کے ساتھ ساتھ دولتِ علم و ادب سے ان کو بدرجۂ اتم سرفراز کیا تھا۔ مرزا غالبؔ جیسے شاعرِ اعظم اور ادیبِ جلیل کی توجہات نے ان کے جمالِ شعر و ادب کو چار چاند لگائے تھے۔ ناظمؔ نے اکثر قطعوں میں غالبؔ کا ذکر عقیدت و محبت کے ساتھ کیا ہے۔ اس شاگردی کا تذکرہ غالبؔ نے اپنے خطوں میں فرمایا ہے چنانچہ مارچ ۱۸۶۶ء میں خواجہ غلام غوث خاں کو مرزا غالبؔ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان بہادر والیٔ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے ناظمؔ ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے ہیں اصلاح دے کر بھیج دیتا ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں ۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء کو میاں داد خاں سیاحؔ کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خان بہادر والیٔ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔"

تخلص کے متعلق ایک خط میں نواب مرحوم کو مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص ہے، ناظمؔ، عالی، انور، شوکت، نیساں، اس میں جو پسند آئے وہ رہنے دیجئے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہ ہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک۔"

نواب صاحب مرحوم نے یکم مارچ کو تحریر فرمایا :۔

"در منجملہ الفاظ تخلص لفظ ناظمؔ مطبوع طبع نیاز گشت"

ان تمام اقتباسات سے یہ ثابت ہوا کہ نواب مرحوم ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو مرزا غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ ۱۵ فروری کو مرزا صاحب نے انہیں چند تخلص تحریر فرمائے اور یکم مارچ ۱۸۵۷ء کو نواب صاحب نے ناظمؔ تخلص کی پسندیدگی کے متعلق مرزا صاحب کو جواب تحریر فرمایا :۔

لیکن منشی امیر احمد صاحب مینائی نے نواب ناظمؔ مرحوم کے تذکرہ میں ایک نئی بات تحریر فرمائی ہے جس سے ایک شدید غلط فہمی پیدا ہوئی اور اب بھی اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے، کہتے ہیں کہ :۔

"طبیعت ازل سے موزوں پائی تھی، سخن گوئی کا ذوق تھا، اُردو شعر فرمانے کا شوق تھا۔ پہلے مومن خاں دہلوی سے مشورہ رہا، پھر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے تلمذ ہوا۔ آخر آخر بوضعِ اُستادانِ لکھنؤ موزوں فرمانے لگے منشی مظفر علی صاحب کو جو آج لکھنؤ میں سحبانِ عصر یکتائے دہر ہیں کلام دکھلانے لگے۔"

ازالۂ غلط فہمی فرماتے ہوئے جناب عرشی ناظم کتبخانۂ رامپور مکاتیبِ غالبؔ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"جہاں تک حکیم مومن خاں مرحوم کی شاگردی کا تعلق ہے سرکار کے اس بیان کی موجودگی میں کہ "کاتب را اتفاقِ موزونیت یک مصرعہ ہم اتفاق نشدہ بود" اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ ایک لمحہ کے لئے امیرؔ مینائی مرحوم کے بیان کو تسلیم کیا جائے اس لئے کہ اگر نواب فردوس مکان مومن سے اصلاح لے چکے تھے تو مرزا صاحب کو یہ کبھی تحریر نہ فرماتے کہ مجھے ابھی تک ایک مصرع موزوں کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا ہے، البتہ منشی مظفر علی صاحب اسیرؔ لکھنوی کی شاگردی کا مسئلہ باقی رہتا ہے، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ نواب فردوس مکان نے مرزا صاحب کی حیات میں انتقال فرمایا ہے اور جبکہ ایک عریضہ بنام

خلد آشیاں سے معلوم ہوتا ہے، آخر وقت تک سرکار مرزا صاحب کے پاس اپنا کلام بھیجتے رہے، اس حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نواب فردوس مکان نے مرزا صاحب کی زندگی میں اور ان سے اصلاح لیتے ہوئے اسیر لکھنوی سے کیوں اور کب مشورۂ سخن کیا، غالباً امیر مینائی کے پاس اس کا جواب صرف یہی ہوگا کہ نواب فردوس مکان کے آخری کلام میں لکھنؤ کا اثر پایا جاتا ہے اسی مدعا کے ثبوت کی اہم دلیل ہے۔

مجھے اس خیال سے اتفاق ہے کہ سرکار کے آخری کلام میں لکھنویت پائی جاتی ہے لیکن صرف وجودِ لکھنویت تلمذ کی دلیل نہیں بن سکتا، خود امیر صاحب کے کلام میں دہلویت پائی جاتی ہے ....

.... مگر اس وجہ سے کسی نے بھی انہیں مرزا داغ کا شاگرد تسلیم نہیں کیا، میری ناقص رائے میں امیر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ اس طرح کہ ۱۸۶۷ء میں مرزا صاحب نے ضعف پیری اور غلبۂ امراض کے باعث سرکار سے استدعا کی تھی کہ مجھے اصلاح سے معاف رکھا جائے، اس زمانے میں دیگر درباری شعراء کے ساتھ سرکار نے منشی اسیر سے بھی کسی وقت دو چار الفاظ میں مشورہ کر لیا ہوگا، امیر مینائی مرحوم نے اس مساویانہ مشورۂ سخن کو تلمذ سمجھ کر دربارِ رامپور سے اپنے رشتۂ استادی کو قدیم بتایا ہے اور بس، اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نواب فردوس مکان نے متعدد قطعوں میں مرزا غالب کی استادی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اسیر کا ذکر نہیں کیا۔ اگر وہ بھی استاد ہوتے تو ان کا مذکور بھی کسی نہ کسی جگہ ضرور آنا چاہئے تھا" (صفحہ ۶۸-۶۹ مکاتیب غالب مرتبۂ جناب عرشی رامپوری)

مرزا غالب کا ذکر ناظم کے قطعوں میں

نواب صاحب ناظم مرحوم نے جا بجا قطعوں میں مرزا غالب کے استاد اور اپنے شاگرد ہونے کا ذکر کیا ہے اس کی چند مثالیں ہم پیش کرتے ہیں ؎

کیوں نہ غالب کے ہو اشراق کا قائل ناظم
دور سے جس نے سکھایا مجھے ایسا کہنا

صوفیا میں اشراقین کا ایک فرقہ ہوتا ہے جو دور سے توجہ اور روحانی پرتو ڈال کر سالک کو کامل بنا دیتا ہے (ا۔ ۹)

ناظم اگرچہ میر بھی تھا خوش سخن مگر — ہے ہم کو شیوۂ اسد اللہ خاں پسند

ناظم ہمیں تتبعِ غالب پہ ناز ہے — ہوگا کسی کو پیروئ میر پہ گھمنڈ

اپنے استاد کے انداز پہ میرا ہے کلام — ہم کو ناظم ہوسِ پیروئ میر نہیں

مبدا رفیاض سے دونوں ہیں ناظم بہرہ یاب — میں بھی ہوں استاد کی حسنِ طبیعت کا شریک

اس شعر کے نیچے مرزا غالب نے لکھدیا ہے کہ:۔ "بلکہ شریکِ غالب"

نواب ناظم مرحوم کا مختصر انتخاب کرنے سے قبل اب ہم مرزا غالب کی اصلاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں۔ ان مقامات کے مطالعہ سے ناظرین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائیگا کہ شاعری سے ناظم کی قدرتی مناسبت اور فطری ذوقِ شعری ایک مسلمہ امر ہے، جس کی اکثر مقامات پر خود مرزا غالب نے بھی تعریف کی ہے۔

نواب ناظم کے کلام پر مرزا غالب کی اصلاحیں

لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
عاقل نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط
احمق نہیں (اصلاح غالب)

پڑھ تو لینگے وہ نامہ میرا بھی
ملتے رہتے ہیں اسکے اکثر خط
اسکے (اصلاح)

(غالب کا نوٹ) اس کا مشارٌالیہ رقیب ہے پس اس پر جمع کا صیغہ کیوں لکھا جائے۔
غالب

لکھنوی رنگ کے اس شعر پر غالب نے ص کا نشان بنایا ہے اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ مرزا نے اس کو پسند کیا۔

ص بانکپن سمجھے ہیں قابو میں آنا شبِ وصل
سیج پہ چاہیئے ایسے کو چڑھانا شبِ وصل

ہر یک

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک
دوست کہتے ہیں اُسے جو ہو مصیبت کا شریک

(اصلاح) جہاں ہر ایک اچھی طرح نہ آئے وہاں ہر یک کیجئے ہر اک کیوں لکھئے۔
غالب

(اصلاح) آ نکلے ہیں یاں بھی

سیاح جہاں گرد ہیں ~~آ نکلے ہیں یہاں بھی~~
کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بُتِ چیں ہم

(غالب کا نوٹ) یہاں بروزن دھاں، فصیح نہیں ہے بے ضرورت نہ چاہئے۔ یہاں بہ یائے مختلط التلفّظ افصح ہے۔
غالب

(اصلاح) وہ جب آپ سے آپ پردہ کریں

~~جو اپنے سے بھی اپنا پردہ کریں~~
تو ~~وہ~~ بندِ قبا کس طرح وا کریں
غالب

وفا شعاری ناظم یقیں نہیں، نہ سہی
یہ کون شخص ہے اس کا بھی کچھ خیال نہیں

(غالب کا نوٹ) سبحان اللہ کیا امیرانہ مضمون ہے۔
غالب

قاصدوں کے کہیں انعام میں بٹ جائے نہ ملک — جلد جلد اب مرے ناموں کے پیام آتے ہیں

(غالب کا نوٹ) یہ مضمون سوائے آپ کے کون باندھ سکتا ہے۔

غالب

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم — واں میں جاتا ہوں تو کہتے ہیں نواب آتے ہیں

(غالب کا نوٹ) ہائے کیا نیا مضمون ہے۔

غالب

ناظم کو غالب جیسے شاعرِ اعظم اور استاذ الاساتذہ نے دادِ سخن دی، یہ ناظم کے کلام کی پختگی خیالات کی جدّت اور جذبات کی بے ساختگی اور مجموعی طور پر ان کے کمال کی کافی و وافی سند ہے؛

انتخاب کلامِ ناظم

تخیلات کی فراوانی اور تاثرات کی زیادتی شاعر کو غیر شاعر انسان سے ممتاز کرتی ہے؛ یوں کہیے کہ کوئی انسان دُنیا میں ایسا نہیں جس کے دل میں خیالات و تاثرات نہ پیدا ہوتے ہوں، لیکن قدرتِ بیان جو بطورِ خاص فطرت سے شاعر کو عطا ہوتی ہے، شاعر کو ممیز کردیتی ہے عام انسانوں سے جذبات کی رفعت اور محسوسات کی نزاکت اور بیان کی شوخی یہ ہیں کلامِ ناظم کے عناصرِ خصوصی جنھوں نے اس کے کلام میں اثر اور کیفیت کی روح دوڑادی ہے؛ جذباتِ محبت اور رومان کے مختلف معاملاتی گوشے اور ان گوشوں میں حسن و عشق کی لطیف چھیڑ چھاڑ ـــــ تمام دیوان کو پڑھنے کے بعد انسان اپنے اندر خیال کی وہ مسرت اور احساس کی وہ جوانی محسوس کرتا ہے جو انسانی حسِ رومانی کی معراج ہے؛

انتخابِ کلامِ نواب یوسف علیخان ناظم والیٔ رامپور

کس کس کا کروں رشک کہ اس راہ گذر میں — ہر ذرّہ مجھے دیدۂ بینا نظر آیا

بیداد سے تو یہ انھیں کرتے ہی بن آئی — جو بعد میرے کوئی نہ مجھ سا نظر آیا

جان کا غم نہیں غم یہ ہے کہ آپ — قتل کرکے مجھے پچھتائیے گا

ناظم شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ — کِسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے — مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہوگیا

قتل کرنے میں نکر دیر کہ ہوں زیست سے تنگ — رحم مجھ پر نہ سہی غیر پہ احساں ہوگا

لو قیامت میں قیامت اور برپا ہوگئی ذکر چھیڑا کس نے میرے نالۂ جاں کاہ کا

ہم کو تقصیر کا دھبہ نہ لگایا ہوتا تم خفا رہتے اگر تم کو خفا رہنا تھا

کچھ غم نہیں ہے صاف مجھے گر دیا جواب کیا کم ہے یہ خوشی کہ دیا بات کا جواب
ناظم تم اُن سے روز کہے جاؤ حالِ دل کب تک نہ دینگے ازرہِ شرم و حیا جواب

سچے ہیں اپنے وعدہ کے آتے وہ خواب میں ناظم مجھی کو نیند نہ آئی تمام رات

بھید اپنوں سے بھی نہ کہنا ناظم مُنہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

تم کرو ترکِ جفا کیا امکاں ہم کریں ترکِ وفا کیا باعث

کیوں کر کہوں کہ چارہ گروں کا قصور تھا اچھا ہوا نہ میں مگر اچھا ہوا علاج

دیتے نہیں جو بوسہ چلو بات پھیر دو اچھا ہے مٹ تو جائے تقاضا کسی طرح

عاشقوں میں ہو وہ کیونکر سُرخرو ہو نہ جس کے خوں سے چوبِ دار سُرخ

وہ ہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

سحر و نیرنگ نہ سیکھو پئے تسخیرِ قلوب دلفریبی کو ہو تم آپ سراپا تعویذ

نجاتے تم نجاتی جان میری بنے کیوں جان کے دشمن تم آکر
وہ گھبرائے سمجھ کر حلقۂ دام ہوا شرمندہ میں آنکھیں بچھاکر
وہ گھر کو دیکھنے آتے ہیں ناظم نہ کیوں بیٹھا رہا میں گھر لُٹا کر

راز میرا ہے اُنہیں غیر سے کہنا منظور — اور میں خوش ہوں کہ سُن لیتے ہیں تنہا ہو کر

جو یاد آتا ہے ہم کو ناظم تو لوٹ جاتا ہے سانپ دل پہ — بلائیں لینے کو منع کرنا وہ اُن کا آنکھیں بچھا بچھا کر

ہم پجاری نہیں تم بت نہیں سمجھو تو سہی — کچھ تو خواہش ہے کہ روز آتے ہیں سرکار کے پاس

نہیں ہے گردش چرخ کبود کا رونا — بلا ہے یار کی چشم سیاہ کی گردش

وہاں قافلہ منزل پہ بھی پہنچا مگر اب تک — ہم کرتے ہیں صحرا میں بآواز درا رقص

دیکھنا شوخی کہ میرا پوچھتے پھرتے ہیں گھر — سُن لیا ہے یہ کہ اُس کو کچھ نہیں گھر سے غرض

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیر آہ و زاری شبہائے تار جھوٹ — آوازۂ قبول دُعائے سحر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے — عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

سوز جگر سے ہونٹ پہ چھالہ افترا — شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

ہاں سینہ سے نمائش داغ دروں دروغ — ہاں آنکھ سے تراوش خون جگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں — اظہار پاک بازی و ذوق نظر غلط

لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں — احمق بنیں ہم اُس کو نہ سمجھیں اگر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی — جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام — کہتے ہو جان دی ہے سر رہگذر غلط

یہ کچھ سُنا جواب میں ناظم ستم کیا — کیوں یہ کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط

جیب و دامن کو کیا سر بسر آلودۂ خوں — کچھ نہ آیا تجھے اے دیدۂ خونبار لحاظ

ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں سدِّ راہ ہے!

(اک مباحثہ)

(جو ساغر نظامی اور پنڈت گوپی ناتھ سنہا ایڈوکیٹ کے مابین آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے
(۳۰ جولائی ۱۹۳۸ء کو ۸ بجکر ۱۵ منٹ پر براڈکاسٹ کیا گیا)

ساغر:- اور بھی سُنا، سنہا صاحب آپ نے، آپ کے فلسفی دوست مظفر حمید بھی شادی فرما رہے ہیں، لیجئے اُن کی فلسفہ دانی بھی ختم ہوئی، وہ بھی بڑے کاموں کے لئے ہاتھ سے گئے!

سنہا:- ساغر صاحب! آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں سدِّ راہ ہوتی ہے میں سُننا چاہتا ہوں کہ اس دعوٰی کے دلائل کیا ہیں؟
جہاں تک میں سمجھتا ہوں دُنیا میں بڑے کام بڑے آدمیوں نے کئے ہیں اور بڑے آدمیوں نے کبھی کسی رُکاوٹ کو تسلیم نہیں کیا۔
یہ کہنا کہ ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے ایک مہمل بات ہے۔
رُکاوٹوں کا بذاتہٖ کوئی وجود نہیں۔

ساغر:- جنابِ والا! کوئی بات دُنیا میں بے وجود، اور مہمل نہیں، یہاں تک کہ لفظ "مہمل" بھی اپنا ایک مفہوم رکھتا ہے۔ انکار کرنے کا آپ کو حق ہے مگر یہ سوچ لیجئے کہ رُکاوٹوں سے انکار، زندگی کی تمام ٹھوس حقیقتوں سے انکار کر دینا ہے!

سنہا:- کسی ایک حالت کو رُکاوٹ مان لینا، یا نہ ماننا ہر شخص کے مزاج اور دماغی کیفیت پر منحصر ہے، انسانی دماغ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے یہ سانچے بناتا ہے اور ان میں حالات کو ڈھالتا ہے۔ ورنہ بڑے آدمیوں کی لغت میں اس لفظ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ازدواجی زندگی اور بڑے کاموں کے لئے رُکاوٹ!؟
محض اک بہانہ ـــــ محض ذہنی فریب ـــــ محض ناقابلیت۔ خدا کی پناہ اس سے زیادہ بزدلی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مرد اپنی کمزوریوں کو غریب عورت کے سر تھوپنا چاہتے ہیں!؟

ساغر:- خوب، بحث ازدواجی زندگی سے ہے نہ کہ عورت اور مرد سے!؟

سنہا:- "عورت" اس ڈرامے کی ہیروئین ہے!

ساغر:- یہ "ہیروئین" بھی زندگی کے ایکٹنگ میں اتنی ہی ناکام ہوئی ہے جتنا کہ غریب "ہیرو" ـــــ اور اس کی بنیادی وجہ محض ازدواجی زندگی ہے۔

سنہا:- اچھا یہ تو فرمایئے ـــ کہ مریادا پرشوتم "رام" نے اپنے باپ کے حکم پر ۱۴ سال پہاڑوں میں گذارے کیا سیتا اُن بڑے کام میں مانع ہوئیں!؟

بھگوان سری کرشن نے بھارت ورش کی یادگار جنگ مہا بھارت لڑی، ارجن کو گیتا کا اُپدیش دیا، کیا رکمنی جی اس بڑے کام میں حائل ہوئیں؟
پیغمبر اسلامؐ نے خدا کا پیغام دُنیا کو دیا، جو آج دُنیا کے لئے شمع ہدایت ہے تو کیا حضرت خدیجہ اس کام میں مانع ہوئیں؟
—— تو پھر اس بے حقیقت بات کو تسلیم کرنا کہ شادی کی زندگی بڑے کاموں میں حارج ہوتی ہے عورت کے خلاف ایک بے بنیاد الزام لگانا ہے۔

ساغر:- بجا ہے، —— بار بار عورت کو فریق مخالف کی حیثیت دے کر غالباً آپ تمام عالم نسواں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہیں —— !؟
پیغمبروں کی مثال دینا یہاں مناسب نہیں، پیغمبر خاص اور بلند فکر و عمل کا انسان ہوتا ہے، وہ دُنیا پر چھا جاتا ہے۔ تاہم حضرت لوط کی زندگی پر غور کیجئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ بی بی ہاجرہ اور بی بی سارہ کا قصہ تو ایک کھُلی ہوئی شہادت ہے کہ پیغمبروں کو بھی ازدواجی زندگی میں چین نصیب نہیں ہوا، رام چندر جی کو بن باس کا حکم دینا مہاراج دشرتھ کی ازدواجی زندگی کی الجھنوں ہی کا نتیجہ تھا۔
بلا شک سیتا جی بن باس میں سکون کی زندگی گذارنے میں مانع ہوئیں، رام کو ان کے لئے ایک جنگ عظیم لڑنی پڑی، اس کے بعد بھی ان کی زندگی اس قصے کے باقی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔
کرشن بھگوان کا آپ نے ذکر فرما دیا مگر مہاتما بُدھ کو آپ بھول گئے، جب تک وہ گرہست جیون کے جال سے آزاد نہیں ہوئے وہ دھیان گیان کی منزلیں طے نہیں کر سکے اور نہ دُنیا میں اپنا دھرم پھیلا سکے۔
ٹالسٹائی ہی کو لے لیجئے اس نے ازدواجی زندگی سے بھاگ کر غربت میں ایسٹا پاوڈ (Astapovo) کے مقام پر جان دی۔ وہ کہتا ہے:—

> "اصلی عیسائی کی نگاہ میں شادی ترقی کا درجہ نہیں بلکہ زوال کی حالت ہے محبت یا جو کچھ بھی شادی کا صریحی نتیجہ ہو زندگی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے میں حائل ہوتی ہے۔ ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اعلیٰ خدمات جو انسان کو انجام دینی چاہئیں خواہ وہ بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہوں یا ملک اور سوسائٹی کے فوائد کے لئے ان میں شادی اور محبت سدِ راہ ہوتی ہیں۔"

پھر کروڑوں انسانوں میں سے چند بڑے اور مقدس انسانوں کو آپ نے منتخب کر لیا اور فرما دیا کہ ان کی کامیابی کا سہرا "عورت" اور ازدواجی زندگی کے سر ہے لیکن لمبی چوڑی انسانی سماج کے اُن غریبوں کو آپ بھول گئے جو اپنے دلوں میں ارادوں کی ایک دُنیا رکھتے ہیں۔ مگر ازدواجی زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں کی وجہ سے پر قینچ کبوتر کی طرح پر تول تول کر رہ جاتے ہیں۔

سنہا:- فرمائیے —— فرمائے جائیے!

ساغر:- انٹونی کی زندگی کو کلوپیٹرا نے ناکام بنایا —— !؟ غازی امان اللہ خاں کے انجام پر غور کیجئے۔
میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اگر وہ مجرد ہوتے تو ان کا دماغ مشورے طلب نہ کرتا، فیصلے کرتا۔

سنہا:- بادشاہوں کی مثال دینی موزوں نہیں، حکومت کا غرور ان کو زیادہ جذباتی بنا دیتا ہے —— !

ساغر:- جی نہیں —— اگر ہاتھ پاؤں، ناک اور کان، بیوی کا اثر قبول کیا کرتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ بندہ نواز! رونا یہ ہے کہ اس "بجلی" سے بیک نظر دل مفتوح، عقل مسلوب، اور دماغ مفلوج ہو جاتا ہے۔

سنہا:- آخر ازدواجی زندگی میں وہ کونسا نقص ہے جو آدمی کو بڑے کاموں کے کرنے کے ناقابل بنا دیتا ہے —— !؟
یہی نا کہ شادی کے بعد بیوی بچوں کی پرورش کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے!؟

ساغر:- ہندوستانی زبان کا ایک لفظ ہے "دُھن" دھنک رے دھُنئے اپنی دُھن" جس طرح دُھنیا ایک خاص دُھن میں روئی دُھنتا ہے بڑے کاموں

کی دھن بھی ایسی ہی ہوتی ہے، بڑے کام کرنے کے لئے آزادی، اکانت، خود اعتمادی، خود رائی اور دنیا سے ٹکرانے کی شکتی ہونی چاہئے۔
ان باتوں میں شادی بیاہ کی زندگی کبھی توازن پیدا نہیں ہونے دیتی۔ ان تمام باتوں کی دشمن وہ "افیون" ہے جسے "محبت" کہتے ہیں۔ بھر بیوی بچوں کی محبت، خدا کی قسم تنہا صاحب! شادی شدہ انسان کے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے ہیں، دماغ بند ہو جاتا ہے اور دل تقسیم ہو جاتا ہے۔
تنہا:۔ مہاتما گاندھی کی راہِ عمل میں شادی کی زندگی کیا مانع ہوئی ؟
میں آپ سے پوچھتا ہوں مسولینی غیر شادی شدہ انسان ہے ؟؟
ساغر:۔ شادی شدہ انسان ہے۔ مگر کیا ہٹلر نے شادی کی ہے ۔۔۔ ! ؟ مصطفےٰ کمال کی ازدواجی زندگی کا انجام آپ کو یاد نہیں ؟ ؟
تنہا:۔ خوب یاد ہے ۔۔۔ مگر کیا ان دونوں ڈکٹیٹروں نے اپنی حکومتوں میں ازدواجی زندگی بسر کرنے کے خلاف کوئی حکم جاری کیا ؟
کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہٹلر نے اچھی ماؤں کے لئے انعامات مقرر کئے، مراعات جاری کیں ؟ ؟
ساغر:۔ ضرور جاری کیں، مگر وہ معاشرتی نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر۔
آپ نے مہاتما جی کا ذکر کیا ۔۔۔ جوانی میں مہاتما جی نے کیا بڑے کام کئے ؟ اور اگر کئے تو اس وقت کئے جب انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی
تن، من، دھن، سب کچھ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے تج دیا ۔۔۔ ان کی زندگی "یوگ" کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔
آپ کی گفتگو کے رُخ ہی سے مجھے اختلاف ہے بہت ممکن ہے کہ اگر انسان شادی بیاہ کی زندگی کو اختیار نہ کرتا تو دنیا میں کم سے کم ایک چوتھائی آبادی "بڑے آدمیوں" کی ہوتی۔
تنہا:۔ معاف کیجئے۔ پہلے تو عورتوں پر مجرمانہ پابندیاں عائد کرنا، ان کو جاہل اور بے دست و پا رکھنا ۔۔۔ کس لئے ؟ محض اس لئے کہ وہ مرد کی دست نگر ہو جائیں۔ بے چون و چرا مرد کی غلامی قبول کرلیں۔ اور پھر اس کے خود "پرور دگار" بن کر بڑے کاموں میں اسے سدِّ راہ قرار دینا۔
ساغر:۔ ٹھہریئے ۔۔۔ میں اسی "پرور دگاری" کے خلاف تو چیخ رہا ہوں۔ آپ کا اصول مردوں کو "پرور دگار" بناتا ہے نہ کہ میرا ! ؟
تنہا:۔ ان مردوں کا، جو شادی کی زندگی کو بڑے کاموں میں سدِّ راہ قرار دیتے ہیں ۔۔۔ آپ کے خیال میں کیا یہ ناروا ظلم نہیں ہے۔ ؟
ساغر:۔ ضرور ہے مگر اس کی اصلی وجہ ازدواجی زندگی اور اس کا موجودہ نظام ہے۔
تنہا:۔ توبہ، توبہ، کس قدر مضحکہ انگیز بات ہے۔ میں دنیا کا سفر نہیں کرسکتا کیونکہ میں شادی شدہ انسان ہوں۔
میں ہمالہ کی مہم سر نہیں کرسکتا کیونکہ میں شادی شدہ انسان ہوں۔
میں اپنے ملک کی حفاظت کیلئے جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ میں شادی شدہ انسان ہوں۔
میں ہوائی جہاز کا سفر نہیں کرسکتا کیونکہ میں شادی شدہ انسان ہوں۔
کیونکہ میں شادی شدہ انسان ہوں اس لئے گھوڑے پر نہیں چڑھ نہیں سکتا۔ سبحان اللہ۔
ساغر:۔ تعجب ہے کہ آپ اس کھلی ہوئی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے، کہ عظیم الشان کام کرنے کے لئے مجرد انسان ذمہ داریوں کی کمی کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے، وہ زیادہ سے زیادہ وقت، زیادہ سے زیادہ طاقت، پوری آزادی کے ساتھ صرف کرسکتا ہے۔
اور شادی شدہ شخص کی راہ میں ازدواجی زندگی پہاڑ بن کر حائل ہو جاتی ہے بڑے کاموں کا کرنا تو درکنار وہ زندگی کے عظیم کاموں کا تخیل بھی نہیں کرسکتا۔
تینتیس کروڑ ہندوستانیوں میں ایک ہی گاندھی کیوں ہے ؟ پورے جرمنی میں ایک ہی ہٹلر کیوں ہے اور ٹرکی کی وسیع آبادی نے کوئی دوسرا مصطفےٰ کمال کیوں پیدا نہیں کیا ؟؟؟

ستنہا:۔ یہ کوئی دلیل نہیں جن بڑے آدمیوں کے نام آپ نے لئے وہ قرنوں اور صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں پڑ کر انسان مجبور ہو جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سماج کے مظالم نے ایک طرف عورتوں کو بے بس اور دوسری طرف مردوں کو کاہل اور بددل کر دیا ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی بدقسمتیوں کو دوسروں کے سر ڈالتے اور کوستے ہیں !!

میرے دوست! ازدواجی زندگی مرد اور عورت کے درمیان ایک "مضبوط پیمان" ہے۔ یہ پیمان ایک دوسرے کو دکھ سکھ کا شریک بناتا ہے یہ پیمان قدرت کا تقاضہ ہے، فطرت کا بھید ہے، وجہِ پیدائش ہے۔

شادی کی زندگی ناگزیر انسانی جذبہ کا ایک تمدنی اور اخلاقی نام ہے۔

اس جذبہ کو عارضی طور پر تسلیم کر لینا اور مستقل شکل میں نہ ماننا، خود غرضی ہے اور انتہائی درجہ کی خود غرضی (selfishness [illegible]) ہے اور بدترین (Exploitation)

ساغر:۔ جناب کا وعظ سر آنکھوں پر، شادی کی ضد میرے ذہن میں غیر پاکدامنی ہرگز نہیں ہے، مگر جس مضبوط پیمان، کا آپ نے ذکر فرمایا وہ تارِ عنکبوت کی طرح کمزور ہے۔ دکھ، سکھ کی شرکت، سر کے بال اڑا کر، چہرہ پر جھریاں ڈال کر تمام فطری قابلیتوں کو مٹانے کے بعد حاصل کرنا بڑا مہنگا سودا ہے! اور یہ سودا آدم کے بچوں میں نہیں ہوتا ہے۔ نیچر ازدواجی زندگی کی پابند نہیں۔ چرند پرند اور کل جانوروں میں نر و مادہ سہی مگر ان میں ازدواجی زندگی کا نظام نہیں پایا جاتا، پودوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں، لیکن ان کا آپس میں نکاح بھی ہوتا ہے! یہ ابھی معلوم نہیں ہو سکا ہے ——— محض شادی بڑے کاموں میں حارج نہیں ہوتی بلکہ ازدواجی زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں انسان کو دنیا کے بڑے کام نہیں کرنے دیتیں۔

ستنہا:۔ کیا خوب دلیل ہے؟ کبوتروں کا غول در غول اڑنا، ایک گھونسلے میں محض ایک جوڑے کا رہنا، سارس اور اس کی مادہ کا ایک جان دو قالب ہونا، بچوں کی خبر گیری، یہ تمام مظاہر محبت کے فطری تقاضہ کا ثبوت ہیں۔ بے زبان جانوروں کی اس حالت کو ازدواجی زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پھر حیوانِ ناطق کے معاملے میں حیوانِ مطلق کی مثال دینا کہاں کا انصاف ہے، انسان کو خدا نے نطق دیا، عقل دی، تدبّر دیا اور تمام مخلوق میں اشرف اور افضل پیدا کیا۔ ان جوہروں کے نتیجے کے طور پر دنیا بنانے کی قوّت دی، انسان نے اپنی دنیا خود پیدا کی، تمدّن اور معاشرت کی زندگی بنائی، اور ازدواجی زندگی اسی تعمیر کے شوق اور تدبّر کا نتیجہ ہے۔ بہرحال آپ لاکھ فرمائیے میں اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر بیوی کسی شوہر کی ترقی کی راہ میں سدّراہ ہے تو اس کی ذمہ دار سوسائٹی ہے جس نے عورت کو انسانی درجہ سے گرا کر حیوانوں کے زمرہ میں شامل کیا مرد اس کے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے عورت کی محبّت، ایثار، اور فرمانبرداری کے جذبہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے حق کو غصب کر لیا۔ اور پھر اس کو باربرداری کے جانور کی طرح استعمال کیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد یہ شکوہ کہ ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں حائل ہوتی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ شادی کی زندگی اگر بڑے کاموں کی راہ میں رکاوٹ ہے تو نسلوں کو تربیت دینے والی عورتوں کی راہ میں کیوں سدّراہ نہیں ہوتی۔ کیا اچھی نسل پیدا کرنا اور پھر اس کی تربیت کرنا کوئی چھوٹا کام ہے !؟

ساغر:۔ بہت بڑا کام ہے، مگر یہ بارِ ثبوت آپ ہی پر ہے کہ اچھی نسل کسے کہتے ہیں؟ کیا موجودہ نسل!؟ ہندوستان ہی کو لے لیجئے، کیا آپ ایمانداری سے بتا سکتے ہیں کہ ازدواجی زندگی کی بدبختیاں ہزار میں ایک ماں کو بھی اولاد کی صحیح تربیت دینے کا موقع دیتی ہیں؟؟ افسوس آپ برابر یہ سمجھ رہے ہیں کہ موضوع کی حمایت عورتوں کی مخالفت ہے، حالانکہ میرا ایمان ہے عورت ہو یا مرد جو بڑا کام دنیا میں کرنا چاہے اس کے لئے ازدواجی زندگی نہایت غلط ہے۔

ازدواجی زندگی کی زنجیریں محض مرد ہی کو نہیں جکڑتیں، عورت پر بھی اس کا برابر کا اثر ہے، دُنیا کی ساری تاریخ میں گنتی کچھ نام ایسے بتاتی ہے جن عورتوں نے سماجی غلامی کے اس طوق کو نہیں پہنا، وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہیروئن ثابت ہوئیں، مسلمانوں میں حضرت رابعہ بصری، یہ ایک مشہور عبادت گذار خاتون تھیں، کوئن الیزبتھ جس نے تمام عمر شادی نہیں کی، یہی ہے وہ ملکہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے برٹش ایمپائر کا سنگِ بنیاد رکھا، جون آف آرک جو اپنے وطن کی خاطر آگ میں جل کر خاک ہوگئی۔ چاند بی بی جس نے شوہر کے مرنے کے بعد باقاعدہ حکومت کی، اور اپنی جنم بھومی پر قربان ہوگئی۔

اگر ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں رُکاوٹ پیدا نہیں کرتی تو چاند بی بی کی شہادت اس کے شوہر کے سامنے ہونی چاہیئے تھی!؟

یہ گنتی کے چند نام ہیں۔ لیکن مان لیجئے ایک ہزار عورتیں بھی اگر اس درجہ کی گذری ہیں تو کیا دُنیا کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہ کوئی قابلِ فخر تعداد ہے —— !؟

ستنہا: مغل شہنشاہ "جہانگیر" کی محبوب بیگم نورجہاں نے سلطنت کے معاملات میں جہانگیر کے دوش بدوش کام کیا۔

خالدہ ادیب خانم نے ٹرکی کی تعمیر میں حصّہ لیا۔

میڈم چیانگ کیائی شک اپنے شوہر کے ساتھ چین کے لئے سربکف ہے!

ساغر: ۔ ایسی ذہین اور بہادر عورتیں اگر ازدواجی زندگی میں نہ ہوتیں تو ان سے زیادہ بڑے کام کر سکتی تھیں۔

ستنہا: ۔ میرا یہ مستقل خیال ہے کہ جس مرد کو ازدواجی زندگی بڑے کام کرنے سے روکتی ہے وہ مرد کہلانے کا مستحق نہیں، اس کی قوّت ارادہ کمزور ہے، اس میں ہمت اور مردانگی نہیں۔ بہتر ہے کہ وہ چپکے سے اپنی کمزوری کا اعتراف کرلے، ازدواجی زندگی کو اتہام نہ دے،

ساغر: ۔ تعجّب ہے آپ یہ تسلیم نہیں کرتے، کہ شادی بیاہ کی زندگی مرد کی جملہ قوّتوں کو تقسیم کر دیتی ہے۔ پورے دماغ پر تو لکھا ہوتا ہے

روٹی

دماغ کے ایک خانے میں مُنّی کرتی ہیں "چین" دوسرے خانے میں ننھے فرماتے ہیں "پین" اور پھر دل میں بیوی اور سُسرالیوں کی چھاؤنی، کبھی اولاد کی تعلیم کا خیال، کبھی تربیت کا جنون، ملازمت اور تجارت کے فرائض، شادی بیاہ، عیش و غم، ہاری بیاری، کیا آپ اب بھی تسلیم نہیں کریں گے کہ قوّتِ ارادی، ہمّت، اور نام نہاد مردانگی کی اس زنانہ تقسیم کے بعد دُنیا کا کوئی کام سرانجام دیا جا سکتا ہے۔!؟

ستنہا: ۔ خیر، جب ان فرائض کو انجام نہیں دیا جا سکتا، دُنیا کی اُلجھنیں برداشت نہیں ہوتیں، ناکامی اور نامرادی میں شادی کی زندگی کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، —— اس وقت مرد اسی عورت کے دامن میں پناہ لیتا ہے جس نے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا عہد شوہر اور بچّوں کی خدمت کا کیا ہے۔!

ساغر: ۔ گویا شادی مرد کو عورت کا غلام بنا دیتی ہے۔

ستنہا: ۔ جی نہیں، شادی بیاہ کی زندگی انسان کو محبّت کا سبق دیتی ہے۔

ساغر: ۔ یہ تو نفسیاتی طور پر غلط ہے، شادی محبّت کی دشمن ہے۔

ستنہا: ۔ خوب! اس کا ثبوت؟!

ساغر: ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اس چیز کے لئے تڑپ سکتے ہیں جو ہماری دسترس سے بلند و دور ہو، اور جب ہم کسی چیز کو پا لیتے ہیں تو ہماری بے تابی ختم ہو جاتی ہے۔ نکاح عورت کو مرد سے قریب کرتا ہے اور یہ قربت محبّت کو فنا کرتی ہے، محبت تو لاحاصلی کا نام ہے اور نکاح بیوی کی مع جہیز کے حاصل کر لینے کو کہتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کے بعد دو محبّت کرنے والے مرد و عورت، محبّت کرنے والے نہیں رہتے، نہ

معاملاتی بن جاتے ہیں۔

محبت جذبات کی تاجدار ہے اور کبھی ازدواجی زندگی کے جنجال کو برداشت نہیں کر سکتی۔

سنہا:۔ جناب اگر شادی بیاہ کی زندگی نہ ہوتی تو نظام نہ ہوتا، عقل تمیزی نہ ہوتی مرد اور عورت غول بیابانی کی طرح ساری دُنیا میں بھٹکتے پھرتے۔

ساغر:۔ کیوں بھٹکتے پھرتے، ممکن ہے انسانی دماغ کوئی ایسا قانون بناتا جو شادی بیاہ کی زندگی سے زیادہ آرام دینے والا ہوتا۔

سنہا:۔ اگر بنا سکتا تو ابتک بنا لیتا، یہی ازدواجی زندگی کا قانون ایک اٹل قانون ہے، یہ قانون سماج میں امن کا باعث ہے، یہ اصول دوسروں کی مسرت میں اپنی مسرت دیکھتا ہے۔

ساغر:۔ ازدواجی زندگی اور مسرت!! بالکل دو مخالف چیزیں ہیں، کبھی میاں بیوی ایک مزاج کے نہیں دیکھے گئے، میاں شمال کی کہہ رہے ہیں، تو بیوی مغرب کی ہانک رہی ہیں، ایشیا میں تو شادی تمام تین چیزوں میں نہایت مضحکہ انگیز چیز ہے۔ شادی سے پہلے ہماری تہذیب دم مارنے کی اجازت نہیں دیتی، مرد یہ معلوم کرے تو کیونکر معلوم کرے کہ اس کی شادی کسی عورت سے ہو رہی ہے یا کسی فاختہ سے!؟ اور عورت کو یہ تصور کرنے کا حق بھی نہیں کہ وہ کسی انسان سے بیاہی جا رہی ہے یا بن مانس سے!؟

مشرق کو چھوڑ کر یورپ میں گو آزادی ہے مگر وہ آزادی بھی انسانی فطرت کے رُخ سے پردے نہیں اُٹھا سکی، اور مرد برابر استعجابی نشان (!) اور عورت مستقل سوالیہ نشان (؟) بنی ہوئی ہے۔

سنہا:۔ اسکے باوجود سماج کا نظام درہم برہم نہیں ہوتا۔

اور دُنیا کامیابی سے چل رہی ہے!

ساغر:۔ کامیابی اور نقصان کے ساتھ، سماج میں لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ اگر ان کو وقت اور سکون ملے تو دُنیا کا بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں۔ اصل گفتگو تو یہ ہے!

سنہا:۔ جی ہاں میں اصل ہی سے بحث کر رہا ہوں۔ ازدواجی زندگی دوسری کی خاطر زندگی بسر کرنے کا سُنہری اصول سکھاتی ہے؛ بُنیادی بے ثباتی میں ثبات پیدا کرتی ہے۔ اور انسان کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ہدایت کرتی ہے!

دیکھیئے ذرا غور تو کیجیئے۔ ہر انسان کے دل میں قدرتی طور پر ترقی کی خواہش کام کرتی رہتی ہے وہ اپنے خاندان اور گھر کی ترقی چاہتا ہے۔ بیوی بچوں کا خیال ہر راحت اور ہر بڑے کام کے لئے اسے تیار کرتا ہے۔ مگر آپ یہی کہے جاتے ہیں کہ شادی کی زندگی بڑے کاموں میں سدِّراہ ہے۔

ساغر:۔ میں یہ تو تسلیم کر سکتا ہوں کہ ازدواجی زندگی چھوٹے کاموں میں رُکاوٹ نہیں ہے مگر بڑے کاموں خاص کر تعمیری کاموں میں سخت سدِّراہ ہے اگر لٹریچر قوموں کو بناتا ہے اور قومیں شعراء کی آغوش میں آنکھ کھولتی ہیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فلسفی، شاعر، اور ادیب کے لئے تو ازدواجی زندگی سمِ قاتل ہے۔

ہم اپنی دُھن میں کوئی نظم لکھ رہے ہیں، یکایک بیوی نے سر پر چڑھ کر للکارا "کیا افیونیوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہو، شاعری نہ ہوئی اک آفت ہو گئی، خبر بھی ہے گھر میں کچھ نہیں اور مہمان آنے والے ہیں"

اب آپ ہی خدا لگتی کہیئے، اس سنگین حقیقت کے سامنے کوئی رنگین تخئیل باقی رہ سکتا ہے!؟

میرا قطعی فیصلہ ہے کہ کبھی ازدواجی زندگی میں اعلیٰ ادب پیدا ہو نہیں سکتا۔

سنہا:۔ مگر دُنیا میں جس قدر بڑے بڑے ادیب و شاعر گذرے وہ سب بیوی والے تھے۔ ذرا اُنگلی پہ گنیئے:۔

(۱) مولانا روم (۲) شکسپیئر (۳) گوئٹے (۴) غالب (۵) میر (۶) نظیر (۷) شیلے (۸) اقبال وغیرہ وغیرہ۔

ساغر:- بجا فرمایا مگر ان میں سے اکثر کی ازدواجی زندگی نہایت المناک تھی ــــ اس نکتہ کو آپ چھوڑ ہی گئے!؟
رہے نام؟ نام تو میں بھی گنا سکتا ہوں مثلاً خیام، خواجہ حافظ شیرازی۔ دونوں نے شادی نہیں کی اور حکمت و شعر کے خزانے اپنی یادگار
چھوڑ گئے۔ ہندوستان کے مشہور ولی اللہ حضرت محبوب الٰہی نے بھی شادی نہیں کی۔

تنہا:- بہرحال ــــ میں نے آپ کے دلائل سُنے اور میں بہت خوش ہوں کہ آپ اپنے خیال کے ساتھ سچے ہیں۔

ساغر:- آپ کی دلیلوں نے بھی مجھے بہت متاثر کیا، اور آپ پہلے انسان ہیں جس نے اس موضوع پر ٹھکانے کی بات چیت کی ہے۔

تنہا:- شکریہ، مگر میرا آخری نکتہ باقی ہے ــــ یہ بتائیے کہ آپ اپنے تمدن کو انسان کا کوئی کارنامہ مانتے ہیں یا نہیں!؟

ساغر:- بے شک مانتا ہوں۔

تنہا:- ازدواجی زندگی مدنی تصور ہی کا نتیجہ ہے نا؟

ساغر:- کوئی شک نہیں۔

تنہا:- گویا تمدن کُل ہے اور شادی اس کا ضروری جزو؟

ساغر:- جی ہاں۔

تنہا:- تو پھر آپ تمدن کو مانتے ہیں نا؟!

ساغر:- تمدن کو ماننے کے لئے مجبور ہوں۔ اس لئے کہ متمدن دنیا کا ایک فرد ہوں مگر ــــ

تنہا:- مگر ــــ مگر کیا معنی!؟ یعنی آپ درخت کو مانتے ہیں اور شاخوں سے انکار کرتے ہیں
گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز!؟

ساغر:- گڑ جب گڑ تھا اس کی خاصیت دوسری تھی۔ اور گلگلوں سے اس لئے پرہیز ہے کہ اس میں فسادِ گندم بھی شریک ہو گیا، بہرحال متمدن زندگی
سے مجھے انکار نہیں اور موجودہ اجتماعی زندگی کی خاطر شادی بیاہ کی زندگی سے بالکل انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام دلائل جو
ازدواجی زندگی کی تائید میں میں نے سُنے وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے، میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ازدواجی زندگی بڑے کاموں میں سدِ راہ ہوتی ہے
"تمدن" صدیوں کی اجتماعی کوششوں، انسانی تصورات، ارادوں اور افعال کا نتیجہ ہے۔
یہ کوششیں جو اب تک تمدن کو بنانے کے لئے ہوئیں، میں سمجھتا ہوں، ان میں بھی ازدواجی زندگی کے مہلک اثرات موجود ہیں۔ اگر شادی
بیاہ کی زندگی اس تمدن کا ضروری جزو نہ ہوتی، تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تمدن جو اس کے بغیر پیدا ہوتا وہ کیا ہوتا؟
ہر کیف یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس تمدن میں بڑے کاموں کی سرانجامی کے مواقع موجودہ تمدن سے ضرور زیادہ ہوتے

تنہا:- میرے نزدیک آپ کا جواب خیالی اور قیاسی ہے، آج سے بہت پہلے سر ٹامس مور نے ایک ([illegible]) یوٹوپیا تیار
کیا تھا اور ہم لوگ اس کے تصور سے اب تک مسرور ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا تمدن جس کی طرف جناب نے اشارہ فرمایا ہے اس دنیا میں
رونما ہو سکتا ہے تو میں بلا پس و پیش آپ کا ہمنوا بننے کے لئے تیار ہوں۔

ساغر
گوپی ناتھ تنہا

امیر محمود ابنِ یمین

(از ملفوظاتِ حافظ احمد علی خاں صاحب شوقؔ رامپوری مرحوم)

اس کے باپ کا نام امیر الدین طغرائی ہے۔ اپنے عصر کے فاضلوں میں سے تھا۔ اخلاق حمیدہ اور اوصاف عمدہ رکھتا تھا۔ تحصیل معاش کا ذریعہ پیشۂ دہقانی تھا۔ تخم معانی کے گل زمینِ بیان میں بوتا تھا۔ سربداروں کے زمانہ میں تھا۔ (شمع انجمن صفحہ ۶۴)

تذکرۂ مجمع الفصحا کا مؤلف مرزا رضا علی خاں ہدایت لکھتا ہے: "ابن یمین فریومدی خراسانی کا نام امیر محمود اور باپ کا نام یمین الدین طغرائی ہے۔ اس کا مشربِ حکیمانہ تھا اور قطعاتِ نظم نصیحت آمیز جس کے ذریعہ سے پند و وعظ کا اثر ہو لکھتا تھا۔ اس کا دیوان ۷۴۳ھ کے فتنۂ سربداران میں ضائع ہو گیا۔ شاعری میں طغا تیمور خاں کی مدح گستری بھی کرتا تھا۔ دو ہزار شعر اس کے باقی ہیں۔" آتشکدۂ آذر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ کا نام یمین الدین ہے اور فضلا اور فقہا کو اپنے ہاں بطور مہمان بلایا کرتا تھا۔ اپنے عزیزوں میں بھی وہ نہایت عزیز تھا۔" آذر کہتا ہے کہ قطعات کے مضامین اچھے ہیں۔ اور دیوانِ قطعات سے یہ انتخاب لکھا جاتا ہے۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان قطعات کے سوا غزلیات کا بھی دیوان تھا

٦١

آتشکدہ مطبوعہ میں سنہ ولادت نہیں لکھی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وقتِ نزع اس نے یہ رباعی کہی تھی (خواہی کہ خدا کار نکو با تو کند)۔ نشترِ عشق حسین قلیخاں سے بھی باپ کا نام امیر یمین الدین ثابت ہے اور سربداران و طغا تیمور خاں کی مدّاحی کی ـــــ بھی تحقیق ہوتی ہے۔ بلکہ نشترِ عشق یہ بھی کہتا ہے کہ ان کی دولت و حشمت سے نعمتِ کثیر ابن یمین نے حاصل کی اور قطعہ گوئی کی شہرت کو ثابت کرتا ہے (چنانچہ اکثر مورخان کلام او را بجائے مناسب و محل موقع داخل تالیفات خود ساختہ اند) تصوّف سے اس کو خوب تعلق تھا اور آٹھویں جمادی الآخر ۷۶۹ھ میں انتقال کیا۔ راؔمی نے قطعۂ رحلت لکھا ہے ؎

آں امیر کبیر ابن یمین　　　　مردہ بنوشت راؔمئی مایوس
ز ابجد و بیّنات ایں تاریخ　　　　زجہاں شد امیر ما افسوس

تذکرہ علی قلیخاں داغستانی میں یہ لکھا ہے (فخر الدین امیر محمود ابن یمین عارفانِ کامل و سالکان و اصل میں سے تھا۔ نظم میں کمال قدرت تھی اور خلف الصدق یمین الدین محمود الفریومد طغرائی کا ہے۔ اس کا دیوان جنگِ سربداران میں ۷۴۳ھ میں تلف ہو گیا اس لئے اس کے اشعار کمیاب ہیں اور اکثر قطعہ اس نے لکھے ہیں۔)

ایک تذکرہ میں لکھا ہے۔ امیر یمین الدین باغِ فضیلت کا ایک شجرِ تر و تازہ تھا جس کا ثمر ابن یمین ہے۔ صاحب دل نیک خلق ۱۱۱۱

صاحب فراست تھا۔ قوم سے ترک تھا۔ سلطان محمد بندہ کے عہدِ حکومت میں فریومد میں سکونت اختیار کی۔ وزرا اور ملوک سب ہی باحترام پیش آتے تھے۔ باپ بیٹوں میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ دونوں فاضل اور خوش گو تھے۔ امیر یمین الدین نے یہ رباعی لکھی ہے

دارم زجفائے فلک بوقلموں — وزگردشِ روزگار خس پرور دوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک — جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین نے جواب میں رباعی لکھی ہے

دارم زجفائے فلک آئینہ گوں — پرآہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہزار غم بشب می آرم — تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

قطعہ امیر یمین الدین

بزرگوار خدایا بسوز سینۂ آناں — کہ علم و حکمت تو راہ یافت در دلِ ایشاں
بزاد راحلۂ رہ روانِ عالمِ قربت — کہ مرغِ وہم نزد بال در مراحلِ ایشاں
بعارفانِ سراپردۂ سراچہ قدست — کہ ہیچ نفس مقدس نشد مقابلِ ایشاں
بآہ و نالۂ بیچارگانِ بیسر و پا بیت — کہ جز تو کس نبرد رہ بحق و باطلِ ایشاں
بہ بے نیازی دیوانگاں سلسلہ دارت — کہ رمزِ عشق بود نالۂ سلاسلِ ایشاں
بہ آبروئے جوانانِ نو رسیدہ بوصلت — کہ نفسِ ناطقہ لال است در فضائلِ ایشاں
بشاہدانِ معانی کہ چشمِ گوشہ نشیناں — نظر نگاہ نمیدارد از شمائلِ ایشاں
بآبدیدۂ پیرانِ ژندہ پوشِ غربت — کہ نیست جز تو کسے زیر ژندہ مائلِ ایشاں
بخونِ پاکِ شہیدانِ عشق بیدل و دینت — کہ ہیچ دیدہ ندیدست دستِ قاتلِ ایشاں
چو کشتیِ تنِ من بشکند ز موجِ حوادث — رساں تو تختۂ جانِ مرا بساحلِ ایشاں

امیر یمین الدین کی وفات ۷۲۴ھ میں واقع ہوئی اور فریومد میں مدفون ہوا۔ ابن یمین کا نام محمود ہے۔ اخلاق پسندیدہ و سیرتِ حمیدہ سے آراستہ تھا۔ طبع ظریف اور باتیں دلپذیر تھیں۔ دہقانیت سے گذر تھی وہ فقرا کی مہمانی کرتا۔ اکابرانِ زمانہ ایسی عزت کرتے تھے جس کا بیان مشکل ہے۔ [illegible] نی الجمال اس کا کلام ایران اور توران میں خاصکر قطعات بہت مقبول ہیں۔ فضلائے دہر اس کے کلام کی قدر و قیمت خوب سمجھتے ہیں۔ وفات [illegible]

میں ہوئی اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔[1]

نشترِ عشق میں تحریر ہے یمینی امیر یمین پدر امیر محمود ہے۔ اصل وطن ترکستان تھا لیکن خراسان میں بود و باش تھی۔ علاء الدین محمد وزیر سلطان خراسان کے زیرِ سایہ بڑے اعتبار اور نعمت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ فاضلوں میں جلیل القدر اور بلاغت کیش تھا۔ مورخ صاحب قدرت اور انشا پرداز زبردست تھا تاریخ یمینی حالات سلطان محمود میں اس نے لکھی ہے۔

مدح

شاہ یحییٰ۔ طغا تیمور خاں۔ کسی بادشاہ کا ہاتھ زخمی ہونے کی عیادت۔ وزیر علاء الدین محمد۔ صفحہ ۱۱۱۔ صاحب قران جلال الدین یونس صفحہ ۱۱۲۔ شاہ یحییٰ صفحہ ۱۱۲۔ نظام صفحہ ۱۱۳۔

کسی رئیس کی فرمائش سے کسی کتاب میں جس میں اُس رئیس کا بھی کلام تھا اس نے اپنا کلام درج کیا۔ صفحہ ۱۲۳

اپنی عرض حال کا قطعہ کسی والیٔ ملک کو لکھا ہے۔ صفحہ ۱۲۴۔

کسی وزیر کو نصیحت کرتا ہے صفحہ ۱۲۷۔

علاء الدین محمد عہدِ سلطان ابوسعید میں خراسان کا دیوان تھا۔ امیر یمین الدین کی عزت کرتا تھا۔

صاحبقراں سلطان جلال الدین بن سلطان محمد محمد خوارزم شاہ ۲۳ ذی الحجہ ۶۱۸ھ کو تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد خدا بندہ

امیر یمین قوم کا ترک تھا۔ عہد سلطان محمد خدا بندہ میں قصبۂ فریومد میں املاک اور اسباب خرید کر سکونت اختیار کی۔ فریومد ہی میں ابن یمین امیر محمود پیدا ہوا۔ سلطان محمد خدا بندہ کا نام قدیمی الجائیتو خاں ہے اور وہ بیٹا ارغون خاں بن اباقہ خاں بن ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں کا ہے۔ خدا بندہ نام کی وجہ تسمیہ[1] کی نسبت کہتے ہیں کہ ارغون خاں کی وفات کے بعد حکومت قازان کو ملی۔ الجائیتو خاں مقابلہ نہ کر سکا اس لئے بھاگ کر چند سال نواح کرمان اور ہرمز میں قوم خربندگان کے ساتھ پھرتا رہا اس لئے اس کو خربندہ کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ وہ حسین تھا نظر بد سے بچانے کے واسطے اس کا نام خربندہ رکھا تھا۔ زمان سلطنت میں خربندہ کی جگہ مداحوں نے خدا بندہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا وزیر وہ مشہور عالم اور مورخ فاضل ہے جس نے تاریخ جامع رشیدی لکھی۔ یعنی خواجہ رشید الدین۔ تبریز میں خواجہ رشید الدین نے وہ عمارت بنائی جس پر لکھا ہے کہ اس عمارت کو ڈھانا بہ نسبت دوسری تعمیر کے نہایت زیادہ مشکل ہے۔ حکمت اور ہندسہ کے مؤلفات اس کے مشہور ہیں۔ سلطان خدا بندہ ۷۰۳ھ میں تخت نشین ہوا اور ۷۱۶ھ میں انتقال کیا۔ گنبد سلطانیہ میں مدفون ہے۔ قلعہ اور شہر سلطانیہ اس بادشاہ کی تعمیر میں سے ہیں۔ ۶۴

تاریخ جامع رشیدی کے دیباچہ میں مؤلف لکھتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اوراد وغیرہ سے فارغ ہو کر طلوع آفتاب تک اس کتاب کو لکھا کرتا تھا۔

سلطان ابوسعید خاں بادشاہ

نہایت نیک سیرت تھا ۱۹ برس کے سن میں سلطان محمد خدا بندہ کی رحلت کے بعد تخت نشین ہوا۔ رعایا کی حفاظت اور امن و امان میں کچھ ایسی قدرت رکھتا تھا کہ ہر دلعزیزی کی بدولت روم سے دریائے جیحون تک تمام ممالک میں اسی کا سکہ اور خطبہ جاری تھا۔ انصاف و عدل سے عالم کو معمور کیا۔ تمام مراسم اور قواعد مذموم جو پہلے سے مخالفِ رفاہ خلائق کے قائم تھے سب کو متغیر کر دیا۔ رعایا کی داد رسی اور دلداری ہر طرح مدنظر تھی۔ وزن اور محصول لگان اور نماز جمعہ و جماعت کے متعلق نہایت مناسب قواعد لکھ کر تمام ممالک میں مشتہر کئے۔ لکڑی کے ستونوں اور پتھر کی چٹانوں میں وہ احکام کندہ کرا کے شہروں میں لگائے۔ تذکرۂ دولت شاہی کا مؤلف کہتا ہے کہ میرے اس زمانہ تحریر میں بھی وہ کتبہ بعض جگہ عراق اور خراسان[2] میں

---

[1] دیکھو تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی حال ابن یمین۔ [2] دیکھو تذکرۂ دولت شاہ حال شیخ عراقی کا۔

موجود ہیں عین جوانی میں انتقال کیا۔ رعایا اور اہلِ ملک کو اس سے وہ محبت اور تعلق خاطر تھا کہ بازاروں میں ایک سال تک [illegible] گھانس کوڑا پڑا رہا۔ گلیوں میں خاک بچھائی۔ خوبصورت اور عالیشان میناروں کو ٹاٹ کے غلاف سے ڈھک دیا۔ خواجہ سلمان نے مرثیہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

گر بنالد تاج و سوزد تخت کے باشد بعید
در زوالِ دولتِ سلطانِ عادل بوسعید

ایک شخص نے تاریخ لکھی ہے ؎

ثالث و عشر ربیع الآخر اندر نیم شب
ہفتصد و سی و شش از ہجرت بحکمِ کردگار

شاہِ عادل علاء الحق والدین بوسعید
شد ازیں دنیا ملول و کرد جنّت اختیار

با ہزاران نالہ و زاری خطاب آمد ز چرخ
کہ اے خداوندانِ جاہ الاعتبار الاعتبار

چھتیس سال کی عمر میں جوانا مرگ ہوگیا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی امن و امان رخصت ہو گئے۔ سوتے ہوئے فتنے بیدار ہوگئے۔ کوئی بیٹا نہ تھا جو باپ کا جانشین ہوتا۔ اطراف و نواح کے امرائے دستِ تغلب دراز کیا۔ سلطنت کی ہوس میں چاروں طرف سے فساد کا سیلاب بڑھا اور تمام حکومت کو نمونۂ قیامت بنا دیا۔ ہر سردار سلطان بن بیٹھا اور ایک شحنہ بھی درجۂ امیری سے اوپر ابھرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ آذربائجان میں امیر چوپان اور شیخ حسن جلائر نے خروج کیا۔ عراق و فارس میں محمد مظفر کی حکومت کے ڈنکے بجنے لگے۔ خراسان میں سربدالان نے لوائے سلطنت بلند کیا۔ بیچارہ علاء الدین وزیر ابنِ یمین کا ممدوح اور دستگیر بلکہ تمام دنیا کے علما اور فضلا، مشائخ و درویش مفلس و محتاج کا مربی و سرپرست امن و امان کا ...... قتل کیا گیا۔ غوغائی جانی قربانی نے مرو اور طوس میں سکہ جمایا۔ سرخس میں والیانِ ہرات نے جھنڈا گاڑا۔ ختلان سے بلخ تک قرغن نے محشر بپا کیا غرض [illegible] سے ۷۸۲ھ تک پچاس سال کے قریب ایران کی زمین میں برابر کشت و خون اور قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ ملک ملک۔ شہر شہر۔ قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں دشمنی اور عداوت گویا خاصۂ طبعی انسانوں کا ہوگئی تھی۔ اس فساد کو امیر تیمور گورکان نے صفحۂ ایران سے اپنی شمشیر تیز سے حک کیا۔

سلطان محمد خدابندہ اور سلطان ابوسعید خاں کے عہد میں مشائخین میں شیخ الشیوخ حضرت علاؤ الدین سمنانی۔ شیخ عبدالرزاق کاشی قدس سرہٗ بڑے پایہ کے فاضل اور درویش باخدا تھے۔ علما میں مولانا نظام الدین ہروی اور شعرا میں خواجو کرمانی خواجہ سلمان ساؤجی۔ عبید زاکانی۔ ناصر بخاری ملک الشعرا انصوح جسنے دہ نامہ نظم کیا ہے۔ اور مورخوں میں مولانا فخر الدین صاحب تاریخ بناکتی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ اس کی قبر گنبدِ سلطانیہ میں اپنے باپ کے پہلو میں ہے (دیکھو تذکرۂ دولت شاہی حال مولانا فخر الدین)

شعرائے ہمعصر سلطان ابوسعید خاں

ملک الشعرا انصوح صاحبِ دہ نامہ نظم۔ ملک الشعرا سراج الدین قمری۔ عبید زاکانی۔ ناصر بخاری۔ خواجوی کرمانی۔ مولانا مظفر ہروی۔

طغا تیمور خاں

خوانینِ مغول کی نسل سے ہے بعد سلطان ابوسعید خاں کے خانی اس کو ملی اور سلطنت استرآباد و جرجان مع توابعات کے اسکے قبضہ میں آئے۔ امرا و سربدالان بھی اسکے مطیع ہوگئے۔ اور خراسان کا بہت سا علاقہ مسخر کیا۔ موسمِ بہار میدان و مرغزار رادکان میں بسر کرتا۔ سردی میں دریائے جرجان کے کنارے اور گرمی میں سلطان دوین اور استرآباد میں رہتا تھا۔ اس کے عہد میں سربدالان کو سلطنت میں نہایت دخل تھا۔

یمینی کراوی کے ہاتھ سے جو سربداران سبزوار میں سے اور حاکم بیہق کا تھا قتل ہوا۔ تاریخ وفات ۔۔۔

تاریخ مقتل شہ عالم طغا تیمور | ز ہجرت بود ہفتصد و پنجاه و چار سال
در روز شنبه از مه ذی القعده شانزده | کیں حال گشت واقع ز حکم ذو الجلال

قطعات ابن یمین

ردیف الف

بیا ز ابن یمیں ای دوست بشنو | قطعه ۱ | گہر ایں شائستہ پند رائگاں را
یکے وسی و پنج است آنکه زیں ہا | نباید بود غافل مومناں را
ز ده عشری وزاں پس منزلے چند | اگر ممکن بود ببریدن آں را
نبی را پیروی کردن دریں ہا | کز ینہا پرورش باشد رواں را
بریں مفزائی ہیچ چیزے ہم مکن کم | منت ضامن بہشت جاوداں را
منم ابن یمیں که نتواں کرد | قطعه ۲ | جز بمن انتساب شعر مرا
در میان سخنوراں باشد | فضل فصل الخطاب شعر مرا
نبود فرق در جہاں گیری | ذرۂ آفتاب شعر مرا
ز اہل دل ہوش بردن آئین است | بر مثال شراب شعر مرا
از حسد آتش اندر آب فتد | گر نویسی بر آب شعر مرا
عقد گوہر کنند تعبیرش | ہر که بیند بخواب شعر مرا
بیت معمور خوانده است خرد | در جہان خراب شعر مرا
کس معارض نمی تواند شد | بجواب صواب شعر مرا
ز انکه خود را فضیحت آرد و بس | ہر که گوید جواب شعر مرا

قطعه ۳

ز روی تیرگی گفتم مر این فیروزه خرگه را | که عاقل را چرا گشتی دوائی جان ابله را
ز پروین مهرها بستی ذنب فعلان مظلم را | بچنگال ذنب کردی مقید صورت مه را
فلک گر دید و با من گفت پیش آتا فرو خوانم | حدیث گرگ و پیراهن - رموز یوسف و چه را
غلط گفت انوری حقا که هر ده روز یک یک را | که سلبت برکند ایام هر یک روز ده ده را

قطعه ۴

عزلت و انزوا و تنهائی | برهاندت از هزار بلا
رسته از دام هر زبون گیری | از چنین حال ها شود عنقا
گوشه گیر و جریده شو که در او | جمع باشد لطائف شعرا
هر که دارد بسان ابن یمین | نیست تنها که هست با تنها

قطعه ۵

مرا فلک بمواعید میفریفت و لیک | ازاں هزار یکی باز می نکرد وفا
زمانه چند گه در هوای بوبک یکی | غرور داد بامید تخم خیر مرا
چو زاں غرور بجز رنج دل نشد حاصل | ملول گشتم از اصحاب منصب اعلا
بحسب حال خود اینک بصورت تضمین | بر اهل معرفت این بیت میکنم املا
حدیث من ز مفاعیل فاعلات بود | من از کجا سخن پیر مملکت ز کجا

قطعه ۶

ز کار بسته بودم مضطرب دوش | پدر در خواب با من گفت بابا
اما تدری اذا ما سد باب | فیفتح بعده الفتاح بابا

قطعه ۷

ای بسا دوستاں که بگزیدم | تا بدیشاں بمالم اعدا را
راستی را بسعی شان ایام | داد مالش بسی دل ما را

قطعه ۸

دلا تا چند با دنیا پرستی | کنی ضائع بغفلت عمر خود را
چه جوئی کام دل از سفله طبعی | که با اطلس نهد یکساں نمد را

چه پوئی در پئے دُنیا چو دوناں | که دارائی بود هر نیک و بد را

ترا ضائع کجا بگذارد آں کس | که روزی می رساند دام و دد را

مرا از خواجه نفع امروز باید | وگرنه روشن است اهلِ خرد را

که فردا چوں بمحشر جمع گردند | بمن حاجت بود چوں خواجه صدرا

قطعه ۹

خسیسے اگر لاف آں مے زند | که باشد یکے در نسب اصل ما

نیم منکر ایں را و لے در حسب | میانِ من و او بود فرق ها

اگرچه ز آهو بود مُشک و پشک | و لے پشک چوں مُشک نارد بها

قطعه ۱۰

مرا پیشه شعر است در وقتها | اثرها پدید آید از پیش ها

چو تیغ زباں اندر آرم بکام | کنم از نهر براں تهی بیش ها

ز تیغ زبانِ من آں کس که او | نیارد بخاطر در اندیش ها

سرانجام داند که بر پائے خود | زنا بخردی مے زند تیش ها

قطعه ۱۱

عطائے خواست از من ماه روئے | بگفتم جاں ز بهرِ تست ما را

و لے باید ز فرماں سر نتابی | که ایں معنی بود قلبِ عطا را

قطعه ۱۲

ابن یمیں اگر همه عالم بکام تست | باشد کزاں فرح نه فزاید دلِ ترا

در ملکِ کائنات ز دستت بروں شود | هاں تا غمش ز جا نه رباید دلِ ترا

چوں هست و نیست جمله نماند بیک قرار | آں به کزاں بیاد نیاید دل ترا

فارغ شو و متابعتِ پیرِ عقل کن | کز بندِ غم جز او نکشاید دل ترا

جز صیقلِ قناعت استادی خرد | از زنگِ حرص کس نه زداید دل ترا

قطعه ۱۳

چشمِ پدر ساز فرقت روئے تو سپید است | فرزند دل افروزِ من اے بدر منیرا

پیراہنِ خود تحفہ فرست اے پسرِ من — فَالقُوهُ عَلٰی وَجهِ اَبِی یَاتِ بَصِیرا

قطعہ ۱۴

خرد دوستی چوں کند با کسے — کہ با دشمناں باشد او را صفا

مدار از بداں چشمِ نیکی ازانکہ — شکر کس نخورد از نئے بوریا

شباں برہ آں بہ کہ دارد نگاہ — ازاں سگ کہ با گرگ شد آشنا

قطعہ ۱۵

از برائے دو چیز جوید و بس — مردِ عاقل جہانِ پُرفن را

یا ازو سربلند گردد دوست — یا کند پائمالِ دشمن را

و آنکہ مے جوید و نمی داند — کہ غرض چیست مال جستن را

چیدہ باشد بہ مسکنت خوشہ — دادہ زاں پس بباد خرمن را

غیرِ جاں کندنِ ز جستن چیست — حاصلِ ناشناس کودن را

قطعہ ۱۶

دانی چہ موجب است کہ فرزند از پدر — منت نگیرد ارچہ فراواں دہد عطا

یعنی درین جہاں کہ محلِ حوادث است — در محنت دہد۔ تو افگندۂ مرا

قطعہ ۱۷

یکے گفت با من کہ خورشید تافت — ترا سر چرا از خوابِ مستی چرا

بدو گفتم اے مہربان یارِ من! — ترا نیست با من دریں ماجرا

بسے بے من و تو دریں مرغزار — غزالہ کند چوں غزالاں چرا

قطعہ ۱۸

ہر کہ در مال مے کند صنعت — سعی در جمعش ار بود تنہا

غلط است آنکہ میکند ناداں — ناپسند آید ایں برِ دانا

جمع تنہا نہ صنعتے دارد — گر نہ تفریق آیدش رفقا

جمع و تفریق ہر دو می باید — تا نکو صنعتے شود پیدا

انچہ دانست گفت ابنِ یمین — کس چہ داند کہ چیست میلِ شما

قطعه ۱۹

زروزگار حوادث امید امن مدار | که در تموز ندارد دلیل برف و هوا
جهان بحقهٔ سربسته ماند از تقدیر | برون برنگ منقش درون بزهر بلا

قطعه ۲۰

چو خواهد گشت وارد امر مقدور | چه در غربت چه در ماوا و منشا
مکن شادی گرت گیتی بکام است | مخور غم گر بود کارت برآسا
چو گردان است گردون از میانه | کنارے گیر و خوش میکن تماشا
مکن جز اهل معنی را تواضع | که خوش گفت آنکه کرد این بیت انشا
ولست بضارع الا الیکم | وما لی غیرکم کلا وحاشا

قطعه ۲۱

گر خرد یار تست ابن یمین | بر طرب نه بنائے کارت را
جهد کن تا بنا خوشی ندهی | خوشی روز و روز کارت را
وقت را مغتنم شمر کامسال | می نیابی نشاط پارت را
ترک اندیشهائے دوران گیر | همچو دی بگذران بهارت را
زانکه چندان تفاوتے نکند | بد و نیک تو کرد کارت را

قطعه ۲۲

نیک همان است که می بگذرد | راحت تو محنت دوشین ما
خوردن تو مرغ مسمن دمی | بی نمکین تانک جوئین ما
خوان زر و صحنک سیمین تو | سیر زده کاسهٔ چوبین ما
قاقم و سنجاب تُرا تکیه گاه | خار و خسک بستر و بالین ما
پوشش تو اطلس و دیبا حریر | بخیه زده خرقهٔ پشمین ما
زین زر و اسپک تازی تو | بودهٔ کفشک شده چرمین ما
طبل قیامت چو بکوبک زنند | آن تو کار آید و یا این ما

قطعه ۲۳

خداوند امرا در علم منقول — زبان و دیدهٔ گر گشت بینا

بمعقولات نیزم دسترس هست — اگرچه نیستم چون ابن سینا

ترا گر مال بسیار است شاید — رضینا قسمت الجبار فینا

قطعه ۲۴

الا ای دل اگر خواهی تماشاگاه علوی را — بسان قدسیان بر شو ببانگ گنبد مینا

نظر بگشای تا بینی جهانی جان همه شادان — ولیکن این کسی داند که دارد دیدهٔ بینا

در این بیدای بی‌پایان که شد عقل اندرو حیران — دلیلت عشق می‌باید نه علم بوعلی سینا

بکوش ای دل که سالک را نشاید یکدم آسودن — زهی دولت اگر باشی ز جمع جاهد و فینا

تو باری جهد خود میکن چه دانی حال چون باشد — کسی واقف نخواهد شد بر اسرار و لو شئنا

ردیف بای موحّده

قطعه ۱

ای دل جهان بکام تو گر نیست گو مباش — منت خدای را که جهان هست منقلب

در دور روزگار نه بر وفق رای تست — خود را مدار از پی این کار مضطرب

خوش باش اگرچه روز شود شب به ناخوشی — آخر نه شام را سحری هست در عقب

قطعه ۲

مه و مهر دلبر چو تابان شود — چه باک ار بود خصم با کین و تاب

چو رخشان کند رخ ز شرق آفتاب — زحل خواه گو تاب خواهی متاب

قطعه ۳

کسی کش به بند د بسختی فگند — سپهر جفا پیشهٔ منقلب

به داد ار باید پناهید و بس — نباید شدن در غمش مضطرب

که مخرج پدید آردش از مضیق — و یرزقه من حیث لا یحتسب

قطعه ۴

سائلی حال جهان را ز یکی کرد سوال — آن شنیدی که چه فرمود حکیمش بجواب

گفت دنیا و نعیمش چو بیابان و سراب | یا خیالیست که صاحب نظرش دید بخواب
خواب را مردمِ بیدار دل اصلا ندهند | نشود اہل خرد غره به تمویه سراب

قطعه ۵

دو مشفق اند طبیبُ ادیب بر سر تو | نگاه دار بعزّت دل طبیب و ادیب
بدرد خسته شوی. گر بنالد از تو ادیب | برنج بسته شوی گر برنجد از تو طبیب

قطعه ۶

در شهر خویش هر که مذلت همی کشد | گر غربت اختیار کند خوانمش غریب
اینت نه بس فضیلتِ غربت! که عاقلان | خوانند هر نفیس ترین چیز را غریب

قطعه ۷

اگر نیک اگر بد چه خواهد رسید | ز ایامِ عمر تو روزی بشب
به بین روز امّا صلاحِ تو چیست؟ | بغم به گذاری بشب باطرب

قطعه ۸

یکدو سیمین بر و یارے سه چهار یم بهم | خورده هر کس من پنج و ششے از بادهٔ ناب
هفتهٔ مجلسِ ما طعنه زن هشت بهشت | بود امروز تهی گشت صراحی ز شراب
اے تو در طاق نه او رنگِ ورا دائے گوہر | وقتِ ما را بمن و بادهٔ گلگوں دریاب

ردیف التاءُ

قطعه ۱

خدائیکه بُنیاد ہستیت داد | بروزِ الست اندر افگند خشت
گل پیکرت را چهل باِمداد | بدستِ خود از راه حکمت سرشت
قلم را بفرمود تا بر سرت | ہمه بود نیها بجا یک نوشت
نه زیبد که گوید ترا روزِ حشر | که این کار خوب است و آن کار زشت
ندارد طمع رستنِ شاخ عود | ہر آنکس که بیخ شتر غار کشت
چو از خطِ فرمانش بیروں نیند | چه اصحابِ مسجد چه اہلِ کنشت

خرد را شگفت آید از عدل او — که آن را دهد دوزخ این را بهشت

قطعه ۲

مرد آزاد در میان گرده — گرچه خوش خود عاقل و داناست

محترم آنگهی تواند بود — که از ینشان بمالش استغناست

وآنکه محتاج خلق شد خوار است — گرچه در علم بوعلی سیناست

قطعه ۳

قطرهٔ آبرو که داشت نهی — تا به اکنون بهیچ کس نفروخت

وین زمان شد چنانکه خاطر او — صدره از فکر مشتریش بسوخت

قطعه ۴

اُستاد کارخانهٔ فطرت بهیچ وقت — از بهر کس بنقش بقا جامهٔ نبافت

چون رستم زمانه بدستان گشاد دست — اسفندیار روئین تن از وی امان نیافت

افتاد در کشاکش ایّام چون کمان — آنکو به تیر فکرت خود موی می‌شگافت

از بهر در کشیدن آزادگان به بند — گردون ز خط ابیض و اسود کمند تافت

نالی نیافت عاقل ازین چرخ سفله طبع — تا چون تنور سینه ز سوز جگر نتافت

دنیا بجائیست مطلب کاهل است آنکه — با دشمنان نشست و رخ از دوستان بتافت

بگریز ازین جهان و غرورش که پیش ازین — عنقا نه برگزاف سوی آسمان شتافت

قطعه ۵

گر نوازد فلکت غرّه مشو از پی آنکه — که صعودی نبود کش که سقوطی ز پی است

گر بلندی دهدت بخت برو نیز مناز — کارتفاعی نبود کش نه هبوطی ز پی است

قطعه ۶

پادشاهی نزد اهل معرفت آزادگی است — هر که بند آرزو بگشاد از دل پادشاه است

گرد خاک آستان و کلبهٔ آزادگی — گر خرد دارد کسی چشم خرد را توتیا است

ده بمعنی بر که در صورت بهم مانند ولی — از یکی ریزد شکر وان یک ز بهر بوریا است

در صفا خواهی ره وحدت سپر زیرا که آب — زامتزاج خاک دارد گه گهی گوی صفا است

میرسد خواری ز آمیزش به مرغِ خانگی عزّتِ گر هست عنقا را ز بهرِ انزوا است

کنجِ عزلت گیر و دهقانی کن ای ابنِ یمین تا بدانی کانچه میکاریش در نشو و نما است

جستن گوگردِ احمر عمرِ ضائع کردن است روی بر خاکِ سیه آور که اکثر کیمیا است

قطعه ۷

ای پسر در ضبطِ آنچت هست جهدی می‌نمای تا ز هر چه آن نیست اندوهی نباید خوردنت

لیک گر ضبط از رهٔ امساک خواهی کردنش خونِ نامِ نیک خود این بس بود در گردنت

بشنو از من تا نمایم در معیشت راهِ راست سنتِ ابنِ یمین باید بجا آوردنت

از درِ افراط و ز تفریط بودن محترز بر طریقِ اعتدال آهنگ باید کردنت

قطعه ۸

بگفتار اگر در فشاند کسی خموشی به بسیار ازین خوشتر است

خردمند خامش بود چون صدف اگرچه درونش پر از گوهر است

قطعه ۹

صاحبا بنده را بخدمتِ تو سخنی عرضه هست خواهد داشت

مُهرِ مهرِ تو بر نگینِ دلش چند سال است تا زمانه نگاشت

هرگز از شیوهٔ وفاداری یک سرِ موی در طلب نگذاشت

بدگمانش که سر بدولتِ تو خواهدش خاک بر فلک افراشت

راستی صید امید داشت بتو خود کژ آمد هرانچه می‌پنداشت

چون ندید از تو هیچ تربیتی فکر بر حالِ روزگار گماشت

شد یقینش که همّتِ مخلوق نرساند بشامِ قوتِ چاشت

هر که داند که خالقی دارد کم ز مخلوق بایدش انگاشت

قطعه ۱۰

کردم ز میانِ همگان عزم کناری ثابت شده یکبار ز چیزی که حرام است

گفتند که اسرارِ نهان داشتنت چیست برگو که حلال است حرام است کدام است

گفتم که یکے ہست نہاں نزدِ من اسرار — واسرارِ نہاں داشتن آئینِ کرام است

قطعہ ۱۱

والاضیا یا توی آنکس که آفتاب — در پیشِ رائے انورت از ذرّہ کمتر است

الفاظ دلکشائے ترا نزدِ عاقلاں — اندر مذاقِ طوطیٔ جاں ذوقِ شکر است

دی قطعۂ بدستِ من افتاد ناگہاں — از گفتہائے تو که بلطف آبِ کوثر است

چوں نور یافت چشمِ رہے از سوادِ آں — دیدم که قطعہ نیست یکے بحرِ گوہر است

عمرت دراز باد که ملکِ سخنوری — طبعِ ترا بقوّتِ فکرت مسخّر است

قطعہ ۱۲

فرزندِ نورِ دیدۂ من آنکه در سخن — داند خرد که مرتبۂ مہتری تراست

خورشیدِ دُرِّ نظمِ تو درگوش میکشد — چوں آفتاب ملکِ سخن مشتری تراست

میدانِ نظم و نثر مرا بود پیش ازیں — پا نہ دریں بساط۔ کنوں سروری تراست

آنکس که از معانی و الفاظ واقف است — داند یقیں که مرتبۂ شاعری تراست

ابنِ یمین ترا چہ نظر میکند بمہر — محسود باش! قاعدۂ عنصری تراست

قطعہ ۱۳

تا توانی التماس از کس مکن — خاصہ از ناکس که آں عینِ خطا است

گر دہد۔ ماندی بزیرِ منّتش — ور ندادت۔ آبرویت را بکاست

گر کند نفست خطا ها صبر کن — زانکه عزّ صبر۔ به از ذلِّ خواست

قطعہ ۱۴

چیزیکه رفت۔ رفت۔ مکن یاد او دگر — زیرا که۔ تازه کردنِ غم کارِ عقل نیست

تا نقدِ روزگار ترا کم زیاں شود — بگذار۔ زانکه سود در او بارِ عقل نیست

نہ نہ عقالِ عقل بیفگن ز پائے دل — کا غیارِ غم کم است که او بارِ عقل نیست

مانند باغباں ہمہ بر گل کند نشاط — ہر دل۔ که خستگیٔ وے از خارِ عقل نیست

خوش روزگار ابنِ یمین! کش خدای داد — آزادگی۔ از آنکه گرفتارِ عقل نیست

قیمت کا بڑھاؤ

(Theory of Surplus Value)

(از ایم، ایم جوہر صاحب)

۷۵

"سرمایہ اور محنت" کے عنوان سے جوہر صاحب میرٹھی نے کارل مارکس کی مشہور تصنیف "سرمایہ" کے جن حصّوں کا ترجمہ کیا ہے یا دوسرے الفاظ میں مارکس کے مطالب کو اُردو زبان میں پیش کیا ہے اُن سے متعلق ایک مضمون (Theory of Surplus Value.) قیمت کا بڑھاؤ ہے۔ جو علمی طور پر بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ آئندہ نمبر میں ہم باقی مضامین "سرمایہ داری میں اصولی تضاد (Contradiction in Capitalism) اور "محنت سے قیمت کی پیدائش" (Labour Theory of Value) پیش کرینگے۔

سب جانتے ہیں کہ دُنیا میں جنس کے لین دین کا زور ہے۔ جنس بنانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں اوّل یہ کہ بنانے والا خود اپنے کام میں لانے کے لئے بنائے۔ دوسرا یہ کہ لین دین کے لئے بنائی جائے مثلاً کپڑا بُن کر ایک نے خود چادر بنالی دوسرے نے بیچ ڈالا پُرانے زمانے میں جنس بنانے والا خود استعمال کیلئے بناتا تھا اگر ضرورت سے بچ رہے اس کا تبادلہ کر لیتا تھا اس میں نفع نقصان کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ سرمایہ داری کی ابتدا اس وقت ہوئی جبکہ جنس کے لین دین کا چکر نفع کی غرض سے شروع ہوا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے لین دین کا مطلب ہمیشہ برابر کی قیمتوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ دس روپیہ کی قیمت کا تبادلہ اسی قیمت کی جنس سے ہوگا۔ جنس کی تبادلی قیمت کبھی اصل قیمت سے زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کم۔ لیکن اگر لمبا عرصہ لیا جائے اور تبادلی قیمت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کا حساب لگا کر اوسط لگایا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ تبادلی قیمت اصل قیمت پر آکر ٹھیرتی ہے۔

(۲) اگر تھوڑی دیر کیلئے سب طرف سے نظر ہٹا کر صرف یہ سوچیں کہ لین دین کیا شے پیدا کرتا ہے تو فوراً یہ معلوم ہو جائیگا کہ لین دین کو جاری رکھنے کے لئے ایسی جنس پسند کرنی پڑے گی جس سے دوسری جنسوں کی قیمت ناپیں۔ فرض کیجئے ناج پسند کیا۔ رام نے ایک من ناج میں بکری بیچدی جب کپڑے کی ضرورت ہوئی تو دھڑی بھر ناج کے بدلے میں ۴ گز کپڑا خرید لیا۔ یہاں ناج کا کام پیٹ بھرنا نہیں ہے بلکہ ناپنا ہے۔ پُرانے زمانہ میں اس غرض کیلئے کوڑیاں۔ تانبا۔ پیتل استعمال ہوتا تھا لیکن جوں جوں بیوپار بڑھا اور بڑی بڑی قیمتوں کی الٹ پھیر ہونے لگی۔ ناپ کے لئے قیمتی دھاتوں کی ضرورت ہونے لگی۔ سینکڑوں سال ہوئے سونا چاندی اس کام آنے لگے تھے وہ دستور اب تک جاری ہے۔ سونا سرمایہ داری کی زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔ اب سونے یا روپیہ کی طرف نظر کرنی چاہئے کہ وہ کیا کام آتا ہے۔

(۳) روپیہ سے دو کام لئے جاتے ہیں ایک پیمانے کا۔ اس سے ناپ کر جنس خریدتے ہیں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے اور جنس استعمال میں آجاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ روپے سے اس طرح لین دین کیا جاتا ہے کہ وہ بڑھ جاتا ہے دوسرے کام میں روپیہ خرچ نہیں ہوتا بلکہ لگتا ہے اور جب لین دین کے چکر سے نکلتا ہے تو زیادہ ہو کر نکلتا ہے۔ روپیہ جب ناپنے کے کام آتا ہے اس کا یہ چکر ہوتا ہے۔

جنس روپیہ جنس

یعنی ناج روپیہ کپڑا

کسان نے ناج پیدا کیا۔ بازار لے گیا۔ روپیہ میں قیمت ناپ لی اور بیچکر روپیہ گھر لے آیا۔ پھر کپڑے کی ضرورت ہوئی تو روپیہ لیا۔ کپڑے کی قیمت روپیہ سے ناپ لی۔ کپڑا خرید لیا۔ دھوتی کرتا بنایا۔ پہنا۔ پھاڑ دیا۔ اس چکر میں روپیہ پیمانے کے طریق پر استعمال ہوتا ہے۔

(۴) اب ایک اور چکر کو دیکھئے۔

روپیہ جنس روپیہ

روپیہ جنس سے بدلا اور جنس پھر روپیہ سے بدلی۔ جنس خریدی کہ پھر اس کو بیچیں گے۔ اگر جنس دس روپیہ میں خریدی اور اتنے ہی میں فروخت کر دی تو بیکار لین دین کے جھگڑے میں پڑے اس لئے جب تک کچھ زیادہ رقم چکر سے واپس نہ ہو۔ لین دین بیکار ہے۔ یہ "زیادتی" یا "بڑھاؤ" ہی روپیہ کو سرمایہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ "بڑھاؤ" کیسے پیدا ہوتا ہے اور سرمایہ داری کیلئے کیوں ضروری ہے۔ سرمایہ بہت سونے۔ چاندی کا نام نہیں بلکہ جب ان کو ایک خاص قسم کے چکر میں لایا جاتا ہے اسوقت یہ سرمایہ کہلاتے ہیں۔

(۵) اب ہمارے سامنے دو چکر ہیں۔

(الف) جنس روپیہ جنس

(ب) روپیہ جنس روپیہ

ان دونوں چکروں میں یکسانیت اور فرق کی کیا باتیں ہیں؟

یکسانیت:۔

۱۔ دونوں چکروں میں جنس بھی ہے اور روپیہ بھی ہے۔

۲۔ دونوں میں لین یعنی خریدنا اور دین یعنی بیچنا بھی ہے۔

۳۔ ان دونوں میں تین آدمی چکر بناتے ہیں۔

۴۔ ایک ہی وقت میں ایک آدمی خریدتا ہے اور بیچتا بھی ہے۔ (جب کوئی جنس بیچتا ہے تو وہ صرف بیچ ہی نہیں رہا بلکہ خرید بھی رہا ہے جنس بیچ رہا ہے اور روپیہ خرید رہا ہے۔

فرق :-

(۱) الف - چکر دین سے شروع ہوتا ہے اور لین پر ختم ہوتا ہے - ب - چکر لین سے شروع ہوتا ہے اور دین پر ختم ہوتا ہے -

(۲) الف چکر میں اگر بڑھاؤ نہ ہو تب بھی اس میں مقصد پورا ہوتا ہے - ب - چکر میں اگر بڑھاؤ نہ ہو تو مقصد پورا نہیں ہوتا -

(۳) الف چکر میں روپیہ صرف پیمانہ کا کام دیتا ہے اور ب چکر سرمایہ کا -

(۴) الف میں دوسری جنس چکر سے نکل کر خرچ ہو جاتی ہے ب چکر میں دوسرا روپیہ نئے چکر کا پہلا روپیہ ہو جاتا ہے -

(۵) الف چکر کا مقصد کھانا پہننا - خرچ کر دینا ہے -

ب کا مقصد روپیہ لگانا - اور بڑھانا ہے -

(۶) اب ہم ان باتوں کو تفصیل سے بیان کرینگے - اگر الف چکر سے روپیہ نکالدیں تو سیدھی بات رہ جاتی ہے - بجائے اسکے کہ جنس اوّل روپیہ میں بدلی جائے اور پھر روپیہ جنس میں بدلا جائے جنس جنس سے بدلی جا سکتی ہے بجائے اسکے کہ تین آدمیوں میں چکر پورا ہو اب دو میں ہو سکتا ہے - ناج کو براہِ راست کپڑے سے بدل لیا - اس میں ناج اور کپڑے کی قیمت برابر ہے لیکن مقصد بھی موجود ہے - ناج سے وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی جو کپڑے سے ہوتی ہے اب ب چکر پر غور کیجئے - اوّل روپے سے جنس خریدی پھر جنس سے روپیہ خریدا اگر جنس کو درمیان سے اُڑا دیں تو روپیہ سے روپیہ خریدا یعنی ۱۰ روپیہ سے ۱۰ روپیہ .... خریدے جو مہمل سی بات ہے - اس چکر میں کوئی مقصد نہیں رہتا جبتک کہ ۱۰ روپیہ کے بارہ روپیہ نہ ہو جائیں - کیونکہ یہاں چکر کا مقصد خرچ نہیں ہے بلکہ روپیہ لگانا ہے تاکہ رقم بڑھے - اس قسم کے سرمایہ کو تجارتی سرمایہ کہتے ہیں - سودی سرمایہ میں درمیان کی کڑی غائب ہو جاتی ہے - اور سرمایہ کا یہ خاص بھید کہ چکر سے بڑھتا ہے ظاہر ہو جاتا ہے - یعنی روپیہ = زیادہ روپیہ کے -

دُنیا میں روپیہ سے تین کام لئے جاتے ہیں اوّل قیمت کو کنجوس کی طرح محفوظ رکھنا دوسرا لین اور تیسرا دین چوتھی شکل ہونا ممکن نہیں - شاید یہ خیال پیدا ہو کہ روپیہ جنس بنانے کے کام آتا ہے یہ چوتھی شکل ہے - لیکن جنس کے بنانے میں بھی خرید فروخت کے سوا کچھ نہیں ہوتا - اگر کپڑا بنانا ہے - پہلے روئی پھر خرچہ - پھر مزدور کی محنت کرنے کی طاقت خریدنی ہوگی اسکے بعد کپڑا تیار ہو کر فروخت ہوگا - کسی جنس کے بنانے میں بھی خرید و فروخت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اب یہ سوچنا ہے کہ ان تین شکلوں میں کونسی شکل ہے جس میں ۱۰ روپیہ کے ۱۲ روپیہ ہو جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ قیمت اپنے آپ بڑھ جاتی ہے -

(۸) کنجوس کی طرح اگر دس روپیہ کو دبا کر رکھا جائے تو دس کے دس ہی رہیں گے - اب لین دین کی شکل دیکھئے - ظاہر ہے -

۷۷

جنس روپیہ جنس

کے چکر میں پہلی مرتبہ جنس فروخت ہوتی ہے دوسری مرتبہ خرید - اگر یہ قاعدہ رکھا جائے کہ بحیثیت بیچنے والے کے دو روپے زیادہ ملا کریں اور خریدنے والے کے گھٹا کریں تو ہر بیچنے والا کیونکہ خریدنے والا بھی ہوتا ہے اس لئے جو دو روپے اس کو بیچنے والے کی حیثیت سے ملیں گے خریدنے والے کی حیثیت سے نکل جائینگے - اور قیمت نہ گھٹے گی اور نہ بڑھے گی - اگر خریدنے والے کی حیثیت سے ملیں گے تب بھی نتیجہ یہی رہے گا - کیونکہ خریدنے والا بیچنے والا بھی بنے گا اب ایک اور شکل باقی رہ جاتی ہے کہ لین کے وقت کم قیمت دی جائے اور دین کے وقت زیادہ قیمت لی جائے - مثلاً موہن نے سوہن سے ناج خریدا اور احمد کو بیچ ڈالا فرض کیجئے کہ ان تین کے پاس ۲۰ + ۲۰ + ۲۰ روپیہ کے برابر قیمت ہے خواہ وہ روپیہ کی شکل میں خواہ جنس کی - فرض کیجیے کہ موہن نے کسی ترکیب سے ۱۰ روپیہ میں سوہن سے ۱۲ روپیہ کا مال خرید لیا اور احمد کو ۱۴ روپیہ میں فروخت کر دیا - موہن کو چھ روپے مل گئے - لیکن ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہو گیا - پہلے ۳ کے پاس ۶۰ روپے تھے - اب یہ دیکھنا ہے کہ اس لین دین سے ۶۰ کے ۱۶ روپیہ ہوئے یا نہیں - موہن کے پاس ۲۶ روپیہ سوہن کے پاس ۱۸ روپیہ اور احمد کے پاس ۱۶ روپیہ رہ گئے - لیکن جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ ۶۰ کے ۶۰ ہی رہے ۱۶ نہیں ہوئے صرف ان کی بانٹ میں فرق پڑ گیا - ایک کا پیسہ دوسرے کی جیب میں آ گیا لیکن بڑھاؤ نہیں ہوا - یہ بات صاف ہو گئی کہ لین دین سے قیمت پیدا نہیں ہوتی جو انفرادی حیثیت سے بڑھاؤ معلوم

ہوتا ہے درحقیقت بڑھاؤ نہیں ہوتا بلکہ بانٹ کا فرق ہوتا ہے۔ جب ہم اس بڑھاؤ کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ نہ کچھ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے
نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ دار جماعت صرف لین دین سے قیمت پیدا نہیں کر سکتی۔ لیکن دُنیا میں سوائے لین دین کے کچھ نہیں ہوتا تمام کاموں کی جان خریدنا اور بیچنا ہے
اس چکر سے باہر کوئی چیز نہیں جا سکتی تو کیا ہم اس بانٹ کے فرق ہی کو قیمت کا پیدا ہونا سمجھے ہوئے ہیں۔ لیکن مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیمت پیدا ہو رہی ہے
اس لئے ہو نہ ہو اسی لین دین کے چکر میں پیدا ہو رہی ہے۔ اب تین باتوں پر غور ضروری ہے۔

(۱) لین دین کا چکر سب کاروبار گھیرے ہوئے ہے۔ سماج اس چکر سے باہر نہیں جا سکتی۔

(۲) لین دین سے صرف بانٹ میں فرق ہوتا ہے قیمت نہیں بڑھتی۔

(۳) اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قیمت پیدا ہو رہی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ قیمت چکر میں پیدا بھی ہو رہی ہے اور نہیں بھی ہو رہی۔ (۹) اس گتھی کے سلجھانے کے لئے اوّل یہ سمجھ لینا چاہئے کہ روپیہ اور مزدوری کی حقیقت کیا ہے۔ ہر وہ جنس جس سے کسی زمانے میں جنسوں کی قیمت ناپی جائے یا جب سب جنسیں رسم و رواج کے مطابق اپنی قیمت کسی ایک خاص جنس میں بیان کرنے لگتی ہیں تو یہ جنس اس زمانے کا سکہ یا روپیہ ہو جاتی ہے ایک عرصہ کی اُلٹ پھیر کے بعد چاندی سونے نے یہ جگہ لے لی اب ہر جنس اپنی قیمت سونے چاندی میں بیان کرتی ہے۔

(۱۰) مزدور وہ ہے جو مزدوری کرنے کی طاقت کو بیچکر اُجرت سے روکھی سوکھی کھا کر پھر مزدوری کی طاقت پیدا کرتا ہے تاکہ پھر اس کو فروخت کرے اور اُجرت کمائے۔ مزدور محنت کرنے کی طاقت فروخت کرنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس خود کام کرنے اور روزی کمانے کا وسیلہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محنت فروخت نہیں کر سکتا۔

(۱۱) محنت اور محنت کرنے کی طاقت میں فرق ہے۔ محنت کرنے کی طاقت جب جنس میں نمودار ہوتی ہے تو محنت ہو جاتی ہے۔ مزدور اس وقت تک محنت فروخت نہیں کر سکتا جبتک کہ اسکے پاس اپنے اوزار، جنس بنانے کا سامان اور فروخت کے وسائل نہ ہوں۔ مزدور اس امر پر مجبور ہے کہ محنت کرنے کی طاقت فروخت کرے کارخانہ دار اس کی طاقت کام میں لاکر مزدور کی محنت فروخت کرتا ہے۔ ساری سرمایہ داری اس فرق کا نتیجہ ہے جس کا ذکر مفصّل طریق پر آگے کیا جائیگا۔

(۱۲) مزدور جب محنت کرنے کی طاقت کو بیچتا ہے دراصل وہ ایک وقت کیلئے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے۔ کیونکہ محنت کرنے کی طاقت مزدور سے جدا نہیں ہو سکتی اور وہ الگ کر کے اس کو بیچ نہیں سکتا مزدور کی اُجرت ہر ملک اور زمانہ میں جُدا جُدا ہوتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری میں مزدور کی قیمت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو مزدور کی مزدوری کی طاقت کو اور اس کی اولاد کو برقرار رکھے۔ اگر سرمایہ داری مزدور کی حالت اس سے بہتر کرنی بھی چاہے تو نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنی نوعیت نہ بدلے۔ اگر ہندوستان میں ایک مزدور ۴ر میں محنت کرنے کی طاقت برقرار رکھ سکتا ہے اور اولاد پال سکتا ہے تو اس کی قیمت ۴ر ہوگی۔ اگر کسی ملک میں ۸ر میں ضرورت پوری ہوتی ہے تو وہاں مزدور کی اُجرت ۸ر آنہ ہوگی۔ ۴ر میں مزدور ۴ گھنٹے بھی کام کر سکتا ہے اور ۸ گھنٹے بھی۔ مزدوری کرنے کی طاقت کی قیمت ۴ر ہے لیکن جب وہ کام کرتی ہے تو ۸ر پیدا کرتی ہے مزدوری کرنے کی طاقت اپنی قیمت سے زیادہ قیمت پیدا کرتی ہے اور یہی وہ بھید ہے جس کو کارخانہ دار خوب سمجھتا ہے۔ مزدور کی محنت کرنے کی طاقت ایک وقت میں دو کام کرتی ہے اوّل جنس میں نئی قیمت پیدا کرتی ہے اور دوسری جنس میں جو قیمت موجود ہے اس کو زندہ رکھتی ہے۔ جب ایک درزی کوٹ سیتا ہے تو کپڑے میں ایک نئی قیمت پیدا کرتا اور کپڑے اور مشین میں جو قیمت موجود ہے اس کو بھی زندہ کرتا ہے۔ اگر کپڑے اور مشین کو ۱۰ یا ۱۲ سال تک ڈالے رکھیں تو کپڑا گل جائیگا اور مشین بھی زنگ کھا جائے گی جو قوّتِ عمل ان دونوں چیزوں پر صرف ہوئی ہے وہ بیکار ہو جائے گی مزدور ایک ہی وقت میں دو کام کرتا ہے ایک نئی قیمت پیدا کرتا ہے دوسرے پُرانی قیمت کو زندہ رکھتا ہے۔

(۱۳) اب ذرا اس چکر پر غور کیجئے:۔

۷۸

روپیہ مزدور روپیہ

فرض کیجیے کہ ۶ گھنٹے میں وہ سب جنس پیدا ہو جاتی ہے جس کے استعمال سے جولاہا اپنی مزدوری کرنے کی طاقت ہر روز پیدا کر لیتا ہے یعنی روکھی سوکھی کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا۔ چھوٹا سا جھونپڑا۔ چارپائی۔ برتن بھانڈا۔ بیوی بچے وغیرہ۔

اگر ۶ گھنٹے کی پیداوار کی قیمت (۱۰ر) ہے اسکے یہ معنی ہوئے کہ جولاہے کے ۶ گھنٹے کی قیمت ۱۰ر ہوئی۔ فرض کیجیے کہ جولاہے کو ۵ روپیہ کی روئی کپڑا بننے کو دی۔ دو دن یعنی ۱۲ گھنٹے میں کپڑا بنا گیا جولاہے کی اُجرت ۱؍۴ر ہوئی۔ اگر روئی کی صفائی۔ دھنائی۔ کتائی۔ چرخے کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کے ۲ روپیہ لگائیں تو سب خرچ کا حساب حسب ذیل ہوا:۔

	روپیہ	آنہ	
روئی کی قیمت	۵	-	۰
متفرقات	۲	-	۰
مزدوری	۱	۴	۰
کل	۸	۴	۰

اگر ۴۰ گز کپڑا بنا گیا تو وہ ۸ روپیہ ۴ر کا ہوا جب یہ سب ہو لیا تو کارخانہ دار کو یہ معلوم ہوا کہ روپیہ بیکار چکر میں ڈالا کیونکہ بڑھا نہیں۔ جتنا لگایا تھا اتنے کا اتنا ہی رہا۔ مبتدی کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ ابھی سے قیمت کیسے بڑھ سکتی ہے جب فروخت ہوگا اس وقت زیادتی ہوگی لیکن جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے لین دین سے قیمت نہیں بڑھا کرتی صرف بانٹ میں فرق آتا ہے۔

(۱۴) معاشیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ برابر کی قیمتوں میں تبادلہ ہوتا ہے اگر اس اصول کو مٹا دیا جائے تو یہ علم ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کارخانہ دار اس اصول کو خوب سمجھتا ہے وہ اس اصول کو توڑے بغیر قیمت بڑھا لیتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے غور سے سُنئے۔

(۱۵) کارخانہ دار چالیس گز کپڑا بازار میں لے گیا۔ وہاں ۸ ۴ر مل گئے۔ خاموش گھر چلا آیا اور سوچنے لگا کہ کام نہیں بنا۔ برابر کی قیمتوں میں تبادلہ ہوتا ہے میری جنس ۸ ۴ر کی تھی وہی مجھے مل گئے اور ٹھیک ملے۔ اگر میں خود ۴۰ گز خریدوں تو ۸ روپیہ ۴ر کی چیز کے ۹ روپیہ نہیں دیتا۔ میں نے روئی چرخہ وغیرہ بھی تو برابر کی قیمت دیکر لیا ہے۔ مزدور کے کام کرنے کی طاقت کے بھی ۱۰ر دئے ہیں۔ اب کارخانہ دار کے دماغ میں ایک چال آئی کہ اگر جولاہے کو اس پر مجبور کیا جائے کہ ۶ گھنٹے کی بجائے ۱۲ گھنٹے کام کرے تو دو دن کا کام ایک دن میں ہو جائیگا جس میں ایک دن میں دو دن کی قیمت پیدا ہو جائے گی ایک دن کی مزدوری مجھے بچ جائے گی۔ کارخانہ دار یوں سوچنے لگا کہ ۱۰ر میں جولاہے کی محنت کرنے کی طاقت خریدی ہے اب جی چاہے میں اس کو ۶ گھنٹے استعمال کروں جی چاہے ۱۲ گھنٹے جولاہے کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے وہ ۱۰ر میں ۲۴ گھنٹے زندہ رہ سکتا ہے۔ میں نے اس کو ۲۴ گھنٹے زندہ رہنے کا سامان دیدیا۔ اب کیا اس سے بارہ گھنٹے بھی کام نہ لوں؟ میں لوں گا ۵ روپیہ کی روئی پہلے جولاہا دو دن میں بُنتا تھا۔ اب ایک دن میں بُنے گا اور دس آنے اُجرت دی جائیگی۔ اس ترکیب سے کپڑے میں ایک روپیہ چار آنہ کی قیمت صرف ۱۰ر میں پیدا ہوگی اب جب بازار میں ۴۰ گز کپڑا ۸ روپیہ ۴ر کو بکا ۱۰ر کارخانہ دار صاحب کو مل گئے۔ اس سے یہ اصول بھی نہیں ٹوٹا کہ برابر کی قیمتوں میں تبادلہ ہوتا ہے اور ۱۰ر بھی بچ گئے۔ محنت کرنے کی طاقت کی اصل قیمت تو دس آنے ہوئی۔ لیکن جب وہ خرچ ہوئی تو دُگنی قیمت پیدا کردی۔ دُنیا کے تمام منافع۔ کرائے۔ سود وغیرہ اس بڑھاؤ میں سے دئے جاتے ہیں جو دراصل مزدور سے چھینا جاتا ہے۔ جب کارخانہ دار سے جولاہا یہ کہتا ہے۔ میری مزدوری اس ترکیب سے کیوں مار لی؟" تو کارخانہ دار پلٹ کر جواب دیتا ہے "میں کیا زہر کھاؤں! کیا زندہ نہیں رہوں! تم یہ تو سوچو کس مشکل سے میں نے روپیہ جوڑا پھر کپڑے کے کام میں لگایا۔ اپنی گاڑھی کمائی خطرے میں ڈالی۔ اگر روپیہ نہ جوڑتا اور برابر خرچ کرتا رہتا تو کیا یہ کام ہو سکتا تھا؟ اور میاں جولاہے کیا تم کو یہ ۱۰ر مل سکتے تھے؟ کیا تم ہوا میں سے کپڑا بُن سکتے تھے؟ کیا میں نے تمہارے لئے کام مہیا نہیں کیا؟ میرے روپیہ کی بدولت تمہارے کام کرنے کی طاقت کام آ رہی ہے۔ دُنیا میں زیادہ تعداد

۷۹

تم جیسے آوارہ گردوں کی ہے۔ کیا میں ان کی روزی کیلئے سامان مہیا کر کے تمام سماج کو فائدہ نہیں پہنچا رہا۔ کیا ان خدمات کے بدلے میں مجھے کچھ بھی نہیں ملیگا۔"

(۱۶) کارخانہ دار کی باتیں سُن کر جولاہا لال پیلا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"میری طرف بھی تو دیکھو نہ کھانے کو نہ پہننے کو۔ دن بھر مرتا ہوں تو صرف اتنی اُجرت ملتی ہے کہ جولاہے کی حیثیت سے آپ کے کارخانوں کے لئے زندہ رہ سکوں اور اولاد پیدا کرتا رہوں تاکہ آپ کے مزدوروں کے ذخیرہ میں کمی نہ آئے اور سستے مزدور ملتے رہیں۔ میں آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ آپ مجھے چھ گھنٹے دیتے ہیں میں آپ کو چھ گھنٹے واپس کر دیتا ہوں یا یوں سمجھئے کہ آپ مجھے ۱۰ ر دیتے ہیں میں چھ گھنٹے میں آپ کی رقم جوں کی توں کپڑے کی شکل میں واپس کر دیتا ہوں۔ کیا ۱۰ ر کے بدلے میں میں نے روئی۔ چرخے وغیرہ کو کپڑے میں نہیں بدل دیا۔ آپ احسان کس پر جتاتے ہیں۔ آپ نے دس آنے خیرات نہیں دی ہے بلکہ کپڑے کی شکل میں وہ ۱۰ ر پورے پورے واپس لئے ہیں۔ کارخانہ دار صاحب آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے اگر کام نہ کرتا تو روئی وغیرہ کچھ عرصہ کے بعد بیکار ہو جاتی اور آپ کو نقصان ہوتا اس کو کپڑے میں بدلکر اس قابل کر دیا کہ وہ بک جائے۔ اُلٹا آپ ہمیں ڈانٹتے ہیں اگر آپ روپیہ جوڑتے ہیں تو اس کا بدلہ بھی پا لیتے ہیں روئی کو کپڑے میں تبدیل کر لیتے ہیں اور نیکی تو آپ اپنا اجر ہے۔ کیا یہ خیال آپ کے ذہن سے اُتر گیا یا یہ دل خوش کن باتیں صرف غریب کے ہی لئے ہیں یعنی یہ کہ آپ اپنا روپیہ خطرے میں ڈالتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے آپ اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ اپنی رقم خطرے میں ڈالیں۔ جب تک نفع کا پورا یقین نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک کام میں روپیہ نہیں لگاتے۔ اور اگر گھاٹ کی وجہ سے آپ کا دیوالہ نکل بھی جاتا ہے تب مجھے تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا آپ کے اور کارخانہ دار بھائیوں ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔ بلکہ جب نفع کم ہونا شروع ہوتا ہے تو آپ مجھ سے زیادہ وقت تک کام کراتے ہیں۔ مزدوری گھٹا دیتے ہیں ایک ماہ کی تنخواہ دو ماہ میں دیتے ہیں اور بسا اوقات اگر کام بالکل ہٹ ہو جائے تو مجھے ویسے ہی دھتکار دیتے ہیں ان باتوں سے مجھے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اور اس پر یہ ظلم ہے کہ آپ ہماری مزدوری چڑھائے رکھتے ہیں ایک طرح سے ہم غریب اُلٹا آپ کو قرض دیتے ہیں۔ آپ ہر ماہ کے آخر میں چٹھا بانٹتے ہیں اور اگر اس سے قبل دیوالا نکل گیا تو ہماری مزدوری بھنگ کے بھاڑے میں گئی۔ اگر آپ اپنا روپیہ خطرے میں ڈالتے ہیں تو ہم بھی اپنی مزدوری خطرے میں ڈالتے ہیں۔ تمہارے دیوالے سے تمہاری کلاس کو نقصان نہیں پہنچتا۔ میری مزدوری مارے جانے سے مجھے اور میری کلاس کو نقصان ہی نقصان ہے۔"

(۱۷) جولاہے کی اس تقریر سے کارخانہ دار صاحب کچھ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کیا میں نے کام نہیں کیا؟ کیا میں تمہارے کام کی دیکھ بھال نہیں کرتا رہا؟ کیا میرے کام کی کوئی قیمت نہیں؟

(۱۸) اس پر جولاہا جواب دیتا ہے۔ "اگر واقعی آپ کے کام سے قیمت پیدا ہوتی ہے تو وہ کپڑے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی وہ آپ کا حق ہے آپ اس کو لے لیجئے۔ ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ہماری مزدوری پوری پوری مل جانی چاہئے باقی آپ جانئے اور آپ کا کام جانے۔ اگر لاکھ روپیہ کی قیمت آپ نے پیدا کر دی ہے تو وہ جنس میں موجود ہوگی۔ آپ لیجائیے۔ ہمیں آپ کے مال پر نظر رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں ہونے دینگے کہ کوئی ہماری مزدوری کرنے کی طاقت مفت میں لے جائے۔ ہمیں دئے تو ۶ گھنٹے اور ہم سے لئے ۱۲ گھنٹے۔ یا دوسری طرح یوں سمجھئے کہ ہمیں ملیں ۱۰ ر آنے اور ہم سے واپس لئے جائیں ایک روپیہ چار آنے۔ کارخانہ دار صاحب جب آپ کو کوئی ۱۰۰ ر روپیہ کا نوٹ دیتا ہے تو آپ اس کو ۲۰۰ روپیہ نہیں پکڑا دیتے ۱۰۰ کے بدلے میں ۱۰۰ ہی دیتے ہیں ہزار نہیں دیدیتے۔ تو ہم سے ۱۰ ر کے بدلے میں ایک روپیہ چار آنے کیوں چاہتے ہیں۔

(۱۹) اب کارخانے دار صاحب جولاہے کو سمجھانے لگتے ہیں۔ "دیکھو بھائی! جب میں گیہوں خرید تا ہوں تو وہ جنس میری ہو جاتی ہے اس کو میں جس طرح جی چاہے استعمال کروں۔ جی چاہے پاؤ بھر کھاؤں۔ جی چاہے آدھا سیر کھاؤں۔ بنئے کو یہ حق نہیں رہتا کہ مجھ سے کہے پاؤ بھر ہی کھایا کرو۔ اسی طرح تمہارے کام کرنے کی طاقت کو میں خرید تا ہوں۔ تم کو اتنی مزدوری دیتا ہوں کہ تمہارے کام کرنے کی طاقت ۲۴ گھنٹے رہے۔ تو کیا اس کو ۱۲ گھنٹے بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ تمہارے کام کرنے کی طاقت پر اب میرا قبضہ ہے جس طرح جی چاہے اور جتنی دیر جی چاہے کام لوں گا تم کو اگر مگر کرنے کا حق نہیں۔"

(۲۰) جب سر سے پانی گذر جاتا ہے تو جولا ہے کو بھی تاب نہیں رہتی وہ جواب دیتا ہے "اجی حضرت! قبضہ کی اچھی سُنائی۔ ہم اتنے بیوقوف نہیں کہ آپ کی ان باتوں میں آجائینگے۔ پاؤ بھر ناج کے پیسے لیکر بنیہ آپ کو دُکان پر قبضہ کرنے نہیں دیگا۔ مجھسے یہ چاہتے ہو کہ ۶ گھنٹے یا ۱۰ ارمیں ساری کام کرنے کی طاقت پر آپ کا قبضہ ہونے دوں یہ کیوں! ۱۰ ارمیں بنیا آپ کو دس سیر گیہوں دیگا۔ جی چاہے اس کی روٹی بنائیے جی چاہے ستو بنا کر پی جائیے۔ اسی طرح ۱۰ ارمیں مجھ سے ۶ گھنٹہ کی محنت لے لو اس میں جی چاہے روئی کتوالو جی چاہے کپڑا بنوالو۔ ۵ روپیہ میں آٹھ دن کام کرنے کی طاقت دے سکتا ہوں۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ دن رات کام کروں گا۔ ۶ گھنٹے روز کام کروں گا اگر ۲۴ گھنٹے کیا تو میری ساری کام کرنے کی طاقت ختم ہو جائیگی اور میں مرجاؤں گا۔ ہاں ایسے کرلو کہ حساب سے یہ معلوم کرلیں کہ میری کلاس کے کام کرنے کی اوسط عمر کیا ہے۔ اگر ۲۰ برس بھی رکھو تو ۱۰ ار کے حساب سے مجھے ۲۰ برس کے دام دیدو پھر تمہارا قبضہ میری تمام کام کرنے کی طاقت پر ہو جائیگا۔ اس وقت تمہیں حق ہوگا کہ جی چاہے مجھے آٹھ دن میں مار دو۔ جی چاہے زیادہ دن میں لیکن اس انصاف میں تو تمہیں نقصان معلوم ہوتا ہے۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ ہفتے بھر کی اُجرت میں میری ساری طاقت پر ڈاکہ مارو مجھے یاد ہے تم مجھے غلام بنایا کرتے تھے۔ جب میری غلامی تم کو مہنگی پڑنے لگی تو تم نے مجھ کو آزاد کر دیا۔ لیکن یہ جتاتے رہے کہ تمہارے دل میں رحم آیا اس لئے مجھے غلامی سے نجات دیدی۔

رحم کی سُنو۔ جب غلامی سے چھوڑا تو بیگار لینے لگے۔ صدیوں تک میں نے بیگار دی ہے۔ چار دن اپنے لئے کام کرتا تھا تو چار دن تمہارے لئے جب یہ بھی تم کو مہنگا پڑا تو بالکل ہی دھتکار دیا۔ پہلے کھانے کا تو سہارا تھا لیکن اب تمہاری طمع اتنی بڑھی کہ وہ کھانا بھی ناگوار گزرنے لگا اور بالکل ہی آزاد کر دیا یعنی قلاش کر کے سڑک پر چھوڑ دیا کہ جاؤ کماؤ کھاؤ لیکن دل میں ہنستے رہے کہ کھائے گا کہاں سے کھانے کمانے کی اشیا پر تو ہمارا قبضہ ہے جھک مار یگا اور ہمارے پاس آئے گا پھر اس کو سستے دام میں خرید ینگے ایک پیسہ دینگے تو دس پیسے کا کام لیں گے جو جنس یعنی کام کرنے کی طاقت میں نے تم کو بیچی ہے وہ اور جنسوں کی طرح نہیں۔ میری جنس میں ایک خاص بات ہے کہ اس کا استعمال قیمت پیدا کرتا ہے اور اپنی قیمت سے زیادہ قیمت پیدا کرتا ہے جو چیز تم کو سرمایہ کا قدرتی بڑھاؤ معلوم ہوتا ہے وہ مجھے اپنی طاقت کا بیجا خرچ معلوم ہوتا ہے میری زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں اپنی طاقت کو برقرار رکھوں ہر روز اس کو پیدا کرسکوں اور فروخت کرسکوں تم ہمیشہ میرے سامنے کفایت کفایت کے راگ گایا کرتے ہو میں کفایت والا ہی مزدور ہوں میری کام کرنے کی طاقت ہی میرا سرمایہ ہے اس لئے میں اسی میں کفایت سے کام لیتا ہوں ہر روز میں اتنی ہی طاقت صرف کرتا ہوں جس سے وہ طاقت نہ صرف بنی رہے بلکہ اور زیادہ ہو جس طرح آپ کام میں صرف اتنا ہی روپیہ لگاتے ہیں جس کی ضرورت ہو اور جو زیادہ سے زیادہ فی صدی نفع دے اگر آپ میرے لئے چھ گھنٹے کے بجائے ۱۸ گھنٹے کا دن کر دینگے۔ تو ایک دن میں میری اتنی طاقت صرف ہو جائیگی کہ شاید تین دن میں بھی مشکل سے پیدا کرسکوں اس لئے جو آپ کا فائدہ ہے وہ میرا نقصان ہے میری طاقت کو فائدہ سے استعمال کرنا اور اس کو مفت کا مال سمجھ کر لوٹ مچانا دو مختلف باتیں ہیں۔ اگر میرے ایک مزدور بھائی کی کامی زندگی کی اوسط ۲۰ سال ہے اور اس کی ہر روز کی اُجرت ۱۰ ار ہے تو ۲۰ سال کی مزدوری ہوئی۔

۱۰×۳۶۵×۲۰ = ۷۳۰۰۰ آنے۔

اگر تم میرے مزدور بھائی کی طاقت ۱۲ گھنٹے کام کرا کے ۱۰ برس میں صرف کر دیتے ہو اسکے یہ معنی ہوئے کہ اس کو صرف ۱۰×۳۶۵×۱۰ = ۳۶۵۰۰ آنے ملے یعنی ۳۶۵۰۰ آنے آپ ہڑپ کر گئے۔ دوسرے الفاظ میں آپ نے میرے بھائی کو ایک دن کی مزدوری دیکر اسکے دو دن ہضم کر لئے۔ اب آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہدیں کہ کیا ہمارا تمہارا یہ معاہدہ تھا کہ ایک دن کی مزدوری دیکر دو دن کام لیا کرو گے میں یہ نہیں کہتا کہ ایک آدمی کو دس برس میں مار دینا انسانیت سے دور ہے معاملات میں جذبات کو دخل دینا حماقت ہے۔ میں آپ سے رحم کی درخواست نہیں کرتا بلکہ معاملہ کی بات کرتا ہوں ایک دو تو ایک لو۔ ایک دیکر دو نہیں لے سکتے۔ ۶ گھنٹے دیکر ۱۲ گھنٹے نہیں لے سکتے۔ اگر آپ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس سے زیادہ حق پر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی توپ تلوار پر گھمنڈ ہے تو ہم کو بھی اپنی تعداد پر غرور ہے۔

گڈریہ اور شہزادی

"اے حسین شہزادی! آ — کہ میں تجھ کو اپنے دل کی ملکہ بنانے کی آرزو، اس وقت سے اس دل افسردہ میں بسائے ہوئے ہوں جبکہ تو ان تمناؤں کو سمجھنے سے بھی قاصر تھی۔ آہ! تجھے کیا معلوم کہ میں نے کتنی تنہا راتیں۔ ایک پوشیدہ مگر بیتاب آرزو کو دل میں لئے ہوئے بسر کر دی ہیں"۔

ہاں!" مگر تیرا بھی کیا قصور، تو الھڑ تھی، نادان تھی، مگر اب، کہ تیرا شباب حُسن کی تمام رعنائیوں کیساتھ بیدار ہو چکا ہے، اُٹھ۔ اور اس سے قبل کہ دُنیا تجھ کو بیوفائی کا الزام لگائے۔ میرے دل کو مسرور کر دے"۔

آ — اے نازک شہزادی! آ — کہ "وہ تمام مسرتیں۔ جو یہ پہاڑیاں۔ وادیاں اور خوبصورت میدان اپنے اندر جذب کئے ہوئے اور چھپائے ہوئے ہیں۔ تیرے پیارے قدموں اور انداز خرام پر نثار ہونے کیلئے نہ صرف تیار بلکہ بیتاب ہیں"۔

آ — اے فتنہ ساماں ملکہ! آ — کہ ہم پہاڑ کی سب سے اونچی اور بلند چوٹی پر بیٹھ کر اس وسیع سلطنت کی خوبصورتی کا جو تیرے موجود ہونے سے اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔ اندازہ کر سکیں...... ...... تیری خوبصورت اور پیاری آنکھیں جوانی کے نشہ میں سرشار اور نیند میں متوالی ہو رہی ہیں۔

آ — کہ میں تیرے واسطے پھولوں کا نرم۔ اور گدگدا بستر تیار کر چکا ہوں۔ جنگل کے تمام پرند تجھ کو میٹھی لوریاں دینے اور نغمہ ہائے دلکش سُنانے کے لئے منتظر ہیں۔

- -

اُس وقت جبکہ ستارۂ صبح خورشید خاور کو حسرت سے خیرباد کہہ رہا ہوگا اور تو چشمہ کے کنارے غسل سے فارغ ہو کر اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو سُلجھا رہی ہوگی۔ میں تیرے لئے زرّیں پھولوں کا تاج ہاتھ میں لئے تیار رہوں گا۔ اور میری بھیڑوں کی اون سے بنا ہوا لباس تیرے نازک جسم کی زینت کے لئے موجود ہوگا۔

اس سے قبل کہ تو پامالی صبر و سکون کیلئے قطعاً تیار ہو چکی ہو ....

جنگل کے تمام خوش ذائقہ پھل جو دیوتاؤں کی غذا ہیں۔ شاہِ بلوط کے درخت کے سایہ میں۔ صندلی میز پر آراستہ ہوں گے اور تمام گڈریئے اپنی اپنی بانسریاں لئے تیرے صرف ایک اشارے کے منتظر......... آ — اور میرے دل میں اسی طرح بس جا! جیسے خوشبو گلوں میں نہاں اور پوشیدہ رہ کر بھی ایک عالم کو محوِ تمنّا کئے رکھتی ہے ....

(ترجمہ)

تاج زبیری

غازی مصطفیٰ کمال اتاترک

ترکی کا مصلح، مفکّر، مُدبّر اور قائد

(از قاضی بدر الحسن صاحب بدرؔ جلالی بی اے (علیگ) مدیر روزنامہ وکیل لکھنؤ)

اگر کامیابی و کامرانی، شکستوں اور مایوسیوں کی اندھیاریوں میں ہی چمکتی ہے اور یہ آفتابِ رحمت قہرمانی قوانین کے گھرے گھرے سیاہ بادلوں ہی میں سے طلوع ہوتا ہے تو دورِ جدید میں ترکی عثمانیہ کی جدید کروٹ نے اس صداقت پر مُہر دائمی ثبت کردی ہے اور ربانی وعدے کو سچ کر دکھایا ہے۔

سلطنت عثمانیہ

سلیم دویم کے قتل، یورپ میں نیپولین کے دور اور روس میں اسکندر زار روس کی کامیابیوں نے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی سلطنت عثمانیہ کی رگوں میں زوال کا زہر دوڑا دیا، دونوں جانب سلاطین عثمانیہ کے دو قوی دشمن پیدا ہو گئے یعنی داخلی طور پر سلاطین کی خود غرضی اور قدامت پسندی، درویشوں اور ملّاؤں کا ذہنی استبداد، عیسوی اور یہودی آبادی کی سازشیں، خارجی طور پر عربوں کی بغاوت نما خواہش آزادی، دول مغربی کی ریشہ دوانیاں اور مداخلت سیاسی وملکی نے سلطنت عثمانیہ کو ہزاروں بیماریوں کا شکار بنا دیا جس نے نصف صدی کے اندر اس کی ہڈیوں کو گلا چھوڑا اور اب آلِ طغرل و خانوادۂ عثمان کی تاجداری کانٹوں کا ایک بستر بن گئی جس پر مریضِ ترکی انتہائی کرب و بے چینی کے ساتھ آخری سانس کے انتظار میں کروٹیں بدل رہا تھا، ادھر یورپ اپنی نئی دُنیا کے خنگِ جہاں پیما پر سوار خدا کی زمین روند رہا تھا۔ اس طرف محمد فاتح کی تلوار جہاں ستاں کو جمود کا مورچہ کھا رہا تھا، اگر کچھ سانس تندرستی اور صحت کے کبھی آتے اور کوئی تحریکِ اصلاحی شروع ہوتی تو داخلی سازشیں اور خارجی ریشہ دوانیاں انکو بیکار کردیتیں، اگرچہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے ترکوں کے اندر جمہوریت و آئینیت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے کیونکہ یہی زمانہ فرانس کے انقلاب، روس کے عروج اور بلقانی ممالک کے خروج کا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ تاجداری اتراک کو ان سے تقویت پہنچتی اور مریض ترکی کے بڑھتے ہوئے آزار میں کچھ کمی ہوتی اور اغیار کی دست درازیوں کیلئے راستے کھل گئے یہاں تک کہ ۱۸۳۰ء یونان وغیرہ کی بغاوت کے بعد یورپ کے سرسبز مقبوضات، افریقہ کی نوآبادیات، اور ریاستہائے باجگذار، ایشیائے کوچک کے عربی اور ارمنی صوبجات میں سازشوں کو زور ہوتا رہا، روس، برطانیہ اور فرانس اپنے بیہودہ کارندوں کے ذریعہ زوال کا زہر پہنچانے میں معین و ممد ثابت ہوتے رہے۔ سلطان عبد الحمید ثانی کی تخت نشینی کے بعد ہی روس کی فوجیں سینٹ اسٹفانو پر نظر آئیں۔ اور دو سال کی کشمکش کے بعد برلن کی کانگریس نے یورپین ترکی کی عظمت خاک میں ملا دی ٹھیک دو سال کے بعد سالونیکا میں مصطفےٰ کمال نے اس گیتیٔ انقلاب آرا میں قدم رکھا اور زوال ترکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُنیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں بالآخر ترکی کا خوف، وقار اور عظمت کا آسمان بھی زمین بوس ہو گیا

اوراب یورپ کا ہر مغرور زبان دراز اس قدیم شاہی کو مردِ بیمار کے نام سے پکارنے لگا۔ وائنا اور برلن کے صلح ناموں سے لیکر آخری صلحنامۂ سیورے تک ہزاروں مرتبہ یورپ کے گیدڑوں نے اس مردِ بیمار کی ہڈیوں کو آپس میں تقسیم کیا اور بالا بالا ان حصّے بخروں کا سودا کرتے رہے صلح سیورے نے سلاطین عثمانیہ کا آخری سانس بھی گھونٹ دیا۔ اوراب سلطنت ہی نہیں بلکہ قوم ترکیہ بھی صفحۂ ہستی پر ایک ڈوبتے ہوئے تارے کی طرح دھندلی اور معدوم نظر آنے لگی۔ سیواس اور ارض روم کی کانگریسوں میں آلِ عثمان کی یادگار جلالت کو دفن کر دیا گیا۔

آثارِ زوال کے دیکھنے والے

غازی ادھم پاشا، اور غازی عثمان پاشا شیر پلونا کی آخری افق تابی کے بعد کچھ اور ستارے دائرہ غروب پر پیدا ہوئے جنہوں نے مردِ بیمار کی موت کے آثار کو بالکل نمایاں دیکھا اور زندگی کے لئے سچی تڑپ کا ثبوت پیش کیا، البانیہ سے لیکر استامبول تک، استامبول سے قونیہ، حلب، موصل اور بغداد تک اصلاحات کی ایک رو شروع ہوئی اور انور و طلعت شوکت و جمال، نیازی و کمال جیسے سبع سیارگان تھے کہ جنہوں نے طالع نحس کی تقویم پارینہ کو بدل دینا چاہا لیکن وہی داخلی و خارجی تباہ کن طبقے ان کی راہ میں بھی حائل رہے اور یہ سب محیر العقول کارنامے دکھا کر فطرتِ زمانہ سے مغلوب ہو کر نابود ہو گئے، اور جنگِ عظیم کا سیلاب ان آخری بہاروں کو بہا کر لے گیا، ایک ہستی انہیں ٹمٹماتے تاروں میں سب سے زیادہ تیز نظر، عاقبت اندیش اور مستقبل کی آئینہ دار تھی اور جو اسی دھندلے افق پر آفتابِ تاباں بنکر نمودار ہونے والی تھی، شیخ علی رضا مقدونیہ کے ایک قریہ کا رہنے والا چنگی کا معمولی افسر اپنے ایک شریر اکلوتے بچے سے بہت نالاں تھا، مذہبی تعلیم و تربیت سے بیگانگی غریب ماں کے کلیجے پر آری کی طرح چلتی لیکن مُناستر کا خون سلونیکا کی گلیوں کے اندر ایک ایسا ہیولا طیار کر رہا تھا جو دُنیا کے نظامِ عسکریت کا اُستادِ اوّل اصلاح قومی کا پیغامبر، ارتقائے ذہنی کا آفتاب کمال اور تدبر و سیاست کا شاطر ہوشدار بننے والا تھا، فوجی کتب کا شوق تاریخ و ریاضی کا ذوق۔ انقلابی ادبیات کا جنون، پیغامبرانِ انقلاب کے سوانح کا چسکا اور حالات قومی پر نگاہ عمیق ڈالنے کا عادی مصطفےٰ اپنے باپ اور ماں کی متضاد اور اُلجھی ہوئی آرزوؤں کے درمیان حیات ملکی کی گرہوں کو سلجھانے میں مشغول تھا، انقلابات عالم میں وہ تیز قدم اُٹھا رہا تھا اور خود انقلاب ترکی اس کی سچی رہنمائی کر رہا تھا، یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء کی ابتدائی بہار میں یہی وہ شخص تھا جس نے جرمنی اور اس کے حلفاء کی فوجی کمزوری اور یقینی شکست کی پیشگوئی کی اور طلعت وزارت کے فیصلے کے خلاف قفقازی مہم کی بے ہنگامی پر صدائے احتجاج بلند کی اور قوم کی آنکھیں کھولیں، عراق اور شام کے اندر جرمنی کے فوجی قائدوں کی ناکامی کا اشتہار کیا اور محاذ فرانس کی شکست کا دس ماہ پہلے اعلان کر دیا۔ دُنیا آجتک اس مردِ ژرف نگاہ کے لفظوں کو یاد کرتی ہے۔

عارضی صلح کے بعد ۱۹۱۹ء میں آیہ صوفیہ کا ہلال دُھندلا پڑ گیا یورپ میں خدائے اسلام کا نام جرم اور عربی ممالک میں ترکوں کی یاد بھی ایک فسق قومی بن گئی۔ مصر، فلسطین، حجاز و یمن، الحساء، شام، عراق، بصرہ، مقدونیہ، رومیلیہ، قسطنطنیہ، سمرنا و ازمیر، قونیہ، قبرص جو سجائے خود وسیع رقبے والے صوبے تھے، ترکی عثمانیہ کی خاکستر کی اُڑی ہوئی چنگاریاں بن چکے تھے جو کبھی لوٹ کر نہیں آتی ہیں، کوہ طارس اور اس کی ویران گھاٹیاں، بحیرۂ اسود کے غیر آباد سواحل، ایرانی سرحد کے سرکش کُردی، نہر سکاریہ کے کچھ اُجڑے باغات باقی رہ گئے تھے جو آل عثمان کی عظمتوں اور جلالتوں پر ماتم کر رہے تھے اور ایک راندۂ درگاہ یورپ، باغی قسطنطنیہ، محروم رفاقت و مہجور ملت انہی تاریک گھاٹیوں میں انقرہ کی کچی دیواروں کے نیچے ٹوٹی پھوٹی توپیں لئے ہوئے ہے۔ چان کیہ کے غیر معروف گاؤں میں جہاں اس کا آمرانہ محل تعمیر ہو چکا ہے۔ یونانی بھیڑیوں کی یلغار کو دیکھ رہا تھا جو دشمنِ اسلام برطانیہ کی آسماں سوز توپوں کے سایہ میں اناطولیہ کے گوشت و پوست کو چبا جانے کے لئے ہو رہی تھی، انقرہ کی شمالی پہاڑی کے ایک بلند ٹیلے پر دیہاتی پلنگ بچھا ہوا ہے، چند زخمی، افسردہ سپاہی جو فوجی اسٹاف کے رکن ہیں ایک اُبھرتے ہوئے آفتاب کے گرد جمع ہیں جس کے چہرے کی زرد رنگت، نیلی آنکھوں کی تیز روشنی کے عکس سے مایوس دلوں میں ایک عزم پیدا کر رہی ہے۔ شامی مہم کی بچی کھچی کور

جبکہ اندر کل ۴ ہزار جانباز ہیں وادیوں کے نشیبی دامن میں مصروف آرام ہے، صبح کا آفتاب سنہری کرنوں کے ساتھ اس آفتاب اناطولیہ کے پشت و شانہ کو گرمار ہا ہے اور وہ استامبول کی طرف رُخ کئے ہوئے ایک چھوٹی دوربین سے ولایت ازمیر کے میدانوں کو دیکھ رہا ہے . . . دفعۃً وہ پکارتا ہے ۔

" ہاں اس آگ کی بجھی ہوئی راکھ میں ترکوں کی حیات تازہ کا مقام مضمر ہے اور ہاں اسی راکھ سے میں عظمت و جلالتِ اسلام کا یادگار اور حیرت انگیز ایوان سنگین بناؤں گا " یونانی درندے ازمیر کے دیہات جلا رہے تھے اور پریشان ہوا کے جھونکوں میں مظلوم ترکوں کے خونِ ناحق کی چراند آرہی تھی ۔

۱۹۱۹ء کی لہکتی ہوئی بہار میں اتحادیوں کے جشن قسطنطنیہ میں منائے جا رہے تھے ۔ جنرل ہیر گنگٹن مقتول و مقہور زارِ روس کی نعش بیکفن پر قبضۂ قسطنطنیہ کا قصیدۂ یادگار پڑھ رہے تھے اور زارِ روس کی حسرتوں کا ماتم اس طرح منایا جا رہا تھا کہ سلاطین عثمانیہ کے پُر جلال تاج کے درخشاں موتی امریکی ایکٹرسوں کی کرتیوں کی زینت بنا دئے گئے تھے ۔ ایسے میں اگر خود دار ترکوں کی خون بھری آنکھوں کو سمجھا تو مصطفےٰ کمال سمجھا اور اس نے اناطولیہ کے محدود رقبے میں نہ صرف چند پریشان حال غازیوں کو جمع کیا بلکہ اس نے دو کروڑ نفوس کی پست اور شکست خوردہ قوم کو ایک مقصدِ عظیم بتایا، آزادیٔ وطن کا سبق پڑھایا اور جمہوریت کی مضبوط بُنیادیں اسی شاہ پسند قوم کے ہاتھوں سے رکھوائیں ۔ اور پہلی مرتبہ ترکی میں صحیح لائحہ عمل رکھنے والی جمہوری جماعت کی بنا ڈالدی جس نے اناطولیہ، مقدونیہ اور روسلیہ کی حفاظت و صیانت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا " زمانے نے یہ بتادیا کہ انقرہ کی شمالی پہاڑی پر جو کچھ اس بیکس و شکست آزمودہ جنرل نے کہا تھا کر دکھایا اور آج یہی جماعت جمہوری " جماعت خلق " کے نام سے ترکیہ کمال کی پارلیمنٹ ہے اور مجلس کبیر ملیہ کہلاتی ہے ۔

مصطفےٰ کمال کی اس دیدہ دلیری کی داد دینا ہی پڑتی ہے جب وہ فرانسیسی اور برطانوی قابضین قسطنطنیہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سلطانی فرمان کے ساتھ اناطولیہ میں آیا اور علمِ بغاوت بلند کیا تھا ان مشکلات اور دشواریوں کا افسانہ آپ خالدہ ادیب خانم کی زبان سے سنیں جو مصطفےٰ کمال کو اس آخری مگر کامیاب تنظیم میں پیش آئیں " ابتلائے ترکیہ " نامی کتاب میں یقیناً مُردہ قوم کی اس زندہ خاتون نے نشاطِ ثانیہ ترکیہ کی روح پرور داستان پیش کی ہے، اس طبقۂ عالی ہمت کی صفِ اوّل میں رکھا ہے جو ہنی بال، قیصر، وغیرہ سے شروع ہو کر نپولین اور کچنر تک آتا ہے، لیکن دُنیا جانتی ہے کہ ان ارواحِ عظیمہ کے اندر کوئی بلند نظر ایسا نہیں گذرا جسنے اپنے کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہو اور اپنی زندگی ہی میں اپنی جدوجہد کا خوش ترین انجام دیکھا ہو بجز ایک غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کے "

اتحادی افواج جو قسطنطنیہ پر اور تمام سواحل ترکی پر قابض تھیں خود سلطان اور شیخ الاسلام کے ہاتھوں اس غازی سرفروش کو باغی اور سرکش کہتے ہیں اور ترکی قانون کی حفاظت سے خارج کردیتے ہیں، لیکن بڑھتی ہوئی ہمتیں ان رُکاوٹوں کو کب دھیان میں لاتی ہیں ۔ جمہوری رو ہر ترک کے سینے میں دوڑ رہی تھی اور غازی کے جھنڈے کے نیچے ہر ترک بچہ خنجر بکف جمع ہو رہا تھا، یہاں اتحادیوں نے ایک اور قربانی کا بکرا ڈھونڈا اور یونان کو اناطولیہ کی سرزمین پر لہکا دیا، پریشان ترک کی پریشان صفیں اتحادیوں کی اس حرکت کا جواب بجز ایک خونی جنگ کے کیا دیتیں ۔ یونانیوں نے بیکس ترکوں پر جو مظالم کئے وہ برطانوی کمینہ پروری اور انتقامی سرشت کی ایک گھنونی تاریخ مرتب کر چکے ہیں، یہ جنگ ظالمانہ اس قدر درشتی اور بہیمیت کے ساتھ لڑی گئی کہ ولایت سمرنا کے . . . گاؤں ایک رات اور ایک دن میں راکھ کا ڈھیر کردئے گئے تھے خود مصطفےٰ کمال کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ چاروں طرف بجلی کی طرح دوڑ رہا تھا اور ترکی افواج کے بچے کچے کالموں کو ایک جگہ کر رہا تھا ۔ اسی تگ و دو میں وہ ایسے ایسے مقامات پر گیا جہاں گولوں اور گولیوں کا مینہ برستا تھا اور وہ نہتے اور مجبور دیہاتی ترکوں کے دلوں میں استقلال اور ہمت کی آگ بھر دیتا تھا، انہی محاربات میں ایک موقعہ پر اس کا ہاتھ گولی سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بخار وورد میں مبتلا رہتا ہے لیکن دریائے سکاریہ پر اگست ۱۹۲۱ء کو وہ ایک زبردست شکست یونانیوں کو دیتا ہے اور ۱۳ ماہ کے عرصہ میں ان کم شکستہ گیدڑوں کو سمندر پار بھگا دیتا ہے اور اس کی فاتح فوجیں تھریس کے میدان میں اُتر جاتی ہیں ۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکوں کا ستارۂ اقبال پھر چمکتا ہے اور یہیں سے مصطفےٰ کمال کا وہ دور

شروع ہوتا ہے جو اس عجیب شخصیت کو دُنیا کی مشہور ترین شخصیتوں کے
مقابلے میں نمایاں و ممتاز کر گیا ۔

" آزادی حاصل کر لینا آسان ہے لیکن اس کو برقرار رکھنا بہت
مشکل" اور یہی آخری مشکل تھی جس کے گہرے گہرے ڈراونے بادلوں
میں کمالی ذہانت اور معاملہ فہمی کا آفتاب چمکا اور ساری ایشیا کو روشن
کر گیا، انقلابی سیلاب میں اصلاح و دوام کی کشتی تیرا کر لیجانا غیر معمولی ذہانت
ہمت اور استقلال رکھنے والے ناخدا کا کام ہے لیکن مصطفےٰ کمال
نے یہ دکھا دیا کہ وہ اس اہم ترین خدمت مخلوق کے لیئے خلق کیا گیا تھا
اور وہ کامیاب و بامراد ثابت ہوا ۔

چان کیہ کے گاؤں میں طارس کی ایک سلامی دار گھاٹی میں مصطفےٰ
کا وہ گھروندا بنا ہوا ہے جو وِلا کہلایا جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں
اُس نے یونانی اقدام کے وقت پُر ہیبت و جلال لفظ کہے تھے۔ اور
جب ۵ برس کے عرصہ میں وہ اپنی قوم کو جگا چکا اور انقلاب تعمیری کی سخت
منزلوں سے بھی سلامت گذار چکا تو ایک صبح کی سُرخ روشنی میں جب آفتاب
پھر اسکے بھورے کوٹ پر اپنی شعاعوں کو نثار کر رہا تھا تو اس نے اسی
آسمانی بشارت کی روشنی میں جو ایسے محیّر العقول انسانوں کے سروں پر سایہ
فگن رہتی ہے ان الفاظ میں ہدیۂ شکر پیش کیا :-

" میں نے تمام قوموں کو پرکھا ہے، میں نے ان کا میدانِ جنگ
میں مطالعہ کیا ہے ۔ آگ اور گرم لوہے کی بارش میں ان کو جانچا ہے،
موت اور بربادی کے سیلاب میں ان کو آزمایا ہے، اور انہی منزلوں میں ہر
انسان اور انسانی اجتماع کے کردار کا طلسم کھلتا ہے، لیکن اے قوم
ترک میں قسم کھاتا ہوں کہ بلندیٔ روح میں تیرا منصب بہت عالی ہے اور
اس منصب پر تو سب سے زیادہ روشن اور تاباں ہے، قوم ! میں تجھ کو اس
منزل تک لیجانا چاہتا ہوں جہاں تیرے قدموں کے نیچے زمین مضبوط،
وفادار اور قابلِ اعتماد ہوگی ۔"

موجودہ دُنیا کا یہ بزرگ ترین انسان بے یار و مددگار نہ خاندان
اور نہ قبیلہ نہ آل اور نہ اولاد قوم کے بچّوں میں بلا امتیاز آزادی و حریت کی
روح بھر کر غیر فانی سکون کی طرف چلا گیا ہے ۔

۱۹۰۳ء میں سالونیکا کے ایک غریب ترک کا بیٹا جس کی گذراب
لکڑی کی تجارت پر ہوتی ہے مناستر کے فوجی اسکول میں داخل ہوتا ہے
اور حکمت فوجی کے سمجھنے اور برتنے کی تعلیم میں نمایاں امتیاز حاصل کرتا ہے
۲ برس کے بعد ہی وہ پہلی مرتبہ قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں جہاں افسری کے
راز بتائے جاتے تھے داخل ہوتا ہے اور ۱۹۰۵ء میں اپنی ذہانت کے
سبب تیسری آرمی کور کے اسٹاف اعلیٰ کا ایک ممبر بن جاتا ہے اور یہیں سے
اسکے حیرت انگیز کارناموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، عبدالحمید ثانی کا زوال،
انجمن اتحاد و ترقی کا انقلاب، بلغاریہ کی بغاوت اور آزادی، مصطفےٰ کی
تعلیم بیروت میں اور پھر طرابلس کی ناگہانی جنگ اطالیہ کی بزدلی اور یورپ
کی خود غرضانہ صلح پسندی، جنگ بلقان، ترکی کی قطع و برید، انجمن اتحاد و
ترقی سے مصطفےٰ کی نا چاقی، اور صوفیہ میں غازی کا ملٹری اٹیچی مقرر ہونا
طلعت وانور وغیرہ سے دوری اور وزارتِ طلعت کے خلاف مصطفےٰ
کا غم ۔ یہ سب انقلابی منزلیں ترکوں کے اس کامیاب سپاہی کی زندگی کا
ایک جز و رہیں ۔ بالآخر ۱۹۱۴ء میں فیصلے کی گھڑی آگئی اور یورپ خود اپنے
ہی خون میں غوطے کھانے لگا ۔ دورانِ جنگ میں مناستر کے اس سپاہی
نے جو خدمات جلیلہ انجام دیں انکا باوجود اختلاف کے آج تک جرمنی
کے فوجی ماہرین کو اعتراف رہا ۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ مصطفےٰ کمال
اتحادی افواج کے مقابلے میں ایک ذمہ دار افسر بن کر آیا اور ترکی افواج
کی اُنیسویں ڈویژن سے اتحادی افواج کے دردانیال میں چھکے چھڑا دیئے
یہاں تک کہ ۸ راگست کو وہ انا فارتہ کے فوجی حلقوں کا سر عسکر اعظم مقرر
کیا گیا اور کامیابی کے ساتھ اتحادیوں کے سیلاب کو روکتا رہا، وہ ابتدا
ہی سے اتحادیوں کے خلاف جنگ کرنے کی مخالفت کرتا رہا لیکن جب
جرمن افسروں کی ناتراشیدہ ضد اور خود غرضی نے ترکوں کی بہترین فوج
کو قفقازی مہم کے لئے روانہ کیا اور یلدرم کی ساتویں کور کو اسکی سرکردگی
میں روس کے خلاف روانہ کرنا چاہا تو اس نے اس مہم کی آنے والی
بربادی کو اپنی تیز نگاہوں سے تاڑا اور استعفےٰ دیکر اس ذمہ داری سے
سبکدوش ہو گیا چنانچہ باوجود عظیم الشان فتح اور روسی پسپائی کے اس
یلدرم فوج کا وہی حشر ہوا جو نپولین کی پُر بہار اور فاتح فوج کا ۱۸۱۲ء
میں ماسکو کے اندر اور وہاں سے تباہ کن مراجعت کے وقت ہوا تھا،

اگر قرا کاظم بکر جیسا ہشیار، مدبّر اور ذہین جنرل نہ ہوتا تو شاید ترکوں کی سوا لاکھ فوج میں سے ایک متنفس بھی نہ بچتا۔ برف کی بوچھار اور قفقازی پہاڑیوں کے تنگ و تاریک راستے ترکی کی بہترین فوج کو نہنگ قضا کی مانند نگل گئے پورے ایک سال تک مصطفےٰ کمال خون کے گھونٹ پی پی کر جرمنی کے جنرلوں کی غلطیوں پر دانت پیستا رہا۔ تا آنکہ وزارت طلعت کو مصطفےٰ کمال کی عاقبت بینی کا اندازہ ہوا۔ اور سخت شکستوں کے بعد شامی فوج کی قیادت پھر غازی کو سونپی گئی اور اس فدائے ملّت نے پھر اپنی رائے اور ضمیر کی قربانی کر کے شام کے منتشر دستوں کی تنظیم شروع کر دی جو سب سے زیادہ غدّار عربوں کی شرارت سے مجبور و معذور ہو رہے تھے۔ اگرچہ کچھ دنوں کے بعد ہی ۳۰ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں نے عارضی صلح کا اعلان کر دیا لیکن غازی مرحوم اچھی طرح سمجھ چکا تھا تمام مآل دیکھ رہا تھا چنانچہ قسطنطنیہ جانے سے پیشتر ہی مصطفےٰ کمال نے اس شامی فوج کو مع ساز و سامان کے اناطولیہ روانہ کر دیا تھا اور یہی فوج بالآخر اسکی آخری ہوئی دُنیا کا سہارا ثابت ہوئی ۔

شامی فوج کو اس طرح بچا لینے، اتحادی جانبداری کا لبادہ اوڑھ لینے اور وحیدی دور کی ذلّت و توہین خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لینے کے بعد اُس نے شمالی فوجی حلقے کی انسپکٹر جنرلی قبول کی سمسون کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور جس قدر ساز و سامان ہو سکا اناطولیہ کی اندرونی گھاٹیوں میں پہنچایا۔ ارض روم اور سیواس کی کانگریسوں میں ترکی ملّت کے غیض و غضب کا پارہ انتہائی بلند درجے پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء کی جنوری کے آخری سانسوں میں قسطنطنیہ کے اندر ترکی پارلیمان کا افتتاح ہوا، قومی میثاق بنا اور مصطفےٰ کمال کی پہلی گرج انقرہ کی دیواروں کی بلندیوں پر گرجی، اتحادیوں کے کید صلح کا پردہ چاک ہو گیا اور تمام قوم پرور ترک قید و بند کے مصائب میں مبتلا کر دئے گئے جن میں سے بہت مالطہ کے اندر زندانِ فرنگ کی سختیاں سہتے رہے، چنانچہ اپریل ۱۹۲۰ء میں یونانی ٹرکی پر حملہ کرتے ہیں اور ۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء میں انقرہ میں پہلی مجلس کبیر کا اجلاس ہوتا ہے اور ۲ کروڑ ترکوں کی حیات تازہ کا پیغام عالمِ اسلام میں گونج جاتا ہے، ۵ راگست ۱۹۲۱ء کو مصطفےٰ الکمال ٹرکی جمہوریہ کا سر عسکر، آمر اعلیٰ اور صدر اعظم مقرر ہوتا ہے اور دنیائے استبداد اُسکے آگے سر تسلیم خم کر دیتی ہے، مدانیہ کانفرنس اور پھر لوزان کانفرنس اس مرد مجاہد کی خواہشات ملی کو تسلیم کرتی ہے اور ۲ راکتوبر ۱۹۲۳ء کو اتحادی تیندووں کا آخری پلّا بھی سرزمین روم سے باحسرت و یاس رخصت ہو جاتا ہے۔ چانکیہ کی گرج چار برس کے اندر انتہائی شاندار کامیابی کے ساتھ صوتِ ہادی کی کڑک ثابت ہوتی ہے اور ۲ راکتوبر ۱۹۲۳ء کو دُنیا جان لیتی ہے کہ ٹرکی واقعی ترکوں کے لئے ہے اور کوئی قوم اس کی طرف نگاہِ حرص نہیں ڈال سکتی"۔

اصلی مصطفےٰ کمال ۳ رمارچ ۱۹۲۴ء کو نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے چنغہ عسکریت نے محاربات خونی کے غبار اور دھوئیں میں گل کر اپنے آخری تاروں کو سازِ اصلاحات میں لگا دیا اور اب مضرابِ جنگی اس حرب دشوار کے تاروں پر لگی جس کی فتح غازیٔ شرق کی سب سے بڑی اور آخری فتح تھی، منصب خلافت سے دفعتہً سبکدوشی کا اعلان ہوا۔ عبدالحمید سوئٹزرلینڈ روانہ ہو گئے، انگورہ کی جمہوریت پر مُہرِ دوام ثبت کر دی گئی اور ٹرکی مذہبی استبداد اور سازشوں کی زنجیروں سے آزاد ہو کر خالص قومی سلطنت میں نمایاں ہوئی، تیزی کے ساتھ، قوت کے ساتھ، عزم بالجزم کے ساتھ ۵ لاکھ مضبوط فوج کے ساتھ، معمور خزانے اور بیشمار ساز و صلاح کے ساتھ، یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ اور زمانۂ انقلاب پرور کے دوش بدوش جمہوریۂ انقرہ نے دنیائے اصلاحات میں قدم رکھا، بغاوتیں فرو ہوئیں، صلحنامہ مکمّل ہوئے، تجارتی تعلقات بڑھے، زبان و ادب میں انقلاب ہوا، تمدن و معاشرت میں تغیّر، اور اندرونی مخالفتوں کا کامل تصفیہ، ۲ کروڑ انسان ایک دل، ایک روح اور ایک زبان بنا دئے گئے۔ کامیابی اور کامیابی تام،

یہ ہے دس سالہ کارگزاری اس مرد عاقبت بیں کی جس نے ۱۹۱۰ء میں زوال کے تیز قدموں کو پہچانا تھا، ۱۹۱۹ء میں اس کے مقابلے کیلئے سربکف اُٹھا اور ۱۹۲۹ء میں ترکی کو اس اوجِ کمال پر پہنچا دیا جہاں ہر قوم اپنے سرِ ممتاز کو فخر و عزّت کے ساتھ بلند کر سکتی ہے اور دُنیا کی آنکھیں اسکی رفعت سے پست اور خیرہ ہو جاتی ہیں، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء کے نومبر تک جو کچھ اس ہستیِ باکمال نے کیا، وہ تدبّر اور سیاست دانی کا ایک غیر فانی

مظاہرہ ہے۔ دیرینہ دشمنوں کو دوست بنا لیا، اسلامی سلطنتوں کو ایک مخصوص جتھہ میں بدل دیا، ایشیا کی رگ رگ میں حریت و انقلاب کی رو دوڑادی دول عظمیٰ کے مغرور پہلو میں اپنی جگہ پیدا کی، تجارت اور صنعت کی راہیں کھولدیں۔ ہر ترک کو مرد آزاد و خوددار بنا دیا، ہر خاتون کو ملت کا کارآمد پرزہ کر کے چھوڑا اور ہر بچے کو عزت آیندہ کا ایک گراں ارز سرمایہ ثابت کر دیا، آزاد خیال ترکوں کی مخالفت مٹ گئی، مہاجرین اور تارکین وطن کو امن عام کا انعام دیدیا گیا، یورپ کی سیاست میں ترکی قوم کا وجود محسوس ہوا اور ہر نگاہ دوربین اسکی دوستی اور رفاقت کی تمنا کرنے لگی، ایشیا کا پاسبان مغربی ایشیا کے ڈوبتے سورج کو سہارا دینے والا اور ایشیا کے مجبور دلوں کو ابھارنے والا اتاترک آج آغوش رحمت میں دائمی نیند سو رہا ہے لیکن ان ابونو کے محاربۂ عظیم کا فاتح اعظم غازی عصمت اسی تخیل و فکر کے ساتھ اسی فولادی ارادے اور عزم کے ساتھ اور اسی وفاداری اور رفاقت کے ساتھ جو مناستر کے شریر فوجی طالب علم کے ساتھ اس کو تھی ہے سنت قائد کی پیروی میں ہے اور اس فصل طیار سے خرمن گراں قیمت جمع کر رہا ہے جس کی سیرابی علی رضا کے پوت کے خون اور پسینے سے ہوئی ہے۔

کون ہے جو آج اس حقیقت سے انکار کرے کہ اتاترک ہی اس دنیائے حاضر میں ایسا شخص تھا جسنے مرنے کے بعد بھی دوست اور دشمن سب سے یکساں خراج عقیدت لیا اور ہر قوم کے سامنے ایک قابل تقلید مثال چھوڑ گیا۔ یقیناً وہ دنیا کا بہترین مصلح، مدبر، مفکر اور قائد تھا، وہ جس قدر میدان رزم میں بلند حوصلہ تھا اسی قدر ایوان بزم میں عالی ہمت، وہ جس طرح خونی سیلاب میں شیر کی طرح تیرا اسی طرح مسند اصلاحات پر شیر کی طرح بیٹھا،

جسے دیوانگی کہتے ہیں فطرت کی نبوت ہے
غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

ہمارا آخری مطالعہ قدرے تلخ ہوا جاتا ہے لیکن نظر بد سے بچانے کے لئے مادر فطرت نے سالونیکا کے اس خوبصورت بچے میں کچھ ایسے داغ بھی رکھے تھے جو کبھی کبھی ابھر کر اس کو خوفناک اور خونخوار گرگ بنا دیتے تھے، لیکن دنیا جانتی ہے کہ اسکے سامنے ہنی بال و قیصر، اٹیلا و چنگیز، نپولین اور دیگر انقلابی انسانوں کا انجام تھا وہ جانتا تھا کہ جمہور کی خدمات کا صلہ دنیا میں بہت کم ملتا ہے، وہی عامۃ الناس جن کی ترقی و عروج، خوشحالی اور مساوات کیلئے ایک مرد مبشر خون اور پسینہ ایک کر دیتا ہے اسکے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور اس کی اصلاحی پابندیوں کو گوارا نہیں کرتے، وہ جانتا تھا کہ ترک سچی آزادی، واقعی فتح اور خطرات مٹ جانے کے بعد انتہائی راحت طلب، قدامت پسند اور فرسودہ ہمت بن جاتا ہے اس لئے اُن اصلاحات اور مقاصد کو ادھورا چھوڑ کر جو اسکے پیش نظر تھا قومی خدمت سے سبک قدمی کے ساتھ گذر جانا اسکا شیوہ نہ تھا، اس نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک ایسا دماغ اور دل پیدا کیا جس کا زبان اور ظاہرہ حلیہ سے کوئی تعلق نہ تھا اس کے چہرے پر خوشی اور مسرت کا رنگ جھلکتا تھا لیکن دل میں خونی ارادوں کا جوش اور دماغ میں انتقامی کارروائیوں کی آگ بھری ہوئی ہوتی تھی، وہ اپنے مقاصد کو کھل کر کبھی بیان نہ کرتا، اسکی گفتگو مختصر اور فیصلہ کن ہوتی تھی، وہ اپنے ارادوں کی تشریح میں بہت محتاط تھا اور دوسروں پر واضح کرنے سے گریز کرتا تھا، لوگ اس کو سازشی، شکی اور بدگمان کہتے تھے اور بجز عصمت، رفعت، علی جو اسکے ہر عمل کے رفیق تھے کوئی شخص اس سے محبت نہ کرتا تھا، تمام ترک جو اسکے قریب تھے اس سے ڈرتے تھے اور جو دور تھے وہ اس کو ترکی کا نجات دہندہ سمجھتے تھے، کاشتکار اور مزدور اس کی بنائی ہوئی جماعت خلق کے ممبر تھے جس کا وہ صدر اعظم تھا اور تعلیم یافتہ ترک اسکی اصلاحات کے مخالف لیکن اسکی ذات کے خلاف کوئی معاندانہ حرکت روا نہ رکھتے تھے کیونکہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی کوئی دوسرا شخص ترکی میں نہ تھا جو ترکوں کے اقبال و خودداری کا پاسبان بنتا۔ صدیوں کا جاری رہنے والا قانون شرعیہ جب سوئس ضابطہ دیوانی، جرمن قوانین فوجداری وغیرہ سے بدلا جاتا ہے تو ترکی کے طول و عرض میں ایک انقلاب عظیم ہوتا ہے، پردہ اٹھایا جاتا ہے، ترکی ٹوپی ممنوع قرار دی جاتی ہے، خلافت کے دلدادوں کو پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے رؤف اور عدنان، قرا کاظم بکر اور جنرل نوری جیسے جانبازوں کو معزول کر کے جلاوطن کر دیا جاتا ہے، پھانسی کے تختوں کا منظر بڑے بڑے شہ زور ترکوں کے خون سے لالہ زار بنایا جاتا ہے اور اس خوشی میں جشن کئے جاتے ہیں

واصلیتں صرف مالغ کئے جاسکتے ہیں غافلوں اور دروازے بند کئے جا سکتے ہیں ۔ یہ سب ہوتا ہے ۔ ترک انقلاب کے لئے پکار سکتے ہیں گروہوں پر تلوار اور تیروں کی بارش ہوتی ہے، عالم اسلام کے وفود کو ٹھکرا دیا جاتا ہے لیکن مصطفےٰ کمال اپنی شان استقلال سے ان کا مقابلہ کرتا ہے، لومۃ ولائم سے بے نیاز، ہر خطرے سے بے پروا، دُنیا کی دوستی اور رفاقت سے الگ تھلگ اپنے مقاصد کو پورا کرتا ہے اور اُن تمام پتھروں اور روڑوں کو خس کی طرح اپنے گرد باد اصلاحات سے اُڑا دیتا ہے ۱۹۲۳ء کے بعد سے ایک شخص متنفس بھی ترکی میں اس کا مخالف نہیں رہتا۔ مجلس کبیر کے نمائندے اس کے غلام، جماعت خلق کے اراکین اس کے پرزے، فوج اسکی کل اور نظام قانون اس کی حرکت اور مصطفےٰ اپنے اور غیروں کے لہو کے سیلاب میں اصلاحات کی تکمیل کرتا ہے۔ کامیاب جیتا ہے کامیاب مرتا ہے اور ساری قوم کو کامیاب مقصد بنا جاتا ہے ۔

غازی اعظم کمال اتاتُرک

(عصمت انونو صدر جمہوریۂ ترکی کی نظر میں)

غازیٔ اعظم کمال اتاترک کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کردینے کے بعد عصمت انونو صدر جمہوریہ ترکیہ نے اپنی قوم کو ایک روح افزا اور جوش انگیز پیام دیا جس میں انھوں نے ملتِ ترکیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

اتاترک کے جسم فانی کو قوم تابوت میں رکھ کر اور اپنے معزز شانوں پر اُٹھا کر دائمی آرام گاہ میں سُلا آئی۔ وہی قوم جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور جس کی خدمت و فلاح کے لئے انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کردی تھی۔

اتاترک اس دن طوفان بن کر اُٹھے جس دن ہم کو ایک ایسے حملے نے آدبوچا تھا جو تاریخ میں سب سے زیادہ ظالمانہ اور انصاف کش تھا انہوں نے ثابت کردیا کہ ترک معصوم تھے اور ملتِ ترکیہ کا مقصد انصاف ۔

ان کی بلند آواز جس کی اہمیت شروع میں محسوس کی گئی تھی تمام دُنیا کے دلوں میں اُتر کر رہی اور اس قوت سے جو کبھی کمزور نہیں ہوسکتی اور اتاترک نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کرنے کے بعد اپنی تمام زندگی ملتِ ترکیہ کے حقوق حاصل کرنے کے لئے وقف کردی، اور انسانیت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں اور ان خصوصیات کا اظہار کیا جن کو انسانیت نے تاریخ کی چٹانوں پر کندہ کردیا ہے ان کو ملتِ ترکیہ کی عظمت، اس کی طاقت، شرافت و کرامت، اسکے شوقِ تہذیب اور اسکے ان انسانیت نواز فرائض پر بھی جو اسکے ذمہ واجب الادا ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ترکی کو جو تہذیب و تمدن اور نظم و نسق میں پیچھے پڑا ہوا تھا ایک مطابقِ وقت سلطنت میں تبدیل کردیا جائے جو انسانیت کے خالص ترین اصولوں سے مزین اور پُرامن ہو۔

جمہوریت، مجلسی اصلاح، قومیت، ہر دلعزیزی اور انقلابیت ہمارے لئے اتاترک کی بہترین وراثتیں ہیں۔ تُرکی قوم نے اپنے محبوب اتاترک کی جس قدر امداد اور عزت کی ہے اس نے تمام دُنیا کو بتادیا ہے کہ اتاترک جیسا فرزند پیدا کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے ۔

عصمت انونو
(صدر جمہوریۂ ملتِ ترکیہ)

شعلۂ طور

حضرتِ جگر مرادآبادی

شوق کو رہنما بنا، ہو جو چکا کبھی نہ دیکھ
آگ دبی ہوئی نکال، آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

شوق کا مرثیہ نہ پڑھ، عشق کی بےبسی نہ دیکھ
اسکی خوشی خوشی سمجھ اپنی خوشی خوشی نہ دیکھ

دل کو مٹا کے عشق میں دل کی طرف کبھی نہ دیکھ
ہو کے نثارِ زندگی حاصلِ زندگی نہ دیکھ

تجھ کو خدا کا واسطہ تو مری زندگی نہ دیکھ
جس کی سحر بھی شام ہو اسکی سیہ شبی نہ دیکھ

ناصحِ کم نگاہ سے کون یہ کہہ کے سر کھپائے
رازِ شکستگی سمجھ، رنگِ شکستگی نہ دیکھ

حُسنِ مجاز سے گذر، یعنی جو تجھ سے ہو سکے
دیکھ لے ایک بار پھر بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

یہ تو نہیں کہ آنکھ کو دعوتِ ماسوا نہ دے
ہاں مگر اس قدر کہ بس ایک ہی رُخ کبھی نہ دیکھ

دل کی لگی بڑھائے جا، تیز قدم اُٹھائے جا
رخصتِ شوق کی قسم فرصتِ زندگی نہ دیکھ

ہو کے رہیگا ہم نوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ
نغمۂ شوق گائے جا حُسن کی بےرُخی نہ دیکھ

تو ہی کمالِ عشق ہے تو ہی کمالِ حُسن ہے
اپنے سوا کسی کو بھی آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ

یہ بھی تری طرح کہیں رُخ سے نقاب اُلٹ نہ دے
حُسن پہ اپنے رحم کر، عشق کی سادگی نہ دیکھ

کس لئے جان دیتے ہیں رندِ شرابِ ناب پر؟
روز نہ پوچھ محتسب تھوڑی سی آج پی نہ دیکھ

فتنۂ روزگار ہیں ہے یہی رازِ عافیت
دل جسے چاہے دیکھنا دیکھ جگر وہی نہ دیکھ

خطباتِ زرتشت کے تین تمہیدی باب

از فریڈرک نٹشے ۔ مترجمہ محمد عبدالسلام رامپوری

(براہِ راست جرمن زبان سے ترجمہ کیا گیا)

(دوسری قسط)

جون ۱۹۳۶ء کے ایشیا سے یہ اہم سلسلہ شروع ہوا ہے جس کے لئے میں محمد عبدالسلام صاحب رامپوری کا دلی شکرگزار ہوں۔ حالانکہ عبدالسلام صاحب کا علمی ذوق اور اُس سے پیدا شدہ استغناء اس شکرگزاری کی منزل سے کہیں اچھوتا اور بلند ہے، مگر ایشیا کے معیارِ ادب کو بلند کرنے میں عبدالسلام صاحب نے جو امداد کی اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

پہلی قسط کی صحت تمام کیلئے مترجم نے نٹشے کے المانوی نسخے سے مدد لی تھی، لیکن یہ قسط براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اور اب ترجمہ میں بظاہر مترجم کے نزدیک کسی شک اور نقص کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے!

ساغر

---

(۴)

۹۱

زرتشت نے لوگوں کی طرف دیکھا اور حیرت کرنے لگا اور پھر یہ تقریر کی۔

انسان ایک رسّی ہے جس کا ایک سرا حیوان ہے اور دوسرا مافوق البشر پر قائم ہے۔ ایک غار پر تنی ہوئی رسّی، ایک خطرناک عبور، پُرخطر سفر، خطرناک پس نگاہی، خطرناک لڑکھڑاہٹ، پُرخطر قیام۔

انسانی عظمت جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ وہ پُل ہے، منزل نہیں۔ انسان میں قابلِ محبّت یہی چیز ہے کہ وہ عبور ہے اور افتادگی۔

مجھے تو اُن سے محبّت ہے جو گر جانے والوں ہی کی حیثیت میں زندگی بسر کرنا جانتے ہیں اس لئے کہ وہ پار اُتر جانے والے ہیں۔

میں محبّت کرتا ہوں بڑے تحقیر کرنے والوں سے کیونکہ یہی سب سے بڑے تعظیم کرنے والے ہیں اور دوسرے کنارے کی حسرت کے تیر یہی لوگ ہیں۔

مجھے ایسے لوگوں سے محبّت ہے جو تباہ ہونے اور قربانی بننے سے پہلے ستاروں سے ماوراکسی وجہ کی تلاش نہیں کرتے، بلکہ کرۂ ارض پر اس لئے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں کہ یہ کبھی مافوق البشر کی دُنیا ہو جائے۔

مجھے اُس کے ساتھ محبّت ہے جو زندہ رہتا ہے تاکہ جان سکے اور جانتا ہے تاکہ کبھی نہ کبھی مافوق البشر وجود میں آسکے اور اسی وجہ سے اپنی تباہی چاہتا ہے۔

میں اس سے محبّت کرتا ہوں جو محنت کرے، نئی نئی چیزیں ایجاد کرے تاکہ مافوق البشر کے رہنے کیلئے مکان بنا سکے، اور زمین کو مویشیوں

کی، پودوں کی اُسی کے لئے تیار کرے کیونکہ تب ہی وہ اس طرح تباہی چاہے گا۔

مجھے محبت ہے اس شخص سے جو اپنی نیکی سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے کہ نیکی عزم ہے تباہی کا اور تیر ہے اسی تمنّا کا۔

مجھے محبت ہے اس کے ساتھ جو روح کے کسی شمّہ کو بھی اپنے لئے بچانا نہیں چاہتا، بلکہ نیکی مکمل روح بن جانا چاہتا ہے۔ اور روح کی طرح اس پُل پر چلتا ہے۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں جو نیکی کو اپنا میلان اور مستقر بنا لیتا ہے، اس طرح وہ اپنی نیکی کی خاطر مزید زندہ رہنا یا زندہ نہ رہنا چاہتا ہے۔

میں محبت کرتا ہوں اس شخص سے جسے بہت سی نیکیوں کی خواہش نہیں، بہ نسبت دو کے ایک نیکی بہت زیادہ نیکی ہے۔ اس لئے کہ مستقر کی وابستگی کے لئے یہ زیادہ بڑی گرہ ہے۔

مجھے اس کے ساتھ محبت ہے جس کی روح مسرّت ہے وہ نہ شکریہ کی خواہش کرتا ہے، نہ شکریہ کا جواب دیتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ بخشتا ہے، اور اپنے لئے بچانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔

میں اس شخص سے محبت کرتا ہوں کہ جو پانسہ کے اپنے موافق گرنے سے شرماتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا میں بے ایمان جواری ہوں؟ اس لئے کہ وہ تباہی چاہتا ہے۔

میں ایسے آدمی سے محبت کرتا ہوں جو عمل سے پہلے الفاظ کی زر فشانی کرتا ہے، اور جتنا وعدہ کرتا ہے ہمیشہ اس سے زیادہ کرتا ہے اس لئے کہ اس کو تباہی کی خود خواہش ہے۔

مجھے محبت ہے اُس شخص سے جو اگلوں کا حق ادا کرے اور پچھلوں کی تلافی، کیونکہ وہ معاصرین کی خاطر فنا ہونا چاہتا ہے

میں ایسے آدمی سے محبت کرتا ہوں جو محبّت کی وجہ سے خدا کی سرزنش کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو خدا کے قہر سے تباہ ہونا ہی ہے۔

اس سے مجھے محبت ہے جس کی روح میں گہرائی ہے۔ حتّٰی کہ مجروح ہونے میں بھی۔ اور وہ معمولی تجربہ کی خاطر بھی تباہ ہو سکتی ہے وہ اس طرح ہنسی خوشی پُل سے گذرتا ہے۔

مجھے اس سے محبت ہے جس کی روح اس قدر لبریز ہو کہ وہ اپنے آپ کو اور اُس کی ہر چیز کو فراموش کردے، اس طرح تمام چیزیں اس کے لئے تباہی ہو جائینگی۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں جو آزاد روح اور آزاد قلب ہو، اس طرح اس کا سر احشاء ہے اس کے قلب کا اور بس، لیکن اس کا قلب اس کو تباہی کی طرف لئے جاتا ہے۔

مجھے ان سب سے محبت ہے جو سروں پر چھائے ہوئے تاریک بادلوں سے ایک ایک کرکے گرنے والی بھاری بوندوں کی طرح برق کی آمد کے نقیب ہیں اور نقیبوں کی طرح فنا ہو جاتے ہیں۔

دیکھو! برق کا نقیب اور اس بادل کی بھاری بوندیں ہوں۔ اور اس برق کا نام مافوق البشر ہے۔

(۵)

یہ الفاظ ختم کر چکنے کے بعد زرتشت نے لوگوں پر پھر نظر ڈالی اور خاموش ہو گیا "وہ کھڑے ہیں" اس نے کہا وہ ہنس رہے ہیں، مجھے انہوں نے سمجھا نہیں، میرے پاس وہ مُنھ نہیں جس کی بات ان کے کان سُنیں۔

کیا پہلے اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ان کے کان پٹ کردے کہ وہ آنکھوں سے سُننا سکیں؟ کیا اس کی ضرورت ہے کہ کوئی نقارہ کی طرح یا توبہ واستغفار کرنے والے مبلغ کی طرح گڑگڑائے؟ یا وہ صرف مُکھوں ہی کا اعتبار کرتے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہ کچھ ہے جس پر اُنہیں غرّہ ہے اُس کو وہ

کیا کہتے ہیں؟ اس کا نام ہے تہذیب۔ یہی اُنہیں بکریوں کے ریوڑ سے ممیز کرتی ہے۔

اسی وجہ سے وہ اپنے متعلق لفظ تحقیر ناگواری سے سُنتے ہیں۔ میں ان کی خودداری کو انگیز کروں گا۔

اُنہیں میں ذلیل ترین چیز کے متعلق بتلاؤں گا۔ لیکن وہ تو پس ماندہ انسان ہی ہے۔

زرتشت نے لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا

"یہی وقت ہے انسان کیلئے نصب العین کو متعین کرنے کا، یہی وقت ہے اعلیٰ ترین آرزو کی تخم ریزی کا۔

ابھی تک اس کی زمین اتنی زرخیز ہے، لیکن ایک روز وہ کمزور اور بنجر ہو جائیگی، اور پھر اس میں کوئی بلند درخت پرورش نہ پا سکے گا۔

افسوس! وقت آنیوالا ہے کہ آدمی انسانیت سے ماورا اپنی تمنا کا تیر نہ پھینک سکے گا۔ اور اس کی کمان کا چلّہ سنسنانا بھی بھول چُکا ہوگا

میں کہے دیتا ہوں کہ ابھی تک رقصاں ستارہ پیدا کرنے کے لئے انسان میں انتشار اور پراگندگی باقی ہے۔

حیف! وقت آرہا ہے کہ انسان کسی ستارے کو پیدا نہ کر سکے گا۔ افسوس! اس ذلیل ترین انسان کا دور آرہا ہے جو خود اپنے آپ کو بھی ذلیل نہ سمجھ سکے گا۔

دیکھو! میں تمہیں پسماندہ انسان دکھاتا ہوں۔

محبت کیا ہے؟ تخلیق کس کو کہتے ہیں؟ آرزو کیا ہے؟ پس ماندہ انسان یہ سوالات کرتا ہے اور آنکھیں ٹمٹماتا ہے۔ زمین چھوٹی ہو جاتی ہے اور اُسی پر پسماندہ انسان جو ہر چیز کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ پھُدکتا پھرتا ہے۔ اُس کی نوع پسّو کی طرح ناقابل استیصال ہے۔ پسماندہ انسان زیادہ زیادہ زندہ رہتا ہے۔

"ہمنے سُکھ کا انکشاف کرلیا ہے" پسماندہ انسان کہتے ہیں اور آنکھیں ٹمٹماتے ہیں۔

وہ ان خطوں کو چھوڑ دیتے ہیں جہاں زندگی سخت ہے۔ کیونکہ اب گرمی درکار ہے۔ ایک شخص ہمسایہ سے محبت کرتا ہے اور اُس سے رگڑ تا ہے کیونکہ گرمی درکار ہے۔ بیمار ہونا، بے اعتماد ہونا، اُن کے نزدیک گناہ ہے۔ وہ چوکنّے چلتے پھرتے ہیں۔ احمق ہے جو اب تک پتھروں یا انسانوں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

۹۳

کبھی کبھی تھوڑا سا زہر۔ یہ اچھے اچھے خواب دکھاتا ہے۔ اور آخر کار بہت سا زہر خوشگوار موت کے لئے۔

آدمی ابھی تک کام کرتا ہے اس لئے کہ کام وقت گذاری ہے۔ لیکن یہ خیال رکھتا ہے کہ کہیں یہ وقت گذاری کوئی تکلیف نہ دینے پائے۔

لوگ اب مفلس و مالدار نہیں ہوا کریں گے یہ دونوں بار ہیں۔ اب حکومت کرنا کون چاہتا ہے؟ دونوں چیزیں سخت بار ہیں۔

بغیر گلہ بان کے ایک گلہ۔ سب کی خواہشیں یکساں، سب مساوی، جس کے جذبات اسکے علاوہ ہوں وہ رضاکارانہ پاگل خانہ جاتا ہے۔

"پہلے دُنیا پاگل تھی" یہ لوگ کہتے ہیں اور آنکھیں ٹمٹماتے ہیں۔

وہ ہوشیار ہیں اور جو ہو چکا ہے اُنہیں سب معلوم ہے۔ لہذا تمسخر کی کوئی انتہا نہیں۔ لوگ ابھی تک لڑتے ہیں، مگر جلد ہی ملاپ کر لیتے ہیں۔ نہیں تو معدہ خراب ہوتا ہے۔

اُنہیں کچھ دن کے لئے چھوٹے موٹے شغل ہیں اور کچھ رات کے چھوٹے ہوئے شغل ہیں۔ صحت مقدم ہے۔

"ہمنے سُکھ کا انکشاف کرلیا" پسماندہ کہتے ہیں۔

یہاں زرتشت کا پہلا خطبہ جس کو تمہید بھی کہا جاتا ہے ختم ہوگیا کیونکہ بھیڑ کا شور اور تمسخر اس نقطہ پر زرتشت کی تقریر میں مخل ہوگیا۔ "زرتشت ہمیں یہ پسماندہ چاہئیے۔" وہ چلاّ اُٹھے۔ "تم ہمیں ایسے پسماندہ آدمی بنا دو اور مافوق البشر کا تحفہ تمہیں مبارک۔" خوشی سے اُچھلنے لگے۔ چٹخارے لینے

لگے۔ زرتشت افسردہ ہوگیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "وہ مجھے نہیں سمجھے۔ میرا ایسا مُنہ نہیں جس کی بات اُن کے کان سُن سکیں"
ہاں! میں زمانے تک پہاڑوں میں رہا۔ بہت زمانہ تک چشموں اور درختوں سے کان لگائے رہا، اب میں اُن سے اس طرح خطاب کرتا ہوں جس طرح بکری کے گلوں سے، میری روح اس طرح ساکن اور صاف ہے جیسے صبح کے وقت پہاڑ۔ مگر وہ مجھے سرد سمجھتے ہیں۔ خوفناک تمسخر کے ساتھ مذاق اُڑانے والا سمجھتے ہیں۔

وہ اب مجھ پر نظر ڈالتے ہیں اور ہنستے ہیں اور طرفہ یہ کہ نفرت بھی کرتے ہیں۔ اُن کی ہنسی میں برف ہے۔

(۶)

اتنے میں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے ہر مُنہ کو گونگا اور ہر آنکھ کو جامد بنا دیا۔ اس اثنا میں نٹ اپنا کام شروع کر چکا تھا اور ایک چھوٹے سے دروازے سے نکل کر رسّی پر چل رہا تھا جو دو برجوں میں لوگوں اور بازار پر کھنچی ہوئی تھی۔ ابھی نٹ درمیان ہی میں تھا کہ چھوٹا دروازہ پھر کھلا اور ایک شخص مسخروں جیسا بھڑکیلا لباس پہنے کود کر نکلا اور تیزی سے پہلے آدمی کے عقب میں چلا "لنگڑے آگے بڑھ" وہ بھیانک آواز میں چلّایا۔ "اے کاہل جانور! سدِّراہ، زرد رو آگے بڑھ۔ میں کہیں تجھے اپنی ایڑی سے گدگدا نہ دوں۔ برجوں کے درمیان تیرا کیا کام ہے؟ تیری جگہ تو برج کے اندر ہے۔ تجھے تو بند رہنا چاہیئے تھا۔ تو اپنے سے بہتر کیلئے راستہ کو روک رہا ہے۔ وہ ہر لفظ کے ساتھ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ صرف ایک قدم پیچھے تھا کہ وہ خوفناک حادثہ پیش آگیا جس نے ہر مُنہ کو گونگا اور ہر آنکھ کو جامد بنا دیا۔ اُس نے دیو کی طرح نعرہ لگایا اور دوسرے آدمی کے اوپر سے جو راستہ ہی میں تھا جست لگائی۔ مؤخرالذکر نے اپنے رقیب کی اس طرح فتح دیکھی۔ اور فوراً ہی اُس کا دماغ اور قدم بہک گئے۔ اُس نے اپنا ڈنڈا پھینک دیا اور خود ڈنڈے سے بھی زیادہ تیز چاروں ہاتھ پاؤں سے چکر کھاتا ہوا نیچے آپڑا۔ لوگ اور بازار اُس سمندر کی طرح ہو گئے جسے طوفان نے آلیا ہو۔ اُنہوں نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا اور خصوصاً اُس جگہ سے جہاں نٹ گرنے والا تھا۔ زرتشت اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور نٹ کا جسم بالکل اُس کے قریب گرا۔ ۔ ۔ ۔ بُری طرح زخمی اور شکستہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ابھی تک وہ مرا نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اُس زخموں سے چور کو ہوش آیا۔ زرتشت کو اپنے قریب ہی جھکا ہوا دیکھا۔

"تم کیا کر رہے ہو" اُس نے آخرکار کہا "میں پہلے سے جانتا تھا کہ دیو میرے ٹھوکر مارے گا۔ اب وہ مجھے جہنّم میں گھسیٹ رہا ہے۔ کیا تو اُسے روکے گا؟"

"دوست! عزّت کی قسم" زرتشت نے جواب دیا "اُن کا کوئی وجود نہیں جن کا تو ذکر کر رہا ہے۔ ۔ ۔ نہ کوئی دیو ہے اور نہ کوئی جہنّم، تیری روح تیرے جسم سے بھی پہلے فنا ہو جائے گی۔ اب کسی چیز سے مت ڈر" اُس شخص نے بے اعتباری سے نظر اُٹھائی "اگر تو سچ کہہ رہا ہے" اُس نے کہا "زندگی جاتی ہے تو کچھ نہیں جاتا۔ میں اُس جانور سے زیادہ نہیں۔ جسے ناچنا سکھایا گیا ہو۔ کبھی مار سے اور کبھی ٹکڑے سے"۔

"ایسا مت کہو" زرتشت نے کہا "تم نے خطرے کو اپنا پیشہ بنایا تھا، اس میں کوئی تحقیر کے قابل چیز نہیں۔ اب تم اپنے پیشہ کی وجہ سے ہی ہلاک ہو رہے ہو۔ اس لئے میں اپنے ہاتھوں سے تم کو دفن کروں گا"

زرتشت جب کہہ چکا تو مرنے والے نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی گویا وہ شکریہ کیلئے زرتشت کا ہاتھ ڈھونڈ رہا ہے۔

(۷)

اسی اثنا میں شام ہوگئی۔ بازار نے تاریکی کی نقاب ڈال لی۔ لوگ رخصت ہو گئے۔ وہ تجسّس اور خوف سے اُکتا گئے۔ زرتشت مردہ کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں محو تھا۔ اُس کو وقت کا بھی خیال نہ رہا۔ اُس تنہا پر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ وہ اُٹھا اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ "حقیقۃً زرتشت نے ایک خوب مچھلی پکڑی ہے۔ کوئی آدمی اُس کے ہاتھ نہیں آیا مگر ہاں ایک لاش۔

انسانی زندگی تاریک ہے اور ابھی تک بے معنی - اُس کے لئے ایک مسخرہ ہی مقدر ہو سکتا ہے۔

میں انسانوں کو اُن کی ہستی کا مفہوم سمجھانا چاہتا ہوں، وہ مافوق البشر ہے - ایک برق ہے - تاریک بادل - انسان کی - لیکن میں اب تک اُن سے بہت دور ہوں - میرے اور اُن کے شعور میں کوئی تخاطب نہیں - انسانوں کے لئے میں ابھی تک ایک بیوقوف اور ایک لاش کی درمیانی چیز ہوں۔

رات تاریک ہے - زرتشت کے طریقے تاریک ہیں۔

آؤ سرد اور اکڑے ہوئے ہمسفر میں تجھے لے جاؤں - جہاں میں تجھے اپنے ہاتھوں سے دفن کروں۔"

زرتشت نے اپنے دل سے باتیں کر کے لاش کاندھے پر لادی اور اپنا راستہ لیا - ابھی وہ سو قدم بھی نہ چلا تھا کہ چپکے سے ایک آدمی آیا اور اُس کے کان میں کہا یہ آدمی وہی مجمع والا مسخرہ تھا" زرتشت اس شہر کو چھوڑ دے" اُس نے کہا " یہاں تجھ سے بہت لوگ بغض رکھتے ہیں - اچھے اور منصف لوگوں کو تجھ سے دشمنی ہے - تجھ کو وہ اپنا دشمن اور تحقیر کرنیوالا کہتے ہیں - حق مذہب کے ماننے والے تجھ سے نفرت کرتے ہیں اور عوام کے لئے تجھے خطرہ بتاتے ہیں - یہ خوش قسمتی تھی کہ تمہارا مضحکہ اُڑایا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ تو مسخروں کی سی باتیں کرتا ہے - مردار کتّے کی رفاقت تیری خوش نصیبی تھی - اپنے آپ کو ذلیل کر کے آج کے لئے تو نے اپنی جان بچالی - بہرکیف اس شہر سے چلے جاؤ - ورنہ میں کل راستہ میں تجھ پر سے کود وں گا ایک زندہ آدمی ایک مردہ پر سے" مسخرہ یہ کہہ کر غائب ہو گیا - زرتشت تاریک کوچوں میں آگے بڑھا۔

شہر کے دروازے پر گورکن ملے - اُنہوں نے مشعل کی روشنی اُس کے چہرے پر ڈالی اور زرتشت کو پہچان کر بُری طرح مضحکہ اُڑایا" زرتشت مردار کتّے کو لئے جا رہا ہے - یہ خوب ہوا کہ زرتشت گورکن ہو گیا - یہ سڑی ہوئی لاش ہمارے ہاتھوں کے قابل نہیں - کیا دیو کے لقمے کو زرتشت چرا لے جائیگا؟ خوب پھر تو غذا مبارک ہو؟ بشرطیکہ دیو زرتشت سے بڑا چور نہ ہو - وہ دونوں کو چرا لے جائیگا، وہ دونوں کو زہر مار کرے گا" وہ آپس میں سر جوڑ کر خوب ہنسے اور زرتشت نے کوئی جواب نہیں دیا - وہ اپنے راستے پر چلتا رہا - دو گھنٹے چلنے کے بعد وہ جنگلوں اور دلدلوں سے نکل گیا - اُس نے بھوکے بھیڑیوں کی آوازیں بہت کچھ سنی تھیں - اُسے خود بھی بھوک معلوم ہونے لگی تھی - وہ ایک تنہا گھر کے پاس جس میں روشنی ہو رہی تھی رُکا -

" بھوک مجھ پر غالب ہے" زرتشت نے کہا " ڈاکو کی طرح - اتنی رات گئے جنگلوں اور دلدلوں میں بھوک حملہ کر رہی ہے - میری بھوک کا بھی عجیب مزاج ہے - اکثر یہ کھانے کا وقت گذر چکنے کے بعد آتی ہے - اور آج یہ دن بھر نہیں آئی - رہی کہاں؟"

اُس وقت زرتشت نے اُس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، ایک بوڑھا آدمی روشنی لئے نکلا اور پوچھا " یہاں آ کر کس نے میری بدخوابی میں خلل ڈالا؟"

" ایک زندہ اور ایک مُردے نے" زرتشت نے کہا " مجھے کچھ کھانے پینے کو دو میں دن میں (کھانا) بھول گیا تھا - عقل کہتی ہے جو بھوکے کو کھانے پینے کو دیتا ہے اپنی روح کو تازہ کرتا ہے"

بوڑھا آدمی چلا گیا اور فوراً ہی نکل آیا - زرتشت کو روٹی اور شراب پیش کی " یہ بھوکوں کے لئے ایک بُرا مقام ہے" اُس نے کہا " یہی وجہ ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں - جانور اور انسان مجھ راہب کے پاس آتے ہیں - لیکن اپنے ساتھی سے بھی کھانے پینے کو کہو وہ تم سے بھی زیادہ تھکا ہے" زرتشت نے کہا " میرا ساتھی مردہ ہے - میں بمشکل ہی اُسے کھانے کی ترغیب دے سکتا ہوں" " اُس سے مجھے کوئی واسطہ نہیں" بوڑھے نے روکھے پن سے کہا " جو میرا دروازہ کھٹکھٹائے اُسے جو میں پیش کروں لینا چاہئے - کھاؤ اور خدا حافظ"

اس کے بعد زرتشت پگڈنڈی اور ستاروں کی روشنی کے بھروسہ پر دو گھنٹے اور چلتا رہا - وہ شب روی کا عادی تھا، وہ خوابیدہ چہروں کو دیکھنا پسند کرتا تھا - صبح کے جھٹ پٹے کے ساتھ زرتشت نے اپنے آپ کو ایک گھنے جنگل میں پایا - اب کوئی پگڈنڈی نظر نہ آتی تھی - مردہ کو اُس نے ایک کھوکھلے درخت میں سر کے بل رکھا - وہ بھیڑیوں سے اُس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا - وہ اپنے آپ مٹّی اور کائی پر لیٹ گیا اور فوراً ہی سو گیا - ماندہ

لیکن ایک ساکن جسم کے ساتھ۔

(۹)

زرتشت دیر تک سوتا رہا نہ صرف گلابی فجر بلکہ صبح بھی اُس کے سر پر سے گذر گئی۔ آخر کار اُس کی آنکھ کھلی۔ اُس نے حیرت سے جنگل اور خاموش فضا کو دیکھا۔ اُس نے حیرت سے اپنے اندر بھی دیکھا۔ وہ اُس بحری مسافر کی طرح جو اچانک خشکی کو دیکھ لے تیزی سے اٹھا۔ ایک خوشی کا نعرہ لگایا کیونکہ اُس نے ایک نئی صداقت پالی وہ اس طرح دل سے باتیں کرنے لگا۔

مجھ پر ایک روشنی طلوع ہو گئی مجھے ساتھیوں کی ضرورت ہے، جو میرا اتباع کریں۔ اس لئے کہ وہ خود اپنا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ ——— اور وہاں تک جہاں میں چاہوں۔

ایک روشنی مجھ پر طلوع ہو گئی۔ زرتشت کو عوام سے گفتگو کرنا نہیں چاہئے۔ بلکہ ساتھیوں سے۔ زرتشت کو گلہ کا گلہ بان اور محافظ کُتا نہیں بننا چاہیئے۔ بہتوں کو گلہ سے بہکالیجانے کے لئے۔ اسی مقصد کے لئے میں آیا ہوں۔ لوگ اور گلے یقیناً مجھ سے ناراض ہوں گے۔ گلہ بانوں کی طرف سے زرتشت کو لُٹیرا کہا جائیگا۔ انہیں میں گلہ بان کہتا ہوں۔ گو وہ اپنے آپ کو نیک اور منصف کہتے ہیں، میں انہیں گلہ بان کہتا ہوں وہ اپنے آپ کو حق مذہب کا معتقد کہتے ہیں۔

نیکوں اور منصفوں کو دیکھو انہیں سب سے زیادہ کن سے دشمنی ہے۔ اُن سے جو اُن کی (قائم کی ہوئی) قدروں کی لوح کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اُس توڑنے والے سے، قانون شکن سے، مگر یہی خلاق ہے۔

ہر مذہب کے معتقدین کو دیکھو! سب سے زیادہ انہیں کن سے عناد ہے؟ اُن سے جو اُن کی قدروں کی لوح کو توڑتے ہیں۔ اُس توڑنے والے سے، قانون شکن سے، جو بہر کیف خلاق ہے۔

ایک خلاق ساتھیوں کو تلاش کرتا ہے نہ کہ لاشوں کو۔ گلے اور معتقدین کو بھی نہیں۔ خلاق، پیدا کرنے والے شرکاء کار کی جستجو کرتا ہے ایسے لوگوں کی جو نئی قدریں نئی لوحوں پر کندہ کریں۔

ایک خلاق کو ساتھیوں کی تلاش ہے۔ اور فصل کاٹنے والے شرکاء کار کی۔ کیونکہ اُس کی کٹائی کیلئے ہر چیز تیار ہے، مگر اُس کے پاس سینکڑوں درانتیوں کی کمی ہے، چنانچہ وہ غلہ کی بالیاں توڑتا ہے، وہ دق ہو جاتا ہے۔

ایک خلاق ساتھیوں کی تلاش کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کی جو درانتیاں تیز کرنا جانتے ہوں۔ انہیں غارتگر اور خیر و شر کا (دونوں کا) تحقیر کرنے والا کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ فصل کو قطع کرنے والے اور جشن منانے والے ہیں۔

زرتشت کو خلاق رفقاء کی، فصل کاٹنے والے رفقاء کی اور جشن منانے والے رفقاء کی تلاش ہے۔ وہ گلہ بانوں اور لاشوں کے ساتھ کیا کریگا۔

اور اے میرے سب سے پہلے رفیق! خدا حافظ۔ میں نے تجھے کھوکھلے درخت میں اچھی طرح دفن کر دیا، تجھے بھیڑیوں سے اچھی طرح چھپا دیا۔

وقت ختم ہو گیا۔ میں تجھ سے جدا ہوتا ہوں ۔ ایک گلابی فجر سے دوسری گلابی فجر تک مجھے نئی صداقت حاصل ہو گئی۔

مجھے گلہ بان ہونا نہیں، مجھے گورکن بننا نہیں۔

اب میں کبھی عوام سے خطاب نہیں کروں گا۔ میں نے ایک مردہ سے آخری مرتبہ باتیں کرلیں۔

خلاقوں کی، فصل کاٹنے والوں کی، اور جشن منانے والوں کی صحبت میں شامل ہو جاؤں گا۔ انہیں قوس قزح دکھاؤں گا اور ما فوق البشر تک کے تمام درجے بتاؤں گا۔

تنہا رہنے والوں کے لئے اور توام رہنے والوں کیلئے میں اپنا گیت گاؤں گا اور اُس شخص کے لئے جو ناشنیدہ بات سُننے کے لئے ابھی تک کان رکھتے

ہیں۔ میں اُن کے دلوں کو اپنی خوش بختی سے باردار بناؤں گا۔
اپنے مقصد کے لئے کوشش کروں گا۔ اپنے راستہ کی پیروی کروں گا۔ سُست اور کاہلوں پر سے میں پھلانگ جاؤں گا۔ اس طرح میری رفتار کو اُن کی تباہی ہونے دو۔

(۱۰)

آفتاب نصف النہار پر تھا کہ زرتشت اپنے دل سے یہ باتیں کر چکا۔ اُس نے اوپر کو تحقیق کے لئے نظر اُٹھائی۔ ایک پرندکی تیز آواز اور پرستی اور دیکھا ایک عقاب ہوا پر بڑے بڑے چکر لگا رہا تھا۔ اُس پر ایک سانپ لٹک رہا تھا ———
شکار کی طرح نہیں سہیلی کی طرح کیونکہ وہ عقاب کی گردن میں لپٹا تھا۔ "یہ میرے جانور ہیں" زرتشت نے کہا اور دل سے خوش ہوا۔
آفتاب کے نیچے سب سے زیادہ خوددار، غیور جانور، آفتاب کے نیچے سب سے زیادہ زیرک جانور، ——(میری) خبر لینے نکل آئے۔
وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا زرتشت ابھی تک زندہ ہے۔ کیا واقعی میں اب تک زندہ ہوں؟
میں نے بہ نسبت جانوروں کے انسانوں میں رہنا زیادہ مخدوش پایا، زرتشت مخدوش راستوں پر جا رہا ہے۔ میرے جانور میری رہنمائی کریں۔
یہ کہہ چکنے کے بعد زرتشت کو راہب کے بن والے الفاظ یاد آئے۔ اُس نے ایک آہ بھری اور دل میں کہا۔
"کاش میں زیادہ عقلمند ہوتا، کاش میں اپنے سانپ کی طرح فطرۃً زیرک ہوتا۔
مگر یہ محال کی خواہش کرنا ہے۔ لہٰذا میں اپنی خودداری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ میری دانائی کے ساتھ رہے۔ اور اگر کسی دن میری عقل مجھے چھوڑ جائے: ۔ آہ! اُس کو پاس سے اُڑ جانے سے عشق ہے۔ اُس وقت میری خودداری میری حماقت کے ساتھ بھی اُڑ جائے۔"
اس طرح زرتشت کا اوتار شروع ہوا۔

طلسمِ جنوں

نکتہ سنجِ فطرتِ تخلیق ہے میرا جنوں	ہر نفی پر نقطۂ اثبات رکھ دیتا ہوں میں
کرکے برہم اک تلاشِ جلوۂ موہوم میں	ساری دُنیائے تجلّیات رکھ دیتا ہوں میں
جب زمانہ تاب لا سکتا نہیں انوار کی	چیختی آنکھوں پہ بڑھ کر ہات رکھ دیتا ہوں میں
جگمگا اُٹھتے ہیں مس کرتے ہی لاکھوں آفتاب	جب کسی ذرّے پہ ہنس کر ہاتھ رکھ دیتا ہوں میں
کھول دیتی ہے جو اہلِ کشف کے دل کی گرہ	شعر میں وہ رمزِ الہامات رکھ دیتا ہوں میں
حُسن کے دل میں اُتر جاتی ہے سینہ پھونک کر	نظم میں وہ سوزِ حسیّات رکھ دیتا ہوں میں
خود مسرّت رقصِ رنگا رنگ سے ہوتی ہے مست	نغمۂ غم میں وہ کیفیّات رکھ دیتا ہوں میں
طاقِ میخانہ میں کچھ قبلِ غروبِ آفتاب!	چاک کرکے قصّۂ آفات رکھ دیتا ہوں میں

ساغر

بجھا ہوا دیپک

(وہ نظم جو ۲۱ اگست ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کی گئی)

جیون کی کُٹیا میں ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک　　آشا کے مندر میں ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک

بُجھا ہوا سا دیپک ہوں میں، بُجھا ہوا سا دیپک

۱

کجرائے ڈیوٹ پہ دھرا ہوں یوں کُٹیا میں ہائے!　　جیسے کوئل سیس نوا کر امبوا پر سو جائے

جیسے شاما گاتے گاتے کُہرے میں کھو جائے　　جیسے دیپک آگ میں اپنی خاکستر ہو جائے

ہجر میں جیسے آنکھ کسی کنواری کی پتھرا جائے

بُجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بُجھا ہوا سا دیپک

۲

جیسے گھٹا میں ہو ہلکی سی اک بجلی بے جان　　جیسے کسی سادھو کا مُردہ اور تھکا ایمان!

آشاؤں کا مدفن، ارمانوں کا قبرستان　　رات کی اندھیاری میں ہوں میں مرتیو[1] کی مُسکان

جیسے اک بیوہ کی چِتا ہو اور ویراں شمشان[2]

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

[1] موت
[2] مرگھٹ

۳

اس ارماں میں کوئی میرے دامن کو چھو جائے — ہلکی سی مسکان[۳] سے اپنی چندر کو شرمائے

جیون کی تاریک کٹی میں تارے سے چمکائے — جلتا ہوں میں کب سے اپنی گودی کو پھیلائے

قسمت کی تاریکی ہر دم کاجل سا برسائے

بجھا ہوا سا دیپک ہاں میں بجھا ہوا سا دیپک

۴

پھنکتا ہوں سنسار میں کب سے میں کرموں کا مارا — جل جل کر کوئلہ سا ہوا ہے میرا جیون سارا

جوتی[۴] کے آکاش پہ ہوں میں اک دھندلا سا تارا — میری جلتی چھاتی بابا اگنی[۵] کا گھوارہ

لب پہ نرک[۶] ہے ہاتھوں میں ہے شعلہ کا اک تارہ

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

۵

کاش امر جوتی[۷] کا آنچل مجھ پر سایہ ڈالے — میرے جیون کی چھایا ہوں بال وہ گھونگریالے

اور مدھر پھونکوں سے بجھائیں الھڑ سونے والے — میرے اندھیرے سے پیدا ہوں چندرماں[۸] کے ہالے

تاریکی اور نور کے داتا! سن لے میرے نالے

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

۳ مسکراہٹ
۴ نور
۵ آگ
۶ جہنم
۷ نور ابدی
۸ چاند

۶

چمکے ہیں اور ڈوبے ہیں یہ سورج، چاند، تارے — جینے اور مرنے کے چکّر میں ہیں سب بے چارے

سانجھ سکارے[8] سو جاتے ہیں یہ غفلت کے مارے — میرے امر آکاش[9] پہ ہر دم دہکے ہیں انگارے

وہ انگارے جن کی چمک کا تم حاصل ہو پیارے!

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

۷

آتم[10]، ہردے[11]، جیون[12]، مرتیو[13]، ست یگ[14]، کلجگ، مایا — ہر رستے پر میں نے اپنے نور کا جال بچھایا

چاروں اور چمک کر اپنی کرنوں کو دوڑایا — جتنا ڈھونڈا، اتنا کھویا، کھو کر خاک نہ پایا

بیت گئے جُگ لیکن ساغر مجھ تک کوئی نہ آیا

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک

۸

آخر بالکل بجھ جانے کی ہو لی جب تیاری — آ کر میرے کان میں بولی اک شب یوں اندھیاری

ساجن! مجھ کو من سے لگاؤ میں بھی ہوں دکھیاری — جگ میں جس کو کوئی نہ پوچھے وہ قسمت کی ماری

اپنے دل میں مجھے بٹھا لو، اے جوتی کے رسیا!

بجھے ہوئے سے دیپک تم، میں تھکی ہوئی اندھیاری!

۸ صبح و شام
۹ سپہرِ ابدی
۱۰ روح
۱۱ دل
۱۲ زندگی
۱۳ موت
۱۴ اچھا زمانہ

اندھیاری کی باتیں سُن کر من بولا اُٹھ جاگ
یہی تری منزل ہے دیپک، یہی ہیں تیرے بھاگ

بھڑک اُٹھی سینے میں برہ کی دبی ہوئی سی آگ
آشا کے مندر میں گونجا اِک طوفانی راگ

آنکھوں میں جلتے آنسو تھے ہونٹوں پر تھیں آہیں
ڈالدیں اندھیاری کے گلے میں رو کر میں نے باہیں

یہی مری منزل تھی بابا یہی مرا مقسوم

بجھا ہوا سا دیپک ہوں میں بجھا ہوا سا دیپک
بجھا ہوا سا دیپک بابا، بجھا ہوا سا دیپک

شاہ قول — ساغر

ٹینیسن اور تخلیق عالم

(تخلیقِ عالم کے متعلق ٹینیسن کا عقیدہ عیسوی رنگ میں رنگا ہُوا ہے۔ عقلی فلسفہ سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا تو شاعر کورانہ تقلید میں مذہب کی روحانی تعبیر کا سہارا ڈھونڈتا ہے، اس کے نزدیک دُنیا کی تخلیق فرزندِ خدا "مسیح" کا معجزہ ہے)

خدا کے طاقتور فرزند! اے غیر فانی محبّت! تجھے ہم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن چشمِ عقیدت سے پہچانا ہے کیونکہ جس شے کو ہم ثابت نہیں کر سکتے اُسے اعتقاد ہی کے ذریعہ یقین کرتے ہیں۔

روشنی اور تاریکی کے دائرے تجھ ہی سے ہیں، تو نے ہی انسان اور حیوان میں زندگی کی روح دوڑائی، تو نے موت کو پیدا کیا۔ اور تیرا قدم تیری مخلوقات کے کاسۂ سر پر رکھا ہوا ہے!

ہمارے چھوٹے چھوٹے نظام بنتے ہیں، یہ بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں۔ یہ سب تیرے ہی وجود سے پھوٹے ہوئے انوار ہیں۔ اور تو اے ہمارے آقا! ان سب سے کچھ زیادہ ہے، ہم محض اعتقاد رکھتے ہیں، ہم وقوف و آگہی سے محروم ہیں علم صرف اُن اشیاء کا ہو سکتا ہے جو آنکھ سے نظر آتی ہیں، تاہم ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ سب تجھ سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ تاریکی میں روشنی کی کرن! —— اسے بسیط ہونے دے!

"ٹینیسن"

کلیسا کا سب سے بڑا باغی

والیٹر

(اقتباس و ترجمہ از انگرسول)

(بہ سلسلہ جولائی ۱۹۳۵ء) (مترجمہ سہیل عظیم آبادی)

اُس پر بہت سے الزامات اس لئے لگائے گئے کہ اس نے تمسخر کا حربہ استعمال کیا۔

فریب کاری نے تمسخر سے ہمیشہ نفرت کی ہے اور کرے گی۔ لغویات کو مزاحِ لطیف کا مزا کیا معلوم۔ حماقتوں کو ظرافت سے کیا دلچسپی۔ اور والیٹر ان چیزوں کا مالک تھا۔ اُس نے کھلے بندوں لغو اور ناممکن باتوں کا مذاق اُڑایا۔ اُس نے اصنامیات اور طلسمات، پادریوں کی احمقانہ اور پُر فریب زندگی کا بھانڈا پھوڑا۔ اُس نے دیکھا کہ بہت سے سادہ لوح اور مظلوموں پر چند چالاک ظالموں نے اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ مورّخ وہم میں مبتلا ہیں اور اپنی کتابوں کو ناممکن باتوں سے بھرے جا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف سائنسداں، صرف اتنے ہی پر قانع ہیں، جو وہ کہتے ہیں۔

والیٹر کو امکانات کا علم تھا۔ وہ اوسط کے قانون سے واقف تھا۔ سمندر کی سطح کو جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ توازن کیا چیز ہے۔ اس لئے اس نے تخئیلی تشکیل وہیئت کا مذاق اُڑا کر چھوڑا۔ جو اس کے زمانہ کے عقائد میں تھے۔ ارسطو نے کہا تھا "عورتوں کے مرد سے زیادہ دانت ہوتے ہیں" اس قول کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے عیسائی سائنسداں بار بار دہرا رہے تھے۔ والیٹر نے اُن کا شمار کیا۔ حقیقت آشکار ہو گئی اور دوسرے بھی مطمئن ہو گئے۔

سالہا سال تک اپنے ماحول اور عام مظالم کے باوجود خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ اور اس کو دینِ فطرت کہتا تھا۔ اُس نے اپنے زمانہ کے عقائد پر اس لئے حملے کئے کہ اس کے خیال کے مطابق یہ عقائد اس کے خدا کی شان اور پسند کے مطابق نہ تھے۔ وہ خدا کو خلّاقِ عالم، رحم، انصاف اور رعنائیوں کا سرچشمہ سمجھتا تھا لیکن کیتھولک کلیسا اس کو مظالم اور حماقتوں کا بھوت بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اُس نے انجیل پر اُن تمام حربوں سے حملہ کیا جو اس کی دسترس میں تھے۔ اس کی ارضیات، فلکیات، انصاف کے تخیل، رسم اور قانون، اس کے بیہودہ اور ناکارہ طلسمات، لغو عجائبات، ہر علم سے جہالت کے اظہار، مجنونانہ پیشینگوئیاں، ظالمانہ دھمکیوں اور وعدہ ہائے فراواں کا مذاق اُڑایا۔

مگر اس کے ساتھ ہی فطرت کے خدا کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔ اس خدا کی جو ہم لوگوں کو آگ اور بارش۔ روشنی اور غذا، پھول، صحت اور مسرت دیتا ہے جس نے ساری دنیا کو حُسن اور جوانی سے بھر دیا ہے۔

اُس پر ہر طرف سے حملے جاری تھے۔ مگر اس نے ہر ایک کا مقابلہ کیا۔ ہر ممکن آلہ سے ظرافت، منطق، توجیہ۔ اظہارِ نفرت، حملے۔ قہقہے اور یاس انگیزی اُس کے آلاتِ حرب تھے۔ اُس نے بارہا معافی مانگی۔ لیکن اُس کی معافی اصلی جرم سے زیادہ سخت ہوئی۔ اُس نے اکثر اظہارِ افسوس کیا۔ لیکن اس کا اظہارِ افسوس

وہ اظہارِ افسوس زیادہ قابلِ اعتراض ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے الفاظ کو واپس لیتا مگر اس طرح کہ پہلے سے زیادہ سخت الفاظ کی بوچھاڑ کے بعد اور اس طرح اپنے نشانہ پر مزید تیر برساجاتا۔ وہ کسی کی تعریف کرتا تو اس میں زہر ملا دیتا۔ وہ کبھی پیچھے ہٹ کر اور کبھی راہ بدل کر آگے بڑھا کرتا تھا۔

وہ کبھی اس کا موقع نہیں دیتا تھا کہ اس کے حریف پادری اس کو مشکلات میں دیکھیں۔ اظہار افسوس کرتے وقت وہ ضرور لکھ دیا کرتا "اُن لوگوں کا خیال ہے ۔میں اظہار افسوس ضرور کروں ۔بہت خوشی سے ۔لیکن میں کہوں گا کہ بالکل سچا تھا۔ اگر سینٹ ہوک اور سینٹ مارک ایک دوسرے کی تنقیص کرتے ہیں۔ تو اُن کے نزدیک یہ مذہب کی سچائی کا دوسرا ثبوت ہے۔ جو جانتے ہیں کہ ان چیزوں کو کس طرح سمجھنا چاہیئے۔ اور مذہب کا سب سے خوبصورت ثبوت یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت سے بالاتر ہے ـــــ میں یہاں تک یقین کروں گا کہ ہر پادری شریف طبیعت اور سچا ہے۔ سارے سادھو نہ تو مغرور ہیں اور نہ سازشی اُن کے اقوال قابلِ قبول ہیں اور اُن کے مراقبے انسانیت کی معراج ہیں۔ ایک لفظ میں ' میں یہ کہنے پر آمادہ ہوں کہ میں وہ سب کچھ کہوں گا جس کی مجھ سے خواہش رکھی جائے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی ایسے آدمی پر الزام نہیں رکھوں گا جس نے کسی کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔"

اس نے اپنی زندگی کے بہترین اوقات کو 'مظلوموں کی دادرسی' غیر محفوظ لوگوں کی حفاظت اور فرانس کے قوانین کی درستگی کی کوشش میں صرف کیا۔ تاکہ ظلم ختم ہو' پادریوں کے دل نرم ہوں۔ منصفوں کے دماغ روشن ہوں۔ بادشاہ کو صلاح نیک ملے۔ اور باشندے متمدن ہوں۔ اور انسان کے دلوں سے جنگ کی محبت دفع ہو۔

آپ خیال کرسکتے ہیں کہ میں نے بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ اس آدمی کو بہت بلندی پر لا بٹھایا ہے۔ اس لئے مجھے مشہور عالم جرمن فلسفی گوئٹے اعظم کا قول بیان کرنے دیجئے۔ وہ اس عظیم المرتبت انسان کے متعلق کیا کہتا ہے۔

ـــــ "اگر تم عمق، طباعی، تخیل کی وسعت، لُطف، توجیہ، فراست، فلسفہ، ارتقا کا ظہور، اور بحیثیت، بلند فطرت، فکر، صحتِ خیال، پختگی اور بہت سی خوبیوں کو ڈھونڈنا چاہتے ہو تو والٹیر کو دیکھو۔"

کارلائل جیسا متعصب بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "والٹیر نے رائج توہم پرستی کا قلع قمع کر دیا۔" ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے وقت کے توہمات کا قلعہ مسمار کرے۔ اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ مگر ایسے ماں باپ اب بھی موجود ہیں۔ جو اپنے پیارے بچوں کو جھوٹی باتیں سیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ سکھلانا چاہتے ہیں کہ اُن کے اعلیٰ تخیّل میں زہر مل جائے۔ اور وہ اس کو برداشت کر لیتے ہیں کہ نیک صورت مردود اُستاد ان کے بچوں کے دماغوں میں بربریت کی تخم ریزی کرے۔ بیجا خوف کے قلعہ کی نیو ڈال دے۔ انسان کے لئے اس سے بڑی نعمت کچھ نہیں ہو سکتی کہ آزاد ہو۔ اور بے خوف ہو کر زندگی گزارے آزاد مرنا غلامی کی زندگی کے دوام سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

ہر ماں باپ کو اس بات کی انتہائی ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ اُن کے پیارے بچے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے آزاد ہوں۔

اُس زمانہ میں خدا کے ماننے والوں کا عقیدہ تھا کہ نظام فطرت ظالمانہ نہیں ہے۔ حقیر چیزیں بڑی چیزوں کی بہتری کیلئے قربان کر دی جاتی ہیں ایک کی زندگی کا دوسرے کی زندگی پر انحصار ہے۔ ایک جانور دوسرے جانور کی زندگی کو ختم کر کے زندہ رہتا ہے اور چونکہ انسان سب کا بادشاہ ہے اس لئے وہ دوسروں کی زندگیوں کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے۔ یعنی کمزوروں کی زندگی اس لئے قربان کر دی جاتی ہے کہ طاقتور زندہ رہ سکیں اس توجیہ سے بہت سے لوگ مطمئن تھے۔ لیکن ہزاروں ایسے بھی تھے جو سوچتے تھے کہ کیا وجہ ہے کہ کمزور قربان کر دیا جائے۔ اور مسرت کی تلاش رنج و محن میں کی جائے۔ لیکن جب سے خوردبین کی ایجاد ہوئی۔ اور انسان اس قابل ہوا کہ بہت بڑی چیزوں کی طرح بہت ہی چھوٹی چیزوں کو بھی دیکھ سکے۔ اس کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ہمارے آباؤ اجداد غلطی کر رہے تھے۔ اور اسی لاعلمی کا نتیجہ تھا کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ صرف چھوٹوں کی زندگیاں بڑوں کے لئے قربان ہوتی ہیں۔

اب ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ہر نظر آنے والی چیز کی زندگی علیحدہ ہے۔ اور ہزاروں موقعوں پر یہ زندگیاں بہت ہی حقیر قسم کی زندگیوں کے لئے تباہ ہو جاتی ہیں۔ خود انسان جراثیم سے تباہ ہو جاتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ زرد بخار کے جراثیم کی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے فطرت نے کروڑوں انسانوں کی زندگی کی بھینٹ چڑھا دی۔ اور ساری انسانی آبادی اس چھوٹے سے کیڑے سے خوف زدہ ہو رہی ہے۔ جو ہیضہ کا باعث ہے۔ ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ ایسے جراثیم بھی ہیں جن کی خوراک صرف انسان کا دل ہے۔ دوسرے پھیپھڑوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض اعصاب سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں بہتیروں کی غذا ہماری آنکھیں ہیں۔ پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ چھوٹوں کی زندگی کا بڑوں کی زندگیوں سے خاتمہ ہوتا رہتا ہے۔

ایک زمانہ تک والٹیر پوپ کے اس خیال کا قائل تھا "انفرادی بُرائیاں، اجتماعی خوبی ہو سکتی ہیں" خوش نصیب لوگوں کیلئے یہ فلسفہ بہت اچھا ہے۔ دولتمندوں کیلئے مفید ہے۔ بادشاہوں اور پادریوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ سُننے میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ فقیروں کی پھینکنے کے لئے اچھا پتھر ہے۔ دوسروں کی بدنصیبیوں سے فائدہ حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔

لیکن فلسفہ اُن لوگوں کیلئے نہیں ہے جو مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ جو چیتھڑوں میں رہ کر صنعت کو ترقی دے رہے ہیں۔ جو اپنی حُب الوطنی کیلئے قیدخانوں میں زندگیاں گزار رہے ہیں جو اپنی سچائیوں کی وجہ سے ہر وقت دست نگر رہتے ہیں یا جو اپنے اوصاف کی وجہ سے ذات باہر کر دئے گئے ہیں۔ یہ فلسفہ صرف ایک جماعت کے لوگوں کے لئے ہے۔ صرف اُن چند لوگوں کیلئے جو خوش نصیب ہیں۔ لیکن جیسے ہی بدنصیبیاں اُن کا گلا دبوچتی ہیں یہ فلسفہ رخصت ہو جاتا ہے۔

۱۷۵۵ء میں بسبن میں زلزلہ آیا اور ایک ہیبتناک تباہی پھیلا گیا تو لوگ پوچھنے پر مجبور ہوئے "ہمارا خدا کیا کر رہا تھا؟ خلّاق عالم نے اپنی ہزاروں غریب مخلوق کو کیوں مسل ڈالا۔ اور ایسی حالت میں کہ اُن میں سے بہت سے اپنے تختوں پر جھکے۔ اسکے آگے سر جُھکائے اسکا شکریہ ادا کر رہے تھے؟" اس خوفناک تباہی کا کیا کیا جائے۔ اگر زلزلہ کو آنا ہی تھا۔ تو یہ غیر آباد صحرا میں کیوں نہ آیا۔ سمندر کے سنسان ساحل پر کیوں نہ اس کا اثر ہوا؟ اسی ہیبتناک واقعہ نے والٹیر کی مذہبی روح کو بدل ڈالا۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ دُنیا کی بہترین شکل یہ نہیں ہے اور بُرائیاں ہمیشہ سے بُرائیاں ہیں اور رہینگی۔ مذہبی لوگ خاموش تھے۔ لیکن زلزلہ نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔

ٹاوُلاز پسندیدہ شہر تھا۔ قدیم آثار سے بھرا ہوا۔ باشندے کاٹھ کے اُلّو کی طرح جاہل تھے۔ لیکن اُن کے قبضہ میں بہت سی نادر چیزیں تھیں۔ سات چیلوں کی خشک لاشیں بہت سے معصوم بچّوں کی ہڈیاں جن کو ہیروڈ نے قتل کر دیا تھا۔ کنواری مریم کے لباس کا ایک ٹکڑا۔ اور بہت سے احمقوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں جو اولیائے کے نام سے مشہور تھے۔

اس شہر میں لوگ بہت شان کے ساتھ دو مذہبی تہوار مناتے تھے۔ ایک تو ہوگنٹاس کا اخراج اور دوسرے سینٹ بارتھو سیمیو کا قتل۔ ——— یہ دو مذہبی حادثات کی یادگاریں تھیں ——— یہاں کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کلیساؤں کے چالاک پادری کرتے تھے۔

ان بھیڑیوں اور گیدڑوں کے شہر میں چند امن پسند پروٹسٹنٹ بھی آباد تھے۔ وہ بھی امن پسند اس لئے تھے کہ کہ اقلیت میں تھے ——— ان میں جین کالاز نامی خشک میوہ جات کا ایک دوکاندار تھا۔ چالیس سال سے وہ اس تجارت کو ایمانداری سے کرتا آ رہا تھا وہ نیک، ایماندار اور انصاف پسند آدمی تھا، اس کی بیوی اور دو بیٹوں کے علاوہ چار بیٹے تھے، ان میں سے ایک بیٹا کیتھولک ہو گیا۔ بڑے بیٹے مارک انٹوائن نے اپنے باپ کے پیشے کو پسند نہ کیا اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اس کو وکالت کی اجازت اس وقت تک نہیں مل سکتی تھی جبتک کہ وہ کیتھولک نہ ہو، اس نے اپنے عقائد کو چھپا کر وکالت کی سند حاصل کر لی۔ لیکن اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور اس کے خلاف نفرت پھیلی۔ اس سے وہ اتنا بد دل ہوا کہ اُس نے خودکشی کر لی۔

لیکن ٹاولاز کے مفسدوں نے یہ مشہور کر دیا کہ اُس کے باپ نے اُس کو قتل کر دیا ہے کہ کیتھولک نہ ہو جائے۔ اس الزام میں گھر

کے بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ خودکشی کرنے والے کی لاش پر پادریوں نے قبضہ کر لیا۔ اور وہ شہید کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔

وہاں کا عجیب طریقہ تھا۔ اور اس کا نام تھا مقدمہ۔ کوئی گواہ نہ تھا، کوئی شہادت نہیں تھی۔ صرف شک تھا۔ سارا ماحول ملزم کی حمایت میں تھا۔ لیکن جین کالاز کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ موت کا حکم سنا دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو ہوا۔

دوسرے دن ۱۰ مارچ کو غم زدہ باپ کو مصیبت خانہ میں لایا گیا۔ سزا دینے والوں سے صلیب پر ہاتھ رکھوا کر قسم لی گئی کہ عدالت کے حکم کے مطابق اس کو ستائیں گے۔ پھر غریب جین کی کلائیوں کو ایک آہنی کڑے سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ زمین سے چار فٹ اونچا لٹک گیا۔ اور اس کے پاؤں فرش میں پیوستہ ایک کڑے میں باندھ دیے گئے۔ اس کے بعد اُن ظالموں نے زنجیر کو کھینچکر چھوٹا کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس مظلوم کے جسم کا ہر جوڑ علیحدہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس سے سوال کیا گیا۔ اُس نے اپنی بیگناہی کا اعلان کیا۔ پھر زنجیر کھینچی جانے لگی یہاں تک کہ اس کی روح جوڑ جوڑ جسم کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ اس ظالمانہ حرکت کا نام تھا "معمولی سوال"

مجسٹریٹ نے پھر وہی سوال کیا۔ جین نے پہلا ہی جواب دیا کہ کوئی جرم ہی نہیں کیا۔ قبول کیا کروں ـــــ اس کے بعد "غیر معمولی سوال" سامنے آیا۔ یعنی ملزم کے مُنہ میں تیس پائنٹ پانی زبردستی انڈیلا گیا۔ اس طرح غریب جین کے پیٹ میں تیس پائنٹ پانی زبردستی پہنچا دیا گیا۔ غریب کو ایسی تکلیف تھی کہ جس کا تخیّل بھی لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے بیان پر ثابت قدم رہا۔

اس سزا پر بھی اُن جلّادوں کا دل نہ بھرا تو اُس کو ایک دوسری جگہ لایا گیا۔ لکڑی کے ایک صلیب سے اس کو باند دیا گیا۔ جلّاد نے ایک لوہے کی سلاخ لے کر ہاتھوں اور پاؤں پر گیارہ گیارہ ضربیں لگائیں۔ کہ ہر ایک دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا گیا۔ موت کے رحم پر۔ اندوہناک تکالیف جھیلنے کے لئے۔ لیکن وہ زندہ کیا رہتا۔ صرف دو گھنٹہ تک اپنی بیگناہی کا اعلان کرتا رہا۔ جو فضا میں تحلیل ہوتی رہیں ـــــ مرنے پر اُس کی لاش کو زنجیروں سے باندھ کر جلا دیا گیا۔

اور یہ تماشہ تھا ـــــ مذہبی تہوار ـــــ ٹاولاز کے وحشیوں کے لئے ـــــ لیکن اگر ان وحشیوں کے دل مسرّت کی موجوں سے ٹکراتے نہ ہوتے تو کیا حشر ہوتا ـــــ دُنیا میں امن' اور انسان کے ساتھ اخلاق کا ؟

لیکن ان کا دل اب بھی نہ بھرا۔ اس خاندان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ بیٹے کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ کیتھولک ہو جائے اور دل شکستہ بیوہ کو در در کی خاک چھاننے کے لئے نکال دیا گیا۔

والیٹر نے اس واقعہ کو سُنا۔ اس کی روح شعلوں میں رقص کرنے لگی۔ جین کے ایک بیٹے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس روح فرسا حادثہ کی تفصیل بادشاہ، ملکہ اور قانون پیشہ لوگوں کو لکھ کر بھیجی۔ سالہا سال تک اُس نے جین کالاز کی چیخوں کی صدائے بازگشت سے سارے یورپ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ فیصلہ غلط ثابت ہوا۔ غریب جین بے گناہ ثابت ہوا۔ اور ہزارہا ڈالر اس مصیبت زدہ خاندان کی امداد کے لئے جمع کئے گئے۔ یہ والیٹر کا کام تھا ـــــ

(۲)

سروِن نامی ایک پروٹسٹنٹ لینگڈوک میں رہتا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی اور تین بیٹیاں تھیں۔ پادری کے ملازم نے اس کی ایک لڑکی کو کیتھولک بنانا چاہا۔ قانون نے پادریوں کو اس بات کی عام اجازت دے رکھی تھی کہ پروٹسٹنٹ لوگوں سے بچے چھین لیں تاکہ اُن کی روح بُرے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ اس قانون کے ماتحت وہ چھوٹی لڑکی اس سے چھین کر کنونٹ میں رکھی گئی۔ لیکن وہ پھر بھاگ کر

اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی ——— اُف اُس معصوم کے سارے جسم پر کوڑوں کے نشانات تھے۔

"چھوٹے بچو! مجھ تک پہنچنے کے لئے مصیبتیں برداشت کرو۔"

لیکن اس معصوم بچی کا خوف سے دماغ خراب ہوچکا تھا۔ وہ یکایک غائب ہوگئی۔ اور تین دن کے بعد گھر سے تین میل کے فاصلے پر ایک کنوئیں سے اس کی لاش برآمد ہوئی۔ پادریوں نے شور مچایا کہ اس کے عزیزوں نے اُس کو اس لئے مار ڈالا ہے کہ کیتھولک نہ بنجائے۔

یہ واقعہ عیسائیوں کے مقدس شہر ٹاؤلاز سے تھوڑی دور فاصلہ پر پیش آیا۔ ان دنوں غریب جین کالاز قید کی مصیبتیں جھیل رہا تھا۔

سروَن جانتا تھا کہ اس مقدمہ کا انجام ہیبتناک سزا پر ہوگا۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بھاگ گیا ——— لیکن اُن کی غیر حاضری ہی میں ان کی سزا ہو گئی۔ جائداد ضبط کر لی گئی۔ والدین کو موت اور بچوں کو دیس نکالے کی سزا دی گئی۔

یہ خاندان سردیوں میں بھاگا تھا۔ ساتھ میں ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہوگئی تھی۔ اُس نے الپس کے برفانی پہاڑ پر ایک بچہ جنا۔ بیوی مر گئی۔ اور جب سروَن سوئٹزرلینڈ پہنچا تو باحال تباہ۔ ایسی حالت میں اُس کے پاس کچھ نہ تھا۔

یہ لوگ والٹیر کے پاس پہنچے۔ اُس نے ان بدنصیبوں کی حمایت کی۔ اُن کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ ضروریات پوری کرتا رہا۔ اور مسلسل نو سال تک اس فیصلہ کے خلاف لڑتا رہا۔ جو زبردستی ان لوگوں کے خلاف سُنایا گیا تھا۔ اُس نے بادشاہوں اور کیتھرائن دوئم ملکۂ روس اور دوسروں سے مالی امداد کی اپیل کی اور کامیاب ہوا۔ اُس نے اس مقدمہ کے متعلق کہا۔ سروَن خاندان کے لوگوں پر جنوری ۱۷۶۲ء میں مقدمہ چلا اور دو گھنٹہ کے اندر فیصلہ سُنا دیا گیا۔ اور آج ۱۷۷۲ء میں یعنی دس سال بعد اُن کی دادرسی ہوئی۔ اُن کے حقوق واپس ملے۔

یہ کام والٹیر کا تھا۔ وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ خدا کی پرستش کرنے والے لوگ انسان سے محبت کرنے والے شخص سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟

۱۷۴۸ء کی بات ہے اسپناسے نامی ایک ذی حیثیت پروٹسٹنٹ نے اپنے گھر میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کو رہنے کی جگہ دی اور کھانا بھی کھلا دیا ——— مگر پادریوں کے راج میں یہ جرم تھا۔

اِس جرم کے لئے اسپناسے پر مقدمہ چلا۔ اور سزا ہوئی کہ ساری زندگی ایک معمولی جہاز میں بسر کرے۔ تیئیس سال کے بعد اس کی خبر والٹیر کو ملی۔ والٹیر نے اس کی رہائی کی جدوجہد کی۔ اور کامیاب ہوا۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ بہت سے مصنفوں، ڈرامہ نویسوں، ایکٹروں، بیواؤں اور یتیموں کے ان واقعات کو بیان کیا جائے جن سے معلوم ہو کہ والٹیر نے دوسروں کے لئے اپنا اثر، اپنا وقت، اور اپنا سرمایہ برباد کیا۔ اور مسلسل کرتا رہا۔ اور اس کی حق پسندی انسانیت پروری اور اخلاقی بُلندی کا علم ہو۔ لیکن میں ایک واقعہ اور بھی بیان کروں گا۔

۱۷۶۵ء کا واقعہ ہے۔ لکڑی کا ایک صلیب ایک پل کے اوپر کٹا چھنٹا ہوا ملا۔ لیکن یہ معمولی بات نہیں تھی۔ جب دو لکڑیاں مل کر صلیب بناتی ہیں۔ تو انسانی خون، گوشت، اور زندگی سے زیادہ قیمتی بنجاتی ہے۔ اس جرم کا دو نوجوانوں پر شبہ کیا گیا۔ ایک تو شیولیر ڈی لا بیرے اور دوسرا دی اتالوندے مشتبہ ہوا۔ دی اتالوندے پروشیا بھاگ گیا۔ اور وہاں کی فوج میں شامل ہوگیا۔

لا بیرے نہ بھاگا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ اور بغیر کسی معمولی شہادت اور کارروائی کے اس کو سزا دی گئی۔ دی اتالوندے کو بھی سزا ہوئی۔ مگر وہ تھا ہی نہیں۔ سزا دیتے تو کس کو۔ اب سزاؤں کی فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) معمولی اور غیر معمولی جسمانی سزائیں۔

(۲) زبانیں گُدی سے کھینچ لی جائیں۔

(۳) کلیسا کے دروازہ پر دونوں کے داہنے ہاتھ کاٹے جائیں۔
(۴) آہنی زنجیروں میں جکڑ کر دھیمی آگ میں اُن کو زندہ جلا دیا جائے۔
لیکن مقدس پادریوں کو انجیل مقدس کا یہ کلام یاد آگیا — "ہماری دخل اندازی کو معاف کر دو جس طرح ہم دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں —"

اس لئے ججوں نے فیصلہ بدل دیا۔ اور یہ رعایت کی کہ اُن کو دہکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کرنے سے پہلے اُن کے سر قلم کروائے جائیں۔ مقدمہ کی اپیل پیرس میں ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت پچیس فاضل ججوں نے کی۔ اور فیصلہ بحال رہا۔ اور یکم جولائی ۱۷۶۶ء کو ملزم کو سزا مل گئی۔

جب والٹیر نے انصاف کے گلے پر اس طرح چھری پھیرے جانے کا واقعہ سُنا تو اُس نے فرانس کو چھوڑ دینے کا عہد کر لیا ایسے ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا عہد، جہاں ایسے ایسے ہیبت ناک مظالم انصاف کے نام پر ہوتے ہوں۔ اُس نے اس مقدمہ کی تفصیل ایک پمفلٹ کی شکل میں لکھی۔

پھر اُس نے دی اتالونڈے کا پتہ لگایا۔ اپنی طرف سے پروشیا کے بادشاہ کو خط لکھا۔ اور فوج کی سخت ملازمت سے رہائی دلائی۔ اپنے گھر لایا اور ڈیڑھ سال تک ساتھ رکھا۔ اُس کو نقاشی، ریاضی، اور انجنیرنگ کی تعلیم دی اور فریڈرک اعظم کی فوج میں اس کو انجنیروں کے کپتان کی حیثیت سے دیکھنے کی مسرت حاصل کی۔

والٹیر ایسا عظیم الفطرت انسان تھا۔ وہ بیکسوں اور مظلوموں کا پشت پناہ تھا۔ وہ ایسا منصف تھا جہاں کلیسا اور حکومت کے ستائے ہوئے اپیل کرتے اور اُن کی دادرسی ہوتی تھی۔

پھر بھی وہ لوگ جو اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنے کے دعویدار ہیں۔ ڈیڑھ سو سال تک اس کو گالیاں دینے میں اپنی زبان کی طاقت صرف کرتے رہے۔ صرف اس لئے کہ اپنے اصولوں کی لغویت کو والٹیر کی روشن دماغی سے محفوظ رکھ سکیں۔

اس نے بہت ہی بلند مقام سے دُنیا کا جائزہ لیا — ہاں اس میں کچھ عیوب بھی تھے لیکن ایسے جو پادریوں میں بھی عام تھے۔ اور جو خوبیاں تھیں وہ تنہا اُسی کی تھیں

وہ عام تعلیم اور تربیت کا حامی تھا۔ لیکن پادری اس کے مخالف تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ دُنیا کا صحیح علم ہر انسان کو ہو سکے۔ اسی لئے ہر مقدس ریاکار اس کا دشمن تھا۔ وہ باغ عدن کے دروازہ سے وہم کے بھوت کو بھگا دینا چاہتا تھا۔ تاکہ آدم کی اولاد شجر علم کے پھلوں کا ذائقہ چکھ سکے۔ لیکن کلیسا نے اس کی راہ روکی۔ کیونکہ اُس کے ایمان پر شجر جہالت کے پھل فروخت کیلئے سجائے ہوئے تھے۔

وہ انسائیکلوپیڈیا کا بڑا حامی تھا۔ اور اس بات کی ہر ممکن کوشش اُس نے کی کہ معلومات کا خزانہ ہر ایک کے ہاتھ لگ جائے۔

جہاں تک اصول کا تعلق ہے وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا قانون داں تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اصلاحات اور فیصلوں کو جانتا تھا۔ بلکہ یہ کہ وہ اس کو سمجھتا تھا کہ قانون کیا ہونا چاہئے۔ اور ان پر عمل درآمد کیسے ہو۔ وہ شہادت کے فلسفہ کو سمجھتا تھا۔ اور شبہ اور دلیل کی حقیقت کو بھی۔ عقیدہ اور علم میں فرق کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور وہ خاموش بھی نہیں رہا — حکومت کی اصلاح اور عدالتوں کی برائیوں کو دور کرنے کی سب سے زیادہ کوشش اپنے عہد کے قانون داں لوگوں میں اُسی نے کی۔

اپنے اسکول کے زمانہ میں اُس نے سسرو کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ اُس سسرو کی تصنیفات کا جو شاید سب سے بڑا رومن مقرر گزرا ہے۔ اُس نے ذاتوں کی تقسیم اور برتری کو غلط کہا۔ اور عام انسانی برابری کا قائل تھا — اُس کے اقوال ہیں :-

۱۰۷

اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی —— اُف اُس معصوم کے سارے جسم پر کوڑوں کے نشانات تھے۔

"چھوٹے بچّو! مجھ تک پہنچنے کے لئے مصیبتیں برداشت کرو۔"

لیکن اس معصوم بچّی کا خوف سے دماغ خراب ہوچکا تھا۔ وہ یکایک غائب ہوگئی۔ اور تین دن کے بعد گھر سے تین میل کے فاصلے پر ایک کنوئیں سے اس کی لاش برآمد ہوئی۔ پادریوں نے شور مچایا کہ اس کے عزیزوں نے اُس کو اس لئے مار ڈالا ہے کہ کیتھولک نہ بنجائے۔

یہ واقعہ عیسائیوں کے مقدس شہر ٹاؤلاز سے تھوڑی دور فاصلہ پر پیش آیا۔ ان دنوں غریب جین کالاز قید کی مصیبتیں جھیل رہا تھا۔ سروَن جانتا تھا کہ اس مقدمہ کا انجام ہیبتناک سزا پر ہوگا۔ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ بھاگ گیا —— لیکن اُن کی غیر حاضری ہی میں ان کی سزا ہوگئی۔ جائداد ضبط کرلی گئی۔ والدین کو موت اور بچّوں کو دیس نکالے کی سزا دی گئی۔

یہ خاندان سردیوں میں بھاگا تھا۔ ساتھ میں ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہوگئی تھی۔ اُس نے الپس کے برفانی پہاڑ پر ایک بچہ جنا۔ بیوی مر گئی۔ اور جب سروَن سوئٹزرلینڈ پہنچا تو باحال تباہ۔ ایسی حالت میں اُس کے پاس کچھ نہ تھا۔

یہ لوگ والٹیر کے پاس پہنچے۔ اُس نے ان بدنصیبوں کی حمایت کی۔ اُن کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ ضروریات پوری کرتا رہا۔ اور مسلسل نو سال تک اس فیصلہ کے خلاف لڑتا رہا۔ جو زبردستی ان لوگوں کے خلاف سُنایا گیا تھا۔ اُس نے بادشاہوں اور کیتھرائن دوئم ملکۂ روس اور دوسروں سے مالی امداد کی اپیل کی اور کامیاب ہوا۔ اُس نے اس مقدمہ کے متعلق کہا۔ سروَن خاندان کے لوگوں پر جنوری ۱۷۶۲ء میں مقدمہ چلا اور دو گھنٹہ کے اندر فیصلہ سُنادیا گیا۔ اور آج ۱۷۷۲ء میں یعنی دس سال بعد اُن کی دادرسی ہوئی۔ اُن کے حقوق واپس ملے۔

یہ کام والٹیر کا تھا۔ وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ خدا کی پرستش کرنے والے لوگ انسان سے محبت کرنے والے شخص سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟

۱۷۴۰ء کی بات ہے اسپناسے نامی ایک ذی حیثیت پروٹسٹنٹ نے اپنے گھر میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کو رہنے کی جگہ دی اور کھانا بھی کھلا دیا —— مگر پادریوں کے راج میں یہ جرم تھا۔

اِس جرم کے لئے اسپناسے پر مقدمہ چلا۔ اور سزا ہوئی کہ ساری زندگی ایک معمولی جہاز میں بسر کرے۔ تیئیس سال کے بعد اس کی خبر والٹیر کو ملی۔ والٹیر نے اس کی رہائی کی جدوجہد کی۔ اور کامیاب ہوا۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ بہت سے مصنفوں، ڈرامہ نویسوں، ایکٹروں، بیواؤں اور یتیموں کے ان واقعات کو بیان کیا جائے جن سے معلوم ہو کہ والٹیر نے دوسروں کے لئے اپنا اثر، اپنا وقت، اور اپنا سرمایہ برباد کیا۔ اور مسلسل کرتا رہا۔ اور اس کی حق پسندی انسانیت پروری اور اخلاقی بُلندی کا علم ہو۔ لیکن میں ایک واقعہ اور بھی بیان کروں گا۔

۱۷۶۵ء کا واقعہ ہے۔ لکڑی کا ایک صلیب ایک پل کے اوپر کٹا چھنٹا ہوا ملا۔ لیکن یہ معمولی بات نہیں تھی۔ جب دو لکڑیاں مل کر صلیب بناتی ہیں۔ تو انسانی خون، گوشت، اور زندگی سے زیادہ قیمتی بنجاتی ہے۔ اس جرم کا دو نوجوانوں پر شبہ کیا گیا۔ ایک تو شیو ئیلیر ڈی لا برے اور دوسرا دی اتالوندے مُشتبہ ہوا۔ دی اتالوندے پرشیا بھاگ گیا۔ اور وہاں کی فوج میں شامل ہوگیا۔

لا بیرے نہ بھاگا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ اور بغیر کسی معمولی شہادت اور کارروائی کے اس کو سزا دی گئی۔ دی اتالوندے کو بھی سزا ہوئی۔ مگر وہ تھا ہی نہیں۔ سزا دیتے تو کس کو۔ اب سزاؤں کی فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) معمولی اور غیر معمولی جسمانی سزائیں۔

(۲) زبانیں گدّی سے کھینچ لی جائیں۔

(۳) کلیسا کے دروازہ پر دونوں کے داہنے ہاتھ کاٹے جائیں۔
(۴) آہنی زنجیروں میں جکڑ کر دہکتی آگ میں اُن کو زندہ جلا دیا جائے۔
لیکن مقدس پادریوں کو انجیل مقدس کا یہ کلام یاد آگیا۔ "ہماری دخل اندازی کو معاف کردو جس طرح ہم دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں۔"
اس لئے ججوں نے فیصلہ بدل دیا۔ اور یہ رعایت کی کہ اُن کو دہکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کرنے سے پہلے اُن کے سر قلم کروائے جائیں۔ مقدمہ کی اپیل پیرس میں ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت پچیس فاضل ججوں نے کی۔ اور فیصلہ بحال رہا۔ اور یکم جولائی ۱۷۶۶ء کو ملزم کو سزا مل گئی۔
جب والٹیر نے انصاف کے گلے پر اس طرح چھری پھیرے جانے کا واقعہ سُنا تو اُس نے فرانس کو چھوڑ دینے کا عہد کر لیا ایسے ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا عہد، جہاں ایسے ایسے ہیبت ناک مظالم انصاف کے نام پر ہوتے ہوں۔ اُس نے اس مقدمہ کی تفصیل ایک پمفلٹ کی شکل میں لکھی۔
پھر اُس نے دی اتالوندے کا پتہ لگایا۔ اپنی طرف سے پروشیا کے بادشاہ کو خط لکھا۔ اور فوج کی سخت ملازمت سے رہائی دلائی۔ اپنے گھر لایا اور ڈیڑھ سال تک ساتھ رکھا۔ اُس کو نقاشی، ریاضی، اور انجنیرنگ کی تعلیم دی اور فریڈرک اعظم کی فوج میں اس کو انجنیروں کے کپتان کی حیثیت سے دیکھنے کی مسرت حاصل کی۔
والٹیر ایسا عظیم الفطرت انسان تھا۔ وہ بیکسوں اور مظلوموں کا پشت پناہ تھا۔ وہ ایسا منصف تھا جہاں کلیسا اور حکومت کے ستائے ہوئے اپیل کرتے اور اُن کی دادرسی ہوتی تھی۔
پھر بھی وہ لوگ جو اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنے کے دعویدار ہیں۔ ڈیڑھ سو سال تک اس کو گالیاں دینے میں اپنی زبان کی طاقت صرف کرتے رہے۔ صرف اس لئے کہ اپنے اصولوں کی لغویت کو والٹیر کی روشن دماغی سے محفوظ رکھ سکیں۔
اس نے بہت ہی بلند مقام سے دُنیا کا جائزہ لیا۔ ہاں اس میں کچھ عیوب بھی تھے لیکن ایسے جو پادریوں میں بھی عام تھے۔ اور جو خوبیاں تھیں وہ تنہا اُسی کی تھیں
وہ عام تعلیم اور تربیت کا حامی تھا۔ لیکن پادری اس کے مخالف تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ دُنیا کا صحیح علم ہر انسان کو ہو سکے۔ اسی لئے ہر مقدس ریاکار اس کا دشمن تھا۔ وہ باغ عدن کے دروازہ سے وہم کے بھوت کو بھگا دینا چاہتا تھا۔ تاکہ آدم کی اولاد شجر علم کے پھلوں کا ذائقہ چکھ سکے۔ لیکن کلیسا نے اس کی راہ روکی۔ کیونکہ اُس کے ایمان پر شجر جہالت کے پھل فروخت کیلئے سجائے ہوئے تھے۔
وہ انسائیکلوپیڈیا کا بڑا حامی تھا۔ اور اس بات کی ہر ممکن کوشش اُس نے کی کہ معلومات کا خزانہ ہر ایک کے ہاتھ لگ جائے۔
جہاں تک اصول کا تعلق ہے وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا قانون داں تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اصلاحات اور فیصلوں کو جانتا تھا۔ بلکہ یہ کہ وہ اس کو سمجھتا تھا کہ قانون کیا ہونا چاہئے۔ اور ان پر عمل درآمد کیسے ہو۔ وہ شہادت کے فلسفہ کو سمجھتا تھا۔ اور شبہ اور دلیل کی حقیقت کو بھی۔ عقیدہ اور علم میں فرق کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور وہ خاموش بھی نہیں رہا۔ حکومت کی اصلاح اور عدالتوں کی برائیوں کو دور کرنے کی سب سے زیادہ کوشش اپنے عہد کے قانون داں لوگوں میں اُسی نے کی۔
اپنے اسکول کے زمانہ میں اُس نے سسرو کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ اُس سسرو کی تصنیفات کا جو شاید سب سے بڑا رومن مقرر گزرا ہے۔ اُس نے ذاتوں کی تقسیم اور برتری کو غلط کہا۔ اور عام انسانی برابری کا قائل تھا۔ اُس کے اقوال ہیں:-

"سارے آدمی برابر پیدا ہوتے ہیں"
"ہم لوگوں کو صلاحیتوں اور خوبیوں کی عزت کرنی چاہیئے"
"ہم لوگوں کو یہ بات دلنشین کر لینی چاہیئے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں"

وہ ہر قسم کی غلامی کا بدترین دشمن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رنگوں کے اختلاف کی وجہ سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ دوسروں کے حقوق پر چھاپہ مار دے۔ وہ چنڈالوں اور کسانوں کا دوست تھا' جانوروں' عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش اُس نے کی۔ اور اُن لوگوں سے حفاظت کی جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں سے ٹھیک اپنی طرح محبت کرتے ہیں۔

یہ والٹیر ہی تھا جس نے فرینکلن اور طامس اپنے کے دل و دماغ میں آزادی کا بیج بویا۔

مکاروں نے غلامی کی حمایت میں دلیل پیش کی "کہ غلامی کی بنیاد ایک قسم کے معاہدہ پر ہے"

والٹیر نے جواب دیا۔ "وہ معاہدہ دکھاؤ۔ اور اگر کسی غلام کے اس پر دستخط ہوں تو میں تمہاری دلیل مان لوں گا"

وہ اس خیال کو لغو سمجھتا تھا کہ خدا نے باپ کو تو ڈوب جانے دیا اور بچوں کو بچانے کے لئے آیا اور اپنی جان دیدی۔ یہ خیال ٹھیک ڈائڈ بروٹ کے خیال سے ملتا جلتا ہے اُس نے کہا تھا ـــــ "اگر مسیح میں یہ طاقت تھی کہ خود کو یہودیوں سے بچا سکتے لیکن اس طاقت کو استعمال کرنے سے انھوں نے انکار کیا۔ تو اُن پر خودکشی کا الزام عائد ہوتا ہے"

والٹیر میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت تھی کہ لکڑی کا الاؤ جلانے سے دماغ میں روشنی نہیں ہو سکتی۔ وہ ظالموں سے نفرت اور کلیسا اور حکومت کے مظلوموں سے ہمدردی کرتا تھا۔ وہ بدنصیبوں کا دوست اور جدوجہد کرنے والوں کا معاون تھا۔ وہ بادشاہوں کی عشرت پسندی اور پادریوں کی خودنمائی کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

والٹیر ولی نہیں تھا۔ اُس کی تعلیم گو پادریوں میں ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی نجات کے لئے کبھی پریشان نہ ہوتا تھا۔ وہ مذہبی جھگڑوں پر ہنستا تھا۔ اصولوں کو دیکھ کر اُن کے دماغی افلاس پر رحم کھاتا تھا۔ لیکن متعصبوں پر اس کو غصہ آجاتا تھا۔ وہ ولیوں سے بہت زیادہ بلند فطرت انسان تھا۔

اُس زمانہ میں زیادہ تر عیسائی کا مذہب روزانہ ضروریات کے لئے نہ تھا۔ بلکہ مصیبت کے وقت سپر کا کام لینے کے لئے والٹیر انسانیت کے مذہب پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اچھے کام کرنا اُس کا فعل تھا۔ کئی صدیوں تک کلیسا نے اپنی بہیم کوششوں سے خوبیوں کو بھونڈے رنگ میں چھپائے رکھا۔ اور برائیاں حسن بنا کر پیش کی جاتی رہیں۔ والٹیر نے مفید چیزوں کے حسن اور توہمات کی برائیوں کو بے نقاب کیا۔

وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر یا ڈرامہ نویس نہ تھا۔ بلکہ سب سے بڑا انسان تھا۔ آزادی کا سب سے بڑا دوست اور توہمات کا سب سے بڑا دشمن۔

اُس نے توہمات کی زنجیروں کی کڑیاں بکھیرتے، لوگوں کے دلوں سے بیجا خوف و ہراس کے بھوت کو نکالنے اور کلیسا کی حکومت کو برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تاکہ دنیا کو آدمیوں کی غلامی سے نجات مل جائے ـــــــــ یعنی وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مذہبی آدمی تھا۔

ستائیس سال کے دیس نکالے اور ساری مہذب دنیا میں غیر فانی شہرت اور عزت حاصل کرنے کے بعد والٹیر پیرس واپس آیا۔ اس کا یہ سفر فاتحانہ اقدام تھا۔ وہ پیرس میں فاتح جنرل کی طرح داخل ہوا۔ ہزارہا آدمی اس کے استقبال میں شریک ہوئے۔ علمی اداروں

نے دعوتیں دیں۔ اس کا حزنیہ ڈراما " آئرینے" اسٹیج کیا گیا۔ اُس کے سر پر پھولوں کا تاج رکھا گیا جس کی خوشبو سے اس کو نشہ سا ہونے لگا۔ وہ سب سے بڑا ادیب تھا۔ اور بہت سے ادیب اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ وہ عام دُنیا والوں سے بہت بُلند تھا۔ اب فرانس میں تین طاقتیں تھیں۔ حکومت، کلیسا، اور والٹیر۔

بادشاہ والٹیر کا دشمن تھا۔ لیکن کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کلیسا والوں کا دل جہنّم کی بھٹّی بنا ہوا تھا جس میں والٹیر کے خلاف انتقام کی آگ سلگ رہی تھی لیکن جمہور میں اس کا اثر تھا۔ ہر مظلوم اس کا فدائی تھا۔ اس لئے نہ تو کلیسا اور نہ بادشاہ ہی اس کا کچھ بگاڑ سکتے تھے۔ وہ فرانس کا دیوتا بنا رہا۔ اور اس کی حریف طاقتیں دیکھ دیکھ کر اپنے غصّہ کی آگ میں جلتی رہیں۔

اب وہ چوراسی ۸۴ برس کا بوڑھا تھا۔ دُنیا کی مسرتیں اس کے قدموں میں لوٹ رہی تھیں۔ وہ بہت ہی دولتمند آدمی تھا۔ دُنیا کا سب سے بڑا دولتمند مصنّف! وہ ذہنی حیثیت سے مصنّفوں کا بادشاہ تھا۔ اور یہ ساری چیزیں خود اُس کی حاصل کردہ تھیں۔ پادری اس کی کامرانیوں کو دیکھ کر حسد اور غصّہ کی آگ میں جل رہے تھے۔ لیکن اُس کا خدا اُس پر اپنی رحمتوں اور نعمتوں کے پھول برسا رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بہت ہی مغرور ہو گیا تھا۔ غرور کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس طرح کی باتیں جیسے سارے پادری اس کی نظروں میں کتّوں کی طرح ذلیل تھے۔

اُس کا یہ رنگ دیکھ کر پادریوں کو بھی خوف ہوا۔ وہ والٹیر کی بربادی کی دُعائیں کرتے۔ گڑگڑا کر کہتے۔ والٹیر کی نظر دُنیا والوں کے لئے بہت ہی خراب ہو گی لیکن اُن کے خدا نے اُن کی بات نہ سُنی۔ عبودیت کے آنسو رائیگاں گئے۔

مئی ۱۷۷۸ء کے اواخر میں پیرس میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ والٹیر کی حالت اچھی نہیں۔ اب وہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے۔ اس خبر کو سُن کر توہّمات کے گدھ پھر اپنے شکاروں کی تلاش میں نکل پڑے۔

اُس کی موت سے دو دن پہلے اس کے بھتیجے نے چند پادریوں کو بلا لیا۔ سیاہ دل پادری سفید لباس پہنے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اُس سے کہا۔ "ہمارے مالک مسیح کی بزرگی کا اقرار کرو، تمہاری روح کو سکون ہو گا"

والٹیر نے پادری کو آہستہ سے اپنے پاس سے الگ کیا۔ اور کہا "مجھے آرام سے مرنے دو" پھر اپنے ملازم سے کہا۔ "میری طرف سے اِن لوگوں کا شکریہ ادا کرو"

پادریوں نے سمجھا کہ وہ ہذیان کی تکلیف میں مبتلا ہے، لیکن وہ بالکل اچھا تھا۔ اُس کا دماغ اور دل پہلے ہی کی طرح روشن تھے اور پادریوں کی آنکھیں انھیں اب بھی دھوکہ دے رہی تھیں۔

۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو سوا گیارہ بجے رات کو وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اِس دُنیا سے چل بسا۔ مرنے سے چند منٹ پہلے اس نے اپنے مقرّب خاص موراند کا ہاتھ پکڑ کر کہا ——— "میرے عزیز اب میں چلا ——"

پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے ———

عجیب و غریب انسان والٹیر! غریبوں اور مظلوموں کا حامی۔ مکّاروں اور ظالموں کا دشمن۔ ذہنی انقلاب و آزادی کا پیغمبر والٹیر۔ زندہ باد۔

اقتصادی بدحالی اور اسکے اسباب

(از:- سیّد محمد یحییٰ میرٹھی)

(وہ تقریر جو ۲۶ستمبر ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کی گئی)

کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا علم اور تمدن میں جتنی ترقی کرتی ہے اُسی تناسب سے بدبختیوں اور تکلیفوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انسانی سوسائٹی کی ابتداء بالکل سادہ زندگی سے ہوئی۔ لوگ محنت کرتے تھے اور اس محنت کا اجر پاتے تھے۔ اس جاہل لیکن ایماندار سوسائٹی میں اقتصادیات صرف محنت کرنے اور پیٹ بھرنے کا نام تھا۔ رفتہ رفتہ دماغی پرواز شروع ہوئی۔ اس سادہ نظام زندگی میں تمدن نے قدم رکھا۔ تمدن نے سوسائٹی کی ظاہری حالت کو ضرور خوشنما بنایا لیکن غیر معمولی فساد کا بیج بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ بو دیا۔

ابتدائی نظام چونکہ بالکل سادہ تھا اس لئے اس کی ضروریات بھی محدود تھیں۔ خرچ کے مطابق پیداوار ہوتی تھی اور ضرورت کے مطابق صنعتیں نفع کمانے اور محفوظ کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تمدن کا ارتقا ہوا۔ انسانی معاشیات ایک خاص مرحلہ پر پہنچ کر اقتصادی گورکھ دھندے میں پھنس گئیں آمد و رفت کے تیز تر وسیلوں نے دُنیا کے مختلف حصوں کو جوڑ دیا۔ ضروریات بڑھیں اور اشیاء کے مبادلے اور نکاس کا رقبہ پھیلاؤ میں برابر بڑھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منڈیاں قائم ہوئیں۔ ایک جگہ کا پیدا کردہ مال دوسری جگہ فروخت ہونے لگا۔ منڈیوں کے قیام نے مقامی بے احتیاجی (Self sufficiency) کو ختم کر دیا۔ "پیدا کرنے والوں" اور "صرف کرنے والوں" میں ایک حدّ فاصل قائم ہوگئی۔ اس وقت ضرورت پڑی کہ ایک ایسا آدمی تلاش کیا جائے جو پیدا کرنے والے کے مال کو صرف کرنے والے تک پہنچا دے۔ اس طرح اقتصادی نظام میں ایک نئے شخص کا ظہور ہوا جسے اقتصادیات کی اصطلاح میں "آڑتی" یا "مڈل مین (Middle man)" کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ "آڑتی" یا دوسرے لفظوں میں "بیچ کا بچولیا" ہی تمام اقتصادی نامرادیوں کی اصل جڑ ہے۔

بہرکیف آڑتی کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کی ضروریات کی مقدار کا اندازہ کرے اور اس کے مطابق سامان فراہم کرے۔ رفتہ رفتہ آڑتی کا اثر سماج کے اس طبقہ پر زیادہ ہوگیا جس نے سامان اور ضروریات پیدا کرنے کا فرض اپنے ذمہ لیا تھا۔ آڑتی کو فکر ہوئی کہ اپنے پیشہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع اُٹھائے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے کاریگروں کو خام اشیاء دینے کا کام بھی اپنے ہی متعلق کر لیا۔ ان کا تیار کیا ہوا مال اپنے ہاں رکھنے لگا ______________________ اور اپنی طرف سے کاریگروں کو اُجرت دینے لگا۔ یہ اقتصادی کایا پلٹ تھی کہ "آڑتی" مالک بن بیٹھا اور جو اصل کاریگر یا "پیدا کرنے والا" تھا وہ اس اقتصادی اُلٹ پھیر میں مزدور کے درجہ پر ڈھکیل دیا گیا۔

اقتصادی ہیئت کا ارتقاء ایک لمبی چوڑی کہانی ہے لیکن جو کچھ مجھے کہنا ہے اس کی پہلی کڑی ابھی میں نے چند لفظوں میں پیش کی ہے۔ موجودہ اقتصادی حالت کے فوری اسباب سے پہلے ابھی بعض درمیانی کڑیوں پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس مرحلہ پر انسانی اقتصادیات نے ایک اور

پلٹا کھایا۔ اس عہد تک منڈیاں بھی قائم تھیں۔ آڑتی بھی وجود میں آچکا تھا اور آمد و رفت کے وسائل بھی وسیع ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی تجارت کا پھیلاؤ محدود تھا۔ اب تجارت میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا جسے "تخمین" یا انگریزی زبان میں ([illegible]) کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس انقلاب کا نشو و نما ہوا۔ تجارتی حد بندیاں توڑی گئیں اور اشیاء کی تیاری کا کام جھونپڑوں اور دکانوں سے ہٹ کر فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہونے لگا۔ دستکاری کی جگہ مشینوں نے لی اور اشیاء کی تیاری بڑے پیمانہ پر ہونے لگی۔ بھاپ کو قید کیا گیا اور دخانی انجن کی ایجاد نے آمد و رفت کو بہت وسیع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منڈیاں کثرت سے قائم کی گئیں اور مختلف منڈیوں کے درمیان تجارتی رشتے قائم کئے گئے۔ اس صنعتی انقلاب نے "مال کے بنانے والے" اور "مال کے استعمال کرنے والے" کے درمیان اور بھی زیادہ دوری پیدا کر دی۔

جیسے جیسے یہ دوری بڑھتی گئی اسی نسبت سے آڑتی کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ سماج کی ضروریات کیا ہیں اور کس قدر ہیں۔ انگلستان کے کپڑے کے آڑتی کو یہ ضرورت پیدا ہوئی کہ ہندوستانیوں کے رہن سہن اور معیار لباس کے متعلق معلومات حاصل کرے تاکہ اس معیار کے مطابق لنکاشائر اور مانچسٹر کے کارخانوں میں کپڑا تیار کرا سکے۔ طرز لباس کے ساتھ ساتھ اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوا کہ ضرورت کی مقدار بھی معلوم کی جائے۔ اس اندازہ میں غلطی کرنا بہت خطرناک نتائج کا باعث تھا کیونکہ وہ تجارتی تعطل کا پیش خیمہ ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی آڑتی کے اندازہ کے مطابق کسی فیکٹری میں ایک ہزار مزدور کپڑا تیار کرنے کے لئے لگا دیئے گئے اور کپڑا تیار ہونے لگا۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ کپڑا ضرورت سے زیادہ تیار ہو گیا تو زائد مال آڑتی کے پاس ہی رہے گا۔ جب مال فروخت ہونے سے رہ گیا تو قدرتاً آڑتی مزید مال تیار نہیں کرائے گا اور اُسے مال کی تیاری روک دینی ہوگی۔ مجبوراً کارخانہ دار کو بہت سے مزدور برطرف کر دینے پڑینگے اور ان مزدوروں کا کوئی ذریعۂ معاش باقی نہ رہے گا۔ تو اب صورتِ حال کیا ہوئی۔ پہلے تو دستکار تباہ ہوئے کہ کام مشینوں سے ہونے لگا۔ اور یہ دستکار مزدور بن گئے اور اس کے بعد یہی دستکار جو اب مزدور کی شکل میں تھے بیکار ہو گئے۔ اس لئے کہ کارخانوں کو اتنے مزدوروں کی ضرورت نہیں تھی جتنے دستکاروں کو کارخانوں نے بیکار کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ بیکاروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اور یہ لوگ سوسائٹی پر ایک بار عظیم ہو گئے۔ ان بیکاروں کی تعداد کوئی معمولی تعداد نہ تھی۔ جب ان مزدوروں کے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تو ان میں اپنی ضروریات پوری کرنے کی قابلیت بھی نہ رہی یعنی قابلیت خرید بالکل گھٹ گئی۔ اب کارخانوں کا کام اور کم ہو گیا اور اسی تناسب سے مزدور کارخانوں سے برطرف ہوتے رہے۔ بیکاری کی تعداد بڑھتی رہی۔ اس طرح بیکاری کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا۔

پہلے تجارتی تعطل شاذ و نادر ہی ہوا کرتے تھے لیکن اس کے بعد تعطل اقتصادی دُنیا میں آئے دن کی بات ہو گئی۔ یہ خطرناک منزل تھی۔ ماہرین اقتصادیات کو فکر دامنگیر ہوئی کہ اس اقتصادی تباہ حالی کی روک تھام کریں۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کے شروع میں (John Bapt[illegible]) (Robert Owen.) (Karl Marx) اور (Henry George.) جیسے ماہرین اقتصادیات نے اس اقتصادی تباہی کی جانچ پڑتال کی اور اسے دور کرنے کی تجاویز پر غور و فکر کیا۔ انگلستان کے مشہور اقتصادی (Jevons.) نے اس تحقیقات کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا جو (Sun Spot.) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح ہر دس سال کے بعد سورج میں ایک داغ نمودار ہوتا ہے اسی طرح اقتصادی دنیا میں ہر دس سال کے بعد اقتصادی تعطل پیدا ہوتا ہے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ دس سال کی مدت کے بعد سماج ایک انقلابی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اقتصادی ارتقاء کی مختصر تاریخ بیان کرنے سے میرا منشا صرف یہ ہے کہ ابتدائی دور میں اقتصادی تعطل کے امکانات نہیں تھے اور اب جب

آئے دن تعطل ہوتے رہتے ہیں اس کا سبب بالکل ظاہر ہے یعنی یہ کہ سماج موجودہ اقتصادی نظام کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے اور یہی ناقص اقتصادی نظام ہے جس نے سماج کے جوڑ بند کو ڈھیلا کر دیا ہے اور عوام تباہ حالی میں مبتلا ہیں۔ اس جگہ میں یہ بھی بتا دوں کہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد رفتہ رفتہ دُنیا کی اقتصادیات یورپ کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں۔ اس طویل دور میں یورپ کی استعماریت دُنیا کی تمام منڈیوں پر قابض ہو گئی۔ ایشیا میں صرف جاپان نے ہی اسکے نقشِ قدم پر چل کر ایک علیحدہ حیثیت پیدا کی ہے لیکن امریکہ اور جاپان بھی اسی تجارتی اور صنعتی اجارہ داری میں منسلک ہو گئے ہیں جن کا مرکز یورپ ہے۔ اس لئے اس بحث میں یورپ کی اقتصادی الٹ پھیر اور سیاسی و قومی پالیسیوں کا اثر ہی زیرِ نظر ہے کیونکہ حقیقتاً انسانی بدبختیوں کا اصل مرکز یورپ کی سیاسیات ہیں جو اصل میں اقتصادی رقابتوں کا براہِ راست نتیجہ ہیں۔

مجھے یہاں اقتصادی مسئلہ کے باریک اور پیچ در پیچ گوشوں کو ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بحث ایک طویل فرصت چاہتی ہے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ جس وقت تک "پیدا وار" (Production) اور "صرف" (Consumption) میں تناسب نہیں ہو گا اس وقت تک اقتصادی ابتری دور نہیں ہو سکتی۔

فیکٹری سسٹم اور بین الاقوامی تجارت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان ایک کارخانہ اور دوسرے کارخانہ کے درمیان یا ایک قسم کے کارخانوں کے گروہ اور اسی قسم کے کارخانوں کے دوسرے گروہ کے درمیان بے پناہ مقابلاتی جنگ شروع ہو گئی اور اسکے ساتھ ساتھ ملکوں اور حکومتوں کو اپنے اپنے تیار کئے ہوئے مال کو فروخت کرنے کے لئے منڈیوں کی تلاش ہوئی۔ اس مقابلاتی جنگ میں سرمایہ داری نے کھل کر اپنا پارٹ ادا کیا اور ان لوگوں کے لئے اس تجارتی دوڑ میں کوئی جگہ باقی نہ رہی جن کے پاس سرمایہ نہ تھا۔

اوّل تو یہی اسباب بدترین تباہی پیدا کرنے کے لئے کیا کم تھے کہ دفعتاً جنگِ عظیم نے جو صورت حال پیدا کی اس نے دُنیا کو کہیں کا نہ چھوڑا جنگِ عظیم سے پہلے ملکوں میں سونے اور چاندی کے سکّوں سے کام لیا جاتا تھا، ایک ملک دوسرے ملک کو سونے اور چاندی کے سکّوں میں قرض ادا کیا کرتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد دُنیا کی کرنسی کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ہر ملک کے داخلی کاروبار میں سونے چاندی کے سکّوں کی جگہ کلّیۃً کاغذ کے نوٹوں نے لے لی۔ ظاہر ہے کہ کاغذی سکّے جاری کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اب کوئی ملک ایسا باقی نہ بچا جہاں کاغذ کا سکّہ جاری نہ کر دیا گیا ہو۔ اصل دولت جو سونے اور چاندی کی شکل میں تھی جنگِ عظیم میں کام آ گئی۔ ایک طرف تو جنگ نے اس دولت کو ختم کیا اور دوسری طرف دولت پیدا کرنے کا کام بند کر دیا۔ چنانچہ کاغذی سکّے جو چلائے گئے وہ اقتصادی اصولوں کے قطعاً خلاف تھے۔ اور ان کی پشت پر سونے اور چاندی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔

حکومتوں نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اقتصادی دُنیا میں امن قائم کریں۔ لیکن پانی سر سے اُتر چکا تھا۔ بڑے بڑے تجارتی کمپنے اور طاقتور سنڈیکیٹ حکومتوں کی تجاویز کو عمل میں لانے سے روکتے تھے سنہ ۱۹۳۳ء میں جبکہ عام کساد بازاری (Great Depression) کو روکنے کے لئے لندن میں اقتصادی کانفرنس طلب کی گئی تو امریکی جمہوریت کے صدر نے اس اجتماعی کوشش کو یہ کہہ کر بیکار کر دیا کہ "اس کے ملک کا مفاد اپنی اپنی راہ پر چلنے میں پوشیدہ ہے۔ ہر ملک کو چاہئے کہ اپنی اقتصادی بدحالی کو خود دور کرے"۔ اقتصادی شعبدہ بازی نے اس خفیف سی کوشش کو جو خود ہی بہت کمزور اور شکست بنیادوں پر قائم تھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ بہرحال جنگِ عظیم کے بعد دُنیا دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ مرفہ الحال یعنی (Haves) اور محروم یعنی (Have Nots) کچھ دنوں تک تو حکومتوں کی چالوں سے مصنوعی خوشحالی کی لہر پیدا ہوئی لیکن اُس کی زندگی بہت کم تھی۔ چند برسوں میں ہی خوشحالی بدترین بدحالی میں تبدیل ہو گئی۔ دُنیا کے مختلف حصّوں میں عظیم اقتصادی انقلابات اور تعطل (Crisis) پیدا ہوئے۔ لاکھوں بنک کروڑوں کارخانے اور لاتعداد آدمیوں کے دیوالے نکل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار یک لخت بند ہو گئی اور دنیا کے لاتعداد آدمی بے روزگار ہو گئے۔

اس اقتصادی بدحالی میں امریکہ اور فرانس نے انوکھا کھیل کھیلا۔ فرانس کو کثیر دولت جرمنی سے تاوان کی صورت میں ملی تھی۔ لیکن فرانس نے اس دولت کو تجارت میں نہیں لگایا۔ یہی طریقہ امریکہ نے اختیار کیا۔ امریکہ کو کثیر دولت قرضہ کی ادائگی میں ملی تھی۔ لیکن جب امریکہ سے دوسرے ملکوں نے قرضہ مانگا تو اس نے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ اور دولت کو اپنے ہی ملک میں روک لیا۔ اس سے دُنیا کی تجارت کو بہت بڑا دھکا لگا اور اقتصادی توازن ختم ہوگیا۔ بے روزگاروں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اب دُنیا ایک لمحہ کیلئے بھی اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

اس اقتصادی ناانصافی کا اندازہ آپ چند مثالوں سے کیجئے۔ ان مثالوں میں آپ کو معلوم ہوگا کہ اقتصادی عدم مساوات نے انسانی زندگی کے اخلاق اور معاشرت پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ شکست خوردہ جرمنی کا ایک قصّہ ہے کہ کسی جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں سے ایک بہت ہوشیار تھا۔ اس نے اپنے تمام روپیہ سے سرکاری نوٹ خرید لئے۔ دوسرے بھائی نے اپنا سارا روپیہ شراب کی تجارت میں لگا دیا اور شراب کے پیپے اپنے تہ خانوں میں بھر لئے۔ تیسرا بھائی بدقسمت تھا وہ پاگل ہوگیا۔ اور جنگ شروع ہونے سے قبل اسے پاگل خانہ میں بھیجدیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد کاغذی سکّوں کی بھرمار نے اقتصادی تباہی برپا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا بھائی توبھوکا مر گیا۔ کیونکہ اپنی تمام دولت سے وہ ایک وقت کا کھانا بھی مہیّا نہیں کرسکتا تھا۔ دوسرا بھائی البتہ اچھا رہا۔ شراب کے پیپوں نے اسے کافی فائدہ پہنچایا۔ تیسرا بھائی جنگ کے اختتام پر پاگل خانہ سے رہا ہوا۔ رہائی کے وقت اُسے سونے کا وہ سکّہ جسے مارک کہتے ہیں واپس کر دیا گیا جو لڑائی سے قبل پاگل خانہ میں داخل ہوتے وقت اُس سے لے لیا گیا تھا۔ اس شخص کو نہ جنگ کا علم تھا اور نہ اقتصادی تباہی کا حال معلوم۔ پاگل خانہ سے جب وہ گاڑی میں گھر آیا تو گاڑی کا کرایہ دینے کے لئے مارک نکال کر دیدیا۔ گاڑی والا اس سکّے کو دیکھ کر گھبرایا اور بنک میں بھنانے کے لئے لے گیا۔ بنک نے اس کے عوض میں لاکھوں مارکوں (سکّوں کے) کے کاغذی نوٹ اسے دیدئے۔ ان کاغذی نوٹوں کو لے کر اس شخص پر یہ اثر ہوا کہ وہ دوبارہ پاگل ہوگیا اور پھر پاگل خانہ بھیجدیا گیا۔

جرمنی میں اس وقت یہ عالم تھا کہ لوگوں کو تھیٹر اور تماشہ گاہوں کے ٹکٹ نوٹوں کے بدلہ میں نہیں مل سکتے تھے لیکن دو انڈوں یا مکھن کی ٹکیہ کے عوض میں آسانی سے ٹکٹ مل جاتے تھے۔ دُکانداروں کو قانون کے ذریعہ مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ دُکانیں کھولیں۔ دُکاندار دعائیں مانگتے تھے کہ کوئی گاہک سودا خریدنے نہ آئے۔ کیونکہ انہیں کاغذی سکّوں کے عوض اشیاء فروخت کرنی پڑتی تھیں۔

ایک غریب عورت کا واقعہ ہے کہ اس نے اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی دولت کا کچھ حصّہ بچا بچا کر اپنے لڑکے کے لئے رکھا تھا اور یہ دولت اتنی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کے لئے ایک نفیس مکان خرید سکتی تھی۔ لیکن تین مہینے کی اقتصادی وبا کے بعد اس دولت کا یہ حشر ہوا کہ وہ اپنی اس تمام دولت سے ٹرام وے کے ایک سفر کا کرایہ بھی ادا نہ کرسکی۔

جرمنی میں ایک مقام فرینکفورٹ ہے۔ اس جگہ کی کچھ جائداد رہن رکھ کر ایک انگریز نے ایک جرمن کو چھ ہزار پاؤنڈ قرض دئے تھے۔ مقروض نے اس روپیہ کی ادائگی اس اقتصادی وبا کے دوران میں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ ادائگی جرمنی کے کاغذی نوٹوں میں ہوئی۔ قرض خواہ جب ان نوٹوں کو لیکر انگلستان آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے نوٹوں کی قیمت ۷ اشلنگ ۲ پنس تھی۔

ان مثالوں سے اندازہ کیجئے کہ تجارت کو تباہ کرنے کے لئے جب اس قسم کے ہولناک اقتصادی اسلحہ استعمال کئے جائیں تو تجارت کیسے قائم رہ سکتی ؟ اور اقتصادی بدحالی کا کیا ٹھکانا رہے گا۔

نفسیاتی اثرات بھی اس کے کچھ کم نہیں۔ اقتصادی بدحالی نے قوموں کے زاویہ نگاہ کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اخلاق اور معاشرت اسی زاویہ نگاہ کے ماتحت پرورش پارہے ہیں۔ ایک اقتصادی اور سیاسی مفکر نے کہا کہ جرمن اطالوی اور جاپانی بچّوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ جنگ کرنا مردوں کا شریف ترین کام ہے اور صلح جوئی جسمانی بزدلی اور اخلاقی انحطاط کی دلیل ہے۔" تشدّد کا یہ نیا الہام بلاشبہ اقتصادی بدحالی کا نتیجہ ہے۔ ایسی حالت میں کیا کوئی تہذیب جسے انسانیت کے نام سے پکارا جاسکے قائم رہ سکتی۔ یقیناً اگر یہ حالت برابر قائم رہی تو انسان کی معاشرت اور سیرت

درندوں سے جا ملے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اس مہلک مرض کا علاج شدید قسم کا ہوگا۔ اقتصادی نظام کو پھر ایسی شکل اختیار کرنی پڑے گی جس میں "پیدا کرنے والے" (Producer) اور "صرف کرنے والے" (Consumer) کے درمیان بُعد کم ہو جائے۔ سماج کی ضروریات کا صحیح اندازہ ہو سکے اور پیداوار ضروریات پیداوار کی مطابقت میں ہوں۔ سرمایہ دار کو یہ اختیار نہ ہو کہ وہ اپنی دولت کے زور پر بازار کے بھاؤ کو اپنی مرضی کے مطابق گھٹا یا بڑھا سکے۔ اشیاء کی قیمت اس اعتبار سے مقرر کی جائے کہ مزدوروں کی کھپت کارخانوں میں آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ کارخانوں کی اہمیت کو بھی کم کر کے جہاں تک جلد ممکن ہو اور جس زیادہ سے زیادہ تعداد میں ممکن ہو مزدوروں کو پھر باکار بنایا جائے۔ اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہر ملک میں اس کی ضرورت کے مطابق گھریلو صنعت وحرفت (Cottage Industry) شروع کی جائے اور اسے فروغ دیا جائے۔ خاص خاص کارخانوں اور دستکاریوں کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے اور انہیں عوام کے مفاد میں استعمال کرے تاکہ تجارت کی آمدنی چند آدمیوں کے اندر کھپ جانے کے بجائے زیادہ آدمیوں میں تقسیم کی جا سکے۔

اگر دُنیا کا امن وامان انسانی سماج کے لئے ضروری ہے تو ان لوگوں کو غور کرنا چاہئے جو تجارتی ظن وتخمین پر دُنیا کی مالیات اور تجارت کو الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے ذاتی مفاد کو مفادِ عامّہ کی وجہ سے نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ ایسی قیمت ہے جسے ادا کرنے میں دُنیا کی خوشحالی پوشیدہ ہے۔ دُنیا کی رفتار بتاتی ہے کہ اگر اجارہ داروں نے یہ قیمت بخوشی ادا نہ کی تو شاید ارتقاء کا آہنی پنجہ زبردستی ان سے اس چیز کو چھین لے گا۔

"ایشیا" کا آئندہ نمبر

مصطفٰے کمال آتاترک (رحمۃ)

کی سوانح حیات سے مزیّن ہوگا۔ اور اتاترک کے زمانہ حیات میں ترکی ادب اور آرٹ کو جو ترقی ہوئی اسکا تفصیلی خاکہ پیش کیا جائیگا۔ جدید ترکی شاعری کے نمونے ترکی افسانے اور ڈرامے خاص اہتمام سے حاصل کرنیکی کوشش کی جا رہی ہے اور انتظام کیا جا رہا ہے کہ یہ نمبر مصوّر بھی ہو۔

اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ اس نمبر کیلئے مضامین زیادہ سے زیادہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۹ء تک ایڈیٹر "ایشیا" کے نام روانہ فرما دیں تاکہ "ایشیا" کے وقت پر شائع ہونے میں دقّت نہ ہو۔

منیجر

"مرداہم ہے یاعورت"؟!

(ایک مباحثہ)

جو مابین ساغرنظامی و پنڈت گوپی ناتھ سنہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے)

براڈکاسٹ کیا گیا

سنہا۔ خیر تو ہے حضرت !؟ کچھ خفت اور کچھ غصہ، یہ رنگ کیا ہے !؟

ساغر۔ کیا رنگ ہے سنہا صاحب! آج بھی مس سلیم آگئی تھیں ـــــ آپ تو جانتے ہیں نا؟ مس سلیم! ان سے ذرا تیز جھڑپ ہوگئی، انھیں عورت کی اہمیت کا خبط، اور مجھے مرد کی برتری کا دعویٰ۔ تین بجے آئی تھیں کامل چار گھنٹہ تک وہ گرما گرم بحث رہی کہ توبہ ــــــ اب ــــــ

115

سنہا۔ اب آٹھ بجکر پندرہ منٹ ہوئے ہیں، فرمائیے ـــــ فرمائیے۔ آپ کو تو ذہنی عیاشی میں لطف آتا ہے، بھلا یہ بھی کوئی بحث طلب بات تھی کہ مرد زیادہ اہم ہے یا عورت، !؟

ساغر۔ ظاہر ہے کہ مرد اہم ہے، ارے آپ خود غور کیجئے ـــــ !؟ مگر اس مسلمہ حقیقت پر راشدہ سلیم نے میرا چار گھنٹہ دماغ کھایا، عجیب جھکی لڑکی ہے۔

سنہا۔ جناب والا! آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ میں عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو زیادہ اہم خیال کرتا ہوں۔

ساغر۔ مگر مرد ہوکر آپ عورت کے نمائندہ کیوں بنتے ہیں !؟

سنہا۔ ارے بھائی! انسانی سوسائٹی ہی مرد اور عورت پر مشتمل ہے، ایک کا وجود دوسرے کے وجود کو مکمل کرتا ہے، ایک کی ہستی دوسرے کی ہستی پر منحصر ہے، ایک ہی کُل کے دو جزو ہیں، برتری و کمتری کا سوال ہی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض آپ کی چھیڑ چھاڑ ہے صرف ایک شغل ہے۔ ع۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

ساغر۔ چھیڑ نہیں جناب! میں سنجیدگی سے یہ خیال رکھتا ہوں کہ مرد عورت کے مقابلہ میں اہم ہے۔

سنہا۔ اچھا اگر آپ اس مسئلہ میں سنجیدہ ہیں تو میرا دعویٰ ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ ساغر صاحب معاف فرمائیے گا اگر میں ذرا صاف گوئی سے کام لوں۔ عورت مرد کی خالق ہے، کیا آپ دُنیا میں ایک مثال ایسی پیش کر سکتے ہیں کہ بغیر عورت کے مرد پیدا ہوا ہو ـــــ لیکن میں آپ کو ایسی مثال بتا سکتا ہوں کہ مرد کا وجود بغیر مرد کے ظہور میں آیا ہے ـــــ!

ساغر۔ بجا ہے جس واقعہ کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا۔ اگر وہ معجزہ تھا تو قدرت کا نہ کہ عورت کا!؟

سنہا۔ اور ـــــ یہ معجزہ کس کا ہے کہ آفرینش سے لیکر آج تک کسی انسانی دماغ کو یہ جرأت و توفیق نہیں ہوئی کہ وہ انسان کی تخلیق کا امکان بغیر عورت کے پیش کر سکے۔!

ـــــ تو پھر عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والا مرد، اس کی گود میں پرورش پانے والا مرد، اس کی تربیت کی آغوش میں پروان چڑھنے والا مرد، ـــــ کیا خواب میں بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں عورت کم اہم ہے!؟

اقبال کہتا ہے ؎

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات — گرم اس آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

ساغر۔ "نکتۂ شوق" اور "لذتِ تخلیق" بہت خوب ہے، نہایت خوب ہے، مگر جناب عورت کی خالقانہ حیثیت محض اک "قدرتی حادثہ" ہے اس سے عورت کی اہمیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔

تخلیق میں مرد ہو یا عورت، دونوں میں سے کسی کا بھی کلیتہً ارادہ تخلیق نہیں ہوتا، اگر ہوتا ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہے۔
اور اس خواہش میں مرد عورت دونوں برابر ہیں۔ آپ اس قدرتی حادثہ میں مرد کو فراموش نہیں کر سکتے۔!؟

سنہا۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، قدرت کی ٹھوس حقیقت پر غور کیجئے، ذرا مسئلہ کو روحانی نظر سے بھی دیکھئے۔ قدرت نے عورت کو "ماں" بنایا ہے۔ انسانی دماغ کی موشگافی اور اس کے فریب کی عینک اتار کر عورت کو ماں کے روپ میں دیکھئے۔ یہی اس کا انوپ روپ ہے ـــــ کیا ماں ہماری دُنیا کی اہم ترین ہستی نہیں ہے؟!؟

میکسم گورکی کہتا ہے:۔

"ماں کی ہمیشہ پرستش کرنی چاہئے، دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ماں کی محبت کے راستے میں حائل اور مانع ہو سکے، انسان کے تمام کامل صفات اور خوبیاں سب ماں کے دودھ کی چھاؤں میں پرورش پاتی ہیں۔ پھول آفتاب کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، نیک بختی محبت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، محبت عورت کے بغیر ممکن نہیں، اور شاعر اور سیاست داں کوئی بھی ماں کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔"

دُنیا کے تمام پیغمبر، تمام مصلحین، تمام قانون داں، تمام سیاست داں اور تمام فلسفی اور تمام شاعر عورت کی کوکھ سے پیدا ہوئے!

ساغر۔ درست ہے، اور دُنیا کی پیدائش سے لیکر آج تک عورت کی کوکھ سے کوئی پیغمبر عورت، کوئی مصلح عورت، کوئی قانون ساز عورت کوئی فلسفی عورت، کوئی حقیقی زبردست شاعرہ اور کوئی ماہرِ سیاست خاتون پیدا نہیں ہو سکی!؟ حیرت ہے!!

عورت کو ماں کی حیثیت میں پیش کر کے گویا آپ نے اپنے خیال میں بحث کا خاتمہ کر دیا ہے، خوب، میکسم گورکی کا ارشاد آپ کیلئے آیت و حدیث ہے تو ہو میں اس سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ سماج نے جو جس کے مراتب قایم کر دئے ہیں اُن کا احترام کرتا ہوں مامتا فطرت کا وظیفہ ہے مجھے تسلیم ہے، مگر محبت عورت و مرد کے مابین جذباتی خود غرضی کا نام ہے، وہ محبت جو کسی دماغی انسان کا

مقصود ہوسکتی ہے وہ عورت کی نہیں بلکہ تمام جانداروں کی محبت ہے۔
یہ گورکی کی قدامت پرستی اور محدود الخیالی ہے' میرے خیال میں وہ محبت کی نفسیاتی تشریح کرنے سے قطعی معذور رہا۔
اچھا چیونٹیاں ہمیں کیوں کاٹتی ہیں' ہم سے محبت کیوں نہیں کرتیں' ہم ان کو کلیجے سے کیوں نہیں لگا لیتے۔ پاؤں سے کیوں مسل دیتے ہیں۔ !؟
اس کے خلاف ہم خوبصورت پھول کو شاخ سے فوراً توڑ لیتے ہیں' سونگھنے کی قوت کی پیاس بجھاتے اور آنکھوں کی بھوک مٹاتے ہیں۔
عورت اور مرد کی محبت بھی بھوک اور پیاس کے تقاضوں کے مماثل ہے کس قدر بے بنیاد' کتنی خود غرضانہ' کیسی مضحکہ انگیز' !؟
اگر گورکی زندہ ہوتا تو میں اس کو بتاتا کہ سچی محبت کے لئے جس میں انسانی ترقی اور امن کا راز پوشیدہ ہے اور جس کے بلند مینار کا کلس عرش الٰہی سے جا کر ٹکراتا ہے' عورت کی ہرگز شرط نہیں۔
عورت کی جس عظیم الشان اور مختص حیثیت پر آپ زور دے رہے ہیں' مرد پر فوقیت لیجانے کا خبط اس مختص حیثیت سے بھی اس کو محروم کر دینے والا ہے' موجودہ متمدن عورت سلسلۂ پیدائش نہیں تو کم از کم بچے پیدا کرنے کے خلاف ہے۔ یعنی اب اُسے ماں بننا پسند نہیں'۔
در اصل یہ آپ کی سخت بھول ہے کہ آپ ذریعۂ پیدائش کو وجہ پیدائش سمجھتے ہیں' کیا صدف میں موتی کے ہونے سے صدف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ع

"نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے"

اس وقت حقیقتاً بحث ذہنی' جسمانی اور عقلی قویٰ سے ہے' ورنہ عورت ہی کی کوکھ سے عورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ایک ہی کی کوکھ کی یہ کیا ناانصافی ہے کہ اس کا ایک پروردہ کمزور اور کند ذہن اور دوسرا قوی و ذہین پیدا ہوتا ہے !؟
سنہا۔ قوی اور کمزور کی تقسیم بھی مرد ہی کا حربہ ہے' ورنہ مرد اور برتری کا دعویدار ! میں مان لوں گا کہ مرد غاصب ہے' اس لئے طاقتور اور اہم ہے' !
عورت کے مقابلہ میں وہ حیوانیت کا ایک ڈھیر ہے اس لئے زیادہ اہم ہے'
اپنی حیوانی طاقتوں سے مکمل فائدہ اٹھا کر مرد نے عورت کو اپنا غلام بنایا ہے اس لئے زیادہ اہم ہے'
عورت کو اس نے اپنی مِلک قرار دیا ہے اس لئے زیادہ اہم ہے'
عورت کی تمام دماغی' روحانی' اور ذہنی قوتوں کو جو قدرت نے اپنی بیٹی کو عطا کی تھیں غصب کیا' سلب کیا' اور معطل کر دیا اس لئے زیادہ اہم ہے !
بازی گر مرد نے عورت کو ایک جاندار گڈا یا بنایا اور پھر اس طرح اس سے کھیلا جیسے کوئی بے ہوش بچہ کھلونے کو کبھی سینہ سے لگاتا اور کبھی ٹھوکر مارتا ہے۔
ساغر۔ ذرا سانس لے لیجئے سنہا صاحب ! ذرا سانس' کوسنوں کی عادت جن ہستیوں کی صحبت میں آپ کو پڑی ہے میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں' ان کی اُستادی برمحل کام آ رہی ہے۔
سنہا۔ کوسنے نہیں جناب یہ حقیقتیں ہیں۔ مرد نے سوسائٹی کے نظام پر قابو پایا اس لئے اہم ہے !

مرد نے عورت جیسی نازک اور قدرت کے بے نظیر شاہکار کو کچلا' سوسائٹی میں اس کو کوئی جگہ نہیں دی، وہ ظالم ہے اس لئے اہم ہے۔
بیچاری دکھیا عورت کے خلاف وہ تشہیر کی' وہ فریب کاریاں کیں کہ الامان والحفیظ !
اس کے احساس کو مردہ کر دیا' اس کی روح کو کچل دیا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ ؎

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ساغر۔ فرمائیے! آپ کے ترکش کے تمام تیر ختم ہو گئے!؟ یا کوئی اور بھی زہر میں بجھا ہوا خدنگ باقی ہے۔ !؟

سرِ دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی !؟

لیکن آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ قوی اور کمزور کی تقسیم مرد کے دماغ نے کی' مرد کو اس کی عملی' ارتقائی اور مدافعانہ طاقتوں نے قوی کیا ہے' یعنی وہ قدرتی طور پر عملی ہے' خالق ہے' عامل ہے' محقق ہے اور محافظ ہے۔ اور عورت کا ذہن ایجاد و تخلیق کے لئے نہیں ہوتا بلکہ تربیت' تنظیم اور معاملات کا طے کرنے والا ہوتا ہے۔
سب سے بڑا سوال انسانی زندگی میں استواری اور ترقی پیدا کرنے کا ہے سو اس سے آپ ہرگز انکار نہیں کر سکتے کہ مرد تمام ذہنی ترقیوں کا خالق ہے' خالق ہے اور جامع ہے' آپ اس سے بھی انکار نہیں فرما سکتے کہ ذہنی ترقی ہی عملی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔
عملی ترقی میں بھی عورت کے مقابلہ میں مرد کا ۸۰ فیصدی حصّہ ہے !

سنہا۔ شکر ہے بیس فیصدی تو آپ نے تسلیم کیا ورنہ بیچاری عورت کا آپ پر کیا زور !؟

ساغر۔ "بیچاری" ——— یہ باتیں بالکل بحث سے خارج ہیں کہ مرد نے عورت کو بیچار کیا یا اس کی ترقی میں سدِّ راہ ہوا کشمکشِ حیات کا یہ ایک معمولی مسئلہ ہے کہ موزوں ترین انسان ہی باقی رہتا ہے اور ضعیف یا تو ختم ہو جاتے ہیں۔ یا تابع ہو جاتے ہیں۔ روسو کا مشہور مقولہ ہے۔

بقائے اَصلح کیا آپ کو یاد نہیں رہا !؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی غلامی قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے ورنہ تاریخ نے کمزوروں کو قوی اور طاقتوروں کو کمزور بنانے میں کبھی رحم سے کام نہیں لیا۔
آپ فرماتے ہیں کہ مرد نے عورت کو غلام بنایا ہے' سماج کے ابتدائی دور میں کوئی ایسی تاریخی سند موجود نہیں ہے جس کی رو سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ مردوں نے زندگی کے کسی دور میں بھی دانستہ عورتوں کو غلام بنانے کی کوئی جماعتی سازش کی ہو!؟ اگر ان کی کمزوری کوئی معنی رکھتی ہے تو وہ ترقی کی منزلوں کا ایک قدرتی نتیجہ ہے' مرد پر اس کا کیوں الزام ہے !؟
دیکھئے سنہا صاحب! آپ نے مرد کے بے گنتی مظالم گنوائے ہیں تو اب یہ بارِ ثبوت بھی آپ ہی کے ذمّہ ہے کہ کرۂ زمین پر سب سے پہلے جو انسانی جوڑا نمودار ہوا اس میں سے جو مرد تھا اُس نے دانستہ عورت کو مغلوب کیا ——— !؟ کم از کم معلوم تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی اس سے ظاہر ہوا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو مخصوص فرائض کی ادائیگی کے لئے پیدا کیا۔ اور ان فرائض کی اہمیت کے اعتبار سے انھیں جسمانی اور ذہنی قویٰ عطا کئے گئے۔

ساغر۔ ایک اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرد اور عورت کی آبادیاں علیحدہ علیحدہ کر دی جائیں تو سماج کے نظام کو قائم رکھنے میں کونسی صنف مقابلتہً زیادہ کامیاب ہوگی ——— !؟

اس جگہ پیدائش اور افزائشِ نسل کا سوال پیدا نہیں ہوتا' اس لئے کہ اس سے تو قدرتاً دونوں سوسائٹیاں عاری ہو جائیں گی۔
لیکن مرد اور عورت کے جدا جدا گروہوں میں سے اپنی زندگی کو اچھی طرح کون بسر کر سکتا ہے ——— یعنی بالآخر عاجز کون ثابت ہوگا !؟

سنہا۔ یہ آپ نے کیا کہا؟ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اگر عورتوں کی کالونی علیحدہ بسا دی جائے تو وہ اپنی تمام ضرورتیں خود پوری کر سکتی ہیں، آپ اسی پر تو اکڑتے ہیں کہ عورت کو اپنی معاش خود پیدا کرنی پڑے تو وہ جانے! مرد کی کیا اہمیت ہے!؟ یعنی عورت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "معاشی غلامی" ہے۔ یقیناً وہ آزاد ہو کر اس کو توڑ دیگی۔

ساغر۔ سوال یہ ہے کہ یہ معاشی غلامی توڑی کیوں نہیں جاتی؟ سماج میں عورت نے اپنی غلامی اپنے تعطّل کو، اپنی کم اہمیتی کو، دُنیا کے لمحۂ پیدائش سے لیکر اس وقت تک کیوں برداشت کیا؟

مرد ظالم ہے، مرد خود غرض ہے، مرد نے عورت کو کھیل کر رکھ دیا ——— سب تسلیم، مگر عورت کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان تمام باتوں کے خلاف بغاوت اور احتجاج کرتی اور مردوں کے چنگل سے آزاد ہو جاتی۔ اس لئے کہ اسی میں اس کا مفاد پوشیدہ تھا۔ مگر عورت نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ تسلیم کرتی ہے، بغیر مرد کے وہ زندہ نہیں رہ سکتی، اور ثابت ہوتا ہے کہ اس کی قوّتِ ارادی کمزور ہے جس صنف کی قوّتِ ارادی کمزور ہو اس کو اُس صنف کے مقابلے میں جس کی قوّتِ ارادی کمزور نہ ہو اور جو ہر لمحہ عملی ہو ہرگز اہم نہیں کہا جا سکتا!؟

آپ کہتے ہیں مرد بازی گر ہے اور عورت کھلونا! ——— اس کا کیا جواب دوں ؎
"یہ بات راز کی ہے اس کو راز رہنے دے"

عورت کا ذوقِ بازی گری کیا کچھ کم ہے جناب! ذرا دُنیا کی تاریخ پر تو ایک نظر ڈال جائیے ——— !؟

مرد بے ہوش بچّہ ہے ——— کیا خوب! مگر یہ بے ہوش بچّہ عورت جیسی ذی ہوش بچّی کے مقابلہ میں بہت ہی خفیف متلوّن اور بہت ہی کم ناقابلِ اعتبار ہے۔

سنہا۔ آخر اس عجیب راز کے رُخ سے پردہ تو اُٹھائیے کہ وہ کون سا شعبہ ہے جس میں مرد کو اہمیت حاصل ہے!؟

ساغر۔ بات یہ ہے سنہا صاحب! آج کل عورتوں کے خلاف کچھ کہنا خود ہی رسوا ہونا اور ملزم بننا ہے مگر حقیقت کے اظہار میں آزاد آدمی کبھی تکلّف نہیں کیا کرتے ——— میرا کہنا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد عورت سے زیادہ اہم ہے، پیدائش سے لیکر معاشی اور سیاسی شعبوں تک میں مرد کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

مردوں کے مقابلہ میں عورتیں نسبتاً زیادہ خود غرض ہوتی ہیں۔ عورتوں کی ہر بات میں نفرت اور محبت کا گہرا رنگ ہوتا ہے اسی لئے تمدّنی معاملات میں عورتوں کی رائے اس کمزوری میں ضرور آسودہ ہوتی ہے۔

سنہا۔ ہرگز نہیں۔ تمدّنی زندگی کی بُنیاد خاندانی زندگی پر ہے اور خاندانی زندگی کا ابتدائی تصور عورت کا مرہونِ منّت ہے۔ اگر آپ کو مرد کی اہمیت ثابت کرنے سے فرصت ہو تو ذرا تخیّل کو آج سے ہزاروں سال پہلے قبل از تاریخ زمانہ کی سیر بھی کرائیے۔ جب عورت بچّوں کو لیکر گپھاؤں میں چھپی ہوتی تھی اور مرد درندوں کی طرح سیر و شکار میں دیوانہ رہتا تھا۔

ساغر۔ عہدِ تاریخ میں بھی ہر درندہ کی مادہ بچّوں کو لیکر گپھاؤں ہی میں پڑی رہتی ہے، معاف کیجئے گا۔ آپ زبردستی ایک سہرہ گوندھ کر عورت کے سر سے باندھ دینا چاہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمدّن انسانی شعور کا نتیجہ ہے۔ اور دُنیا کو ترتیب دینے کا خیال سب سے پہلے

119

مرد کو ہوا، اس نے قدرت سے زیادہ کار نمایاں کیا اور زندگی کو منظّم کر کے دنیا کو جنّت بنا دیا۔

سنہا۔ اس جنت میں اگر عورت نہ ہوتی تو یہ جنّت دوزخ بن جاتی ساغر صاحب!

ساغر۔ جی ہاں، جس جنت میں عورت تھی اس جنّت سے اس فردوس آفریں عورت ہی نے مرد کو محروم کیا۔ اور اس کی مکافات میں آدم کے بچّے دُنیا کے جہنم میں جُھن رہے ہیں —— خیر عورت کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ سوال تو ایک دوسرے کے کم اور زیادہ اہم نہ ہونے کا ہے، مرد کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ قدرت نے اس کو بچّوں کی پیدائش اور پرورش سے آزاد پیدا کیا ہے۔

سنہا۔ اور نسل کی حفاظت —— !؟

ساغر۔ جہاں تک نسل کی حفاظت کا سوال ہے مرد اور عورت جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر مرد ایثار کرتا ہے، قربانی کرتا ہے اس لئے زیادہ اہم ہے۔

سنہا۔ بیوی کے مرجانے کے بعد فوراً دوسری شادی کرتا ہے اس لئے زیادہ اہم ہے!؟

عورت کے ساتھ ⟵——⟶ زندہ جل جاتا ہے اس لئے زیادہ اہم ہے!؟

ساغر۔ مرد جذبات کی رو میں بہنے والی ہستی نہیں۔ آپ کی یہ دلیل آپ ہی کے لئے باعث نقصان ہے حکما کا قول ہے کہ عورت کے نظامِ عصبی میں دل اور دماغ نسبتاً مرد سے کمزور ہوتے ہیں، خون کے ذرات بھی کم ہیں۔ اور دونوں کی کھوپڑی میں ۸۵ اور ۱۰۱ کا فرق ہے۔ عورت مطیع ہے، فرمانبردار ہے، غلامی پسند ہے اور اس کی فطرت تمام خارجی معاملات میں قوت کے آگے سرنگوں ہے۔

شوہر کے ساتھ ستی ہو جانا دماغی کمزوری تھا محض عورت کی رواجی پیچ تھی، کمزوری اور رسم پرستی کبھی اہمیت کا سبب قرار نہیں دی جاسکتی۔

مرد بیوی کے مرنے کے بعد شادی کرتا ہے حضور اس میں کچھ وقت تو لگتا ہے مگر عورت کے تلوّن کا عالم تو یہ ہے کہ پلک جھپکتے ہی بدل جاتی ہے۔

سنہا۔ اور فرمائیے؟

ساغر۔ منو کے قانون کے مطابق ——————

سنہا۔ بات کاٹ کر گستاخی معاف! ساغر صاحب میں ——————

ساغر۔ میں کیا —— ؟ —— کیا آپ منو کے قانون سے انکار کرتے ہیں، جس نے عورت کو مجبور، پابند اور کمزور بنایا تھا، ارسطو نحیف و حقیر کہتا ہے، روسو کے خیال میں عورت صرف "مرد کو خوش کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے"!؟

سنہا۔ کیا ضروری ہے کہ میں روسو اور ارسطو کے اقوال کو مانوں، یہ سب مرد تھے، اور مردوں نے قانون بنائے، جب میں آپ سے کہہ چکا کہ دُنیا میں ہمیشہ مردوں نے عورتوں کو پامال کیا تو ان کے اقوال اور قوانین میں عورت کے لئے کلمۂ خیر کیونکر ہو سکتا ہے۔ اور وہ اپنے مقابلے میں غریب عورت کی اہمیت کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں، پیغمبر بنے تو مرد بنے!

ساغر۔ قانون بنانے سے عورت کو کس نے روکا تھا، آپ فرماتے ہیں کہ مرد پیغمبر بنے کیا یہ واقعہ ہے کہ وہ خود بن گئے سنہا صاحب اگر یہ صحیح ہے تو عورت کی راہ میں مرد کب حائل تھا کہ وہ پیغمبر نہ بنے!؟

کیا تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی بتائی جاسکتی ہے کہ عورت نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ——— !؟

——— کیوں نہیں کیا ! ؟ ——— اس کے اسباب آپ بتا سکتے ہیں ؟

دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس میں قابلیت نہ تھی جیسا کہ میرا یقینی خیال ہے یا اگر قابلیت تھی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ علی الاعلان کوئی اصلاحی قدم اٹھا سکے۔ بہرصورت عورت نے اس اعتبار سے سماج کی کوئی خدمت نہیں کی اور اس کی وجہ سے اس کی اہمیت گھٹ جاتی ہے !

سہنا۔ میرے دوست ! مرد کے استبدادی پنجہ کی گرفت اتنی سخت رہی ہے کہ عورت سانس نہیں لے سکی۔ وہ غریب کیا پیغمبری کا دعویٰ کرتی اور کیونکر تمدّن و سیاست میں مرد کے دوش بدوش حصّہ لیتی۔

ساغر۔ اچھا ایک بات کا جواب دیجئے۔ مرد کے استبدادی پنجہ کے مقابلہ میں آپ قدرت کے پنجۂ اقتدار کو طاقتور مانتے ہیں یا نہیں ؟

سہنا۔ مانتا ہوں۔

ساغر۔ مرد وہ اہم صنف ہے جس کے سر پر دُنیا کی پیدائش سے لیکر تا ایندم قدرت کا پنجۂ اقتدار گڑا رہا۔ کچے دھاگے میں بندھی ہوئی برہنہ شمشیروں کی طرح مشیت زندگی بھر اس کے سر پر مسلط رہی مگر اس نے بجلی کو مسخر کر لیا۔ آواز کو قید کر لیا، سمندروں کے سینہ پر علی الاعلان مونگ دلی، ہواؤں کو مرکب بنا لیا، سمندر کا سینہ کھکول ڈالا ——— حوادث اس کے تعاقب میں برابر دوڑتے رہے ——— حادثات قدم قدم پر اس کو چت کرنے کے لئے سرگرم کار رہے، لیکن مرحبا، ابن آدم نے مڑ کر نہیں دیکھا ——— یہ تمام دُنیا اس کی قوت ارادی کا شاندار کارنامہ ہے، زندگی یکسر اس کی جہدی قوتوں کا بولتا ہوا شاہکار ہے۔

——— برخلاف اس کے عورت نے کچھ نہیں کیا۔ وہ ابھی دوڑ میں مرد سے بہت پیچھے ہے۔ یہ دلیل اس کی غیر اہم ہونے کے لئے کافی ہے، مرد نے عورت کو سانس نہیں لینے دیا تسلیم۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ خالص ان کاموں میں جن کا تعلق دماغ اور ذہن سے ہے۔ عورت نے کوئی قابل قدر چیز پیش نہیں کی جو سوسائٹی کے لئے مشعل راہ ہوتی۔ کوئی فلسفہ کوئی قانون، کوئی نظریہ جو محض زبانی اعلان سے تعلق رکھتا ہے اور جس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کا کوئی اندیشہ نہیں ——— کیا عورت نے کبھی پیش کیا۔

——— اس کے متعلق بھی آپ یہی فرمائیں گے کہ مرد نے اسے پامال کیا اس لئے وہ اظہار خیال کرنے سے بھی عاجز رہی ! ؟

سہنا۔ تاریخ سے بہت سے نام ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں کہ عورتوں نے ذہنی و عقلی کارنمایاں کئے۔ نورجہاں اور زیب النسا کی ذہانت سے آپ کو انکار ہے ؟

ساغر۔ یہ آپ بالکل سطحی بات فرما رہے ہیں، یہ محض شہزادیاں تھیں اور تمام زمانے کے لئے نہیں تھیں۔ میری مراد ٹھوس فلسفہ اور علم سے ہے، کوئی اقتصادی فلسفہ، کوئی معاشرتی نظریہ، کوئی سائنٹفک اکتشاف ؟ کوئی مذہبی قانون اور ان تمام علوم میں کوئی مجتہدانہ کوشش ! ——— عورت پیش کر سکی۔ ؟ ؟

جناب میرا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ عورت جن صفات کی وجہ سے عورت ہے اُن میں چار چاند لگانا بھی مرد ہی کی فیاض فطرت کا اعجاز ہے۔ ورنہ وہ حقیقتہً اتنی نہیں تھی جتنا مکمل کر کے مرد نے اُسے پیش کیا ہے، ے

مرے مٹتے ہی مٹ جائینگی شانیں حُسن برہم کی   تری زلفوں کے چرچے ہیں مرے حالِ پریشاں تک

سنہا۔ مرد نے عورت کو مکمل کیا۔ !؟ کیا خوب، مرد کیا عورت کو مکمل کرتا عورت خود فطرت کے مصوّر کا خوبصورت اور اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔

ساغر۔ کسی لحاظ سے میں اس دعوی کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ مرد عورت سے بہرحال خوبصورت ہے۔ موت سے پہلے پہلے اس میں روشنی اور زندگی رہتی ہے لیکن عورت کا شباب اور خوبصورتی نسیم کے جھونکے کی طرح آتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔

انسانوں ہی میں نہیں، درندوں میں بھی قدرت نے جمالیاتی برتری قائم رکھی ہے، شیرنی کے مقابلے میں شیر زیادہ حسین ہوتا ہے پرندوں میں مورنی کے مقابلہ میں مور کے زیادہ جمیل ہونے سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس لئے مصوّر فطرت کا شاہکار عورت نہیں مرد ہے۔

سنہا۔ ساغر صاحب آپ مرد ٹھہرے، اگر سزا و جزا کی کوئی حقیقت ہے تو جناب مرد کو ان مظالم سے پناہ نہیں مل سکتی جو ان حضرت نے عورت پر توڑے ہیں۔ اور اگر خدا بھی مرد ہے تو خدا حافظ ——— !

ساغر۔ بے شک کسی الہامی کتاب میں خدا کے لئے اسم تانیث نہیں دیکھا گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد کی اہمیت لامحدود ہے۔

سنہا۔ یہ بھی مردوں کی انتہا پسندی ہے۔ کاش میں عورت ہوتا۔ تو مظلوم ہونے کا شرف مجھے حاصل ہوتا۔ ظالموں کی فہرست میں میرا نام نہ ہوتا۔ اور اہمیت کے دعویداروں کی جماعت میں شریک ہونے کی بدقسمتی میرا حصّہ نہ ہوتی۔

ساغر۔ سنہا صاحب جذبہ بھی کبھی دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے !؟

سنہا۔ جی نہیں یہ جذبہ اس حقیقت کی شہادت ہے کہ مردوں ہی میں آپ کے مخالف اور عورت کی اہمیت کے قائل موجود ہیں آپ سے اور آپ کے دوستوں سے اکثر مجھے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے، آپ لوگوں کا سب سے بڑا جو دعویٰ ہے وہ معاش کا ہے گویا انسانی سوسائٹی کا اہم ترین کام ہے، مجھے رہ رہ کر ہنسی آتی ہے جب میں اس دعوی پر غور کرتا ہوں، خود ہی سوسائٹی کا نظام قائم کیا، خود ہی اپنی روزی پیدا کرنے کا اہم فرض اپنے ذمہ لیا مرد بننے پر برتری کی صدا بلند کی، لیکن ساغر صاحب یہ کچھ دنوں سے مرد صاحب اپنے اس سب سے بڑے فرض سے رفتہ رفتہ دست کشی کیوں اختیار کرتے جا رہے ہیں ؟

کیا تمدّنی زندگی میں کوئی تبدیلی پیش نظر ہے !؟

عورتوں سے یہ مطالبہ کیوں شروع کیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی معاش اپنے دست و بازو سے پیدا کریں۔ کیا مرد ان اہمیتوں کو ترک کر کے غیر اہم جنس عورت بننے کا ارادہ ہے۔ کیا بچوں کو پرورش کرنے کا شوق چرّایا ہے ؟ یعنی اہم ہوتے ہوئے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ؟!

کیا یہ واقعہ نہیں کہ آزادی کا فریب دے کر عورت کو معاش کے میدان میں کھینچا جا رہا ہے اور اب ایسی عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو اپنی معاش خود اپنی جدّ و جہد سے حاصل کرتی ہیں۔ مردوں کی اہمیت کا یہ کونسا رُخ ہے !؟

ساغر۔ میرے خیال میں سنہا صاحب مسئلہ کو آپ نے صحیح صورت میں بیان نہیں فرمایا، مرد کے پیش نظر کوئی تبدیلی نہیں۔ مرد نے عورت سے روزی پیدا کرنے کا مطالبہ ہرگز نہیں کیا، مرد کو عورت بننے کا شوق نہیں ہوا، عورت مرد بننا چاہتی ہے، مرد سے جتنی کوششیں تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا سلسلہ ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہوا۔ مگر عورت اپنے فرائض سے روگردانی کر رہی ہے عورتوں میں اپنی نام نہاد اہمیت اور فوقیت کا احساس خاندان کے تصوّر کو فنا کر رہا ہے۔

اور رہی معاش سو اگر عورت اس طرف متوجہ ہوئی ہے تو اس کا یہ اپنا شوق ہے، مرد سے کیا تعلق۔ اس کا تعلق تو عام اقتصادی رشتوں سے ہے۔! اور اگر اس الزام کو قبول بھی کر لیا جائے تو میں یہ عرض کروں گا کہ تنگ آ کر ہم نے ایک تجربہ کا آغاز

کیا ہے۔ دیکھیں زندگی میں عورت خود اعتماد ہو سکتی ہے یا نہیں !؟

سنہا۔ بس بس جناب مرد کی عنایتوں کے زیادہ راگ نہ گائیے، خوف ہے کہیں حاتم کی روح نہ پھڑک اُٹھے !؟ جس رواداری کا آپ نے ذکر کیا یہ بڑا گہرا فریب ہے۔

ساغر۔ ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج نہیں۔ حیرت ہے کہ آپ فراخدلی کو فریب کہہ رہے ہیں؛

سنہا۔ "من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را"

ساغر۔ گویا مرد عورت سے متعصب ہے !؟

سنہا۔ یقیناً۔

ساغر۔ ہرگز نہیں، عورتوں کے بارے میں یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ وہ پرانے تعصبات اور سوسائٹی کے رسوم اور قیدوں کی پابند ہوتی ہیں

سنہا۔ کبھی نہیں، مردوں نے عورت کو کمتر جنس فرض کر کے اس کی طرف سے جو تعصبات قائم کر لئے تھے وہ آج تک دور نہیں ہوئے۔

ساغر۔ فرض کرنے کی بھی ایک ہی رہی، عورت اور مرد کے مابین روحانی طور پر جو معاہدے ہیں اُن کی رو سے عورت کی حیثیت مفتوح اور مرد کی حیثیت فاتح کی ہے۔

سنہا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے کون فاتح ہے !؟

ساغر۔ مرد۔

سنہا۔ ذرا آنکھیں ملا کر کہئے۔

ساغر۔ میری یہ جرأت نہیں، خیر، تمدنی زندگی کی تاریخ کا ایک ایک ورق اُلٹ کر دکھایا جا سکتا ہے، سائیکالوجی کی رو سے ثابت کیا جا سکتا ہے، اور بالآخر روزانہ زندگی کی نظیروں سے بتایا جا سکتا ہے۔ کہ جب تک ان معاہدوں کے پُرزے پُرزے نہ ہو جائیں، جن کا پُرزے پُرزے ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا مرد کا بچے پیدا کرنا اُس وقت تک مرد کا احساسِ برتری نہیں مٹ سکتا۔

سنہا۔ عورت اگر چاہے تو مرد پر دُنیا کا ہر دروازہ بند کر سکتی ہے !

ساغر۔ ازل سے اس وقت تک مرد ہر دروازہ کھول کر سوتا رہا ہے تب بھی عورت کوئی دروازہ بند نہیں کر سکی۔ دیکھئے سنہا صاحب ! جس وقت تک عورت کے پاؤں میں فطری و روحانی تقاضوں کی زنجیر پڑی ہوئی ہے آپ اس کی اہمیت تسلیم نہیں کرا سکتے، معاشی غلامی جس کا آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن میرے نزدیک اس کا جواب دیا جا سکتا ہے، ختم ہو سکتی ہے، لیکن دوسری غلامی کا ختم کرنا فطرت کے نظام کے خلاف ہے؛

سنہا۔ ساغر صاحب تمام موجودات میں صنفِ نازک کا کوئی جواب نہیں، عورت خدا کے وجود کا بہترین ثبوت ہے !؟

ساغر۔ سنہا صاحب تمام مخلوق میں عورت ہی نہیں، انسان کا کوئی جواب نہیں، انسان (جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں) شیطنت اور یزدانیت کا بہترین معجونِ مرکب ہے !؟

سنہا۔ ساغر صاحب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ "آپ ـــــ خدا کی شان ـــــ آپ" مجھ کو ثبوت کے ساتھ یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ عورت انسانی سماج میں چھوٹا درجہ رکھتی ہے، وہ کیا شعر ہے آپ کا ـــــ "آنکہ خدائے میکدہ" ـــــ ذرا سُنائیے تو؛

کی قدیم دیسی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ چونکہ موجودہ حکومت ہی ان کے زوال کا باعث بنی ہے، انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۰۵ء میں اپنی ایک شاخ صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے مخصوص کردی۔ گو اس کا اثر گیارہ سال کے بعد ظاہر ہوا۔ وہ بھی جنگ کے زمانہ میں۔ اس وقت اگر دوسرے ملکوں کو اشیائے خورد و نوش کے لئے دوسرے ملکوں کا مُنہ تکنا پڑا، تو ہندوستان کو اپنی دوسری ضروریات زندگی کے لئے دوسروں کا دست نگر ہونے کا احساس ہوا، پھر جنگی سامان کی تیاری کے لئے بھی ملک میں صنعت کے قیام کو ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں حکومت نے صنعتی کمیشن مقرر کیا۔ جس کی رپورٹ دو سال بعد شائع ہوئی۔ اور مختلف طریقوں سے صنعت کی امداد شروع کی۔

ہندوستان میں زراعت کا حال بالکل مختلف ہے، اگر دوسرے ملکوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کے یہاں زرعی آبادی کم ہے، تو ہم کو یہ گلہ ہے کہ ہمارے یہاں اس کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ اگر وہ زرعی آبادی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہم اس میں کمی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کی آبادی کا ۷۱ فیصدی حصہ براہ راست زراعت سے آمدنی حاصل کرتا ہے، پھر زراعت ایک ایسا شعبہ ہے جس سے ریلوں، موٹروں اور دوسرے ذرائع کو بھی آمدنی ہوتی ہے۔ یہاں کی آبادی کا ۸۹ فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے، گویا ہمارا ملک دیہاتوں کی ایک وسیع دنیا ہے، یہاں ۶,۸۵,۲۶۰ دیہات ہیں۔ جن میں بعض ایسے ہیں جو صرف چند جھونپڑوں پر مشتمل ہیں، اور بعض ایسے جنکی آبادی ۵ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مگر واضح رہنا چاہئے کہ چھوٹے دیہاتوں کی تعداد زیادہ ہے چنانچہ ۵۰۰ سے کم آبادی والے مواضعات کی تعداد ۵,۱۷,۰۳۶ ہے۔

ہندوستانی گاؤں کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بالخصوص وہ لوگ جن کو مہینہ دو مہینہ گاؤں میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا ہو، وہاں کے مسائل سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے جو بمبئی سے کلکتہ کا سفر میل ٹرین کے اوّل درجہ میں کرتے ہیں۔ اور ریل کی کھڑکیوں میں دیہاتوں کی جھلکیاں دیکھ کر یہاں کے مسائل پر ضخیم کتابیں لکھدیتے ہیں جن کو ہم مستند اور صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں، نہ ان میں اُن عہدہ داروں کو شامل کیا جا سکتا ہے جو دیہات کا دورہ فرماتے ہیں۔ کسی پہاڑی کے دامن میں یا پُر فضا مقام پر ڈیرے ڈالدئے جاتے ہیں، گاؤں سے بکریاں، مرغیاں، انڈے، گھی، دودھ، دہی اِن کے لئے مہیا کیا جاتا ہے، وہ اپنے ڈیروں میں آرام کرسیوں پر بیٹھے سگار یا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیہاتیوں کے نذرانے یا سلام قبول کرتے ہیں۔ بعضوں کو تو سلام قبول کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ اور ان کا زیادہ وقت شکار میں گزرتا ہے۔ جب یہ دورے سے واپس آتے ہیں اور اپنے اخراجات کی تفصیل پیش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک یوم کی غذا پر جو رقم صرف ہوئی وہ پورے گاؤں کی یومیہ غذا سے زیادہ ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی طور پر ہندوستانی گاؤں سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ ایک گاؤں میں کچھ عرصہ تک مقیم رہے، مگر اس شان سے نہیں کہ وہ ان کا حاکم یا عہدہ دار ہے بلکہ وہ بھی ان ہی جیسا ایک فرد ہے نیز اس کو اپنے خلوص کا بھی یقین دلانا ضروری ہے، کیونکہ دیہاتی عام شہریوں سے بہت بدکتے ہیں اور ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنی زندگی میں جن لوگوں سے کام پڑتا ہے، وہ ان کے ساتھ ظلم، زیادتی، بے ایمانی کرتے ہیں، تحصیلدار، تھانیدار، بندوبست کے اہلکار، تحصیل کے منشی، دوسرے محکموں کے ملازم، حتّٰی کہ تحصیل کے پیادے اور چپراسی بھی ان کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔ اور وہ اِن سب کو شہری سمجھتے ہیں۔ یہی وہ تمام لوگ ہیں جو ان سے رشوت لیتے ہیں، ان کو تنگ کرتے ہیں، اِن کو جا و بیجا سزائیں دیتے ہیں۔ اِن کے مویشی اور گھر بار نیلام کر دیتے ہیں، اِن سے بیگار لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر انھوں نے یہ یقین کر لیا کہ تمام شہری ہی ایسے ہوتے ہیں تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ جب ایک دیہاتی کو یہ یقین ہو جائے کہ آپ اس کے مخلص دوست ہیں تو وہ آپ پر اپنا دھن من تن

قربان کرنے پر تیار ہو جائیگا۔ وہ اپنی حقیقی تکالیف اور مشکلات بیان کرے گا۔ اور اُن کا علاج چاہے گا۔ وہ اپنے دکھے ہوئے دل کی داستان سُنائیگا۔ وہ عہدہ داروں کے مظالم بتائے گا۔ نیز وہ قدرت کی ناانصافیاں بھی گنائے گا۔ مگر اس سلسلہ میں ایک چیز کا خیال رکھنا اور ضروری ہے کہ اس کے تمام بیانات میں تھوڑا بہت مبالغہ ہوتا ہے۔ اس مبالغہ میں اس کی بدنیتی شامل نہیں، بلکہ دراصل وہ کسی شے کے بارے میں قطعی نہیں ہے، یہ عدم قطعیت اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس طرح سرایت کرگئی ہے کہ اس کے ہر بیان میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے ایک گاؤں والے سے پوچھا کہ "تمہارے گھر میں کتنے آدمی ہیں؟" اُس نے جواب دیا "یہی چھ سات" مگر جب ان کی تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں تیرہ آدمی ہیں۔ چنانچہ اگر آپ سوال در سوال کریں تو بڑی جلدی یہ مبالغہ دور ہو جاتا ہے اور صحیح بات آپ کو معلوم ہو سکتی ہے۔

ہندوستانی گاؤں کی جامع تعریف بھی نہیں کی جا سکتی، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کچے مکانوں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کا ایک مجموعہ ہے، جہاں محنتی، راستباز، دیانتدار، مخلص، مہمان نواز لوگ رہتے ہیں، جن کو سال کے بڑے حصہ میں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ جن کے جسم کا اکثر و بیشتر حصہ شرمندۂ لباس نہیں ہوتا۔ جن کی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت نام کو نہیں۔ پھل، ترکاریاں، گوشت، انڈے تو ان کو بمشکل میسر آتے ہیں، گھی، دودھ بھی ان کو نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ ان کے رنگ زرد، چہرے اداس، گال پچکے ہوئے، آنکھیں دھنسی ہوئی اور بدن پر جھرّیاں نظر آتی ہیں، ان کو سردیوں میں گرم کپڑے، یا گرمیوں میں باریک اور ٹھنڈے کپڑے میسر نہیں۔ اُن کی کھیتی کی جان مویشی ہیں، مگر ان کی بڑی تعداد نحیف و نزار، کمزور و لاغر، ناکارہ اور غیر کارکردہے جو بجائے مفید ہونے کے اور مضر ہوتی ہے۔ اس کے پاس مویشیوں کے لئے الگ مکان نہیں، وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں ایک جانب مویشی باندھتا ہے اور دوسری جانب اپنے، بیوی بچوں سمیت مویشیوں کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اس طرح اس کے مکان غلاظت اور گندگی کا اچھا نمونہ بنجاتے ہیں۔ وہ دُنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے۔ مگر خود اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، وہ محنت و مشقت اور اپنا خون پسینہ ایک کرکے پیداوار حاصل کرتا ہے اور اس کا سارا نفع دوسروں کی جیبوں میں جاتا ہے۔ وہ قرضدار ہے اور اس کا بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے۔ ساہوکار اس کی محنت کی کمائی لوٹ کر لے جاتا ہے اور وہ مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے وہ جس قدر رقم قرض لیتا ہے اس سے تگنی چوگنی رقم ادا کرنے کے بعد بھی اصل رقم اس پر واجب الادا رہتی ہے۔ کبھی وہ غلام بنجاتا ہے تاکہ محنت مزدوری کرکے اپنا قرض ادا کرے۔ کبھی اپنی جوان بیوی یا بیٹی کو ساہوکار کے حوالے کر دیتا ہے تاکہ اس پر سود کا بار نہ پڑے، غرض یہ کہ ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور آفتوں کا شکار ہے۔

١٢٧

ہندوستانی کسان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ کونسی چیز اچھی ہے یا کونسی بُری یا کس بات میں فائدہ ہے اور کس میں نقصان، مانا کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے، دُنیا کے حالات سے بے خبر ہے تو پھر بھی اس میں اچھائی اور بُرائی کا احساس ضرور موجود ہے، لیکن اس کے باوجود وہ قدیم اور فرسودہ طریقوں پر عمل کر رہا ہے، اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور اونچا ابھرنے کی امنگ مفقود ہو چکی ہے، اور وہ قسمت پرست بن گیا ہے، قسمت پرستی اس کی فطرت میں داخل ہو گئی ہے۔ دراصل صدیوں سے وہ حوادث کا شکار رہا۔ بیرونی حملہ آور آتے تھے اور اس کے ہرے بھرے کھیتوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند دیتے تھے، اس کی فصلیں جلا دیتے تھے، پکی ہوئی فصلیں کاٹ لیتے تھے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک یہی حالت رہی مگر اس کے بعد بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر قدرتی حادثوں کا سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ سیلاب۔ خشک سالیاں، بے وقت بارش، ٹڈیوں کے حملوں نے اس کی کمر توڑنا شروع کر دی، مختلف بیماریوں مثلاً طاعون، ہیضہ، ملیریا، چیچک نے اس کو اپنا شکار بنانا شروع کیا۔

وبائیں آتی ہیں اور اس کے مویشیوں کو جو اس کا اصل ہیں ختم کر کے چلی جاتی ہیں۔ گویا وہ قدرت کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ احساس پیدا ہو گیا۔ وہ خود کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی شے ہے جس پر اس کو قابو نہیں ہے، اس لئے اس نے اپنے تمام کام قدرت کے سپرد کر دئے۔ نتیجۃً وہ زیادہ قناعت پسند یا بالفاظ دیگر زیادہ سست اور کاہل ہو گیا۔ اس نے اپنا مقصد زندگی دن بھر محنت کرنا، روکھا سوکھا کھانا، موٹا جھوٹا پہننا اور مرجانا سمجھ لیا۔ کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ اپنا، اپنے بال بچوں کا، اپنے مویشیوں کی بیماریوں کا علاج تعویذ گنڈوں، منتروں، قربانیوں، چڑھاووں سے کیوں کرتا ہے۔ کیوں وہ ہر بات میں ملّا، سیانوں، رمّالوں، نجومیوں سے مشورہ لیتا ہے۔ وہ زمین کس دن تیار کرے، بیج کس دن بوئے، فصل کب کاٹے، کنواں کب کھودے، مکان کس روز بنائے، شادی کس دن کرے، اپنے ہر فعل کیلئے وہ ساعت اور ایام کا کیوں انتظار کرتا ہے، محض اس لئے کہ وہ بیماریوں، وباؤں، اور مصیبتوں کو خدا یا دیوتا کا غضب تصوّر کرتا ہے۔ اس کو پختہ اعتماد ہے کہ ساری ارضی و سماوی آفتیں انسان کے بُرے افعال کا نتیجہ ہیں۔ گویا اس نے قدرت کو ایک نا منصف ہاتھ تصوّر کر لیا ہے۔ یہ خیال کبھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا کہ آخر قدرت اس قدر ظالم کیوں ہے، اور قدرت نے خاص طور پر اپنے شکار کے لئے اس کا انتخاب کس لئے لیا ہے۔

آج سے چند سال پہلے ان چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل گیا۔ آج سائنس کا دور ہے۔ موجودہ فن انجنیئری کی بدولت سیلاب، ناوقت بارش پر قابو پایا جا سکتا ہے، علم طب کی ترقی نے انسانی امراض پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ علم بیطاری (وٹینریری) کی بدولت مویشیوں کے لاعلاج امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے، فن زراعت کی ترقی کی وجہ سے ناکارہ زمینوں کو شاداب زمینوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ریگستان کو چمنستان بنایا جا سکتا ہے۔ مگر وہ اپنی ناواقفیت اور کم علمیت کی وجہ سے ان چیزوں سے لاعلم ہے اور اب بھی لاعلم رہنا چاہتا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ اب تک قسمت پرست ہے۔ اس کے تخیّلات کی دنیا آج تک اسی قدر تنگ، محدود اور مختصر ہے جتنی کہ چند سو سال پہلے تھی۔ اس میں یہ احساس پیدا نہ ہو سکا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور ایک نئے دور کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ نہ صرف امکان ہے بلکہ یہ اس کے بس میں ہے۔ وہ اس راستہ کو اختیار کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار اور آرام دہ بنا سکتا ہے، مگر وہ ماضی کا دلدادہ ہے، ہر گاؤں والا اور بالخصوص بوڑھا آدمی ماضی کے شاندار قصّے سُناتا ہے۔ وہ ان واقعات کو اس دُکھ بھرے دل سے بیان کرتا ہے کہ سُننے والا بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کا انداز بیان اس قدر دلکش ہے اور پیش کردہ تصویر کا رُخ اس قدر تابناک ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے سُننے والے بھی محو ہو کر چیخ اٹھتے ہیں کہ "کاش ہم بھی اس زمانہ میں ہوتے" حالانکہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ماضی شاندار تھا ہی نہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ حالات مختلف تھے، خود کفالت کا زمانہ تھا، اپنی ضروریات خود ہی مہیّا کرنی پڑتی تھیں، چیزیں ارزاں تھیں، مگر ضروریات زندگی کس قدر محدود تھیں۔ موجودہ زمانہ کی آمد و رفت کی سہولتیں، رسل و رسائل کے ذرائع، علاج معالجے کے طریقے، اس زمانہ میں کہاں میسّر تھے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دور حاضرہ کچھ نہیں ہے تو ماضی خواہ وہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو اس پر رونا دھونا اور کفِ افسوس ملنا بیکار ہے۔ ماضی کی یاد سے حال اور مستقبل نہیں بنتا۔ اب تو حال بلکہ مستقبل کی فکر ضروری ہے، ماضی کی یہ مہمل یاد بھی ہمارے کاشتکاروں کی پستی کا بڑا سبب ہے۔

زراعت کی پستی کے اور بھی مختلف اسباب ہیں جن کی فہرست بڑی طویل ہے، اس وقت صرف چند ضروری امور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ زراعت کی پستی میں حکومت کی لاپروائی کو بھی بڑا دخل ہے، حکومت کو ملک کے سب سے بڑے اور اہم شعبہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر اُس وقت کے مروّجہ خیالات کی رو میں کہ زراعت کی کوئی اہمیت نہیں، ہمارے یہاں کی حکومت نے بھی اس کی طرف سے لاپروائی برتی۔ خود ہندوستانیوں کو بھی اس کا احساس نہ ہوا کہ ہم آپ ہی اپنے پیر پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ مگر جب جنگ عظیم

میں حکومت برطانیہ کو زراعت کے سلسلہ میں تلخ تجربات ہوئے تو اس نے حکومت ہند کو یہاں کی زراعت کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ کیا۔ ۱۹۱۹ء کی نئی اصلاحات میں وزیر زراعت کا عہدہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا جس نے زراعت کو بہتر بنانے کے لئے مفید سفارشات پیش کیں اور حکومت نے شملہ میں صوبوں کے وزیروں، ناظموں اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی ایک کانفرنس منعقد کر کے کمیشن کی سفارشات کو منظور کیا، اور ان پر عمل کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۲۹ء میں امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ مستقل ممبران کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ مگر حکومت نے ابھی تک دیہات سدھار کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ گو پنجاب کے ضلع گڑگاؤں میں مسٹر ایف۔ ایل برین کے تجربات بہت کامیاب رہتے تھے۔ بہر حال زمانہ اس طرح گزر رہا تھا کہ ۱۹۳۱ء میں عالمی کساد بازاری شروع ہو گئی۔ اس کساد بازاری نے کاشتکاروں کی حالت اور تباہ کر دی۔ دوسری جانب بھی وہ زمانہ تھا جبکہ کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا تھا۔ مگر حکومت کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ اس کی سب سے بڑی مخالف جماعت دیہات کے کثیر التعداد لوگوں کا من موہ لینے میں کامیاب ہو، چنانچہ اب اس نے بھی دیہات سدھار کی جانب توجہ کی اور ہندوستانی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ ۳۵-۱۹۳۴ء کے موازنہ میں دیہات سدھار کے لئے ایک کروڑ روپیہ منظور ہوا۔ اس کے بعد سے مرکزی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں نے اس طرف توجہ شروع کر دی ہے، مگر ۲۵ کروڑ زراعت پیشہ آبادی کی امداد کروڑ، ڈیڑھ کروڑ روپیہ سے کیا ہو سکتی ہے۔

مگر سارا الزام حکومت کے سر رکھ دینا بھی مناسب نہیں۔ ہندوستانی گاؤں کی تبدیلی میں مصلحین معاشرت، قوم کے لیڈروں اور محب وطن لوگوں کے اشتراک کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ دراصل ہمارے مصلحین معاشرت کا فرض تھا کہ وہ دیہات کی جانب توجہ کرتے مگر انھوں نے اپنی توجہ کو شہروں تک محدود رکھا، مگر وہ کارخانوں کے مزدوروں کے اوقات کار کم کرانے، عورتوں کو زیر زمین معدنوں میں کام کرنے، ان کو زائد وقت کا الاؤنس دلوانے، اور ان کے لئے دوسرے امدادی طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش میں مصروف رہے چونکہ شہروں میں رہنے والے مزدور دنیا کے حالات سے تھوڑے بہت واقف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے ہڑتالوں اور مزدور سبھاؤں کے ذریعہ اپنی حیثیت کو مضبوط بنا لیا۔ اور گزشتہ کے مقابلہ میں کافی مراعات حاصل کر لیں یہ بات دوسری ہے کہ ان مراعات کے باوجود ان کا معیار زندگی پست اور ان کی اجرتیں ادنیٰ ہوں۔ ہمارے ملک میں کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ۲۰ سے ۲۴ لاکھ کے درمیان ہے۔ گویا ہم نے قلیل اقلیت کی طرف توجہ کی مگر اس کثیر اکثریت کو نظر انداز کر دیا جس کی تعداد ۲۵ کروڑ کے قریب ہے۔ اس عام غفلت کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ شہر کے رہنے والے دیہات کے حالات سے ناواقف تھے، ان کو پتہ نہیں کہ ہمارا کسان صبح سورج نکلنے سے بلکہ بعض اوقات سورج نکلنے سے پہلے سے سورج ڈوبنے تک جلتی ہوئی دھوپ، کڑکتی ہوئی سردی، تیز بارش میں آسمان کے نیچے ایسی سخت محنت کرتا ہے جس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کثیر آبادی جس ماحول میں رہتی ہے وہ ملیریا، پلیگ، ہیضہ انفلوئنزا، اور دق کا گھر ہے، وہ جن کنوؤں کا پانی پیتی ہے اس میں ہزار ہا قسم کے امراض کے جراثیم زیر پرورش ہیں۔ وہ جو غذائیں کھاتی ہے اُن میں چاروں حیاتوں (وٹامن) میں کسی ایک کا یا بعض اوقات کسی کا بھی جزو نہیں۔ وہ قرضدار ہے، گھر میں کھانے کو نہیں مگر لڑتی ہے، منشیات استعمال کرتی ہے، رسومات پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہے۔ دراصل دیہاتی اصلاح کا کام دیہات کے رہنے والے تعلیم یافتہ لوگوں کو کرنا چاہیے۔ اوّل تو یہ دیہات کے رہنے والے ہوتے ہیں اور وہاں کے حالات سے کما حقہ واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے ان کو دیہاتیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے، تیسرے تعلیم کی بدولت ان میں وسعت نظر، دور اندیشی اور سوچ بچار کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ دنیا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ مگر انھوں نے بھی لاپروائی سے کام لیا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیہات میں ذہین، ذی عقل اور دور اندیش آدمی پیدا نہیں ہوتے۔ گو ان کی تعداد مختصر ہی کیوں نہ سہی، مگر یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر انھوں نے اِن چھوٹے

چھوٹے دور افتادہ اور غیر معروف مقامات کو اپنے لئے ناموزوں سمجھا۔ کیونکہ یہاں اِن کے جذبۂ شہرت پسندی کے لئے میدان بہت تنگ تھا۔ وہ خدمت و ایثار کرنا چاہتے تھے مگر اس کے ساتھ شہرت و ناموری کے بھی خواہاں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں دھواں دھار تقریریں کریں۔ تاکہ سارے شہر پر ان کی قابلیت کا سکہ جم جائے۔ اخباروں میں جلی حروف سے ان کی تقریروں کے اقتباسات شائع ہوں۔ اخباروں میں ان کی تصویریں چھپیں، انجمنیں اور سبھائیں ان کو اپنے جلسوں کی صدارت کے لئے مدعو کریں، ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ایک گاؤں میں کہاں میسر، شہرت طلبی کی یہی مذموم خواہش تھی جس نے ان کی توجہات کو شہروں کی طرف پھیر دیا اور گاؤں پھر کس مپرسی کے عالم میں پڑے رہ گئے۔

اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آخر اصلاح دیہات کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے لئے بڑے کثیر روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور کسی بڑی سے بڑی حکومت کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اتنی کثیر رقم اس مد پر خرچ کرسکے۔ حقیقت میں جب کوئی نیا کام شروع کیا جاتا ہے تو اس کے لئے زر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اسی کو ستار، رزاق، اور قاضی الحاجات سمجھ لینا زرپرستوں کا تخیل ہے۔ دُنیا میں اکثر کام اور بالخصوص جن کا تعلق انسانوں سے ہو وہ خالی زر سے نہیں ہوسکتے۔ ان کے لئے بعض اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے جن کو ہم خلوص، ایثار، ہمدردی، صداقت اور انسانیت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، ہر ملک اور قوم کی تاریخ ایسی نظیریں پیش کرسکتی ہے کہ حقیر ترین ادارے جن کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی مگر یہ دوسرے عناصر موجود تھے، دُنیا میں کامیاب ہوگئے۔ اور لاکھوں کا سرمایہ رکھنے والے اداروں کا آج پتہ بھی نہیں۔ ضرورت ہے کہ کام کا جوش رکھنے والے مخلص اور تعلیم یافتہ نوجوان گاؤں میں سکونت اختیار کریں۔ وہ اپنے آپ کو غریب دیہاتیوں کا دوست، مشیر بلکہ خادم سمجھیں، وہ ان سے ملیں، ان کے گھروں میں جائیں، ان کے دُکھ اور سُکھ میں شریک ہوں، ان کی اچھی اور بُری باتیں سنیں، انھیں مشورہ دیں اور ان کا اعتماد حاصل کرکے اپنا پروگرام ان کے سامنے پیش کریں۔ اس طرح چند ہی سال میں ہندوستان کی کایا پلٹ ہوسکتی ہے۔ ابتدا میں لوگ گاؤں میں رہنے سے ہچکچائیں گے۔ کیونکہ وہاں ان کو مشکلات پیش آئیں گی، وہاں کوئی سوسائٹی نہ ہوگی، وہاں اخبار، رسالے، کلب، سینما، شہروں کی چہل پہل نہ ہوگی۔ وہاں وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کریں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ ان کو کسی زنداں میں ڈال دیا گیا ہے، مگر رفتہ رفتہ وہاں کی سادہ زندگی پُر فضا اور خوشگوار آب و ہوا، اِن کے دلوں پر اپنا اثر جمالے گی، اور پھر ان کو شہر کاٹنے کو دوڑیں گے، ابتدا میں ایسے مخلص اور کام کرنے والے نوجوانوں کی ہمت افزائی صوبجاتی حکومتوں اور بالخصوص کانگریسی حکومتوں کو کرنا چاہیئے۔ جب ایک مرتبہ ایک راستہ بنجائے گا تو اس پر چلنے والے خود پیدا ہوجائیں گے۔

محمد احمد سبزواری

بی۔ اے (عثمانیہ)



هزاردستان

ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

جولائی۔اگست۔ستمبر ۱۹۳۸ء

میرا خواب

(ساغر کی ایک کہانی جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو براڈکاسٹ کی گئی)

میں نے جاگتے میں ایک خواب دیکھا۔ کہ یہ دنیا قدرت کا ایک سپنا ہے۔ اور قدرت اس خواب کو اپنے ارادے سے دیکھ رہی ہے۔ میں جب سوتے میں خواب دیکھتا ہوں تو میرے خواب کی ہر دید اور ہر شنید میرے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ مگر قدرت کا یہ عظیم، دلچسپ، شیریں، لیکن حیرتناک خواب ایسا خواب ہے جو خود اس کے ارادے سے دیکھا جا رہا ہے۔

خواب دیکھنا کیسی عجیب فطرت ہے کہ انسان تو انسان خود قدرت اس کے رنگین جال میں پھنسی ہوئی خواب دیکھ رہی ہے!؟

قدرت نے اس خواب کو تڑوہتی۔ نمو و مسرت اور امید کے شانوں پر اپنا سر رکھ کر دیکھنا شروع کیا تھا۔ خواب دیکھنے کی پہلی آرزو ہی اس کے شاندار خواب کا آغاز تھا۔ اس کے بعد خواب شروع ہو گیا۔

دھرتی۔ آکاش۔ چاند۔ ستارے، باغ و صحرا، دریا و آبشار کہسار اور سمندر غرضیکہ تمام مناظر فطرت ہستی کے سینے سے پھوٹ کر اپنی اپنی رفتار سے گذرنے لگے۔ شام و سحر کا دور شروع ہوا۔ رنگ و بو نے دُنیا کو پُر بہار اور چاند ستاروں نے کائنات میں چراغاں کر دیا۔

قدرت اس خواب کو دیکھ رہی تھی۔ اور بے چین تھی۔ وہ کونسی شے ہے جس کے بغیر میرا خواب بے جان ہے، میرے چاروں طرف خوشبو بکھری ہوئی ہے۔ مگر میرا مشام اُس سرمدی مہک سے محروم ہے۔ جس کے لئے میں اپنی روح کو بے چین پاتی ہوں آخر وہ نسیم کہاں ہے، جس سے میرے خواب کی فردوس سراسر خوشبو بن کر اُڑ جا سکتی ہے!؟

یہ اس کی دوسری آرزو تھی ——— عدم کی خوابگاہ سے "انسان" انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ دُنیا کے ہر منظر میں ایک نئی زندگی کی روح دوڑ گئی۔ اب قدرت کے خواب کی عظمت کا کیا کہنا تھا۔ انسان تخلیق کے کیف سے جھومتا ہوا اُٹھا۔ قدرت نے مسرت سے بیتاب ہو کر امید کی گردن میں باہیں ڈالدیں اور بولی!

یہ میرا شاہکار ہے۔ مجھے اس پر ناز ہے، صبح کی دیوی کو حکم ہوا کہ نسیم و شمیم سے انسان کے چرن دھوئے۔ سورج کو حکم ہوا کہ قدرت کے محبوب کے ماتھے پر اپنی کرنوں کا تلک لگائے، کہساروں کو تنبیہ کی گئی۔ کہ اپنی سرکش گردنیں جھکا دیں اور سمندروں سے کہا گیا کہ اپنی موجوں کو ساکت کر کے انسان کے قدموں کے نیچے بچھا دیں۔ چاند ستاروں کو حکم ہوا کہ اُس نور کو سلامی دیں جس نے قدرت کے خوابوں کی دُنیا کو روشن کر دیا ہے۔

ایک لمحہ میں زندگی اپنی تمام شکتی کے ساتھ آدمی کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی،

مگر قدرت کی طرف سے انسان کا خیر مقدم اپنے خواب کی افزائش کے سوا اور کیا معنی رکھتا تھا کچھ دن بعد قدرت نے دیکھا۔ اس کے

خواب کا ہیرو [illegible] ہے۔ کبھی سینے پر ہاتھ رکھتا ہے
کبھی [illegible] پھولوں کے کنجوں کی طرف دوڑتا ہے
کبھی درختوں کو اپنی آغوش میں بھینچتا ہے۔ آواز آئی۔ یہ تو پاگل
ہوگیا! ـــــ قدرت نے امید سے کہا نہیں اور مسکرانے
لگی۔ اس کی مسکراہٹ کی ایک لہر۔ صرف ایک موجِ تبسم بجلی کی طرح
کوندی۔ اور انسان کی آغوش معمور تھی۔ آباد تھی۔ پہلے تو یہ وحشی
گھبرایا۔ مگر دل کی زبان میں آنے والے سے پوچھنے لگا: ـــ
"کیا تو چاند کی کرنوں سے برسی ہے؟ کیا نسیم میں جان پڑگئی؟
کیا شمیم ذی روح ہوگئی۔ اے اوشا کی سہیلی کیا تو ستارۂ سحر سے برسی
ہوئی روشنی ہے یا پو پھٹنے سے پہلے کی نیرنگیوں کا عکس ہے؟ یا
ابھی ابھی سمندر کی تازہ موجوں کے ہلائے ہوئے صدف سے پھوٹی ہے
ـــــ!؟ اے موتیوں کی روح!"
اشاروں کی زبان میں عورت نے کہا۔ میں "محبت" ہوں
ـــــ اس کے بعد خواب کی ساری فضا، پریم کے اک تارہ پر
مسرت سے تھرکنے لگی ـــ

(خواب دیکھنے والے ہی اس مجبوری کو جانتے ہیں کہ کبھی خواب
مکمل نہ دیکھا جاتا ہے۔ اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے)
یکایک قدرت نے ایک خوفناک چیخ بلند کی۔ ـــ "خون"۔
ایک ساتھ اُس نے دیکھا خواب کی دُنیا خون سے رنگین
ہے۔ انسان، انسان کے خون سے کھیل رہا ہے۔ اور ایک خوفناک
سایہ اس کے دوش بدوش حرکت کرتا ہے۔ زندگی اور موت کی
جنگ۔ ظلم و ستم کا راج۔ قتل و غارت کی گرم بازاری۔ خود غرضی اور
خود پرستی کی اک قیامت!؟
قدرت نے آغاز کے نقطہ سے لیکر ترقی کے مرکز تک انسانی
تمدن۔ معاشرت اور دماغی خلاقی کے وہ وہ مظاہر اپنے خواب میں
دیکھے کہ حیرت میں رہ گئی۔ اُس نے شخصیت کا کرّ و فر بھی دیکھا اور
تہذیب و ترقی کے نام پر کمزور قوموں پر طاقتور اقوام کا فولادی پنجہ
کبھی گرتا ہوا دیکھا۔ ازل سے وہ ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ کبھی

اس خواب میں اُسے جرمنی، اٹلی، جاپان، چین اور اسپین کے
خواب بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ مجال کہاں کہ خواب کے سلسلے کو
توڑدے اور شاید یہ اُسکے بس میں بھی نہیں ہے۔
قدرت کی دلچسپی دن رات بڑھتی گئی۔ آپ کہیں گے یہ
خواب کے ساتھ دن کا کیا تعلق ہے۔ تو کیا یہ غلط ہے۔؟ ہم
فرضی اعتبارات کے سہارے جیتے ہیں۔ دن۔ دن ہے اور رات
رات۔ یہ ہمارے شب و روز تو خواب کے دن رات ہیں۔ قدرت
ہمارے دن رات کی قیدی نہیں۔ آزاد ہے۔ سپنوں کی رسیا ہے
خواب دیکھتی ہے اور جیتی ہے۔!؟

(۲)

میں بھی قدرت کی طرح سپنوں کا رسیا ہوں۔ مجھے تو قدرت
بھی خواب نظر آتی ہے۔ اک خواب میں نے دیکھا؟ جب میں پیدا
نہیں ہوا تھا تو پیدا ہونے کے خواب دیکھتا تھا۔ جب ماں کی
گود میں آیا تو شعور کا خواب ماں کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔ اور جب
ذی شعور ہوگیا۔ تو سوتے جاگتے خواب دیکھنے لگا۔

(۱)

اوّل اوّل میرے گوشۂ احساس میں کسی عجیب و غریب خیال
نے چٹکی لی۔ اک چکر سا آیا۔ سینے میں دل کی دُنیا ہچکولے سے کھانے
لگی۔ ایک بڑی ہی سُندر صبح تھی۔ مدن بان اور چنبیلی کے پھول ہر طرف
کھلے ہوئے تھے۔ ایک لڑکی اپنے کومل ہاتھوں سے پھول چُن رہی
تھی۔ میں نے بڑھ کر اُس کے چرنوں کو دامنِ گلچیں بنا دیا۔ اُس نے
نازک ہاتھوں سے پھول اُچھالتے ہوئے جواب دیا۔ ہم نے بھی پھول
توڑے۔ یہ کہہ کر وہ ماضی کی طرح معدوم ہوگئی۔ اور اس کے بعد
ہم دونوں کبھی نہیں ملے۔

(۲)

اپنے جھونپڑے سے میں ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھتا ہوں
میں نے دیکھا صبح سے زیادہ لطیف اور حسین شہزادی ایک رنگ محل
میں بیٹھی ہوئی چاند ستاروں سے کھیل رہی ہے۔ اس کے لبوں سے
گیت پھول بن بن کر برس رہے ہیں۔ میں نے سوچا اس کو کیا نذر دوں

بڑے تپ جپ کے بعد میں نے ایک مالا تیار کی۔ سُنئے اس مالا میں جو موتی تھے وہ دُنیا کی کسی مالا میں نہیں دیکھے گئے تھے۔ وہ شبنم سے زیادہ لطیف، ستاروں سے کہیں روشن اور موتیوں سے کہیں قیمتی و خوبصورت تھے۔ یہ مالا لیکر میں اس کی طرف بڑھا۔ لاکھوں کوس کی مسافت میرے جھونپڑے اور رنگ محل کے درمیان تھی۔ چلتے چلتے برسوں ہو گئے۔ مگر میں اُس کے آستان تک نہ پہنچ سکا۔ مگر شہزادی کو اتنا قریب پاتا تھا کہ وہ میری مالا کے ہر دانے میں بیٹھی ہوئی گنگنایا کرتی تھی ــــ

ایک دن میں نے دیکھا، میری مالا کا دھاگہ ٹوٹا۔ اور موتی بکھر گئے۔ ان کو بٹورنے کی ناکام کوشش میں جھکا ہی تھا کہ لرز گیا۔ میں ایک ملوجیں مارتے ہوئے سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔

میں بیداری میں سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا۔ جو لوگ جاگتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خیال کرنا۔ خواب دیکھنے سے مختلف چیز ہے۔ وہ خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ خیال بیداری کا خواب ہے۔ مستقبل کے لئے سوچنا۔ پروگرام اور اسکیمیں بنانا اور اپنے خیالات کی ایک سوچی ہوئی ترقی یافتہ شکل کی تصویر تخیل میں دیکھنا یہ خیال ہے یا خواب ؟

ہاں تو وہ شام بھی بڑی ہی سُندر اور نشیلی شام تھی ۔ وہ زندگی کی شاموں میں تاریخی اور یادگار شام! جب میں نے محسوس کیا کہ میرے پیروں پر لطیف طور پر ایک ہی وقت میں خنکی اور گرمی بوسہ دے رہی ہے۔ سر جھکا کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سپنوں کا حاصل میرے قدموں میں پڑا ہے۔ اس وقت میں نے ضرور کہا تھا کہ الٰہی! یہ خواب ہے یا حقیقت ؟ یعنی دُنیا کی ہر شے کو اضافی یقین کرتے ہوئے، حقیقت بھی واقعی کوئی چیز ہے؟ وہ مسکرائی اور بولی ۔ نئے زمانے میں خواب کی کوئی حقیقت نہیں۔ آؤ اس پھولوں سے سجی ہوئی کشتی پر بیٹھو، آؤ اس مندر میں چلیں جہاں ہم ایک دوسرے کی پوجا کریں گے۔ اور امر ہو جائینگے۔ سفر شروع ہو گیا۔ ایک صبح ہوا کے شدید جھونکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ندی کی ایک ایک موج اژدر میں بدل گئی ہے اور کشتی کو اچھال کر نگل جانا چاہتی ہے

میں نے دیکھا وہ محو خواب تھی۔ میں نے پوچھا۔ طوفان میں بھی خواب کی کچھ حقیقت ہے ؟ اُس نے جواب دیا مجھے سونے دو ــــ بلند مندر کا عکس سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ کنارا قریب تھا۔ مگر ہر حقیقت خواب ہو چکی تھی۔ سوائے خواب کے کوئی حقیقت نہیں !

انسان کی فطرت خواب کی بندی ہے۔ وہ کیونکر خواب سے آزاد ہو سکتی ہے۔ جن باتوں کو زندگی کی امٹ سچائیاں کہا جاتا ہے۔ اُن کا آغاز خواب ہی سے ہوا۔ خدا کے خواب نے کائنات اور انسان کو پیدا کیا۔ ساری موجودات دختر خواب ہے۔ شاعروں کے خوابوں نے قوموں کو بام عروج پر پہنچنے کی حقیقت بخشی۔ فاتحین کے خواب نے ملکوں کی تقدیریں بدل دیں۔ اور پیغمبروں کے خوابوں نے دنیا کو نیکی۔ امن اور دوامی عافیت کی نوید دی۔ پھر میں اپنے خوابوں کو ہیچ کیوں خیال کروں۔ ان خوابوں کے سہارے تو میں جیتا ہوں۔ انہیں خوابوں کے شہپروں پر میں مستقبل کے سیہ خانے کی سیر کر آتا ہوں۔ اور وہاں اپنی نشانیاں چھوڑ آتا ہوں۔ کہ مجھے حقیقت بن کر وہاں پھر جانا ہے ۔

میں نے بہت زمانہ ہوا۔ اس حقیقت کا خواب ہی دیکھا تھا۔ جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے۔ میں نے غیر اختیاری طور پر شہرت کا خواب دیکھا۔ کیا خواب میں نے دیکھا ؟

ایک عظیم الشان ملک ہے، اتنا عظیم الشان کہ یہ ہماری دُنیا اس کا ایک گوشہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے آسمانوں پر دو لفظ جگمگا رہے ہیں۔ "محبت اور محنت"، سورج اور چاند ان دونوں لفظوں کو اپنے دوش پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ دور بہت دور سے اپنے زرنگار رتھ پر سوار آ رہے ہیں۔ وہ قریب بہت قریب ہو گئے، میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بس یہی ایک لمحہ تھا کہ میں نے خواب دیکھنے سے خود کو محروم پایا۔ کچھ دیر کے بعد سورج اور چاند کا رتھ گذر گیا تو میں نے سُنا دور سے شہنائی کی دلدوز صدا آ رہی ہے ۔ وہ قریب آئی اور قریب آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حوروں کے جھرمٹ میں حُسن کی دیوی اپنے کاندھوں پر "امر جیون" کے لفظ کو اُٹھائے رقص کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے ۔

میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں ۔ میرا سینہ ایک حرارت سے پھنک گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے خاک ہوں۔

اس خواب کے بعد میں نے محنت و محبت کو دُنیا کی سب سے بڑی سچائی ثابت ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

ایک رات گہری تاریکی میں موت اپنے خوفناک رتھ پر سوار ہو کر میرے گھر آئی۔ وہ اس طرح آئی۔ جیسے رات کی تاریکی کا ایک حصّہ ٹوٹ کر خوفناک شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ موت نے کہا:۔

تم نے زندگی ہی کے خواب دیکھے۔ کبھی میرا خواب بھی دیکھا،

میں نے جواب دیا۔ تمہاری بھول ہے۔ زندگی کے خواب دیکھنا ہی تمہارے خواب دیکھنا ہے۔ مگر میں ابھی اپنی خوابگاہ تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ تم میری منزل نہیں ہو۔ مجھے خوابوں سے فرصت نہیں ہے۔ـــ

اُسی رات سے میں نے اپنی خوابگاہ میں قفل لگا دیا ہے کہ یہ روسیاہ موت اگر میرے روشن خوابوں میں خلل نہ ڈالے۔

میں نے دیکھا، خوشی، غم، بیماری، لاچاری۔ فراغبالی، تنگ دستی، زندگی کی ہمسری اور جیون کی کراہ بیک وقت خوابوں میں ایک ہی مرکز پر دور کرتے ہیں۔ مگر یہ خوابوں کے رسیاہی کی آنکھیں ہیں۔ کہ دل پر بیتتی ہے ۔ مگر دیکھتا ہے ۔

خوابوں کا کارواں بھی کیا سبک سیر کارواں ہے۔ میری آنکھوں اور دماغ پر طوفان کا شور، آگ کی لپٹیں، گھوڑوں کی ٹاپیں، سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کچھ اثر نہیں کرتے۔ عجیب وغریب مخلوق، درندوں اور لاکھوں دُنیاؤں کا بوجھ بھی سپن دیوتا دماغ اور آنکھوں پر رکھ دیں۔ مگر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پر وزن محسوس نہیں ہوتا محسوس کرتے۔ اور سب کچھ دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں۔ مگر ہائے مجبوری کسی خواب کو حقیقت بنا کر رکھ نہیں سکتے۔!

بظاہر یہ خوابوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے مگر خواب ایک ہی ہے۔ اور اس کا نہ دیکھنا انسانی ـــــ فطرت کے خلاف ہے۔ کوئی حقیقت اس خواب سے آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ میں اور قدرت دونوں خواب کے رسیا ہیں۔ وہ محو خواب، میں مستِ خواب !!

ساغر نظامی

تتلی اور گلاب

(آٹھ سے اسی برس تک کی عمر کے بچوں کیلئے)



ایک تھی تتلی اور ایک تھا گلاب کا پھول۔ دونوں باغ کے ایک کونے میں الگ تھلگ رہتے تھے۔

تتلی گلاب کے پھول کو اپنا سہانا ناچ دکھاتی۔ اور گلاب اُسے دیکھ دیکھ کر جھومتا۔ اور مارے خوشی کے اپنی ساری پتیاں کھول دیتا کہ تتلی جتنا رس چاہے چوس لے۔ دونوں میں دوستی تھی۔ اور وہ اپنی چندروزہ زندگی خوش خوش گذار رہے تھے۔

باغ کے جس حصے میں یہ دونوں رہتے تھے وہ ایسا بے رونق تھا کہ تیتریاں اور بھونرے اُدھر کبھی رُخ نہ کرتے تھے۔ وہاں گلاب کا صرف ایک ہی پیڑ تھا۔ اُس میں کلیاں تو کئی تھیں۔ مگر پھول یہی ایک کھلا تھا۔ چنانچہ تتلی گلاب کے پھول کو دنیا کا سب سے حسین پھول سمجھتی تھی۔ اور گلاب کا پھول تتلی کو دُنیا کی سب سے حسین تتلی۔ دونوں کی زندگی بڑے امن اور چین سے گزرتی تھی۔

ایک دن اتفاق سے تتلیوں کا ایک جھرمٹ اُدھر آنکلا وہ سب کی سب حسین تھیں۔ اُن کے پر رنگ برنگے اور نازک تھے اور اُن پر نہایت خوش نما چتیاں پڑی ہوئی تھیں، یہ تیتری خوبصورتی میں اُن کی گرد کو بھی نہ پہنچتی تھی۔ اس کے پر نازک تو تھے۔ مگر اُن کا رنگ نہ تو سُرخ تھا۔ نہ نیلا اور نہ ارغوانی۔ وہ سفید تھے اور بس۔

تتلی اور گلاب کا پھول بڑی حیرانی سے انہیں دیکھنے لگے۔ یہ جھرمٹ باغ کے اس کونے میں صرف پل بھر کے لئے رُکا۔ اور پھر آگے بڑھ گیا۔ تتلیوں کو شاید باغ کا یہ ویران کونا پسند نہ آیا۔ اور اُنہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہاں ہمارے حُسن کو پرکھنے والا تو کوئی ہے نہیں۔ یہاں کیا ٹھہرنا۔ باغ کے اُس حصّہ کا رُخ کیا۔ جہاں چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ رنگا رنگ اور قسم قسم کے پھول کھلے تھے۔ سنگِ مرمر کا حوض تھا۔ وہ چاہتی تھیں۔ کہ اس کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھیں اور حوض کی لال لال خوبصورت مچھلیوں سے باتیں کریں۔

ان تتلیوں کے اِدھر آجانے سے ان دونوں کی زندگی جیسے یک بیک بدل سی گئی۔ اب وہ پہلے کی طرح خوش نہ رہے۔ تتلی کو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دُنیا میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر حسین تتلیاں موجود ہیں۔ اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ ادھر گلاب کا پھول اپنی دوست کو غمگین دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔

آج تتلی نہ پہلے کی طرح گلاب کے ارد گرد ناچی نہ اس کی پتیوں پر بیٹھ کر رس پیا۔ دن بھر دونوں چپ چپ رہے۔ آخر دن تمام ہوا اور چاروں طرف شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ تتلی رات کو ہمیشہ گلاب کے پھول کی گود میں سویا کرتی تھی۔ مگر آج وہ اس کی شاخ کے اُن پتوں میں جن میں کانٹے ہی کانٹے تھے مُنہ چھپا کر پڑ رہی۔ معلوم ہوتا تھا اپنی بدصورتی کی وجہ سے گلاب کے پھول سے دور رہنا چاہتی ہے۔

رات ہوئی۔ پرندوں کے چہچہے ختم گئے۔ ہر طرف خاموشی

چھا گئی۔ جگنو روشنیاں لے لے کر باغ میں چوکیداری کرنے نکل آئے سب چرند پرند سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ مگر گلاب کے پھول کو نیند کہاں۔ وہ اپنے دوست کے غم کا راز سمجھ گیا تھا۔ اور دل ہی دل میں ایسی تدبیریں سوچ رہا تھا جس سے تتلی حسین بن جائے۔

آدھی رات گذر گئی مگر پھول اب بھی سوچ رہا تھا۔ یکایک ایک تجویز اُس کے ذہن میں آئی۔ مگر وہ ایسی خوفناک تھی کہ اس کی پتی پتی کانپ اُٹھی۔ آخر اس نے دل مضبوط کیا اور اس تجویز پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

اس نے جُھک کر تتلی کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر شاخ کے ہرے پتّوں میں بے خبر سو رہی تھی۔ پھول نے اپنا سارا زور لگا کر اپنی پتّیوں کو سکیڑنا اور اُن کی نازک رگوں سے سُرخ رس جو گویا پھول کا خون تھا۔ کھینچنا شروع کیا۔ اس عمل سے پھول کو کس قدر تکلیف ہوئی۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے مگر وہ پھر بھی خوش تھا۔ کیونکہ وہ یہ سب تکلیف اپنے دوست کو خوش کرنے کے لئے اُٹھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں پھول کی کٹوری سے خون کے سُرخ سُرخ قطرے اُس جگہ ٹپکنے لگے۔ یہاں تتلی اپنی بدصورتی کا غمناک خواب دیکھ رہی تھی۔ رات بھر گلاب کے پھول کے خون کے یہ سُرخ سرخ قطرے تیتری کے سفید ملگجے پروں پر گرتے اور ان میں جذب ہوتے رہے اور پھول خون نکل جانے کے باعث لحظہ بہ لحظہ کمزور ہوتا گیا۔

صبح کو سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی تتلی کی آنکھ کھُل گئی۔ اسکی نظر جونہی اپنے پروں پر پڑی اس کے مُنہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ اب اس کے پَر ان تتلیوں کے پروں سے بھی زیادہ خوشنما تھے جو ایک دن پہلے ادھر سے گذری تھیں۔ سفید سفید پروں پر سُرخ سُرخ چتّیاں یوں چمک رہی تھیں۔ گویا تتلی کے پروں پر ننھّے ننھّے لال ٹکے ہوں۔ ایک بات اس کے پروں میں ایسی تھی جو دُنیا کی کسی تتلی کے پروں میں نہ تھی۔ وہ یہ اس کے پروں سے گلاب کی بھینی بھینی خوشبو نکلتی تھی۔ جیسے گلاب کا عطر لگا رکھا ہو۔

تتلی نے دل میں سمجھا۔ رات ضرور پریوں کی نیک دل ملکہ کا ادھر سے گذر ہوا ہے۔ اُسے چونکہ اپنی مخلوق کے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اُسے میرے غم کی وجہ معلوم ہو گئی اور اسی نے مجھے حسین بنا دیا۔

تتلی کی خوشی کا اب کیا ٹھکانہ تھا۔ وہ شاخ سے باہر نکلی۔ اور اپنے خوبصورت پروں کو ہوا میں ہلا ہلا کر اُڑنے لگی۔ سب سے پہلے اسے اپنے دوست گلاب کے پھول کا خیال آیا۔ اور وہ نازو انداز سے اُڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

لیکن اب پھول کہاں تھا! رات ہی رات میں اسکی حالت ایسی بدل گئی تھی کہ دیکھ کر گمان نہ ہوتا تھا کہ وہ کبھی تازہ اور حسین بھی ہو گا۔ وہی پھول جس کی سُرخی کبھی کبوتر کے خون کو شرماتی تھی۔ اب مرجھا کر ایسے پھیکے رنگ کا نظر آ رہا تھا۔ گویا کئی دنوں کا باسی پھول ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر تتلی کو بڑا اچنبھا ہوا۔ کچھ دیر بعد بولی "پیارے گلاب۔ ننھے گلاب تمہیں کیا ہو گیا؟"

پھول میں جواب دینے کی سکت نہ تھی۔ تتلی نے پھر کہا "پیارے ننھّے گلاب۔ ادھر دیکھو!" پھول نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک تتلی کے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ اپنے دل میں کہنے لگی "یہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ کہیں یہ میرا حُسن وجمال دیکھ کر جل تو نہیں گیا!"

یہ کہا اور اپنے خوشنما پر ہوا میں لہراتی۔ اٹھکیلیاں کرتی۔ باغ کے اُسی حصّے کی طرف چل دی جس طرف حسین تتلیوں کا جھرمٹ گیا تھا۔ جہاں چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ رنگا رنگ اور قسم قسم کے پھول گملوں میں لگے تھے اور سنگِ مرمر کے حوض میں لال لال خوبصورت مچھلیاں تیرتی تھیں۔

غلام عبّاس

روحوں کی دُنیا

(ساغرؔ کی ایک تقریر جو ۱۹ر جون ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کی گئی)

کچھ دن کی بات ہے کہ میں کشمیر گیا۔ میرے ہمراہ ایک پڑھی لکھی خاتون اور نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کو ماننے والے بے پڑھے لکھے دوست تھے۔ یہ امیر آدمی تھے۔ اور گو لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مگر ہر وقت مذہب۔ روح۔ دُنیا۔ عقبیٰ اور زمین آسمان کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ خاص کر روحوں کے بارے میں اُن کے دماغ کا خزانہ کبھی خالی نہیں دیکھا گیا۔ خاتون گو ہر بات کو مانتی تھیں مگر کبھی کبھی باتوں کو عقلِ سلیم کے کانٹے پر بھی تول لیا کرتی تھیں۔ مگر میں نے بہت سوچا، یا الٰہی کشمیر سے ان باتوں کا کیا تعلق ہے۔ مگر کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر بھی اپنے ہمسفر دوستوں کی اَن مل بے جوڑ باتوں سے دلچسپی ضرور لیتا تھا۔ اس دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ یا کیا؟ بہرحال میرے خیالوں میں ایک صوفیانہ روح دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اور کچھ ہو یا نہو، ان باتوں کا یہ اثر تو ضرور ہوا کہ میں سیاست۔ مذہب۔ روح۔ مادّہ اور اسی قسم کے مسئلوں کی گُتھی سلجھانے کی کوشش میں اُلجھ کر رہ گیا۔ سب سے زیادہ اثر میرے دماغ پر روحوں کا تھا۔

ٹھنڈی چاندنی راتوں میں ڈل کے اندر ہاؤس بوٹ کے تھرتھراتے ہوئے عکس کے نیچے میرے کان روحوں کے قدموں کی چاپ سی سُنتے رہتے اور نگاہیں سفیدے کے درختوں کے سایوں میں طرح طرح کی روحوں کے دیکھنے کے لئے بھٹکتی تھیں۔

رات دن کے ذکر اذکار نے تمام دُنیا کو جاندار بنا دیا تھا اور میرے لئے کائنات پُراسرار ہو گئی تھی۔ دماغ کا یہ سانچہ بنا اور تصوّرات اس میں ڈھل گئے ——— تب مجھ پر یہ بھید کھُلا کہ "دو شانتی کا راز" توہم میں پوشیدہ ہے۔

(۲)

ایک رات کو میرے دوست روحوں کے قصّے سُنا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو میں نے سوچا کہ آخر یہ روح کیا ہے اور زندگی کے بعد دوسری زندگی؟ آخر یہ کیا جنجال ہے۔ اور کیوں ہے ——!؟ اگر ہے تو سب کیوں نہیں مانتے ——؟ نہیں ہے تو اتنے سارے کیوں مانتے ہیں۔ انہیں وسوسوں میں اُلجھا ہوا۔ میں اپنے ہاؤس بوٹ سے نکلا۔ اور جہلم کے کنارے کنارے چل دیا۔

میں کچھ ایسی شکتی اپنے اندر دیکھ رہا تھا۔ جیسے آج انسانی روح کا ہر بھید معلوم کر لوں گا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ جہلم کے کنارے ایک سفید براق چیز چُپ چُپ، ساکت کھڑی ہے، میرا رواں رواں کانپ گیا۔ مگر میں بے ارادہ چلتا رہا۔ ذرا اور آگے بڑھا تو میں نے سوچا یہ کوئی آدم زاد ہے۔ جو پانی بھرنے کے لئے دریا کے کنارے آیا ہے ——! مگر ایسی سردی میں!؟ اتنی رات گئے!؟

میں کچھ اور آگے بڑھا تو میں نے اس کے لباس۔ سکوت اور بھاؤ سے یہ جان لیا کہ وہ اس مادّی دُنیا کی کوئی مخلوق نہیں ہے۔ ایکبار پھر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ کپکپاہٹ کے ساتھ دھندلکا اس طرح کم ہوا۔ جیسے کوئی کسی دُلہن کے مکھڑے سے سُرمئی ریشمیں اوڑھنی ایک ساتھ

کھینچ لے - چاندنی پھیل گئی -

چاندنی میں اس کی آنکھوں میں زندگی کی شعاع چمکی - لب ہلے - مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ میں جان نہیں ہے، ہوش نہیں ہے - ارادہ نہیں ہے - خوف اور نیم غنودگی کی حالت میں میرے کانوں میں آواز آئی :-

کیا ڈھونڈتا ہے ــــــ ؟ کیا چاہتا ہے ــــــ !؟

میں علم و حکمت کی روح ہوں - میں جس انسانی دماغ سے پردے اٹھا دیتی ہوں - وہ امر ہو جاتا ہے - اور دنیا کو سچائی اور شانتی کا راستہ دکھاتا ہے - میں روشنی ہوں - میں گہرائی ہوں - اور میں وسعت ہوں - آ جا میرے آغوش میں - میں تیرے سینے کو اپنے تبسم سے نورانی کردوں - تیرے دل و دماغ سے وہ موٹے موٹے پردے اتار پھینکوں - جو روایتوں کی گرد سے اٹے پڑے ہیں -

خوف اور بے ہوشی ہی کی حالت میں رحم اور پیار سے بھری ہوئی تقریر سُن کر میں نے محسوس کیا کہ میں نسیم کی طرح لطیف ہوگیا ہوں میں نے کہا :-

اے علم و حکمت کی روح !

مجھے روحوں کی دنیا میں لے چل، اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے چل -

علم و حکمت کی روح نے جواب دیا :- اے بے کل انسان ! میں تجھے لیکر روحوں کی دنیا میں چلتی ہوں -

یہ کہکر اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا - اور ایک دباؤ کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ میں بلند ہوا - اور بلند ہوتا چلا گیا - طرح طرح کی خوشبوئیں رنگارنگ منظر اور مختلف اثر کرنے والی ہواؤں میں بلند ہوتا چلا گیا - یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں ایسی فضا میں ہوں - جہاں ایک عجیب خموش ہنگامہ ہے دل پر اس ہنگامہ کا دباؤ پڑتا ہے، محسوس ہوتا ہے مگر نظر نہیں آتا - اور ہوا کے سرد جھونکے میرے پاس آتے، جاتے اور ٹھہرتے گذرتے ہیں - یکایک میں نے سُنا ؎

بگذار دلا، وسوسۂ عقل و معاش | از ہستیٔ خویشتن بیر چون او باش
در بزم برقلندران معنی بنیش | آزادہ شو و شراب نوش خوش باش

میں نے علم و حکمت کی روح سے پوچھا :-

یہ خیام کی رباعی کس نے پڑھی !؟

علم و حکمت کی روح نے جواب دیا :-

خود خیام نے - دیکھو وہ میرا کامیاب شیدائی، مسکرا کر تمہارا خیر مقدم کر رہا ہے -

خیام کی روح :- خوش آمدید اے عزیز مہمان ! کہو تمہاری دنیا کا کیا حال ہے - ؟ میرے زمانے میں جو نفسی نفسی تھی - کیا اُسی خود غرضی کا راج ہے کیا دکھ اور مصیبتیں اسی طرح پھیلی ہوئی ہیں - اور ہاں ! جو نسخہ میں نے آدمی کی مسرت اور سکون کے لئے تجویز کیا تھا ــــ وہ دنیا کو یاد ہے یا نہیں !؟

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است" ــــ کو اگر انسان سمجھ گیا ہے تو بے چینی اور اضطراب ختم ہو جانا چاہیے - غم اور مصائب کے ہنگامے دب جانے چاہئیں - یہی تو انسان کی منزلِ مقصود ہے !؟

میں نے جواب دیا :- جناب والا دنیا کا میں آپ سے کیا حال عرض کروں :-

آپ کے زمانے اور میرے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے - زندگی کے رُخ سے تمام حجابات اُلٹے جارہے ہیں - پرانے مسلمات سے لوگ باغی ہو رہے ہیں - اور ایسی ایسی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں - کہ پرانے لوگوں کے ذہن و خیال میں بھی نہ ہوں گی - آپ جانتے ہیں کہ بال کی کھال جب نکلتی ہے مصیبت پیدا ہوتی ہے - سو انسان جتنی تلاش کر رہا ہے - اتنا ہی گم ہو رہا ہے - لیکن وہ اصلی چیز - جسے "مسرت اور سکون" کہتے ہیں وہ دور دور نہیں زندگی ہر طرف پڑی کراہ رہی ہے -

آپ کے عہد میں ایک شہر کی بات مہینوں میں دوسرے شہر تک پہنچتی تھی۔ اب سیکنڈ کا سواں حصّہ بھی صرف نہیں ہوتا۔ اور دُنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک لبوں کی حرکت سُن لی جاتی ہے۔

خیام کی روح نے کہا :۔ حیرت ! ؟

اس ترقی کے باوجود دُنیا اک ہُوک ہے، اک چیخ ہے۔ اور اس کے دُکھ کا واحد علاج آپ کا نسخہ ہے۔ دُنیا اسے بھولی نہیں۔ بلکہ استعمال کر رہی ہے۔ فقیر کی چٹکی نے بڑا کام کیا ہے۔ یورپ سے لیکر ایران اور ایران سے لیکر ہندوستان تک آپ کا ڈنکا بج رہا ہے۔ عہد سلجوقی میں تو آپ کو محض ہیئت داں، نجومی، ماہر ریاضی سمجھا جاتا تھا۔ شاعر حکیم کا درجہ آپ کو میرے عہد نے دیا ہے۔ آپ کا فلسفہ اور آپ کی تعلیم تھکی ہوئی انسانیت کی بہترین پناہ ہے۔ میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ فضا میں کبیر داس کی روح یہ بھجن گاتی ہوئی نظر آئی ؎

تو جانے ہر دور ہے، پر ہر، ہر دے ماہیں
اندر تیرے کپٹ ہے تا سے دیکھت ناہیں

کبیر کی روح بولی :۔ جیون کا حاصل عشق نہیں، بھگتی اور معرفت ہے۔ آنند اور چت دھیان گیان میں ہے نہ کہ ہنسی اور مستی میں؟ رنج اور دکھ شانتی اور اشانتی سب کرنی کے پھل ہیں۔ نیکی جیون کی دھارا کو اصلی سرچشمہ سے ملا دیتی ہے ؎

ہر بسرے کبیرا بھلا ہوا
ہر مرے تو ہم مرے اور ہری مر بلائے ۔۔۔ سانچ گرو کا بالکا مرے، نہ مارا جائے
ہر بسرے، ہر بسرے کبیرا بھلا ہوا

کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ پارسی ہے نہ عیسائی۔ سب ایک ہی سمندر کی موجیں ہیں۔ سب ایک درخت کی شاخیں ہیں۔ سب کچھ ایک سے نکلا ہے۔ سب کچھ ایک میں مل جائے گا۔ بابا۔ ! تیاگ میں چین ہے۔ اور دھیان گیان میں شانتی۔ کوئی پناہ نہ ڈھونڈ۔ اصلی پناہ کی طرف آ ؎

جا کی جا کی سب کہیں، مانی کہئے نہ کوئے ۔۔۔ مانی سے جو لگ رہا۔ بال نہ بیکا ہوئے

یکایک چانک کی روح آئی اور بولی :۔

غلط۔ جھوٹ۔ زندگی کا حل نہ تم نے پیش کیا۔ نہ خیّام نے۔ صرف میری "راج نیتی" ہے جو آدمی کو زندگی کے گُر بتاتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جب سے دُنیا قائم ہوئی اس وقت سے میرے عہد تک "قوّت زندہ باد" کی کہاوت غلط ثابت نہیں ہوئی ۔۔۔ ! ؟ بعد کا مجھے اندازہ نہیں بتاؤ کیا دُنیا میری راج نیتی کے بتائے ہوئے راستوں سے آگے نکل گئی ہے؟ کیا سیاسیات میں سب جائز ہے کا اصول غلط ہو گیا ؟

میں نے عرض کیا :۔ مہاراج دُنیا آپ کے بتائے ہوئے راستہ سے نہ صرف آگے نہیں نکلی۔ بلکہ اس راستہ پر تیزی سے چل رہی ہے۔ مگر گستاخی معاف ! ذرا یہ تو فرمائیے کہ آپ کے بعد فوراً ہی اشوک کو حق اور سچائی کی بُنیادوں پر سلطنت قائم کرنے میں کیوں کامیابی ہوئی ۔۔۔ ! ؟ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چانک کی روح نے بات کاٹ کر کہا :۔

یہی تو لوگ نہیں سمجھتے کہ چندر گپت موریا کے وزیر اعظم کی "راج نیتی" ہی اشوک کی کامیابی کی بُنیاد ہے۔ ہر سلطنت "راج نیتی" کی بُنیادوں ہی پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے بعد سُت کا اعلان ہوتا ہے، میری نگاہ میں وہ نکتے ہیں جن کو مورخ چھوڑ گئے۔ یاد رکھو طاقت ہی حکومت ہے اور حکومت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں۔ قوّت کا قیام اسی اصول پر مبنی ہے کہ "اس حکم کو مانو۔ اس کو مت مانو"۔ یہ ہے سلطنت کا کل نچوڑ !

میں نے عرض کیا :۔ مگر اس کے باوجود دُنیا کو آج تک سکون حاصل نہیں۔ آج کی تمام تہذیب اور کل سیاسی عقیدے آپ کی "راج نیتی" کی

بُنیادوں پر سہی مگر دُنیا برابر تڑپ رہی ہے۔

چانکیہ کی روح نے جواباً کہا:۔ اور اس وقت تک تڑپتی رہے گی۔ جب تک "راج نیتی" پر عمل نہ کرے۔ مگر ــــــ

کارل مارکس کی روح نے بات کاٹ کر کہا:۔

کبھی نہیں۔ میرے نظام میں دُنیا کا امن اور سلامتی پوشیدہ ہے۔ شاعری۔ تصوّف۔ راج نیتی ایک ہی افیون کے تین نام ہیں۔ دُنیا کے مسئلوں کا حل دُنیا میں تلاش نہ کرنے کی غلطی برابر ہوتی رہی۔ چانک مہاراج! یہی ہے بُنیادی خرابی۔ بدلنے والی دُنیا کے لئے نہ بدلنے والے قانون!؟ کیا خوب! ہیں نے انسانی فلاح اور ضرورت کے لحاظ سے اپنے نظام پر اکتفا کی تعلیم بھی نہیں دی۔ عام سکون و امن کے لئے سب کچھ بدلا جاسکتا ہے۔ میں نے تاریخ کی مادی تعبیر کی۔ دوسری دُنیا کے خیال کی طرف سے توجہ ہٹا کر زندگی پر نگاہیں جمادیں۔!؟

اور زندگی! (کبیر کی روح نے دخل درمعقولات کے طور پر کہا)

ارے سیانے! اگر دوسری دُنیا نہیں تھی۔ تو تم یہاں کہاں ــــ!؟

چندا جھلکے سب کوئے جائیں

"رُک جاؤ" (ملکۂ نورجہاں کی روح نے تیز لہجے میں کہا)

تخلیق کے سرچشمہ پر تم سب نے آگ ہی برسائی۔ شاعر ہو یا سیاست داں۔ صوفی ہو یا فلسفی عورت کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ یہ حضرت مارکس جو باتیں بنا رہے ہیں۔ یہ بھی عورت کے درد کو سمجھنے کی طرح نہ سمجھ سکے۔ اور یہ چانک مہاراج! انہوں نے کیا کیا۔ ان کے تو سارے نظام میں عورت دُکھیا کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں کس طرح سیاست کا کھلونا بنی رہی۔ سیاسی کھلاڑیوں نے کہیں کسی کو بھیجا کہیں کسی کو پٹکا۔ شیر افگن کا جو حشر ہوا۔ وہ روشن ہے۔ ملکہ بنی۔ طاقت ہاتھ میں آئی۔ سو وہ بھی جہانگیر کے سہارے۔ میرا جی ہی جانتا ہے کہ میں نے کیا کیا جتن کئے۔ جیسے ہی اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ میری ہستی کوئی راہبہ سے زیادہ رہ گئی!؟

ــــــ راوی کے کنارے اک مایوس زندگی۔!!

میں تو ٹھہری عورت ذات، مگر اس کا جواب دو۔ تم نے مرد ہو کر عورت کیلئے کیا کیا؟ نصف بہتر دیوی قابلِ پرستش یہ اور وہ ــــ سب کھلا فریب! (یکایک مُلّا دو پیازے کی روح نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی)

سب غلط۔ عورت، عورت ہے اور مرد، مرد۔ اکبر، اکبر ہے۔ جودھا بائی، جودھا بائی۔ سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ روحوں کی دُنیا اور یہ واویلا ــــ!!

کیسی شاعری۔ کیسی شکتی۔ کیسی بھگتی۔ کیسی سیاست۔ کیسی طاقت اور کیسی مادیّت!؟

ہنسنا۔ ہنسانا۔ اور ہنسی اُڑانا ــــ یہ ہے زندگی!

جینا۔ جینے دینا۔ یہ ہے سچی سیاست و طاقت۔ محبّت کرنا اور محبّت کرانا یہ ہے بھگتی اور شکتی ــــ اور بغیر کسی لاگ کے کھانا پینا۔ مزے اُٹھانا۔ اور ہنسی خوشی مر جانا۔

یہ ہے زندگی کا سب سے بڑا فلسفہ

یہ کہہ کر مُلّا صاحب کی روح نے قہقہہ لگایا تو مجھے بھی ہنسی آگئی۔ یکایک میں نے دیکھا۔ جہلم کی موجیں صبح کی روشنی سے کھیل رہی ہیں۔ اور میں جہلم کے کنارے کھڑا ہوا ہوں۔

ساغر نظامی

ٹالسٹائی کا سب سے پہلا افسانہ

حملہ

ٹالسٹائی نے یہ افسانہ ۱۸۵۲ء میں لکھا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر چوبیس سال تھی، لیکن اشاعت سے قبل سنسر نے کاٹ چھانٹ کر کے اس کا ناس کر دیا تھا، جس کا خود ٹالسٹائی کو سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ ایک خط میں اُس نے اپنے بھائی سرجی کو لکھا:۔

"یہ افسانہ سنسر کی قطع برید کی وجہ سے ناس ہو گیا، اس میں جتنی خوبیاں تھیں وہ یا تو نکال کر پھینک دی گئیں، یا پھر اس طرح بدل دی گئیں کہ کچھ کا کچھ ہو کر رہ گئیں۔ افسوس!"

اب اسّی سال بعد جبکہ روس میں ہر طرح کی آزادیاں نصیب ہیں، علم و ادب پر پابندیوں کی لعنت باقی نہیں رہی، ٹالسٹائی کی تصانیف کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ماسکو میں اُسکے اصلی مسودات کی چھان بین کی گئی، تو اس افسانے کا اصلی مسودہ بھی ملا پھر اس کو اس کی اصلی صورت میں شائع کیا گیا۔

"آرگوسی"، جولائی ۳۲ء میں یہ افسانہ مسٹر اور مسز ایلمر ماؤڈ کی متحدہ کوششوں سے پہلی مرتبہ انگریزی میں شائع ہوا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مسٹر اور مسز ماؤڈ ٹالسٹائی کے خاص عقیدتمندوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور انگریزی زبان میں ٹالسٹائی کے جتنے تراجم موجود ہیں، اُن میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے تراجم کو دی جاتی ہے۔ س۔ ج۔

لڑائیوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ لیکن اُن لڑائیوں سے نہیں، جو بڑے بڑے فوجی افسروں کے ماتحت بحری جہازوں، یا خشکی پر بڑی بڑی فوجوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ یا پھر فوجیوں کی نقل و حرکت سے دلچسپی ہرگز نہ تھی کہ وہ بہت شاندار اور پُرشکوہ معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی لڑائیوں سے مجھے ہمیشہ نفرت سی رہی، شاید اس لئے بھی کہ وہ میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ بلکہ مجھے لڑائی کی اصلیت اور کشت و خون کی ماہیت جاننے سے دلچسپی تھی ـــــ میں جاننا چاہتا تھا کہ کن حالات میں، اور کن جذبات کے ماتحت ایک سپاہی دوسرے سپاہی کو مار ڈالتا ہے۔ میں بس یہی جاننا چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ آسٹرلیزا اور بورڈینو میں فوجیں کس طرح آراستہ کی گئیں ہیں۔

میں دیر سے اپنے کمرے میں ہاتھ ہلا ہلا کر ٹہل رہا تھا۔ اور یہ سمجھ رہا تھا کہ میں بھی اپنے وقت کا سورما ہوں، جیسے میں نے ہزاروں کی تعداد میں دشمنوں کو قتل کیا ہے، اور اس خدمت کے صلے میں جنرل بنا دیا گیا ہوں۔ اس تخیل کے ماتحت میرے دل میں مسرتوں کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ لیکن میرے دماغ میں جو خیالات چکر لگا رہے تھے، وہ عجیب و غریب تھے۔ میں ایک جنرل کی حیثیت سے یہ سوچ رہا تھا کہ "آخر کن خیالات اور جذبات کے ماتحت ایک انسان

خود کو خطرات کے اندر ڈال دیتا ہے۔ اور کیوں اپنے مقابلے میں پاکر دوسرے انسان کو قتل کر دیتا ہے۔ انسان میں ایسی بربریت کیوں پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو دماغ میں یہ خیال قائم رہا کہ یہ سب کچھ غصّے کی حالت میں ہوتا ہے مگر پھر یہ ممکن نہیں کہ ساری کی ساری فوج ہر وقت غصّے میں رہتی ہے۔ اس خیال کے علاوہ مجھے بہت سے مفروضہ فرائض کا احساس ہوتا رہا۔

"شجاعت" کیا ہے؟ وہ صفت جو ہر زمانے اور ہر قوم میں عزّت کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ یہ صفت، ہر شخص میں کم و بیش کیوں ہے؟ کبھی یہ انتہائی سرکش آدمیوں میں پائی جاتی ہے، اور کبھی نیک اشخاص میں بھی۔ کیا خطرات کا خاموشی اور مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنا صرف جسمانی طاقت پر منحصر ہے؟ تو کیا ہر لمبے چوڑے اور قوی آدمی کی عزّت ایک سورما کی طرح کی جاتی ہے؟ کیا ہر طاقتور آدمی سورما کہا جاتا ہے؟ کیا گھوڑے کو بھی بہادر کہا جا سکتا ہے؟ کیونکہ وہ بھی کوڑے کے خوف سے ایسی پُرخطر جگہوں میں قدم ڈال دیتا ہے جہاں قدم بڑھاتے ہی اس کا گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یقینی ہے۔ کیا اُس لڑکے کو بھی بہادر اور شجاع کہا جا سکتا ہے؟ جو سزا کے خوف سے خطرناک جنگل میں چلا جائے، جہاں پہنچتے ہی اُسکی موت یقینی ہے۔ کیا اس عورت کو بھی بہادر کہا جا سکتا ہے؟ جو یہ جاننے کے باوجود کہ اُس کو مجرم بن کر سزا بھگتنی پڑے گی، محض رسوائی کے خوف سے اپنے بچّے کو مار ڈالتی ہے، یا پھر اُس شخص کو بہادر کہا جا سکتا ہے جو محض خود نمائی کی غرض سے ایک انسان کو قتل کر کے کہتا ہے کہ خود میرے قتل ہو جانے کا خطرہ تھا۔

ہر خطرے کے موقع پر انسان اپنے خیالات کے ماتحت عمل کرتا ہے، اُس کو بھی اختیار ہوتا ہے کہ خطرے کا مقابلہ کرے یا بھاگ جائے اور یہی وہ خیالات ہیں جن کی بناء پر کسی کو بہادر یا بُزدل کہا جاتا ہے۔ میرے دماغ میں یہی خیالات اور شکوک بھرے ہوئے تھے اور انہیں کو جاننے کے لئے میں لڑائی پر جانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ تاکہ مجھے خود ان کا تجربہ ہو جائے۔

سنہ ۱۸۴۲ء کا واقعہ ہے، گرمیوں کا موسم تھا، میں کاکسس (روس کی ایک فوج) کے ساتھ "ن" میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ جگہ نہایت اچھی تھی۔ جولائی کی بارہ تاریخ تھی، کپتان خلوپو میرے معمولی مکان میں داخل ہوا۔ وہ پورے فوجی لباس میں آراستہ تھا، اُس کی کمر میں بیش قیمت اور خوبصورت تلوار بندھی ہوئی تھی، جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، حالانکہ میرا اُس کا ساتھ ایک عرصے سے تھا۔ وہ آتے ہی مجھے کچھ سُننے کے لئے بیچین دیکھ کر بولا۔

"میں سیدھا جنرل کے پاس سے آ رہا ہوں۔ کل ہمارا دستہ یہاں سے روانہ ہو جائیگا۔"

"کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"م —— وہاں مورچہ کو مضبوط کرنا ہے۔"

"اور شاید وہیں لڑائی بھی شروع ہو گی۔"

"ممکن ہے —— میرا بھی خیال یہی ہے۔"

"کس طرف —— تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اس میں خیال کو کیا دخل ہو سکتا ہے۔ میں تم سے وہی کہہ رہا ہوں جو مجھے معلوم ہے۔ کل رات کو ایک تاتاری سوار نے آکر جنرل کا یہ حکم سُنایا کہ دستہ دو دن کی خوراک کے ساتھ روانہ ہو جائے۔ لیکن کیوں اور کتنے دنوں کیلئے، یہ سب میں نے دریافت نہیں کیا۔ ہم لوگوں کو جانے کا حکم ہوا ہے اور وہ میرے لئے کافی ہے۔"

"لیکن جب دو دن کی خوراک ساتھ رکھنے کا حکم ہوا ہے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دستہ دو دن سے زیادہ باہر نہیں رہے گا۔"

"نہیں، اس سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔"

"یہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ایک مرتبہ ہم لوگ ڈرگو گئے۔ ایک ہفتہ کی خوراک ساتھ رکھنے کا حکم تھا، لیکن وہاں ہم لوگوں کو ایک مہینہ ٹھہرنا پڑا۔"
"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں نا؟" میں نے سوال کیا۔
"ہاں ـــــ لیکن، تم خود کو خطرات میں کیوں ڈالتے ہو؟"
"لیکن میں تمہاری نصیحت سُننا نہیں چاہتا۔ میں ایک مہینہ سے محض اس امید پر یہاں پڑا ہوں کہ کبھی مقابلے کی لڑائی ہو تو دیکھوں۔ اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ اس موقع کو بھی کھو دوں۔ کیوں؟"
"نہیں۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں۔ مگر بہتر یہی تھا کہ تم یہاں ٹھہرتے اور ہماری واپسی کا انتظار کرتے۔ اس درمیان میں تم سیر وشکار سے دل بہلاتے۔"
وہ اس انداز سے سب کچھ کہہ گیا، جیسے ایک مہینہ سخت انتظار میں کاٹ دینا اس سے بہتر ہے کہ کوئی لڑائی میں شریک ہو، لیکن میں نے فیصلہ کن طور پر کہا۔
"یہ ہرگز ممکن نہیں۔"
"میں زبردستی نہیں کرتا۔ لیکن وہاں تمہاری دلچسپی کی کون سی چیز ہو سکتی ہے ـــ؟ ـــ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں تو میخیلوسکی ڈانیلوسکی کی کتاب "حالات جنگ" پڑھو۔ یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ اس میں تمہیں ہر چیز بالتفصیل ملے گی۔ یہاں تک معلوم ہو جائیگا کہ میدانِ جنگ میں لاشیں کس طرح پڑی رہتی ہیں خون کس طرح جم کر سیاہ ہو جاتا ہے اور لڑائیوں کے داؤگھات کیا ہوتے ہیں۔"
"مگر مجھے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے اُکتا کر جواب دیا۔
"تو پھر کس چیز سے دلچسپی ہے؟ ۔ کیا تم دیکھنا چاہتے ہو کہ آدمی کس طرح قتل ہوتے ہیں۔ ۱۸۳۲ء میں میرا ایک دوست بھی میرے ساتھ تھا، شاید وہ اسپین کا باشندہ تھا۔ دو محاصروں میں میرے ساتھ وہ شریک ہوا، بڑی سرگرمی سے لڑا اور وہ کارہائے نمایاں کئے کہ تجربہ کار افسر بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ لیکن میرے دوست تم یہ نہیں کر سکتے۔"
میں نے دیکھا کہ کپتان میری باتوں کو نہ سمجھا۔ اور اب اُس کو غلط فہمی ہو رہی ہے، اس لئے اس سلسلے کو ختم کر دینے کیلئے میں نے اُس سے سوال کیا۔
"کیوں تمہارا وہ دوست بہادر بھی تھا؟"
"خدا بہتر جانتا ہے۔ مگر اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ سب سے آگے رہتا تھا۔ اور جہاں سخت گولہ باری ہوتی تھی، وہاں موجود رہتا تھا۔"
"تب تو وہ ضرور بہادر تھا۔" میں نے کہا۔
"نہیں۔ جہاں ضرورت نہ ہو، وہاں خود کو خطرے میں ڈال کر پہنچ جانا بہادری نہیں ہے۔" کپتان نے جواب دیا۔
"تو پھر تمہارے نزدیک بہادری کیا تعریف ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"بہادر . . . . . بہادر؟" کپتان نے اس طرح دہرایا جیسے کسی سے پہلی مرتبہ سوال کیا جائے اور وہ گھبرا کر سوال کو دہرائے ـــــ پھر تھوڑی دیر تک سوچنے اور ماتھے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اُس نے جواب دیا۔
"بہادر وہی ہے، جو یہ سمجھ کر کام کرے کہ اُس کو کیا کرنا چاہئے۔"
مجھے یاد آگیا کہ حکیم افلاطون بہادری کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے "بہادری وہ صحیح علم ہے کہ کس چیز سے ڈرنا اور کس چیز سے نہ ڈرنا چاہئے۔" یہ خیال آتے ہی میں نے دونوں کا موازنہ کیا۔ دونوں کی تعریف کی بنیاد تقریباً ایک ہی ہے۔ مگر پھر بھی کپتان نے بہادری کی جو تعریف کی ہے وہ یونانی فلسفی سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کپتان بھی یونانی حکیم کی طرح اپنے خیالات کے اظہار پر قادر ہوتا تو ضرور یہی کہتا "بہادر وہی ہے جو اُنہیں چیزوں سے ڈرتا ہے

جوڈرنے کی چیزیں ہیں، اور جو چیزیں ڈرنے کی نہیں ہیں اُن سے نہیں ڈرتا" میرا ارادہ ہوا کہ اپنے خیالات کا اظہار کپتان پر کردوں۔ میں نے کہا۔

"ہاں میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہر خطرے کے موقع پر انسان کی اپنی پسند کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ یہی پسند جب احساسِ فرض کے ماتحت ہوتی ہے تو بہادری کہلاتی ہے، اور اگر ذاتی اغراض کی بنا پر ہوتی ہے تو بزدلی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص ذاتی اغراض کی بنا پا اپنی جان کو خطرے میں ڈالدے وہ کسی حال میں بھی بہادر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو شخص احساسِ فرض اور ضرورت کے ماتحت کسی معمولی خطرے کا بھی مقابلہ کرے تو وہ بہادر ہے۔ یا کوئی شخص اگر سچائی کے ساتھ کسی معمولی خطرے کا بھی مقابلہ کرنے کو نہ تیار ہو تو وہ بزدل نہیں کہا جا سکتا۔"

جب میں یہ کہہ رہا تھا تو کپتان مجھے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں خاموش ہو گیا تو وہ اپنے پائپ میں تمبا کو بھرتے ہوئے بولا۔

"میں صرف ایک سپاہی ہوں، اس لئے میں اس قسم کی گفتگو میں تمہاری دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا۔ البتہ ہم لوگوں کے پاس ایک نوجوان فوجی تعلیم حاصل کرنے کیلئے آیا ہے، وہ اس قسم کے فلسفیانہ مباحث سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے، تم اُس سے ملو، وہ شاعر بھی ہے۔"

میں کپتان کو روس چھوڑنے سے پیشتر ہی سے جانتا تھا۔ لیکن میری اور اُس کی ملاقات یہاں آکر ہوئی تھی۔ اُس کی ماں، میری ایوانوا خلوپوا، ایک غریب اور معمولی زمیندار تھی، میری ریاست سے دو میل کے فاصلہ پر اُس کا مکان تھا۔ میں یہاں آنے سے پیشتر اُس سے مل چکا تھا۔ بوڑھی عورت مجھ سے مل کر اس لئے بہت خوش ہوئی کہ میں اُس کے "پاشنکا" سے ملنے والا تھا۔ کپتان کو وہ پیار میں اسی نام سے پکارا کرتی تھی۔ وہ بہت زیادہ اس لئے خوش ہوئی کہ میں اُس کے لئے ایک زندہ خط کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس نے تھوڑی سی چیزیں مجھے دیں کہ اُسکے پاشنکا کے پاس پہنچا دوں، جس کا وعدہ میں نے اُس سے کر لیا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی تھیلی تھی۔ اور سیاہ ریشمی فیتے سے بندھی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت نے تھیلی مجھے دے کر کہا:۔

"دیکھو، اس میں ایک تعویذ ہے جس پر "بزنگ بُش" والی ماں کا بُت بنا ہوا ہے۔ سنو جب وہ فوج میں داخل ہو کر لڑائی کے میدان میں گیا تھا تو میں نے اپنی مہربان ماں سے یہ منّت مانی تھی کہ اگر وہ زندہ رہا تو تمہارا بُت بنوا کر اُس کے پاس بھیجدوں گی۔ یہ بُت تم اُسے دیدینا۔ دیکھو اٹھارہ سال ہوئے ابتک کنواری ماں مریم، اور خداوند یسوع کے رحم و کرم سے میدانِ جنگ میں سرگرمی سے حصّہ لینے کے باوجود کبھی زخمی تک نہ ہوا۔ میکائیل جو اُس کے ساتھ گیا تھا اُس نے مجھ سے اُس کے متعلق البتہ بہت سی باتیں کہیں۔ مگر وہ میرے گھبرانے کے خیال سے لڑائی کا قصّہ تو کیا کبھی اپنی خیریت کا خط بھی نہیں لکھتا۔ کبھی کبھی برس چھ مہینے گزرنے پر مختصر سا خط بھیجدیتا ہے۔" (حالانکہ یہاں آکر مجھے خود کپتان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک بار تو کیا چار چار بار سخت زخمی ہوا تھا اور زندگی کی امید باقی نہ رہی تھی۔ مگر ماں کو کبھی اس کے متعلق خبر نہ دی)۔

بوڑھی عورت تھوڑی دیر تک چپ بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

"ہاں۔ اور یہ تعویذ اُس کو پہنا دینا۔ میری ساری دعائیں اُس کے ساتھ ہیں۔ کنواری ماں اُسکی حفاظت کریں۔ میرے مہربان دوست اُس سے کہہ دینا کہ تعویذ ضرور پہنو، تمہاری ماں کی یہی خواہش ہے۔"

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ اُس کی ہدایت کے بموجب اُس کا پیام پہنچا دوں گا۔ لیکن بوڑھی عورت نے پھر کہنا شروع کیا۔

"تم بہت جلدی میرے پاشنکا سے محبّت کرنے لگوگے، وہ اتنا ہی اچھا آدمی ہے۔ میری باتوں کا یقین کرو، وہ ہر سال مجھے کچھ نہ کچھ روپیہ ضرور بھیجدیتا ہے۔ اسکے علاوہ میری بیٹی کی بھی ہمیشہ مدد کرتا رہتا ہے۔ خدا نے مجھے اتنا اچھا بیٹا دیا کہ اگر میں ساری زندگی بھی اُس کا شکریہ ادا کرتی رہوں تو کم ہے۔" بوڑھی عورت کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو چمکنے لگے۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کبھی تمہیں خط بھی لکھتا ہے؟"

"بہت کم۔ شاید سال میں ایک ہی بار جب روپیہ بھیجتا ہے۔ اس نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ خط نہ لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ میں زندہ اور بخیر ہوں، اور اگر میرے ساتھ کچھ حادثہ ہوا تو پھر لوگ تمہیں خبر کر ہی دینگے۔ خدا اس کو آفتوں سے بچائے۔"

جب میں نے کپتان کو اُس کی ماں کا تحفہ دیا، تو مجھ سے ایک کاغذ مانگا۔ اُس میں تعویذ کو حفاظت کے ساتھ لپیٹ کر اُس نے رکھ لیا۔ میں نے اُسکی ماں کے متعلق اُس سے بہت سی باتیں کیں۔ وہ برابر خاموشی سے سُنتا رہا۔ جب میں اپنی گفتگو ختم کر چکا تو وہ اُٹھ کر ایک کونے میں چلا گیا، اور دیر تک کھڑا کھڑا پائپ میں تمباکو بھرتا رہا۔ پھر مڑ کر بولا۔

"ہاں وہ بڑی نیک عورت ہے مجھے اُس کی زیارت نصیب ہوگی، یا نہیں، خدا جانے"

ان سیدھے سادھے الفاظ میں سچائی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھ پر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا اور میں نے اُس سے پوچھا۔

"تو پھر آپ یہاں ملازمت کیوں کرتے ہیں؟"

"ملازمت کرنا تو بہرحال ضروری ہے" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ اپنا تبادلہ روس کیوں نہیں کرا لیتے۔ وہاں آپ اپنی ماں سے قریب ہو جائینگے"

کپتان کے چہرے پر ایک ہلکا سا مغموم تبسم پھیل گیا اور اُس نے منہ ہی منہ میں دُہرایا۔

"روس، روس؟ یہاں تو بہرحال کچھ اچھی حالت ہے، لیکن روس میں تو بالکل معمولی زندگی گزارنی پڑے گی۔ یہاں تنخواہ دوگنی ملتی ہے، اُس پر اتنی تنگی سے گذرتی ہے، اور وہاں کیا ہوگا"

"آپ یہاں کون بڑی شان و شوکت سے رہتے ہیں، جس سادگی سے آپ یہاں رہتے ہیں، کیا روس میں اس تنخواہ میں گذارا نہیں ہو سکتا؟"

"اور بڑی تنخواہ کیا کافی ہوتی ہے" کپتان نے کہا "میرے افسروں کی حالت کا اندازہ کرو، کسی کے پاس ایک دھیلہ بھی بچتا ہے؟ سب کا سب مہاجنوں اور دُکانداروں کے پاس چلا جاتا ہے۔ پھر بھی مقروض ہی رہتے ہیں۔ تم میری رہائش کو کہتے ہو ...... کیا تمہارا خیال ہے کہ میری رہائش میری تنخواہ کے لحاظ سے زیادہ شاندار ہے، یا کم پایہ کی۔ بالکل نہیں۔ ابتک تمہیں یہ معلوم نہیں کہ یہاں ہر چیز کی قیمت تین گونہ زیادہ ہے ....."

کپتان اپنی رہائش کے معاملہ میں حد درجہ منتظم اور محتاط تھا۔ کبھی تاش یا کسی قسم کا جوا نہ کھیلتا تھا۔ اور نہ بہت شراب پیتا تھا۔ سب سے کم دام کا تمباکو استعمال کرتا تھا (جس کو چند وجوہات کی بنا پر خود ساختہ کہا کرتا تھا) مجھے اُس سے بڑی محبت ہوگئی تھی۔ وہ اُن چند سادہ مزاج روسیوں میں تھا جن سے انسان کو دوستی کرنی چاہئے۔ اس گفتگو کے بعد اُس کے لئے میرے دل میں اور بھی زیادہ قدر و منزلت کا جذبہ بڑھ گیا۔

۱۴۷

دوسرے دن چار بجے صبح ہی کو کپتان میرے پاس آیا۔ اُس وقت وہ ایک کوٹ پہنے ہوئے تھا، جس پر فیتیوں کا کام تھا۔ لیکن کندھوں پر فوجی جبہ نہ تھا، سر پر سفید بھیڑ کے چمڑے کی ٹوپی تھی، جو زمانہ کے ساتھ رنگ بدل کر کچھ پیلے رنگ کی ہوگئی تھی۔ اور کمر میں تلوار بندھی ہوئی تھی۔ ایک سبزہ پر جو گردن کو جھکا کر اور دُم کو جس میں بال بہت کم رہ گئے تھے۔ سوار تھا۔ اگرچہ اس کپتان کی شکل نہ تو بہت زیادہ پُرشکوہ تھی۔ اور نہ خوبصورت، مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار تھا۔

میں نے بالکل دیر نہ کی، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور ساتھ ساتھ قلعے کے پھاٹک سے باہر ہو گیا۔

فوجی دستہ ہم لوگوں سے بہت آگے تھا۔ لیکن نیزوں کی نوک سے جو دور سے سوئی کی طرح معلوم ہو رہی تھیں! ہم لوگ دستہ کا اندازہ کر سکتے تھے، یا پھر اُن کے گانے کی آواز سے جو کبھی کبھی ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ پھر ڈھول کی آواز جو مسلسل ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ سڑک جس پر ہم لوگ جا رہے تھے ایک وادی میں واقع تھی۔ جس کے پاس ہی ایک چھوٹا سا نالہ تھا جو اس وقت اُبل پڑا تھا۔ جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ اُڑ رہا تھا۔ کبھی ہم لوگوں کے سر پر چکر لگاتا اور کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ آفتاب ابتک طلوع نہیں ہوا تھا۔ مگر وادی کے دائیں جانب آفتاب کی ہلکی ہلکی شعاعیں پڑنے لگی تھیں۔ بھوری اور سفیدی مائل چٹانیں، سبز اور پیلی گھاس اور شبنم سے ڈھکی ہوئی "خار مسیح" کی جھاڑیاں۔ سُنہری صبح کی روشنی میں حد درجہ دلآویز معلوم ہو رہی تھیں، لیکن دوسری طرف ابھی تاریکی کا تسلط تھا۔ ساری فضا پر کہاسا کی ایک موٹی سی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مختلف رنگوں کی آویزش

کر کے فضا کو رنگ دیا گیا ہے۔ پہلا ارغوانی بالکل سیاہ، گہرا سبز اور سفید۔ ہم لوگوں کے سامنے برف سے ڈھکا ہوا پہاڑ سفید اور نیلگوں افق سے ملا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پتنگے۔ جھینگر اور دوسرے حشرات الارض ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور سڑک سے نیچے لمبی گھاسوں میں بیٹھے آزادی کے ترانے گا رہے تھے۔ اُن کی آواز ہمارے کانوں میں اس طرح پہنچ رہی تھی جیسے ہزاروں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ فضا پھول، پانی، گھاس اور کھلے کی بو سے لبریز تھی۔ اس میں شروع گرمی کی دلآویز صبح کی سہانی خوشبو تھی۔ کپتان نے ایک دیا سلائی جلائی اور اپنا پائپ جلایا۔ اس کے معمولی تمباکو کی بو اُس وقت مجھے بے حد خوشگوار معلوم ہوئی۔

فوجی دستہ سے جلد از جلد مل جانے کیلئے ہم لوگوں نے سڑک چھوڑ دی۔ کپتان اُس وقت بہت متفکر نظر آرہا تھا۔ پائپ برابر مُنہ میں لگائے رہا اور ہر قدم پر گھوڑے کو ایڑ لگاتا جاتا تھا۔ ہم لوگ سڑک سے نیچے گھاس سے بھری ہوئی زمین پر جا رہے تھے، اور ہر تھوڑی دور پر ٹاپوں کی آواز سے ایک تیتر اُڑتا اور تھوڑی دور جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ لیکن کپتان ان تمام دلچسپیوں کی طرف سے آنکھ بند کئے اپنی دُھن میں جا رہا تھا۔ حالانکہ یہ منظر ایسا تھا کہ ہر شکاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بہت کافی تھا۔

اب ہم لوگ فوجی دستہ کے قریب آ گئے تھے کہ پیچھے سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ فوراً ایک خوبصورت نوجوان، افسروں جیسا کپڑا پہنے اور سفید بھیڑ کی کھال کی ٹوپی پہنے ہمارے پاس سے تیزی سے گذر گیا۔ گذرتے وقت اُس نے کپتان کو دیکھا تعظیماً گردن جھکائی اور مسکرا کر گھوڑے کو کوڑا لگایا۔ میں اتنی جلدی میں صرف یہ اندازہ کر سکا کہ وہ گھوڑے پر خاص انداز سے بیٹھا ہے۔ لگام بھی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہے۔ واقعی وہ نہایت ہی شاندار معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھیں سیاہ اور چمکیلی ہیں اور شباب کا عالم ہے۔ مجھے اُس کی جو چیز سب سے اچھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ ہماری تعریفی نگاہوں کا اندازہ کر کے وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کا یہ تبسم ہی صاف کر رہا تھا کہ بہت ہی کمسن ہے۔

"یہ کہاں جا رہا ہے؟" کپتان نے اس انداز سے مُنہ ہی مُنہ میں کہا، جس سے بے اطمینانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"یہ کون شخص ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا نام انسائن الانن ہے۔ ہمارے دستے میں ماتحت افسر ہے اور ابھی ایک مہینہ ہوا، دستہ 'ل' سے آیا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ جنگ میں پہلی بار شریک ہونے کے لئے جا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا خوش ہے" کپتان نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نوجوانی"

"لیکن اس میں خوشی کی کون سی بات ہے؟ خیر میں یہ دیکھنے کا موقع ملے گا کہ جنگ سے وہ کتنی دلچسپی رکھتا ہے"

کپتان دو منٹ تک خاموش رہا۔ پھر نہایت ہی دھیمی آواز میں بولا۔

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں، نوجوانی، جس شخص نے ایک چیز کبھی نہ دیکھی ہو تو اُس سے کیا دلچسپی لے سکتا ہے۔ لیکن جو شخص اس کو چند بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھر اُس کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ سنو، اس دستے میں جو بیس افسر ہیں اور ان میں سے کوئی نہ کوئی جنگ میں ضرور ہی کام آئے گا۔ آج میں، کل دوسرا۔ پرسوں تیسرا۔ اب بتاؤ اس میں خوش ہونے اور دلچسپی لینے کی کونسی چیز ہے؟

جیسے ہی آفتاب پہاڑی سے بلند ہوا۔ ساری وادی روشن ہو گئی۔ بادل غائب ہو گئے اور گرمی شروع ہو گئی۔ فوجی سپاہی کندھے پر رائفل اور پشت پر مختصر سامان رکھے آہستہ آہستہ سڑک پر جا رہے تھے۔ بہت سے بوڑھے سپاہی نہایت ہی متانت کے ساتھ مُنہ میں پائپ دبائے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ کیونکہ سامان لادنے کی گاڑی سڑک پر جا رہی تھی، جس سے گرد کا ابر اٹھ کر فضا پر چھا گیا تھا اور بے حس و حرکت تھا۔ آگے آگے افسر گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور جلدی جلدی گھوڑوں کو چابک لگا رہے تھے کہ گھوڑے تیز چلیں۔ اسکے بعد گانے والے تھے جو تیز

دھوپ اور گرد و غبار ہونے کے باوجود گاتے جا رہے تھے۔

اس دستے سے دو سو گز کے فاصلے پر تاتاریوں کا ایک دستہ تھا، جس کا لفٹنٹ ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ لفٹنٹ نوجوان اور خوبصورت تھا۔ اس کے متعلق یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ خواہ جان ہی کا خطرہ کیوں نہ ہو، مگر سچ بولنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اُس کے جسم پر ایک لمبا سیاہ لبادہ تھا جس میں سنہرا کام اور لیس ٹنکا تھا۔ اور نہایت ہی خوبصورت مشرقی وضع کا جوتا پاؤں میں تھا۔ اور سر پر بھیڑ کے بال کی کھال کی اونچی ٹوپی جو پیشانی سے اوپر ایک طرف جُھکی ہوئی تھی۔ کمر میں ایک طرف بے نیام نیز تلوار تھی اور پاس ہی ایک چھوٹا سا پستول، سینے سے ہوتا ہوا کمر تک ایک چمکیلا فیتہ تھا۔ اُس میں بارود کی کپّی تھی۔ دوسرا پستول اور ایک طمنچہ اسکے کمربند سے آویزاں تھا اور مونڈھے پر ایک فیتہ تھا جس سے بندوق اس طرح آویزاں تھی کہ وہ اس افسر کی پُشت پر رکھی ہوئی تھی۔ اس لباس میں اس طریقہ سے اور اس شان کے ساتھ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا کہ ہر حرکت سے تاتاری معلوم ہوتا تھا، اور تاتاری سپاہیوں سے ایسی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جس کو میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن تاتاری سپاہی اس کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی گفتگو کو بالکل نہیں سمجھتے۔ دراصل وہ ان نوجوان اور بہادر افسروں میں سے ایک تھا، جو اپنی زندگی کو کہانیوں کے سورماؤں کے معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دراصل خود کو وہ "مُلّا نور" اور "ہمارے سورما" کے اوراق کے ہیرو کے معیار پر اپنی زندگی کو تولنے کا عادی ہو چکا تھا جس کی نظیر صرف کتاب کے اوراق میں مل سکتی ہے۔ لیکن دُنیا میں نہیں، اُس کی ہر حرکت اپنے دل کے مطابق نہ ہوتی تھی، بلکہ اپنے رجحان کے ماتحت اس کردار کے مطابق جس کو وہ اپنے لئے نمونۂ زندگی سمجھتا تھا۔

مثال کے طور پر خود یہ لفٹینٹ بااثر اور بلند شخصیت کے مرد اور عورتوں سے اور جنرل، کرنل وغیرہ سے ملنا زیادہ چاہتا تھا۔ اور ان کی صحبت کو زیادہ پسند کرتا تھا (یہ میرا خیال ہے کہ وہ اس طرح کی سوسائٹی کو پسند کرتا تھا، کیونکہ وہ بہت زیادہ بلند حوصلہ نوجوان تھا) لیکن وہ اپنا فرض یہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر بلند شخصیت کے انسان کو بُری نگاہوں سے دیکھے اور کبھی اُن سے اچھے مُنہ سے بات نہ کرے۔ حالانکہ اپنی اس کہانی میں وہ بہت ہی معتدل تھا کبھی انتہاپسندی سے کام نہ لیتا تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ بڑے لوگوں کے سامنے خود کو حد درجہ غیور اور مستغنی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اگر قلعہ میں کبھی کوئی خاتون آتی تو پھر اُس کا فرض ہو جاتا کہ وہ اپنے کسی عزیز دوست کے ساتھ اس دریچہ تک ضرور جاتا جہاں وہ خاتون بیٹھی ہوتی۔ اُس وقت لال قمیص، ڈھیلا پاجامہ اور سلیپر اُس کے لباس میں شامل ہوتے۔ زور زور سے قہقہہ لگانے میں اُسے شاید لطف آتا تھا۔ لیکن اس حرکت سے اُس کا مقصد کبھی اسے خفا کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ اپنے ظاہری حُسن کی نمائش اور یہ ظاہر کرنا کہ محبت کرنے کے قابل ہے۔ یا پھر وہ یہ کیا کرتا کہ اپنے دو تین وحشی تاتاری دوستوں کے ساتھ پہاڑی پر چلا جاتا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ رہتا اور جب کوئی ایسا تاتاری اُدھر سے گذرتا جس سے اُسے دُشمنی ہوتی، اُسے قتل کر دیا کرتا تھا۔ حالانکہ ہر بار اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس طرح دشمن کا خاتمہ کر دینے میں کوئی بہادری نہیں ہے۔ لیکن اُس کا یہ خیال ہو گیا تھا کہ قدرت کا میرے پیدا کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُن لوگوں کو میری ذات سے تکلیف پہنچتی رہے جن کے ساتھ اُس کے تعلقات اچھے نہ تھے، یا پھر جس سے وہ خواہ مخواہ نفرت کرنے لگے۔

دو چیزیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھیں ایک تو گرز اور دوسرے خنجر، خنجر ہمیشہ قمیص کے اوپر رہتا تھا اور جب سونے کیلئے بستر پر دراز ہو جاتا تو بھی اسی طرح ساتھ رہتا تھا۔ اُس کا پختہ خیال تھا کہ اُس کے بہت سے دشمن ہیں، اور اس خیال کے ماتحت وہ خون کرنے سے ذرّہ برابر بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ بلکہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا تھا کہ خون سے اُس کی ندامتیں دُھل گئیں۔ اُس کا ایمان تھا کہ انسان کے اندر دوسروں کے لئے نفرت و حقارت، جوشِ انتقام اور دوسروں کو ذلیل کرنے کا جذبہ سب سے زیادہ شاعرانہ اور دلیرانہ ہے۔ لیکن جب اُس کی داشتہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اُس نے کہا کہ وہ حد درجہ مہربان اور نرم دل انسان ہے۔ اور ہر روز اپنے تمام پراگندہ خیالات کو ڈائری میں ٹھیک اُسی طرح پابندی کے ساتھ لکھا کرتا ہے، جیسے اپنے روزمرّہ کے حساب کو، اور ہر روز نہایت ہی عجز و انکسار کے ساتھ خدا کی درگاہ میں عبادت ــــ اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتا ہے کہ اُس کے احباب بھی اُس کو اُسی نگاہ

سے دیکھنے کے عادی ہو جائیں جس نگاہ سے وہ خود کو دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اُس کے احباب نے کبھی اُس کو اُس روشنی میں دیکھنے کی کوشش نہ کی جس روشنی میں وہ خود کو پیش کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک بار رات کے وقت اپنے چند عزیز دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک ایسا آدمی مل گیا جس سے اس کو بغض تھا۔ اس نے اس شخص کی ٹانگ میں گولی مار دی۔ اُس کو گرفتار کر کے قلعہ میں لایا۔ وہ شخص سات ہفتے لفٹیننٹ کے ساتھ رہا۔ لیکن لفٹیننٹ نے پھر کبھی اس کو تکلیف نہیں پہنچائی بلکہ برابر اس کی اس طرح خدمت کرتا رہا جیسے اپنے کسی عزیز ترین دوست کی خدمت کر سکتا تھا۔ اور جب وہ شخص بالکل اچھا ہو گیا تو اُس کو بہت سے تحائف کے ساتھ رخصت کیا۔ ایک مرتبہ عین مقابلے کے وقت جب ہم لوگ سختی کے ساتھ پہاڑیوں کو پیچھے ہٹانے کے لئے گولہ باری کر رہے تھے، اور لفٹیننٹ بے حد مصروف تھا، کسی نے اُس کا نام لے کر پکارا، اس کے بعد ہی ایک زخمی فوجی اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا، لفٹیننٹ بے خوف ہو کر اُس کی طرف بڑھا اور گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ پہاڑیوں نے اُس کو اُس وقت کچھ نہ کہا، خاموش کھڑے رہے۔ کسی نے اُس پر گولی نہ چلائی۔ لیکن جیسے ہی وہ پلٹا چند پہاڑیوں نے ایک ہی بار اُس کو اپنا نشانہ بنا ڈالا۔ ایک گولی لفٹیننٹ کی پیٹھ میں لگی اور پیوست ہو گئی۔

ایک دوسرا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ایک بار قلعہ کے اندر ہی آگ لگ گئی۔ فوجیوں کا دستہ اُس کو بجھانے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک قدآور نوجوان مشکی گھوڑے پر سوار آیا۔ اور بھیڑ کو ہٹاتا ہوا آگ کے قریب تیزی کے ساتھ پہنچ گیا۔ پھر گھوڑے سے کود جلتے ہوئے مکان کے اندر گھس گیا، پانچ منٹ بعد وہ نکلا، لیکن ایسی حالت میں کہ سر کے تمام بال جھلس چکے تھے اور تمام چہرے پر خراش تھی، اور دو کبوتروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ صرف ان دو کبوتروں کو شعلوں سے بچانے کے لئے اُس نے خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

اس کا نام تھا روزنکرانز، وہ اپنے حسب نسب کے متعلق نہایت ہی فخر کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا اور اپنا سلسلہ نسب دارانجین (روس کا پہلا حکمراں خاندان) سے ملاتا تھا اور ہمیشہ فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ خود اور اسکے اسلاف قدیم روسی تھے۔

آفتاب اپنی آدھی مسافت طے کر چکا تھا۔ اور اپنی تیز اور گرم کرنوں کو خشک زمین پر پھیلا رہا تھا۔ گہرا نیلا آسمان۔ صرف پہاڑیوں کی چوٹیوں تک بادل منڈلار ہے تھے۔ ہوا ساکت تھی اور غبار آلود۔ گرمی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ ایک نہر ملی۔ وہاں کُل لوگوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ سپاہیوں نے بندوقیں رکھدیں اور نہر میں اُتر پڑے۔ رسالے کا کمانڈار نہر کے کنارے گالوں پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے وہی جلال ظاہر تھا جو اُس بلند حیثیت کے شایانِ شان تھا۔ کمانڈار نے تھوڑی دیر کے بعد چند دوسرے افسروں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ کمانڈار ایک فوجی گاڑی کے سائے میں دراز ہو گیا۔ بہادر لفٹنٹ، روزنکرانز اور چند دوسرے نوجوان افسروں نے اپنا لبادہ زمین پر پھیلا دیا اور اس پر بیٹھ رہے۔ اور تھکن مٹانے کے لئے شراب کا دور چلا۔ بہت سی بوتلیں جمع ہو گئیں اور دور چلنے لگا۔ اُن میں چند ایک نے گنگنانا شروع کیا اور بعضوں نے سیٹی بجانا شروع کیا۔ اسکے بعد جوا شروع ہوا۔

ان افسروں میں وہ نوجوان علم بردار بھی تھا جو تیزی کے ساتھ صبح کے وقت ہم لوگوں سے آگے نکل گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ خوشی سے اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جھوم جھوم کر ہر شخص کے ساتھ اپنی محبت ظاہر کر رہا تھا، اور یکے بعد دیگرے ہر ایک کو چوم رہا تھا۔ غریب لڑکا! اُس کو کیا معلوم کہ جس خلوص اور محبت کا اظہار دوسروں کے ساتھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب ایسی گرمجوشی کے ساتھ ہر ایک سے ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے لیکن اس کو ایسی باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی کب تھا۔ وہ برابر اپنے خلوص اور محبت کا اظہار لوگوں سے کرتا رہا اور آخر تھک کر اپنے لبادے پر دراز ہو گیا کہنی کے سہارے ہاتھ پر سر رکھ کر تماشہ دیکھتا رہا۔ اُسکے سیاہ اور لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ پسینہ سے تر تھا۔ اس وقت نوجوان علم بردار بہت زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔

ہر شخص خوش تھا لیکن ایک شخص پر خوشی اور مسرت کا کوئی اثر نہ تھا۔ کیونکہ اُس کا گھوڑا کھو چکا تھا اور وہ دوسرے افسر کا گھوڑا اس شرط پر لے کر

آیا تھا کہ قلعے میں آکر واپس کردے گا۔ اس کا اثر اس پر بہت زیادہ تھا اور وہ بے حد متفکر معلوم ہو رہا تھا لیکن بار بار دوسرے افسروں کو للکارتا جاتا تھا اور اصرار کر کے اس تماشے کو بچھا اور دیر تک جاری رکھنے کے لئے کہتا رہتا تھا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی پیش کر دی تھی کہ جو شخص سب پر بازی لے جائیگا اُس کی خدمت میں وہ ایک کاسکٹ صرف پندرہ روبل میں پیش کرے گا۔ یہ کاسکٹ اس نے ایک یہودی سے تیس روبل میں خریدا تھا اور ہر شخص کو اسکی قیمت معلوم تھی، لیکن اپنی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے وہ اسے علیحدہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے مخالف نے اُس کو حیرت سے دیکھا اور خاموش ہو رہا۔ نہ جانے دیر تک کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر یکایک چونک کر شراب کا اس نے ایک جام چڑھایا اور کھیل میں مشغول ہو گیا۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ قلعہ سے چلتے وقت میں نے اس جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن کچھ دور آنے کے بعد نہایت ہی مایوس کن خیالات میرے دماغ میں گھومنے لگے۔ اور چونکہ ہر شخص اپنی طرح دوسروں کو بھی سمجھتا ہے۔ میں نے دوسرے سپاہیوں اور افسروں کی گفتگو میں حصہ لینا شروع کیا اور ساتھ ہی برابر اُن کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ کرتا رہا۔ لیکن کسی کے چہرے پر کسی قسم کے خوف وہراس کا کوئی اثر نہ تھا، نہ کبھی ایک لفظ کسی کی زبان سے ایسا سنا جس سے خوف کا اظہار ہوتا ہو۔ تفنن، قہقہے، قصہ خوانی، جوا اور شراب خواری کے سوا اُنہیں کچھ یاد ہی نہ تھا۔ خطرات سے سب کے سب اس طرح بے پرواہ تھے جیسے اُن میں سے ایک شخص بھی اس سے واقف ہی نہ تھا۔ اور ہر ایک اس طرح مطمئن تھا جیسے سب کے سب اپنی زندگی کے تمام مرحلے طے کر چکے ہیں اور اب اس دنیا میں اُنہیں کچھ کرنا باقی نہیں ہے۔ یہ کیا تھا ——! استقلال، خطرات کا مقابلہ کرنے کی جرأت، یا بے پروائی، اور زندگی کی طرف سے بے نیازی —— یا پھر یہ تمام باتیں ایک جگہ جمع ہو کر ہر ایک کو بلند حوصلہ بنا رہی تھیں۔

اسی شام کو ۷ بجے کے قریب ہم لوگ مضبوط قلعہ "م" میں پہنچ گئے، لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہر ایک شخص تھک کر چور تھا، اور ہر ایک کے جسم پر گرد وغبار کی تہ جمی ہوئی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اپنی گلابی اور آڑی ترچھی کرنوں کو اس منظر پر، باغ پر جو قلعہ کے چاروں طرف تھے، اُن غلوں پر جیسے کھیتوں پر اور اُن سفید بادلوں پر پھیلا رہا تھا، جو پہاڑ کی برفانی چوٹیوں کو گھیرے ہوئے تھے جیسے وہ اُن کی نقل اُتارنے کو گھیرے ہوئے تھے اور ایک قطار قائم کر دی تھی جو اُن سے کم خوبصورت اور دلکش نہ تھے۔ افق پر ننھا سا چاند نکلا۔ تاتاری گاؤں میں ایک تاتاری مسلمان اذان دے رہا تھا اور ہمارے گانے والوں نے تازہ دم ہو کر گانا شروع کر دیا۔ (باقی)

سہیل عظیم آبادی

مختصر افسانہ اور اسکے عناصر

(بیگم ح - ش - رفعت بی - اے - دہلوی)

نام تو اس کا مختصر افسانہ ہے - مگر صحیح یہ ہے - کہ لفظ افسانہ سے ان چھوٹی کہانیوں کو تعبیر کرنا - غلط فہمی پیدا کرتا ہے - مختصر افسانہ الف لیلیٰ کے قصے یا چہار درویش یا فسانۂ آزاد کی طرح کسی کی عمر بھر کی یا دو چار سال کی بلکہ دو چار مہینوں کی بھی تاریخ زندگی پر مشتمل نہیں ہوتا - وہ تو زندگی کے کسی ایک پہلو پر اچٹتی ہوئی مگر ہنگامہ خیز نظر ہوتی ہے - اس میں نفسیات کا پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے - کوئی ہنگامی بات، کوئی غیر معمولی لمحہ - کوئی جنت آفریں یا جہنم خیز جذبہ گویا کوئی ایسی بات جو پڑھنے والے کے دل میں ایک کیفیت پیدا کر دے جو اس کو اس دُنیا کے ایسے مناظر سے آشنا کرے کہ اس کے ماحول سے تو وہ شناسا ہو - مگر نکہت، خوشبو میں زیادہ تیز اور رونق اپنی بہاریں زیادہ شباب پر ہو - گویا وہ اس لمحہ کو زندگی کی ایک ساعت سمجھے جو کبھی فراموش نہ ہو اور ایک مستقل اور پائیدار اثر پیدا کرے -

مختصر افسانہ میں پلاٹ تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کو پلاٹ کہنے میں پھر وہی دقت پیش آتی ہے - جب ہم اس کا مقابلہ کسی ڈرامہ یا قصے کے پلاٹ کے ساتھ کرتے ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہئے جب ہم دونوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو دونوں پر ایک ہی لفظ پلاٹ کا وارد کرنا ناجائز معلوم ہوتا ہے - ڈرامہ میں کئی سالوں کے قصے کو تین یا چار ایکٹ میں پیش کیا جاتا ہے - اس کی زمین وسیع اس کا حلقہ بسیط - اسکے برخلاف مختصر افسانہ تھوڑے سے "وقت" کے متعلق ہوتا ہے - گویا اس کی ساری کارروائی عملی طور پر زندگی کے تھوڑے وقت میں ختم ہو جاتی ہے - باقی رہا ادیب کا زورِ قلم وہ ــــ چاہے تو ایک کبھی دل سے محو نہ ہونے والا نقش تیار کر لے - دریا کو کوزے میں بند کر دے اور ایک ہنگامی وقوعہ کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنائے کہ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہے -

ناول اور مختصر افسانہ کا تفاوت مقصد اور طریقِ کار کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے - یہ صحیح ہے کہ دونوں کا زندگی سے گہرا تعلق ہے - ناول میں "زندگی"، ایک مکمل چیز کے نظریہ سے پیش کی جاتی ہے جس کے مختلف منظر، واقعات، ایک ہی متحرک تصویر کے مختلف ٹکڑوں یا حصوں کی مانند ہیں جن میں عمداً ایک باہمی ربط و اتحاد قائم رکھا جاتا ہے - اور جو ایک ہی مضمون کے مرکزی خیال کی طرف مائل نظر آتے ہیں -

کردار

جذبات، حرکت یا کردار کے عمل تفصیل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں - واقعات جو یکے بعد دیگرے قصے میں بیان کئے جاتے ہیں - زندگی کا ایک مخصوص کیفیت پیش کرتے ہیں - ہم زندگی کے دشوار گزار راستوں میں داخل ہوتے ہیں - ایک سین کے بعد دوسرا سین دیکھتے ہیں - اور خوب سمجھتے ہیں کہ خاتمہ سے پہلے ہم ان سب کڑیوں کو ایک مکمل زنجیر کی صورت میں منسلک پائینگے - ایک دوسرے سے تعلق واضح ہو جائے گا اور یہ تمام قصہ ہماری سمجھ میں آجائے گا اور یہ چھوٹی چھوٹی پھولوں کی کیاریاں آپس میں ربط و نظم قائم کرنے کے بعد ایک وسیع اور منظم باغ بن جائینگی - کہانی کا جو کچھ بھی مدعا ہو وہ مختلف امر ہے لیکن ناول کے مختلف حصوں کے ربط سے ہم اس کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں -

زندگی کو سطحی طور پر مطالعہ کرنے سے بھی ہم پر یہ امر اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ معدودے چند کے سوا بہت ہی کم افراد کی زندگیاں ایسی ہیں جو ہمارے لئے توجہ کا مرکز بن سکیں ۔ یا جو بادی النظر میں ہماری دلچسپی کو اپنی طرف مائل کر سکیں ۔ یعنی ہم ان کے قصّے کو پڑھنا یا سننا چاہیں ۔ مگر آئیے ذرا حقیقی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ بعض حقیر ترین ہستیاں بھی ہمارے سامنے ایسے مناظر پیش کرتی ہیں ۔ جو بہترین انسانی جذبات کو ہیجان میں لاسکیں ۔ اور یہی عنصر قصّہ یا کہانی کی جان ہے ۔ مثلاً ایک غریب مفلوک الحال شخص کو لیجئے جو ایک عظیم الشان شہر میں رہ کر عالیشان محلوں کے سایہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔ کیا اس کی زندگی میں کبھی چند ایسے لمحے نہیں آئے ۔ جن کی محض یاد بھی اس کے لئے فردوسی کیف، حقیقی مسرّت، اور روحانی سرور رکھتی ہو ۔ اب ایک عالی مرتبہ عیش پسند شخص کو لیجئے ۔ دولت کی فراوانی ہے ۔ اقبال کا چتر سر پر ہے ۔ کامیابی قدم چومتی ہے ۔ دُنیا سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہے مگر کیا اس کی زندگی کا کوئی واقعہ صحیح طور پر اس کے لئے ایک مہیب خواب، جہنّم کا عذاب ــ ایک بلائے بے درماں تھا جس کا محض تصوّر ہی اسکے عیش کو مکدّر اور اس کی جبینِ خنداں کو پُرشکن کر دے ۔ ایسا ہی کوئی ایک حسین لمحہ، ہوشربا واقعہ، ہنگامہ خیز جذبہ ایک مختصر افسانہ کا لُبِّ لباب بن کر زینتِ قرطاس ہو جاتا ہے ۔

مختصر افسانہ، ڈرامہ کے مقابلہ میں اپنی جدّت وبلند پروازی میں کم مگر ٹیکنیک میں زیادہ آزاد ہوتا ہے ۔ وہ ہماری توجہ ایک لمحہ کیلئے کاملاً جذب کر لیتا ہے ۔ مگر وہ ہوتا ہے ایک ہی لمحہ ۔ ناول میں کئی باب ہوتے ہیں ۔ جن میں ایک فرد کی مختلف ذہنی کیفیتیں دکھائی جاتی ہیں ۔ ڈرامہ بھی اسی طرح سے مختلف تاثرات پیدا کرتا ہے اور مختلف کیفیتیں یکجا کر دی جاتی ہیں ۔ مگر مختصر افسانہ میں ہم کسی واقعہ پر اجمالی مگر گہری نظر ڈال لیتے ہیں ۔ یا کسی کردار سے ایسا تعارف حاصل کرتے ہیں کہ اسکی خصوصیت یا اچھوتا پن ہمارے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے ایک گہرا نشان چھوڑ جائے کبھی محو نہ ہونے والی یاد ۔

ناول بسیط میدان پر حاوی ہے ۔ اور اس لئے اس میں بعض کمزور مقام بھی آجائیں تو کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ وہ پُرزور مقامات کو زیادہ نمایاں کرنے میں امداد دیتے ہیں ۔ مختصر افسانہ میں یہ بھی کوشش نہیں کرنی چاہئے کہ کسی کردار کی پوری زندگی کو اس چھوٹے سے وقفہ میں پیش کر دیا جائے بلکہ یہ اسکی ٹیکنیک کے خلاف ہے اور ایسا کرنے سے یہ تحریر مختصر افسانہ کہلانے کی مستحق نہ رہے گی ۔ اس لئے کہ اس میں زندگی کا صرف ایک رُخ ۔ ایک پہلو، کسی شخص کی کوئی خاص خصوصیت، کسی واقعہ کی اہمیت، یا انسانی فطرت کی کوئی خوبی یا بُرائی بہت ہی نمایاں طور پر دکھائی جاتی ہے ۔ وہ ہمارے سامنے زندگی کو ناول سے زیادہ پُرزور زیادہ شاندار صورت میں ظاہر کرتا ہے ۔

لفظ مختصر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی مختصر سی کہانی لکھ دی جائے ۔ تو مختصر افسانہ کہلانے کی مستحق ہو گی ۔ مختصر افسانہ میں اور بھی بہت سی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ۔ مثلاً مختصر افسانہ میں زندگی کا صرف ایک ہی موضوع پیشِ نظر رکھا جاتا ہے ۔ اور اس کو دکھانے یا ظاہر کرنے کے لئے پیچ در پیچ طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا ۔ نہ اس میں الفاظ کی بھرمار ہی ہوتی ہے اور نہ اس میں کسی ایک واقعہ کو زیادہ نمایاں بنانے، یا اہمیت دینے یا پھر کسی کردار کی کوئی خاص خصوصیت ظاہر کرنے کیلئے کسی طرح کا گریز یا کسی طرح کی آورد ہوتی ہے ۔

ناول اپنی تفصیل وطوالت کے لحاظ سے ہم کو زندگی کا ایک خوبصورت اور مکمل خاکہ پیش کرتا ہے ۔ مگر مختصر کہانی ہم کو زندگی کی محض ایک دلربا جھلک دکھاتی ہے ۔ ہمارا خوابیدہ اشتیاق اس کے بارے میں اور زیادہ جاننے کے لئے بڑھ جاتا ہے ۔ ایک اچھے مختصر افسانہ کا ماہر مصنّف اس کو اس طرح نفاست و حسن سے بیان کرتا ہے اس میں کوئی ایسا دلچسپ واقعہ دکھاتا، ایک ایسی نمایاں شخصیت پیدا کرتا یا پھر ایسا ماحول مہیّا کرتا ہے کہ ہمارا تخیّل ان مختصر صفحات میں جو کچھ دیکھتا ہے اس سے بہت زیادہ سمجھتا ہے ۔ مگر یہ تمام ذہنی اثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مصنّف اپنے فن میں پوری مہارت رکھتا ہو ۔ اور اس کو زبان پر اس قدر عبور حاصل ہو کہ بالکل موزوں اور صحیح لفظ استعمال کرے ۔ واقعہ بھی اہم، دلچسپ اور اپنی ہر تفصیل میں روشن انتخاب کیا جائے ۔ کیونکہ اس میں اتنی جگہ ہی نہیں ہوتی کہ فضول الفاظ یا متعلق رکھنے والے واقعات کو دکھایا جائے اگرچہ اس سے قصّہ کی رنگینی میں اضافہ ہو جائے ۔ یا ادبی معیار سے زبان بہتر ہو جائے ۔ یہاں تک کہ کردار کے عادات و خصائل بھی صرف گفتگو کے ذریعہ ہی

ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ میں کردار کی تعریف، ہر فعل کی حرکت یہاں تک کہ صرف ایک لفظ بھی اپنی نوعیت لطافت اور ساخت کے لحاظ سے وہ نفیس کیفیت پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ جس کو ادبی دُنیا "ماحول" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ الغرض مختصر افسانہ کی ساخت میں پلاٹ، واقعہ، کردار، ماحول، الفاظ تمام موزوں ہونے چاہئیں اور ان سب کے درمیان ایسی ہم آہنگی، ربط و اتحاد ہونا چاہیئے۔ کہ یہ تمام باتیں مل کر ایک مکمل تصویر بن جائیں۔ اجزا منتشر نہ ہوں۔ بلکہ ایک ٹکڑا دوسرے پر دلالت کرے۔ اور سب باہم مل کر پڑھنے والے کے دل پر ایک گہرا نقش قائم کریں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک عنصر مصنّف کی طبیعت کی جدت کے مطابق باقی عناصر پر حاوی ہو جائے۔ مثلاً کردار کی شخصیت کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ افسانہ کی باقی تمام دلچسپی پر حاوی ہو جائے۔ اور ہم اسی کے نکتۂ نظر سے ہر شے کو نمایاں یا حقیر محسوس کریں کسی میں ماحول اس قدر رنگین اور شاعرانہ پیدا کیا جائے کہ باقی ہر بات اسکے اندر جذب ہو کر اپنی اہمیت کھو دے۔ اور ماحول کی ندرت ہی ہر شے پر چھا جائے۔ کبھی کوئی واقعہ ہی اس قدر اچھوتا اور عجیب دکھایا جائے کہ اس کو ہر طرح پر کامیاب و نادر بنانے کے لئے کردار و ماحول کو اسی کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ اور پھر وہی ہماری تمام تر توجہ کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اور یہی امر مختصر افسانہ کا جوہر، اس کی جان اور اس کی سب سے اہم خصوصیّت ہے۔

مختصر افسانہ میں ناول کی طرح ایسے واقعات زندگی سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ جو حقیقت کے قریب ہوں۔ مگر ان میں ندرت موجود ہو۔ مبالغہ اور رنگ آمیزی کو دخل نہ ہو۔ مگر جاذب توجہ ہوں۔ اگر افسانہ حقیقت و سچائی سے دور ہے تو پھر اس کی اور تمام خوبیاں ہیچ ہیں۔ وہ واقعات یا کیفیتیں یا نفسیاتی محویتیں جو حقیقت سے بعید اور ذہن انسانی کے خلاف ہیں۔ ان کو افسانہ میں کبھی داخل نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے تمام شکل بگڑ جاتی ہے۔ اور سارا اثر ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر سبز پری کی کہانی، لال دیو کا قصّہ الہ دین کا چراغ، طوطا مینا کی کہانی لکھنا منظور ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ اسکے عناصر مختلف، اس کو کامیابی کے ساتھ نباہنے کا طریقہ مختلف۔ یہاں تو بحث مختصر افسانہ سے ہو رہی ہے۔

افسانہ کی ایک خاص خصوصیّت یہ بھی ہے کہ اس میں حقیقت و افسانویت میں ایک گہرا رنگین ربط پیدا کیا جائے۔ اور کردار اپنی تمام مخصوص عادات و خصائل کسی خاص عیب و ہنر کے باوجود یکتا نہیں۔ بلکہ ہمارا ایسا ایک خاکی انسان ہوتا ہے۔ اس کی فطرت بھی کم و بیش انہیں اجزاء کا مرکب ہوتی ہے۔ جو ہمارے خمیر میں داخل ہیں۔ افسانہ لکھنے میں بھی تخیل کی رنگینی و بلند پروازی، بیان کی ندرت و ظرافت کو اسی قدر دخل ہے۔ جتنا کہ طول و طویل ناول میں بلکہ اس سے زیادہ۔ کیونکہ یہاں ایک چھوٹے سے وقفہ میں ایک گہرا نقش پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سادگی و صفائی، اور اصل مفہوم کو بغیر کسی پس و پیش یا شاعرانہ گریز کے ادا کرنے میں بھی وہ عظمت و شان پائی جاتی ہے۔ جو بذاتِ خود افسانہ کی روح رواں بن جاتی ہے۔ اور ادائے بیان کی جس بے ساختگی کو پڑھ کر ہم گھنٹوں جھومتے رہیں۔

ادائے بیان پر ایک کہنہ مشق ادیب کی طرح حاوی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم زبان کے تمام ہم معنی یا مرادف الفاظ سے واقفیت رکھتے ہوں ان کے استعمال سے جو مختلف رنگ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے آشنا ہوں۔ محاورات اور بندشوں کے پیچیدہ معانی اور ان کے اختلاف ہمارے ذہن میں موجود ہوں۔ اور ہم ان کا استعمال حسب ضرورت، موقعہ بموقعہ کرتے چلے جائیں۔ بعض اوقات آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ایک گھٹیا افسانہ نویس محض اپنی زبان کے زور پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارا افسانہ لکھ جاتا ہے۔ پڑھتے وقت آپکا یہ جی تو چاہتا ہے کہ تمام کو پڑھ جائیں۔ وہ زبان کی خوبی ہوتی ہے۔ مگر ختم کرنیکے بعد آپ یہ ضرور کہتے ہیں کہ یہ مختصر افسانہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اگر اس میں زبان بھی نہ ہوتی تو آپ دو چار سطریں پڑھ کر چھوڑ دیتے۔

مختصر افسانہ کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور اس کو کامیاب سے کامیاب ترین بنانے کی بہت گنجائش ہے مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ لوگ افسانہ نویسی کو بہت آسان سمجھنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر پانچ افراد میں سے ایک کو آپ افسانہ نویس پائینگے۔ اگر کوئی پوچھے تو خیر سے مختصر افسانہ کے عناصر، خصوصیات لوازمات کسی کا بھی علم ان افسانہ نویسوں کو نہیں ہوتا۔

خونِ تمنّا

(محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ)

حسنے سے میرا ملنا پہلی مرتبہ ایک میلاد کی محفل میں ہوا گو وہ مجھ سے کافی فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تاہم میں نے ایک سرسری نظر میں اُس کے خوبصورت چہرے کو پڑھ لیا۔ مجھے اُس کی بلند پیشانی پر وہ خاص نقوش نظر آئے جو ہر کس و ناکس میں نہیں پائے جاتے۔ بہت کم ہستیاں ایسی ہیں جن کی جانب میرا دل خود بخود کھنچتا ہے۔ اور وہ ہستیاں جن کی جانب میرا دل کھنچے کوئی خاص افسانوی حقیقت رکھتی ہیں۔ ایسے ہی حُسن آرا پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھ کو ارتباط بڑھانے کا خیال ہوا۔ اور اپنی ایک عزیزہ سے جن کا نام زہرہ تھا اور جو حسنے کی بھی رشتے دار تھیں تعارف کرانے کیلئے کہا۔ زہرہ نے مجھ کو حُسن آرا سے ملوا دیا۔ اُس نے جب مجھے دیکھنے کے لئے اپنی مخمور آنکھیں اُٹھائیں تو مجھ کو اس کی حسین آنکھوں میں ایک دُنیائے جذبات پوشیدہ نظر آئی۔

میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ کسی نئے آدمی کا اور خصوصًا جس سے ارتباط بڑھانا منظور ہو۔ جبتک مطالعہ نکرلوں خلا ملا نہیں کرتی۔ حسنے کو بھی میں نے ناقدانہ نظر سے جانچنا شروع کیا۔ مگر اُس کو حُسنِ ظاہری کے علاوہ حُسنِ باطنی سے بھی مالا مال پایا۔ اس کی شرمیلی باتیں۔ حیا آفریں تبسّم اس کا شاہد تھا کہ اس کی سیرۃ بہت بلند ہے۔ صورت خدا نے ایسی پیاری عطا کی تھی کہ ایسی صورتیں صرف شعراء اور مصوّروں کے خیال ہی میں پائی جاتی ہیں اور دُنیا میں کم نظر آتی ہیں۔ بادامی نرگسی آنکھیں جن سے بجائے شوخی کے حیا ٹپکتی تھی۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ ننھا سا دہانہ۔ لبِ لعلیں گلابی پنکھڑیوں کی طرح تر و تازہ اور شاداب۔ صراحی دار گردن۔ سیاہ لانبے بال۔ جو اکثر پیچ سے اس کے رُخِ گلگوں پر ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ نازک اندام سرو قد۔ آواز اس قدر ترنّم پذیر تھی کہ جس وقت بات کرتی فضا پر موسیقی کی کیفیت چھا جاتی۔

حسنے ایک شاداب پھول تھی اور عورت پن کا مکمل نمونہ۔ جس کو قدرت نے اپنی فرصت کے خاص وقت میں بنایا تھا۔ گو عمر ابھی صرف سولہ سال کی تھی مگر انتہا کی متین۔ غضب کی سنجیدہ۔ غرضکہ ایک دفعہ کے ملنے میں مجھے اس نے موہ لیا۔ اس کے بعد میں اور وہ گاہے ماہے ملتے رہے۔ مجھ سے اس نے بہت عرصہ تک مغائرت برتی اور تکلف کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ تاہم اس کی باتوں میں مجھے درد کی بو آئی۔ اس کے نغمے سوز میں ڈوبے ہوئے پائے جو زخم خوردگانِ محبت کا حصّہ ہیں۔ اور میں نے جان لیا کہ یہ نازنین بھی حضرتِ کیوپڈ کے تیرِ جانگداز کا نشانہ ہو چکی ہے۔

آخر کچھ عرصہ بعد زہرہ سے باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ حسنے لڑکپن میں اپنے چچازاد بھائی محمد منیر سے جو قابل اور خوبصورت نوجوان ہیں منسوب ہو چکی تھی۔ مگر حسنی کی ماں اور چچی کی آپس کی خانگی رنجشوں نے جو ہندوستانی جاہل عورتوں کا خاصّہ ہے یہ رشتہ قائم نہ رہنے دیا اور ان دونوں دلدادگانِ محبت پر اس خبر نے بہت بُرا اثر کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہوش سنبھالنے سے بیشتر اپنا سمجھتے تھے۔ اب اسی تغیّر نے دونوں کو جان سے بیزار کر دیا اور اندرونی کاوشوں سے دونوں کی صحت تباہ ہوگئی۔ حسنے کمسن تھی۔ الھڑ تھی۔ اس چوٹ نے اس پر زیادہ اثر کیا بیچاری لڑکی ایک مدّت تک

صاحب فراش رہی۔ حسنیٰ کے اچھے ہونے کے بعد منیر کی باری تھی۔ یہ غریب دونوں ہاتھوں سے دل سنبھالے تھا کہ میرے رنج کا حُسنیٰ پر زیادہ اثر نہ ہو ساتھ ہی اس ناامیدی میں تھوڑی سی امید بھی جھلکتی تھی کہ چچی اور ماں کو ہم دونوں کی سوگوارانہ حالت پر رحم آئے۔ مگر تو بہ صاحب۔ ہندوستان کی جاہل ماؤں کا درجہ قصائی سے کیا کم ہے۔ نوجوان دلوں پر آفت توڑنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ حسنیٰ کی ماں اپنے طنطنے میں تھیں۔ منیر کی ماں اپنے غرور میں۔ رشتے کے قائم ہونے کی صورت کیا ہوسکتی تھی۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ حسنیٰ کے رشتہ کی خالہ کہیں دور دیہات میں بیاہی ہوئی تھیں وہ بہت عرصہ بعد دلی آئیں تو بہن سے بھی ملنے آئیں۔ حسنیٰ کی پیاری اور بھولی صورت پر ریجھ کر۔ فوراً اپنے اکلوتے لڑکے کے لئے پیام دے دیا حسنیٰ کی ماں کو بھلا [illegible] ہوسکتا تھا۔ بہن کا بیٹا۔ اور اکلوتا۔ جھٹ پٹ راضی ہوگئیں۔ بڑی دھوم کے ساتھ منگنی کا شگون بھی کردیا۔

اس منگنی نے ہی [illegible] کا خاتمہ کردیا۔ اور اب غم کی برداشت نہ لاکر منیر ایسے پڑے کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ کمسن حسنیٰ پر ایک اس منگنی کا صدمہ [illegible] منیر کی بیماری کا۔ حواس باختہ ہوگئے۔ غنیمت تھا کہ پردے کی مصیبت دونوں کے درمیان میں حائل نہ تھی۔ اور حسنیٰ کو تیمارداری کا موقعہ مل گیا تھا۔ سارے سارے دن کھیل کا دانہ اسکے مُنہ میں اُڑکر نہ جاتا۔ رات رات بھر دُعائیں مانگ کر گزار دیتی۔ آخر حسنیٰ کی معصوم دعائیں بار آور ہوئیں۔ اُنیسویں روز منیر کا بخار ٹوٹا اور وہ رفتہ رفتہ سنبھلنے لگا۔ ایک روز شدّت کی کھانسی کی وجہ سے منیر کے سینے میں کسک تھی۔ حسنیٰ قریب بیٹھی ہوئی سینک رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت اور کوئی کمرے میں نہ تھا۔ یہ دونوں تنہا تھے۔ مگر حسنیٰ کو نظر اونچی کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اور وہ نیچی نظر کئے اپنے کام میں مشغول تھی۔ منیر کی طویل آہ سے گھبرا کر حسنیٰ نے اس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ منیر کا رنگ بیماری اور روحانی تکالیف سے زردی مائل ہورہا ہوگیا تھا۔ آنکھیں کثرتِ گریہ سے بے نور۔ اور جسم ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ چہرے پر جس کے نقش و نگار کبھی آنکھوں میں کھُبتے تھے۔ ایک بے کیف مردنی چھائی تھی۔ حسنیٰ سے زیادہ نہ دیکھا گیا اور اس کی چشم میگوں سے۔ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔

منیر جو حسنیٰ کی پریشان اور بھولی صورت کو بغور ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ مضطرب ہوگیا اور پوچھا۔ خیر ہے حسنیٰ۔ کیوں روتی ہو؟ حسنیٰ نے سُبکی لے کر کہا "آہ بھائی جان۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر دل بھر آیا۔ خدا کے لئے آپ اپنے کو سنبھالئے"

منیر نے آہ سرد بھر کر جواب دیا "حسنیٰ۔ میں نے اپنے کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر یہ بات اختیار سے باہر ہے۔ دل سے مجبور ہوں کاش میں پیدا نہ ہوتا۔ یا ہوتے ہی مرجاتا"

حسنیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا "خدا نہ کرے۔ آپ ایسے کلمے زبان پر کیوں لاتے ہیں۔ اللہ آپ کی صد وسی سال کی عمر کرے میرے دُکھے ہوئے دل کو آپ زیادہ نہ دُکھائیں۔

منیر نے کھانس کر گلا صاف کیا اور جواب دیا "کاش بھولی حسنیٰ۔ تم کو یہ علم ہوتا کہ اک چنگاری کس طرح میرے رگ و پے کو پھونک رہی ہے کاش والدہ اور چچی مجھ کو تمہارے ساتھ منسوب کرنے کا خیال نہ کرتیں تو مجھ کو صبر ہوتا۔ میں دل کو سنبھال لیتا۔ دونوں نے اپنی جہالت سے میری آرزوؤں کا خون کردیا۔ اور آہ حسنیٰ تم پر کتنا بڑا ظلم کیا۔ گو تم مُنہ سے اس کا اظہار نہ کرو۔ مگر دلی حالت کا تمہاری مجھ کو خوب علم ہے۔ جس سے تم اب وابستہ کی جاؤ گی۔ انسان ——— ہوتا تو میں یہ خیال کرکے خوش ہوتا کہ میں برباد ہوا تو بلا سے۔ مگر حسنیٰ کو ایسا شوہر ملا ہے کہ وہ مجھ کو بھول جائیگی۔ مگر افسوس چچی جان نے میرے ساتھ اپنی لڑکی کی زندگی بھی تباہ کردی" منیر برابر جوش میں کہہ رہا تھا اور حسنیٰ سر جُھکائے سُن رہی تھی۔ آخر منیر نے قدرے سکوت کے بعد آنسو بہاتے ہوئے کہا "بہن حسنیٰ معاف کرو۔ اور یہ ایک مجذوب کی بڑ سمجھو۔ تم اب دوسرے کی امانت ہو۔ بہتر ہے حسنیٰ مجھ سے دور رہو۔ میں تم کو بھولنا چاہتا ہوں۔ خواہ اس کوشش میں اپنے کو ہی بھول جاؤں" اب حسنیٰ میں زیادہ ضبط کی تاب نہ تھی۔ سر جُھکائے اُٹھی اور رقدم برداشتہ کمرے سے نکل گئی۔

اپنے کمرے میں جاکر وہ خوب روئی۔ اور آتشِ غم کو جو دل و جگر میں بھڑک رہی تھی خدا جانے کب تک آنسوؤں کے چھینٹوں سے سرد کرتی رہی

یکایک پاؤں کی آہٹ سے چونک کر اس نے دروازہ کی جانب دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے چھوٹے بھائی نسیم نے کہا "آپا تم کو خبر بھی ہے بھائی منیر نصف گھنٹہ سے بیہوش ہیں"۔ حسنیٰ پریشان ہو کر بغیر جواب دئے بیمار کے کمرے میں چلی گئی۔ چاروں جانب عورتوں کا ہجوم تھا۔ کوئی کہتی تھی ضعف سے غش آگیا ہے۔ کسی نے کہا، نہیں بی۔ دوا تیز تھی، موئے ڈاکٹر نے نشہ ملا دیا۔ منیر کی والدہ کھڑی ہوئی پیٹ رہی تھیں کہ ارے لوگو مانی بندی کو یہ کیا ہو گیا۔ ابھی تو اچھا خاصا تھا۔ ہے ہے میری اکیس برس کی کمائی۔ ارے میرے لعل آنکھ تو کھول۔ چاؤں چاؤں سے حشر مچا رکھا تھا۔ مگر ہوش میں لانے کی ترکیب کوئی نہ کرتا تھا۔ حسنیٰ کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ وہ سمجھ گئی کہ انتہائی رنج کی وجہ سے غش آگیا۔ وہ تین منٹ وہ ساکت رہی۔ مگر پھر سب کو ہٹا کر منیر پر جھکی منیر کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ صرف سانس کی ضعیف آمد و شد اس کی زندگی کا پتہ دیتی تھی۔ ورنہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتا تھا۔ حسنیٰ نے سرد پانی کے چھینٹے زور سے منیر کے مُنہ پر دئے۔ پھر لخلخہ سنگھاتے ہوئے مسلسل بھائی جان۔ بھائی جان کی صدا لگائی۔ غریب منیر پر تکان اور رنج سے غش کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ دماغ کو فرحت پہنچتے ہی آنکھ کھول دی۔ گرد و پیش مجمع دیکھ کر مُسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ مگر یونہی سا تبسم کر کے رہ گیا۔ ماں نے آگے بڑھ کر چٹاچٹ بلائیں لیں۔ صدقہ اُتر وایا۔ اور سب کی جان میں جان آئی۔ جتنا منیر سنبھلتا گیا حسنیٰ کنارہ کشی کرتی گئی تاکہ دُنیا کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے اور اتنا ملنا بھی جاتا رہے۔

قاعدہ ہے کہ ہجراں نصیبوں کی عمر معشوقوں کی درازیٔ زلف کا جواب ہوتی ہے۔" اسی طرح میاں منیر بھی دو تین ماہ بعد تندرست ہو گئے مگر ساری چونچالی اور شگفتگی رخصت ہو گئی۔

وہ منیر جو کبھی تمام تمام دن سقف شگاف قہقہے لگاتا رہتا۔ ہمہ وقت افسردہ نظر آتا۔ اس کی اس مردہ دلی سے احباب متحیر۔ اعزا پریشان۔ مگر بھید نہ کھلنا تھا۔ اور کھلتا تو کیسے۔ لبوں پر مہر خاموشی لگی ہوئی تھی۔ منیر کا رنگ گورا تو نہ تھا مگر گندمی رنگ بھی ایسا تھا کہ گورے رنگ پر سبقت تھی شباب کی سُرخی جھلکتی تھی۔ نقش و نگار نہایت موزوں اور وجیہہ نوجوان تھا۔ مگر ان واقعات کے بعد نہ وہ سڈول جسم رہا نہ شاداب چہرہ۔ اس کی حالت اس کھلائے ہوئے پھول کی طرح تھی جس کو عین شگفتگی کے وقت بادسموم کے جھونکے پژمردہ کر دیں۔ نہ وہ والہانہ قہقہے رہے۔ نہ پُرجوش تقریریں کالج میں اس کا شمار ہونہار طلبا میں تھا۔ اس کی مدلّل و دلچسپ تقریریں۔ اس کا پاکیزہ مذاق۔ اس کی وجیہہ صورت نے حلقۂ طلباء میں امتیازی درجہ حاصل کیا تھا۔ مگر اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ایک جسم تھا بے جان۔ ایک ہستی تھی ہمہ تن یاس و حرماں۔

یہ سارے واقعات مجھ کو زہرہ سے جو حسنیٰ کی رشتہ دار اور ہم سن ہونے کے علاوہ اس کی رازدار سہیلی بھی تھیں وقتاً فوقتاً معلوم ہوتے رہے حسنیٰ نے کبھی مجھ کو اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ نہ میں نے ہی پوچھنا مناسب سمجھا۔ جب حسنیٰ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اس کی منگنی ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ مُنیر کی منگنی بھی ان کی ماں نے حسنیٰ کی منگنی کے تھوڑے دنوں بعد رشتہ داروں میں ایک لڑکی سے کر دی تھی۔ اور اس عجلت میں کہ حسنیٰ منسوب ہو گئی میرے لڑکے کی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ جس لڑکی سے منگنی کر رہی ہوں وہ منیر کے لائق بھی ہے کہ نہیں مُنیر نے منگنی وغیرہ میں بالکل دخل نہیں دیا۔ ایک بے جان مورت کی طرح ساکت رہا۔ انتہائی رنج نے اس کو بالکل بے حس کر دیا تھا

(۲)

برسات کی ایک پُرکیف شام کو میں اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ جن میں حسنیٰ بھی شامل تھی مختلف موضوع پر گفتگو کر رہی تھی۔ موسم بہت ہی دلفریب تھا۔ نسیم جانفزا کے جھونکوں نے ان پری وشوں کے گیسو چہروں پر برہم کر دئے تھے۔ مجھ پر ایک عالم سرور طاری تھا۔ اور اسی رنگ و بُو کے مرقع میں مست و مخمور بیٹھی تھی۔ میرے چند لمحوں کے سکوت پر میری شوخ و حسین سہیلی۔ شاہ بانو نے کہا۔ آخر آپ کس تخیّل میں کھوئی ہوئی ہیں میں نے متبسم لہجہ میں جواب دیا۔ میں سوچ تو کچھ بھی نہیں رہی۔ البتہ اس گلاب کو دیکھ رہی ہوں جو تمہارے ہاتھ میں ہے اور مُرخ گلگوں سے شرما رہا ہے شاہ بانو

شرما کر مسکرا دی۔ اور سب نازنینوں نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔
حسنیٰ نے کھلتی ہوئی کلی کی طرح مسکرا کر کہا۔ کہتی تو آپ سچ ہیں۔ بہن شاہ بانو کا حسن واقعی بے مثال ہے۔ وہ کوئی بڑا خوش نصیب ہوگا جس کی یہ رفیقۂ حیات بنیں گی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ اور وہ بھی خوش قسمت ہوگا جس کو ہماری حسنیٰ جیسی نازنین ملیگی۔ حسنیٰ کی نازک پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے بے چین ہو کر اس طرح پہلو بدلا۔ گویا میرے الفاظ نے اس کو سخت اذیت پہنچائی ہے۔ فوراً موضوع بدل کر اُس نے کہا۔ فرمائیے۔ آپ نے شہاب کی سرگزشت" دیکھی ہے؟
میں نے جواب دیا۔ ہاں مکرر۔ سہ کرر۔ خوب کتاب ہے۔ مولانا نیاز نے اک خاص فلسفۂ محبت سے بحث کی ہے۔ واقعی محبت اور شادی کا کوئی ساتھ نہیں۔ محبت جب تک بے لوث ہے محبت ہے۔ ذرا بھی اس میں غرض شامل ہوئی اور محبت ختم۔ شادی محبت کی موت ہے،

حسنیٰ نے ایک لمبا سانس کھینچا اور کہا۔ آپ بجا فرماتی ہیں۔
شریر ستارہ جبیں جو ابھی تک ہارمونیم کے سروں پر ہاتھ مار رہی تھی۔ شوخ لہجے میں بولی۔ بہن حسنیٰ آج ہم تمہارا گانا ضرور سُنیں گے حسنیٰ نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ستارہ بہن۔ آج معاف کرو۔ گلا خراش کر رہا ہے۔ ستارہ نے اپنی غمناک آنکھوں میں شرارت کو نمایاں کر کے کہا۔ بس بس معلوم ہے کہ تم خوش گلو ہو۔ یہ ناز اپنے شوہر صاحب کو دکھانا۔
ناز برآں کن کہ خریدار تُست
حسنیٰ پھر مضطرب ہوگئی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ستارہ تم ہی پہلے کچھ سُناؤ۔ پھر حسنیٰ بھی گائیں گی۔ ستارہ نے کچھ گنگناتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے خوش آئند لہجے میں ایک دردبھری نظم سُنائی۔ جس نے ہم سب کے دل پر بہت اثر کیا۔ اور حسنیٰ کے پیارے چہرے پر تو کچھ عجب حسرت برسنے لگی۔ ستارہ نے نظم ختم کر کے ہارمونیم حسنیٰ کی جانب سرکا دیا۔ اور اس نے محویت سے چونک کر تھوڑی دیر سُر ٹھیک کرنے کے بعد نہایت سوز بھری آواز میں غالب کی یہ غزل گانی شروع کر دی۔
نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
وہ گاتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ آواز میں لوچ اور کیفیت زیادہ ہوتی گئی ؎
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگائے نہ لگے۔ اور بُجھائے نہ بنے
اِس شعر پر پہنچکر تو اس کی آواز میں اس قدر گداز پیدا ہوگیا کہ اس کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گانا تھا یا جادو۔ سب مست و بیخود تھے اور وہ حسین ساحرہ اپنے نغمے کے زیر و بم سے سب کو مسحور کر رہی تھی۔ غزل ختم کر کے اِس نے دلربایانہ انداز سے انگڑائی لی اور مُسکراتے ہوئے ہم سب سے رخصت چاہی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک تھکان تھی۔ اور آنکھوں پر باوجود مسرت کے اظہار کرنے کے ایک یاس برس رہی تھی وہ چلی گئی۔ اور اس کے متعلق میں دیر تک سوچتی رہی۔

(۳)

کچھ ہمخیال ہستیوں کے مل جلنے سے مجھے نت نئے علمی مشاغل سوجھتے تھے۔ انھیں سب کے ضمن میں سوسائٹی کی تحریک بھی جسمیں شاہ بانو ستارہ اور زبیدہ نے میری بہت مدد کی۔ حسنیٰ بھی برابر شریک رہی۔ اور بہت تھوڑے دنوں میں کافی ممبر ہم لوگوں نے اس سوسائٹی کے لئے فراہم کر لئے جس کا جلسہ پہلے تو ہر ماہ ہوتا رہا۔ پھر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد چونکہ اکثر ممبر اسکولوں کی طالبات تھیں۔ ماہانہ جلسہ میں شرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ اِس لئے جلسہ ہر تیسرے ماہ ہونے لگا۔ اس سوسائٹی کا مقصد صرف غریب مردہ دل لڑکیوں میں جو میل جول نہ ہونے کے سبب پژمردہ ہو کر

15

رہ گئی ہیں شگفتگی پیدا کرنا تھا۔ اور ہر ممبر کا فرض تھا کہ اپنی خوش مذاقی سے تمام ممبران کو محظوظ کرے۔ ہر بات میں خوش مذاقی کا عنصر شامل رہتا۔ شاندار
مشاعرے ہوتے۔ دھواں دھار تقریریں۔ آہ کیا اچھا زمانہ تھا۔ مجھے اس زمانہ کی یاد ابتک نہیں بھولتی۔ شاہ بانو کا بلیغ لکچر۔ خورشید کی درد انگیز
ترنم ریزیاں۔ زبیدہ اور ستارہ کی دلکش نظمیں۔ انجمن آرا کا پاکیزہ مذاق۔ سلطانہ کا رپورٹ سُنانا۔ اور وہ حسنےؔ کے پُرسوز نغمے۔!!

آہ۔ ایک برقِ شعلہ پاش تھی جو چمک کر معدوم ہوگئی۔

حسنےؔ کو ان جلسوں کی شرکت نے بہت بے تکلف کر دیا تھا۔ اور کافی جھجک جاتی رہی تھی تاہم ذاتی واقعات پر میری اس کی کبھی گفتگو
نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ جبکہ ہماری سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور ساتھ ہی زبردست ایٹ ہوم بھی تھا۔

حسنےؔ نارنجی ساری پہنے ہوئے نسیم بہار کے ہلکے جھونکوں کی طرح سب سے پہلے آئی۔ میں نے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ حسنےؔ آج تو تم ہی
سب سے اوّل رہیں! مُسکرا کر کہنے لگی۔ جی ہاں مگر مجھ کو مغرب کے بعد واپس جانا ہے۔ میں نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ پھر تمہارا آنا بے فائدہ ہے۔
تم کو سوسائٹی کے قواعد معلوم ہیں؟ کارروائی جلسہ ہمیشہ مغرب کے بعد ہوا کرتی ہے۔ سر جھکا کر جواب دیا۔ کیا کروں، جانے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہتا
مگر بھائی جان کی منگنی ہے۔ میں نے تعجب سے سر ہلا کر کہا۔ تمہارے بڑے بھائی کی تو شادی ہو چکی ہے، کیا چھوٹے بھائی کی منگنی ہے؟ اس نے عجلت سے
جواب دیا۔ جی نہیں چچازاد بھائی محمد مُنیر کی منگنی ہے! میں نے کہا مگر زہرہ نے کہا تھا۔ انکی بھی منگنی ہو چکی ہے۔ حسنےؔ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔
جی ہاں، ہو تو چکی تھی۔ مگر وہ منگنی ٹوٹ گئی، دوسری جگہ ہو رہی ہے۔ شاہ بانو نے کہا۔ آخر کس لئے منگنی چھوڑ دی؟ حسنےؔ نے جواب دیا۔ لڑکی بیوقوف سی تھی۔
اور سُنا ہے پڑھی لکھی بھی بالکل نہیں تھی۔ ستارہ بولی منیر اس کے خلاف ہوں گے اس لئے چھوڑ دی۔ حسنےؔ نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ جی نہیں بھائی
جان تو عجیب طبیعت کے انسان ہیں۔ دخل ہی نہیں دیتے۔ چچی نے خود ہی کی اور آپ ہی چھوڑ دی، اب دوسری جگہ بھی وہی کر رہی ہیں، سلطانہ بولی
جب لڑکی پسند نہ تھی تو ناحق کی کیوں حسنےؔ نے کہا عجلت میں کر دی تھی۔ میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ حسنےؔ چلو تم خوش رہو، تمہارا تو فائدہ ہی ہے، ابھی تو
خدا جانے کتنی منگنیاں میاں مُنیر کی ہوں گی۔ ہر مرتبہ تم کو نیگ ملیگا۔ حسنےؔ سر جھکا کر مسکرا دی۔

شوخ ستارہ جو بہت بے چین طبیعت رکھتی ہے بول اٹھی، لے عورتیں تو بے زبان ہوتی ہی تھیں مردوں میں کب سے یہ صفت ہونے لگی۔
وہ کیسے گریجویٹ ہیں کہ اماں کی مرضی پر ہیں۔ حسنےؔ نے کہا۔ ہم سب کو تعجب ہے، پہلے تو ایسے نہ تھے، خدا جانے تین چار سال سے اُن کو کیا ہو گیا
ہے۔ ہم سب ہنسیں مذاق کرتی ہیں اور وہ خموش بیٹھے سُنا کرتے ہیں۔ سلطانہ نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔ آخر اس کی کچھ وجہ بھی ہے؟ حسنےؔ
وجہ ہی تو نہیں معلوم۔ سارا سارا دن کمرہ بند کئے بیٹھے رہتے ہیں، نہ ملتے ہیں نہ کہیں جاتے ہیں، نہ گھر میں کسی سے ہنستے بولتے ہیں، میل جول سب ترک
کر دیا۔ میں نے کہا۔ لڑکیاں بے چارے مُنیر کے پیچھے کیوں پڑ گئیں۔ اس رنگ کو ہم ہی جانتے ہیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!؟!

سب میرے سر ہو گئیں۔ آپ کیا سمجھیں ہم کو بھی بتائیے۔ میں نے حسنےؔ کے عارض گلگوں پر نظر ڈالی جس کو شرم نے اور بھی آتشیں کر دیا
تھا۔ اور جواب دیا۔ پھر سہی۔ وہ دیکھو زبیدہ اور انجمن آرا آ گئیں۔ سب کلونس بیگم، کلونس بیگم، کہکر دوڑ کر انجم سے جا لپٹیں۔ انجم کا رنگ ذرا سانولا
ہے، اِس لئے مذاق سے سب کلونس کہتے ہیں۔ ابھی انجم اور زبیدہ پر ہی غریب ستارہ پھبتیاں کس رہی تھی کہ مس عبداللہ ہارون خراماں خراماں
آتی نظر پڑیں۔ ادھر سے استقبالیہ کمیٹی کی سکریٹری بی ستارہ مذاق چھوڑ کر سنجیدگی سے ان کے خیر مقدم کو بڑھیں اور سب نے بڑھ کر اُن کو خوش آمدید
کہا۔ سب نازنین مہمان جمع ہو چکے تھے، ہال میں چائے اُڑ رہی تھی، زرق برق ساریاں اپنی نمائش میں مصروف تھیں حسین و متبسم چہروں سے
سارا ہال جگمگا رہا تھا۔ دلکش نقرئی قہقہوں اور بے پایاں فقروں اور لطیفوں سے عجب ہنگامہ برپا تھا۔ کہ ستارہ نے اپنے مخصوص ترنم میں
استقبالیہ نظم شروع کی۔ کمسن حسین اراکین پر ایک عالم وجد طاری ہو گیا۔ جہاں تھوڑی دیر قبل سقف شگاف قہقہوں سے کان پڑی آواز نہ سُنائی

دیتی تھی وہیں ایک دلآویز سکوت طاری ہو گیا۔ البتہ نازک ہاتھ کبھی کبھی تالیاں بجا کر ستارہ کی سُریلی آواز کی داد دیتے تھے۔ حسنیٰ اس وقت مجھ سے معافی مانگ کر رخصت ہو گئی۔

(۴)

کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے اور چند جاہلوں نے رخنہ اندازی کی کہ سوسائٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہم سب الگ الگ ہو گئے۔ شاہ بانو اپنی خالہ کے یہاں گئی۔ اور ستارہ اپنی بہن کے یہاں۔ دہلی میں صرف میں اور حسنیٰ رہ گئے۔ کتنے ہی روز مجھ کو اس سے ملے بغیر گزر گئے۔ ایک روز کلب میں زہرہ ملیں تو اُن سے معلوم ہوا۔ حسنیٰ کی نسبت غالباً ٹوٹ جائے اور پھر محمد مُنیر سے ہو۔ حسنیٰ کے باپ کو حسنیٰ کا یہ منگیتر کچھ پسند نہیں البتہ ماں ابھی تک اپنی بات پر اڑی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا زہرہ تمہارے مُنہ میں گھی شکر۔ خدا کرے حسنیٰ کی مُنیر سے شادی ہو۔ میں تو شکریہ کے نفل پڑھوں گی۔ مگر حسنیٰ سے کہہ دینا کیا مائیوں بیٹھی ہو۔ جو اتنے روز سے ملی بھی نہیں۔ ! ؟

اس بات کے تیسرے روز سہ پہر کو چائے کے بعد میں ہمایوں کے مطالعہ میں غرق تھی دیکھتی کیا ہوں حسنیٰ ہنستی ہوئی چلی آرہی ہے میں نے دوڑ کر اس سے معانقہ کیا۔ اِس مرتبہ حسنیٰ کا حسین چہرہ مجھے شاداب نظر آیا۔ بات بات پر مُسکرا رہی تھی۔ میں نے دل میں سمجھ لیا کہ اُمید موہوم نے اس کے دل کی پژمردہ کلی کھلا دی ہے۔ بہت دیر تک گھل مل کر باتیں میں اور وہ کرتے رہے آخر رات کے کھانے کے بعد جلد ملنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہوئی۔ اس کے بعد میں اس قدر افکار میں مُبتلا ہوئی کہ تین ماہ صاف گزر گئے اور حسنیٰ سے ملنا نہ ہوا۔ پھر میری سالگرہ پر اُس کو بُلوا گیا تو معلوم ہوا وہ شملہ گئی ہوئی ہے۔ انھیں دنوں شاہ بانو کی قرارداد ہو گئی۔ اور ہم سب شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ حسنیٰ کو بھی شادی کا بلاوا گیا۔ مگر وہ جو ایک کاغذ کا پُرزا جانے پر دوڑ کر آتی تھی نہ آئی۔ نہ کوئی جواب ہی دیا۔ میں اور ستارہ حیران تھے کہ الٰہی اس طویل خموشی کی کیا وجہ ہے۔

شادی کے بعد شاہ بانو سُسرال سدھاریں اور میں اور ستارہ فرصت سے بیٹھے تو پھر ہم دونوں نے حسنیٰ کو خط لکھے مگر اس کے جواب میں وہی طویل خموشی رہی۔ اس مرتبہ جواب نہ پا کر میں نے سمجھ لیا کہ ضرور کسی خاص واقعہ نے حسنیٰ کو خاموش کر دیا۔ آخر ملازمہ کے ہاتھ میں نے زہرہ کو پرچہ بھیجا کہ حسنیٰ کی بابت لکھو۔ وہ کیسی ہے ؟ اِس نے عرصہ سے ہمارے خطوط کا جواب بھی نہیں دیا۔ ہم لوگ اس کی جانب سے پریشان ہیں۔ زہرہ نے جو جواب اس کا دیا اُس کو دیکھ کر میرے اور ستارہ کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ آہ بہن حسنیٰ غریب کی کیا پوچھتی ہو اِس کی شادی ہو گئی۔ باپ کی بات نہ چلی۔ ماں کا ہی کہنا ہوا۔ یعنی محمد مُنیر سے شادی نہ ہو سکی۔ اس کی شادی میں کوئی ددھیال والا شریک نہ ہوا۔ شادی سے دو روز پیشتر حسنیٰ کی ماں نے حکم لگا دیا تھا کہ چاہے کچھ ہو میں حسنیٰ کی شادی اپنے بھانجے سے کر دوں گی۔ ورنہ میری بہن مجھ سے چھُٹ جائے گی جس وقت سے ماں کا یہ قطعی حکم حسنیٰ نے سُنا وہ مردہ کی طرح پڑ گئی۔ غش پر غش آرہے تھے۔ آخر اسی حال میں دوسرے دن شام کو نکاح ہو گیا۔ نہ مائیوں ہوئی نہ سانچق۔ نکاح کے وقت دُلہن سے اذن تک نہیں لیا گیا بس ماں نے ہی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اور اس طرح جاہل ماں نے اپنی خوشی پوری کر کے بے زبان لڑکی کو اپنی خوشی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ اور بیہوش حسنیٰ کو موٹر میں ڈال کر رخصت کر دیا۔ آٹھ روز میکے رہ کر پرسوں وہ سُسرال گئی ہے۔ اب غالباً دو تین روز میں پھر آئیگی۔ جب آئے گی آپ کا پیغام اس کو دیدوں گی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دیر تک ستارہ اور میں اس کے لئے افسوس کرتے رہے۔

(۵)

اِس خبر کے چوتھے روز حسنیٰ مع زہرہ کے آئی۔ اس کا نازک سڈول جسم نیلے رنگ کی ساری میں جس کے کناروں پر کارچوبی بیل بنی ہوئی تھی زیرِ آب کنول کی طرح جھلک رہا تھا۔ بناؤ سنگھار جو نئی دلہنوں کے لئے ضروری ہوتا ہے وہ اُس سے مبرّا تھی۔ نہ دانتوں میں مسّی تھی

نہ رُخ پر غازہ۔ نہ ماتھے پر افشاں۔ مشرقی سوسائٹی کے رواج نے کمسن حسنیٰ پر بڑا ظلم کیا تھا۔ اس میں ایک عظیم الشان انقلاب ہو گیا تھا دل کے غم نے پھولوں کی سیج کو کانٹوں سے زیادہ سخت بنا دیا تھا۔ صبح و شام کے نرم و نازک قہقہے جن سے اِس کی فضائے دوشیزگی معمور تھی اب افسردہ تبسم میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔ اَب حسنیٰ وہ حسنیٰ نہ تھی۔ جسے چمنستان شباب کا وہ پھول کہا جا سکے جن کی عطر بیزی کے افسانوں سے آج بھی دُنیائے جمال معمور و آباد ہے۔ اس کی آنکھوں سے ایسی حسرت برس رہی تھی جس سے اس کے دلی رنج کا حال عیاں ہو رہا تھا۔ میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ایں! یا حسنیٰ یہ تمہاری کیا وضع ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ تم نئی دُلہن ہو' زمانہ عروسی میں آسمانی رنگ سُرخ یا گلابی ساری پہنی ہوتی حسنیٰ نے شرمیلے انداز سے سر جھکا لیا۔ اور زہرہ نے کہا۔ اِن کی اماں نے بہت کہا سُرخ ساری پہن جاؤ۔ مگر انھوں نے نہ سُنا۔ کہا مجھ کو شرم آتی ہے۔ ستارہ بولی۔ واہ یہ نرالی شرم ہے۔ دُنیا زمانہ سے یہ نرالی ہیں۔ سب دُلہنیں پہنتی ہیں۔ تم کو کون دُلہن کہہ سکتا ہے۔ حسنیٰ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے دلہن کے خطاب سے کچھ خوشی بھی نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سب بہنوں کی نظروں میں پہلی حسنیٰ رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا۔ حسنیٰ یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ خواہ کسی قدر سادہ حالت بناؤ مگر دوشیزگی تو اَب تم سے قدرت نے چھین لی۔ غم میں گھلنا حماقت ہے۔ اس لئے کیوں نہ اپنی زندگی کو خوشگوار بناؤ۔ حسنیٰ نے ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا۔ آہ وہ عہد تسکین مجھ سے زبردستی چھین لیا گیا اور اس کی تلافی میں کسی قیمت پر نہیں کر سکتی۔ سلطانہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ بس بس رہنے بھی دو۔ تم کیا دُنیا سے انوکھی پارسا تھیں۔ سب کے ہی بیاہ ہوتے ہیں۔ ابھی شاہ بانو کا ہُوا ہے تم اس میں بھی شریک نہ ہوئیں۔ حسنیٰ نے اپنے خوبصورت سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ جی ہاں اس زمانہ میں ان جھگڑوں میں کچھ اس قدر مبتلا تھی کہ سب جگہ آنا جانا ترک کر دیا تھا ستارہ نے زہرہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ آخر یہ بھی تو ہیں۔ اب ڈیڑھ سال بیاہ کو ہو گیا۔ افشاں بھی لگی ہوئی ہے غازہ بھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ دُلہن ہیں۔ ایک بی حسنیٰ تم ہو۔ حسنیٰ مُسکرا اٹھی اور کہا۔ جی ہاں یہ خوش نصیب ہیں۔ کیوں نہ بناؤ کریں۔ میں نے کہا تو تم خدا نہ کرے کیا بدنصیب ہو' حسنیٰ نے جو بیساختہ فقرہ مُنہ سے نکل گیا تھا اس کی تلافی کرتے ہوئے کہا جی نہیں میرا مطلب یہ ہے۔ زہرہ کا میکہ سُسرال سب دہلی میں ہے یہ خوش نصیب ہیں۔ مجھے دیکھئے کہ کالے کوسوں ہوں۔ جب کبھی دہلی آؤں گی آپ لوگوں کی زیارت ہوگی۔ ورنہ ملنے کے لئے دل لوٹا کرے گا۔ شوخ ستارہ ہاتھ چمکا کر بولی۔ ایسی تو یاد کرنے والی! اپنے بیاہ میں تو پوچھا نہیں۔ خوشی میں ایسی محو ہوئیں کہ سہیلیاں بھی یاد نہ رہیں۔ اور بیگم صاحبہ اب آئیں بھی تو کن نخروں سے۔ پردیس میں یاد کریں گی ضرور۔ گاتے ہوئے۔

آپ ہم سے اور کریں گی وفا جی بجا درست! ہم کو اُمید آپ سے بیشک وفا کی ہے!؟

حسنیٰ نے ایک لمبا سانس لیکر گردن جھکا لی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلک رہے ہیں۔ ستارہ حسنیٰ کو رنجیدہ دیکھ کر اپنے مذاق پر پشیمان ہو گئی اور اس نے کہا۔ اے حسنیٰ بہن معاف کرو میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم رنجیدہ ہو گئیں!؟ واہ یہ بھی کوئی بات رونے کی ہے' آج تم کو ہو کیا گیا ہے۔ غریب حسنیٰ کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ وہ آگ جو چار سال سے سینے میں دبی ہوئی تھی مشتعل ہو چکی تھی اور اس کا نازک دل ظلم کے پتھر سے چور چور ہو گیا تھا۔ اِس نے آنسو صاف کئے اور کہا۔ بہن ستارہ تمہاری بات پر نہیں۔ میرا تو یونہی دل بھر آیا تھا آہ بہن میری شادی نہیں بلکہ دل کی بربادی ہوئی ہے۔ زہرہ سے پوچھو اپنے حال کی خبر نہ تھی کسی اور کی خبر کیا ہوتی۔ تمہارا شکوہ بجا۔ گو درست مگر میری تو شادی ہوئی ہی نہیں۔ اماں کی خوشی میں جو آیا کیا۔ شادی تھی یا ماتم۔ ددھیال والا کوئی شریک نہ ہوا۔ ننھیال والے بھی کھڑے آئے اور میرا زندہ جنازہ موٹر میں ڈال کر چلے گئے۔ کیا آپ مجھ کو وہ حسنیٰ سمجھتی ہیں جو چھ ماہ قبل تھی۔ بہن اب تو صرف حسنیٰ کا جسم باقی ہے جذبات مردہ ہو چکے دل بجھ گیا۔ مجھے تو آسمان کی گردش نے کچھ ایسا پیسا کہ کسی بات کا لُطف باقی نہ رہا۔ حسنیٰ کہہ رہی تھی اور میں اس کا مُنہ تک رہی تھی۔ وہ حسنیٰ جو کبھی نظر اونچی کر کے بات بھی نہ کرتی تھی آج آزادانہ اس طرح گفتگو کر رہی تھی جیسے کوئی لکچر دے رہا ہو۔ آخر کار وہ کھڑی ہو گئی اور کہا دل گھبراتا ہے میں ذرا صحن میں ٹہلتی ہوں۔ میں نے سُلطانہ کو ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔ اور کہا۔ ہاں' ہاں ذرا ٹہلو اور ٹھنڈا پانی پیو۔ طبیعت درست ہو جائیگی۔

اس کے جانے کے بعد زہرہ نے ستارہ سے کہا۔ آپ نے اس موضوع پر گفتگو کرکے غضب کیا۔ مجھ کو تو اس کی جان کا خطرہ تھا اور ہے۔ رنج کی وجہ سے آپ دیکھتی ہیں اس کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ میں نے کہا زہرہ قطع کلام ہوتا ہے۔ یہ تو بتاؤ منیر کی کیا حالت ہے؟ زہرہ نے کہا۔ کہ اس غریب کی حالت کیا پوچھتی ہو۔ جس وقت حسنیٰ وداع ہوئی اور منیر کو خبر ملی۔ بیہوش ہو گئے۔ ———— خدا کی قدرت کا تماشہ نظر آتا تھا۔ ایک بھائی کے یہاں شادی۔ دوسرے کے یہاں کہرام۔ خود حسنیٰ کے والد بھتیجے کے سرہانے کھڑے رو رہے تھے۔ ابر دست ہونے کے بعد بھی منیر دو روز تک خاموش رہے۔ سارا گھر پریشان تھا۔ بے چارے کی عجیب حالت ہو گئی ہے۔ معصوم بچوں کی طرح ایک ایک کا منہ تکتے ہیں نہ بات کرتے ہیں نہ ہنستے ہیں۔ کھلا دیا تو کھا لیا ورنہ پرواہ نہیں۔ گھنٹوں کمرہ بند کرکے ساکت پڑے رہتے ہیں یا جنگلوں میں رہ کر وقت گزارتے ہیں۔ میں نے کہا۔ زہرہ آخر اس نسبت تڑانے کی وجہ کیا ہوئی؟ کیا جن سے اب شادی ہوئی ہے زائد روپے والے ہیں یا قابل زیادہ ہیں؟ زہرہ نے کہا قابل تو محمد منیر بہت ہیں۔ حسنیٰ کا دولہا ان کا پاسنگ بھی نہیں۔ روپیہ بھی کچھ اتنا زیادہ نہیں۔ ستارہ بولی۔ صورت کیسی ہے؟ زہرہ۔ کیا بتاؤں بس غلاصے ہیں۔ ذرا موٹے ہیں، جوڑ بس اگر ہوتا حسنیٰ اور منیر کا ہوتا۔ نازک نازک نقشہ۔ بڑے جامہ زیب آدمی ہیں۔ مگر اب تو بیچارے کی صورت آدھی بھی نہ رہی۔ غموں نے تباہ کر دیا۔ صورت پر وحشت و حسرت برستی ہے۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی مگر حسنیٰ کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ اور اس کا دل بہلانے کو مذاقیہ گفتگو شروع کر دی۔

معصوم حسنیٰ حسب دستور پھر مسرور ہو گئی اور قہقہے پر قہقہے لگانے لگی۔ جو ایک حد تک نئی دلہنوں کے لئے ناموزوں ہوتے ہیں مگر وہ بناوٹی تھے۔ دراصل غریب لڑکی کو اپنا رنج خوشی کی تہوں میں چھپانے اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے سخت کوشش کرنی پڑ رہی تھی جب اس کے جانے کا وقت قریب آیا تو میں نے اس کا نازک حنا آلود ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے ہاتھ پر مہندی نہیں بلکہ کسی کی تمناؤں کا خون ہے۔ حسنیٰ مسکرا دی اور کہا۔ آپ شاعرانہ طبیعت رکھتی ہیں۔ جو فرمائیں بجا ہے۔ میں تو سمجھتی نہیں آپ کا اس سے مطلب کیا ہے میں نے کہا "خون تمنا" کے زیر عنوان بڑا دلچسپ افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ حسنیٰ نے بیساختہ کہا۔ ضرور لکھئے۔ میں نے کہا۔ ہاں میرا بھی دل چاہتا ہے۔ فرضی تو بہت لکھے اب ایک اصلی بھی لکھوں۔

دیکھئے خدا اب کب ملائے۔ یہ کہتی ہوئی حسنیٰ کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ حسنیٰ کتنا اچھا ہوتا۔ اگر تم منیر سے بیاہی جاتیں، آہ۔ حسنیٰ نے عجیب درد انگیز لہجے سے غالب کا یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اور سبک روی سے چلدی

میں دیر تک غور کرتی رہی کہ یا رب غریب لڑکیوں کو اس الفاف کے زمانہ میں بھی عرب کی جاہلانہ رسم کے مطابق زندہ در گور کر دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کے ادبار کا سبب مظلوم لڑکیوں کی توہین ہے۔ خدا جانے حسنیٰ جیسی کتنی لڑکیاں مصنوعی شرم اور ماں باپ کی لاج کی خاطر بھینٹ چڑھ گئیں اور چڑھتی رہتی ہیں۔

افسانہ گو

محترمہ قمر حنا صاحبہ

صحرائے "روحم" کی ایک خوشگوار رات تھی۔ پرندے دن بھر کی تڑپا دینے والی گرمی میں بھنکر اس وقت سکون کے ساتھ اپنے اپنے آشیانوں میں میٹھی نیند سو رہے تھے......... کوئی مضطرب پرندہ کہیں دور کسی کھجور کے بلند درخت پر بیٹھا دردناک راگ الاپ رہا تھا۔ جھلسا دینے والی ریت دن بھر کی آتش ریزیوں سے اُکتا کر اَب چاند کی خنک گود میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ چاند کی ضیا پاش کرنوں میں ریت پر پریاں رو پہلا لباس پہنے ناچ رہی تھیں...... صحرائی ندی ایک سیمیں دھاری کی صورت میں سُبک رفتاری سے بہہ رہی تھی جس میں چاند کی نقرئی کرنوں کے ساتھ ہزاروں ننھے ننھے ستارے بہے چلے جا رہے تھے۔ ہوا کچھ خنکی لئے نازک خرامی سے چل رہی تھی۔ کھجور کے بلند درختوں کے جھنڈ کے قریب جہاں خاموش ندی تقریباً رُک سی گئی تھی...... نسبتاً ریت کے ایک بلند منقش ٹیلے پر "افسانہ گو" بیٹھا تھا...... اِس کے آگے ذرا نیچے نرم چمکیلی ریت پر معصوم بچے کنواری لڑکیاں اور لڑکے۔ نوجوان مرد اور عورتیں محوِ حیرت بیٹھی ہوئی تھیں.........

بلوچی افسانہ گو چاند کی سفید روشنی میں اک دیوتا معلوم ہو رہا تھا...... زرتار پگڑی اس وقت اک ہار کی طرح گلے میں پڑی تھی..... قرمزی ریشم کا کلی دار کرتہ جسکی چوڑی چوڑی آستینیں اور ڈھیلے دامن جنگل کی ہوا میں ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے زیبِ تن تھا..... گلے میں موتیوں کی اک لمبی مالا کئی بل کھائے پڑی تھی...... بڑے بڑے بالے اور چمکتی چوڑیاں ایک عجیب طلسمی منظر پیش کر رہی تھیں...... اِس وقت وہ ہزاروں نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا...... کہانی کے شیدائی ہمہ تن گوش بنے ہوئے اُسے تک رہے تھے..... افسانہ گو خواب کے سے عالم میں کھویا کھویا رباب کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے بیٹھا تھا...... چاند حریری بادلوں میں روپوش تھا۔ ستارے ہلکے ہلکے آنکھیں بند کرتے جا رہے تھے...... فضا ہی پر نہیں تمام کائنات پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ یکایک وہ چونک اُٹھا..... اُس نے اپنی حسین آنکھیں کھولدیں۔ مجمع پر ایک جادو بھری نگاہ ڈالی اور مُسکرا پڑا۔ اس کی لطیف موجِ تبسم نے چمک کر چاند کا حسین چہرہ بے نقاب کر دیا۔ ستارے کھِل کھلا کر ہنس پڑے...... صحرائی ندی نامعلوم مسرت سے لبریز ہو کر کانپنے لگی۔ کھجور کے بلند درختوں پر ہوا پُراسرار طور پر سرسرانے لگی..... غرضکہ تمام کائنات میں حرکت و حرارت کی ایک روح دوڑ گئی۔

افسانہ گو نے رباب کے تاروں کو چھیڑا۔ زمزموں نے ابھی تاروں کے جھروکوں سے جھانکا بھی نہ تھا کہ انسانی سماعت..... زمین ...... آسمان..... یہاں تک کہ زندگی کے تمام تار جھنجھنا اُٹھے....... ہر ایک رگ و پے سے نغمے جاری ہو گئے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ زمزمے اور موسیقی ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر محوِ رقص ہیں۔ سُننے والے فرطِ حیرت سے پیکرِ حیرت بن گئے تھے...... اس نے ایک

نامعلوم راگ چھیڑتے ہوئے کہا "کل ہیں کل اسی منزل تک پہنچا تھا نا؟ کہ شہزادہ پریوں کی شہزادی کی تلاش میں تن تنہا گھر سے پا پیادہ نکل کھڑا ہوا۔" نگاہوں نے اثبات میں جواب دیا...... افسانہ گو نے کچھ سوچکر رُک رُک کر کہنا شروع کیا "شہزادہ، وہ جستجو کا پیغمبر، وہ تلاش کا دیوتا پریوں کی شہزادی کے خیال میں برابر چلتا رہا۔ اُس کا سفر لامتناہی تھا۔ کئی سورج نکلے اور اس کی ہمّت پر حیرت زدہ ہوکر چھُپ گئے۔ کئی چاند طلوع ہوئے اور شہزادہ کی بے بسی پر مایوس روشنی ڈال کر روپوش ہو گئے۔ مگر شہزادہ برابر چلتا رہا ..... راہ کے مصائب اس کی وحشت سفر کے قدموں پر تھے۔ اور صعوباتِ منزل اس کے زیر پا۔ وہ شہزادی کی یاد میں ڈوبا ہوا۔ مُسکراتا ہوا۔ خاموش چلتا رہا...... ذوق جستجو مشعل راہ تھا۔ اور محبّت رہبر...... اپنی سلطنتِ روح کو شہزادی کی ہستی سے آباد کرنے کے لئے....... حریفوں میں فاتح کی حیثیت سے نمایاں ہونے کیلئے..... وہ پُرخطر راستوں...... عمیق سمندروں...... گھنے جنگلوں...... وسیع صحراؤں...... گہری وادیوں اور بلند پہاڑوں سے...... بےخطر گزر گیا۔ شہزادی کی یاد کے شہپر لگائے ہوئے اڑ رہا ہوا جستجو پر سوار اس کا نہ ختم ہونے والا سفر برابر جاری رہا.. ... مگر آہ شہزادی! شہزادی تو اَب بھی لامعلوم تھی...... مگر جستجو کی اِس ناکامی کے خیال میں ڈوبا ہوا شہزادہ اَب بھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھا..... اس کی اُمنگیں اَب بھی تازہ تھیں۔ اس کی قوّتِ ارادی اَب بھی جوان تھی۔ اس لئے وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ مُسلسل چلتا رہا۔ اک نامعلوم سمت کی طرف۔" یہاں تک پہونچکر افسانہ گو خاموش ہو گیا"..... اُس نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ جس کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ فضا ایک اُداس اور مایوس جھرجھری لے رہی ہے..... خوبصورت چاند..... چمکدار ستارے...... خاموش ندی اور مرتعش ہوا سب کے سب جو کہانی سُننے میں محو تھے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ہر اک نے اپنی اپنی چادر میں مُنہ چھپا لیا۔ .....

افسانہ گو خاموش تھا۔ فضا جو کچھ دیر پہلے حسین و رسیلی آواز اور رباب کے دل گداز نغموں سے لبریز تھی اب ساکت ہو چکی تھی.... کچھ عرصہ بعد افسانہ گو پھر مخاطب ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بجلی سی پیدا ہوئی۔ اُس بجلی کی حسین چمک میں افسانہ گو نے پوچھا "اچھا بتاؤ کہ شہزادہ کامیاب ہوا کہ نہیں؟ پریوں کی شہزادی شہزادے کو ملی یا نہیں؟ اُداس آوازوں نے ہلکے سروں میں جواب دیا "شاید نہیں۔"

افسانہ گو کھڑا ہو گیا۔ اس کے تابناک چہرہ پر مسرّت اور کامیابی کی بجلیاں کوندنے لگیں....... وہ دراز قد مجسمۂ حُسن۔ ایک عجیب بےخودی کے عالم میں جھوما۔ اُس نے اپنی آغوش کھولدی۔ اس کی چوڑیوں سے ایک دلکش ترنّم پیدا ہوا۔ سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اِس نے کہا "تمہارا خیال غلط نکلا۔ شہزادہ کو شہزادی مل گئی۔" یہ کہکر اُس نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا سب نے اپنی روح آنکھوں میں سمیٹ کر درختوں کے سیاہ دھبّہ کی طرف دیکھنا شروع کیا....... ایک درخت سے چمٹی ہوئی ایک حسین صندلی رنگ اور کاہیدہ جسم دوشیزہ کھڑی تھی...... معصوم لڑکی ایک ایسی حسین پری معلوم ہو رہی تھی جو کسی خواب میں بہہ رہی ہو۔ بڑی بڑی خمار آگیں آنکھیں بند تھیں۔ لمبی خمدار پلکوں نے مستعد محافظوں کی طرح حسین رخساروں پر سایہ کر رکھا تھا۔ سیاہ گھونگریالے بال دو لٹوں میں تقسیم ہو کر شانوں سے بکھر کر سینہ پر پڑے تھے۔ جن میں کہیں کہیں مقیش کے تار سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے...... اور وہ حُسن کی دیوی افسانہ و رباب کے کیف میں مست تھی..... مجمع یک لخت کھڑا ہو گیا۔ بچّوں نے چیخکر اور نوجوانوں نے آہستہ سے کہا۔ "خانہ بدوشوں کی لڑکی پریوں کی شہزادی۔" بچّے خوشی کی چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔ نوجوان ہلکے ہلکے ایسا ہی یا اس قصّہ سے ملتا جُلتا اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ چاند ہنستا ہوا بلند درختوں کے پیچھے جا چھپا جہاں سے اب بھی تاک جھانک کر رہا تھا..... ستارے خوش ہو کر آپس میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ ہوا مسرّت سے گنگناتی ہوئی کوئی دوسرا قصّہ سُننے کیلئے روانہ ہو گئی۔ ندی سوچتی ہوئی آگے بڑھی کیا یہ سچ ہے۔ !؟

دوسرے لمحہ نوجوان بلوچی افسانہ گو افسانوی پریوں کی شہزادی کے سامنے دو زانو کھڑا تھا جو اس وقت دونوں ہاتھ سینے پر رکھے دھڑکتے دل کو تھامے۔ نیم وا آنکھیں کئے حیرت کے عالم میں سوچ رہی تھی کیا یہ سب کچھ سچ ہے جو میں نے سُنا اور دیکھ رہی ہوں یا میرے

"حسین خواب کا ایک نا مکمّل باب"

بنام او کہ داماد فرنگ است

حضرت شوکت تھانوی کا ایک مزاحیہ شاہکار

اے ولایتی سسرال کے سودیشی داماد! میں تم کو صرف فرید[1] کہکر مخاطب کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اپنی حقیقت سے باخبر رہو اور اگر مجھ کو بھول گئے ہو تو یاد کرلو۔ اس کے بعد میں تم کو اس ازدواجی زندگی پر مبارکباد دیتا ہوں جس کی دعوت ہنوز واجب الادا ہے اور میں لرزاں ہوں اس وقت کے تصور سے جب تم چھری کانٹے سے مجھ کو کھانا کھلا کر فاقہ کشی کی موت پر محض اس لئے مجبور کرو گے۔ کہ تمہاری مغربی رفیقۂ حیات ایک ہندوستانی کی چھری اور کانٹے سے بیگانگی کا مضحکہ خیز تماشہ دیکھ کر ذرا لطف اندوز ہو جائیں۔ یہ حسن طلب نہیں بلکہ توبہ کرنے کا مقام ہے حالانکہ تم ولایت جانے اور نصف ولایتی بنجانے کے بعد اس کیفیت کے احساس اور اس احساس کی "عبرت انگیزی" سے یقیناً بیگانہ ہو چکے ہو گے۔ لہذا میں بھی اس طرف سے صبر کرتا ہوں اور تم سے ایک خاص مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

غالب اور میر کا ذکر یقیناً ایسا ہی بے محل ہے جس طرح کوئی صاحب ہر سطر سے میر انیس کے مراثی پر اظہار خیال کی خواہش کریں میں تو تم سے رڈیارکپلنگ کے متعلق ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اُن حضرت نے بھی یہ عجیب پھلجھڑی چھوڑی ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔" دنیا ہے کہ اس نظریہ کو خدا جانے کس قدر ناقابل انکار حقیقت سمجھے ہوئے ہے مگر میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر یہ نظریہ ذرا بھی سچا ہوتا تو تم خود ایک "مغربی رفیقۂ حیات" کے "مشرقی رفیق زندگی" کیونکر بنتے۔ میں خوش ہوں کہ تم نے میری طرح الفاظ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس نظریہ کے باطل کو نمایاں کیا ہے اور مجھ کو اُمید ہے کہ تم دونوں دولہا دولہن مل کر اس ضرب المثل کو اس طرح شرمندۂ معنی بنادو گے کہ مغرب مشرق ہو جائے اور مشرق مغرب۔ ع

این دعا از من و از زوجۂ خود آمیں باد

نیرنگ خیال کے تازہ نمبر میں رڈیارڈ کپلنگ کے اس تعصب آمیز نظریہ کی مصور تردید نظر سے گزری۔ اس تصویر میں مشرق مطلع مغرب پر اور مغرب افق مشرق پر نظر آرہا ہے۔ مادر ہند کا لال سید فرید جعفری انگریزی لباس میں خوشدامن برطانیہ کا داماد بنا ہوا ہے۔ اور مادر برطانیہ کی دختر نیک اختر سلمٰی (خدا جانے ان کا ولایتی نام کیا ہے[2]) ساری باندھے مچھلی شہر کے ایک شریف گھرانے کی بہو بنی کھڑی ہیں۔ کیا یہ مشرق کا مغرب اور مغرب کا مشرق ہونا نہیں ہے اور کیا اس کے بعد بھی رڈیارڈ کپلنگ کے اس فیصلہ کو ناطق کہا جا سکتا ہے۔؟

[1] سیّد فرید جعفری مچھلی شہری۔ [2] ایلن

میں تم دونوں کے اس روحانی اور مقدس اتحاد کو سودیشی اور بدیشی دونوں حیثیتوں سے مبارک سمجھتا ہوں۔ برطانوی یا سرکاری نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہندوستان مفتوح بنکر رہے اور اپنے فاتح کا سعادتمندی کے ساتھ احترام کرے۔ چنانچہ آپ سلمیٰ نے تم کو فتح کیا ہے اور مجھ کو اُمید ہے کہ تم ایک شریف ہندوستانی شوہر کی طرح اپنی مغربی بیوی کے نہایت فرماں بردار شوہر ثابت ہو گے۔ اگر اسکو خود ستائی نہ سمجھو تو میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں خود بھی ایسا ہی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں بیحد شریف ہوں بلکہ محض اس لئے کہ عافیت اسی میں ہے لہذا تم بھی اگر شرافت سے کام نہ لو تو سیاسی طور پر اس اصول کو پیش نظر رکھو۔ اس کے بعد تم کو اندازہ ہوگا کہ یہ کتنا بڑا حکیمانہ مشورہ ہے جو میں تم کو بلامعاوضہ یعنی بغیر دعوت کھائے ہوئے دے رہا ہوں۔ ہاں تو سرکاری حیثیت تو یہ ہوئی اب رہی قومی حیثیت وہ بھی سُن لو کہ کانگریس کا مطمح نظر سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ فاتح مفتوح بن کر رہیں خواہ حکمرانی کئے جائیں۔ لہذا تم خود بھی اپنے فاتح کے فاتح ہو یعنی اپنی بیوی کے شوہر۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے کو مجازی خدا سمجھتے سمجھتے اس بیچاری کو حقیقی بندی سمجھنے لگو اور اس کے بعد خدائی تو خدائی اپنی انسانی عافیت کو بھی خطرہ میں ڈالو۔ یقین جانو کہ میں نے کبھی اپنے بچّوں کی ماں کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ مجھ کو خدا بنجانے کے فریب میں مبتلا کریں اور میں گمراہ ہو کر فرعون بنجاؤں تاکہ پھر ان کو حضرت موسیٰ کی تاریخ دہرانے کا موقع ملے اور بلا وجہ گومتی کو میرے لئے دریائے نیل بننا پڑے۔ آخر اس طوالت سے فائدہ کیا۔ خاموشی کے ساتھ آدمی شوہر کیوں نہ بنا رہے اور اگر شامت ہی آگئی ہو تو دوسری بات ہے۔!؟

میرا دوسرا مشورہ ذرا نازک ہے ممکن ہے کہ تمہارے نقطۂ نظر سے نازک نہ ہو مگر پوتے کے منتظر دادا اور اپنے لال کے لال کی مشتاق دادی اس مشورہ پر خوش نہ ہوں گی۔ مگر بھائی میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم نے باپ بننے میں جلد بازی سے کام لیا تو یاد رکھو کہ تمہاری ازدواجی مسرتیں اپنی زر بنیوں کو ٹٹولتی پھریں گی۔ اور سلمیٰ کی مامتا مجبور ہوگی کہ فرید کے بجائے سلمان فرید (یہ سلمیٰ اور فرید کے لڑکے کا نام ہوگا) کو اپنا مرکز توجہ بنالے۔ مختصر یہ کہ وہ ماں بنجائیں گی اور تم باپ۔ رہ گئیں تمہاری ازدواجی امنگیں وہ علامہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری کے پوتے کی شکل اختیار کرلیں گی۔ یقین جانو کہ میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا اور شادی کے پانچ سال بلا شرکت غیرے اس طرح گزارے کہ ہم دونوں کی خلوتوں میں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا۔ مگر اب اس کا احساس ہوتا ہے کہ پانچ سال کے بعد بھی آخر ہم پر کیا شامت آئی تھی کہ باپ بن بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تو بن گئیں اپنے بچّے کی ماں اور ہم ایسے ہو گئے کہ گویا اُن سے کبھی جان پہچان بھی نہ تھی۔ شوہر ہم اب بھی ہیں اور مرتے دم تک رہیں گے مگر یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے کہ وہ ہماری بیوی زیادہ ہیں یا اپنے بچّوں کی ماں۔ خیر اس سوال کا تو کوئی جواب ہو یا نہ ہو مگر ہم خود اپنے اس احساس کا کیا علاج کریں کہ اب خود ہم کو اپنی ذاتی بیوی پر یہ شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ ہماری بیوی ہوں یا نہ ہوں مگر ہمارے بچّوں کی ماں ضرور ہیں۔ اس نکتہ کا ایک حل سمجھ میں آگیا ہے مگر ہم اپنی اور اپنی بیوی بلکہ تمہاری اور تمہاری بیوی کی جان سے دور کہکر عرض کرتے ہیں کہ بچّہ ہونے کے بعد ایک بیوی شوہر کی بیوی کم رہ جاتی ہے اور بچّے کی ماں زیادہ ہوتی ہے اس لئے کہ شوہر سے علیحدگی ممکن ہے یعنی اگر خدانخواستہ طلاق کی نوبت آجائے تو بیوی بیوی نہ رہے گی۔ البتہ بچّوں کی ماں ہونے سے اس کو کوئی شرعی یا قانونی دفعہ باز نہیں رکھ سکتی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ طلاق کے بعد ایک شوہر بھی شوہر نہیں رہ سکتا مگر بچّوں کا باپ رہنے سے اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ سچ ہے مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک مرد ہر وقت اس شرافت کیلئے تیار رہتا ہے کہ وہ بیوی کے حضور بچّوں کو قربان کردے۔ جس کا کھلا ہوا ثبوت سوتیلی ماؤں کے بیشمار افسانے ہیں مگر کیا تم نے کبھی کسی سوتیلے باپ کا بھی کوئی قصہ سُنا ہے کہ اس نے اپنے سوتیلے بچّوں پر مظالم کئے ہوں اور ان کی سگی ماں نے ان مظالم کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرلیا ہو۔

لاحول ولا قوۃ بات میں بات پیدا ہو کر ضبط تولید سے سوتیلے ماں باپ تک پہنچ گئی۔ منع تو کرنا چاہتے ہیں بچے پیدا کرنے کو مگر یہاں خود بخود پیدا ہوئے جاتے ہیں ماں باپ۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ بھائی اب اگر تم نے شادی کی ہے تو خدا کے لئے اس شادی میں ابھی دیمک نہ لگانا ورنہ کیا فائدہ کہ ابھی تو کر و جلد بازی اور اس کے بعد بیوی ہوں زچہ خانہ میں اور خود تم کتب خانہ میں ضبط تولید کا لٹریچر چاٹتے ہوئے نظر آؤ۔ اور اپنی بیوی کے شوہر کے بجائے اپنے بچوں کے باپ کہلاؤ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ باپ کہلانا نوجوانی کی موت اور جوانی کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ بہرخواہ تم کیسے ہی جوان رعنا کیوں نہ بنو مگر تمہارے سیہ بالوں پر خضاب کا شبہ ہونے لگے گا۔ اور تم کو خود اپنی امنگیں کمر جھکائے ہوئے تسبیح پڑھتی نظر آئیں گی۔

میرا تیسرا مشورہ بھی گرہ میں باندھ لو حالانکہ میں کیا اور میرا مشورہ کیا۔ مگر یہ تو تمکو معلوم ہی ہوگا کہ میں شوہر ہونے کی حیثیت سے تم سے سینئر ہوں۔ اور خواہ تم اس کو میری سخت جانی سمجھو یا کچھ بہرحال میں تم سے سچ سچ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پندرہ برس سے شوہر بنا ہوا ہوں۔ اگر ان پندرہ برس میں سے پانچ سال خالص شوہر کی حیثیت کے نکال دو تو بھی دس سال سے بحیثیت ایک باپ کے زندگی بسر کر رہا ہوں لہٰذا کافی تجربہ کار ہوں اور ان نشیب و فراز سے پورا آگاہ جن سے تم کو اب واسطہ پڑے گا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اپنے تجربہ کی بنا پر تم سے کہدوں کہ یہ جو ساس بہو کا جھگڑا ہوتا ہے اس سے ذرا ہوشیار رہنا۔ دراصل اگر اس سلسلہ میں تم نے میری پیروی کی تو خواہ ساس اور بہو کے تعلقات کیسے ہی ناگفتہ بہ ہو جائیں مگر تم مزے میں رہو گے۔ میں نے اس حکمت عملی کا سبق اُستاد جان بل سے سیکھا ہے اور میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ یہ کیسا تیر بہدف نسخہ ہے۔ سب سے پہلی بات تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھو کہ کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرنا کہ زیادتی کس کی ہے اس لئے کہ دراصل دونوں کی زیادتی ہوتی ہے۔ اور اگر تم نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی تو تمہارا دماغ چکرا جائیگا اور آخرکار تم زیادتی صرف اپنی سمجھوگے کہ اپنی بیوی کی ساس کے لڑکے اور اپنی ماں کی بہو کے شوہر بنے ہی کیوں تھے۔ بھائی ہم پر یہ سب کیفیتیں گزر چکی ہیں۔ ع۔

جو دن ہم پر بیت گئے ہیں وہ دن تم پہ آوت ہیں

(اس کا دوسرا مصرعہ بابو راجندر پرشاد سے خط لکھ کر پوچھ لو۔ جو اُردو اور ہندی کی درمیانی زبان تلاش کر رہے ہیں۔)

اس قسم کے مواقع پر جبکہ ساس اور بہو میں معرکہ آرائی ہو محض سر جھکا کر بیٹھ جانا شوہر کے لئے مناسب ہے تاکہ دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چلے کہ تمہارا منُہ کدھر ہے۔ اس کے بعد جب یہ ہنگامہ فرو ہو جائے اور دونوں اپنی اپنی جگہ منہ پھُلا کر بیٹھ جائیں تو تمہارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ چور سے کہو چوری کر اور شاہ سے کہو کہ ہوشیار رہے۔ یعنی ماں کا دل ہاتھ میں لینے کے لئے ماں کے سامنے بیوی کی زیادتیوں کا اعتراف کرو اور بیوی کے پاس جا کر اس بات کی معذرت چاہو کہ میں ایسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہی کیوں ہوا نتیجہ ظاہر ہے کہ تم سے دونوں خوش رہیں گی۔ خواہ آپس میں دونوں کے درمیان نفاق کی خلیج بنگال حائل ہو جائے یا بحر الکاہل مگر تمہاری بلا سے۔ اوّل تو خدا کرے اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن داشتہ آید بکار۔ اس نصیحت کو بھی یاد رکھنا

چوتھا پُر خلوص مشورہ اس لئے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے دوست سے بخل میرے مشرب میں جائز نہیں۔ حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جو عام طور پر اُستادی کا گُر سمجھی جاتی ہیں۔ اور لوگ ان کو علم سینہ کی طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر علم سینہ بھی اپنے جگری دوست سے راز نہیں رکھا جا سکتا۔ بہرحال وہ مشورہ یہ ہے کہ تم کو تو اس کا پورا اختیار ہے کہ تم اپنی رفیقۂ حیات پر خواہ کیسا ہی اعتماد کرو مگر خدا کے لئے اس حسن ظن میں کبھی مبتلا نہ ہونا کہ وہ بھی تم پر اعتماد کرتی ہیں۔ حالانکہ وہ تم کو یقین دلائیں گی۔ اور اگر تم بھی میری طرح عقل سے کام نہ لو گے

تو کبھی نہ کبھی سخت خطرہ میں مُبتلا ہو جاؤ گے۔ دراصل وہ تم پر اعتماد نہیں بلکہ "اظہارِ اعتماد" کریں گی۔ اور خفیہ طور پر تمہاری نگرانی بھی کرینگی اب اگر تمہارے قدم کہیں ڈگمگائے اور تمہاری نگاہیں کہیں بھکیں تو غضب ہی ہو جائے گا۔ بھائی ہم بھی اپنی عقلمندی سے اپنی رفیقۂ حیات کو نہایت وسیع النظر نہایت بلند خیال اور نہایت روادار سمجھے ہوئے تھے چنانچہ اپنی ایک آدھ لغزش کا ان سے نہایت سادگی کے ساتھ تذکرہ کر دیا۔ بس جناب وہ دن اور آج کا دن کہ ان کی نظر میں اس دُنیا کے پردہ پر ہم سے زیادہ سیہ کار ہم سے زیادہ فاسق اور فاجر اور ہم سے زیادہ ناقابل اعتبار اور کوئی مرد ہے ہی نہیں حالانکہ میں ان سے نہیں بلکہ تم سے کہتا ہوں کہ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں۔ مگر یاد رکھو کہ خدا کی نظروں میں ایک بے گناہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ بیوی کی نگاہوں میں بھی بے گناہ ثابت ہو سکے۔ لہٰذا اس قسم کی غلطی تم نہ کرنا میں تاصح نہیں ہوں کہ تم کو گناہ کرنے سے روکوں۔ البتہ دوست ہوں اس لئے اظہارِ گناہ سے تمکو باز رہنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

تم مشورے سُنتے سُنتے پریشان ہو گئے ہو گے مگر میں کیا کروں کہ میرے خلوص کا طوفان امنڈا تا ہی چلا آتا ہے اور اپنی رو میں عجیب عجیب مشورے بہا کر لا رہا ہے لہٰذا پانچواں مشورہ بھی سُن لو۔ اور یہ مشورہ میں محض اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ تم نہایت جری قسم کے سچے آدمی ہو۔ اور شاید ہی کبھی تفریحاً جھوٹ بولتے ہو۔ مگر میرے پیارے دوست اب تم جھوٹ بولنے کی مشق پیدا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے مگر عقبیٰ کے لئے اور سچ بولنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے جو اسی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دنیا میں رہنے والا خصوصاً ایک شوہر قسم کا انسان سچ بول کر کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ واضح رہے کہ اگر تم نے کبھی کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر صداقت سے کام لیا اور اس کے حسن کو حسن کہدیا تو تمہاری زندگی عذاب بنجائے گی اور اس سچ کی پاداش میں تم کو جیتے جی جہنم کا مزہ آجائے گا۔ تم کو چاہیئے کہ تم ہر خوبصورت عورت کو دیکھ کر خواہ دل ہی دل میں کیسا ہی وجد کیوں نہ کرو مگر زبان سے اور چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے اپنی رفیقۂ حیات پر یہی ظاہر کرو کہ اس سے زیادہ کریہہ المنظر عورت گویا تم نے دیکھی ہی نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد تم کو ایک امتحان کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ تمہاری رفیقۂ حیات اس کے حسن کو حسن ہی کہیں گی مگر تم پھر بھی نہ بھکنا۔ بلکہ اس قابلِ پرستش حسن سے اظہار تنفر ہی کرتے رہنا۔ گو تمہارا یہ ضعف بصر "تشویش انگیز" ضرور ہو گا۔ مگر یاد رکھو کہ ایک بیوی اسی قسم کے نابینا شوہر سے خوش رہ سکتی ہے جو صرف اس کے لئے "بینا" اور باقی تمام دُنیا کی عورتوں کیلئے آنکھ اور عقل دونوں کا اندھا ہو۔ اس مشورہ کو غیر اہم نہ سمجھو بلکہ باور کرو کہ اسی میں ازدواجی مسرتوں کا راز انگڑائیاں لے رہا ہے۔ یہ بات تمہارے لئے اس قدر مشکل بھی نہیں جس قدر عام قسم کے شوہروں کیلئے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ تمہاری سلمیٰ میری آنکھوں میں خاک تمہارے حسن نظر کی ایک زرّیں شعاع ہیں۔ جن کے مقابلہ میں تم کو تمام دُنیا کا حسن ماند نظر آنا بھی چاہیئے۔ البتہ یہ بات اُن کے لئے قابل تحسین ہو سکتی ہے جو اپنی کالی مائی کے مقابلہ میں وینس کے مجسمہ اور قلو پطرہ کے حسن کو بھی جاذب نظر نہیں سمجھتے۔

اچھا اب میں ایک نئے دولہا کی جوان امنگوں کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ البتہ یہ چاہتا ہوں کہ تم میرا چھٹا مشورہ بھی سُن لیتے تاکہ تم کو ایک خطرناک لغزش کا احساس ہو جاتا۔ بھائی بات یہ ہے کہ تم بھی آخر اُن ہی مردوں میں سے ایک ہو جو اپنی عقلمندی سے عورت کو ناقص العقل سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ مردوں کی تباہی کی اگر کوئی وجہ ہے تو وہ ان کا یہی احساس ہے کہ وہ بزعم خود نہایت عقلمند بنتے ہیں حالانکہ اگر عورت ناقص العقل ہے تو مرد ازلی طور پر یتیم العقل واقع ہوا ہے اور ناقص العقل اپنے اس یتیم العقل مرد کی اس حماقت مآبی کی بدولت عملی دُنیا میں مرد کو شکست پر شکست دے رہی ہے۔ اور وہ دن قریب ہے جب یہی ناقص العقل اس عقلِ کُل کو سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ دے گی۔ اور مرد مُنہ کھول کر رہ جائیگا کہ۔ ع ۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا !؟!

میرے عزیز دوست تم دُنیا کے تمام مردوں کو بیوقوف بننے دو مگر خود عقل سے کام لیکر عورت کو ہرگز ناقص العقل نہ سمجھو بلکہ یہ یاد رکھو کہ ایک معمولی سے معمولی عورت ایک شاطر سے شاطر مرد کو چرانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں دراصل وہ سیاسی بیداری اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے جو ہر عورت کو پیدائشی طور پر فطرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے گویا سیاسی طور پر ہر معمولی سے معمولی عورت بڑے سے بڑے قومی رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ تدبر کے سلسلے میں ہندوستان ایسے ملک کی عورتیں بھی مشاہیر برطانیہ کا درجہ رکھتی ہیں دوسرے ملک کی بیدار عورتوں کا تو کہنا ہی کیا۔ گو بظاہر یہ عورتیں نہایت معصوم اور نہایت بھولی بھالی نظر آتی ہیں مگر ان کے دل سے پوچھو کہ وہ مردوں کو کیا سمجھتی ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کی رائے مردوں کے متعلق یہ ہوسکتی ہے کہ یہ عورت اور گدھے کی درمیانی مخلوق ہے یعنی اگر مرد ذرا ترقی کرتا تو عورت بن سکتا تھا اور اگر ذرا تنزل کی طرف مائل ہوتا تو گدھا بن جاتا۔ بہرحال اب بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے تو انسان ہے مگر عقلی حیثیت سے اس میں اور گدھے میں امتیاز کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بہرحال میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بحیثیت ایک مرد کے جوانمردی کے ساتھ اپنی جنسی حماقت کا اعتراف کرتے رہنا اور اپنی رفیقۂ حیات کو ناقص العقل کہکر اس کا موقع نہ دو کہ وہ مدبرانہ طور پر بیوقوف بنکر تمہاری مفروضہ عقل کی لاٹھی سے تم ہی کو چرانا شروع کردیں۔ بھائی مجھ کو یعنی ع ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کہ میں نے چونکہ اپنے کو بحیثیت ایک مرد کے انسانیت سے بعید اور گدھوں سے متصل سمجھ رکھا ہے۔ لہٰذا تمہاری بھاوج کے کچھ نلائے نہیں بنتا۔ وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کو ناقص العقل سمجھوں۔ مگر میں اپنی حقیقت سے آشنا ہوں لہٰذا ان کی تمام اسکیم معرض التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی میری طرح عقل سے کام لیکر بیوقوف بنے رہوگے۔

اچھا اب مجھ کو صرف ایک بات کہنا ہے یعنی میرا یہ ساتواں مشورہ بالکل آخری ہے اور وہ یہ ہے کہ زن وشوہر کے تعلقات کو ہر نوع خوشگوار بنانا اور اس خوشگواری کو قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر مرد عورت کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے بجائے اپنے کو عورت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے تو زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور زیادہ مزے میں رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنی رفیقۂ حیات پر روٹی کپڑے کا دعویٰ کردو۔ بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خوب کماؤ اور خوب روپیہ پیدا کرو تاکہ تمہاری بیوی کی محبت اسی مناسبت سے ترقی کرے۔ مگر اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ اپنی بیوی کے حوالے کردو اور خود ان کے دست نگر بن کر رہو۔ پھر دیکھو کہ تم کو کیسا روحانی سکون اور کیسا قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ وہ خود تمہارے کپڑے بنوائیں گی تمہارے لئے جوتا خریدیں گی اور تمہارے لئے ٹائی اور کالر مہیا کریں گی۔ پھر یہ نہ ہوگا کہ وہ تمہاری ضروریات کی چیزوں کو غیرضروری سمجھیں اور اپنے متعلق اُن کو شکوہ پیدا ہو کہ تم کو ان کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ عقلمند قسم کے شوہر ایک حرکت اور بھی کرتے ہیں کہ اپنی آمدنی کا تین چوتھائی حصہ اپنی بیوی پر اپنی کل آمدنی ظاہر کرتے ہیں اور ایک چوتھائی حصہ دبا لیتے ہیں مگر میں تم کو اس کا مشورہ نہ دوں گا۔ اس لئے کہ ان ہی حرکتوں میں خود میں نے بہت سے شریف زادوں کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسرے یہ ترکیب ذرا خطرناک بھی ہوتی ہے اور وہ اس حیثیت سے کہ اگر کبھی یہ راز آپ کی رفیقۂ حیات پر کھل گیا تو پھر زندگی بھر وہ آپ کی کل آمدنی کو تین چوتھائی آمدنی سمجھ کر ایک چوتھائی کا آپ کو چور سمجھیں گی۔ خواہ آپ کیسے ہی ساہوکار کیوں نہ ہوں اور پھر اس کے نتائج آپ کو اس صورت میں بھگتنا پڑیں گے کہ وہ آپ کی کفالت کی طرف سے غافل ہوجائیں گی۔ اور خود آپ بھی اپنے کفیل نہ ہوسکیں گے۔ لہٰذا ان مالی معاملات میں بھی عافیت اسی میں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ ایک شوہر اپنی گھروالی کا دست نگر بن کر رہے۔

ان ساتوں مشوروں پر اگر تم نے عمل کیا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں کہ تم بحیثیت ایک شوہر کے خوش رہ سکو گے اور تمہاری

رفیقۂ حیات بھی تم سے اس قدر ناخوش نہ ہوں گی جس قدر ایک بیوی کو اپنے شوہر سے اصولاً اور اخلاقاً ناخوش رہنا چاہیئے۔
سلمیٰ کو سلام کہہ سکتے ہو مگر اس عبارت کا صحیح ترجمہ نہ سُنانا ورنہ وہ تمہارے متعلق کوئی اچھی رائے قایم نہ کرینگی۔
اور میرے متعلق تو شاید مغربی اخبارات میں یہ مضمون شائع کرادیں کہ اس شخص سے کوئی مغربی لڑکی شادی نہ کرے۔ گویا اس میں میرا اور تمہارا دونوں کا نقصان ہے اور بحصّۂ مساوی۔
اچھا اب جاؤ اور اس مضمون کا غلط ترجمہ اپنی سلمیٰ کو سُناؤ۔

تمہارا تجربہ کار دوست
شوکت تھانوی

ثروت آرا بیگم

(محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا ادبی شاہکار)

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں اور جن کے مضامین ملک کے وقیع رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، بالآخر اپنے ادبی ماحول کے پیہم اصرار اور تقاضات سے متاثر ہو کر اپنی ایک قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" کی اشاعت فرما رہی ہیں، جو اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے اور جس میں زندگی و سماج کی کامل اور صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ بعید از قیاس تصوریت (   ) اور گذری ہوئی شعریت سے قطع نظر کرکے ناول کے مقرر کردہ ماحول (   ) اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو مدنظر رکھا گیا ہے۔
یہ تو ہے بنیاد، لیکن جو زبان اس میں استعمال کی گئی ہے، وہ نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اس کو ممیز کرتی ہے اور اس کا ہر صفحہ شہادت دیتا ہے کہ یہ ایک عورت کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے، یہ بڑی تسکین وہ بات ہے کہ اسکے انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں ہے، بلکہ لہجہ، لفظی تراکیب، بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کی معیاری مدوجزر، یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ ناول کو شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا، یہی نہیں، بلکہ "ثروت آرا بیگم" اپنے صفحات میں ایک خاص کلچر، تہذیب اور "آفاقیت" رکھتی ہے۔ اس کو پڑھ کر دہلی کی لٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھنچ جاتا ہے، اور لسانی لحاظ سے دسیوں نئے محاورے جو دہلی کے مردوں میں نہیں بلکہ عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔
نہایت دلچسپ، عبرتناک اور مطالعہ کے قابل کتاب ہے، عنقریب شائع ہونے والی ہے۔
حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادر محترم آنریبل مسٹر فخرالدین علی احمد وزیر آسام کے نام معنون کیا ہے اور شروع میں ان کی تصویر بھی شریک کتاب کی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ
مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

"دیمک"

(فریدہ۔ مچھلی شہری)

بی۔اے کی ڈگری ....! آخر میں گریجویٹ ہو ہی گئی، اب دُنیا میری ٹھوکروں میں ہوگی، یورپ جاؤں گی، اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گی، بیرسٹری کی سند لاؤں گی اور اپنی قوم میں تہلکہ سا مچادوں گی۔ بار میں پہلی مسلمان لڑکی ہوں گی جس کی تقریریں ساری عدالت کو حیرت میں ڈال دیں گی۔ ہر طرف میری تعریفیں کی جائیں گی۔ میری شادی کے پیامات آئیں گے اور میں انھیں مزے لے لیکر ٹھکرادیا کروں گی۔ میرے والدین کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ ہوگا۔ وہ میرے سامنے نئے رنگروٹ آئی، سی، ایس سے لیکر حکومت ہند کے بڑے سے بڑے افسر اعلیٰ کی دزدیدہ نگاہیں لائیں گے۔ مگر میں ازدواجی بیڑیوں کو پہنکر اپنی آزادی کو کبھی خاک میں نہ ملاؤں گی، ہمیشہ اپنے دماغ و دل کو کنوارا ہی رکھوں گی.... ......لیجئے سفر ختم ہوا، شملہ پہونچ ہی گئی، سارا سفر سوچتے ہی گزرا۔ آخر کسی نتیجہ پر نہ پہونچنا تھا نہ پہونچی!........ وہ پاپا کھڑے ہیں، آج وہ بڑی چاہ سے مجھے چومیں گے۔ ان کی ننھی زہرہ آج اُنسے بی، اے ہو کر مل رہی ہے "بی بی" ہو کر نہیں۔ ہوا کیا بی، اے" آج کل "بی بی" کا پہلا زینہ ہے ....

....

میں رکشا پر آنکھیں بند کئے پڑی ہوں، مال روڈ کے بعد ہی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے، جھٹکا بار بار لگتا ہے۔ میں آنکھیں کھول دیتی ہوں .... صرف چند پیسوں کی خاطر قلی ہماری زندہ لاشوں کو آسمان پر لئے جا رہے ہیں۔ وہ ہانپ رہے ہیں اور پسینہ میں سر سے پیر تک بھیگے ہوئے ہیں، ان کے موٹے بازوؤں اور سخت پنڈلیوں کی مچھلیاں اُبھر رہی ہیں۔ چڑھائی سخت ہے اور وہ دھیرے دھیرے ہمیں کھینچے لئے جا رہے ہیں، اور میں اطمینان سے رکشا پر بیٹھی ہوئی اس نظّارہ کو دیکھ رہی ہوں .... انسان کس قدر خود غرض ہے اور کتنا ذلیل ہے! میں کانپ جاتی ہوں .... کیا صرف چند پیسوں کی نمائش کر کے سرمایہ، انسان سے اپنے ہی جیسے گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسانی ڈھانچوں سے چوپایوں کا کام لے سکتا ہے؟ کیا صرف تانبے کے چند سکّوں سے انسان کی شکتی مول لی جا سکتی ہے، کیا اپنے ہی جنس والوں سے خچّر اور گدھوں کا سا سلوک روا ہے؟ لیکن یہاں میں کسی قدر لاجواب بھی ہوتی ہوں...... ......اگر دُنیا میں سب برابر کی حیثیت اختیار کرلیں تو سب کا پیٹ کیسے بھرے؟ سب کی روٹیاں کیسے بنیں؟ امیر غریب سے درندوں کی طرح پیش آتا ہے، تو ان کا پیٹ بھی پالتا ہے، ان کے منجمد خون کو حرارت بھی تو پہنچاتا ہے؟ لیکن؟ .... اگر رکشا قلی ہماری سانس لیتی ہوئی لاشوں کو نہ لادیں اور نہ کھینچیں تو ان کو مزدوری کہاں اور کس طرح ملیگی؟ اور بھی تو مزدور ہیں، انھیں اگر ان کی جگہیں مل گئیں تو ان کا گزارا کیسے ہوگا؟ میرا دماغ جواب دیدیتا ہے، میں بہت پریشان ہو جاتی ہوں.......... چاہے میرے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے

مگر میں یہ کس طرح مان لوں کہ ہم تو محلوں میں سوئیں، مرغن غذائیں کھائیں، رات دن مسہری پر پڑے رہیں۔ صرف چند دستخطوں سے کام نکال لیں، اور ان بیچاروں کو جھونپڑیاں بھی میسر نہ ہوں، یہ نان و نمک سے بھی ترسیں۔ بلکہ جھپکا لینا بھی ان کے لئے ناممکن ہو، بیچارے تھوڑی سی مزدوری کی خاطر دن کو دن نہ جانیں اور رات کو رات نہ سمجھیں ....

....

کیسی چڑھائی ہے، اور میرا دماغ بی، اے کے منطقی لکچروں میں فیصلے تلاش کر رہا ہے، توبہ۔ کیسی الجھن ہے مجھے، بیچارے قلی جان دیئے دے رہے ہیں، ان کے قدم مشکل سے اُٹھ رہے ہیں۔ ان کے قدموں کی ایک ہلکی کپکپی، کسی کانٹے کی ایک ذراسی چبھن انھیں اور مجھے تحت الثریٰ کی آخری منزل میں پہنچا سکتی ہے، مگر ان کو میرے ہلکے بوجھ کا بھی احساس ہے۔ کیا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہیں، ان کے زخمی تلوے کنکروں پر ٹکڑ ٹکڑ کر پڑ رہے ہیں، مگر پھسلتے پھسلتے بھی اِن کے پنجے زمین کو پکڑ لیتے ہیں، کیا قیامت انگیز منظر ہے، رکشا ذراسا ہل بھی جاتا ہے، اور ان میں سے کوئی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے تو اُسے اپنی تکلیف کا خیال نہیں ہوتا ہے، وہ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتا ہے کہ پیسہ والی میم صاحب کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔

میں اُدھر سے نظر ہٹاتی ہوں، اور دائیں بائیں ہو کر دیکھتی ہوں تو بوجھ تلے دبے ہوئے قلی نظر آتے ہیں، اِن کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے، رکشا قلی تو چار کی تعداد میں میری ایسی نازک عورت کو کھینچ رہے ہیں، مگر ان قلیوں میں سے ہر ایک کے کاندھے پر چار من سے کم بوجھ نہیں ہے، بڑے بڑے وزنی بکس، لمبے لمبے بھاری بھاری جاڑے کے بستر جنھیں گھر سے روانہ ہوتے وقت چار چار پانچ پانچ نوکروں نے مل کر اٹھایا تھا، وہ اکیلے اُٹھائے ہوئے ہیں، بیچاروں کو سستانے کا بھی موقع نہیں ملتا، وہ ذرا بھی رکتے اور دم لینا چاہتے ہیں تو ہمارا بیرا پیچھے سے ڈانٹ بتاتا ہے اور بیچارے پھر اسی ثابت قدمی سے روانہ ہو جاتے ہیں، میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں، دور میرے پاپا اپنی رکشا پر کھنچے آ رہے ہیں۔ میں نے کھیتوں پر چرسے کی رہٹ چلتے دیکھی ہے، اور پھر چرسے کا ڈول پانی سے نکلتے بھی دیکھا ہے۔ ویسا ہی منظر ہے اور وہی سماں میرا دل اب دھڑکنے لگا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اختلاج کا قدیم مرض نہ شروع ہو جائے ....

پاپا کے رکشا کے آگے ایک نوجوان قلی بہت زیادہ سامان لادے رینگتا ہوا چپ چاپ چلا آ رہا ہے۔ دور سے اسکی حالت ظاہر ہو رہی ہے، دُبلا پتلا، زرد چیتھڑوں میں ملبوس، میں حیران ہوں کہ دوسرے پہاڑی قلیوں کے برعکس یہ تو نہایت نازک سا ہے، پھر اس قدر بوجھ؟ توبہ! بھئی توبہ۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ دم لینا چاہتا ہے، مگر میرا بیرا اُسے ڈانٹتا ہے، وہ آخر کھڑا ہو ہی گیا۔ بیچارہ بہت تھک گیا ہے، بیرا اُسے ٹھوکر مارتا ہے، غریب گر پڑتا ہے، سامان بکھر جاتا ہے، بکس تیلی تیلی نالیوں میں جا پڑتے ہیں، بستر دور ڈھلکتا ہوا جا پڑتا ہے۔

بیرا کو اُسے زمین پر سے اُٹھانا چاہئے، معافی مانگنی چاہئے، مگر وہ اُسے نہیں اٹھاتا، وہ اُس سے معافی نہیں مانگتا، اُلٹے جوتا، لات، اور گھونسوں سے بیچارے کو ادھ موا کئے دیتا ہے۔ مجھ سے نہیں رہا جاتا، میں چیختی ہوں۔ میں بیرا کو ڈانٹتی ہوں، اُسے روکنا چاہتی ہوں، مگر وہ میری ایک نہیں سُنتا، میں رکشا سے کود پڑتی ہوں، میرے پاپا کا رکشا بھی قریب آ جاتا ہے، میں انھیں مُسکراتے دیکھتی ہوں، مجھے غصّہ آ جاتا ہے، میں قلی کی طرف بڑھتی ہوں، پاپا مجھے روکتے ہیں، میں قلی کو کراہتے سُنتی ہوں، اور پاپا سے کترا کر نکل جانا چاہتی ہوں، پاپا کہتے ہیں: "پاگل ہوئی ہے زہرا! جا اپنے رکشا پر بیٹھ، بیرا انھیں حفاظت سے لے آئیگا، بکسوں میں کوئی ٹوٹنے والی چیز تھی کیا!" وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے بکسوں کے گرنے سے جو نقصان ہوا ہے اُس کی پریشانی ہے، میں سخت لہجہ میں کہتی ہوں: "پاپا بیرا غریب قلی کو برابر پیٹے جا رہا ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ وہ مر جائیگا" پاپا میری طرف حیرت سے دیکھتے ہیں اور میں آگے بڑھ جاتی ہوں، بیرا الگ کھڑا ہو جاتا ہے اور ہانپتے ہوئے کہتا ہے۔

"چھوٹی بیگم، کیا فرما رہی ہیں آپ؟ یہ بڑے شیطان ہوتے ہیں، ستیاناس کر دیا سب، کہہ دیا تھا بدمعاش سے کہ سنبھل کر چل، مگر دم تو

ہے نہیں، بڑا قلی بنا ہے۔" پھر قلی سے کہتا ہے۔ "ابے! جب تیری سانس ہی ٹھیک نہیں چلتی تو تو نے ان بکسوں کو کیوں لادا، دیکھ نہ لیا تھا پہلے"

"بکواس مت کرو!" "میں بیرا کو ڈانٹتی ہوں، وہ خاموش ہو جاتا ہے، میں قلی کی طرف توجہ کرتی ہوں، بہت دُبلا ہے اور کتنا کمزور، رنگ و روپ سب سرمایہ نے دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ میں گھٹنے ٹیک کر اس کی نبض دیکھتی ہوں، نبض اتنی سست ہے کہ مجھے پریشانی ہوتی ہے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے ہیں، ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ ابھی تک بیہوش ہے، زخمی بھی اچھی طرح ہوا ہے، گھٹنا چھل گیا ہے، سر پھٹ گیا ہے، تلوے بھی کنکروں نے اچھی طرح چھید دئے ہیں، اور ان میں متعدد چھوٹے چھوٹے سوئی کی نوک کے برابر سوراخ ہیں، میں بیرا کو بھیج کر سامنے موچی کی دوکان سے پانی منگاتی ہوں، بیرا کی پگڑی اُس سے زبردستی لے لیتی ہوں، اس کی چھوٹی چھوٹی پٹیاں بناتی ہوں، زخموں کو دھوتی ہوں، صاف کرتی ہوں، پھر پٹیاں باندھ دیتی ہوں، اب مجھے اسے ہوش میں لانے کی فکر ہوتی ہے، پاپا سامنے کھڑے ہیں۔ اور میری دیوانگی کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ میں اسے ہسپتال لیجاؤں گی، وہ خفا ہو کر مجھ سے کہتے ہیں۔

"پگلی! تیرے ہسپتال جانے کی کیا ضرورت ہے، بیرا لیجا سکتا ہے، چل گھر چل بھوک لگی ہے بھائی بہن سب تیرا انتظار کر رہے ہونگے۔"

میرا دل چیخ اٹھتا ہے، ایسے وقت میں بھی، ایک نیم مردہ غریب آدمی کے سامنے بھی ہم اپنے عیش اور اپنے آرام کو نہیں بھولتے غریب مرتا ہے تو مر جائے، .... میں نہایت غصہ میں اور غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ پاپا سے سخت کلام ہو کر کہتی ہوں،۔

"پاپا یہ کیا اندھیر ہے؟ اِس کی جان جا رہی ہے، یہ مر رہا ہے، اور آپ کو بھوک کی پڑی ہے، بھوک کا اس موقع پر کیا سوال؟ آپ کو کھانے میں معمول سے ذرا دیر ہو جانے پر تکلیف ہوتی ہے اور اس دل ہلا دینے والی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، جو ہم سب اپنی آنکھوں سے اس قلی میں تڑپتی دیکھ رہے ہیں"..........

وقت کم ہے اور حادثہ اہم، میں پاپا کے جواب کا انتظار نہیں کرتی ہوں، اور انھیں اس کا موقع ہی نہیں دیتی ہوں کہ وہ صفائی پیش کریں رکشا والوں کو پکارتی ہوں، اپنی رکشا پر قلی کو لٹاتی ہوں، اور ہسپتال بھاگتی ہوئی جاتی ہوں، ہسپتال میں خاطر خواہ انتظام ہو جاتا ہے، مرہم پٹی کے بعد وہ ہوش میں بھی آجاتا ہے، میں اُس سے گھر کا پتہ پوچھتی ہوں اور ہسپتال سے واپس چلی آتی ہوں۔

۱۷۳

....

قلی کا گھر! قلی ہی کا گھر ہے۔ مچھلی بازار ایسی گندی جگہ، پھر ایک نہایت چھوٹی سی بوسیدہ کوٹھری، جس کے چاروں طرف تعفّن، یہاں بھی آدمی زندہ رہ سکتے ہیں؟ دروازہ کھلا ملتا ہے، اور میں کوٹھری کے اندر دو تین مرتبہ کھٹکھٹا کر داخل ہو جاتی ہوں۔ کوئی جواب نہیں، کوٹھری میں کوئی نظر نہیں آتا، ایک گوشہ میں ایک میلی چکٹی ہوئی توشک بچھی ہے، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ مگر؟ نہیں، کوٹھری خالی نہیں ہے، دیوار سے سہارا لگائے توشک پر بیٹھی ہوئی ایک مورت نظر آتی ہے، مورت اس لئے کہ اس مورت کی آنکھیں بھی بند ہیں، یہی اُس کی اندھی ماں ہوگی، میں پوچھتی ہوں ......"کیا آپ ہی چندر کی ماں ہیں"......... وہ جواب نہیں دیتیں۔ میں غلط جگہ آگئی، یہ چندر کی ماں نہیں ہوں گی پھٹی ہوئی دوسوتی میں لپٹی لپٹائی چندر کی اندھی بڑھی ماں ٹھنڈی برف میں بجھی ہوئی دیوار سے کس طرح ٹیک لگا سکتی ہے۔ میں پھر آواز دیتی ہوں، پھر جواب نہیں ملتا، غریب ہیں، لاچار ہیں، بڑھی ہیں، اندھی ہیں، ممکن ہے بہری بھی ہوں، میں واپس ہونا چاہتی ہوں، ایک اور جوان لڑکی کوٹھری میں داخل ہوتی ہے، میں اُسے ہکا بکا ہو کر دیکھتی ہوں، آنے والی گھبرا جاتی ہے، اور ہاتھ سے کوئی چیز گرا دیتی ہے تیل! کڑوا تیل! بھاجی پکانے کے لئے لائی ہوگی، معلوم ہوتا ہے کہ یہی بہن ہے، میں معذرت کرنا چاہتی ہوں، اپنی موجودگی کی وجہ سمجھانا چاہتی ہوں، اجنبیت کی وحشت اس کے دل سے دور کرنا چاہتی ہوں، مگر وہ زمین سے تیل کو اپنی ہتھیلی میں کانچھ رہی ہے۔ میں کہتی ہوں،"

"بہن مجھے افسوس ہے، میں تمہیں تیل دلادوں گی، یہ اب گر گیا تو گر گیا، جانے بھی دو۔"

.... وہ جواب نہیں دیتی، میری "اجنبیت" بھی اُسے نہیں کھٹکتی۔ کیا میں اجنبی نہیں ہوں، ممکن ہے اس گھرانے کو مدد دینے والے لوگ برابر یہاں آتے رہتے ہوں۔ پنجاب میں بھکشا پر ایمان رکھنے والی عورتیں بہت ہوتی ہیں، میں پریشان ہوکر پوچھتی ہوں۔

"تم چندر کی بہن ہو؟ اور یہ تمہاری ماں ہیں؟"

......چندر! وہ نام سُنکر چونک جاتی ہے، اور گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے آپ چندر کو جانتی ہیں، مگر چندر کسی بھیک دینے والے کو نہیں جانتا، اُسے نہیں معلوم کہ ہم آپ لوگوں سے بھیک لے لیتے ہیں۔ آپ ہیں کون؟ اس محلہ میں تو آپ کو کبھی نہیں دیکھا، دیکھئے گھبرا کر میں نے تیل گرا دیا، ماں کے بدن کی مالش کرتی تھی، اب تو بیچاری اُٹھنے، بیٹھنے، سُننے، دیکھنے سب سے محتاج ہوگئیں، دماغ بھی گم سم رہنے لگا، ایک بھیا کا دم ہے۔ بس........

"مگر....... !" میں بات کاٹتی ہوں، دکھیوں کو ہر ایک ہی فرشتہ نظر آتا ہے، اور فرشتے کے سامنے ساری کتھا بیان کردینے کو جی بھی چاہتا ہے، میں سُننا ضرور چاہتی ہوں، مگر چندر کے حادثہ کی خبر بھی دینی ہے۔ میں آخر کہتی ہوں، شروع سے آخر تک بتا دیتی ہوں مجھے حیرت ہوتی ہے، بہن ایک لفظ نہیں کہتی، کچھ بھی نہیں بولتی۔ میں اُسے گلے لگانا چاہتی ہوں، وہ روتی ہے، آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں، مگر یہ صاف آسمان کی بوندیں ہیں، ان میں بھی کوئی آواز نہیں، میں اطمینان دلاکر کوٹھی کو واپس جانا چاہتی ہوں، وہ میری ساری کا پلو پکڑ لیتی ہے۔ "مجھے ہسپتال لے چلئے۔" میں سمجھاتی ہوں کہ شام کو میرا نوکر رکشا لیکر آئے گا اور اُسے ہسپتال لیجائیگا، بڑی صابر اور مہذب لڑکی ہے، چپ ہو جاتی ہے۔

....

اس مرتبہ شملہ میں اس گھرانے کے سوا میرا دل کہیں نہیں لگتا، میں بدنام ہو رہی ہوں، میں جانتی ہوں، میرے پاپا بھی ناراض ہیں کہ میں تلی اور وہ بھی ہندو کے گھر جاتی ہوں، ان کی پوزیشن گر رہی ہے، دوستوں میں، عزیزوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی، مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں لندن جانے کی تیاریاں شروع کردوں، مطلب یہ ہے کہ میں چندر، اُس کی ماں، اور اس کی بہن سے نہ ملوں۔ کیوں نہ ملوں؟ دوستی میں بھی امیر و غریب کا فرق ہوتا ہے، چندر کی بہن میری تمام سہیلیوں سے بہتر ہے، بی، اے نہیں ہے نہ سہی، سمجھدار تو ہے، کون بات نہیں جانتی، ہندوستانی پڑھ لکھ لیتی ہے۔ بی، اے کی ڈگری اس نے نہ لی تو اس کا قصور؟ اُسے کوئی پڑھائے وہ اب بھی پڑھے گی۔ رہا چندر اس غریب کو مزدوری سے چھٹی کہاں ملتی ہے، یوں پڑھا لکھا وہ بھی ہے۔ ایف، اے فیل سہی مگر اُس سے کم لیاقت کے لوگ حکومت ہند کے دفاتر کی بیشتر ڈبل اسپرنگ کی کرسیوں پر رونق افروز ہیں، یہ اس غریب کی قسمت ہے، اور سرمایہ کی کار فرمائیاں ہیں کہ اُس نے جب بھی نوکری کی، افسر اعلیٰ کے کسی رشتہ دار نے اُسی سال بی، اے کیا اور اس کی جگہ تخفیف میں آگئی۔ مجھے اس کی محنت اور مزدوری اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کام کیسا بھی ہو کام ہے، اور زندگی نام ہی ہے جد و جہد کا، جو جتنی جد و جہد کرتا ہے اتنا ہی دُنیا پر اس کا حق ہوتا ہے، رہا اس کا ہندو ہونا، تو میری سمجھ سے یہ بات باہر ہے، ہندو مُسلمان کا جھگڑا میرے کبھی بھی سمجھ میں نہ آیا، میں بچہ تھی تو مشن میں تعلیم پائی، اور عیسائی دوست ملے، اسکول اور کالج میں ہندو دوست ہوئے تو پھر میں کسی کے ہندو ہونے سے کیوں اپنے دل پر پتھر باندھوں۔ ہندو مسلمان سب ایک ہی دھرتی کے ماں جائے ہیں، پھر ان میں ایسا بیر، ایسی نفرت، بڑی ذلیل بات ہے۔

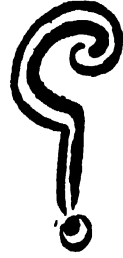
....

میرے پاپا میرے بی، اے پاس ہونے سے بھی خوش نہیں معلوم ہوتے، انھوں نے میری چھوٹی بہن کو پردہ میں بٹھا دیا کیوں؟

میں سمجھتی ہوں کہ وہ چندر کے گھرانے سے میرے تعلقات کو میری جنسی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، انھیں رنج ہے کہ اس شہرت کے بعد کوئی آئی سی ایس داماد نہ ملے گا۔ گویا کہ مجھے تعلیم صرف اس لئے دی گئی کہ ایک آئی سی ایس داماد کے معاوضہ میں میری ستھری جوانی اور متاعِ آزادی بیچی جاسکے، میں حیران ہوتی ہوں، سوچنے کی کوشش کرتی ہوں، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، جنسی آزادی ہے جنسی آزادی کیا بلا ہے۔ شادی نہ کرنا اگر جنسی آزادی ہے تو میرے ماموں جان کو لوگ بُرا کیوں نہیں کہتے۔ انھوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی، اور ہزاروں اُن کے مُرید ہوتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتی کہ پھر میں شادی کیوں کروں۔ میں پاپا سے کہتی ہوں تو وہ فرماتے ہیں "بیٹی! یہ میرا ہی قصور ہے کہ تو اس طرح بے حیائی کی باتیں کرتی ہیں"۔ پھر بھی وہ مجھے لندن بھیجنا چاہتے ہیں۔

مگر میں ابھی لندن نہیں جانا چاہتی، میں نے اپنا مستقبل طے کرلیا ہے، میں اپنی ساری زندگی قلیوں کی، ماؤں، بہنوں کی سیوا میں گزاردوں گی، میں اس کے لئے بڑی سے بڑی جنگ کے لئے تیار ہوں، میں ملک میں ہر طرف شور مچادوں گی، میں آج ہی چندر سے کہتی ہوں کہ تمام قلیوں میں ایک "یونین" بنانے کی تحریک پھیلائے، کل ہی جلسہ ہونا چاہیے، میں خود تقریر کروں گی، چندر کی بہن شرماتی ضرور ہے، مگر میں اُسے بھی تیار کردوں گی، چندر کی ماں کو اسٹیج پر بٹھاؤں گی تاکہ سب دیکھیں، کہ چوبیس گھنٹہ بوجھ ڈھونے والے قلیوں کے گھروالوں کو کونسی دیمک چاٹ رہی ہے..........؟



(حضرتِ جگر مرادآبادی)

بے کیف ہے مئے ناب ہے، معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے، معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و اصرار
وہ جُرعہ بھی زہراب ہے، معلوم نہیں کیوں

دیپک

(برادرم ساغر کی ایک لاجواب نظم "دیپک" سے متاثر ہو کر)

(اعظم کریوی)

دیپک سچ بتا تجھے کس کی تلاش ہے ؟ تیری روشنی کا کیا مطلب ہے ؟

تم ضرور کسی رات بھر جاگنے والے عبادت گزار یا کسی برہ کے مارے شکستہ دل پریمی کی آنکھیں ہو۔

میں نے باغ میں جا کر دیکھا کہ پھول اپنی خوشبو سے کسی کا استقبال کر رہا ہے۔ درختوں میں چھپی ہوئی کوئل پنچم سُر میں کسی کو پکار رہی ہے اور اب مجھے نظر آ رہا ہے کہ گھر کے اندھیرے کونے میں دیپک کسی کو ڈھونڈھ رہا ہے۔

دیپک نے صرف تیاگ کے لئے جنم لیا۔ خود جل کر سنسار کو روشن کرتا ہے۔

دیپک تیاگ کی مورت ہے۔ تمام پتنگے اس کے پاس تیاگ کا سبق پڑھتے ہیں۔

پریتم ! صرف ہم اور تم ہی اس دُنیا میں دکھی نہیں ہیں۔ دیکھو نا دل میں محبّت کی آگ رکھنے سے بیچارے مٹّی کے دیپک کو بھی جلنا پڑ رہا ہے۔

دن کی روشنی غائب ہو جانے پر دیپک اندھیرے میں روشنی کی لاج رکھتا ہے اور جب صبح ہوتے ہی روشنی کا راج ہوتا ہے تو دیپک ہنستا ہوا روشنی کی گود میں اپنا دم توڑ دیتا ہے۔

اے دل ! اگر تو یونہی رہ رہ کر بُجھتا رہے گا تو کسی کو کیونکر پائے گا ؟ برہ کی آگ میں جلنے کا جو مزہ ہے وہ اِس بے زبان جلنے والے دیپک سے پوچھ لے !

یہ لگن کی جوت ہے یا پریم کا گیت ؟ آہا یہ مٹی کا دیپک بھی کتنی لاجواب شاعری کر رہا ہے۔ !؟

(تیاگ بھومی)

ڈاکٹر اعظم کریوی

جوار بھاٹا

سید فرید جعفری مچھلی شہری



"پرکاش! روٹی تو کھالو پیارے!"

سرلا نے اپنے مخصوص رسیلے لہجہ میں کہا لیکن اس کا پران پتی بدستور، کھمبے سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔

پرکاش! تم روٹی کیوں نہیں کھاتے؟" جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سرلا دوبارہ بولی۔

"سرلا! تم نے روٹی کھائی ہے؟"

فرض کرلو میں نے نہیں کھائی تو کیا ہوا؟

پریم نے دال کا پانی پیا ہے؟

. . . .

شاما کو چھٹانک بھر دودھ بھی تم نے دیا ہے۔

مگر!

سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم نازک ہو۔ استری ہو۔ میرے لئے مری جاتی ہو تین روز سے فاقہ ہے۔ خود منہ میں دانہ نہیں ڈالا اور مجھ سے اصرار کرتی ہو کہ روٹی کھالوں۔ پریم ننھا سا بچہ ہے "پتا جی! پتا جی!" کہتے اس کا منہ سوکھتا ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ہفتہ بھر سے پھنک رہا ہے۔ ڈری ہڈی دیکھ لو۔ دوا دارو درکنار دال کا پانی بھی غریب کے منہ میں نہیں پڑا۔ شاما بیچاری ننھی سی جان سال بھر بھی تو اسکے پورے نہیں ہوئے۔ تم یوں ہی سو کھ رہی ہو۔ گیتا کا چھٹانک بھر دودھ بھی اسکے لئے مہیا نہیں کر سکتے۔ دروازہ میں لگا گھنٹہ بھر اُس کو بلکتا سنتا رہا۔ پھر روٹی کھالوں۔ بیوی مُرجھا رہی ہے۔ لڑکا مر رہا ہے۔ بچی کوئی دن کی مہمان ہے اور میں روٹی کھالوں۔ روٹی؟ کیسی روٹی سرلا! گھر میں ٹکڑا نہیں۔ دانہ نہیں۔ کہاں سے روٹی آئی۔ کیوں چھل دیتی ہو پیاری؟

پرکاش! میری آس تم سے ہے۔ بچے گھر کے چراغ ہیں۔ تمہارے ہیں۔ بجھتے بجھتے بجھ جائینگے۔ تم میرا خزانہ ہو۔ میری دولت ہو۔ پیارے تم میرے دیوتا ہو۔ تمہیں کیسے کھو دوں؟ مگر پرکاش! بھگوان بڑا دیالو ہے۔ بڑا بھاگیہ ہے۔ پریم بیچارے کو تو آج چار دن سے سدھ نہیں۔ آنکھ تک نہیں کھولی ہے۔ شاما البتہ چراغ جلے سے فساد کرنے لگی۔ بلکتے بلکتے ابھی سوئی ہے۔ سوئی بھی کیا ہوگی۔ آنکھیں بند کرلی ہیں۔ دھان پان تو پیدا ہی ہوئی تھی۔ پھر ایک قطرہ دودھ بھی نہ ملے تو تم ہی سوچو کہ غریب کس حال میں ہوگی۔ میں بہت روئی اور جب رویا بھی نہ گیا تو سیٹھ جی کا نوکر آیا اور روٹی دے گیا۔

سیٹھ جی کا آدمی روٹی دے گیا۔ کیسی باتیں کرتی ہو سرلا؟

ہاں وہ محل ہی کا آدمی تھا پرکاش! کہتا تھا کہ آج بہو رانی سسرال سے آئی ہیں۔ ان کے آنے کی خوشی میں سیٹھانی نے بھوجن بانٹا ہے محلہ کے گھر گھر بٹا ہے۔ ہمیں بھی بھیجا ہے۔ پھر میں نے لے لیا۔ میں تو اسے کنہیا جی کی دین سمجھتی ہوں۔ بھگوان نے بڑا رحم کیا۔ اس میں دال بھی تھی پرکاش

177

میں نے اُسے ہانڈی میں چڑھا کر پتلا کر لیا اور اس کا پانی پریم کو پلا دیا۔ دودھ بھی تھا ایک پیالے میں۔ اب گائے کا ہو یا بھینس کا لیکن میں نے شاما کو دو گھونٹ پلا ہی دیئے۔ تبھی تو بیچاری نے ابھی ابھی آنکھیں بند کی ہیں۔ میں تو بڑی آس سے تمہارا انتظار کر رہی تھی پر کاش! اب تم بھی کھا لو تو مجھے شانتی ہو۔ صبح کے گئے دس بجے رات کو آئے ہو۔ نہ معلوم کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائی ہونگی۔ تم روٹی کھا لو اور لیٹ رہو تو میں تمہارے پیر داب دوں۔ تم تھک گئے ہوگے۔ صبح پھر تمہیں کام کی تلاش میں جانا ہے؟ مِل کی اسٹرائک کے ختم ہونے کے تو ابھی کوئی آثار نہیں۔

سرلا! مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ ہاں رحم میری جان! کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ ہم غریب ہیں پھر بھی خوددار ہیں۔ فاقے کرتے ہیں پھر بھی آن رکھتے ہیں۔ رسی جل گئی پر بل نہیں گئے سرلا! ہم سسکتے سسکتے مر جائیں گے۔ لیکن ان امیروں کا کھانا نہیں کھائینگے۔ محنت مزدوری کر کے دو پیسے کے چنے چبا لیں گے۔ لیکن ان کا دلیا نہ قبول کریں گے یہ سیٹھانی جی ہی تو تھیں جنہوں نے ذرا سا چراغ مانگنے پر دھتکار دیا تھا پریم اندھیرے میں گھبراتا تھا تو میں نے تمہیں بھیجا کہ محل سے ایک چراغ مانگ لاؤ۔ یاد ہے تمہیں کہ تم کس طرح دھتکاری گئی تھیں؟ آج اُسی محل سے کھانا آتا ہے۔ خیرات بانٹی جاتی ہے اور سرلا تم میری بیوی ہو کر اُسے قبول کر لیتی ہو۔ میرا رہا سہا سہارا بھی ٹوٹا جا رہا ہے سرلا؟

"پیارے تم سچ کہتے ہو مگر لڑکے کو اپنی آنکھوں کے سامنے آخری سانس لیتے دیکھوں اور کیسے نہ اُف کروں؟ بچی میری گود میں بلکے اور میں کیسے نہ گھبراؤں؟ میرا سرتاج میرے سامنے تڑپے اور میں کیسے نہ چیخوں؟ پر کاش! کیسی خودداری؟ کہاں کی آن؟ یہ دُنیا کی باتیں ہیں پیارے! "جیو ہے تو جہان ہے"۔ میں اپنے بچوں کے لئے بھیک مانگوں گی کوئی کام تمہیں نہ مِلا تو راہِ خدا میں ٹکے بھی قبول کر لوں گی۔ تمہاری خاطر۔ تمہاری سیوا کے لئے میں کیا نہیں کر سکتی پر کاش! میں عورت ہوں۔ نیچا ہونا میری فطرت نہیں۔ مگر عورت اپنے پتی کو کراہتے نہیں سُن سکتی اپنے بچوں کے درد کی ٹیس محسوس کر کے نہیں شانت رہ سکتی ——
روٹی تو کھا لو اب؟

ہاں سرلا۔ روٹی کھاؤں گا۔ لیکن آج نہیں۔ چندر ما کی اس راجدھانی میں نہیں۔ سرمایہ داروں کے سایہ تلے نہیں۔ اب ہم روٹی تبھی کھائینگے جب یہ سیٹھ اور یہ سیٹھانی ہمارے دروازے پر ایڑیاں رگڑتے ہوں گے جب ہم مزدوروں کا راج ہوگا جب یہ مِل ہمارے پورے قبضہ میں ہوں گے اُس وقت میری جان ہم روٹی خوشی سے کھائینگے۔ بھگوان کی یہ راجدھانی ہمارے لئے نہیں ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ گوکل سے نئی فوج بڑے ساز و سامان سے آ رہی ہے۔ پھر عیش ہی عیش ہوں گے۔ اس آسمان کے نیچے روٹی کھا لو۔ جہاں پریم ایسا بچہ دم توڑ رہا ہے جہاں شاما ایسی گڑیا ایڑیاں رگڑ کر بھی جان نہیں دے سکتی۔ جہاں سرلا تمہاری ایسی دیوی کو بھی پناہ نہیں۔ روٹی کھا لیں؟ کیسے کھا لیں؟ خیرات کی روٹی ہاں کیسے کھا لیں؟ سیٹھ جی کے یہاں باجے بج رہے ہیں۔ چاندی سونے کے برتن کھنک رہے ہیں۔ روشنی سے سارا محل جگ مگ کر رہا ہے۔ دیکھو مٹھو وہ گولے چھوٹ رہے ہیں۔ کھانے نالیوں میں بہ رہے ہیں۔ ان کی لڑکی سسرال سے آئی ہے۔ یہ اس کی خوشی ہے۔ یہ کھانا اس کی خوشی میں بنٹا ہے۔ ہم کیوں یہ کھانا کھائیں۔ محل سے اس سے پہلے تو ہماری خبر نہ لی گئی تھی جب پریم آنکھیں کھول سکتا تھا۔ جب وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ مرتے مرتے ہماری تسلی کر سکتا تھا۔ شاما اپنی توتلی زبان سے "ماں" پکار کر ہمیں خوش کر سکتی تھی۔ سرلا! آج سیٹھانی جی ایک ناچنے والی بازاری بیسوا کو ہزاروں دیدینگی مگر ایک شریف اور معصوم بچی کو اس سے پہلے ایک چھٹانک دودھ بھی نہیں دے سکتی تھیں؟ پریم کے گھبرائے ہوئے دل کو تسکین دینے کے لئے ایک مٹی کا دیا نہیں بھیج سکتی تھیں؟ ان سے کیا چھپا ہے وہ کیا نہیں جانتیں۔ مگر وہ لکشمی ہیں۔ ہم غریب مزدور ہیں ان کو ہماری فکر کیوں ہو۔ یہ سرمایہ دار جونک ہیں جونک۔ سرلا روٹی نہیں کھاؤں گا نہ تمہیں کھانے دونگا۔ کل صبح ایک طرف محل سے دُلہن کی سواری سسرال جائیگی۔ شادیانے بجیں گے۔ رنگ برنگ کے کپڑوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارے گا۔ دوسری طرف ایک مزدور کے کھنڈر سے دو معصوم مجسمے گوکل کو جائیں گے۔ ان کے ساتھ آنسوؤں کے چلتے بھاگتے پھول ہوں گے۔ اور چپکتی ہوئی گزی گاڑھے کی جھالریں! اب روتی ہو تم سرلا؟ کیوں روتی ہو؟ ابھی سے کیوں روتی ہو؟ رو لینا جب وقت آئے گا۔ چیخ لینا جب ضرورت ہوگی۔ اس وقت ہماری،

فریادیں زمین و آسمان کو ہلا دیں گی۔ ان معصوموں کی لاشوں پر آگ بھی
چنگاریوں کی بارش کیسی؟

"بھگوان! دیا کر! میرے دیوتا پر کرپا کر! انہیں شانتی دے! بھگوان
میرا سرتاج پاگل ہو گیا۔ اب میں کیا کروں گی بھگوان!" ....

"سرلا کیا کہہ رہی ہو۔ گھبراؤ نہیں دھیرج رکھو۔ میں سچ کہتا ہوں سرلا
سیدھا لٹا دو اب ان بچّوں کو۔ یہ اب ہمارے نہیں ہیں۔ ان کی معصوم
روحیں بھگوان کے پاس ہماری بپتا سنانے جا چکیں۔ دیکھو کیسے برف
ہو رہے ہیں یہ؟

"بھگ ...... وا ...... ن ...... مے ...... میرے
...... بچے ...... بھگ ...... وان!

(۲)

سیٹھ نانک چند کے محل سے دُلہن کا جلوس نکلا ہے۔ صبح ہوتے
ہوتے سارے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ ایک طرف "آنند بھون" کے
فلک پیما دروازے سے بینڈ والے ہوشربا ترانے گاتے گزرے۔ ان کے
پیچھے سپاہیوں کا دستہ۔ پھر بہورانی ڈولے میں سوار۔ چار طرف زرق
برق کپڑوں میں ملبوس ملازمین ساتھ۔ دوسری طرف ماتا پتا کے کاندھوں
پر پڑی ہوئی ایک ٹوٹی سی کھاٹ پر لیٹے دو معصوم دائمی نیند میں بیہوش
گھاٹ کی طرف چلے۔ ان کے آگے پیچھے آنسوؤں کی "پھلجھڑی" چھوٹ
رہی تھی۔ ٹانگیں سکی ہوئی چادر میں سے نکلی پڑی تھیں۔ چہرہ پر مکھیوں
کی فوج تھی۔ ایک طرف شہنائی بج رہی تھی۔ دوسری طرف "رام نام ست ہے"
کی آواز سے فضا تھرا رہی تھی۔ بہو رانی کے جلوس میں آدھا شہر ہو گا۔
لیکن ان معصوموں کو سہارا دینے کے لئے بھی کوئی نہ تھا۔

لاشیں گھاٹ پر پہنچ گئیں مگر مہا بامن دیوتا مفت کریا کرم پر
راضی نہ ہوئے گھی کا پیپا نہ سہی لکڑیاں ہونی چاہئیں تھیں۔ مگر فاقہ زدہ
ماتا اور پتا کے پاس "دو پیسے" بھی تو نہ تھے۔ ہاتھ جوڑے پیروں میں گرے
منتیں کیں خوشامدیں کیں۔ مگر گھاٹ کا "بے بگڑی کا راجہ" ٹس سے مس
نہ ہوا۔ غریبوں کے کریا کرم کے لئے گھاٹ کے زمیندار کے دئے پیسے
اُس نے کب کے ہضم کر لئے تھے۔ سرلا سچ مچ کی پاگل ہو گئی تھی وہ ایسے
موقع پر کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر پرکاش کا دل پتھر کا تھا۔ زمانہ کی چوٹیں
سہتے سہتے وہ سخت ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ خوشامد نہ کی گئی۔ اس نے
ذرا خونخوار آنکھیں نکالکر سرلا سے کہا "چلو کھاٹ اُٹھاؤ۔ یہ دیوتا
مہاراج ہمارے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ ہم آپ بندوبست کر لیں گے" سرلا سے
نہ کچھ کہا گیا۔ نہ کچھ پوچھا گیا۔ اس کے ہوش و حواس ہی کہاں درست تھے!
چون وچرا نہ کی۔ ایک نے "پائینتی" کو اُٹھایا ایک نے "سرہانا" اور دونوں
کھاٹ کو دریا کی طرف لے چلے۔ وہاں عجیب منظر تھا۔ ہر طرف لاشوں
کے جلنے کے نشانات تھے۔ کہیں لکڑیاں تھیں۔ کہیں ادھ جلی ہڈیاں
کہیں صرف جھلسی ہوئی چتا۔ چراہند دماغ کو اچھی طرح مسموم کر رہی تھی۔
گدھوں اور کوّوں کا غول سارے شمسان پر چھایا ہوا تھا۔ سرلا کی
دُکھی ماتا ان چیزوں کو کس طرح برداشت کرتی! بیہوش ہو کر گر پڑی
آخر انسان پھر عورت۔ وہ بھی ماں۔ مرے پہ سو دُرّے فاقہ زدہ! اسکے
گرتے ہی کھاٹ گری۔ اسپر سے پریم اور شاما ڈھلکے۔ پرکاش نے بھی گھبراہٹ
میں سنبھلتے سنبھلتے ٹھوکر کھائی اور غائب!

(۳)

صبح ہوئی۔ دن چڑھا۔ دھوپ اٹکھیلیاں کرتی چھتوں اور دیواروں پر پھیل گئی
پرکاش ...... اُٹھ بیٹھا۔ آج وہ چالیس سے اوپر کا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں
میں حلقے۔ چہرہ پر زردی۔ ہاتھوں میں رعشہ۔ قدموں میں ڈگمگاہٹ اس نے
سرلا کو آواز دی۔ پاس بچھی ہوئی کھاٹ خالی تھی۔ سرلا نے اُسے جواب
نہیں دیا۔ وہ سمجھا اُٹھ بیٹھی ہو گی۔ آنگن کی طرف قدم بڑھایا مگر اس سے چلا
نہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کی ساری قوّت مردہ ہو چکی ہے۔ اس کی
جوانی کی بجلی اس کے "گھنگھور جسم" سے بھاگ چکی ہے۔ زندگی کا امرت
اس سے چوس لیا گیا ہے۔ پھر بھی سرلا کو دلاسا دینے کے خیال کے سہارے
وہ انگنئی تک پہنچا۔ دو قدم! مگر یہ راستہ بھی گھسٹتا ہی گزرا۔ انگنئی میں بھی
ویرانی۔ کوئل وہاں بھی نہیں تھی۔ اب تو وہ حیران ہوا۔ چاروں طرف دیکھا
مگر کچھ ہو تو نظر آئے۔ ہر چیز ذرّہ ذرّہ اُسے بھیانک معلوم ہوا۔ ایک ہولناک
واہمہ اسکے دماغ میں سمایا اور وہ چیخ اُٹھا اور ناہموار پتھریلے فرش پر گر پڑا
مگر پھر اُٹھا اور "سرلا سرلا" کی آوازیں لگاتا شمسان کی طرف چلا۔ راستہ میں
جو اسے دیکھتا۔ پاگل کہتا۔ سرمست جوان اسپر ہنستے اور ناسمجھ بچے اُس پر
اینٹوں اور پتھروں کی بارش کرتے۔ اس سے راستہ چلا نہ جاتا۔ قدم من من بھر

کے ہو رہے تھے۔ مگر وہ گھسٹتا ہوا اور نگاہوں کے ہالے میں ساری دُنیا کو سموئے ہوئے شمشان تک پہنچ ہی گیا۔ اچھا خاصا دن۔ روشنی کی چھتری سر پر۔ شعاعیں دور دور مگر اسے شمشان میں پہنچتے ہی اندھیرا نظر آیا۔ جھینگروں کی صداؤں نے اسکے دل میں ایک عجیب ہول پیدا کر دی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا مگر تھوڑی دیر بعد سنبھلا "ٹکر ٹکر" کرتی ہوئی آنکھوں سے ساری فضا کو پھاڑتا ہوا دوبارہ اُٹھ بیٹھا۔ اسی وقت گھاٹ کے "با من مہاراج" اسکے پاس سے گزرے۔ ان کے ساتھ کسی کے لٹے ہوئے سہاگ کا جلوس تھا۔ انہوں نے آج پرکاش پر ترحم کی نظر ڈالی۔ رُکے اور اس کو اُٹھایا بھی۔ ایک منٹ اس کو دلاسا بھی دیتے رہے۔ پرکاش سے کہا بھی جاتا تو نہ کہہ سکتا اور آج تو آواز بھی اسکے مُنہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ پھر دیوتا جی چل دئے۔ پرکاش بدستور کہنیوں کے سہارے لیٹا رہا۔ وہ خیالات کے ایسے گرداب میں پھنس گیا کہ سرلا بھی اسے یاد نہ رہی اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کو بھول گیا ہے وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر دماغ سُن ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اس کا بھی احساس نہ رہ گیا کہ وہ یاد کیا کر رہا تھا۔ آخر تنگ آکر اُس نے تھوڑی دور پر جلتی ہوئی ایک سہاگن کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اُسکے رشتہ دار پتا ماتا سب ڈکرا رہے تھے۔ گھی میں بھنتے ہوئے زنانے گوشت کے ریشے آگ میں چرچراتی ہوئی نازک کلائیاں اور ساقیں۔ انگاروں میں سنسناتی ہوئی آنکھیں۔ بل کھاتی ہوئی سُنہری لہروں میں دل کا کسمسانا اور شعلوں میں ایک شعلۂ جوالہ اس نے اپنی آنکھوں کے آئینہ میں کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا۔ چتا کی طرف گرتے پڑتے چلا۔ وہاں اس سے کوئی نہ بولا اور وہ ان کے پاس کھڑا جوانی کے رس کو آگ پر پھوٹتے جلتے اور چھن چھن مناتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ حُسن کا غازہ تیار ہو گیا۔ لوگ آخری رسوم انجام دیکر چلے گئے مگر وہ کھڑا رہا اور اُسے اتنی بھی سُدھ نہ رہی کہ اس کا رُخ کس سمت ہے وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ بے خیالی میں اُس نے آنکھیں دریا کی طرف اُٹھائیں۔ ساحل پر لاتعداد گدھ اور کوے جمع تھے۔ یہاں اُسے قدرت نے حرکت کی لاٹھی ماری اسے سب بھولا ہوا یاد آ گیا۔ وہ جگہ تو وہی تھی۔ جہاں اس نے جگر پاروں کو گنگا کی سمیں چادر میں چھپایا تھا۔ ہولناک سماں نے اسے بے قابو کر دیا اُس سے نہ رہا گیا۔ وہ گدھوں کی طرف دوڑ گیا۔ مگر وہ نہیں ہٹے۔ دو لاشیں چھتڑے چھتڑے پڑی تھیں۔ پانی کا بہاؤ انہیں ساحل کی طرف ہی واپس لا رہا تھا۔ گدھ انپر ٹوٹ پڑے تھے۔ اور متعفن گوشت اور ہڈیوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھا رہے تھے۔ چرچر کر کر اور مرمر کی صدائیں تھیں جو فضا میں اچھی طرح گونجی ہوئی تھیں۔ پرکاش نے کھڑے ہی کھڑے دیکھا کہ ایک نے شاما کی ایک آنکھ حلقہ میں سے نکال لی اور ڈھیلے کو نگل گیا۔ دوسرا گدھ جھپٹا اور چھیننے کی کوشش کی اور ناکام ہونے پر غصہ میں ایک کان نوچ لے گیا۔ پرکاش یہاں ایک خونخوار باپ تھا۔ جو اس موقع پر ستارۂ تخریب بن کر بھگوان کو بھی نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ اس میں طاقت کے شرارے دوڑ گئے۔ اسکے ہاتھوں کی مچھلیاں اُبھر آئیں۔ نگاہوں سے غیض و غضب کا لپکا اُٹھا اور دیوانہ وار اُن آدم خواروں کی طرف جھپٹا۔ اس وقت وہ ایک ایسا اہرمن تھا جو تخلیق عالم کو ڈھا دینے پر تُل آیا تھا۔ اسکے گھونسے اُسکی لاتیں گولیوں کی بارش سے زیادہ خوفناک تھیں۔ اُس کی مٹھیوں کی گرفت آہنی تلواروں میں بل ڈال سکتی تھیں۔ گدھ پہلے تو بھاگے مگر پھر ان میں سے بعض جو انسانی گوشت کے نشہ اور مزے سے مدہوش ہو چکے تھے۔ انتقاماً مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئے مگر اسی وقت ایک جلی ہوئی لاش کی ایک ہڈی پرکاش کے ہاتھ آ گئی۔ اُس نے اسکی مسلسل مار سے انکا شمعراؤ کر دیا۔ کام ختم ہو چکا۔ گدھ بھاگ گئے۔ وہ ایک شکاری شیر کی طرح بپھرا۔ اب اُس نے ایک نظر گھاٹ کی دوسری عمارتوں پر ڈالی تو دیکھا کہ سرلا اس سے نزدیک ہی کھڑی حیرانی سے واقعات کی ستم ظریفی کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں لڑیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ "پیارے بھگوان!" کی آوازیں ٹکرائیں اور دونوں ایک دوسرے کے سینے سے چمٹ گئے۔

(۴۱)

"آج کون دن ہے پرکاش؟"

"یاد نہیں سرلا"

"سوچ کر بتاؤ پیارے!"

"پیاری یہ بھی تو یاد نہیں کہ سوچا کس طرح جاتا ہے"

"صبر کرو پیارے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بھگوان سے آشا رکھو۔"

"صبر کروں؟ بھگوان سے آشا رکھوں؟ بھگوان کے سہارے جیوں؟ صبر! بھگوان! بے معنی الفاظ۔ مہمل اصطلاحات! دنیا میں صبر کیسا؟ زندگی میں صبر کیا چیز ہے؟ تڑپتے رہو جلتے رہو۔ آہ! آہ! کرتے رہو۔ جب تھک جاؤ تو سانس لو۔ یہ وقفہ صبر ہے۔ اسکے سوا بھی صبر کوئی چیز ہے سرلا۔ احمق! تجھے اب بھی عقل نہ آئی۔ بھگوان بھگوان کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ کیسا بھگوان؟ کون بھگوان؟ کس کا بھگوان؟ کہاں کا بھگوان؟ بھگوان ہوتا تو شاما اور پریم جیسے پھول کو گِدھ نوچ سکتے؟ بھگوان ہوتا تو آج تیرے بچوں کے کرپا کرم سے با من دیوتا انکار کر دیتے؟ بھگوان ہوتا تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے تھے اور جمنا بھی انہیں اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیتی؟"

"پرکاش! بھگ......"

"چُپ رہ! سرلا تیری عقل ماری گئی ہے۔ اپنے بچوں کا انتقام نہیں لیگی کیا؟ سُن وہ دیکھ وہ ہیں شاما اور پریم کی روحیں سُنتی نہیں۔ "اماں! اماں!" کی رٹ لگائے ہیں۔ کیسے گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ وہ ماتا کو یاد کر رہے ہیں۔ اُس ماتا کو جو بھگوان کی رٹ لگائے ہوئے ہے اور پتا کو نہیں یاد کرتے جو ان کے لئے پاگل ہو گیا ہے جس کی ہر طرف ہنسی اُڑتی ہے! سرلا سُن! میں انتقام لوں گا۔ اپنے بچوں کا انتقام ضرور لونگا۔ تمہارے ان سات روز کے فاقوں کا انتقام لونگا۔ تمہاری مُرجھائی ہوئی جوانی کا انتقام لونگا۔ انتقام! انتقام!!

"میرے پیارے! کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ایسے تو تم کبھی نہ تھے دُنیا میں ہم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہیں۔ دُنیا کا کارخانہ ایسا ہی ہے میری جان جدوجہد کرتے رہو۔ بھگوان سے آشا رکھو۔ سپھل ہوگا۔ پھر انتقام کیسا پیارے؟ انتقام کس سے لیں؟ کسی نے ہمارے بچوں کا خون تو نہیں پیا ہے؟ پھر انتقام کیسا؟ روز ہی بچے مرتے ہیں۔ پتا ماتا اس کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا کرتے۔ بھگوان کی مرضی جب چاہا دیا جب چاہا بُلا لیا۔

"سرلا! میں بہت سُن چکا۔ اب میں اس بات کا بھی انتقام لونگا کہ تمہارے بھگوان نے تم کو بھی مجھ سے منحرف کر دیا ہے کہتی ہو کس بات کا انتقام لیں؟ انتقام! اپنا انتقام لیں گے اپنے بچوں کا انتقام لیں گے جو ہم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہیں اور جو انتقام کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ ان کا انتقام لینگے۔ دُنیا کا کارخانہ ایسا ہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ نہیں ہے پھر؟ انتقام بھی تو اسی کارخانہ کی ایک معمولی سی ایجاد ہے۔ بھگوان سے آشا رکھوں سپھل کرے گا؟ ہاں میں اُسی بھگوان سے انتقام لوں گا جس کا دل اتنا سخت ہے کہ ہم کو اس قدر تکلیف میں بھی دیکھ کر نہیں پسیجتا۔ ایسے ایسے پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑے اور وہ حاکم ہو کر۔ راجاؤں کا راجا ہو کر نہیں رحم کرتا۔ میں اسی بھگوان سے انتقام لونگا جس کی راجدھانی میں غریبوں کی کوئی پوچھ نہیں۔ جس کو غریبوں سے کوئی مطلب نہیں جو امیر کو غریب پر جور و ستم کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور نظریں ہٹا لیتا ہے جس کی راجدھانی میں غریبوں کو ایک روٹی بھی میسّر نہیں۔ میں تمہارے اُسی بھگوان سے انتقام لونگا سرلا؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو؟ کیسا راجہ ہے۔ کیسا راج ہے؟ امیر کبھی اسے نہیں جپتے کبھی اس کا بھولے سے دھیان نہیں کرتے۔ پھر بھی وہ ان کا ہے۔ ان کی سی کرتا ہے۔ ان کے لئے ہر طرح کی عیش و آرام کی چیزیں مہیّا کرتا ہے۔ اور غریب ہیں کہ مرتے مرتے بھی اسی کے نام کی مالا جپتے رہتے ہیں۔ ان کی آخری آہ میں بھی بھگوان ہوتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے بھگوان! بھگوان! چلّاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سرلا تمہاری ایسی ستم زدہ بھی یہی بکواس کر رہی ہے۔ خوب! اچھّا! سمجھوں گا۔ مزدور کا غصّہ! دکھاؤں گا! تمہارے بھگوان کو دکھاؤں گا کہ مزدور کا انتقام کیسا ہوتا ہے۔ دیکھوں تو وہ اپنے اِن سونے کے پتلوں کو کیسے بچاتا ہے؟ مزدور کی اکڑی ہوئی مٹھیوں کی مار سے انہیں کیسے محفوظ رکھتا ہے؟ آج مہینے ہو گئے۔ پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملا۔ ہفتہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایک دانہ مُنہ میں نہیں پڑا۔ ہلنے کی بھی طاقت نہیں مگر بھگوان جی! تمہیں بتاؤں گا کہ پرکاش میں کتنی طاقت ہے؟ پرکاش کا انتقام کتنا سخت ہے!

"سرلا کیا کر رہی ہو۔ میرے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھاؤ۔ میں پاگل نہیں ہوں! ابھی میں نے خون نہیں کئے ہیں سرلا؟ اچھّا جو مرضی تمہاری! کچھ نہ کہوں گا۔ لو میں چُپ ہوا جاتا ہوں۔"

"پرکاش! بچّوں کو کھو کر ان کے چیتھڑے کرا کر ہفتہ بھر سے فاقہ کرنے کے باوجود میں خوش تھی۔ مگر آج تم نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے

تمہاری باتیں بہت خوفناک ہیں۔ بھگوان بڑا دیالو ہے وہ میری خاطر تمہیں معاف کرے گا۔ لیکن پرکاش تمہارے ارادے اچھے نہیں۔ بے گناہ امیروں کو مار کر تمہیں کیا ملے گا؟ ان کے بھی بچے ہیں۔ ان کے پاس بھی تمہاری سرلا ایسی دیویاں ہیں۔ ان کو یتیم۔ بیوہ اور رانڈ بنانے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ کیا شاما اور پریم تمہیں واپس مل جائیں گے؟ کیا اس طرح تم گدھوں کے پیٹ سے ان کی لاشوں کے ٹکڑے نکال سکو گے۔ کیا اس طرح ہمارے فاقے دور ہو سکیں گے؟ کیا تمہاری ان حرکتوں سے ہمیں سکھ مل سکے گا۔ تم پکڑے جاؤ گے قانون کے شکنجے میں ہو گے۔ پھانسی پر لٹکو گے اور مجھے بیوہ کر جاؤ گے لاوارث چھوڑ جاؤ گے۔ پھر سوچو کہ میں کن ہاتھوں میں ہوں گی۔ کیا تب انہی امیروں کے ٹکڑے پر میری بسر نہیں ہوگی۔ پرکاش تمام باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو پھر پاگلوں کی طرح بکواس کرنا۔"

"سرلا میں نے سب ٹھنڈے دل سے ہی سوچا ہے۔ تمام باتوں پر غور کر لیا ہے۔ مجھے انتقام کے بعد ہی شانتی ہوگی۔ پریم اور شاما تو نہیں ملیں گے۔ مگر میری پیاس بجھ جائے گی۔ یہ بھی ایک آرزو ہوا کرتی ہے سرلا؟ میں اپنی پیاس بجھاؤں گا اور پھر اسی وقت مجھے شانتی ہوگی۔ ان کے بھی بچے ہیں جس طرح جونک چمٹتی ہے اسی طرح ان کے بچے بھی چمٹتے ہیں۔ جس طرح جونک کو ماروں گا اسی طرح ان کے بچوں کو بھی ماروں گا اور دولت اور امارت کے اس سنسار سے انہیں نکال باہر کروں گا تاکہ وہ بھگوان کی اس راجدھانی سے باہر ہو کر مساوی زندگی کی حقیقت تو سمجھیں۔ ان کی بھی سرلا ایسی دیویاں ہیں۔ دیوتا اور دیوی دونوں کو ماروں گا۔ دونوں کا خون کروں گا۔ وہاں سرلا ایسی دیویاں کہاں؟ سرلا تو سات روز سے فاقے کر رہی ہے۔ سرلا کے بچوں کو تو گدھوں نے کھایا ہے۔ لیکن انہوں نے تو کھانے نالیوں میں بہائے ہیں۔ ان کے بچے تو ہنستے رہتے ہیں۔ زرق برق ملبوسات میں اچھلتے کودتے رہتے ہیں۔ ہم انہی سرمایہ داروں کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم پر یہ مصیبت انہی کی وجہ سے پڑی ہے۔ یہ بغیر ہاتھ ہلائے سونے اور چاندی کے برتنوں پر اینڈتے پھرتے ہیں۔ زر و جواہر سے کھیلتے ہیں اور ہم ہفتوں متواتر کام کرتے رہتے ہیں۔ جان توڑ محنت کرتے ہیں پھر بھی ہمیں ایک روٹی بھی ٹھیک سے میسر نہیں آتی۔ ان کے بچے معمولی پڑھ لکھ کر اور بغیر محنت کا مزہ چکھے کلکٹر اور کمشنر ہو جاتے ہیں اور ہم ہیں کہ محنت پر اپنے جیون کی ساری شکتی نثار کرنے کے باوجود مشین کے پہیوں میں پسے جا رہے ہیں۔ راجاؤں کے راجہ کی اس چشم پوشی غریبوں کی طرف سے اس بے پرواہی کے خلاف بغاوت کی جائے گی۔ اس راجدھانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ نئی حکومت ہوگی۔ نئے انتظام ہوں گے۔ امیر و غریب کا سوال مٹا دیا جائے گا۔ سب امیر! سب غریب۔"

"پرکاش میں تم سے کہتی ہوں کہ خاموش ہو جاؤ۔ دیکھو کوئی تمہیں آوازیں دے رہا ہے۔ سنو بھی!"

"ہاں کون ہے؟ کون؟ ۔ رحمت علی!

یہیں سے کیا سوال و جواب کر رہے ہیں۔ دروازے پر جا کر بات کر لو نا۔

پرکاش اٹھا۔ دروازہ تک گیا۔ دروازہ کھولا اس نے دیکھا کہ رحمت میاں مالک مکان کے کارندے ہیں۔

"کہئے کیسے آئے؟"

"پرکاش جی! ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔ شاما اور پریم ہمارے ہی بچے تھے۔ خدا تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ وہ زیادہ دن اس دنیا کے باغ میں چہکیں۔ اس لئے اس نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

"رحمت میاں! آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ! کوئی حکم؟"

"جی! جی! ہوں! مجھے مالک نے حکم دیا ہے۔"

"کیسا حکم؟"

"کیا بتاؤں پرکاش جی! مجھے رنج ہوتا ہے۔" مگر میرا کیا قصور میں نوکر آدمی ہوں جو حکم ملے اس کو بجالانا میرا فرض ہے۔"

"تو صاف کہئے نا!"

"آپ کے مکان کا کرایہ چھ مہینے سے بقایا ہے۔ اور ۔۔۔۔"

"میں سمجھا، رحمت میاں، تم میری حالت جانتے ہو۔ تمام واقعات تمہیں معلوم ہیں۔ میری مصیبتیں تم سے چھپی نہیں ہیں۔ کل تک تیس روپیہ کیا ایک پائی بھی مانگو تو نہیں دے سکتا۔ سات روز سے منہ میں کھیل تک نہیں پڑی ہے رحمت میاں!"

"بابو جی! میں سب جانتا ہوں مگر سرکاری حکم ہے اور میں مجبور ہوں۔"

میں کل آکر رقم کا مطالبہ کروں گا۔ بابوجی! میرے پاس ڈیڑھ روپیہ ہے اسے لے لو اور بہو کو کھلاؤ اور تم خود کھاؤ۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہوں بابوجی!"

"رحمت میاں!"

(۵)

"پرکاش! آدھی رات کو کہاں چلے؟"

"ٹٹی کرنے سرلا؟"

"نہیں مجھے شک ہوتا ہے۔"

"شک کی کیا بات ہے سرلا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے!"

"کیوں ڈر رہی ہو؟"

"نہیں پیارے اس وقت نہ جاؤ۔ لاٹھی بھی ہے تمہارے ہاتھ میں۔"

"لاٹھی اندھیرے کی وجہ سے لے لی تھی۔ کہو تو لاٹھی بھی چھوڑ جاؤں۔ جلدی آجاؤں" جلدی آجاؤں گا۔"

"اچھا جاؤ۔ جلدی آنا۔ مجھے نیند نہ آئے گی۔"

(۶)

"بھگوان! آدھی رات سے گئے ہیں۔ نہ معلوم کیا بپتا پڑی۔ ابتک نہیں آئے۔ دیا کرنا بھگوان۔ کل وہ پاگل ہو رہے تھے کہیں کچھ سچ مچ کر نہ بیٹھے ہوں پھر ان کے دشمن گرفتار ہو گئے ہونگے......"

"ایں یہ دروازہ کون پیٹ رہا ہے۔ اچھا بھائی رکنا اٹھتی ہوں کسے دریافت کر رہے ہیں آپ؟"

"دروازہ کھولو!"

"بابوجی نہیں ہیں"

"دروازہ کھولو!"

"میں نے کہدیا کہ پرکاش بابو نہیں ہیں میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔"

"ہم حکم دیتے ہیں دروازہ کھولو۔"

"آپ کون ہیں؟"

"قرقی کے سپاہی ہیں اور آپ کے مال و اسباب کو قرق کرنے آئے ہیں۔"

"قرقی؟ کیوں؟"

"دروازہ کھولو"

سرلا نے دروازہ کھولدیا۔ اس کو قرقی کا پروانہ دیا گیا۔ مکان کا کرایہ نہیں چکایا تھا۔ اس لئے مال و اسباب کو قرق کر لینے کا حکم ملا تھا سرلا ہنسی اور عورت کی آن کے ساتھ اس نے انہیں مکان کا کونا کونا دکھایا۔ ٹوٹے پھوٹے مٹی کے برتن۔ چند گھسی ہوئی پیتل کی ہانڈیاں لوٹا وغیرہ اور رکھا ہی کیا تھا۔ سامراج کے سپاہی تھے آخر! ان بیکار چیزوں کو بھی اٹھا لے گئے۔ کارگزاری جو دکھانی تھی۔ اب سرلا اور پریشانی سے پرکاش کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لال لال پگڑی والے اور بھی آتے دکھائی دئے۔ سرلا اس مرتبہ ان کے آنے سے گھبرا گئی۔ انہوں نے آتے ہی کہا "پرکاش نے رات سیٹھ صاحب کا خون کر دیا ہے۔ اسی سلسلے میں تمہارے مکان کی تلاشی ہوگی اور تم تھانے لیجائی جاؤ گی۔"

سرلا بھونچکی سی ہوگئی "میرا پرکاش! ناتھ! تم نے خون کردیا؟ پرکاش نے خون کردیا؟ پرکاش ٹٹی کرنے گئے تھے۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے۔ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ پرکاش نہیں وہ کوئی اور پاپی ہوگا؟"

ایک نے کہا "آپ تھانہ میں چلئے۔ معلوم ہی ہو جائیگا سب؟"

دوسرا بولا "دیکھو کیسی بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہے۔"

تیسرا بڑبڑایا "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے!"

سرلا بولی "چلئے میں چلوں گی۔ میں اپنے ناتھ کے پاس ضرور چلوں گی۔"

(۷)

تھانہ میں سب سے پہلے وہ تھانے دار صاحب کے سامنے پیش کی گئی۔ انہوں نے لاکھ کوشش کی مگر وہ ایک لفظ نہ بولی۔ اسکی پتھرائی ہوئی آنکھیں ایک ٹک تھانیدار کو دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی آنسو کے ایک دو قطرے گر جاتے۔

(۸)

سرلا پرکاش سے ملنے جیل گئی۔ پرکاش نے سرلا کو دیکھا اور

پروپرے ہنسا - پر ۃ ... الٹ پٹ دیکھ کر گھبرا گئی - اُس کے ہوش اُڑ گئے - وہ رکتی ہوئی پرکاش کے پاس پہنچی اور پہنچتے پہنچتے بیہوش ہو گئی - سرلا جیل سے نکلی ہی تھی کہ پرکاش نے زور کا قہقہہ لگایا - یہ وہ وقت تھا جب قیدی جیل کے میدان میں کام کیا کرتے تھے - سرلا کا کوٹھری سے نکلنا اور پرکاش کا پاگلوں کی طرح ہنسنا اور چیخنا ان کو متوجہ کرنے کیلئے کافی تھا وہ سب ایک ایک کر کے اس کی کوٹھری کے گرد جمع ہو گئے - کوٹھری کھلی چھوڑ دی گئی تھی - پرکاش قیدیوں کے جم غفیر کو دیکھ کر باہر نکلا - ایک قیدی اسے دیکھتے ہی بولا "یہ آپ کی استری تھیں؟"

دوسرے نے کہا "اس سنسار میں غریبوں پر کتنا ظلم ہوتا ہے"

تیسرا بڑبڑایا "میں انہیں جانتا ہوں - یہ میرے گاؤں کے ہیں مالگذاری نہ ادا کرنے کے جرم میں جب میں گرفتار ہوا تھا تو پرکاش بابو نے میری حمایت میں قرق امین کے ڈنڈے کھائے تھے -

چوتھے نے پوچھا - تو یہ پرکاش بابو ہیں - ہریش چندر کے پُتر - یہ تو مل میں ملازم تھے؟"

کئی آوازیں آئیں "ہاں ہاں یہ وہی ہیں - دیکھو تو بیچارے کیسے پاگل ہو رہے ہیں؟"

پرکاش جو ابتک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا بولا - "بھائیو! دیکھتے ہو کہ اس سامراج میں ہم مزدوروں کی کیا درگت ہے آپ میں سے کتنے ہیں جو اس ظلم کا شکار ہوئے ہیں؟"

پہلا "میں ایک روز بیگار میں نہ جا سکا اسکی سزا بھگت رہا ہوں"

دوسرا "میں تھانیدار صاحب کو گھی کا پیپا نہ پہنچا سکا یہی میرا جرم ہے"

تیسرا "بھائی میں مالگذاری نہ ادا کر سکا تھا - مکان مال و اسباب سب قرق کر لیا گیا"

چوتھا "میری بیوی بیمار تھی - کوتوال صاحب کی لڑکی کی شادی میں تانگہ نہ لیجا سکا - یہ میری اُسی گستاخی کی سزا ہے"

پرکاش کی آنکھوں سے غصہ کا بھبکا نکلا - اس نے کہنا شروع کیا - "میرے وِیر ساتھیو! جانتے ہو کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ ہم پر آئے دن یہ ظلم کیوں ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ ہم متحد ہو کر احتجاج نہیں کرتے - چُپ چاپ ظلم سہ لیتے ہیں - مگر ساتھیو! کبتک یہ سلسلہ جاری رہے گا - کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم ایک ہو کر اس سامراج کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں - آخر مرنا ہے - سسک سسک کر مرنے سے تو یہ اچھا ہے کہ اپنی عزت کیلئے اپنی آزادی کی خاطر - اپنے بال بچوں کیلئے ہم اپنے خون کا دریا بہا دیں - کیا یہ اندھیر نہیں ہے کہ ایک طرف ہمارے بچے پیسہ پیسہ کو ترسیں - دوسری طرف سیٹھوں کے پُتر اشرفیوں سے کھیلیں - ہم محنت کریں - مزدوری کریں - دن رات ایک کر دیں اور یہ پھولوں کی سیج پر اینڈنے والے ہماری گاڑھی کمائیوں کو دھوئیں اور شراب میں اُڑائیں - ہمارے ننھے ننھے بچوں اور ہماری بیمار اور نازک استریوں سے بیگار لی جائے - آؤ ہم سب مل کر مزدور رجائی کیلئے ایک نیا راج بنائیں - سب ملکر نئے انقلاب کے شراروں سے اس سامراج کی دیواروں کو جھلس دیں - یاد رکھو اس کے لئے ہم کو مستقل مزاجی سے جد و جہد کرنی ہو گی - اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اپنی مظلوم جاتی کی حمایت میں بہانا ہو گا . . . ."

قیدیوں نے مل کر انقلاب زندہ باد - مزدور رجائی زندہ باد ظالم سامراج برباد کے نعرے لگائے - پرکاش پھر چیخا "ویرو ہمیں صرف اس وقتی جوش کی ضرورت نہیں ہے - بہتر ہے کہ جو کرنا ہے آج ہی کر ڈالیں - قسم کھاؤ مزدور رجائی کی اور سب ملکر عہد کرو کہ ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں ہمیں پھانسی کے تختوں پر لٹکا دیا جائے ہمارے گھروں کو لوٹ لیا جائے ہمارے بچوں کو تہ تیغ کر دیا جائے - ہماری استریاں لونڈیاں باندیاں بنا لی جائیں مگر ہم اپنے حقوق حاصل کر کے رہیں گے - ہماری جانیں یوں ہی ہتھیلیوں پر ہیں - اپنے سروں کو چراغاں کیجئے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی دُنیا بنائیے - قسم کھاؤ - مزدور رجائی کی اور بولو انقلاب زندہ باد - مزدور رجائی زندہ باد!

فلک شگاف نعرے گونجے اور جیل کے در و دیوار تھرا گئے پرکاش نے دیکھا جیلر مع سپاہیوں کے آ رہا ہے اُس نے جلدی جلدی آخری انجکشن دیا "ویرو کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ کیا صرف ان نعروں سے دشمن مرعوب ہو جائیں گے؟ ایک ایک منٹ قیمتی ہے - بڑھو حملہ کرو - جیل ڈھا دو - ہتھیاروں کو لوٹ لو جو بھی روکے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دو بڑھو چلو - حملہ کرو - انقلاب زندہ باد - مزدور رجائی زندہ باد - ظالم سامراج برباد"!!!

(بقیہ افسانہ صفحہ ۱۹۱ پر)

میخانۂ الہام

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

جولائی۔اگست ستمبر ۱۹۳۸ء

دردناک مشاہدہ

نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔اے لکھنوی

وہ ملک ترقی کبھی کر ہی نہیں سکتا — صرف اپنے لئے جیتے ہوں جس ملک کے زردار

جو پرورشِ نفس سے دم بھر نہیں فارغ — بیکس سے ہے مطلب نہ غریبوں سے سروکار

سکے ہیں بدل دیتے ہیں جو اپنے خدا کو — وہ مفلسوں کے ہوں گے بھلا خاک مددگار

ان کے لئے سامان ہے عشرت کا مہیّا — دہقان سراسیمہ ہے، مزدور ہے بیکار

اُترے ہوئے چہروں کا ہر اک نقش کہانی — حلقے پڑی آنکھوں سے عیاں فاقوں کے آثار

وہ عورتیں ان کی کہ جوانی ہے بڑھاپا — چڑھتی ہوئی ندّی سی نہ رفتار نہ گفتار

پنگھٹ پہ وہ جھمگھٹ نہ وہ بولی نہ ٹھٹولی — آپس کی وہ چہلیں ہیں نہ وہ چھیڑ نہ تکرار

نتھنوں میں پھڑک اُٹھے، نہ ہونٹوں پہ تبسّم ۔۔۔ یہ حال ہے برسوں کا ہو جیسے کوئی بیمار

پیوند لگے چیتھڑے پوشاک ہے جن کی ۔۔۔ گیتوں کے عوض ایک خموشی لبِ اظہار

تنگیِ معیشت کی اور اس پہ یہ مصیبت ۔۔۔ اولاد پر اولاد کا بڑھتا ہوا طومار

یہ رات پہاڑ، اور ہوا جاڑے کی ٹھنڈی ۔۔۔ تن ڈھکنے کو چادر نہیں اللہ رے ادبار

اس پر بھی یہ مردوں کی ہے غیرت کہ جو دو مفت ۔۔۔ مرزائی ہو کمّل ہو کہ دھوتی کریں انکار

یہ کہہ کے ملے قرض ہمارا تو دلا دو ۔۔۔ پر بھیک تو لینے کے لئے ہم نہیں تیار

ہاں سچ ہے کہ نادار ہیں سردی بھی کڑی ہے ۔۔۔ کس کام کا سُکھ اپنوں سے جب آنکھ نہ ہو چار

سو بار شرف ان کو امیروں پہ ہے واللہ ۔۔۔ تیور یہ غریبی میں ہوں جن کے وہ ہیں اوتار

ایسوں کا لہو چوس لیں ایسے بھی ہیں انسان ۔۔۔ ایسوں کا گلا گھونٹ دیں ایسے بھی ہیں غدّار

کیوں قابلِ عبرت نہ ہو اس ملک کی حالت

یہ جس کا تمدّن ہو یہ اسلوب، یہ کردار!

لہ یہ نظم دراصل حقیقی تاثر پر مبنی ہے۔ ضلع بلیا میں بحیثیت کلکٹر سیلاب کے موقع پر جب آثر صاحب مالی امداد پہنچانے کا فرض ادا کر رہے تھے تو ان کا بیان ہے کہ بھوکے اور ننگے دہقانیوں نے اس امداد کو اپنی غیرت کے منافی سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر "دردناک مشاہدہ" کو نظم کا لباس پہنایا گیا۔
ساغر

قومی مجاہد

(جناب تمنّی عظیم آبادی)

مرحبا جانباز اے قومی مجاہد! سرفروش
تیری آنکھوں میں تپش، بازو میں دم، سینے میں جوش

اے کہ تیری زندگانی وقفِ شمشیر و تفنگ
اے کہ جولانگاہ تیری وسعتِ میدانِ جنگ

اے کہ قائم تجھ سے ہے تیرے ملک کا عزّ و وقار
عزمِ راسخ پر ترے ناموسِ قومی کا مدار

اے کہ تو پیدا ہوا ہے جاں نثاری کے لئے
ہے لہو تیرا وطن کی آبیاری کے لئے

ملک کی قسمت ہے تابندہ تری تلوار سے
سرخرو ہے قومیت تیرے لہو کی دھار سے

ظلم ہوتا دیکھتا ہے جب کہ مظلوموں پہ تو
کھنچ کے آجاتا ہے آنکھوں میں تری سارا لہو

پیسنے لگتا ہے جب مزدور کو سرمایہ دار
سر پہ چڑھ جاتا ہے اُس دم تیرے تلوے کا بخار!

جب غریبوں اور نہتوں کو ستاتے ہیں امیر
لے کے تو بڑھتا ہے اس دم ہاتھ میں تلوار تیر

قوم میں آتی ہے جب بیروزگاری کی وبا
گھونٹتا ہے بڑھ کے تو سرمایہ داری کا گلا

سخت ہو جاتی ہیں استبداد کی جب بندشیں
تیرے ماتھے کی اُبھر آتی ہیں غصّہ میں رگیں

جاں گسل ہو جاتا ہے شاہنشہی کا جب عذاب
تو اُٹھا لیتا ہے ہاتھوں میں نشانِ انقلاب

جب نظر آتی ہے خطرہ میں وطن کی آبرو
بے محابا جان کی بازی لگا دیتا ہے تو

تو پلٹ دیتا ہے دم میں قسمتِ اقوام کو
پھیرتا ہے نوکِ خنجر سے رُخِ ایّام کو

مرحبا، شاباش، صد تحسین شیدائے جہاد
سرفروش اے ملک کے قومی مجاہد زندہ باد!

"نامۂ محبّت"

(حضرت فاروق بانسپاروی)

روح کی جنّت آنکھ کے تارے!
مجھ کو مجھ سے زیادہ پیارے!

باغِ جہاں میں شاد رہو تم ۔۔۔ بن کے بہار آباد رہو تم
دن بھر راہ دکھانے والے ۔۔۔ وعدہ کر کے نہ آنے والے
مہر و وفا کی باتیں بھولیں ۔۔۔ دِن بھولا وہ راتیں بھولیں
گھر والوں کی نظر بچا کر ۔۔۔ چلتے وقت وہ چھت پر آکر
آہستہ یوں مجھے بُلانا ۔۔۔ "بات اک کہنی ہے سُن جانا"
سانچے میں یہ ڈھالا جُملہ ۔۔۔ یاد ہے کو ٹھے والا جُملہ
بھول گئے کیا چھت کی باتیں ۔۔۔ فردوسِ خلوت کی باتیں
گود میں لے کر پیار کیا تھا ۔۔۔ یاد ہے کچھ اقرار کیا تھا
ساون کی ٹھہرا کے گئے تھے ۔۔۔ کتنی قسمیں کھا کے گئے تھے
خود بھی نہ آئے خط بھی نہ بھیجا ۔۔۔ پتھر کا کیوں ہوا کلیجہ!؟
ساون کی متوالی بدلی ۔۔۔ آگ لگانے والی بدلی

گھرے بادل کالے بادل　　جم کے برسنے والے بادل
سطحِ فلک پر چھائے ہوئے ہیں　　سینوں کو گرماتے ہوئے ہیں
ندی نالہ ایک ہوا ہے　　ادنیٰ اعلیٰ ایک ہوا ہے
ساری پہنے دھانی دھانی　　رقص میں ہے برسات کی رانی
گنگا کی لہریں جاگ اُٹھیں　　سوئی ہوئی نہریں جاگ اُٹھیں
سبزہ جاگا وادی جاگی　　جنگل کی شہزادی جاگی
دن کی دنیا رات کی دنیا　　جاگ اُٹھی جذبات کی دُنیا
رم جھم رم جھم پانی برسے　　ساغر بکف جوانی برسے
پھول چمن میں پھول رہے ہیں　　شاخ پہ جھولا جھول رہے ہیں
کویل کُوکُو بول رہی ہے　　فطرت آنکھیں کھول رہی ہے
مستی خیز مہینا بھی ہے　　ساغر بھی ہے مینا بھی ہے
شغل مگر یہ کس کو بھائے　　کون پیئے اور کون پلائے
پردیسی سب گھر آئے ہیں　　چھٹی لے لے کر آئے ہیں
میں دن رات برہ کی ماری　　دیکھ رہی ہوں راہ تمہاری
دو ہی دن کی رخصت لے کر　　پاؤں کے نیچے جنّت لے کر
آؤ بالم تم بھی آؤ　　"بات اک کہنی ہے سُن جاؤ"
ڈوب رہے ہیں چاند ستارے　　زیادہ "حدِّ ادب" اے پیارے

میں ہوں — تمہارے ہجر میں یوگن
پریم کی بھوکی پریم پجارن

۱۸۹

شہپرِ تخئیل کی اب چرخ پیمائی کہاں؟ بلبلِ رنگیں نوا کی نغمہ پیرائی کہاں؟
آہ! پائینگے کہاں اب شوخئ طرزِ ادا؟ شیشۂ الفاظ رنگیں ہیں مئے فکرِ رسا؟
محفلِ قدرت میں چھیڑے کون اب سازِ حیات؟ کون کھولے عقدۂ سربستۂ رازِ حیات؟

موت کے رہزن نے لوٹا کاروانِ شاعری!
ہے خزاں دیدہ بہارِ گلستانِ شاعری!

اور دکھلائیں گے ہاں تصویرِ فطرت کھینچ کر خامۂ ارژنگ دا سے دل پہ ڈالیں گے اثر
کلکِ گوہر بار سے لکھیں گے آزادی کے گیت دشمنِ ہندوستاں کی خانہ بربادی کے گیت
نورِ حریت سے بھر دیں گے در و دیوارِ ہند روکشِ باغِ جناں ہوگا ہر اک گلزارِ ہند
اپنے نغموں سے گرائیں گے وہ برقِ اتفاق پھونک ڈالے گی جو اک لمحہ میں تعمیرِ نفاق
ملتِ[1] بیضا پہ لیکن کون ہوگا اشک ریز؟ کس کی سرد آہوں میں پنہاں ہوگی آوازِ بجیز
کون ہوگا اب علمبردارِ تہذیبِ حجاز؟ کون دکھلائے گا اب انوارِ تہذیبِ حجاز؟
کس کا دامن اشک سے تسلی ہوگا گلفروش؟ مسلمِ خفتہ کو دیگا کون پیغامِ خروش؟
کون سکھلائیگا اب مسلم کو آئینِ خودی؟ کس کے دم سے ہوگی تجدیدِ مذاقِ زندگی؟

آتشِ سوزِ بیاں سے دل کو گرمائیگا کون؟
قصۂ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپائیگا کون؟

گوشۂ عزلت تجھے اقبال تھا شاید پسند رونقِ ہنگامۂ محفل سے دل تھا دردمند
مل گیا آخر تجھے شہرِ خموشاں میں سکوں لے ہی پہنچا تجھ کو منزل پر ترا ذوقِ جنوں
محفلِ اُردو مگر بے کیف ہے تیرے بغیر رشکِ صد فردوس تھی کل تک یہی یادش بخیر!

تا قیامت تجھ کو روئیگا مگر تیرا وطن
تیرے مٹنے سے خزاں منظر ہے اُردو کا چمن

---

[1] یعنی عندلیب صاحب کے نزدیک آزادی کے گیت لکھنا اور دشمنِ ہندوستاں کی خانہ بربادی کے گیت گانا، "آزادیِ ہند" اور "ترقیِ ہند" نفاق کی فنا اور اتفاق یہ تمام چیزیں "ملتِ بیضا" کے مفاد کے منافی ہیں ——! ؟
یہی ہے وہ مغالطہ جس میں مسلمان ایسا گرفتار ہے کہ آزادی کا نام نہیں لیتا۔ ساغر

پریت کا گیت

(پروفیسر اکبر خاں اکبر حیدری)

دُنیا والو؟ اس دُنیا میں پریم نہیں ہے پریت نہیں
مطلب کا سنسار ہے سارا ۔ کوئی کسی کا میت نہیں
کوئی کسی کو یاد کرے اور کوئی کسی کا نام نہ لے
اگلے پریمی کہتے تھے یہ پریت نگر کی ریت نہیں
تم نے من کو موہ لیا تھا ۔ ہم نے تن کو تیاگ دیا
ہار ہماری ہار نہیں ہے ۔ جیت تمہاری جیت نہیں
ہنستے ہو اور ہنس ہنس کر تم پریم کی بپتا سُنتے ہو
پریم کی بپتا سُننے والو ۔ پریم کی بپتا گیت نہیں
اکبرؔ تم پر ساری دُنیا کچھ تو سمجھ کر ہنستی ہے
تن من دھن سب پریت میں کھونا اس نگری کی ریت نہیں

کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لیلے!

حضرت ریاض گوالیاری ایم۔اے

یہ صدمہ، وہ آفت، یہ غم، وہ مصیبت، ہزاروں بکھیڑے، ہزاروں جھمیلے
اُٹھالے ہمیں اب تو دُنیا سے یارب! کہاں تک کوئی رنج و آزار جھیلے؟

کبھی چین پائے، کبھی غم اُٹھائے، کبھی لطف دیکھے، کبھی رنج جھیلے
کہاں تک کہیں ہم، ہو یہ کہانی، محبت میں پاپڑ بہت ہم نے بیلے

یہ دل، یہ جگر، یہ کلیجہ ہمارا، کہ اُلفت میں غم عمر بھر ہم نے جھیلے
اُدھر تُو جفا کار، تنہا اِدھر ہم، اُدھر ظلم لاکھوں اِدھر ہم اکیلے

کبھی اُس طرف تھا حسینوں کا جھُرمٹ، کبھی اِس طرف نازنینوں کے میلے
غرض ہمنشیں عہدِ اُلفت میں ہم نے، بہت رنگ دیکھے بہت کھیل کھیلے

خدا کیلئے یوں شبِ ماہ میں تم، نہ نکلا کرو گھر سے باہر اکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے، کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لیلے

اُدھر خوف اُنہیں اپنی بدنامیوں کا، اِدھر ڈر ہمیں اپنی رسوائیوں کا
پڑے یاد کرتے ہیں اک دوسرے کو، اُدھر وہ اکیلے، اِدھر ہم اکیلے

جہاں ہو یہ نقشہ، یہ عالم، یہ صورت، وہاں آئے کیا عرضِ مطلب کی نوبت
مہینوں میں، ہفتوں میں، برسوں میں ہم کو، کبھی مل گئے وہ اکیلے دکیلے

رہی جب یہ صورت تو کشتی ہماری، بھلا بحرِ اُلفت سے کیا پار ہوتی
غموں کے تھپیڑے، حوادث کے جھٹکے، مصائب کے طوفاں، بلاؤں کے ریلے

یہ کیا عشق و اُلفت کی نیرنگیاں ہیں، یہ کیا انقلابِ زمانہ ہے یارب!
بچھڑ جائیں عہدِ جوانی میں دونوں، جو بچپن میں دن رات ہوں ساتھ کھیلے

ریاض اُس ستمگر سے پالا پڑا ہے، جو ہشیار اتنا ہے عیار ایسا
کہ ڈھائے ستم، پھر خوشامد بھی کرلے، جفائیں بھی توڑے، دعائیں بھی لیلے!

درائے کارواں

بے پر و بالی نہیں شرمندۂ معنی ہنوز
منتہائے اوج ہے حدِ نظر میرے لئے

یہ مرصع آسماں یہ ماہ و انجم بحر و بر
محوِ حیرت ہوں کہ کیوں یہ کرّوفر میرے لئے

موجِ بحرِ زندگی سرگشتۂ ساحل نہیں
ہر نفس ہے دعوتِ عزمِ سفر میرے لئے

عبّاس

نگاہِ شوق

(جناب حمید لکھنوی)

دیکھنا تو اے نگاہِ شوق یہ کیا راز ہے
ہے بھی کچھ پردے میں یا آواز ہی آواز ہے

ابتدا و انتہائے عشق گو اک راز ہے
درحقیقت ہے وہی انجام جو آغاز ہے

جلوہ ہر شے سے عیاں اور پھر نگاہوں سے نہاں
بزم آرائی کا تیری اک نیا انداز ہے

ہاں ذرا پھر میری جانب مسکرا کر دیکھ لو
خندۂ گل پر بہت صبحِ چمن کو ناز ہے

کچھ تو ہیں مجبوریاں اے ہمصفیرانِ قفس
اُڑ نہیں سکتا ہوں میں گو طاقتِ پرواز ہے

طالب و مطلوب میں ہے فرق اتنا ہی حمید
ایک دل میں سوز ہے اور ایک دل میں ساز ہے



(حضرت ماہر القادری)

لکھی ہے سرِ صبح ستاروں کے لہو سے — شب نے کسی ناکامِ تمنّا کی کہانی

دریا کے دھڑکتے ہوئے دل کا ہے فسانہ — موجوں کی کشاکش میں حبابوں کی روانی

دن رات کی اس گردشِ پیہم کے اثر سے — ہر روز شفق کرتی ہے خوننابہ فشانی

اک آن میں پامالِ ستم ہائے خزاں ہے — کلیوں کا لڑکپن ہو کہ پھولوں کی جوانی

اک دل بھی نہیں فطرتِ مجبور سے آزاد — مجروحِ غمِ دہر ہے ماما ہو کہ رانی

اک کیفیّتِ غم ہی کو کہتے ہیں مسرّت — احساس کا دھوکا ہے غمِ عشرتِ فانی

شبنم کی تمنّا کا جنازہ ہے جنازہ — پھولوں کی جبینوں سے ڈھلکتا ہوا پانی

کونین میں ہے جبرِ مسلسل کی خدائی
اے قادرِ خلّاق! دہائی ہے دہائی

حُسن سے خطاب

(حاجی نبی احمد صاحب رضا بریلوی)

اے ازل کے چاند، لے نور و ضیائے کائنات
اے تجلّی ہی تجلّی، دلربائے کائنات

عالمِ انسانیت کو تو نے بخشا ہے عروج
بن گیا ہے مستقل نغمہ برائے کائنات

خاک کے پتلوں میں تجھ سے ہی کشش پیدا ہوئی
ہے تری تخلیق پر نازاں خدائے کائنات

تیرہ و تاریک تھی دُنیا نہ ہونے سے ترے
تجھ کو فطرت نے کیا راز آشنائے کائنات

ماہِ تاباں اور تارے ہیں تجھی سے ضَو فروز
تیرے پرتو سے ہیں روشن جلوہ ہائے کائنات

نکہتوں کی بارشیں ہوتی ہیں تیرے فیض سے
مستیوں میں غرق رہتی ہے فضائے کائنات

عشق ہے محکوم تیرا، یہ تری معراج ہے
فتحمندی کا جہاں کی تیرے سر پر تاج ہے

میں کہ ہوں اک ناظرِ فطرت خرابِ رنگ و بو
صبح سے تا شام پڑھتا ہوں کتابِ رنگ و بو

تیرا دیوانہ ہوں تیرے ہی پرستاروں میں ہوں
ذوقِ دل نے کر دیا ہے کامیابِ رنگ و بو

دیکھتا ہوں لالہ زاروں میں ترے انوار کو
کچّی کلیوں سے جھلکتا ہے شبابِ رنگ و بو

ڈھونڈتا رہتا ہوں تیری نو بہ نو رنگینیاں
روز کر لیتا ہوں پیدا ماہتابِ رنگ و بو

دیکھ کر تیری ضیائیں انجمن در انجمن
خود ہی کر لیتا ہوں اکثر انتخابِ رنگ و بو

عمر بھر جلووں کو دیکھا ہے ترے سو رنگ سے ہے نگاہوں میں مری ہر آب و تابِ رنگ و بو

دلربائی کے تجھے لاکھوں طریقے یاد ہیں
تیرے جلووں سے زمین و آسماں آباد ہیں

طلعتوں سے تیری بزمِ دو جہاں آباد ہے تو نہ ہو تو زندگی بے کیف و بے بنیاد ہے
فہمِ انساں سے ہیں بالا تیرے اوصافِ جمیل مرتسم ذرّاتِ عالم پر تری روداد ہے
ہاں مگر اے حسن اس دورِ مجاز آلود میں حرص کے ہاتھوں تری معصومیت برباد ہے
کس قدر اندھیر ہے اے شعلۂ برقِ رواں کارگر تجھ پر ہوس کا خنجرِ بیداد ہے
ہو رہی ہے خود پرستوں میں تری مٹی خراب دیکھتا ہوں تو اسیرِ پنجۂ صیّاد ہے
گرم بازاری ہوس کی کر رہی ہے مضمحل ترجمانِ شادمانی ہے مگر ناشاد ہے

ہو نہ آزردہ یہ رنگِ خود پرستی دیکھ کر
میں تجھے دیتا ہوں تسکین نبضِ ہستی دیکھ کر

بھیج لعنت حرص کے بندوں پہ، گلخانے میں آ جو محبت سے ہے ہوتا بندہ اُس آفانے میں آ
تیری پوجا کر رہا ہوں ابتدائے زیست سے میں ہوں جویائے حقیقت میرے پیمانے میں آ
ہیں یہاں کے گوشے گوشے میں نئی آبادیاں بے حجابانہ کبھی خاموش ویرانے میں آ
پاپ کی بستی میں دادِ دلبری دیتا ہے کون چھوڑ اس دُنیا کو، دل والوں کے میخانے میں آ
یوں نہ ہو ہر بامِ و در سے بے طلب جلوہ نما اک خصوصی شان سے الفت کے کاشانے میں آ
پھیر دے اپنی کمندِ ناز کا رُخ پھیر دے ہو جہاں پوجا تری تو اُس صنم خانے میں آ

یوں نہ ہونی چاہئیے رسوا درخشانی تری
فیج کب تک ہوئی ہوس کاروں میں تابانی تری

ہو طلب جس دل میں صادق تو اُسے سرشار کر — اپنی ضوریزی سے تقسیم سکوں سو بار کر
جو عقیدت کے خزانے تیرے قدموں پر لٹائے — گل بداماں شوخ کرنوں سے اُسے ہشیار کر
عشق ہو تجھ سے جسے دیوانہ ہے تیرا وہی — جو پرستارِ حقیقی ہو اُسے سرشار کر
یوں تو سب ہوسکتی ہیں لیکن امتحاں بھی شرط ہے — کون ہے طالب ترا، حل عقدۂ دشوار کر
بیٹھ خلوت میں تجھے اپنی صباحت کی قسم — جلوہ گر ہو گا نہ اب ہر بزم میں اقرار کر
چھوڑ دے جلوت پسندی کے طریقے چھوڑ دے — اپنا آئینِ جہانبانی نیا تیار کر

تو اگر چاہے تو یہ دورِ بلا ٹل جائیگا
پیش گوئی ہے مری دورِ حقیقی آئیگا

مضطرب ہوں گے جبین و آستاں تیرے لئے — کروٹیں بدلے گا لاکھوں آسماں تیرے لئے
تو اگر خودداریوں کا دے سکا اپنی ثبوت — رات دن صرفِ فغاں ہوگا جہاں تیرے لئے
تیرا استقلال ہوگا خاتم حرص و ہوا — پھول کیا روئے گا سارا گلستاں تیرے لئے
رفتہ رفتہ ایک دن پامال ہوگی ہر بدی — مطلعِ عالم بنے گا کہکشاں تیرے لئے
پھر وہی تیرے پجاری ہوں گے اور جلوے ترے — مستقل ہوگا سکونِ جاوداں تیرے لئے
مجھ سا دیوانہ بھی تیری کامیابی دیکھ کر — ہو سکے گا طرزِ نو سے نغمہ خواں تیرے لئے

یہ تغیّر ہو تو نظمِ دہر بھی تبدیل ہو
پھر یہ ممکن ہے مذاقِ حُسن کی تکمیل ہو

۱۹۹

طلوعِ صبح

(محمد یحییٰ صاحب تنہا بی، اے)

شبِ تاریک کی ظلمت سے جہاں تھا معمور — نور کا نام نہ تھا نور ہوا تھا کافور

گھپ اندھیرا تھا، سیاہی میں تھی ہر شے مستور — کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا نظر تھی مجبور

شکر صد شکر اُفق پر فلک آرا نکلا

رات آخر ہوئی اور صبح کا تارا نکلا

بسترِ راحت و آرام پہ سوتے تھے بشر — کوئی آواز نکلتی نہ تھی گھر سے باہر

دشت ویرانہ تھا، سنسان، خموش اور ششدر — لبِ تصویر کی مانند جہاں تھا یکسر

ایک سناٹا تھا، خاموش ہی خاموش تھے سب

نیند کے نشّہ سے مدہوش ہی مدہوش تھے سب

مُرغ کی بانگ نے سوتوں کو جگایا آخر — للہ الحمد مؤذن نے اُٹھایا آخر

شورِ مرغانِ چمن نے بھی مچایا آخر — حمد کا راگ پرندوں نے بھی گایا آخر

مسجدوں میں تو نمازی ہوئے مصروف نماز

اور بُت خانوں سے ناقوس کی نکلی آواز

مُردنی چھائی ہوئی تھی کہ تھے زندہ درگور
نہ یہ رونق تھی کہیں اور نہ کہیں تھا یہ شور
زندگی کے ہوئے آثار نمایاں فی الفور
اُس کی قدرت ہے عیاں اس سے اگر کیجئے غور

وہی زندوں کو بنا دیتا ہے مردہ دم میں
وہی مُردوں کو بنا دیتا ہے زندہ دم میں

اب جدھر دیکھئے ہر چیز میں جان آئی ہے
کیا شجر اور حجر سب میں وہ رعنائی ہے
کہ نظر دیکھ کے حیران ہے، شیدائی ہے
جلوے لاکھوں ہیں مگر ایک تماشائی ہے

طور پر حضرتِ موسیٰ سے جو دیکھا نہ گیا
میں یہاں دیکھتا ہوں اور کہیں آیا نہ گیا

پتے پتے میں ہیں وہ بیل وہ بوٹے کہ نہیں
مل سکیں گے کسی انسان کی صنعت میں کہیں
دل کشی کیسی ہے اور کیسے ہیں واللہ حسیں
واہ کیا لعل اُگلتی ہے ہماری یہ زمیں

پھول کا ذکر ہی کیا پھول تو پھر پھول ہی ہے
شان کانٹے کی بیاں کرنا بھی اک طول ہی ہے

کسی صحرا میں ذرا دیکھیے شبنم کی بہار
یدِ قدرت نے کیا سبزہ پہ گوہر کو نثار
سبز مخمل پہ روپہلی کئے یا نقش و نگار
یا زمیں کو یہ ستارے دئے بیحد و شمار

جس طرف دیکھئے جنگل میں بہار آئی ہے
اور مستی کو صبا ساتھ لگا لائی ہے

آبشاروں میں وہ پانی کا ٹپکنا کیا خوب ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہواؤں کا لہکنا کیا خوب
باغ و گلزار میں پھولوں کا مہکنا کیا خوب اور میووں کا درختوں پہ لٹکنا کیا خوب

رقصِ طاؤس میں اک وجد کی کیفیت ہے
دلِ شوریدہ کی اس وقت عجب حالت ہے

جانور[1] کرتے ہیں آپس میں کلیلیں تو ہرن چوکڑی بھرتے ہیں اور پھرتے ہیں جنگل میں مگن
یہ نہیں جانتے، کیا شے ہے غم و رنج و محن ان کے نزدیک یہ جنگل بھی ہے گویا گلشن

دیکھ کر ان کو خوشی ہوتی ہے اوروں کو بھی
بھول جاتے ہیں پریشانیاں اپنی اپنی

فرحت افزا ہے یہ دریا کا بھی کیا آبِ رواں کیسی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے یہاں
آ رہا ہے یہ بہت دور سے جائیگا کہاں دیکھ کر اس کو طبیعت ہوئی اپنی شاداں

اس کی رفتار ہے مستانہ کہ معشوقانہ
ہوشیار اس کو مگر دیکھ کے ہو دیوانہ

بامداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار
صوفی! از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

صبح کا وقت سہانا ہے نشاط افزا ہے
کھل جاتی ہیں خود آنکھیں یہ تماشا کیا ہے

[1] سبحان اللہ!

یادِ اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے!

(سنسکرت کے دوہوں کا آزاد ترجمہ)

(جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے لکھنوی)

اُف انوکھی وہ سجاوٹ وہ انیلی چتون
چمپئی رنگ پہ چندن کی وہ بندی کی پھبن

کھل گیا جیسے چمن یہ تھا ہنسی کا نقشہ
تازہ اک پھول کنول کا تھا شگفتہ چہرہ

بسترِ ناز سے اُٹھنے پہ یہ تھا جس کا حال
چھوئی موئی کی طرح دردِ جدائی سے نڈھال

یادِ اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

جیسے پیغامِ سحر پر کوئی نرگس کی کلی
مسکراتی ہے کبھی اور لجاتی ہے کبھی

یہی ان انکھڑیوں کا نیند میں نقشہ دیکھا
خوابِ رنگیں کے تصوّر کا کرشمہ دیکھا

یادِ اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

دیکھ کے آئینے میں اس کی ادائیں گیسو
رُخ پہ جھک پڑتے تھے لینے کو بلائیں گیسو

وہ جوانی کہ نثار اس پہ لپیٹ پھولوں کی
مشک و صندل کی مہک حسن کے سینے میں تھی

پلکیں ان آنکھوں پہ یوں سایہ فگن تھیں گویا
عشق نے حسن کو آغوش میں لینا چاہا

یادِ اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

۲۰۳

وصل کے بعد یہ تھا شرم سے اس کا عالم
سُرخی آنکھوں کی نہ تھی خونِ کبوتر سے کم

اور کُندن سے دمکتے ہوئے چہرہ پہ عرق
گل کے رخسار پہ غازہ سا ملے جس طرح شفق

یوں پسینے کی تھی اک بوند لبِ نازک پر
جھلملاتا ہوا ستارہ کوئی ہنگامِ سحر

لاکھ بیتاب تھے گل ہائے تبسم کے لئے
غنچے مُنہ کھول نہ سکتے تھے تکلم کے لئے

شاخِ مرجاں سے بھی نازک وہ کلائی اسکی
دانت وہ جن سے کہ بے آب ہو موتی کی لڑی

چال وہ ہنس کی جو چال کو ٹھوکر میں اُڑائے
دو قدم یوں جو چلے بادِ سحر غش آجائے

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

آہ وہ وقت کہ وہ شوق کے آغوش میں تھی
گو اندھیرے میں نظر آتی نہ تھی شکل اسکی

جوت میں رتنوں کی ناگاہ ہوئیں چار آنکھیں
مسکرائی ذرا اور پھیر لیں اک بار آنکھیں

شرمِ آسودہ تبسم کو بھلاؤں کیونکر
ایسے خاموش ترنّم کو بھلاؤں کیونکر

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

بھولی صورت پہ غضب اس کا وہ اندازِ حجاب
جس سے مدہوش ہو عالم وہ شراب اس کا شباب

جیتے جی اس کو جو پھر ایک نظر دیکھ سکوں
عیشِ لافانیٔ فردوس کو قربان کروں

یاد اِس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

کیوں کٹھن ہو نہ مجھے زیست کا اک اک لمحہ
دور جب اس سے رہوں لطف نہیں جینے کا

کاٹ دے موت کہیں جلد گلے کا پھندا
صبرِ جاوید و سکونِ ابدی کر کے عطا

یاد اُس جانِ تمنّا کی رلاتی ہے مجھے

شرط

مجید امجد صاحب بی۔ اے (جھنگ)

یہ نظم جو حقیقت نگاری کا ایک نہایت لطیف اور نشہ آور نمونہ ہے چیلنج ہے ان روائتی شعراء کے لئے جو غزل کی محبت کو حقیقی محبت کہتے ہیں محبت کبھی ادغامِ حسن و عشق کے بغیر مکمل ہو نہیں سکتی اور پھر بھی محبت کا سہرا عورت ہی کے سر رہتا ہے۔ ہمارا چاہنا، خود کو چاہے جانے کی آرزو کا پرتو ہوتا ہے۔ جب یہ نفسیات ہیں تو اب ذرا ان ہجر کی راتوں کی تاریکی پر نظر ڈالئے جہاں کانٹوں کے بستر پر غزل کا شاعر ازل سے ابد تک تڑپتا رہتا ہے ——— !؟

"شرط" خوب ہی نہیں خوب تر ہے۔ اور نئے تقاضاتِ شعری کی بہترین نمائندگی ! ساغر

تجھ کو یہ ڈر ہے کہ ناموس گہ عالم میں — عشق کے ہاتھوں نہ ہو جائے تو بدنام کہیں
آج تک مجھ سے جو شرما کے بھی تو کہہ نہ سکی — وہ ترا راز زمانے میں نہ ہو عام کہیں
کسی شب نالۂ بے تابِ فلک سوز کے ساتھ — نہ نکل جائے ترے لب سے مرا نام کہیں
روزنِ در سے لگی منتظر آنکھوں کا حال — جا کے تاروں سے نہ کہہ دے شفقِ شام کہیں!
اس کی پاداش میں ساقیٔ فلک چھین نہ لے — مرے ہونٹوں سے ترے ہونٹوں کا یہ جام کہیں
عہدِ آغاز کی ناعاقبت اندیشی کا — ہو ترے حُسن کی رسوائی نہ انجام کہیں
یہ تری شرطِ وفا ہے کہ وفا کا قصہ — دیکھ پائے نہ گردشِ گرِ ایام کہیں

ہاں مری روح پہ مسطور ہے یہ شرط تری
مجھے منظور ہے منظور ہے یہ شرط تری

تو یقیں رکھ کہ ترے عشق میں جیتے جیتے — عدم آباد کی آغوش میں سو جاؤں گا میں
ایک دن دل سے جب آوازِ شکست آئیگی — اس کے آہنگ فنا رقص میں کھو جاؤں گا میں
موت کے دیو کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو — جذب اس شعلۂ جانسوز میں ہو جاؤں گا میں

اور خدا پوچھے گا وہ راز با صرار ترا
اس کے اصرار سے ٹکرائیگا انکار مرا

غالب و عارف

نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف مرحوم کے نواسے اور لسان الغیب حضرت اسد اللہ خاں غالب کی بیوی کے بھانجے ہوتے تھے۔ عارف مرحوم کی والدہ اور غالب مرحوم کی اہلیہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔

عارف مرحوم غالب کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ گو نقشِ اوّل تھے لیکن نقوشِ مابعد سے کسی طرح آب و رنگ میں کم نہ تھے۔

غالب مرحوم اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب عارف کا جوانی میں انتقال ہوگیا تو ایک غزل بطور مرثیہ لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف مرحوم کا اصلی دیوان جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر افشاں مرحوم کے کتب خانے میں تھا۔ ایام غدر میں دستبرد ہوگیا۔ نیّر افشاں مرحوم نے عارف کا وہ کلام جو اُن کو خود یاد تھا۔ اور وہ جو اُن کے اور عزیزوں دوستوں کو زبانی یاد تھا یا کسی کے پاس لکھا ہوا تھا بہت کاوش سے جمع کر کے دوبارہ دیوانِ عارف طیار کیا۔

لیکن ابھی اسکے طبع کرانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ نواب صاحب نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا۔

اسکے بعد نواب احمد سعید خاں طالب خلف رشید نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کو بھی اسی دیوان کی طباعت کا خیال رہا لیکن خدا جانے کیا وجوہات پیش آئیں کہ اپنے محترم والد کی طرح وہ بھی اسی خیال کو مکمل کرنے سے قبل رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ اب دیوانِ عارف۔ عارف مرحوم کے خلفِ اکبر مرزا باقر علی خاں مرحوم کی بڑی صاحبزادی ——— بیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم کے پاس محفوظ ہے۔

ان بیگم صاحبہ کو غالب مرحوم نے نبیون بیگ کے خطاب سے جابجا اپنی تصانیف اور خطوط میں یاد کیا ہے۔ اور ان کی پیدائش کی تاریخ سبدِ گل میں موجود ہے۔

بیگم صاحبہ موصوفہ نے اب اپنے جدِّ عالی تبار کے کلام بلاغت نظام کو طبع کرانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ عنقریب دیوانِ عارف زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر شائقینِ ادب کے لئے منظرِ عام پر آجائے گا۔

میں محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا بیحد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بطور خاص ایشیا کے لئے یہ مخمس اور تمہیدی نوٹ کے ساتھ ارسال فرمایا۔

ساغر

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کئے ہوئے　　روشن چراغِ مہ سے شبستاں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کئے ہوئے　　مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

صورت یہی ہے تو کوئی دم میں ہوا ہے دم　　اب زندگی سے اپنی نہایت خفا ہے دم
پھر پاسِ ننگ و نام سے گھبرا گیا ہے دم　　پھر وضع احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

کیا کہئے کیا شفیق ہمارا ہوا ہے عشق　　ہر دم ہمارے واسطے راحت فزا ہے عشق
گویا کہ پیشکارِ لبِ دلربا ہے عشق　　پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر تارِ سازِ شکوۂ دلدار ہے نفس　　پھر پیراہنِ حوصلہ کا خار ہے نفس
پھر داغِ شعلہ خیزیِ اظہار ہے نفس　　پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

نکلے تو نکلے کوچۂ قاتل میں آرزو　　کیا کیا ہے اپنی اس دلِ بسمل ہیں آرزو
ایک جنگجو کے ملنے کی ہے دل میں آرزو　　چاہے ہے پھر کسی کو مقابل ہیں آرزو
سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

معلوم کیا کرے کوئی اس رنج سخت کو　　تاب و تواں کی کھو دے کے بیخ درخت کو
برباد کر کے صبر کے سامان و رخت کو　　کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

۲۰۷

بندِ گراں ہے عاشقِ ناکام پر ہوس — قانع نہیں ہے نامہ و پیغام پہ ہوس
ڈالے ہے پردۂ تلخیِ انجام پر ہوس — تاکے ہے پھر کسی کو لبِ بام پہ ہوس

زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

ایک یارِ دلنواز کو تاکے ہے پھر نگاہ — اندازِ جاں گداز کو تاکے ہے پھر نگاہ
ایک چشمِ فتنہ ساز کو تاکے ہے پھر نگاہ — ایک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

گو وہ سدا بغل میں عدو کے پڑے رہیں — پیویں ہم اپنے گھونٹ لہو کے پڑے رہیں
پیاسے ہی واں پڑے رہیں بھوکے پڑے رہیں — پھر جی میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں

سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

عارف میں پاکے بوئے دل آغوشِ اشک سے — بھرتا ہوں جامِ چشم کو سر جوشِ اشک سے
آتی ہے یہ صدا لبِ خاموشِ اشک سے — غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مستی کا صدقہ

قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی

وہ آنکھیں تو برسائے جائینگی مستی
کہاں تک کئے جایئے مے پرستی

نہ ہر مدّعی درخورِ شور و مستی
نہ جنسِ مئے عشق ہی اتنی سستی

سمجھ کر مرے دل کو پامال کیجئے
اُجڑ جائے گی ایک آباد بستی

اُسی چشمِ میگوں کی مستی کا صدقہ
مرا ذوقِ رندی و بادہ پرستی

نمودِ شباب ان کو سمجھا رہی ہے
نشیب و فرازِ بلندی و پستی

مرے عشق کی کس مپرسی تو یہ ہے
اب آگے ترے حُسن کی سرپرستی

مرے دل کی ہمّت تو قاصر ہے مائل
اُنہیں کی نگاہیں کریں پیش دستی

نغماتِ شعری

حضرت اصغر شعرؔی بھوپالی

تباہیوں کا ہیولا ہے آدمی کیا ہے
فنا بقا کے مقابل ہے زندگی کیا ہے

بہم مسرّت و غم میں ہما ہمی کیا ہے
تری نظر کا اشارا ہے زندگی کیا ہے

جو تیرے غم میں نہ آئے وہ موت ہے بیکار
جو تیرے ساتھ نہ گذرے وہ زندگی کیا ہے

گذر گئے ہیں خود دار و بے نیاز انہ
وہ پوچھتے ہی رہے کیوں تری خوشی کیا ہے

تمام درد و مصیبت ہے زندگی لیکن
نہ جانے پھر یہ تمنّائے زندگی کیا ہے

مسلسل آہ و فغاں ہے، برابر اشکِ رواں
ترے نثارِ محبت میں اب کمی کیا ہے

بڑی سمجھ سے لیا کام تیرے مستوں نے
تمام عمر نہ سمجھے کہ زندگی کیا ہے

نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے کوئی
برتر از وہم و گماں ہے کوئی

پردہ داریٔ مسلسل کی قسم
ذرّہ ذرّہ سے عیاں ہے کوئی

میری جاتی ہوئی دنیا دیکھے
ہائے ایسے میں کہاں ہے کوئی

وجہِ بیتابیِ دل ہو کر بھی
باعثِ راحتِ جاں ہے کوئی

شکریہ حضرتِ ناصح، لیکن
میرا دل ہے، مری جاں ہے کوئی

غم کی مستانہ خرامی کی قسم
دل کی رگ رگ میں رواں ہے کوئی

نظر کی نیرنگیاں

مشاعرہ ادبی مرکز میرٹھ منعقدہ ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء کی وہ چند غزلیں جو براڈکاسٹ کی گئیں

ادبی مرکز میرٹھ کا آل انڈیا عظیم الشان مشاعرہ جو مرکز کے رکن خصوصی اور میرے مخلص دوست محترمی سیٹھ گوپی ناتھ صاحب رئیس اعظم میرٹھ کی کوٹھی "شانتی نکیتن" میں ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء کو میرٹھ کے علم دوست رہنما محترم پنڈت پیارے لال شرما (سابق وزیر تعلیم صوبہ یو۔پی) کی صدارت میں منعقد ہوا دلوں میں اپنی ابدی یادگار قائم کر گیا ہے۔ اسکے انعقاد و انتظام کے کامیاب بنانے میں "ادبی مرکز" کے جن مشیر، رکن رکین اور مخلص دوستوں نے حسن اخلاص و محبت کا ثبوت دیا ان میں سیٹھ گوپی ناتھ، پنڈت گوپی ناتھ سنہا ایڈوکیٹ، مسٹر اقبال احمد ایڈوکیٹ اور سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں لیکن اس قسم کے استحقاق کو تسلیم کر لینا، کھلے بندوں اس گہرے تعلق کی توہین کرنا ہے جو ان "پیاروں" کو ادبی مرکز اور ساغر کے ساتھ ہے —— میں کیوں اس توہین کا جرم کروں!؟

مقامی شعراء مولانا شمس، مولانا صوفی میرٹھی، مولانا لائق علی صاحب شمیم، حضرت تاج میرٹھی، حضرت اظہار رامپوری، حضرت قمر، حضرت اختر وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے ان معاصرین و مشاہیر نے اس مشاعرہ میں شرکت فرمائی جن کی شرکت ہر جگہ ممکن نہیں ہوتی۔ بلیا جیسے دور دراز مقام سے نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔اے۔ جھانسی سے سید محمد عسکری طباطبائی بی، اے، حضرت تبسم نظامی، علی گڈھ سے جناب کباب (علیگ)۔ دہلی سے حضرت بہزاد لکھنوی۔ لاہور سے حضرت احسان بن دانش۔ لکھنؤ سے پنڈت آنند نرائن ملا ایم۔اے۔ اور میرے بزرگ دوست حکیم الطاف احمد آزاد انصاری و شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے شرکت فرما کر اس ادبی اجتماع کو "جشن شاعرانہ" میں تبدیل کر دیا۔

اس معاصرانہ رافت و محبت کے جواب میں رسمی شکریہ ادا کر کے میں ان کے لطف و کرم کے کیف کو مٹانا نہیں چاہتا!؟

اس مشاعرہ میں میرٹھ کے جملہ ہندو مسلمان طبقے شریک تھے، گو یہ مشاعرہ آل انڈیا اجتماع ہونے کے باوجود ایک مخلوص صحبت کی حیثیت میں منعقد کیا گیا تھا نہ اس کے متعلق عام اعلان تھا اور نہ عام دعوت، لیکن مشاہیر کی آمد کی اُڑتی ہوئی خبر نے اس کو عام سے عام تر کر دیا، اور میرٹھ کے تمام ارباب ذوق اور اہل شوق سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر جمع ہو گئے۔ ہنگامہ در ہنگامہ یہ ہوا کہ شام کو بارش ہو گئی اور سبزہ زار کے بجائے کوٹھی کے اندرونی حصے میں مشاعرہ منعقد کیا گیا جہاں مجمع کے لحاظ سے گنجائش نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں اصحاب مایوس واپس چلے گئے اور سینکڑوں نے مجبوراً بیرونی برآمدہ میں ریڈیو کے ذریعہ ہی مشاعرہ سننے پر اکتفا کیا۔ یعنی قدرت کی بے موقع ستم ظریفی کی وجہ سے بمشکل امن قائم رہ سکا۔ اچھا اب چند غزلیں گنگنائیے۔

(باقی نوٹ صفحہ ۲۱۶ پر غزلوں کے بعد) ساغر

سید محمد عسکری طباطبائی۔ بی اے

چمن میں ایک میخانہ خراماں دیکھ لیتا ہوں
تجھے مصروف گلگشت گلستاں دیکھ لیتا ہوں

شراب و شعر میں پھولوں میں پنہاں دیکھ لیتا ہوں
تجھے ہر پردۂ رنگیں میں عریاں دیکھ لیتا ہوں

شبِ غم آنسوؤں میں تجھ کو خنداں دیکھ لیتا ہوں
کنارِ آب جو سرو چراغاں دیکھ لیتا ہوں

جنونِ حسرتِ دیدار اَب اِس حد پہ آیا ہے
کہ برقِ طور کو سینہ میں پنہاں دیکھ لیتا ہوں

یہ عالم درد کا اَب ہے کہ جب کروٹ بدلتا ہوں
غرورِ حُسن کو مجبورِ درماں دیکھ لیتا ہوں

سرشکِ لالہ گوں پیمانۂ رنگِ طبیعت ہے
اُٹھا کر ایک قطرہ نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

ہر اک شبنم کے قطرہ میں ہر اک آنسو کے موتی ہیں
محبّت، یم بہ یم، طوفاں بہ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

بنا رکھا ہے دیوانہ مجھے شوقِ شہادت نے
کہیں خنجر چلے اپنی رگِ جاں دیکھ لیتا ہوں

ڈبو دوں ناخدا کے ساتھ پہلے ذوقِ ساحل کو
تجھے بھی پھر فریبِ موج و طوفاں دیکھ لیتا ہوں

بفیضِ رنگِ استغنا، بسعیِ خود نگہداری!
گرہ میں غُنچے غُنچے کی گلستاں دیکھ لیتا ہوں

گزر جاتی ہیں منظر کیا پسِ منظر سے بھی نظریں
سُکونِ مُستقل میں عزمِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

نظر مضراب بن کر دوڑ جاتی ہے رگِ گُل پر
کلی کو چھیڑ کر سازِ بہاراں دیکھ لیتا ہوں

نہ تنظیمِ چمن باقی، نہ صف بندیِ گل قایم!
پریشانی خیاباں در خیاباں دیکھ لیتا ہوں

جمودِ سیلِ آزادی نگاہِ پاسباں تک ہے
مُڑیں نظریں تو پھر بُنیادِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

مجھے پھندے میں شیخ و برہمن کیا خاک لائینگے
کہ میں رازِ درونِ کفر و ایماں دیکھ لیتا ہوں

تہِ ابرِ تنک کیا چودھویں کے چاند کو دیکھوں
تصوّر میں ترا حُسنِ پشیماں دیکھ لیتا ہوں

تری آغوش میں دل کا دھڑکنا یاد آتا ہے
جو گُل پر قطرۂ شبنم کو لرزاں دیکھ لیتا ہوں

محبّت کے لئے برسات کا موسم قیامت ہے
ہواؤں میں گلے ملنے کے ارماں دیکھ لیتا ہوں

حضرت تبسّم نظامی

میں جب بکھرے ہوئے گیسوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں / کھلی آنکھوں سے اِک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

ستم پر جب کبھی اُن کو پشیماں دیکھ لیتا ہوں / جہانِ عشق کو سر در گریباں دیکھ لیتا ہوں

جنوں میں چاک ہستی کا گریباں دیکھ لیتا ہوں / دکھاتا ہے جو حُسنِ فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں

نظر بھر کر جسے خود حُسن نے اب تک نہیں دیکھا / وہ جلوہ میں تصوّر میں نمایاں دیکھ لیتا ہوں

نظارہ رات بھر کرتا ہوں پروانوں کے جلنے کا / سحر ہوتے مآلِ شمعِ سوزاں دیکھ لیتا ہوں

وہ خنداں و گل افشاں ہیں نظر میں روح میں دل میں / بہار اپنی گلستاں در گلستاں دیکھ لیتا ہوں

ہر اِک موجِ تبسّم غنچہ ہے ہر غنچہ گلشن ہے / لبوں پر تیرے لُطفِ صد بہاراں دیکھ لیتا ہوں

سمجھ کر ڈالتا ہوں ہاتھ میں اپنے گریباں پر / جنوں میں پہلے ظرفِ جیب و داماں دیکھ لیتا ہوں

چمن میں اے تبسّم مُسکرا دیتے ہیں وہ جب بھی
میں جی بھر کر بہارِ صبحِ خنداں دیکھ لیتا ہوں

حضرت اظہار رامپوری

بہر صورت فریبِ رنگِ امکاں دیکھ لیتا ہوں / جو آئینہ نہیں ملتا گریباں دیکھ لیتا ہوں

جگر کو داغِ غم سے گل بداماں دیکھ لیتا ہوں / میں گھر بیٹھے بہارِ صد گلستاں دیکھ لیتا ہوں

وہ میکش ہوں کہ ہر قطرہ میں طوفاں دیکھ لیتا ہوں / پلا کر ایک چُلّو ظرفِ انساں دیکھ لیتا ہوں

اسیری میں انہیں معلوم کیا نوبت گزر جاتی / غنیمت ہے کبھی خوابِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں

نیازِ عشق بھی تسخیرِ حُسنِ دوست ہے گویا / جہاں کرتا ہوں سجدہ روئے تاباں دیکھ لیتا ہوں

نہیں مٹتا مذاقِ بزم آرائی نہیں مٹتا
گرا کر برق دشمن پر چراغاں دیکھ لیتا ہوں

حقیقت آشنائے موجِ غم ہوں بحرِ عالم میں
جہاں دو اشک گر جاتے ہیں طوفاں دیکھ لیتا ہوں

نہیں کم لطفِ وحشت کا گریباں کے نہ ہونے سے
میں اک دامن میں اپنے سو گریباں دیکھ لیتا ہوں

حدیثِ آرزوئے دل پہ کوئی صاد کرتا ہے
کسی کی کفر بار آنکھوں میں ایماں دیکھ لیتا ہوں

زمانے کی کسی شے کا اثر دل پر نہیں ہوتا
مگر اظہار جب اُن کو پریشاں دیکھ لیتا ہوں

ڈاکٹر مظفر ہمایوں صاحب تاج زبیری میرٹھی

اسیری میں بھی آزادی کے ساماں دیکھ لیتا ہوں
قفس کی گود میں خوابِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں

چُنا کرتا ہوں کلیاں نو شگفتہ موسمِ گل میں
مگر چُننے سے پہلے ظرفِ داماں دیکھ لیتا ہوں

میری آشفتگی کا سلسلہ جانے کہاں تک ہے
کہ جب سوتا ہوں اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

بقدرِ جوشِ وحشت چاک جب دامن نہیں ہوتا
نگاہِ یاس سے سوئے گریباں دیکھ لیتا ہوں

چُرا لیتا ہوں کیف انگیز لب ہائے مغنّی سے
جو نغمے قابلِ سازِ رگِ جاں دیکھ لیتا ہوں

خیال آتا ہے اُبھرے گا کبھی ڈوبا ہوا دل بھی
ستارہ صبح کا جب میں درخشاں دیکھ لیتا ہوں

حضرت بہزاد لکھنوی

صنم خانوں میں جا کر نورِ یزداں دیکھ لیتا ہوں
میں اپنی کفر سامانی میں ایماں دیکھ لیتا ہوں

مری دانائیِ وحشت پہ حیراں ہیں جہاں والے
میں فصلِ گل میں ہر تارِ گریباں دیکھ لیتا ہوں

گئے وہ دن کہ جب خواب سبک تھے میری دُنیا میں
ترے صدقے میں اب خواب پریشاں دیکھ لیتا ہوں

خدا شاہد ہے میری روح تک بے چین ہوتی ہے
میں جب ان نرگسی آنکھوں کو گریاں دیکھ لیتا ہوں

مجھے آواز دے لے ناخدا کیوں ہے پریشانی
کہ میں ٹھہری ہوئی موجوں میں طوفاں دیکھ لیتا ہوں

جنوں کا جوش جب بڑھتا ہے بہزادِ جنوں پرور
تو میں دامن کو تا حدِّ گریباں دیکھ لیتا ہوں

ساغر

دلِ نازک میں کیا اُٹھتے ہیں طوفاں دیکھ لیتا ہوں
نظر سے ان کی اپنا غم نمایاں دیکھ لیتا ہوں

جب ان کے دستِ رنگیں میں نمکداں دیکھ لیتا ہوں
ہے کس منزل میں میرا زخم پنہاں دیکھ لیتا ہوں

شگفتِ لالۂ و گل میں طلوعِ ماہ و انجم میں
جہاں میں چاہتا ہوں ان کو خنداں دیکھ لیتا ہوں

قفس تبدیلِ ہیئت کر کے بن جاتا ہے خود گلشن
تصوّر کو گلستاں در گلستاں دیکھ لیتا ہوں

مجھے جب دیکھنے ہوتے ہیں اندازِ جنونِ دل کے
اُٹھا کر پردہ ہائے جیب و داماں دیکھ لیتا ہوں

مری نومیدیاں امید کے دیپک جلاتی ہیں
اندھیرے میں بھی اک بزمِ چراغاں دیکھ لیتا ہوں

مری بربادکشتی کم نہیں کچھ ساغرِ جم سے
کہ ہر طوفاں کو ماقبلِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

مجھے آسانیوں کی شکل سے نفرت سی ہوتی ہے
جو اک مشکل کو بھی الفت میں آساں دیکھ لیتا ہوں

جنونِ حرّیت نے وہ بصیرت مجھ کو بخشی ہے
تقاضاتِ در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

کلی سے پھول ہونا، پھول ہو کر مسکرا دینا
بہ ہر آغاز انجامِ بہاراں دیکھ لیتا ہوں

لچک کر ٹوٹ جاتی ہے کلائی برقِ لرزاں کی
اُٹھا کر جام میں نبضِ بہاراں دیکھ لیتا ہوں

لگی رہتی ہیں آنکھیں تند موجوں کے تھپیڑوں پر
کہ بن قطرہ اُٹھائے نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

حدودِ دوانہ وخرد مِئی سے آگے ہے نظر میری
رگِ ہستی میں جولاں خونِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

اسی جانب مری کیفیتی بھی پیہم وجد کرتی ہے
کدھر برپا ہے بزمِ رقصِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

حمیّت کی کوئی ادنیٰ سی چنگاری بھی ہے باقی
جلا کر خرمنوں کو نبضِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

حجاباتِ تعیّن میں وہ چھپتے ہیں بہت لیکن
میں ان سے چین کر ان کو ہر عنواں دیکھ لیتا ہوں

تڑپ کر ہاتھ رکھ دیتی ہے قدرت میری آنکھوں پر
جو اک ادنیٰ حقیقت کو بھی عریاں دیکھ لیتا ہوں

مرا ٹوٹا ہوا دل بھی عجب آئینہ ہے ساغر
انہیں اکثر اس آئینے میں حیراں دیکھ لیتا ہوں

(بقیہ صفحہ ۲۱۱)

طرح وغیر طرح کی کوئی قید نہ تھی لیکن ایک مصرعۂ طرح بھی اُٹھا کر ایک قطرۂ نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں" مشتہر کیا گیا تھا جس میں تقریباً ۱۴، ۱۵ حضرات نے غزلیں فرمائیں۔ چنانچہ ۸ بجکر ۵ امنٹ پر پنڈت پیارے لال صاحب شرما سابق وزیر تعلیم یو۔ پی نے اپنا مختصر خطبۂ صدارت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے اہتمام میں "شانتی نکیتن"، سیٹھ گوپی ناتھ صاحب رئیس اعظم کی کوٹھی سے براڈ کاسٹ (ریلے) کیا اسکے بعد طرحی مشاعرہ (ریلے) کیا گیا جو اپنی خصوصیت اور اہمیت کے لحاظ سے نہایت کامیاب طور پر براڈ کاسٹ ہوا۔

یہ پہلی نشست گو اپنی اہمیت وجاذبیت کے لحاظ سے بے نظیر تھی۔ لیکن ۱۱ بجے شب کے بعد دوسری نشست میں جناب آثر بی اے، جناب احسان بن دانش، جناب عسکری طباطبائی، اور حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنی شاہکار نظموں اور جاذب ومرعوب کن اندازِ بیان سے اک حیرت و نشاط کا عالم پیدا کر دیا، یہ لمحات تاریخ میں یادگار رہیںگے کہ جوش نے میرٹھ میں جس جھماوٹ اور استغراق کے ساتھ کامل ڈیڑھ گھنٹے اپنے الہامات کی بارش کی، دوسرے شہر کو یہ فخر وامتیاز حاصل نہیں ہو سکا۔ اور میں جانتا ہوں کہ آسانی سے حاصل بھی نہیں ہو سکے گا۔

جوش صاحب کے علاوہ نواب جعفر علی خاں صاحب آثر نے اپنے ارشادات سے میرٹھ کو اس قدر متاثر کیا کہ ابھی تک ہر زبان پر ان کا نام ہے اور میں تو اگر وہ مجھے مفتخر بھی نہ فرماتے تب بھی ان کے قدیم مداحوں میں سے ہوں۔ کس کس کی تعریف کروں، عسکری نے تڑپا دیا۔ احسان نے دل میں چٹکیاں لے لیں۔ اور یہ سب جادوگر، میرٹھ کے سحر زدگانِ شعر کو دیوانہ بنا کر چلے گئے

ان جادوگروں کی سحر آفرینیوں سے خدا کرے" ہندوستانی مُردوں میں روح پیدا ہو، جو مسرّت اور زندگی کو نہیں جانتے اور نہ جاننا چاہتے ہیں تب تو ان کی شاعری جادو ہے، ورنہ محض شاعری ہے!

ساغر نظامی

نقد و نظر

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۳۸ء

نقد و نظر

کتابوں، رسائل و اخبارات پر تبصرے

مکاتیب غالب پر ایک نظر

از علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری۔ بار ایٹ لا

اُردو ادب سرعت کے ساتھ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے، کسی ادب کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں برابر مختلف النوع کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے، لیکن یہ معیار بہت سطحی ہے فی الحقیقت کسی ادب کی ترقی کا ضامن اس کا عمق ہے۔ یہی چیز دراصل بنیادی ہوتی ہے اور لافانی شہرت کی مستحق و مالک، اُردو ادب ابھی اپنے نشو و نما کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے، ترقی یافتہ زبانوں کے لئے خواہ صورت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اُردو کے لئے لابدی ہے کہ اس میں ایسی کتابوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو، جنکا طرّۂ امتیاز شہرتِ عام اور بقائے دوام ہو، محض دویم درجہ کی کتابوں کی فراوانی اُردو کی پائداری اور ترقی کے لئے کافی نہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ آج کی صحبت میں ہم آپ کو ایک ایسی کتاب سے روشناس کر رہے ہیں جو ہمارے اس معیار کے مطابق اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے کماحقہٗ عہدہ برآ ثابت ہوگی،

مکاتیب غالب، یہ عہد آفریں کتاب ریاست رامپور کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، اور معنوی خوبیوں سے قطع نظر کرکے بھی حُسنِ صوری اور طباعت کی نفاست اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز ہے، اُردو میں کم کتابیں اس اہتمام اور کد و کاوش کا پتہ دیتی ہیں جو اس کتاب کی اشاعت میں کی گئی ہے۔ یہ کتاب آرٹ پیپر پر نہایت خوبصورت مصری ٹائپ میں "مطبعۂ قیمۃ" بمبئی سے طبع ہوئی ہے، مؤلف نے مصری ٹائپ کو لیتھو پر ترجیح دی ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس دعوے اور اہتمام کے باوصف کتابت و طباعت کی چند اغلاط اس کے حسن و جمال میں ایک داغ لگا رہی ہیں، ہمیں یقین ہے کہ دوسری اشاعت میں کتاب ان غلطیوں سے قطعاً پاک ہو جائیگی، تاکہ ظاہری نفاست کے لحاظ سے یہ کتاب "آخری لفظ" بن جائے۔

یہ کتاب نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا اسد اللہ خاں نظام جنگ دہلوی متخلص بہ غالب کے ان عرائض و خطوط کا مجموعہ ہے جو نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں طاب ثراہ اور نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیاں طاب ثراہ اور دیگر وابستگانِ دربار کی خدمت میں لکھے گئے تھے، کل خطوط کی تعداد ۱۱۵ ہے، چند خطوط فارسی میں ہیں اور باقی اُردو میں۔ مکاتیب کے علاوہ چند غیر مطبوعہ اُردو و فارسی قصائد و

قطعات بھی ہیں جو نہ صرف تبرک ہیں بلکہ ادبی خوبیوں کے بھی حامل ہیں، جیسا فاضل مؤلف نے بتایا ہے اگر غالب کے تمام خطوط موجود ہوتے جو انہوں نے نوابینِ رامپور کو لکھے تو ان کی تعداد پانچ سو کے قریب پہنچ جاتی، لیکن ان میں سے اکثر ضائع ہو گئے، اور ہمیں محض باقی الصالحات پر قناعت کرنی ہے۔

ضرورت تھی کہ ایسے ادبی نوادر کے ساتھ جو دیباچہ ہو وہ مخمل میں مخمل ہی کا پیوند معلوم ہو اور دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا "عرشی" کا فاضلانہ اور عالمانہ دیباچہ شرح و بسط، تنقیدِ عالیہ اور رائے حکیمانہ کا پرتو ہے۔ غالب کے ریاست رامپور سے تعلقات ہنوز بہت حد تک تاریکی میں تھے ان پر جس خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے، ادبی نکتۂ نظر سے تو یہ ۸۳ صفحہ کا دیباچہ نہایت اعلیٰ وارفع مقام کا مستحق ہے کیونکہ غالب کے حیات و ادب کے متعلق اس میں سیر حاصل بحث ہے، جیسا دیباچوں کے مختلف حصوں کے سرفہرست سے منکشف ہو جائے گا، جو "تمہید، سرگذشتِ غالب، تصانیف، تلامذہ، لوازماتِ امارت، انگریزی تعلقات، بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقاتِ دربارِ رامپور، انشائے غالب، متعلقاتِ انشا، طباعت خطوط کے عنوانات پر مشتمل ہیں، کم و بیش بیس نہایت مستند و نایاب کتب کی امداد سے ان عنوانات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، خصوصاً انشا رغالب کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اسکے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی طرزِ مکتوبات نگاری اور اسلوبِ بیان کے ہر رخ کے متعلق اس سے بہتر بحث کسی اور جگہ ملنی ناممکن ہے، بہت سی نامعلوم باتیں پہلی بار ظاہر ہوئی ہیں جن میں غالب کے متبنیٰ پوتوں اور بیوی کے متعلق بہت سے نئے واقعات ہیں۔

ان کی زندگی کے متعلق اکثر باتوں کی تصحیح کی گئی ہے، مثلاً مرزا صاحب کا رامپور سے تعلق، عام روایت کے خلاف بجائے ۱۸۵۸ء کے ۱۸۵۷ء سے شروع ہوا۔ انگریزی سرکار میں پنشن و دربار کی بحالی اور کئی باتیں تحقیق سے پایۂ ثبوت تک پہنچائی گئی ہیں جن میں مرزا غالب کی اردو مکاتیب نگاری کی ابتدا اور اسکے وجوہ لائق ذکر ہیں، اس پر اضافہ کیجئے دربارِ رامپور سے تعلقات کی تشریح تو آپ پر ظاہر ہو جائیگا کہ ادبی اور تاریخی خوبیوں کے لحاظ سے یہ کتاب ایک کارنامہ ہے جو دربارِ رامپور کی علم دوستی کا مرہونِ منت ہے، یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ شاید مرزا غالب رح کی اردو نثر نگاری اور زندگی کے واقعات کے متعلق کوئی گوشہ تشنۂ فہم نہیں رہ گیا،

موجودہ تنقید نگاری کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ ہر ادبی کارنامہ اپنے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ اس اصول کی تشریح میں ٹھوکر کھاتے ہیں اور اس لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ان کتابوں کو دیکھ کر جو اپنے ماحول سے ظاہرا مطابقت نہیں رکھتیں پریشان ہو جاتے ہیں اور اس اصول کی صحت میں شبہ کرنے لگتے ہیں، اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ اس معیار کو استعمال کرتے وقت ہمارا مطمحِ نظر ذرا محدود ہو جاتا ہے۔ کسی ادب کے ذہنی ارتقاء کے کئی دور ہوتے ہیں اور ہر دور مشتمل ہوتا ہے کئی رجحانات پر۔ ایک ہی دور کی پیداوار میں اکثر ظاہرا بعد المشرقین ہوتا ہے اگرچہ یہ سب نمائندہ ادبی کوششیں ایک ہی ماحول میں سانس لیتی ہیں اور ایک ہی خیالاتی دنیا سے غذا حاصل کرتی ہیں، ایک ہی دور کی نگارنگ نغمہ آرائیاں ہوتی ہیں جس طرح ایک ادیب اپنے زمانہ کا نہ صرف ترجمان بلکہ نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر اس ادیب کی انشا بھی اس زمانہ کی چغلی کھاتی ہے۔ "پوپ" نے نہایت سچ کہا ہے "ایک انسان کی حقیقت اسکے اسلوب بیان میں مضمر ہے۔" کیونکہ ادب محض ایک آئینہ ہے جس میں ہم زندگی کی گوناگوں ہما ہمی دیکھتے ہیں اور ادیب کا کام ہمارے سامنے آئینہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم کو اس میں زندگی اور اسکے لوازمات کی وہ جھلک دکھائی دے جو اس ادیب کے دل و دماغ میں جاگزیں ہے، ہر ادیب کی انفرادیت اور اس کی ذہنی بلندی کا راز اسی بات میں پنہاں ہے کہ وہ کوئی نئی اور تازہ بات نئے اور تازہ طرزِ بیان کے ساتھ پیش کرے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ شخص جو کوئی ذاتی بات بیان کرنا چاہتا ہے اس کے بیان کرنے کے لئے کوئی ذاتی طریقہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اُردو کے ایک نقاد نے اُردو ادب پر اس اصول کا اطلاق کرتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "مرزا غالب جب اپنے خانگی خطوط لکھنے بیٹھتے ہیں جن میں ذاتی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے تو اپنی خاص طرزِ تحریر سے کام لیتے ہیں برخلاف اسکے تقریظوں اور دیباچوں میں مقبولِ عام طرز روش پر چلنے لگتے ہیں۔

آج جب ہم اپنے ادب کا دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب سے موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنی کم مائگی کا قوی احساس ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے لئے باعثِ صد افتخار یہ بات ہے کہ ہم میں ایک ایسی غیر فانی ہستی مرزا غالب کی ہے جو دُنیا کے اور خدایانِ ادب و فرمانروایانِ اقلیم سخن کا ہم پلہ اور ہمسر ہے

عام بنے مانگی کا ایک غیر منفک لازم البدل ہے ۔ اس وقت ہمارا موضوع بحث غالب کی شاعری کے متعلق نہیں جس کو عبدالرحمٰن بجنوری الہامی خصوصیات کا حامل بتاتے ہیں، اس وقت ہم صرف ان کی نثر نگاری اور بھی اُردو نثر نگاری سے بحث کرینگے ۔

کسی ادبی کارنامہ کی قدر و قیمت کا جائزہ کرنے کے لئے تنقید نگاری کا ایک اصول یہ ہے کہ اس کی لازوال شہرت اس کی اندرونی بہتری وخوبی پر دلالت کرتی ہے ۔

یحییٰ تنہا کے الفاظ میں مرزا غالب کا اندازِ بیان اب بھی محبوب و دلفریب ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے موت کی آبنائے سے گذر کر حیات کے چشمہ کو پالیا ہے اور ابدالآباد تک آپ کی طرزِ تحریر کو قبولیت حاصل رہیگی اور آپ کے گلہائے عبارت مشامِ جان کو ہر زمانہ اور ہر فصل میں اپنی خوشبو سے معطر کرتے رہینگے ۔

کوئی وجہ تو ہے کہ آج جب اُردو نثر نگاری ترقی کے کئی مراحل قطع کر چکی ہے مرزا غالب کی اُردو نثر اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ اب بھی جلوہ فگن ہے یہ بات غور طلب ہے کہ مرزا غالب نے اپنے زمانہ کی ادبی فضا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا، ادب کا یہ ایک نکتہ ہے کہ جہاں ادیبوں کی اکثریت اپنے زمانہ کی عام طرزِ نگارش کو استعمال کرتی ہے ۔ ادبی طباع جب زبان استعمال کرتے ہیں تو اسکے مطیع ہو کر نہیں بلکہ اس پر قابض ہو کر نیومین (Newman) کا دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ غیر معمولی اور زبردست شخصیتوں کے ہاتھ زبان پر ہمیشہ ایک تازیانہ لگتا ہے، مرزا غالب نے اپنے ادبی ماحول کی کایا پلٹ کر دی اور ان کی مساعی جمیلہ کے اثر سے اُردو نثر نگاری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے ڈاکٹر درفود کا مقولہ ہے "کسی ادیب کی شخصیت میں جتنی مخصوص انفرادیت ہوتی ہے اسی قدر اس کا اسلوبِ بیان اس کے ماحول کی عام نگارش سے مختلف ہوتا ہے" مرزا کی ساری شاعری ان کی ساری ادبی کوششیں ان کی زندگی اور ان کے روزمرّہ واقعات کے چٹکلے سب ان کی انفرادیت کے شاہد ہیں ۔ مولانا عرشی نے ٹھیک کہا ہے "مرزا صاحب کو قدرت نے اپج والی طبیعت عطا کی تھی، وہ فطرتاً روشِ عام کو ناپسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی انفرادیت کو میدانِ ادب میں بھی نمایاں رکھیں" یہی خصوصیت غالب کی تمام ادبی کاوشوں میں پائی جاتی ہے ۔ انگریزی کے ایک نقاد پروفیسر [illegible] نے کہا تھا کہ ادب صدا ہائے بازگشت کا تسلسل ہے غالباً اس حقیقت کا اعتراف ہی تھا جس نے کارلائل کو مجبور کیا کہ ہم کو آگاہ کر دے کہ ادبی کارنامے دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک اصلی آوازیں اور دوسری صدا ہائے بازگشت ۔ جو چیز ان ہی دو قسم کے ادبی کارناموں کو ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اصلی آوازیں وہی ہوتی ہیں جس میں اپنے تجربہ ہوتے ہیں اور جس میں زندگی کے متعلق اپنا نظریہ اپنے انفرادی طرزِ بیان سے پیش ہوتا ہے ۔ یہی ادب اور یہی اسلوبِ بیان عارضیت سے ماوراء ہوتا ہے ۔

ابھی ہم آپ سے اسلوبِ بیان کی اہمیت کے متعلق چند الفاظ کہہ چکے ہیں ۔ یہاں پر اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اسلوبِ بیان آدمی کی شخصیت کا اشاریہ ہوتا ہے، ہڈسن کا نظریہ پروفیسر محی الدین قادری کے الفاظ میں اس خیال کی خوب تشریح کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ "ایک ادیب کے خیالات، معتقدات، احساسات اور توہمات کی موجیں جو اس کی محیط ذہنیت میں اٹھکیلیاں کرتی رہتی ہیں، تمیز، تقابل، تعلق اور تعمق کی جو قوتیں اس کی فطرت میں ودیعت ہیں ظاہری اور معنوی اشیاء کے ساتھ اس کا برتاؤ، رسم و رواج اور تاریخ پر اس کا فیصلہ، اس کی فراست، ذہانت، ذکاوت، ظرافت، متانت، غرض ان تمام کے متعلق لاتعداد اور مسلسل تخلیق جو اس کی غیر معمولی صناعی کی مرہونِ منت ہوتی ہے مخصوص اور انوکھی زبان کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے جو اس کے سایہ کی طرح ہمیشہ اسی سے وابستہ ہوتی ہے" مرزا غالب ؒ کے مزاج کی نرمی اور مانوسیت، خوش طبعی و ظرافت، بے تکلفی و شمول، یہ سب خصوصیات ان کے اُردو خطوط میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں، دراصل ان کے اُردو خطوط ان کی ظرافت جس کے متعلق مولانا حالی ؒ نے ان کو "حیوانِ ظریف" کا خطاب دیا تھا، کے سرمایہ دار ہیں ۔ جو چیز آج ہم کو غالب کے خطوط کو خراجِ تحسین دینے پر مجبور کرتی ہے وہ ان کے خطوط ہیں ۔ ان کے اپنے الفاظ میں ان کی شخصیت کا اظہار ہے ۔ اگرچہ مرزا غالب کے خطوط کا مجموعہ ایک مکمل

کتاب نہیں ہے لیکن وہ ایسی خاصہ کی چیز ہے جس پر ہزاروں کتابیں نثار ہوں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کسی اور ادیب کے خطوط اپنے اندر اس قدر معیت پنہاں رکھتے ہیں جو مرزا صاحب کے خطوط میں موجود ہے اور جس کا اعتراف و ثبوت مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکۃ الآرا، کتاب غالب میں دیا ہے جس میں انہوں نے غالب کے خطوط کو ماخذ بنا کر ان کی ایک مبسوط سوانح عمری تیار کر دی ہے۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ دیوانِ اردو جس کو مرزا غالب مجموعۂ ننگ سے مخاطب کرتے ہیں وہ موجودہ نسل کے لئے ان کا سب سے نمایاں طرۂ امتیاز ہے۔ اسی طرح اگرچہ اردو خطوط انہوں نے اس لئے لکھے کہ علالت کی وجہ سے ان میں ایسی قوت نہ رہ گئی تھی کہ وہ محنت پر وہی وجگر کاوی جاری رہے جو فارسی خطوط لکھنے میں ان کو کرنی پڑتی تھی۔ لیکن یہی اردو خطوط اردو ادب کے پرستاروں کے لئے حرزِ جاں ہیں۔ تاریخ ادب کی یہ ستم ظریفیاں بہت دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔

مرزا غالب اپنے اردو خطوط کی خصوصیت سے بالکل واقف تھے، چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں "مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" نواب انور الدولہ بہادر کو لکھتے ہیں "پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں" مرزا غالب کے خطوط کے تتبع میں اردو کے مختلف ادبا نے جو مکتوبات لکھے اور شائع کئے ہیں وہ زبانِ حال سے مرزا غالب کی قابلِ رشک کامیابی کا گانا گا رہے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ میں جو خطوط ہیں جیسا عرشی صاحب نے بتایا ہے "مرزا غالب کی سنجیدہ ترین مکاتبت ہے" لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنی سنجیدہ ظرافت اور خوش طبعی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اس مختصر سے وقت میں زیادہ مثالیں دینی تو ممکن نہیں لیکن چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ نواب فردوس مکاں کو لکھتے ہیں "یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے گستاخی معاف کرو اور آپ سے اجازت لیکر بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سو اسو روپیہ جو تودہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہیگا یا نہیں؟" ظاہر ہے کہ یہ طرزِ خطاب اس شخص کا حصہ ہے جس کے متعلق مولانا حالی کی روایت ہے کہ "ایک بار نواب کلب علی خاں نے رخصت کے وقت مرزا سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا صاحب نے جواب دیا "حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں" ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں سے کسی ادبی نکتہ کے متعلق کچھ اختلاف ہوا تو ان کی سند کے متعلق لکھتے ہیں "میاں انجو جامع فرہنگِ جہانگیری شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو، سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی نورٌ علیٰ نور ا۔" حکایت لذیذ ہے اور طبیعت نہیں مانتی۔ اس لئے صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کروں گا، رامپور میں نمائش ہو رہی ہے اس کا ذکر مرزا غالب سنتے ہیں اور نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں "نمائشگاہِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں بالا خانے پر رہتا ہوں اتر نہیں سکتا مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا، کہار چلے راہ میں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بینظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر وہ بھی بے پر و بال نہ چل سکوں نہ پھر سکوں، جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے" انہی کو لکھتے ہیں "پیر و مرشد حضرتِ فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا اس کی رسید میں خطِ تحسین و آفریں کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، دو سو پچاس کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی، یہ رسم بری نہیں اگر جاری رہے تو بہتر ہے" ہر شخص جو اسلوب بیان کو شخصیت کا اشاریہ سمجھتا ہے وہ یہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ خطوط یہ ہلکی ظرافت یہ سنجیدہ خوش طبعی اسی شخص کی خصوصیت ہو سکتی ہے جس کے یہ اشعار ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غرض کہاں تک مثالیں دی جائیں ظرافت اِن کی انشار کا ایک جزو لاینفک تھی، اور یہی وجہ ہے کہ جو انداز بے تکلّف دستوں کے ساتھ مستعمل اور مناسب تھا اِس کی جھلک نوّاب فردوس مکاں اور خلد آشیاں کے حضور میں جو عریضے لکھے گئے اُن میں بھی متعدد بار دکھائی دیتی ہے، ادبی نکتۂ نظر سے بعض خطوط شاہکار ہیں۔ ایک مختصر ساخط ملاحظہ ہو، نوّاب فردوس مکاں کو لکھتے ہیں

"خداوند نعمت سلامت جو آپ بن مانگے دیں اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آپڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔ بارِ گرانِ غم سے پست ہوگیا ہوں، آگے تنگ دست تھا اب تہی دست ہوگیا ہوں، جلد میری خبر لیجئے اور کچھ بھجوا دیجئے۔"

یہ ہے وہ انشا پردازی جس پر زبان چٹخارے لیتی ہے، اور ادبی ذوق سر دُھنتا ہے، ان ۱۱۵ خطوط میں بعض میں ظرافت کی چاشنی ہے اور بعض میں ادبی نکتے، اور اکثر محض رسمی تحریریں رسیدیں یا عرائض ہیں، القاب و آداب، دعا و خاتمہ، ان سب میں حتی الامکان اختصار سے کام لیا گیا ہے، اور بہت حد تک یہ خطوط بھی ان سب خصوصیات کے حامل ہیں جنھوں نے غالب کے اُردو خطوط کو بل لیسٹر (Belles Lettres.) کی حیثیت دیدی ہے۔

قصّہ مختصر ایسی بلند پایہ کتابیں اُردو کے استحکام کی ضامن ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وعدہ کے مطابق دربارِ رامپور سے اُسی پایہ کے اور علمی کارنامے جلد ظہور میں آئیں گے۔

انشائے جدید

مصنّفہ محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری، ملنے کا پتہ "خسرو باغ روڈ۔ رام پور سٹیٹ۔ یو۔پی۔

یہ ضروری اور مفید کتاب ریاست رامپور کے شاعر و ادیب محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری نے تالیف کی ہے۔ دورِ جدید کے فارسی خطوط، رقعات اور فرامین کا ایک ذخیرہ اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلا فائدہ اس کے مطالعہ سے یہ ہوتا ہے کہ ایران کی نئی فارسی اور اس کے طرزِ نگارش کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مراسلت اور مکاتبت کے سلسلہ میں بہ آسانی تمام معلومات ہو جاتی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں چھ صفحوں پر ایک مقدمہ ہے جس میں انشار کی مختصر تاریخ اور حالیہ تغیر کا ذکر ہے۔ سیّد محمد علی ایرانی پروفیسر نظام کالج کے مشورہ ایران کی مطبوعہ کتبِ انشار سے خاص اہل زبان کے رقعات و مکتوبات جمع کئے گئے ہیں۔ اور ہر طرح کی مراسلت و مکاتبت کے نمونے اور طریقوں سے روشناس کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایران کے مروّجہ سکّوں، اوزان اور پیمانے بھی تحریر کر دئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجموعی حیثیت میں یہ ایک مفید کتاب ہے۔ اس کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلم یونیورسٹی نے اس کو ایف، اے کے کورس میں داخل کر لیا ہے دوسری یونیورسٹیوں کو یقیناً مسلم یونیورسٹی کی تقلید کرنی چاہئے۔ قیمت درج نہیں۔

دلّی کا سنبھالا

مصنف خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی؛ سائز $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ و جلد و سرورق سب کچھ نہایت حسین و خوبصورت قیمت مجلّد ایک روپیہ۔ ناشر "مکتبۂ جامعہ دہلی"۔

مکتبہ جامعہ دہلی نے اردو ادب کو اپنی کوششوں سے جس قدر مالا مال کیا ہے اس پر کسی کی مہر توثیق کی ضرورت نہیں ہے؛ تاریخ ادب میں اسکی مخلصانہ ادبی و علمی کارگزاریاں جلی حروف میں لکھی جائیں گی اور ہمیشہ اس کے مخلص ادبی کارکنوں کو زندہ رکھیں گی۔

یوں تو اُردو زبان میں مختلف رسالیب ہیں لیکن ہمارے دوست خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کا اسلوب اپنی بے ساختگی، تاثیر اور روانی و شادابی میں اپنی مثال آپ ہی ہے، وہ قلعہ معلّٰی کی کوثر میں دُھلی ہوئی زبان رکھتے ہیں جس کے پس منظر میں دلّی کا تمام شاندار ماضی جھلکتا ہے۔ "دلّی کا سنبھالا" گیارہ ۱۲۶۵ھ کی دلّی کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے جس ہیرو کا خواجہ صاحب نے ذکر کیا ہے اُس میں جان ڈالدی ہے۔ دلی کے خالص محاورات اچھوتے چھوٹے ٹکڑے بھولی بھولی شوخ شوخ، چنچل باتیں، کہیں دل مچلتا ہے کہیں دل بھر آتا ہے؛ کتاب مختصر سی محض ۱۵۵ صفحات کی ہے مگر مختلف فنون کی اصطلاحات اس میں ملتی ہیں؛ جہاں ستار نواز کا ذکر ہے، وہاں وہ موسیقی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں؛ جہاں شہسواروں کا ذکر ہے وہاں وہ مرد میدان نظر آتے ہیں، رزم و بزم اور اس رزم و بزم کے ہیرو، اور خود اس کتاب کا مصنف دلّی کے اقبال و شاندار ماضی کی جیتی جاگتی تصویر ہے، ادیب، عالم، بنوٹ، طبیب حکیم، ضلع جگت کے اُستاد، پہلوان، منجم، شاطر، شاعر، عالم، پیراک، غرضیکہ ہر صاحب کمال کا اس کتاب میں ذکر ہے، اور اس انداز میں ذکر ہے کہ کتاب کا پہلا صفحہ پڑھنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ شخص یقیناً بدقسمت ہے جس نے اس کتاب کو نہیں دیکھا۔

مضامین "فلک پیما"

حجم ۳۸۰ صفحات، سائز "بادۂ مشرق" کاغذ، کتابت طباعت ہر لحاظ سے اعلیٰ اور خوبصورت قیمت درج نہیں، منیجر رسالہ "ہمایوں" نمبر ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

پنجاب کی مردم خیز سرزمین نے ایک طرف اقبال سا فلسفی اور مفکّر شاعر پیدا کیا تو دوسری طرف "فلک پیما" جیسا صاحب فکر انشا پرداز، دُنیا کے دل پر پنجاب ہی نہیں تمام اُردو دُنیا کی عظمت قائم کرنے کے لئے اقبال و فلک پیما دو شخصیتیں میرے نزدیک کافی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اگر کسی نے "مضامین فلک پیما" کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو میرے خیال سے وہ دُنیا کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہا ہے۔ "مضامین فلک پیما" میاں عبدالعزیز صاحب بار ایٹ لا و ریونیو ممبر جے پور (اسٹیٹ) کے ۹۵ مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے جس کی ہر سطر گہرے فکر، بلند خیالی، دلنوازی، بے ساختگی اور اعلیٰ و نفیس مزاح کا موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔

یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی، مگر یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے اسے تین سال کے بعد دیکھا، مجھے خوب یاد ہے کہ بہت کم کتابیں زندگی میں مجھے اپنا متوالا بنا سکی ہیں۔ نامق کمال کا ڈرامہ "خوارزم شاہ" مولانا ابوالکلام مدظلہٗ کا ترجمان القرآن۔ اور "مضامین فلک پیما" اِن تینوں کتابوں کے ساتھ عجیب واقعات پیش آئے ہیں۔

جب میں نے سجّاد حیدر یلدرم کا ترجمہ کیا ہوا خوارزم شاہ ایک شام کو پڑھا تو اس کے مطالعہ سے مجھے ایسا کیف حاصل ہوا کہ لیمپ میں تیل ختم ہو جانے پر میں نے اس کے انتظام میں وقت ضائع نہیں کیا اور سڑک پر ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر صبح تک اس ڈرامہ کو پڑھتا رہا اور صبح سے دوسری صبح تک جب تک میں نے دو مرتبہ نہیں پڑھ لیا میں نے کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔ ایسا ہی واقعہ ترجمان القرآن کے ساتھ ہوا اور "فلک پیما" کے مضامین کو بھی میں نے باوجود انتہائی مصروفیت کے ایک سانس میں مسلسل پڑھا اور پڑھتا رہا۔

غیر معمولی تخلیق اور گہری فلسفیانہ مزاح کی چاشنی ان مضامین میں پائی جاتی ہے؛ سماجی، مذہبی، ادبی اور جملہ مسائل حیات پر آسان اور لطیف، سادہ اور بے ساختہ زبان میں وہ تنقیدی اور مزاحی چھینٹے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے اور دل میں اک مسرّت اور اطمینان پیدا ہوتا ہے۔

فلک پیما کے ادب کا پس منظر، یورپی و ہندوستانی ملا جلا کلچر اور اعلیٰ طبقہ کا ماحول ہے، اس کے تمام مضامین میں زندگی اور حرارت دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے؛ اس کا پیغام "زندگی" ہے، اور زندگی کا بلند ترین تصور؛ ہر قسم کے اوہام کو اس نے ڈھا کر رکھ دیا ہے، بڑی سے بڑی عمارت کو وہ اک موج تبسم سے بتاشہ کی طرح بٹھا دیتا ہے لیکن اس موج تبسم کے پس منظر میں اس کی قدرت فکر کارفرما رہتی ہے؛ وہ چاہتا ہے کہ اگر انسان اشرف المخلوقات ہے تو اُٹھے اور اس کا ثبوت دے؛

اظہار بیان کے طریقوں میں رنگارنگی اور تکمیل ہے، دلچسپی پیدا کرنے کے سلسلے میں وہ ایک ماہر فن آرٹسٹ کی طرح اپنے رنگوں کو جس طرح چاہتا ہے موزوں طور پر استعمال کر لیتا ہے؛ مکالمہ، خط، تقریر، وعظ، جہاں جیسا موقع ہوتا ہے وہاں اظہار کے ان ذرائع سے کام لیتا ہے؛ شاعرانہ تخلیق کا وہ عالم اس کی نثر میں ہے کہ نازک سے نازک شاعر کی نظم میں بھی ممکن نہیں؛ نثر کی آزادی کی وجہ سے اس کی شعریت ہمیشہ فلسفہ در آغوش رہتی ہے، اور پھر اس شعریت کا ایک گوشہ کشت زعفران بھی بنا ہوتا ہے؛

سچ یہ ہے کہ اس کتاب نے شائع ہو کر مزاحیہ ادب کا معیار بتایا ہے؛ مزاحی زبان کا معیار بتایا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ مزاحیہ ادیب کے لئے کس درجہ جامع اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے؛

اس کے فکر ادبی کی مثال ایک شہ زور الھڑ نوجوان کی سی ہے، جو مسکراتا ہوا فضا میں اُڑ رہا ہو، اور ستارے اس کے جلو میں جگمگا رہے ہوں، قہقہہ لگاتا ہوا اُڑا جا رہا ہو۔ زندگی اور موت، ماضی و حال و مستقبل، رنج و عیش سب سے بے نیاز؛

اِس کتاب کا دیباچہ اُردو زبان کے مخلص ادیب میاں بشیر احمد بی، اے (آکسن) مدیر ہمایوں نے تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"فلک پیما کا نصب العین ہے کہ ہر انسان کی رگوں میں قوت و مسرت کا خون دوڑے اور یہ محض ایک خالی سا اصول نہیں بلکہ خود ان کی زندگی اس زبردست خیال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔"

دیباچہ نگار کا فرض ہے کہ وہ چند اوراق میں کتاب کی روح سے ناظرین کو واقف کرا دے، میاں بشیر احمد صاحب نے اِس سلسلہ میں کامل کامیابی حاصل کی ہے؛ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

"فلک پیما کے مضامین کا احاطہ کرنا، ان کے خیالات کو پرکھنا، ان کے خیالات کی گتھیوں کو سُلجھانا، انتہائی دشوار کام ہے، ان کی زبان سُلجھی ہوئی اور سادہ ہے اور ان کا طرز بیان نہایت دلکش اور انوکھا، لیکن ان کے خیالات کو سمجھنے کے لئے کبھی غوطہ زنی کی ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی بلند پروازی کی؛ اس کی وجہ شاید ان کا یہ فلسفہ ہے کہ :۔

"میری تمام کوششوں کا مرکز یہ ہے کہ اپنے آپ کو جانو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے لئے ایک نہ یاد آنیوالا خواب بنا رہوں۔"

جس طرح انسان آب و باد و خاک و آتش کی ترکیب سے بنتا ہے اسی طرح "فلک پیما" کا مضمون ان چار عناصر یعنی شعریت[1] ۔ مزاح[2] ۔ فلسفہ[3] ۔ اور زبان کی روانی و سادگی سے مرکب ہوتا ہے۔ جو کافر یہ لکھے کہ :۔

[1] "اے میری پری میں سنگ تراش نہیں ہوں، میرے پاس صرف ہلکا سا جادو ہے اتنا ہلکا کہ تجھ پر نہیں چلتا، اتنا بھاری کہ میں اس کے بوجھ سے ہل نہیں سکتا۔"

[2] "جس طرح تم ایک شاندار نظم ہو اُسی طرح میں ایک بے سروپا کہانی ہوں ——————— !"

[3] "جس طرح تم سے دُنیا کی توقع یہ ہے کہ بجائے نظم بنے رہنے کے تم ایک کامیاب روحانی جاروب کش بن جاؤ، اسی طرح مجھ سے گلہ یہ ہے کہ میں ایک کارآمد بوریا کیوں نہیں ؟

۴۔ "تہذیب کا تازیانہ انسان سے کیا کیا نہ قبولوالیگا، یہ تو مدت ہوئی کہ انسان انگوٹھا لگا کر تحریر دے چکا کہ مذاہب لغو، مذاہب کے اوہام سب باطل، تہذیب کی مار پیٹ سے مجبور انسان نے پہلے تو خدا کو بت خانوں سے نکال کر آسمان پر بٹھایا پھر آسمان سے اُتار کر خود اپنے ذہن کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ہستی مطلق کہکر اُسے مقید کیا، اب انسان خود اس تہ در تہ ذہنی زنداں سے بھی منکر ہے۔"

۵۔ "کائنات نے انسان کے پیچھے کس غرض سے یہ پولس لگا ئی ہے ؟ کس جرم کے بدلے، کبھی جو یونہی گردن موڑ کر ان سال و ماہ کو دیکھ لیتا ہوں جو اب پس پشت ہیں تو جلدی سے مُنہ پھیر لیتا ہوں، اس تمام دھندلکے میں اگر کچھ اُجالا ہے تو دلو جاڑا ابلہانہ اُمنگوں کا۔"

اس کی شعریت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے ! ؟

زبان میں خال خال نہایت معمولی لغزشیں ہیں؛ مگر ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی حسین کنواری کے رخساروں پر سیاہ تل؛

ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ "فلک پیما" ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان راہوں سے اتفاق نہیں رکھتے جو ملک کو ہزاروں برس پیچھے لے جائیں؛ وہ جدت اور بالکل جدت کے قائل ہیں۔ لیکن اس اختلاف میں وہ کہیں رجعت پسند کے لباس میں نظر نہیں آتے۔ کیونکہ وہ ان حقائق سے انکار نہیں کر سکتے ہیں جو ہندوستان کی آزادی یا غلامی سے تعلق رکھتے ہیں؛

محض ملکی آزادی ہی ان کے اَدب کا منتہا نہیں، بلکہ اس باب میں وہ ذہنی آزادی اور عالمگیر مجلس آزادی کے خواہاں ہیں۔ وہ انسان کو اس کے بنائے ہوئے مفروضہ بندھنوں سے آزاد کر کے خالص مسرت اور راحت سے ہمکنار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان تمام آرزوؤں کی روح ان کا انسانی خلوص ہے جو لفظ لفظ میں کار فرما ہے۔ وہ غریب کی نمائندگی اس تمنا کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ سماج میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ ممکن ہے کہ وہ امیروں کو نہ گھٹانا چاہیں مگر غریب کو غریب نہیں دیکھنا چاہتے اور زندگی کی ملمع کاری سے سخت متنفر ہیں؛

مشرق کی تمام اچھی خصوصیات کے وہ مست ہو کر گیت گاتے ہیں، مگر اُن خامیوں پر جو مشرق کی ترقی میں حائل ہیں استہزا کرتے ہیں اور مغرب کی ترقی کے مقابلہ میں اس کو بیکار ثابت کرتے ہیں؛

"جمالیات" کے وہ خاص طور پر ماہر ہیں، ان کے ادب میں نصف مزاح ہے اور نصف جمال، گویا ان کا ادب ایک شوخ و شنگ محبوب ہے جو اپنے الہڑپن سے ساری محفل کو بیک نگاہ چھیڑتا ہے اور مردہ دلوں کو کشت زعفران بنا دیتا ہے؛ ایسی کشت زعفران جس کا رنگ پیلا نہیں، گہرا سُرخ ہے؛

آہنگ

حجم ۱۰۴ صفحات، چھوٹا سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ کاغذ، لکھائی، چھپائی سب کچھ دیدہ زیب و دل کش،
قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ "حلقۂ ادب لکھنؤ"

"آہنگ" میرے دوست اسرار الحق صاحب مجاز بی۔ اے (علیگ) کی نظموں کا مجموعہ ہے؛ جو اس وقت مجھے ملا جب زیر نظر مہر کے تمام ابواب تقریباً مرتب و مکمل ہو چکے تھے۔ اس لئے فی الحال مفصل اظہار خیال تو ناممکن ہے لیکن آہنگ کی فطری کشش نے ایک اجمالی نظر کے لئے مجبور کر دیا؛

سب سے اوّل "زیب داستان" کے عنوان سے سجاد ظہیر صاحب نے ایک مختصر دیباچہ سپرد قلم کیا ہے جو اپنی جگہ بہت قیمتی ہے اور جو شلوسٹ نقطۂ نگاہ سے ادب جدید و شعر نو کی ایک نازک تشریح ہے؛

یہ دوسری بات ہے کہ یہ نازک تشریح ہر نقاد مزاج آدمی کو اصل کتاب کے متعلق زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے اور بحث و نظر کے مختلف گوشے پیدا کرتی ہے لیکن بہر حال مجاز کی شاعری میں وہ بنیادی انقلابی خیال ضرور پایا جاتا ہے جس پر ایک عالیشان عمارت تعمیر ہونے کی نوید ملتی ہے۔

نئی سماج کے نئے تقاضے جو کلچرل اور ذہنی فضا پیدا کر رہے ہیں، ہندوستانی ادب کے نوجوان ادیب و شعراء قدرتی طور پر اُس سے متاثر ہوتے ہیں، بعض میں یہ تاثر زیادہ پایا جاتا ہے اور بعض میں کم، لیکن ان تقاضات کو قبول کرنے کا شعور بجائے خود ایک دماغی ترقی اور روحانی بلندی ہے، مجازؔ ان نوجوان شعراء میں سے ایک . . . . ہیں، جو نئی دماغی ترقی اور روحانی بلندی کے علمبردار ہیں اور شعر و ادب کو انسانی زندگی سے ملا دینا چاہتے ہیں۔

"انجمن ترقی پسند مصنفین" نے ان کا مختصر مجموعۂ نظم شائع کر کے ہمارے وارفتہ مزاج اور ملیح الخیال شاعر کو نہایت بروقت دعوت دی ہے کہ وہ اپنی ذات کا عرفان اور اپنی دماغی اہلیتوں کی حفاظت کرے، یہی نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور جملہ قوم پر اُس نئے شاعر سے روشناس کر کے ایک احسان کیا ہے جس کی ذات سے مستقبل کی شاندار امیدیں وابستہ ہیں۔

اب اس حقیقت کو زیادہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ اُردو شاعری میں جو سب سے زیادہ ارتقائی شاعری موجود ہے وہ تصوّف اور جذبات کی آمیزش کا ایک وجدانی نمونہ ہے یہ وجدان ہماری روح کو متوالا تو کر دیتا ہے، مگر ذی حیات نہیں بناتا، منفعل تو کرتا ہے مگر عملی نہیں بناتا۔

ادب و شعر کا جدید تصوّر، زندگی میں اُس حقیقت نگاری کو وسیع کرنا چاہتا ہے، جو زندگی کے حقیقی پہلو کو مدِ نظر رکھے، اور جس کی عمارت کسی قدیم فلسفہ کے سہارے نہ کھڑی کی جائے، بلکہ فرد کے ذاتی تاثر کی بُنیاد پر چُنی جائے۔

ادب میں یہ واقعیت نگاری ([illegible]) شروع ہو کر وسیع ہونے کے درجہ تک آگئی ہے، اس سلسلہ میں آہنگ کی ایک نظم "آوارہ" بڑی دلدوز ہے، مجازؔ کہتا ہے ؎

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل — پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل — اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں!؟

"غمِ دل" اور "وحشتِ دل" رسمی غزل کا "غمِ دل" اور "وحشتِ دل" نہیں ہے۔ انہیں دو ترکیبوں میں تاثرات کی ایک دُنیا پوشیدہ ہے۔ اور یہی دو ترکیبیں اس نظم کی بُنیاد ہیں۔

یہ مفلس اور غلام ملک جوانی میں سرشار نوجوانوں سے خالی نہیں ہے۔ اُن نوجوانوں کی وہی نفسیات ہیں جو دُنیا کے نوجوانوں کی ہو سکتی ہیں، لیکن ہندوستان کے ہر نوجوان کی دُنیا تنگ ہے ہر قسم کی آرزو دل میں پیدا ہوتی ہے، جائز و ناجائز، لیکن نہ جائز کے پورے ہونے کا امکان ہے نہ ناجائز کی تکمیل کی گنجائش، چاندنی اپنے فرش کرتی ہے اور سمیٹ لیتی ہے۔ بہار گنگناتی ہوئی آتی ہے اور گذر جاتی ہے ؎

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں — ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں — اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جوانی کی یہ بھی ایک خامکاری ہے کہ وہ رسوائی کا خیال کرتی ہے۔ سماج کے اعتبارات سے مرعوب ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس احساس کے بعد "غمِ دل" اور وحشتِ دل میں کیسی جان پڑتی ہے!؟ پھر آگے چل کر کہتا ہے ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب — جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب — اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ بند اور اس میں تشبیہ و استعارات کی ندرت، خاص طور پر قابلِ غور ہے، پُرانے خیال کا شاعر جو ساونتی تمدن کا ایک جزو تھا، اوّل تو

ماہتاب کو کبھی بیلانہ کہتا اور کہتا بھی تو ملّا کے عمامے اور بنئے کی کتاب سے استعارہ نہ کرتا۔ لیکن۔ مجاز انسانی جذبات شباب، اور رومانی تقاضوں کو زندگی کی اقتصادی حقیقتوں سے آزاد نہیں سمجھتا (جیسے کہ وہ ہیں بھی) اس کا غمِ دل کیا ہے، زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا، اس کی وحشتِ دل کیوں ہے؟ ناکامی، آوارگی، بیکاری، تاریکی، اس لئے نفسیاتی طور پر ماہتاب اس کو "عروس کا جھومر" نظر نہیں آتا، ملّا کا عمامہ اور بنئے کی کتاب دکھائی دیتا ہے بالآخر تیسرے مصرع میں وہ کھل جاتا ہے اور مفلس کی جوانی سے استعارہ کرتا ہے، یہی نہیں، ایک برش اور دیتا ہے اور تصویر کو رنگین و غمناک تر بنا دیتا ہے یہی وہ "واقعیت" ہے جو نفسیاتی طور پر کم از کم تصوّف کی بھول بھلیوں کے مقابلے میں زیادہ قیاسی ہے۔

اس کے بعد جوانی کی ترنگ، ارادوں کی شکست، کس مپرسی کی کشمکش اس طرح بیان کرتا ہے ؎

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں — لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے، یہ "قسمت" نہیں — اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

تیسرے مصرع میں "قسمت" کا ذکر میرے خیال سے اس قسم کے شاعر کے لئے اس کے عقیدہ کے منافی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم بہت سی پرانی باتوں کے عادی ہیں۔ ان ہی سے ایک قسمت کا تخیل بھی ہے۔ تمام نظم نہایت مؤثر، بلند اور لطیف تاثرات سے معمور ہے۔ آخری بندوں میں سے ایک بند اور سناتا ہوں ؎

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے — سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے — اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اصلی چیز احساسِ مفلسی ہے، اور یہ واقعیت کے عین مطابق ہے، بہرحال یہ اور ایسی کئی نظمیں خاص کر رات اور ریل، سرمایہ داری وغیرہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ایک نئی شخصیت سے روشناس کراتی ہیں، میں نے دلی جذبات کو روک کر یہ چند سطور لکھی ہیں، گو مجھے اساتذہ کی بوڑھی نسل" سے خوف نہیں، لیکن ایسی باتوں سے ان کے دل پر جو بیتتی ہے اس کا ضرور خیال کرتا ہوں، اس لئے مجاز کی شاعری پر کم از کم روشنی ڈالی ہے تاکہ تنگ دل دنیا دوست پرستی کا اتہام نہ لگائے۔ مگر ایشیا کی کسی اشاعت میں ایک مستقل مضمون انکے متعلق شائع کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی کے مطبوعات پر ایک نظر

مکتبہ جامعہ دہلی اپنے مطبوعات میں موضوع کے لحاظ سے ادبی رنگا رنگی اور تنوع کا خاص خیال رکھتا ہے یعنی نہ صرف اُس نے ٹھوس سیاسی علمی کتابیں شائع کی ہیں بلکہ افسانہ و ڈرامہ، شعر و شاعری کی اعلیٰ ترین تصنیفات کی اشاعت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قوم کے جملہ ذہنی و دماغی مطالبہ کی تکمیل کا تنہا ذمہ دار ہے۔

اب رہا کتابوں کا جمالیاتی پہلو سو ایک کتاب ایسی نہیں ہے جس کی لکھائی، چھپائی اور عام گیٹ اپ دلکش و بلند نہو، اس قسم کا آرٹسٹک تناسب اُسی ادارے کے کام کرنے والوں میں پایا جاسکتا ہے جو قلب و نظر اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے مہذّب اور شاعر ہوں۔ آئیے مکتبۂ جامعہ کے چند تازہ مطبوعات کو دیکھیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائیگا کہ میں غلط طور پر متاثر نہیں ہوں۔

بیوہ مصنفہ منشی پریم چند مرحوم مجلد صفحات ۹۸ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ۸/
سرِورق بیوگی کا ایک دردناک و ماتمی منظر ہے۔ زرد جلد کے رنگ میں بھی بیوگی کی مناسبت رکھی گئی ہے۔ کاغذ سفید چکنا، کتابت و طباعت

اعلیٰ۔ زرد سرورق بلاک سے آرٹ پیپر پر چھپا ہوا ہے۔ یہ منشی پریم چند کے مشہور ناول کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ منشی پریم چند اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور ان کا تمام ادب ماحول ———— سے تعلق رکھتا ہے، وہ ماحول کی تصویرکشی میں کمال رکھتے تھے اور اُن امراض سے بھی اچھی طرح واقف تھے، جن میں ہندوستانی سماج مبتلا ہے۔ ان ہی میں سے ایک بیواؤں کی شادی کی بندش بھی ہے۔ ہندو سماج میں گو اب اس مسئلہ کے متعلق شدت نہیں پائی جاتی تاہم بیوہ کی شادی کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اس جاہلانہ اور خلاف عقل رسم کے خلاف پریم چند نے جہاد کیا اور اپنی تحریر کے ذریعہ سوسائٹی کو اُن مضرتوں سے آگاہ فرمایا جو بیواؤں کی شادی کی مخالفت میں پوشیدہ ہیں۔

اپنی اس شاہکار تصنیف میں پریم چند نے ایک بیوہ کی افسوسناک زندگی کی کامیاب تصویرکشی کی ہے۔ اور لفظ لفظ میں ان کی زبان و اسلوب کا شباب اپنا جلوہ دکھا رہا ہے، ہندوستانی معاشرت کی تصویر وہ کس کامیابی سے کھینچتے ہیں اور اوّل سے آخر تک کس خوبی سے کلائمکس کو قائم رکھتے ہیں۔ اسکے متعلق اب بحث کی گنجائش نہیں، کہ یہ مرحوم کا خاص کمال تھا۔ ہندوستانی ادب کے اس شاہکار کو ہندوستان کے ہر تعلیم یافتہ گھر میں ہونا چاہئیے۔

معاہدۂ عمرانی (از روسو)

مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت عہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ سرورق مع کور خوبصورت جلد مضبوط

یہ فرانسیسی حکیم ژان ژاک روسو کی تصنیف "کونترا سوسیال" کا کامیاب اُردو ترجمہ ہے جس کو مع مقدمہ و حواشی ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی نے ترجمہ کیا ہے۔ جب تک کوئی قوم آزاد نہیں ہوتی اس وقت تک وہ تخلیق کی اُن برکتوں سے محروم رہتی ہے جو آزادی ہی کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں، مفلسی اور اقتصادی تباہی اور سیاسی رجعت پسندی کے عہد میں تو ممکن ہے کہ انفعال پرست شعراء کی بہتات ہو۔ لیکن "حکیم" کی پیدائش ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب قدرتی اور واقعاتی دونوں نقطۂ نگاہ سے محض "ترجمہ" کے دور میں ہے زبان کی کمسنی اور کم مائگی کے لحاظ سے بھی تو یہ غلط اور غیر متوقع نہیں، ابھی عرصہ تک ہمیں اسی کوشش کو کامیاب بنانا بھی ہے۔ یہاں تک کہ اُردو زبان دوسرے علوم اور دیگر زبانوں کے ادب سے مالا مال نہ ہو جائے۔

سب سے پہلے روسو کی تصویر اس کتاب کی زینت ہے اسکے بعد دیباچۂ مترجم، مقدمۂ مترجم اور پھر پیش لفظ۔
مترجم کے مقدمہ کے بعد پہلی کتاب تمہید سے شروع ہو کر مندرجۂ ذیل ۹ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) پہلی کتاب کا موضوع
(۲) ابتدائی معاشرت
(۳) حق اقوی
(۴) غلامی
(۵) معاہدۂ اولین کی طرف رجوع کرنا ہمیشہ ضروری ہے
(۶) معاہدۂ عمرانی
(۷) فرماں روا
(۸) مدنی زندگی
(۹) جائداد غیر منقولہ

دوسری کتاب ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے جس کے ضمنی عنوانات یہ ہیں۔

(۱) اقتدار اعلیٰ کا ناقابل انتقال ہونا
(۲) اقتدارِ اعلیٰ کا ناقابلِ تقسیم ہونا
(۳) کیا ارادۂ اجتماعی سے غلطی ناممکن ہے؟
(۴) اقتدارِ اعلیٰ کی حدود
(۵) حق زندگی و موت
(۶) قانون
(۷) قانون ساز
(۸) قوم

(۹) قوم (بہ سلسلۂ ماسبق) (۱۱) قوانین کی تقسیم

(۱۰) قانون سازی کے مختلف طریقے

تیسری کتاب میں ۱۸ ضمنی عنوانات ہیں، اور چوتھی میں محض ۹۔

فاضل مترجم نے مقدمہ و حواشی کی تیاری میں روسو کی دوسری اہم تصانیف کے علاوہ انگریزی اور جرمن کتابوں سے بھی مدد لی ہے، دیباچہ کے بعد مترجم کا مقدمہ بجائے خود ایک نہایت اہم حصہ اس کتاب کا ہے، جس کے مطالعہ سے روسو کے دل و دماغ نفسیات اور تمام زندگی پر گہری روشنی پڑتی ہے؛ نہایت وضاحت کے ساتھ اس کتاب کے ماخذ اور فاضل مترجم نے بتایا ہے کہ روسو کے فلسفے اور اس کی زندگی میں کوئی جہ تطابق ہے اور اسکے بعد کتاب کے ۱۴ صفحات پر فرانسیسی حکیم کے سوانح حیات تحریر کئے ہیں جو تمام و کمال روسو کی ہستی کو پیش کر دیتے ہیں۔

سوانح حیات کے بعد اسکی مشہور اور اہم تصانیف سے بحث کی ہے۔ آخر میں "معاہدۂ عمرانی" کے متعلق بتایا گیا ہے کہ تمام مہذب قوموں کی زبان میں (Contrat Social) کا ترجمہ موجود ہے اور انگریزی زبان میں تو اسکے متعدد ترجمے موجود ہیں۔ آخر میں ۱۳ صفحہ میں روسو کے فلسفہ پر نہایت سیر حاصل بحث ہے صفحہ ۲۶ پر ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ روسو اشتراکیت کا قائل ہے کہ انفرادیت کا؟ جو مصنف اسے اشتراکیت کا حامی خیال کرتے ہیں وہ اسکی تصنیف "انسانی عدم مساوات کے اسباب" کے ان الفاظ کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو اس نے "موجودہ سوسائٹی کے بانی" کے متعلق کہے ہیں:" وہ شخص جس نے پہلے پہل زمین کے ایک قطعہ پر قبضہ کر کے یہ کہا کہ یہ میری ملک ہے اور جس کے اس دعویٰ کو دوسرے احمقوں نے بے چون وچرا تسلیم بھی کر لیا وہ، روسو کے خیال میں ہماری موجودہ سوسائٹی کا اصل بانی ہے؛ کتنے جرائم، جنگوں، قتل و غارتگری مصائب اور آلام سے بنی نوع انسان کو نجات ملتی اگر کوئی شخص حدبندی کے پتھر اکھاڑ پھینکتا یا کھائیوں میں مٹی بھر دیتا اور اپنی قوم کو مخاطب کر کے یوں چلا اٹھتا:۔ اس دھوکہ باز کی بات کو ہرگز نہ مانو، تمہارا بس خاتمہ ہے اگر تم یہ بھول گئے کہ زمین کی پیداوار کے مالک تم سب ہو اور زمین کسی کی ملک نہیں۔"

"بلاشبہ اس عبارت کے آخری حصہ سے اشتراکیت کی بو آتی ہے لیکن روسو کی پوری تعلیمات کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ اشتراکی ہے اور نہ شخصی ملکیت کو قطعی طور پر ریاست کے حق میں قربان کرنے کو تیار، وہ تو ریاست کو صرف اس حد تک دست اندازی کی اجازت دیتا ہے جس حد تک فلاح اجتماعی اسکی طالب ہو، اور جس کی ضرورت کا خود جماعت کو احساس ہو وہ اپنے مقالہ "معاشیات" میں یہاں تک کہتا ہے کہ:۔

"اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملکیت تمام مدنی حقوق میں سب سے زیادہ ناقابلِ دست اندازی ہے یہ بعض اعتبارات سے آزادی سے بھی زیادہ اہم ہے اور ملکیت معاشرتی نظام کی صحیح معنوں میں بنیاد ہے اور فرائض شہری کی سچی ضامن۔"

کتاب کے آخر میں انگریزی حروف کی ترتیب کے اعتبار سے اصطلاحات کی ایک فہرست اور دوسری اردو حروف کی ترتیب کے اعتبار سے دی گئی ہے۔ جو سیاسی علمی اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے نہایت لازمی اور ضروری تھی؛ زبان شروع سے آخر تک موضوع کی ثقاہت کے باوجود شگفتہ اور سلیس ہے۔

بہر حال معاہدۂ عمرانی کا ترجمہ ہر لحاظ سے اردو ادب کی شاندار خدمت ہے اور اسکے لئے مکتبۂ جامعہ کو جس قدر بھی سراہا جائے کم ہے۔

قصۂ طلب ضرب الامثال

از خواجہ محمد عبدالمجید صاحب دہلوی، سائز $\frac{20\times 30}{16}$ قیمت ۸؍ غیر مجلد حجم ۱۲۸ صفحہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی

غالباً یہ اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے جو قصۂ طلب ضرب الامثال کے متعلق خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی نے تحریر فرمائی ہے۔ تمہید میں خواجہ صاحب نے ان کی تحریر اور تدوین پر روشنی ڈالی ہے اور اسکے بعد ۸، قصۂ طلب ضرب الامثال کو سادہ اور لطیف زبان میں تصنیف فرمایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، خصوصاً بچوں کیلئے یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے،

زبان میں نہایت بے ساختگی اور دلنوازی پائی جاتی ہے۔

دلّی کی دوسو برس کی تاریخ
(تیمور کے حملے سے قبل)

ازسید حسن صاحب برنی ایم۔ اے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی

کون ہے جو اُردو زبان کے مورخ اور یوپی کے ادیب و شاعر مولوی سید حسن برنی ایم اے ایل ایل، بی سے واقف نہو، یہ دوسری بات ہے کہ باوجود قربت اور تعلق کے وہ کبھی ایشیا میں نظر نہیں آتے سو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ہم تو اس "سرمایہ دارانہ ادا" کے بھی قائل ہیں، شکایت بس اتنی ہے کہ دوسری جگہ مورخ کی حیثیت میں برنی صاحب کو جلوہ گر ہونے کا کامل حق ہے، اگر وہ ایشیا میں صرف ایک شاعرانہ جھلک ہی دکھا جایا کریں۔

دلّی کی دوسو برس کی تاریخ ایک اہم تاریخی مقالہ ہے جو اُردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ۱۹ر جنوری ۱۹۳۶ء کو سید حسن صاحب برنی نے پڑھا۔اس مقالہ میں آثار و تمدن کی تاریخ پر گو ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے مگر پھر بھی ذہن میں دلّی کے دوسو برس کی تاریخ (تیمور کے حملے سے قبل) کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔برنی صاحب نے کمال تحقیق سے اپنے اس مقالہ میں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی ہے اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ اور قدر و قیمت دکھانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

مقالہ اک نہایت اہم اور تاریخی دستاویز ہے، جو تاریخ کے طالب علم کے لئے کلیدِ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔کچھ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں ہی کے لئے نہیں، ہر ہندوستانی کے لئے اس کا مطالعہ قیمتی اور دلچسپ ثابت ہوگا۔میں نے جب اس کو پڑھا تو ماضی ایک شاندار خواب کی طرح اک معدوم حقیقت کی طرح میرے دل و دماغ پر چھا کے رہ گیا۔

سبدِ چیں

میرزا غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ، قیمت ۶ر۔سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ سرورق بلاک سے چھپا ہوا۔کاغذ سفید و چکنا۔ جو لوگ غالب کے سچے پرستار ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مرزا کی شاعری کا کمال ان کی فارسی شاعری میں نظر آتا ہے، اگر آج پرانے زمانے کا طرزِ تعلیم جاری ہوتا تو اُردو کلام سے زیادہ غالب کا فارسی کلام مشہور ہوتا۔

۱۸۶۷ء میں خود میرزا غالب نے اپنے اس کلام کو جو کلیات میں چھپنے سے رہ گیا تھا یا کلیات کے بعد شائع ہوا سبدِ چیں کے نام سے شائع کیا تھا۔غالب کی وفات کے بعد کلیات کے متعدد ایڈیشن طبع اور شائع ہوئے مگر یہ کلام کسی میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ کسی جگہ سے شائع ہی ہوا بالآخر یہ کلام نایاب ہوگیا۔

اسکے علاوہ میرزا غالب کا اور بھی بہت سا کلام تھا جو مختلف کتابوں میں منتشر تھا اور ان کے کسی مجموعہ میں ان کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے دوست اور اُردو ادبیات کے حقیقی پرستار مالک رام صاحب ایم۔اے نے نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمان خاں شروانی کے کتب خانہ سے یہ نسخہ حاصل کیا اور مرزا کے منتشر کلام کو جمع فرماکر سبدِ چیں کے نام سے ترتیب دیا جس کو مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ہے شروع میں میرزا غالب کی ایک تصویر بھی ہے۔

گو یہ ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن اُردو ادب میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔کلام کی ترتیب مندرجۂ ذیل عنوانات کے ماتحت کی گئی ہے۔

قصائد — مثنوی — غزلیات
ترکیب بند — قطعات — متفرق اشعار
ترجیع بند — نظم — رباعیات

ذکرِ غالب

یہ کتاب بھی مالک رام صاحب ایم۔ اے کی تالیف و تحقیق کا نتیجہ ہے یہ میرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن بڑی حد تک مکمل اور مستند ترین سوانح حیات ہے جس میں میرزا کے متعلق اکثر نئی باتیں پیش کی گئی ہیں۔یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعہ نے شائع کی ہے اور

اس کی قیمت ۸ روپے ہے۔ شروع میں غالب اعظم کی نئی تصویر بھی ہے۔

اس موضوع پر چند سال کے اندر یکے بعد دیگرے کئی اہم کتابیں اور بھی شائع ہوئی ہیں۔ غالب مولفہ غلام رسول مہر (پنجاب)۔ غالب نامہ مصنفہ محمد اکرام صاحب۔ اور مکاتیب غالب مولفہ مولانا عرشی رامپوری، یہ تینوں کتابیں ضخیم اور مفصل ہیں۔ مگر ذکر غالب مختصر اور جامع ہے اور اس میں واقعات بہ حساب سنین ترتیب دئے گئے ہیں۔

دوسری کتابوں کے مقابلے میں مالک رام صاحب کی یہ مختصر کتاب غالب کے متعلق بعض نئی معلومات کی بھی حامل ہے۔ غالب کے بزرگوں کے متعلق بعض تفصیلات، ان کی بہن کا حال، عارف اور ان کے دونوں بیٹوں کے حالات، میرزا غالب کو ملک الشعراء بنانے کی تجویز، انکی نئی تصویر کے علاوہ آگرے والے مکان کے فوٹو نے اس کتاب کو اور بھی ممتاز کر دیا ہے۔

مالک رام صاحب نے جس محنت اور کاوش کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا ہے، تاریخ ادب کبھی اس کو فراموش نہیں کرے گی۔

بنی اسرائیل کا چاند

مصنفہ رائڈر ہیگرڈ، مترجمہ عبدالمجید صاحب حیرت بی، اے (علیگ)، قیمت عہ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۷ ، ۴۴ صفحہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

بنی اسرائیل کا چاند، سر رائڈر ہیگرڈ کا ایک مشہور اور دلنواز ناول ہے جسے حیرت صاحب نے کمال فصاحت و روانی کے ساتھ ترجمہ فرمایا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں محاورہ، زبان کی لطافت، تخیل اور جذبات، مفہوم اور لطیف رومانی اشاروں کی تمام خوبیوں کے ساتھ کسی تصنیف کو ترجمہ کرنا بعض اوقات تصنیف کرنے سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوتا ہے۔ "بنی اسرائیل کا چاند" کا ترجمہ ایک ایسی ہی خدمت ہے جس کے کامیاب ترجمہ نے رائڈر ہیگرڈ کے طرز تحریر اور انداز بیان، خیالات اور اسلوب بیان کو ایک بڑی حد تک متعارف کرنے میں حیرت صاحب نے کامیابی حاصل کی ہے۔

گو اس ناول کے ۷ ، ۴۴ صفحات ہیں۔ مگر یہ ذرا مشکل ہے کہ آپ اس کو ایک نشست میں پڑھ ڈالیں، لیکن یہ دلچسپ تنا ہی ہے کہ آپ اس کو ایک نشست میں پڑھنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ قیمت حجم اور ادبی معیار کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔

قرآن پاک

از عبدالواحد سندھی جامعی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ۲ ر حجم ۱۰۳ صفحہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ صرف مسلمان بچوں کیلئے ایک مفید کتاب ہے۔ سہل زبان میں قرآن پاک کے متعلق وہ ساری باتیں جلی حروف میں تحریر کی گئی ہیں، جن کا مسلمان بچوں کو جاننا ضروری ہے۔

مضامین رشید

مصنفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم، اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ناشر مکتبہ جامعہ دہلی سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۳۲۲ صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد اور کور ہر لحاظ سے مکمل اور متناسب، خوبصورت اور نظر کش، قیمت عام علاوہ محصول۔

رشید احمد صاحب صدیقی ملک کے اُن مزاح نگار ادیبوں میں سے ایک ممتاز مزاح نگار ہیں۔ جو اپنا ایک اسلوب اور اس اسلوب کی کچھ خصوصیتیں رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے مزاح اور ادب کے لحاظ سے قدیم اور معمر بھی ہیں۔ اس لئے ان کا ادب قدرتی طور پر اور بھی تنقید طلب ہو جاتا ہے کیونکہ گذشتہ دس سال کے اندر اُردو ادب میں کئی نئی اور دلچسپ شخصیتیں جراحیہ ادب کے منظر پر نمودار ہوئی ہیں یعنی "وحدت" "کثرت" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ رشید صاحب اپنے رنگ میں "وحدہ لاشریک" سہی مگر جنس کی "وحدۃ لاشریکیت" باقی نہیں رہی۔

مضامین رشید اظہار خیال کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ اُردو کے تمام مزاح نگاروں کے اسلوب انکے بنیادی عناصر اور ان کے ادب کے پس منظر سے بحث کر کے رشید کی انفرادیت کو واضح کیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ وقت کی قلت اور آیشیا کے حجم کی کمی اس ارادے کی تکمیل میں مانع

ہے۔ یہ خیال دراصل ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ جس کے لئے "فرصت کے رات دن" کی ضرورت ہے۔

لیکن بہرحال اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ رشید صدیقی اُردو زبان کے ممتاز و مسلّمہ مزاح نگار ادیب ہیں، اور انہوں نے اُردو زبان میں جس سنجیدہ اور بلیغ مزاح کی بنیاد ڈالی وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ اس مجموعہ میں ان کے شاہکار مضامین بھی ہیں اور سرسری بھی لیکن سب میں ان کا اسلوب حسن و دلچسپی پیدا کر رہا ہے، مرشد، مغالطہ اور گھاگھ اعلیٰ مزاح نگاری کے ایسے نمونے ہیں کہ اُردو زبان اُن پر فخر کرسکتی ہے خصوصاً "ارہر کا کھیت" جو جزئیات کی تصویر کشی کی تکمیل کے لحاظ سے نہایت کامیاب ہے۔ غالبًا اسکی کامیابی میں مصنف کے ذاتی تجربہ کو بھی دخل ہے! ؟

مضامین رشید اور ان کے متعلق کسی اڈیٹر کی سفارش، ——— ! ؟ شدید قسم کی مسخرگی ہے، اس لئے صرف اس اطلاع پر اکتفا کرتا ہوں کہ "زمانے گذرے کتاب کی صورت میں چھپ گئے"۔

نورِ مشرق

مصنفہ مہرلال ضیا فتح آبادی ایم۔ اے۔ ملنے کا پتہ گجندر لال سونی کٹرہ کرانا پھاٹک حبش خاں دہلی۔ سائز $\frac{20\times26}{16}$ مجلد کاغذ و کتابت بہتر۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول۔

میرے عزیز و محترم دوست مہرلال ضیا فتح آبادی کے نام سے ناظرینِ ایشیا اچھی طرح واقف ہیں، نورِ مشرق ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جس کو خود مصنف نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے نام کو ضیا صاحب کے نام سے یکگونہ تعلق ضرور ہے مگر نظموں اور نام سے کوئی خاص ہم آہنگی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک اور کتاب آگرہ سے مولانا سیماب کے "لطیف شاگرد" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کا نام "آفتاب مشرق" ہے ——— ! ؟ ضیا صاحب کو محفوظ کرنے کے بعد کہنا ہی پڑتا ہے کہ بادۂ مشرق کی اشاعت کے بعد سے مولانا سیماب اور ان کے شاگردوں کو لفظ "مشرق" سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اب مشرق کا خدا حافظ ہے!

کتاب میں سب سے پہلے حضرت جوش ملیح آبادی کا تعارف ہے۔ اسکے بعد تعارف ملا ۲ کے عنوان سے حکیم آزاد انصاری کا دیباچہ اور تعارف ملا ۳ کے عنوان سے منظر صدیقی اکبرآبادی کی ایک زبردستی کی نثر۔

حضرت جوش ملیح آبادی نے ضیا صاحب کی شاعری کے متعلق اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے: ۔

"تراکیب کی چستی، معنی و الفاظ کی ہم آہنگی، الفاظ کی ترتیب و نشست، اندازِ بیان کی روانی و موسیقی اور طرزِ سخن کی ہمواری (ثبات) یہ تمام چیزیں ظاہر ہے کہ مشاقی کے نقطۂ عروج پر پیدا ہوتی ہیں، ضیا صاحب نوجوان ہیں اور نومشق اس لئے موجودہ حالات میں ان سے تمام مندرجہ بالا محاسن کی توقع رکھنا قبل از وقت ہے لیکن ان کی نظموں کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اگر ان کی مشق اسی طرح جادۂ صحیح پر گامزن رہی اور ان میں وہ پندارِ کمال نہ پیدا ہوگیا جو اکثر و بیشتر ان کے سے طبّاع اور خوشگو شعراء میں احباب کی تحسین و آفریں سے پیدا ہو جایا کرتا ہے تو یہ ایک یقینی بات ہے کہ وہ ہندوستان کے ممتاز شعراء میں سے شمار ہونے لگیں گے"۔

خاتمہ پر جوش صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: ۔

"جہاں تک ضیا صاحب کے کلام کا تعلق ہے میں دوبارہ عرض کروں گا کہ وہ ہر طرح اس کا مستحق ہے کہ ہندوستانی زبان کے قدرداں آگے ہاتھوں ہاتھ لیکر ان کی ہمت افزائی کریں اور خاص طور پر انہیں مبارکباد دیں کہ "فرسودہ و نقالانہ شاعری کے ماحول" میں رہتے ہوئے انہوں نے وہ راہ اختیار کی ہے جو حقیقی فطری اور زندگی سے ہم آہنگ ہے"۔

یقینًا یہ تعجب ناک بات ہے کہ ضیا صاحب نے مولانا سیماب اکبرآبادی کا شاگرد ہوتے ہوئے حضرت جوش سے یہ خراجِ عقیدت حاصل کرلیا،

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری جو مولانا حالی کی یادگار اور ایک ماہرِ فن شاعر ہیں، ضیا صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: ۔

"یہ مجموعہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک دلچسپ اور نظر نواز مجموعہ ہے، سلاستِ زبان اور بلاغتِ بیان کے جابجا ایسے

ایسے نادر اور دلکش نمونے نظر آتے ہیں جن کی تعریف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس مجموعہ کی اکثر نظموں میں زندگی کے اکثر پہلو اس خوبصورتی سے روشنی میں لائے گئے ہیں کہ ہمارا اُردو ادب اُس پر فخر کر سکتا ہے۔

اگرچہ ابھی آپ کی شاعری پورے بلوغ کو نہیں پہنچی مگر آثار کہہ رہے ہیں کہ آپ ایک نہ ایک دن پورے اوجِ شاعری پر پہنچ کر دَم لیں گے۔"

ان اہم اور یادگار رایوں کے بعد جو یقیناً نہ ذاتی ہیں اور نہ کسی اثر کے ماتحت تحریر کی گئی ہیں، تیسرا تعارف جناب منظر صدیقی اکبرآبادی نے تحریر فرمایا ہے۔ اور میں بعد غور بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کی کیا ضرورت تھی، جوش اور آزاد کے بعد منظر کا تعارف نہ کوئی ضرورت پوری کرتا ہے نہ راستہ بتاتا ہے نہ سند دیتا ہے !؟

پھر مضمون نگاری کے لحاظ سے اس شذرہ کی حالت یہ ہے کہ ہر چار سطروں کے بعد وہ تمہید اُٹھاتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔ بالآخر جب کچھ شروع کرتے ہیں تو محض تعلقات اور مکاتبت کی تاریخ !؟ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:—

"دیکھنے کو وہ "ہندو" ہیں مگر ان کی بعض عادتیں اسقدر سنجیدہ اور مدبرانہ ہیں کہ وہ نہ صرف ایک انسان صادق و مخلص نظر آتے ہیں بلکہ اکثر ان پر ایک فلسفی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے" (!؟!)

یعنی ہندو نہ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ مدبر؟ کیا صداقت و اخلاص، سنجیدگی اور تدبر کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں' !؟ اور یہ کہ ہندو ہونا فلسفی ہونے کی نفی ہے۔

جن لوگوں نے بچشمِ خود "ذاتِ اقدس" جناب منظر اکبرآبادی کو دیکھا ہے انہیں مندرجۂ ذیل سطور کو پڑھکر بڑا ہی لطف آئے گا:—

"انھوں نے (ضیا صاحب) مجھ سے بارہا اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میں شعر کہنا ترک کر دوں گا۔ مگر میرے کہنے سُننے سے اپنے ذوقِ شعری کو اب تک باقی رکھ سکے ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ آج ان کا پہلا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔"

دیکھا آپ نے "قصرِ ادب آگرہ کا شاعرانہ سامراج" گویا تمام دُنیائے شاعری کی تخلیق اُسی منبع شعر و ادب سے ہوئی اور ہو رہی ہے، اور نہ صرف دماغوں بلکہ انسانوں کے "ذوق" پر بھی جو روح سے تعلق رکھتا ہے منظر صاحب کی حکومت ہے، خدا ان لوگوں پر اپنا رحم کرے کہ یہ لوگ تنقید کی منزل میں نہیں رحم کی منزل میں ہیں۔

۳۴۴

بہرحال نورِ مشرق میں منظر اکبرآبادی کے تعارف نے ایک دھندلکا سا پیدا کر دیا ہے۔ اگر یہ تعارف نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ ضیا صاحب منظر صاحب کے مقابلے میں کہیں اچھے شاعر، کہیں بہتر نثر نگار اور کہیں اچھے انسان ہیں۔ ان کو ہرگز منظر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی جو سینکڑوں جگہ سے بے ربط، پارہ پارہ، شکستہ اور کرم خوردہ ہے۔

نورِ مشرق میری نگاہ میں کیا ہے، سو، میں کیا اور میری نگاہ کیا؟ ضیا کے پسند کرنے والوں میں سے میں بھی ایک ہوں، اور ان کو اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ ضیا کی شاعری میں جان ہے، جذبہ ہے، رنگینی ہے اور ان عناصر میں تکمیل و ترقی کے ذی روح امکانات کار فرما ہیں

شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے حضرات کو نورِ مشرق ضرور خرید کر پڑھنا چاہیئے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ روح اسکے مطالعہ سے محظوظ ہو گی۔

تحفۂ طاہرہ
(فارسی)

از فدائے یاران ربانی اسفندیار بختیاری کراچی۔ ملنے کا پتہ:۔ محفل مقدس روحانی بازار بلیماران دہلی

یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جسے بہائی مذہب کے مبلغین نے شائع کیا ہے۔ اُم سلمہ طاہرہ ایرانی کو نام علمی و ادبی حلقوں میں شہرت جاوداں حاصل کر چکا ہے۔ گو یہ طاہرہ کی ایک مختصر سوانح حیات ہے مگر اس کی شاعری کے نادر نمونے میں بھی پیش کئے

صاحب نے شریک کتاب فرما کر سوانح حیات کو مختص و بلند کر دیا ہے۔ زبان جدید فارسی ہے، رواں اور سلیس۔ مظلوم قرۃ العین طاہرہ کی ایک مختصر نظم آپ بھی سُنئیے اور دیکھئے کہ وہ الفاظ و خیال پر کس قدر قدرت رکھتی تھی۔ آہ انسان کس قدر وحشی اور ظالم ہے کہ محض عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر طاہرہ جیسی شاعرہ کو قتل کر دے سکتا ہے!؟

گر بتو افتدم نظر　　چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دہم غمِ تو را　　نکتہ بہ نکتہ مو بمو

از پیٔ دیدنِ رخت　　ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بہ خانہ در بدر　　کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

میرود از فراق تو　　خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم　　چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

دورِ دہانِ تنگ تو　　عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل　　لالہ بہ لالہ بو بہ بو

ابرو و چشم و خال تو　　صید نمودہ مرغِ دل
طبع بطبع و دل بدل　　مہر بمہر و خو بخو

مہر ترا دلِ حزیں　　بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بنخ　　تار بتار و پو بپو

در دلِ خویش طاہرہ　　گشت نہ دید جز تو را
صفحہ بہ صفحہ لا بلا　　پردہ بہ پردہ تو بتو

ہٹلر اعظم

مصنفہ پروفیسر چندر شیکھر شاستری، ضخامت ۳۸۶ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۳۲ کتابت وغیرہ متوسط درجہ کی۔
قیمت غیر مجلد ۲ مجلد ۲/۸۔ ملنے کا پتہ:۔ سیاسی لٹریچر کمپنی ۸۱۱ مسجد کھجور دہلی

یہ کتاب ہندوستانی سیاسی ادب میں بہت بڑی خدمت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا سہرا شاستری صاحب کے سر ہے۔ ہمارے ادب میں اگرچہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہو کہ فارسی رسم الخط دونوں زبانوں میں ادب لطیف، ڈرامائی ادب اور افسانوی لٹریچر کی اب اس قدر کمی نہیں ہے جتنی پہلے تھی۔ لیکن سیاسی مباحث پر مستقل کتابیں اس وقت تک اتنی تعداد میں منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔ جس تعداد میں ایک غلام اور پسماندہ دبی ہوئی اور سوئی ہوئی

قوم کو ضرورت ہے۔

یقیناً یہ بھی ایک بیداری ہے کہ اسی سال میں چند بہترین سیاسی کتابوں کے ساتھ ایک ضخیم کتاب پروفیسر چندر شیکھر صاحب شاستری نے دہلی سے شائع کی ہے جو جرمنی کی قدیم تاریخ اور اسکے قومی تصورات کے خلاصہ کو پیش کرتی ہے، اور ان وجوہ واسباب کو بتاتی ہے جن کی بنا پر جرمنی جنگِ عظیم میں شریک ہوا۔

ان اسباب پر روشنی ڈالنے کے بعد ان تمام تحریکوں کی تاریخ دی گئی ہے، جو جرمنی کی شکست کے نتیجہ کے طور پر جرمنی میں پیدا ہوئیں اور جن کی وجہ سے پندرہ برس تک جرمنی غلام رہا۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد پارلیمینٹری ازم۔ کمیونزم، فاشزم یا نازی ازم پر مصنف نے ایک بسیط بحث کی ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خوش عقیدہ "فیسسٹ" ہیں۔

کتاب ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے، اور جرمنی کی قدیم تاریخ سے لیکر سوڈیٹن لینڈ اور یورپ کے امن وامان تک جملہ تاریخی وسیاسی حالات اس میں نہایت کاوش وتحقیق سے تحریر کئے گئے ہیں، موجودہ اقتصادی، معاشرتی اور اصلاحی کارنامے۔ ہر ہٹلر کی زندگی کے حالات، اسکے کارہائے نمایاں، مسولینی کے حالات، جرمنی کے ممتاز افراد کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔

یہ بڑی زیادتی ہوگی اگر اس کتاب کو محض فاشزم کی موافقت میں پروپگنڈا تصور کیا جائے۔ اس کتاب کی اشاعت بہرحال ہندوستانیوں کے لئے مفید اور ضروری ہے .... اور اُردو سیاسی ادب میں شاندار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

وفاقِ ہند

از ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری ایل ایل ڈی بار ایٹ لا، پبلشر جناب مظہر انصاری بی اے دہلوی، سائز ۲۲×۱۸ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک۔ اُردو لٹریچر کمپنی دہلی

سلسلۂ آئینِ عالم کی پہلی کتاب "وفاقِ ہند" جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) بھی بتمام وکمال شامل ہے اُردو لٹریچر کمپنی دہلی نے شائع کی ہے جس میں ہندوستان کی نئی طرزِ حکومت اور اسکے پسِ منظر (Back ground) کو عمداً اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ صرف واقعات روشنی میں آتے ہیں، اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر اب تک سیاسی فضا سے آگہی حاصل ہو جاتی ہے۔

کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے اور ۵ ضمنی ضمیمے، اسکے بعد آنریبل سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا کا پیش لفظ ہے موضوع کی نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے یہ کتاب اُردو کے سیاسی ادب میں عظیم درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جعفری کے اسلوبِ تحریر کے متعلق سر شاہ سلیمان کہتے ہیں:—

"لائق مصنف نے آئین سازی جیسے "خشک" موضوع کو اس قدر دلکش بنا دیا ہے کہ کتاب ایک تاریخی کہانی معلوم ہونے لگتی ہے"۔

کتاب میں کسی خاص سیاسی مسلک یا کسی مخصوص سیاسی جماعت کے عقائد کا پروپگنڈا نہیں اور نہ یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا محض ترجمہ ہے بلکہ ڈاکٹر جعفری نے قیامِ وفاق اور اصولِ وفاق کو مستقل موضوع کی حیثیت دی ہے اور کل نیا دستور بھی اپنے ضروری اجزا کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ جعفری صاحب کا بڑا کارنامہ ہے اور اُردو ادب کی نہایت عظیم الشان خدمت ہے، ہر اُس شخص کے لئے جو فیڈریشن، دستورِ جدید اور اس کی جملہ باتوں سے واقف ہونا چاہتا ہے "وفاقِ ہند" کا مطالعہ ضروری ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہاں تک ہے کہ ہر نوجوان کے لئے اس قسم کی سیاسی کتابوں کا مطالعہ مذہبی کتابوں (باستثنائے چند) سے کہیں زیادہ ضروری فرض ہے۔

رسالے

بُرہان ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ ایڈیٹر سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند قرول باغ نئی دہلی سائز ۲۶×۲۰/۸ کاغذ اور طباعت اعلیٰ مجموعی طور پر سادہ اور خوبصورت سالانہ چندہ صہ

برہان ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ ہے اور اس کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو ندوۃ المصنفین کے ہیں ندوہ کا سب سے عظیم مقصد یہ ہے کہ :-

(۱) وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن و سنت کی مکمل تشریح و تفسیر مروجہ زبانوں علی الخصوص اردو انگریزی زبان میں کرنا۔

(۲) مغربی حکومتوں کے تسلط و استیلا اور علوم مادیہ کی بے پناہ اشاعت و ترویج کے باعث مذہب اور مذہب کی حقیقی تعلیمات سے جو بعد ہوتا جا رہا ہے بذریعہ تصنیف و تالیف اس کے مقابلے کی موثر تدبیریں اختیار کرنا۔

(۳) قدیم و جدید تاریخ، سیر و تراجم، اسلامی تاریخ اور دیگر اسلامی علوم و فنون کی خدمت ایک بلند اور مخصوص معیار کے ماتحت انجام دینا؛

(۷) عام مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو جدید قالب میں پیش کرنا خصوصیت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر مسلمان بچوں اور بچیوں کی دماغی تربیت ایسے طریقے پر کرنا کہ وہ بڑے ہو کر تمدن جدید اور تہذیبِ نو کے مہلک اثرات سے محفوظ رہیں۔

ان جملہ مقاصد سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ "ندوۃ المصنفین" ایک خالص علمی نہیں مذہبی ادارہ ہے اور اس کا واحد مقصد زیادہ تر تبلیغ ہے۔

مقصد نمبر ۳ یقیناً علمی مقصد ہے۔

مقصد نمبر ۳ کے شروع کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ادارہ مسلمانوں کی رہبری کم از کم اس منزل کی طرف کریگا۔ جو ترکوں کا مقصود و مقصود تھی؛ مگر اس کے آخری الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ وہ نئے تمدن (مغربی تمدن) اور نئی تہذیب کے "مہلک اثرات" سے بچانا چاہتا ہے؛

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اور اسلام کی بقاء رجعت سے ممکن ہے یا ارتقاء کی ہم نوائی سے؛ موجودہ زمانے کے جو تقاضے ضرورتیں اور حالات ہیں؛ قدیم اسلامی تہذیب و تمدن ان کے سانچے میں یا عصرِ حاضر کے تقاضے پُرانی تہذیب کے سانچے میں کیونکر ڈھل سکتے ہیں۔ !؟

ترک، مصری، ایرانی، عراقی یہاں تک کہ خود حجازی جدید تمدن و تہذیب سے متاثر ہو چکے اور سوائے کلچر کے جو ان کا اپنا کلچر ہے ان کے دماغ و دل تک نئی تہذیب کے تقاضوں سے محفوظ نہیں؛ اگر ترکوں کی آزادی، واقعی اس ارتقاء کا نتیجہ ہے جو قدامت کو مٹا کر "تجدد" کو بحال کرنے سے پیدا ہوا تو ندوۃ المصنفین کا یہ مقصد کو نئی

معنی نہیں رکھتا۔

اگر مصر، ایرانی اور جملہ اسلامی ممالک کی موجودہ زندگی میں زیادہ تر حصہ جدید تہذیب اور تمدن کا ہے اور اس کی رفتار سے واقعی ان قوموں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی بہتر ہے تو ہمارے لئے کافی مثال ہے اور ہم کو بھی چاہیئے کہ ہندوستان میں بجائے رجعت کے ارتقاء کو اختیار کریں اور اس کی تعلیم دیں۔

میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں جب نشر و اشاعت، رسل و رسائل اور ایک دوسرے سے قریب ہونے کے ذریعہ پیدا ہو گئے ہیں (اور ابھی ان میں جدید حیرتناک اضافوں کا امکان باقی ہے) اس قسم کی تحریکیں کہ قوموں کو تہذیبی اور تمدنی طور پر علیحدہ تقسیم کیا جائے کامیاب نہیں ہو سکتیں ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اس وقت مغربی تمدن پھیل گیا ہے۔ بعض چیزیں اس میں بہت بری ہیں مگر بعض باتیں اختیار کے قابل ہیں۔ پس، عقلمند رہبر کا فرض ہے کہ اعتدال اور تناسب کے ساتھ قوم کو ان باتوں کے اختیار و منع کی ہدایت کرے۔

بہرحال برہان ایک ٹھوس علمی اور مذہبی ادارہ کا نہایت اہم رسالہ ہے اور اس میں معارف کی سی خشکی نہیں بلکہ تازگی اور شگفتگی ہے اس کے کارکن ایک مخصوص ارتقائی خیال کے حامل ہیں اور خلوص کے ساتھ اس ادارہ کو چلانا چاہتے ہیں۔ میرا اظہار خیال مخلصانہ اور آزادانہ ہے میں امید کرتا ہوں کہ ندوۃ المصنفین اس پر ضرور غور کرے گا۔ اور مسلمانوں سے نہایت پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ اس ادارہ کی رکنیت و سرپرستی قبول کریں۔ مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی سے طلب فرمائیے۔

کسان (سہ ماہی) پٹنہ

زیر سرپرستی آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیمات صوبہ بہار، سالانہ چندہ دو روپیہ قیمت فی پرچہ ۸ آنے

اڈیٹر- (۱) ڈی، آر، سیٹھی ڈائرکٹر محکمہ زراعت (بہار)

(۲) بی ان سرکار ایل اے جی ڈائرکٹر محکمہ زراعت (بہار)

(۳) عزیز الحسن رضوی بی، ایس، سی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ زراعت بہار۔ کھگول روڈ پٹنہ

"کسان" صوبہ بہار کے محکمہ زراعت کی طرف سے کئی سال سے ہندی زبان میں نکلتا ہے۔ اب اردو زبان میں بھی اس کا ایڈیشن شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ گو اس کا مقصد کسانوں کو کھیتی باڑی کے ضروری اور ترقی یافتہ ذریعوں سے واقفیت پیدا کرانا ہے۔ پھر بھی اس میں اونچے اور اپنے موضوع پر اعلیٰ مضامین پائے جاتے ہیں اور بڑے سلیقے سے اس کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے تین نمبر اس وقت تک ہماری نگاہ سے گذرے ہیں۔ سب سے پہلا نمبر "اوکھ نمبر" ہے جس میں اوکھ اور اس کی کاشتکاری سے تعلق رکھنے والی باتوں کے متعلق قیمتی معلومات سے پُر مضمون ہیں۔

سب سے پہلے آنریبل ڈاکٹر سید محمود کا پیغام ہے اس کے بعد عرض حال اور "پیر میسگھ کی دیوی" ایک نظم، نظم و نثر کے جتنے مضمون اس نمبر میں ہیں وہ نہایت مفید اور قیمتی ہیں۔

خود آنریبل وزیر تعلیم کا مضمون "چینی کا کاروبار اور اس کی نگرانی" نہایت محققانہ و مفید مضمون ہے۔

صوبہ بہار میں ڈاکٹر سید محمود مدظلہ کی مدبرانہ اور انتظامی و اصلاحی کار گزاریوں نے دوسرے صوبوں کے لئے ایک شاندار مثال قائم کر دی ہے، شاید ہندوستانی زبانوں میں کسان جیسا زراعتی رسالہ اس کامیابی کے ساتھ کبھی جاری نہیں ہوا۔

مراۃ الشعراء (زیر طبع)

مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی، اے، ایل ایل بی

بیگم باغ کوٹھی بھیا نظام الدین صاحب میرٹھ۔

ناظرین ایشیا کو شاید یاد ہو کہ ایشیا سہ ماہی کے پہلے نمبر میں "اردو زبان کی تاریخ" اور ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا جس میں نوید دی گئی تھی کہ مولوی صاحب نے ایک تذکرہ قدیم و جدید شعراء کا تحریر فرمایا ہے؛ خود وہ مضمون دراصل اس اہم تذکرہ کا دیباچہ ہی تھا۔ جو آپ حضرات سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

اب ہم کو یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی ہے کہ تذکرہ جس کا

نام مرآۃ الشعراء ہے عنقریب چھپ کر شائع ہونے والا ہے۔ النظیر لکھنؤ
زمانہ کانپور اور جامعہ دہلی میں اس کے اکثر مضامین شائع ہو کر مقبول
ہو چکے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کیا ادبی حیثیت رکھتا ہے اس کا
اندازہ کتابی صورت میں ہی کیا جا سکتا ہے، کتاب کی ضخامت تقریباً
ایک ہزار صفحات تک ہوگی۔ اور کاغذ و کتابت خاص کر طباعت
کے لحاظ سے اس کو حسین و دلکش بنانے کی خاص سعی کی
جا رہی ہے"۔

اس کی قیمت باوجود ایک ہزار صفحات کے محض چھ روپیہ
مقرر کی گئی ہے۔ لیکن جو اصحاب ۔

۳۱ جنوری ۱۹۳۹ء تک

مبلغ صہ بطور پیشگی قیمت روانہ فرمادیں گے ان کو اسی قیمت
میں یہ کتاب ارسال کی جائیگی۔ یہ تذکرہ شروع سے موجودہ دور
تک کے شعراء کا تذکرہ ہے جو بہ لحاظ تنقید و انتخاب اشعار اپنی نظیر
آپ ہی ہوگا۔ روپیہ مصنف کے نام ہی ارسال کیجئے جن کا پتہ
اوپر درج کر دیا گیا ہے۔

تنقید کا حق محفوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے دوست کی اس محنت
کی داد کی بہترین صورت یہی خیال کرتے ہیں کہ آپ مرآۃ الشعراء
کی خریداری فرمائیں اور مبلغ صہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر اپنی
ادب دوستی کا ثبوت دیں۔

صورِ اسرافیل

اڈیٹر۔ احمد الملقب بلید رم
معاون فیض الحسن صاحب صدیقی۔

سالانہ قیمت تین روپیہ فی پرچہ چار آنے فلیمنگ روڈ لاہور
یہ رسالہ لاہور کے نئے اور تازہ دم رسالوں میں سے
ایک ہے۔ جو بہتر نظم و نثر پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔
چند نئے لوگوں کو نظر انداز کر کے اس کے مضامین نگاروں
میں ملک کے مشاہیر ادب بھی نظر آتے ہیں۔ خود اڈیٹر
ایک خاص قلب و دماغ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ
دوسری بات ہے کہ چند رسالوں کو چھوڑ کر لاہور سے
جس قدر رسالے شائع ہوتے ہیں، وہ مذہبی احساس سے
خالی خالص ادبی و علمی نہیں ہوتے اور ادبی و شاعرانہ
مباحث و مسائل کو بھی مذہبی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ یہ
مسئلہ بھی اب بحث طلب نہیں رہا ہے کہ پنجاب ہی ایک
ایسی جگہ ہے جہاں متفرق کھانے پینے کی چیزوں کی طرح
شاعری کو بھی "اسلامی" ہونا ضروری ہے۔

لیکن بہرحال پنجاب اردو ادب کی ایک مضبوط
پناہ گاہ ہے اور ہم اس کی اہمیت و طاقت کو دیکھ کر
مسرور و مطمئن ہوتے ہیں۔ اس نے اردو ادب کی اشاعت
و تعمیر میں بڑی امداد کی ہے اور ایسی ہستیاں پیدا کی ہیں
جن کی وجہ سے اردو ادب کی ساکھ ہندوستان میں قائم
رہے گی۔ صور اسرافیل بھی اداریہ سے لے کر آخری
صفحے تک اپنے مضامین میں جان رکھتا ہے۔ اداریہ کی
زبان بہت سخت "ابوالکلامی" ہے کاش بلید رم صاحب
یہ معلوم کر لیں کہ وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اب
ابوالکلام بھی ایسی زبان نہیں لکھتے۔

اقبال اور فنون لطیفہ

کے عنوان کے ماتحت ہمارے دوست سید عابد علی صاحب
نے حضرت جوش ملیح آبادی پر جو سب و شتم کیا ہے۔ وہ
قابل نفرت ہے۔ اور سید عابد علی کی تنقیدی اہلیتوں
کو رسوا کرتا ہے، بہرحال اردو دان پبلک کو اس کی
پذیرائی کھلے دل سے کرنی چاہیئے۔

ساغر (نظامی)

اعتراف

نظم ونثر، ادب وسیاست، تنقید وتاریخ، نظم وغزل، افسانہ ومکالمہ اور جملہ عالمگیر مسائل کے متعلق جس قدر اور جتنا معیاری سامان مہیا کیا جاسکتا ہے وہ اس نمبر میں پیش کیا جارہا ہے۔ تراجم سے لے کر طبع زاد مقالوں اور افسانوں تک میں اس معیار کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جو اعلیٰ ادب اُردو کا معیار ہے اور جسے قائم رکھنے کی ایشیا کے ہر نمبر میں اپنی سی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

تراجم

تراجم میں "کشمکش" "قیمت کا تجزیہ" "خطبات زرتشت کے تین تمہیدی باب" اور "والٹیر" یقیناً نہایت مفید رواں اور اعلیٰ ترجمے ہیں۔

طبع زاد مقالات

طبع زاد مضامین میں "مشرقِ قریب میں وطنیت کا طوفان" "نواب یوسف علیخاں ناظم رامپوری کے کلام پر مرزا غالب کی اصلاحیں" "غازی مصطفےٰ کمال اتاترک۔ اقتصادی بدحالی اور اس کے اسباب، ہندوستانی گاؤں" محض ادب ہی کے نمونے نہیں ہیں، بلکہ ایک خاص نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں۔

افسانے

اس نمبر کی یہ ترتیبی خصوصیت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ سیاسی، علمی وتنقیدی مضامین کا حصہ جیسقدر زبردست ہے اسی قدر افسانوں کا باب بھی نہایت کامیاب اور معیاری ہے۔ قطع نظر اپنے مضامین، افسانوں اور نظموں کے میں فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کس شاعر اور کس فاضل مضمون نگار کی تعریف کروں اور کس کی نہ کروں!!؟!

افسانوں میں دو افسانہ خواتین کے بھی ہیں؛ محترمہ قمر حنا صاحبہ کا افسانہ گو بہت خوب ہے اور محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا افسانہ "تمنا" ایک بہت ہی خوب رومانی شاہکار ہے؛ جو اپنے انجام میں سماج کے لئے دعوت غور وفکر رکھتا ہے۔ ہم جنسوں کا شکریہ ادا کرنے میں جس قدر جری ہوں اس لحاظ سے صنف نازک کے مقابلہ میں بزدل؛ اس نے محترمہ حمیدہ سلطان اور قمر حنا صاحبہ کی ایشیا نوازی کا شکریہ ادا کرنا۔ نیازمندی اور ادائیگی فرض دونوں لحاظ سے ضروری ہے۔

ہاں، شاید میں بھول جاؤں "مرد اہم ہے یا عورت!؟" مکالمہ کو پڑھ کر میری معزز بہنوں کو یہ ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ میں

اس مکالمہ میں ذرا بھی سچ بولا ہوں، تھکے ہوئے بزرگ صنفِ نازک کو ناقص العقل کہتے تھے، یقین رکھیئے نئے لوگ عورتوں کی عقلمندی پر ایمان رکھتے ہیں مجھے یقین ہے کہ جو عقلمند خاتون اسکو پڑھینگی وہ یہی کہیں گی کہ یہ سو فیصدی جھوٹ ہے —— واقعی ضرورت سے مجبور ہو کر جھوٹ بولنے کا گناہ اس دیدہ دلیری کیساتھ میں نے کبھی نہیں کیا، !؟ —— پر سچ تو یہ ہے کہ اس معصیت کی ذمہ داری آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے سر ہے ۔

ایک اور مضمون نعمت صاحبہ دہلوی کا مختصر افسانہ کے عناصر کے عنوان سے افسانوں کے باب میں شائع کیا جا رہا ہے، ایشیا محترمہ کا دلی طور پر شکر گذار ہے ۔

افسانوں میں دو افسانے سید فرید جعفری مچھلی شہری کے بھی ہیں، "دیمک" اور "جوار بھاٹا" ان دونوں افسانوں کی تعریف کرنا در اصل اپنے مضامین کی تعریف کرنا ہے، لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ جو لوگ آرٹ اور نئے خیالات کا سنگم دیکھنا چاہتے ہیں، "واقعیت نگاری" زبان، اور انقلاب کی نمائندگی آرٹ کے جملہ عناصر کے ساتھ پسند کرتے ہیں، ان کے لئے یہ افسانے اعلیٰ ترین شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں ۔

میں خاص طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارکان کو دعوت دونگا کہ وہ ان افسانوں کو گہری تنقیدی نظر سے پڑھیں، اگر ایک خاص خیال کو پیش کرنے کیساتھ ساتھ شاعرانہ کیفیت کہانی میں پیدا نہیں کیجا سکتی ہے تو کہانی مؤثر نہیں ہو سکتی، اور مؤثر نہیں ہو سکتی تو اس کا لکھنا اور چھپنا فضول ہے، واقعیت نگاری کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب میں کھردرا پن پیدا ہو جائے !؟ کھردرے پن کو بھی ہمیں اس طرح ظاہر کرنا چاہیئے کہ وہ اثر کرے ۔

مزاحیہ ادب کے سلسلے میں ہم حضرت شوکت تھانوی کا ایک زبردست شاہکار پیش کر رہے ہیں، "بنام اُدو اماِ فرنگ لسٹ" ہر لحاظ سے یہ مضمون اپنی مثال نہیں رکھتا، آپ مطالعہ کے بعد تسلیم کر لیجئے کہ مدتوں کے بعد شوکت نے ایک ایسی چیز لکھی ہے جسکی اہمیت کا صحیح "ریڈیو ٹاکر" ہونیکے بعد اندازہ ہو ہی نہیں سکتا، !؟

نظموں کے باب میں جس قدر نظمیں و غزلیں ہیں ایشیا میں انکا شائع ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ارفع و اعلیٰ اور شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، میں جزو آ جزو آ کیا اُن کی تعریف کروں، !؟

نقد و نظر کے باب میں علامہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری کا تنقیدی مضمون "مکاتیب غالب پر ایک نظر" انتقادی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

ہر ادارہ اور رسالہ اپنے مضامین نگاروں کا شکریہ ادا کرنیکے لئے بہترین الفاظ تلاش کر کے استعمال کرتا ہے، لیکن میرے پاس صرف ایک "معترف نگاہ ہے" ۔ سو اسکی کیا قیمت —— میں بھول گیا تھا۔ بڑی زیادتی ہوگی اگر میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کا شکریہ ادا نہیں کرونگا جس نے از راہ کرم میرے مکالمات، نظموں اور سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی کی تقریر شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

۲۴۱

آخر میں تین کتابوں کی تیاری کی نوید دینا بھی میرا فرض ہے۔ (۱) کتاب یو، پی کے مشہور شاعر حضرت ریاض گوالیاری ایم، اے کا دیوان زیر طبع ہے اور ایک دو ماہ میں شائع ہونے والا ہے، (۲) مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی، اے کی تصنیف "مراۃ الشعراء" جو قدیم و جدید شاعروں کا تذکرہ ہے کتابت کے لئے دیدیا گیا اور وہ بھی چند ماہ میں شائع ہوگا، (۳) ان دو کتابوں کے علاوہ محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا شاہکار ناول "ثروت آرا بیگم" کتابت ہو رہا ہے، یہ خالص ادبی اور اخلاقی ناول ہے اور تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا،

نہ اس میں ناقابلِ قیاس تصوریت (Romanticism) ہے اور نہ شاعرانہ مبالغہ آرائی بلکہ ناول کے مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کی گئی ہے، اسکی زبان دوسرے ناولوں کے مقابلے میں نہایت لطیف رواں اور خالص دلی کی ٹکسالی زبان ہے، اندازِ بیان میں روایتی رومانی اور افسانویت نہیں ہے وہ خاص محاورات جو دلی کی عورتوں ہی میں بولے جاتے ہیں، اس میں پائے جاتے ہیں، ایک خاص قسم کی شگفتگی اس ناول کا حصہ ہے، اور کردار و اخلاق کا خیال ہر باب میں رکھا گیا ہے، مصنفہ کا قلم ناول کے ماحول میں کردار نگاری، زبان، ادبیت، واقعیت اور تخیل کے تمام تقاضات کو پورا کرنے میں بہ آسانی کامیاب ہوا ہے، یہ ناول بہت جلد شائع ہوگا ۔

یہ تینوں کتابیں مکتبہ ساغر میرٹھ سے بھی خط و کتابت کرنے پر مل سکیں گی ۔

ساغر (نظامی)

پرکاش آگے جیل کے ساری قیدی پیچھے۔ انقلابی نعرے لگاتے اسلحہ خانے کی طرف چلے۔ کوٹھریوں کی آہنی سلاخیں نکال لیں کدال۔ بیلچے۔ کھرپیاں اُٹھالیں۔ کھاٹ کی پٹیاں اور پائے نکال لئے چھوٹے چھوٹے درختوں کو جڑ سے اُکھیڑ لیا۔ جواب بھی خالی ہاتھ تھے انہوں نے کنکر اور پتھر اُٹھا لئے۔ وہ اسلحہ خانہ پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ جیلر اور سپاہیوں نے تھوڑی بہت مدافعت کی۔ مگر ان بپھرے ہوئے شیروں کا سامنا آسان نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں سپاہی بھاگ گئے جیلر مار دیا گیا۔ اسلحہ خانہ لوٹ لیا گیا۔ پھاٹک کے پرخچے اُڑ گئے جیل کو ویران کر کے بھوکے شیروں کی یہ فوج چنگھاڑیں لگاتی مل کی طرف بڑھی۔ شہر والے اس خوفناک جلوس کو دیکھ کر گھبرا گئے اور اپنی دکانیں بند کرنے لگے مگر پرکاش نے عین چوک میں کھڑے ہو کر ایک دوسری مختصر لیکن نہایت جوشیلی تقریر کی۔ اب بہت سے دوکاندار راہی اور چھٹے ہوئے مزدور بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

بڑھی ہوئی داڑھیوں۔ اُلجھی ہوئی بالوں کی لٹوں۔ خونخوار آنکھوں۔ بڑے بڑے ناخنوں۔ جیل کے لباس میں ملبوس ہتھیاروں کی اسقدر فراوانی کے ساتھ ان کے وحشیانہ حملے نے فوجی سپاہیوں کو

. . . .

بھی گھبرا دیا۔ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گو انہوں نے گولیوں کی بارش کی اور بڑھتے ہوئے قدم رُکے مگر بھوکے شیر اپنے پیچھے تڑپتی ہوئی لاشوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھے چلے۔ گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا گیا۔ گو ان کی ناتجربہ کاری نے اس حملہ میں ان کو ہی زیادہ نقصان پہنچایا۔ مگر جب یہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے کہ سنگینوں کی بجلیاں کوندیں اور خرمنِ ہستی کو جلا دیں۔ بیلچوں اور کدالوں سے "سبزۂ ہستی" کو کھود ڈالا جائے۔ تو ان کی بن آئی۔

(۹)

"یہ باہر شور کیسا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ مل میں انہیں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

شور بلند ہوتے ہی پہرہ کے سپاہی پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے لوٹ کر چھوٹے سیٹھ جی سے کہا "مہاراج! یہ جیل کے قیدی ہیں فوج بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ انہوں نے اسلحہ خانہ بھی لوٹ لیا ہے"۔

"یہ کیا چاہتے ہیں مل کی طرف یہ کیوں آئے؟"

"سرکار! ......"

اتنے میں شیر پہنچ ہی گئے۔ پہرہ کے دس بارہ سپاہیوں کی کیا حقیقت سب مارے گئے اور قیدیوں کا ریلہ خود سیٹھ کے پرائیویٹ کمرے میں ہوا سیٹھ جی نے دروازہ بند کر لیا تھا اور فوج کے لئے چھاؤنی کو فون کر چکے تھے ایک دم سے "مزدور زندہ باد" کا ہوشربا نعرہ بلند ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ قیدی اندر آ گئے اور سیٹھ جی کی طرف بڑھے۔ سرلا سیٹھ جی کے پاس کھڑی تھی سیٹھ جی نے سرلا کی آڑ لے لی تھی۔ سرلا واقعات کی اس تیز رفتاری کا نہایت سکون کے ساتھ مطالعہ کر رہی تھی۔ وہ خود ہی سیٹھ جی کے سامنے آ گئی مزدوروں نے اُسے بند کمرے میں دیکھا اور اس طرح سیٹھ جی کی محافظت کرتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے اور چلائے "پرکاش کی استری! تو نے مزدور جاتی پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے۔ یہ اچھا بلیدان ہے۔"

سرلا غصہ میں دیوانی ہو گئی۔ چیخ کر بولی "بھائیو! تم نہ صرف میری توہین کر رہے ہو بلکہ میرے پتی کے ناموس کو بھی بٹہ لگا رہے ہو۔ بڑے سیٹھ جی نہایت شریف اور بہت نیک تھے۔ مزدوروں کی سیوا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کو ہماری مصیبتوں کا کچھ علم نہ تھا۔ میں نے جب چھوٹے سیٹھ جی سے بتایا تو ان کی آنکھیں آنسو سے بھر گئیں اور سیٹھ جی نے وعدہ کیا کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو گا۔

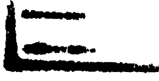
"جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ۔ فریب! بے عزتی! پرکاش! کدھر ہو تم! ہم خون لینگے۔ سیٹھ جی کے خون سے مل کو رنگ دینگے۔ کل سے یہ مل مزدوروں کی انجمن چلائیگی۔ مل کے ہم ہی مالک ہونگے اور ہم ہی مزدور

. . . . قیدی یہ خوفناک آوازیں لگاتے جاتے تھے اور دھیرے دھیرے بڑھتے جاتے تھے اتنے میں بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا پرکاش آ پہنچا۔ ایک خون آلود بیلچہ اس کے ہاتھ میں تھا آنکھوں میں خون ہی خون۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ بدن میں کپکپی۔ وہ سیٹھ جی کی طرف جھپٹا لیکن سرلا کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر بیلچہ کو سر سے اونچا اُٹھایا اور آگے بڑھا "بلیدان! انتقام! انتقام!! آخری انتقام!!! الفاظ پورے طور پر ادا نہ ہونے

اور سیلیچ ابھی نشانہ پکڑنے نہ پایا تھا کہ ایک گولی اسکے بازو پر لگی۔ سیلیچ ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ دوسری گولی اسکی پسلی کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ گورہ فوج آ گئی تھی۔

(۱۰)

جس طرح ناتجربہ کار ساقی بیر کی بوتل کھولتے ہوئے آدھی سے زیادہ گرا دیتا ہے پرکاش کی اور اسکے ساتھیوں کی شکتی بھی استعمال میں آئی۔ البتہ سرلا کی رسیلی جوانی نے ممتا کے دکھے اور ستائے ہوئے دل کی ساری تلخیاں بھلا دیں اور اسکی بیر کی آدھی بوتل کی طرح شرابی سامراج کے متوالے سیٹھ نے اسے بھی آلۂ کار بنا لیا۔



نسیم جعفری

اعلانات

ایشیا کے دو نمائندے

(۱) کوئی سال بھر ہوا کہ محمد عمر صاحب (علی گڑھی) کو ان کی درخواست پر ایشیا اور پیمانہ کا نمائندہ بنایا گیا تھا۔ لیکن اب ان کی اور پبلک کی واقفیت کے لئے یہ اعلان کر دینا ضروری ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء سے محمد عمر صاحب ادبی مرکز کے رسالوں اور کتابوں کو فروخت کرنے یا خریدار پیدا کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

(۲) چار مہینے ہوئے سہارنپور کے رہنے والے غازی عبد الرشید صاحب کو ایشیا کی نمائندگی کے فرائض سپرد کئے گئے تھے لیکن اس مقدس تاریخ کے بعد سے آج تک نہ ان کی زیارت ہوئی اور نہ انہوں نے کوئی رسید دی کہ وہ کہاں تشریف رکھتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس لئے مجبوراً ان کے متعلق بھی پبلک کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء سے ہم خود ان کے حق میں دست بردار ہوتے ہیں۔ خدا حافظ !؟

ایک اور ضروری اعلان

رسالہ پیمانہ جو صہبا صاحب کی ادارت میں جاری ہوا تھا افسوس کہ رجسٹرڈ نمبر نہ ملنے کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔

(ساغر نظامی)



یوپی کے تاریخی شہر میرٹھ میں

بڑے پیمانے پر اُردو ہندی اور انگریزی تین زبانوں کے الیکٹرک پریس کا قیام

ادبی مرکز کے شعبۂ طباعت "ساغر پریس" کا ترقی یافتہ روپ

"ساغر برقی پریس"

اُردو اور ہندی زبان کے اہلِ قلم کے لئے آسانیوں کی پیشکش۔ ہندوستانی چھپائی کے معیار کو

مغربی صنعتِ طباعت کے درجہ پر لانے کا تخیّل

ادبی مرکز میرٹھ کے پروگرام کی تکمیل کیلئے ایک نیا قدم

ساغر پریس ادبی مرکز میرٹھ



ادبی مرکز میرٹھ کا علمی، ادبی تماہی رسالہ

ایشیا

زیرِ سرپرستی

ڈاکٹر سید محمود

(بہار گورنمنٹ کی طرف سے اسکولوں کے لئے منظور شدہ)

ایڈیٹر ساغر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مجلد ایشیا ۶؍
قیمت سالانہ غیر مجلد ایشیا صہ؍

قیمت ایک نمبر مجلد عہ علاوہ محصول
قیمت ایک نمبر غیر مجلد ۸؍ علاوہ محصول

ساغر کے مجموعۂ کلام

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ساغر نسری

(ناگری ایڈیشن)

مع اُن تازہ گیتوں غزلوں اور نئی قومی نظموں کے جو بادۂ مشرق میں نہیں چھپے

سنہ ۱۹۳۵ء میں ادبی مرکز میرٹھ نے بادۂ مشرق کو اُردو، ہندی گجراتی اور انگریزی زبان میں شائع کرنیکا اعلان کیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں "بادہ" کا اُردو ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوکر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا اور آج اس کی ایک جلد بھی باقی نہیں ہے۔ اُردو زبان میں طبع ثانی سے پہلے اَدبی مرکز اُس وعدہ کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اُس نے پبلک سے ناگری ایڈیشن کے متعلق کیا تھا۔ چنانچہ ہم نہایت مسرّت کے ساتھ ناگری پڑھنے والے اصحاب کو اِطلاع دیتے ہیں کہ "بادۂ مشرق" ناگری رسم الخط میں ساغر نسری کے نام سے تیّار ہوگیا۔ تمام کتاب کا انتخاب بجنسہٖ اُردو حروف کے بجائے ناگری حرفوں میں چھپا ہے اور حاشیہ پر اُن الفاظ کے معنی آسان زبان میں لکھ دیئے گئے ہیں جنکو سمجھنے میں کچھ دقّت ہوسکتی ہے۔ کتاب پیلے رنگ کے اینٹک کاغذ پر نہایت حسین اور واضح ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ اُردو ایڈیشن کی طرح ہر باب پر اس کی مناسبت سے بلاکس کے پس منظر دوسرے رنگ میں چھاپی گئی ہیں، جلد نہایت مضبوط اور حسین ہے حجم تقریبًا ۲۰۰ صفحات، کتاب میں حضرت ساغر کا ایک اسکیچ اور فوٹو کی تصویر بھی دیگئی ہے۔ قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔

مکتبۂ ساغر اَدَبی مرکز میرٹھ

فہرست

رسالہ ایشیا (سہ ماہی) اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۹ عیسوی

میرا گناہ

میرا گناہ یہ نہیں ہے کہ میں نے زندگی میں "محنت" اور "خود اعتمادی" کو کیوں اپنا شعار بنایا اور نہ میرا گناہ یہ ہے کہ میں بہ حیثیتِ شاعر قصیدہ خوانی کو بڑے سے بڑے گناہ سے بھی بدتر خیال کرتا ہوں میرا گناہ یہ بھی نہیں ہے کہ میں نے اپنی مادّی مقاصد کے مقابلے میں شاعر کی اعلیٰ پوزیشن کا ہمیشہ خیال رکھا! اندازہ تو مدتوں سے کر رہا تھا۔ لیکن یہ خیال حق الیقین کے درجہ کو اسی ماہ میں پہونچا ہے کہ چوری، ڈاکہ، دل آزاری، بدلفظی، بے اعتمادی، بدچلنی، بے حیائی مکر و ریا، سماج کی امن شکنی اور حقوق العباد سے لاپرواہی، ان تمام معاصی میں سے کسی معصیت کا ارتکاب مسلمانوں کے خیال میں میں نے نہیں کیا، لیکن کیسی دلچسپ بات ہے کہ میرا گناہ ایک اور صرف ایک قرار دیا گیا ہے کہ میں "آزادی" کا دیوانہ کیوں ہوں!!؟

اور ہندوستان میں بسنے والی ۳۳ کروڑ آبادی میں بدامنی، دل آزاری، فرقہ پرستی اور غلامی کا پرچار کیوں نہیں کرتا! بلووں کا شیدائی کیوں نہیں، دشنام طرازی میں ید طولیٰ کیوں نہیں رکھتا! پاکستانی تحریک کا کیوں حامی نہیں؟ اور لفظِ اسلام سے جلبِ منفعت کیوں نہیں کرتا۔ اور یہ ایمان کیوں نہیں رکھتا کہ ہندوستان کی آزادی ناممکن ہے، حاکمیت اور غربت و افلاس کا ردِ عمل محال ہے یعنی زندگی ہرگز تغیر و تبدیلی کا نام نہیں اور ارتقا و انقلاب قدرتی طور پر ناممکن ہے ــــــــ !؟!

میرا گناہ ایک اور صرف ایک ہے کہ میں اپنے دماغ سے کیوں سوچتا ہوں!!؟ کیوں دھوکہ نہیں کھاتا اور کیوں دھوکہ نہیں دیتا! اس معلوم اور فطری طور پر شریف قوم کو جسے "ابھی تک" دنیا مسلمان کہتی ہے کیوں اس کے نقطۂ خیال کے مطابق باتیں نہیں بناتا جس دھارے میں کل قوم بہی چلی جا رہی ہے۔ اس دھارے میں خود بھی کیوں نہیں بہ جاتا!!؟

کیا خوب میرا گناہ ہے کہ میری شاعری روایتی ہجر و وصال، رسمی مذہب پرستی اور جاہلانہ تصورات کی پوٹ نہیں ہے ــــــ !؟

کیا خوب ہے میرا گناہ ــــــــ !؟ کہ "ایشیا" میں رومان Romance، کی خالص افیون ہی کیوں نہیں ہوتی!؟

کیا خوب ہے میری معصیت ــــــــ !؟ کہ ایشیا میں عشق و محبت کی جھوٹی اور بے اصل کہانیاں کیوں نہیں ہوتیں! ایشیا میں "نسیم" اور کاتبِ بالا کی تصویریں کیوں نہیں ہوتیں! ــــــ !؟

ــــــــ ایشیا اپنا محبت نمبر کیوں نہیں شائع کرتا۔

ایشیا

میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے اور نہایت خوب ہے کہ میں ہندوستان سے کیوں محبت رکھتا ہوں ۔ !؟ ملک کے کروڑوں بھوکوں، غریبوں اور دُکھیوں کا تصور مجھے کیوں بھاتا ہے اور اعلیٰ طبقے کی استبدادیت کیوں پسند نہیں آتی !؟ شاعر (جس کا تصور مسلمانوں میں، مذموم، بھاٹ، غزل خواں، مفلوج، بدسیرت، بدقماش، بداطوار، پنج، میلا، سفلا، بیکار، قلاّش، کم اوقات، قصیدہ گو، تاریخ گو، قطعہ گو، مفلس، کم سخن، بے عمل، بداعمال، مفت خور، انجمن آرا، سوسائٹی کا غلام، حکام اور وکلاء کے مقابلہ میں ارذل، مولوی اور پیروں سے اسفل، غرضکہ ایک بیہودہ ترین شخص کے مترادف ہے) ہو کر ملکی و سیاسی اور زندگی کے بڑے بڑے عنوانات سے کیوں ذوق رکھتا ہوں !؟

(میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تمام شعراء کے متعلق جمیع قوم مسلم کا یہ تصور ہے، مگر یہ تو ظاہر ہے کہ آئی۔سی۔ایس کے مقابلے میں اسلامی کیا انسانی سوسائٹی میں شاعر کی کوئی پوزیشن نہیں ۔)

میرا گناہ خواتین کے نزدیک نہایت حسین ہے اور وہ یہ ہے کہ میں "پجارن" جیسی نظمیں کیوں کہتا ہوں، اردو کے گاتے ہوئے الفاظ اپنے گیتوں میں کیوں لکھتا ہوں (مگر ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہ پجارن کو پسند نہیں کرتیں اور گاتے ہوئے الفاظ انکو بھاتے نہیں۔ مگر بہرحال گناہ پھر گناہ ہے خواہ حسین ہو یا قبیح) اور ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے آئیڈل کو جملہ سامانوں سے آراستہ کرکے اپنے دل کے خون سے اس کے کندنی ماتھے پر لہو کی ایک بوند کیوں ثبت کر دیتا ہوں ——— !؟

کتنا حسین گناہ ہے ——— اور سچ پوچھ یہ تو گناہ ہے !؟

مسلم نوجوان مجھ سے شکایت رکھتے ہیں کہ میں اُن سے محبت کیوں رکھتا ہوں ۔؟ محبت کے بجائے اُن کا غلام کیوں نہیں بن جاتا، ان کو فرقہ پرستی، نفرت، قدیم الخیالی اور برخود غلط رہنے کا مشورہ کیوں نہیں دیتا !؟

ہم سے اوپر کے مسلمان مجھ سے اسلئے زیادہ خوش نہیں کہ "روایتی مذہبی شاعری میری طرف سے عالمِ ظہور میں کیوں نہیں آتی !؟

میرا گناہ اپنی عظمتوں کے لحاظ سے کسی قدر عظیم ہے !؟ مسلم لیگی مسلمان مجھ سے اس لئے ناخوش ہیں کہ میں "مسلم لیگی" کیوں نہیں !؟ اور کیوں اس وقت تک "قائدِ اعظم" کا قصیدہ خواں نہیں بنا !؟

یہ ہے میرا گناہ ! ——— یہ ہے میرا گناہ !! جس کی تشریح صرف اسقدر نہیں ہے، اہلِ فکر کیلئے پس منظر میں بہت کچھ چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اس تمام انبوہ میں ایک شخص نہیں جس نے حقیقتوں کی گہرائی میں جاکر نفسیاتی طور پر مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کے دل و دماغ مفلوج اور خلاّقی کا جوہر بیکار ہو جاتا ہے تو اس میں عیب جوئی اور نکتہ چینی کے بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے عمل اور بے اعتماد قوم نکتہ چیں اور عیب بیں ہونے کے بعد اُن افراد کو پسند کرتی ہے جو اُن کے عیبوں پر پردہ ڈالیں، جو خود نمایاں ہونے کے لئے جملہ امراض کو صحت سے تعبیر کریں۔ اور تاریخی و نفسیاتی چھان بین کرنے کے بعد جماعت کو اصلی حیثیت سے آگاہ نہ کریں۔

"ملکی آزادی کا مسئلہ" اب کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی اور علمی مسئلہ ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ حاکم قومیں یا تو محکوم قوموں میں رل مل گئیں یا انکو اپنی حکمرانی سے دست بردار ہونا پڑا۔

دور کیوں جایئے۔ ہندوستان ہی میں گریک، ہن، سیتھین اور مسلمانوں کی نظیر موجود ہے۔ ان تمام کے بعد اب انگریزوں کی باری ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے والی قوموں میں سے سب سے زیادہ کم عمر انگریزی قوم کے وقار کی ہے۔ صرف ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں ہمارے دلوں سے ان کی عزت و عظمت جاتی رہی ان کا اخلاقی و سیاسی اثر ختم ہوگیا اور آج ہم کسی شرط پر ان کی حاکمیت کو پسند کرنے کیلئے تیار نہیں !؟

یہ بے شریعت سہی، لیکن عمل کا لازمی ردِ عمل ہے اور مسلمان ہی نہیں خود انگریز اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ہندوستانیوں میں جو سیاسی شعور پیدا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر ان کی معہور آزادی کا ضامن ہے۔ اور جیسے جیسے یہ شعور ترقی کرتا جائیگا؛ ہندوستان کی آزادی، ہندوستان سے قریب ہوتی جائے گی۔ سب سے بڑی مشکل ملک کی عام جہالت ہے، جس دن یہ جہالت ختم ہوگئی اور یہاں کے کسانوں اور مزدوروں کی سمجھ میں اپنی بھوک اور افلاس کی اصلی وجہ آ گئی؛ سیاسی شعور کی تکمیل ہو جائے گی؛ اس بیداری کی ابھی ابتدا ہی ہے اور نہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثر سے خالی نہیں؛۔

کیا دلچسپ بات ہے کہ مسلمان اس عہد کے شاعر سے غالب اور داغ کے اخلاق و سیرۃ کا مطالبہ کرتے ہیں!؟ یہ نہیں سمجھتے کہ شاعر قدرتی طور پر روایتی آزادی سے بھی زیادہ حریت پسند ہوتا ہے، اور کوئی طاقت اس کے جذبہ کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوتی؛ جو شخص پہلو میں دل، اور سر میں دماغ رکھتا ہے وہ "آزادی" کو "جنس کاسد" کہنے کا گناہ نہیں کر سکتا؛ ملکی آزادی تو اس کے نزدیک ایک معمولی حصہ ہے۔ اُس حقیقی آزادی کا جس پر انسانی زندگی کا مدار ہونا چاہیئے ملکی آزادی تو اس حالت میں بھی فرض کی جا سکتی ہے جب کسی ملک میں جاگیرداری، اور شہنشاہیت کا رواج ہو؛ لیکن اس آزادی سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہونچیگا؛؟

آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک نئے اجتماعی تصور کی نئی تشکیل و ترتیب اور اس کے اجرا کے بغیر "ملکی آزادی" ایک بالکل فضول چیز ہے؛

تاہم ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی مشکلات کو جانتا ہے ماننا ہی پڑے گا۔ کہ اس قسم کی غلامی میں جس میں ہم جکڑے ہوئے ہیں، کسی تصور کی تکمیل قطعی ناممکن ہے؛ اس لئے ہمارے لئے لازمی ہے کہ فی الحال آزادیٔ محض کی بساط پر جان تک کی بازی لگا دیں اور اس کے حاصل کرنے کے بعد آزادی سے پیدا شدہ برکتوں کو ایک سانچے میں ڈھال کر ایسی فردوس آراستہ کریں جس میں بھوک بے اعتمادی غلامی اور ذلت کی کوئی جگہ نہ ہو؛ کسی ملک میں رہنے والے باشندوں کے عام اور مضبوط اتحاد ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔

ایسے مضبوط اتحاد کی بنیادوں پر اس تصور کی عمارت چنی جا سکتی ہے جو حقیقی ہو، لازوال ہو، اور جس کے لئے کوششوں کو لامتناہی بنا دیا جائے؛ آزادی کوئی حسین سیب نہیں ہے کہ ہاتھ بڑھا کر درخت کی شاخ سے اُسے توڑ لیا جائے۔ آزادی ٹھنڈے پانی کا گلاس نہیں ہے کہ اٹھا کر غٹ غٹ پی لیا جائے، آزادی اور کامل آزادی کے مندر کا کلس انسانی دسترس سے کافی اونچا ہے۔ آزادی وہ چشمۂ حیواں ہے جس کے لئے انسان کو سکندر بننا پڑتا ہے، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد عروسِ کامیابی سے ہمکناری نصیب ہوتی ہے؛

(۲) کسی ملک یا سوسائٹی میں بدامنی پیدا کرنا تو بہت آسان ہے لیکن بدامنی سے پیدا ہونے والے اثرات پر قابو پانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ فرقہ پرستی کی لعنت اور کسی غلام ملک میں!؟ یقین کیجئے کہ اس زہر سے انسانی زندگی کا جوڑ جوڑ پانی ہو جاتا ہے، اور غلامی! غلامی انسان کو حیات کی ان تمام برکتوں سے محروم کر دیتی ہے، جو آزاد قوموں ہی کا حصہ ہے۔ عام راحت و مسرت، خود اعتمادی، خود مختاریت، صنعتی و تجارتی آزادی، فوجی اور شہری آزادی، مذہبی اور مجلسی آزادی، اور دماغی و روحانی آزادی یہ تمام برکتیں غلامی میں رہ کر کبھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ترک ایک چھوٹی سی قوم ہے لیکن یورپ میں اس کے اقتدار و دوستی کو برطانیہ عظمیٰ قابلِ فخر و تسکین خیال کرتی ہے؛ اور ہم غلام، دور بیٹھے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی وسیع ترین سلطنت ہے! یہ اثر ترکوں کی مکمل آزادی کا ہے، آزادی نے ان کی قلت کو طاقت اور اکثریت سے بدل دیا ہے۔

---*---

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ شاعر اس روایتی ملکی آزادی کے تصور سے زیادہ وسیع اور تصوراتی آزادی کے نشہ میں چور رہتا ہے، اس کے سامنے ایک آئیڈل ہوتا ہے، یہ آئیڈل اسے زندگی میں مست رکھتا ہے سچا شاعر کبھی اخلاقی مسلّمات کے خلاف نہیں جا سکتا، وہ محبت کے مقابلے میں نفرت، آزادی کے مقابلے میں غلامی اور غربت کے مقابلے میں کبھی امارت کے طعنے کو برداشت نہیں کر سکتا؛ حقیقی شاعر ہونے کا دعویٰ تو خیر کیا کیا جا سکتا ہے، لیکن میں بعد کوشش بھی یہ معلوم نہیں کر سکا کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں سے کیوں نفرت کروں ۔۔!؟ میں جانتا ہوں

کہ سماجی، مذہبی اور ذہنی غلامی کو میں آج تک برداشت نہیں کرسکا تو میں ملکی غلامی کو کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں، اور کیوں برداشت کروں؟ میں اسے لعنت خیال کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ قدرت کا ایک قہر ہے جو ہندوستانیوں کی غداریوں، کاہلی، سستی اور بداعمالیوں کی سزا میں ان پر توڑا گیا ہے؛ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی نہ صرف اجنبی حکومت سے ہی تصادم کریں بلکہ اپنی برائیوں پر قابو پاکر اور اپنے اندر نئے محاسن کو پیدا کرکے اپنی قسمت سے تصادم کریں اور وہ حیثیت حاصل کریں جو زندہ اور عملی قوموں کی قسمت ہے!

ہندو مسلم فسادوں سے یہاں کے بسنے والے بے حس اور بیوقوف ہندو مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ علیحدہ علیحدہ دونوں قوموں میں ”خونی جنگجوئی“ اور ”بہادری“ کی روح ترقی کرے گی۔!؟

یہ کیسی بھول ہے، یہ کیسی غلط روی ہے۔ یہ کتنا عظیم گناہ ہے، بدقسمتی سے جن لوگوں کا یہ خیال ہے انکو بلووں سے پیدا شدہ خطرناکی اور دوری کا اندازہ نہیں ہے۔ آیئے میں اس دوری اور خطرناکی کی ایک کہانی سناؤں!۔

۸

کانپور جہاں ہندو مسلم فساد آئے دن کا کھیل ہے، میں میرے ایک ہندو دوست ہیں، ان کی چھوٹی بچی میری شاعری کی دیوانی ہے۔ اتنی دیوانی کہ جب میں کانپور جاتا تھا تو وہ ماں باپ کو چھوڑ کر ہر وقت میرے پاس بیٹھی رہتی تھی؛ یہاں تک کہ وہ بجائے گھر کے میرے ساتھ ہی سوتی تھی، اور راتوں کو جگا کر مجھ سے کہتی تھی کہ ایک شعر سنا دیجئے۔

دو سال کے بعد ابکی گرمیوں میں میں پھر کانپور گیا، وہ گھر پر نہ تھی؛ میں نے اُسے بلایا، مگر وہ نہ آئی اور جب آئی تو خود آئی، لیکن اس کے آنے، بیٹھنے، ہنسنے اور ملنے میں وہ پریم، اور بے ساختگی نہ تھی اور وہ سہمی سہمی معلوم ہوتی تھی؛ جب سوٹ بدل کر ڈرائنگ روم میں آیا جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے شوخی سے کہا ”اچھا مسلمان سوٹ بھی پہنتے ہیں۔!؟“ یہ کہنے کے بعد اس کے انداز و اطوار میں میں نے ایک خوف چھپا ہوا محسوس کیا۔“

اس قریبی مثال سے آپ اچھی طرح اس نتیجے پر پہونچ گئے ہوں گے: کہ کانپور کے مسلسل بلووں سے ہندو بچوں تک میں نفرت اور خوف کے گھناؤنے جراثیم پیدا ہوئے، اور ایک ہندو بچی اس شخص سے بھی ڈرنے لگی جو ہندوستان کی قوموں کو بہر حال متحد دیکھنا چاہتا ہے۔

اس معصوم بچی کے دل میں نفرت کا یہ زہر دیکھ کر میں کانپ گیا، اور میں نے عہد کیا کہ میں ساری زندگی قومی اتحاد کی کوشش میں صرف کردوں گا!

گالیاں بکنا اور اس طرح کہ ملک میں ان گالیوں سے نفاق پیدا ہو، دل آزاری کا بازار گرم ہو، کسی شریف اور حساس دل انسان کا کام نہیں ہوسکتا، یہ بازاری انسانوں کا شغل ہے، پاکستانی تحریک، سیاسی اور جغرافیائی تقاضوں کے قطعی منافی ہے۔ وحدتِ قومی کے خلاف ہے اور ایک ایسی جانبداری پیدا کرتی ہے جو بدامنی پھیلائے گی اس لئے مجھے اس سے قطعی اتفاق نہیں! لفظ ”مذہب“ اور ”اسلام“ سے جلب منفعت کرنے والوں کی تعداد دونوں قوموں میں اتنی زیادہ ہے کہ اب اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر گنجائش بھی ہو تو کم از کم وہ دماغ جس کو ذرا بھی سوچنے کی عادت ہے، ایسی ذلیل معصیت میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ ذاتی معتقدات کو ذریعۂ معاش بنائے۔ اس کے خلاف میرا خیال یہ ہے کہ مذہب کے غلط تصور کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکنے کی ضرورت ہے، جس وقت تک انسانی ذہن سے روایتی مذہب کے زہریلے جراثیم نہ نکلیں گے اس وقت تک ہندوستان اور ہندوستانیوں کی فلاح اور ترقی ناممکن ہے!

انسانی زندگی ایک عجیب گورکھ دھندہ ہے! ایک بات سے دوسری بات کا گہرا رشتہ ناتہ ہے، روایتی مذہبیت کے مٹ جانے کے بعد یقیناً انسانی دماغ میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور مسائل کو ان کی اصلی روشنی میں سوچنے کی عادت ہوجائے گی؛ پھر اس کے بعد بہ آسانی آدمی یہ جان سکیگا کہ ”حاکمیت“، کھلی ہوئی قزاقی اور غربت و افلاس اسی انسانی لوٹ ہی کا نتیجہ ہیں! جو لوگ تبدیلی کے دشمن ہیں، کبھی آپ نے سوچا ہے کہ وہ کیوں دشمن ہیں!؟ وہ اپنی تمام علمی طاقتوں سے تبدیلی کو غلط ثابت کرنیکی

کیوں کوشش کرتے ہیں، محض اس لئے کہ وہ زندگی کو سطحی اور "مادی" تسلیم کرلیں تو خود ختم ہو جائیں گے؛ انکی خدائی کو گھن لگ جائیگا لیکن اگر صبح کے بعد شام اور شام کے بعد رات ہماری دنیا کی مسلّمہ انقلابات ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ مسرّت کے بعد رنج، اور زندگی کے بعد موت لازمی ہے تو کون ہے جو انقلاب کی تردید کرنے کی جرأت کرسکے۔!؟

میں تبدیلی کا دشمن بن کر دھوکہ نہیں کھانا چاہتا اور اپنی ذاتی ترقی کے لئے مسلمانوں کو احمق نہیں بنانا چاہتا، میں نے سوائے اپنے دل و دماغ کے آج تک کسی کی رہبری منظور نہیں کی، میں نے بچپن سے لیکر اس وقت تک ذہنی غلامی کو برداشت نہیں کیا۔ اور نہ میں اب کسی شرط پر یہ غلامی برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں! بدقسمتی سے میں ازلی باغی ہوں، اور ہر حصۂ عمر میں میں نے اپنے ماحول سے بغاوت کرنیکا مقدس کھیل کھیلا، اب جبکہ ایک بہت عظیم بازی گاہ میرے سامنے ہے، قدرتی طور پر میں بغاوت سے باز نہیں آسکتا، بلکہ اضافے کے موقعوں کا منتظر ہوں۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ "متمدن" اور "مہذب" سماج میں جس کا سارا کاروبار ایک نمائش کے علاوہ کچھ نہیں، ذرا سی کھری بات کہنا بھی خود اپنی ہنسی اڑانا ہے۔ خیر سے سوسائٹی کو شعراء اور حکماء کی ہمیشہ حاجت محسوس ہوتی رہی، مگر جب مذہب سے موازنہ ہوا، منافقت صاف ظاہر ہوگئی یعنی شاعری ایک تفنن سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔

اول تو آج تک کبھی خواب میں بھی مجھے یہ گمان نہیں ہوا کہ میں شاعر ہوں، کیونکہ میرے تصور میں شاعر کی جو حیثیت اور مرتبہ ہے، اور اس کی تعمیر کیلئے جن عناصر کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے میسر نہیں ہیں، لیکن فرض کر لیجئے کہ میں شاعر ہوں تو اس فرض کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اور آپ کو وہی زاویۂ نظر بنانا چاہیئے جسے "آئیڈل" کہا جاسکے!

اس آئیڈل کے پیش نظر مجھ سے "راہِ نجات" "نور نامہ" اور "گلدستۂ قوالی" کا مطالبہ کرنا، آپ خود ہی سوچئے ذرا آپ کی زیادتی ہے!

مجھے ہرگز دعویٰ نہیں لیکن اس متصورہ آئیڈل کے زاویۂ نظر سے شاید آپ کو وہ سننے کیلئے تیار رہنا چاہیئے جو میں عرض کروں، آپ زندگی کو اپنے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور میں اپنے نقطۂ نظر سے؛ مجھے ہجر میں لطف آتا ہے، آپکو وصل میں، ایک کو مذہب پرستی میں سکون ہے، دوسرے کو اصول ایجادی میں، بہت سے شعراء فاقہ مستی کے باوجود "شاہد و شراب" اور "لالہ و گل" سے کھیلتے ہیں، تو بندہ نواز اس کی بھی تو سنئے جو صاف یہ کہتا ہے کہ ؎

عشق ہے بھوک کا باغی یہ تمسخر ہے فقط
عشق مجلس پہ ہے حاوی یہ تمسخر ہے فقط

حیرت ہے کہ لوگ اس سچ کو گاہے گاہے بھی نہیں سننا چاہتے جو ایک بار "جھوٹ" کا لباس پہن کر نمودار ہو جائے!؟

ایشیا اپنی عمومیت کے ساتھ ہی بدقسمتی سے یہ خصوصیت بھی رکھتا ہے کہ میں اُسے ترتیب دیتا ہوں، تاہم بہت کچھ اس کے صفحات میں میں اپنے مزاج کے خلاف شائع کرتا ہوں۔ خاص کر نظم کے حصہ میں غزل اور غزلوں میں دقیانوسی خیالات، اس سے زیادہ رجعت پسندی اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ادب کو نقصان پہونچایا جائے۔ تمام دنیا کی زبانیں ادب جس ترقی یافتہ زاویۂ نگاہ پر متفق ہیں۔ ہمیں بھی وہی زاویۂ نگاہ اختیار کرنا چاہیئے۔

رومان!؟ (ROMANCE) ایک طرف مسلمان انتہائی ثقہ بنتے ہیں، دوسری طرف وہ روایتی عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے افسانے پڑھنا چاہتے ہیں۔ محبت ثقاہت کے خلاف ہو یا نہ ہو مگر "جذبات کی انتہائی منافقت" اور "رنگین جھوٹ" ضرور ہے، نسیم کا حُسن مسلّم، کانِ بالا کی نزاکت تسلیم، مگر لٹے ہوئے ایشیا کے جنگل میں ان حوروں کی گنجائش کہاں!؟ خاص کر ایسی حالت میں کہ آپ "مومنین" کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں!؟

یقین کیجئے کہ ایشیا اپنا "محبت نمبر" ضرور شائع کرتا اگر اس کے اراکین کو محبت کا ادنیٰ سا تجربہ بھی ہوتا۔

ایک گناہ ہو تو اس کی تردید کی جائے، ایک جرم ہو تو بیان صفائی پیش کیا جائے، مسلمانوں کے نزدیک تو جو شخص ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے قابلِ گردن زدنی ہے

حبِّ ذات، خودداری کا احساس خدا معلوم مسلمانوں کے نزدیک اس
عہد میں کیوں گناہ ہو گیا !؟ اسلام کی تعلیم انفرادی خودی، انسانی خودداری
اور مساوات پر مبنی ہے، مگر مسلمانوں میں ابھی تک ایامِ جاہلیت کی طاقت
پرستی کارفرما ہے، وہ طبقے جنھیں ایک خاص نظامِ تمدن نے حادثاتی طور
پر "اعلیٰ" کا خطاب دے دیا ہے۔ دماغی لوگوں کو بھی اُس زاویۂ نگاہ سے
کیوں دیکھتے ہیں جس سے وہ سوسائٹی کے عام افراد کو دیکھنے کے عادی
ہیں؛ امیر سے مرعوب ہونا اور مفلس کو مرعوب کرنا ان حضرات کا پیشہ ہے؛
نسل و رنگ، حسب و نسب حقیقی شرافت، قدرتی بلندی، علم و فضل،
ذہانت اور فطانت سب امارت کے آگے ہیچ ہے؛

ظاہر ہے کہ تقسیم دولت کے غلط نظام نے اہلِ علم کو ہمیشہ مفلس
رکھا، اس لئے اور بھی رکھا کہ اہلِ علم میں ان اعلیٰ طبقوں کی لوٹ کھسوٹ
کی طاقت موجود نہ تھی؛ جن صاحبانِ علم و فراست میں یہ طاقت تھی وہ
حسن آبنِ صباح کی طرح چمکے، جو شاعر تھے وہ خیام کی طرح دنیا میں
مکتفی رہے؛

اس کسوٹی پر ہمارے یہاں سوسائٹی کسی جاتی ہے اور سوسائٹی
کی کسوٹی پر ہم پرکھ کر پھینک دیئے جاتے ہیں؛ عام طور پر شاعر کا فرض یہ تسلیم
کیا گیا ہے کہ وہ "ڈرائنگ روم" کی رونق بڑھائے اور بس، اس کو یہ
حق ہرگز نہیں کہ وہ سیاسی و دینی مسائل کے متعلق اظہار رائے
بھی کر سکے؛

سیاست کا فیصلہ کرنا امرا کا کام ہے، مذہب کا کاروبار علماء
کے ہاتھ میں، پھر وہ کیا گیا !؟

مذہبی پیشواؤں کو تو فنِ لطیف سے کوئی تعلق ہی نہیں، رہ گئے
تھکے ہوئے امرا، سو شعراء کا فرض ہے کہ وہ رومانس (   )
کی افیون نظم کے مشک و عنبر میں ملا کر ان کو دیں؛ تاکہ یہ دوسرے دن
پھر کام کر سکیں —!؟

(یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچکر شاعری کے قدیم اور جدید رویہ
پر خود ہی روشنی پڑ جاتی ہے؛ اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر شاعر، جنتا کا
نمائندہ ہو گا تو اس کا زاویۂ نظر بالکل بدل جائے گا۔ اور یہاں اس کے
لئے لازم ہو جائیگا کہ وہ دکھوں کو وضاحت سے بیان کرے، یہ وضاحت
نظم ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے غزل کے ذریعہ نہیں ہو سکتی؛ غزل تو قطعی
نشاطی اور سامراجی چیز ہے ؛)

بہرحال وہ مفکر شعراء جو موجودہ ماحول کے پیداوار ہیں اپنا منصب
اور اپنی جگہ اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور خواہ ان کی ہستیاں خاک ہو جائیں
مگر وہ اپنی خودداری کو کسی کے ہاتھوں فروخت نہیں کر سکتے؛ وہ نہیں
جائیں گے کسی کے دروازے پر اور وہی کہیں گے جو واقعی اُن کو
کہنا چاہیئے؛

کوئی شک نہیں کہ امیر ہوں یا غریب یہ تمام انسانی سماج کی ملک
میں ہیں اور انھیں کسی سے کد یا غرور نہیں، ان کی ساری جدوجہد
سوسائٹی ہی کے لئے ہے، یہ انسانی ذہن کی ترتیب و بلندی کے ذمہ
دار ہیں، مگر خود کو پستی میں ڈھکیل کر وہ ہرگز سوسائٹی کو بلند کرنا پسند نہ
کریں گے؛

میں شاعری کی اس نوعیت و حیثیت کو قطعی غلط سمجھتا ہوں کہ وہ ہندوستان
کے ایک فرقہ کا شاعر معلوم ہو؛ اور غیر ملکی عناصر کو اُردو شاعری کی انفرادیت
کے منافی خیال کرتا ہوں؛ شاعرانہ تصورات کو میں کسی خاص جغرافیائی
حدوں میں بند کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر ملک کا ادب اسکی
کلچرل خصوصیات کا حامل ہوا کرتا ہے؛ اسی لحاظ سے اردو شاعری کو
قطعی "ہندوستانی" ہونا چاہیئے۔ شعراء کے اختلاف کو میں کوئی
اہمیت نہیں دیتا؛ کیونکہ یہی ایک ایسی قوم ہے کہ کسی ایک چیز پر کبھی
متحد نہیں ہو سکتی؛ لیکن سیاسی یا ادبی مسائل میں جب میں مسلم خواتین
کو رجعت پسند دیکھتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے؛ کیونکہ ہماری مائیں اور
بہنیں ہی ایک نئی شاندار اور صاحبِ سیرۃ نسل پیدا کرنے اور اسے
تربیت دینے کے ذمہ دار ہو سکتی ہیں؛ اگر ان کے ذہنوں پر رجعت
پسند مردوں کا پرتو اسی طرح پڑتا رہا تو ترقی کا ہر سلسلہ بند ہو جائیگا؛
یہ مائیں اور یہ بہنیں جنھیں آج تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ہونے
کا دعویٰ ہے، امین ہیں اُس ارتقاء کی جو مستقبل میں ظہور پذیر ہونے
والا ہے؛ انکو نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ عورت کا دوسرا نام محبت
ہے، انھیں اپنے دل ہر قوم کے لئے وسیع کرنے چاہئیں کہ ہندو، مسلمان
انگریز، عیسائی، پارسی، سکھ اور جملہ اقوامِ عالم کے محاسن کو محاسن ہی

خیال کرنا چاہیئے ۔ اگر اس ملک کی ہندو مسلم خواتین میں بھی فرقہ پرستی کا زہر سرایت کرنے لگا ہے تو پھر مایوسی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے ۔

مسلم نوجوان سے مسلمان کی آئندہ قسمت وابستہ ہے، میں اپنے بھائیوں سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہر وقت اپنے قدموں پر میرا سر دیکھ سکتے ہیں، مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ میں انھیں نفرت اور فرقہ پرستی کی طرف آواز دوں ؛ شاعر کبھی محبت کے مقابلے میں نفرت اور آزادی کے مقابلے میں غلامی کی تلقین نہیں کر سکتا ؛ وہ قدرتی طور پر محبت کوش اور آزاد ہوتا ہے ؛

میرے بزرگ رہم سے اوپر والے، اچھی طرح جانتے ہیں کہ فنِ شاعری میں کسی قسم کی روایتی شاعری کی کوئی جگہ نہیں ؛ شاعر کا کام مذہبی توعیظ نہیں ہے ؛ بلکہ جو اس کا قدرتی ظنِّ غالب ہے اُسی کو وہ بیان کر سکتا ہے ۔

مسلم لیگی مسلمان اس حقیقت کو دیکھ کر بہت کڑھتے ہیں کہ اس عہد کا کوئی مستند اور مشہور و مقبول اور صاحب حیثیت شاعر ان کے ساتھ نہیں، مگر کڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر مسلم لیگ سے شعراء کے عدم تعاون کے اسباب پر غور کریں تو ان کی تکلیف کم ہو سکتی ہے ۔ شاعر تنگ دلی، فرقہ پرستی، نفرت، تکبّر، غلامی، فریب، تن آسانی، بے عملی اور گمراہی کا ساتھ کبھی نہیں دے سکتا ؛ !؟

آج اگر مسلم لیگ، کانگریس کے برابر ہی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرے تو سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جو اس کے گیت جھوم جھوم کر گانا اپنا فرض سمجھے گا ؛

لوگ غلط خیال کرتے ہیں کہ کانگریس ہی ہماری منزلِ مقصود ہے، کانگریس کو تو ہم محض اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ آزادی اور ترقی کی علم بردار ہیں ؛ ہماری منزل آزادی اور آزادی سے پیدا ہونے والی عام راحت و عزت ہے ۔

ایشیا کے خلاف جن چند حضرات نے دفتر میں خطوط بھیجے ہیں، ان کے لئے اور ان کے ہم خیالوں کے لئے میں نے یہ چند صفحات تحریر کئے ؛ اب براہِ راست میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ ایشیا اپنے مسلک سے سرمو قدم نہیں ہٹا سکتا ؛ اس کی خریداری سے دست برداری تو کیا خواہ اس کے دفتر کو پھونک دیا جائے اور ساغر کو زندہ آگ ہی میں کیوں نہ جلا دیا جائے ۔

فقر اور جہد کا دعویٰ کرنا تو بڑی کم ظرفی ہے : مگر اڈیٹر ایشیا کی زندگی ہی کچھ اسی طرح کی ہے اور وہ اسی طرح خدمتِ خلق میں صرف ہو جائے گی ؛

اس کے ساتھ ہی ان حضرات کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ایشیا کو پسند کرنے والا طبقہ بھی اپنی جگہ ایک مستقل وسعت رکھتا ہے، آپ کے مسترد کر دینے سے اس وسعت میں کمی نہیں ہو سکتی ؛ اگر یہ واقعہ ہے کہ ایشیا اردو ادبیات کی خدمت کر رہا ہے اور اس کا اڈیٹر اپنی ساری زندگی اسکے لئے وقف کئے ہوئے ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ قدرت اور انسان اتنے دیوالیہ ہو گئے ہیں کہ ایشیا اور ساغر کی پشت پناہی نہ کریں !؟

ملک میں ایک عظیم الشان جماعت ایشیا اور اس کے مسلک سے اتفاق کرنے والی موجود ہے، شب و روز روشن خیالات اور نئے تصورات قدامت کے خس و خاشاک کو صاف کر کے اپنی جگہ پیدا کر رہے ہیں ؛ ان حالات میں مجھے کوئی مایوسی نہیں ہے

یاس اک رُخ ہے جمود و سعی کی تدبیر کا

ساغر

روس اور فن لینڈ کی کشمکش ماضی کی روشنی میں

روس اور فن لینڈ کی موجودہ کشمکش نے سامراج پرستوں کو یہ زریں موقعہ دیدیا ہے کہ وہ روس کے خلاف اپنے ان جذبات کا اظہار کر سکیں جو سالہا سال سے ان کے دلوں میں پرورش پا رہے ہیں۔

چنانچہ آج روس پر مختلف قسم کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ سامراج شاہی کا مخالف آج خود "سامراج پرستی" کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت کا مرکز نازیت اور فسطائیت کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ موجودہ بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ نہ اخبارات آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے ہیں اور نہ صحیح خبروں کے عوام تک پہونچنے کا امکان ہے۔

خبر رساں ایجنسیاں جس صورت میں بھی مختلف خبریں پہونچاتی ہیں انھیں سے واقعات کا کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب صحیح واقعات ہی سامنے نہ ہوں تو ایسی صورت میں ہمارے واسطے بھی آزادی سے رائے دینا مشکل ہے۔ برطانیہ کی طرف سے جو سرکاری بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں ان سے وہاں کی رائے عامہ کا کچھ اندازہ ممکن تھا اگر وہیں کے سیاسی مدبر اور ناقدان بیانات پر شدید نکتہ چینی نہ کرتے۔

جب "عمل" کے ساتھ "رد عمل" بھی سامنے آجائے تو کسی مناسب نتیجہ پر پہونچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو مسٹر چیمبرلین کا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے روس کے موجودہ رویہ کو "جارحانہ" بتا کر اسکی بری طرح مذمت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جس طرح پولینڈ پر "ڈاکہ" ڈالا گیا تھا اسی طرح فن لینڈ پر بھی ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ فن لینڈ کی "بہادرانہ مدافعت" کی تعریف بھی کی ہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اسے اپنی عملی امداد کا یقین بھی دلایا ہے۔ ادھر فرانس کے وزیر اعظم موسیو ولیڈیر آغاز جنگ ہی سے فن لینڈ کے آنسو پوچھ رہے ہیں۔

یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ عملی مدد کر بھی رہے ہیں۔ جنگی طیارے فن لینڈ کو عاریتاً دیے جا رہے ہیں۔ مالی مدد سے بھی گریز نہیں کیا جا رہا ہے۔ حیرت کیسا تھ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اٹلی بھی ان سامراجی حکومتوں سے پیچھے نہیں۔ وہ بھی روس کے خلاف فن لینڈ کو مدد دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ سوئڈن جو فن لینڈ اور روس دونوں کا پڑوسی ہے اپنے سورماؤں کو فن لینڈ کے مقتل میں سرمایہ اور مزدور کی کشمکش میں شکار کرا دینا چاہتا ہے۔

اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ روس کے خلاف اتنا زبردست محاذ کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب کہ "جنگ عظیم" برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے درمیان ہو رہی ہے اور برطانیہ کی ساری توجہ جرمنی کے خلاف ہونی چاہیئے تھی۔ یہاں یہ بھی غور طلب بات ہے کہ جرمنی کا واقعی طرز عمل کیا ہے۔

اخبارات کی خبریں کبھی کچھ کہتی ہیں، کبھی کچھ۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی اس معاملہ میں روس کا ساتھ دے رہا ہے اور تھوڑے دنوں سے یہ سننے میں آ رہا ہے کہ جرمنی، فرانس، برطانیہ اور امریکہ پر روس کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور باوجودیکہ اسکو روس سے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں، وہ یہ نہیں چاہتا کہ روس کو فن لینڈ کے محاذ پر شکست ہو جائے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی شکست سے خود اس کی قوت پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف روس بھی یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی کی نئی دوستی ختم ہو جائے۔ اس کو بھی جرمنی کی شکست سے ایسا ہی خطرہ ہے۔ وہ ایک طرف جرمنی کو فتحیاب دیکھنا چاہتا ہے تاکہ برطانوی سامراج شاہی اتنی کمزور ہو جائے کہ وہ برطانوی سرمایہ داروں پر قابو حاصل کر لے اور وہ دنیا کے مزدوروں کو، خصوصاً روسی مزدوروں کو اپنی سوداگری سے جانکنی کی حالت میں نہ ڈال سکیں۔ لیکن اگر تاریخ کی روشنی میں جرمنی اور فن لینڈ کے تعلقات دیکھے جائیں، تو یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جرمنی کا دل بھی روس کی طرف سے صاف ہے۔ تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فن لینڈ اور جرمنی کے درمیان آج بائیس برس سے خون اور پسینہ کا رشتہ قائم ہے۔ فن لینڈ کے میدانوں میں جرمن جوانوں کا بھی خون بہا ہے۔ نہ اسے فن لینڈ بھول سکتا ہے اور نہ جرمنی۔ غالباً یہی سب الجھاوے ہیں

ایشیا

جس کی وجہ سے روس کو فوری کامیابی نہیں ہو سکتی ہے

اس لڑائی پر رائے دینی اس موقع پر مناسب نہیں۔ جب فیصلہ ہو جائیگا۔ کوئی جیتے کوئی ہارے، دنیا کے سامنے روسی حملہ کا مقصد آپ آجائے گا، لیکن فن لینڈ کی بیس سالہ تاریخ پر ہم کسی قدر روشنی ضرور ڈالیں گے تاکہ ہمارے ناظرین صرف جذبات کی رو میں کھو کر غلط فیصلے نہ کر سکیں،

ہلسنگفورس (HELSINGFORS) کے وسط میں ایک یادگار آج بھی نہایت معصومیت سے اعلانِ حال کر رہی ہے۔ یہ یادگار اُن جرمن سپاہیوں کیلئے ہے جو روسی سپاہیوں سے جنگ کرتے ہوئے فن لینڈ میں موت کی گھاٹ اُترے تھے۔ بائیس برس پہلے کی بات ہے جب فن لینڈ سامراجی روس سے جنگِ آزادی کر رہا تھا۔ یہ یادگار غالباً بہت الجھاوے دور کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ یہ یادگار خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یورپ بائیس برس پہلے کی تاریخ نہیں بھولا ہے۔ اسوقت فن لینڈ نے جرمنی کی زبردستی کی مدد کو اپنے بھولے پن کی بنا پر پُرخلوص مدد کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اس لئے آج بھی ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ جرمنی کا مقصد دراصل فن لینڈ کے مظلومین کی مدد کرنا نہ تھا بلکہ اُسے سیاسی اور جغرافی اثرات کے جال میں جکڑنا تھا۔

فن لینڈ کے باشندے بڑے جذباتی ہوتے ہیں اس لئے وہ ابتک جرمنی کے پُرخلوص دوستی اور دیانتداری پر فخر کیساتھ ایمان رکھتے ہیں، وہ اس بات کو (جیسا کہ اکثر محققین کہتے ہیں) کسی طرح ماننے کیلئے تیار نہیں کہ جرمنی کا مقصد خود غرضانہ تھا اور وہ فن لینڈ کو صرف شکار کا بکرا بنا کر فن لینڈ کے جنگلوں میں داخل ہوا تھا۔

یہاں پر سوئڈن کی محبت بھری نظروں کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ فن لینڈ میں دس فیصدی سوئڈن کے ماں جائے بسے ہوئے ہیں۔ موجودہ فن لینڈ کا کلچر بھی بہت حد تک سوئڈن کا مرہونِ منت ہے۔ خود فن لینڈ والے یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ انکی حکومت کا مرکز (HELSIN-
-GFORS)، ہلسنگفورس ہر لحاظ سے (STOCKHOLM) اسٹاکہالم کا (سوئڈن کی حکومت کا مرکز)، ایک مختصر نمونہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ سوئڈن کلچرل طور پر جرمنی سے بہت قریب ہے۔ اسکولوں میں اعلیٰ تعلیم جرمن زبان میں ہی دی جاتی ہے۔ اونچا طبقہ بھی جرمن

زبان میں لکھنا پڑھنا فخر سمجھتا ہے۔ یہ تمام باتیں فن لینڈ میں جرمنی کے گہرے اثرات کے راز کو سمجھاتی ہیں۔

اس موقعہ پر ایک بات اور بھی سمجھنی چاہیئے۔ جب بائیس برس پہلے فن لینڈ کے باشندوں نے سامراجی روس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور جرمن اثرات کی وجہ سے (جس کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے) اس نے جرمن کی عسکری مدد قبول کی، خود فن لینڈ میں اس مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو گئے۔ جرمن سرمایہ کی طرف فن لینڈ کا سرمایہ کھینچا اور زار روس کی حکومت کے خلاف آزادی کا پرچم لہرانے میں دونوں ملکوں کی سرمایہ داری ہاتھ ملا بیٹھی۔ فن لینڈ کے مزدوروں اور کسانوں نے یہ سمجھا کہ ایسی قومی حکومت جو ایک کے چنگل سے نکال کر انھیں دوسرے کے قبضۂ قدرت میں پھنسا دے گی، کسی کام کی نہیں اور دراصل ان میں آزادی کا جذبہ فن لینڈ کے وطن پرستوں نے پیدا بھی نہ کیا تھا۔ لینن اور دوسرے روسی انقلابیوں نے انھیں آزادی کی جنگ کیلئے توجہ دلائی تھی، اس لئے کہ ان کی سرکردگی میں خود روس میں سامراجی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ان کا مقصد فن لینڈ کی آزادی سے یہ تھا کہ فن لینڈ نہ صرف زار کی سامراج شاہی سے آزاد ہو جائے بلکہ ان کی سرمایہ داری کی غلامی بھی دور ہو جائے۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ فن لینڈ کے سرمایہ دار رہنما، اپنی تنگ نظر وطن پرستی کی بنیاد پر اپنے ذاتی اقتصادی اقتدار کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکا رہے ہیں جس سے فن لینڈ کے کسانوں اور مزدوروں کو کوئی خاص فائدہ نہ پہونچے گا۔ روسی انقلابی فوجوں کا ایک حصہ جنوبی فن لینڈ پر اسی طرح حملہ آور ہوا۔ جس طرح انھوں نے ماسکو اور لینن گراڈ پر حملے کئے تھے۔ دراصل اسوقت چونکہ فن لینڈ روسی حکومت میں شامل تھا۔ اس لئے فن لینڈ کے معاملہ میں ان کی جارحانہ دلچسپی غیر متوقع نہ تھی۔ یہ فن لینڈ کے مزدوروں اور کسانوں کی بدقسمتی تھی کہ روسی انقلابی فوج اُنکی پوری مدد نہ کر سکی۔ وہ اس وقت خود روس میں عظیم جنگ و جدال میں مبتلا تھے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ اُن کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ اپنے فن لینڈ کے کامریڈ کی مدد جاری رکھ سکیں۔ جیسے ہی روسی فوجیں واپس ہو گئیں

جرمنی کو موقع مل گیا کہ فن لینڈ کو اس غلط خیال میں مبتلا کردے کہ روس کی انقلابی فوج انکی کسی طرح ہمدرد نہ تھی۔ اُس کا مقصد زار روس کی حکومت کے بہ حصّہ کو اپنے قبضہ میں کرلینا تھا۔ اور وہ دراصل فن لینڈ پر روس کا پرچم ہرانے آئے تھے۔ جرمنی کے لئے یہ چیز نہایت ضروری تھی اس لئے کہ وہ اس وقت برطانیہ اور فرانس کیساتھ ساتھ روس سے بھی نبرد آزما تھا۔

جرمنی کا پیدا کیا ہوا یہ جذبہ آج بھی فن لینڈ کی جاہل آبادی کے دلوں میں محفوظ ہے، جہالت حقیقت کی روشنی کو یوں بھی نہیں چمکنے دیتی۔ پھر غلط اور تنگ نظر وطن پرستی کا جذبہ یوں بھی اس چیز کے سمجھنے میں مانع ہوتا ہے کہ صحیح آزادی وہ ہے جس میں ملک کی جنتا اگر ایک طرف اعلیٰ زندگی کے مزے چکھ سکے تو دوسری طرف دنیا میں اپنے دوسرے ہمجنسوں کے منہ سے نوالہ بھی نہ چھینے۔

بالکل یہی صورت حال آج بھی ہے۔ صرف تصویر الٹی ہے۔ پہلے جرمنی فن لینڈ کے محاذ پر روس سے لڑ رہا تھا تاکہ اس طرف سے وہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے سامنے کانٹوں کا جنگل بچھا سکے اور اب روس، فن لینڈ کے محاذ پر یورپ کی سامراج شاہی سے اس لئے لڑ رہا ہے تاکہ اس بڑی تجارتی منڈی کو تباہ کرسکے۔ وہ اپنے مزدوروں کے ساتھ ساتھ، دنیا کے مزدوروں کیلئے بھی روٹی محفوظ کرسکے۔

(ب)

جس طرح ہر ملک میں اشتراکیوں کی تعداد حقائق کی روشنی میں بڑھتی جاتی ہے، اسی طرح فن لینڈ میں بھی لوگ آنکھیں کھولنے لگے ہیں۔ اور وہ سرمایہ کی وطن پرستی سے چوکنے ہوگئے ہیں لیکن وطن پرستی کی چکا چوند میں ابھی ان کی آنکھیں پوری طرح دور کے منظر کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کی موجودہ طوفانی فضا سے چوکنا ہوکر جب روسی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت نے ماضی کے جذبات کی بنا پر فن لینڈ کو یورپ کی سامراج شاہی سے محفوظ کرنے کیلئے اور ساتھ ہی اپنی حفاظت کیلئے فن لینڈ سے محبّت کا رشتہ جوڑنا چاہا تو فن لینڈ نے انکار کردیا اور جب روس کی انقلابی حکومت نے چھوٹے بھائی کی حماقت اور جہالت کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک تجربہ کار بھائی کی طرح اسکی تنبیہہ کرنی چاہی تو وہ بال ہٹ کر بیٹھا۔ اور آب فیصلہ کی ایک صورت ہے یا تو بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو اپنے حال پر چھوڑ دے کہ اُسے بھیڑیا اپنی خوراک بنالے، یا پھر اس وقت تک کیلئے اس کے ہاتھ پیر توڑ دے جب تک کہ اُسے خود اصلی خطرہ نظر نہ آجائے۔

یہ تو تھی روس اور فن لینڈ کے درمیان کشمکش کی کہانی، اب بات میں نکلی ہوئی ایک بات اور سنئے۔

جب فن لینڈ سے مایوس ہوکر روسی مجاہدین روس کو واپس ہوگئے، ان کی ساری توجہ مقامی حالات کی طرف ہوکر رہ گئی۔ روس کی سامراجی قوّت کا توڑنا اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ لینن اور دوسرے انقلابی لیڈر سمجھے بیٹھے تھے۔ خود کسانوں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو شہنشاہی سے بغاوت پسند نہ آئی اس لئے کہ وہ ایک دق کی مریض کی طرح اپنے حال پر شاکر تھے، اس ہٹ دھرمی نے خانہ جنگی شروع کردی اور یہ جنگ تین سال تک ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب جنگ یورپ ختم ہوئی تو نئی روس کی ساری توجہ تعمیر کیطرف تھی اور اُس میں اتنی سکت نہ رہ گئی تھی کہ روس سے باہر نکل کر دیکھے کہ کون کیا چال چل رہا ہے۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ اس چیز سے غافل نہ تھے۔ بیچارہ فرانس تو اتنا زخم خوردہ تھا کہ اسے دیر تک اسپتال کا مریض بننا پڑا تھا۔ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی مرہم پٹی میں مشغول ہوگیا۔

جب ورسلز کے صلحنامہ کے بموجب جرمنی کو ننگا، لولا اور لنگڑا کردیا گیا تو دوسری چھوٹی طاقتوں پر رعب چھا گیا۔ فن لینڈ بھی جس کی آزادی کی بڑی وجہ جرمن مدد تھی، ڈر گیا، اُس نے سوچا کہ اگر ان جیتی ہوئی قوموں کے سامنے اُس نے ہاتھ نہ جوڑے کہیں جرمن دوستی کے جُرم میں وہ بھی اپاہج نہ بنا دیا جائے۔ اِدھر برطانیہ اور امریکہ نے یہ سوچا کہ فن لینڈ پر سایۂ عاطفت ڈالکر اسکی خام پیداوار سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ پھر جنگ سے یہ فتحمند قومیں بھی تھک چکی تھیں۔ اس لئے انھوں نے فن لینڈ کے ضدی بچہ کو اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں چھپا لیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اینگلو امریکن اثرات فن لینڈ پر چھا گئے۔ فن لینڈ میں چونکہ عوام کی حکومت نہیں تھی اس لئے اونچے طبقے کے رہنماؤں نے دوسرے ممالک میں اپنے ہمجنسوں کی تلاش کی جو اتفاقاً

بازی گری میں اُن کے شریک کار بن سکیں۔ ظاہر ہے کہ اسوقت اینگلو امریکن سرمایہ سے رشتہ ناتہ ہی اُن کے لئے مناسب تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بائیس برس کے عرصہ میں آزاد فن لینڈ، اینگلو امریکن سرمایہ داروں کیلئے اچھی خاصی شکارگاہ بن گیا۔ جس طرح جزائر فلیپائن باوجود امریکہ سے "اونچی درجہ" ذہنی آزادی حاصل کرنے کے اقتصادی طور پر اُس کے بالکل غلام ہیں اسی طرح فن لینڈ بھی آج آزادی اور وطن پرستی کے بلند دعوؤں کے باوجود اینگلو امریکن سرمایہ داری کا دست نگر ہے۔ یہ رشتہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک بڑے اور چھوٹے مہاجن کے درمیان ہوتا ہے۔ چھوٹا مہاجن اپنی جگہ پر آزاد تو ہوتا ہے لیکن بڑے مہاجن کا دست نگر بھی رہتا ہے۔ آج فن لینڈ کی ساری تجارت امریکن سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جسمیں برطانوی سرمایہ بھی شامل ہے۔ خصوصاً لکڑی کی زبردست تجارت بالکل برطانوی سوداگروں کے ہاتھ میں ہے۔

——— زمین کا آخری انچ بھی جرمن یا سوئڈش زمینداروں کے ہاتھ میں ہے جو وہاں پچھلی جنگ آزادی کے زمانے سے وہیں بسے ہوئے ہیں۔ حکومت دراصل بیرونی سرمایہ کی دست نگر ہے۔ زمین پر غیروں کا قبضہ ہے۔ ہندوستان کی طرح بیچارے فن لینڈ کے معصوم اور مظلوم باشندے صرف مزدور ہیں یا کسان ہیں یا جنگ کی شکارگاہ کیلئے شکار کا بکرا۔

پچھلے ہفتہ سے جو فن لینڈ کے معاملہ میں جرمن پالیسی کی خبریں آرہی ہیں، اُسکا راز اڈیٹر کی تحریر سے معلوم ہوجائے گا۔ جرمنی غالباً اب یہ سمجھتا ہے کہ فن لینڈ سے اُس کا رشتہ جذباتی ہی رہیگا اور جب تک کہ وہ خود فن لینڈ کے محاذ پر سرمایہ داروں سے سرمایہ دارانہ جنگ کرے، رشتہ میں گہرائی نہ پیدا ہوسکے گی۔ بھوکا غلام آقا کی بے لاگ خدمت کیلئے مشہور ہے۔ اس لئے وہ روس کی اخلاقی مدد ضرور کرنا چاہتا ہے۔ روس کی اقتصادی پالیسی بھی گو اس کے پر کاٹتی ہے۔ پھر بھی وہ شہنشاہیت کے تلے پلے ہوئے سامراجی پودے پر اشتراکی سرمایہ کو ترجیح دیتا ہے! غالباً اُسکے نزدیک نازی سامراجیت اور اشتراکی اقتصادیات میں صرف ایک منزل سے زیادہ فاصلہ نہیں!

جنگِ چین کا مستقبل

چین اور جاپان کے درمیان ایک عرصہ سے جو جنگ جاری ہے کیا اس کے جلد ختم ہونیکا کوئی امکان ہے۔ کیا جاپان کے مقابلہ میں چین کو شکست ہوجائے گی۔ کیا جاپان اپنی سفاکیوں۔ بیدردیوں اپنی خوفناک توپوں۔ بندوقوں اور زہریلی گیسوں کے ذریعہ چین کے رہنے والوں کو آزادی کی دولت سے ہمیشہ کیلئے محروم کرنے میں کامیاب ہوجائیگا۔ یہ ایک مستقل سوال ہے۔ جو عام طور پر تمام دنیا کے رہنے والوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چین و جاپان کی جنگ جس قدر طول کھینچتی جاتی ہے اتنی ہی بیرون چین کی دنیا کو چین کی طرف سے مایوسی ہوتی جاتی ہے۔ اسقدر طویل عرصہ تک جنگ کا جاری رہنا اور پھر ایسے روح فرسا اور جانگداز حالات میں یقیناً اہل چین کی ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو ختم کردینے کیلئے کافی تھا۔ مگر دنیا شاید اس راز سے ابھی اچھی طرح واقف نہیں ہے کہ جب "آزادی کی دیوی" کسی ملک کے رہنے والوں کو ایک مرتبہ اپنی حقیقی برکتوں سے سرفراز کردیتی ہے تو اس ملک کے رہنے والوں کیلئے ملک کی آزادی کے مقابلہ میں مصائب کے پہاڑوں اور تکلیفوں کے طوفانوں کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ شمع حریت کے پروانے غلامی کی عمر جاوید سے آزادی کے ایک سانس کو قیمتی سمجھتے ہیں۔ یہی حال چین والوں کا ہے۔ جن لوگوں کو وہاں کے اندرونی حالات کا پتہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا کی کوئی مصیبت ایسی نہیں جو چین والوں کو نہ برداشت کرنا پڑی ہو اور زمانہ کی شاید ہی کوئی ایسی پریشانی ہو جس سے انھیں آئے دن سابقہ نہ پڑتا ہو۔ جنگ نے چین کے دلکش و جانفزا گلزاروں کو روح فرسا جہنم کدوں میں تبدیل کردیا ہے۔ مگر ظالم و جابر جاپان حالات کو جس قدر خراب کرتا جاتا ہے مظلوم چینیوں کی قوتوں میں مقابلہ کی صلاحیتیں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں۔ طوفان کی بپھری ہوئی موجیں جتنی خوفناک ہوتی جارہی ہیں کشتیوں کے ناخدا بادبانوں کو اتنا ہی مضبوط کررہے ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا کومنتانگ کی مرکزی

ایشیا

مجلس منتظمہ کا چھٹا اجلاس چنگ کنگ میں منعقد ہوا۔ اور مجلس مذکور نے اپنا ایک مینی فسٹو شائع کیا جس سے چین والوں کی بلند ہمتوں اور ان کے پہاڑوں جیسے مضبوط ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مینی فسٹو کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"اب تک ہم نے جو کچھ حاصل کیا وہ سب ہمارے ان جانباز اور دلیر افسروں اور برادران وطن کی بدولت ہے جو میدان جنگ میں اپنی ناقابل شکست کوششوں سے کام لیکر دشمن سے کامیاب نبرد آزمائی کر رہے ہیں۔ ان مقتدر ہستیوں کے بعد ان بہادروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو وسطی رقبے میں خدمت وطن کی اہم ذمہ داریوں کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان تھک جانفشانیاں سماجی انتظامات۔ پبلک خدمات۔ جنگ کے سلسلہ میں مدافعت کرنے اور جنگ کو آئندہ کامیابی کے ساتھ رکھنے کی تدابیر، یہ سب کام ایسے ہیں کہ ان کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے ساتھ ہی ہم ان جانفروشوں کی مقدس روحوں کے سامنے تعظیماً سر تسلیم خم کرتے ہیں جنھوں نے ملک وقوم کی خدمات کے سلسلے میں اپنی زندگیوں تک کی پروا نہیں کی اور اپنی جانوں کو ملکی آزادی کی راہ میں بے خوف وخطر قربان کر دیا۔ اب جو لوگ میدان جنگ میں دشمن کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں ان کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری حقیقی ہمدردیاں اور دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں ان کے واسطے وقف ہیں۔ ہمارے دردمند دلوں میں اپنے ان بھائیوں کی بھی بڑی وقعت ہے جو بیرون ملک سے اس نازک زمانہ میں اپنے برادرانِ وطن کی مالی ونیز دیگر قسم کی امداد کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم یہ ظاہر کر دینا بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ انقلاب کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے تمام اہل وطن کو تباہی وبربادی کے موجودہ ہولناک دور سے ہر ممکن حفاظت کے ساتھ نکال لیجائیں۔ ملک کے اُن حصوں کو جو انتہائی بیدردی کیساتھ ویران کر دیے گئے ہیں پھر آباد کریں اور اپنے ملک کو آزادی کی دولت سے مالا مال کر کے اس بلند سطح تک پہونچا دیں جو دنیا کے ترقی یافتہ آزاد ممالک کی طرۂ امتیاز ہے تاکہ ہمارے برادرانِ وطن بھی دنیا کی دوسری ممتاز قوموں کے مساوی ایک آزاد حیثیت حاصل کر سکیں۔ ۱۹۳۵ء میں نیشنل کانگریس کا پانچواں اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس میں ہم نے حملہ آور دشمن کی طرف سے بڑھتے ہوئے سیلاب جنگ کو روکنے اور اپنے نظام جنگ کو مستقل اور دیرپا بنانے کے لئے "مدافعت" کا پروگرام تیار کیا تھا۔ آج بھی ہمارا وہی پروگرام ہے۔ ہمارے اس پولیٹکل پروگرام کے سلسلے میں دس اصولوں پر مشتمل ایک مینی فیسٹو شائع کیا گیا تھا۔ جس میں ہماری جماعت کے آئندہ انقلابی کام کی تفصیل تھی۔ اس مینی فیسٹو میں ان تمام تجاویز کا خلاصہ موجود تھا۔ جو شروع سے اس وقت تک عمل میں لائی گئی تھیں۔ اور انھیں تجویزوں پر ہمارے اس "مدافعت" اور "تعمیر جدید" کے پروگرام کی بنیاد تھی جو سی، ای، سی نے اپنے ۱۹۳۸ء کے غیر معمولی اجلاس میں منظور کیں۔ اس مینی فیسٹو میں حسب ذیل دس اصول نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

(۱) ہمیں اخلاقی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیکر عوام کو اپنے احاطۂ اثر میں لینا چاہیئے۔

(۲) ہمیں استحکام قومیت کے لئے حقیقی اور واقعاتی مطالعہ کے ذوق کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیئے۔

(۳) ہمیں عوام کی طاقت کو بڑھانے کیلئے تعلیم کو زیادہ وسیع پیمانہ پر رواج دینا چاہیئے۔

(۴) ہمیں اقتصادی ذرائع سے کام لیکر عوام کی مالی حالت کو بہتر بنانا چاہیئے۔

(۵) کاروبار پیشہ لوگوں کی تقسیم وانتخاب نہایت غور کے بعد عمل میں لائی جائے اور پبلک سروس میں کام کرنے والوں کی باقاعدہ سخت نگرانی کی جائے۔

(۶) ملکی قانون کی حفاظت پر زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ بے اصول اور متشدد قسم کی مقدمہ بازی سے عوام کے جانی ومالی حقوق محفوظ رہ سکیں۔

(۷) ہمیں "یوآن" کے امتحان اور اس کے متعلقات کو زیادہ

اہمیت دینی چاہیئے اور حاکمانہ بدعنوانیوں کو روکنے اور عوام کی آواز
کو زیادہ قوت پہونچانے کے لئے قدیم نظام نشرواشاعت کے جدید
نمائندوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے ۔

(۸) ہمیں سرحدی علاقوں کے انتظامات کو اس مقصد کے
ماتحت زیادہ مضبوط کرنا چاہیئے کہ وہاں تمام اقلیتیں ایک مضبوط
قومی اتحاد میں منسلک ہو جائیں ۔

(۹) ہمیں "نمائندہ حکومت" قائم کرنے اور اس کے مطابق
اندرونی نظام کی تشکیل کرنے کی ضرورت ہے اور اس طرح جمہوریت
کی بنیادیں استوار کرنا ہیں ۔

(۱۰) ہمیں مصمم ارادے کیساتھ "معاہدۂ ننکنگ" کے متعلقات کو
پورا کرنا چاہیئے ۔ عوام میں ذاتی اعتماد پیدا کرنا ۔ دوسرے ممالک سے
بہترین باعزت تعلقات قائم کرنا ۔ یہ سب باتیں ضروری ہیں تاکہ
چین ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دوسرے ممالک کے ساتھ مساویانہ
تعلقات قائم رکھ سکے اور اس طرح دنیا کا "دولت عامہ" کے متعلق
جو نظریہ ہے وہ صحیح معنوں میں عملی جامہ پہن سکے ۔ مینوفسٹو میں
ہمارے موجودہ جنگی کام کے متعلق بھی مفصل بحث کی گئی تھی ۔ اور تاریخ
نے ہمارے موجودہ انقلاب کی "تعمیر اندرونی" و "مدافعت بیرونی"
کے متعلق جس طرح رہنمائی کی ہے اسکا بھی ذکر کیا گیا تھا ۔

ہمیں ابھی عوام میں بہت کچھ روح عمل پیدا کرنی ہے اور
ان کی قوتوں کو کام کے واسطے تیار کرنا ہے ۔ منتظمین اور کارکنوں
کے دلوں اور دماغوں کو پبلک لائف کے تمام شعبوں میں متفق
کر کے ایک متحدہ قوت بنانا ہے ۔ حال ہی کے ایک اجلاس میں
جنرل اسمو نے مذکورہ بالا دستاویز کا ذکر کرتے ہوئے ہم سے یہ
کہا تھا کہ ہمیں اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اندرونی اور بیرونی
معاملات میں ہمارے مقاصد کو بالتفصیل پیش کرتی ہے ۔ ہمارے
جو ارادے ابھی عمل میں نہیں آئے ہیں ہمیں ان کی طرف بھی فوری
توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ اور ہمارے جن کاموں کی ابھی تکمیل
نہیں ہوئی ہے ان کو جلد مکمل کرنا ہے چاہے ہمیں اس کام میں کتنی
ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں ۔ ایک طرف ہمیں جنگ کی فوری
ضروریات کے مطابق جلد ہی جانی اور مالی امداد کے لئے سامان فراہم
کرنا ہے ۔ دوسری طرف ہمیں فوراً موجودہ معیار جنگ کو زیادہ بلند
اور انتظامی طریقوں کو زیادہ منظم کرنا ہے ۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ جوں جوں جنگ کی سختیاں بڑھتی جائیں
ان کا مقابلہ ہر درجہ اور ہر فرقہ کے انسان زیادہ قوت کے ساتھ کریں
یاد رکھیئے وہ چاہے کوئی قوم ہو یا کوئی فرد مصیبت میں سب کی
عملی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اگر ہم بھی چاہتے ہیں کہ اپنی قوت عمل
کی بیداری کا ثبوت دیں تو حملہ آوروں کا اچھی طرح مقابلہ کرنا اور
انقلاب کی راہ سے ہر بڑی سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنا ہمارا فرض
ہے تاکہ ہم جس مقصد کی طرف جا رہے ہیں اس کے لئے ایک نئی
جنگی قوم تیار ہو جائے ۔

داخلی امور کے سلسلہ میں اجلاس ہذا کی سب سے اہم تجاویز یہ ہیں
کہ ہم "پیوپلس اسمبلی" کی تاسیس کی تاریخ فوراً مقرر کر دیں اور
"سین نظام" کو دوبارہ بروئے کار لائیں ۔ یہ دونوں تجاویز ایک
دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں اور جدید قومی تعمیر کیلئے بہت
ضروری ہیں ۔ "پیوپلس اسمبلی" کی تاسیس کی ضرورت کو ہماری
جماعت بہت دنوں سے متواتر محسوس کر رہی ہے ۔ "جیہول"
کی جنگ کے بعد ہی ۱۹۳۲ء میں جنرل اسمو نے یہ تجویز کیا تھا کہ
سیاسی انتشار کا زمانہ بہت جلد ختم ہو جانا چاہیئے ۔ ملک پر مصائب
کی شدت کے زمانہ میں اس نے یہ محسوس کیا کہ ہماری جو کوششیں
ایک نئی حکومت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں ان کو باقاعدہ ہونا
چاہیئے اور جب یہ ہو جائیگا تو ہماری قوم ہر قسم کے حالات کا مقابلہ
کرنے کیلئے تیار ہو سکیگی ۔

۱۹۳۳ء میں کانسٹی ٹیوشن کی تجویز کا آغاز ہوا تھا اور دوسرے
ہی سال اس کا مسودہ تیار ہو گیا ۔ ۳۵ء و ۳۶ء میں اس مسئلہ
کے متعلق اور بہت سی تجاویز منظور ہوئیں لیکن قومی انتشار کی
وجہ سے ان پر عملدرآمد نہ ہو سکا ۔ ۳۷ء میں "پیوپلس اسمبلی" کی
تاسیس کیلئے واقعی ایک تاریخ مقرر کر دی گئی لیکن چونکہ جنگ کا
آغاز ہو گیا اس لئے تمام پروگرام ملتوی کر کے مدافعت اور مقابلہ

میں مصروف ہوجانا پڑا۔ اب ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اجلاس ہذا میں ایک مستقل تجویز پاس ہوئی ہے کہ "پیپلز اسمبلی" کو کانسٹی ٹیوشن کے قیام سے پہلے طلب کیا جائے اور بہت ممکن ہے کہ یہ اجلاس جنگ کے "فاتحانہ اختتام" کے قریب ہی کسی تاریخ میں ہو۔

گذشتہ عرصہ میں ہماری بہت سی کمزوریوں کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ "تنگلی" کی تجاویز کو جن میں "سین اضلاع" کے انتظامی اقدامات بھی شامل تھے۔ عملی جامہ نہیں پہنایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام بہتری کے لیئے کوئی مستقل بنیاد قائم نہ ہو سکی اور عوام کی تعلیم اور سیاسی تنظیم میں بھی کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی۔ ہماری یہ ناکامیاں جنگ کے زمانہ میں زیادہ محسوس ہوئیں۔

مرکزی حکومت نے اس سال ستمبر میں "سین حکومت" کی تشکیل کا خاکہ تیار کیا اور "سین اضلاع" کے مقامی باشندوں کو دعوت دی کہ اس خاکہ میں ترقی کیلئے جو تجاویز موجود ہیں مثلاً مدافعت۔ تعلیم۔ عوام کی حفاظت اور بہبودی وغیرہ ان سب کو عمل میں لانے کی ذمہ داری خود وہ اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔ اس سلسلہ میں ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمام متعلق لوگوں کی بہتری کے لیئے خود اپنے ذرائع استعمال کریں۔

اس کے لیئے وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ اپنے ہی آدمیوں میں سے قابل اور اہل لوگوں کو اپنا مشیر کار بنالیں۔ یہ مشیر صاحبان عام حالات کا صحیح مطالعہ کرنے کے بعد یقیناً اس قابل ہونگے کہ عوام کی رہنمائی کرکے انھیں صحیح معنوں میں سیلف گورنمنٹ کا اہل بنا سکیں۔

اس طریقۂ کار سے ایک ایسے کانسٹی ٹیوشن کا قیام یقینی ہوجاتا ہے۔ جسے جدید جمہوری قوم کے بلند ترین معیار کی بنیاد کہنا چاہیے۔ اس تجویز پر پرامن علاقوں ہی میں نہیں بلکہ جنگ کے رقبوں میں بھی عمل ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیش آئیں۔

مدافعت کی متفقہ طور پر منظور کی ہوئی پالیسی کے متعلق جنرل اسمو بہت صاف طور پر اپنے ایڈریس میں کہہ چکے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں جبتک جاپانی اپنی غلطی کا احساس نہیں کریں گے۔ ہماری مدافعت جاری رہے گی: آج فتح کا سامان مکمل ہوچکا ہے۔ ہمارا دشمن جس قدر آج پریشان ہے اس سے پہلے کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اسے اپنا جماعتی نہیں بلکہ قومی فرض سمجھیں کہ ہم اپنے مقدس مقاصد کو نہایت جانفشانی سے پورا کریں اور "تنگلی" کے یہ الفاظ کہ "صلح کرنا دھوکا کھانا ہے" خوب اچھی طرح یاد رکھیں۔

ہمارے "مدافعت" اور "تعمیر جدید" کے پروگرام بالکل واضح ہیں مدافعت تو ہم اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے علاقوں سے دشمنوں کو باہر نکال دینا ہے اور تعمیر جدید اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد نمائندہ گورنمنٹ کا قیام ہے۔ ہمیں امید ہے کہ متعلق لوگ کام کرتے وقت ہمارے ان پروگراموں کو خیال میں رکھیں گے۔

اس مینی فیسٹو کے مطالعہ کرنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ جنگ میں جاپان کو شکست ہوگی!

(۲۱۲۸)

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

اَدبیات وسیاسیات

اشتراکیت، اشتمالیت اور سرمایہ داری کارل مارکس کی نظر میں

آجکل ہندوستان میں ہر تعلیم یافتہ کی زبان پر سوشلزم ہے اور بہت سے ہندوستانی لیڈر اپنے آپ کو سائنٹفک سوشلسٹ کہنے لگے ہیں لیکن اپنی تقریروں میں مارکس کے اقتصادی نظریوں کو جیم کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

یورپ میں مارکس کی مشہور تصنیف سرمایہ کی تردید میں جتنی تصانیف نکلی ہیں شاید ہی کسی دوسری تصنیف کی تردید میں نکلی ہوں۔ اس لئے اگر یہ ہمارے لیڈر مارکس کے نظریوں کو جیم کہیں تو کیا مضائقہ ہے، لیکن یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک شخص مارکس کے اقتصادی نظریوں کو جیم بھی کہتا جائے اور اپنے آپ کو سائنٹفک سوشلسٹ بھی۔ مارکس کا اشتراکیت، اشتمالیت اور سرمایہ داری کا تمام تر تخیل اس کے قیمت کے نظریہ پر منحصر ہے۔ اگر اس کو رَدّ کر دیا جائے تو مارکس کے تمام اقتصادی نظریئے ختم ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سوشلسٹ لیڈروں نے اس آڑ میں کہ ہر ملک کے حالات جدا ہوتے ہیں اور سوشلزم کے اصولوں کو ہر ملک کے حالات کے مطابق ڈھال کر منظر عام پر لانا چاہیئے، اپنے ایجاد کردہ نظریئے تبلیغ کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے یہ فائدہ ہو گیا کہ وہ مارکس کے مطالعے سے بچ گئے جو از خود ایک کٹھن کام ہے۔ سوشلزم کو سمجھنے کے لئے مارکس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خاصکر اس زمانہ میں جبکہ سوویٹ یونین کا حکومتی طبقہ اپنے ہر عمل کو مارکس اور لینن کی تعلیم کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے نظامِ حکومت کو اُن کی تعلیم کا عکس بتاتا ہے اور عوام و خواص یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جو کچھ یونین میں ہو رہا ہے وہی سوشلزم ہے۔

سوشلزم کے متعلق ہندوستان میں ہر شخص کا تخیل جدا ہے ہر وہ شخص جو سماجی بہبودی کے لئے کوشاں ہو، سوشلسٹ کہلانے لگتا ہے۔ اگر زید کہتا ہے۔ "انسانو تم آپس میں بھائی ہو، اگر تم میں سے ایک مالدار ہے تو اس کو چاہیئے کہ اللہ کے نام پر فراخ دلی سے خرچ کرے" یا بکر کہتا ہے "کارخانہ دار و مزدوروں پر ظلم نہ کیا کرو، دیکھو وہ بھی اس دھرتی ماتا کے پُوت ہیں جس کے تم ہو۔ نہ مزدوروں کو ہڑتال کرنی چاہیئے نہ کارخانہ دار کو مزدوری گھٹانی چاہیئے۔ کاشتکاروں لگان کم کر دو، اگر اُن کو قرض دے رکھا ہے تو اس پر زیادہ سود نہ کھاؤ"، یہ تو دونوں سوشلسٹ خیال کئے جائیں گے لیکن مارکس کے نزدیک اس قسم کے لوگ سوشلسٹ نہیں ہیں، اس قسم کے مبلغ ہر ملک اور ہر دَور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اُن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر سماجی بُرائی اس قسم کی تبلیغ سے دُور ہو سکتی ہے۔ سوشلسٹ کا خیال ہے کہ دنیا میں اس قسم کا تبلیغی کام ہزار سال سے جاری ہے لیکن انسان کا ظلم ختم نہیں ہُوا۔ فی زمانہ مساوات کا جتنا چرچا ہے شاید کسی زمانے میں ہو لیکن آجکل یہی دنیا میں سب سے زیادہ تفریق ہے۔ سوشلسٹ صرف اخلاقی پند و نصائح ہی تک نہیں رہتا بلکہ یہ سوچتا ہے کہ سماجی نظام میں وہ کونسی خامی ہے جو سماج میں ظلم و ستم، جھوٹ اور بے ایمانی ممکن کرتی ہے، وہ انفرادی بُرائیوں کے پیچھے نہیں پڑتا بلکہ اس نظام کے پیچھے پڑتا ہے جو سب بُرائیاں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً سوشلسٹ کا خیال ہے کہ ملکیت اور دولت کی غیر مساوی تقسیم انسان کا انسان پر ظلم کرنا ممکن کرتی ہیں۔ جھوٹ بولنے اور بے ایمانی کرنے کا لالچ اس لئے ہوتا ہے کہ نفع کی اُمید ہوتی ہے۔ اگر ایسا سماجی نظام بنا دیا

جائے جس میں نہ انفرادی ملکیت معہ انفرادی نفع، تو نہ ظلم رہے گا نہ جھوٹ اور نہ بے ایمانی رہے گی۔ مارکس نے ایسے سماجی نظام کے اصول بیان کئے ہیں جس کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کیونکہ مارکس کے اقتصادی نظریوں سے ہنوز بے بہرہ ہے اس لئے یہاں پر شریف النفس انسان کو سوشلسٹ کہنے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم روس کے انقلابی زمانے کو دیکھیں تو لینن اور پوکھارن جیسے لیڈر نظر پڑتے ہیں جو کارل مارکس کے اقتصادی اصولوں کو خوب سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے عمل میں تیزی تھی، وہ ملک کو جس طرف لے جارہے تھے اُس راستہ سے خوب واقف تھے، قدر اور قدر زاید پر ان دونوں کی کتابیں موجود ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ان اقتصادی اصولوں کو مبہم خیال نہیں کرتے تھے بلکہ اُنھوں نے غور و فکر کیا تھا اور جب تک اُن کو اقتصادی اصولوں کے ٹھیک ہونے کا یقین نہ ہوگیا وہ مارکسٹ نہیں ہوئے، ایمان داری کی بات بھی یہی ہے کہ جب تک کسی بنیادی اصول کے درست ہونے کا یقین نہ ہو اُس وقت تک کوئی کیونکر ان نتیجوں کو تسلیم کرسکتا ہے جو اُس سے نکالے جاتے ہیں اور کیونکر اُن پر کاربند ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ دوسرا انسان بھی کسی دوسرے نظریہ کے مطابق انھیں نتائج پر پہونچے جبکہ کارل مارکس پہونچا تھا۔ اس شکل میں اُن دوسرے صاحب کو اپنا نظریہ پیش کرنا چاہیے تاکہ اس پر غور کیا جائے اور اگر درست معلوم ہو تو عمل بھی کیا جائے۔ کیونکہ عمل تو کسی اصول ہی کے ماتحت ہوسکتا ہے۔ لیکن ہندوستانی سوشلسٹ بغیر کارل مارکس کو سمجھے ہی سوشلسٹ ہیں اس لئے ان کے سوشلزم کی حقیقت معلوم۔ ان کا سوشلزم کمیونسٹ مینیفسٹو سے آگے نہیں بڑھتا۔

دنیا میں جہاں اور بہت سی عجیب باتیں ہورہی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انگلستان کے مشہور فاضل پروفیسر جے۔ ڈی۔ ایچ کول صاحب نے ۱۹۳۴ء میں ایک کتاب "کارل مارکس کا دراصل مطلب کیا تھا" کے عنوان سے لکھی تھی اور پروفیسر موصوف تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کارل مارکس کا نظریہ تو ٹھیک ہے لیکن سماجی ضروری محنت قیمت پیدا کرتی ہے" غلط ہے۔ فاضل پروفیسر نے کارل مارکس کے نظریہ میں جو خامی تھی اُس کو پورا کرکے ایک اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی مارکس کے قیمت کے نظریہ کو نہ بھی مانے تو بھی قدر زاید کے نظریہ کو مان سکتا ہے" یہ دونوں الگ الگ نظریے ہیں اور ایک کو نہ ماننے سے دوسرا رد نہیں ہوتا۔ اگر مجھے غلط یاد نہیں تو ایک مشہور سوشلسٹ جون اسٹریچی صاحب نے اپنی کتاب "سرمایہ داری میں کرائسس" میں کول صاحب کی اس دیدہ دلیری پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ کہ اُنھوں نے قدر زائد کے نظریہ کو تو مان لیا لیکن قیمت کے نظریہ کو جس پر کہ اور تمام اقتصادی نظریوں کا دارومدار ہے رد کردیا ہے۔ جون اسٹریچی صاحب نے پروفیسر موصوف سے دریافت کیا ہے کہ اگر مکان کے نچلے حصّے میں آگ لگ جائے تو بالائی منزل کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟

اس مضمون کے دوران میں پروفیسر کول کے اعتراضات اور اُن کے نظریہ کا بھی ذکر آئے گا لیکن اس مختصر مضمون میں صرف اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں۔ لمبی بحث یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن اشارے اتنے واضح ہوں گے کہ اقتصادیات سے دلچسپی رکھنے والے اگر اس مضمون کو پڑھ کر پروفیسر کول کی کتاب کے ساتویں باب کا جو قیمت کے نظریہ پر ہے، مطالعہ کریں گے تو وہ پروفیسر صاحب کے اعتراضات کا جواب بخوبی سمجھ جائیں گے۔

اب ہم نفس مضمون کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ علم المعیشت کے پڑھنے والے کو سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قیمت کیا ہے؟ کس طرح پیدا ہوتی ہے اس کا لین دین کن مختلف طریقوں پر ہوتا ہے؟ اور مختلف طریق لین دین کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مارکس نے قیمت کو تین نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے اوّل قدر استعمال یا استعمال کے نقطۂ نگاہ سے۔ جب سماج جنس کو استعمال کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہے اور اسی نقطۂ نگاہ سے اُس کو سماج میں تقسیم کرتی ہے تو وہ کمیونسٹ سماج کہلاتی ہے۔ جب کوئی سماج جنس قدر اصل کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہے یعنی اُس میں کتنا ضروری وقت اور سماجی محنت شامل ہے اور جنسوں کا آپس میں تبادلہ اس میں ضروری سماجی وقت اور محنت کی مقدار دیکھ کر کرتی ہے تو وہ سماج سوشلسٹ کہلاتی ہے اور جب کوئی سماج جنس کو اس کی قدر تبادلہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے تو انفرادی نفع قدر نظر رکھ کر تبادلہ کرتی ہے تو وہ سماج کیپٹلسٹ کہلاتی ہے۔

اب ہم ان تینوں قدور کا مفصّل ذکر کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ کمیونزم۔ سوشلزم اور کیپٹلزم کو سمجھنے کے لئے قدر کی ان تینوں قسموں کا سمجھنا کس قدر ضروری ہے اور یہ کس قدر غلط ہے کہ ان اصولی باتوں کو مبہم یا دماغی عیاشی خیال کرکے چھوڑ دیا جائے اور زبان سے سوشلزم سوشلزم پکارا جائے۔

(۱) قدر استعمال (Use Value)

۱۶

(۲) قدرِ اصل (Nuess Lahour Thim Value)

(۳) قدرِ تبادلہ (Exchange Value)

قدرِ استعمال۔ کسی جنس کی صفت یا خصوصیت کا نام ہے۔ اور وہ خصوصیت یا صفت اس کے استعمال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اناج کی قدرِ استعمال کھانے سے معلوم ہوتی ہے۔ لوہے کی قدرِ استعمال اس کے آسانی سے نہ مُڑنے۔ نہ ٹوٹنے۔ بھاری ہونے۔ دھار لگ جانے اور دوسری اس قسم کی خصوصیّات کی وجہ سے ہے۔ لیکن اگر بتدریج یہ خصوصیّات لوہے میں سے گھٹا دی جائیں تو اسی نسبت سے لوہے میں سے استعمالی قیمت بھی گھٹتی جائے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی مقدار میں بھی فرق آجائے۔ اس بیان سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اگر ہم کسی جنس کی مقدار کی بجائے اس کی صفت یا خصوصیت دیکھیں تو ہم اس جنس کی استعمالی قیمت دیکھ رہے ہوں گے۔ اگر کسی سماج میں جنس کی صرف استعمالی قیمت ہی دیکھی جانے لگے تو وہاں جنس کی مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس سیر بھر آٹو ہیں اور دوسرے کے پاس آدھ سیر سونا ہے لیکن سماج قدرِ استعمال کو مدِّ نظر رکھتی ہے۔ اس وجہ سے قیمت اور مقدار کے اختلاف کے باوجود وہ دونوں جنسوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے۔ اس مثال کو اگر اور زیادہ صاف کرنا ہو تو دو بچّوں کو دیکھیے ایک کے پاس گڈّولنا ہے اور دوسرے کے پاس نارنگی، جس کے پاس نارنگی ہے وہ گڈّولنا چاہتا ہے اور دوسرا نارنگی، تو وہ آپس میں تبادلہ کریں گے۔ یہاں بچّوں کے سامنے نارنگی اور گڈّولنے کی قدرِ استعمال ہے قدرِ تبادلہ نہیں ہے۔ اگر قدرِ تبادلہ ہوتی تو جس بچّے کے پاس گڈّولنا ہے وہ یہ کہتا کہ چار درجن نارنگیاں لاؤ تب گڈّولنا دوں گا۔ جس سماج میں جنس کی قدرِ استعمال ہی دیکھی جانے لگے گی وہاں جنس کا تبادلہ اسی طرح ہوگا جیسا کہ ان بچّوں نے کر لیا۔ ان بچّوں کے تبادلہ میں اور کمیونسٹ سماج کے جنسوں کے تبادلہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ بچّوں نے یہ تبادلہ غیر شعوری طریق پر کیا، کمیونزم میں یہ شعوری طریق پر ہوگا کمیونسٹ سماج میں ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق پیدا کرے گا اور سماج اُس کو اُس کی ضرورت کے مطابق جنس دیگی۔ وہاں مقدار اور قیمت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن ایسی سماج اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ صنعت و حرفت اس قدر ترقی کرلے کہ ہر جنس افراط سے پیدا ہو اور جس جنس کی کسی کو ضرورت ہو وہ مانگنے پر مل جائے۔ کمیونسٹ سماج میں یہ لازمی ہوگا کہ سائنس اور صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے کیونکہ اس ترقی پر کمیونسٹ نظام کا دار و مدار ہوگا برخلاف

17

اس کے سرمایہ داری میں صنعت و حرفت روکی جا رہی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ سرمایہ داری کو اب یہ حق نہیں کہ وہ طریق پیداوار کی طاقتوں پر قبضہ جمائے رکھے

قدرِ استعمال۔ قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ میں فرق ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی چیز میں قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ نہ ہو اور قدرِ استعمال موجود ہو۔ مثلاً ہوا یا سورج کی روشنی لیجیے، ان میں بہت زیادہ قدرِ استعمال موجود ہے لیکن نہ قدرِ اصل ہے نہ قدرِ تبادلہ۔ خود رو جنگل میں بھی قدرِ استعمال موجود ہوتی ہے لیکن نہ قدرِ اصل ہوتی ہے نہ قدرِ تبادلہ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی جنس کی قدرِ اصل یا قدرِ تبادلہ کم ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قدرِ استعمال میں بھی فرق آجائے۔ اگر ایک اونی کوٹ ۲۰ گز سوتی کپڑے کے بدلے میں آتا ہے لیکن اچانک ایسا ہو کہ اُون کا بھاؤ گر جائے اور اُونی کوٹ کے دام صرف ۱۰ گز سوتی کپڑا رہ جائے تو کوٹ کی قدرِ تبادلہ تو کم ہو گئی لیکن قدرِ استعمال میں فرق نہ آیا۔ کیونکہ جس طرح پہلے کوٹ کی قدرِ استعمال پہننا تھی اسی طرح قدرِ تبادلہ کے گھٹ جانے پر بھی کوٹ پہننے کے ہی کام آتا رہا۔ اور اس کی قدرِ استعمال میں کوئی فرق نہ آیا اسی طرح کوٹ کی سلائی کا سستا ہو جانا کوٹ کی قدرِ استعمال پر اثر نہیں ڈالتا۔ حالانکہ وہ کوٹ کی قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ کو گھٹا دیتا ہے۔

نوعیّت کے لحاظ سے سب چیزیں برابر ہیں، اس نقطۂ نظر سے ان کی قدرِ تبادلہ اور مقدار کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ سماج میں ہر جنس کو افراط سے پیدا کرنے کے ذرائع موجود ہوں۔ دنیا بہت ترقی کر گئی ہے ہر جنس افراط سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ ملکیت جنس کی افراط نہیں ہونے دیتی۔ کیونکہ ایسا ہوتے ہی نفع مفقود ہونے لگتا ہے۔ نفع سرمایہ داری کی جان ہے اور سرمایہ داری کبھی ایسا راستہ اختیار نہیں کر سکتی جس میں نفع نہ ہو۔

اشتمالیت تو اب نہیں ہے اگر تمام دنیا تعاونِ عمل سے کام لے تو آج ہی اشتمالی نظام قائم ہو سکتا ہے مگر محدود دائرے میں ہم آج بھی اشتمالیت کے

ایشیا

زرّیں اصول پر کاربند ہیں کہ ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق پیدا کرے اور ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرے۔

کسی سماج میں جنس اُس وقت تک نوعیّت کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھی جا سکتی جب تک اُس سماج میں ملکیت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ کمیونزم کا بنیادی تخیّل جنس کی استعمالی قیمت پر مبنی ہے۔ اِس لئے جب تک کہ ملکیت فنا نہ ہو جائے اور صنعت و حرفت بہت ترقی نہ کر جائے۔ کمیونزم نہیں چل سکتا کمیونزم جاری کرنے کے لئے ایک طرف تو ملکیت کو مٹانا پڑے گا اور دوسری طرف صنعت و حرفت کو بڑھانا پڑے گا یعنی مٹانا اور بڑھانا ساتھ ساتھ ہوگا اجمالاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم اُس سماجی نظام کا نام ہے جس میں کہ جنس کی صرف قدرِ استعمال دیکھی جائے۔

قدر اصل۔ استعمال کی جس چیز پر بھی نظر ڈالی جائے وہ اِس محنت اور وقت کو بتا رہی ہوگی جو اس کے بنانے میں صرف ہوا۔ میز کا ہر رگ ریشہ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح ایک درخت کاٹا گیا صاف کیا گیا۔ پھر مختلف طریقوں سے کاٹنے اور صاف کرنے کے بعد کٹے ہوئے ٹکڑوں کو انسانی محنت نے اِس طرح ترتیب دیا کہ وہ مِل کر میز کی شکل میں آ گئے۔ جب اِس محنت اور وقت کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو درخت کاٹنے۔ صاف کرنے اور علیحدہ علیحدہ ٹکڑے کرنے اور میز بنانے میں صرف ہُوا اُس وقت نظر میں اس میز کی قدر اصل دیکھتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ جب ہم کسی چیز کو صرف اِس نظر سے دیکھیں کہ اس میں سماجی ضروری محنت کس مقدار میں موجود ہے تو ہم کو اُس چیز کی قدر اصل معلوم ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ روٹی وغیرہ پکانے کے لئے زیدؔ کو چولھا بنانے کا خیال پیدا ہُوا۔ سب سے پہلے وہ مٹی کی تلاش میں نِکلا۔ جب اُس کو مٹی مِل گئی تو اُس نے بھوسا جمع کیا اس کے بعد کنکر اکٹھے کئے، پھر ان میں پانی ملایا، اس کے بعد ایک خاص قسم کی شکل میں اِس تمام گارے کو تبدیل کیا۔ پھر اِس شکل پر چکنی مٹی کا ہاتھ پھیرا اور چولھا بنا لیا۔ اگر اس تمام کام میں آدھا دن صرف ہُوا اور اگر دن بارہ گھنٹے کا شمار کیا جائے تو زیدؔ نے چھ گھنٹے سامان مہیّا کرنے اور چولھا بنانے میں صرف کئے۔

جس طرح زیدؔ نے چھ گھنٹے کی محنت کے بعد چولھا تیّار کیا۔ اِسی طرح موہن نے اتنی ہی محنت کے بعد لکڑی کا ایک کھلونا بھی آدھے ہی دن میں تیّار کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی اتنی ہی محنت سے چھ گھنٹوں میں اور دوسری چیزیں تیّار کیں۔ لیکن اگر زیدؔ موہنؔ اور دوسرے لوگوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی شکلیں ہم دماغ سے نکال دیں تو اِن تمام شکلوں کی بجائے صرف ایک چیز رہ جاتی ہے کہ وہ سب چھ گھنٹے کی محنت ہیں جو ہر حالت میں برابر ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ محنت کو دو نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں ایک تو نوعیت کے نقطۂ نگاہ سے اور دوسرے مقدار کے اعتبار سے کارل مارکسؔ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا کی پہلی شخصیت ہے جس نے انسانی محنت کے ان دو رُخوں پر روشنی ڈالی ہے۔

محنت نوعیّت کے نقطۂ نگاہ سے :۔ نوعیت کے نقطۂ نگاہ سے محنت کسی خاص قسم کی ہوتی ہے مثلاً درزی کی محنت، بڑھئی کی محنت وغیرہ۔ درزی کی محنت اِس لئے خاص قسم کی ہے کہ وہ صرف کپڑا سینے ہی میں محنت کر سکتا ہے۔ اور اگر لوہار کا کام اُس کو دے دیا جائے تو وہ اس کو انجام نہ دے سکیگا۔ ہر ایک شخص کا اپنی صنعت میں محنت کرنا محنت کو نوعیّت کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ محنت کی نوعیّت جنس میں قدر استعمال پیدا کرتی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نوعیّت کے اعتبار سے جنس کسی خاص قسم کی محنت ہوتی ہے۔

محنت مقدار کے اعتبار سے :۔ اِنسان جو کام بھی کرتا ہے اُس میں محنت کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ محنت کرنے کے طریقے جدا جدا ہوتے ہیں، بڑھئی اور سُنار دونوں مختلف طریق پر محنت کرتے ہیں لیکن اِس اختلاف کے باوجود اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر جنس کسی خاص عرصہ کی محنت کا نتیجہ ہے یہ خاص عرصہ کی محنت جنس میں قدر اصل پیدا کرتی ہے۔ ایک کاشتکار کی مثال لیجئے جو روئی بوتا ہے۔ اس کے بعد روئی کے بنولے نکالتا ہے پھر اس کو کاتتا اور بنتا ہے۔ اب اِس پر غور کیجئے کہ وہ خواہ روئی ہو خواہ سوت ہو خواہ کپڑا ہو سب کاشتکار کی محنت کا نتیجہ ہے۔ صرف محنت کی نوعیت میں فرق ہے لیکن آخر سب محنت ہی ہے جو ہر حال میں ایک ہی ہے۔ محنت کی مثال بالکل ہماری روح کی سی ہے۔ جس طرح ہر انسان کا چہرہ مہرہ دوسرے انسان سے مختلف ہے اسی طرح جنسوں کی شکلیں بھی مختلف ہیں اور جیسے روح سب کی ایک ہے ویسے ہی محنت جنسوں کا جوہر ہے اور ایک غیر منقسم شے ہے۔

۱۸

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک کوٹ (برابر) ایک پتلون (برابر) دو من گیہوں (برابر) ایک من لوہا وغیرہ۔ تو اِس زنجیر پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس نسبتی

زنجیر میں کسی جنس کی نوعیت یا شکل نہیں۔ بلکہ محنت کو اس کی رواں اور غیر منقسم شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔ یہاں جنسوں کو برابر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جذبہ کا مقابلہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک ان میں کوئی خصوصیّت مشترک نہ ہو۔ اگر آدمی کا پتھر سے مقابلہ کرنے لگیں تو بے وقوفی ہوگی۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدمی کا دل پتھر کی طرح سخت ہے۔ جب سختی کو مشترک مان لیا تو مقابلہ ہو گیا۔ اب اگر یہ کہیں کہ دس من گیہوں = ایک من لوہا تو گویا ان میں کوئی مشترک خصوصیّت ہے۔ جس کا مقابلہ کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ دونوں جنسیں قیمت میں برابر ہیں۔ اب دیکھنا صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیا کیا خصوصیّتیں مشترک ہیں جن کی بنا پر دس من گیہوں ایک من لوہے کی برابر ہیں۔ اِن جنسوں میں مادّہ مشترک ہے لیکن کسی جنس کے مادّی ہونے سے اس کی قیمت کی نسبت کسی دوسری جنس سے قائم نہیں کی جا سکتی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دونوں میں قدرِ استعمال موجود ہو لیکن پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قدرِ استعمال کے نقطۂ نظر سے جنس میں قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ نہیں ہوتی اس لئے نسبت قائم کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا قدرِ استعمال کے اعتبار سے مختلف قیمتوں یا مقداروں کی جنسیں برابر ہیں کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ بیر اور انگور مادّی ہیں میٹھے ہوتے ہیں، کھانے کے کام آتے ہیں تو ان باتوں سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ دونوں کی کیا قیمت ہو۔ اور ان کا تبادلہ کس نسبت سے ہونا چاہئے۔ جب ثابت ہو گیا کہ قیمت نہ تو مادّہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ قدرِ استعمال سے تو پھر کس سے پیدا ہوتی ہے؟ اس کا جواب ایک مثال کے سمجھنے سے آسان ہو جاتا ہے۔

جب اقلیدس میں مستقیم الخطین شکلوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو پہلے ان کو مثلثوں اور پھر مثلثوں کو مستطیلوں میں بدلا جاتا ہے اور مستطیلوں کا رقبہ نکال کر آدھا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک شکل دوسری شکل کے برابر ہے ان دونوں شکلوں میں ایک تیسری شے مشترک ہے جس کو رقبہ کہتے ہیں جس کی نہ کوئی شکل ہے نہ صورت جو ان دونوں شکلوں میں شامل ہے۔ لیکن ان سے جدا ہستی رکھتا ہے۔ جس طرح ان دونوں شکلوں کو ناپتے ہیں اسی طرح گیہوں اور لوہے کو بھی ناپا جاتا ہے۔ گیہوں اور لوہے کو تیسری شکل میں بدل ڈالتے ہیں جو ان دونوں جنسوں میں مشترک ہوتی ہے اور وہ شے نئی قدرِ استعمال پیدا کرنے والی سماجی ضروری محنت ہے۔ اس محنت کو ناپ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ایک من گیہوں اور ایک من لوہا برابر ہیں۔

اگر چولھے والی مثال سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ چولھے کی قدرِ استعمال اس پر روٹی پکانے سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا قدرِ استعمال کے علاوہ اِس چولھے میں کوئی اور شے نہیں ہے؟ کیا استعمالی قدر جادو کے زور سے پیدا ہو گئی؟ اور کیا آدھے دن محنت اس پر صرف نہیں ہوئی؟ کیا مٹی پتھر گھاس فراہم نہیں کئے گئے؟ اور کیا کام کرنے کی طاقت کو استعمال میں نہیں لایا گیا؟

اگر ان تمام سوالوں کا جواب سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جادو جس نے چولھے کے اندر استعمالی قیمت پیدا کر دی محنت ہے۔ یہ کام کرنے کی طاقت ہی تھی جس نے گھاس مٹی اور پتھر میں استعمالی قیمت پیدا کر دی۔ اور اس کام کرنے کی طاقت کا دوسرا نام چولھا رکھا گیا۔ لیکن اگر محنت چولھے میں سے نکال دی جائے جیسے ڈبّہ میں سے ہوا نکال دی جاتی ہے تو چولھا قائم نہیں رہتا اور ہر ایک شے الگ الگ ہو کر وہاں پر پہونچ جاتی ہے جہاں سے فراہم کی گئی تھی۔

پس معلوم ہوا کہ محنت اس چولھے میں چھپی ہوئی بیٹھی ہے اور اگر اس چولھے کی خاص شکل کا خیال دماغ سے خارج کر دیا جائے تو چولھا صرف محنت رہ جاتا ہے۔ اب رہے مٹی، پتھر اور گھاس تو وہ قدرت کی طرف سے مفت کا عطیّہ ہیں۔ لیکن یہ واضح ہونا چاہئے کہ صرف چولھے کے ساتھ ہی یہ بات نہیں بلکہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز لے لیجئے اور اس میں سے وہ خصوصیّتیں جو اس میں محنت نے پیدا کر دی ہیں نکال دیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخر میں وہ شے قدرت کا عطیّہ رہ جاتی ہے۔ جو قدرت کی طرف سے ہمیشہ مفت ہوا کرتا ہے۔

چولھے کو چھوڑ کر انجن کو دیکھئے۔ انجن کو جس شے نے اتنا مفید بنایا وہ جادو یا نظر کا پھیر نہیں بلکہ انسانی محنت ہے اور اگر ہم اس انجن میں سے انسانی محنت نکال دیں تو وہ فولاد کا ایک ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔ اگر فولاد میں سے بھی انسانی محنت خارج کر دیں تو وہ کچّے لوہے کی شکل اختیار کرے گا اور پھر کچّے لوہے میں سے بھی انسانی محنت جو اس کو کان سے نکالنے اور فیکٹری تک لانے میں لگی، علیحدہ کر دیں تو وہ لوہے کی کان ہو جاتا ہے۔ جو کسی انسان کی پیدا کردہ نہیں بلکہ قدرت کا ایک عطیّہ ہے۔ کوئی بھی جنس لے لیجئے اور پھر تحلیل کر کے دیکھ لیجئے آخر آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ وہ شے قدرت کا عطیّہ ہے جس کو انسانی محنت نے بدل کر ایک کار آمد چیز بنا دیا۔ قدرت مادّہ کی شکل بدلتی رہتی ہے اور انسان بھی یہی کرتا ہے۔ انسان نے ہمیشہ مادّہ کی شکل بدلی اور

آج بھی دن رات اپنی محنت کی بدولت مادّہ کی شکل بدلتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب یہ سمجھ لیا کہ ہر جنس جمی ہوئی محنت ہے تو قیمت کی تعریف اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ محنت کرنے کی طاقت جب جنس کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو وہی قیمت ہو جاتی ہے۔ محنت کرنے کی طاقت ہی وہ شے ہے جو مادّی شکل میں تبدیل ہو کر جنس کہلاتی ہے۔

اب جنس کی تعریف بہت آسان ہو جاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنس مادّہ اور انسانی محنت سے مل کر بنی ہوئی شے کا نام ہے جو سماج کے لئے بنائی جائے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ مادّہ قدرت کا عطیہ ہے جو ہمیشہ مفت ہوتا ہے اس لئے جو کچھ جنس کی قیمت ہوئی وہ محنت کا نتیجہ ہے۔ چھ گھنٹے کی محنت ہونے کی حیثیت سے چولھے میں ایک خاص قیمت ہے لیکن یہ قیمت اس کی قدر استعمال سے بالکل الگ ہے۔ کسی جنس کی اصل قیمت وہ سماجی ضروری محنت ہے جو اُس کو تیار کرنے میں لگی لیکن قیمت کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ جنسوں کے تبادلہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اب جبکہ زید نے چولھا خود استعمال کیا تو کیا اس میں قیمت نہیں رہی؟ یقیناً قیمت تو چولھے میں موجود ہے لیکن وہ قیمت صرف زید کی ذات تک محدود ہے۔ سماج کو اس سے کوئی سروکار نہیں، زید نے اس چولھے کے تیار کرنے میں آدھے دن محنت کی لیکن اگر زید پورے دن میں اس محنت سے آٹھ آنے کما لیتا تو کیا وہ آدھے دن میں چار آنے نہ کمائے گا۔ اور جبکہ چولھے میں آدھے دن کی محنت لگی ہے۔ اس لئے چولھے کی قیمت بھی چار آنے ہوئی۔ لیکن اگر جنس سماج کے لئے بنے گی تو انفرادی وقت اور محنت کام نہیں دیں گے بلکہ سماجی وقت اور محنت کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر سماج میں ایک جنس ایک گھنٹے میں پیدا ہوتی ہے اور زید اسی جنس کو دو گھنٹے میں بناتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ سماج میں زید کی جنس کی قیمت آدھی ہے۔ کیونکہ اس کا وقت اور محنت سماجی وقت اور محنت سے دُگنے ہیں۔

اسی وجہ سے اگر زید اپنی جنس کے بدلے سماج سے دو گھنٹے کی سماجی محنت لینا چاہے گا تو وہ نہیں مل سکتی۔ کیونکہ سماج کے نزدیک اس جنس کو صرف ایک گھنٹے کی محنت درکار ہے۔ اس لئے جب جنس سماج کے لئے بنائی جاتی ہے تو اس کی قیمت وہ محنت ہوتی ہے جو عام طور پر سماج اس چیز کے پیدا کرنے میں صرف کر رہی ہو نہ کہ کسی کی انفرادی محنت،

۲۰

سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے اور وہی اس کی اصلی قیمت ہوتی ہے۔

قدر اصل کا نظریہ ایک مثال سے صاف ہو جائے گا۔ فرض کیجئے ۱۸۰۰ء میں ڈھاکہ میں ایک ہزار جولاہے تھے اور عام طور پر ایک جولاہا دس گھنٹے کے ایک دن میں دس گز کپڑا بُنتا تھا۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ سو جولاہے فی جولاہا ساڑھے آٹھ گز کپڑے کے حساب سے بنتے ہوں۔ دو سو جولاہے فی جولاہا ساڑھے نو گز کپڑے کے حساب سے بنتے ہوں۔ سو جولاہے فی جولاہا تیرہ ۱۳ گز کپڑے کے حساب سے بُنتے ہوں اور چھ سو جولاہے فی جولاہا دس گز کپڑے کے حساب سے بُنتے ہوں۔ اس کا حساب یہ ہوا:-

جولاہوں کی تعداد	گھنٹوں کی تعداد	تعداد کپڑا فی جولاہا	کل تعداد کپڑا
۱۰۰	۱۰۰۰	۸½ گز	۸۵۰ گز
۲۰۰	۲۰۰۰	۹½	۱۸۵۰ گز
۱۰۰	۱۰۰۰	۱۳ گز	۱۲۰۰ گز
۶۰۰	۶۰۰۰	۱۰ گز	۶۰۰۰ گز
۱۰۰۰			۱۰۰۰۰

اگر اس کا اوسط نکالیں کہ فی جولاہا کتنے گز کپڑا پڑتا ہے تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک ہزار جولاہوں نے دس ہزار گز کپڑا بنا۔ یعنی فی جولاہا دس گز کپڑا پڑا۔ اوسطاً فی جولاہا ایک گھنٹے میں ایک گز کپڑا تیار ہوا۔ اب ہم یہ کہیں گے کہ ایک گز کپڑا بننے کے لئے ایک گھنٹہ سماجی ضروری محنت درکار ہے اس

ایشیا

سماج میں ایک گز کپڑے کی قدر اصل ایک گھنٹہ ہوگی۔ اس اصل قیمت کی کمی یا زیادتی نہیں بدل سکتی، خواہ کپڑا ضرورت سے زیادہ بنے یا کم لیکن جب بنے گا تو ایک گز بنانے میں ایک گھنٹہ سماجی ضروری محنت صرف ہوگی، دنیا کی ہر جنس قدر اصل رکھتی ہے اور یہ قدر اصل سماج کو برابر مجبور کرتی رہتی ہے کہ رسد اور مانگ میں برابر کی نسبت قائم رہے اور ہر جنس اپنی قدر اصل پر بکے۔ سماجی ضروری محنت جنس میں قدر اصل پیدا کرتی ہے اور جب تک کہ کسی جنس میں سماجی ضروری محنت کی مقدار نہ گھٹے بڑھے اُس وقت تک اُس کی قدر اصل بھی نہیں گھٹ بڑھ سکتی۔ فرض کیجیے دس سال بعد روئی بہتر اور اُس کا تار لمبا اور مضبوط ہونے لگا آسانی سے کھنچنے اور صاف ہونے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس گھنٹے میں پندرہ گز کپڑا بنا جانے لگا۔ یا فرض کیجیے کہ نئی وضع کا چرخا یا کھڈی ایجاد ہوگئی جس سے ایک گھنٹے میں دس گز کی بجائے پندرہ گز کپڑا تیار ہونے لگا۔ غرض کچھ ایسی ترقی ہوئی کہ پہلے جتنی محنت کر کے ایک جولاہا دس گھنٹے میں دس گز کپڑا بنتا تھا اب وہی جولاہا اتنی ہی محنت کر کے دس گھنٹے میں پندرہ گز کپڑا بُننے لگا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ عام طور پر اب ایک گھنٹے میں ۱½ گز کپڑا بنا جانے لگا یعنی سماجی ضروری محنت کا معیار بدل گیا۔ اب ایک گز کپڑے کی قیمت کم ہوگئی۔ جیسے جیسے صنعت و حرفت آلاتی ہوتی جاتی ہے، سماجی ضروری محنت کا معیار بدلتا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ جنس کی اصل قیمت بدلتی جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کا سماجی ضروری محنت کا نظریہ سرمایہ دار مفکرین کا پڑتے (cost) کا نظریہ ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مثلاً سرمایہ دار جنس کے پڑتے میں صرف مزدوری شامل کرتا ہے لیکن مارکس وہ وقت بھی شامل کرتا ہے جس میں کہ مزدور قدر زائد پیدا کرتا ہے اور جس کی مزدوری اُس کو نہیں دی جاتی ہے۔ جب سماج اس نقطۂ نظر سے قدر مقرر کرتی ہے کہ کسی جنس کے بنانے میں کتنی ضروری سماجی محنت صرف ہوئی ہے اور اس جنس کا تبادلہ کسی ایسی ہی دوسری جنس یا جنسوں سے کرتی ہے کہ جس میں یا جن میں اسی مقدار میں ضروری سماجی قدر موجود ہو تو وہ سماج سوشلسٹ کہلاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ریڈیو بنانے میں اور گیہوں پیدا کرنے میں جو سماجی ضروری محنت صرف ہوتی ہے اُس کو کس طرح ناپ کر برابر کیا جاتا ہے اور یہ کس طرح مقرر ہوتا ہے کہ کسان کی ۳ ماہ کی محنت ریڈیو انجینئر کی آدھے ماہ کی محنت کی برابر ہے۔

کسی سماج میں کسی خاص زمانے میں اوسط کا معمولی آدمی جس میں کوئی خصوصیت نہ ہو اور جو ہاتھ پیر کا ٹھیک ہو، جیسے ہمارے یہاں کا دیہاتی یا شہر والا اس کو معیار مان کر ماہر مزدور کی محنت کو اناڑی مزدور کی سادی محنت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ماہر مزدور کی محنت گاڑھے اقوام کی اناڑی مزدور کی سادی محنت ہوتی ہے۔ ماہر مزدور کی کم مقدار اناڑی مزدور کی محنت کی زیادہ مقدار کی برابر ہوتی ہے۔ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ماہر کی محنت کو ہمیشہ اناڑی کی محنت میں ناپا جا سکتا ہے۔ ایک بہت بڑے انجینئر کی محنت کو ایک اناڑی مزدور کی محنت میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک آدمی اٹھارہ برس میں B.S.C کا امتحان پاس کرتا ہے اور پھر پانچ سال میں انجینئرنگ کا امتحان پاس کرتا ہے پھر پانچ برس عملی کام سیکھتا ہے تو اٹھائیس برس کی محنت کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ کارخانہ میں کام کرے۔ اب اُس کے کام کا ایک گھنٹہ اناڑی مزدور کے ایک یا زیادہ دن کے برابر ہوگا۔

کارل مارکس یہ کہتا ہے کہ اناڑی مزدور اور انجینئر کی قدر اصل کا فیصلہ اس طرح ہوگا جس طرح کہ دوسری جنسوں کی قدر اصل کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی ان کے پیدا کرنے میں کتنی ضروری سماجی محنت صرف ہوئی ہو۔ فرض کیجیے کہ اناڑی مزدور کے پیدا کرنے میں اور جب تک کہ کام کے قابل ہوتا ہے پانچ برس کی سماجی ضروری محنت صرف ہوئی جس کی قدر اصل روپیہ میں ۱۰۰۰ روپیہ کی برابر ہے اور انجینئر کے پیدا کرنے میں اناڑی مزدور کی بیس برس کی سماجی ضروری محنت صرف ہوئی جس کی قیمت روپیہ میں ۴۰۰۰ ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انجینئر کے پیدا کرنے کا صرف اناڑی مزدور کے پیدا کرنے کا صرف چار گنا ہوا۔ تو اناڑی مزدور کے چار سال کی محنت انجینئر کے ایک سال کی محنت کی برابر ہوئی۔ انجینئر جو ایک سال کی محنت سے پیدا کرے گا اُس کا تبادلہ اناڑی مزدور کی چار سال کی پیداوار سے ہوگا۔ لیکن ہر سماج میں اناڑی کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ اناڑی کی قدر اصل کا تعلق سماج کی ذہنی، دماغی، جسمانی اُٹھان سے ہے اور یہ کہ سماج نے قدرت پر کتنا قابو پایا ہے۔ سماج کی پیداوار کی طاقت کیا ہے، سائنس نے کتنی ترقی کی ہے۔ روس میں مزدوری کا فیصلہ اس طرح ہوتا ہے کہ ہر سال ہر سوویٹ میں ہر پیشہ کے یونین اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس میں کہ اُس پیشہ کے مختلف کاموں کی مقرر کردہ مزدوریاں درج ہوتی ہیں۔ مزدوری

۲۱

کسی خاص اصول کے مطابق مقرّر کی جاتی ہے اور وہ اصول مختلف یونینیوں کی سنٹرل کمیٹیاں بناتی ہیں۔ سب مزدور کارخانے کے مقامی حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بہت ردّ و کد کے بعد مزدوریاں مقرّر کرتے ہیں۔ اس طرح ہر سال میں ایک دفعہ ہر مرد اور عورت کو موقع ملتا ہے کہ مزدوری کے مقرّر کرنے میں حصّہ لے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مختلف کاموں کے لئے مختلف مزدوریاں ہوتی ہیں لیکن وہ سب کی مرضی سے مقرّر ہوتی ہیں اور سب کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو کیوں مختلف مزدوریاں ملتی ہیں اور وہ کس طرح زیادہ مزدوریاں حاصل کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب مزدوریاں مختلف ہیں تو سوشلزم کیا ہوا۔ سوشلزم میں مساوات اُس معنی میں ہوگی کہ سب کو کام کرنا پڑیگا مزدوری سب کو کرنی پڑے گی اور سب کی مزدوری سب مل کر طے کیا کریں گے اور سب کام سماج کے ہاتھ میں ہوں گے۔ ان حالات میں اس کا خطرہ نہیں ہوگا کہ پھر ایک سرمایہ دار جماعت پیدا ہو جائے۔

کارل مارکس کا خیال ہے کہ شروع شروع میں مزدوروں کو اُن کی محنت کے مطابق مزدوری ملے گی۔ سرمایہ داری کے مٹاتے ہی یہ نہیں ہو سکتا کہ سماج اس اصول پر کاربند ہو جائے کہ ہر مزدور اپنی استطاعت کے مطابق پیدا کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق جنس استعمال کرے یعنی سماج جنس کی قدرِ استعمال کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تبادلہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ سماج کو سوشلزم کے دَور سے گذرنا ہوگا۔ جس کا اصول یہ ہوتا ہے کہ ہر مزدور کو اُس کی محنت کے مطابق مزدوری ملے گی۔ دو برابر کی سماجی ضروری محنتوں میں تبادلہ ہوگا یعنی سماج جنس کی قدرِ اصل کو مدِّ نظر رکھ کر تبادلہ کرے گی۔ یہ اصول کیونزم کے اصول سے بہت گرا ہوا ہے لیکن سماج کو کیونزم کی منزل تک پہونچنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ سوشلزم کی راہ طے کرے۔ جس طرح سرمایہ داری بڑھ کر امپیریلزم ہو جاتی ہے اسی طرح سوشلزم بڑھ کر کیونزم ہو جاتا ہے۔

قدرِ اصل یعنی سوشلزم کا دار و مدار قدرِ اصل یعنی ضروری سماجی محنت کے نظریّہ پر ہے۔ یہ نظریّہ اقتصادی ہے نہ کہ سیاسی۔ لیکن عام طور پر سوشلزم کو ایک سیاسی نظریّہ سمجھا جاتا ہے، یہ امر کہ سوشلسٹ حکومت کس طرح قائم کی جائے اور اُس کے لئے جماعتی لڑائی کس طرح شروع کی جائے وغیرہ سیاسی پہلو لئے ہوئے ہیں لیکن مارکس کے نزدیک اس جدوجہد کا مقصد اقتصادی ہے کہ سماج کو قدرِ اصل کے نظریّہ پر چلایا جائے۔ لیکن اگر کوئی سوشلزم کے اس بنیادی اقتصادی اصول کو بھی مبہم کہہ دے تو اس کے لئے سیاسی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

قدرِ تبادلہ:۔ قدرِ تبادلہ کے سمجھنے سے پہلے لفظ "نسبت" کو سمجھ لینا چاہئے اور یہ کہ نسبت کن دو چیزوں یا جنسوں میں قائم کی جاتی ہے۔ نسبت اُن ہی دو جنسوں میں ہوتی ہے جن میں کہ کوئی شے مشترک ہو۔ نسبت کے لئے دو جنسوں کا مقابلہ ہونا لازمی ہے اور کسی ایک چیز کا دونوں جنسوں میں مشترک ہونا ضروری ہے۔ قدرِ ایک تنہا جنس میں بھی ہو سکتی ہے جب ایک جنس کی قیمت کسی دوسری جنس سے قائم کی جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی "قدرِ تبادلہ" ہوتی ہیں لیکن اُن دونوں میں قدرِ اصل کا ہونا ضروری ہے۔ قدرِ تبادلہ۔ قدرِ اصل کا نتیجہ ہے نہ کہ اس کا سبب، جب یہ کہا جاتا ہے کہ

دو من ناج = ۴ من کوئلہ

= ۱ من چائے

= ½ من ٹماٹر اور دنیا کی ہزاروں جنس ہو سکتی ہیں تو یہاں یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ ہم دو من ناج کی قیمت کو آخر میں رکھ کر تبادلہ نہ کہ تبادلے سے دو من ناج کی قیمت پیدا ہو رہی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جنس کی رسد اور مانگ قدر پیدا کرتی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ رسد اور مانگ کا قدر پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں بلکہ اس کا ہاتھ تو صرف نسبت قائم کرنے میں ہے، وہ نسبت کبھی جنس کی قدرِ اصل سے کم ہوتی ہے کبھی زیادہ، فرض کیجئے کہ جنس کی قدرِ اصل تو چار آنے ہے لیکن رسد اور مانگ کا فرق کبھی چار آنے کی نسبت پونے چار آنے سے قائم کرے گا اور کبھی سوا چار آنے سے۔ لیکن رسد اور مانگ کی کشمکش چار آنے کو نہیں بدل سکتی۔ قدرِ تبادلہ قدرِ اصل کے اِرد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ دس کی نسبت نو سے قائم کریں یا ایک ہزار سے اس نسبت سے دس نہ نو رہ جائیں گے اور نہ گیارہ ہو جائیں گے دس کے دس رہیں گے۔ دس کی نسبت نو اور دس دو الگ الگ

مقداریں ہیں۔ "نسبت" دس اور ہزار سے الگ ایک حیثیت رکھتی ہے، دس کو اگر قدرِ اصل مانیں تو صاف ہو جاتا ہے کہ نسبت قدرِ اصل کو نہیں بدل سکتی۔ نسبت بذاتِ خود ایک الگ چیز ہے اور رسد اور مانگ کا اثر صرف نسبت پر ہوتا ہے نہ کہ جنس کی قدرِ اصل پر۔ جنس کی قدرِ اصل میں سماجی ضروری محنت رد و بدل کر سکتی ہے۔ جنس کی قیمت صرف اس لئے ہے کہ وہ سماجی ضروری محنت کا کھلیان ہے۔ اگر جنس تین گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت میں بنتی ہے تو رسد اور مانگ کی کشاکش اُس کو نہ دو گھنٹے اور نہ چار گھنٹے کی محنت بنا سکتی ہے۔ البتہ اس کی اور دوسری جنسوں کی تبادلی نسبت میں کچھ عرصہ کے لئے فرق ڈال سکتی ہے۔

جنسوں کی قدرِ تبادلہ کا اُتار چڑھاؤ اور بات ہے اور قدرِ اصل کی کمی زیادتی دوسری بات، جنسوں کا آپس میں قدرِ تبادلہ کے لحاظ سے لین دین کرنا سرمایہ داری کا بنیادی اصول ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنس ہمیشہ کبھی قدرِ اصل سے کم اور کبھی زیادہ پر فروخت کی جاتی ہے۔ سرمایہ داری اس غلط طریقہ لین دین پر مبنی ہے اور قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے جنسوں کا لین دین کرتی ہے۔ سرمایہ داری میں یہ ضروری نہیں کہ دو جنسوں کا تبادلہ ان کی قدرِ اصل کے بموجب ہو بلکہ اکثر زیادہ قیمت کا کم قیمت سے اور کم قیمت کا زیادہ قیمت سے تبادلہ ہو جاتا ہے اس کو بالکل اسی طرح سمجھئے کہ ہم اپنے جذبات کی ترجمانی الفاظ کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ لیکن الفاظ جذبات نہیں ہوتے بلکہ جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ ہوتے ہیں لیکن اکثر وہ الفاظ ہمارے جذبات کو بہت رنگین یا بہت پھیکا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح قدرِ تبادلہ قدرِ اصل نہیں ہوتی بلکہ قدرِ اصل کے اظہار کا ایک طریق ہوتی ہے جس میں قدرِ اصل کا تبادلہ کبھی کم قیمت سے ہوتا ہے اور کبھی زیادہ قیمت سے۔

فرض کیجئے کہ کپڑے کی اصل قیمت فی گز ایک گھنٹہ ہے اور ایک گاؤں میں بیس آدمی ہیں ان میں سے ہر ایک فی ہفتہ تین گز کپڑے کا خواہشمند ہے تو ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ساٹھ گز کپڑا فی ہفتہ ہونا چاہئے۔ لیکن فرض کیجئے کہ کپڑا صرف چالیس گز ہے اب یہ ضروری ہے کہ کپڑا مہنگا ہو جائے یعنی اُس کی تبادلی قیمت زیادہ ہو جائے اور سماج ایک گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت کے بدلے میں شاید ۱½ گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت دینے پر تیار ہو جائے لیکن زیادہ عرصہ تک یہ نسبت قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ جنس کی قدرِ اصل سماج میں مانگ گھٹا کر اور رسد بڑھا کر وہ توازن پیدا کر دے گی کہ کپڑا قدرِ اصل پر فروخت ہو۔ اب مخالف مثال لیجئے، کپڑا ساٹھ گز ہے اور درکار صرف چالیس گز ہے تو کپڑا سستا ہو گا یعنی ایک گز چالیس منٹ کی سماجی ضروری محنت کے بدلے میں ملنے لگے گا۔ پھر قدرِ اصل سماج میں مانگ بڑھا کر اور رسد گھٹا کر وہ اقتصادی توازن پیدا کرے گی کہ کپڑا قدرِ اصل پر فروخت ہو گا۔ یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ رسد اور مانگ قدرِ تبادلہ کو کس طرح گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہے اور قدرِ اصل رسد اور مانگ کا کس طرح توازن قائم کرتی ہے تاکہ جنس کا تبادلہ قدرِ اصل پر ہو۔ اگر جنس کی قدرِ تبادلہ قدرِ اصل سے کم ہو گی تو قدرِ اصل سماج میں جنس کی مانگ بڑھا کر اور رسد گھٹا کر ایسے صورت حالات پیدا کرے گی کہ قدرِ تبادلہ اور قدرِ اصل برابر رہیں۔ اور اگر قدرِ تبادلہ قدرِ اصل سے زیادہ ہو جائے گی تو قدرِ اصل مانگ کو گھٹا کر اور رسد کو بڑھا کر قدرِ تبادلہ کو گھٹا دے گی۔ یہاں تک کہ قدرِ تبادلہ گھٹ کر قدرِ اصل کے برابر آ جائے۔ قدرِ اصل رسد اور مانگ کو (Govern) کرتی ہے۔ اور رسد اور مانگ قدرِ تبادلہ کو (Govern) کرتی ہے۔ قدرِ تبادلہ کا اُتار چڑھاؤ سرمایہ داری کی جان ہے اور اسی سے سرمایہ داری کی ساری بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اگر یہ مان لیں کہ رسد اور مانگ جنس میں قیمت پیدا کرتی ہیں تو اگر کبھی یہ برابر ہو جائیں یعنی کسی جنس کی جتنی ضرورت ہو اتنی ہی جنس موجود ہے اس وقت رسد اور مانگ کے اثرات تو ایک دوسرے کو منسوخ کر دیں گے تو جنس کس قیمت پر فروخت ہو گی۔ سرمایہ دار مفکرین کہتے ہیں کہ رسد اور مانگ کے برابر ہونے پر جنس (Equilibrium Price) پر فروخت ہو گی، لیکن وہ یہ بھولتے ہیں کہ اگر (Equilibrium Price) قدرِ اصل سے زیادہ یا کم ہوتی تو قدرِ اصل رسد اور مانگ کو گھٹا بڑھا کر ایسا توازن قائم کرے گی کہ جنس قدرِ اصل پر فروخت ہو۔ اگر سماج کپڑا بنانے سے قبل اس کا حساب لگائے کہ کتنا اور کس قسم کا کپڑا سماج کو درکار ہو گا اور اسی حساب سے کپڑا بنائے اُس وقت رسد اور مانگ کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہو گا تو جنسوں کی قیمت کیسے مقرر ہو گی۔ دراصل رسد اور مانگ کسی جنس میں قدر پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ تو صرف تبادلی نسبت میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرتی رہتی ہیں۔ رسد اور مانگ کا اُتار چڑھاؤ ہمارے سماجی نظام کی خرابی کا نتیجہ ہیں جنس میں ہماری ضروری محنت قیمت پیدا کرتی ہے

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے جب سماج جنس کو قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتی ہے تو وہ سماج کیپٹلسٹ کہلاتی ہے۔ دولت کی غلط تقسیم رسد اور مانگ کے اُتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ داری کے لئے یہ ضروری ہے کہ سماج کو رسد اور مانگ کے اُتار چڑھاؤ کے اصول پر چلائے۔ یہ اُتار چڑھاؤ سماج میں دولت کی تقسیم کرتا ہے نہ کہ دولت پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دار جنس کا مالک ہوتا ہے اس لئے وہ جنس کا تبادلہ اس صورت سے کرتا ہے کہ کم جنس کے بدلے میں دوسرے سے زیادہ

جنس ہے ہے۔ قدرِ تبادلہ اقتصادی لوٹ کا ایک ذریعہ ہے کبھی مصنوعی طریق پر جنس کی رسد بڑھا دی کبھی مانگ بڑھا دی اور عوام کو لوٹا۔ اس کا اندازہ اسٹوک ایکسچینج پر خوب ہوتا ہے۔

دراصل قیمت کا تعلق سماجی تعلقات سے ہے کہ کسی خاص سماج میں لوگوں کے کیسے تعلقات ہیں۔ تعلقات کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرد سماج کے لئے جنس بناتا ہے اور اُس کو بازار میں لے جاتا ہے جہاں اور لوگوں کی جنسوں کا بھی ہجوم ہوتا ہے وہاں لوگ ایک دوسرے کی جنس کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں گویا ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق ہے لیکن کس قسم کا؟ وہ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُس سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ استعمال کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے تو اُس سماج کے افراد کے تعلقات (Relation ship) اشتراکی تعلقات کہلائیں گے اور وہ سماج اشتراکی سماج کہلائے گی اگر کسی سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ اصل کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے تو اُس سماج کے افراد کے تعلقات (Socialistic Ralation ship) کہلائیں گے اور وہ سماج اشتمالی سماج کہلائے گی۔ اگر کسی سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے ہوگا تو اُس سماج کے افراد کے تعلقات (Capitalistic Relation ship) سرمایہ دارانہ تعلقات کہلائیں گے اور وہ سماج سرمایہ دارانہ سماج کہلائے گی۔ سرمایہ داری میں خرید و فروخت ایسے طریق پر ہوتا ہے کہ قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ میں فرق ہوتا ہے۔ قدرِ اصل مقناطیس کی طرح رسد اور مانگ پر برابر اثر ڈالتی رہتی ہے کہ دونوں برابر رہیں اور سماج کو مجبور کرتی ہے کہ جنس کا تبادلہ قدرِ اصل پر ہو، لیکن ہمارا غلط سماجی سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ قدرِ اصل کے اثر کو مٹاتا رہتا ہے۔ لیکن مٹانے کی کوشش میں وہ طاقتیں بھی پیدا کرتا رہتا ہے جو اُس طریق خرید و فروخت کو دوسرے طریق خرید و فروخت سے جس کو سوشلزم کہتے ہیں، بدل دیگا لیکن اقتصادی رجحانات اور کوشش بذاتِ خود کچھ نہیں کر سکتی۔ ان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو سرمایہ داری خود کرتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے سرمایہ داری کے دن قریب آتے جا رہے ہیں وہ اپنے قبر کھودنے والوں یعنی غریب مزدوروں کی تعداد بڑھاتی جا رہی ہے لیکن اس غریب مزدور جماعت کی تنظیم کے لئے لیڈر اور پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں سے سوشلزم کا سیاسی رُخ شروع ہوتا ہے جس کا ذکر ہر خاص و عام کی زبان پر ہے لیکن اس سیاسی جدوجہد کا اصول اقتصادی ہے کہ سماج میں جنس کا تبادلہ یا قدرِ اصل کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے یا قدرِ استعمال کے نقطۂ نظر سے۔ تب وہ سماج اشتمالی یا اشتراکی کہلائے گی۔

اب ہم کارل مارکس کی تصنیف "سرمایہ" اور پروفیسر کول کی تصنیف "دراصل کارل مارکس کا کیا مطلب تھا" مطبوعہ وگرا گولنز لمیٹڈ سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین خود انصاف کر سکیں کہ آیا پروفیسر صاحب نے مارکس کا وہی مطلب سمجھا ہے جو اُس کا خیال تھا یا کچھ اور۔ پہلے "سرمایہ" سے اقتباسات دیکھئے۔ ۲۴

نمبر ۱۔ "سرمایہ" ایوری مین لائبریری صفحہ ۳۔ "ہر ایک مفید شئے مثلاً لوہا۔ کاغذ وغیرہ کو دو نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ایک نوعیت کے نقطۂ نظر سے دوسرے مقدار کے"

نمبر ۲۔ "سرمایہ" صفحہ ۴۔ "کسی شئے کا کارآمد ہونا اُس کو قدرِ استعمال دیتا ہے۔ لیکن کارآمد ہونے کی خصوصیت کوئی الگ شئے نہیں ہے یہ جنس کی خصوصیات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان خصوصیات سے الگ کارآمد ہونے کی خصوصیت کا وجود نہیں ہوتا۔ لوہا، گیہوں۔ ہیرا قدرِ استعمال رکھتے ہیں۔ بحیثیت ہیرا ہونے کے جو اس پتھر میں خصوصیات ہیں اُن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہ اس ہیرے کے حاصل کرنے میں کتنی محنت صرف ہوئی" (اگر ایک ہیرا بہت محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے اور دوسرا آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے تو ان دونوں کی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں ہوگا)

نمبر ۳۔ صفحہ ۶۔ "قدرِ استعمال کے اعتبار سے جنس صرف کسی خاص نوعیت کی ہوتی ہے۔ قدرِ تبادلہ کے اعتبار سے اس میں صرف مقدار کا فرق ہوتا ہے کیونکہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے اس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی" یہ عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ دار۔ روٹی۔ قہوہ۔ اناج دریا برد کرتے ہیں یا جلاتے رہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کو ان جنسوں کی قدرِ استعمال سے سروکار نہیں۔ بلکہ ان کا مطمعِ نظر قدرِ تبادلہ ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں ہر جنس قدرِ تبادلہ یعنی مقدار کے اعتبار سے دیکھی جاتی ہے اور نفع کمانا مقصدِ حیات ہے۔ یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ نفع قدرِ استعمال پیدا کرنے سے ہوتا ہے لیکن قدرِ استعمال پیدا کرنا سرمایہ دارانہ سماج کا مقصدِ حیات نہیں ہوتا۔ جب سرمایہ داروں کو قدرِ استعمال کے تباہ کرنے سے قدرِ تبادلہ ملتی ہے تو وہ اس کے تباہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس مثال سے کارل مارکس کا مندرجہ بالا اقتباس صاف ہو گیا کہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے جنس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی۔ مارکس کہتا ہے جنس میں بیک وقت۔ قدرِ استعمال۔ قدرِ تبادلہ اور قدرِ اصل ہوتی ہیں لیکن سماج یہ کر سکتی ہے کہ جنس کو کسی ایک قدر کے نقطۂ نظر سے دیکھے جب مارکس یہ کہتا ہے کہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نگاہ سے جنس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی تو اس کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو سماج جنس کی قدرِ تبادلہ دیکھتی ہے جیسی سرمایہ دارانہ سماج تو اُس کے لئے جنس میں قدرِ استعمال کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس کا مطمعِ نظر مقدار اور نفع ہے نہ کہ استعمالِ جنس۔ اب پروفیسر کول کی کتاب سے اقتباسات دئے جاتے ہیں۔

ایشیا

کول صاحب ۔ "قیمت اور دام" کے باب میں صفحہ ۲۱۳ پر ایک سوال فرماتے ہیں اور صفحہ ۲۱۴ اور ۲۱۵ پر اس کا خود جواب دیتے ہیں۔ سوال و جواب حسب ذیل ہیں۔

سوال "جب کارل مارکس یہ کہتا ہے کہ انسانی محنت کسی قدرتی شے میں قدر پیدا کرتی ہے تو اُس کا اشارہ قدر تبادلہ کی طرف ہوتا ہے یا قدر استعمال کی طرف"؟

جواب "انسانی محنت جو قدر قدرتی اشیا میں پیدا کرتی ہے وہ حقیقت میں قدر استعمال ہوتی ہے نہ کہ قدر تبادلہ، لیکن زمانۂ حال کے ماہرین اقتصادیات کا یہ دعویٰ درست ہے کہ قدر استعمال اور قدر تبادلہ دونوں کو مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں"

پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ قدر استعمال اور قدر تبادلہ دونوں کو مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں، مہمل سی بات ہے۔ مارکس کے نزدیک قدر استعمال جب صرف مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہے تو قدر تبادلہ کہلاتی ہے۔ قدر تبادلہ تو سرمایہ داری کا نتیجہ ہے۔ یہ قدر جنس کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ رسد اور مانگ کی کشمکش اسے پیدا کرتی اور گھٹاتی بڑھاتی رہتی ہے۔ اگر سرمایہ داری ختم ہو جائے تو قدر تبادلہ بھی ختم ہو جائے گی اور جنسوں کا تبادلہ قدر اصل کے بموجب ہوگا لیکن قدر استعمال اور قدر اصل جنس سے کبھی بھی جُدا نہیں ہو سکتے۔ پھر پروفیسر کول صفحہ ۲۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک قدر تبادلہ = قدر اصل

مارکس کے نزدیک دونوں الگ الگ ہیں۔ البتہ قدر تبادلہ قدر اصل کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے "قیمت اور دام" کے باب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنس کی قدر اصل۔ قدر تبادلہ اور قدر استعمال میں برابر خلط ملط کرتے رہتے ہیں۔

مارکس کے اس نظریہ کے متعلق کہ سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے ۔ ماہر مزدور کی محنت اناڑی مزدور کی محنت میں منتقل کر کے ناپی جاتی ہے ۔

کول صاحب صفحہ ۲۲۳ پر فرماتے ہیں۔ "یہ نظریہ مجھے جچتا نہیں یہ اُسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ تمام انسانی مہارت اور پیداوار کی طاقت مرضی کے مطابق ہر وقت کے وقت پیدا کی جا سکے۔ یہ نظریہ جہاں تک ماہر مزدور کی محنت کو اناڑی مزدور کی محنت سے ناپنے کا تعلق ہے وہاں تک تو درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں اناڑی مزدور کی محنت سے ایک غیر معمولی انسان کی محنت کو ناپنے کا تعلق ہے وہاں یہ نظریہ منطبق نہیں ہو سکتا۔ میرا گمان ہے کہ اگر مارکس زندہ ہوتا تو مان لیتا کہ اس کا نظریہ یہاں درست نہیں اُترتا

کول صاحب فرماتے ہیں کہ ایک غیر معمولی انسان کی قدر کی بابت یہ کہہ دینا کہ اس کی قدر سو اناڑی مزدوروں کی قدر کے برابر ہے، غلط ہوگا۔ کیونکہ غیر معمولیت کسی شکل میں بھی اناڑی مزدور کی محنت سے نہیں ناپی جا سکتی۔ مارکس کے نزدیک اس غیر معمولیت کی کوئی قیمت نہیں وہ تو قدرت کی طرف سے مفت کا عطیہ ہے۔ اگر کول صاحب غیر معمولی دماغ کے انسان ہیں تو یہ قدرت کی طرف سے اُن کو مفت کا عطیہ ہے۔ وہ غیر معمولیت اُن کی ذاتی محنت کا نتیجہ نہیں اس لئے اس کی کوئی قیمت نہیں اور نہ کول صاحب کو حق ہے کہ جو شے انھیں مفت عطا ہوئی ہو اور جس کی کوئی قیمت نہ ہو اُس کا معاوضہ دوسروں سے وصول کریں۔ یہ پروفیسر صاحب خود مانتے ہیں کہ کسی شے پر قبضہ ہونا اس میں قدر پیدا نہیں کرتا۔ کسی جنس پر قبضہ ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں اس کی قدر میں فرق نہیں پڑتا۔ پروفیسر صاحب کا اپنے دماغ پر قبضہ اس میں قدر پیدا نہیں کرتا۔ اُن کے دماغ میں جو کچھ قدر ہے وہ قدرت کا عطیہ ہے اور مفت ہے۔ البتہ اگر انھوں نے ذاتی محنت سے استطاعت بڑھائی ہے تو اس میں قدر ہے کیونکہ وہ محنت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک پروفیسر صاحب کے دماغ کی تیزی اُن کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے وہاں تک اس میں قدر اصل ہے اور جہاں تک وہ تیزی قدرت کا عطیہ ہے وہاں اُن کے دماغ کی صرف قدر استعمال ہے۔ پروفیسر صاحب کو یہ پہلو کھٹکا معلوم ہوتا ہے انھوں نے (~~[illegible]~~) کی بجائے natural endowment of mind کہا ہے کیونکہ اگر natural endowment of mind کہہ دیتے تو ظاہر ہو جاتا کہ غیر معمولیت قدرت کی طرف سے مفت کا عطیہ ہے ۔

مندرجۂ بالا اعتراضات کرنے کے بعد پروفیسر صاحب خود قیمت کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اُن کے نظریہ کو مان لینے سے وہ تمام اعتراضات حل ہو جاتے ہیں جو مارکس کے نظریہ پر وارد ہوتے ہیں۔ اور مارکس کا نظریہ جس اصول پر قائم ہے اس کو بھی ضرر نہیں پہنچتا۔ پروفیسر صاحب صفحہ ۲۵۰ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "اصولاً اقتصادیات میں قدر قلت سے پیدا ہوتی ہے قیمتی اشیا، وہی ہیں جن کی سماج کو ضرورت زیادہ ہے لیکن اُن کی مقدار محدود ہے۔ اگر وہ بغیر محنت کے دستیاب ہو سکتیں تو لوگ اُن کو بڑی مقدار میں استعمال کرتے"

نہ معلوم پروفیسر صاحب نے کس مصلحت کی بنا پر رسد اور مانگ کی بجائے "قلت" اور "زیادہ ضرورت" کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ مطلب دونوں کا ایک ہے۔ پروفیسر صاحب نے

دوسرے الفاظ میں وہی رسد اور مانگ کا نظریہ پیش کر دیا۔

صفحہ ۲۶۱ پر پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں "انسانی محنت جنس میں اس لئے قدر پیدا کرتی ہے کہ انسانی محنت کی قلت ہے اور پیداوار میں اس کی ضرورت ہوتی ہے"۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک انسانی محنت اس لئے قدر پیدا کرتی ہے کہ دنیا میں اُس کی قلت ہے۔

صفحہ ۲۶۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "کسی جنس کی قلت عام طور پر انسانی محنت کی قلت سے پیدا ہوتی ہے اور اس سچائی کو کہ قلت قدر پیدا کرتی ہے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ محنت قدر پیدا کرتی ہے اور اُس کو ناپتی ہے"۔

صفحہ ۲۸۵ پر تحریر فرماتے ہیں "کسی جنس کی قلت اس میں قدر پیدا کرتی ہے۔ قدر معلوم کرنے کے لئے یہ سوال کہ جنس محنت سے پیدا ہوئی ہے یا نہیں غیر متعلق ہے جنس کی قدر اُس کی قلت ہے اور جنس کی قلت اُس کی قدر ہے"۔

ان اقتباسات نے پروفیسر صاحب کے "قدر کا نظریہ" صاف کر دیا اُن کے نزدیک رسد اور مانگ قدر پیدا کرتے ہیں۔ جس کی رد ہم کر چکے ہیں۔ مختصراً پھر دہرائے دیتے ہیں فقط جنس کی قلت سے قدر پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ اُس جنس کی مانگ نہ ہو۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اکثر صابن کے بلبلے بنانے کی ایک قیمتی مشین کی مثال پیش کی جاتی ہے حالانکہ وہ مشین قلت سے ہوگی لیکن کوئی اس کے بدلے میں رقم کثیر دینے کو تیار نہ ہوگا۔ فی زمانہ ایسی زود کار مشینیں موجود ہیں جن کا استعمال عام بے روزگاری پیدا کر دیتی ہے وہ مشینیں مفید بھی ہیں اور اُن کی قلت بھی ہے لیکن کوئی آدھے دام پر بھی خریدنے کو تیار نہیں۔ پروفیسر صاحب کے ذہن میں یہ اعتراض تھا اس لئے انھوں نے قلت کے ساتھ ایک اور شرط لگا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک دونوں موجود نہ ہوں قدر پیدا نہیں ہوتی یعنی قلت کے ساتھ اُس جنس کی ضرورت ہونا بھی قدر پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے۔ قلت یعنی رسد اور انسانی ضرورت یعنی مانگ، پروفیسر صاحب نے وہی رسد اور مانگ کا نظریہ پیش کر دیا۔

ہم قدر تبادلہ کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ رسد اور مانگ تو وہ قیمتوں میں نسبت پیدا کرتی ہیں قدر پیدا نہیں کرتیں۔ پروفیسر صاحب کی نگاہ ادھر نہیں گئی کہ ایک شئے ایسی بھی ہے جو قلت کو کثرت میں اور کثرت کو قلت میں تبدیل کرتی رہتی ہے اور سماج کو اس امر پر مجبور کرتی رہتی ہے کہ جنس کی رسد اور مانگ برابر رکھے۔ وہ سماجی ضروری محنت ہے جو اُس جنس کے بنانے میں عام طور پر صرف ہوتی ہے اور جو جنس کی قدر اصل ہوتی ہے۔ کسی جنس کی قلت ہوئی یعنی قدر تبادلہ قدر اصل سے زیادہ ہوئی اور قدر اصل نے سماج کو کمپٹیشن پر آمادہ کیا اور رسد اور مانگ کو برابر کر دیا کسی جنس کی افزونی ہوئی اور قدر تبادلہ قدر اصل سے گری اور قدر اصل نے کمپٹیشن غائب کیا اور رسد اور مانگ کو برابر لے آئی۔ وہ شے جو سماج میں کمپٹیشن پیدا کرتی اور مٹاتی ہے۔ رسد اور مانگ میں برابری کی نسبت قائم کرنا چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ جنس اپنی قدر اصل پر فروخت ہو وہ شئے سماجی ضروری محنت اور وقت ہے جو اس جنس کے بنانے میں عام طور پر صرف ہوتا ہے اور وہی محنت اور وقت جنس میں قیمت پیدا کرتے ہیں۔

کمپٹیشن قدر اصل کا ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے وہ جنس کی قلت و کثرت کو ہموار کرتی رہتی ہے۔ رسد زیادہ ہوتے ہی جنس سستی ہو جائے گی۔ کارخانہ دار نفع نہ دیکھ کر جنس بنانا کم کر دیں گے جنس میں کمپٹیشن کم ہو جائے گا اور جنس کی قدر تبادلہ قدر اصل کے برابر ہو جائیگی۔

دوسری شکل لیجئے۔ رسد کی قلت ہونے سے قدر تبادلہ قدر اصل سے زیادہ ہو جائے گی۔ دوسرے سرمایہ دار نفع دیکھ کر جنس بنانا شروع کر دیں گے۔ اور کمپٹیشن شروع ہو جائے گا کمپٹیشن رسد اور مانگ برابر کر دیگا اور جنس قدر اصل پر فروخت ہوگی۔ قدر اصل حسب ضرورت سماج میں کبھی کمپٹیشن پیدا کر کے اور کبھی اُس کو مٹا کر جنس کی قلت اور ضرورت (رسد اور مانگ) کو ہموار رکھتی ہے۔

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

مقداریں ہیں۔ "نسبت" دس اور ہزار سے الگ ایک حیثیت رکھتی ہے، دس کو اگر قدرِ اصل مانیں تو صاف ہو جاتا ہے کہ نسبت قدرِ اصل کو نہیں بدل سکتی۔ نسبت بذات خود ایک الگ چیز ہے اور رسد اور مانگ کا اثر صرف نسبت پر ہوتا ہے نہ کہ جنس کی قدرِ اصل پر۔ جنس کی قدرِ اصل میں سماجی ضروری محنت رد و بدل کر سکتی ہے جنس کی قیمت صرف اس لئے ہے کہ وہ سماجی ضروری محنت کا کھلیان ہے۔ اگر جنس تین گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت میں بنتی ہے تو رسد اور مانگ کی کشاکش اُس کو نہ دو گھنٹے اور نہ چار گھنٹے کی محنت بنا سکتی ہے۔ البتہ اس کی اور دوسری جنسوں کی تبادلی نسبت میں کچھ عرصہ کے لئے فرق ڈال سکتی ہے۔

جنسوں کی قدرِ تبادلہ کا اُتار چڑھاؤ اور بات ہے اور قدرِ اصل کی کمی زیادتی دوسری بات، جنسوں کا آپس میں قدرِ تبادلہ کے لحاظ سے لین دین کرنا سرمایہ داری کا بنیادی اصول ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنس ہمیشہ کبھی قدرِ اصل سے کم اور کبھی زیادہ پر فروخت کی جاتی ہے۔ سرمایہ داری اس غلط طریقہ لین دین پر مبنی ہے اور قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے جنسوں کا لین دین کرتی ہے۔ سرمایہ داری میں یہ ضروری نہیں کہ دو جنسوں کا تبادلہ ان کی قدرِ اصل کے بموجب ہو بلکہ اکثر زیادہ قیمت کا کم قیمت سے اور کم قیمت کا زیادہ قیمت سے تبادلہ ہو جاتا ہے اس کو بالکل اسی طرح سمجھئے کہ ہم اپنے جذبات کی ترجمانی الفاظ کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ لیکن الفاظ جذبات نہیں ہوتے بلکہ جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ ہوتے ہیں لیکن اکثر وہ الفاظ ہمارے جذبات کو بہت رنگیں یا بہت پھیکا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح قدرِ تبادلہ قدرِ اصل نہیں ہوتی بلکہ قدرِ اصل کے اظہار کا ایک طریق ہوتی ہے جس میں قدرِ اصل کا تبادلہ کبھی کم قیمت سے ہوتا ہے اور کبھی زیادہ قیمت سے۔

فرض کیجئے کہ کپڑے کی اصل قیمت فی گز ایک گھنٹہ ہے اور ایک گاؤں میں بیس آدمی ہیں ان میں سے ہر ایک فی ہفتہ تین گز کپڑے کا خواہشمند ہے تو ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ساٹھ گز کپڑا فی ہفتہ ہونا چاہئے۔ لیکن فرض کیجئے کہ کپڑا صرف چالیس گز ہے اب یہ ضروری ہے کہ کپڑا مہنگا ہو جائے یعنی اُس کی تبادلی قیمت زیادہ ہو جائے اور سماج ایک گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت کے بدلے میں شاید ۱½ گھنٹہ کی سماجی ضروری محنت دینے پر تیار ہو جائے لیکن زیادہ عرصہ تک یہ نسبت قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ جنس کی قدرِ اصل سماج میں مانگ گھٹا کر اور رسد بڑھا کر وہ توازن پیدا کر دے گی کہ کپڑا قدرِ اصل پر فروخت ہو۔ اب مخالف مثال لیجئے، کپڑا ساٹھ گز ہے اور درکار صرف چالیس گز ہے تو کپڑا سستا ہو گا یعنی ایک گز چالیس فٹ کی سماجی ضروری محنت کے بدلے میں ملنے لگے گا۔ پھر قدرِ اصل سماج میں مانگ بڑھا کر اور رسد گھٹا کر وہ اقتصادی توازن پیدا کرے گی کہ کپڑا قدرِ اصل پر فروخت ہو گا۔ یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ رسد اور مانگ قدرِ تبادلہ کو کس طرح گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہے اور قدرِ اصل رسد اور مانگ کا کس طرح توازن قائم کرتی ہے تاکہ جنس کا تبادلہ قدرِ اصل پر ہو۔ اگر جنس کی قدرِ تبادلہ قدرِ اصل سے کم ہو گی تو قدرِ اصل سماج میں جنس کی مانگ بڑھا کر اور رسد گھٹا کر ایسے صورت حالات پیدا کرے گی کہ قدرِ تبادلہ اور قدرِ اصل برابر رہیں۔ اور اگر قدرِ تبادلہ قدرِ اصل سے زیادہ ہو جائے گی تو قدرِ اصل مانگ کو گھٹا کر اور رسد کو بڑھا کر قدرِ تبادلہ کو گھٹا دے گی۔ یہاں تک کہ قدرِ تبادلہ گھٹ کر قدرِ اصل کے برابر آ جائے۔ قدرِ اصل رسد اور مانگ کو (Governs) کرتی ہے۔ اور رسد اور مانگ قدرِ تبادلہ کو (Governs) کرتی ہے۔ قدرِ تبادلہ کا اُتار چڑھاؤ سرمایہ داری کی جان ہے اور اسی سے سرمایہ داری کی ساری بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اگر یہ مان لیں کہ رسد اور مانگ جنس میں قیمت پیدا کرتی ہیں تو اگر کبھی یہ برابر ہو جائیں یعنی کسی جنس کی جتنی ضرورت ہو اتنی ہی جنس موجود ہے اس وقت رسد اور مانگ کے اثرات تو ایک دوسرے کو منسوخ کر دیں گے تو جنس کس قیمت پر فروخت ہو گی۔ سرمایہ دار مفکرین کہتے ہیں کہ رسد اور مانگ کے برابر ہونے پر جنس (Equilibrium Price) پر فروخت ہو گی لیکن وہ یہ بھولتے ہیں کہ اگر (Equilibrium Price) قدرِ اصل سے زیادہ یا کم ہوتی تو قدرِ اصل رسد اور مانگ کو گھٹا بڑھا کر ایسا توازن قائم کرے گی کہ جنس قدرِ اصل پر فروخت ہو۔ اگر سماج کپڑا بنانے سے قبل اس کا حساب لگائے کہ کتنا اور کس قسم کا کپڑا سماج کو درکار ہو گا اور اسی حساب سے کپڑا بنائے اُس وقت رسد اور مانگ کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہو گا تو جنسوں کی قیمت کیسے مقرر ہو گی۔ دراصل رسد اور مانگ کسی جنس میں قدر پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ تو صرف تبادلی نسبت میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرتی رہتی ہیں۔ رسد اور مانگ کا اُتار چڑھاؤ ہمارے سماجی نظام کی خرابی کا نتیجہ ہیں جنس میں ہماری ضروری محنت قیمت پیدا کرتی ہے۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے جب سماج جنس کو قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتی ہے تو وہ سماج کیپٹلسٹ کہلاتی ہے۔ دولت کی غلط تقسیم رسد اور مانگ کے اُتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ داری کے لئے یہ ضروری ہے کہ سماج کو رسد اور مانگ کے اُتار چڑھاؤ کے اصول پر چلائے۔ یہ اُتار چڑھاؤ سماج میں دولت کی تقسیم کرتا ہے نہ کہ دولت پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دار فیس کا مالک ہوتا ہے اس لئے وہ جنس کا تبادلہ اس صورت سے کرتا ہے کہ کم جنس کے بدلے میں دوسرے سے زیادہ

جنس بے ہے۔ قدرِ تبادلہ اقتصادی لوٹ کا ایک ذریعہ ہے کبھی مصنوعی طریق پر جنس کی رسد بڑھادی کبھی مانگ بڑھادی اور عوام کو لوٹا۔ اس کا اندازہ اسٹوک ایکسچینج پر خوب ہوتا ہے۔

دراصل قیمت کا تعلق سماجی تعلقات سے ہے کہ کسی خاص سماج میں لوگوں کے کیسے تعلقات ہیں۔ تعلقات کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرد سماج کے لئے جنس بناتا ہے اور اُس کو بازار میں لے جاتا ہے جہاں اور لوگوں کی جنسوں کا بھی ہجوم ہوتا ہے وہاں لوگ ایک دوسرے کی جنس کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں گویا ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق ہے لیکن کس قسم کا؟ وہ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُس سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ استعمال کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے تو اس سماج کے افراد کے تعلقات (Relation ship) اشتراکی تعلقات کہلائیں گے اور وہ سماج اشتراکی سماج کہلائے گی اگر کسی سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ اصل کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے تو اُس سماج کے افراد کے تعلقات (Socialistic Relation ship) کہلائیں گے اور وہ سماج اشتمالی سماج کہلائے گی۔ اگر کسی سماج میں جنسوں کا تبادلہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے ہوگا تو اُس سماج کے افراد کے تعلقات (Capitalistic Relation ship) سرمایہ دارانہ تعلقات کہلائیں گے اور وہ سماج سرمایہ دارانہ سماج کہلائے گی۔ سرمایہ داری میں خرید و فروخت ایسے طریق پر ہوتا ہے کہ قدرِ اصل اور قدرِ تبادلہ میں فرق ہوتا ہے۔ قدرِ اصل مقناطیس کی طرح رسد اور مانگ پر برابر اثر ڈالتی رہتی ہے کہ دونوں برابر رہیں اور سماج کو مجبور کرتی ہے کہ جنس کا تبادلہ قدرِ اصل پر ہو، لیکن ہمارا غلط سماجی سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ قدرِ اصل کے اثر کو مٹاتا رہتا ہے لیکن مٹانے کی کوشش میں وہ طاقتیں بھی پیدا کرتا رہتا ہے جو اُس طریق خرید و فروخت کو دوسرے طریق خرید و فروخت سے جس کو سوشلزم کہتے ہیں، بدل دیگا۔ لیکن اقتصادی رجحانات اور کشش بذاتِ خود کچھ نہیں کرسکتی۔ ان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو سرمایہ داری خود کرتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے سرمایہ داری کے دن قریب آتے جا رہے ہیں وہ اپنے قبر کھودنے والوں یعنی غریب مزدوروں کی تعداد بڑھاتی جا رہی ہے لیکن اس غریب مزدور جماعت کی تنظیم کے لئے لیڈر اور پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں سے سوشلزم کا سیاسی رُخ شروع ہوتا ہے جس کا ذکر ہر خاص و عام کی زبان پر ہے لیکن اس سیاسی جد و جہد کا اصول اقتصادی ہے کہ سماج میں جنس کا تبادلہ یا قدرِ اصل کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے یا قدرِ استعمال کے نقطۂ نظر سے۔ تب وہ سماج اشتمالی یا اشتراکی کہلائے گی۔

۲۴ اب ہم کارل مارکس کی تصنیف "سرمایہ" اور پروفیسر کول کی تصنیف "دراصل کارل مارکس کا کیا مطلب تھا" مطبوعہ وگر ڈاگو نز لمیٹڈ سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین خود انصاف کرسکیں کہ آیا پروفیسر صاحب نے مارکس کا وہی مطلب سمجھا ہے جو اُس کا خیال تھا یا کچھ اور۔ پہلے "سرمایہ" سے اقتباسات دیکھئے۔

نمبر ۱۔ "سرمایہ" ایوری مین لائبریری صفحہ ۳۔ "ہر ایک مفید شئے مثلاً لوہا۔ کاغذ وغیرہ کو دو نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ایک نوعیت کے نقطۂ نظر سے دوسرے مقدار کے"

نمبر ۲۔ "سرمایہ" صفحہ ۴۔ "کسی شئے کا کارآمد ہونا اُس کو قدرِ استعمال دیتا ہے۔ لیکن کارآمد ہونے کی خصوصیت کوئی الگ شئے نہیں ہے یہ جنس کی خصوصیات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان خصوصیات سے الگ کارآمد ہونے کی خصوصیت کا وجود نہیں ہوتا۔ لوہا، گیہوں، ہیرا قدرِ استعمال رکھتے ہیں بحیثیت ہیرا ہونے کے جو اس پتھر میں خصوصیات ہیں اُن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہ اس ہیرے کے حاصل کرنے میں کتنی محنت صرف ہوئی" (اگر ایک ہیرا بہت محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے اور دوسرا آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے تو ان دونوں کی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں ہوگا)۔ نمبر ۳ صفحہ ۶۔ "قدرِ استعمال کے اعتبار سے جنس صرف کسی خاص نوعیت کی ہوتی ہے۔ قدرِ تبادلہ کے اعتبار سے اس میں صرف مقدار کا فرق ہوتا ہے کیونکہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے اس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی" یہ عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ دار۔ روٹی۔ قہوہ۔ ناج دریا بُرد کرتے ہیں یا جلاتے رہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کو ان جنسوں کی قدرِ استعمال سے سروکار نہیں۔ بلکہ ان کا مطمحِ نظر قدرِ تبادلہ ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں ہر جنس قدرِ تبادلہ یعنی مقدار کے اعتبار سے دیکھی جاتی ہے اور نفع کمانا مقصدِ حیات ہے۔ یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ نفع قدرِ استعمال پیدا کرنے سے ہوتا ہے لیکن قدرِ استعمال پیدا کرنا سرمایہ دارانہ سماج کا مقصدِ حیات نہیں ہوتا۔ جب سرمایہ داروں کو قدرِ استعمال کے تباہ کرنے سے قدرِ تبادلہ ملتی ہے تو وہ اس کے تباہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس مثال سے کارل مارکس کا مندرجۂ بالا اقتباس صاف ہوگیا کہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نظر سے جنس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی۔ مارکس کہتا ہے جنس میں بیک وقت۔ قدرِ استعمال۔ قدرِ تبادلہ اور قدرِ اصل ہوتی ہیں لیکن سماج یہ کرسکتی ہے کہ جنس کو کسی ایک قدر کے نقطۂ نظر سے دیکھے جب مارکس یہ کہتا ہے کہ قدرِ تبادلہ کے نقطۂ نگاہ سے جنس میں قدرِ استعمال نہیں ہوتی تو اس کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو سماج جنس کی قدرِ تبادلہ دیکھتی ہے جیسی سرمایہ دارانہ سماج، تو اُس کے لئے جنس میں قدرِ استعمال کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس کا مطمحِ نظر مقدار اور نفع ہے نہ کہ استعمالِ جنس۔ اب پروفیسر کول کی کتاب سے اقتباسات دئیے جاتے ہیں۔

کول صاحب۔ "قیمت اور دام" کے باب میں صفحہ ۲۱۳ پر ایک سوال فرماتے ہیں اور صفحہ ۲۱۴ اور ۲۱۵ پر اِس کا خود جواب دیتے ہیں۔ سوال و جواب حسب ذیل ہیں۔

سوال "جب کارل مارکس یہ کہتا ہے کہ انسانی محنت کسی قدرتی شے میں قدر پیدا کرتی ہے تو اُس کا اشارہ قدر تبادلہ کی طرف ہوتا ہے یا قدر استعمال کی طرف"؟

جواب "اِنسانی محنت جو قدر، قدرتی اشیا میں پیدا کرتی ہے وہ حقیقت میں قدر استعمال ہوتی ہے نہ کہ قدر تبادلہ، لیکن زمانۂ حال کے ماہرین اقتصادیات کا یہ دعویٰ درست ہے کہ قدر استعمال اور قدر تبادلہ دونوں کو مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں"

پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ قدر استعمال اور قدر تبادلہ دونوں کو مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں مہمل سی بات ہے۔ مارکس کے نزدیک قدر استعمال جب صرف مقدار کے نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہے تو قدر تبادلہ کہلاتی ہے۔ قدر تبادلہ تو سرمایہ داری کا نتیجہ ہے۔ یہ قدر جنس کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ رسد اور مانگ کی کشمکش اس کو پیدا کرتی اور گھٹاتی بڑھاتی رہتی ہے۔ اگر سرمایہ داری ختم ہو جائے تو قدر تبادلہ بھی ختم ہو جائے گی اور جنسوں کا تبادلہ قدر اصل کے بموجب ہوگا لیکن قدر استعمال اور قدر اصل جنس سے کبھی بھی جُدا نہیں ہو سکتے۔ پھر پروفیسر کول صفحہ ۲۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک قدر تبادلہ = قدر اصل

مارکس کے نزدیک دونوں الگ الگ ہیں۔ البتہ قدر تبادلہ قدر اصل کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے "قیمت اور دام" کے باب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنس کی قدر اصل۔ قدر تبادلہ اور قدر استعمال میں برابر خلط ملط کرتے رہتے ہیں۔

مارکس کے اِس نظریّہ کے متعلق کہ سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے۔ ماہر مزدور کی محنت اناڑی مزدور کی محنت میں منتقل کر کے ناپی جاتی ہے۔

کول صاحب صفحہ ۲۲۳ پر فرماتے ہیں۔ "یہ نظریّہ مجھے جچتا نہیں یہ اُسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ تمام انسانی مہارت اور پیداوار کی طاقت مرضی کے مطابق ضرورت کے وقت پیدا کی جا سکے۔ یہ نظریّہ جہاں تک ماہر مزدور کی محنت کو اناڑی مزدور کی محنت سے ناپنے کا تعلق ہے وہاں تک تو درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں اناڑی مزدور کی محنت سے ایک غیر معمولی انسان کی محنت کو ناپنے کا تعلق ہے وہاں یہ نظریہ منطبق نہیں ہو سکتا۔ میرا گمان ہے کہ اگر مارکس زندہ ہوتا تو مان لیتا کہ اس کا نظریّہ یہاں درست نہیں اُترتا"

کول صاحب فرماتے ہیں کہ ایک غیر معمولی انسان کی قدر کی بابت یہ کہہ دینا کہ اِس کی قدر سو اناڑی مزدوروں کی قدر کے برابر ہے، غلط ہوگا۔ کیونکہ غیر معمولیت کسی شکل میں بھی اناڑی مزدور کی محنت سے نہیں ناپی جا سکتی۔ مارکس کے نزدیک اس غیر معمولیت کی کوئی قیمت نہیں وہ تو قدرت کی طرف سے مفت کا عطیّہ ہے۔ اگر کول صاحب غیر معمولی دماغ کے انسان ہیں تو یہ قدرت کی طرف سے اُن کو مفت کا عطیّہ ہے۔ وہ غیر معمولیت اُن کی ذاتی محنت کا نتیجہ نہیں اس لئے اس کی کوئی قیمت نہیں اور نہ کول صاحب کو حق ہے کہ جو شے اُنھیں مفت عطا ہوئی ہو اور جس کی کوئی قیمت نہ ہو اُس کا معاوضہ دوسروں سے وصول کریں۔ یہ پروفیسر صاحب خود مانتے ہیں کہ کسی شے پر قبضہ ہونا اس میں قدر پیدا نہیں کرتا۔ کسی جنس پر قبضہ ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں اُس کی قدر میں فرق نہیں پڑتا۔ پروفیسر صاحب کا اپنے دماغ پر قبضہ اس میں قدر پیدا نہیں کرتا۔ اُن کے دماغ میں جو کچھ قدر ہے وہ قدرت کا عطیّہ ہے اور مفت ہے۔ البتہ اگر اُنھوں نے ذاتی محنت سے استطاعت بڑھائی ہے تو اس میں قدر ہے کیونکہ وہ محنت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک پروفیسر صاحب کے دماغ کی تیزی اُن کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے وہاں تک اس میں قدر اصل ہے اور جہاں تک وہ تیزی قدرت کا عطیّہ ہے وہاں اُن کے دماغ کی صرف قدر استعمال ہے۔ پروفیسر صاحب کو یہ کھٹکا معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے ([illegible]) کی بجائے natural endowment of mind کہا ہے کیونکہ اگر natural endow-ment of mind کہدیتے تو ظاہر ہو جاتا کہ غیر معمولیت قدرت کی طرف سے مفت کا عطیّہ ہے۔

مندرجۂ بالا اعتراضات کرنے کے بعد پروفیسر صاحب خود قیمت کا نظریّہ پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اُن کے نظریّہ کو مان لینے سے وہ تمام اعتراضات حل ہو جاتے ہیں جو مارکس کے نظریّہ پر وارد ہوتے ہیں۔ اور مارکس کا نظریّہ جس اصول پر قائم ہے اس کو بھی ضرر نہیں پہنچتا۔ پروفیسر صاحب صفحہ ۲۵۰ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "اصولاً اقتصادیات میں قدر قلّت سے پیدا ہوتی ہے قیمتی اشیا وہی ہیں جن کی سماج کو ضرورت زیادہ ہے لیکن اُن کی مقدار محدود ہے۔ اگر وہ بغیر محنت کے دستیاب ہو سکتیں تو لوگ اُن کو بڑی مقدار میں استعمال کرتے"

نہ معلوم پروفیسر صاحب نے کس مصلحت کی بنا پر رسد اور مانگ کی بجائے 'قلّت' اور 'زیادہ ضرورت' کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ پروفیسر صاحب نے

دوسرے الفاظ میں وہی رسد اور مانگ کا نظریہ پیش کر دیا۔

صفحہ ۲۶۱ پر پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں "انسانی محنت جنس میں اس لئے قدر پیدا کرتی ہے کہ انسانی محنت کی قلّت ہے اور پیداوار میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پروفیسر صاحب کے نزدیک انسانی محنت اس لئے قدر پیدا کرتی ہے کہ دنیا میں اُس کی قلّت ہے۔

صفحہ ۲۶۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "کسی جنس کی قلّت عام طور پر انسانی محنت کی قلّت سے پیدا ہوتی ہے اور اس سچّائی کو کہ قلّت قدر پیدا کرتی ہے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ محنت قدر پیدا کرتی ہے اور اُس کو ناپتی ہے۔"

صفحہ ۲۸۵ پر تحریر فرماتے ہیں "کسی جنس کی قلّت اس میں قدر پیدا کرتی ہے۔ قدر معلوم کرنے کے لئے یہ سوال کہ جنس محنت سے پیدا ہوئی ہے یا نہیں غیر متعلّق ہے جنس کی قدر اُس کی قلت ہے اور جنس کی قلّت اُس کی قدر ہے۔"

اِن اقتباسات نے پروفیسر صاحب کے "قدر کا نظریّہ" صاف کر دیا اُن کے نزدیک رسد اور مانگ قدر پیدا کرتے ہیں جس کی رد ہم کر چکے ہیں۔ مختصراً پھر دہرائے دیتے ہیں۔ فقط جنس کی قلّت سے قدر پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ اُس جنس کی مانگ نہ ہو۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اکثر صابن کے بُلبُلے بنانے کی ایک قیمتی مشین کی مثال پیش کی جاتی ہے حالانکہ وہ مشین قلّت سے ہوگی لیکن کوئی اس کے بدلے میں رقم کثیر دینے کو تیار نہ ہوگا۔ فی زمانہ ایسی زود کار مشینیں موجود ہیں جن کا استعمال عام بے روزگاری پیدا کرتی ہے وہ مشینیں مفید بھی ہیں اور اُن کی قلّت بھی ہے لیکن کوئی آدھے دام پر بھی خریدنے کو تیار نہیں۔ پروفیسر صاحب کے ذہن میں یہ اعتراض تھا اس لئے اُنھوں نے قلّت کے ساتھ ایک اور شرط لگا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک دونوں موجود نہ ہوں قدر پیدا نہیں ہوتی یعنی قلّت کے ساتھ اُس جنس کی ضرورت ہونا بھی قدر پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے۔ قلّت یعنی رسد اور انسانی ضرورت یعنی مانگ، پروفیسر صاحب نے وہی رسد اور مانگ کا نظریہ پیش کر دیا۔

ہم قدر تبادلہ کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ رسد اور مانگ تو دو قیمتوں میں نسبت پیدا کرتی ہیں قدر پیدا نہیں کرتیں۔ پروفیسر صاحب کی نگاہ ادھر نہیں گئی کہ ایک شے ایسی بھی ہے جو قلّت کو کثرت میں اور کثرت کو قلّت میں تبدیل کرتی رہتی ہے اور سماج کو اس امر پر مجبور کرتی رہتی ہے کہ جنس کی رسد اور مانگ برابر رکھے۔ وہ سماجی ضروری محنت ہے جو اُس جنس کے بنانے میں عام طور پر صرف ہوتی ہے اور جو جنس کی قدر اصل ہوتی ہے۔ کسی جنس کی قلّت ہوئی یعنی قدر تبادلہ قدر اصل سے زیادہ ہوئی اور قدر اصل نے سماج کو کمپٹیشن پر آمادہ کیا اور رسد اور مانگ کو برابر کر دیا کسی جنس کی افزونی ہوئی اور قدر تبادلہ قدر اصل سے گری اور قدر اصل نے کمپٹیشن غائب کیا اور رسد اور مانگ کو برابر لے آئی۔ وہ شے جو سماج میں کمپٹیشن پیدا کرتی اور مٹاتی ہے۔ رسد اور مانگ میں برابر کی نسبت قائم کرنا چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ جنس اپنی قدر اصل پر فروخت ہو وہ شئے سماجی ضروری محنت اور وقت ہے جو اس جنس کے بنانے میں عام طور پر صرف ہوتا ہے اور وہی محنت اور وقت جنس میں قیمت پیدا کرتے ہیں۔

کمپٹیشن قدر اصل کا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے وہ جنس کی قلّت و کثرت کو ہموار کرتی رہتی ہے۔ رسد زیادہ ہوتے ہی جنس سستی ہو جائے گی۔ کارخانہ دار نفع نہ دیکھ کر جنس بنانا کم کر دیں گے جنس میں کمپٹیشن کم ہو جائے گا اور جنس کی قدر تبادلہ قدر اصل کے برابر ہو جائیگی۔

دوسری شکل لیجئے۔ رسد کی قلّت ہونے سے قدر تبادلہ قدر اصل سے زیادہ ہو جائے گی۔ دوسرے سرمایہ دار نفع دیکھ کر جنس بنانا شروع کر دیں گے۔ اور کمپٹیشن شروع ہو جائے گا کمپٹیشن رسد اور مانگ برابر کر دیگا اور جنس قدر اصل پر فروخت ہوگی۔ قدر اصل حسب ضرورت سماج میں کبھی کمپٹیشن پیدا کر کے اور کبھی اُس کو مٹا کر جنس کی قلّت اور ضرورت (رسد اور مانگ) کو ہموار رکھتی ہے۔

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

فارسی اور اُردو شاعری کا پس منظر

"شاعری" اور "اقتصادی ماحول"

خطبۂ صدارت

آل انڈیا مشاعرہ یو، پی پولیٹیکل کانفرنس متھرا

مُنعقدہ ۲۶ نومبر ۱۹۳۹ء

ساغر نظامی

فارسی اور اردو شاعری کا پس منظر

شاعری اور اقتصادی ماحول

شاعری کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے آج سخت علمی تحلیل کی ضرورت ہے اور بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ تبدیلی کی ضرورت تو محسوس کرتے ہیں مگر مسائل کے جغرافیائی، تمدنی اور اقتصادی پس منظر کو سمجھتے ہیں اور نہ اصلی سبب بتاتے ہیں کہ ادب معاشرت کی پیداوار اور اس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ معاشرت کی نیو ہوتی ہے جغرافیائی اور اقتصادی ماحول پر۔ اور جغرافیائی ماحول ایک حد تک مستقل حیثیت ہے کہیں ہزاروں لاکھوں برس کے بعد کوئی خاص اور نمایاں تبدیلی ظاہر ہوتی ہے اصل چیز اقتصادی ماحول ہے۔ پیداوار کے ذریعے اور تقسیم دولت کے اصول وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ مذہبی سیاسی اور ادبی نظریے پیداوار کے ذریعوں اور دولت کی بانٹ پر مبنی ہیں اسلئے یہی بدلتے رہتے ہیں مصلح اور پیغمبر، ادیب و شاعر، اپنے زمانے (یعنی اقتصادی ماحول) کا نتیجہ، ساختہ پرداختہ اور آواز ہوتا ہے۔

ان مخصوص انسانوں کے پیرو ہمیشہ دعوی کرتے آئے ہیں کہ یہ پیرو ہیں اور انھوں نے انقلاب پیدا کیا۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو سمجھ میں یہی آئے گا کہ ادیب و شاعر انقلاب پیدا نہیں کرتا بلکہ ہر انقلاب اپنے اپنے ادیب و شاعر پیدا کیا کرتا ہے۔ فرانس میں والٹیر اور روسو نے انقلاب پیدا نہیں کیا بلکہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کے اقتصادی ماحول نے والٹیر اور روسو کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ انقلاب کے تسلط اور وسعت کے لئے شاعر اور ادیب بنیادی خدمتیں سرانجام دیتے ہیں اور انقلاب و بیداری شعور و احساس کو جس قدر یہ تیز کرتے ہیں دوسرے طبقے اور ادارے کم کر سکتے ہیں۔ والٹیر اور روسو نے اپنے زمانے کے اقتصادی تبدیلیوں کی بنا پر جو ہیجانات جنتا کے دلوں میں موجزن تھے، ان کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ منظر عام پر پیش کر دیا۔

والٹیر اور روسو نے جو آئینہ تیار کیا جو درپن تیار کیا اس درپن میں اپنی شکل دیکھ کر سماج کو معلوم ہوا کہ اس کا اصلی رنگ و روپ کیا ہے ؟!

اردو شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لوگ بنیادی مسائل سے آنکھ بند کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ عوام اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں اور نہ شاعری کے دلدادہ ان مسائل کا جواب حاصل کر سکتے ہیں جن کے لئے وہ قدرتی طور پر بے چین ہیں۔ آجکل اردو شاعری ماحول کے اثرات سے قطعی ایک مختلف اور ایسی شاعری ہے جس کی ترقی کی تیز رفتاری اس کے اعلیٰ ترین اور سنہری مستقبل کا پتہ دیتی ہے لیکن وہ لوگ جو بزعم خود ہدایت و رہبری کے ذمہ دار ہیں کبھی اس کو قدیم و جدید کہہ کر ٹال دیتے ہیں اور کبھی وطنیا اور انقلابی شاعری کے لیبل لگا کر اس کو مختلف اقسام ثابت کر دیتے ہیں اور وہ سر پھرے جو حال ہی کی پیداوار ہیں کچھ قدرتی طور پر کچھ فطرتاً ماحول اور ان مسائل کو اپنے خیال میں خود حل کر بھی لیتے ہیں مگر وہ حضرات جن کی شاعری کا کاروبار خالص مابعد الطبیعاتی فلسفوں اور خیالات پر چلا کرتا تھا وہ اس نام نہاد ادبی انقلاب کے سرچشمے تک نہیں پہونچتے۔ جب قدیم خیال کے متعفن ذہن اس خوفناک سیلاب کو دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور خوف و نفرت کے ملے جلے جذبات ان کو گھیر لیتے ہیں۔ آخر کار وہ گھبرا کر منہ پھیر لیتے ہیں۔

اور ان تمام ناگواریوں کی اصلی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی مسائل کو ان کی اصلی روشنی میں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ شعر کو جب پرکھا گیا زبان اور عروض کی کسوٹی پر، کبھی اس کی تحلیل و تنقید معاشرتی، اقتصادی، جغرافیائی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے نہیں کی گئی۔

میں محض ایک طالب علم ہوں، پیدا ہونے سے آج شام تک میری ساری زندگی شعر و ادب کے ضبط ہی میں گذری ہے، یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں اسے سمجھا ہرگز نہ سمجھئے، اصل میں یہ بھی ایک کوشش ہے مسائل کے سمجھنے کی اور بس، اردو شاعری فارسی شاعری کی مکمل نقل ہے۔ بحور، اوزان، الفاظ، خیالات، تخیل، جذبات، ساز و سامان، لباس و معاشرت، ماحول، سماجی آفاقی تقاضوں کے لحاظ سے بھی یہ فارسی شاعری کی حیرتناک نقل ہے اور اس درجہ کامیاب کہ بعض جگہ اصل سے بہتر نظر آتی ہے۔

اس کے کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اردو ادب، عربی اور فارسی اُدب پر مبنی ہے جس طرح فارسی اُدب پر اسلام کا اثر ہے اسی طرح اردو اُدب پر بھی اسلام کا اثر ہے، یہاں تک میں اکثر ہندو شعراء کے کلام میں خالص اسلامی تصوف کے مراحل نظم میں پیش کر سکتا ہوں۔ اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلّمہ طور پر جب اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے تو اگر مسلمان شعراء اور ادیبوں کے یہاں ہندو فلسفہ یا ہندو خیالات کی بہتات نہیں ہے تو خود ہندو ادیب اور شاعروں کے کلام میں تو کچھ جھلک انفرادیت کی شکل میں نظر آ جاتی اور اردو ادب و شعر سے یہ معلوم ہو سکتا کہ اس کی جائے پیدائش ہندوستان ہی ہے کوئی دوسرا مقام نہیں۔

میرا خیال ہے کہ فارسی سے اردو ادب کے موثر ہونے کی اصلی وجہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایرانی ہندی ملا جلا کلچر اور خود ان کی جلد فنا ہو جانے والی کمیّت تھی، اگر اکبر کی اولاد حاکمانہ شان کے ساتھ ہندوستان میں کچھ روز زندہ رہتی تو اردو شاعری کا کلچر بالکل ہندی ہوتا۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اردو کے دورِ اوّل قطب شاہی عہد کے شعراء کا کلام موجود ہے اور میر وغیرہ کے یہاں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن محض موضوعاتی اثرات کو بنیادی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اسباب کچھ بھی ہوں اردو شاعری فارسی شاعری کی نقل ہے اور اس وقت تک نقل ہے۔ کیوں ہے اس کے بیّن وجوہ و اسباب ہیں۔ ایران میں آج تک ذرائع پیداوار اور تقسیم دولت میں کوئی معتد بہ انقلاب پیدا نہیں ہوا وہی جاگیرداری نظام جو شاہانِ قبلِ اسلام کے زمانے سے رائج تھا اب تک موجود ہے اور جو تغیرات ہوئے ہیں وہ نہایت سطحی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اسلام نے اقتصادی نظام کو نہیں بدلا نہ سماجی طبقوں میں اسلام کی وجہ سے کوئی خاص الٹ پلٹ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری رودکی و فردوسی سے لے کر قاآنی اور ملک الشعراء بہار تک ایک ہی نہج پر رہی۔ الفاظ، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور طرزِ ادا میں تغیرات ہوتے رہے مگر تخیلات تقریباً بالکل یکساں رہے اور یہ اعتراض خود بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ان شعراء کا کلام فطرت کے عین مطابق نہیں تھا آپ کہیں گے کہ فطرتِ انسانی نہیں بدلتی اس لیے ان کا کلام بھی نہیں بدلا، میں جرأت کے ساتھ عرض کروں گا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔

فطرتِ انسانی میں جتنا جزء فطرتِ حیوانی کا ہے وہ تو ایک حد تک مستقل شے ہے مگر اس کے ظہور کی مختلف اوضاع و اشکال جنھیں تہذیب و تمدّن کہتے ہیں وہ تغیّر پذیر ہیں، مثلاً "عشق" جو جنگلی بکرے گونڈ اور متمدن شاعر تینوں میں "بیالوجیکل نیڈ" ہونے کی وجہ سے مشترک ہے، زمان و مکان کی قید سے ایک حد تک بے نیاز ہے مگر اس کے ظہور کے طریقے ہر زمانے ہر ملک اور ہر طبقے میں مختلف ہیں کیونکہ اس کے اظہار کی صورت اقتصادی ماحول پر مبنی ہے مستقل طور پر نہ بدلنے والی انسانی فطرت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

ایران میں اقتصادی انقلاب نہیں ہوئے اس لئے نہ جذبات کے ظہور کی صورتیں بدلیں، نہ دنیا اور زندگی کو دیکھنے کا زاویۂ نظر بدلا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام فارسی ادب میں تکلیف دہ یکسانیت ہے۔ تنوّع اور رنگا رنگی کا فطری تقاضا تھا کہ جہاں درباری شعراء کی فارسی شاعری میں بہتات تھی کوئی ایک شاعر باغی بھی پیدا ہوتا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ فارسی شاعری کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی ایک باغی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے؟ یہ یاد رہے کہ موجودہ زمانے کے وہ شعراء مستثنیٰ ہیں جنھیں انقلابِ سُرخ کی اسپرٹ نے پیدا کیا، کیونکہ وہ تو روس کے اقتصادی ماحول کی پیداوار ہیں نہ کہ ایران کے جاگیردارانہ ماحول کی مخلوق۔ اصل میں لوگ یہ سمجھنے کی بالکل زحمت نہیں فرماتے کہ فارسی شاعری جاگیرداری نظامِ تمدّن کی پیداوار ہے۔ شعراء سب کے سب درباری، ان کی شاعری کا تمام

نظامِ تخیلات شاہ و رعایا کے باہمی ربط کا مرقع ہے، مسلّماتِ شعر (Poetical Convention) کا ایک ایک کرکے دیکھنا اور ان پر تنقید کرنا اپنی جگہ خود ایک موضوع ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر تخیل شاہ و رعایا کے تخیل پر مبنی ہے۔ مثلاً غزل کا معشوق مطلق العنان، متلوّن المزاج جفا جو شہنشاہ کی طرح ہو اور عاشق وفا شعار، خود کو مٹا دینے والی، ظلم سہنے والی رعایا کی مانند۔ اسی طرح عاشقانہ شاعری کے دوسرے تمام تخیلات ہیں جو درباری شعرا نے رائج کئے

افسوس کہ وقت نہیں ملا، اور وقت نہیں ہے ورنہ تاریخی طور پر اس موقع پر رودکی اور فردوسی کے عہد کے اقتصادی ماحول کی تصویر کھینچی جاتی تو بہت سی باتیں سامنے آجاتیں۔ مگر اس میں کیا شک ہے کہ صوفیانہ شاعری ایرانی عوام کی اقتصادی گراوٹ کی آواز تھی اور اخلاقی شاعری درمیانی طبقے کے اخلاق کی منظم شکل۔ اس موقع پر شیخ سعدی کی اخلاقی تعلیم کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی ثابت ہو جائے کہ یہ تعلیم بھی دنیا کی تمام مڈل کلاس مورلیٹی (Middle class morality) کی طرح سخت رجعت پسندانہ اور زمانہ سازی پر مبنی تھی۔

ایران کی طرح ہندوستان میں بھی اب تک کوئی انقلاب انگیز اقتصادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ خلجیوں سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک نہ کوئی اقتصادی انقلاب ہوا اور نہ کوئی ایسا سیاسی انقلاب جو سماج کے طبقات میں الٹ پلٹ کر دیتا اس لئے خسرو سے غالب تک کی شاعری کے تخیلات اور رجحانات میں کوئی تغیر نہ ہو سکا۔ فارسی شاعری کی تقلید اردو میں اب تک رائج ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی اور اردو دونوں کے پس منظر میں جو اقتصادی ماحول ہے وہ ایک ہی ہے۔

اردو میں بھی فارسی شاعری کی طرح درباری شعراء، صوفی شعراء، اور اخلاقی شعراء ہیں اور وہی ان کے مسلّمات شاعری ہیں جو فارسی والوں کے تھے اور بعینہ وہی ان کا زاویۂ نگاہ ہے۔ مگر نہایت تعجب کی بات ہے کہ ایران سے لے کر ہندوستان تک کے لمبے چوڑے رقبہ میں زمانے کی ریتی رواج کے قطعی خلاف نظیر اکبر آبادی پیدا ہوا جو بڑی حد تک جنتا کا شاعر تھا جس کی شاعری عوام کی شاعری اور جس کی بولی جنتا کی بولی کہی جا سکتی ہے۔ نظیر آبادی کو جنتا عوام کی شاعری کی کسوٹی پر کسئے وہ خالص کندن ثابت ہوتا ہے۔

۳۰

حالی اور آزاد اور اس کے بعد تمام اردو کے جدید شاعروں کی شاعری کا راج محل نظیر کی رکھی ہوئی بنیاد پر چنا گیا ہے ہاں اس کی بولی اپنی اصلی صورت میں نہ رہ سکی اور رہنی بھی نہیں چاہئے تھی۔

ہندوستان میں مشینوں کی آمد کے بعد سے کچھ نئے ذرائع پیداوار و تقسیم سامنے آئے ہیں مگر وہ سارے کے سارے ترقی کی نہایت ابتدائی منزلوں میں ہیں۔ ان کا رواج اتنا نہیں ہے کہ سماج کی تشکیل میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا کر دیں، اب بھی جاگیرداری نظام باقی ہے اس مٹنے والے نظام کا اثر لٹریچر پر موجود ہے اور اردو لٹریچر کی ترقی میں سدّ راہ ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پرانی لکیر کے فقیر جو کسی اقتصادی نظام پیداوار و تقسیم کے ختم ہو جانے پر بھی خود کو بدلنے والے ماحول کے مطابق نہیں بنا سکتے پرانے زمانوں کے خواب دیکھے جاتے ہیں یا زمانے کے دھارے کو پلٹ کر الٹی گنگا بہانی چاہتے ہیں۔ حالی ہوں یا اقبال ٹیگور ہوں یا کوئی اور جو سماج کو آگے بڑھانے کے بجائے ۹ ہزار سال پہلے کے ہندوستان یا کم از کم ۱۳ ½ برس پہلے کے حجاز کی طرف لے جانا چاہتا ہے اسے ہم رجعت پسند نہ کہیں تو بتایئے کیا کہیں!؟

جس زمانے میں ہم سانس لے رہے ہیں اس زمانے کی بیداری کچی نیند کی طرح ہے صبح ہونے سے پہلے ہماری آنکھ کھل گئی ہے۔ جب تک رات کی تاریکی بالکل نہ چھٹ جائے اور نور کا تڑکا نہ ہو جائے ہم چیزوں کو اُن کی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہمارے چہرے دوسروں کو اچھی طرح نظر آسکتے ہیں۔

اس وقت تک جنتا میں سیاسی بیداری نام نہاد اخلاقی فلسفوں کے رستہ پر پھیلائی گئی ہے اس لئے ملک میں بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ نئے شاعر اور ادیب سماج سے پیدا ہو کر سماج اور پرانے ماحول ہی سے باغی ہیں۔ اُن کی بغاوت نہ صرف ملکی آزادی کے لئے جو اجنبی حکومت کے خلاف ایک آتشیں قدم ہے بلکہ وہ سرے سے نقشہ ہی بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے سیاسی انقلاب کے علمبرداروں میں اتحاد ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ اس

ایشیا

انقلابی روح ہی کی پیداوار ہیں جو ہمارے زمانے کے اقتصادی ماحول کے بطن سے پیدا ہوئی ہو۔ لیکن نئی سماج کے جسم کے بہت سے حصّے ابھی کچے ہیں اور وہ اپنے فائدہ کی بات سُننے سے بھی بھڑکتی ہے اِس لئے سماج وادب (لٹریچر) کا مضبوط اقتصادی بندھن نہیں ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ جھونپڑوں کا پجاری سرمایہ داروں کے رنگ محل میں باوجود انقلابی ہونے کے، نظر آتا ہے اور پُرانی سماج سے بغاوت کرنے پر بھی اِس کے ساتھ اپنے رشتہ کو ختم نہیں کرتا جہاں وہ جنتا کے من کی سی کہتا ہے وہاں خواص کے لئے غزل سرائی بھی کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو اس دوعملی سے ادب کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ لٹریچر کی ٹیکنک مکمل طور پر ابھی نہیں بدل سکیں۔ چنانچہ ابھی تک ملک کے انقلابی اور وطن پرست شاعر اور ادیب بنتے ہیں اور انھوں نے پوری طرح جاگیرداری نظامِ تمدّن کے پیدا کئے ہوئے خیالات سے اپنا رشتہ ناتا نہیں توڑا ہے۔ ان کی مثال بالکل اُس مانجھی کی سی ہے جس نے کشتی کو کنارے سے باندھ دیا ہو اور خود چپّو چلا رہا ہو۔

ان انقلابی شاعروں کو بھی کیا دوش دیا جائے۔ ہندوستان میں خود دورِ سرمایہ داری ترقی کی پہلی منزل میں ہو۔ اِس لئے ہماری دیسی زبانوں خاصکر اُردو میں اطمینان و فارغ البالی کا ویسا اَدب پیدا نہیں ہوسکا جیسا کہ انگلستان میں اُنیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہُوا۔

جو کچھ اِس وقت ہوسکا ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ پُرانی اُردو شاعری میں داخلیّت کا عنصر زیادہ تھا اور نئی شاعری میں خارجیّت بڑھی ہوئی ہے پُرانی شاعری روح اور روحانیت اور مابعد الطبیعاتی فلسفوں کی اسیر تھی اور نئی شاعری میں زندگی کے مشاہدہ پر زور دیا جاتا ہے۔ پُرانے اپنی شاعری کے کارواں کو آسمانوں پر لے جاتے تھے اور نئے دیوانے اِسی زمین پر اپنے قافلے کو لے کر چلے جا رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ انقلاب بھی کم نہیں۔

باقی

ساغر

ماحول

سمندر کی موجیں صدف میں گہر پیدا کرتی ہیں اور پھر اپنے ہی تھپیڑوں سے متاعِ صدف کو گُم کر دیتی ہیں، اس سوکھے ہوئے قلبِ دونیم سیپ کو ٹھکراؤ نہیں جو ساحل کے ریت پر موجوں نے ابھی ابھی پھینکا ہے۔

نامہذّب اور غیر تعلیم یافتہ خاندان، بے عمل اور غافل قومیں، اور مردُم ناشناس سماج، سمندر کی اندھی اور بے شعور موجوں سے زیادہ خطرناک ہے، جو ذہین و خلاّق انسان کی متاعِ دماغی کو اپنے سلوک سے برباد کر دیتی ہے۔

ماحول ہی اپنی ضرورت کی بنا پر جوہر قابل کو پیدا کرتا ہے اور ماحول کی ناسازگاری ہی اُسے ضائع کر دیتی ہے

ساغر

۱۳۲

ڈکنس کی ناول نگاری

انگریزی ادب میں تاریخی ناول نویسی کی داغ بیل والٹر اسکاٹ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، لیکن اس مخصوص صنف کو معراج کمال پر پہونچانے کے حقیقی ذمہ دار ڈکنس اور تھیکرے ہیں۔ اُنیسویں صدی کے آخری نصف دَور میں اِن دونوں نے وہ لازوال شہرت حاصل کی کہ افسانہ نگاری کے بادشاہ سمجھے گئے۔ ہرچند اُن کی تصانیف اب پُرانی ہو چکی ہیں مگر آج تک اُن میں ایک کیف ہے اور صاحبانِ ذوق کی دلچسپی میں ہنوز کوئی کمی نہیں آئی۔

اگر آپ کسی زبان کے ادب کا تجزیہ کریں تو ہمیشہ ایک دور کی خصوصیات کو دوسرے دَور کی خصوصیات سے ممیّز پائیں گے۔ چنانچہ یہ تبدیلیاں انگریزی ادب میں بھی آپ کو نظر آئیں گی۔ پھر رجحانِ طبیعت کا یہ تغیّر نہ صرف نثر نویسی ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے بلکہ نظم بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں رہتی۔ عہدِ شکسپیر کے ادب کا مطالعہ کیجئے تو اُس زمانے کی نظم و نثر دونوں میں ایک رومانی لہر جاری و ساری پائیں گے "سترھویں صدی کا ادب" بالخصوص ملٹن کی تحریریں ایک گہری مذہبی بیداری کا پتہ دیتی ہیں؛ اٹھارھویں صدی کا تمام تر ادب حقائق کی جستجو اور اُن کو بے نقاب کرنے کی ایک مستقل کوشش ہے۔ چنانچہ پوپ کی نظموں کے اکثر و بیشتر موضوعات خشک اور فلسفیانہ ہیں لیکن جیسا کہ انسانی فطرت ہے، طبائع ٹھوس اور خشک چیزوں سے اِبا کرتی ہیں اور رومانی و افسانوی رنگ کی طرف مائل رہتی ہیں اس صدی کے اواخر ہی میں رومانی عناصر انگریزی ادب میں پھر داخل ہونے لگے۔ کولنس، گرے اور برنز وغیرہ کی نظموں میں عشقیہ جذبات کی ترجمانی اکثر نظر آتی ہے۔ پھر اُنیسویں صدی کا پہلا نصف حصّہ تو "عہدِ احیائے رومان" (Romantic Revival Period) کہلاتا ہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس زمانے کا ادب ببانگِ دُہل یہ کہتا ہوا سُنائی دیتا ہے کہ پوپ اور اُس کے ہم عصروں کی یہ کوشش کہ ادب سے رومانیت کا عنصر خارج کر دیا جائے سراسر خیالِ خام ثابت ہوئی اور کیفیت یہ ہوئی کہ ؎

دل میں پھر گریہ نے طوفان اٹھایا غالبؔ   آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

یہی سبب ہے کہ شیلےؔ، کیٹس، بائرنؔ اور ورڈسورتھ کی جس نظم کو اُٹھا کر دیکھئے اس میں عشقیہ جذبات کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے لیکن تغیّر فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اِسی صدی کے دوسرے حصّہ میں پھر ردِّ عمل شروع ہوا اور ادیبوں اور شعرا کی توجہ پھر سیاسی، فلسفیانہ، خشک اور ادق مضامین پر مرکوز ہو گئی۔ اگرچہ اس مرتبہ رومانیت بالکل مفقود نہ ہو سکی، تاہم کوشش یہی رہی کہ جو کچھ لکھا جائے وہ صرف دل بہلانے کے لئے نہ لکھا جائے بلکہ اِس عہد کی سوسائٹی کی صحیح تصویر ہونی چاہیئے۔

اُنیسویں صدی کا یہ آخری نصف دور واقعیّت (Realism) کا زمانہ ہے۔ چنانچہ پہلے دَور میں اسکاٹ اور جین آسٹن جیسے ناول نگار پیدا ہوئے جنہوں نے رومانی عناصر کو اپنی تحریرات سے خارج نہیں کیا۔ دوسرے دَور میں ڈکنس اور تھیکرے جیسے لوگ بروئے کار آئے جن کی تصنیفات میں رومان کم ہے اور حقیقت زیادہ، چنانچہ اِن دونوں کے تاریخی ناولوں میں عہدِ وسطیٰ (Middle Ages) کا ذکر بہت کم ہے۔ ڈکنس نے اپنے دونوں ناولوں بارنبی راج (Barnaby Rudge) اور اے ٹیل آف ٹو سٹیز (A Tale of Twocities) میں صرف اُس عہد کی تصویر کشی کی ہے جو اس کے اپنے زمانے سے کچھ ہی قبل کا زمانہ تھا۔ اِسی طرح تھیکرے نے اپنے ناول ہنری اسمینڈ (Henry Esmond) میں جو تصاویر پیش کی ہیں ان کا تعلق عہدِ وسطیٰ سے محض نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہرچند اس ناول میں کچھ رومانی عناصر ضرور نظر آتے ہیں مگر بہت کم، اور اسکاٹ یا اس کے ہم عصروں سے قطعاً مختلف انداز میں۔

ایشیا

ڈکنس کے متعلق یہ دعویٰ کہ وہ فطرت ہی کی طرف سے ناول نگار کا دل ودماغ لے کر آیا تھا کچھ بے جا نہیں۔ شروع ہی سے وہ ہر چیز پر غور کرنے اور اس کی تہ تک پہونچنے کا عادی تھا۔ چنانچہ اپنے لڑکپن میں اور عنفوانِ شباب میں جو کچھ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو تجربات اس کو دنیا کے متعلق ہوئے اُن سب کو اُس نے اپنے دماغ میں ایک مدّت مدید تک محفوظ رکھا اور بعد ازاں اس کے یہی تجربات ومشاہدات اس کی تصانیف کے لئے مواد بہم پہونچانے میں معین مددگار رہے۔

اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ اسکاٹ کی اسلوب نگارش سے متاثر نظر آتا ہے۔ مگر اسمالٹ (Smollet) کا اثر اس کے دماغ پر بڑی طرح حاوی ہے۔ جس طرح تھیکرے، فیلڈنگ سے متاثر معلوم ہوتا ہے، ڈکنس بھی اسی طرح اسمالٹ سے شدید طور سے وابستہ ہے۔ لیکن یہ کہنا صریحًا غلط ہوگا کہ اس کے پکوک پیپرز (Pickwick Papers) ان متذکرہ بالا حضرات کے رہین منّت ہیں۔ بلکہ یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ اپنی اس تصنیف کے لئے ڈکنس کو جارج کالمین سے بہت کچھ مدد ملی۔ کیونکہ لندن کے کوچوں کی زندگی، وہاں کے مناظر، آوازیں، اور دوسرے معمولی واقعات کو اَدَب میں ایک مستقل جگہ دینے کا انداز اُس نے اسی سے سیکھا۔ اُس کو محض ایک تحریک کی ضرورت تھی کیونکہ اس قسم کے مشاہدات سے اُس کا دماغ لبریز تھا اور میرا خیال ہے کہ لکھتے وقت اس کو بجائے مواد کی کمی کی دقّت کے انتخاب مواد میں زیادہ کاوش کرنی پڑتی ہوگی۔ مواد کی کثرت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں بہت سے ایسے کردار ٹھونس دیتا ہے جن کا اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جو خواہ مخواہ قصہ میں یکایک آموجود ہوتے ہیں اور یکایک غایب ہوجاتے ہیں۔ بہرحال باوجود اسمالٹ، کالمین، ایگن اور ہک وغیرہ کی امداد کے یہ ایک واقعہ ہے کہ ڈکنس کی طرح بہت کم مصنف تخلیقی (Original) ہوتے ہیں، ایک آدھ فقرہ یہاں سے لے لیا، ایک آدھ واقعہ وہاں سے لے لیا، ایک بات یہاں سے لی، ایک بات وہاں سے ـــــ یہ ضرور اُس نے کیا۔ لیکن جو نتایج وہ اپنی کہانیوں سے نکالتا ہے وہ یقینًا اس کے اپنے ذاتی ہیں جس کے ذمّہ دار زیادہ تر اُسکے خود تجربات ومشاہدات ہیں۔ اس کی تصانیف کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ اس کی یادداشت قابل رشک تھی۔ اس کی نظر گہری اور نفسیات کو سمجھنے کی قوت لاجواب۔ نہ صرف یہ کہ اس میں یہ تمام اہلیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں بلکہ اس کی یہ قوتیں قبل از وقت بروئے کار آگئی تھیں۔

یہ امر کہ ڈکنس کے افسانوں کی بنیاد اُس کے ذاتی تجربات پر قائم ہے، دو باتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اوّلًا یہ کہ وہ جو افسانہ لکھتا ہے، لندن شہر سے متعلق ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے قصص میں صرف نیچے درجہ۔ ۔ ۔ ۔ کے لوگوں کی زندگی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے ذاتی مشاہدات صرف لندن شہر اور نیچے طبقے کے لوگوں تک محدود ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اس سے ذرا کچھ آگے بڑھتا بھی ہے تو متوسط طبقے کے لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ امراء اور روساء کی زندگی ہرگز اس نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی وہ کبھی کبھی دیہاتی زندگی کا بھی ذکر کردیتا ہے۔ مگر لندن کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک خاص خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پکوک پیپرز کے تمام کردار لندن کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ جتنے فقیروں، بدمعاشوں، آوارہ گردوں اور جادوگروں کا ذکر اس کی مختلف تصانیف میں ملتا ہے اُن سب کی پوشش اور طرزِ گفتار وغیرہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اُس کے اکثر کردار شہر سے باہر گاؤں اور پہاڑوں میں رہتے ہوئے ملتے ہیں مگر ان سے تمام حرکات شہریوں کی سی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ڈکنس لندن میں پیدا نہ ہوا تھا، لیکن ایک عرصۂ دراز تک وہاں رہنے کی وجہ سے لندن بجا طور پر اس کا مرز بوم ہونے پر فخر کرسکتا ہے۔ ڈکنس نہ صرف لندن طبقہ کی سوسائٹی سے اچھی طرح واقف تھا بلکہ وہ وہاں کی پیشہ ورانہ زندگی سے بھی خوب باخبر تھا۔ اس کے سب ناول اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ لندن کے کوچے کوچے سے واقف ہے اور وہاں کی مختلف تجارتوں کا حال جانتا ہے۔ سوداگر پیشہ لوگوں کی زندگی کا معمولی سے معمولی واقعہ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ غرض اس کی یہی واقفیت ہے جس سے اپنی کتابوں میں وہ مسالہ جمع کرتا ہے اور چونکہ (Pickwick Papers) میں وہ اپنے ان چشم دید واقعات کو جوں کا توں صفحۂ قرطاس پر منتقل کردیتا ہے اسلئے جو کامیابی اس کو اپنی اس تصنیف میں ہوئی وہ دوبارہ اُسے نصیب نہ ہوئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ڈکنس محض ادنیٰ اور متوسط طبقہ کی زندگی سے واقف ہے یہ اعتراض ایک حد تک بجا ہے کہ اس کو کسی امیر و شریف گھرانے

کے آدمی کے کردار پیش کرنے میں شاذونادر ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے اُس کے بہت سے ایسے غریب کردار ہیں جن میں شریفانہ عادات پائی جاتی ہیں مگر جب کبھی وہ کسی اعلےٰ خاندان کے فرد کی تصویر کھینچتا ہے تو ناکام رہتا ہے۔ آخری زمانے میں ضرور ایک آدھ ایسا کردار پیش کرنے میں اُسے کامیابی ہو گئی جیسا کہ سڈنی کارٹن کے کردار میں ہوا ہے۔ لیکن یہ کامیابی محض اتفاقی سمجھنی چاہئے وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے تخیل سے کردار پیش کرنے میں بہت کم مدد لیتا ہے اور اپنے قلم کو صرف انھیں تصویروں میں مصروف کار رکھتا ہے جو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اسی بنا پر ڈکنس کے ناولوں میں جتنے کردار نظر آتے ہیں وہ سب ایسے ہیں جن میں برائی زیادہ اور خوبیاں کم ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کرداروں کی بُری حرکات دیکھتے دیکھتے طبیعت میں ایک تنفر سا پیدا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ پکوک پیپرز میں اکثر جگہ افسانے کی بے ترتیبی نظر آتی ہے لیکن یہ تصنیف اس کثرت سے فروخت ہوئی کہ مصنّف اور ناشر دونوں اس کی کامیابی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ زیادہ فروخت ہونے کا یہ سبب تھا کہ تصنیف عمدہ تھی اور جس موضوع پر لکھی گئی تھی وہ بالکل نیا تھا۔ پھر مصنف کی ذہانت نے کتاب میں ایسے کردار پیش کر لئے جو باوجود کم علم ہونے کے حاضر جوابی میں طاق ہیں اس کے علاوہ جب مصنّف کا اشہبِ قلم ظرافت کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کشتِ زعفران میں پہونچ گیا اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں، غرض یہ کہ کتاب ہر طبقے میں پسند کی گئی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ افسانے نہ صرف عمدہ تھے بلکہ ان کے موضوع کو ایک حد تک جدّت آفریں کیا جا سکتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ شہری زندگی کی تصویریں ڈکنس کے پیشرو مصنّفین کھینچ چکے تھے، مثلاً شکسپیر نے ڈراموں میں اور ہومر نے رزمیہ نظموں میں اکثر اس قسم کی زندگی کے مختلف پہلو دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اصل چیز اندازِ بیان ہے، ہر شخص کا اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے مگر چونکہ ڈکنس نے وہ اندازِ بیان اختیار کیا جو اپنے ماسبق مصنّفین سے مختلف تھا، اس کی جدّت آفرینی کو سب نے پسند کیا۔ اور باوجود ایگن، کالمن اور ہوکر کی سابق کوششوں کے ڈکنس ہی کو لندنی زندگی کے افسانوں کا باوا آدم تسلیم کیا گیا۔

برخلاف اسکاٹ کے ڈکنس حقیقت نگار مصنّف ہے کیونکہ اس کے یہاں پرانے قصّے بالکل مفقود ہیں وہ صرف انھیں چیزوں کو لیتا ہے جو اپنی روزانہ زندگی میں دیکھتا ہے اور جن کے متعلق اس کی واقفیت لاجواب ہے لیکن اس کو حقیقی معنوں میں واقعیت نگار نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس کے افسانے محض خشک اور ٹھوس حقیقتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں لندن کی گلیوں کے دلچسپ واقعات فسانوی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں۔ اسکاٹ کے زمانے میں افسانہ نگار اپنا موضوع اعلیٰ طبقہ کی زندگی کو بناتا تھا۔ پرانے زمانے کی تصویر کھینچتا تھا اور ایسے قصّے گھڑتا تھا جن کو پڑھ کر ناظرین کی عقل دنگ رہ جائے۔ مگر ڈکنس کے زمانے میں اس کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا اسی لئے حقیقت نگار ناول نویس گلیوں کی گندگی، غریبوں کی تکالیف اور آوارہ منش لوگوں کی بداطواری کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے جس سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ وہ بسا اوقات بھول جاتا ہے کہ دنیا میں بُرائی کے علاوہ بھی اور کوئی چیز ہے جس کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور اسی وجہ سے وہ حُسن کے مقابلے میں بدصورتی اور نیکی کے مقابلے میں بدی کو زیادہ سچّی حقیقت سمجھتا ہے۔ لیکن ڈکنس ایسا نہیں کرتا، وہ ہزار بدصورت لوگوں میں سے ایک خوبصورت انسان نکال لانے کی کوشش کرتا ہے اور لاتعداد بداطوار لوگوں میں سے ایک آدمی ایسا ضرور پیدا کر دیتا ہے جو نیکی کی مثال قائم کر سکے۔ اگرچہ بعض اوقات اس کے کردار سراسر بُرائی کے مجسّمے ہوتے ہیں لیکن شاید یہ اس وجہ سے کہ وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا تھا کہ اس کے عہد میں جو ردِّ عمل احیائے رومان کے خلاف شروع ہوا تھا وہ کہاں تک جاری رکھنا مناسب ہے۔

بڑے بڑے تخیلی مصنّفین کی طرح ڈکنس بھی کسی ایک اصول کی پابندی نہیں کر سکتا، چنانچہ اپنی تحریرات کے ذریعہ جب اُس نے مدارس، تعلیم، سرکاری دفاتر اور سوسائٹی کے عام اخلاق کی اصلاح کرنے کا بیڑا اُٹھایا تو اس سے بدترین غلطیاں ظہور میں آئیں۔ اس زمانے سے قبل اس کی رہبری اس کی ظرافت کرتی تھی وہ جو کچھ لکھتا تھا ایسی بات لکھتا تھا جس کا ظرافت کے پیرایہ میں اثر ہونا ممکن ہو لیکن بعد ازاں اس کا معیارِ انتخاب زیادہ تر اپنے مقصد کی بلند آہنگی پر مبنی ہو گیا تھا اور چونکہ یہ اصول کوئی فنّی اصول نہ تھا اس لئے اُس سے بہت سی غلطیاں کرائیں مگر ان کمزوریوں کے باوجود وہ لندن کی گلیوں کا بہترین افسانہ نگار ہے اس کی تمام تر تصاویر حقیقی انسانوں کی تصویریں ہیں، ایسے انسان جن سے اُس کو اکثر سابقہ پڑا ہے — لیکن ان تصاویر میں جان فی الحقیقت اس کے تخیل نے ڈالی ہے۔ اس کے تخیل نے پک وک پیپرز کے تمام کرداروں میں ایک تطابق پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً اگر آپ ونکل کردار معمولی انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھیں جسے اپنے کھلاڑی ہونے کا محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے تو وہ کچھ زیادہ دلچسپ کیریکٹر نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن جب مصنّف کے تخیل کی بدولت اس کی ظریفانہ باتوں پر بھی غور کیا جاتا ہے تو یقیناً ایک

قابلِ ستائش کردار نکلتا ہے۔

ڈکنس ہرگز کسی عام حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتا جب تک اپنے تخیّل او ظرافت کی مدد سے اس میں کوئی ایسی بات پیدا نہیں کر لیتا کہ قارئین اس کو پڑھ کر اچھل پڑیں وہ ہمیشہ اپنے کرداروں کو انصاف کی ترازو میں تولتا ہے۔ بدمعاشوں کو بدی کی سزا دیتا ہے اور نیکوں کے اتفاقی نقصان کی اُن کی نیکی کے صلہ میں تلافی کر دیتا ہے۔ مثلاً ٹوئسٹ (Twist) چوروں کے پھندے میں پھنس جانے کے باوجود پھر کسی نہ کسی طرح اپنی اصلی حالت پر پہنچ جاتا ہے، اسی طرح اسمائک (Smike) کے ساتھ اُستاد نے اسکول کے دوسرے بچوں کی طرح جو سختیاں کی تھیں نکل بی (Nickleby) کی بدولت اُن تکالیف کی کچھ نہ کچھ تلافی کر دی جاتی ہے اور اُسے کچھ دنوں آرام سے زندگی گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جس طرح اُردو ادب میں سرشار اپنی ظرافت نگاری میں بے مثل ہے۔ ڈکنس بھی انگریزی زبان میں اپنی ظرافت میں جواب نہیں رکھتا۔ ظرافت آمیز مضامین پیش کرنے میں تو اس کو مہارت تامہ حاصل ہے مگر ظریف کرداروں کی تصویر اور بھی بہتر انداز میں کھینچتا ہے چنانچہ سیم ویلر (Sam Weller) سیری گیمپ (Sairey Gamp) اور مکابر (Micawber) اس کے بہترین کردار ہیں۔ بہرحال جین آسٹن، تھیکرے اور اسٹرن جیسی نزاکت اس کے یہاں ملنی دشوار ہو مگر یہ امر یقینی ہے کہ اس کے افسانوں میں ایک شگفتگی اور تازگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے

لازم و ملزوم

شاعروں کے نزدیک دُنیا کی سب رنگینیوں، راحتوں، اور مسرتوں، پھولوں کی مہکتی ہوئی خوشبوؤں، نغموں کے زیر و بم اور اٹھلاتی ہوئی خوب رو جوانیوں سب کی کشش کی وجہ ہے محبت! اور محبت کی خالق ہے روحانیت!

بے شک محبت کی کارفرمائیاں اتنی ہی جادو اثر اور دلرُبا ہیں جتنی شاعر کے نزدیک، بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر لیکن اس محبت کی محرّک روحانیت نہیں بلکہ کھولتا ہوا سُرخ سُرخ نوجوان خون ہے!

"نوجوان خون" خدا کی اتنی ہی عظیم نعمت ہے اور اتنا ہی متبرک ہے جتنی "شاعر کی روحانیت"! جنسی ترغیبات حدود کے اندر رہیں تو رحمت — دنیا کی سب دلچسپیوں اور دلفریبیوں کی خالق!

حدود سے گذر جائیں تو شیطنت — دُنیا کے سب فتنوں اور سفونتوں کی مسبب الاسباب! نوخیز جنسی نفسیات کی جمال پرستی نہ ہوتی تو عشق کا وجود نہ ہوتا۔ محبت کا ہنگامہ گرم نہ ہوتا۔ یہ ذوق و شوق نہ ہوتا۔ یہ سوز و ساز نہ ہوتا۔ آہوں کے نغمے نہ ہوتے۔ انتظار کی پُرلطف جانکاہیاں نہ ہوتیں۔ بے اعتنائی کے نکھرے نہ ہوتے۔ بے وفائی کی شکایتیں نہ ہوتیں۔ جفاؤں کا رونا نہ ہوتا۔ بدگمانیوں کا طلسم نہ ہوتا۔ اس طلسم کے ٹوٹ ٹوٹ کر جڑنے اور جڑ جڑ کر ٹوٹنے کی کشمکش نہ ہوتیں۔ حسن کی بے پرواہیوں پر بڑی شان سے خود بھی بے پرواہ ہو جانے کی قسمیں کھا کھا کر عشق کا حُسن کی بے اعتنائیوں کی جھٹ توجہیں کر کر کے اپنی قسموں کو یوں خاک میں ملا دینا نہ ہوتا۔ سو سو ناز برداریوں سے، بات بات پر بے وجہ بگڑنے والوں کا یوں منایا جانا نہ ہوتا۔ آرزؤں کی شورش نہ ہوتی بے قراریاں نہ ہوتیں۔ اضطراریاں نہ ہوتیں۔ جنونانہ وار بدتمیزیاں نہ ہوتیں۔ یہ خوشامدیں نہ ہوتیں۔ یہ اطاعتیں نہ ہوتیں۔ یہ عبادتیں نہ ہوتیں۔ یہ سجدہ ریزیاں نہ ہوتیں۔ بہرحال عشق یوں مفتوح نہ ہوتا! بہرکیف حسن یوں فاتح نہ ہوتا! — اور حُسن — حسن کا سکہ بھی یوں رواں نہ ہوتا۔ یہ ناز نہ ہوتے۔ انداز نہ ہوتے۔ تنک مزاجیاں نہ ہوتیں۔ بات بات پر رُوٹھنا نہ ہوتا۔ اٹھکیلیاں نہ ہوتیں۔ یہ شوخی نہ ہوتی۔ شرارت نہ ہوتی۔ بے نیازیاں نہ ہوتیں۔ بے اعتنائیاں نہ ہوتیں۔ نا اُمیدی کے بادلوں سے امیدوں کے سورج کے نکل نکل کر چھپنے اور چھپ چھپ کر نکلنے کا جادو نہ ہوتا۔ دلوں پر حکومت نہ ہوتی۔ خیالوں پر قبضہ نہ ہوتا۔ نگاہوں پر جادو چلانا نہ آتا۔ دماغوں پہ یکبارگی ایسے چھا جانا نہ آتا۔ یہ شان نہ ہوتی۔ یہ شوکت نہ ہوتی۔ یہ سطوت نہ ہوتی۔ یہ عظمت نہ ہوتی۔ نہ ہوتے پجاری نہ یہ بنتا خدا۔!

الغرض حسن یوں فاتح نہ ہوتا! نہ حُسن ہوتا فاتح، نہ عشق ہوتا مفتوح یعنی یہ دنیا رہنے کے قابل نہ ہوتی! اگر گرم خون نہ ہوتا۔

بشیر احمد
ایف۔ایس

جمہوریّت

یہ لفظ جس قدر عام ہوگیا ہے اسی قدر اس کے معنی سمجھنے میں غلطیاں کی جاتی ہیں۔ ہر وہ ادارہ جس میں عام لوگوں کو بولنے یا دخل دینے کی اجازت مل جائے، جمہوری ادارہ کہلائے جانیکا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی ادارہ کو جمہوری تعبیر کرنے سے پہلے یہ معلوم کرلیا جائے کہ اس میں عوام کی رائے کی کیا نوعیت ہے اور مسائل کو فیصل کرنے میں رائے عامّہ کا کس حد تک پاس ولحاظ کیا جاتا ہے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ اس چیز کو بھی تلاش کرنا چاہیئے کہ رائے عامّہ پیدا کرنے میں کن کن ذرائع کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور آیا رائے عامّہ حقیقتاً رائے عامّہ ہے بھی یا محض عوام کے ذہن اور جذبات کو ہنگامی اشتعال سے گرما کر اور سیاسی کم شعوری سے فائدہ حاصل کرکے ان کی تائید حاصل کی جاتی ہے۔

آئے دن ہم یہ مناظر دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک قوم دوسری قوم کا گلا کاٹنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ لاکھوں سپاہی میدان جنگ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کا خون بہانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ غریبوں کی گاڑھی کمائی اور بے پناہ محنت سے پیدا کی ہوئی دولت جنگی سامان پر صرف کی جاتی ہے۔ تو کیا یہ جمہوریّت کے نتائج ہیں؟ کیا برطانی سپاہی کو جرمن سپاہی سے کچھ دُکھ پہونچا ہے جس کا بدلہ لینے کیلئے غریب برطانی سپاہی جنگی مصیبتوں کو جھیلتا ہے۔ فنلینڈ کے عوام نے روس کے عوام کو بے آب ودانہ کیا ہے جس کی پاداش میں فنلینڈ آتش کدہ بنایا جارہا ہے۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ یورپ کی تمام چھوٹی اور کمزور اقوام کیوں لرز رہی ہیں۔ کیا ان کے عوام نے طاقتور قوموں کے عوام کے بیل مارے ہیں جس کی وجہ سے انھیں ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان کی اقتصادی اور سیاسی آزادی سلب کرلی جائیگی۔

اور یہ اقتصادی اور سیاسی آزادی سلب کرنے والے کون لوگ ہیں۔ کوئی بتائے کہ طاقتور اقوام نے کب اور کیوں کر یہ احساس کیا اور کس طرح اور کس نے ان کے اندر یہ خواہش پیدا کرائی یا اپنی برتر قوت کے بل بوتہ پر وہ کمزور اقوام کو کچل ڈالیں۔ خود اپنے ملک کی لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچوں کو یتیم بنائیں اور دوسروں کے لاکھوں گھروں کو بے چراغ کرڈالیں۔ سچ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عوام کو ان باتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ پکّی دلیلوں اور مضبوط شہادتوں کی بناپر یہ حقیقت ثابت کی جاسکتی ہے کہ جنگ اور صلح، قومی پالیسی اور اقتصادی وتجارتی پالیسی میں عوام کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ چند مالدار لوگ پردے کے پیچھے بیٹھ کر سیاسی لوگوں کو کٹ پتلی کی طرح نچاتے ہیں اور سیاسی پیچ کے بچولئے اپنی خطابت اور قومی خدمتوں کی جھوٹی دھاک بٹھاکر عوام کے قومی تصوّرات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان چند مالداروں کے ہاتھوں میں نہ صرف اقتصادی اور تجارتی اداروں کی ہی کنجی ہوتی ہے بلکہ علمی، اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اداروں کو بھی وہ دولت کے ذریعہ اپنی مٹھّی میں رکھتے ہیں۔ یہ ایسی موٹی موٹی باتیں ہیں کہ جنھیں سمجھنے کیلئے کسی مخصوص ذہن اور بصیرت کی ضرورت نہیں، تاہم کتابوں، اخباروں اور تقریروں پر چونکہ چند نفوس کا قبضہ ہوتا ہے اس لئے عوام کو کبھی مذہب کبھی قومیّت اور کبھی رنگ ونسل کے گورکھ دھندوں میں پھانس کر صحیح حالات سے بیخبر کرنے اور عالمگیر جماعتی شعور کو ٹھنڈا رکھنے کیلئے جان توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ ان تمام ننگی حقیقتوں کے باوجود ہر چہار طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے متوالے ہیں، ہماری

آوازِ جمہور کی آواز ہے۔ یہ ہزار ہا جانیں جو توپوں اور بموں کا شکار ہو رہی ہیں عوام کے مفاد کی خاطر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہیں۔ یہ کروڑ ہا روپیہ کی دولت جسے کسان اور مزدور کے قوی ہاتھوں، بھوکے پیٹوں اور بیجز دماغوں نے پیدا کیا ہے۔ انسانی برادری کے بچاؤ کی خاطر سمندروں کی گہرائیوں کے سپرد کی جاتی ہے اور یا زہریلے گیسوں اور توپوں کے دھوؤں میں اُڑادی جاتی ہے۔!!! یہ کیسا عظیم الشان جھوٹ ہے! ایک عامی جب کبھی معمولی سمجھ کی کسوٹی پر ان متضاد حالات کو پرکھتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس کی حالت تو بدستور ایک ننگے اور بھوکے انسان کی سی ہے پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ اسی کے نام پر اور اسی کے بچاؤ کی دُہائی دے کر اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ تو میدان جنگ میں کود پڑ اور اپنے ہی جیسے ننگے، بھوکے انسانوں کا گلا کاٹ ڈال!" کیوں کاٹ ڈال" ؟ مجھ سے اُن کی کیا دشمنی ہے ؟ .... " کوئی دشمنی نہیں اور نہ گلا کاٹنے کا اور کوئی سبب موجود ہے" لیکن فوراً قومیّت کے سریلے نغموں میں آواز آتی ہے " انسانیّت خطرہ میں ہے۔ کمزور قومیں خطرہ میں ہیں۔ جمہوریّت خطرہ میں، قومی وقار اور عزّت خطرہ میں ہے۔ تو بہادر ہے۔ قومی چمن کی آبیاری کیلئے تیرے خون کی ضرورت ہے۔ تاریخ تیرے نام کو سنہری لفظوں میں لکھے گی۔ قوم تیرے کارناموں پر فخر کرے گی" ...... غریب عامی ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ اپنی بہادری اور دلیری پر تو اُسے پورا اعتماد ہے۔ لیکن جب تاریخ کی کہانیوں کو پڑھتا ہے تو کسی جگہ سکندر کا نام ہے کہیں نپولین کا۔ کسی جگہ نلسن اور فولادی ڈیوک پر صفحے کے صفحے رنگے ہوئے ہیں تو کہیں بسمارک، ہٹلر، پٹ، بونزلا، ابراہیم لنکن اور لینن کے قصیدوں سے کتابوں کی کتابیں سیاہ ہو رہی ہیں۔ خود اس کا وجود اور اس وجود کی قدر و قیمت قربانی کے بکرے سے زیادہ نہیں۔ جمہوریت محض ایک سراب ہے اور جمہور کا مفاد صرف دھوکا۔ پیداوار کے جملہ ذریعوں پر جن کا قبضہ ہے اور دولت کی تقسیم پر جن کا حاکمانہ قابو ہے ان کا مفاد حقیقی مفاد اور ان کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ باقی اربوں بھوکے اور ننگے انسان ان کے ملازم اور غلام ہیں۔ ان کی جنبشِ ابرو جنگ و صلح کا فیصلہ کرتی ہے ان کا مفاد امن عالم کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور ان کی مصلحتیں ہی صلح کی فضا پیدا کر سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ کھلے بندوں ہوتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ پھر بھی غریب محنت کش کی محنت اور جان کو قومیّت اور قومی غیرت کے نام پر سستے داموں میں خریدا جاتا ہے اور اُسے تھپکیاں دے دے کر اپنے بھائیوں کے خون بہانے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ کاش جہالت کا پردہ عوام کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائے تو صداقت اپنے پورے قد و قامت کیساتھ سامنے آکھڑی ہو۔ پھر نہ لڑائیاں ہوں نہ خون ریزیاں، نہ تجارتی تفوّق کیلئے منڈیوں کی تلاش ہو اور نہ سیاسی برتری کی خاطر نئی اراضیات کی تگ و دو۔ یہ کھلا ہوا چیلنج ہے کہ عوام کی مرضی پر اگر فیصلہ چھوڑ دیا جائے تو جنگ کے الٹی میٹم ختم ہو جائیں اور دنیا کو آئے دن کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔

بہر طور جمہوریّت کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں اور جان بوجھ کر پیدا کرائی جاتی ہیں اس نے ہر آمرانہ نظام اور ہر سامراجی سلطنت کو جمہوری نظام کے لقب سے پُکارنے کا عادی کر دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا جمہوری نظام انسانی زندگی سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ صداقت ہے کہ انسان اپنی ضروریات کے لحاظ سے جماعتی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ یہ جماعتی زندگی اسلئے ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد ایک دوسرے کی مدد کریں اور زندہ رہنے کے لئے مشترکہ طور پر کھانے پینے، رہنے اور سہنے میں جد وجہد کریں۔ جان و مال کی حفاظت اور اس مشترکہ اقتصادی نظام کی مضبوطی اور بچاؤ کیلئے ایک ایسی طاقت ہونی چاہیئے جو عوام کی مرضی کی نمائندہ ہو اور جس کے ہر شعبہ میں عوام مؤثر طریق پر دخل انداز ہوں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہی جمہوریّت کی تعریف سادہ لفظوں میں یہ کی جاتی ہے کہ جمہوریّت اس سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی سسٹم کو کہتے ہیں۔ جو عوام کا بنایا ہوا ہو، جس کے چلانے میں عوام عملی طور پر شریک ہوں اور جو عوام کے مفاد کیلئے وضع کیا گیا ہو۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حیوانات کی دنیا میں سب سے زیادہ انسان ہی کو منظم جماعتی نظام کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان اپنی

پورا کرنے میں سب سے زیادہ مجبور و معذور ہے اور بغیر اپنے ہم جنسوں کی
امداد کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان چونکہ
حیوان ناطق ہے اس لئے دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں اس
پر عدل و انصاف کے احساس کا بہت زیادہ غلبہ رہتا ہے۔ اس کی
سادہ اور بشری عقل بشرطیکہ وہ لالچ اور حصول قوت کے جذبات
سے مغلوب نہ ہو چکی ہو اُسے اس بات کی طرف رغبت دلاتی رہتی
ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں انصاف سے کام لے۔ اور ظاہر
ہے کہ عدل و انصاف کو قائم کرنا اور قائم رکھنا اور انفرادی بوالہوسی سے
لئے بچانا بغیر ایک طاقت ور جمہوری نظام کے ممکن نہیں۔

جمہوریت کی تعریف اور تعبیر مختلف طریقوں پر کی جاتی ہے
زمانہ حال کے ایک مشہور مصنف "طامس مین" نے اپنی کتاب
"جمہوریت کی فتح" میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔
"میں لفظ جمہوریت کو زیادہ وسیع معنیٰ پہناتا ہوں۔ یہ معنی جمہوریت
کے محض سیاسی مفہوم سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ
ہے کہ میں جمہوریت کا علاقہ اعلیٰ ترین انسانی اوصاف کے ساتھ
قائم کرتا ہوں جنھیں دُنیا کی کوئی طاقت ہلاک نہیں کر سکتی۔ اگر ہم ایک
سیاسی نظام کو دوسرے سیاسی نظام کے مقابلہ میں پرکھیں اور
ہمیں یہ معلوم ہو کہ ایک نظام کو اپنے مخالف نظام پر حقیقی عملی فوقیت
حاصل ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہو جائیگا کہ آخر کار فتح جمہوریت
کی ہوگی۔ لیکن جمہوریت کی ہر وہ تعریف ناکافی ہے جو محض اصطلاحی
سیاسی پہلو تک محدود ہو۔ اس لئے ہمیں اس سے زیادہ بلند ہو کر
جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں کرنی چاہیئے کہ جمہوریت سماج
کی اس شکل کو کہتے ہیں جو ہر بات سے بڑھ کر انسانی "وقار" کے
شعور اور احساس سے سرشار ہو"

اس تعریف کے روحانی پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے
ایک نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کے نام پر جو سیاسی
نظامات پیش کئے جاتے ہیں ان کی فوقیت عملاً خواہ کچھ بھی ہو وہ اس
وقت تک حقیقی جمہوریت کے ضامن نہیں ہو سکتے جب تک انسانی
"وقار" (یعنی عدل و انصاف، آزادی اور صداقت کے اوصاف)
ان کے بنیادی اصول نہ ہوں۔ اس لئے کہ فردی زندگی جماعت
کیلئے اور جماعت کی قوت فرد کی حفاظت کیلئے اس وقت تک صحیح
طور پر استعمال نہیں کی جا سکتی جب تک انسانی قدر و قیمت سوسائٹی
میں ٹھیک ٹھیک نہ سمجھی جائے اور انصاف کے اصول پر اسے
صحیح درجہ حاصل نہ ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں متعدد جمہوری نظامات چلائے جا رہے
ہیں۔ لیکن ان میں سے حقیقتاً ایک بھی اس بات کا مستحق نہیں کہ
اسے صحیح معنوں میں جمہوری نظام کہا جائے۔ بظاہر قانون کی فرمانروائی
ہر ریاست کا بنیادی اصول بتایا جاتا ہے اور قانون میں عدل و
انصاف سب سے زبردست عنصر تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی بنا پر یہ
مقولہ ہر شخص کی زبان پر رواں ہے کہ قانون کی آنکھ سماج کے
تمام افراد کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے لیکن کیا حقیقت میں ایسا
ہوتا بھی ہے۔ قانون کی فرماں روائی انصاف اور مساوات قائم
رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ خود کوئی مقصد نہیں پھر جب ہم یہ دیکھتے
ہیں کہ کسی نظام کو جمہوری نظام بتایا جائے اور اس نظام میں کسی
ریاست کے تمام افراد کیلئے ایک ہی قانون بھی ہو اور اس کے
باوجود سماج اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں میں بٹا ہوا ہو۔ جنگ اور صلح
میں عوام کا درجہ اور ان کی رائے ایک نوکر اور غلام سے زیادہ
وقعت نہ رکھتی ہو تو پھر آنکھیں بند کر کے اور فہم و شعور سے خالی
ہو کر ہی ہم ایسے نظام کو جمہوری نظام کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت میں
تو یہ جمہوری نظام نہیں۔

موجودہ زمانہ کی جمہوریتیں کم و بیش ایک ہی طرز کی ہیں۔ مسٹر
ایچ۔ جی۔ ویلز نے جن کے نام سے غالباً تمام دنیا روشناس ہے
اسی مفہوم کو اپنی ایک کتاب (Fall of Homo Sapuens)
میں واضح کیا ہے اور اگرچہ وہ بطور مثال کے برطانوی جمہوریت کو
پیش کرتے ہیں لیکن حقیقتاً تمام جمہوریتیں اسی وضع قطع کی واقع
ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر ویلز نے جمہوریت کی ایک تعریف بھی
کی ہے جو جمہوریت کے سمجھنے میں کافی مدد دے سکتی ہے۔ وہ
کہتے ہیں:۔

"برطانوی سامراج بنایا نہیں گیا، خود بخود پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک تاجدار عدیدیہ (Crowned Oligarchy) ہے جس نے جمہوریّت کا چولا پہن رکھا ہے۔ یہ سامراج اس بات پر لاف زنی کرتا ہے کہ اس نے پارلیمنٹ کے دو ایوانوں میں سے ایک ایوان کو عام رائے دہندگی کا حق عطا کر دیا ہے گو کہ امر واقعہ یہ ہے کہ عوام النّاس کو ان کی حقیقی رائے کے ظاہر کرنے سے دو طریقوں پر روکا جاتا ہے۔ اول تو آسانی کے ساتھ ہاتھوں میں ناچنے والا ووٹنگ سسٹم، دوسرے پریس جو اشتہار دینے والوں کا غلام ہے۔

"بہت سے انگریز چونکہ یہ باور کرتے ہیں کہ ہمارا نظام ایک جمہوری نظام ہے۔ اور اب ہم جمہوریت کی خاطر جنگ کرنے، مصیبتیں جھیلنے اور اپنی جانوں کو تلف کرنے میں اپنے آپ کو مبتلا پاتے ہیں اس لئے ہمارے لئے مناسب ہے کہ اپنے دل سے سوال کریں کہ آخر صحیح جمہوریت ہے کیا چیز! ایک اوسط درجہ کے آدمی کے نزدیک اس لفظ کے جو معنی ہیں اس کا کچھ کچھ تصوّر اُسے ہے۔ یعنی وہ سمجھتا ہے کہ جمہوریّت کوئی ایسی چیز ہے جس کا آزادی، اور حرّیت سے تعلّق، اور انفرادی خود مختاری اور ملّی حکومتِ خود اختیاری کے حق سے واسطہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ سلطنت فرد کی بہبودی کی خاطر قائم ہے نہ کہ فرد سلطنت کی فلاح کیلئے۔ اس (جمہوریت) میں متعدد منفی خواص ہیں یعنی یہ کہ جمہوریت ایک ایسی چیز ہے جو فاسزم، نازی ازم، کمیونزم اور جنگ کے خلاف ہے۔

"یہ سب کچھ کم و بیش درست سہی، پھر بھی عمل کے اندر اس تصوّر پر حدود قائم کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ کوئی جمہوری ملّت، افراد کی آزادی پر قیود عائد کئے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ کرایہ کی سواری گاڑیوں پر محصول، سڑک پر چلنے کے قواعد، کم سے کم مزدوری کا تعیّن، ایک متعین شرح سود، یہ سب چیزیں انفرادی آزادی پر قیود عائد کرنا ہیں، تاہم دورِ حاضر کی جمہوریت کے لئے ضروری ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی جمہوریّت بغیر مکمل قانونی قیود کے جن کا نفاذ سختی کیساتھ عدالت اور پولیس کے ذریعہ قانون کے ماتحت کرایا جائے، عالمِ وجود میں نہیں آسکتی۔

"اور یہی ایک خاص فرق جمہوریّت اور دوسری طرز کی حکومتوں کے درمیان ہے۔ جمہوریّت کے اندر ہر آدمی اس چیز کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اُس کے لئے کیا کرنا ضروری ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے لیکن کر نہیں سکتا۔ اسے یہ حق ہے کہ اگر کوئی غیر آئینی حکم یا درخواست موصول ہو تو اس پر "لاحول" پڑھ دے۔ جمہوریت میں کوئی امتیازی طبقہ نہیں ہونا چاہیئے جو اپنی پوزیشن یا خاندانی حق کی بنا پر علی الرغم ملّت، جمہوریت پر غلبہ کرلے اور بالخصوص اقتصادی اعتبار سے کوئی امتیازی طبقہ نہیں ہونا چاہیئے جو اپنے روپیہ کی طاقت سے دوسروں کی آزادیوں میں رکاوٹ ڈالے یا ان سے استحصال کرے۔

"ان باتوں کے پیش نظر ہم جمہوریّت کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں:- جمہوریت کے معنی ہیں اقتصادی عدل، اور تمام لوگوں کیلئے خاطر خواہ سامانِ زندگی جو سائنٹفک طریق پیداوار کی وجہ سے وافر مقدار میں موجود ہے!- جمہوریت کے معنی ہیں تمام لوگوں کیلیے ممکن طور پر پوری پوری تعلیم، اور نکتہ چینی اور اظہار خیال کرنے کا بے قید و بند حق!- جمہوریّت کے معنی ہیں ایک مشترک معاشرتی نصب العین کا تصوّر، جس طرح کہ ایک فٹ بال ٹیم گول (Goal) جیتنے کا تصوّر رکھتی ہے۔ جمہوریت کے معنی ہیں ایک مکمل اور متحد پولیس کنٹرول جو اُن ٹولیوں کا انسداد کرے جو نجی ملکیّت کے جاں بہ لب سسٹم کو سہارا دے کر مالی امداد کے ذریعہ اُبھارنے کی آخری کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ ہے وہ جمہوریت جس کی خاطر اس زمین پر بسنے والے ہر ذہین مرد اور عورت کو لڑنا اور مرنا چاہیئے۔ کیا انگلستان میں ایسی جمہوریت موجود ہے؟"

مسٹر ویلز نے جو سوال اخیر میں کیا ہے وہ قریب قریب تمام دنیا کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ کیا فرانس میں ایسی جمہوریت موجود ہے؟ کیا امریکہ، جرمنی، اٹلی، جاپان اور اسپین میں ایسی جمہوریت موجود ہے؟ ظاہر ہے کہ کہیں تاجدارانہ چندسری حکومت ہے کہیں دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی فرماں روائی اور کہیں ڈکٹیٹرشپ،

بادی النظر میں یہ جمہوریتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک طرح کی آمریتیں ہیں، جن کا معاشرتی نصب العین طبقاتی نظام کا قیام، اور جن کا اقتصادی پروگرام، عوام الناس کی محنت کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ جمہوریہ روس اگرچہ داخلی اعتبار سے اقتصادی عدل کو زیادہ سے زیادہ پیمانہ پر چلا رہی ہے۔ لیکن اس کی خارجہ پالیسی اس زمانہ میں آکر وہی شکل اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے جو اس دور کی سرمایہ دار حکومتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

بعض وقت جمہوریت کے مسئلہ پر اچھی خاصی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ بقاء اصلح کے ماننے والے ہر اس نظام کو فطری کہتے ہیں جو مناسب اور طاقتور ہاتھوں میں ہو۔ ان کی سب سے بڑی دلیل واقعات ہیں۔ اور اگر چند لوگ اپنی دماغی یا جسمانی قوت کی بنا پر قوموں پر حکومت کرتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے اس لئے کہ زندہ اور کامیاب وہی ہوتا ہے جو زندہ یا کامیاب ہونیکا اہل رکھتا ہے۔ یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس سے بھی کسی جمہوری نظام کی تردید نہیں ہوتی۔ اگر بقا کا تعلق اصلح سے ہے تو اصلح کسی فرد تک یا کسی مخصوص نظام ہی تک کیوں محدود کیا جائے۔ اسے وسیع کر کے ہر قسم کے سیاسی اور اقتصادی نظاموں پر بھی تو عائد کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں جبکہ عوام الناس اپنے سیاسی اور اقتصادی حقوق سے واقف ہوتے جا رہے ہیں اور انھیں یہ بھی اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ سماج اور ریاست کے بنانے اور قائم رکھنے میں ان کی کیا حیثیت ہے اور اگر وہ چاہیں تو چند لوگوں کے اقتدار اور حاکمیت کو پلک جھپکنے میں ختم کر سکتے ہیں تو اس علم اور وقوف کی موجودگی میں ہر وہ نظام ناممکن العمل ہو جائیگا جو بقاء اصلح کی غلط تعبیر اور غلط تصور کی وجہ سے فطری اور زندہ و پائندہ خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی عوام اپنے علم کی روشنی میں صرف اسی نظام کو پسند کرینگے جو ان کی معیاری زندگی کا محافظ ہو اور ان تمام طریقوں کو فنا کر دیں گے جو اب تک ان کی جہالت کی وجہ سے مقبول ہوتے چلے آئے ہیں۔ جس رفتار سے عوام کے علم میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی رفتار سے قدیم سوسائٹی کی روایتیں اور قوتیں بھی مٹتی جائیں گی اور وہ تمام ناانصافیاں جو قدیم سوسائٹی کی پیداوار تھیں دور ہو جائیں گی۔

یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دور استبداد اب واپس نہیں آئے گا۔ اس زمانہ میں بھی اگر شخصیتیں پوجی جاتی ہیں تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ پرانے بادشاہوں کی طرح طاقتور ہیں بلکہ محض اس لئے کہ بجا یا غلط طور پر انھیں عوام اپنی سیاسی اور اقتصادی دشواریوں کا علاج خیال کرتے ہیں۔ پان یوروپین تحریک (Pan European movement) کا بانی کاؤنٹ کوڈن ہوو کیلرگی (Count Kouden-Houe Galergi) ایک جگہ کہتا ہے "آنے والے زمانے میں فاسسٹ اور جمہوری نظاموں کے درمیان دشمنی اپنی طاقت زائل کرے گی۔ اس لئے کہ گزشتہ دس سال میں آمریت کی تاریخ نے یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مطلق العنانی کی طرف واپسی بالکل ناممکن ہے۔ نیز یہ کہ کوئی بادشاہ یا ڈکٹیٹر اپنے ملک کی رائے عامہ کے خلاف حکومت کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا زوال لازمی ہے۔ فاسسٹ طرز حکومت صرف اس وقت چل سکتا ہے جب تک کہ عوام کی تائید اُسے حاصل رہے گی۔ یعنی یہ کہ وہ پارلیمنٹری طریقہ جمہوریت پر تو حملہ کر سکتا ہے لیکن ریاست کے کاروبار میں عوام کی شرکت کے خلاف نبرد آزما نہیں ہو سکتا"

اس کے معنی کھلے لفظوں میں یہ ہیں کہ قیصری اور سکندری کا دور ختم ہو گیا اور اب شاہی یا شخصی استبداد اور مطلق العنانی کا نظریہ ضمیر عالم کو گمراہ کرنے کے تمام امکانات کو زائل کر چکا ہے اس مرحلہ پر پہونچکر ایک اوسط درجہ کی عقل کا آدمی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ غور کرتا ہے کہ جب پارلیمنٹری نظام یا فاسسٹ نظام بھی عوام کی رائے پر قائم ہے تو پھر کیوں دنیا مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے۔ عوام تو جنگوں کی مصیبت میں پڑنے کیلئے تیار نہیں۔ پھر یہ جنگیں کیوں ہو رہی ہیں اور عوام بطیب خاطر اس میں کیوں حصہ لے رہے ہیں۔ ذرا سے غور کے

بعد یہ نکتہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ موجودہ دور کی قومیتیں اسی
جذباتی طاقت کو حاصل کر جاتی ہیں جو کسی زمانہ میں مذہب کو حاصل
تھی اور جس طرح مذہب کے نام پر خود غرض اشخاص اپنا مفاد
پورا کیا کرتے تھے آج قومیت کے نام پر وہی کام لیا جا رہا ہے۔ قومیت
خود ایک مذہب بن گیا ہے اور قومی بزرگی اور برتری حاصل کرنے
کے جذبہ نے عوام کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی ہے مختلف
ملکوں کے اعلیٰ طبقات کے اقتصادی مفاد کو ان ملکوں کے
باشندوں کا مفاد بنا کر عوام میں ہیجان پیدا کرا دیا جاتا ہے۔
لیکن کیا یہ حالت کچھ زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے؟ اس کا
جواب بالکل نفی میں ہے۔ آج کل جو جنگ ہے وہ اقتصادی
عدم مساوات کی وجہ سے ہے یعنی یورپ کی قوموں نے جو کرۂ
ارض کے دوسرے ممالک میں لوٹ کھسوٹ کی ہے اس کا بٹوارہ
مساوی طور پر نہیں ہوا ہے۔ اس وقت محض اتنی کوشش ہے
کہ یہ بٹوارہ یورپ کی قوموں میں برابر ہو جائے؛ لیکن اس تحریک
کے بطن سے دو تحریکیں قدرتاً پیدا ہو کر رہیں گی۔ اوّل تو غلام
قوموں میں سیاسی اور اقتصادی آزادی کا جذبہ اور انقلابی
ذہنیت، اور دوسرے خود یورپ کے ملکوں میں اعلیٰ طبقات
کے خلاف اقتصادی برابری کا مطالبہ، یعنی اب قومیں ایک
دوسرے کے خلاف لوٹ کھسوٹ میں برابر کی شریک ہو جانے
کے لئے لڑ رہی ہیں اور عنقریب عوام ان طبقات کے خلاف
اقتصادی مساوات کی خاطر نبرد آزما ہو جائیں گے جو اپنے
مفاد کو قومی مفاد قرار دے کر عوام کو اصل چیز سے بے خبر رکھنے
کے لئے قومی جنگوں میں مصروف رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں جو کچھ ہو رہا
ہے وہ اس انقلاب کی خبر دے رہا ہے جو موجودہ اعلیٰ طبقہ کی حاکمیت
اور اقتصادی برتری کو نیست و نابود کر دے گا اور جو صحیح جمہوریت
کی بنیاد قائم کریگا۔

اس جمہوریت میں نہ اونچ اور نہ نیچ ہو گی نہ سیاسی اور اقتصادی
ناانصافیاں، نہ عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش ہو گی اور نہ خیالات
اور رائے پر پابندیاں۔ یہ ایک جمہوری سوسائٹی ہو گی جس کا معاشرتی
نصب العین، یکساں قانون اور بے لوث عدل پر قائم ہوگا۔

دنیا ایسے نصب العین کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی ہے۔
جو لوگ اس کے باوجود بھی غلط فہمی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں ان
کے اندھے پن کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ پرانا نظام دم توڑ رہا
ہے اور جو لوگ اس کو سہارا دے رہے ہیں وہ خود اسی کی قبر میں دفن
ہو جائیں گے۔

تاریخ کی تیز رفتاری جس کا دوسرا نام انقلاب ہے۔ اس کھوکھلی
جمہوریت کو پامال کئے ڈالتی ہے جو محض سیاسی آزادی کے پُرفریب
ستونوں پر قائم تھی۔ دنیا کی مشکلات کا حل صرف اقتصادی
جمہوریت میں ہے جو اشتراکی نظام کے بغیر کامیاب
نہیں ہو سکتی۔

(سیّد محمد یحییٰ میرٹھی)

عیش ونشاط:۔

بادۂ ناب کے احمریں جاموں کے چھلکنے سے حکومتوں کی زندگیوں کے جام لبریز ہو رہے تھے۔ رقاصہ کے پاؤں کی جھنکاریں اور مُغنیّہ کے نغموں
کے سُروں سے بادشاہوں کے مرثیوں کی لَیئیں اٹھ رہی تھیں۔ عشرت کی گود میں سر رکھ کر ہزاروں سلطنتوں نے جان دیدی!

بشیر

شمالی دیہاتی لکھی (ادب سبھا)

(وہ رپورٹ جسے سکریٹری اُتری شمالی دیہاتی لکھی (ادب یا ساہتیہ) سبھا نے دیہاتی کویوں سائروں اور لکھیاؤں کی دوسری کانفرنس میں متھرا کے مقام پر ۲۸ رنومبر ۱۹۳۹ء کو پڑھ کر سنائی)

اس مضمون کے پڑھتے وقت یہ نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ دیہاتی عوام کے سامنے پڑھا گیا تھا جس زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ ہماری شہری ومتمدن زبان سے مختلف ہی سہی لیکن دیہاتیوں نے اسکو اچھی طرح سمجھا اور ان مسائل کو بہ آسانی بیان کیا جاسکا جن سے دیہاتی عوام کو آگاہ کرنا مطلبی صاحب کا اصل مقصد تھا۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ جو اس مضمون میں بار بار آتے ہیں ان کے معنی یہ ہیں۔

اڈیٹر

(۱) لکھی۔ (ادب یا ساہتیہ)، (۲) لکھیا (ادیب، لیکھک)، (۳) راگی (نظم (Poetry)، (۴) نراگی (نثر)، (۵) سائر (شاعر)

۱۵ راکتوبر ۱۹۳۸ء کو جس دن الہ آباد میں اچھی بیٹھکی میں نے اپنی یہ رائے کچھ ساتھیوں کے سامنے رکھی کہ اتری (شمالی) ہندوستان کے دیہاتی کویوں سائروں اور لکھیاؤں کی ہر سال سبھا کی جایا کرے۔ اور دیہاتی لکھی کی جو اپنے آپ ہی ابھرتی اور امنڈتی چلی آرہی ہے سنبھال کی جاوے اور ایسا کیا جاوے کہ وہ رستے سے بھٹکنے نہ پاوے ساتھ ہی اسے اتنا مانجھا اور صفا کیا جائے کہ چندرماں سے زیادہ چمکدار اور نکھوٹ اور پاک ہو جائے۔ اس طرح اردو اور ہندی کا جھگڑا اور جھگڑا نمٹ جائے گا۔ جس کے بہانے سے آج سارے دیس میں سرکاری گرگوں اور دلاوں کا ایسا میلا لگ رہا ہے کہ اس کی رَو میں بہت سے دیش بھگت بھی بہے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بات چیت جس پر اٹھی اور چلی وہ میرا ایک لیکھ تھا جو میں نے دیہاتی بولی کے بارے میں اردو ہندی کے سوال کو سامنے رکھکر لکھا تھا۔ ساتھیوں اور دوستوں کی یہی صلاح ہوئی جس پر دیہاتی سائروں کویوں اور بھجنکوں کی پہلی سبھا فریدآباد ضلع گوڑگانواں میں دلی سے ۱۶ میل دکھن میں ۱۴ ر ۱۵ رمئی ۱۹۳۹ء کو جوڑی گئی جس کے لئے پہلی اپریل کو میں نے سب دیہاتی سائروں اور کویوں اور دوسرے لوگوں کو بھی جنھیں لکھی (ادب یا ساہتیہ) سے پریم ہے چاہے وہ اردو ہندی ہے یا دیہاتی ایک چٹھی چھپوا کر بھیجی اس طرح گئی کہ جن لوگوں سے میری اپنی جان پہچان تھی ان کو کئی کئی چٹھیاں بھیجیں اور لکھا کہ اپنے گرد اور اطراف کے کویوں کو یہ چٹھیاں دیں اور انھیں سبھا میں لانے کیلئے تیار کریں ضلع بلندشہر، متھرا، آگرہ، صوبہ دہلی اور ضلع رہتک کرنال اور دوسری جگہوں کی کانگریسی کمیٹیوں کے پاس بہت سی چٹھیاں بھیجیں کہ وہ سائروں اور بھجنکوں کو میری اور سے نوتہ دیں پر یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ بہت سوں نے تو رسید تک نہ دی سوائے حکیم برج لال ضلع کانگریس کمیٹی متھرا کے پردھان کے انھوں نے سچ تو یہ ہے کہ ہماری اتنی مدد کی اتنا اس کام میں ہاتھ بٹایا اور اتنا کچھ کیا کہ اگر وہ نہ کرتے تو سبھا کا ہونا نہ ہونا ایک ہی ہو جاتا۔

لہ نوراح

پہلی اپریل کی چھٹی میں، ۸ اور ۹ مئی ۱۹۴۳ء کی تاریخیں سبھا کیلئے رکھی تھیں پر کچھ ایسا بونت[1] آن پڑا کہ سبھا ۱۰ اور ۱۱ مئی کو جوڑنے[2] کی ٹھیری بڑے بڑے اشتہار چھاپ کر گاؤں گاؤں بانٹے گئے اور اس میں یہ بھی لکھکر خبر دی گئی کہ پنڈت ساتو کی جی متھرا ضلع کے دیہاتی سائر نے اس سبھا کا پردھان ہونا مان لیا ہے۔ یہ تو سب کچھ ہوا پر ہماری سبھا سپھل ہونے میں دو بڑے بھاری اٹکاؤ لگے۔ کہ:۔ اس زمانہ میں دیہات میں بیاہ برات کا وہ زور رہا کہ جیسے اب کے کسی گاؤں کا بھی ایک چھورا یا چھوری بن بیاہے نہ رہیگا۔

ہر گاؤں میں کئی کئی باراتیں آ رہی تھیں۔ اور کئی کئی وہاں سے جا رہی تھیں۔ اس لئے سائر، کوی، بھجنک اور تماشائی سب ہی سبھا میں کم آئے۔ دوسرا اٹکاؤ موسم کا تھا۔ سخت اندھیاؤ اور لُو دونوں دن ہی رہے۔ اور جب ہوا رکی بھی تو ایسی گرمی اور گھام رہی کہ شمیانے کے نیچے بیٹھنا بہت ٹیڑھا کام ہوگیا۔ ان سب اٹکاوٹوں پر بھی سبھا میں بہت سے سائروں، بھجنکوں اور گویّوں نے حصّہ لیا۔ اور تماشائی بھی کبھی ڈیڑھ سو دو سو سے کم نہ ہوئے۔ اس پہلی سبھا میں ضلع گوڑ گانوں میتھرا۔ صوبہ دہلی کے دیہاتی کوی تو آئے ہی تھے۔ پر جامعہ ملیہ دہلی سے پروفیسر محمد عاقل آئے اور ہندوستانی بھی کو آگے بڑھانے والی کمیٹی کے منتری سید سجاد ظہیر لکھنؤ سے آئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر احمد علی صاحب دہلی کے مشہور ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ صاحب انصاری اور مشہور تصویریں بنانے والے رویا ما صاحب بھی آئے۔ اور ان سب بھائیوں نے ہمارا اس اپنے ڈھنگ کی نئی اور نرالی سبھا کے چلانے میں ہات بٹایا۔

ایک چُوک اس سبھا میں آنے والے اور نہ آنے والے کویوں سے یہ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ یہ سبھا بھی کانگریس کی سبھا ہے۔ اس لئے وہ سارے سائر اور بھجنک جنھوں نے کانگریس یا دیش بھگتی پر اپنی کویتا یا بھجن نہیں بنائے نہیں آئے۔ اور آئے بھی تو اس میں بولتے ہوئے شرمائے بات یہ تھی ہی نہیں جو سمجھی گئی۔ یہ تو سچ ہے کہ سائری کویتائی اور دیش بھگتی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پر ہمارے بہت بھائیوں نے سمجھ لیا کہ جس کویتا یا بھجن میں پنڈت جواہر لال یا گاندھی جی کا حال نہ ہو وہ اس سبھا میں سنانی ٹھیک نہیں یہ ان کی چوک اور غلطی ہی تھی۔ راگی کویتا یا نظم اور بزاگی (نثر) اچھی یا ٹھیک وہی مانی جاتی ہے۔ جو دیس میں صاف صاف دکھائی دیتے ہوئے اُجاگر سوالوں اور باتوں کو سمجھ کر اور ان کی تیال تک پہونچ کر لکھی جاوے جیسے سورج کا ڈوبنا چڑیوں کے بسیرا لیتے سمے کی چوں چوں چاندنی رات میں پانی کے ہلوروں میں چاند کا اٹھکیلیاں کرنا۔ مور کا مورنیوں کے سامنے ناچنا۔ اونچی چٹانوں سے گرتی ہوئی۔ ندیوں کا رول غول۔ مچھلیوں کا تڑپنا پھر گھندار روکھوں میں جھولوں کی بہار۔ گانے والیوں کے ملہار۔ چھما چھم برکھا کو دیکھے بنا نہیں رہتے۔ اسی طرح آج کل اس دیس میں تھوڑے آدمیوں کو چھوڑ کر سارے دیس کے باسیوں کی کنگالی اور نردھن بن[3] اور ساتھ ہی سات بہت تھوڑے مانسوں کا اٹوٹ[4] دھنمنت[5] ہونا بھی ہماری آنکھ سے نہیں چھپتا۔ اب ایک لکھیا۔ سائر یا کوئی کوی جو یہاں رہتا ہے۔ کیسے اندھیاؤ سے پھونس تک اڑے ہوئے ہزاروں چھپروں کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی حویلی یا محل بن دیکھے رہ سکتا ہے؟ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی بڑی بے جوڑ اور اٹل[6] بات پر سوچ بچار ہی نہ کرے۔ آج ہم یہاں جس بھومی پر اکھٹے ہوئے ہیں۔ کیا کیا اچنبے کی باتیں نہیں دیکھتے۔ ہزاروں مرد، بیر کا مندروں کے سامنے بھیک لینے کیلئے جس کو دنیا دان کہتی ہے۔ اکٹھا ہونا۔ اور ان کی یہ دشا کہ پہننے کو کپڑے نہیں جاڑے میں سُو سُو کرتے ٹھٹھر رہے ہیں۔ اور پھر وہ لوگ جن کے چکنے اور بھاری بدن، چمکتے دمکتے ٹھنڈے اور گرم کپڑوں سے چھپے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ پاس سے نکلتے ہیں تو سگندھ کی لپٹیں اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ یا جمنا کے کنارے سانجھ[7] سکارے[8] جب مانس پانی کے کنارے چلتے ہیں۔ تو پانی میں ریتی کے ساتھ ساتھ کچھوؤں کے دَل کے دَل دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان چنوں کے دانوں کی راہ تکتے ہوتے ہیں۔ جو ان کو روز دھنمنت لوگ آن کر ڈالتے ہیں اس پورب نگری میں جہاں کچھوؤں اور مچھلیوں تک کو دان دیا جاتا ہے ہزاروں مرد اور بیر جاڑوں کی راتیں بنا روٹی آگ کے سامنے بیٹھ بیٹھ کر بتاتے

---

[1] موقع ڈھنگ [2] منعقد کرنے۔ [3] بارآور [4] بے حد، نہ ختم ہونیوالا [5] سرمایہ دار [6] نہ ملنے والی [7] شام [8] صبح
ایشیا

ہیں۔ کھلی بات ہے کہ ہمارے کوی یا لکھیا سے یہ بات چھپی نہیں ہے۔ شہروں کو چھوڑ کر ہمارے کوی تو رہتے ہی گام گرام میں ہیں۔ وہاں ساہوکار، اور بڑے بڑے زمیندار بنا کشٹ[1] کسالے[2] کئے کسانوں کی کمائی پر آنند کے تار اُڑاتے انھیں دکھائی دیتے ہیں۔ اور انھیں حویلیاں اور نوہروں کے سامنے وہ مرد بیٹر ہیں۔ جو دن رات گرمی سردی اور برسات کے سب موسموں میں برابر کسالہ کر کے ناج اور دنیا کی سب چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کر کے اسے زمیندار کی لگان اور ساہوکار کے سود کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور پھر قرض کیلئے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ اور انت[3] بنا لتے کپڑے اور دو بنا مٹھی بھر ناج یا روٹی کا ایک ٹوک منہ میں ڈالے گذار دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بات بھی ہمارے کویوں سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے کوی یا لکھیا کو ان آنکھوں دیکھی باتوں پر سوچ بچار کر کے اور ان کی تہ ٹٹول کر من کی بات کہنی یا لکھنی چاہیئے؟ یا ہنومان جی کے پہاڑ کو اٹھا کر لنکا کے ساگر میں دے مارنے پر؟ اسے اس دنیا میں آنکھوں دیکھی باتوں کا وِرودھی بننا ٹھیک ہوگا۔ یا ایک اَن دیکھی نہ سمجھ میں آنے والی من گھڑت کہانی کے کسی راجا یا جلاد کا؟ جیسے ایک کنول کا پھول، ایک گھن دار رو کھ کی چھاؤں، اور ایک بڑی جل سے بھری پوکھر سے۔ کنارے پر دھانی دھانی دوب اور جھکے جھکے آم اور برگد کی چھایا ایک کوی کے من میں لہریں اٹھاتے اور اس کی کویتا کے میٹھے سروں کو جگاتے ہیں۔ ایسے ہی جب ایک اپنا ہی کسی نردوش پر ہات اوٹھاتا ہے تو ایک سچے کوی کی کویتا ایک لاچار کی کڑکڑاہٹ۔ یا ایک بگڑے اور جھلّائے ہوئے سینگھی[4] کی غرغراہٹ بن جاتی ہے۔ یہی کویتا کا ایک اصلی جیون ہے۔ اسی جیون کا ہر کوئی اور لکھیا میں ہونا بڑی جان کی بات ہے یہ جان اتنی ہی بڑی ہوئی ہوگی۔ جتنی کوی کی نظر اور سوچ بچار دکھائی دیتی ہوئی چیز یا سمے یا بات کی گہرائی میں اترے گی۔ جس کویتا آگی یا نراگی نیو ایسی پکی سچی دیکھی اور سمجھی ہوئی باتوں پر ہوگی۔ اتنی ہی وہ امر[5] ہے۔ مگر جس کویتا کی نیو پرانی کہانیوں، جھوٹے سچے راسوں پر رکھی گئی ہو جس کو سو دو سو نہیں ہزاروں کوی گاتے اور سناتے رہے ہوں اور جن میں سنو لیس سے ۹۵ بے بھروسہ اور جھوٹی ہوں اس بجی بجائی جھرجھری اور پھٹی بانسری کو ہم کب تک بجائیں اور اس کا کیا نتیجہ؟ اگر ہم یہ من سمجھوتی کریں کہ اس سے ایشور پرماتما یا خدا بہت راجی ہو رہا ہوگا۔ یا کہ سمجھیں کہ نبیوں کی روح اپنی بڑائی کو سُن سُن کر پرسند ہو رہی ہے۔ تو یہ اور بات ہے۔ پر وہ کویتا جو برائی سے کرودھ، بھلائی سے پریم پیدا نہ کرے۔ وہ کویتا جو مری ہوئی آتماؤں میں سنئے سرے سے جان نہ ڈالدے، اور وہ کویتا جو سوتی ہوئی جنتا کو نہ جھنجھوڑ ڈالے۔ اور وہ کویتا جو سننے والوں میں سمجھ جاگ اور ہمت نہ پیدا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اشوریا ان سُرگ لوک میں سوتے ہوئے دیوی دیوتاؤں اور رشیوں منیوں کو پرسند ہو۔ خدا یا خدا کے ان نبیوں، ولیوں اور شہیدوں کو جو قبروں میں پیر پھیلائے اسی بھومی کی مٹی بن چکے ہیں۔ راجی کر سکے اور اس دھرتی پر بسنے والوں کو اور گھنا اُونگھ کا دان دیدے۔ پر اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ آج تک ہمارے شہروں کے کوئی اور لکھیا جو اردو ہندی میں اپنی کویتا یا لیکھ لکھتے رہے ہیں۔ ان کی راگی اور نراگی کی سدا ڈھونگ رہے ہیں۔ یا تو انھوں نے ایران، توران، عرب اور روم شام کی شہزادیوں قاف کی پریوں پرانے مگدھ دیس یا سراندیپ کی پاتر جیسی رانیوں کے پریم کے جھوٹے سچے گنڈے اور مہاگنڈے راجاؤں، شہزادوں، بے یا دبے حیا، پن کی کہانیاں لکھیں جن میں کہیں سے ایسے طوطے، مینا، چکوا، چکوی سنجوگ کرنے آجاتے ہیں جو آدمی کی بولی بولتے ہیں۔ اور پھر مزا یہ ہے۔ کہ اگر شہزادہ یا راج کنوار بنگالہ دیس ہے۔ تو اس سے اسکی بولی نہیں اور شہزادی یا راج کنواری روم شام یا لنکا کے ہیں تو ان سے ان کی بولی میں یہ جانور بات کرنے لگتے ہیں۔ دیس دیس کی بولی جانتے ہیں۔ شہزادہ کسی بن دیکھی کنیا کی برہ کی اگنی میں اٹھوائی کھٹوائی لے جل جل دم توڑتا ہوتا ہے کہ کہیں سے کوئی حکیم یا یاتا یا کسی پردیس کا سوداگر آ نکلتا ہے۔ وہ ایک تصویر دکھاتا ہے۔ شہزادہ کا غذی مورت دیکھتے ہی ستا کا کھایے شدہ ہو جاتا ہے۔ ناڑی (نبض) بند ہو جاتی ہے۔ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی ہنڈول سنگھاتا ہے تو آنکھ کھلتی ہے۔ تصویر دکھانے والے سے اتہ پتہ پوچھا جاتا ہے۔ اور بتائے ہوئے پتہ پر شہزادہ جنگل جنگل بن بن، دھکے کھاتا، نینوں سے نیر بہاتا،

---

[1] محنت [2] مشقت [3] آخرکار [4] شیر [5] مرنے والی [6] لڑائیاں [7] راضی [8] پسند، خوش

ایشیا

تصویر گلے میں لٹکائے مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک دن رات جس روکھ کے نیچے بسرام کرتا ہے اسی پر دو چکوا چکوی یا طوطا مینا آپس میں اس کی لکھا پر باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح ان سے رام رام ہو جاتی ہے۔ بس اب جو راہ ایک سوجھ بوجھ کے مانس کے ڈھونڈے نہ ملی تھی۔ وہ پکھیرو دکھاتے ہیں۔ بہت بڑا سنسان جنگل، پھر پہاڑ، پھر سوکھے دریا، ریت کے میدان ملتے ہیں جادو گھات سے مٹھ بھیڑ ہوتی ہے۔ پتال سے پتلیاں نکلتی ہیں۔ امبر سے گولے برستے ہیں جب جادوگر مارا جاتا ہے، تو پتہ لگتا ہے، کہ اسی جادوگر کی قید میں راج کنوار یا شہزادے کے دل کی کلی تھی۔ اب دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے، وہ کنواری کنیا رنڈیوں کی طرح آنکھ ملتے ہی جواب سوال کرنے لگتی ہے۔

مطلب یہ تھا کہ شہری لوگوں نے ایسے جھوٹے قصے لکھے۔ کہ انھیں جھوٹ کی پوٹ کہا جائے تو ٹھیک ہوگا۔ اور پھر جھونٹ بھی کیسا جس کا اور نہ چھور جھوٹ اور بات کا بڑھانا اگر لگاون[1] کے ڈھنگ پر ہو تو نبھ بھی جاوے۔ ان میں لگاون جتنا سچ بھی نہیں۔ پھر ان قصوں میں ہمارے لئے کیا بات اچھی ہو سکتی ہے۔ ہاں راجہ رانیوں کیلئے تو یہ بہت مزے کی کہانیاں ہیں۔ رات نرم نرم سیجوں پر پڑے سنتے رہے۔ اور سنتے سنتے سو گئے اٹھے تو ساری رات اندر سبھا سپنے میں دیکھتے دیکھتے اٹھے۔ جس میں آپ ہی راجا اندر گلفام یا لال پری ہتے اس ڈھنگ کی کتابیں چاہے وہ راگی میں ہیں یا نراگی۔ ایک دو نہیں ہزاروں اردو ہندی میں لکھی گئیں دوسرا ڈھنگ اردو ہندی لکھی (ادب یا ساہتہ) کا دھارمک ہے دین دھرم کے اوپر ہندی اور اردو میں بہت کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں نماز روزہ پوجا پاٹ کے قاعدہ اور قانون، پیر، پیغمبر، دیوی، دیوتاؤں کے قصے کہانیاں آیتیں۔ اور اشلوک سب ہی ہیں۔ اور آتما پرماتما سے لگا کر چھوچھا تک سب پر کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کو مولوی پنڈت ہی پڑھتے[2] ہیں۔ گام گرام میں ان کا چرچا بہت کم ہوتا ہے۔ دھرم دین کی کتابوں کی ایک اور ٹہنی ہے، اور وہ ہے۔ صوفیوں، پیروں، سادھوؤں، رشیوں اور جوگیوں کی باتیں۔ اردو اور ہندی لکھی اس شاخ کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہے۔ ان کی کہانیوں کو کویتاؤں، سانگوں میں بھی لکھا گیا ہے۔ اور نراگی میں بھی۔ ہر کوئی تو اس بات کو ٹھیک نہیں کہتا۔ پر کچھ ہیں جو کہتے ہیں۔ کہ ان کے پڑھنے سے دین دھرم کا کلیان ہوتا ہے۔ اور ان کے پڑھنے اور سننے تک مانس سُرگ لوک میں چلا جاتا ہے یا جنت کی سیر کرنے جوگا ہو جاتا ہے۔ پر ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے جس کو سنتے سنتے جگ بیت گئے ہیں۔ ابتک کسانوں مزدوروں اور دوسروں کی دُرگتی اور کٹھنائی نہیں کٹی ہے۔ جو جونک ان کا خون پی پی کر ست ہوتی رہتی ہے۔ وہ ویسی کی ویسی بنی ہوئی ہے۔ ان کے دکھ ان کتابوں کے پڑھنے اور سننے سے نہیں ٹھہرے جاتے اور دھنت ساہوکاروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے پینے دانت ان کتابوں کے باچنے سے کبھی بھونٹے نہیں ہوتے۔ اور تیز ہی ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ان دو ڈھنگوں کو چھوڑ کر ہندی اردو لکھی میں بہت سی دوسری اچھی اور فائدے کی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ جو پہلے بہت تھوڑی تھیں۔ پر جوں جوں دن بیتے ہیں۔ ان میں بڑھوتری ہو رہی ہے۔ آپ سب کو یہ پتہ تو ہے ہی۔ کہ ہماری دیہاتی لکھی (ادب یا ساہتہ) میں صرف راگی ہی راگی ہے۔ اور اس میں نراگی کا پتہ نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے دیہات کے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے نہ تھے۔ اور اب تک جتنے راج اس دیس میں جمے اور رہے۔ ان سب کو دیہات کے لوگوں کے ان پڑھ رہنے میں گھنا سواد ملا ہے، اور ملتا ہی رہیگا۔ دس دس روپیے میں دیس کے مورکھ نوکر ہو گئے۔ اور انھوں نے اپنے ہی بھائیوں پر گولیاں برسائیں جن کو ۱۰، ۷ ا روپیے میں مول لیا گیا۔ انھوں نے اپنے بھائیوں پر بس نہیں کیا وہ لاکھوں کے ٹول بن بن کر پردیسوں میں گئے۔ دیس کے دیس برباد کر دیئے اور وہاں کی پرجا اسی راج کی سمراجی بندھن میں جکڑ کر غلام بنا آئے جو خود ان کا خون پی رہا ہے۔ دو دو چار چار آنے کے لوبھ میں کارخانوں میں پہنچے خود تو ۲رہ رسے آگے نہ بڑھے مگر کارخانے کے مالک کو تھوڑے ہی دن میں کروڑوں کا مالک بنا دیا۔ ساہوکار یا کسی بڑے زمیندار کے پاس پہنچے جہاں اس نے کہا گونٹھا ٹیک آئے اور دس بیگھہ دھرتی کے جوتنے کے چاؤ میں اپنے اور اپنے بیٹے پوتے اور بہوؤں تک کے جیون

[1] چرائے - [2] پڑھے

سدا سدا کو پھل دئے ۔ سُود سُود بھرتے بھرتے خود بھسم ہو گئے۔ مگر زمیندار اور ساہو کار کا گھر بھر دیا ۔ خود ویسے کے ویسے ہی دکھی، کنگال اور نردھن رہ گئے ۔ اور اس دشا پر بھی بہت راضی کہ "یہ سب ایشور کی مایا ہے" اور "اپنے اپنے بھاگ ہیں" ۔۔ اگر یہ لوگ ان پڑھ نہ ہوتے ۔ تو آج یہ دھرتی اور اس کے سب کار بیوہار ہی دوسرے رنگ سے ہوتے ۔ نہ انگریزی سوداگروں کا راج ہوتا اور نہ ہی پونجی پتی دنیا کی لوٹ ہوتی ۔ ان پڑھ لوگ سکھ پا کر موج میں گاتے ہیں، بولتے چالتے بھی ہیں ۔ ان کو دُکھ پہنچتا ہے تو کلاتے ہیں یا موج میں آ کر گاتے ناچتے ہیں وہ سب گیت بھجن اور کویتا بن جاتے ہیں ۔ ان گیتوں میں ایسا سواد ایسا رسیلا پن ہوتا ہے ۔ کہ ان بھجنوں کے بول ان پڑھ اور پڑھے لکھے سب طرح کے لوگوں کو یاد ہو جاتے ہیں پر بول چال کے بول یاد نہیں رہتے یہی بول چال ہماری نراگی ہے جو یاد نہ رہنے سے نہیں ہے اور ان سکھ اور دکھ کے گیتوں سے ہماری راگی کی نیو پڑی ہے جو آج تک موجود ہے اگر ہمارے دیہات کے لوگ پڑھے لکھے ہوتے اور اپنی دیہاتی میں وہ کتابیں لکھتے تو ہماری نراگی بھی ہوتی پر دیہات کے لوگ جنہوں نے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا انھوں نے اگر کوئی کتاب یا لیکھ لکھا بھی تو اردو یا ہندی میں لکھا اور اگر وہ لکھتے بھی تو پڑھتا کون اسی کارن ہماری نراگی کی بنیاد ہی نہیں پڑی لیکن وہ اب پڑنی چاہیئے اور ضرور بالضرور پڑ لی جاہیئے جس لکھی میں راگی اور نراگی دونوں نہ ہوں وہ لنگڑی ہے ہماری راگی دنیا کی دوسری بولیوں کی راگی سے پیچھے نہیں ۔ اس میں بھیک کبیر ۔ سعد اللہ ۔ کھکے ۔ عیوض ۔ گردھر کب رائے ۔ جنو ۔ دلیر جیسے ہزاروں ہی بہت اونچے دھیان کے سائر ۔ کوی اور بھنک ہوئے ہیں ۔ جنہوں نے اس رسیلی بولی میں کوئیلوں کی سی کوک اور پپیہوں کی سی میٹھی پکار گھول گھال کر وہ کچھ کہا ہے کہ ہماری یہ راگی اردو ہندی کی کیا بلکہ دوسری راگیوں سے بھی پیچھے نہیں رہی ہے پر ایک بات یہاں کہنی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ اردو ہندی کی شاعری اور کویتائی نے ہماری راگی پر بھی اپنی چھایا ڈالی ہے پچھلے دنوں ہماری راگی پر اشور کی چاہنا اور بھگتائی راج کرتی رہی ہے اور دوسری ان دیکھی اور نہ سمجھ میں آنے والی شکتیوں کا سایا پڑتا ہمیں دکھائی دیتا ہے ۔ بس بل اتنا ہے کہ اردو ہندی کویوں کی بناوٹ کی جگہ سادگی اور البھول پن اس میں بھی برستا ہے ۔ بھگتائی اور ان دیکھی شکتیوں کا راج وہی ایشور کی مایا اپنی اپنی پرالبدھ[1] جیسی افیم ہے جو رات دن کی کٹھنائیوں میں گھرے ہوئے اور پچھلے ہوئے دُکھیوں کو سلانے کو پلائی جاتی ہے پر جوں جوں دیس میں کانگریس اور مزدوروں اور کسانوں کے سوال ابھرتے اور اپجتے[2] آتے ہیں توں توں اس افیم کا نشہ ہرن ہوتا جاتا ہے ۔ اس کا اثر دیکھنا ہو تو ہمارے دیہاتی کویوں کی کویتائیں ۔ بھجن دیکھنے چاہئیں ۔ جن کے سُننے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے آکاس اور دھرتی کے جوڑنے بلواں بلواں پون کے کاندھوں پر سوار بجلیاں چمکاتے گھگھاٹ کرتے آندھی کی طرح بادل اُٹھے چلے آتے ہیں ۔ اور ان کی کڑک ۔ گھور گرج اتنی ڈراؤنی ہے کہ ہردے میں کپکپی لگ جاتی ہے شریر[3] کا جوڑ جوڑ کڑکڑانے لگتا ہے ۔ یہ آسا کہ جل تھل ہو جائیگا اس ترا سا سے بدل جاتی ہے کہ ساری پرتھوی ڈوب جائیگی بجری[5] گر گر کر جیو اور جنتو[4] ، اَن دکھ اور بن سب کا ہی ناس کر دیگی ۔ اس ترا سا میں ایک اٹل اتھا[6] بھروسا بھی سر نکالتا ہے اور وہ یہ کہ "یہ پرتھوی اس برکھا سے مزدور ضرور سیراب ہو گی ۔ ہاں یہ ہو گا کہ پرانا گلا ہوا ڈھانچا ضرور کھات بن جائیگا اور اس کی جگہ نئی بنا بستی لہراتی اور لپٹیا دیتی دکھائی دیگی ۔

ہمارے دیہاتی سائروں اور کویوں کی راگی میں سچ مچ وہ آگ دھدک رہی ہے جو اوپر بتائے ہوئے طوفان کا پتہ نہیں دیتی بلکہ بتلاتی ہے ۔ کہ وہ آ گیا " انقلاب زندہ باد " کے نعروں اور جیکاروں میں آج تک آسا ہی آسا تھی ۔ پر اب آسا کا سوال نہیں ۔ اب تو خود اس انقلاب کی جھنکاریں ہم سُن رہے ہیں ۔ اور یہ جھنکاریں ہماری دیہاتی لکھی کی نئی راگی ہے ۔ جس کے تیز دھارے ہمارے کویوں کے ہردے میں سے امنڈ گھمنڈ کر ببل ببل کرتے ہوئے سارے دیس میں پھیل رہے ہیں ۔

۴۷

---

[1] تقدیر قسمت [2] بویا ہوا ابھرتا ہوا بیج [3] جسم [4] کیڑے مکوڑے جانور [5] بجلی [6] بے روک اور بے ...، یعنی قطعی اور یقینی بلا شبہ ۔

جب[1] سے ہم نے دیہاتی لکھی کے سوال کو پرجا کے سامنے دھرا ہے۔ اُردو ہندی کے پریمیوں کے دنگل میں خوب کھلبلی[1] ہل چل سی پڑنے لگی ہے بہت سے تو ہمارے اس "ایرادہ" پر ناک بھوں ہی چڑھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "ہاں جی نئی دنیا۔ اور نئے زمانے میں کوئی نئی بات اٹھانا بھی فیشن ہے"۔ کچھ کچھ لوگ ایسے ہیں جو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ان کے دھیان میں دیہاتی لوگ گنوار ہیں۔ گدھے ہیں۔ گنواروں اور جنگلیوں کی بول چال پر زور دینا گدھے پن کی بات ہے! گنواروں اور جنگلیوں کو آدمی بنانے کیلئے گنوارُ بول چال کو مٹانا ہی سمجھداری ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے دیہاتی لکھی کا سوال اٹھا کر دیش کو اٹھانے اور آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے گھسیٹنے کا بیڑا اٹھایا ہے" انکا یہ بھی کہنا ہے کہ جو بولی لکھی پڑھی نہ جاتی ہو یا جس بولی کے بولنے والے لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہ ہوں ان کی بولی کے چند گانوں کو لکھی (ادب یا ساہتہ) کی چوکی پر لا بٹھانا کوڑھ پن کی بات ہے"۔ یہ سب باتیں جو کہی جا رہی ہیں۔ جھوٹی ہیں سچی بات، کہنے والے دلیں چھپا کر دوسری باتیں کہتے اور اس میں میکھ نکالتے ہیں۔ وہ کھُل کر نہیں کہتے کہ "دیہاتی لکھی کا چرچا جو دیش کے ہزار میں ۹۹۹ آدمیوں کی بولی اور لکھی ہے۔ اُردو ہندی کی بناوٹی چمک کو پھیکا کر دے گا۔ اور ان کی ساری سوبھا اڑ جائے گی"!

یہی ڈر سچا ڈر ہے پر اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہم تو چاہتے ہیں۔ کہ دیہاتی لکھی اور بولی کو سنوارا جائے اور اس کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ اس کا بھدا پن دُور ہو جائے۔ اس میں اب بھی اتنا رسیلا پن ہے کہ اُردو اور ہندی کے لکھیا، بنا اس کی ملونی کے اپنی اپنی لکھی کو کھُردری اور بے رس پاتے ہیں۔ پنجاب کے لکھیاؤں کے اردو لیکھ اور ان کی کتابوں کو بھی دیکھ لیجیے، جن میں دیہاتی کا میل نہیں ہوتا۔ وہ کانوں کو اچھی نہیں لگتی یا نئی ہندی کے کٹر لکھیاؤں کے لیکھ سُن کر اور پڑھ کر مزا تو ملنے سے رہا۔ کبھی کبھی جی تک چلا جاتا ہے اور ادنگھ تو آنے ہی لگتی ہے۔ اس بات پر یہ بات کہی جائیگی۔ اور کہی جاتی رہی ہے۔ کہ اردو اور ہندی لکھی (ادب یا ساہتہ) کی بھاشائیں ہیں۔ بول چال تو دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ایسی ہے کہ دیہاتی سے کچھ بہت دور نہیں اس لئے دیہاتی بولی کا سنوارنا تو یہ ہوا۔ کہ دیہاتی لوگ اپنی بولی کے بدلے شہری بھاشا بولیں اور ان کی لکھی اُردو یا ہندی ہو بات تو یہ ٹھیک تھی پر اُردو ہندی کے لکھیاؤں شاعروں اور کویوں نے جو نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ جن سے رات دن کی اپنی ہی بول چال سے ان کا کوئی میل ہی نہیں رہا ہے۔ اور نت نئے جو اکھاڑے جمائے ہیں۔ اور پٹا کے روز جو نئے نئے ہاتھ نکالے جاتے ہیں۔ اس سے اس بات کو اتنا جھگڑے میں ڈالدیا ہے۔ کہ اس کا ہونا بہت دور ہو گیا ہے۔ اور سچ سچ اُردو اور ہندی دیوتاؤں اور فرشتوں کی بولیاں بن گئی ہیں۔ "جنگلیوں" اور "گنواروں" کے بچوں کو انھوں نے اپنی پوتھی میں سے پھاڑ کر ہی پھینکدیا ہے۔ اگر ہم دیہاتی لکھی کو اُبھاریں اور سنواریں تب ہی یہ ہو سکے گا۔ کہ یہ فرشتے اور دیوتا اپنی دور رنگی آسمانی لکھی کی بولیوں کو چھوڑ کر (جو ایک دوسرے کے سمجھ میں نہیں آتی ہیں) مجبور ہو کر دیہاتی لکھی کو سیکھیں گے اور آہستہ آہستہ ایک ہی دریا کے دونوں دھارے پھر اپنے گھر سے پاک صاف اور پوتر دریا میں آملیں گے۔

دیہاتی لکھی کو ابھارنے کیلئے ہمیں اتنی باتیں کرنی چاہئیں:۔

۱۔ ایک ایسی سماج سوسائٹی یا انجمن کا ہر ضلع میں بنانا۔ جس میں سب ضلع کے دیہاتی کوی ہسائروں بھجنک، ممبر بنیں۔ ہر تیسرے مہینے ہر ضلع میں دیہاتی کویوں کے سمیلن یا مشاعرے ہوں۔ اُردو ہندی، راگی اور دوسری دنیا کی راگیوں کے بڑھیا نمونے بھی سنائیں جائیں۔

۲۔ ہر ضلع کے پُرانے اور نئے شاعروں اور کویوں کی راگی اکٹھی کی جاوے۔ اور اسکو چھاپنے کا انتظام کیا جاوے۔

۳۔ سالانہ ایک کانفرنس یا سبھا نمبروار ہر ضلع میں باری باری جوڑی جائے۔ جس میں دیہاتی کویوں اور سائروں کا سمیلن یا

---

[1] خاصی

مشاعرہ بھی ہو اور ساتھ ہی دیہاتی لکھی کے ضلعدار کے کام کی رپورٹ پیش ہو۔ اور دیہاتی لکھی کے آگے بڑھانے پر سوچ بچار کر کے فیصلہ کیا جایا کرے جس پر ضلعوں کی کمیٹیاں قدم بڑھائیں۔ اور چلیں۔ اسی سالانہ جلسے میں جنرل سکرٹیری کا چناؤ کیا جائے۔

جیسے جیسے ہم کام کو چلاتے جائیں گے ہمیں اپنے کام کو آگے بڑھانے کیلئے راستہ ملتا جائیگا۔ آخر میں یہ بات کہنی اور دہرانی ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ کٹھن ہے پر جتنا کٹھن ہے اتنا ہی اچھا اور ضروری ہے جس سے ہم اپنے دیس کی سیوا کرنے کا ایسا دھیان ہردے میں ٹکا رہے ہیں۔ جس پر ہماری آنیوالی اولادیں ہی ہمیں آشیرباد دے سکیں گی ——

سید مُطّلبی فریدآبادی

ادب کا نیا زاویۂ نگاہ

سوال یہ ہے کہ ہماری پروازِ ذہن کی حدیں کیا ہیں، اور ہمارے گہرے غور و فکر کا نتیجہ یا ہماری منزلِ مقصود کیا ہے۔؟ کیا محض آزادی! ؟ یاد رکھئے، ملکی آزادی ہرگز ادب کی منزلِ مقصود نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ سیاست کی منزلِ مقصود بھی نہیں ہو سکتی۔ ادب کی منزلِ مقصود عام انسانیت ہے۔

ترقی یافتہ ادب کا مقصد یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسکی کوششیں دیش بھگتی اور ملکی آزادی حاصل کرنے کیلئے بھی خرچ کی جائیں مگر ادب کا واقعی مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی ذہنی اور دماغی آزادی کو ہم سے قریب کرے اور زندگی کے کم و بیش ہی نہیں بلکہ جمال اور مسرت سے ملتسفت ہونیکا موقع دے۔ شاید اب وقت آگیا ہے کہ لوگ آسمانوں کی باتیں کہنا چھوڑ دیں، اور وہ کہیں جس کی زندگی کو ضرورت ہے۔ ہمارے لٹریچر کو اب زندگی کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ اور زندگی یہی نہیں ہے جو ہم شہروں میں دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی زندگی وہ گاؤں ہیں، جہاں جھونپڑے ہیں اور جن جھونپڑے پر پورا پھونس بھی نہیں ہے، ہندوستان کی حیات اُن غریبوں اور مزدوروں کے گھناؤنے مکان ہیں۔ جہاں تازہ ہوا بھی نہیں جاتی۔ شاید اب وقت آگیا ہے کہ ہم رنگ محلوں، باغوں، خانقاہوں، اور ہر پرانی فضا سے آنکھ پھیر کر زندگی کو اُن مکانوں اور جھونپڑوں میں دیکھیں۔ اگر ہماری آنکھیں اس طرف نہیں دیکھیں گی تو ہماری شاعری اور ہمارا ادب کبھی ترقی یافتہ ادب نہیں سمجھا جائیگا۔ اور اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کے ماتھوں پر ایک اَمٹ کلنک کا ٹیکا لگ جائیگا۔

ساغر

فکر و عمل

یہ ظلمتِ شب، یہ نورِ سحر ۔۔۔ یہ چہرۂ رخ بریں، یہ شمس و قمر
یہ شوخیٔ انجم و رقصِ شرر ۔۔۔ تنویرِ نگاہ و درزِ بصر
دُنیا ہے زِ سر تا پا نظری

گلشن کا یہ چشم افروز سماں ۔۔۔ یہ نور کی دُنیا ہر سو عیاں
یہ سبزہ و گل، یہ سروِ چماں ۔۔۔ یہ سرو چماں، یہ جوئے رواں
تصویرِ حجاب و پردہ دری

یہ وادیٔ کوہ، یہ بحر، یہ بر ۔۔۔ یہ نورِ مبینِ لعل و گہر
ہیں سب ہی تماشا گاہِ نظر ۔۔۔ او محوِ تغافل دیکھ اِدھر
لیکن نہ بہ طرزِ بے خبری

غم خانہ سے اُٹھ، گلشن سے گزر ۔۔۔ ہمت بہ جگر، جلوہ بہ نظر
کردار کے صحرا زار میں آ ۔۔۔ پروائے سکونِ خام نہ کر
تا چند یہ ننگِ بے اثری

یہ پستیٔ ذوق و ہوش و نظر ۔۔۔ توہینِ متاعِ علم و ہنر
یہ تیریٔ خودی کی خود فگنی ۔۔۔ یہ تیرا سکونِ قلب و جگر
تذلیلِ جمالِ خود نگری

تقدیر کمالِ خود شکنی ۔۔۔ تقدیر زوالِ خود نگہی
تقدیر کا حاصل فقر و فنا ۔۔۔ تقدیر کی قسمت فکر و نبی
تقدیر ہے رازِ بے جگری[1]

تقدیر کے دامِ زبوں سے نکل ۔۔۔ فطرت سے جھگڑ، قدرت سے مچل
پستی سے ابھر، ہستی سے گزر ۔۔۔ آزادوں کا شیوہ فکر و عمل
محبوس کی دُنیا بے خبری

مسعود رزمی

[1] بے جگری فارسی ترکیب ہے، بمعنی بزدلی ۔

اُردو زبان کے ہندو شعراء، ادیب اور اخبار نویس

ایک سرسری چھان بین

ایک زمانہ سے میرا خیال اردو زبان کے ہندو شعراء، ادیب اور اخبار نویس حضرات کی ایک مکمل فہرست تیار کرنے کا تھا لیکن آئے دن کی نت نئی مصروفیتوں نے اس کام کو پورا نہ ہونے دیا، مولانا اصغر جمشید (فاضلِ دیوبند) نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا اس لئے میں اس کی ایک چھوٹی سی قسط ایشیا میں شائع کرتا ہوں۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد خالص علمی و تاریخی ہے، تاکہ اردو ادب کے مورخ کو اس عنوان کے ماتحت کچھ سامان مہیا ہو جائے۔ اس فہرست کو زندگی کے حالات، اور دوسری تفصیلات سے جان بوجھ کر محفوظ رکھا گیا ہے کیونکہ یہ محض فہرست ہے "تذکرہ" نہیں ہے۔ ہاں اس فہرست کی بنیادوں پر ایک تذکرہ ضرور لکھا جا سکتا ہے اور وہ خود ایک بڑا کام ہے۔

یہ کوئی مکمل فہرست نہیں ہے، اس کے باقی حصے ایشیا کے آئندہ چھپنے والے نمبروں میں شائع ہوں گے۔ مگر اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اردو، ہندی کا مسئلہ کتنی غلط بنیادوں پر پروان چڑھ رہا ہے، ملک میں جو اہلِ قلم شاعر، اور اخبار نویس ہیں وہ ہندو قومیت، یا مسلم قومیت کو سامنے رکھ کر اُردو زبان کے شاعر، افسانہ نگار یا افسانہ نویس نہیں بنتے، بلکہ وہ جو زبان بولتے آئے ہیں قدرتی طور پر اسی زبان میں شعر کہتے اور کہانیاں لکھتے ہیں۔

اس فہرست کے دیکھنے سے یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان ہرگز ہندوستان کی کسی ایک قوم کی زبان نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کی بھی زبان ہے، اگر مسلمانوں میں اُردو کے ادیب شاعر اور اخبار نویس پیدا ہوئے تو ہندو قوم نے بھی اُردو شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کی شاندار پیداوار کی جسے مقابلتہً ہرگز مسلمانوں سے کم نہیں کہا جا سکتا۔

اُردو شاعری میں چکبست، رواںؔ، محرومؔ، کیفیؔ اور آنند نرائن ملاؔ کا مرتبہ دوسرے شاعروں سے کم نہیں ہے، نثر میں سرشار، سدرشن اور پریم چند کا مرتبہ وہی ہے جو اُردو کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان افسانہ نگاروں یا ناول لکھنے والوں کا ہے، بلکہ مقابلہ کے طور پر سرشارؔ اور خاص کر پریم چند کی انفرادیت ان مسلمان

لکھنے والوں سے جو قدرتی طور پر اپنے ادب میں ماحولی اثر نہ پیدا
کرسکے کہیں زیادہ نمایاں ہوئی ہے

لوگ کہتے ہیں کہ ہمیشہ زبان و ادب میں استادانہ حیثیت
مسلمانوں ہی کی رہی، میں اس کو بھی تسلیم نہیں کرتا پچھلے زمانوں
کو چھوڑیئے موجودہ زمانے میں کئی ہندو بزرگ شخصیتیں ایسی ہیں
جن کی رہبری استادی کے اثرات ایک ہی وقت میں ہندو
مسلمان دونوں قوموں کے نوجوانوں کیلئے مشعل راہ بنتے رہے ہیں۔
پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی کو کون نہیں جانتا، ہندوستان
کے تمام مسلمان شاعر و ادیب ان کے استاد کو اسی طرح تسلیم کرتے
ہیں جس طرح ہندو شاعر و ادیب جناب شیدا دہلوی نے بغیر
ملت و مذہب پنجاب کے تمام اخباری حلقوں کو اخبار نویس بنایا
اسی طرح اگر بتلانے پر آیا جائے تو بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے

ہندی والوں کو اس کا پورا حق ہے کہ وہ ہندی ادب کو
زندہ یا صحیح لفظوں میں نئے سرے سے پیدا کرنے کیلئے جان توڑ کوشش
کریں۔ لیکن ان کو چاہیئے کہ وہ اردو زبان کو ہندی کا مقابل نہ
بنائیں۔ میں آج پھر اپنے اس خیال کو دہراتا ہوں کہ اگر انصاف سے
دیکھا جائے تو ملک میں زبان ایک ہی ہے، مگر اس کے طرز و اسلوب
مختلف ہیں۔ اُردو کے ہر لفظ کا ترجمہ کرکے ایک زبان بنانا،
ہرگز نئی زبان پیدا نہیں کرسکتا۔ میں اپنے کانوں سے سُنتا ہوں
کہ ہندی کے وہ شاعر بھی جو نئی بنی ہوئی ہندی زبان میں کوتا
لکھتے ہیں، بات چیت، اپنی کوتا کی زبان میں نہیں کرتے بلکہ اس
زبان میں بولتے ہیں جس دکھیا کو اُردو کہا جاتا ہے۔

یہ طریقہ اتنا ہی غیر فطری ہے جتنا ایک ہندوستانی کا عربی
اُردو فارسی میں شعر کہنا۔ مادری زبان وہ کہلائی جا سکتی ہے جس
میں بات چیت ہو...... اور بات چیت کی بولی ہی شاعری کی
بولی ہونی چاہیئے۔

تقریباً تین سال پہلے اردو شاعروں اور ادیبوں کے ایک
طبقے نے یہ نظریہ بنایا کہ محاورات اور ٹکسالی بولی کے خلاف شاعری
اور نثر کی زبان ہونی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ اپنے سارے
سامانوں کے ساتھ ناکام ہو چکا ہے اور آج اردو نثر و نظم میں جو کایا
پلٹ ہوئی ہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں لیکن اس کی بنیادوں
پر ایک بے ساختہ، سچا اور نیا اسلوب پیدا ہونے کی داغ
بیل پڑ گئی ہے۔

لیکن دوسری طرف ہندی والوں نے اس منزل میں
قدم رکھا ہے جس منزل سے اُردو والوں نے واپسی اختیار کرلی ہے۔
اس مثال کی موجودگی میں ہر عقلمند اور دور اندیش کا یہی
فیصلہ ہوگا کہ ہندی والے جس ڈگر پر جا رہے ہیں، وہ غلط ہے، اور
انھیں واپس ہوکر اس منزل پر آنا پڑے گا جس منزل پر اُردو والوں
کو آنا پڑا۔

اور وہ منزل کیا ہے —— !؟ وہ منزل زبان کی سادگی
اور بے ساختگی ہے جسے جنتا (عوام) زیادہ سے زیادہ سمجھ سکے، میں
پورے یقین کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کتابوں اور رسالوں کی ہندی
اور اُردو، عوام نہیں سمجھتے۔ آنے والے زمانے میں اس بولی کا
ادب کامیاب ہو سکے گا جسے عوام زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں گے
اور جو محض اونچے طبقوں کے گنے چنے لوگوں کے لئے مخصوص
نہ ہوگا۔

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء نمبر میں اس فہرست کا بڑا حصہ شائع کیا جائے گا
جس کے مطالعہ سے آپ جان سکیں گے کہ اردو زبان اور اُردو شعر و
ادب کوئی مسلمانوں کی جاگیر نہیں ہے، جیسا کہ بعض ہندو دوست
خیال کرتے ہیں۔

ساغر

فہرست

اُردو زبان کے ہندو شعراء ادیب اور اخبار نویس

شمارہ	نام	نوعیت	صوبہ اور شہر
۱	اوم پرکاش ساحر	شاعر	لاہور پنجاب
۲	پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی	〃	دہلی
۳	رگھوپتی سہائے فراق ایم اے	شاعر و ادیب	الہ آباد (یو پی)
۴	پنڈت جگموہن رینہ شوق ریٹائرڈ	شاعر	(یو پی) شاہجہانپور
	ڈپٹی کلکٹر		〃
۵	ظفر ادیب	〃	ملتان (پنجاب)
۶	پنڈت ٹھاکر دت ڈگشت	جرنلسٹ	یو پی
۷	رام پرشاد ناشاد ایم اے	شاعر	نامعلوم
۸	پروفیسر سنت پرشاد ناشاد ایم اے	〃	〃
۹	مسٹر رام جوایا خنداں	〃	راولپنڈی
۱۰	رائے سدھ ناتھ فراق بارہ بنکوی	〃	بارہ بنکی (یو پی)
۱۱	دیا نرائن نگم بی اے اڈیٹر زمانہ کانپور	ادیب اور جرنلسٹ	کانپور (یو پی)
۱۲	نازؔ لاہوری	شاعر	لاہور (پنجاب)
۱۳	تلوک چند محروم بی اے	〃	〃 〃
۱۴	بیرندر ناتھ منٹو ایم اے	〃	پنجاب
۱۵	جگن ناتھ آزاد	〃	〃
۱۶	سردار دیوان سنگھ اڈیٹر ریاست	جرنلسٹ	دہلی
۱۷	رام لال ورما اڈیٹر تیج	〃	〃
۱۸	منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی	شاعر و صاحب تصنیف	〃
۱۹	رام نرائن بھٹناگر اڈیٹر وطن دہلی	جرنلسٹ	دہلی 〃
۲۰	صوفی لچھمن پرشاد اڈیٹر رسالہ مستانہ جوگی	〃	لاہور
۲۱	انوپ چند	شاعر	پانی پت (پنجاب)
۲۲	نارائن داس طالب پانی پتی	〃	〃 〃
۲۳	جگر بریلوی	〃	بریلی (یو پی)
۲۴	اثر بریلوی	〃	〃 〃
۲۵	پنڈت آنند نرائن ملا ایم اے	شاعر و ادیب	لکھنؤ (یو پی)
۲۶	امر چند قیس جالندھری	شاعر	پنجاب
۲۷	کیلاش ناتھ شائق ورما ناز	〃	یو۔ پی
۲۸	مہر لال سونی ضیا فتح آبادی ایم اے	〃	لاہور (پنجاب)
۲۹			
۳۰	علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ	ادیب و شاعر و نقاد	〃
۳۱	کیفی دہلوی	افسانہ نگار و مصنف	
۳۲	نشتر ہنگامی	شاعر	یو پی
۳۳	رگھوندر راؤ جذب	〃	〃
۳۴	کرم چند اڈیٹر پارس	جرنلسٹ	لاہور (پنجاب)
۳۵	پیارے لال شاکر میرٹھی	شاعر و ادیب و جرنلسٹ	دہلی
۳۶	مسٹر لچھمن چند ودیارتھی	جرنلسٹ	نامعلوم
۳۷	روشن نکودری بی ایس سی (آنرز)	شاعر	پنجاب
۳۸	لکشمی چند نسیم	〃	〃
۳۹	روشن پٹیالوی	جرنلسٹ	پٹیالہ (پنجاب)
۴۰	پنڈت گوپی ناتھ امن لکھنوی	شاعر و جرنلسٹ	دہلی (یو پی)
۴۱	بسمل الہ آبادی مصنف جذبات بسمل	شاعر و صاحب تصنیف	الہ آباد (یو پی)
۴۲	بندرابن پرشاد طالب لکھنوی	شاعر	لکھنؤ (یو پی)
۴۳	راج بہادر اوج	〃	(یو پی)

۵۳

ایشیا

نمبر	نام	پیشہ	مقام
۴۴	رام نرائن ساجد	شاعر	یوپی
۴۵	رائے گوربل صاحب آزاد	"	حیدرآباد دکن
۴۶	نمارام سرکشن پرشاد شاد	شاعر و ادیب	"
۴۷	منشی جگناتھ پرشاد آزاد بی اے	شاعر	پنجاب
۴۸	منشی جگدیش سہائے سکینہ بی اے ایل ایل بی	"	یوپی
۴۹	بھٹناگر گشتہ	"	"
۵۰	مسٹر دیش راج سروش	"	"
۵۱	لال جگی رعنا بی اے	"	نامعلوم
۵۲	گنگا دھر فرحت بی اے ایل ایل بی	"	یوپی. کانپور
۵۳	جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی	ڈرامہ نگار	بریلی یوپی
۵۴	شائق ہندو	شاعر	"
۵۵	ہری کشن ایم اے	"	"
۵۶	بدری پرشاد شاطر الہ آبادی	"	"
۵۷	ٹھاکر جے آر	جرنلسٹ	پنجاب
۵۸	مہاشہ جیمنی سرشار	شاعر	"
۵۹	ہری کشن روز	"	یوپی
۶۰	مدھر بہاری لال	"	"
۶۱	سوانند سکینہ جلال ایم اے	"	لکھنؤ (یوپی)
۶۲	منشی دوارکا پرشاد گہر لکھنوی	"	"
۶۳	نوبت رائے نظر لکھنوی	شاعر و ادیب	"
۶۴	منشی اقبال ورما سحر ہنگامی	"	ہنگاؤں یوپی
۶۵	سردار اودے سنگھ شائق	شاعر	لاہور (پنجاب)
۶۶	دینا ناتھ مست کشمیری صدر	"	سری نگر (کشمیر)
۶۷	بزم اردو جموں		
۶۸	منوہر لال ہادی	"	پنجاب
۶۹	پرشوتم لال ضیا مدراسی	"	"
۷۰	سردار تخت سنگھ	"	"
۷۱	سادھو رام آرزو سہارنپوری	"	سہارنپور (یوپی)

نمبر	نام	پیشہ	مقام
۷۲	چھنی لال مہروترا شیدا امروہوی	شاعر	امروہہ (یوپی)
۷۳	حکیم برجموہن لال اثر	"	یوپی
۷۴	دیا شنکر حیراں بی اے ایل ایل بی	"	"
۷۵	راجندر نرائن سکینہ بسمل شائق	"	"
۷۶	ہر سروپ بہوگی مراد آبادی	"	مراد آباد (یوپی)
۷۷	شنکر سہائے بلگرامی بی اے ایل ایل بی	"	بلگرام یوپی
۷۸	یادرام جرنلسٹ بلند شہری	جرنلسٹ	بلند شہر یوپی
۷۹	پرشوتم داس آریہ داغ	شاعر	یوپی
۸۰	پروفیسر دھیرج لال صابر علیگ	"	علی گڑھ یوپی
۸۱	روشن لال دیوانہ	جرنلسٹ	لاہور (پنجاب)
۸۲	پنڈت انند بہاری	"	لاہور
۸۳	مہتہ ستیہ پال	"	"
۸۴	کشن لال ثاقب بریلوی	شاعر	بریلی یوپی
۸۵	پنڈت میلارام وفا	"	لاہور (پنجاب)
۸۶	گردھرن لال ادیب ایم اے	شاعر و افسانہ نگار	یوپی
۸۷	مہتہ عجیب چند ضیا	"	مانڈلے
۸۸	ہرچرن لال مصنف انمول جواہرات	مصنف	آگرہ یوپی
۸۹	لالہ کانشی رام چاولہ مصنف پریم ترنگ	"	پنجاب
۹۰	گیندن لال بینوا	شاعر	پیلی بھیت (یوپی)
۹۱	مہاشہ سدرشن	مشہور افسانہ نگار	لاہور پنجاب
۹۲	منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی	شاعر و جرنلسٹ	دہلی
۹۳	دھرم پال گپتا وفا دہلوی	"	"
۹۴	پرکاش چندر جین مونس سیوہاروی	"	یوپی
۹۵	بھوپیندر ناتھ اندر بی اے	جرنلسٹ	پنجاب
۹۶	امیر سنگھ ناصر سیہوروی	شاعر	سیہور (یوپی)
۹۷	چندو لال اختر بی اے،	"	دہلی
۹۸	ایل ایل بی وکیل دہلی		
۹۹	بلدیو شرما	جرنلسٹ	لاہور (پنجاب)

ایشیا

۱۰۰	لالہ شنکر لال رئیس اعظم دہلی	شاعر	دہلی
۱۰۱	لالہ یوگراج	جرنلسٹ	یوپی
۱۰۲	جگدیش بھٹناگر شاغل	شاعر	اورنگ آباد (دکن)
۱۰۳	بہارتی	”	لاہور (پنجاب)
۱۰۴	بخشی رام بھایا ساحر	”	امرتسر (پنجاب)
۱۰۵	سروجنی دیوی اڈیٹر آکاش	شاعرہ	جالندھر (پنجاب)
۱۰۶	ندیم دولتالوی	شاعر	امرتسر (پنجاب)
۱۰۷	جگدیش راج بھلہ لاہور	”	پنجاب
۱۰۸	پشپا کماری چنچل	شاعرہ	”
۱۰۹	چاند پنڈت لاہور	شاعر	”
۱۱۰	فدا پٹیالوی	جرنلسٹ	”
۱۱۱	ہری پرکاش جگی	شاعر	لاہور (پنجاب)
۱۱۲	راجندر ناتھ شیدا	”	مظفر نگر (یوپی)
۱۱۳	شمبھو ناتھ دانش	”	سیوہارہ (یوپی)
۱۱۴	پنڈت نظر سوہانوی	”	یوپی
۱۱۵	اندر جرنلسٹ	جرنلسٹ	”
۱۱۶	شاد پوروی	شاعر	پنجاب
۱۱۷	مس لاسکینہ پیلی بھیتی	شاعرہ	پیلی بھیت (یوپی)
۱۱۸	نانک چند عشرت ایم اے	شاعر	دہلی
۱۱۹	پرشوتم لال ضیا	”	”
۱۲۰	پریم چند (مرحوم)	مشہور افسانہ نگار ناولسٹ وادیب	یوپی
۱۲۱	ڈاکٹر ستیہ پال کانگریس لیڈر ایڈیٹر "کانگریس"	جرنلسٹ	لاہور (پنجاب)
۱۲۲	چکبست لکھنوی (مرحوم)	شاعر وادیب	لکھنؤ (یوپی)
۱۲۳	نارائن پرشاد مہر	شاعر	پنجاب
۱۲۴	کرشن چند ایم اے۔	ادیب	”
۱۲۵	دیاسدیو دانش	شاعر	”
۱۲۶	پروفیسر نند کشور جہنگن	ادیب	”

۱۲۷	پنڈت اندرجیت شرما	شاعر	ماچھرہ ضلع میرٹھ
۱۲۸	لالہ دیوی چند جی ایم اے	جرنلسٹ	ہوشیارپور (پنجاب)
۱۲۹	ہرگوردیال ایم اے	ادیب، شاعر	پنجاب
۱۳۰	گوربخش سنگھ مخمور	شاعر	آگرہ یوپی
۱۳۱	منشی حب لال رعد	”	گوالیار
۱۳۲	نرائن پرشاد مہر	”	”
۱۳۳	فدا دہلوی	”	مقیم گوالیار
۱۳۴	رنگیشور دیال ایم اے	”	بلند شہر یوپی
۱۳۵	منوہر لال منوہر	”	پنجاب
۱۳۶	سندر لال حمید ایل ایل بی	”	”
۱۳۷	اودھم سنگھ	”	”
۱۳۸	شیام سندر ودیارتھی	”	دہلی
۱۳۹	سرداری لال نشتر	”	یوپی (میرٹھ)
۱۴۰	لالہ آسارام	ادیب	پنجاب
۱۴۱	بشن داس صاحب گلشن	شاعر	”
۱۴۲	کنول داس تاثیر	”	”
۱۴۳	کلیان چند حسرت	”	فیروزپور پنجاب
۱۴۴	شیر سنگھ شمیم	”	فرخ آباد یوپی
۱۴۵	شوری لال اختر	”	پنجاب
۱۴۶	روشن لال نسیم	”	”
۱۴۷	جگناتھ پرشاد	ادیب	یوپی
۱۴۸	لکشمی نرائن متی	شاعر	جے پور (راجپوتانہ)
۱۴۹	پنڈت چرنجی لال فانی	”	دہلی
۱۵۰	مسٹر امرت لال امرت	شاعر	نامعلوم
۱۵۱	پیارے لال رونق	”	”
۱۵۲	دریا پرشاد سرور	شاعر، ادیب	جالندھر پنجاب
۱۵۳	کملا ناہید موہنی	شاعرہ	پنجاب
۱۵۴	برجیندر سنگھ عارف	”	یوپی
۱۵۵	برہم سروپ سوتی غار	”	یوپی (میرٹھ)

۱۵۶	بھیم سین سرشار	شاعر	ساہن وال (پنجاب)
۱۵۷	مسٹر کرشن لال ادیب ایم اے لکھنوی	شاعر	مظفر نگر
۱۵۸	ٹھاکر سکھ لال سنگھ روزنہ	شاعر	پنجاب
۱۵۹	کرشن کماری	شاعرہ	"
۱۶۰	پرمانند آزاد	شاعر	امرتسر پنجاب
۱۶۱	پنڈت پیارے لال شرما آزاد (میرٹھی)	شاعر وادیب	میرٹھ
۱۶۲	(کانگریس لیڈر و سابق وزیر تعلیم یوپی)	و جرنلسٹ	
۱۶۳	دین دیال بھاٹیہ	جرنلسٹ	لاہور
۱۶۴	کلونت کماری ناز مدیرہ "سہیلی"	"	پشاور (سرحد)
۱۶۵	کرتار سنگھ	"	لاہور پنجاب
۱۶۶	اخگر فیروز پوری وکیل	شاعر	فیروز پور پنجاب
۱۶۷	گوپال	"	پنجاب
۱۶۸	کرشن چند	ڈرامہ نگار	"
۱۶۹	تارا شنکر ناشاد ایم اے	افسانہ نگار	یوپی
۱۷۰	پنڈت دیودت شرما بی ایس سی	ڈرامہ نگار	امرتسر پنجاب
۱۷۱	میلا رام ماہر	شاعر	پنجاب
۱۷۲	چمن سنگھ جوش	فسانہ نگار	سہارنپور یوپی
۱۷۳	کرشن چند خورشید	شاعر	مظفر گڑھ پنجاب
۱۷۴	دیا بہادر وطن	"	لاہور پنجاب
۱۷۵	شانتی سروپ کیف	"	نامعلوم
۱۷۶	سورج پرکاش	جرنلسٹ	پنجاب
۱۷۷	گرسا صاحب	شاعر	پانی پت
۱۷۸	بشن داس زار	"	یوپی
۱۷۹	گوبند پرشاد سنوی ایم اے	ادیب و نقاد	انسوہ یوپی
۱۸۰	برق دہلوی مرحوم	شاعر	دہلی
۱۸۱	سنت رام ایم اے	ادیب	یوپی
۱۸۲	سوتی رام فرحت	شاعر	پنجاب
۱۸۳	منوہر لال دل	"	نامعلوم
۱۸۴	جگن ناتھ عابد	جرنلسٹ	"

۱۸۵	لالہ رام پرشاد جی بی اے	جرنلسٹ	ساہن وال (پنجاب)
۱۸۶	وتستہ پرشاد فدا بی اے	شاعر و صاحب تصنیف	دہلی
۱۸۷	للت پرشاد اختر مرحوم	شاعر وادیب	سہارنپور یوپی
۱۸۸	بھائی پرمانند جی ایم اے ایل ایل بی	اخبار نویس وادیب	لاہور (صوبہ پنجاب)
۱۸۹	لالہ دونی چند انبالوی وائس پریذیڈنٹ		
۱۹۰	پراونشل کانگریس کمیٹی	جرنلسٹ	لاہور (صوبہ پنجاب)
۱۹۱	جمنا داس اختر ایڈیٹر بھارت ماتا	"	"
۱۹۲	بالکشن بترا آبر بی اے ایل ایل بی	شاعر	ملتان
۱۹۳	پریذیڈنٹ سناتن دھرم ہائی اسکول		
۱۹۴	سردار امر سنگھ ایڈیٹر شیر پنجاب	"	لاہور (صوبہ پنجاب)
۱۹۵	مہاشہ کرشن ایڈیٹر ملاپ	جرنلسٹ	لاہور
۱۹۶	چمن لال	"	"
۱۹۷	جوش ملسیانی	شاعر	پنجاب
۱۹۸	بال مکند لال عرش ملسیانی	"	"
۱۹۹	رنبیر بی اے ایڈیٹر ملاپ	جرنلسٹ و شاعر	لاہور پنجاب
۲۰۰	اپیندر ناتھ اشک	افسانہ نگار	" "
۲۰۱	ہر بھگوان شاد	شاعر	راولپنڈی
۲۰۲	ہربنس لال نسیم	"	"
۲۰۳	منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی	"	لکھنؤ یوپی
۲۰۴	رائے سدرشن ناتھ بلی فراق دریا آبادی	"	دریاآباد "
۲۰۵	پنڈت تربھون ناتھ صاحب زار دہلوی	"	دہلی
۲۰۶	منشی چندر بھان کیفی دہلوی	"	"
۲۰۷	شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی بی اے	شاعر وادیب	بریلی۔ یوپی
۲	منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی	شاعرہ	دہلی
۲۰۹	کالی چرن صاحب آثر دہلوی	شاعر	"
۲۱۰	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی)	ادیب و نقاد	لاہور پنجاب
۲۱۱	مسٹر گیان پرکاش اختر بریلوی	نثر نگار و نقاد	بریلی (یوپی)

ایشیا

نمبر	نام	حیثیت	مقام
۲۱۲	منشی رام شنکر پرشاد مرحوم	جرنلسٹ	لکھنؤ۔ یوپی
۲۱۳	رام سہائے تمنا مرحوم	ناثر و شاعر	״
۲۱۴	نسیاں لکھنوی مرحوم	شاعر	״
۲۱۵	پنڈت برج ناتھ شرفہ ایم اے ایل ایل، بی وکیل	شاعر و اخبار نویس	״
۲۱۶	منشی کندن لال قمر سہارنپوری	شاعر	سہارنپور ״
۲۱۷	بابو جگت موہن لال رواں ایم اے مرحوم	شاعر و ادیب	اناؤ۔ یوپی
۲۱۸	منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی مرحوم	شاعر	لکھنؤ۔ یوپی
۲۱۹	منشی پیارے لال رونق دہلوی مرحوم	شاعر اخبار نویس	دہلی
۲۲۰	راج بہادر رشیر دہلوی	شاعر	״
۲۲۱	حکیم مدن لال مدن دہلوی	״	״
۲۲۲	پنڈت دینا ناتھ معجز بی اے مرحوم	״	״
۲۲۳	جگدمبا پرشاد قیصر لکھنوی مرحوم	״	لکھنؤ۔ یوپی
۲۲۴	آنریبل سر تیج بہادر سپرو	ادیب	الہ آباد۔ یوپی
۲۲۵	ڈاکٹر بھگوان داس	״	״ ״
۲۲۶	مسٹر سچدانند سنہا بار ایٹ لا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی	״	״ ״
۲۲۷	مسٹر کدار ناتھ خورشید	جرنلسٹ	لاہور۔ پنجاب
۲۲۸	دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن	شاعر	״ ״
۲۲۹	پنڈت رام ناتھ آغا	״	الہ آباد۔ یوپی
۲۳۰	پنڈت آنند کرشن آنند گیرلو	״	بجنور۔ ״
۲۳۱	پنڈت سروپ نرائن رازداں ایس بی اے	״	امرتسر (پنجاب)
۲۳۲	پنڈت پرتھی ناتھ صاحب شوق	״	الہ آباد۔ یوپی
۲۳۳	پنڈت نندلال کول طالب ایم اے	״	کشمیر
۲۳۴	پنڈت رنجیت سنگھ عاشق	״	پریم نگر لاہور (پنجاب)
۲۳۵	دیوان کیشو داس عاقل بی اے	شاعر	لاہور پنجاب
۲۳۶	پنڈت کرشنا کانت مالوی ایم ایل اے (کانگریس لیڈر)	شاعر و ادیب	الہ آباد (یوپی)
۲۳۷	پنڈت سندر لال (کانگریس لیڈر)	ادیب و مورخ	״ ״
۲۳۸	پنڈت شو نارائن بیدراج مذاق دہلوی	شاعر	دہلی
۲۳۹	پنڈت کامتا پرشاد سکھیا سرور	״	بجنور (یوپی)
۲۴۰	پنڈت لکشمی نرائن ہشیار	״	پرتاب گڑھ اودھ
۲۴۱	پنڈت کنور گوری پرشاد ہمدم	شاعر و جرنلسٹ	آگرہ (یوپی)
۲۴۲	کرنل بھولا ناتھ آئی، ایم، ایس	شاعر	״
۲۴۳	نانک لکھنوی	״	لکھنؤ
۲۴۴	ڈاکٹر تارا چند صدر ہندوستانی اکیڈمی	ماہر زبان و ادب	الہ آباد (یوپی)
۲۴۵	پریم ناتھ بزاز	جرنلسٹ	کشمیر
۲۴۶	دیپ چند	״	دہلی
۲۴۷	لالہ رام سرن سنگھ	״	״
۲۴۸	شمبھو ناتھ چوپڑا ڈیر سوراجیہ	״	״
۲۴۹	دیوان چند شرما اڈیٹر ہفتہ وار آریہ گزٹ	״	״
۲۵۰	ولیسراج صاحب اڈیٹر نوجوان	״	لاہور پنجاب
۲۵۱	چرنجی لال پریم اڈیٹر آریہ	جرنلسٹ و شاعر	״ ״
۲۵۲	ڈی آر دوھان اڈیٹر سدا بہار	جرنلسٹ	״ ״
۲۵۳	گوربخش سنگھ بی۔ ایس۔ سی اڈیٹر "پریت لڑی"	״	״ ״
۲۵۴	ڈاکٹر آر، این لائل	״	کلکتہ۔ بنگال
۲۵۵	حکیم ولیسراج اڈیٹر امرت	״	لدھیانہ۔ پنجاب
۲۵۶	شادی رام شاد	شاعر	میرٹھ (یوپی)
۲۵۷	ست ہرش۔ اڈیٹر اخبار ہندو	جرنلسٹ	ہردوار (یوپی)
۲۵۸	مہابیر پرشاد اڈیٹر وجے	״	مظفر نگر۔ یوپی

۵۷

ایشیا

۲۵۹	دیوی چند ربسمل اڈیٹر "مزدور"	شاعر	کیرانہ یو۔پی
۲۶۰	جمنا داس آتر اڈیٹر "بھارت ماتا"	جرنلسٹ	لاہور۔ پنجاب
۲۶۱	ساحر سنامی	جرنلسٹ و شاعر	پٹیالہ۔ پنجاب
۲۶۲	میلا رام کوہلی	جرنلسٹ	لاہور۔ "
۲۶۳	منشی پنجاب رتن	شاعر	پٹیالہ۔ "
۲۶۴	منوہر لال شہلاؔ بی اے	"	لاہور "
۲۶۵	حکیم امیر چند بیدارؔ	شاعر	(یو۔پی)
۲۶۶	شانتی سروپ نشاطؔ	"	جموں۔ کشمیر
۲۶۷	خورسند بہادر سیامؔ ایم، اے	ادیب و مصنف	پنجاب
۲۶۸	لالہ شگن چند روشنؔ بی، اے، ایل، ایل، بی۔ وکیل	شاعر	پانی پت پنجاب
۲۶۹	پنڈت گوپی ناتھ تنہاؔ ایڈوکیٹ (کانگریس لیڈر)	شاعر	میرٹھ یوپی
۲۷۰	سیوک رام باصر لاہور	ادیب جرنلسٹ	پنجاب
	لالہ کرشن چندر لطیفؔ بی۔ اے بی، ٹی	ادیب	"
۲۷۱	پنڈت دلارام صاحب رتنؔ منشی فاضل	شاعر	"
۲۷۲	پریم سیانوی		یوپی
۲۷۳	گوربخش سنگھ صاحب گوہرؔ	شاعر و مصنف	پنجاب

اوپر کی فہرست میں قدیم و جدید بزرگ و نوجوان، اور مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے ہندو شعراء، ادیب اور اخبار نویس حضرات کے نام درج کیے گئے ہیں؛ تاہم غیر مشہور اصحاب کے مقابلہ میں کافی حضرات ایسے ہیں جن کو اُردو ادب و صحافت میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے اور مشاہیر میں اپنا ایک درجہ رکھتے ہیں؛ آئندہ نمبر میں ان اصحاب کے متعلق تفصیل کیساتھ لکھا جائیگا؛ اور باقی فہرست بھی شائع کی جائیگی۔

ساغر

جنگ کے جرائم

جنگ کی یقینی وجہ کیا ہے ؟
آدمی لڑتے کیوں ہیں ؟ جبکہ وہ امن کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں ؟
قومیں اپنے خزانوں کو تخریب کے لئے کیوں خالی کرتی ہیں جبکہ تعمیر کے لئے انھیں خزانوں کی ضرورت ہوتی ہے ؟
آدمی امن کی ہنستی کھیلتی زندگی کے بجائے جنگ کی مہلک بیماریوں کو کیوں پسند کرتا ہے ؟

فرض کیجیے کہ ہم ڈاکٹر ہیں اور دنیا ہمارے زیر علاج ہے اور ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ مریض جنگ کے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ کامل تحقیق کے بعد ہم نے مرض اور مریض دونوں کو سمجھنے کے لئے ایک خاکہ بنایا ہے جو ہمیں مرض کی سطح تک پہونچا سکتا ہے۔ آیئے ہم آپ سوچیں اور ایک نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں۔

جنگ اور وطنیت

جنگ کے مرض کی بڑی وجہ صرف یہ ہے ․ ․ ․ ․ وطنیت ! ؟ انسان میں محبتِ وطن کا جذبہ بیا اس زہر سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔ جو انسانوں کو مذمنہ امراض میں مبتلا کرتا ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ میری ہنسی اڑائیں گے ! آپ مجھے غدار کہیں گے۔ آپ مجھے ٹوڈی کا خطاب دیں گے اور نہ معلوم کن کن ناموں سے یاد کرینگے
․ ․ ․ ․ مجھے سب قبول ! مجھے آپ کا ہر فیصلہ جس کا تعلق میری ذات سے ہے ․ ․ ․ ․ منظور ! اس باپ کی طرح جو اپنی اولاد کو گھناؤنے اور خطرناک انسانی امراض سے پوری
طرح واقف نہیں کرتا۔ میں اپنے کو مجرم اور بیوقوف سمجھوں گا۔ میرا یہ جرم عالمگیر انسانی برادری کے خلاف ہوگا۔ اس لئے مجھے عیسیٰ ․ ․ ․ ․ کی طرح آپ کے خلاف ذہنی
بغاوت کرنے کے جرم میں سولی پر لٹکنے سے انکار نہیں۔ سنگسار ہونے سے میں نہیں ڈرتا۔ جو کچھ میں نے معلوم کیا ہے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں دوسرے حکیموں نے
اور بھی اس بارے میں جو تحقیق کی ہے اس کی خبر میں آپ کو ضرور دوں گا۔ میں اسے اپنا انسانی فرض سمجھوں گا ․ ․ ․ اور میں آپ کو اس مرض میں مبتلا نہ ہونے دوں گا
․ ․ ․ ․ شراب کی طرح وطنیت کے زہر میں بھی نشہ ہے، لذت ہے، خمار ہے، کیف ہے، مستی ہے لیکن شراب ہی کی طرح وطنیت کے زہر میں تباہی ہے۔ بربادی ہے
جس طرح وہ ڈاکٹر جو مریض کو دوا کے طور پر شراب دے کر ایک مستقل نشہ کی دعوت دیتا ہے میں اگر ڈوبتی ہوئی قوموں کو وطنیت کی دوا پیش کروں
تو میں انھیں مستقل تباہی کی طرف لے جاؤں گا، اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ یہ عالمگیر برادری کو بتا دیا جائے کہ وطنیت مہلک ترین زہر ہے۔ گناہ عظیم ہے، یہ
گناہ صرف ایک ملک والوں کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ جرمن وطن پرست اتنا ہی گنہگار ہے جتنا کہ برطانوی وطن پرست یا امریکن وطن پرست، اطالوی وطن
پرست یا پول وطن پرست یا ہندوستانی وطن پرست۔ وطن پرستی کا لفظ کھوکھلا ہے ․ ․ ․ ․ بے معنی ہے، یہ صحیح ہے کہ قوموں کی تاریخیں اسی ایک لفظ کی مرہون

منّت ہیں۔ صدیوں سے وطن کی خاطر قربانی اور مرگ آسا بہادری کی تاریخیں رنگی جا رہی ہیں۔ لیکن، اب وقت آگیا ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے اس لفظ کے معنی بدل گئے، اس کا مفہوم بدل گیا۔ اس کی خصوصیّات بدل گئیں اور یہ معلوم کر لیا گیا کہ یہ صرف زہر ہے جو امراضِ مزمنہ کے زہر کی طرح صدیوں سے قوموں کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہے اور علاج کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کو جڑ سے کاٹ دیا جائے ان کے ذہن و دماغ میں ایسی برقی لہر دوڑائی جائے جو اس لفظ کو راکھ کر دے اور مریض طبعی فرحت حاصل کر کے صحت پا جائے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ وطنیّت کا جذبہ فطری ہے؟ ہم میں سے بیشتر لوگ اس خیال کی گود میں پروان چڑھتے ہیں کہ ہر شریف اور با عزت آدمی وطن کی محبّت کی حرارت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس بیان میں کتنی حقیقت ہے، یہ صرف ایک معمولی مثال سے معلوم کیا جا سکتا ہے، ایک جرمن ایک فرانسیسی اور ایک برطانوی بچے کو پیدا ہوتے ہی لے کر ایک غیر آباد جزیرے میں چلے جایئے اسوقت وہ معصوم بھولے بھالے بچّے آپ کے دست نگر ہوں گے وہ کبھی وطن پرست نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ اُن کے دل و دماغ میں اُن کے وطن کی محبت نہ ڈالیں اور فرض کریئے کہ آپ ہندوستانی ہیں اور صرف ہندوستانی بولتے ہیں اور آپ ہی اُن کی پرورش بھی کر رہے ہیں سوچئے کہ کیا آپ ان بچّوں کو صرف اس بنا پر اپنے لئے غیر قدرتی سمجھیں گے کہ وہ Deutschland uber Alles یا Vive La France یا Long Live Britain کے نعرے نہیں بلند کر سکتے،

اس طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وطنیّت کا جذبہ صرف بچپن کی تعلیم کا نتیجہ ہے، ہم بھارت ماتا کہتے ہیں۔ ماتر بھومی کہتے ہیں۔ بندے ماترم بولتے ہیں۔ انگریز مدر انگلینڈ کہتا ہے۔ جرمن فادر لینڈ کہتا ہے۔ اسی طرح اطالوی، فرانسیسی، امریکن، پول ترک، چینی اور دوسری تمام قومیں اسی قسم کا نام لیتی ہیں اور فخر کرتی ہیں۔ دنیا کے بیشتر ذہنی لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ وطنیّت کا جذبہ فطری ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ یہ خونی اور نسلی رشتہ داری نتیجہ ہے ایک جغرافیائی حادثہ کا، بہت ساری قوموں کی سرحدیں نتیجہ ہیں صرف حادثات کا۔ سیاسی پہیئے کی ایک کروٹ کا۔ یہ ساری حدیں غیر قدرتی ہیں، رسمی ہیں اور کروڑوں غیر قدرتی تعلیم کے تحت جغرافیائی حادثات کی خاطر تاریخی رسوم کے زیرِ اثر ہوش میں آتے ہی یہ سکھائے جاتے ہیں کہ زمین کے ایک ٹکڑے، عالمگیر برادری کے ایک حصّہ کو ویسی ہی محبت اور عقیدت کی نظروں سے دیکھیں جیسے وہ اپنی اُن ماؤں کو دیکھتے ہیں جن کے پیٹ سے وہ پیدا ہوتے ہیں، جب میں سُنتا ہوں کہ تو میرا خون ہے تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میرا گوشت ہے، تو میں بھی اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ جب تک آدمی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا رہے گا وہ اس عورت کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھیگا جس کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، دنیا میں ہزاروں انقلاب آئیں گے لیکن محبّت کا یہ جذبہ جیتا جاگتا ہی رہے گا، اس لئے کہ یہ فطری جذبہ ہے۔

اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وطن کی محبّت کا جذبہ فطری نہیں ہے۔ خوف، خطرہ، حسد، توہمات اور رسمیّات، یکطرفہ فیصلوں، خواہ مخواہ کی طرفداری اور جانبداری اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے مِل جُل کر وطنیّت کا جذبہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

حادثہ پر فخر

اتنا کچھ سُنکر آپ سے نہیں رہا جاتا۔ آپ کے دماغ میں طوفان اُٹھنا شروع ہوتا ہے اور آپ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ غالباً اس سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ یہ فخر کا جذبہ حصول یا کامیابی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ سمجھے نہیں تو آیئے میں آپ کو دوسری طرح سمجھا دوں شاید آپ اس بات میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ آدمی کسی ایسی بات پر فخر کرنے کا حق نہیں رکھتا جو اس نے نہیں کی ہے، آدمی شکر گذار ہو سکتا ہے اپنی موروثی دولت، تندرستی، حسن اور جمال کے لئے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے آپ کو انکار نہیں ہوگا کہ آدمی کو اپنی موروثی دولت اور موروثی خوش جمالی پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی آدمی ایسا کرتا ہے، آپ خود ہی اُس کو بے وقوف جماؤ رنگ جمانے والے کا خطاب دیتے ہیں۔ آپ اُس کی خود ستائی کو پسند نہیں کرتے، آپ کہتے ہیں کہ وہ شخص اپنے مُنھ میاں مٹھو بنتا ہے، وہ مغرور ہے، کسی صفت کے لئے شکر گذار ہونا دوسری بات ہے۔ مغرور ہونا دوسری بات ـــــ!
پھر آپ مجھے بتائیں کہ آپ کو اپنے ہندوستانی ہونے پر کیوں ناز ہے۔ کیا اس کا صرف ایک یہی جواب نہیں ہے کہ آپ کو اُس حادثہ پر فخر ہے۔ جس نے آپ کو ایک

خاص کرے یا کوٹھری میں پیدا کیا؟ ـــ کیا اس کا دوسرا جواب بھی ہے؟ میرے خیال میں نہیں!

براہِ کرم مجھے سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے۔ شاید آپ یہ کہنا چاہیں کہ آپ کو ہندوستان پر فخر ہے ـــ آپ کو اس ملک پر فخر ہے جس نے بودھ، کرشن، ٹیگور اور گاندھی پیدا کئے،

ہم یہاں پر ملکوں کی خصوصیات پر بحث نہیں کر رہے ہیں، ہم ایک حادثہ پر بحث کر رہے ہیں۔ پیدائش کا حادثہ!؟ کیا آپ کو اس حادثہ پر فخر ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ صرف ایک حادثہ پر کس طرح فخر کر سکتے ہیں! آپ یقیناً ایک حسنِ اتفاق کے لئے شکر گذار ہو سکتے ہیں۔ مگر فخر اور غرور ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔ آپ اگر غور کریں گے شاید آپ انگلستان پر فخر کرنے اور انگریز ہونے پر فخر کرتے میں جو بڑا فرق ہے اُسے سمجھ سکیں گے، یہ فرق حدِ طبعی ہے۔ میں خود بھی آپ کی طرح اس زمینی ستارے کے اُس زمین کے ٹکڑے پر فخر کرتا ہوں جس نے بودھ اور کرشن اور ٹیگور اور گاندھی جیسی ہستیاں پیدا کیں، لیکن شاید آپ میرا منہ نہ نوچیں گے اگر میں ساتھ ہی یہ کہوں کہ مجھ کو اسی طرح انگلستان پر فخر ہے۔ کیونکہ انگلستان نے شکسپیر اور انگلس کو پیدا کیا۔ مجھے جرمنی پر فخر ہے جس نے مارکس اور بیتھوون کو پیدا کیا۔ اور مجھے اٹلی پر بھی فخر ہے جس نے آرٹ اور نغمے کے سہانے رنگ ورو پے دنیا کو مدھر بنایا!

مگر آپ بےچین ہو کر کہتے ہیں کہ یہ بات اُن باتوں سے زیادہ گہری ہے۔ عقل اور غور و خوض سے زیادہ اس کا تعلق جذبات سے ہے، آپ بےچین ہو جاتے ہیں اور چیخ اُٹھتے ہیں، ہندوستان سے میں کیوں نہ محبت کروں، ہندوستان! جو جنت نشان ہے جو سارے جہان سے اچھا ہے، ہندوستان جس کی رگ رگ میں مستی ہے، نشہ ہے، یہاں کے پھل پھول، یہاں کے چرند، پرند سب بے نظیر ہیں۔ آبشاروں کے راگ، دریاؤں کے نغمے، پہاڑوں کے گیت، میں اسے کیسے پیار نہ کروں، اُس ملک سے مجھے کیسے عشق نہ ہو جہاں صبح عبیر اور عنبر میں نہا کر اُٹھتی ہے اور جہاں رات بھی چاندی اور سونے میں لپٹ کر سوتی ہے۔ ہندوستان ہندوستان ہی ہے، مجھے اس ملک کے راجاؤں اور رانیوں سے محبت ہے اس کے پرچم سے محبت ہے، اُس کے نغمہ و جنگ سے محبت ہے اور جب میں اس ملک سے باہر دور کسی دوسرے ملک میں غریب الوطن ہوتے ہوئے یہ سوچتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں تو میری رگ رگ پھڑک اُٹھتی ہے، فخر سے میرا سینہ تن جاتا ہے ....!!!!

کیا یہ خالص خود ستائی نہیں ہے؟ کیا یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہیں ہے؟ کیا یہ مغرور ہونے کے انداز نہیں ہیں؟

میرے دوستو یہی وہ جذبہ ہے جو آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ معاشی زندگی میں غرور اور فخر کا جذبہ جب بڑھتا ہے تو انقلاب برپا ہو جاتا ہے، اور جب قومی فخر و غرور کا جذبہ پھیلتا ہے تو جنگ ہو جایا کرتی ہے۔ آپ جو کچھ اپنے ہندوستان کے لئے فخریہ کہتے ہیں، انگریز انگلستان کے لئے، اطالوی اطالیہ کے لئے، فرانسیسی فرانس کے لئے اور دوسرے ملک والے اپنے اپنے ملکوں کے لئے کہتے ہیں اور یہی خود نمائی اور خود ستائی نتیجہ ہوتی ہے عالمگیر ہلاکت کا۔ آپ کی صرف اپنے وطن سے محبت آپ کے لئے مہلک بن جایا کرتی ہے۔ صرف اپنے ملک سے آپ کی محبت ایک عالمگیر جنگ پیدا کر سکتی ہے، وہ جنگ جو آپ کو مجبور کرے گی کہ آپ دوسرے تمام لوگوں سے نفرت کریں جو آپ ہی کی طرح اپنے اپنے ملکوں پر فخر کرتے ہیں۔ آپ دونوں ایک ہی جذبہ کی خاطر ایک دوسرے کی جان لیں گے، ایک دوسرے کا خون پئیں گے۔ وہ جذبہ جو آپ دونوں کو عزیز ہے اور آپ دونوں تباہ ہو جائیں گے جس طرح تاج محل کے ذرّات فضا میں بکھر جائیں گے اُسی طرح ٹاور آف لندن، برلن میں اولمپیا کی عمارتیں، وینس کا سین مارکو، قسطنطنیہ کی مساجد اور روس کے کارخانے بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے اس لئے کہ ان سے ان کے ملک والوں کو ایسی محبت ہے جس میں دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اور کسی دوسرے ملک کا آدمی فخر کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔

عالمگیر بھائی چارہ

میں ایک عالمگیر بھائی چارہ کی دعوت دیتا ہوں۔ بین الاقوامی خیالات میں ایک عالمگیر انقلاب چاہتا ہوں یہ انقلاب صرف ایک نسل کی زندگی میں بغیر کسی خرچ کے نہایت آسانی سے انجام دیا جا سکتا ہے، آپ یہ کہیں گے کہ آپ کے انٹرنیشنل ہونے سے فائدہ! جبکہ دوسری تمام قومیں قومیت اور وطنیت پر روز بروز

رہی بھی جارہی ہیں۔ انگریزوں یا جرمن یا ہندوستانیوں کو اپنے پڑوسی سے محبت کرنے سے کیا فائدہ جبکہ سارے پڑوسی خود غرض ہیں اور صرف اپنے سے محبت کرتے ہیں ـــــــ !؟

اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ پہلی غلط فہمی تو یہی ہے کہ دوسری قومیں روز بروز قومیت اور وطنیت کی گہرائیوں میں ڈوبتی جارہی ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں کثیر تعداد میں بین الاقوامی تحریکیں اُبھرنے کی برابر کوشش کرتی رہتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی تحریکیں بڑھنے نہیں دی جاتیں اور پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، اطالوی پریس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا ہے۔ فرانسیسی پریس زیادہ تر ہتھیاروں کے سوداگروں کے زیر اثر ہے۔ جرمنی میں ہر ایڈیٹر کے سینہ پر ایک سپاہی کا بھوت بیٹھا ہوتا ہے۔ پھر اس کے یہ معنی کس طرح ہوسکتے ہیں کہ دوسری قومیں یا آپ کے علاوہ دوسرے لوگ صرف وطن پرست ہیں دھیرے دھیرے اِن ملکوں کے وطن پرست سنتریوں کے پیروں تلے بارود کی سرنگیں پھیلتی جارہی ہیں اور وہ وقت دُور نہیں ہے جب یکبارگی یہ سرنگیں بھڑک اٹھیں گی۔
آپ کا یہ کہنا کہ جبکہ ساری دنیا وطنیت کے انگارے سے کھیل رہی ہے آپ کے عالمگیر بھائی چارہ سے کیا فائدہ؟ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ آپ کہیں کہ اس دنیا میں آپ کا دیندار ہونا کیا معنی رکھتا ہے جبکہ یہ دنیا برائیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے، میں ایک ہوں، آپ دو ہوسکتے ہیں اور تیسرے کو شریک کرکے تین بن سکتے ہیں۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ہماری آپ کی طرح اس موضوع پر سوچ بچار سے کام لیتے ہیں
ابھی کل کی بات ہے کہ نئی دہلی کے ایک چمن میں چند نازک اندام نوجوانوں کو میں نے جنگ کے مسئلہ پر گفتگو کرتے سنا۔ ایک شوخ کماری جی نے لچک کر کہا " اب مزہ آئیگا پڑھائی وڑھائی تو ہوگی نہیں کیا پتہ کہ امتحان کے وقت تک اسکول بھی بند ہوجائیں !؟ دوسری نے کہا جو غالباً شریمتی تھیں اور جن کی انگلیاں پکڑے دو تین برس کا ایک بچہ جھول رہا تھا۔ ہاؤ تھرلنگ (How Thrilling) ایک صاحبزادے تھے وہ بولے۔ بھئی مجھے تو اب اخبار پڑھنے میں مزہ آیا کرے گا۔ آجکل نیوز پیپر (News Papers) کتنے (Dull) ہیں" دوسرے صاحبزادے نے ذرا تیز بیچ کہا۔ لڑائی تو ضرور ہونی چاہئے ہم تو تماشہ دیکھیں گے" پھر کئی آوازیں آئیں " لڑائی سے بے روزگاری دور ہوگی۔ ہندوستان آزاد ہوجائے گا۔ دنیا کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے" ......!
وغیرہ وغیرہ۔ اِن نوجوانوں کی گفتگو سُنکر مجھے بڑا صدمہ ہُوا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ دراصل حقیقتوں سے یہ ایک عالمگیر بے خبری ہے جو ایسے ایسے سندر اور من موہن نوجوانوں کے مُنہ سے ایسی باتیں کہلاتی ہے اور انھیں جنگ کے مہلک مرض کی طرف دھکیلتی ہے۔ اوپر کے اِن اشاروں کے بعد اب میں آپ کو ذرا تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں کہ جنگ کے جراثیم کس طرح پھیلتے ہیں۔!؟

جنگ اور کھلونے

آپ کے بچے کھلونوں سے ضرور کھیلتے ہوں گے، ساری دنیا کے بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اِن کھلونوں میں " کھلونے کے سپاہی " بھی ہوتے ہیں بعض صورتوں میں پوری فوج ہوتی ہے۔ توپیں، بندوقیں، فوجی باجا اور کیا کچھ نہیں۔ اگر آپ نے اپنے بچے کو کبھی دھیان سے کھلونے کے سپاہیوں سے کھیلتے دیکھا ہے تو یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ شروع شروع میں جب آپ نے اُن کو کھلونا لاکر دیا اور آپ نے اُن کو کھلونے کھیلنے کو کہا وہ ڈر ڈر کر بڑھے مگر فوراً ہی دلچسپی سے کھیلنے لگے۔ آپ کے لئے تو نہیں کہہ سکتا مگر میں اپنا تجربہ ضرور بیان کرتا ہوں۔ میں نے بچوں کو ایسے کھلونوں کو شوق سے کھیلتے دیکھا ہے، اوپر کی اِن سطور کو غالباً آپ بے سرو پا سمجھیں اور موضوع سے الگ حالانکہ ایسا نہیں، یہ کوئی مضحکہ خیز بات نہیں ہے اگر آپ بچے کی دماغی اٹھان سے واقف ہیں تو آپ اِس حقیقت سے انکار نہ کریں گے کہ بچے کی حس نہایت نازک ہوتی ہے۔ شروع کے محسوسات ایک چھاپے کی طرح ہمیشہ کے لیئے اس کی زندگی کے داغ بن کر رہ جاتے ہیں بظاہر وہ انھیں بھول جائے اس لئے کہ یکے بعد دیگرے محسوسات کا بوجھ اس پر پڑنا شروع ہوتا ہے جس طرح کہ ایک تناور درخت کے زخم ظاہر نہیں ہوتے جو اُسے اُس کے نمو کے زمانے میں ملتے ہیں لیکن اگر اس کی گہرائیوں کی آپ چھان بین کریں اُس کی جڑ کو کھودیں تو آپ کو حوادثِ زمانہ کی وہ ساری سختیاں صاف نظر آجائیں گی جس کا وہ بے چارہ درخت اپنے کنوار پن

کے زمانے میں شکار ہوا تھا۔ بالکل یہی مثال بچّے کی بھی ہے اُس کی روح
کی آخری گہرائیوں میں اس کے اوّلین محسوسات ہمیشہ برقرار رہتے
ہیں اور یہی وہ محسوسات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اس کی زندگی کی
ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے اور جب وہ ہوش سنبھالتا ہے تو عادات
و اطوار معصوم عمر کے محسوسات کے اثرات کے تحت ڈھلتے ہیں۔ اب آپ
خود ہی سوچیں کہ جب آپ اپنے ننھے نادان معصوم بھولے بھالے بچّے کے
ہاتھ میں کھلونے کا سپاہی دیتے ہیں تو آپ اُس کی آیندہ زندگی
کے لئے اُس کی روح کی گہرائیوں میں کیسا خطرناک نقش کیسے مہلک زہر
کی صورت میں چھوڑتے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سپاہی
جنگ کا نشان ہوتا ہے۔ دل میں ہمیشہ کے لئے کُھب جانے والا نشان"
اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ بچّے کی حس نہایت نازک ہوتی ہے۔ کھلونے
کے یہ سپاہی زیادہ تر خوبصورت چمکیلے، شاندار اور دلچسپ شکلوں کے
ہوتے ہیں۔ اب آپ خود ہی خیال کریں کہ آپ جب ان کھلونوں کو اُسے
کھیلنے کے لئے دیتے ہیں تو گویا آپ اپنے بچّے سے کہتے ہیں کہ جنگ خوبصورت
ہے چمکیلی ہے، جنگ مسرّت ہے، جنگ میں دلچسپی ہے، جنگ ایک کھیل ہے
دنیا کا سب سے بہتر کھیل، یہ پڑھنے لکھنے سے بھی زیادہ اچھا کھیل ہے اس کا
ثبوت بچّے کو اُس کے دوسرے کھلونے خود ہی دے دیتے ہیں، حروف کے
کھلونے اور دوسرے تعلیمی کھلونے نہ شاندار ہوتے ہیں نہ چمکیلے ہی ہوتے ہیں
نہ اُن سے مسرّت ٹپکتی ہے اور نہ وہ دلچسپ ہی بنائے جاتے ہیں، بچّے
کو آپ یہی بتاتے ہیں کہ یہ کھیل یعنی جنگ کا کھیل آرٹ سے بھی زیادہ بہتر
ہے اس لئے کہ جو بکس آپ بچّے کو دیتے ہیں اُس کے رنگ کھلونے کے
سپاہی کے کوٹ کے رنگ سے زیادہ جاذبِ نظر نہیں ہوتے، میرے کہنے کا
مطلب نہیں ہے کہ آپ بچّے کو خود اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ جنگ شاندار ہے
مسرّت ہے، ایک کھیل ہے ــــ نہیں ــــ لیکن کہنے کے بعض دوسرے
طریقے بھی ہیں اور وہ زبان سے کہنے سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ آپ خود ہی
غور کریں کہ جب آپ کا لڑکا ایک گدیلی قالین پر لیٹا ہوا کھلونے کے سپاہیوں
کی قطاریں بناتا ہے اور ان سپاہیوں پر اپنے کھلونے کی بندوق داغتا ہے
کھلونے کا توپ خانہ اُسے جواب دیتا ہے اُس وقت کے حالات خود ہی
بچّے سے کیا یہ نہیں کہتے کہ جنگ کھیل ہے، جنگ دلچسپ ہے، جنگ میں مسرّت ہے

اُس وقت آپ کے لئے خود بھی غور کا موقع نکلتا ہے جس وقت کہ کھلونے
کے سپاہی گرتے ہیں اُن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں، پیٹ پچک جاتے
ہیں اور وردی کا چمکیلا رنگ بہ نکلتا ہے۔ اگر آپ ایسے منظر اپنی اُن تمام
انسانی بلندیوں کے ساتھ دیکھیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ چین سے نہیں بیٹھ
سکیں گے۔

میرے پڑوسی دوکان دار نے مجھ سے تھوڑے ہی دن ہوئے
کہا تھا کہ پچھلی جنگ کے بعد سے آج تک کبھی اتنے کھلونے کے سپاہی نہیں بکے
جتنے کہ اُس نے ان تھوڑے دنوں میں بیچ لئے۔ وہ دوکاندار نے مجھے بھی شاید
بیوقوف سمجھا کیونکہ اُس نے ایک نمونہ کا ٹینک اُٹھاتے ہوئے کہا، دیکھئے
سرکار لڑائی کے تمام نئے نئے ہتھیار ہم نے کھلونے کی شکل میں منگائے ہیں،
کھلونے کی تجارت میں شاید یہ نیا اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے یہ کھلونے
تیزی سے بک رہے ہیں۔ . . . . !!!

میرے عزیز دوستو! غالباً اب آپ سے یہ بات پوشیدہ نہ رہی ہوگی
کہ یہ آپ ہی ہیں جو اپنے معصوم اور بھولے بھالے بچّوں کے دماغ میں جراثیم
پھیلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپ کا بچّہ ہوش سنبھالتا ہے اور سوچنے
سمجھنے کی قوّت اس کے دماغ میں پیدا ہوتی ہے وہ ہر اُس چیز میں دلچسپی لینے
لگتا ہے جس میں فوجی آن بان ہوتی ہے۔ آپ اگر دلّی میں رہتے ہیں تو آپ
اُسے وائسرائے کے محل کے سامنے فوجی محافظوں کے دستے کا تماشہ دکھانے
کے لئے جاتے ہیں آپ اُسے قلعہ کے سامنے سالانہ فوجی نمائش دکھاتے
ہیں۔ اگر آپ لندن میں ہیں تو آپ Whitehall کے سامنے محافظین
کے دستے کی تبدیلی کا سماں اپنے بچّوں کو ضرور دکھاتے ہیں، اس لئے کہ یہ تاریخی
منظر کہا جاتا ہے آپ کا بچّہ چمکیلی وردیوں پہ بے اختیار ریجھ جاتا ہے، وہ آپ سے
خواہش کرتا ہے کہ آپ اُسے بھی ایک ویسی ہی وردی لا دیں۔ پھر وہ بھی چمکتی
ہوئی ڈھال اپنی چھاتی پر باندھنا چاہتا ہے وہ ہندی ٹوپی یا کلاہ اپنے
سر پر بھی دیکھنا چاہتا ہے وہ بھی ایک شاندار گھوڑے پر تلوار باندھ کر بیٹھنا
چاہتا ہے . . . . !!!

یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب آپ اُس کے دل و دماغ کو بالکل مسموم
کر دیتے ہیں یہی وہ مناظر ہیں جس کی گہرائیوں میں اگر کوئی ڈوب سکے تو نہایت
ہوش رُبا پائے۔ لیکن آپ بچّے کے ہلکے پھلکے دماغ کے سامنے ان مناظر کو

ایسا حسین وجمیل، ایسا شاندار اور ایسا پُر وقار، ایسا چمکدار اور بھڑکیلا
بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اُس بچارے کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں اُس کے
دل و دماغ میں یہ نقش ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتا ہے کہ یہ سارے مظاہرے
نہ صرف دلکش و دلفریب ہیں بلکہ شاندار اور پُر وقار، وہ اُسی وقت سے
سمجھنے لگتا ہے کہ یہ آدمی ہیرو ہیں اور یہ سارے مظاہرے بہادری اور
دلیری ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب پہلی بار اُس کے دماغ
میں ایک خاموش نقش کی صورت میں "میرا ہندوستان، بندے ماترم،
مدر انگلینڈ (mother England) فادر لینڈ (Vaterland) وغیرہ وغیرہ کا خیال بیٹھ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا بچہ جو
آپ کی اُنگلیاں پکڑے اِن تماشوں کو دیکھتا ہوتا ہے یہ الفاظ اپنی توتلی
زبان سے نہ کہہ سکے، وہ بلند آواز سے یہ نہ چیخ سکے کہ "سارے جہاں سے
اچھا ہندوستاں ہمارا"، لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ اُس کے دماغ میں کچھ
ایسے ہی خیالات چکر لگانے لگتے ہیں۔ فخر اور غرور کا جذبہ موجزن ہونا
شروع ہوتا ہے جس کی پرچھائیاں آپ اُس کے سلونے رخساروں پر رنگ
اُڑنے کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں — آپ یہ مناظر اُسے دکھا دکھا کر ایک
ننھا منا سا سپاہی بنا دیتے ہیں، جراثیم اُس کے سارے بدن میں دوڑنا
شروع ہوتے ہیں اور وہ تباہی کی طرف دھیرے دھیرے چلنا شروع کر دیتا ہے۔

جنگی یادگاریں

آپ ننھے مُنے بچے کو تو چھوڑیئے، خود اپنی ذات پر غور کیجئے۔
آپ کے شہر میں کسی نہ کسی مقام پر ایک جنگی یادگار ضرور ہوگی — میرے شہر
میں تو ہے۔ ایک نہیں کئی یادگاریں ہیں۔ ایک خونی یادگار کہلاتی ہے جسے
صرف ایک تیغ یادنے یادگار بنا رکھا ہے۔ مگر دوسری یادگاریں بھی ہیں
خوبصورت خوبصورت پتھروں کی۔ کسی کے دھڑ پر ایک دیو ہیکل انسان
بیٹھا ہوتا ہے کسی کی ہتھیلی پر ایک گھوڑا مع اپنے سوار کے چوکڑی لگاتا
نظر آتا ہے۔ کسی بچاری یادگار پر کچھ الفاظ ہی کندہ ہوتے ہیں۔ کوئی یادگار
سیدھے سادے پتھر کی ہوتی ہے۔ اِن میں کچھ آدمیوں کے نام بھی ہوتے
ہیں، ممکن ہے کہ اُن آدمیوں میں سے کسی نہ کسی سے آپ واقف بھی ہوں
پیروں تلے کچھ پھولوں کے سوکھے سوکھے ہار پڑے ہوتے ہیں، آپ کو حیرت
ہوتی ہے کہ یہ پھول کون ڈالتا ہے۔ آپ کو دُکھ ہوتا ہے آپ کو حیرت
ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک خاص قسم کی فخر کی لہر آپ کی آنکھوں میں گرم خون
دوڑا دیتی ہے۔ آپ کی گردن اونچی ہو جاتی ہے۔ آپ کا سینہ پھول جاتا
ہے۔ میں اپنی بتاؤں، جب میں اِن یادگاروں کے سامنے سے گزرتا ہوں
میرا دل چیخ اُٹھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آنسو میری آنکھوں سے گرنے
لگتے ہیں۔ میرے نزدیک بیچارے شہیدوں کی یادگاریں اس شکل میں کسی
طرح مناسب نہیں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ یادگاریں انسان کی زندگی
اور موت دونوں کروٹوں کا خاموش مضحکہ اُڑاتی ہیں۔

انگلستان کو لیجئے مجھے ایک بھی جنگ کی سچی یادگار وہاں نظر نہیں
آئی۔ یہی حال امریکہ اور فرانس اور دوسرے ممالک کا ہے جن کو جنگی
طوفانوں نے کبھی کبھی اپنے خونخوار دامن میں لپیٹا تھا۔ ہندوستان جس
کی ساری تاریخ جنگی ہے اور جہاں ہزارہا ایسی یادگاریں ہیں ایک بھی سچی
یادگار نہیں رکھتا۔ غالباً آپ کچھ یاد کرکے میرے اس بیان کو تسلیم کرنے کے
لئے کسی طرح تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کو مجھ سے ایک چھپی ہوئی سی نفرت ہو جائے
گی۔ لیکن میرے عزیز دوست تو مجھے یہ تو بتایئے کہ سنگ مرمر کے اُن آدمیوں کا
جو آج شہروں اور گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے تلے پتھرائی ہوئی
آنکھوں سے ہمیں تک رہے ہیں جنگ سے کیا تعلق ہے۔ یہ شاہیں جن کے
ڈہنے شاہراہوں کو جنگ کی یادگار کے طور پر سایہ دیتے ہیں انھیں جنگ
سے کیا نسبت ہے ——— !؟!

یہ پیتل کی قطاریں، یہ قہقہے لگاتے سوار جو حملے کے وقت یکایک
برف کی طرح جم کر رہ گئے تھے جس وقت کہ اِن کے لرزتے ہوئے ہونٹوں
سے ایک رسیلا گیت نکل رہا تھا بلکہ اُن کا دل دہشت سے ڈب ڈب کر رہا
تھا، بھلا یہ درحقیقت کیا ہیں؟ یہ کیوں ہیں؟ یہ کس چیز کی یادگاریں ہیں؟
یہ اب یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ ساری یادگاریں سراپا دھوکا ہیں،
فریب ہیں، چونکہ ان کو آنسوؤں کے سیلاب نے کھوکھلا کر دیا ہے اس لئے
کسی آدمی میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان کو مسمار ہوتے ہوئے دیکھے
چاہئے تو یہ تھا کہ انھیں گرجا گھروں، مندروں، مسجدوں اور ایسی ہی
دوسری پُر امن فضا میں رکھ دیا جائے جو ان کے لئے مناسب ترین
جگہیں ہیں اور انھیں مصروف اور مشغول شاہراہوں سے ہٹا دیا جائے

جہاں بیوقوف اور بھولے بھالے لوگ ان کے سایوں ۔ سے مسموم
ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ساری دنیا میں یہ یادگاریں ایک ہی قسم کے
جھوٹ پھیلاتی ہیں۔ الفاظ کتنے ہی مختلف قسم کی شکلوں میں لکھے ہوں
لیکن کہانی ایک ہی ہوتی ہے اور سپاہی ایک ہی جیسے سنگ مرمر
اور دوسرے پتھروں کے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ بے روح
لب کھول سکیں، ان میں ہلکا سا بھی ارتعاش پیدا ہوسکے۔ اگر سانس
کی ایک گرم لہر سرد پتھروں میں دوڑ سکے، آواز بھی نکلے گی، کہ میں نے
اس لئے جان دی کہ "ان ہاتھوں" نے مجھ سے یہی کہا کہ یہ میرا فرض ہے،
میں نے اپنے وطن کے لئے جان دی، میں راستی پر تھا" ...... ؟
اور اگر انسان کی اُس روح کی حقیقت تک آپ پہونچ سکیں، جو اُس سے
ایسے جواب دلاتی ہے تو آپ کھوکھلے الفاظ کی تہ میں ہی تند و تیز حقیقت
پائیں گے کہ نہیں تم غلطی پر ہو ------ میں حیران ہوں اور میری سمجھ میں ذرا
بھی نہیں آتا کہ جنگ کی یادگاروں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب طاعون
سیلاب کی سی تیزی سے ملک کے طول و عرض میں پھیلتا ہے۔ ہزاروں آدمی
مرتے ہیں۔ ہم اس کی یادگاریں کسی قسم کے سنگ نہیں کھڑے کرتے جس سے
یہ ظاہر ہو کہ یہ کوئی دلفریب اور عظیم بات تھی۔ جنگ تو طاعون سے زیادہ
بُری ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ تباہی لاتی ہے اسلئے کہ آدمی خود ہی اس کی وجہ
ہوتا ہے۔ آدمی انسانوں کو طاعون کے جراثیم سے خود مسموم نہیں کرتا لیکن
جنگ کے جراثیم کے انجکشن وہ اپنے ہاتھوں سے لگاتا ہے۔ اس لئے جب
میں جنگ کی یادگاروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُن میں ایک بخار سا تھرتھراتا
نظر آتا ہے۔ جس کی سردی گرمی میں مہلک جراثیم جھلکتے دکھائی دیتے ہیں
اگر ہم ان جراثیم کو ایک سرے سے ختم نہیں کر سکتے تو کم از کم ہم انھیں پہچان
کر ختم ضرور کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہلاکت کی قوت ضرور فنا کر سکتے ہیں
اس کی سب سے بڑی ترکیب تو یہ ہے کہ ہم ان یادگاروں کو ایسی گھناؤنی
شکلوں کے ساتھ پیش کریں، انھیں اتنا بدصورت اور اتنا بدنما بنائیں کہ وہ
جنگی جراثیم جو معصوم بچوں کے دماغوں میں رینگتے ہوتے ہیں، جو انھیں
اُن کے چاروں طرف کھیل کود کے لئے لبھاتے ہیں، ہمیشہ کے لئے ختم
کردیں۔ میں نے اکثر اسکولوں کے پھاٹک پر ایسی ہی مسموم تحریریں دیکھی
ہیں۔ ان تحریروں کے بجائے اگر ایک سپاہی کی ایسی تصویر لٹکائی جائے
جس کے پھیپھڑے گیس کے کھائے ہوئے ہوں تو مجھے یقین ہے کہ بچے ساری
زندگی جنگ کے نشہ، جنگ کی مستی اور جنگ کی دلفریبی کے دھوکے میں
مبتلا نہ ہوں گے۔ اگر میرا بس چلے تو ان سارے مجسموں کو زمین سے لگا دوں اور
ان پر ایسی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بناؤں جن میں زخمیوں کی لاتعداد تصویریں
لٹکائی جاسکیں۔ ایسی تصویریں جنھیں پتھر دل بھی مشکل ہی سے دیکھنے کی تاب
لاسکیں۔ نُچے ہوئے چہرے، دل و جگر کے ٹکڑے، اُدھڑے ہوئے بھیجے،
ٹوٹی پھوٹی آنکھیں، کٹے ہوئے کان، جھولتی ہوئی گردن لٹکتے ہوئے
شانے، جنھیں دیکھ کر کوئی انسان نہ کہہ سکے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ وہ
لوگ بھی جو جنگ کے آج متوالے ہو رہے ہیں جو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد
جنگ آزمائیاں سمجھے بیٹھے ہیں، ہمیشہ کے لئے راہِ راست پر آجائیں گے۔
جنگی یادگاروں کے بعد جس چیز سے مجھے تکلیف ہوتی ہے وہ جنگی
وردیاں ہیں ------ !!!

جنگی وردیاں

جب میں انھیں اپنے ہمجنسوں کے بدن پر دیکھتا ہوں میں بیان نہیں
کرسکتا کہ میرے دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ جنگی وردیاں ایک طرح
جنگ کی پتھریلی یادگاروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان
وردیوں ہی میں جنگ جوانی کے پورے جوش میں نظر آتی ہے۔ اس چیز
کی اہمیت آپ کو اُس وقت زیادہ معلوم ہوسکتی ہے جبکہ آپ جنگ کو وردیوں
کے جوبن بغیر دیکھیں۔ یا اگر ایسا خیال کرنا بھی آپ کے لئے گناہ ہے تو آپ
یہی فرض کرلیجئے کہ دنیا کے ہر ملک کا ہر سپاہی ایک ہی جیسی وردی
پہنے کسی مضبوط انٹرنیشنل تحریک سے مجبور ہو کر انگلستان کی فوجیں،
فرانس کی فوجیں، جرمنی کی فوجیں اور دنیا کے دوسرے تمام ملکوں کی
فوجیں بھی ایک ہی طرح کی وردیاں پہنیں جن کا رنگ بھی ایک ہو، جن کے
کاٹ بھی ایک ہوں، ٹوپی ویسی ہو، بٹن ویسے ہی ہوں، ......
آخر یہ ساری فوجیں اپنے رہنماؤں کے بیانات کے مطابق ایک ہی مقصد کی
کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتی ہیں ...... عزت کی خاطر
انصاف کے لئے، آزادی کے لئے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ فوجیں طرح
طرح کے کپڑے پہنیں ------ سوچئے کہ پچھلی جنگ میں کیا ہوا ہوتا اگر

صورت حال یہ ہوتی جو میں نے اوپر لکھی ہے، ظاہر ہے کہ گھمسان کی لڑائیاں کم خون بہاتیں۔ دو دو ہاتھ کی لڑائیاں، نہایت سُست ہوتیں۔ اگر فوجیں جنگی نظم کے تحت تتّر بتّر ہوتیں تو صبح کے ہلکے دھندلکے میں وہ یہ کیسے معلوم کر سکتیں کہ کون دوست ہے کون دشمن —— بات بظاہر بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، لیکن میرے دوستو! یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ جنگ کے زمانے میں کوئی ایسی بات کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ فوجی افسر فرق معلوم کرنے کے لئے رنگ برنگ کے فیتے ہی باندھ دینگے۔ لیکن امن کے زمانے میں میرا یہ مشورہ پوری طرح کارگر ہو سکتا ہے وہ اس طرح ..... جس طرح کہ ایک برہمن کے لئے خاص قسم کا ٹیکہ، ایک مُلّا کے لئے خاص قسم کا عمامہ اور لبادہ، اور ایک پادری کے لئے ایک مخصوص وضع کا کوٹ ہوتا ہے اسی طرح ایک سپاہی کے لئے بھی اس کی وردی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ پادری مذہبی تاثرات پیدا کرنے کے لئے اپنی وردی پہنتا ہے۔ گرجا میں رنگ برنگ کی کھڑکیاں اور طرح طرح کی تصویریں اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے لوگوں کے دلوں میں مذہبی احترام پیدا ہوتا ہے۔ فوجیں طرح طرح کے پرچم لہراتی ہیں یادگاریں بناتی ہیں تاکہ جنگی قربانیوں کی داغ بیل مضبوط پڑے۔ سخت ترین نظم کے لئے فوجیں طرح طرح کی پریڈ کرتی ہیں، گرجا میں بھی اسی طرح مخصوص عبادتیں ہوتی ہیں اور مخصوص دعائیں پڑھی جاتی ہیں، سپاہی کو ایک خاص جذبہ کے تحت اپنی زندگی ڈھالنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی مدّت اور زندگی اس کے اپنے ملک کے لئے وقف ہونی چاہئے وہ اگر اپنے ملک کے لئے جیئے گا اور اپنے ملک کے لئے جان دے گا اس کے نام کو ہمیشہ کے لئے بقا نصیب ہوگی۔ بالکل اسی طرح ایک پادری یا مُلّا اپنے پجاریوں سے یہی کہتا ہے کہ اس کی موت اور زندگی عیسیٰؑ اور محمدؐ کے نام اور پیام کے لئے وقف ہونی چاہئے اور اگر وہ عیسائی ہو کر یا مسلمان رہ کر جیئے گا تو اس کا نام کبھی نہ مٹے گا ——— اگر آپ علمِ نفسیات کے ماہر ہیں آپ اس چیز کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں اگر ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سپاہی وردیاں ہی پہنیں جنگ کی خونخواری کو ہلکا کرنے کے لئے کم از کم ساری دنیا کی فوجیں ایک قسم کی وردیاں ہی پہنیں۔ دنیا کے سارے سپاہی ایک دوسرے صرف اس لئے لڑتے ہیں کہ ان کے افسر ان سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خاص مقصد کے لئے انھیں اپنی جانیں قربان کرنی ہیں۔ یہ خاص مقصد ساری فوجوں کے لئے ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں ——— پھر یہ کیسی گھناؤنی بات ہے کہ ایک دوسرے کی جان لینے میں بھی آپ کپڑوں کی قسم قسم کی کانٹ چھانٹ چاہتے ہیں!؟ چمکیلے بھڑکیلے رنگ ڈھونڈتے ہیں ---------!!

جنگی کتب خانے

تیسری چیز جس میں جنگ کے جراثیم اُن گنت نظر آتے ہیں وہ آپ کا کتب خانہ ہے۔ میری آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ آپ اُن کتابوں کو دوبارہ پڑھئے جن میں گزشتہ جنگِ عظیم کے حالات لکھے ہیں، دوبارہ پڑھنے کی گزارش اس لئے کر رہا ہوں کہ میں نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اُس کی روشنی میں اگر آپ اُن کتابوں کو پڑھیں گے تو آپ جنگ کی تفسیر خود ہی کر لیں گے۔ دوسری کتابوں کو جانے دیجئے لائڈ جارج کی (وار میموری) "جنگی یاد" پڑھئے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ پچھلی جنگ کس لئے لڑی گئی تھی، کیا وہ واقعی جمہوریت کے لئے لڑی گئی تھی؟ کیا لوگ درحقیقت انصاف اور وطن کی خاطر موت کے گھاٹ اُتارے گئے تھے، اگر یہ کتاب آپ کے لئے زیادہ بھاری بھرکم ہو تو ایک دوسری چھوٹی سی کتاب پڑھئے ([illegible]) کی ۱۹۱۸ء اور دوسری نظمیں" اس کتاب کی ایک سو چالیس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کے اقتباسات ہزارہا بہادر نوجوان شہیدوں کی قبروں پر کندہ کئے گئے ہیں اس کی نظمیں متعدد پادریوں نے خطبات کے طور پر خدا کے گھروں میں سنائی ہیں۔ اسکولوں میں بھی ہم نے کورس کے طور پر ان نظموں کو گایا ہے۔ ان نظموں کے گھنگرو فلک پیما عمارتوں سے لیکر گھاس پھونس کی جھونپڑیوں تک میں بجے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان نظموں کو سن کر چاند تک کو اپنی امن پسندی پر شرم آجاتی ہے اور وہ نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ آسمان کی سطح پر لاتعداد ستارے ہیں جو دنیا کی ابتداء سے لیکر آج تک ایک دوسرے سے بغلگیر رہے ہیں، جنھوں نے ایک بار بھی ایک دوسرے کا گلا نہیں گھونٹا ہے اور اگر کسی نے کبھی ذرا آنکھ دکھائی بھی تو

ستاروں کی ساری برادری اُسے توڑ کر ہماری جھگڑالو بستی پر پھینک دیتی ہے۔ستاروں کی وہ دنیا اِن نظموں کی گھن گرج کو شکر غم کی ایک چادر میں چھپا جاتی ہے، اِس کتاب میں سب سے مشہور سانیٹ وہ ہے جو آج بھی ہر "وطن پرست" جھوم جھوم کر گاتا ہے۔جس میں اپنے وطن کا دیوانہ شاعر کہتا ہے۔

"اگر میں مرجاؤں اور میری کبھی تمھیں یاد آئے تو صرف
یہ سوچنا کہ ایک غیر ملک میں ایک ایسا گوشہ بن گیا ہے
جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے انگلستان کہلائے گا۔اُس
زرخیز سرزمین پر زیادہ زرخیز بنیاد بن جائے گی"

کتنے عظیم جذبات! الفاظ کی موسیقی، جذبات کی گرج آپ کی آنکھوں میں عجیب چمک پیدا کر دیتی ہے۔میں جب یہ نظم پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو جاتی ہیں میرے سامنے ایک تصویر دوڑنے لگتی ہے۔ایک نازک اندام نوجوان ایک سنسان کھیت میں آرام کے لیے لیٹ جاتا ہے۔اُس کی چھاتیوں پر ایک سُرخ دھبّا دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہوتا ہے۔تھوڑی دیر لیٹنے کے بعد وہ کراہنے لگتا ہے، کبھی اُٹھتا ہے کبھی بیٹھتا ہے۔کبھی اُٹھتے ہی گر پڑتا ہے، پھر یکایک سو جاتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد کسی عجیب و غریب معجزے سے اُس کا جسم دھرتی میں اِس طرح رل جاتا ہے کہ دھرتی ہی دھرتی نظر آتی ہے۔کچھ دیر بعد اُس جگہ لالہ کے پھول لہلہانے لگتے ہیں جنکی آنکھیں دہشت زدہ سی نظر آتی ہیں، اِس تصویر کو آپ اپنے دماغ میں تازہ رکھتے ہوئے (Siegfried Sassoon) کی مشہور کتاب (Memoirs of an Infantry. Officer) کے چند جملے پڑھیئے۔میں انہیں اِس جگہ لکھتا ہوں۔مجھے خاص طور پر وہ منظر یاد ہے۔جبکہ میں گھاٹیوں میں ہو کر گذر رہا تھا۔میں نے دو ہاتھ (قومیت کا پتہ میں نہ چلا سکا) بھیگی ہوئی زمین میں اِسطرح دھنسے ہوئے دیکھے جیسے درخت کی جڑیں اُلٹی سیدھی نکل رہی ہوں، سیلاب میں ڈوبی ہوئی کھائی کی سطح پر ایک اِنسانی چہرہ بھی نظر پڑا جو کھوپڑی سے الگ تھا......

اب آپ مجھے بتائیں کہ اِن میں سے کونسی تصویر آپ کو زیادہ متاثر کرتی ہے Rupert Brook کی بنائی ہوئی تصویر یا Siegfried Sassoon کی؟ — آپ کسے ترجیح دینگے نظم کو یا نثر کو، مبالغہ آمیز رنگ آمیزی کو یا جیتی جاگتی تصویر کو بدن میں جھرجھری پیدا کرنے والا افسانہ یا ایک انقلاب آگیں حقیقت؟ —

اگر آپ اپنے لڑکے کا چہرہ اس کی کھوپڑی سے الگ کسی کھائی میں تیرتا ہُوا نہ دیکھنا چاہیں، آپ اپنے لڑکے کو کسی ایسے اسکول میں بھیجنا گوارا نہ کرینگے، جہاں اُس کو ایسی خطرناک نظمیں پڑھنے کے لیئے مجبور کیا جاتا ہے، جہاں اُس کے دماغ میں زبردستی جنگ کے مہلک جراثیم ڈالے جاتے ہیں۔آج یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اِنڈسی ادب کا پڑھنا ہمارے لیے ممنوع ہے، جنسی فلسفہ پر Havelock Ellis کی کتابیں ہماری نظر سے گزرنا سنگین جرم اور عظیم گناہ ہے۔ حالانکہ یہ وہ مضامین ہیں جو ہر منصف اور ہر جج کے مطالعہ میں ہونے چاہیئں۔ D. H. Lawrence کی جنسی کتابوں کو ہمیں پڑھنے سے روکا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم Rupert Brook کو حرف بحرف پڑھیں ایک سطر بھی نہ چھوڑیں یا وہ پاگل ہیں یا میں پاگل ——

لڑکوں کی تعلیم

آپ کی کتابیں اتنی خطرناک نہیں ہیں جتنی کہ وہ کتابیں جو آپ کے لڑکے پڑھتے ہیں یا ان کو پڑھائی جاتی ہیں شاید آپ کو اِس نہایت خطرناک صورتِ حال کا ذاتی تجربہ نہیں ہے، شاید آپ کو پوری طرح نہیں معلوم کہ آپکے لڑکے کے جسم میں جراثیم کے انجکشن دینے کے علاوہ اُس کے دماغ کو بھی کس حد تک مسموم کیا جا رہا ہے۔بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنے لڑکے کے اسکول میں کسی دن اچانک چلے جائیں اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ کیا کر رہا ہو ہے ---۔گرمی کی صبح ہے — گیارہ بج رہے ہیں اور تاریخ کا سبق شروع ہو چکا ہے —— وہ کچھ پڑھ رہا ہے انگلستان کی سیاسی تاریخ ۱۴۸۵ء سے ۱۵۴۷ء تک (کتاب کا مصنف H. A. L. Fisher ہے Fisher وزیرِ تعلیم رہ چکا ہے۔آپ ذرا جھک کر چپ چاپ وہ سطریں پڑھنے کی کوشش کریں جو آپ کا لڑکا اُس وقت پڑھ رہا ہے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو سرتے فلوڈن کرسٹ سے چھ میل کے فاصلہ پر پڑا ہوا تھا۔ اسکاٹس پر اسوقت حملہ کرنا اِس کے لئے بیوقوفی ہوتی۔ ۸ کو سرتے ...

کو پار کر کے بارتور پر حملہ آور ہوا۔ ارکاٹش پڑاؤ سے چھ میل مشرق کی جانب۔ ۔ ۔ ۔ درست! سرے ٹل کو پار کر کے حملہ آور ہوا ظاہر ہے کہ وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا ـــــ کیسی ضروری معلومات ہے۔ آپ اپنے لڑکے کا چہرہ دیکھتے ہیں وہ سوچ رہا ہے ـــــ آپ آگے پڑھئے ـــــ اور بارتور میں ڈیرا ڈال دیا۔ اس طرح انگریزی فوجیں پہاڑوں کے پیچھے آکر دشمنوں کی نگاہوں سے چھپ گئیں اور اس وقت سرے نے آخری اور عظیم فیصلہ کیا ـــــ آخری فیصلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کتاب دلچسپ ہو چلی مسٹر فشر کہتے ہیں کہ آخری اور عظیم فیصلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ اگر اور پڑھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ پریشان ہو جاتے ہیں۔ "کلاس روم" میں بڑی گرمی ہے۔ باہر بمبار طیارہ ڈبے پھڑپھڑاتا اُڑا جا رہا ہے ـــــ اس سے بھی دور آپ یاد کرتے ہیں کہ ایسی آبادیاں ہیں جو پریشان حال ہیں جہاں بغاوتیں اُٹھ رہی ہیں جہاں لوگ درد و کرب میں چیخ رہے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ آپ کے لڑکے کو کیسی فضول اور بیکار چیز پڑھائی جاتی ہے، بھلا یہ اُس کے کس کام کا کہ سرے نے ٹل کو پار کر کے بارتور پر حملہ کیا۔

سرے ٹل، بارتور یہ کون ایسے ضروری نام ہیں جبکہ آپ کے لڑکے کے لئے جانا اُس کی زندگی کے سفر میں معاون ہوگا۔ یہ صرف ایک کتاب ہی ـــــ تاریخ کی دوسری کتابیں بھی آپ کے لڑکے کو پڑھائی جاتی ہیں، ہندوستان کی تاریخ، یورپ کی تاریخ۔ دنیا کی تاریخ۔ ان تمام تاریخوں میں ایک تاریخ پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ آپ اپنے لڑکے سے یہ کتاب لے کر پڑھئے۔ اس کا نام

(The Ground work of Birtish History)

ہے اور اسے مسٹر جارج ٹاؤسنڈ وارنر Mr. George Touse-nd warner اور سی ایچ کے مارٹن Mr. C.H. K. Marten نے لکھا ہے۔ ایک کیمبرج کا فیلو کہلاتا ہے۔ دوسرا آکسفورڈ کا پروفیسر، برطانوی نظامِ تعلیم کے تحت ہزار ہا انگریز، افریقی، چینی بچے۔ دنیا کے متعلق اپنی محدود معلومات اسی کتاب سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ نادان معصوم اٹھتی جوانیوں کے لئے وہ مندر ہے جہاں انھیں علم کی پوری روشنی دی جاتی ہے ـــــ اب آیئے ہم بھی غور کریں، ہم خود بھی فیصلہ دیں سب سے پہلا سوال ہمارے دماغ میں یہ آتا ہے کہ آخر برطانوی سلطنت کی تاریخ میں وہ کونسی ہستیاں ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے برطانوی تاریخیں اپنے بلند کردار سے بنائیں ـــــ میرے سامنے کتاب کا جو ایڈیشن ہے وہ تازہ ترین ہے۔ اس لئے ہم اس میں جنگ عظیم کے زمانے سے لیکر آج تک کے نام ڈھونڈتے ہیں، اس لئے کہ برطانوی تاریخ صحیح معنوں میں اُس زمانہ میں بنی، اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ برطانوی سلطنت کی جدید تاریخ کی سب سے عظیم ہستی گاندھی کی ہے، ہم اُسے فہرست میں تلاش کرتے ہیں ـــــ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ "آج" کے تحت جہاں اُسے ہونا چاہیئے تھا Gesiths کے بارے میں بہت کچھ ہے جو Wessex کے بادشاہوں کی ملازمت میں حبشیوں کا ایک گروہ تھا (Decline and Fall of the Roman Empire) کے مصنّف کا ذکر ہے۔ لیکن اُس ہستی کے متعلق کچھ نہیں جو آج بھی ایک دوسری سلطنت کے زوال کا مصنّف ہو سکتا ہے۔ آیئے ہم دوسرے بڑے نام بھی تلاش کریں۔ برطانوی پریس نے برطانوی استعماریت کا سب سے بڑا دشمن لینن کو بتایا ہے۔ اس پر الزام لگایا گیا اور لگایا جاتا ہے کہ اُس نے انگلستان کے سرمایہ داروں کو فاقوں سے نڈھال کرنے کی کوشش کی اُس نے سامراجی برادری کو برانگیختہ کر دینا چاہا۔ ہم فہرست میں اس کا نام تلاش کرتے ہیں "ل" کے تحت جہاں اُس "شیطان" کا نام ہونا چاہیئے۔ ہم صرف (Earl of Laster) کا نام پاتے ہیں جس کی بڑائی صرف یہ ہے کہ اُس نے تیرھویں صدی میں کچھ نہایت غیر ضروری کارنامے انجام دیئے۔ ارل موصوف کے نیچے (Duke of Lensler) کا نام ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ کچھ پوچھے نہیں ہیں۔ کیونکہ امریکہ کی جنگ آزادی کے زمانے میں فرانسیسی حملہ کے خلاف ڈبلن کی فوج کی اُنھوں نے رہنمائی کی تھی۔ نتیجہ کیا ہوا تھا، یہ ہمیں نہیں بتایا گیا۔ اُن کا نام غالبًا صرف اس لئے شامل کیا گیا کہ یہ ڈیوک تھے۔ میرے ساتھ غالبًا اب آپ کی پریشانی بڑھ رہی ہوگی آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے کہ آپ کے لڑکے کو برطانیہ کی جو تاریخ پڑھائی جا رہی ہے وہ کتنی غیر دلچسپ اور کتنی غیر ضروری ہے، غالبًا یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ جیسے معصوم نام تلاش کرنے کی کوشش کریں جن کی سوئی ہوئی بزرگی نے شاید اُنھیں اس کتاب کا ہیرو بنا دیا ہو، صفحہ چار سو چھیالیس ۴۴۶ پر ہم فلورا میکڈانلڈ کا نام پاتے ہیں۔ فہرست میں اس نام کے اوپر کیتھ کا نام ہے جن کا ذکر صفحہ ایک سو تینتیس ۱۳۳ پر ہے۔ نیچے دوسرے میکڈانلڈس

کے نام ہیں جن کی مدح سرائی صفحہ چار سو ستاون ۴۵۷ پر کی گئی ہے لیکن بیچارے ریمزے میکڈانلڈ کا کہیں اشارہ اور کنایہ سے بھی ذکر نہیں — مسٹر ڈی ولیرا تک کا بھی نام نہیں ہے۔ ہیگ ایسے فرمانروائے برطانیہ کا کہیں نام نہیں اور جہاں Christabel Paukh urst — کا نام ہونا چاہئے تھا وہاں Pampeluna کی فتح کا ذکر ہے۔ ہم حیران ہیں کہ مسٹر ٹواسنڈ وارنر کی نظروں میں اہمیت کیسی بیکار ہستیوں کی ہے۔ آپ بھی شاید اب اس نظریہ پر پہونچ گئے ہوں گے کہ آپ کے لڑکے کے لئے Pempeluna کی فتح کا حال پڑھنا اس کی آئندہ زندگی کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا ایسے موقعوں پر کہا یہ جاتا ہے کہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ان کے دماغ کی بلند پروازی کے لئے ضروری ہے۔ یا یہ کہ پچھلی باتیں جاننے سے مستقبل کا وزن متوازن ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ نہایت ایمانداری سے جواب دیں کہ کیا آپ کا لڑکا Pempeluna کی فتح کا حال پڑھے۔ پیشہ ور مؤرخین مجھ پر حقارت اور نفرت کی بوچھار ضرور کریں گے۔ لیکن اس سے مجھے پریشانی اس لئے نہ ہوگی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ سائنس والوں پر بھی پیشہ ور علمائے دینیات نے ایسے ہی حقارت اور نفرت کے تیر پھینکے تھے۔ ممکن ہے کہ آپ بحث میں مجھے شکست دے دیں۔ لیکن اُس وقت بھی میں اپنے ہونٹوں سے صرف یہی سوال کروں گا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا لڑکا Pempelana کی فتح کا حال پڑھے؟ میرا دل کہتا ہے کہ اگر پانچ منٹ آپ نے آنکھیں بند کرکے سوچنے کی کوشش کی [illegible] آپ یہی جواب دیں گے کہ نہیں میرے لڑکے کے لئے Pempeluna ایسی غیر معروف جگہ کی فتح کا حال پڑھنا تضیع اوقات ہے جس کو اُس کی آئندہ زندگی سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

(باقی)

"شانتی پریاگی"

(ایشیا) یہ مضمون انسانی ذہن و تفکر کی انتہائی بلندی پر پہونچ کر لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے کوئی شک نہیں کہ دنیا کے امن اور بین الاقوامی محبت کے نقطۂ نگاہ سے اس مضمون کے خیالات نہایت پاکیزہ اور جذبۂ انسانیت پر مبنی ہیں لیکن یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر رائے زنی نہ کی جاسکے۔ "شانتی" نے جنگ کی اصلی وجہ "وطنیت" کو قرار دیا ہے۔ یورپ میں اس وقت جو لڑائی چھڑی ہوئی ہے اس کے اسباب میں پہلا اور آخری سبب یہی بتایا ہے کہ ہر محدود خطۂ زمین کے باشندے اُسی محدود خطۂ زمین ہی کو اپنی دنیا یقین کرتے ہیں اور اُسی کے مفاد و حفاظت کے لئے اپنی اپنی جگہ جنگ آزما ہو رہے ہیں، لیکن اُنھوں نے "وطنیت" کو امراضِ مزمنہ سے مثال دیتے ہوئے یہ حقیقت قطعی فراموش کردی کہ جنگ کی اصلی وجہ محض "وطنیت" نہیں ہے بلکہ سامراجی نظامِ حکومت اور سامراجی تمدن ہے۔ اگر واقعی کوئی "خدا رسیدہ" دنیا میں امن و راحت کی بحالی چاہتا ہے تو اُس کو سامراج اور اس سے پیدا شدہ تمدن کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے "وطنیت" کی مخالفت سے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں کھولت اور رکاوٹ پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ پھر ہندوستان کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ یہاں برسوں ابھی دفاعی قوم پرستی ( ) پر عمل کرنا ہوگا۔ بہرحال ابھی مضمون ختم نہیں ہوا ہے اس لئے رائے زنی قبل از وقت ہے، جب اس کی تمام قسطیں شائع ہوجائیں گی تو اس کے سلسلے میں آئے ہوئے موافق و مخالف مضمون شائع کئے جائیں گے اور ثابت کیا جائے گا کہ جنگ انسانی فطرت سے ہے اور سامراجی نظام و عمل کا ردِّ عمل تو سوائے جنگ و ابتری کے اور کچھ ہے ہی نہیں

ساغر

برطانیۂ عظمیٰ میں تحریکِ مزدور

جنگِ عظیم سے عصرِ حاضر تک کی تاریخ

(ف)

یہ مضمون ایک مستقل کتاب کا آغاز ہے، افسوس ہے کہ ضروری اور اہم "دستاویز" ایسے وقت دفتر ایشیا میں پہونچی کہ کتابت کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا، تاریخی اور سیاسی لحاظ سے موضوع کی اہمیت ظاہر ہے۔ اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اس مختصر سے رسالہ کو لکھوایا ہے جس کا کچھ حصہ یہاں شائع کیا جاتا ہے، مگر جنوری نمبر میں اس کے لئے کافی گنجائش نکال لی گئی ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اسے بیحد پسند کرینگے خاص کر آنیوالی قسطوں کو، ایشیا میں اشاعت کیساتھ ہی اسے کتابی شکل میں شائع کرنیکا اہتمام کیا جا رہا ہے، جیسے ہی بادِ مشرق کے ہندی اور انگریزی ایڈیشن سے فرصت حاصل ہوئی سب سے پہلے اسی کتاب کو شائع کیا جائیگا۔

(ساغر)

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کی مسکراتی ہوئی صبح کو دنیا کے کانوں میں بھیرویں کی نئی مدھر راگنی پہونچی۔ سب نے سنا کہ صلح ہو گئی، جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ دھرتی کو تنزل کر دینے والی انسانیت نئی تہذیب و معاشرت کی ماتائی گود میں جاگی، نہ ختم ہونے والی تاریکی پر آخر جوان موسمِ سرما کی سنہری سنہری کنواری اور دلاری کرنیں چھا ہی گئیں۔ زمانہ ہو گیا تھا کہ بھیرویں کی مدھر راگنی کو ملگجی آنکھیں گدگدانے کا موقع نہ ملا تھا، آج جو وہ اٹکھیلیاں کرنے کیلئے آزاد ہوئی تو انسانیت کا عالمگیر کہر بھی چھٹتا نظر آیا۔ اس کہر کے چھٹتے ہی زخمی دھرتی کی ننگی چھاتیاں بھی صاف نظر آنے لگیں۔ سب نے دھرتی کو کراہتے سنا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ادھیڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

کوئی عضوِ زندگی کی مشینری کا کوئی پرزہ اپنی جگہ پر نہ تھا، جہاں قدم رکھو پاؤں پھسلتے تھے، عمیق غار پیدا ہو گئے تھے۔ جہاں انسان دیکھتے کی دیکھتے نگل لیا جاتا تھا۔ قدم جمانے کیلئے عجیب کشمکش تھی، طاقتور، کمزور کو صرف اس لئے دھکا دے کر نئے حالات کی غاروں میں ڈھکیل دیتا تھا کہ جیتی جتائی دھرتی کا جتنا بھی سلونا ٹکڑا ہاتھ آ جائے، اس پر قبضہ کر لے، طاقت دولت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی، اور کمزوری محنت کے شکستہ بال و پر کے سہارے پھڑپھڑا رہی تھی، نئی صبح کے پھیلتے ہی اور آخری سانس لیتی دھرتی کو سنہرے کفن پہناتے ہی طاقت کی سامراجی گاڑی دنیا کے طول و عرض میں دوڑنے لگی اور اس کے

بھاری بھرکم پہیوں تلے محنت کی راکھی بچھ گئی۔ محنت و سرمایہ کی اس کشمکش میں محنت کا خاتمہ ہی ہوگیا، سرمایہ کا پرچم ہر طرف لہرانے لگا۔ آمدنی بڑھ بڑھ کر تجوریوں میں بند ہونے لگی اور مزدوری بیچاری سسکیاں بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

یہ وہ اندھیر تھا جو دن دھاڑے ایک ہو چکنے والی جنگ کی قبر سے اٹھ رہا تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کا اہرمن پھر نئے روپ میں اٹھ رہا ہے۔ سوئی ہوئی جنگ نئے انداز کی کروٹ بدل رہی تھی۔ جنگ وسیع دنیا سے سمٹ کر محدود حلقوں میں انتشار کی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ سامراجی طاقتوں کی ایک دوسرے پر اقتدار حاصل کرنے کی ہنگامی جنگ تو ختم ہو گئی لیکن اب سامراج کو اپنے اُن سپاہیوں سے لڑنا ہوگا جنہوں نے چار برس ان کی جنگ کی مشین کو اپنی محنت سے چلائی، اپنی محنت کا ایندھن دیکر اُن کی مشینری میں حرکت کیلئے بھاپ پیدا کی، اپنے قوّتِ بازو کے ذریعہ ان کے ذریعہ آمد و برآمد کو کامیاب بنایا۔ کوئلے کی کانیں کھودیں کہ وہ اپنی طاقت کے گولے داغیں، ہتھیار نگر کے خونی گھروندے میں صبح شام ایک کی، اسلئے کہ وہاں ان کے لئے ناگنیں ڈھل سکیں جو ساری دنیا میں سامراج کی طاقت کا زہر پھیلائیں!؟

آخر ایک دن یہ دوسری جنگ بھی ہو ہی گئی، حالات اور وقت کے انقلاب کی چنگاریاں اڑیں اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے روئی کے ایک کھیت میں جا بجھیں ہوں۔ لانبے لانبے شعلے ہر طرف بھڑک اُٹھے اس نئے جنگ کی چنگاریاں سنہ ۱۹۱۴ء ہی سے بلند ہو رہی تھیں۔ انقلاب کی ایک ٹھہری ہوئی لہر دنیا میں ہر طرف مستقل گرمی اور پناہ کی تلاش میں چکر لگا رہی تھی، چونکہ برطانیہ روس، سامراج شاہی کے مستحکم ترین قلعہ تھے اس لئے یہاں چنگاریاں زیادہ بیقرار تھیں، سامراج کے طوفانی زور نے چار برس اپنی گاڑی آنکھیں بند کر کے چلائی ضرور، لیکن کھینچنے والے گھوڑوں نے کبھی کبھی دولتّی مار ہی دی، کہیں کہیں، وہ اڑے بھی اور کسی کسی جگہ گاڑی الٹی بھی لیکن سامراج کے ہنٹر میں بے پناہ بجلی تھی جس نے گاڑی کو رواں دواں رکھا۔

مزدور نے سرمایہ سے اختلاف زبردست ہڑتالوں کی شکل میں کیا، کوئلے کی کان اور ریلوے کے مزدور بغاوت کے علمبردار بنے ان کی ہڑتالیں اتنی زبردست تھیں کہ برطانیہ نے اس سے پہلے کبھی بھی نہ دیکھی تھیں۔ جوش و خروش کا ایسا عالم تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے ٹریڈ یونین جس کا ایک مقصد صرف تجارتی سودا تھا۔ نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نکلی، اب اس نے اپنے طریقۂ عمل سے یہ ظاہر کیا کہ برطانوی سیاست اپنی چولی بدل کر رہے گی اور آمدنی کو تجوریوں میں بند کرنے والے سرمایہ داروں کی تجارتی آمریت ختم کر کے دم لیگی۔ سب سے بڑا اقتصادی ادیب ویب (Webb) لکھتا ہے کہ:۔

سنہ ۱۹۰[illegible]ء میں صنعتی جھگڑوں کی تعداد صرف ۳۹۹ تھی سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ ۹۰۳ تک پہونچی اور سنہ ۱۹۱۳ء کے وسط میں اور سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی اس نے ایسی ہنگامہ خیز صورت اختیار کر لی کہ مہینے میں ایک سو پچاس ہڑتالیں معمولی سی بات تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں برطانوی ٹریڈ یونین صنعتی جھگڑوں کی ایک تباہ کن سُرنگ سامراج شاہی کے پیروں تلے بچھا رہی تھی۔ جس نے برطانیہ کی جنگی پالیسی اور سیاسی رجحانات کو منتشر کر دیا تھا۔

لڑائی سے کچھ پہلے یہ تحریک خاص طور پر ٹریڈ یونین کے اشاروں پر چل رہی تھی، وہ بھی زیادہ تر یونین کے کرتا دھرتا چند رہنماؤں کے بل بوتے پر، اس وقت اس تحریک کو اگر اک طرف سامراجی نمائندوں سے الجھنا پڑ رہا تھا تو دوسری طرف خود لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی عجیب و غریب حرکات کا بھی مقابلہ کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت مزدوروں کی جماعت میں کوئی بھی ایسی انقلابی سیاسی پارٹی نہ تھی جو برطانوی ڈپلومیسی کا جواب کلّہ بہ کلّہ دے سکتی۔ تحریک کے چند علمبردار سوشلسٹ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ کسی پارٹی سے بھی تعلق نہ رکھتے تھے۔

جنگِ عظیم کے بادل جونہی فضا پر چھائے اور فضا میں سَکی گرج گونجی، یہ تحریک کچھ دیر کیلئے بیٹھ سی گئی لیکن جیسے ہی پہلا پانی برس چکا اس تحریک کی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں، جس صنعتی انقلاب

کی گھن گرج کیلئے مزدوروں کی جماعت ایک عرصہ سے تیار ہو رہی تھی
اسے جنگی زمانے کی آہنی آمریت بھی نہ دبا سکی؛ جنگ نے جس قدر تیزی
اختیار کی اور جس قدر دیر ہوتی گئی اسی قدر رہائش کا خرچ بھی بڑھا
اور اس کے بڑھتے ہی جنگ سے پہلے کی وہ تمام خواہشیں پھر پیدا ہوئیں
اور محنت کی مزدوری کی زیادہ سے زیادہ معیار قائم کرنے کیلئے آوازیں
بلند ہونے لگیں۔ جیسے جیسے جنگ کی وجہ سے سرمایہ دوگنا اور چوگنا ہوتا
گیا اسی قدر امیر و غریب کا فرق بھی محسوس کیا جانے لگا، چونکہ لیبر پارٹی
اور تمام یونین جماعتیں سرکاری طور پر جنگ میں حکومت کی معاون
تھیں۔ یونین کی مشینری کو بھی مزدوروں نے عام طور پر حکومت کا
لیبر ڈپارٹمنٹ سمجھا۔ اور رہنماؤں کی طرف سے بے اعتمادی پھیلنے
لگی۔ اس بے اعتمادی نے سنہ ۱۹۱۵ء میں ایسی سخت صورت اختیار
کر لی کہ جنگ کے زمانے کی سب سے پہلی بڑی ہڑتال جنوبی ویلز کے کوئلوں
کے کانوں کے مزدوروں اور کلائیڈ کے انجینیروں نے کی۔ اتفاق ایسا
تھا کہ ہڑتال کرنیوالوں کو سرکاری پوزیشن بھی حاصل تھی۔ انجینیرنگ میں
دو کانوں کے منیجر جو حکومت کی طرف سے انسپکٹر تھے اور اپنی یونین
کی طرف سے شہر کی کمیٹیوں میں رپورٹر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب
فیکٹریوں کے نمائندے بن گئے اور ہڑتال کے لیڈر اس صورت حال
نے تحریک کو بجلی کی سی تیزی کیساتھ ملک میں ہر طرف دوڑا دیا۔

کلائڈ میں جنگ کے زمانے کی یہ تحریک زبردست طاقت پکڑ
گئی۔ سنہ ۱۹۱۵ء کی اسٹرائک کیساتھ ہی کلائڈ ورکرز کمیٹی Clyde
Workers Committee کی بنیاد پڑی، جس نے یہ
عہد کیا کہ وہ حکومت کے ہتھیاروں کے ایکٹ کی ہر ممکن مخالفت کرے
گی۔ مخالفت کا یہ جذبہ اتنا تند و تیز تھا کہ جب یونین کے عہدداروں
نے حکومت کی اس معاملے میں حمایت کرنی چاہی تو کمیٹی نے یہ بیان
شائع کیا کہ ان کا یہ طریق عمل مزدوروں کی جماعت کے خلاف غداری
ہے۔ یونین کا اثر لیکا یک کم ہو گیا اور یہ کمیٹی مزدور جنتا کی واحد نمائندہ
بن گئی۔ اس کا اثر گلاسگو اور اس کے قرب و جوار میں بھی ہوا، کمیٹی نے
اعلان کیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ فیکٹریوں کے حالات پر اسے پوری
قدرت حاصل ہو جائے۔ اور ایسے شرائط تجویز پائیں جن کے مطابق

مزدوروں کی محنت استعمال میں لائی جا سکے۔ اور مزدوروں کی
جماعت کو ایسے طریقوں سے منظم کیا جائے کہ وہ اپنی لڑائی اسوقت
تک جاری رکھ سکیں جب تک کہ محنت کے معاوضہ کا طریقہ تبدیل
نہ ہو مزدوروں کو آزادی حاصل نہ ہو، اور ایک مکمل صنعتی جمہوریت
حاصل نہ کر لی جائے۔

کوئلے کی کانوں میں بھی یہ جذبہ پورے شباب پر تھا؛ اس کا اندازہ
کوئلے کی کانوں کے فیڈریشن سکریٹری فرینک ہاجیز کے اس بیان
سے ہوتا ہے جو اس نے سنہ ۱۹۱۸ء کی کانفرنس میں "وطنیت" کے خلاف
تقریر کرتے ہوئے دیا تھا کہ:۔

جب تک کہ مزدوروں کی جماعت پر لوٹ کھسوٹ
کا سلسلہ رہیگا مجھے پورا یقین ہے کہ میرے ملک میں
وطنیت سے ایک شخص بھی فائدہ نہ اٹھا سکیگا۔"

حالات کا یہ رنگ دیکھ کر ٹریڈ یونین جماعتوں نے بھی اپنی
پالیسی بدلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جہتی کی شعاع روشن ہوتے ہی مزدور
جنتا ٹوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹریڈ یونین کی ممبری کی تعداد
اسی طرح بڑھنے لگی جس طرح کی لڑائی طول اختیار کرتی گئی؛ سنہ ۱۹۱۳ء
میں ٹریڈ یونین کانگریس کے ممبروں کی تعداد سوا دو ملین (ساڑھے
بائیس لاکھ) تھی سنہ ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد پینتالیس ۴۵ لاکھ تک پہونچ گئی۔
چھوٹی چھوٹی جماعتیں جو پہلے اپنی ڈفلی الگ بجا رہی تھیں ایک جھنڈے
تلے آگئیں۔ سنہ ۱۹۱۷ء ایکٹ کے نافذ ہوتے ہی اس نے ایک فیڈریشن
کی سی صورت اختیار کر لی؛ اسی سال کوئلے کی کان ریلوے، اور
آمد و برآمد کے مزدوروں کی جماعتیں ایک کانگریس کے تحت آگئیں
لڑائی کے شروع ہوتے ہی سنہ ۱۹۱۴ء میں جو خواب دیکھا گیا تھا اس کی
تعبیر سنہ ۱۹۱۹ء میں اس طرح نکلی؛ اچھا اب دیکھنا یہ ہے کہ مزدوروں
کی اس تحریک کو کچلنے کیلئے سرمایہ داروں نے کیا کیا۔ اس سے پہلے کی
مزدور جنتا ایک جھنڈے تلے آگئی اور ان کی بکھری ہوئی قوت سمٹی
سرمایہ داروں نے سنہ ۱۹۱۶ء میں اپنی ایک فیڈریشن برطانیہ کی صنعتی
فیڈریشن (British Industrial Federation)
کے نام سے بنالی۔

سرمایہ کی یہ مرکزی قوت تیز تر مزدوروں کو پیس کر رکھ ہی دینے
ہی والی تھی کہ روسی آسمان سے گھنگھور گھٹائیں اٹھیں اور انقلاب کی
موسلا دھار بارش یکایک شروع ہو گئی۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں روسی مزدوروں
نے جاگیرداری، زمینداری شاہی اور سرمایہ داری کے خلاف مقدس بغاوت
کی جنگ سے تھکی ہوئی جنتا نے یورپ کے اس ردِ عمل پر خوشی کے
نعرے بلند کئے۔ روس کے موافق جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جون
۱۹۱۷ء میں لیڈز (Leeds) کے مقام پر ایک زبردست
جلسہ ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک میں مزدوروں اور سپاہیوں کی
کونسلوں کا جال سوویٹ روس کے مطابق پھیلا دیا جائے۔ مگر سرمایہ
کی مشینری ہوشیار تھی اور مزدوروں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی
نہ ہو سکی۔ مگر مزدوروں نے اپنی شکست کا جواب اس طرح دیا کہ مئی
اور جون دو مہینوں میں کلائیڈ۔ شفیلڈ۔ بیرو۔ لنڈن اور دوسرے
اسلحہ کے کارخانوں کے مراکز پر ہڑتالوں کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس سے
مزدور تحریک کو اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ لیبر پارٹی کی موافق جنگ پالیسی
تبدیل ہونے لگی۔

جس وقت مزدوروں کی چیخ اور پکار سے مرعوب ہو کر لیبر
پارٹی نے سوویٹ روس کو (Stockholm)
کے مقام پر منعقد ہونے والی بین الاقوامی سوشلسٹ امن کانفرنس
کی شرکت کا دعوت نامہ بھیجا اور روس نے اسے منظور کر لیا تو پارٹی
کے اندر ایک عجیب ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہنڈرسن جو کولیشن کیبنٹ
مشترکہ وزارت میں لیبر پارٹی کا نمائندہ تھا مستعفی ہو گیا۔ اس وقت
مزدوروں کو تھوڑی سی فتح حاصل ہوئی اور یہ طے پایا کہ پارٹی کا ایک
نیا وفاق بنایا جائے جس کا پروگرام اشتراکی ہو۔

چونکہ روسی انقلاب ایسے زمانے میں ہوا تھا جبکہ برطانیہ کی سیاسی
کشمکش ذہین مفکرین کو گہرے غور و تفکر کا موقع ہی نہ دیتی تھی اسلئے
برطانیہ کے سوشلسٹ روس کی اقتصادی کروٹ کو پوری طرح نہ سمجھ
سکے البتہ جان میکلین نے جو بے مثل شورش پسند معلم اور کلائیڈ کے
مزدوروں کا ہر دلعزیز لیڈر تھا، برطانیہ کا سب سے اونچا پُر خلوص مارکسٹ
اور انقلابی تھا ۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں اعلان کیا کہ روس کو کامل

آزادی اسی وقت حاصل ہو سکے گی جب کہ طاقت وہاں کے مزدوروں
کے ہاتھ میں آ جائیگی اور وہی وقت ہوگا جبکہ روس کی آزادی ایک
ناقابل شکست قوت حاصل کرے گی۔ اس نے اپنے اعلان میں برطانیہ
کے مزدوروں سے بھی اپیل کی کہ وہ بھی روس کے نقش قدم پر چلیں
جنگ کے خلاف جو جدوجہد روسی مزدوروں نے شروع کی ہے،
وہ بھی اپنی پوری قوت سے اس میں شامل ہو جائیں، تاکہ حکمراں،
سرمایہ دار طبقہ دنیا کے پردے سے ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے اور
دنیا میں ہمیشہ کیلئے امن کی صورت پیدا ہو جائے۔

نومبر میں جو خبریں دنیا نے سنیں ان خبروں نے نہ صرف دنیا
کو حیرت میں ڈالدیا، بلکہ دنیا کو متزلزل بھی کر دیا۔ دنیا کی انتہائی بنیادیں
بھی ہل گئیں، کئی جھوٹی خبروں کے سیلاب اور گھناؤنے پروپگنڈے
سے بھی یہ حقیقت نہ چھپ سکی کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نیچے طبقے
کے لوگوں نے نہایت عظیم اور بلند حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں
لے لی اور اسکو سرد و گرم جھونکوں کے باوجود ہاتھوں سے نہ چھٹنے دیا۔

برطانیہ میں جو اس کا اثر ہوا وہ کلائیڈ کے معتدل لیڈر پی جی
ڈوکن نے اپنے ایک بیان میں اس طرح ظاہر کیا۔

۴۳

"سارے ملک میں ان نام نہاد سوشلسٹ اور
لیبر جماعتوں کے رہنماؤں کے اس طرزِ عمل کے خلاف
جو وہ ہمارے بالشویک کامریڈوں کی مخالفت
میں ظاہر کر رہے ہیں ایک بے چینی کی لہر دوڑ رہی ہے"
"ممکن ہے کہ ہمارے روسی کامریڈ اپنے طریق
عمل میں نرم نہ ہوں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں
کر سکتا کہ انکا مقصد وہی ہے جو ہمارا مقصد ہے"

جنوری ۱۹۱۸ء میں ناٹنگھم کی لیبر پارٹی کی کانفرنس میں یونائیٹڈ
نئی روسی ریپبلک کے مجاہد کا نہایت جوش و خروش سے استقبال ہوا،
اسی وقت کلائیڈ کے انجینئرنگ اور دوسری معادن ٹریڈ یونین جماعتوں
نے حکومت کو اس کے نئے اسلحہ بندی کے بل کے خلاف ایک زبردست
سیاسی ہڑتال کی دھمکی دی، اور ساتھ ہی یہ کہا کہ فوراً ایک بین الاقوامی
کانفرنس بلائی جائے جو صلح کی شرائط پر گفتگو کرے۔ حکومت نے

ایشیا

سر آکلینڈ گیڈس کا فوری تقرر اس بات کیلئے کیا کہ ان جھگڑوں کو انجینیروں
کو ختم کر دیا جائے؛ لیکن مزدوروں کی یک جہتی کا یہ عالم تھا کہ ان کو
اسی طرح منہ کی کھانی پڑی جس طرح کہ مسٹر لائڈ جارج کو دو برس پہلے۔

جنگ کے آخری دو سالوں میں بے چینی کا سیلاب دن
بدن تیزی اختیار کرتا گیا، "مئی ڈے" کے احتجاجی جلسے نے ایسی
عظیم الشان صورت اختیار کی کہ کلائڈ کے کارخانے بند ہو گئے اور
وہاں کے لوگوں میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے کبھی بھی
دو کانوں کے منتظمین اور مزدوروں کی کمیٹیوں میں ایسا زبردست اتحاد
نہ ہوا تھا؛ مختلف اضلاع میں تحریک بڑھنے لگی اور ان میں ایک
ایسا ربط قائم ہونے لگا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ تحریک اب محدود
نہ رہیگی بلکہ بہت جلد قومی حیثیت اختیار کر لیگی؛ یہاں تک کہ اگست
کے مہینے میں پولس کی جماعت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور
اس نے بھی ہڑتال کی دھمکی دی؛ اس چیز نے حکومت کو اچنبھے میں
ڈال دیا؛ پولس کی ہڑتال کے ساتھ ہی اسلحہ خانوں کے کارخانوں،
خصوصاً جنوبی ساحل کے بحری مرکزوں میں بھی ہڑتال کی صورت پیدا
ہوئی؛ ۱۹۱۸ء کے موسم سرما کے شروع ہوتے ہوتے ایسے ہی جھگڑے
فوجوں میں بھی اٹھنے لگے۔ ایٹپلیس (Etaples) کے فوجی
محاذ پر غدر رہا۔ ٹی۔ ایچ۔ ونٹرنگھم (T. H. Wintringham)
کی کتاب "غدر" کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوجی پولیس پر
گولیاں بھی چلائی گئیں۔ اور اگر مسٹر اسٹیفن گراہم کے بیان پر یقین کر لیا
جائے تو (Brigade of Guards) میں بھی ناراضگی کے
آثار پیدا ہو گئے تھے۔ جرمنی کے آخری زبردست حملے کے ٹوٹتے ہی
مرکزی طاقتیں بیٹھ گئیں اور جنگ ختم ہو گئی۔ مرکزی طاقتوں کی شاہی
باجگزاری خاک میں مل گئی؛ اور اب ہانپتی ہوئی انسانیت کو سانس
لینے کا موقع ملا؛ برطانیہ کے مزدوروں کو بھی مسٹر ویب کے الفاظ میں یہ

کہ جنگ عظیم کی راکھ سے کوئی چنگاری ایسی مزدور بھڑکے گی جو انہیں
بہتر تمدن کی روشنی سے ہمکنار کرے گی؛ لیکن ہوا یہ کہ حکمراں طبقہ
پہلے سے بھی زیادہ موٹا ہو گیا۔ انھوں نے ناقابل بیان منافع حاصل
کئے، مثال کے طور پر ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں ایک ممتاز سیلولائٹ
کے کارخانے کا حصہ ۱۴ پاؤنڈ دس شلنگ میں فروخت ہوا۔
جنگ ختم ہونے کے تین دن بعد لیبر پارٹی کی ایک فوری کانفرنس
لنڈن میں منعقد ہوئی اور اس نے لیبر وزیروں کو مشترکہ وزارت سے
نکال کھینچا اور حکومت کی قدیم اقتصادی پالیسی کو برقرار رکھنے پر زبردست
صدائے احتجاج بلند کی عام انتخاب کیلئے جنتا کے نام ایک نیا اعلان
شائع کیا گیا جس کے عنوانات یہ تھے کہ:۔

(۱) جمہوریت کو برقرار رکھو (۲) امن کے لئے نئی بنیاد ڈالو (۳)
ملک مزدوروں کا ہے (۴) دس لاکھ اچھے گھر تعمیر کرو (۵) سرمایہ پر ٹیکس
لگاؤ۔ مخصوص طور پر یہ خواہش کی گئی کہ:۔

"کوئلے کی کانوں، ریلوے، جہازات، اسلحہ،
برقی طاقت اور ایسے ہی دوسرے عوام سے تعلق
رکھنے والے شعبوں اور محکموں کو فوری طور پر قوم
پرورانہ اور جمہوری نظام کے ماتحت لایا جائیگا۔ ٹریڈ
یونین ازم کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے گا اور اسے
انتہائی وسعت دی جائیگی؛

بے روزگاری کو ختم کر دیا جائیگا؛ ہر شخص کو
کام کرنیکا حق ہوگا؛ اور مزدوری کے اوقات قانونی
طور پر معین ہوں گے؛ اور فیکٹریوں کے قوانین
میں سختی کے ساتھ تغیر اور تبدل ہوگا؛ جس کا مقصد
یہ ہوگا کہ مزدوروں کی حفاظت قانونی طور پر
ہو سکے اور ان کے نقصانات کی تلافی کی جا سکے؛

(باقی)

اُردو شاعری میں عورت کا تصوّر

(سیّد محی الدّین رنجور عظیم آبادی)

میکسم گورکی کہتا ہے۔

"پھول آفتاب کے بغیر نہیں کھل سکتا، نیک بختی محبت کے بغیر نہیں ظہور پذیر ہو سکتی اور محبت عورت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی ——— انسان کی تمام خوبیاں اور خصائل جمیلہ ماں کے دودھ کی چھاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔"

قانون فطرت ہے کہ ہر ذی حیات کا نر سراپا پرستش و نیاز ہوتا ہے اور مادہ سراسر عشوہ و ادا، جبلّی طور پر انسان بھی اسی اصول کا پابند ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں تمدن کی روشنی پہنچی ہو یا نہیں، آئین معاشرت مدون ہوا ہو یا نہیں مرد نے ہمیشہ عورت کے سامنے اپنی شکستگی کا اعتراف کیا، شاعر کا جمالیاتی ذوق اور جذبۂ شعری اس کی ایک جنبشِ ابرو کا متمنی رہا، یورپ کے قرونِ وسطیٰ اور عرب کے دورِ جاہلیت کا مطالعہ کیجئے، میرا دعویٰ بالکل صحیح نظر آئیگا ——— اُس دور کا معیار ادب کتنا ہی پست ہو، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہی وہ آئینہ ہے جو فطرتِ انسانی اور روح وجدان کی سچی روکشی کر سکتا ہے

اس کلیہ کے بعد اُردو ادب کا مطالعہ کیجئے، آپ یہاں بالکل دوسرا ہی عالم دیکھیں گے ——— یہاں ادب کا اکثر حصّہ ایسا نظر آئے گا، جس میں نسائیت، اور اسکی نزاکتِ فطری کا وجود نہیں، لانبے لانبے بال اور شرمیلی نگاہوں کا فقدان ہے، البتہ سبز خط امردوں کے معاشقہ کی داستاں سرائیاں، ان کے جلوۂ بے محابا کی جلوہ پاشیاں، بھیگی مسیں اور گھونگھر یالے بالوں کی قصیدہ خوانیاں ہیں۔

اس کے اسباب سمجھنے کیلئے کسی فلسفہ کے مسئلہ کی عقدہ کشائی کی ضرورت نہیں ——— بات یہ ہے کہ اردو نے فارسی کی گود میں آنکھ کھولی، اسی ماحول میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی، فارسی ادبیات نے اس پر اپنی پوری پوری رنگ آمیزی کی، بحور و قوافی میں تقلیدیں کی گئیں، اصول و قواعد کے جادہ سے سرِ مو قدم نہ ہٹایا گیا، اگر یہیں تک بس کی جاتی تو کوئی بات نہ تھی غضب تو یہ کہ وہ تمام فرسودہ عناصر بھی کورانہ طور پر اردو ادب میں داخل کر لئے گئے جو اس کے ماحول کے قطعی منافی تھے ——— لیلیٰ مجنوں کا معاشقہ، شیریں و فرہاد کی محبت مانی و بہزاد کی نقاشی، جیحون و سیحون کی طغیانی، بلبل کا نغمہ، گل کی رعنائی، اور سنبل کی زلف پریشانی آج بھی ہمارے ادب کی جزوِ اعظم بنی ہوئی ہے، ناختہ سرو پر دلدادہ ہے، بلبل گل پر فریفتہ، کتاں چاند کی ضیا پاشیوں سے پارہ پارہ ہے، فارسی کا یہ اثر کچھ تعجب خیز بھی نہیں، کیونکہ

لہ کشش کا سوال ہی نہیں، تاریخی طور پر مغل ان سامانوں کو اپنے ساتھ لائے تھے اور انکی بڑھوتری مسلمانوں کی حاکمیت کی وجہ سے ہوئی کشش کا فلسفہ اتنا ہی تو ہے کہ برائے عادتہ جس شے کو زیادہ سے زیادہ متاثر کر دیتی ہو وہ شے زیادہ ذی اثر ہو جاتی ہے، ورنہ کنول، گلاب سے کم خوبصورت نہیں۔ ساغر ایشیا

وہاں کی آب وہوا تک میں یہ اثر ہے کہ سب کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے، اور جسے چاہتی ہے اپنا بنا لیتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ کتنی قومیں فاتح بن کر آئیں اور ذہنی طور پر مفتوح ہو گئیں، اسکندر اعظم اس لالہ زار میں پہونچا اور یہیں کے رنگ میں ڈوب گیا، عباسیوں نے اس سرزمین پر قدم جمائے اور ایرانی تمدن میں مدغم ہو کر رہ گئے، اور اموی دربار میں بھی کسروی آوازہ سرنہ ہو سکا، ——— آرٹ اور لٹریچر کا کیا کہنا اس کے تاثرات کہاں کہاں ہیں بیان کرنے کیلئے ایک دفتر چاہیئے۔

ہاں اس ضمن میں اردو کس قدر متاثر ہوئی اس کے جاننے میں زیادہ دشواری نہیں، ہمارے تمام ادبا اور شعرا بھی ہمیشہ فارسی شعرا کی طرح سبز خط امردوں پر مرتے رہے، میر نے مرسرآم نامی نوجوان کے حسن و رعنائی کی قصیدہ خوانی میں زمین و آسمان کا قلابہ ملا دیا، مصحفی نے طفل حجام کی محبت میں دل خون کر ڈالا، تمام مضامر جو معشوقوں کیلئے آتے ہیں۔ مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ تلمیحات میں ایاز و شمشاد کے حسن و جمال کی روکشی کی جاتی ہے ——— جناب طالب "مقدمۂ اردو" میں فرماتے ہیں کہ

"غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں، مگر حقیقت میں اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت مرد سے دو بدو گفتگو کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی نرم و لطیف باتیں ہوں جو عورتوں سے کی جا سکیں، ایشیا میں عورتوں کا درجہ تمدنی، علمی اور معاشرتی اتنا بلند نہیں جتنا یورپ کے بعض حصص میں ہو چکا ہے، للذا اردو غزل کے خیالات بھی زیادہ سادگی، بے تکلفی اور عام فہم جذبات اور عشق کی لطیف طعن تشنیع کی تصویروں پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۱۵۵"

قربان جایئے کیا استدلال ہے، تمدنی، علمی، معاشرتی پستی نرم و نازک باتیں کرنے کی تو اجازت نہیں دیتی مگر یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

۷۶

یا ؎ دل رہے ہے ہمیشہ گھات کے بیچ — کیونکہ لاؤں انھیں میں ہات کے بیچ

پھر فرماتے ہیں ——— " یہ سچ ہے کہ تشبیہوں کی نزاکت اور صنایع کی تلاش میں بعض شعرا نے سبز خط، طفل عطار، یا قبا و دستار کا ذکر کیا ہے، مگر اس کی حیثیت بھی معنوی اعتبار سے بالکل بدل جاتی ہے، اس لئے کہ شعر کے معنی اکثر اوقات اس کے الفاظ سے کہیں زیادہ وسیع و رفیع ہوتے ہیں اور باکمال شاعر کسی دنیوی محبوب کا ذکر کرتے ہوئے خالق محبوب کا خیال ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مفہوم شعر کے مجازی درجہ سے حقیقی مرتبہ تک پہونچنے میں بہت کم تکلیف ہوتی ہے صفحہ ۱۵۸"

یہی تصوف اور الوہیت کی وہ گمراہ کن فرسودگی ہے جس نے آج تک اردو ادب میں صحیح اصول تنقید قائم نہ ہونے دیا، شاعر کے ہر شعر کی بنیاد تصوف پر رکھنی غایت درجہ کی پستی نظر ہے، بھلا ان اشعار کو کسی صورت سے بھی تصوف کی طرف لیجا سکتے ہیں؟

یاں تلک خوش ہوں امارد سے کہ یا ربِّ کریم — کاش وے حور کے بدلے میں بھی غلماں مجھکو
(شاہ مبارک آبرو)

مجمع ترکوں کا کوئی دیکھو ذرا جا کے کہیں — جس کا میں کشتہ ہوں اسمیں وہ سپاہی بھی نہ ہو
(میر)

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں
(میر)

ایشیا

آخر ش مارا گیا ہاتھوں سے ان کے گوہری ہم نہ کہتے تھے کہ ان بانکے پٹھانوں کو نہ چھیڑ
(گوہری)

اس مغل زادے سے نبھی بات کی تکرار خوب بدزبانی کی بھی اس نے تو کہا بسیار خوب
(میر)

ولی دکنی کی مثنوی امرت لال اور سینکڑوں شعرا کے کلام اس قسم کے پیش کئے جا سکتے ہیں جو جذبۂ امرد پرستی کے قطعی آئینہ دار ہیں، طالب صاحب کو اگر ان سب میں تصوف والوہیت کا رنگ نظر آئے تو یہ ان کی نظر کا معجزہ ہے۔ مندرجۂ بالا اشعار کی تہ میں ہوسکتا ہے کہ کچھ اصلیت بھی ہو اور بعض شعرا کے اصلی خط وخال نظر آتے ہوں لیکن یہ قطعی ہے کہ اس کی بنیاد زیادہ تر فارسی کی کورانہ تقلید[1] پر ہے۔

فارسی شاعری میں یہ چیز کہاں[2] سے آئی خود ایک اہم موضوع ہے، لیکن اتنا مسلّم ہے کہ امرد پرستی کا ذوق سرزمین فارس کا ایک قدیم ذوق ہے، اور سچ پوچھئے تو اس ذوق کی ترویج دور از قیاس بھی نہیں، کیونکہ جہاں مدت سے عورتوں کے خلاف نفرت انگیز جذبات پرورش پا رہے ہوں، جس قوم کی کتب مقدسہ میں ان سے کنارہ کشی کی تلقین ہو اس قوم سے اس سے کچھ زیادہ چاہنا بھی اس پر ظلم کرنا ہے، خطبات[3] زرتشت کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے

"اے سپیتا زرتشترا! یہ گاہی (عورت)، ہے جو اپنے اندر مومنین ومنکرین، پرستاراں مزدا اور پیروان دیو، یعنی بُرے بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے، اے زرتشترا! اس کی نگاہ عظیم الشان سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے نازل ہوتا ہے، بقدر ایک ثلث خشک کر دیتی ہے، اے زرتشترا! اس کی نگاہ ایک ثلث طلائی رنگ پودوں کو افسردہ کر دیتی ہے، اسکی نگاہ سپنتا آرمائتی (دھرتی ماتا) کی ایک ثلث طاقت زائل کر دیتی ہے، اور اس کے چھونے سے مومنین کے ایک ثلث نیک خیالات۔ ایک ثلث اقوال پسندیدہ، ایک ثلث اعمال حسنہ، ایک ثلث طاقت جسمانی، ایک ثلث قوائے فتحمندی اور ایک ثلث تقدس خاک میں مل جاتا ہے، اے سپیتا زرتشترا! میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رینگنے والے سانپوں سے، غرانیوالے بھیڑیوں سے، اُس مادۂ گرگ سے جو گلہ پر چھاپہ مارتی ہے، نیز اس مینڈکی سے جو اپنے ہزاروں بچوں کو لئے ہوئے پانی میں کود پڑتی ہے، ان سب سے زیادہ اس مخلوق کو تباہ ہونا چاہیئے"

ادب قوموں کے معاشرۃ، تہذیب وتمدن اور جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے، ہر قوم کے خط وخال خود بخود اس آئینہ میں آجاتے ہیں اور مستقبل کا مورخ ان کی جھلکیاں عینی مشاہدہ کے طور پر دیکھ لیتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری میں مونث ومذکر کی کوئی تفریق نہیں مگر سینکڑوں لوازمات رعنائی وجمال اور خصوصیات عشوہ وادا اس طرح کی ہیں جو صرف نوخیز امردوں ہی پر منطبق ہو سکتی ہیں، تلاش وتجسس سے

---

[2] ایران میں یہ ذوق شاید یونان سے آیا، افلاطون کی کتاب Banquet سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان قدیم میں یہ ذوق اعتقادات مذہبی میں شامل تھا، ویوی (Aphrodite) کے تولید کے متعلق خیال ہے کہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئی تھی کیونکہ یورینیوس نے ایک اپنے ہی ہم جنس سے اختلاط کیا تھا جو اس کی پیدائش کا سبب ہوا، ارسطو اور سقراط بھی روحانی ارتقا کیلئے استلذاذ بالمثل کے حامی ہیں (ضمیات یونان)

[3] یہ قدیم اہل فارس کی ایک مذہبی کتاب ہے، اپنے دور میں اسکو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج قرآن اور انجیل کو ہے۔

[1] آپ کی صلح پسندی، اور مہاتمائیت قابل داد ہے، صاف صاف کہیئے کہ جو کچھ نظم کیا گیا ہے وہ اس عہد کی سوسائٹی کا ذوق تھا اور یہ تمام "شعرائے کرام" اسی "بدذوق سوسائٹی" کے "نمائندہ" افراد تھے۔ ساغر

بہتیرے قصیدے، سینکڑوں غزلیں ایسی مل سکتی ہیں جس میں ان کے حسن وادا، غمزہ وناز کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے، امیر معزّی ملک شاہ سلجوقی کے دور کا ملک الشعرا تھا، اس نے سمرقند کی فتوحات کے موقع پر ایک قصیدہ کہا تھا، اس میں خوشرو سپاہیوں کے خط وخال کی کیا ہی رنگین تصویر پیش کی گئی ہے ـــــ ملاحظہ ہو

یکے بہ ساعدِ سیمیں درون فگندہ کماں ۔۔۔ یکے بہ سُنبل مُشکیں درون کشیدہ سپر

یکے شگوفۂ سوسن گرفتہ در جوشن ۔۔۔ یکے بنفشہ و عنبر نہفتہ در مغفر

ابوالمعانی رازی کے ایک بہاریہ قصیدہ میں سلطان مسعود سلجوقی کے غلاموں کی عشوہ طرازی و حسن وجمال کا نقشہ دیکھیے:-

یارب ایں بچہ ترکاں چہ بتان اند کہ ہست ۔۔۔ کہ ہمہ مردم نظارہ ازیشاں چو بہار

نظر زہرہ و مریخ بہم بافتہ اند ۔۔۔ کہ ہمہ روز نواز ند ہمہ تیغ گذار

بگہِ رزم نہ دانند بجز اسپ و سلاح ۔۔۔ بگہِ بزم نہ دانند بجز بوس و کنار

منم آنکس کہ ہمہ سالہ دریں اندوہم ۔۔۔ کہ ازیناں صنمے بینم اندوہ گسار

یہ تو بحرِ تخیل کی موجیں تھیں، سینکڑوں تاریخی شہادات بھی اس ذوق کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں معاشقہ کی داستانیں ایسی بہم پہنچائی جا سکتی ہیں جن کے ہاتھوں نہ جانیں کتنے اہل کمال اور فرد روزگار شعرا کا خون ہوا ـــــ اور آج تک تاریخ معاشرہ ان دھبّوں سے رنگین ہے۔

دقیقی[1] ایک ترک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا، ظہیر فاریابی کا تمام کلام حکمت وموعظت سے لبریز ہے اور ہر اہل تصوّف اس پر سر دھنتا ہے، مگر انھیں کیا معلوم کہ بتانِ شکر لب کے معاشقہ نے اس بیچارہ کی کیا درگت بنائی، غضب تو یہ کہ اوحدالدین کرمانی جیسا صوفی مشرب آدمی ان ماہ رویان سبز خط کی گھنیری زلفوں میں الجھنے سے نہ بچ سکا، روایت ہے کہ جس وقت اُن پر جذبی کیفیت طاری ہوتی تھی تو فرط محبت میں کسی خوبرو کو سینہ سے چپٹا لیتے تھے، بغداد شریف تشریف لائے تو خلیفہ کے نو عمر صاحبزادے نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، ولیعہد غضب کا حسین وجمیل تھا، اسلئے اہالیان بارگاہ شاہی نے شاہزادے کو ملنے سے روکا اور انکی حرکت والہانہ سے آگاہ کیا، شاہزادے نے کہا کہ اگر انھوں نے میرے ساتھ ایسی حرکت کی تو میں انھیں قتل کرادوں گا، وہ صوفی نہیں بلکہ کافر ملحد ہے، آخر اُس نے ملاقات کی؛

بوقت ملاقات کرمانی نے یہ رباعی پڑھی ؎

سہل ست مرا بر سرِ خنجر بودن ۔۔۔ در پائے مرادِ دوست بے سر بودن

تو آمدۂ کہ کافرے را بکشی ۔۔۔ غازی چو توئی رواست کافر بودن

ہر ملک کی الگ خصوصیتیں ہوتی ہیں، اور مخصوص ماحول کی چیزیں شعر وادب میں بھی رچ جاتی ہیں۔ انگریزی ادبیات میں [illegible]

۷۸

---

[1] یہ وہی دقیقی ہے جس نے شاہنامہ کا آغاز کیا اور فردوسی کو زندۂ جاوید بنانے کا محرک ہوا۔

کی بہت تعریف ہے، ہندوستان میں ساون کی گھنگھور گھٹاؤں سے گھرا ہوا آسمان نہایت کیف انگیز سمجھا جاتا ہے، لیکن ہمارا اردو ادب ہمیشہ حقیقت نگاری اور ماحول کی سچی تصویر کشی سے عاری رہا۔

شاخ اور پتوں پر مرنے والوں نے کبھی نہ جانا کہ پھولوں کی رنگینیوں اور نکہت بیزیوں میں کتنی حسن کی جمال آرائیاں پوشیدہ اور بادلوں کی اوٹ میں کتنی بجلیاں خوابیدہ ہیں۔ اسی طرح صنف نازک بزم شعر و ادب سے ہمیشہ دور رکھی گئی ؎

گندمی رنگ بھی ہو زلفِ سیہ فام بھی ہو[1]

مرغ دل کیوں نہ پھنسے غلّہ بھی ہو دام بھی ہو

پر ہمیشہ سر دُھنا گیا مگر زلف تاکمر میں کس قدر جادو بھرا ہے کسی کی نظر سے نہیں گزرا، ایاز کا حسن نادیدہ تخیلہ کو ہمیشہ رنگین بناتا رہا لیکن ایک دہقانی دوشیزہ کی کافرماجرائی کبھی بھی مرکز تصور نہ بن سکی، اگر انھیں انجمن ادب[2] میں لایا بھی گیا تو بالکل مسخ شدہ صورت میں، متاع حسن لٹی لٹی، دامن عصمت چاک چاک، کبھی سر بازار، کبھی چوراہوں پر، ہر کسی سے نظر بازیاں کرتی ہوئی اور پیام وصل پر ہمیشہ رضا مند۔ ایک تصویر ملاحظہ ہو ؎

چھاتی یوں جی میں آن اڑتی ہے	گویا چھاتی سے چھاتی لڑتی ہے
دل ہے ہے ہمیشہ گھات کے بیچ	کیونکہ لاؤں انھیں میں ہات کے بیچ
کیا ہی خوبی سے مَنت مال کرے	جی ہی جانے جو تیرا حال کرے
سِسکیاں لیکے تلملانے لگے	.. ..
شرم کے مارے پست ہو جائیں	ہاتھوں ہاتھوں میں مست ہو جائیں

[3]

.. ..

یہ اقتباس خواجہ میر درد دہلوی کے بھائی خواجہ میر اثر دہلوی کی مثنوی "خواب وخیال" سے پیش کیا گیا ہے، اللہ اللہ! وہ خواجہ میر اثر کہ جن کے زہد و تقویٰ پر رشک کیا جاتا ہے اور نقشبندیہ طریقہ کے مشائخ طریقت میں شمار ہوتا ہے۔

---

[1] اس شعر کے ساتھ ساتھ فارسی کے اس شعر کو پڑھئے، تخیل کی کسقدر ہم آہنگی ہے ؎

سبز خط بہ خط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

[2] زیادہ تر مثنویوں میں تو مردوں کی ہوسناکیوں کا شکار بنانے کیلئے — رنجور

[3] شعر نہایت خوب تھا، مگر شدید عریانی کی وجہ سے کاٹ دیا گیا، رنجور صاحب معاف کریں۔

بات یہ ہے کہ کسی شخص کو نظم و مضمون لکھتے وقت یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ادب صرف پختہ کار مردوں ہی کا حق ہے؛ خاص کر ایشیا کے متعلق میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اسکے ناظرین میں ۵۰ فیصدی عورتیں ہیں۔ اسلئے اسکے فاضل مضمون نگاروں کیلئے احتیاط لازمی ہے۔ ساغر ایشیا

لیکن حیرت بالائے حیرت اسوقت ہوتی ہے جب میرؔ جیسا سنجیدہ اور پرگو شاعر بھی اس حمام میں آکر ننگا ہوجاتا ہے اور اپنی تمام متانت شعری کھو بیٹھتا ہے ؎

پان کا شوق نہ تھا کیسا مسّی کا مذکور — غصّہ ہوجاتے تھے سُن ایسے کسی کا دستور
یا تو اب کبنی پھٹی، مونڈھے جسے رہتے ہیں — باہر اندر ہو کہیں بند کھلے رہتے ہیں
کب کب آنچل رہے تھا ہاتھ میں اکلائی — اتنا دل بستہ نہ تھا جامۂ زیبائی کا
جن کا شیوہ ہو حرمزدگی انھیں سے صحبت — بندگی کیشوں سے پرخاش خدا کی قدرت

مگر اس دور کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو تعجب کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اپنے ماحول و معاشرۃ کی سچی تصویریں ہیں۔ یہ سرمایۂ ادب کے اس دور کی یادگار ہے جبکہ اسلامی شان و شوکت کا آفتاب ڈوب رہا تھا جس طرح سلجوقی دور تاریخ فارس میں سیاسی انحطاط اور رنگ رلیوں کا شرمناک زمانہ ہے، بالکل اسی طرح یہ دور حکومت تاریخ ہند کا ایک نہایت حسرتناک باب ہے۔ بادشاہوں اور امرا کی عام عیش پرستیاں تھیں، انکی ہوسناکیاں سرحد اعتدال سے گزر چکی تھیں، سماج میں عورتوں کی پوزیشن صرف ایک جام رنگیں کی سی رہ گئی تھی۔

"راستوں[1] پر رقاص عورتوں کیلئے تخت چنے جاتے تھے، جگہ جگہ خوش اسلوبی کیساتھ ساتھ نوبتیں بجتی تھیں، اچھے اچھے لوگ سوانگ بھر بھر کر نکلتے تھے، جوگی، اوباش سپاہی، خمار اور شاعر کی نقلیں کی جاتی تھیں —————— اس زمانہ میں عورتوں کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ فطرتاً مکار ہوتی ہیں، ان کا فریب سارے جہاں میں مشہور ہے، قرآن پاک میں بھی ان کے مکر و کید کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اکثر ناقص العقل ہوتی ہیں اور کسی سے وفا نہیں کرتی ہیں، عورت ظاہر میں لاکھ رشکِ ماہ ہو، باطن میں ضرور مارِ سیاہ ہوتی ہے، اس کے علاوہ نوجوانوں کا عام مذاق بھی بگڑ گیا تھا، امرد پرستی فیشن میں داخل ہوگئی تھی اور مردوں میں نسائیت نمائی کا شوق بڑھ رہا تھا۔" (روح تنقید حصّہ دوم)

ان خیالات نے رنگیلے شاہ وغیرہ کے دور میں کتنا ہی زور پکڑا ہو۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مغلوں کے عہد میں شروع ہی سے یہ سب چیزیں داخل ہوتی جا رہی تھیں، سب سے پہلے اکبر اعظم نے اس بیج کو بویا، اس کی سینکڑوں کنیزیں، بیسوں مغنیے تعیش پرستی کی بدیہی دلیلیں ہیں " ساون بھادوں، اور "شیش محل" کی رنگ رلیاں، آج تک رومانی یادگار سمجھی جاتی ہیں، فیضی کی مثنوی نل دمن کی محرک بھی یہی بزم طرب ہے، جہانگیر بیچارہ تو رومانی بادشاہ مشہور ہی ہے اور بقول بعض مورخین[2] کے شعر و موسیقی، مصوری اور مے نوشی کے لئے پیدا ہی ہوا تھا اور نورجہاں نے اسکے جمالیاتی ذوق کو اور بھی رومانی کر دیا تھا اس کا ایک شعر ہے ؎

جام مے را بر رُخِ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

---

[1] میر کی مثنوی میر سرام بالکل انھیں جذبات کی حامل ہے، میر سرام (پٹنہ کا ایک حسین نوجوان) نے عاشق سے اپنی شادی ہوجانے کا ذکر کیا اور مزید صحبت و مواصلت کی معذرت پیش کی تو عاشق نے بالکل ہی منظوم تحریر اپنے محبوب کے سامنے پیش کی ہے،

[2] تذکرہ مرزا سرخوش

شاہ جہاں کا مذہبی غلو اور اتقا مشہور ہے، لیکن ملکہ پر شاعروں کا منہ آنا اور آوازہ کسنا آج تک تاریخ میں یادگار ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ممتاز محل ہاتھی پر عماری کے اندر "صاحب باغ" کی سیر کو جا رہی تھی، میر صیدی نے یہ منظر دیکھا تو اس شعر کو بلند آواز میں پڑھا[1]

برقع بہ رُخ افگندۂ و ناز بباغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

بیگم نے سنا تو شاعر کو پانسو روپیہ انعام عنایت کیا (تذکرۂ مرزا سرخوش)

اورنگ زیب کی مذہبیت اور تدبرِ سیاسی مسلم ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ سریر آرائے شاہی ہوا تو اس نے ان محفلوں کو درہم برہم کر دیا بزمِ شاہی سے جام و سبو علیحدہ کئے گئے، نازک اندامان ماہ وش سے محفل خالی کی گئی، لیکن افسوس کہ یہ چیزیں ملک میں جڑ پکڑ چکی تھیں اور عوام کی طبیعتوں میں یہ خیال رچ گئے تھے۔ رقعاتِ عالمگیری کو دیکھئے، اس نے اپنے ولیعہد کو جو خطوط لکھے ہیں اُس سے اُس زمانہ کے معاشرہ کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتی ہیں، ایک رقعہ میں لکھتا ہے،

"فرزند دلبند من .... شخصے در زمانۂ سلف پیش بزرگ شکایت زمانۂ آغاز کرد فرمود کہ ہنوز موقعہ سپاس و موضعہ حمد بے قیاس است۔ کہ انسان را خوفِ نان نہ غم ال و جان است، و نہ اندیشۂ ستی دین وایمان در زمان مستقبل نبات ابنائے دُنیا مبدل خواہد گشت، وجور ہائے متنوعہ ظہور خواہد یافت، عدل واحسان قطعاً خواہد رفت، خلیفۂ عصر از چشم داد خواہد پوشید .... ونسواں بدلیری پیش خواہند آمد، دختراں بولادت اختصاص خواہند یافت، مردم ذوی القدر از بس بے دلی و بے قدری عمداً بہ اصلاح کارنہ خواہند پرداخت زنان صالحہ از فسق و بے مہری شوہراں طالع خواہند نالید .... خواہش در ساکن و خواقین علانیہ ساکن خواہند بود و مرداں بہ پوشیدن لباس زناں رغبت خواہند نمود"

تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ شہادت دے سکتا ہے کہ یہ ساری کیفیتیں اس کے خاص اپنے دور یا جانشینوں کے عہد کی آئینہ دار ہیں، ہمارے ادب نے اسی ماحول میں پرورش پائی، دربار میں پھلا پھولا، اس لئے ہمارے ادب کا زیادہ تر حصہ بادشاہوں اور اُمرا کے طبعی رنگ میں رنگا ہوا ہے، اکثر مثنویاں بادشاہوں کو خوش کرنے کیلئے اُن کے فتوحات پر لکھی گئیں اور بعض میں اُن کے عیش و عشرت کی داستاں سرائیاں کی گئیں، مولانا نصرتی نے "گلشنِ عشق" عالی شاہ عادل کے کارنامہ ہائے فتح و ظفر پر لکھی، میر نے نواب آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کی رنگینیوں کو نظم کیا، دہلی میں محمد شاہی دور میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں، شاہ مبارک آبرو نے بھی کھل کر سخن آرائی کی، اور خوب خوب داد پائی۔

لطیف احمد اکبرآبادی نے "نقش و نگار" کے مقدمہ میں کتنا سچ کہا ہے، کہ "اردو شعرا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شاعری پروان اس وقت چڑھی، جب ہندوستان میں مسلمانوں کا تمدن رو بہ انحطاط تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں غیر معمولی ترقی ہوئی، اگر مستثنیات سے قطع نظر کر لیا جائے اور کثرت پر رائے قائم کرنیکا اصول صحیح سمجھا جائے تو پھر ہمارا یہ توقع کرنا کہ ہماری شاعری اخلاقی پستیوں کے سوا بھی کچھ مل سکتا ہے۔ محال عقلی کی آرزو کرنا ہے، جس شاعری کے آغاز میں میاں جعفر زٹل کا نام ملے اور جس کے عہد عروج میں رنگین اور جان صاحب جلوہ آرائے بزم ہوں اُس پر نقد و جرح کرنا بھی لا حاصل ہے"

---

[1] تذکرۂ مرزا سرخوش

سحر البیان ۔ ڈاکٹر محی الدین زور روح تنقید حصہ دوم میں کہتے ہیں کہ "میر حسن کے علاوہ ایشیا کے بعض ادیبوں نے فطرت کی نقاشیاں اور جذبات کی تصویریں پیش کی ہیں، سنسکرت میں کالیداس بھاشا میں تلسی داس، اردو میں انیس اور عرب کے قدیم شعرا میں خصوصاً امراء القیس نے ہر قسم کی فطرت نگاری کی تصویریں پیش کی ہیں لیکن سحر البیان کی سی جامعیت بہت کم کسی اور کلام میں پائی جاتی ہے"

ایک تو میر حسن کو انیس پر ترجیح دینا ہی خود محلِ نظر ہے، لیکن میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مانا کہ سحر البیان مناظر فطرت کی نقاشی میں دنیائے ادبیات میں واحد ہے، فن تمثیل اور سلاست بیانی کی روح ہے، لفظ لفظ میں محاسنِ شعری کیوں نہ ہو، مصرعہ مصرعہ اردو ادب کا شہپارہ کہا جاسکتا ہے، لیکن مصنف نے "بدر منیر" اور "بے نظیر" کے اختلاط و مواصلت کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ہمارے جمالیاتی ذوق کی پستی کی بدترین مثال ہے ڈاکٹر صاحب کو اس پہلو پر بھی نظر کرنے کی ضرورت تھی۔

اس موقع پر مستورات کی حیا سوزی اور عفت و عصمت کی چاک دامانی کا نظارہ جس صورت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر تہذیب و متانت آنکھیں بند کرلیتی ہیں، افسوس کہ اس خار و خس میں پھولوں کا پتہ نہیں ملتا اور سارے محاسنِ شعری ان خرافات میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں

شعر:-
پکڑ ہاتھ مسند پہ کھینچا اسے ۔۔۔ محبت کے رشتہ میں اینچا اسے

لگی جا کے چھاتی جو چھاتی کیساتھ ۔۔۔ چلے ناز و غمزہ کے آپس میں ہاتھ
کسی کی گئی چولی آگے سے چل ۔۔۔ کسی کی گئی چین ساری نکل

غضب تو یہ کہ مندرجہ بالا اختلاط و مواصلت کا سماں دو دو بار رسم مناکحت سے قبل پیش کیا گیا ہے جو مشرقی معاشرہ کے قطعی منافی ہے

مرزا شوق کی مثنوی نگاری طبقۂ خاص و عام میں مشہور ہے، فنی مرتبہ اس کا کچھ بھی ہو اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں، البتہ ان کے معاشقہ کی نوعیت کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں، اور دیکھنا یہ ہے کہ تعشق (... ... ...) کے جذبہ کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت مثنوی خواب و خیال میرے روبرو ہے، مثنوی کے شروع شروع میں شاعر کی جوانی و سرمستی اور جنون سامانی کی داستان سرائی، اور اوباشوں کی سیہ کاریوں کا افسانہ ہے یہ کاروانِ آوارہ سیر کی خاطر کربلا کو جاتا ہے اور بس یک بیک جس طرح آسمان سے بجلی گرتی ہے۔ اسی طرح الفت کی آنکھ بیچ میں دلال بن گئی۔ ۸۲

اس پیکرِ "رنگ و بو" کا یوں ذکر کیا گیا ہے،

شعر:-
بیٹھی ہے وہ قریب چلمن کے ۔۔۔ باہر آتا ہے نور چھن چھن کے
ہنس کے جس سمت آنکھ پھرتی ہے ۔۔۔ جانِ عاشق پہ برق گرتی ہے

اس جمال برق پاش کا نظارہ دیکھنا تھا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگا، سارے جسم کا خون آنسو بننے کو تیار ہو گیا، رات کی نیندیں حرام ہو گئیں، مگر یہ تو ابتدائے عشق تھی، محبت کی بوقلمونیاں تو آگے رنگ لاتی ہیں، ہزاروں فریب اور جعلسازی سے وہ "پارۂ ماہ"، شاعر صاحب کے باغ میں لائی جاتی ہے۔ جب وہ دوشیزہ اس گلزار الفت میں حیران و ششدر ہونے لگتی ہے تو عاشق زار صاحب ایک طرف سے یوں پھول برساتے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔

باغ پھولا ہوا ہے سبزہ ہے ۔۔۔ ہر طرف آب سرد چھڑکا ہے
دیکھو کیا چل رہی ہے مست ہوا ۔۔۔ دو گھڑی سیر کیجئے اس جا

ایشیا

کوئی اتنا روکھائی کرتا ہے ۔۔۔ یہ تو سمجھو کہ کوئی مرتا ہے

آپ کو کربلا میں دیکھا تھا ۔۔۔ جان جاتی تھی دم نکلتا تھا

اس اظہارِ تعشق پر حسینہ نے جو جلی کٹی سنائی اس کا مکالمہ بہت طویل اور نہایت بے لذّت ہے، اُس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے آپ دیکھیں گے کہ مشرقی عورتوں کا کتنا ذلیل اور مکروہ کیریکٹر نمایاں ہوتا ہے، ملاحظہ ہو۔

ساری دیکھی ہوئی ہیں یہ گھاتیں ۔۔۔ ہیں مرے ناخنوں میں یہ باتیں

ہم کہیں آتے اس فریب میں ہیں ۔۔۔ تم سے سو ایسے میری جیب میں ہیں

لاکھوں دھوکے اٹھائے ہیں ایسے ۔۔۔ سو گھروندے مٹائے ہیں ایسے

تم نے بندی سے پیش کب کھائی ۔۔۔ ہے تھپیڑے تھپیڑے بدلائی

نہ بھی جاؤں گی میں جو آج کی رات ۔۔۔ وہ نہیں ہو گی تم جو سمجھے بات

اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں ۔۔۔ مردوں پر جو جان کھوتی ہیں[۱]

یا تو جلال و تمکنت کا یوں نظارہ پیش کیا گیا ہے یا فوراً شکستگی و نیاز کا جذبہ سینے میں حلول کر جاتا ہے، اور اب تو نہ وہ بے نکی رہتی ہے نہ جوش و غضب کا وہ انداز، فوراً عشق و محبت کی پینگیں بڑھنے لگتی ہیں، حتیٰ کہ اختلاط و مواصلت کی رنگینی و پُرکیفی سے ہوسناک شباب کھیلنے لگتا ہے،

نہ رہی درمیاں میں جب تکرار ۔۔۔ ہو گیا وصل بعد قول و قرار

اور بھی میں قریب جا بیٹھا ۔۔۔ ران سے ران کو ملا بیٹھا

. . . .

کچھ دنوں تک مزے اُڑائے خوب ۔۔۔ لُطف اُس شوخ سے اٹھائے خوب

بھر گیا دل پھر اُس کی صحبت سے ۔۔۔ ہو گئی نفرت اس کی صورت سے

کیا یہی وہ نسوانی کیریکٹر ہے جس پر مشرق کو ناز ہے؟ یہی وہ صنفِ نازک ہیں جن کے دامن پر فرشتے بھی نماز پڑھیں[۲]؟

لارڈ بائرن کی سیہ کاری اور عُریاں نگاری ادبی حلقوں میں ضرب المثل ہے، لیکن اس کے ادبی کارناموں میں بھی مغرب کی عصمت باختہ عورتوں کے دامن پر ایسے بدنما دھبّے نظر نہیں آتے، ان کے کیریکٹر کا ایسا نقشہ دکھائی نہیں دیتا، حالانکہ بائرن کے قلم پر نہ تو کسی قسم سے مذہب کا تسلّط تھا، نہ معاشرہ کی زنجیر بندی تھی،

---

[۲] مرزا شوق کا زمانہ واجد علیشاہ کے عہدِ حکومت کا آخری دور ہے، اس لئے اس مثنوی کی اصلیت پر زیادہ شبہ بھی نہیں،

[۱] جتنا بھی بُرا کہیے، مگر ہے خوب!؟ ۔۔۔ رنجور

میرے خیال میں مثنوی "زہرِ عشق" میں شوق کی تمام مثنویوں سے زیادہ اعتدال پایا جاتا ہے، مخصوص حصے نہایت غم آگیں اور درد انگیز بھی ہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ جگہ جگہ قدیم فرسودگیٔ خیال اور جمالیاتی ذوق کی تہیدامانی صنفِ لطیف کے دامن کو سیہ کاری سے آلودہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی، ہمارے مشرقی شعرا (خصوصاً فارسی اور اُردو کے) حُسن و عشق مرد و عورت کے وصل و اتصال کی داستان سرائی میں اتنا پھیلتے ہیں، کہ کوئی حد و حساب نہیں۔

غور کیجئے، ابھی محبوبہ نے پہلا نامۂ محبت بھیجا ہے، نہ تو دید و شنید ہوئی ہے، نہ ارتباط و مراسم پیدا ہونے پاتے ہیں لیکن مثنوی کا ہیرو جواب یوں تحریر فرماتا ہے ؎

شعر۔ اب جو بھیجی ہے آپ نے تحریر — ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں — دل کی سب حسرتیں نکل جائیں

لیجئے فوراً ہی قسمت کا تارا یوں چمکتا ہے،

رات بھر میرے پاس رہ کے گئے — صبح کے وقت پھر یہ کہہ کے گئے

گناہ سر چڑھ کے بولتا ہے، چھپکے چوری کی ہوسناکیوں کا پردہ چاک ہوا، رنگ رلیوں اور اختلاط کی شراب گلگوں رنگ لائی، اور سیہ کاریوں کی داستانِ سربستہ کھل گئی۔ اس لئے محبوبہ عاشق ہوسناک سے آخری ملاقات کو آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام پر شاعر نے رنگینیٔ عالم اور بے ثباتیٔ روزگار کے بیان میں دل چیر کر رکھدیا ہے لیکن فوراً ہی ہندوستانی دوشیزہ کے جذبۂ نسائیت کا جس طرح خون کیا گیا ہے اس کا خوں بہا غیر ممکن ہے۔ محبوبہ کہتی ہے ؎

شعر۔ عمر تم کو تو ہے ابھی کھینا — دن بہت سے پڑے ہیں رو لینا
باہیں دونوں گلے میں ڈال لو آج — جو جو ارمان ہو نکال لو آج

[1]

.. ..

حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے — اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے

.. ..

.. ..

یہ تو خیر ایک جوان عورت کے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے، "طلسم الفت" میں بادشاہ اور اس کی بوڑھی ملکہ کے درمیان بیٹیوں کے عقد کی نسبت باہم مشورے ہو رہے ہیں، میں اس موقع کا جو منظر صاحب مثنوی نے پیش کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

شعر۔ ایک دن بادشاہِ حسن آباد — اندرونِ محل تھا با دل شاد

---

[1] سمجھ لیجئے گا کہ یہاں ناگفتنی اشعار تھے۔ رنجور صاحب معاف کریں۔ ساغر

اپنی بیوی سے گرمِ صحبت تھا | محوِ راحت تھا، مستِ عشرت تھا
اس پری رُو نے تخلیہ پاکر | عرض کی اختلاط میں آکر
سُن کے کہنے لگا یہ عالی جاہ | یہ ترے کہنے ہی تک ہے کیا اے ماہ

میں نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر اس قسم کی منظر نگاری کا کونسا موقع تھا، مگر اسکو کیا کیجئے کہ مردوں اور عورتوں کے اجتماع کے معنی ہی اردو شاعری میں صرف ہوسناکیوں کا کھیل کھیلنا ہے، اور یہ سراسر اثر ہے فارسی کی کورانہ تقلید کا۔[1]

مثلاً غور کیجئے ——— مولانا جامی کا شمار صوفیائے کرام اور مشائخ عظام میں ہے، لیکن اس حمام میں اگر وہ بھی ننگے ہو جاتے ہیں، شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور تراوشِ خامہ سے عمامۂ تقدس آلودہ نظر آنے لگتا ہے، مثنوی "یوسف زلیخا" فارسی منظومات کا ایک گراں مایہ سرمایہ ہے، فصاحت و بلاغت شستگیٔ الفاظ اور محاسن شعری سے ساری کتاب گلزار سدا بہار ہے، لیکن اس لالہ زار رنگ و بو میں بعض ایسے خار زار بھی ہیں کہ ذوقِ سلیم کبھی انھیں گوارا نہیں کر سکتا، ایک مقام پر حضرت یوسف اور زلیخا، (ایک ضعیفہ عورت[2]) کا اس طرح نقشہ پیش کیا گیا ہے ؎

لب از شیریں دہانش پُر شکر کرد | ز ساعد طوق و از ساقش کمر کرد
بہ پیش ناوکش جان را ہدف ساخت | ز شوقِ گوہرش تن را صدف ساخت
نہانے ہر از آں پیش و ستے | یکی عقدہ کشادی و بہ بستے
سوالش کرد کاں پردہ پئے چیست | وراں پردہ نشستہ پردگی کیست

اس کے بعد کے اشعار لکھنے کی مجھ میں جرأت نہیں، اختلاط و مواصلت اور تبادلۂ صہبا کی کوئی شرمناک حالت ایسی نہیں جو فروگزاشت کی گئی ہو، ——— بیچارے جامی پر کیا منحصر ہے، فارسی کا شاید کوئی شاعر ہو جو مثنوی نگاری میں اس قسم کی آلودگیوں سے پاک رہا ہو، ہاں شہنشاہِ سخن فردوسی البتہ ایسے مقامات سے آنکھیں بند کئے آہستہ گزر جاتا ہے اور اپنی متانت و سنجیدگی برباد نہیں کرتا۔

یہاں پر ہندی شاعری کی سنجیدہ نگاری بار بار دامنِ تخیل اپنی طرف کھینچتی ہے، اور غالباً اردو ادب کے تجزیۂ ذوق و وجدان کے سلسلہ میں اس لالہ زار کے رنگ و بو کا امتزاج بے محل بھی نہیں، گرچہ "مسلمان[3] کہتے ہیں، کہ ان کی قوم وہی ہے جن کا دین اسلام ہے، ہندو کہتے ہیں کہ ان کی قوم میں بھی وہی داخل ہو سکتے ہیں جن کا کسی نہ کسی وجہ سے نام ہندو پڑ گیا ہے" ——— آج سیاسی لیڈر اسے جتنا بھی

---

[1] محمد حیدر علی جوش نے متعدد فارسی مثنویوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا، جس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو فارسی شاعری میں پائے جاتے ہیں، وہی عریانی، وہی رکاکت خیالی اور ہوسناکیوں کا طومار ہے جو نہ جانے کب سے فارسی شاعری میں موجود ہے۔

[2] زلیخا ایک بوڑھی عورت تھی، یوسف علیہ السلام کی مناکحت میں آنے کے بعد آپکی دعا سے اسکی جوانی عود کر آئی۔ (اساطیر اسلامی)

[3] تحریر مولانا مناظر احسن گیلانی بہ سلسلۂ مضمون "ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب" رنجور ایشیا

چاہیں اچھالیں مگر ہمارے جدید ادب کا دیسی خیالات اور پس وپیش کے تاثرات سے اثر پذیر ہونا ایک امر ناگزیر ہے، ہم اپنے ماحول سے جتنا جی چاہے منہ موڑیں، مگر آنکھیں بند کرکے نہیں رہ سکتے، حقیقت نگاری (Real Painting.) اگر ادب اور آرٹ کا کوئی جز ہے تو ہمیں اپنے ماحول معاشرہ، مناظرِ قدرت اور جذبۂ معاشقہ کی طرف دیکھنا ہی پڑے گا ——— اور آج دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ رنگ ہمارے ادبیات پر کس قدر گہرائی سے چڑھتا جارہا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب ہمارا ادب بالکل ماحول کا سچا آئینہ بردار ہو جائیگا،

اس لئے اسوقت میں سرسری طور سے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس درپن میں عورتوں کے خدوخال کیسے نظر آتے ہیں، اور ہندوستانی شعرا کا جمالیاتی ذوق کیسا ہے

ہندی ادبیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ادب میں غنائی شاعری کی بنیاد نسوانی تاثرات و جذبات پر رکھی گئی ہے[1]۔ اس اصولِ محبت کے پردہ میں ہندوستان کے ذوقِ شعری کی کتنی بلندی ہے، ایک ماہر نفسیات ہی بتلا سکتا ہے، جوان طوفانوں سے اچھی طرح واقف ہے، جو عورت کے دل میں اٹھتے رہتے ہیں، ان نغموں کو سنتا رہتا ہے جو ان بے زبان حوا کی بیٹیوں کے بربطِ دل کے تاروں سے پھوٹتے رہتے ہیں ——— لیکن اندھی اور بہری سماج اپنی سنہری زنجیروں سے انھیں آزاد نہیں کرسکتی، شاید یہی وجہ ہے کہ جذبات نگاری میں دنیا کی کوئی زبان ہندی بھاشا سے بازی نہیں لیجاسکتی۔

پھر بھی اکثر شعرا نے صرف عورتوں کے ہی حُسن وجمال کو اپنا موضوعِ سخن بنایا، داستانوں، قصوں، اور اساطیری منظومات میں نسوانی کیریکٹر پر روشنی ڈالی، مہابھارت قدیم ہندوستان کے تہذیب وتمدن پر ایک جامع تصنیف کہی جاسکتی ہے،

پانڈؤں کے عہد میں عورتوں کی کیا پوزیشن تھی اس داستان میں صاف اور نمایاں نظر آئیگی، سب جانتے ہیں کہ یودھشٹر قمار بازی میں اپنی ساری کائنات ہار گیا تھا، حتیٰ کہ اپنی بیوی کو بھی کھو بیٹھا، دریودھن نے اس کی بیوی دروپدی کو برسرِ دربار بلایا، دربار میں دروپدی کی جو تقریر ہوتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ہندوستانی عورتوں کے کیریکٹر کا معیار کتنا بلند تھا،

"بزرگو! راجاؤں نے مجھے سویمور کے موقع پر دیکھا تھا، اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں دیکھا، ہوا اور سورج بھی مجھے نہ دیکھ پاتے تھے، آج بدقسمتی سے مجھے غیر مردوں کے سامنے آنا پڑا، اور اب اجنبی لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہوگی کہ مجھ جیسی پاک دامن عورت کو مجمع میں آنا پڑا، ہزار افسوس کہ راجے اصلی دھرم کھو بیٹھے، ہم تو سنتے آتے تھے کہ قدیم شرفا کبھی منکوحہ بیوی کو مجمع میں نہ لیجاتے تھے، افسوس کرو کہ خاندان سے دھرم جاتا ہے ——— اشلوک ۴۔ ۵۔ ۸۔ ۹ مہابھارت ص۶۱[2]"

شکنتلا کو راجہ دوشنیت پہلی بار دیکھنے پر کہتا ہے۔

"آہا!... یہ نقاب پوش، تمام بدن کو برقعہ سے لپیٹے ہوئے کوئی لڑکی سی دکھائی دیتی ہے، جس کے جسم کی خوبصورتی ذرا بھی دکھائی نہیں دیتی، ان فقیروں کے گھر میں وہ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سوکھے پتّوں میں لپٹی ہوئی نئی کونپل" (اشلوک ۱۳ شکنتلا بکر)

---

[1] تاریخ ادبیات عالم شاہد ہے کہ کیوپڈ کا پہلا تیر ایک عورت ہی کے دل میں پیوست ہوا، "غنائی شاعری" انسان کے داخلی حسیات، یاس وقنوط، امید ونشاط کی آئینہ دار ہے، مسیح کی پیدائش سے سات سو برس قبل جزیرۂ یونان کی ایک دوشیزہ (Sappho.) سیفو کے دل میں محبت کے بے پناہ شعلے بلند ہوئے، اس کا جذبۂ دردناک نغموں کے شکل میں پھوٹ نکلا جو شاید غنائی شاعری Lyrical poem کا پہلا نمونہ تھا، پھر (Arion Aleman) وغیرہم نے اسکو ترقی دی۔ (Encyclopaedia Page (533) Voll 8.)

[2] از "ہماری قدیم قومی ووطنی تہذیب" مقالہ مولانا مناظر احسن گیلانی

رنجور

ایشیا

رامائن میں لکھا ہے کہ لکشمن جی بن باس کے دوران میں صرف ایک بار سیتا جی کے پاؤں دیکھ سکے تھے ۔

ان ادبیات میں کتنا ہی غلو ہو مگر جذبات نگاری کی سنجیدگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ، بخلاف اس کے "مثنوی یوسف زلیخا" اور بہت سی اُردو مثنویاں جو اس کے تتبع میں لکھی گئیں، کی حیا سوزیوں اور مشرقی خواتین کی مکروہ تصویر کشی کا جائزہ لیجئے ۔

اس سے انکار نہیں کہ اساطیری داستانیں بھی ہندی ادب میں معاشقہ و محبت کی لطافتوں کے ساتھ آئیں، خصوصاً وشنو شعرائے[1] نے اس صنف شاعری کو خوب خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیا، رادھا و کرشن کی پریم کہانی میں عجیب عجیب رنگینیاں اور لطافتیں پیدا کی گئیں ۔ رادھا کی مدھ ماتی آنکھیں، لانبے لانبے بال، اور تلوار جیسی ابرو کی قصیدہ خوانی میں سینکڑوں، ہزاروں دیوان اور مثنویاں مرتب کی گئیں ، ودیا پتی اور کالیداس کے کارنامے اس سلسلہ میں غیر فانی ہیں، ودیا پتی نے رادھا اور کرشن کنہیا کی ملاقات کا ایک منظر پیش کیا ہے[2] ۔

شام دھندلکا لے کر آئی گوری گھر سے باہر آئی ،
چہرہ جیسے بجلی چمکے اور کاندھے پر بال گھٹا سے
نئی نویلی اور اچھوتی مالا نکھرے پھولوں والی

. . . .

رُک رُک کر وہ بول رہی تھی شرم سے اُسکی آنکھ جھکی تھی
لاج سے بات ہوئی کب پوری لب پر آئی بات ادھوری
آج تھی اُس کی چال انوکھی اِک پل مانی، اِک پل روٹھی
بات سُنی جب رنگ بھاؤ کی زور سے مُوندیں آنکھیں اپنی
ایک جھلک میں اُسنے دیکھا پریم کا ساگر آنکھوں میں تھا
چاند کنول کو گود میں لیکر ڈوب گیا مستی میں یکسر

یہ ہے ہزلیات سے اجتناب کی . . . . عالمانہ قادر الکلامی کی مثال، آخری شعر میں جن کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس کی داد نہیں دیجا سکتی، اس سلسلہ میں زہرِ عشق کو دیکھیئے اور موازنہ کیجئے کہ جمالیاتی ذوق کا کتنا بڑا افتراق ہے، لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس قسم کا ادب اب

---

[1] سنہ ۱۴ء میں وشنوؤں کا لٹریچر ہندوستان میں بہت عروج پر تھا، پندرہویں صدی میں رام کی پرستش کا زور ہوا تو یہ لوگ بھی اُسی طرف مائل ہو گئے ۔

[2] اصل گیت میتھلی زبان میں ہے، ودیا پتی کے دور میں بہار (مگدھ) کی زبان یہی تھی، ودیا پتی کا مولد و مامن شاید ضلع دربھنگہ ہے یہ منظوم ترجمہ مجھے "میراجی" کے توسط سے حاصل ہوا ۔

رنجور

جان کنی کے عالم میں ہے، آج ہر قسم کی فرسودہ چیزیں بزم شعر و ادب سے نکالی جا رہی ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کا عدم وجود برابر ہے،

دورِ جدید کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے، اس کی روشن کرنیں زندگی اور انقلاب کا پیام لیکر آئی ہیں۔ اس لئے ہمیں اب ادب میں بھی سراسر زندگی چاہیئے، ہمارے جمالیاتی ذوق و وجدان میں بھی زندگی کی لہریں ہونی چاہئیں، حُسن ہوسناکیوں سے کھیلنے کیلئے نہیں، صنف لطیف صرف شباب لٹانے ہی کیلئے نہیں تخلیق کی گئی، بلکہ وہ ہماری تکمیل حیات کا ایک عنصر ہے، ہم اگر سمندر ہیں، تو وہ اس سمندر کی لہریں ہیں مرد اگر ساز ہے تو عورت اس ساز کا نغمہ ہے،۔

بہاری نے قطعی طور پر اپنی شاعری کا موضوع عورتوں ہی کو بنایا، اس کی غنائی شاعری جسکو ہندی اصطلاح میں شرنگار رس کہا جاتا ہے مشرقی ادبیات میں بے مثال ہے، اس میں شک نہیں کہ مغلوں کی علمی دلچسپی اور ادب نوازی نے بہاری کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا اور اس پر فارسی و عربی کا رنگ بھی چڑھایا،

اس کے کلام کا جائزہ لینے سے بکثرت فارسی، عربی اور ترکی الفاظ ملیں گے، اور سچ تو یہ ہے کہ عبیر و گلال کے ساتھ ساتھ عطر و گلاب کا امتزاج نہایت کیف آگیں ہے بھی، لیکن بہاری کا کمال یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور جمالیاتی ذوق کی سنجیدگی اور متانت کا دامن کبھی ہاتھوں سے نہیں دیتا،

کہیں کہیں شاعر جذبات کی رو میں بہک بھی جاتا ہے، لیکن عریانی کی حد تک نہیں، ایک منظر کی مصوری دیکھئے ؎

بال چھبیلی تین میں بیٹھی آپ چھپائی
ارکٹ میں پانوس سی پرگٹ ہوت لکھائی

(وہ نازک اندام حسینہ عورتوں کے جھرمٹ میں گھونگھٹ کے اندر چھپی چھپائی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے فانوس کے اندر شمع جل رہی ہو ــــ)

عورتوں کے جھرمٹ میں بھی مکھڑے کو گھونگھٹ کے اندر چھپانا ہندوستانی نسائیت کا بہت ہی بلند اور سچا کیریکٹر ہے، اگر ذرا اس سلسلہ نسکسی کے اس شعر کو بھی ملاحظہ کیجئے ؎

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

یا ــ دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

ایک نازنین اپنی بھرپور جوانی کیساتھ مچل مچل کر جھولا جھول رہی ہے، شباب کی مستی، حُسن کا نشہ ہے، نہ آنچل کا ہوش ہے، نہ لچکتی ہوئی کمر کے ٹوٹ جانے کا ڈر، سکھیاں بار بار روک رہی ہیں، پر وہ مستِ شباب اور بھی ہٹ کرنے لگتی ہے اور زور سے پینگیں بھرنے لگتی ہے، اسوقت اس کی کمر ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہے، بالکل اس طرح، جس طرح پھولوں کی پتلی ڈالی بارِ گل سے لچک لچک کر رہ جاتی ہے، بہاری اسکو یوں بیان کرتا ہے ؎

۱؎ پانوس فانوس کی خرابی ہے، یہ مغلیہ دور کے ماحول کا اثر ہے، مگر تخیل کے اندر ہندوستانی جذبات کی ترجمانی ہے، رنجور

ابطیا

برجیں دونی ہٹ پڑے، نہ سکے نہ سکائی
ٹوٹ کٹ دمچی مچک لچک لچک بیچ جائی

برکھا رُت میں جس شخص نے اس عالم کو کبھی دیکھا ہوگا وہ یقینی اس شعر پر کلیجہ تھام لے گا، ہمارے شادؔ عظیم آبادی نے بھی اس منظر کی ایک جگہ مصوری کی ہے، اگرچہ تخئیل بہاری کے تخئیل کی طرح بلند و لطیف نہیں، پھر بھی اپنی جگہ غیر فانی منظر نگاری کا نمونہ ہے ؎

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹہ لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی اُدا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا،
چال میں لغزش، منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شادؔ کا ذکر بالکل ضمنی طور پر آگیا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید شاعری کی تعمیر میں جن شعرا کا بھی حصّہ ہے ان کی شاعری میں ایسی تصویریں نظر سے اکثر گزریں گی، خاص طور سے جوشؔ ملیح آبادی، ساغرؔ نظامی اور اخترؔ شیرانی نے صنفِ لطیف کے جمالیاتی پہلو پر جس طرح سے سخن آرائی کی ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔

اُردو شاعری کے اس پہلو پر جدید شاعری اور عورت کے عنوان سے کسی دوسری فرصت میں تبصرہ کیا جائیگا۔

۸۹

قدیم شاعری پرانی سماج اور معاشرت کی بندی، اور نئی شاعری موجودہ سوسائٹی کی مخلوق ہے۔ پُرانے شاعر، پرانی سماج کے اخلاق اور اطوار کے علم بردار تھے اور نئے شاعر نئے ماحول کے نمائندہ ہیں۔ کل اگر کوئی مخرّب اخلاق چیز تھی تو ماضی کی سوسائٹی اسکی ذمّہ دار تھی، ماضی کے آرٹسٹ نہیں، کیونکہ کوئی شاعر اور کوئی آرٹسٹ اپنے ماحول سے الگ نہیں جا سکتا۔ قدیم ماحول غلط تھا، مگر پُرانے ماحول کے ادیب و شاعر اُس سے منافق نہیں تھے۔ لیکن جو ادیب اور جو شعرا موجودہ سوسائٹی اور حاضر ماحول کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ اپنے اسلاف کے مقابلے میں شدید منافق ہیں اور ادب کی تاریخ پرانوں کے مقابلے میں ان جدید علمبردارانِ ادب کو مہمل، غلط اور منافق قرار دیگی جو سب کچھ بدل جانے کے باوجود اپنی مہمل شاعری، بے بُنیاد تصوّرات، فرسودہ خیالات اور غیر نفسیاتی اصولوں پر اڑے رہنا اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، اور نئے لوگوں کو "مغرب زدہ" کہتے ہیں

لہ جوشِ محبت اپنی جگہ بجا مگر تمام مُلک کی مِلک پر یہ آپ کی محبت کا ناجائز قبضہ ہے!؟ اگر شادؔ آپ کا تھا تو بہاری کو آپ غیر کیوں سمجھتے ہیں، —!؟ ساغر

ایشیا

ہندو مسلمانوں کے علمی اور تاریخی تعلقات

(پروفیسر ایم، اے شاستری)

خلفائے عباسیہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کا پائے تخت دمشق سے بدل کر بغداد میں منتقل ہوگیا۔ اور بغداد علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ خلفائے عباسیہ نے تمام اطراف و جوانب سے علماء و فضلاء کو بغداد میں لاکر اسلامی علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی مبارک سعی کی۔ ہندوستان کی ترجمانی کیلئے جو علماء اور ماہرین فن بغداد میں پہونچے تاریخ سے ان کا تذکرہ اور حال معلوم ہوتا ہے، حسب ذیل ہندو نام خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ منکا "دیا منی کاؤ۔ مانک"، جو ایک مشہور طبیب اور صاحب فلسفہ تھا۔ وہ سنسکرت کے علاوہ فارسی زبان کا بھی ماہر تھا۔ اس نے ایک اور ہندو طبیب "شانک" کی کتاب "زہر" فارسی زبان میں ترجمہ کی، یہ کتاب سمیات اور زہروں کی تحقیق پر مکمل کتاب مانی جاتی ہے۔ وہ عراق میں خلیفہ ہارون رشید کے عہد زریں میں پہونچا۔ بادشاہ بہت سخت بیمار ہوگیا اور مقامی حکماء اس کے مرض کے ازالہ سے عاجز آئے تو اس ہندو طبیب کی تدبیر سے کارگر علاج ہوا۔ اور اس کے بعد سے بغداد کے علماء میں قابل رشک فخر حاصل ہوگیا۔

۲۔ خلیفہ ہارون رشید کے بھتیجے شہزادہ ابراہیم کو کوئی بہت مہلک مرض ہوا مقامی طبیبوں نے اسے دیکھ کر لا علاج قرار دیدیا۔ لیکن ہندوستان کے ایک طبیب نے جو آیورویدک طب کا مشہور ماہر مانا جاتا ہے اور جس کا نام "سالح" تھا۔ اور اس کے باپ کا نام "سیاہلاہ" تھا۔ اس شہزادے کا علاج کیا۔ اور دفن ہونے سے بچ گیا۔ ورنہ اس کی موت کا سب کو یقین ہوگیا تھا۔ سالح کی بڑی عزت و توقیر ہوئی اور آخر کار اس نے اسلام قبول کرلیا اور عرصہ دراز تک دربار عباسیہ کا معتمد طبیب رہا۔

۳۔ بغداد کے مشہور ہسپتال "برمکیہ" میں ایک اور ہندو طبیب دھآن نامی کام کر رہا تھا اس کا لڑکا ہسپتال کا ایک افسر اعلیٰ بن گیا اور سنسکرت کی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔

۴۔ شانک جانکیہ ایک مشہور فلسفی اور طبیب تھا۔ اس نے بہت سے مضامین کی کتابیں سنسکرت سے فارسی و عربی میں ترجمہ کیں۔ عربی زبان میں ہندوؤں کی جن مشہور و اہم کتب کا ترجمہ ہوا ان کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ مگر مختصراً یہ نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) سوریہ سدانت علم ہیئت پر مشہور کتاب اور مسلمان علماء ہیئت میں اس کتاب کا بہت بڑا پرچار رہا۔ یہ کتاب رفتہ رفتہ ہسپانیہ پہونچی جہاں مسلمانوں کی بڑی زبردست حکومت تھی اور اس کے بعد اندرون یورپ تک اس کتاب کی رسائی ہوگئی۔ اور اس سے لوگ عرصہ دراز تک فائدہ اٹھاتے رہے اس کتاب کے چار ابواب تھے۔

(۲) "چرک" اس کا پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا اور بعد میں عبداللہ بن علی نے اسے عربی میں منتقل کیا۔

(۳) "کھنڈا کھوڈیکا"، علم ہیئت کی مستند کتاب

(۴) سندھاسن علم کامیابی پر ایک کتاب ہے جسے پنڈت دھآن کے لڑکے نے عربی میں ترجمہ کیا۔

از منۂ وسطیٰ سے لیکر سترھویں صدی عیسوی تک عربی علوم کا یورپ پر حکم جاری رہا۔ عربی کتابوں کے ذریعہ ہندو اطباء، اور حکماء کا حال یورپ تک پہونچا۔

سوریہ سدہانت کے علاوہ اور علم ہیئت کے ماہرین مثلاً درہم

ڈچ ہندوستان

برطانوی ہندوستان سے آسٹریلیا کی سڑک پر

آج جبکہ ۱۹۳۹ء کی جنگ لحہ بہ لحہ بڑھ رہی ہے اور قرینوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ سے اُٹھا ہوا یہ طوفان ایشیا پر بھی چھا کر رہے گا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈچ ہندوستان (Dutch Indies) پر کچھ لکھوں، کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے یہ ہندوستان سے آسٹریلیا کو جانے والی سڑک پر واقع ہوا ہے اور اگر ان ملکوں میں جو جمہوری اور کالی قوموں پر حکومت کرنا اپنی تہذیب اور تمدن کیلئے ضروری خیال کرتے ہیں لڑائی ہوئی اور یوروپ نے اگر مزید نوآبادیاتی کشمکش میں مبتلا ہونا چاہا تو ڈچ ہندوستان یقینی طور پر اِس جنگ کا محاذ بنے گا۔

اِس کا رقبہ بہت کافی ہے اور اِس کی آبادی ۵ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ ڈچ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہے، مشرقی اور مغربی۔ مغربی ڈچ ہندوستان ۱۹۱۸ء سے پہلے تک برطانیہ کے زیر حکومت تھا ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے "نہایت مہربانی" سے اِسے ڈچ حکومت کو جنگ عظیم میں پُر خلوص معاونت کے معاوضہ کے طور پر دے دیا۔

برطانیہ عظمیٰ نے اِس نوآبادی کو بڑی جانکاہی سے فتح کیا تھا جب ڈچ حکومت سے تجارتی جنگ شروع ہوئی تو برطانیہ کے لئے اِس نوآبادی کا سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اِس لئے کہ مشرق میں اِس کی فوجوں کے راستے کے لئے اِس وقت کوئی نہر سوئیز نہ تھی۔ ڈچ مشرقی ہندوستان پر نوآبادی تاریخ کے وقت ہی سے ڈچ حکومت کا قبضہ تھا۔ ۱۸۱۴ء میں جب برطانیہ عظمیٰ نے ڈچ نوآبادی کو ایک قلعوں کے سلسلوں میں گھیر لینا چاہا، ڈچ حکومت کو برطانیہ کی اِس پالیسی سے خطرہ پیدا ہوا اور اُس نے برطانیہ کے دفتر خارجہ سے پوشیدہ طور پر نہایت چالاکی کے ساتھ اپنے داخلی نوشتہ دار افسروں سے ۲۰ لاکھ پونڈ میں خرید لیا اور کہا کہ یہ روپیہ قلعوں کی تعمیر میں صرف ہونا چاہیے ڈچ حکومت بھی قلعوں کی تعمیر کے اخراجات کے لئے اتنی ہی رقم دیگی، یہ سودا ایسا تھا کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے کسے خریدا اور کون فروخت ہوا۔ !؟

۱۸۱۶ء تک ڈچ مشرقی ہندوستان پر پوری طرح ڈچ حکومت کا قبضہ نہ ہوا تھا جس سے فائدہ اُٹھا کر ریفلیس (Raffles) نامی ایک انگریز سوداگر نے عجیب و غریب حرکتوں سے سنگاپور اور قرب وجوار کی بہت سی نوآبادیوں پر قبضہ کرلیا جو اِس وقت تک ڈچ حکومت کے زیر اثر تھیں

"جانکاہی کی فتحمندی" کی ایک معمولی مثال تو یہ تھی اور دوسری یہ کہ زبردستی زمین پر قبضہ کر کے کھیتوں کی کاشت کرلی جاتی تھی۔ باشندوں کو صرف خاص خاص فصلوں کی کاشت کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مثلاً چائے اور تمباکو، اور اِس کے بعد انھیں بھاری شرح پر نقدی کی صورت میں ٹیکس دینے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ظلم زیادہ تر ڈچ حکومت کے زیر اثر حصہ میں ہو رہا تھا۔ حکومت کے ایک افسر ڈکر (Dekker) اِن حالات پر ایک کتاب لکھی جس نے کہ ہالینڈ کی ڈچ جنتا پر بیحد اثر کیا اور حکومت مجبور ہوگئی کہ ۱۸۶۳ء میں اِس طریقہ عمل کو ختم کردے۔

غالباً یہ بیان یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں سماترا کے قریب اچین نامی ایک آزاد حکومت باقی رہ گئی تھی جو ڈچ حکومت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ ۱۸۷۳ء میں ڈچ حکومت نے اچین کی حکومت پر حملہ کردیا۔ بہانہ یہ تھا کہ کالے نیٹو (Natives) نہ صرف تہذیب یافتہ نہیں ہیں بلکہ ان کی غیر مہذب حرکتوں سے اِس نوآبادی کے ڈچ باشندوں

کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے اور وہ لوٹ کھسوٹ بھی کرتے ہیں جس
کی وجہ سے ڈچ حکومت کے جہازوں کو بڑا خطرہ ہے۔ یہ بہانہ یورپ
میں تمدّن کے دعوی دار ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔ یہ لڑائی ۱۹۱۲ء
(یعنی ۴۸ برس) تک جاری رہی اور اُس وقت جا کر ختم ہوئی جبکہ اچین
کی جوان ہندوستان آبادی ایک ایک کر کے ختم نہ ہو گئی اور بوڑھوں
نے اپنی فطرت کے مطابق غلامی کا طوق نہ پہن لیا۔ ساغر نے خوب کہا
ہے ؎

"کہ پیری غلامی، بغاوت جوانی"

کاشتکاروں پر زبردستی کی پابندیوں نے سرمایہ داری کو
اپنے کھیل کھیلنے کے لئے موقع بہم کر دیا۔ ہالینڈ کے سرمایہ نے دیکھتے ہی
دیکھتے بیچارے ہندوستانیوں کو اپنے سونے اور چاندی کے ناقابلِ شکست
جال میں جکڑ لیا۔ اس لئے جب ۱۸۶۳ء میں حکومت نے "یہ کمال مراحمِ
خسروانہ" اصلاحات دیں تو بیچارے ہندوستانیوں کو کوئی خاص رحمت
حاصل نہ ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں ڈچ مشرقی ہندوستان میں غلامی کا تو سدِّباب
ضرور ہو گیا تھا مگر جو دوسرا طریقۂ عمل اختیار کیا گیا وہ اگر اس سے زیادہ
خراب تھا تو کچھ اچھا بھی نہ تھا یعنی مزدوروں کے ساتھ ـــــــ
ـــ (Labour Contracts) معاہداتِ مزدوری
کئے گئے۔

چونکہ اس وقت فیکٹریاں اور کارخانے بن رہے تھے اس لئے مزدوری
کا یہ معاہدہ کاشتکاروں سے کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے بیچارے کاشتکاروں کو
ہاں یا نہیں کے فیصلے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ حکومت کے قوانین کی طرف سے
وہ مجبور تھے کہ حکومت جس قسم کا معاہدہ چاہے انھیں کرنا ہوگا۔ تھوڑے
دنوں تک تو پچھلے ہوئے پٹھوں نے زندگی کو کسی قدر استقلال دینے کے لئے
غلامانہ فرماں برداری کی، لیکن جب ان میں تھوڑی سی سکت پیدا ہو گئی،
وہ چونکے، اور انھوں نے سمجھا کہ غیر ملکی حکومت نے نہ صرف ان کی آزادی
چھین لی ہے بلکہ ان کی روح کو بھی نچوڑ کر رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے،
یکایک انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ ایسا کام نہیں کریں گے جس سے انھیں
کسی طرح کی بھی شانتی نہ ہو، اور وہ اپنے گاؤں کو واپس چلے گئے۔

ڈچ حکومت کی جمہوری شان کو ہندوستانیوں کے اس طرزِ
عمل سے سخت صدمہ پہونچا، اور اس نے فوراً قوانین بنائے جن کی
رُو سے سارے ہندوستانی جو معاہدات سے زیر بار تھے سخت ترین سزا
کے مستوجب ہو سکیں، جور وستم کی یہ کیفیت تھی کہ یورپین تمدّن کو مشرق
میں لانے والی پہلی قوم اور اُس کی حکومت کے طریقوں اور وحشیانہ
قبائل یا پانچ ہزار برس کی شخصی حکومتوں کے اطوار میں کوئی فرق معلوم نہیں
ہوتا تھا۔ ہندوستانی باشندوں کو مارپیٹ کر مجبور کیا گیا کہ وہ معاہدہ
پر دستخط کریں۔ بظاہر اُن کو بڑی بڑی رقمیں دی گئیں اور پھر دس دس
برس کے طویل عرصہ کے لئے اُن کی محنت اور مزدوری پر معاہدہ کی رُو سے
پوری قدرت حاصل کر لی گئی۔ اس کے بعد انھیں سوماترا اور اس کے قرب
جوار کی نوآبادیوں میں بھیج دیا گیا جہاں اُن سے کارخانوں وغیرہ میں بھی
کام لیا جاتا تھا۔

اتفاق کی بات کہ سوماترا میں چند برطانوی سوداگر بھی اپنا جال پھیلائے
ہوئے تھے وہاں انھیں طرح طرح کے لہو ولعب میں مبتلا کیا گیا۔ اُن کو
ترغیبات دی گئیں کہ وہ جُوا کھیلیں اور نشئی چیزیں استعمال کریں۔ نتیجہ یہ
ہُوا کہ معاہدہ کا زمانہ ختم ہونے تک اُن کے پاس چھدام بھی باقی نہیں
رہتا تھا اور وہ اتنے غریب ہو جاتے تھے کہ وطن کو جانے کی خواہش
بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تھے، آخر کار وہ دوبارہ معاہدہ کرنے کے
لئے مجبور ہو جاتے تھے، آج جبکہ ویسی اندھیر نگری نہیں ہے آج بھی سزا
کے وہ قوانین بدستور برقرار ہیں، یورپ کو یہ بتانا تو بیکار ہے کہ جمہوری
حکومت کی تعریف یہ ہے کہ ملک کی حکومت عوام کی ہو، عوام کے لئے ہو
اور عوام کی طرف سے ہو، لیکن اس کا اعادہ موجودہ زمانے میں شاید
نامناسب ہو کہ سزا اور جزا کا اختیار حضرت عیسیٰؑ کی ساری قربانیوں کو نہایت
معمولی قیمت پر فنا کر دیتا ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد امریکہ نے اسی زمانے میں جزائر فلپائن کو ایک
"اونچے درجے" کی آزادی دے دی، اور برطانوی ہندوستان میں
جس کو پڑوسی کی حیثیت حاصل ہے آزادی کی تحریک شروع ہوئی اور چین نے
بیداری کی انگڑائیاں لینے لگا۔ پڑوسی ممالک کی ان انقلابی کروٹوں
نے ڈچ ہندوستان میں بھی ڈچ حکومت کے خلاف جذبہ پیدا کرنا شروع
کیا جو آج ایک کمزور تحریک کی صورت میں اپنا کام کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے

ڈچ ہندوستان کے ہندوستانی باشندے جن کی ملک میں تھوڑی بہت طاقت ہے اور جو امتیازی حیثیت رکھتے ہیں وہ سرمایہ داروں کے طبقے ہیں اور وہ سب کے سب ڈچ حکومت کے نمک خوار ہیں۔

حکومت کے انتظامی معاملات میں اُن کو بڑا دخل ہے اور وہ کلچرل طور پر بھی ڈچ ہوکر رہ گئے ہیں اور اپنی وطنی زبانیں بھول چکے ہیں اور اُن کی ڈچ زبان میں تقریر و تحریر ملایا میں پیدا ہوئے ڈچ لوگوں سے کہیں بہتر سمجھی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ڈچ مشرقی ہندوستان میں سرمایہ دار طبقے تو ہیں لیکن جاگیرداری نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میانی دیہی طبقہ بھی نہیں ہے، یا تو لوگ بہت زیادہ امیر ہیں، یا لوگ بالکل ہی غریب ہیں۔ حالات نے کچھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ کسانوں کو مخصوص پوزیشن حاصل ہوگئی ہے۔ غالباً اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ اُن ڈچ باشندوں نے بھی جو وہاں رس بس گئے ہیں کاشتکاری کو سوداگری پر ترجیح دی جس کی وجہ سے حکومت ہندوستانی اور ڈچ کاشتکار میں امتیاز نہ کرسکی اور اُسے مجبوراً بندوبست استمراری کے اصول پر عمل کرنا پڑا ملک میں اب ۹۰ فی صدی کاشتکار ضرور ہیں۔ چونکہ اب ہر ملک میں درمیانی طبقہ انقلابی تحریک کا علمبردار ہوا کرتا ہے۔ ڈچ ہندوستان میں اس تحریک نے زیادہ زور نہیں پکڑا۔ کسان بیچاروں کو پیداوار کی فکر اس قابل ہی نہیں رکھتی کہ وہ انقلاب کی آواز بلند کریں۔ اُن کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ اُن کے کھیتوں کی پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ سال کے کسی حصہ میں بھی خالی نہ بیٹھ سکیں۔ قدرت کی خشکی جو چند ایسے مہینے بھی مہیا کرتی ہے تو ان کو بازار اور چولھے کی فکر اُٹھنے کا موقع نہیں دیتی۔

اِن حالات میں اس قسم کی تحریک جنتا میں ایک اطمینان بخش خود اعتمادانہ جذبہ کے سوا اور کوئی شے پیدا بھی کب کرسکتی ہے اور یہ خود اعتمادی جنتا کو صرف اصلاحات ہی کی روشنی سے مسحور رکھتی ہے اس سحر کی بنا پر حکومت کے دئے ہوئے اصلاحات کو دولتِ غیر مترقبہ خیال کر لیا جاتا ہے اس لئے جب ۱۹۱۶ء میں کونسل آف دی پیپل۔ دارالعوام نے اصلاحات چاہیں تو ڈچ حکومت نے اُسے گورنر جنرل کے لئے مشاورتی کمیٹی کی حیثیت دے دی۔ جس سے اس کی یہ پوزیشن ہوگئی کہ اگر گورنر جنرل اور اُس کے درمیان کسی معاملے پر مخالفت ہو تو فیصلہ صرف ہالینڈ کی ڈچ شہنشاہیت ہی کرسکتی ہے۔ اس کے ۶۱ ممبر ہیں جن میں ۳۸ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں اور باقی حکومت کے نامزد، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حالات ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے ممکن ہے کہ اس سیاسی ارتقا میں کافی وقت صرف ہو، لیکن ترقی کی جو موجودہ رفتار ہے اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈچ ہندوستان میں بھی ہندوستانیوں کی نمائندہ حکومت ہوکر رہے گی۔

برطانوی سلطنت کا مدافعیاتی مرکز

ڈچ نوآبادیات کی اس مختصر تاریخ کے بعد اب میرے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ میں اس تاریخ پر اصول کی روشنی میں کچھ لکھوں۔ تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ دنیا کے مستقبل اور اس کی سیاسیات پر اس چیز کا کیا اثر پڑے گا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ اور ڈچ حکومتوں کے درمیان ڈچ نوآبادیات کی تیل کی تجارت کے سلسلے میں آج نہایت گاڑھی چھن رہی ہے۔ تیل ہی کی تجارت نہیں، کسی قسم کی بھی سوداگرانہ کشمکش اِن دو حکومتوں کے درمیان نہیں پائی جاتی۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈچ مشرقی نوآبادی برطانوی سلطنت کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہت آسانی سے اِن جزائر کو برطانوی ذرائع رسل و رسائل پہنچانے کے لئے ایک محاذ بنایا جاسکتا ہے، یہ بات اُس وقت سے اور بھی زیادہ اہم ہوگئی ہے جب سے برطانوی حکومت نے سنگاپور کو ایک نہایت ضروری بحری محاذ بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج سنگاپور برطانوی شہنشاہیت کے لئے مشرق بعید میں سب سے بڑا محاذ ہے، لیکن اگر جغرافیائی اعتبار سے اس چیز کو دیکھا جائے تو سنگاپور کا محاذ کسی طرح بھی ناقابل شکست نہیں ہے۔ ہوائی حملے کے لئے سنگاپور نہایت آسان نشانہ ہے۔ جاپان جس وقت بھی چاہے سنگاپور کو زہریلی گیس سے اندھا کرسکتا ہے۔ دفاعی ہوائی توپ (anti air craft guns)۔ ممکن ہے کہ جہازوں کو سنگاپور تک نہ پہنچنے دے لیکن بادلوں کی نقاب میں چھپا ہوا اگر کوئی ہوائی جہاز ایک چکر لگانے میں کامیاب ہوگیا تو پھیلنے والی زہریلی گیس ہی سنگاپور کی آبادی کو ہمیشہ کے لئے سُلا دینے کو کافی ہے۔ سنگاپور بڑی مرطوب جگہ ہے اور مرطوب جگہ میں گیس تھمتی نہیں بلکہ ہمیشہ اُڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ ایسی گیس کا سدّباب نہایت

مشکل ہے۔ جاپان اور جرمن خارجی پالیسی اور ان دونوں کی نوآبادیاتی سو ڈر جیتا جاگتا خطرہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈچ مشرقی نوآبادی میں جاپانیوں کی مضبوط اقلیت بسی ہوئی ہے جس کی وجہ سے جاپان کو اس نوآبادی میں بڑی دلچسپی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ڈچ نوآبادی میں جاپانی باشندے ایسی ایسی جگہوں پر واقع ہیں کہ جاپان کی للچائی نظریں آسانی سے اپنا کام کرسکتی ہیں۔ ذرا سے اندرونی ہنگامہ کے بعد سیاسی توازن اور حکومت کا نظم یوں بھی ختم ہوجایا کرتا ہے اور جب ایسی صورت پیدا ہوگئی تو جاپان کو اپنی آبدوز کشتیوں اور بحری طیاروں کے لئے محاذ بنالینا ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔

جاپان گو آج چین پر اپنی ساری طاقت صرف کر رہا ہے اور یوروپ کے تازہ واقعات بھی اس کے لئے اطمینان بخش نہیں ہیں پھر بھی وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے غافل نہیں ہے۔ ہندوستانی اخبارات "ڈچ ہندوستان" میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس لئے جاپان کی حرکتیں ہمارے علم میں نہیں آتیں، لیکن ڈچ اخبارات آئے دن اس کشمکش کی خبریں شائع کرتے رہتے ہیں، ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ جاپانی مچھیرے ڈچ حکومت کے رویہ کے خلاف بڑی گڑبڑ مچائے ہوئے تھے اور خواہ مخواہ دونوں قوموں میں تنازعہ کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ جاپان کے لئے اس قسم کا بہانہ پیدا کرنا یا بات کا بتنگڑ بنالینا کوئی مشکل کام نہیں۔ جب بھی وہ ہنگامی طور پر روس سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہتا ہے تو منچوکو کے ساحلی مچھیروں کو آلۂ کار بنالیتا ہے، چین سے بھی بے بنیاد لڑائی اس نے ایسا ہی ایک بہانہ کرکے مول لی۔

۱۹۳۳ء میں تو جاپان نے یہاں تک کیا کہ ڈچ مشرقی نوآبادی کی قلعہ بندی پر اعتراضات کئے اور سرکاری طور پر احتجاج بھی کیا۔ فروری ۱۹۳۴ء میں جاپان نے شطرنج کی چال دوسری طرح کھیلی۔ اس نے ہالینڈ سے ایسی صلح کرنی چاہی جس کی رو سے وہ اس کا جنگی اور مدافعتی معاون ہوسکے، ڈچ حکومت اب تک ایسے صلح نامے سے بچتی رہی اگر جاپان چین کی بھول بھلیاں میں نہ پھنس گیا ہوتا تو غالباً ٹھکرایا محبت کا پیام اعلان جنگ میں تبدیل ہوجاتا۔

ڈچ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ایسے صلح نامے کے معنی یہ ہوں گے کہ ڈچ مشرقی نوآبادی جاپان کے زیر حفاظت آجائے گی۔

برطانیہ کو صرف یہی ایک خطرہ نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ہالینڈ کا جاں نثار دوست بنا ہوا ہے۔ خود ہالینڈ کا وجود جزائر برطانیہ کی حفاظت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہالینڈ کی کمزوری کے یہ معنی ہوں گے کہ جرمنی دیکھتے ہی دیکھتے جزائر برطانیہ پر پنجہ مار بیٹھے گا۔ آج بھی ایسی خبریں سننے میں آتی ہیں کہ جرمنی ہالینڈ پر اسی خیال کے ماتحت حملہ کرنا چاہتا ہے اور کیا تعجب ہے کہ اگر بلجیم جیسا کہ خبریں سننے میں آئی تھیں، موجودہ جنگ میں جرمنی کا ساتھ دے جاتا یا غیر جانبدار ہوجاتا تو پولینڈ کے بعد جرمنی کا دوسرا حملہ ہالینڈ پر ہوتا۔ وہ تو یہ کہئے کہ بلجیم نے ہالینڈ پر حملہ ہوجانے کی صورت میں جب اپنی غیر جانبداری اٹھا دینے کا اعلان کیا تو بڑھتے ہوئے جرمن کے ہاتھ پیچھے کی طرف کھنچ گئے۔ برطانیہ کو پورا بھروسہ ہے کہ ہالینڈ اس کے خلاف کبھی بھی اقدام نہیں کرے گا بلکہ موقع آنے پر سپر بننے سے بھی گریز نہ کرے گا۔

انہیں تمام حقیقتوں کی روشنی میں میں ڈچ نوآبادیوں کی اہمیت کی طرف ہندوستان کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان سے آسٹریلیا کی یہ سڑک ایشیا کے لئے بارود کی سرنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیّد فرید جعفری

دکُه کُه

ایشیا

دوسرا باب

فنی ڈرامے

نفرت!

کسی کا یہ قول میرے ذہن میں محفوظ تھا کہ دنیا میں دو ہی مجرّد قوتیں ہیں! ایک محبّت کی دوسری علم کی! ایک دن میں نے اناتول فرانس کے ایک مضمون میں پڑھا کہ زندگی کی قوّت متحرکہ محبت اور بھوک ہے - لامحالہ میرا خیال اس طرف جانا تھا کہ بیان کے اختلاف اور اظہار کے فرق کو اگر نظرانداز کردیا جائے تو مقصود ان دونوں مفکّروں کا ایک ہے ۔ اور جب غور و فکر کرنے والی دو مانی ہوئی شخصیتیں کسی مسئلے پر متفق الرّائے ہوں تو پھر اسمیں غلطی کا امکان کم ہی رہتا ہے - چنانچہ مجھے خیال ہوا کہ ان قوتوں میں سے ہماری قوم کو کون سی قوت متحرک رکھتی ہے -

پہلے میں نے علم کو جانچنا چاہا - لیکن میں نے پہلے علم ہی کو کیوں جانچنا چاہا - اس پہیلی کو آپ بوجھئے - اَتے پتے کے طور پر اتنا بتایا جاسکتا ہے کہ اس بات کو کچھ نفسیات سے تعلق ہے -

آپ نہیں بوجھ سکیں گے - پہیلی ہے بھی مشکل - سنئے" میرا تحت الشعور رجحان رہا تھا کہ ان میں سے کسی ایک قوت کو خارج کر دینا پڑے گا اور ایک آدمی ایسی ہی چیز کو خارج کرنا پسند کرتا ہے جس سے اُسے لگاؤ نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے - خیر!

آپ اگر فرمائیں کہ آپ کو کسی سے محبّت نہیں ہے یا نہیں رہی تو غلط ہی سمجھا جائیگا - اور اگر آپ کھانا نہیں کھاتے اور آپ کو بھوک نہیں لگتی تو کبھی نہ مانا جائیگا - علم ہی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر واقعی حاصل ہے تو آپ "اپنا شمار" داند کہ نداند" میں کرائیں گے اور اگر واقعی حاصل نہیں تو "داند بداند" میں نام لکھائیں گے -

چنانچہ میں نے غور کیا تو نظر آیا کہ ہماری قوم کا ہر تیسرا آدمی علامہ ہے یا شاستری، مولوی ہے یا پنڈت، پروفیسر ہے یا اچاریہ، پیر ہے یا پروہت، ادیب ہے یا ساہیتہ رتن، شاعر ہے یا کوی، لیڈر ہے یا ایڈیٹر، صحافی ہے یا جرنلسٹ، اور یہ تمام القاب حصولِ علم پر دلالت کرتے ہیں - مگر عالموں کی یہ قوم بھی تحریر و بیان سے انسانی قابلیت اور علمی جوہر کا اندازہ نہ کر سکے اور ہمارے عالموں کو اپنے نام کے ساتھ القابِ فضیلت لکھنا پڑے، انگریزی حروف کو اُردو میں لکھنا ضروری ہو جائے - یعنی ڈگری جانے بغیر عزت نہ ہو سکتی ہو تو وہ اصل میں جاہلوں کی قوم ہے - اور جاہل قوم کا عالم بڑا جاہل ہوا کرتا ہے! اس لئے میں نے علم کو اپنی قوم کی قوتِ متحرکہ ہونے سے خارج کر دیا -

اب کچھ احساس اعتماد کیساتھ بھوک کو جانچنا شروع کیا کہ جس قوم کی ایک تہائی آبادی بھوکی سوتی ہو، بھوک اگر اس قوم کی قوت متحرکہ نہ ہوگی تو کس کی ہوگی - لیکن ذہن نے سمجھایا کہ جس ملک میں تیرہ کروڑ بندگانِ خدا بھوکے سوتے بھوکے اُٹھتے اور پھر بھوکے سو جاتے ہوں اُس ملک کی تو ہر ہر بستی میں ہر روز لوٹ ہو جانا چاہیئے! مگر ہمارے ملک میں تو ایسا ہوتا نہیں! ساتھ ہی مجھے مولانا شوکت علی کا (جو اس وقت "مرحوم" نہ تھے)، یہ قول یاد آیا کہ مسلمان بھوکا نہیں وہ روٹی نہیں چاہتا، اُسے ایمان بس ہے! تو یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہندو مسلم طور پر زیادہ خوشحال ہے - اگر مسلمان بھوکا نہیں ہے تو ہندو بدرجۂ اولیٰ بھوکا نہیں ہے - اب مجھے اعتراف کر لینا پڑا کہ ہماری قوم کی قوت متحرکہ بھوک بھی نہیں -

مگر دل نے سوال کیا کہ یہ اعداد و شمار تو بدیسی حکومت کے

حساب کتاب کا نتیجہ ہے ، اور بدیسی حکومت اتنی بیوقوف نہیں کہ اپنے غلاموں کو بھوک کی یاد دلائے ۔ یہ تو شیطان کا ناز کیلئے جگانے والی بات ہوگی۔ دماغ پر اور زور ڈالا تو یہ ظاہر ہوا کہ انگریز واقعی چالاک واقع ہوا ہے ۔ وہ نفسیات کو خوب جانتا اور اس سے خوب کام لیتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ ہمیں اگر اپنی بھوک کا یقین ہوجائے تو آزادی کی لڑائی کو بھول کر نوکریوں کی بھیک مانگتے پھریں گے یا ان کے پیچھے آپس میں سر پھٹول کرنے لگیں گے۔ آزادی کی مانگ کھٹی میں پڑجائے گی۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ مسلم لیگ ہوشیار تھی کہ اس جھکے میں نہ آئی اور کانگریس احمق تھی کہ چکر کھاگئی۔ لیگ نے ڈنکے کی چوٹ کہدیا، کرتے اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کے تنے ہوئے پیٹ دکھا کر کہدیا کہ مسلمان کو بھوک لگتی ہی نہیں؛ کانگریس اس خیال سے وزرا کا بوجھ اٹھا بیٹھی کہ کسان مزدور کے پیٹھ سے لگے ہوئے پیٹوں میں ایک ٹکڑا تو پہنچا سکے ۔

یہ سمجھ میں آجانے کے بعد مسلمانوں کی خوش فہمی کا قائل اور ہندوؤں کے لالچی ہونے کا یقین کرلینا پڑا۔ اب چونکہ سوچتے سوچتے میرا دماغ بالکل تھک چکا تھا اس لئے میں اس تاویل ہی سے مطمئن ہوگیا کہ ہمارے لیڈروں کا مقصود اگر لیڈری نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ چھٹ بھیا لیڈر اپنی ممبریوں اور ممبری کے اثر سے بیٹے بھتیجوں کی نوکریوں کیلئے ڈھونگ رچایا کرتے ہیں اور بڑے نیتا بیان نکالنے اور انٹرویو دینے کی خاطر پاکھنڈ کرتے رہتے ہیں۔ بس یہی "پوری قومی حکومت" ہے اور یہی "پورن سوراج"!

اس کو سمجھ لینے کے بعد میں نے ایک لمبی سانس لی کہ چلو مشکل تو حل ہوئی۔ محبت کی قوت، وہ قوت ہے جس پر دو غور و فکر کرنے والے متفق ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ کرکے ہی رائے قائم کی ہوگی اور چونکہ یہ میں مان چکا تھا کہ ہماری قوم کی قوت متحرکہ نہ علم ہوسکتا ہے اور نہ بھوک، اور اس لئے کہ ایک قوم کا وجود ہے تو اس کی کوئی قوت متحرکہ ضرور ہونا چاہیئے ، میں بے دلیل اور بلا غور کئے مانے لے رہا تھا کہ ہماری قوم کو محبت کی قوت ہے جو متحرک رکھتی ہے مگر اسی وقت خدا کا بندہ اخبار ڈال گیا اور میں نے اخبار میں ایک عدالت کا فیصلہ یعنی محبت کی یہ داستان پڑھی ۔

ایک بدچلن عورت اور ایک بدچلن مرد ملتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں۔ کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ شاید یہ سمجھ کر کہ یہ تو ایک پرانا قصہ ہے اور اس وقت سے ہوتا چلا آرہا ہے جب آدم کے دو ہی لڑکے تھے۔ غرض ملتے رہنے کا یہ سلسلہ طویل ہو کر اس عورت اور اس مرد کی عادت بن جاتا ہے ۔ اور عادت ہی کے نتیجے میں وہ دونوں ہمیشہ کیلئے مل جانا چاہتے ہیں یعنی اپنے بے ضابطہ ملنے کو باضابطہ بنالینا چاہتے ہیں ۔

لیکن ان دونوں پر روشن ہوا کہ اگرچہ ان کا بے ضابطہ ملنا سماج اور مذہب کی نظر میں بُرا فعل تھا، لیکن اُسے باضابطہ بنانے میں سماج اور مذہب ہی رکاوٹ بھی ہیں! بات دراصل یہ تھی کہ عورت کے باپ کے سر پر چوٹی تھی اور مرد کے باپ کے چہرے پر ڈاڑھی ۔ اور ہماری قومی غیرت اس بات کو روا نہیں رکھتی کہ کوئی چٹیا ڈاڑھی کے جُون میں آجائے یا ڈاڑھی چوٹی کی شکل اختیار کرلے ۔ یہ دونوں غریب جاہل بھی تھے ۔ انھیں شاید خبر نہ تھی کہ ملک میں "سول میرج" کا قانون مذہب کی رکاوٹ کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن کون جانے کہ یہ دونوں مجسٹریٹ کے سامنے مذہب سے بیزاری ظاہر کرنے پر آمادہ بھی ہوجاتے! کیونکہ سول میرج کے قانون سے فائدہ اٹھانے کیلئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم کسی مذہب کے پیرو نہیں۔

مختصر یہ کہ ان دونوں کو مذہب کی سچائی اور حقیقت سے تو واسطہ نہ تھا مگر مذہب کا نام بھی نہ چھوڑنا چاہتے تھے ۔ اور چونکہ انکی ایک بڑی ضرورت اٹک گئی تھی، اس لئے وہ آسان طریقہ ہی اختیار کرسکتے تھے۔ اور سب سے زیادہ سہولت اس میں تھی کہ وہ عورت مُلّاں کے سامنے جاکر کلمہ پڑھ لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا؛ اور اُسی کے ساتھ دوسرے دو بول بھی پڑھوا دئے گئے ۔ چند منٹ میں رکاوٹ باقی نہ رہی اور مقصد پورا ہوگیا۔

اب جن کو اس کا علم ہوا، چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے کی طرح اب بھی اپنے کام سے کام رکھتے ؛ مگر ایسے موقعے لیڈری قائم کرنے

کیلئے ہی آیا کرتے ہیں۔ اور ہندو جماعت کی لیڈری کانگریس سے چھین لینے کیلئے آریہ سماج کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ اور کانگریس کو نقصان پہنچانے کیلئے آریہ سماج نے اپنے بہت سے ممبر کانگریس میں داخل کر دیئے ہیں۔ غرض ہمارے ملک میں آریہ سماج کا ایک اٹل اصول یہ ہے کہ مہابھارت کی لڑائی سے پہلے آنے والے ہی ہندوستان کے دھنی ہو سکتے ہیں، بعد کے آنے والے ملکش ہیں، وہ خاک پاک ہند کو اپنا وطن نہیں بنا سکتے۔ اس لئے کہ "آریا ورت آریاؤں کیلئے" کی اسکیم سے یہ چیز خارج ہے۔

ان "غیر" جماعتوں میں سب سے بڑی جماعت مسلمانوں کی ہے اور شاید بڑی جماعت ہونے کے باعث ہی غیر سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ غیر تو پارسی بھی ہیں۔ اور پارسی بڑی چھوٹی جماعت ہے۔ وہ بآسانی کھپ مل بھی سکتی ہے۔ دوسری بدیسی جماعت انگریز ہیں اس کے متعلق آریہ سماج کو یقین ہے کہ جب روٹی مکھن نہ ملیگا۔ آپ سے آپ چلی جائے گی اور روٹی مکھن دینا نہ دینا ہمارے ہات میں ہے۔ لے دے کے مسلمان ہی بدیسی یا ملکش ہیں۔ جن کو ایکہزار برس تک رہنے سہنے کے بعد بھی بھارت کے پوت کہلانے کا حق نہیں۔ لیکن آریہ سماج کی اسکیم کی ایک خفیہ دفعہ یہ بھی ہے کہ جب بدیسیوں کو بالکل نکالا جائے تو دھرم کو پوتر بنانے کیلئے سناتنیوں اور جینیوں سے وہی بھائی چارہ قائم کیا جائے جو برہمنوں نے بودھ کے بھکشوؤں کیساتھ قایم کیا تھا۔

چنانچہ جب آریہ سماج کو پتا چلا کہ ایک آریا استری آریا ورت کی اسکیم میں اس طرح کھنڈت ڈال رہی ہے، کھسر پسر ہوئی سازشیں ہوئیں، مگر وہ آریا استری ہات نہ لگی۔ تب جلسے ہوئے ریزولیوشن پاس کئے گئے، مگر اس سے بھی آریا استری رام نہ ہوئی پھر رِپٹا رپٹی ہوئی۔ عدالتی عدالتا ہوئی؛ مگر بدنصیبی سے عدالت کی نظر میں لڑکی بالغ تھی اور اس لئے مختارِ فعل قرار پائی۔

دوسرے فریق نے اس کامیابی کو فتح قسطنطنیہ بلکہ فتح مکہ سے بھی زیادہ اہم سمجھا۔ بھاگا بھاگ ایک جلوس کا انتظام ہوا۔ میاں گھسّو سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار کئے گئے اور بی مسلمہ، جو پہلے آوَشارانی تھیں، کلمہ پڑھ کر عائشہ بی کہی گئیں، اور مقدمہ جیت کر مسلمہ لقب ملا۔ ڈولے میں بٹھائی گئیں۔ برات کا جلوس اور اس کی شان کا کیا کہنا، ضلع کے سارے بڑے حاکم اور پوری پولس کی فوج جلو میں چل رہی تھی!

برات چوک میں پہنچی تو سیکڑوں مسلمان چھتوں اور چھجوں پر تماشا دیکھنے نکل آئے۔ اتفاق کہ کسی کلمہ گو کے ہات سے منڈیر کی ایک اینٹ ڈھلک گئی۔ بس پھر کیا تھا، ایک پہلے نمبر کا بلوہ ہوا اور گیارہ نفر اللہ میاں کے سامنے یہ شہادت دینے کیلئے بھیجدیئے گئے کہ بے شک ایک عورت اور ایک مرد میں ناجائز تعلق تھا انھوں نے اسے جائز کرلینا چاہا، یہ بات آریہ سماج کو پسند نہ آئی!

شہر میں کئی دن بدامنی رہی اور بہت سے محنتی مزدور یا ایسے بوڑھے بچے جو ضرورت سے مجبور ہوکر کچھ بیچنے یا خریدنے نکلے تھے، ان کو ان جھنجٹوں ہی سے چھٹکارا دلادیا گیا۔ بہت سوں کو اسپتال کا دودھ پینے کو بھیجدیا۔ پھر مقدمے چلے، بڑے بڑے چندے ہوئے، نئے نئے لیڈر بنے، مزید پانچ نفر پھانسی پر چڑھے اور امر شہید کہلائے، کچھ کو کالا پانی ہوا اور کچھ دو دو چار چار برس کیلئے جیلوں کی مردم شماری بڑھانے کو روانہ کئے گئے۔ مذہب کی فتح ہوئی، دھرم کا بول بالا ہوا!

اب آپ سوچ کر بتایئے کہ چالیس کروڑ انسانوں کی اس زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد کیا میں اُن دو پاگلوں کی بات مان لیتا جو نہ معلوم فرشتوں کی دنیا سے یا احمقوں کی جنت سے یہ کہتے ہوئے نکلے تھے کہ انسان کی قوتِ متحرکہ محبت ہے یا بھوک ہے یا علم ہے!

سنئے بدیسی حکومت سے تو مجھے پُرانی نفرت تھی ہی، اس سوچ بچار میں اپنے لیڈروں سے بھی نفرت ہو گئی۔ ہندو سے بھی نفرت ہوئی اور مسلمان سے بھی ——— بلکہ اس درندے سے بھی جو انسان کے نام سے پکارا جاتا ہے! اور میں نے طے کیا کہ ہندوستانی قوم کی قوت متحرکہ نہ تو محبت ہے، نہ بھوک ہے اور نہ علم ہے! ہندوستانی

۹۹

ایشیا

قوم کی قوت متحرکہ تو نفرت ہے!
ایک خدا کو دوسرے کے خدا سے نفرت، ایک مذہب
کو دوسرے مذہب سے نفرت، ہندو کو ہندو سے نفرت اور
مسلمان کو مسلمان سے نفرت، ایک پارٹی کو دوسری پارٹی
سے نفرت، ایک لیڈر کو دوسرے لیڈر سے نفرت، بھائی کو
کو بھائی سے نفرت!
مذہب ہے تو نفرت، ایمان ہے تو نفرت!
نفرت کا مذہب زندہ باد! نفرت کا دھرم پائندہ باد!

ل احمد

بھائی

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ مگر پربھا اور سُریندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سریندر ابھی ایک مجرم کو تین سال کی سزا دینے کا فیصلہ لکھ کر اٹھا تھا۔ پربھا کہہ رہی تھی "دنیا میں جتنی بھی برائیاں ہیں، اس کی وجہ اکثر وہی لوگ ہیں جو ان برائیوں کی مذمّت کا نقارّہ بجایا کرتے ہیں۔ ان بُرائیوں کا ارتکاب اگر کوئی کرتا ہے تو مجبوری کی حالت میں۔ ورنہ وہ اُسے خود بھی پسند نہیں کرتا۔"

پربھا اسی قسم کی باتیں کرتی جاتی تھی۔ اور سریندر کہہ رہا تھا۔ تم تو گاندھی جی کی انداز میں باتیں کرتی ہو۔ میں وکیل ہوں، ہر روز چوروں بدمعاشوں سے ملنا پڑتا ہے لیکن مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا" جب پربھا سریندر کی خشک باتوں سے گھبرا جاتی تو کہتی آپ باتوں میں ٹال رہے ہیں" سریندر کہتا "میں تو دن بھر کچہری میں سر مارتا ہوں۔ یا قانون کی کتابوں میں۔ تم روز روز نئی کتابیں پڑھتی ہو اور سوچتی ہو۔ مجھے ان باتوں پر سوچنے کی فرصت کہاں" مگر پربھا باتوں کا سلسلہ بڑھاتی ہی جاتی تھی۔

آخر سریندر کو نیند آنے لگی، اور وہ کرسی سے اٹھ کر مسہری پر لیٹ گیا۔ پربھا چاہتی تھی کہ اُس نے جو کچھ بھی سوچا ہے، سریندر اس کی تصدیق کر دے۔ اسی لئے نہ وہ خود سوتی تھی اور نہ سریندر کو سونے دیتی تھی۔ اگر وہ پربھا کی باتیں سنتے سنتے اونگھنے لگتا تو کسی نہ کسی طرح جگا دیتی تھی۔ آخر سُریندر نے کہہ دیا۔

"دن بھر کا تھکا ہوں۔ مجھے سونے دو۔"

پربھا نے رونی سی آواز بنا کر کہا

"دیکھئے رات کیسی کالی ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی اور اکیلے ڈر لگتا ہے۔"

سُریندر کو بیساختہ ہنسی آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ پربھا کی شرارت ہے۔ ورنہ پربھا اور ڈر! اُس نے پربھا کو بھی کھینچ لیا۔ مگر وہ یہ کہتی ہوئی مسہری سے اٹھ گئی کہ پیاس معلوم ہو رہی ہے۔ صراحی سائبان کی منڈیر پر رکھی تھی۔ وہ باہر چلی آئی۔ کالے آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ وہ آسمان کو دیکھتی رہی۔ یکایک اُسے کسی کے پاؤں کے چاپ کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھی کہ سریندر اُسے ڈرانے آیا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ پربھا کے مڑتے ہی وہ سیڑھی سے اُترنے لگا۔ پربھا کو یقین ہو گیا کہ سریندر نہیں ہے۔ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میلے ہیں۔ وہ ڈر کر چلّا اٹھی۔

وہ آدمی گھبرا کر بھاگا۔ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتا ہوا سیڑھی سے نیچے جا گرا۔ سریندر اور نوکر بھی آپہنچے اور اسے مارنا شروع کیا۔ چور کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ پربھا بھی کانپتی ہوئی نیچے پہنچی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اُسے دیکھا اُس کے پھٹے اور میلے کپڑے خون میں تر تھے۔ سریندر نے نوکروں سے کہا۔

"لے جاؤ بدمعاش کو تھانے میں۔"

نوکر اُسے لے جانے لگے۔ چور نے نہ تو کھینچا تانی کی اور نہ کچھ بولا وہ چپ چاپ رہا۔ اُس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مار پیٹ اور سینکڑوں سوالات کے جواب میں وہ برابر روتا رہا۔ آخر نوکر اُسے لے جانے لگے۔ جیسے ہی وہ تین چار قدم آگے گیا۔ پربھا جیسے یکایک چونک پڑی اور بولی۔

"اب تو اسے کافی سزا مل چکی۔ تھانے نہ بھیجیے۔"

سریندر نے مڑ کر پربھا کو دیکھا، اور بولا۔

"پربھا! دیا ایسے چنڈالوں پر نہیں کی جاتی۔"

پربھا بولی۔

"نہیں مت بھیجیے دیا کرنا ہر حال میں اچھا ہے۔ کسی کے ساتھ بھی کیوں نہ ہو۔"

سریندر نے چڑ کر کہا۔

"تم تو عجیب آدمی ہو۔ ایسے چنڈالوں کے ساتھ بھی دیا ہوتی ہے کہیں۔"

پربھا نے سریندر کے پاس جا کر کہا۔

"ہاں ۔"

وہ اور آگے بڑھی۔ اور چور کا ہاتھ پکڑ کر بولی: "آؤ بھائی"۔ اور کوٹھے پر لے آئی۔ ایک نوکر سے پانی منگایا۔ اس کا سر دھویا۔ پٹی باندھی۔ سریندر کے دھلے کپڑے نکال کر پہنائے۔ دودھ منگا کر پلایا۔ سریندر سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ پربھا نے چور سے بڑی محبت سے کہا۔

"چوری کرنا بڑی بری بات ہے بھائی! اب کبھی چوری نہ کرنا۔"

چور نے سر اٹھایا۔ پربھا کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پربھا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے ایک کمرے میں چور کو سونے کیلئے آرام کی جگہ دی۔ کمرہ بند کرتی آئی۔ ایسا نہ ہو کہ رات کو اٹھ کر روانہ ہو جائے۔

سریندر بہت خفا تھا۔ لیکن پربھا سے اس کو اتنی زیادہ محبت تھی کہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ چور تو خیر آدمی ہی تھا۔ اگر وہ کتے کو بھی اُسکے کپڑے پہنا دیتی اور مسہری پر سلا دیتی تو وہ کچھ نہ بولتا۔ مگر جب پربھا اُسے سلا کر واپس آئی تو وہ چپ نہ رہ سکا۔ اس نے کہا۔

"پربھا کبھی کبھی تم بچوں کی طرح کام کرتی ہو۔ اگر اس چنڈال پر ایسی ہی دیا آگئی تھی تو چھوڑ دیتیں۔ مگر تم نے اس کی سیوا کی اور گھر میں رکھا۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ جو ہمارا گھر لوٹنے آئے اُس کے ساتھ مہربانی ......"

پربھا ہنستی ہوئی ہٹ گئی۔ سریندر کی گردن میں باہیں ڈال کر بولی۔

"آپ تو بیکار ہی دکھی ہوتے ہیں۔ اگر میرا یا آپ کا بھائی ایسا ہو جاتا تو اُسے تھانے بھیجدیتے۔ یا اُسے اچھا آدمی بنانے کی کوئی ترکیب کرتے .....!؟"

سریندر نے بات کاٹ کر کہا۔

"بس تمہیں ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اُسے بالکل سادھو بنا دو گی۔"

پربھا ہنسنے لگی اور بولی۔

"آپ شرط بدتے ہیں؟ دیکھئے میں اسے ایسا اچھا آدمی بنا سکتی ہوں کہ آپ بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ ذرا یہ سوچئے کہ اس نے چوری کرنے کی کیوں ٹھانی؟ یہ بُرائی اس میں کہاں سے آئی؟ کوئی بُرا پیدا تو نہیں ہوتا؟ ہاں حالات بُرا بنا دیتے ہیں۔ اگر حالات کو درست کر دیا جائے تو بگڑا ہوا آدمی اچھا کیوں نہیں بن سکتا؟ اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی اگر ایک بگڑا ہوا آدمی سُدھر جائے۔"

سریندر نے پربھا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"پربھا، سچ سچ کتابیں پڑھنے کا فائدہ تم نے اٹھایا ہے۔ میں تو بس روپیہ کمانے کی مشین بن کر رہ گیا ہوں۔ تم یہ باتیں مجھ سے تو فضول ہی کرتی ہو۔ ایسی باتیں تو تم گاندھی جی کے آشرم میں کرتیں تو اچھا معلوم ہوتا۔ خیر اب میں کچھ نہ بولوں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ چنڈال کبھی آدمی نہ بنے گا۔ تم آزما دیکھو۔"

پربھا سریندر سے اور بھی قریب ہو گئی۔ کمرے میں سبز رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ اور دریچے سے تاروں بھرا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ پربھا دیر تک چور کے متعلق سوچتے سوچتے سو گئی۔

(۲)

صبح ہوئی تو پربھا چور کے کمرے میں گئی۔ وہ اب تک سو رہا تھا۔ جا کر اُسے اٹھایا۔ چور گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پربھا بولی۔

"زیادہ دیر تک نہیں سونا چاہیئے۔"

چور شرما گیا۔ اس نے نظر پھرا کر کمرے کی ہر چیز کو دیکھا۔ ایک طرف سنگار میز پر بڑا سا آئینہ رکھا تھا۔ اُس نے اپنی صورت اُس آئینے میں دیکھی۔ اب تک اس کے سر پر پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ اپنے سر کو ٹٹولا۔ پربھا پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ اُس نے کہا۔

"بھائی تمہیں چوٹ زیادہ آگئی ہے۔ ابھی آرام کرو۔"

پربھا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سریندر دس بجے کھانا کھا کر آفس چلا جایا کرتا تھا۔ پربھا صبح اُٹھتے ہی اس کی ساری ضرورت کی چیزیں مہیا کر دینے کی عادی تھی۔ چور کو کمرے میں چھوڑ کر وہ سیدھے نیچے دیکھنے آئی کہ ناشتہ وغیرہ تیار ہوا ہے یا نہیں۔ باہر کے کمرے میں ایک نوکر سریندر کے چپراسی سے کہہ رہا تھا۔ بھائی ایشور کی لیلا بھی نرالی ہے۔ ہمارے صاحب بہادر تو ہر روز چور اچکوں کو بڑے گھر بھیجا کرتے ہیں۔ اور رات گھر میں چور گھسا تو بائی نے اُسے تھانے جانے نہیں دیا۔ بلکہ اُسے چوٹ آگئی تھی تو مرہم پٹی بھی اپنے ہاتھوں سے کی اور اُسے آرام سے رکھا۔"

چپراسی نے جواب دیا۔ ایشور کی لیلا ہی ہے بھائی ہمارے صاحب دیوتا ہیں اور بائی جی دیوی ہیں دیوی۔ ہم لوگ تین ٹکے کے آدمی ہیں، اور وہ کبھی نام لے کر نہیں پکارتی ہیں۔ تم کو اُس دن کی بات یاد ہوگی صاحب کے ایک دوست نے ہم کو "ابے چپراسی" کہہ کے بلایا۔ تو انھیں سمجھانے لگیں۔ بولیں۔ "غریب مگر شریف آدمی ہے۔ چپراسی جی کہہ کر بلایئے۔" بھلا اتنا کسکو خیال رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ـــ"

پربھا کے پاؤں کی چاپ سُن کر دونوں چپ ہو گئے۔ نیچے اُترتے ہی اس نے چپراسی اور نوکر کو بلا کر کہا۔

"دیکھو کوئی آدمی اس سے کچھ ایسی بات نہ کہے کہ اس کو تکلیف ہو ـــ"

دونوں سمجھ گئے کہ ہماری باتیں پربھا نے سُن لیں۔ چپراسی جی خوش ہو گئے کیونکہ وہ تعریف کر رہے تھے۔ اندولال ڈر گیا کیونکہ ایک طرح وہ پربھا کی شکایت کر رہا تھا۔ مگر پربھا پر نہ تو چپراسی کی تعریف کا کوئی اثر ہوا اور نہ اندولال کی شکایت کا۔ وہ سیدھے رسوئی گھر میں پہنچی۔ وہاں رسویا کو بھی یہی بات سمجھائی اور ہر نوکر کو جب اُسے یقین ہو گیا کہ ہر چیز وقت پر مل جائیگی تو وہ پھر اوپر آئی سریندر ڈاڑھی بنانے کو صابن لگا چکا تھا۔ پربھا کو جیسے ہی دیکھا اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور بولا۔

"چلو ذرا نئے دوست کو دیکھتے آئیں۔"

دونوں ہنس پڑے۔ پربھا سریندر کو لئے ہوئے اُس کمرے میں پہنچی جہاں چور تھا۔ وہ مسہری کے ایک کونے پر بیٹھا ہر چیز کو حیرت اور خوف بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سریندر نے کہا۔

"یار ہو قسمت کے سانڈ۔ اگر میرے اجلاس میں چوری کر کے آتے تو کم سے کم چھ مہینے کیلئے بھیجدئے جاتے۔ لیکن آئے تو گھر میں، جہاں پربھا دیوی رہتی ہیں۔ اگر بہن کے یہاں بھی چوری کرنے جاتے تو سونے کو مسہری نہ ملتی۔ یہ تو بہن سے بھی زیادہ نکلیں ـــ"

چور نے شرم سے گردن جھکالی۔ اُس نے جھکی ہوئی نگاہوں سے سریندر اور پربھا کو دیکھا۔ اُس کی آنکھ سے آنسو بہ نکلے۔ پربھا سریندر سے بولی ـــ

"جایئے ڈاڑھی بنا کر جلدی اشنان کر لیجئے۔ ناشتہ تیار ہے۔"

سریندر ہنستا ہوا چلا گیا۔ چور اب تک نگاہیں نیچی کئے کھڑا تھا اس کے دل اور دماغ میں احساسات اور خیالات کا طوفان امنڈا آرہا تھا۔ بہت سے خیالات یکے بعد دیگرے تیزی سے اس کے دماغ میں آرہے تھے۔ جیسے ریل کے ٹھہرتے ہی تیسرے درجے کے ڈبے میں مسافر۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر پربھا کے پاؤں پر سر رکھدے۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ بھاگ جائے۔ اگر اس وقت زمین پھٹ جاتی تو وہ خوشی سے اس میں سما جاتا۔ مگر پربھا سے وہ آنکھ ملانا نہیں چاہتا تھا۔ پربھا کی مہربانی کے بدلے اگر وہ اسوقت پولیس کی سختیوں میں ہوتا تو زیادہ سکون محسوس کرتا۔

پربھا نے چور کے دل اور دماغ کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر دیکھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ عادی مجرم نہیں ہے۔ کوئی بدحال ہے اور مصیبت سے تنگ آکر اس نے چوری کرنے کی ٹھانی

تھی۔ اس لئے تھوڑی سی کوشش میں اُسے اچھا آدمی بنایا جا سکتا ہے۔ اُسے اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اپنی خیالی کامیابی پر مسکرانے لگی۔ وہ خیالات کے بہاؤ میں دور تک پہنچ گئی۔ اپنے خیالات کی دنیا میں چور کو اس نے ایک شریف نیک اور ہونہار آدمی کی شکل میں دیکھا۔ دیر تک وہ انھیں خیالات میں اُلجھی رہی اور نہ جانے کب تک اُلجھی رہتی کہ سریندر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"شریمتی جی!"

پربھا چونک پڑی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ سریندر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے چور کو دیکھا، وہ گردن جھکائے اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کا اثر اُس پر اور بھی زیادہ ہوا۔ وہ چور کے پاس گئی۔ اور بولی

"دیکھو بھائی۔ زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔ تم صرف پکّا ارادہ کر لو کہ تم اچھے آدمی بنو گے۔ مجھے تو ابھی سے یقین ہے کہ تم اچھے آدمی ہو اور ہمیشہ رہو گے بھی۔"

سریندر نے پھر کہا۔

"پربھا! اگر تمہارا بھائی بھی آتا تو شاید تم اتنی خاطر نہ کرتیں ...."

پربھا نے پلٹ کر جواب دیا۔

"میرا ہی بھائی ہے۔"

سریندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے آج میں آفس جاؤں گا یا نہیں۔ کچھ کھانے کو بھی ملیگا یا نہیں؟"

پربھا مسکرائی۔ اُس نے نوکر کو پکارا۔

"اندو لال"

اندو لال آیا۔ پربھا نے اُس آدمی کو اُس کے ساتھ کر دیا کہ اُسے ہاتھ مُنہ دھو کر کھلائے پلائے۔ پھر ہسپتال لے جا کر مرہم پٹّی کرا لائے۔ اندو لال اُسے لیکر چلا گیا۔ پربھا سریندر کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ نوکر چائے ناشتہ لایا۔ دونوں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ سریندر نے پربھا کو چھیڑنے کیلئے کہہ دیا۔

"پربھا تم کو راکھ میں گھی سکھانا خوب آتا ہے۔ یاد ہے تم کو۔ ایک بھیک مانگنے والی چھوکری کو تم نے رکھا تھا۔ آخر پھر وہ بھاگ گئی۔ جس کو کوئی بُری عادت پڑ جاتی ہے وہ کسی طرح بھی نہیں چھوٹتی۔"

پربھا اپنی عادت کے مطابق مسکرا کر بولی۔

"آپ کا کہنا شاید صحیح ہو۔ لیکن ہمارے اور آپ کے خیالات میں بڑا فرق ہے۔ آپ مجسٹریٹ ہیں۔ صرف سزا دینا جانتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی کو سُدھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

سریندر نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔

"شاباش۔ مجھ پر تو ایک طرف۔ تم نے سارے مجسٹریٹوں پر ایک مستقل الزام رکھ دیا۔ تو تم یہ چاہتی ہو کہ ہم لوگ بھی تمہاری طرح سارے چور اُچکے اور بدمعاشوں کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئیں۔"

پربھا بحث کرنے کو ہر وقت ہی تیار رہتی تھی۔ اب وہ چپ کیسے رہتی۔ وہ خود ہی ہر بات پر سریندر سے بحث کرنا چاہتی تھی۔ سریندر ہی ان بحثوں میں حصّہ لینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ پربھا اس موقع کو کب چھوڑنے والی تھی۔ فوراً ہی بولی۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ مگر آپ لوگ یہ کبھی نہیں دریافت کرتے کہ آخر جرائم کن حالات کے ماتحت ہوا کرتے ہیں۔ اگر حکومت سزائیں دینے کے بدلے اس قسم کی تحقیقات کرے اور انھیں بدلنے کی کوشش کرے تو میرے خیال میں زیادہ بہتر صورت حال پیدا ہو جانے کی اُمید ہے۔"

"میں تو قانون کے ماتحت سزا دینا جانتا ہوں۔ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ تحقیقات کرتا پھروں۔ کہ کس نے کیوں جرم کیا۔"

"ہاں" پربھا بولی۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون اور حکومت دونوں غافل ہیں۔ بیماری ہونے کے بعد علاج کی نامکمل صورتیں تجویز کرتے ہیں۔ بیماری سے لوگوں کو بچانے کا انھیں کوئی طریقہ معلوم نہیں ہے۔"

سریندر نے ذرا سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔
"پربھا تم کس دنیا میں بستی ہو؟"
"یہ کیوں؟"
"یہ اس لئے کہ تم عجیب طرح کی باتیں کیا کرتی ہو۔ ایسی باتیں جو اوسط دماغوں میں نہیں سما سکتیں۔"
"آخر میں کیسی باتیں کر رہی ہوں۔"
"دیویوں جیسی۔"
"نہیں تو۔ آدمی کے دماغ میں سبھی باتیں آسکتی ہیں۔ یہ اس سے باہر کی چیز۔ نہیں۔ ہاں آدمی، آدمی بن کر تو سوچے!"

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پربھا گھر کے کاموں میں لگ گئی اور سریندر آفس کے فائل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد نوکر اُسکو لے کر واپس آیا۔ پربھا نے اس کا نام پوچھا۔ نام تھا کبیر۔ پربھا نے بہت سے سوالات کئے۔ لیکن وہ صرف اتنا بتا سکا کہ اس کا نہ باپ ہے اور نہ ماں۔ ایک غریب آدمی نے اُسے پالا تھا۔ پہلے تو چین سے کٹی لیکن بڈھے کے مرنے پر تکلیف ہونے لگی۔ تو کام ڈھونڈنے نکلا تھا۔ لیکن خراب صحبت میں پڑ کر چوری کرنے آ گیا تھا

* * * * * *

۲

پربھا اور سریندر کی زندگی محبت کا نمونہ تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتے۔ سریندر کے باپ بابو دھرندر پرشاد اپنے شہر کے مشہور وکیل تھے۔ پربھا کے باپ مُرلی بابو بھی نامی وکیل تھے۔ لیکن دھرندر بابو کے مقابلہ کے نہیں پھر بھی دونوں میں بے حد دوستانہ تھا۔ دونوں کے درمیان کسی قسم کی غیریت نہ تھی۔ دونوں کی دوستی اور محبت کے قصّے مثال کے طور پر بیان کئے جاتے تھے۔

دھرندر بابو کی وکالت جتنی کامیاب تھی، اُن کی گھریلو زندگی اتنی ہی ناکام۔ چار بچوں کی موت کے بعد سریندر پیدا ہوا، تو اُن کی دھرم پتنی سدھار گئیں۔ سریندر کو اس کی پھوپھی نے پالا پوسا۔

بیوی کی موت نے دھرندر بابو کا دل اُچاٹ کر دیا۔ وکالت میں بھی اُن کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ اُن پر ایک قسم کا جنون طاری رہنے لگا۔ وہ دو دو دن کسی سے بات تک نہ کرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے انھیں رائے دی کہ کچھ دن سیر و سیاحت میں گزاریں۔ ڈاکٹروں کی رائے پر انھوں نے عمل کیا۔ اور بہت دنوں تک اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے کشمیر پہنچے۔ کشمیر کی دلچسپیاں انھیں بہت بھائیں۔ اور انھوں نے مستقل ارادہ کر لیا، کہ وہ ایک عرصہ تک وہاں قیام کریں گے۔ (دھرندر بابو نے اپنے سارے موکل پربھا کے باپ کے سپرد کئے۔)

دھرندر بابو جن دنوں کشمیر میں تھے، انھیں مُرلی بابو کا خط یکایک ملا۔ پربھا کے ماں باپ کشمیر آ رہے تھے۔ دھرندر بابو کو بیحد خوشی ہوئی۔ دو سال کے بعد دونوں دوست ملے، دونوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن پربھا کی ماں بہت ہی دُبلی ہو گئی تھی۔ دھرندر بابو نے اُسے پہلی نظر میں پہچانا بھی نہیں۔ پربھا کے باپ نے انھیں بتایا کہ اُن کے کشمیر آنے کی وجہ دراصل بیوی کی صحت کی خرابی ہے۔ کچھ دنوں کشمیر کی سیر کرنے کے بعد مُرلی بابو اپنی بیوی کو چھوڑ کر گھر واپس آ گئے۔

اس واقعہ کو ڈیڑھ سال سے زیادہ بیت گئے۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ مُرلی بابو کام کی زیادتی کی وجہ سے پھر کشمیر بھی نہ جا سکے۔ برابر ارادہ ہی کرتے رہے۔ آخر مرلی بابو کو اپنی بیوی کا ایک خط ملا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ دھرندر بابو چند دنوں سے لاپتہ ہیں۔ انھیں بہت ڈھونڈا گیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

مرلی بابو پریشان ہو کر وہاں پہنچے۔ ہزار ڈھونڈا لیکن اس کا پتہ بالکل ہی نہ چلا۔ مجبور ہو کر دونوں واپس آئے۔ اُن کے ساتھ دھرندر بابو کا وفادار نوکر صغیر بھی تھا، اور اس کی بیوی بھی۔ جس کے متعلق دھرندر بابو ایک وصیّت نامہ چھوڑتے گئے تھے۔ صغیر کی بیوی کی گود میں پانچ مہینے کا ایک بچہ تھا۔ وصیّت نامے میں دھرندر بابو نے لکھا تھا کہ صغیر کو تا زندگی پچیس روپئے ماہوار پنشن دی جائے۔

مُرلی بابو تھک کر واپس آ گئے۔ اس حادثے کا اثر اُن پر بہت

زیادہ ہوا۔ پربھا کی ماں کا بھی یہی حال تھا۔ اُس کی صحت اب پہلے سے بہت اچھی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مضمحل تھی۔ دھرندر بابو کے یکایک غائب ہوجانے سے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اُنھوں نے سنیاس لے لیا ہے۔ مرلی بابو نے سریندر کی نگہداشت بڑی محبّت کے ساتھ شروع کی۔ وہ انھیں کے ساتھ شہر میں رہنے لگا۔ اسی دوران میں پربھا پیدا ہوئی۔ دونوں ساتھ پالے پوسے گئے۔ کچھ سال کے بعد پربھا کی ماں بھی اس دنیا سے چل بسی۔ اور مرلی بابو کی محبّت کا مرکز یہ دو بچّے رہ گئے۔ سریندر نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اسے لائق دیکھ کر اور اپنے عزیز دوست کی محبّت کی یاد تازہ رکھنے کے خیال سے اُنھوں نے پربھا اور سریندر کو بیاہ دیا۔

سریندر کی ہر ضد مرلی بابو پوری کرتے تھے، اور اُسے بڑی شفقت سے پالا تھا۔ اس کا اثر سریندر پر بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے کو کسی حد تک پربھا کا مرہونِ منّت بھی سمجھتا تھا۔ اسی لئے وہ پربھا کی ہر ضد، خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، ضرور پوری کرتا تھا بلکہ اسے پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سریندر نے خوشی کیساتھ ایک چور کا اپنے گھر میں رہنا گوارا کرلیا، جو شاید اس کی عدالت میں جاتا تو نہ جانے کتنے دنوں کے لئے جیل خانے کی ہوا کھاتا۔

* * *

(۳)

چند دن اور بھی گزر گئے۔ کبیر بالکل اچھا ہوگیا۔ وہ اتنا بُرا نہ تھا۔ پربھا کو یقین تھا کہ وہ ایک دن اچھا آدمی بن جائے گا وہ زیادہ تر بالکل چپ چاپ بیٹھا رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا تھا کہ پربھا نے اُس سے سوال کیا۔

"تم کیا سوچتے رہتے ہو بھائی"؟

"سوچتا ہوں کہ اس طرح کب تک نبھے گی"۔

"تو تم کام کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ——"

"کون سا کام؟"

"جو بھی مل جائے ——"

پربھا نے اُس سے پھر پوچھا۔

"تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"ہاں ——"

کبیر نے جواب دیا۔ پربھا سوچنے لگی کہ یہ کون سا کام کرسکتا ہے۔ وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ اُسے کوئی اونچی تعلیم نہیں ملی ہے۔ اُسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ جس کو بھائی کہا، جسکو مرہم پٹّی کی اُسے کہیں معمولی خدمتگاری کرنے دے۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد ایک راہ نکالی۔ پچاس روپئے اپنے پاس سے دیئے۔ اس کے کپڑے خرید والئے۔ اور کبیر سے کہا کہ اسے پھیری کرکے بیچے۔ جو کچھ بکری ہو وہ لاکر اس کے ہاتھ میں دیدیا کرے۔

کبیر نے یہ کام خوشی کے ساتھ منظور کرلیا۔ وہ روز صبح سویرے کپڑوں کا گٹھر لے کر چلا جاتا۔ دن بھر ادھر اُدھر بیچتا اور شام کو واپس آکر جو کچھ بیچتا، پربھا کو دیدیتا۔ پربھا کو خوشی تھی کہ اس کی محنت ضائع نہیں گئی۔ ایک بگڑا ہوا آدمی سدھر رہا ہے۔ سریندر دل میں اقرار کرتا۔ لیکن پربھا کو چڑانے کو کہدیا کرتا۔

"تم دیکھ لینا پربھا! جب زیادہ رقم ہاتھ لگے گی، یہ کہیں کھسک جائے گا؟"

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ برابر اپنی کمائی لاکر پربھا کے ہاتھ میں دیدیا کرتا تھا۔ جو محنت کرتا ہے، فائدہ ضرور ہی اٹھاتا ہے، پچاس روپئے کی رقم چھ سات مہینوں میں بڑھ کر پانچ چھ سو ہوگئی۔

پربھا کو جب کامل یقین ہوگیا کہ کبیر اب کام کرسکتا ہے۔ تو شہر کے ایک بڑے دکاندار کو بلا کر اس کا معاملہ طے کرادیا۔ اب کبیر کے پاس ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ پھیری کرکے کپڑے نہیں بیچتا تھا —— مگر پربھا کبیر کی دن دونی ترقیوں کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکی۔ سریندر کا کچھ دنوں بعد ہی تبادلہ ہوگیا۔

* * *

(۴)

دو تین برس اور بھی گزر گئے۔ اب کبیر اس شہر کا نامی دکاندار

تھا۔ اس کی ایمانداری، اور اس کے اخلاق گاہکوں کو اس کی دوکان تک کھینچ لاتے تھے۔ وہ پربھا اور سریندر کو برابر اپنی حالت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ پربھا خوش ہوتی تھی۔ ایک بار اس نے لکھا کہ وہ بیاہ کرنے جا رہا ہے۔ پربھا اس کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکی۔ اُسے بہت افسوس تھا۔ لیکن بہت دور اور مجبور تھی اُس نے تحفے بھیج دیئے۔

دو تین سال اور بھی گذر گئے۔ کبیر نے پربھا کو خوشخبری بھیجی کہ اُسے خدا نے بیٹا دیا ہے۔ پربھا کو اس سے بیحد خوشی ہوئی۔ دوری کے باوجود اُس نے ارادہ کر لیا کہ اس خوشی میں ضرور شریک ہوگی سریندر سے جب اس نے کہا تو پہلے تو اس نے ٹالنا چاہا۔ لیکن پربھا نے کہا۔

"آپ ضرور چلیں، ورنہ کبیر بھائی سمجھیں گے کہ ہم لوگ انہیں بھول ہی گئے۔"

سریندر نے بھی اس بات کو منظور کر لیا۔ اور فرصت کی درخواست دیدی۔ پربھا نے کبیر کو خبر کردی کہ وہ دونوں جلد ہی آنے والے ہیں کبیر کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اُن کے آرام و آسائش کے سامان مہیا کر لئے۔

دو چار دن گزرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پانچ چھ سال بعد پھر سب ملے۔ سب خوش تھے۔ کبیر نے اپنی بیوی سے پربھا کو یہ یہ کہتے ہوئے ملایا کہ اِنھیں نے میری زندگی کو سدھار دیا ورنہ آج نہ جانے کیا ہوتا۔

پربھا نے اس بار کبیر کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کو بھی دیکھا۔ جس کی آنکھیں بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔ کبیر اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ دریافت کرنے پر کبیر نے بتایا کہ یہی وہ عورت ہے جس نے اُسے پالا ہے۔

پربھا نے جس وقت سے بوڑھی عورت کو دیکھا۔ اس کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ اسے ایک فکر ہو گئی۔ کسی طرح یہ معلوم کیا جائے کہ کبیر کون ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ لیکن اسے موقع ہی نہ ملتا تھا۔ مگر اپنے اچھے سلوک سے پربھا نے بوڑھی عورت کو بالکل اپنا لیا تھا۔

آخر پربھا کو ایک وقت مل ہی گیا۔ کبیر کے کچھ سسرالی لوگ آ گئے۔ اس کی بیوی عورتوں کی خاطر میں رہی، اور کبیر کچھ کاموں میں پھنس گیا۔ پربھا بوڑھی عورت کو پکڑ کر لے آئی۔ سریندر بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے بوڑھی عورت سے پوچھا تو اُس نے بتایا۔

"یہ دراصل میرے مالک کا بیٹا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ میرے مالک کی بیوی مر گئیں تو وہ بہت پریشان رہنے لگے۔ ڈاکٹر کے کہنے سے کشمیر چلے گئے۔ میرا شوہر ان کے ساتھ تھا۔ وہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ میرے شوہر کو بہت مانتے تھے۔ کچھ دنوں بعد اُنکے ایک دوست کی بیوی بھی بیمار ہو کر وہاں آ گئیں۔ وہ اچھی تو ہو گئیں لیکن کبیر ان کے پیٹ میں رہ گیا۔ وہ بہت گھبرائیں۔ بات بھی ایسی ہی تھی۔ بدنامی کے ڈر سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی گئی۔ وہاں لوگ یہ جاننے لگے کہ میاں بیوی ہیں۔ لیکن مجھے وہاں بلا لیا گیا۔ اور جب کبیر پیدا ہوا تو میرے حوالہ کر دیا گیا۔ اور میں نے اُسے اپنا بیٹا مشہور کر دیا۔ مگر جب ان لوگوں کے گھر واپس جانے کا وقت قریب آیا تو میرے مالک شرم سے کہیں چلے گئے۔ بہت دن تک تو اُن کے گھر سے روپیہ آتا رہا۔ مگر پھر بند ہو گیا۔ میرے شوہر بھی مر گئے۔"

پربھا نے جلدی سے پوچھا ـــ

"اچھا بوڑھی مائی! تمہارے مالک کا نام کیا تھا؟ یہ تو بتایا ہی نہیں۔"

بوڑھی عورت کچھ دیر چپ رہی۔ پھر وہ بولی۔

"بیٹی مگر یہ بات کسی سے بھی نہ کہو، تو کہوں ـ"

پربھا نے کہا۔ "ہاں۔ کبھی کسی سے بھی نہیں کہیں گے ـ"

عورت کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی ـــ

"میرے مالک کا نام تھا۔ دھرندر بابو وکیل۔"

سریندر نے پربھا کو، اور پربھا نے سریندر کو دیکھا۔ اور دونوں دیر تک چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے ـــ کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

سہیل عظیم آبادی

پیوستگی

مسعود کے چہرے کا رنگ ایک پرت اُڑ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔
سائرہ لکھ رہی تھی۔

"میں نے اچھی طرح جانچ کر لی، کسی صفائی کی ضرورت نہیں آپکو فیروزہ اور آپ فیروزہ کو مبارک رہیں۔
میں آج شام کی گاڑی سے ہمیشہ کیواسطے ......

سائرہ نہ جانے کیوں لفظ کی تلاش میں یا وفورِ جذبات سے رُک گئی، قلم نازک ہاتھ میں خفیف سا کانپا اور وہ بے اختیار کرسی کے تکیہ سے لگ گئی۔

آنکھیں لڑ گئیں۔ سائرہ کا چہرہ تمتما اٹھا، شرم اور غصہ کے امتزاج نے ایک انوکھا رنگ پیدا کر دیا۔ بیضاوی رخسارے نوخیز قندھاری انار سے ہم رنگ ہو گئے۔

"سائرہ یہ صرف واہمہ ہے اصلیّت ....
"میں ایک حرف نہیں سنوں گی۔"

بس صرف اسی قدر ......

سائرہ نے یکایک چمکدار قرولی نکال لی۔ کھڑکی کے سُرخ شیشہ کا شفّاف عکس پھل پر پڑا۔ قرولی سامراجی استبداد کی طرح بھیانک ہو گئی۔

"اب تم نے کوئی اور لفظ زبان سے نکالا اور ....
جملہ ناتمام چھوڑ کر وہ اٹھی اور خنجر بکف کمرے سے نکل گئی۔
کمرے کے ساتھ فیروزہ کی زندگی سونی ہو گئی۔ سر چکرانے لگا معلوم ہوتا تھا جنتِ آزادی میں کسی غدّار نے عین موقعہ پر اپنی کمظرفی کے دھارے میں ساری ناؤ ڈبو دینے کی کوشش کی جو بظاہر عارضی طور پر سہی، کامیاب سی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے کا تمام فرنیچر مارِستان بن گیا۔ کاٹنے کھاتا تھا۔

ٹھیک دس بجے رات کو سارے اسٹیشن پر ہلکی بیجنی روشنی ہوئی "راہ درست" کی علم بردار برقی ؟ جگمگا اٹھیں۔
بجلی کی ریل مستانہ انداز سے ٹھہری، بجلی کی لہروں کے ماتحت معجزہ فریب دروازے آپ سے آپ کھل گئے نہ گارڈ کی سامعہ شگاف سیٹی تھی نہ انجن کا بے ہنگم شور، نہ مسافروں کی شین شاں اور نہ کوئلے کے ذرات بدیسی لیڈروں کی طرح فضا کو مکدر کر رہے تھے۔
ہر ڈبے میں ٹکٹوں کا یہ انتظام تھا کہ مسافر کو جتنے دور کا ٹکٹ مطلوب ہو اسی نمبر کے دہانے میں رقم کرایہ ڈالدے اور ٹکٹ والی مشین آپ سے آپ مطلوبہ ٹکٹ تاریخ ڈالکر مسافر کے حوالہ کر دے۔ دروازے اعجازی انداز سے بند ہو گئے اور بے گارڈ اور بے ڈرائیور کی بجلی گاڑی آپ سے آپ مست خرام ہو گئی۔ نہ چل پڑنے کا جھٹکا لگا نہ رفتار تیز ہونے کی شقاشغ محسوس ہوئی۔
سائرہ بالکل آخر میں گھبرائی ہوئی پہونچی تھی مشین سے ٹکٹ لیکر بڑھی تو معلوم ہوا کہ سارا ڈبّہ بھرا ہوا ہے۔ درمیانی دروازے سے دوسرے ڈبے میں داخل ہوئی تو اس سرے پر صرف ایک سیٹ خالی نظر پڑی۔ وہ جاکر بیٹھی ہی تھی کہ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ آنکھیں کچھ اور بڑی ہو کر زیادہ حسین ہو گئیں۔
داہنے بازو کی سیٹ پر مسعود بیٹھا تھا۔ یا مسعود کا بُت تھا، چتر بیندر ناتھ بینرجی کی کمال دستکاری کا نمونہ۔ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ کا شائبہ سا تھا، غالباً مصوّر کے نازک جذبہ کا ترجمان ....
سائرہ اندر ہی اندر کھول گئی۔ بغل والوں میں کسی سے تعارف نہ تھا، وہ متمدّن تھی۔ ہندوستانی مسافروں کی طرح غُلامانہ بے تکلّفی سے اسکو دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ ہیجان کا

کاایک سمندر تھی مگر ساکت ۔ جذبات آبدوز کشتیوں کی طرح جہازِ
سکون پر بے خبری میں گولے برسا رہی تھیں لیکن حسنِ اتفاق
نے لبوں پر "غیر جانبداری" کی سنگین مہر لگادی تھی۔ شیشے کی چھت
میں یکایک سُرخ قمقمے جل اٹھے خطرہ کا برقی بینڈ بجا، "سیاہ باش"
کا سگنل ہوا اور چشم زدن میں ساری گاڑی میں پٹ اندھیرا ہوگیا۔
جنگی طیاروں کی پرواز کی صدائیں آنے لگی ہلکے دھماکے بھی محسوس
ہوئے۔

عالمگیر یورپین جنگ کے واسطے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مسعود
اور سائرہ دونوں ان چیزوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ اندھیرے
میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا، ہاں مسعود کے سگار کا ہلکا
سا شعلہ فضا میں ساکن سا تھا کوئی حرکت نہ تھی۔

اچانک سائرہ کو محسوس ہوا کہ کسی زبردست مردانے ہاتھ
کا حلقہ اس کی کمر میں پڑ گیا ہے۔ وہ بے ساختہ چیخ اٹھنے ہی کو
تھی کہ یکایک کسی نے کھینچکر لپٹا لیا اور دونوں ہونٹ پوری قوت
سے پیوست کر دیے۔

لذّت کی یہ نفرت انگیز مگر شیریں کیفیت پیوستگی قریب
قریب پانچ منٹ تک قائم رہی اور شوہر سے روٹھی سائرہ،
جوانی سے بھرپور سائرہ، عصمت و عفّت کی دیوی سائرہ، بالکل
اسی طرح بے بس رہی۔ جیسے بغاوت کے شعلوں میں بھنتی
ہوئی ریاست کسی ظالم حکمراں کے پنجوں میں ہو۔ فرق صرف اتنا
تھا کہ وہ مشکل سے گزرتے ہوئے دراز لمحوں میں نفرت کے
باوجود لذّت پیوستگی کا شکار ہوتی جارہی تھی۔ اور اپنا سب کچھ
کھو کر بھی سکون کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی اس تمام عرصہ میں
مسعود کے سگار کا شعلہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔ سائرہ کے واسطے یہ گتھی
اور زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ مسعود کا فعل ہو ہی
نہیں سکتا ورنہ سگار کا شعلہ اپنی جگہ سے ضرور جھکولے لیتا پھر
یہ کون ہے؟

کوئی ہو اُسے وہ محبت کرنیکا رازداں، ماہر اور نفسیّات
کا عملی ڈاکٹر ضرور ہے۔ کاش ......

یکایک شیشے کی چھت میں پہلے سبز قمقمے "فضا صاف ہے"
کے پیمبر بنکر نمودار ہوئے اور ساری گاڑی پھر بقعہ نور بن گئی۔

مسعود اب بھی بت بنا بیٹھا تھا۔

سائرہ کی گود میں ایک کارڈ تھا جس پر آتشیں حروف میں
لکھا تھا۔

"فیروزہ میری سوتیلی بہن ہے"

سائرہ اور مسعود اپنی مشترک خوابگاہ میں شب خوابی کے
ہلکے کپڑوں میں ہیں اور اسی طرح ہم آغوش ہیں کہ صرف دو سر نظر
آتے ہیں۔

مگر یہ ناممکن تھا کہ تمہارے سگار کا شعلہ اپنی جگہ قائم رہے۔

"یہ بالکل ممکن تھا" "سیاہ باش" کے ساتھ ہی میں نے کھڑکی
کی درجے میں سگار قائم کر دیا اور "فضا صاف ہے" کے ساتھ ہی
سگار پھر میری انگلیوں میں تھا۔

طالب الہ آبادی ایم۔اے

لہو کی بھیک

سید محمد عسکری طباطبائی بی۔اے

کھانے کو دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑے اور جھوٹا پچ میل سالن وہ بھی کم اور ڈانٹ پھٹکار زیادہ، لیکن قربان کا ضمیر نہ جانے کس مٹی کا تھا کہ اُس کے جسم کا پودا روز بروز پھیلتا ہی چلا جاتا تھا نہ گھر والوں کی نظر اُسے لگتی نہ مالکوں کی ہوس اُسے کھاتی۔ بیگم صاحبہ نے "دُنبہ" "سانڈ" اور "گینڈا" وغیرہ خطاب دے رکھے تھے جنھیں وہ بچپنے ہی سے ہنس ہنس کر سُننے اور سُن سُن کر سہنے کا عادی ہو گیا تھا۔

محلّے کے مرحوم میر صاحب کا یتیم بچّہ جسے کمسنی ہی سے بیگم صاحبہ نے پال لیا تھا۔ قربان بڑا محنتی اور جفاکش تھا۔ جب وہ جھاڑو دیتا تو گرد کے بادل اُٹھتے اور سر پر چھا جاتے، کہتے ہیں کہ گرد پھیپھڑوں میں جم جانے سے دِق ہو جاتی ہے۔ قربان کے پھیپھڑوں سے تو گرد ہی دق ہو جاتی تھی شاید جو کچھ فاسد مادّہ اُس کے جسم کے اندر جاتا، پسینہ بن کر نکل جاتا اور اُس کا رنگ روز بروز نکھرتا ہی جاتا۔ نواب صاحب اکثر ہنسی میں کہتے بھی تھے کہ عربی نسل کا گھوڑا ہے۔ جتنی محنت لے لو ہار نہ مانے گا اور گردن اونچی ہی رکھے گا۔ اور واقعاً تھا بھی قربان کا یہی حال، جب اُس کا گورا چٹّا بدن کام کی کثرت سے پسینہ پسینہ ہو جاتا تو اُس کا چہرہ کُندن کی طرح دمک اُٹھتا اور وہ ہنستا ہی رہتا۔ صورت کا اچھا خاصا تھا، میلے کپڑوں میں سے نجابت جھانکا کرتی، گرد سے اَٹے ہوئے ماتھے پر شرافت کی دُھندلی مگر یقینی تحریر تھی، تو دن بھر بیچارہ کام کرتا اور اوپر سے ڈانٹیں سُنتا، ہر ایک ذرا ذرا سی بات پر کسے مار دیتا۔ بِن ماں باپ کے بچّے کا کون پُرسان ہوتا ہے، ہاں کبھی کبھی حمیدہ کو ترس آ جاتا۔ یہ اِس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ ساتھ دوڑنا دھوپنا، ساتھ ہی مٹّی کے گھروندے بنا بنا کر بگاڑ ڈالنا، کہاں تک اُس کا خیال نہ آتا۔ اِس لیئے جب کوئی بے دردی سے قربان کو مارتا تو یہ منع کر دیتی۔ پھر کسی کی مجال نہ ہوتی، غرضیکہ قربان کی ساری زندگی ہی محنت، ذلّت اور تندرستی کا ایک چھوٹا سا مجموعہ تھی۔ اب اُس کی عمر کا پندرھواں سال تھا اور حمیدہ نے گیارھویں میں قدم رکھا تھا۔ اِس لیئے بیگم صاحبہ نے مناسب سمجھا کہ قربان کو محل میں نہ آنے دیا جائے اور باہر ہی رکھا جائے، یہ بات قربان کو بُری بھی لگی، لیکن اُس کے سوچ بچار سے کیا ہوتا تھا، اُسے اندر نہیں جانا چاہیئے تھا اور بس! وفادار کُتّا ڈیوڑھی ہی پر بندھا رہتا ہے!

دن گذرتے رہے، خواری اور محنت کے دن، افلاس اور ذلّت کے دن، اور مفلس کی جوانی اپنا کام کرتی رہی۔ یہ خزاں شریک بہار بار بار پر آتی رہی، یہ کانٹوں بھری بیل منڈھے چڑھتی رہی۔ اب قربان پورے اٹھارہ سال کا تھا، قوی ہیکل اور بلند بالا، بقول بیگم صاحبہ خاصا "شہتیر"، باہر رہنے سے ذرا کام بھی کم کرنا پڑتا تھا۔ اِس لیئے پڑھنے لکھنے میں جی لگایا کچھ ہی دنوں میں اچھا خاصا حساب وغیرہ نکالنے لگا۔ جنس لاتا اور پائی پائی کا حساب لکھ کر آ دیتا کر دیتا۔ کبھی کبھی ایک پیسہ کا اخبار بھی مول لے کر پڑھتا۔ اب اُس کے آگے ملازموں میں سے بھی کسی کی کم ہی چلتی تھی وہ حسد کرنے لگے اور مالکوں کی نظر سے اُسے گرانے کی گھاتیں سوچنے لگے۔ اُس کے کام میں تو خرابی ملی نہیں، چال چلن پر الزام لگا دیا۔ دروازہ پر ایک جوان بھکارن آتی تھی۔ ۱۷-۱۸ برس کی لگ بھگ۔ جابجا پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے چکنا پنڈا مسکراتا ہوا غربت و حقارت میں سے جوانی انگڑائیاں لیتی ہوئی، قربان کبھی کبھی اُس کو دو ایک پیسے دے دیتا تھا۔ بس بوڑھے خانساماں نے جھوٹا الزام لگا دیا۔ نواب صاحب یقین کر گئے، بیگم صاحبہ سے ذکر کیا وہ آگ بگولا ہو گئیں، لو صاحب گھر میں

اللہ رکھے لڑکی جوان ہونے کو آئی اور اس موئے کی یہ لب بھری باتیں! یہ گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔" ابھی کھڑے کھڑے نکال دو نواب صاحب بیگم صاحبہ کے خلاف کہاں جا سکتے تھے، قربان سے کہا "تمھارے باپ کی لاج میں تمھیں پال پوس کر جوان کر دیا۔ اب ہمیں تمھاری ضرورت نہیں ابھی ابھی چلے جاؤ!" یہ حکم قربان کیلئے معمولی حکم نہ تھا۔ ایک عمر اُس نے اس گھر میں کاٹی تھی۔ چپّہ چپّہ پر شناسائی کی مُہریں تھیں، در و دیوار پر محبّت کے نقوش تھے۔ قربان ایک بچّے کی طرح بِلک بلک کر رو رہا تھا۔ جھوٹے الزام پر توبہ کی، ہاتھ جوڑے، منّتیں کیں، لیکن ایک نہ سُنی گئی۔ کھڑے کھڑے نِکال ہی دیا۔

قربان جب گھر سے چلا ہے تو یہ حال تھا کہ قدم رکھتا کہیں اور پڑتا کہیں، آج دنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا، دربدر کی ٹھوکریں کھا کر قسمت کا لکھا پُورا کر رہا تھا۔ کچھ دِنوں مارے مارے پھرنے کے بعد ایک رئیس کے یہاں نوکری مِل ہی گئی۔ پڑھ لِکھ تو گیا ہی تھا، اُنھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنے سلیقہ کی بدولت کچھ ہی دنوں میں نئے مالکوں کی نگاہوں پر چڑھ گیا۔ گاؤں تحصیل وصول کے لئے بھیجا گیا، بہت اچھی وصولی کر کے لایا۔ مالک بہت خوش ہوئے۔ ایک سال کے بعد اُنھوں نے مختار نامہ بھی اِس کے نام کر دیا ۲۵ روپیہ ماہوار تنخواہ مقرّر ہو گئی۔ چلو اچھی کٹنے لگی۔ قربان مہینے پیچھے نواب صاحب کے یہاں سلام کرنے چلا جاتا۔ لیکن بیگم صاحبہ سامنے نہ آتیں نہ بات ہی کرتیں۔ نواب صاحب بھی ٹیڑھے ہی رہے۔ شاید سمجھتے کہ ہم کو اپنے ٹھاٹھ دکھانے آتا ہے۔ اِس بے رُخی سے قربان کا دل ٹوٹ گیا۔ اب مہینوں اُدھر کا رُخ نہ کرتا اُس کے دل میں نواب صاحب کی طرف سے بغاوت سی پیدا ہوئی کہ جن تو جھوٹے ہی الزام پر ایسا مردودِ بارگاہ ٹھیرایا گیا اور وہ دن بھول گئے جو خود ایک کمسن طوائف کو گھر میں ڈال لیا تھا اور دن رات بیگم صاحبہ سے لڑائی ٹھنی رہتی تھی۔۔

خیر یہ تو نوّاب صاحب کی جوانی دِوانی کی کتھا تھی۔ اب وہ بڑے اللہ والے ہو گئے تھے، کیا مجال تھی جو نماز قضا ہو جائے، روزہ چھُوٹ جائے، سحری کھانے کا ثواب ناغہ ہو جائے۔ حالانکہ رمضان میں بھوک کے ڈر سے اناڑی کی بندوق کی طرح پیٹ اتنا بھر لیتے تھے کہ سارے دنوں سے زیادہ بیمار رہتے تھے۔ بہر حال تہجّد میں بھی فرق نہیں آتا تھا شاید اسی سے کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی بڑی "پکّی مُومنہ" اور خالص جنّتی بیوی تھیں۔ رمضان میں پیٹ بھرے مولویوں کو مزے مزے کی افطاریاں کھلواتیں، محرّم میں خوش پوشاک لوگوں کو جمع کر کے مجلسیں کرتیں خوشبودار حقّے سُلگتے۔ طرح طرح کا گوٹا بنتا۔ اچھے اچھے حصّے تقسیم ہوتے یوں بھی ہر مہینے کچھ نہ کچھ نذر نیاز ہونا ضروری تھی بات بات پر حمیدہ بی بی کے لئے منّتیں مرادیں مانی جاتیں کونڈے رَت جگے ہوتے، خیر سے بچّی پروان چڑھ جائے، پھر بھی یہ سب کچھ کام نہ آیا۔ حمیدہ بی بی بیمار پڑ ہی گئیں، اور بیمار بھی ایسی کہ توبہ ہی بھلی! سچ مچ جان کے لالے پڑ گئے۔ یہ کمبخت اٹھارواں سال ہوتا ہی بڑا کٹھن ہے اور مرض بھی کمبخت عجیب مرض تھا۔ کھانے کو تو دنیا بھر کی عمدہ غذائیں، پھل پھلاری، دودھ، مکھن اور اوپر سے طرح طرح کے "ٹانک" لیکن جسم تھا کہ سوکھتا ہی چلا جاتا تھا۔ خون پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ناخن برابر سفید ہوتے جاتے، چہرہ یکسر کُمھلاتا جاتا۔ ماں باپ کو اللہ نے پیسہ دیا تھا۔ ٹھیکری کر دیا۔ پانی کی طرح بہایا۔ انگریزی، یونانی، وید، سبھی آزمائی لیکن ایک کارگر نہ ہوئی صحت کسی کے بس کی نہ تھی۔ مُلّا، پنڈت، رشی بلائے۔ گنڈے تعویذ، ٹونے، ٹوٹکے کئے، علوی سفلی ایک نہ چھوڑی، لیکن سب بے سود، مرض اپنی جگہ پر اٹل تھا، اب تو ماں باپ سچ مچ بچّی کی طرف سے نا اُمّید ہو گئے۔ ملازموں سے دُرشتی اور آپس کی خوش مزاجی غائب ہو گئی۔ ہر ایک سے بات کرتے ڈرنے لگے کہ کہیں حمیدہ بی بی کے لئے کوئی بُری بات مُنھ سے نہ نکال دے، ایک پکّا ہوا پھوڑا تھے کہ چھیڑا اور پھوٹ بہا، ایک بندھا ہوا گھاؤ کہ چھُوا اور لہو اُبل نکلا۔ لڑکی کو آنکھ بھر کے نہ دیکھ سکتے تھے، جسے کلیجے سے لگا کر پالا اُسے بستر پر دم توڑتے کیسے دیکھیں اور پھر اکلوتی بچّی منّتوں مرادوں کی پالی، اپنے تو اپنے غیر بھی روتے تھے۔ کیسی بھرپور جوانی مٹ رہی تھی، کیسی ہری بھری ڈالی مُرجھا رہی تھی، اللہ دشمن پر بھی ایسی نہ ڈالے!

وہ تو کہئے خالق میاں۔ حمیدہ بی بی کے چچا زاد بھائی اُنھیں دنوں ولایت سے تازہ دم ڈاکٹری پاس کئے آ گئے۔ انھوں نے علاج کا بیڑا اُٹھا لیا۔ ماں باپ نا اُمّید تو ہو ہی گئے تھے لڑکی کو سولھوں آنے اُن کے سپرد کر دیا۔ ولایت میں نیا طریقۂ علاج کا ایجاد ہوا تھا۔ برسوں کا

مریض دم بھر میں چنگا ہو جائے۔ تندرست آدمی کا خون رگوں میں داخل کیا جاتا تھا انھوں نے حمیدہ بی بی کے لئے یہی تجویز کیا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں، آس کے دیپک کی ٹمٹماتی ہوئی لو پھر بڑھ کر سارے من مندر پر چھا گئی، لیکن اب سوال یہ تھا کہ خون ایسا ہو جو مریضہ کے خون سے میل کھا جائے۔ بہت موٹے تازے بیگاری غنڈے اپنا خون بیچتے ہوئے سکّوں کے عوض دینے کو تیّار ہو گئے لیکن حمیدہ بی بی اور اُن کی غذا میں بہت فرق تھا۔ خون میں بھی فرق نکلتا۔ خالق میاں مایوس ہو چلے، بڑے پریشان تھے۔ خون بہت ملتا تھا لیکن جو حمیدہ بی بی کے انگ کو لگ جائے ایسا نہ ملتا تھا۔ قربان کو یہ حال معلوم ہُوا تو تڑپ گیا۔ آخر حمیدہ بی بی کو گودیوں میں کھلایا تھا۔ ۱۲ برس میں خون بدل جاتا ہے اُس نے تو ۲۰ برس نواب صاحب کے یہاں گذارے تھے پورے ۲۰ برس، اُس سے نہ رہا گیا۔ جھٹ خالق میاں کے پاس پہونچا اور اپنا خون جنچوایا۔ لاٹری اُسی کے نام نکلی اُس نے بھی تو برسوں حمیدہ بی بی ہی کا جھوٹا بچا کھچا کھایا تھا۔ دونوں کے خون میں صرف ۱۹ و ۲۰ کا بل تھا۔ خالق میاں کا چہرہ کامیابی کے خیال سے دمکنے لگا۔ قربان سے بولے "بہت روپیہ ملے گا خون بیچ ڈالو"، روپیہ کے نام پر قربان جلبلا گیا۔ بولا "جانیئے جانیئے میں اپنا خون سونے چاندی کے بھاؤ نہیں بیچتا" یہ دوڑے ہوئے نوّاب صاحب اور بیگم صاحبہ کے پاس گئے، سب حال کہہ سُنایا وہ لوگ عجیب کشمکش میں پڑ گئے، جسے اِس بُری طرح دھتکارا اور پھر مُنہ نہیں لگایا اُس سے مُنہ پھوڑ کر کیسے خون مانگیں! ایک طرف لڑکی کی جان کا سوال تھا دوسری طرف زندگی بھر کی آن کا۔ آخر کو ماں سے نہ رہا گیا۔ ممتا کی آگ میں سُلگ رہی تھی، کوکھ اُجڑی جاتی تھی کہ باتیں تھیں کیسی آن! کہاں کی خودداری! انھوں نے قربان کو بلوا ہی لیا۔ بندھا بندھا چلا آیا۔ یہ کلیجہ تھام کر اُٹھیں آج بچے ہوئے ملازم سے بھیک مانگنے چلی تھیں۔ اور بھیک بھی لہو کی بھیک! غیرت سے گڑی جاتی تھیں! ایک ایک پیر من من بھر کا ہو رہا تھا! مگر کرتیں کیا! پڑ ہی ایسی گئی تھی! پردہ اُلٹ کر ڈیوڑھی کے کمرے میں قربان کے روبرو آ گئیں، اُس نے جُھک کر سلام کیا، یہ دعا میں دے کر بولیں "بیٹا قربان! آج ہم پر بپتا پڑی ہے۔ مدد نہ کرو گے؟"

وہ بولا کیوں نہیں! انھوں نے کہا "پھر دُکھیاری بہن کو" لہو کی بھیک دے ڈالو!" قربان پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہا تھا! بولا "خادم کو حکم دیجئے حکم۔ یہ تو تھوڑے سے خون کا معاملہ ہے اگر جان بھی درکار ہو تو حاضر ہے۔ زہے قسمت اُس خادم کی جس کا خون آقا زادی کے خون سے مل کر رہے"، بس پھر کیا تھا۔ خالق میاں خون لینے اور قربان دینے پر تُل گئے دونوں ہی نے کسر بھی نہیں اُٹھا رکھی! خالق میاں بولے "قربان کافی وزن میں خون چاہئے گا! شاباش تم بڑے بہادر ہو" اُس نے کہا "آپ کے جوش دلانے کی ضرورت نہیں! آپ میری فکر نہ کریں، جتنا خون درکار ہو لے لیں۔ حمیدہ بی بی کی جان بچ جائے! بس خالق میاں نے قربان کے بازو کی رگ چھید دی اور پورا ۲ سیر جیتا جیتا خون نچوڑ لیا۔ واہ رے قربان، اُف بھی تو نہیں کی! لیکن آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ تیورا کر گرا۔ چہرہ سُت گیا۔ جسم سوکھی لکڑی کی طرح مرجھا گیا۔ اِدھر حمیدہ بی بی کی رگوں میں زندہ خون داخل ہُوا۔ اُن کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی، ایک تصویر زرد پڑ گئی دوسری میں رنگ آ گیا۔

حمیدہ بی بی چند ہی دنوں میں جھاڑ پونچھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ قربان کا خون کچھ ایسا راس آیا کہ پھر قوت آتی ہی چلی گئی۔ کیوں نہ ہو اُس کی نیک نیتی بھی تو شامل تھی۔ اپنے لہو سے یہ پود اسینچ کر وہ کتنا خوش تھا۔

اب تو نواب صاحب اور بیگم صاحبہ نے قربان کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ عزیزوں کی طرح گھر میں رکھ لیا۔ کوششیں کیں کہ نکلا ہوا خون اُس میں پھر پیدا ہو جائے لیکن دو سیر خون کا واپس آ جانا کچھ کھیل نہیں ہے قربان کی حالت خطرناک ہو گئی۔ حمیدہ بی بی نے خود اُس کی دیکھ بھال شروع کی، ماں باپ نے پھر اُنھیں اُس کے سامنے کر دیا۔ بچپنے سے لاکھوں بار تو اُس نے دیکھا تھا مستقل دیکھا تھا۔ اب کچھ دنوں سے آنکھ کا پردہ تھا۔ رہے رہے نہ رہے۔ اُس نے بھی تو جان دے کر انھیں زندگی بخشی تھی تو عمر بھر قربان نے حمیدہ بی بی کی خدمت کی تھی۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ اب قربان بستر پر لیٹا رہتا اور حمیدہ بی بی اپنی نگرانی میں اُسے دوائیں پلواتیں۔ اس کے جسم میں حرارت ٹھہر گئی تھی، یہ اُس کا ماتھا دیکھتیں نبض کی رفتار شمار کرتیں، دل کی دھڑکنیں ٹٹولتیں۔ غرضیکہ پوری توجّہ

دیتیں، اُن کے لئے قربان گور کنارے ہو رہا تھا۔ اب وہ اتنا بھی نہ کرتیں
آخر شریف خون رکھتی تھیں، احسان کا بدلا احسان ہوا کرتا ہے۔
ماں باپ نے بھی چشم پوشی کی۔ کبھی تنہائی میں تو انھیں اُسکے پاس نہیں جانے
دیا لیکن اُنکی توجہ اور خبر گیری میں کسی طرح مخل نہ ہوئے۔

پورے ایک مہینہ کی تیمارداری سے قربان اچھا ہونے لگا لیکن
اُسے جسم کا روگ غائب ہو چلا تو روح کو گھن لگنا شروع ہو گیا ایک نئی آگ
میں سُلگ رہا تھا۔ حمیدہ بی بی کی شفقت محبّت اُن کی توجہ دلسوزی رنگ
لائی۔ قربان نے اچھا ہوتے ہوئے پلٹا کھایا۔ سنبھالا لینے سے حمیدہ بی بی
نے توجہ میں کمی کر دی تھی یہ اُس کے حق میں ستم ہو گیا۔ پھر جاں بلب تھا
وہی پیاری پیاری صورت تصوّر میں آ آ کر ستاتی !!! وہی گوری کلائی
آنکھوں میں چمکا کرتی وہی سریلی آواز کانوں میں گونجتی۔ نسخوں پر حمیدہ بی بی
لکھا دکھائی دیتا ! دوا کی شیشی میں انھیں کی موہنی مورت تیرا کرتی۔

اُدھر حمیدہ بی بی بھی بالکل چین سے نہ تھیں رگوں میں قربان
کا خون رنگ لا رہا تھا ! محبّت کی دیوی ہمیشہ عجیب و غریب پارٹ کھلاتی
ہے انھیں دو دلوں کو ملاتی ہے جن میں بڑی سے بڑی خلیج حائل ہو، آگ
سلگی اور اچھی طرح سلگی ! رکاوٹوں نے تیل چھڑکا ! فرقِ مراتب نے ہوا دی
اور یہ شعلے ایسے بھڑکے کہ بجھائے نہ بجھے ۔ ۔ ۔ !!!

اُدھر خالق میاں حمیدہ بی بی کو اپنا جیتا ہوا انعام سمجھے ہوئے
تھے اور ایک حد تک حق بجانب بھی تھے اُنھوں ہی نے تو زندگی دلائی
تھی، خون قربان کا تھا تو ہوا کرے، غریب کے خون کی قیمت ہی کیا !
جب تک قربان کے جسم میں تھا پانی تھا۔ جیسے حمیدہ بی بی کی رگوں میں
بہ نکلا خون سمجھے جانے کے قابل ہو گیا !

خالق میاں حمیدہ بی بی کی چاند سی صورت پر فریفتہ تھے ہی،
پہلے سے بھی اس بیاہ کی کچھ بات چیت تھی، اب تو کچھ کہنا سننا ہی نہیں رہ
گیا تھا۔ دن تاریخ معیّن ہوئے۔ رسم رسوم ہوئیں اور شادی کی گھڑی آ
پہونچی۔ اُدھر حمیدہ بی بی نے کلیجہ پتھر کر لیا، کہاں تک برداشت کرتیں
پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہار بیزاری کرتی رہیں لیکن اس کو ان
کی شرم و حیا پر محمول کیا گیا۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہوا
جاتا ہے تو ایک دن ماں کو خلوت میں بلا کر اس نسبت سے انکار کر ہی تو
دیا۔ بس قدامت زدہ ماں کے سینے میں غصّہ اور نفرت کی آگ بھڑک
اُٹھی اور اُس کے لُوکے زبان سے نکلنے لگے۔ زہر کی پڑیا منگائی اور حمیدہ
بی بی کے سامنے پھانکنے کو تیار ہو گئیں ! باپ سے کہدیا اُنھوں نے خنجر
نکالا اور گردن پر رکھ لیا۔ لاکھ قربان نے احسان کیا تھا، پھر بھی اُس کا صلہ
یہ تھوڑی ہو سکتا تھا کہ اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی اُس کو سونپ دی جائے
ایک غریب ملازم ! زیادہ سے زیادہ مختار ! وفاداری سے شریف ہے تو
ہوا کرے ! کوئی ڈگری رکھتا ہے ؟ کچھ جائداد کا مالک ہے۔ خدا نہ کرے
اُس سے شادی ہو خاندان کی ناک کٹ جائے، سارے عالم میں رسوائی
ہو، ہو جائے ــــ ہائے سماج !

قصّہ مختصر یہ کہ حمیدہ بی بی کی محنت کا گلا گھونٹ دیا گیا وہ بھی دوستی
ناکام محبّت کو ان گنت آنسوؤں اور بے شمار ٹھنڈی سانسوں کا خراج دیکر
بیٹھ رہیں اور ایک بے زبان بکری کی طرح ماں باپ کے حکم پر بھینٹ چڑھ گئیں
خالق میاں کو بیاہ دی گئیں اور چند ہی سالوں میں بالکل "بال بچوں
والی" ہو کر رہ گئیں !

یہاں اُن کے نکاح والے دن قربان بستر نقاہت سے اُٹھا اور قہقہے
مارتا ہوا ایک سمت چلدیا ! اب بھی دہلی کی سڑکوں پر ایک پاگل اکثر قہقہے
مارتا دکھائی دیتا ہے ! اس کی کہانی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ کہتے
ہیں کہ ہر سال جب بہار اپنے پورے جوش پر آتی ہے اور اس دیوانے کی
وحشت زور کرتی ہے تو اب بھی کبھی کبھی اس کے بازو کی رگ لہو دیتی ہے !!!

عسکری طباطبائی

یہ ہے دُنیا!

(مختصر کہانیوں کا اک سلسلہ)

ایشیا، کی یہ کوشش کہ اُردو ادب میں زیادہ سے زیادہ واقعیتؔ نگاری کی روح کارفرما ہو، کوئی خاص انفرادیت یا خصوصیت نہیں رکھتی، ہاں ایشیا کو صرف اس قدر فخر ضرور حاصل ہے کہ وہ ادب کے زاویۂ نگاہ کو وسیع اور مقبول کرنے میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے رہا ہے اور چاہتا ہے کہ انسانی ذہن زندگی کی کھُلی ہوئی حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی طرف رجوع ہوجائے، ظاہر ہے کہ کسی زبان کے افسانہ نگار اس واقعیت نگاری کے فرض کو نہایت بڑے اور موثر طریقے سے ادا کرسکتے ہیں مگر عجیب بدقسمتی ہے کہ اُردو زبان کی کہانی اُس وقت تک ذہنی منافقت اور رومانی جھوٹ سے آزاد نہیں ہوسکی۔ خالص رومانی افسانہ نگار اپنی اپنی جگہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت کا آغاز فلسفیانہ انداز میں نہیں ہوتا اور نہ محبت کی عمر اک "رقص شرر" سے زیادہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ محبت کبھی روحانی اور مادی مصلحتوں سے آزاد نہیں ہوتی۔ پھر بھی وہ اسی غلط اور مہمل حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ "محبت" روحانی اور آسمانی چیز ہے اس طرزِ عمل اور زاویۂ نگاہ سے ہٹ کر اگر افسانہ نگار زندگی پر گہری اور ناقدانہ نظریں ڈالے تو ہر لمحہ کہانی اور ہر سانس افسانہ ہے۔ انھیں خیالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موجودہ اشاعت سے "یہ ہے دنیا" کے عنوان کے ماتحت ایسے افسانوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جن میں "خیالی تصویروں" کے بجائے "عملی نقوش" زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اور جو انسان کی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلا افسانہ "خبطی" ہے جو سیّد فرید جعفری کا ایک کامیاب نتیجۂ فکر ہے۔ حیاتِ انسانی کے وہ معمولی واقعات جن کو آجکل کے مروّجہ اصول افسانہ نگاری کے ماتحت کسی افسانہ میں ظاہر کرنا تضیعِ اوقات کے مترادف سمجھا جاتا ہے اپنی جگہ اس قدر اہم ہوتے ہیں کہ انھیں" بنیادوں پر انسانی کردار کی عمارت تیار ہوتی ہے "خبطی" میں یہی نہیں کہ ان واقعات کی عملی حیثیت کو وضاحت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے بلکہ کردار نگاری کے سلسلے میں جو مخصوص انداز اختیار کیا گیا ہے اُس نے افسانہ کی معنوی خوبیوں میں ایک نہایت دلکش اضافہ کردیا ہے۔

دوسرا افسانہ محترمہ سُلطانہ قاضیہ کی ایک مختصر کہانی "آدمی اور کتا" ہے اور اگرچہ اس میں بھی زندگی کا ایک معمولی منظر پیش کیا گیا ہے لیکن جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ ایک مستقل دعوتِ غور و فکر ہے۔ میں اپنے تمام افسانہ نگار دوستوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس عنوان پر کہانیاں لکھ کر اس فرض کو ادا کریں جو شاید بحیثیت افسانہ نگار اُن پر عائد ہوتا ہے۔

ساغر

خبطی!؟

پہلی تاریخ کی شام کو جب مِل سے بوڑھا منیجر نکلا اُس کے کوٹ کے اندر کی جیب میں دس دس روپیہ کے بیس نوٹ تھے۔ بوڑھاپا ضرور جھول رہا تھا۔ مگر قدم اتنی تیزی سے اُٹھ رہے تھے کہ جوانی کی ترنگ کا دھوکا ہوتا تھا۔ گھٹنے جھکے جھکے نہ تھے اور چلتے میں پاؤں بھی گھسٹتے نہ تھے۔ موٹی چھڑی اسی کی طرح کمرِ خمیدہ اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن حسب معمول سڑک پر چٹکی نہ بجاتی تھی دوسرا ہاتھ خلاف معمول کمر کو سہارا دینے کے بجائے پتلون کی جیب میں تھا باقی تمام باتیں روزانہ کی طرح تھیں وہی مٹیالی پھیکی پھیکی سی انگریزی دھوپ ٹوپی، کہیں کہیں سے پچکی ہوئی جیسی افیونی کی جاگی سوئی آنکھیں جس پر لال نیلی پنسل، کافی، بیئر اور چائے کے دھبے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی مشقی تختے پر مصوّر نے جلدی میں بُرش مارے ہوں۔ بوڑھے منیجر کی ٹوپی ہر پہلی تاریخ کو اس کی عمر کا اچھا خاصہ اشتہار بن جاتی تھی۔ مہینے کے دوسرے دنوں میں کوئی اس پر توجہ کرے یا نہ کرے لیکن جہاں وہ پہلی تاریخ کی شام کو مِل سے نکلا نگاہیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ اِسی طرح بند گلے کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اور ٹخنوں تک کا کہیں سے ڈھیلا کہیں سے چست پتلون بھی وہی تھا جو جاڑے گرمی برسات ہر موسم میں اس کے جسم پر ہوتا تھا۔ جوتے بھی وہی تھے، بھاری کئی تلہ کا تلہ کناروں پر پیوند، کہیں بھورا بھورا، کسی جگہ ہلکا کالا اور زیادہ حصّہ پامال گھاس کے رنگ کی مانند،

راہ چلتوں نے حسب معمول اس کی طرف نگاہیں اُٹھائیں، بعض پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے، بعض جھلک دیکھتے ہی منہ موڑ لیتے، کوئی اسے ایک روایتی چلتا ہوا بھک منگا سمجھ کر کترا بھی جاتا۔ لیکن بوڑھے منیجر کو کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوائے ساری دنیا کو حرفِ غلط خیال کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں دوسرے دنوں کی طرح آج بھی جھکی ہوئی صرف اپنے سامنے کی چند گز زمین دیکھ رہی تھیں۔ جب سڑک کا وہ حصّہ طے ہو جاتا نگاہیں اتنا ہی فاصلہ آگے ڈھونڈ لیتیں۔ کبھی کبھی وہ پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر کوٹ کی جیب تک لے جاتا اور نوٹوں کو محفوظ پا کر پھر اسی طرح پتلون کی جیب میں ڈال لیتا۔ اُسے یہ تو معلوم تھا کہ دن دہاڑے کوئی اُس کی جیب نہ کترے گا۔ پھر بھی نوٹوں کو اوپر ہی سے چھو لینے میں بھی اس کو خاص مسرت حاصل ہوتی تھی۔

اب اُسے ٹرام کا اڈّا نظر آنے لگا تھا اور چونکہ دور تک ٹرام آتی نظر نہ آتی تھی اُس کے قدم ذرا سست پڑ رہے تھے اُس نے پہلی بار چھڑی ہلانی شروع کی۔ ہلاتے ہلاتے کئی بار اُس کو آگے پیچھے گھما بھی دیا۔ زرّیں ساری پہنے ایک عورت بچّے کی انگلیاں پکڑے اس کے قریب سے گزرنے کی کوشش کر رہی تھی گھومتی ہوئی چھڑی سے یکایک ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی اُسے شک ہوا کہ بوڑھا اندھا بھی ہے۔

ٹرام کے اڈّے تک پہونچتے پہونچتے ٹرام آ ہی گئی۔ بوڑھا اندر جا کر آخری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ زرّیں ساری والی عورت اور اس کا بچّہ بھی آیا لیکن وہ دروازے سے زیادہ دُور نہ بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں ٹرام بھر گئی، گھنٹی بجی اور چل پڑی، عورت رہ رہ کر بوڑھے کو دیکھتی تھی۔ اُس کی نگاہوں سے کچھ حیرت کچھ نفرت اور کچھ ہمدردی ظاہر ہو رہی تھی اُس کی توجہ کا خاص مرکز بوڑھے کی عجوبہ ٹوپی تھی۔ کیونکہ وہ کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی۔ اُس نے ایسے عجیب غریب انسان کو اتنے قریب سے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا نہ کبھی اُس کے ابا جان

نے ایسی ٹوپی پہنی تھی، نہ کبھی اُس کے نوکر نے ایسے جوتے پہنے تھے،
اُس نے جن انسانوں کو قریب سے دیکھا تھا وہ ایسی ٹوپی اور ایسے جوتے
کبھی نہیں پہنتے۔ تین شوخ و شنگ اینگلو انڈین لڑکیاں اس کے جوتوں
ہی کو دیکھ کر زعفران زار بنی ہوئی تھیں اُن کے نشاط انگیز قہقہے ٹرام
میں نشہ پھیلا رہے تھے۔ مگر بوڑھا مہجر خیالوں کی دنیا میں آنکھیں بند کئے
بیٹھا تھا کبھی کبھی ٹرام کی حرکت سے اس کی آنکھیں اگر تھوڑی بہت کھل
جاتیں وہ مسافروں پر ایک نگاہ غلط انداز ضرور ڈال لیتا۔ لیکن اُس کا کام
ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اس قسم کے لوگوں سے کبھی واسطہ نہ رکھا
تھا۔ اور اگر اسے اس کا احساس ہو بھی جاتا کہ لوگ اس کی ٹوپی اس کے کپڑوں اور
اس کے جوتوں پہ ہنس رہے ہیں اس کے دل پر پھر بھی دھکا نہ لگتا، اُسے
مطلق پرواہ نہ تھی وہ صرف اپنے آپ سے یہ کہہ کر رہ جاتا کہ لباس وغیرہ کا
خیال فخر اور غرور کے جذبات سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے اس سے
بہتر کیف کے سامان موجود ہیں۔

نئے جوتے کبھی اس کے پاؤں میں فٹ نہ آتے، اُسے تو ان پرانے
ساتھیوں کو بھی کبھی کبھی، کسی کسی جگہ چاقو سے چھیلنا پڑتا ہے تاکہ لانبے لانبے
راستے چلنے میں آسانی ہو پھر جب کبھی پیر کی انگلیاں باہر کو جھانکنے لگتیں اور
پیوند کی ضرورت ہوتی تو یہ کام بھی خود ہی کر لیتا۔ اپنے دوستوں کے اصرار سے
اگر کبھی کسی موچی کو اس نے مرمت کے لئے کہا بھی تو اُس نے بغیر کچھ کہے
سُنے اپنی دوکان سے باہر پھینک دیا۔

ٹرام کا ٹکٹ کلکٹر کرائے کے پیسے لینے آیا تو اس نے آنکھیں کھول
دیں، پتلون کی جیب میں سے پیسے نکال کر دیئے اور اُٹھ کھڑا ہوا اس کی پہلی
منزل آ گئی تھی۔ ٹرام کے رکتے ہی مسافر اس طرح بھاگے جیسے کسی جیلخانے
سے قیدی رہا ہوں، وہ تینوں سب سے پہلے نکلیں بجائے سہمی ہوئی ہونے کے کھلی
جا رہی تھیں۔ مرد کو کونپل کی شکل میں انھوں نے ضرور دیکھا تھا کبھی پت جھڑ
کے روپ میں مرجھائی ہوئی زندگی اُن کو نظر نہ آئی تھی۔ زندگی کو جسے انھوں
نے جب بھی دیکھا تو چوڑے چکلے سینوں پر بے قرار پایا۔ آج شام کو ٹرام کی آخری
سیٹ پر خشک سورج مکھی پھول کی صورت میں دیکھ کر انھیں ہنسی مذاق کا سامان
مل گیا تھا۔ ان کے بعد گھبرائی ہوئی زرد ساری والی عورت اور اس کا بچہ
نکلا۔ اس جلدی کے باوجود بھی بچہ بوڑھے سے چھو گیا۔ عورت نے بوڑھے کو
بری طرح گھورا جس سے وہ ٹھٹک تو گیا لیکن پہلی بار مسکرا بھی دیا اتنے میں
نئے مسافروں کی یورش ہوئی اور اسے مجبوراً پھر بیٹھ جانا پڑا۔ ٹرام دوبارہ
سیٹیاں بجاتی چل کھڑی ہوئی ٹکٹ کلکٹر نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا
اور اس کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکتا بوڑھے نے پتلون
کی جیب ہلا دی، پیسے بجے، ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا اور واپس ہو گیا۔ اب نئے
مسافر بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور بوڑھے میں بھی نئی زندگی پیدا
ہو گئی تھی۔ اُس نے بھی اب نگاہوں کا جواب نگاہوں سے دینا شروع کیا۔

(۲)

ایک مچھیرن نیلے رنگ کی سوتی ساری باندھے اُس کے پاس ہی بیٹھی
تھی، اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی جو ننھی ننھی مچھلیوں سے بھری
ہوئی تھی، اُس نے ٹوکری کو سیٹ کے نیچے رکھنے کی کوشش کی بوڑھے نے
ہاتھ اُٹھا کر اُس کو روک دیا،

"جگہ کافی ہے، کسی کا کیا نقصان ہے!؟ اسی طرح رہنے دو"
عورت کے چپلی مٹی جیسے رنگ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"دادا، تمہاری بڑی مہربانی"

ٹرام اپنے اڈوں پر رکتی رکاتی چلی جا رہی تھی، بوڑھے نے کہیں جگہ
بھی اُترنے کی کوشش نہ کی، سامنے کی سیٹ پر ایک نہایت بھاری جسم کا
سٹوریا بیٹھا ہوا تھا، اونچا سکندری صافہ جس کا طرّہ سڑک پر چلنے والی
کشتی کا بادبان معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹا تنگ فراک کوٹ، مفلر، زنگار رنگ
جاپانی سلک کا جس کی گرہ پر تانبے کا چاند تارا "صاحب لوگ کے لباس
شب خوابی کے کپڑے کی چوڑی دھاری کی نہایت لاچتی قمیص، اور بڑے
پائنچوں کی طوفانی شلوار، اور خوفناک پشاوری چپل، یہ سب جواب تھا اُس
زرد ساری والی عورت کا جو ٹھیک اسی جگہ کچھ دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی،
سٹوریا نے ذرا کھنکار کر بوڑھے مہجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:-

"ائے، یہ ٹوکرا تیرا ہے ـــ!؟"

بوڑھے نے اس کی طرف دیکھا اور گردن ہلاتے ہوئے مسکرا دیا،
یہ اُس کی دوسری مسکراہٹ تھی، سٹوریا کا چہرہ تمتما گیا، اُس نے ذرا آگے
کھسک کر ایک ہاتھ زانو پہ ٹکتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے کمر کو سہارا دے کر

درشت آواز میں پوچھا :-

"پھر یہ کس کا ہے ——— !؟

ایسا معلوم ہوا جیسے ہمالہ کی چوٹی سے ایک چٹان لبستی کی طرف لُڑھک رہی ہے۔ مچھیرن گھبرا کر اپنی جگہ سُکڑ گئی۔ گویا اس کی رہی سہی ہمّت نے بھی جواب دے دیا تھا۔ دو تین سکنڈ تک کوئی نہ بولا۔ ٹرام کے انجن کی سنسناہٹ میں ایک اور سنسناہٹ شامل ہوگئی۔ سٹوریا نے اب کھڑے ہوکر ساری ٹرام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

بڑی بُری گل (بات) ہے۔ ٹرام میں بھی اب چار چوڑے (مہتر) سفر کرنے لگے، اس کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ کہ مچھیرے بدبودار سڑی ہوئی مچھلیاں لے کر ٹرام میں سفر کریں، کسی کو اعتراض ہے اگر میں اس کو باہر پھینک دوں !؟

ٹرام کی آخری سیٹ سے ایک عورت کی آواز آئی :-

"چُپ بیٹھ جاؤ"

سارے مسافروں کی نظر اُس طرف گئی، بوڑھے نے بھی دیکھا، مچھیرن نے بھی ذرا ہمّت کے ساتھ نظر اُٹھائی۔ سٹوریا نے بھی دیکھا مگر وہ بیٹھا نہیں، سپید ساری میں ایک چودھویں کا چاند تھا جو سب کے سروں پر آگیا تھا۔ اتنے ہی میں ٹرام کا اڈّا آگیا۔ سٹوریا کُود کر باہر نکل گیا، سارے مسافر اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ سٹوریا کو ڈانٹ دینے والی لڑکی نہ اُتر گئی۔ سب نے دیکھا کہ وہ نئے زمانے کی کالج کی ایک لڑکی تھی، مہندی اور چھلّوں کے بجائے نازک نازک ہاتھوں میں دو موٹی موٹی کتابیں تھیں، لیکن یہ صرف بوڑھے نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کتاب پر "درانتی اور ہتھوڑا" کی تصویر تھی، ٹرام پھر چل دی، مسافر دور تک اُس لڑکی کو کھڑکیوں سے دیکھتے رہے، وہ جوانوں کی چال سے مجمع کو چیرتی پھاڑتی چلی جا رہی تھی، یکا یک بوڑھے نے دیکھا کہ مچھیرن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہ نکلی۔ اس کی تیسری مسکراہٹ پیدا ہونے سے پہلے ہی فنا ہوگئی۔ اس نے کہا :-

"روتی کیوں ہو ——— !؟ یہ باتیں کوئی رونے کی ہیں، !؟ ان پر تو تمھیں ہنسنا چاہئے، ہنسنا، میں تو جب ہنستا ہوں، انھیں باتوں پہ ہنستا ہوں۔"

"دادا میں کیا کروں !؟ جہاں جاتی ہوں، ٹھوکریں کھاتی ہوں، زندگی بڑا عذاب ہے، ہنسنا تو ہنسنا ہم زندہ بھی کیوں رہیں" !؟

اُس نے مُنہ موڑ لیا، لیکن بوڑھے نے شفقت سے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا :-

"بیٹی ! میں جھوٹ نہیں کہتا، تمھیں ہنسنا ہی چاہئے۔ آؤ، میرے ساتھ چلو، میں تمھیں بتا دوں گا کہ رونے اور کُڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مچھیرن نے اُس کی طرف اُمیدّ اور محبّت کی نظر سے دیکھا اُس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہُوا جیسے وہ اُن بوڑھوں سے اس بوڑھے کا موازنہ کر رہی ہو، جو بڑی محبّت کے بعد اس سے مچھلیوں کا سودا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اُن کے گھر جا کر ان مچھلیوں کو چولھے پر چڑھا بھی دے۔ دوبارہ جب اس کی نگاہیں بوڑھے کی تھرّائی ہوئی آنکھوں میں جذب ہُوئیں وہ اپنے شک پر لجا کر رہ گئی۔ یہ بے چارہ اُسے صرف بوڑھا معلوم ہُوا ہے۔

"اچھا دادا جیسے تمھاری مرضی !"

ٹرام کا اڈّا جیسے ہی آیا، دونوں اُتر گئے۔ بوڑھا اُسے ایک چھوٹی سی دوکان میں لے گیا، دوکان دار بھی بوڑھا تھا البتہ کوٹ پتلون کی بجائے دھوتی اور کرتا پہنے تھا، اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اور مُٹھی باندھ کر آنے والوں کو سلام کیا، بوڑھوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں مسکرا دیے، بوڑھے منیجر نے جب مچھیرن سے بیٹھنے کو کہا تو وہ کرسی کو دیکھ کر گھبرائی، اور کھڑی رہی، بوڑھے نے سمجھا اور وہ پہلے خود ہی بیٹھ گیا۔ اور بولا :-

"تم نے چائے کبھی کاہے کو پی ہوگی !؟ ایک پیالہ چائے پیو پھر تمھیں معلوم ہوگا کہ تمھاری ہنسی تمھارے بھائی بندوں کے لئے کتنی قیمتی ہے ؟!

مچھیرن نے سر ہلا دیا، اور کھڑی رہی، بوڑھے نے اس کی طرف دیکھا اور کہا :-

"میں سمجھا، تم نے ایسی دوکانوں میں نہ کبھی کچھ پیا ہے نہ پیو گی، چلو میں تمھیں سامنے تارڑ کے باغ میں لے چلوں وہاں تمھاری تکان جس چیز سے بھی مِٹ سکے گی، میں تمھیں پلاؤں گا۔" تارڑ کے باغ میں پہونچ کر بوڑھا ایک بنچ پر بیٹھ گیا، اس مرتبہ اُسے مچھیرن سے کہنے کی حاجت نہ ہوئی وہ

خود ہی اُس کے پاس بیٹھ گئی، پاس کی جھونپڑی سے ایک آسی جیسی نیلی ساری باندھے ایک عورت نکلی۔ اُس کے ہاتھوں میں دو کُلھّڑ تھے، بوڑھا اِس بار مُسکرایا نہیں۔ لیکن مچھیرن نے مسکراتے ہوئے اپنے حصّہ کا کُلھّڑ لے لیا اور ایک گھونٹ میں سارے کا سارا پی گئی۔ بوڑھے نے اپنا کُلھّڑ صرف ہونٹوں سے لگا کر بنچ کے نیچے رکھ دیا، اور بولا :-

"اب بتاؤ، تم نے کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں؟" کُلھّڑ کو چڑھائے بغیر اُس کی آنکھوں میں نشّہ کی چمک تھی،

مچھیرن نے رُک رُک کر کہا :-

داوا کچھ بھی ہو، تم میرے لئے نئے ہو، پھر ٹھوکر ایک دو ہوں تو بتاؤں، اور میرا تو یہ تجربہ ہے کہ جب بھی بتایا پھر ٹھوکر کھائی۔

بوڑھے نے آنکھیں جُھکا کر کہا :-

بیٹی تُم مجھ پر بھروسہ کرو، میں ٹھوکر دیتا نہیں ہُوں، ٹھوکر کھاتا ہوں، لو، میرا کُلھّڑ بھی پی جاؤ، پھر شاید تم کو مجھ پر بھروسہ ہو جائے!؟

اُس نے اب کی بار بوڑھے کو پہلے جی بھر کر دیکھا، پھر ایک لفظ کہے بغیر کُلھّڑ چڑھا گئی۔ کُلھّڑ زمین پر رکھتے ہوئے بولی :-

"پچھلے برس تک میری دِشا ایسی نہ ہوئی تھی، جیسے ہی میرے ایک بچّہ پیدا ہُوا، میرے شوہر نے مجھے چھوڑ دیا، ماں باپ نے بھی اپنے دروازے بند کر دیئے۔ بات یہ تھی دادا، کہ تمھاری طرح میرا شوہر بھی بوڑھا تھا۔ میں نے کوئی خاص پرواہ نہ کی، مچھیروں میں مِل کر میرے لئے مچھلیوں سے ٹوکری بھر لینا کچھ ایسا کٹھن نہ تھا۔ مگر اِس سال جب میرے پہلے بچّہ کی موت کے بعد پندرھواڑہ میں دوسرا بچّہ پیدا ہُوا مچھیروں نے بھی میری طرف سے نگاہیں پھیر لیں، اب مجھ میں اتنی شکتی بھی نہیں رہی ہے کہ مچھلیاں خود ہی پکڑوں اور بزاروں میں سارے دن بیچتی پھروں، پھر بے حبیب کا بچّہ ماں سے زیادہ دودھ اور پانی کے لئے پھڑکتا رہتا ہے۔ اسی طرح کے ایک تاڑ کے باغ کی جھونپڑی میں مجھے جگہ مِل گئی ہے جس نے راتوں کی نیند حرام کر دی ہے، یہ ایسی ٹھوکر ہے کہ زخم بھرنے ہی کو نہیں آتا۔ یہ نہ سمجھو کہ میں جیون کو ایک بٹیا پر چلانا ہی نہیں چاہتی، ابھی کچھ دنوں ہی کی بات ہے کہ مچھیروں کے ٹھیکیدار نے اپنے گھر کا کام کاج مجھے سونپ دیا تھا۔ پر بچّے کے ہمکاروں کو وہ گھر کا اکیلا بھی برداشت نہ کر سکا اور اب میں پھر انہیں کُلھّڑوں کے ٹکڑوں پر سوتی ہوں، مجھے اپنی پرواہ نہیں، اس لئے کہ مجھے اب بھی آگ اور پانی دونوں مِل سکتے ہیں، پر بچّے کے ننھے ننھے ہاتھ آگ اور پانی دونوں کو مجھ سے دور پھینک دیں گے"

بوڑھے نے ذرا جھک کر کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا :-

"تم مِل میں نوکری کرو گی"؟

مچھیرن نے اُس کی طرف دیکھا :-

"داوا تم سچ کہتے ہو"——!؟

کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے بوڑھے نے ایک کارڈ اور پنسل نکالی اور اُس پر کچھ لکھتے ہوئے کہا :-

"تو یہ لو، کل کلیان مِل میں چلی جانا تمھیں کام مِل جائے گا، اور تمھیں پہلی مزدوری ملنے سے پہلے روٹی اور کپڑے بھی تو چاہئیں"...!؟

"دادا! تم مجھے یہ دو کاغذ کے ٹکڑے کیا دیتے ہو؟ یہ کیا ہیں"!؟

"بیٹی یہ دس دس روپیہ کے دو نوٹ ہیں، بیس روپیہ، تمھیں کوٹھری بھی تو چاہیے، مِل کے پاس ہی تمھیں کوٹھری مِل جائے گی، پر وہاں پیسے پیشگی دینے ہوں گے، مِل کا بنیا بھی پیسے لئے بنا کچھ نہ دے گا"

"دادا! تم بھی وہی بات کر رہے ہو ...."

بوڑھا اُٹھ کھڑا ہُوا، اس نے جھکتے ہوئے بھورے کالے بادلوں کی طرف دیکھا، پورب سے گھنگھور گھٹا اُٹھ رہی تھی، بغیر ایک لفظ کہے وہ لڑکھڑاتا ہُوا جیسے بہت پی لی ہے سڑک کی طرف چل دیا۔ اب اِس میں جوانوں کی سی ترنگ نہیں تھی اور اندھیرا بھی چھا گیا تھا۔ کوئی اس کی اس تبدیلی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یکایک فضا میں گھُٹن کی سی کیفیّت پیدا ہو گئی تھی، ہوا بند تھی اور شہر سے اتنی دُور بھی بے پناہ گرمی تھی۔ اُس نے اپنی چھڑی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔ اِس مرتبہ ٹرام کے اڈّے پر جو نہی وہ پہونچا، ٹرام آسے کھڑی ملی مگر وہ اس میں نہیں بیٹھا۔ آگے بڑھ کر ایک تاریک کچّی سڑک پر چل دیا دُور تک چلا گیا۔ آبادی بڑھنے لگی، دھیرے دھیرے وہ پھر گنجان بستی میں پہونچ گیا اتنی رات چڑھنے پر بھی تھوڑی دور پر کسی مِل کی چمنی سے دھواں اُٹھ رہا تھا، بوڑھے نے دُھندلے چاند، اور سانس توڑتے ہوئے تاروں کی روشنی میں دھوئیں کو دیکھا اور پھر پیچھے مُڑ کر دُور نہ نظر آنے والے تاڑ کے باغ کو دیکھا، اور پھر زیادہ جُھک جھک کر چلنا شروع کیا، سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے مکانات کی لانبی قطاریں دُور تک نظر آتی تھیں، آتنے

میلے کچیلے مکانات جو رات کے اِس بھوسے پن میں بھی اپنی غلاظت نہ
چھپا سکتے تھے، کہیں پانی کہیں کیچڑ، کہیں تُو تُو میں میں، کہیں مار پیٹ
سب دیکھتا اور سُنتا وہ آگے بڑھا چلا جارہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں
دروازوں کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے گھٹنوں پر ننھے ننھے بچوں کو لئے
ماں اور باپ کی راہ تک رہی تھیں جو اسی وقت آسکتے تھے جب امنو
کا دھواں چمنی سے نکلنا بند ہوجائے اور چمنی کی آخری سیٹی گھروں میں
چراغ جلا دے۔ رات کو بھی مچھروں کے ساتھ ساتھ مکھیاں اُس کے
کانوں پر بھنبھنا رہی تھیں، بوڑھے نے ٹوپی کو اپنی آنکھوں پر کھینچ لیا،
اور چلتا رہا، تھوڑی دور اور جاکر وہ سڑک کے اُس نشان کے
پاس رُک گیا جس سے وہ سڑک کا نام معلوم کرسکتا تھا۔ اِس سے
پہلے کہ وہ سڑک کے اُس لیمپ کی روشنی میں جس کا آدھا تیل میونسپلٹی
کے لیمپ جلانے والے ملازم کی کُپّی کی نذر ہوچکا تھا سڑک کے نام کا
آخری حرف پڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ کوڑا کرکٹ کی لاری اُس کے سر پر
آپہونچی، سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ اس کے لپیٹ میں آگیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ
بیدم سڑک پر پڑا رہا، پھر یکایک سوئی ہوئی سڑک جاگ اُٹھی، جیسے اِس
کے مکانات میں ایک جادو سا دوڑ گیا ہو، شور وغضب پھوٹ پڑا۔ لولے
لنگڑے، سبھی دوڑ پڑے، ڈرائیور اور لاری کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا،
بوڑھے نے چھڑی کی مدد سے اُٹھنے کی کوشش کی گھنی مونچھوں اور
خاکی رنگ کی شلوار پہنے ایک شخص نے بڑھ کر اُٹھنے میں بوڑھے کی امداد کی

"مجھے چوٹ نہیں لگی ہے، خان! تم گھبراؤ نہیں"۔

بوڑھے نے سہارا دینے والے سے کہا اور پھر گھبرائے ہوئے ڈرائیور
کی طرف دیکھ کر مسکرادیا۔

مایوس مجمع کا ہیجان ختم ہوگیا اور لوگ ایک ایک کرکے چلدیئے
تھوڑی دیر کے بعد وہاں مونچھوں والے آدمی اور چند معصوم بچّوں اور خود
اس کے سوائے کوئی موجود نہ رہا۔ مونچھوں والے آدمی نے کہا:۔

"بابو تم ہمارے پاس آؤ، ہمارا عورت تمھیں چائے پلائے گا۔
تم ٹھیک ہوجائے گا۔ بچّے خان کی لاٹھی کو سڑک پر بجتا دیکھ کر اپنے اپنے
گھروں کو بھاگ گئے، بوڑھا خان کے پیچھے ہولیا۔ خان کے گھر پر پہونچکر
بوڑھے کو معلوم ہوگیا کہ خان نے اُس سے کیوں ہمدردی دکھائی، خان
جس کی خاطر وہ اصل سے دوگنا سود بھوکے مل کے مزدوروں سے مہینے
کے مہینے وصول کیا کرتا تھا۔ خان کی عورت کے چہرے پر مل کی چمنی کا دھواں
صاف نظر آرہا تھا۔ خان کے ڈنڈے سے بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیٹھ
کی دوکان کا اب محافظ نہیں رہا۔ خان بے روزگار تھا اور خان کے کپڑوں
میں افلاس کی آگ سلگ رہی تھی، خان نے کہا:۔

"بابو! آخر اس جنگ کا نتیجہ کیا ہونا ہے!؟ ہم گرمیوں میں آپکے
ملک کی فوج میں کام کرتا ہوں، جاڑے شروع ہوتے ہی تمھارے دیس کو
چلا آتا ہوں، اب کی سال تمھارا دیس بھی لڑائی کر رہا ہے، روزگار نہیں ملا،
بھوکا مر رہا ہے"۔

بوڑھے نے کہا:۔

"خان! تم بُرا نہ مانو تو تمھیں چائے کی قیمت دے دوں"۔

خان نے ذرا غصّہ سے جواب دیا:۔

"بابو! تم سمجھا نہیں، ہم لڑائی سے گھبراتا نہیں، ہم لڑائی کا عادی
ہے اور ہر لڑائی کے بعد روزگار کھونے کا بھی عادی ہے! اور ہم بے روزگار بھی
اُس وقت ہوتا ہے جب لڑائیوں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے"۔

بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا:۔

"اِسی لئے تو میں تمھیں چائے کی قیمت دیتا ہوں"۔

خان کی عورت نے خان کی طرف دیکھا، خان کچھ کہتے کہتے رہ گیا، بوڑھا
اُٹھا اور خاموشی سے اُس نے طاق پر چائے کا پیالہ رکھ دیا۔ چھپا کر جیب سے کچھ نکالا
اور چائے کے پیالے کے ساتھ اسے بھی رکھ دیا، اس کے بعد وہ کچھ کہے بغیر گھر
سے نکلا اور اپنی راہ لی۔

ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں سے ہمیشہ اس کا
واسطہ رہا تھا ان میں سے ابھی تک صرف دو ہی ملے تھے، وہ اپنے ان
آدمیوں کی تلاش میں ذرا تکان محسوس کئے بغیر چلتا ہی رہا۔ اُس میں اب
پھر شگفتگی آگئی تھی، چھڑی پھر اُس نے بغل میں دبالی تھی اور ہاتھوں کو پتلون
کی جیبوں میں ڈال لیا تھا، کوئی میل دو میل چلنے پر ایک چھوٹے سے شراب
خانے کے سامنے اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان جو بیس اکیس برس کا
معلوم ہوتا تھا۔ شراب خانے کے دروازے کے سامنے رُکا جھکا، کچھ آگے

بڑھا، پھر واپس آیا، پھر جھکا، تھوڑی دیر کھڑا رہا، پھر ہاتھوں کو پتلون
کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ بوڑھے
کے قدم آپ ہی آپ رُک گئے۔ اُس نے نوجوان کی طرف خاص فکر سے
دیکھنا شروع کیا، نوجوان نظروں سے اوجھل ہونے ہی کو تھا کہ اس کے
قدم اُٹھ گئے اور اُس نے اس کا پیچھا کیا، اور تھوڑی دُور جا کر اُسے پکڑ لیا
نوجوان ایک گلی میں جا ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے آواز دی۔

"صاحبزادے ٹھہرو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں"!؟

نوجوان نے مُڑ کر دیکھا، اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا، بوڑھے نے قریب آکر
پہلی بات دہرائی تو نوجوان نے شک ظاہر کرتے ہوئے کہا:۔

مجھے ——— !؟ مجھ سے تمھارا کیا کام ہے !؟! دوسروں کے پیچھے جاؤ
میرے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔

بوڑھے کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اُس نے کہا "تم میری نگاہوں
سے نہیں چھپ سکتے تھے، جب تم شراب خانے کے دروازے پر شش و پنج
میں تھے، میں تمھارے دماغ کی کشمکش کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا"

نہایت تلخ لہجے میں نوجوان نے جواب دیا:۔

"جاؤ، جاؤ، بوڑھے میاں اپنی راہ لو، تمھارا مجھ سے تعلق!؟

بوڑھے نے نوجوان کا کوٹ پکڑتے ہوئے کہا:۔

"سُنو، ممکن ہے کہ میں تمھاری مدد کر سکوں"

کیسے !؟

نوجوان نے پھر بھی شک کے ساتھ پوچھا۔

یہ تو تمھیں کو معلوم ہو سکتا ہے۔ پریشانی تو تمھیں کو ہے۔ مجھے سچ سچ بتا دو،
پھر تمھیں اس سے کیا ——— !؟ نوجوان نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
اگر تم کسی مصیبت میں ہو تو، شاید میں تمھاری امداد کر سکوں، بوڑھے
آخری جواب کے طور پر کہا:۔

"جاؤ، جاؤ، اپنی راہ لو، تم میری کیا مدد کرو گے، میں ایسا بھولا
نہیں ہوں، بمبئی ہی میں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا، مجھے تم لوگوں کی ساری
حرکتیں معلوم ہیں"

"تھوڑا سا روپیہ تمھارا کام بنا دے گا"!؟

بوڑھے نے سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کہا۔

"روپیہ"؟ ——— چونکہ میرے پاس روپیہ نہیں ہے اسی لئے تو میں
شش و پنج میں ہوں، روپیہ ہی پیدا کرنے و چاہے جیسے بھی ہو میں گھر
سے نکلا ہوں،

یہ ہے ...."

اس نے اپنی ساری کہانی بیان کر ڈالی، ایک لڑکی نوجوان، حسین، ایک
خوش حال اور خوش پوش نوجوان، دولتمند نہ ہونے کی وجہ سے اس کا
ٹھکرایا جانا، لڑائی جھگڑا، طرح طرح سے روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا
چوری کرتے کرتے رہ جانا۔ پارک کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی میم صاحب سے
بیگ چھین کر واپس کر دینا۔ تاش، جُوا، گھوڑ دوڑ، اور اب جہاں بھی دیکھو
وہ لڑکی اسی خوش پوشاک نوجوان کے ساتھ نظر آتی ہے، اس کی طرف
نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ وغیرہ"

"تو بات یہ تھی تم شراب کا اک جام چڑھا کر سب کو بھول جانا چاہتے
تھے، گھڑی بھر کے لئے، مگر یہ تو کمزوری ہے، استقلال نہیں، میں تم میں استقلال
پیدا کر سکتا ہوں، تمھیں اک سہارا دے سکتا ہوں کہ تم میں جدوجہد کی قوت
پیدا ہو، اور پھر تمھیں اگر بھولنا ہی ہے تو گھڑی بھر کے لئے نہیں، ماضی
کے سب کھیلوں کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ"

اُس نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور عنہ کا ایک نوٹ نکال کر اُس سے کہا

"لو، ممکن ہے کہ یہ تمھاری زندگی میں اک نیا باب کھولے،...."

ابھی وہ بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ نوجوان نے جھپٹ کر نوٹ چھین لیا،
اور بولا:۔

"سیٹھ تم بڑے اچھے آدمی ہو" اس سے ضرور میری کایا پلٹ ہو
جائے گی، میں ہمیشہ بے وقوفی سے بجائے روپیہ بنانے کے کھوتا ہی رہا،
لیکن اب میں سمجھا ہوں کہ یہ نوٹ مجھے دولت کے ایک انبار پر کھڑا کر دے گا
کل کی ہونے والی گھوڑ دوڑ پر میرے محلہ کے شراب خانے میں بازی لگا کرتی
ہے، میں یہ سب کا سب "دلکشی" پر لگا دوں گا، پھر دیکھوں "دلکشی" کیسے ہاتھ
نہ آئے گی۔!؟

بوڑھے نے اس کی طرف ٹھہرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، نوجوان نے بات
جاری رکھی:۔

"سیٹھ میں تمھیں اک بات بتاؤں، تم گھوڑوں پر بازی لگاتے ہو؟

بوڑھے نے جواب دیا۔

"نہیں" اور اگر میں تمھاری جگہ ...."

نوجوان نے بات کاٹتے اور مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"لو، اب رہنے بھی دو، سیٹھ، لکچر تو دینا نہیں، میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے نہ کھوؤں گا"

اُس نے بوڑھے کے کاندھے کو زور سے تھپکتے ہوئے اک زور سے قہقہہ لگایا اور ٹرام کی طرف بھاگا۔ چلتی ہوئی ٹرام پر کود کر چڑھ گیا، اور تھوڑی ہی دیر میں ٹرام کے نظروں سے اوجھل ہو گیا؛ بوڑھے نے سڑک کی طرف حسرت سے دیکھا اُس کی ذہانت نے اُسے جواب دے دیا تھا، اس سے غلطی ہو گئی تھی، اب وہ آئندہ محتاط رہے گا۔ کام ختم ہوتے ہوتے رُک گیا۔ مگر کیا پتہ کہ یہ نوجوان بھی کسی نہ کسی طرح مستحق ہو۔ اُس نے اپنا سر ایک عجیب درد اور کرب سے ہلایا اور پھر چل دیا۔

آئندہ کئی منٹ تک وہ کھویا ہوا سا چھڑی سے سڑک پر ٹک ٹک کی آواز کرتا چلتا رہا، کئی ایسے آدمی ملے جن سے واسطہ پیدا کرنے کے لئے وہ نکلا تھا۔ ایک ماں جو اپنی بچی کے لئے دوا نہ خرید سکتی تھی، ایک بوڑھا آدمی جس کی پھلوں کی ٹوکری اسکول کے لڑکوں کی ایک ٹولی نے لوٹ لی تھی، ایک چھوکرا جس کے ہاتھوں سے بازار کا سودا کسی نے چھین لیا تھا سب کے سب مستحق ایسے ہی لوگوں سے اُس نے ہمیشہ واسطہ پیدا کیا، مگر نوجوان کا بھوت اُسے بدستور ستاتا رہا۔ بوڑھے کا روپیہ، اور گھوڑ دوڑ کی بازی، نہایت تکلیف دہ بات تھی، اُس نے کبھی اس سے پہلے اپنے فیصلے میں اتنی لغزش نہ کی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس واقعہ نے اُس کے سارے کئے پر پانی پھیر دیا، یہاں تک کہ درجنوں نئے مستحقین سے واسطہ پیدا کرنے کے بعد بھی اس کی روح کی ہیجان نہ مٹی، جوں جوں نوجوان کا خیال اُسے ستاتا وہ تکان سی محسوس کرتا؛ اور اب آسمان پر بھی کالے بادلوں کی ایک چادر بچھ گئی تھی، بادلوں کی گرج بھی سنائی دیتی تھی اور بجلی بھی چمکتی نظر آتی تھی۔

ایسا ہی کوئی لمحہ ہو گا جبکہ اُس نے کسی آدمی کو اپنا آخری نوٹ تھما دیا، اس وقت وہ اتنا تھک چکا تھا کہ ایک چلتی پھرتی سڑک پر ایک ہوٹل کی دیوار سے، لگ کر کھڑا ہو گیا، کسی نے اُسے دھکا دیا، اور منہ کے بل پاس ہی ایک خوانچہ پر گر گیا۔ خوانچہ والے نے کچھ پوچھا نہ گچھا۔ بوڑھے کی گردن ناپی، اُسے جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کی ٹوپی کے اوپر ایسا سخت گھونسہ مارا کہ بچی کچی ٹوپی بالکل اُس کی آنکھوں پر آ گئی اور اسے ایک دولات رسید کر کے سڑک پر پھینک دیا۔ راہ چلتے ہنسنے، ایک عورت نے اُس وقت بھی احتجاج میں آواز بلند کی، وہ ایک جھولی لٹکائے کسی قحط زدہ شہر کے لئے بازار میں چندہ جمع کرا رہی تھی، خوانچہ والا چلاتا ہی رہا "میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ میرے خوانچہ پر جان بوجھ کر گرا؛ میرے لئے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، بڑا ہیٹ لگائے پھرتا ہے"۔

بوڑھا کراہتا ہوا اُٹھا، اب وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اس کی زبان سے بات تک بھی نہیں نکلتی تھی، قہقہوں کی گونج میں وہ آگے چل دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور وہ خود کیچڑ میں لت پت تھا، اس کی بیچاری دھوپ ٹوپی کی کوئی شکل ہی نہ رہ گئی تھی، اس سارے مجمع میں کسی کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ بوڑھے سے واسطہ پیدا کرنا چاہیئے۔ وہ اب ٹرام کے اڈے کی طرف بڑھا، اس سے قبل پہلی تاریخ کی کسی شام کو اُسے ایسی خستگی نہ ہوئی تھی، مگر اب بھی غیر مستحق نوجوان سے واسطہ پیدا کرنے کا ملال ہو رہا تھا۔

الف

آخر وہ ٹرام کے اڈے پر پہونچ گیا، اُسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا ٹرام کے آتے ہی وہ اس پر سب سے پہلے چڑھا۔ لیکن اس مرتبہ آخری سیٹ پر نہیں بیٹھا۔ بلکہ دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ٹرام حسب معمول مسافروں کو بھر کر چل کھڑی ہوئی۔

"اپنے اپنے کرائے نکالو"

ٹکٹ کلکٹر نے آواز لگائی۔ ٹکٹ کلکٹر کے آتے آتے اُس نے اپنی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں، ایک پیسہ نہ ملا۔ ٹکٹ کلکٹر کے پہونچنے پر بھی وہ اپنی جیبوں ہی سے جھگڑ رہا تھا، آخر اُسے کہنا پڑا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں"

ٹکٹ کلکٹر نے بٹن دبایا، گھنٹی بجی، اور ٹرام یکایک رُک گئی،

"نکل جا بے" اور تو نے اپنی ٹوپی ہی کیوں نہ بیچ لی، صاحب بنے ٹوپی تو لے لی، پیسہ نہ لیا، بڑا چلا ہے کوٹ پتلون پہن کر بغیر پیسے کے ٹرام پر سفر کرنے، جا، نکل جلدی سے نکل، ورنہ بلاتا ہوں پولس کو"

ایشیا۔

بوڑھا پھر سڑک پر چل رہا تھا۔ مگر وہ چلتے چلتے بھی اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ وہ بالکل خالی ہو چکی تھیں، پہلی ٹرام کے سفر، تاڑی خانے کے بل، خان کی چائے کی قیمت، اور مستحقین کو دس دس اور بیس بیس کے نوٹوں کی بارش ایک ایک کر کے سارا حساب اس کی سمجھ میں آ گیا، مگر اس نے پھر سوچنا شروع کیا، دس روپیہ پھر بھی اس کے پاس ہونے چاہئیں تھے یہ سوچتے ہی نوجوان کا چہرہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ پاس سے لکڑی کی گاڑی پر ایک انسانی ڈھانچے کو کھینچتے ہوئے ایک بوڑھا گزر گیا اس کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو آ گئے، اس نے جھنجلا کر اپنے کوٹ کی جیب پھاڑ دی، سمندر سے سرد ہوا کا جھونکا سڑکوں پر نکلا تھا۔ مد کی خموشی دور ہو گئی تھی۔ فضا میں جزر پیدا ہو گیا تھا۔ بوڑھے کو اب سردی معلوم ہونے لگی، وہ تھوڑی دیر میں ٹھٹھرنے لگا، بھوک بھی اب اُسے ستا رہی تھی، صبح بل کو جاتے ہوئے بھی اس نے کچھ نہ کھایا تھا، اس لئے کہ ہر مہینے کی پہلی کو وہ برت رکھا کرتا تھا اور وہ اتنا تھک گیا تھا کہ قدم مشکل سے اٹھتے تھے، پھر اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، اس نے سوچا کہ دوسری ترکیبوں سے کام لے۔ ٹیکسی پر گھر کو جانا چاہئے وہاں اس کی بیوی، بوڑھے تھکے ہارے شوہر کو اپنے مہاجن باپ کے کنیا دان میں سے ٹیکسی کا کرایہ ضرور دے دے گی۔ ٹیکسی پر پیسہ صرف کرنے کے خیال سے اُسے تکلیف تو ضرور ہوئی، مگر اس وقت کوئی چارہ بھی نہ تھا، ابھی وہ فیصلہ بھی کرنے نہ پایا تھا کہ بارش ہونے لگی، تیز بارش، سرد ہوا، وہ فیصلہ پر مجبور ہی ہو گیا، اس نے ٹیکسی کے لئے سڑک پر نظر دوڑانی شروع کی، کوئی کھڑی ہوئی نہ ملی، ایک دو جو گذریں بھی تو اُن میں مسافر بھرے ہوئے تھے جو سگار اور لونڈر کی خوشبوئیں پیچھے چھوڑ گئے۔ مگر اس کے ہاتھ اٹھانے پر بھی نہ رُکے۔

ب

ہوا تیز ہو گئی اور پانی برسنے لگا۔ لیکن ایک گھنٹہ تک ہر طرف تلاش کرنے کے باوجود بھی ٹیکسی نہ ملی، اسی ذہنی کشمکش نے اس کے اندر ایک نئی ہمت پیدا کر دی تھی، اس لئے وہ ٹیکسی کی تلاش سے مایوس نہ ہوا۔ جب ایک گھنٹے کے بعد ایک خالی ٹیکسی آہستہ آہستہ اس کی طرف آتی دکھائی دی، تو اس نے دیوانوں کی طرح اپنی چھڑی ہلانی شروع کی، اور چیخنا شروع کیا۔ ٹیکسی اس کے قریب آ گئی پر رُکتی نہ معلوم ہوئی وہ کود کر سامنے آ گیا، ٹیکسی رُک گئی۔ اُس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

"ٹھہرو بھی، تم آخر جاؤ گے کہاں"!؟

ڈرائیور نے لہجے میں طعنے کی چبھن کے ساتھ کہا۔

بوڑھے نے لکنت زدہ زبان سے اپنا پتہ بتایا۔

"جھوٹا، شرابی کہیں کا، میں جب جانوں کہ تو مجھے میرے کرایہ کی رقم دکھا دے" ڈرائیور نے موٹر کا انجن چلاتے ہوئے کہا۔

بوڑھے نے چیخ کر ڈرائیور کو روکنے کی کوشش کی "میں سچ کہتا ہوں، وہی میرا گھر ہے، میں کلیان مِل کا منیجر ہوں، مجھے سب جانتے ہیں"

"کلیان مِل کا منیجر" ابے کتنی چڑھا لی ہے آج!؟"

ڈرائیور نے یہ کہتے ہوئے سوئچ دبایا اور موٹر روانہ ہو گئی۔ بوڑھے کی عجیب و غریب کیفیت ہوئی، حلق بیٹھتا معلوم ہوا سر پھٹنے لگا۔ چند سکنڈ تک تو ایسی کیفیت رہی کہ اُسے یہ بھی احساس نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، وہ لڑکھڑانے لگا۔ سڑک کی روشنیاں گھومتی معلوم ہوئیں، اس نے سمجھ لیا کہ اگر اُسے فوری مدد نہ ملی، اس کا دل بیٹھ جائے گا، کم از کم ایک پولیس کانسٹبل ہی اُسے مل جائے جسے وہ سمجھا سکے، زیادہ سے زیادہ گرفتار ہو جائے گا۔ بہرصورت ہر چیز موجودہ حال سے بہتر ہو گی۔ غشی کی سی حالت پیدا ہونے کے باوجود آگے بڑھا۔ اُس نے ٹرام کی لائن دیکھی، غالباً وہ اس کے سہارے کسی منزل تک پہونچ سکے۔ اس کے بعد اس نے ٹرام کی روشنی دیکھی اور ایک مجمع، برساتی پتنگے کی طرح وہ روشنی کی طرف دیوانہ وار لپکا، اُس نے فوراً ہی سوچ لیا کہ وہ پہونچتے ہی گرم اور روشن ٹرام میں گھس جائے گا، اور اُس کی آخری سیٹ پر بیٹھ جائے گا۔ جب وہ کرایہ نہ دے سکے گا، اُسے پولس کے حوالے کر دیا جائے گا، لیکن اس کی جان بچ جائے گی اُس نے طاقت کی آخری چنگاری سلگانے کی کوشش کی۔ جیسے جیسے وہ نزدیک ہوتا گیا روشنی تیز ہوتی گئی، اب وہ لوگوں کو ٹرام کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف گھر کو جانے والے بے تاب سینما سے لوٹنے والوں کا ایک ہجوم تھا جو آخری ٹرام میں گھس جانے کے لئے ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرنے سے بھی باز نہ آ رہا تھا، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے مجمع اسے دبا رہا تھا وہ آپ ہی آپ ٹرام کی طرف ڈھلکتا

جارہا تھا ، ایک گز صرف ایک گز ٹرام کو وہ چھو لینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس نے آخری ہمت کی ، سامنے کے دو چار نوجوانوں کو چیر پھاڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ، پھر گھنٹی کی آواز سنائی دی ، اور کچھ مایوس آوازیں ، ٹرام چل دی ، وہ دھیرے دھیرے شکست خوردہ واپس لوٹا۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں شیشہ کے باہر سے رنگ و بو کا سمندر دیکھنے لگیں دو نوجوان عورتیں شراب خانے کے باہر کچھ کھا رہی تھیں ، ان سے ذرا فاصلہ پر ایک نوجوان ایک خوانچہ والے سے کچھ خرید رہا تھا ، بوڑھا ان کو بھی دیکھنے لگا ، اس سے اب بالکل چلا نہ گیا وہ کھڑا ہوگیا ، نوجوان نے خوانچہ والے سے فارغ ہو کر بوڑھے کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا :۔

" صاحب ! ہم کچھ کھانا پینا مانگتا ۔۔۔ !؟

بوڑھا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا ، عورتیں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں ، " ڈرو نہیں ہم تمھیں کھا نہیں جائیں گے "

ایک لڑکی نے آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھماتے ہوئے کہا :۔

" ڈارلنگ سنبھل کر " ۔۔۔ میں تم سے کہہ رہی تھی ناکہ اتنا نہ پیو ،

نوجوان بولا :۔

" کیوں نہیں ، میں تو اور پیوں گا اور اپنے ساتھ اس بوڑھے کو بھی پلاؤں گا ، وہ ہلکی ہلکی ہنسی ہنسنے لگا ، ہنستے ہنستے اندر گیا ، پھر نکلا اور بوڑھے کو اندر کھینچ لے گیا ، بوڑھے کو جیسے ہی شراب کا پیالہ ملا ، وہ ایک سانس میں چڑھا گیا ، ایسا معلوم ہوا کہ شراب نے زندگی کے سوم رس کا کام کیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے نوجوان کو پرنام کیا اور کہا :۔

" بوڑھے کا سلام یاد رکھنا۔ کبھی مدد چاہو گے تو ان جوڑے ہوئے ہاتھوں کی یاد میں تمھاری بڑی سے بڑی امداد کروں گا۔

نوجوان بے ساختہ ہنس دیا ،

" بوڑھے تو پاگل بھی ہے کیا ۔۔۔ !؟ جا لے جا ، ان روپیوں سے اپنی زندگی بدل ، شاید تیرا کام بن جائے "

لڑکیوں کے روکتے روکتے اس نے بوڑھے کے ہاتھ میں زبردستی دس کا ایک نوٹ تھما دیا ، شراب خانے کے سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی ڈرائیور اندر شراب پی رہا تھا اسی وقت باہر نکلا۔ دیکھتے ہی بولا :۔

" ٹیکسی چاہیے سرکار ! "

سب کے سب ہنس دیئے۔ ٹیکسی والا اس شراب خانے میں بڑا مسخرہ مشہور تھا

بوڑھے نے کہا :۔

" ہاں مجھے ٹیکسی چاہیے "

اور بغیر جواب کے انتظار کے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا ، ٹیکسی اس کو لے کر روانہ ہو گئی۔ جب قہقہوں کی گونج دبی اور ٹیکسی دور چلی گئی بدمست نوجوان نے ذرا سوچتے ہوئے کہا۔

" میں تو سمجھتا ہوں یہ وہی حضرت ہیں جنھوں نے آج شام کو میری قسمت کا پانسہ پلٹا تھا۔

ایک لڑکی نے کہا :۔

" تم تو آج عجیب و غریب چیزیں دیکھ رہے ہو ، بھلا ایسے خبطی کو بھی اس طرح چھوڑ دینا چاہیے تھا "

دوسری نے کہا :۔

" یہ ہمیشہ کے بے وقوف ہیں ، سونے کی چڑیا اڑ گئی ،، آج کی رات تو پونا ہی میں جا کر گذارنی چاہیے تھی "

جیسے نوجوان کا نشہ اتر گیا ہو ، بولا :۔

" مجھے یقین ہے کہ یہ وہی آدمی تھا جس نے مجھ پر ترس کھا کر میری مدد کی تھی ، خدا کرے کہ ٹیکسی والا اسے صحیح و سلامت گھر پہونچا دے

پہلی لڑکی نے کہا :۔

" ارے جانے بھی دو ، پہونچ ہی جائے گا ، بوڑھا آگھوسٹ ! "

دوسری نے نوجوان کے چٹکی لی اور تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ، رات کے اندھیرے نے ان پر نقاب ڈال دی۔

سید فرید جعفری

آدمی اور "کُتّا"

"نیچے چلو" ——— "ہٹو بچو" ——— بچو جناب!

گرمی کا زمانہ تھا، چلچلاتی ہوئی دھوپ انسانی دماغوں کو ہانڈی کی طرح پکائے دے رہی تھی ———!

اس کی کمزور آواز کانپ رہی تھی، اس کی سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح تیز چل رہی تھی، اس کے سینے پر پسینہ پھوٹ کر ثابت و قائم ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا چمکدار تانبے کے تھے پر تیل کی مالش کر دی گئی ہو، گرمی میں دوڑنے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

"تیز چلو، تیز، ہمیں جلسے میں ٹھیک وقت پر پہونچنا ہے۔ مرو، تیز چلو" ——— ٹھہرو، ہم دوسری رکشا لیتے ہیں۔

نہیں، نہیں، بابو جی میں تیز چلتا ہوں، بابو جی گستہ مت ہو!؟

وہ بھاگنے لگا، اُس کی سانس اور بھی پھول گئی، وہ دوڑتے دوڑتے نڈھال ہو چکا تھا، یکایک موڑ آیا وہ ہانپتے ہوئے جانور کی طرح مڑا سامنے سے ایک تانگہ آگیا، اُس نے ایک طرف بچنے کی کوشش کی، مگر ناکام، اُس کے فاقہ زدہ بدن میں جان نہ تھی، بھوک کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اس کے کمزور ہاتھ رکشا کو نہ سنبھال سکے ———!؟

(۲)

ہسپتال کے برآمدے میں وہ لہولہان بے ہوش پڑا تھا اس کے سر سے خون کی گنگا بہ رہی تھی۔ اسسٹنٹ سرجن کو خبر کی جا چکی تھی، ایک آدمی کا خون بہ رہا ہے اور وہ مرنے کے قریب ہے، ڈاکٹر فوراً باہر آیا، شاید اس کو گمان تھا کہ کوئی "باعزت" امیر آدمی ہوگا، متوسط، غریب، نوجوان اور بوڑھے آدمیوں کی بھیڑ نے اُس کے گمان کو تقویت بخشی تھی، اس بھیڑ کے شور و غل ہی نے تو اُس کو باہر کھینچ لیا تھا، لیکن میلے اور کھدر کے بدبودار چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی جراحت کو دیکھ کر وہ جھجکا اور ایک سرسری نظر ڈال کر اُس نے زخمی مریض کی مرہم پٹی کرنے کے اور کمرے میں بیڑ ے جانے کے لئے کمپاونڈر کو حکم دیا، وہ مریض کے خون میں تر بتر چیتھڑوں پر کچھ رحم اور کچھ حقارت سے ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اپنے کمرے میں جانا ہی چاہتا تھا کہ ایک شاندار چمکتی ہوئی موٹر آکر رکی اور ڈرائیور نے سرعت سے اُتر کر ڈاکٹر کو کمشنر کی میم صاحبہ کی آنے کی خبر دی، ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا، اور ایک بدحواسی کے ساتھ وہ موٹر کی طرف دوڑا، اُس نے اپنی ٹوپی کو ادب کے ساتھ حرکت دی، اور ایک خشک بدحواس مسکراہٹ کے ساتھ جس میں غلامی کی تھرتھراہٹ اس کے دل کے اضطراب کا پتہ دے رہی تھی، میم صاحبہ کو سلام کیا۔ کمشنر کی بیوی موٹر سے اُتری۔ چہرے پر پریشانی کے آثار تھے، اور ہاتھوں میں ایک خوبصورت کُتّا!؟

ڈاکٹر دوڑ کر اُس کے پاس پہونچا،

"ول ڈاکٹر! میرے کتے کو سخت چوٹ لگی ہے، پاؤں میں سے برابر خون نکل رہا ہے، بند ہی نہیں ہوتا، اس کی مرہم پٹی کرو۔"

"لیکن معاف کیجیے میں کتوں کا ڈاکٹر نہیں، ———!؟ اُس نے جواب دیا،

میم صاحب کا چہرہ اس جواب کو سن کر تمتما اُٹھا، آواز میں درشتی پیدا ہو گئی اور وہ بولیں:-

"یہ میں جانتی ہوں کہ آپ کُتّوں کے ڈاکٹر نہیں مگر انسانیت بھی کوئی چیز ہے، آپ سب سے زیادہ نزدیک تھے۔ اسی لئے میں آپ کے پاس چلی آئی، دیکھو اس کے حسین پاؤں سے خون کتنی تیزی سے بہ رہا ہے،

لرزاں قیامتیں

برپا ہیں ہر قدم پہ ہزاروں قیامتیں
دیکھو خرامِ ناز کی مُڑ کر نزاکتیں

مایوسیوں کو دے ہی گئیں درسِ آرزو
اُن کی نگاہِ شوخ کی رنگیں شرارتیں

اک جذبۂ لطیف کی، اک موجِ درد کی
ہاں دے رہی ہیں اب وہ نگاہیں شہادتیں

ہر لحظہ مجھ کو تازہ تجلّی کی آرزو
اُن کو مری نگاہ سے بچنے کی عادتیں

کیفِ تصوّرات کا اللہ رے فسوں
کرتا ہوں اُن کے سامنے اُن کی عبادتیں

اس پیکرِ لطیف میں بجلی سی بھر گیا
اُف آتشیں شباب کی رنگیں حرارتیں

وقتِ خرامِ ناز، وہ بیمِ نگاہِ ناز
لغزیدہ پائے ناز وہ لرزاں قیامتیں

عشق و وفا گنہ تو نہیں ہیں مرے خدا
کرتے ہیں میرے دوست مجھے کیوں ملامتیں

پھر میں حدودِ شوق کے نزدیک آ گیا
طے کر کے راہ یاس کی لمبی مسافتیں

۱۲۳

ایشیا

اُٹھتی نہیں نگاہ اُٹھاتا بھی ہوں جو سر — دیکھ اپنے در کے سامنے میری ارادتیں

پھر حد سے ہے سوا اثرِ نشترِ الم — یاد آ رہی ہیں دورِ گذشتہ کی راحتیں

اُن کی نگاہِ ناز جُھکی جا رہی ہے پھر — دیکھ اے نگاہِ شوق نہ کر اب شرارتیں

اے جوشِ خُونِ دل تری غیرت کو کیا ہوا — آنکھوں سے مِٹ رہی ہیں وفا کی علامتیں

ہوتی ہوئی طلوع وہ صبحِ بہارِ خلد
وہ آمدِ شباب وہ رنگیں صباحتیں

ذوقی کاندھلوی

مُہمل ہے مرے لئے نصابِ زر و سیم — حاصل ہے مجھے سلطنتِ قلبِ سلیم

رکھتی ہے نگاہوں میں جو آفاقِ جہات — میری ہستی ہے وہ رصدگاہِ عظیم

جوش ملیح آبادی

حکمتِ بندگانہ

(مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

کس دلِ بیقرار کو تو نے یہ ولولہ دیا
دینا نہ دینا ایک ہے ظرف سے جب سوا دیا

ہائے یہ روشنیٔ طمع اُف یہ بلائے رنگ و بُو
چشمِ ہوس پرست نے پھر سے جواں بنا دیا

حُسن چمک گیا تو کیا بُوئے وفا تو اُڑ گئی
اِس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول بُجھا دیا

جاگتے کو جگائے کون، ایسے کو گدگدائے کون
لیجئے آ گئی ہنسی دیکھئے وہ جگا دیا

ہائے وہ ماجرائے شب ہائے وہ صبحِ اولیں
جُھک کے سلام کیوں کیا آئینہ کیوں دکھا دیا

داورِ حشر کچھ نہ پوچھ دورِ شباب کا مزہ
شہدِ بہشت تھا مگر دستِ بخیل کا دیا

جذبۂ عاشقانہ دیکھ، حکمتِ بندگانہ دیکھ
بن کے یگانہ میں نے خود نقشِ دوئی مٹا دیا

انجمِ اختر

مدفنِ شباب

جہاں دیدنی ہے لہو کی روانی — برستی ہے جس جا مئے ارغوانی
جسے کہتے ہیں سرزمینِ محبّت — وہیں دفن ہے میری کافر جوانی

مایوسِ حیات

کسی کو غمِ عشق کا ہے سہارا — کسی کو تمنّاؤں کا آسرا ہے
مگر جس کی امیدیں سب مٹ چکی ہیں — الٰہی وہ ناشاد کیوں جی رہا ہے

لمحۂ زرّیں

وہ اس وقت یہ کہہ رہی ہے کہ اختر — تجھے اپنے دل کے سوا اور کیا دوں
اگر وقت پر حکمرانی ہو میری — تو اس لمحے کو میں ابد تک بڑھا دوں

تخلیقِ شاعر

تمنّا کی بُو ہے مرے ہر نفس میں — مرے دل میں حسرت ہی حسرت بھری ہے
یہ معلوم ہوتا ہے تخلیق میری — تمنّاؤں اور حسرتوں سے ہوئی ہے

بیزاری

بہت سہ چکا میں یہ مہلک اذیّت — یہ زہرِ ہلاہل بہت پی چکا میں
الٰہی بس اب تو مجھے موت دے دے — بہت جی چکا میں، بہت جی چکا میں

اختر انصاری

توجیہ

ھ

(سبارڈینیٹ اکاؤنٹس سروس کے امتحان میں فیل ہو کر)

کیوں مرے رُخ پہ ہیں حیرت سے نگاہیں تیری — طنز سے دوش پہ آسودہ ہیں باہیں تیری
جانتا ہوں جو ترے ذہن میں غلطاں ہے سوال — بھانپ لیتی ہے نظر میری جھجکتے ہُوئے حال
تجھ کو حیرت ہے کہ کیوں آیا ہوں میداں سے تہی — کامیابی کے گہرہائے درخشاں سے تہی

ہاں! وہی ہوں، ہے گزر جس کا ستاروں سے پرے — عرش سے عالمِ امکاں کے کناروں سے پرے
ہاں! وہ میری ہی سماعت ہے کہ ہے جس سے بپا — بے حِسی اور خموشی میں بھی اک حشرِ نوا
ہاں! وہ میرا ہی تخیّل ہے کہ ہے جس کا فسوں — کہیں موجوں کا تبسّم کہیں طوفاں کا جنوں
ہاں! وہ میرا ہی تکلّم ہے کہ ہے جس کا گداز — شمع و پروانہ کی مہکی ہوئی تاریخ کا ناز
ہاں! وہ میرے ہی معانی ہیں جو آسانی سے — آگے بڑھ جاتے ہیں کچھ برق کی تابانی سے
ہاں! وہ میرے ہی خیالات کی گہرائی ہے — جس میں مستقبلِ محکم کی توانائی ہے
ہاں! وہ میرا ہی دھڑکتا ہوا دِل ہے جس پر — تھک کے جبریل نے آرام کیا ہے اکثر
ہاں! وہ میری ہی چمکتی ہوئی پیشانی ہے — صورت اپنی جہاں خورشید نے پہچانی ہے

عدل کی راہ پہ چل یوں بھی نہ کج گامی سے — مجھ کو مت جانچ مرے کام کی ناکامی سے
بلکہ اُس کام کی نوعیّتِ مجہول کو دیکھ — ہائے اُس شاعرِ بدبخت کی تقدیر کا لیکھ
دے دیا جائے یہی کھاتہ کا خلجان جسے — آدمی سوز خرافات کا طوفان جسے
میری ناکامی مرے وصف کا خمیازہ ہے،
لذّتِ شعر ابھی سرد نہیں تازہ ہے!

عدم

ایشیا

۱۲۷!

تعمیرِ حیات

(پروفیسر احتشام حسین رضوی لکھنؤ یونیورسٹی)

بنا کے اپنے کرم کا شہید اے ساقی
یہ بے رُخی ہے کرم سے بعید اے ساقی

سمجھ میں آنے لگا ہے تری نگاہ کا راز
بڑھیگا اور ابھی ذوقِ دید اے ساقی

نگاہِ گرم کے آنسو، دُکھے دلوں کی پکار
یہ جنسِ بیش بہا بھی خرید اے ساقی

ستم اُٹھا کے جو اَب تک جیا کئے ہم لوگ
لگی ہوئی ہے کہیں تو اُمید اے ساقی

لہو حیات بنانے میں کام آجائے
فدا اسی پہ ہیں تیرے شہید اے ساقی

جہاں خیال ہے آزاد جسم و جاں آزاد
لگی ہے ایسے جہاں سے اُمید اے ساقی

تڑپ کے یاد جسے کر رہے تھے دیوانے
اب آگیا وہی وقتِ سعید اے ساقی

وہ سُرخ اُفق پہ چمکتا ہے ماہ کا خنجر
ہوئی ہے اب ترے مستوں کی عید اے ساقی

وہ دیکھ مست ترے بڑھ رہے ہیں لے کے نشاں
کوئی پیام بہ طرزِ جدید اے ساقی

ہر اک سے کہدے کہ نیچے نشاں کے آجائے
سنا دے نعرۂ هل من مزید اے ساقی

نہ فکر موت کی کر یہ جہاں بدل دیں گے
لہو میں ڈوب کے تیرے شہید اے ساقی

ہمارے قبضہ میں اب ہو گی کائناتِ عمل
وہ قفلِ غیب کی ٹوٹی کلید اے ساقی

شبِ سیاہ کی تاریک و سرد منزل سے
ہوئی ہے صبحِ درخشاں پدید اے ساقی

بھٹک رہے تھے مگر راہ پا گئے ہم لوگ — ترے کرم سے اُجالے میں آ گئے ہم لوگ

مذاقِ دہر بدل کر سما گئے دل میں — بدل کے راہ زمانے پہ چھا گئے ہم لوگ

نظر بلالے کی دہقاں میں آ گئی قوّت — خودی کا راز اُسے بھی بتا گئے ہم لوگ

جسے دبا نہ سکیں فوج و دولت و ثروت — کچھ ایسے زور کا طوفاں اُٹھا گئے ہم لوگ

کھنڈر میں ہیں مگر امن و خوشی کا سایہ ہے — جفا و ظلم کے ایواں گرا گئے ہم لوگ

ابھی اُجاڑ ہے لیکن سنوار لیں گے جب
کہے گی خلق کہ دنیا بنا گئے ہم لوگ

بدل رہے ہیں نظامِ کہن کی بنیادیں — کہیں ہنسی کی صدا ہے کہیں ہیں فریادیں

بنے گا دہر یہ فردوس جس طرح بھی بنے
کریں گے ختم فریب و ستم کی میعادیں

ریا پرستوں سے ایمان و دین چھینیں گے — کسی سے زر تو کسی سے زمین چھینیں گے

گرا کے فاقہ کشوں کے قدم پہ تاج اکدن
غریب رہنے کا دل سے یقین چھینیں گے

بگفتار اگر دُر فشاند کسے — خموشی بہ بسیار ازیں خوشتر است

خردمند خامُش بود چوں صدف — اگرچہ درونش پُر از گوہر است

ابنِ یمین

شیطان

میں اکثر سوچتا ہوں کس قدر ناداں ہے یہ دنیا

وہ جس کے نام سے موسیقیوں کا رس ٹپکتا ہے
شمیمِ جانفزا کا مخملیں دامن مہکتا ہے

وہ جس کی مسکراہٹ میں ستارے جھلملاتے ہیں
وہ جس کے عنبریں لہجے میں ساغر گنگناتے ہیں

وہ جس کی یاد میں بدمستیاں پہلو بدلتی ہیں
جوانی کی حسیں پریاں شرابی ہو کے چلتی ہیں

وہ جس کے سایۂ رحمت سے جنّت جھینپ جاتی ہے
تھکے ہارے ہوؤں کو راحتوں کی نیند آتی ہے

شریعت جس کی خوابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
حسینوں کے نقابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے

تصوّر میں کبھی جب جھوم کر آنکھیں ملاتا ہے
تو میرے ناتواں ہاتھوں سے ساغر چھوٹ جاتا ہے

گناہوں سی حسیں شے جس نے دنیا کو عطا کی ہے
ترنُّم آفریں شے جس نے دنیا کو عطا کی ہے

وہ خودداری کے دریا جسکی شریانوں سے بہتے ہیں
سمجھ سکتا نہیں میں کیوں اُسے شیطان کہتے ہیں

میں اکثر سوچتا ہوں کس قدر ناداں ہے یہ دنیا

الطاف مشہدی

نیا راگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

جلدی ڈاکٹر جلدی،

ہندوستانی ڈاکٹر پر میم صاحبہ اور وہ بھی کمشنر کی بیوی !؟ پھر لہجہ کی درشتی میں التجا کا رنگ ! ڈاکٹر خود کو مکمل انسان ثابت کرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔

"یقینی میں ایک خوبصورت کتے کو موت سے بچانے کے لئے خود اس کی مرہم پٹی کروں گا"

کمپاؤنڈر یہ سُنکر دوڑے، ادھر اُدھر ہسپتال میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، ڈاکٹر نے تیزی اور توجہ کے ساتھ کتے کی مرہم پٹی موٹر کے نرم نرم گدّوں پر کردی، اور ہاتھ دھوتے ہوئے بولے۔

"کتنا پیارا کتّا ہے" — !؟

"اوہ ڈاکٹر! میں آپ کی کتنی شکر گزار ہوں"۔

جوابی اظہارِ تشکّر کے بعد ڈاکٹر نے کہا، "جی نہیں یہ تو میرا فرض تھا"

موٹر کے پٹ ایک شاندار آواز کے ساتھ بند ہوئے اور ایک پُر وقار موسیقی کے شور میں، یہ جا، وہ جا،

اس کے جاتے ہی ڈاکٹر کو دوسرے مریضوں کا خیال آیا۔ وہ اُس کمرے میں آیا جہاں مریضوں کو مرہم پٹی کی جاتی ہے۔ میز پر وہ پھٹے پُرانے خون آلود چیتھڑوں میں پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کو دیکھا۔ اس کے خون کی گنگا کا بہاؤ اب بند ہو چکا تھا۔ اب اُس کو کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

سلطانہ قاضیہ

رُباعیات

جب دہر میں پچھلی رات ہو جاتی ہے
کچھ دیر کو کائنات سو جاتی ہے
اک "جانِ وفا" کو یاد کرتے کرتے
جانے کہاں میری رُوح کھو جاتی ہے

(*)

ہر شوقِ دلِ فگار قرباں کردوں
ہر خواہشِ جانِ زار قرباں کردوں
اُس جبر پہ جس میں تیری مرضی ہو دوست!
میں سینکڑوں اختیار قرباں کردوں

(کیف مرادآبادی)

ایشیا کو ماہانہ کرنے کی تجویز

ایشیا کو ماہانہ شائع کرنے کے خیال سے جرأت رندانہ کبھی آزاد نہیں رہی، لیکن دو باتیں ہمیشہ مانع رہیں،۔
(۱) کسی اچھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا فقدان (۲) موجودہ ادبی و علمی معیار کے قائم نہ رہنے کا خدشہ، لیکن میری کتنی خوش قسمتی ہے کہ راہ کے ان دو پتھروں میں سے میں ایک پتھر کو ہٹا دینے میں کامیاب ہوگیا ہوں، ایک مشہور شاعر و ادیب ہاتھ بٹانے کے لئے میرٹھ تشریف لے آئے ہیں اور انھوں نے کام کرنا بھی شروع کر دیا ہے، اس نمبر کو شائع کرنے کے بعد ان کا کام محض یہ ہوگا کہ وہ ایشیا کے حلقۂ مضامین نگار کو زیادہ منظم فرمائیں اور مضامین کا اتنا ذخیرہ حاصل کرلیں کہ آسانی کے ساتھ ایشیا کو ماہانہ کر دیا جائے۔

اگر وہ اس نقشۂ عمل میں کامیاب ہوگئے تو چھ ماہ کے بعد یقیناً ایشیا کو ماہانہ کر دیا جائیگا۔ ماہنامہ کی صورت میں صفحات کی مناسب کمی کے ساتھ اسی معیارِ صورت کو باقی رکھا جائیگا، سائنٹفک معلومات اور سیاسی حصّہ کو بڑھا دیا جائیگا، ساتھ ہی نظم کے حصّہ کو معیاری طور پر شدید، اور مقداری طور پر کم کر دیا جائیگا، اب سوال رہ جاتا ہے تصاویر کا۔ سو میری رائے تو ماہنامہ کی صورت میں بھی مصوّر کرنے کی نہیں ہے، البتہ آپ کی رائے لینا ضروری ہے کہ آپ روائتی تصاویر کی اشاعت کو پسند کرتے ہیں؟ اگر آپ کی رائے ہوگی تو اس مسئلہ پر ضرور غور کیا جائیگا، بہرحال ابھی دو ماہی نمبر شائع کرنے باقی ہیں اور بنیادی انتظامات بھی کرنے ہیں اس لئے میں قطعی طور پر اس کا اعلان نہیں کر رہا ہوں، صرف سرسری طور پر یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ ایشیا کو ماہانہ کرنے کی تجویز اب بہت کچھ مائل بہ ترقی ہے۔ اور اس تجویز کو زیادہ مینا بنانا آپ کے ہاتھ میں بھی ہے، اگر آپ رسالہ میں لگے ہوئے تحریک خریداری کے فارم پر توجہ دیں تو آپ بہ آسانی اُس فرض کو ادا کرسکتے ہیں جس کی ادائیگی کے بعد ہم زیادہ تیار ہوسکتے ہیں اور ایشیا کو ماہنامہ کی صورت میں لانے کا خیال زیادہ پختہ صورت پکڑ سکتا ہے۔

ساغر ——— ایشیا

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

فریبِ وعدہ

فریبِ وعدہ مُسلّم وفائے عہد محال
جو اُن کا حال یہی ہے تو وائے استقبال

ہزار دل پہ ہمیں اقتدار ہے، لیکن
وہ جانتے ہیں اداؤں کا حسنِ استعمال

اب آپ کی بھی عیادت ہی بس عیادت ہے
وہ حال آپ کے بیمار کا ہے دُور از حال

ابھی تو اور ہے مقسوم، سعیٔ لاحاصل
ابھی کہاں مجھے ناکامیوں کا اضمحلال

عتاب میں بھی کرشمے کئی کارفرما ہیں
جلال میں بھی کسی کے جھلک رہا ہے جمال

یہ خود بہ خود جو مرے ہاتھ پھیل جاتے ہیں
کسی کی خوئے کرم کر رہی ہے جذبِ سوال

میں اپنے حال کے اُس مرتبے پہ ہوں مائلؔ
جہاں نہ حسرتِ ماضی نہ فکرِ استقبال

سجدۂ عاشقانہ

جبیں بوس ہے آج ہر آستانہ
یہ کس نے کیا سجدۂ عاشقانہ

خُمارِ سحر ہے نہ دورِ شبانہ
گزرتا چلا جا رہا ہے زمانہ

یہی ہے یہی مسلکِ عاشقانہ
محبت کئے جایئے والہانہ

چمن یا قفس یہ تو تقدیر جانے
نشیمن ہے ہاں لے چلا آب و دانہ

ہیں دل کی کمزوریاں کیوں بتائیں
اُنھیں کی نگاہیں نہ ڈھونڈیں بہانہ

وہ ساقی کی آنکھوں میں مستی سی جھلکی
وہ رندوں پہ چھایا سرورِ مغانہ

خدا جانے سجدوں کو کیا ہو گیا ہے
جبیں سے تو اونچا نہیں آستانہ

اُٹھیں آندھیاں بھی گریں بجلیاں بھی
رہے گا چمن میں مرا آشیانہ

یہ اپنا بیتیں مجھ سے چھُٹ جائیں مائلؔ
وہ بیگانگی دے خدائے یگانہ

قاضی محمد مکرم صاحب مائلؔ تھانوی

قصرِ جاوداں

بہت لطیف ہے یہ مختصر جہاں اپنا
جگر نواز بھی تو، تو ہی راز داں اپنا

بہم ہوئے ہیں شناسائے یک دگر دونوں
نگاہِ ناز تری قلبِ خوں چکاں اپنا

زہے نصیب کہ تعمیر کر لیا آخر
متاعِ عشق نے اک قصرِ جاوداں اپنا

تمام دولتِ ہستی لٹا کے مانگوں گا
بہارِ حسن تری ذوقِ جاوداں اپنا

جبیں نواز ہے جلووں کی یہ فراوانی
کہاں ہے آج سرِ سنگِ آستاں اپنا

یہ عارضی ہی سہی آب و رنگِ حسن، مگر
لٹا رہی ہے خرد اُن پہ کارواں اپنا

ہیں آشنائے حوادث تو خوفِ برق ہی کیا
دکھا دکھا کے بناتے ہیں آشیاں اپنا

کبھی یہ محرمِ رنگینیٔ بہار بھی تھا
دلِ حزیں کہ ہے غم دیدۂ خزاں اپنا

شفق میں، سینۂ گل میں، جنوں کی وادی میں
بٹا ہے خونِ جگر بھی کہاں کہاں اپنا

نوازشاتِ گذشتہ کہ اب خیالی ہیں
سجا رہا ہوں پھر اُن سے میں گلستاں اپنا

طلسمِ دہر ہے کیا بس نظر بندی
نظر سے کاش اُٹھے پردۂ گراں اپنا

نہ سود ہے نہ زیاں ہے نہ رنج و راحت ہے
ہے عقل و ہوش کے پردے میں امتحاں اپنا

حبیب صدیقی

ربابِ محبت

دل و جاں پہ بجلی گرا کر نہ دیکھو
نہ دیکھو مجھے مسکرا کر نہ دیکھو

یہ بجلی ہے بجلی اسے دل نہ سمجھو
یہ فتنہ ہے فتنہ جگا کر نہ دیکھو

تمھیں کیا خبر دل کا کیا حال ہوگا
نظر سے نظر یوں ملا کر نہ دیکھو

محبت کی خودداریوں کے تصدق
مری سمت تیوری چڑھا کر نہ دیکھو

مرے دل کی دنیا نہ ہو جائے برہم
ارے یوں نگاہیں بچا کر نہ دیکھو

تمھاری بھی آنکھیں نہ ہو جائیں پُرنم
تماشا مرا تم رُلا کر نہ دیکھو

کہیں عشق بھی چاک کر دے نہ پردہ
نقاب اپنے رخ سے ہٹا کر نہ دیکھو

کہیں ہو نہ جائے خود اپنا ہی ہوکا
مجھے تم بہت پاس آ کر نہ دیکھو

کہیں زخمِ دل پھر نہ ہو جائیں تازہ
خدا کے لئے مُسکرا کر نہ دیکھو

وفا سے نہ بدلے گا اعظم تمھارا
جفاؤں سے تم آزما کر نہ دیکھو

محمد اعظم علیخاں اعظم لکھنوی

خاتمِ سلیمان

وہ کمسن ہے ایسا نہ ہو بھول پن سے
مری یاد کو اپنے دل سے بھلا دے

جواں ہو رہا ہے جنون عاشقی کا
ترے حسنِ رعنا کی چنچلی نہ کھا دے

شبِ وصل کی بے خودی کہہ رہی تھی
کہ تاروں بھری رات بستر بچھا دے

تری طبع نازک کی رنگیں لطافت
مجھے ساغرِ گل سے کوثر پلا دے

تری زلفِ مشکیں کی عنبر تسلسل
مری شامِ غم کو پیامِ بقا دے

تری کم سنی پر زمانہ ہے حیراں
مرے عشقِ بالغ نظر کو دعا دے

مرے دل کی پہنائیوں میں سما جا
اٹھا دے یہ قیدِ تعین اٹھا دے

ثاقب سلیمانی بی۔اے (جھنگ)

دو آتشہ

(سید محمد عسکری طباطبائی بی۔ اے)

عشرتکدۂ گوش ہو اور جنتِ دیدہ
اے صورتِ نادیدہ و صوتِ نشنیدہ

دل ہے کہ تڑپتا ہے جراحت کی ہوس میں
اے ناوکِ ناجستہ و تیغِ نکشیدہ

آواز دے للہ محبت کا گھٹا دم
اے غنچۂ لب بستہ و صبحِ ندمیدہ

اب ناخنِ رنگیں سے محبت کی گرہ کھول
اے دستِ حنابستہ بخونِ دل و دیدہ

بکھرائے ہوئے پھولوں کی خوشبو ہی سنگھا دے
اے بادِ چمن سوئے غریباں نوزیدہ

لبریزِ مئے حسن سے کر شیشۂ دل بھی
اے مستِ نظر خلوتِ آئینہ گزیدہ

سیلابِ تمنا میں بہا جاتا ہے کوئی
اے مستِ غزل خواں بہ لبِ نہر چمیدہ

موجِ مئے رنگیں میں ترا لوچ کہاں ہے
اے سروِ رواں، غازہ بر رخسار کشیدہ

قربان ترے جھوم کے آغوش میں آجا
بالیدہ بخود، شاخِ گلِ تازہ دمیدہ

دے اذنِ کشائش کبھی کبھی چینِ جبیں کو
اے تو کہ قلم بر خطِ تقدیر کشیدہ

آ خلوتِ خاموش میں اور دھوم مچا دے
اے چارہ گرِ خاطرِ محزون و کبیدہ

آیا کوئی آغوش میں اور آ کے گیا بھی
مانندِ تمنا کہ ز دل زود بریدہ

پھر دھوم مچاتی ہوئی گلشن میں بہار آئی
صد حیف کہ دستے بہ گریباں نرسیدہ

۱۳۴

ایشیا

کیا فائدہ کہ پاؤں کے چھالوں سے اگر چھیڑ
اے وائے بہ خارے کہ سر از دل نکشیدہ

کیا علم تجھے نشترِ مژگاں کی خلش کا
اے در دلِ تو خارِ محبّت نہ خلیدہ

مست انکھڑیوں کے کیف کی تجھکو بھی خبر ہے
اے ساقیِ میخانہ و خود مے نہ چشیدہ

اب ضبطِ غمِ عشق کی ہے لاج ترے ہاتھ
اے دست نہادہ بہ دلِ شوق تپیدہ

یہ کس کی تمنّا میں جگر خوں ہے شفق کا
ہے کس لئے صبحِ چمن جیب دریدہ؟

ہے چودھویں کا چاند کہ اُترا ہُوا چہرہ؟
فرقت کی شبِ ماہ ہے یا رنگِ پریدہ؟

جس طرح کسی طفل کو ناگن نے ڈسا ہو
لہریں یونہی لیتا ہے دلِ زلف گزیدہ

دیکھے تو کوئی عشق کی رعنائیٔ گریہ
دامن میں گل و لالہ ہیں یا اشک چکیدہ

چمکا اُفقِ دل پہ تو ہو عیدِ شہادت
یہ ماہ نما خنجرِ ابروئے خمیدہ

غربت میں کوئی ساتھ کسی کا نہیں دیتا
وحشی سے ترے رہتا ہے سایہ بھی رمیدہ

جس کا کوئی پُرساں ہے نہ منزل کوئی جس کی
صحرا کی صدا ہوں کہ پیامِ نہ رسیدہ

وحشت نے کیا چاک گریبانِ تحمّل
فریاد ہے اے یوسفِ دامن نہ دریدہ

کس وادیٔ دشوار میں لایا ہے مجھے عشق
جادہ ہے جہاں وہم سے منزل کے دویدہ

عسکری طباطبائی

مسائلِ لطیف

خرد نے وہم و گماں نام کر دیئے میرے
جنوں نے قطع سب اوہام کر دیئے میرے

چلا حریفِ لطیف مرے ساتھ ساتھ چند قدم
عنایت اُس کو بھی کچھ گام کر دیئے میرے

عجیب شے تھی مری نامآل اندیشی
کہ جس نے کام سرانجام کر دیئے میرے

تعیّنات کے اندر دیا مجازِ عمل
معاملات تہِ دام کر دیئے میرے

جہانِ قطرہ بہ دامن میں بھیج کر مجھکو
تخیّلات یم آشام کر دیئے میرے

چمک کے معنیٔ صورت پرستیٔ دل نے
خدا طراز سب اصنام کر دیئے میرے

مری سرشت کا اک دوسرا لباس ہے مے
عمل شراب کو الغام کر دیئے میرے

مرے تساہلِ فطری کو بھانپ کر بر وقت
کسی نے آپ ہی سب کام کر دیئے میرے

نگاہِ میکدہ ساماں کی ایک جنبش نے
شراب گوں سحر و شام کر دیئے میرے

نگاہِ عرش بھی پہنچی نہ تا مقامِ عدم
بلند اتنے دَر و بام کر دیئے میرے

عدم

آغازِ افسردگی

(از حسن نذیر ایم۔ اے)

پوچھ مت جانسوزئ فکرِ معاش
زیست کے ہنگامہ ہائے ناتمام
لوٹ کرلے جائیں گے اک روز میری روح کو
ضربِ ناکامی سے جانِ آرزو پامال ہے ——————— گرد و پیش اور کائنات
میرے احساسات کی دنیا میں، آہ
آہ ! ان میں موت کی تاریکیوں کا راج ہے
یہ جوانی اور یہ افلاس کی بیچارگی
اے مرے اللہ تو سرمایہ دار !
تیری ملکیت مکان و لامکاں
اور انساں کو غمِ محرومئ نانِ جویں ! ——————— مجھ کو لیکن
مجھ کو فاقہ مستیوں کا ڈر نہیں،
مجھ کو مرگ و زیست کی پروا نہیں،
اے خدا مجھ کو شکستِ آرزو کا غم نہیں،
ہاں مگر تیری خدائی تشنۂ تکمیل ہے
کیا الم انگیز ہے افسردگی احساس کی
آوارگی تخئیل کی
اور روح کی پژمردگی
زندگی کی کشمکش نے یوں کچل ڈالا مجھے
ظاہر و باطن ہوئے سب پاش پاش ——————— بجھ گیا
بجھ گیا وہ شعلۂ ذوقِ حیات
مٹ گیا احساسِ اندازِ شباب
کاش ! آغازِ جوانی کے وہ دن پھر لوٹ آئیں
جب میں اک افسانۂ موہوم تھا
زندگی اک خواب تھی،
کائنات اک جلوہ گاہ
روح ارمانوں کی سرمستی سے یکسر شعر و شوق
آج ! آج ارمانوں کی موت

آج باطن کی شبِ تاریک و تار
چھا چکی ہے حسنِ زنگارنگ موجودات پر
میری آنکھیں ہیں مگر مجھ کو نظر آتا نہیں
چاندنی کی ملگجی پریوں کا عکس
اور صنوبر کے گھنے سایوں کا رقص
وہ بسیرے کا درخت
جو نغاں کی وسعتوں میں ساکت و خاموش سا
دیوتاؤں کے حضور
محوِ اندازِ نیاز
کھو گیا ! جس طرحِ قلاش کے میں نے کی آہ
میرے کانوں سے وہ ذوقِ نغمہ یابی گم ہوا
اب میں سُن سکتا نہیں،
رات کی تاریکیوں میں ٹوٹتے تاروں کا راگ
اور دوشیزاؤں کی آواز کا وہ ارتعاش
کارفرما جس میں ہو عصمت کا احساسِ لطیف
اب میں سُن سکتا نہیں،
بانسری کے زمزمے
شورشیں طوفان کی
عشق آمادہ جوانوں کی ترنم زائیاں
ہاں مگر صوتِ فشارِ زندگی
زندگی کے نوحہ ہائے خونچکاں
طاری و ساری ہوئے وجدان پر۔
اپنی ان آنکھوں سے دیکھا میں نے مزدوروں کا خون ——— باعثِ تزئینِ غیر
موجبِ آرائشِ دیوارِ ہر عشرت کدہ
اپنے ان کانوں سے سنتا ہوں میں اکثر صبح و شام
ریشمی پردوں سے چھن کر آنے والے قہقہے ——— یا پسِ دیوار یا باہر گذرگاہوں کے پاس
ہاتھ پھیلائے ہوئے دریوزہ گر
ننھے بچے، عورتیں بیمار، اور ناکارہ مرد
سب کے سب انسانیت پر نوحہ گر !
——— ایشیا

کسوٹی

کتابوں اور رسائل پر رائے

زندگی کے کھیل | از لطیف الدین احمد اکبر آبادی
قیمت عہ ملنے کا پتہ ۔ منٹولہ، آگرہ

لطیف الدین احمد اکبر آبادی ملک کے اُن اعلیٰ انشا پردازوں میں سے ایک چوٹی کے ادیب ہیں، جو اردو ادب کے تاج و نگیں میں کوہ نور کا درجہ رکھتے ہیں۔ انکی ادبیت یونانی علم الاصنام کے ترجموں اور ابو الکلامی اسلوب تحریر کی تقلید سے شروع ہو کر خود ان کے طبع زاد اسلوب پر ختم ہوتی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ آج سے بیس برس پہلے کے افسانوی ادب اور اس کے اسلوب کے ماہرین میں شاید، احمد اکبر آبادی ایک ایسی ہی نمایاں شخصیت ہیں، جنہوں نے وقت کے تقاضوں اور زبان و اسلوب کے ایک انقلاب کو ایک مدبر کی طرح معلوم کیا اور اس کے بعد اپنے اسلوب میں نہایت تراشیدہ اور سوچا ہوا انقلاب پیدا کیا۔

یہ بارہ افسانے موضوع اور زبان کے لحاظ سے ل احمد صاحب کے قدیم اسلوب سے قطعی مختلف ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ حُسن اور پختگی ان میں نہیں پائی جاتی جو ان کے قدیم افسانوں کی روح رواں ہے اس پر بھی ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ایک خاص قسم کی کشش ان افسانوں میں نہ ہو، خاص کر "جینے کی قیمت" ان افسانوں میں فلسفیانہ وزن رکھتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ ایک خاص اسٹائل کی کامیاب نمائندگی ہوتی ہے۔

ان تمام افسانوں میں زندگی کے کٹھن پہلوؤں پر جابجا فلسفیانہ دیکھا نہ بحث پائی جاتی ہے اور نازک سے نازک مقام پر بھی لطیف صاحب نے اپنی روایتی شعریت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے، آسان ہندی الفاظ کا نہایت خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس نئی دنیا میں لطیف صاحب ایسی آزادی سے سفر کرتے ہیں گویا یہ زمین، برسوں سے ان کے پاؤں لگی ہوئی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد، سماجی پاکیزگی، معاشرتی خرابیوں کا استیصال، فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں بلند خیالی، زبان کی آسانی اور سلاست اور اصلاحی آئیڈل کے لحاظ سے یہ بارہ افسانے اردو زبان میں بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر کانگریسی حکومتیں جاری و باقی رہتیں تو وہ اس کتاب پر ضرور انعام دیتیں اور اپنے اپنے صوبوں کی لائبریریوں کیلئے اسکو منظور کرتیں۔

مگر ملک میں لطیف صاحب کے ادب سے جو گرمی دلچسپی پائی جاتی ہے، اسکو دیکھتے ہوئے اس کتاب کی کامیابی ظاہر ہے۔ ہندی زبان کے افسانہ نگاروں کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہیئے، تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ "ہندوستانی" زبان کا ایک ملا جلا کلچر اور معیار قائم کرنے میں اردو ہی بنیادی کام کرتی ہے۔ محض الفاظ کا سنسکرت میں ترجمہ کر دینے سے کوئی نئی زبان نہیں بن سکتی۔ اس کام کیلئے ایک سچا اور خالص آرٹسٹ جو کمال دکھا سکتا ہے وہ ہندی اردو کے دیوان نہیں دکھا سکتے۔ بلاشبہ لطیف صاحب ایسے آرٹسٹ ہیں اور نثر میں انھوں نے "زندگی کے کھیل" میں یہ کمال دکھا کر میرے دعوی کو صحیح کر دیا ہے۔

ایشیا

انشائے لطیف

از لطیف الدین احمد اکبر آبادی
قیمت ۱۲؍ منڈولہ آگرہ

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اردو ادب میں افسانہ نگاری کا جو معیار لطیف الدین صاحب نے پیش کیا وہ اپنی آپ ہی ایک مثال ہے، جن لوگوں نے ان کے ادب کا بالکلیہ مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا ہر افسانہ نفسیات، واردات، علم و حکمت اور لطیف ترین جمالیاتی روح کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

انشائے لطیف، پونے تین سو صفحات کی ایک نادر تصنیف ہے۔ اس میں پندرہ افسانے ہیں جن کے لفظ لفظ میں نفسیات، جوانی، حسن و عشق کے جذبات، باریک نقاشی، لطیف مصوری، اور اعلیٰ ترین ادب و شعریت کی روح کارفرما ہے۔

"یہ زندگی کے کھیل" سے بالکل مختلف چیز ہے، یا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ "زندگی کے کھیل" اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تو سلطنت ہے جس کے بلا شرکت غیرے لطیف الدین احمد صاحب حکمراں ہیں۔

انشائے لطیف کا ہر افسانہ انسانی دل و دماغ کو تخئیل کے ناپیدا کنار سمندر میں ہچکولے دیتا ہے اور اس کے مد و جزر میں روح کو وہ کیفیت و مسرت محسوس ہوتی ہے، جو دولت سے بھی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

نغمات

از لطیف الدین احمد اکبر آبادی
قیمت مجلد ۳؍ منڈولہ۔ آگرہ

یہ بھی لطیف صاحب کی تصنیف ہے۔ جس میں ان کے ۶۰ مختصر افسانے اور ادب پارے ہیں، اگر ان کے لئے یہ کہا جائے کہ یہ نثر نہیں اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے تو یقیناً بیجا نہ ہوگا۔ زبان کی سلاست، خیال کا اختصار، حسن بیان کی نزاکت و جامعیت، یہ تمام عناصر اس کتاب کی جان ہیں۔

نقوشِ سلیمانی

از سید سلیمان ندوی
مکتبۂ جامعہ دہلی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ملک کی ترقی میں اس کے علم و ادب کی ترویج و ارتقا کو بڑا دخل ہے اس لئے ہر غیر ترقی یافتہ و محکوم ملک کے رہنے والوں کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی قومی و ملکی ترقی اور سیاسی آزادی کی جد و جہد میں اپنی ملکی زبان و ادب کی ترقی کو بھی شامل رکھیں۔ اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ تمام ملک کی ایک زبان متعین کر لی جائے تاکہ ملکی علم و ادب کو رفیع و بلند کرنے میں تمام اہل ملک کی مساعی شریک کار ہو سکیں اور انسانوں کے ارتقائے دماغی و عروج ذہنی کیلئے ایک مشترک مقصود بن جائے ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اول تو ہماری ادبی عظمت اس سطح پر نہیں آئی ہے جس پر ترقی یافتہ ممالک اپنے ادب کو پہونچا چکے ہیں دوئم اس وقت تک ہمارے ملک کی مشترکہ زبان کا مسئلہ ہی زیر بحث ہے۔ "اردو" اور "ہندی" کا نزاع جس افسوسناک حد تک ہمارے برادران وطن کی توجہات کا مرجع بنا ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے یہ مسئلہ اپنی حقیقت میں جس قدر سادہ اور آسان تھا ہمارے رہنماؤں کی سیاسی مصلحتوں نے اسے اتنا ہی مشکل بنا دیا ہے۔ اگر انصاف سے غور کیا جائے تو ہندوستان میں "اردو" کی تخلیق اور اسے رواج دینے کا احساس ہی ایک ایسے وقت ہوا تھا جب کہ ملک کی دوسری تمام زبانوں نے اپنی "عدم صلاحیت" اور "تنگی دامن" کا یقین دلا دیا تھا اور ملکی زبان بننے کیلئے جس ہمہ گیری اور "وسعت الفاظ و معنی" کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے ہر مروجہ زبان کا دامن تہی پایا گیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے آج تک اردو زبان کو ترقی دینے میں ہندوستان کے رہنے والے تمام فرقوں نے حصہ لیا مگر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جب ہماری ملکی زبان کشمیر تا راس کماری رواج پا کر ہمارے علمی و ادبی کارناموں کو دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوئی تو خود ہمارے برادرانِ وطن اس کی مخالفت میں سرگرم نظر آنے لگے۔ اور زمانہ حاضرہ کی سب سے

زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کو بھی ایک مستقل فرقہ وارانہ
رنگ دیدیا گیا ہے۔ خدا جانے "ہندو دماغ" اور "مسلمان دماغ"
کے یہ نتائج فکر ہمارے ملکی حالات کو کیا بنا کر رہیں گے۔ ملک میں اور
بدبختیاں کون سی کم ہیں جو علم و ادب کی محفلوں کو بھی فرقہ وارانہ
ہنگاموں کی نذر کردیا جائے۔

قبلہ سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کئی تقریروں میں اس
مسئلہ پر وضاحت کیساتھ بحث کی ہے اور تاریخ کی روشنی میں دلائل کیساتھ
"اُردو" کو نہ صرف ہندوستان کی واحد ملکی زبان ثابت کیا ہے
بلکہ یہ بتایا ہے کہ اُردو کی ترویج میں تمام ملک کی مختلف قوموں نے
مساویانہ حصہ لیا ہے۔ سلیمان صاحب کی ذات اقدس کسی تعارف
کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کی تمام عمر ملک کی علمی و ادبی خدمات میں
صرف ہوئی ہے اس لئے آپ کی تقریریں علمی و ادبی خزینے ہیں
جن سے تمام ملک کے ادبی ذوق رکھنے والوں کو استفادہ حاصل
کرنا چاہیئے۔ "نقوشِ سلیمانی" میں اس قسم کی پانچ تقریروں کو جو
"خطبات" کی صورت میں ہیں ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے۔ آل انڈیا
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا میں جو خطبہ سید صاحب نے
ارشاد فرمایا تھا اس میں حسب ذیل مسطور خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

"حقیقی مصنف ہر زمانہ میں پریشان حال رہے
ہیں۔ پھر بھی موجودہ زمانے نے ان کو اور زیادہ
پریشان بنا رکھا ہے۔ ان شاذ و نادر ہستیوں
کیلئے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف علم کی خدمت
قرار دینا چاہتی ہیں۔ ہندوستان کی کئی ہزار میل
کی وسعت میں امن و اطمینان کا ایک گوشہ بھی ہے؟
غیر ملکی حکومت ملکی مصنفوں کی دستگیری کیلئے تیار
نہیں، کوئی قومی کتب خانہ ہماری ضرورت کے مطابق
ملک میں موجود نہیں، ان کی علمی مہانداری کیلئے
کوئی فنڈ نہیں جو ان کے دل و دماغ کو افکار سے
فارغ کرسکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مصنف ہر
قسم کی کڑیاں جھیل کر اور ہر طرح کی مصیبتیں اٹھا کر
جب اپنی تصنیف کے چند اجزا فراہم کرلیتا ہے
تو صدا دیتا ہے۔

من قماش فروش دل صد پارۂ خویشم،

لیکن افسوس کی انتہا نہیں ہوتی جب کرۂ
ارضی اور فضائے آسمانی سے ایک آواز بھی
ان جگر پاروں کی خریداری کیلئے نہیں اٹھتی۔
اگلے مصنفوں کا کام کتاب کا آخری صفحہ
لکھ کر ختم ہوجاتا تھا۔ شائقین خود اسکے نسخے ہاتھوں
ہاتھ نقل کرکے مشرق سے مغرب اور مغرب سے
مشرق پہنچا دیتے تھے۔ لیکن حال کے مصنفوں
کا کام ختم تصنیف کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کتاب
کو کسی مطبع کے حوالے کرنا۔ کاپیوں کی تصحیح، پروفوں
کی ترمیم، روپیہ کی کافی مقدار کی فراہمی، اور پھر
ریویو اور اشتہار کیلئے اخباروں کی خوشامد
اور چاپلوسی، اور ان ساری مصیبتوں کے بعد
کتاب کے نسخوں کو بغل میں دبا کر خریدار کی
تلاش میں گلی کوچہ کی آوارہ گردی کیا یہ قابلِ
رحم حالت اس انسانی طبقہ کے مناسب حال ہے
جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم اور صرف علم
کیلئے ہونا چاہیئے تھا۔"

اس طرف اہلِ ملک کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ کسی
مصنف کے ذہن و دماغ کو جب تک اس قدر اطمینان حاصل نہ ہو کہ
وہ یکسو ہوکر علمی کام کرسکے۔ اس وقت تک اس کی قوتِ تحریر اپنے
جواہر پاروں کو صحیح معنوں میں ملک کے سامنے پیش نہیں کرسکتی
یہاں ہمیں ملک کے اہلِ قلم حضرات سے بھی ایک بات عرض کرنا
ہے۔ ہمارے ملک میں ادبی کارناموں کی بے قدری کچھ تو اہلِ ملک
کی غفلت کی وجہ سے ہے اور کچھ خود اہلِ قلم حضرات کی غیر خوددارانہ
روش بھی اس کی ذمہ دار رہی ہے۔ ہم میں سے بعض اصحاب نے اپنے
معیارِ ادب کو اس قدر پست اور اپنی ذہنیتوں کو اس قدر منافقانہ

رنگ میں ملک کے سامنے پیش کیا ہے کہ اہلِ ملک ناقدری پر مجبور ہوگئے۔
شاعر اور ادیب ملک کے رہنما ہوتے ہیں ان کو اپنے تخیلات کی
بلندی کے ساتھ اپنے اعمال کی پاکیزگی و رفعت کا بھی احساس رکھنا
چاہیئے تاکہ اہلِ ملک کے دماغوں پر ان کے جو نقوش قائم ہوں وہ
انسانیت کے مرتبۂ عظیم کا پتہ دیں۔

"نقوشِ سلیمانی" میں وہ تبصرے اور مضامین بھی ہیں جو
سیّد صاحب نے مختلف شعرا وغیرہ کی تصانیف پر کئے ہیں۔ "اکبر کا
ظریفانہ کلام" "کلامِ شاد" "کلیاتِ عشق" وغیرہ شاد و عشق کی شاعری
پر تبصرے ہیں مگر "شعلۂ طور" کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ شاعری
کے متعلق نہیں ہے بلکہ صرف شاعر کے متعلق ہے لیکن جو شاعر کبھی
کسی رنگ میں آئے اور کبھی کسی رنگ میں اس کی زندگی پر کوئی
مستقل تبصرہ بھی محال ہے چنانچہ جس نے جگر کو ایک رند مست و
سرشار ازل کی صورت میں دیکھا ہو وہ اب اسے ایک "مولوی"
و "متقی" کی صورت میں دیکھ کر کیا اندازہ کریگا۔

بہرحال مکتبہ جامعہ کی کوشش بھی قابل مبارکباد ہیں کہ وہ
ملک کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں کو یکجا کر رہی ہے۔

رسولِ پاک

مکتبہ جامعہ دہلی
قیمت ۸ر

زبانِ اُردو میں پیغمبر اسلام صلعم کی حیات اقدس پر متعدد
کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر غالباً بچّوں کیلئے نہایت سلیس اور
عام فہم عبارات میں کوئی ایسی سوانح حیات شائع نہ ہوئی ہوگی
"جیسی" رسولِ پاک" ہے حیات مبارک کے تمام نمایاں واقعات اور
خصوصیات عالیہ اس کتاب میں موجود ہیں۔ مسلمان بچّوں کی دینوی
تعلیم میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

دو بھائی

از سیّد احسن صاحب ایم اے (علیگ)
مکتبہ جامعہ دہلی

یہ دو بھائیوں کی ایک مختصر کہانی ہے جو بچّوں کیلئے نہایت
سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ قصّہ دلچسپ ضرور ہے مگر نہ تو سبق
آموز ہے اور نہ واقعیت سے اسے کوئی تعلق ہے۔ بچّوں کیلئے
اگر اس قسم کی کہانیاں لکھی جائیں جو زندگی کے حقیقی واقعات سے
متعلق ہوں اور اخلاقی درس دیتی ہوں تو یہ نہ صرف ادبی کارنامہ
ہے بلکہ ایک قومی کام بھی ہے۔ "دو بھائی" بچّوں کیلئے
بالکل ایسی ہی کتاب ہے جیسی "طلسم ہوشربا" بڑوں کے لئے۔
بہرحال بچّوں کو کہانیوں کا شوق دلا کر تعلیم کیطرف راغب کرنے
کیلئے یہ کتاب اچھی ہے۔

کایا پلٹ

از محمد عبدالغفار صاحب مدہولی۔
مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔
لاہور۔ بمبئی

بچّوں کیلئے یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں جگہ جگہ بچّوں
کو صفائی۔ پابندی وقت صحت اور شوق تعلیم کا خیال دلایا گیا
ہے۔ آسان زبان میں یہ چھوٹا سا ڈرامہ اس قابل ہے کہ ہر اسکول
کے نو عمر طالب علم اسے کبھی کبھی کھیل لیا کریں۔ اس قسم کے ڈرامے
بچّوں کی تعلیمی دلچسپی کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی عام تربیت
کے سلسلہ میں بھی بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

دیہاتی گیت

از ڈاکٹر اعظم کریوی
عصمت بکڈپو دہلی قیمت ۸ر

ڈاکٹر اعظم کریوی ہندوستانی زبان کے مشہور و مقبول اور
زندہ جاوید افسانہ نگاروں میں سے ایک نمایاں افسانہ نگار ہیں
جن کی ذات پر ہندوستانی قوم کو فخر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پریم چند
کی موت نے اس تخلیق کو ختم کر دیا جو ہندوستانی قومیت، ہندی
معاشرت اور ہندوستانی تقاضوں کو پورا کرتی تھی اور افسانہ نگاری
کی دنیا بغیر پریم کے سونی ہے کوئی شک نہیں کہ پریم چند کی بے
وقت موت سخت ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مگر جس وقت تک
اعظم زندہ ہے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک اور خصوصیت ہے جو اعظم کو پریم چند سے بھی ممتاز
کرتی ہے اور وہ ہے ان کی کہانیوں کی رومانی مستی و رنگینی۔ پریم چند
کی کہانیوں میں سب کچھ پایا جاتا ہے۔ مگر شاعرانہ سرمستی نہیں پائی
جاتی۔ غالباً یہ اس لئے کہ پریم چند کی زندگی آغاز ہی سے سخت

قسم کی گذری ان کا شاعرانہ احساس نمایاں ہونے سے پہلے ہی فنا ہو گیا اور جب واسطہ پڑا تو زندگی کی کھلی ہوئی حقیقتوں سے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی فطرت میں شاعری کی گنجائش ہی نہ تھی ۔ لیکن اعظم کریوی کی زندگی اور زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات "شعریت" سے محروم نہیں ۔

خود اعظم اپنی فطرت اور دماغ کے لحاظ سے شاعر واقع ہوا ہے ۔ اس کی زندگی ۔ زندگی کے واقعات ۔ بہرہ ۔ مہرہ ۔ رنگ روپ ، چال ڈھال سب شاعرانہ ہے ۔ اور اسی لحاظ سے اسکی کہانیوں میں رومانی طور پر بھی جان پائی جاتی ہے ۔

کسی قوم اور کسی ملک کے ادب پر نظر ڈالتے ہوئے نقاد کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ آرٹسٹ ۔ شاعر یا افسانہ نگار کہاں تک اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے ۔ بعض ان میں سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ماحول ان کی قوم اور ملک ہی ہوتا ہے ۔ اور بعض کا ماحول اپنا "زمانہ" اس قسم کی "آفاقیت" ہی دراصل کسی انشا پرداز اور افسانہ نگار کی انفرادیت کہلائی جا سکتی ہے ۔

پریم چند کا ادب ماحولی ہے اور اعظم کی کہانیوں میں بھی وہی آفاقیت بدرجہ اتم اور کامل حسن کے ساتھ پائی جاتی ہے جو کسی افسانہ نگار کو صاحب طرز کا درجہ عطا فرماتی ہے ۔

جہاں اور باتیں پریم چند اور اعظم میں مشترک ہیں وہاں یہ ایک حقیقت بھی دونوں کی قسمت ہے کہ ان دونوں یادگار افسانہ نگاروں کے "ادب" کا ماحول "سامراجی تمدن اور قدیم معتقدات" ہیں ۔ گو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کہانی اسی قدر ترقی و تغیر سے ضرور ہمکنار رہوئی ہے ۔ جس قدر کہ سماج پر تغیر کے اثرات ہیں ۔

خاص کر اعظم نے تو اپنی دنیا الگ بنا لی ہے اور اسی لحاظ سے ہم اس کو خاص "انقلابی" کہہ سکتے ہیں ۔ وہ راجہ ۔ رانی ۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کا ثناخواں نہیں ہے ۔ وہ ہندوستانی دیہات اور گاؤں کی زندگی کا نمائندہ ہے ۔ اس کی تصویریں ہندی اور ان تصویروں کا رنگ خالص "آفاقی" ہے ۔ وہ ہندوستانی گاؤں کی پاک اور بھینی زندگی اور غریبوں کی بے لوث معاشرت اور اس سادہ معاشرت میں جان ڈالنے والی سچی محبت کا مصور ہے ۔

یہ مختصر کتاب "دیہاتی گیت" (ان) کہانیوں کا تو مجموعہ نہیں لیکن ہندوستانی ادب میں بیش قیمت کتاب ہے ۔ اور اعظم کی فطرت اور افسانوی تقاضوں کی ایک کڑی ہے جس کو ہمارے دوست مولانا رازق الخیری نے شائع فرما کر اردو ادب میں ایک یادگار کتاب کا اضافہ کیا ہے ۔

سوچا جائے تو یہ بھی افسانویت سے خالی نہیں اور اس ترقی یافتہ ادب کیلئے بنیادی سامان ہے جس کی طرف ہمارے فقیر مگر سرمایہ داروں کے مغرور نمائندے ادیبوں اور شاعروں نے حال ہی میں توجہ فرمائی ہے یہ اس نئے احساس کی ایک روشن اور کامیاب تصویر ہے جو ہندوستان کی سماجی اور طبقاتی آزادی کے خط و خال کو واضح کرتا ہے اور جس کی وضاحت میں ملکی آزادی کا راز پوشیدہ ہے ۔

آپ جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر جس کتاب کی یہ اہمیت ہو اس کے مصنف اور اس کے ناشر کو کس قدر مبارکباد کا مستحق قرار دیا جانا چاہیئے ـــ !؟

۱۴۵

ہمارے نئے ادب کی تاریخ یہ استحقاق ضرور ان لوگوں کو دیگی بڑی پستی ہے اگر خدمت کرنے والے ان باتوں میں الجھ کر رہ جائیں اور میں جانتا ہوں کہ اعظم اور رازق اس مرتبہ کے کام کرنے والے نہیں ہیں جن کو تعریف اور ستائش اور صلہ و معاوضہ کی کوئی پرواہ ہو

ترقی صوبجات کی تجویز

از ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار
کتابستان الہ آباد قیمت تین روپیہ

یہ کتاب ڈاکٹر صاحب موصوف نے سنہ ۱۹۳۹ء میں انگریزی میں شائع کرائی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کانگریس وزارتیں برسر اقتدار تھیں ۔ صوبہ بہار تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ ہندوؤں کے زمانہ حکومت میں مدت دراز تک یہ صوبہ مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے ۔ مہاتما گوتم بدھ جن کی مقدس تعلیمات نے ہندوستان

اور دنیا کے دوسرے بڑے بڑے ممالک میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا خود اسی صوبہ کے رہنے والے تھے ۔ اگرچہ اس صوبہ میں اب ان کے پیروؤں کی تعداد نفی کے برابر ہے ۔

ڈاکٹر سید محمود نے ترقیِ صوبجات کی تجویز کیلئے اسی صوبہ کو منتخب کیا ہے ۔ وہ خود اسی صوبہ کے رہنے والے ہیں اور جو آسانیاں اُن کو اس صوبہ کے حالات معلوم کرنے میں ہو سکتی تھی دیگر صوبجات کے متعلق نہ ہوتیں۔ اس لیے اُن کا یہ انتخاب مناسب ہے ۔ جو تجاویز ترقی انہوں نے اپنی کتاب میں تحریر فرمائی ہیں وہ بلا شبہ دیگر صوبوں کیلئے بھی کارآمد ہیں اور ہر صوبہ میں اپنے اپنے حالات کے مطابق کچھ تغیر و تبدل کے بعد ان کو اختیار کیا جا سکتا ہے ۔

اس کتاب میں نو (۹) باب ہیں اور تین سو دو (۳۰۲) صفحات ہیں ۔ بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس نے سات صفحہ کا پیش لفظ تحریر فرمایا ہے اور خود مصنف نے آٹھ صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے ۔ کتاب کے آخر میں سر ماریس ہیلیٹ گورنر صوبہ بہار ۔ مسٹر گری وزیر صنعت و حرفت صوبہ مدراس، مسٹر یاردولی سابق وزیر اعظم صوبہ آسام، مسٹر بسوا ناتھ داس سابق وزیر اعظم اوڑیسہ مسٹر سنہا سابق وزیر مال صوبہ بہار، ڈاکٹر سین ادارہ تحقیقات، رانچی، ڈاکٹر ساہا پروفیسر سائنس کلکتہ یونیورسٹی کی آراء درج ہیں ۔

گورنر صوبہ بہار کو اگرچہ ڈاکٹر صاحب سے بہت سے امور پر اختلاف ہے لیکن وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت سے ایک کارآمد مقصد حاصل ہوگا ۔ لوگوں میں ان اہم مسائل کی طرف غور کرنیکا رجحان پیدا ہو جائیگا اور عملی ترقی کی طرف قدم بڑھانے کا موقع مل جائے گا ۔

صوبہ بہار میں گنگا، گھاگرا، سون، گنڈک، باگمتی، کوسی، مکند، ترہی جوکا، نہر نرکیھا اور بہت سے چھوٹے بڑے دریا ہیں جو اس صوبہ کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی تباہ کن طغیانیاں بھی برسات کے موسم میں آتی رہتی ہیں اور بعض اوقات ہرے بھرے قطعاتِ آراضی دلدل بن جاتے ہیں اور بہت سے لوگ ملیریا کا شکار بن جاتے ہیں۔ اس صوبہ میں معدنیات بکثرت ہیں۔ کوئلہ، لوہا، تانبا اور دیگر معدنیات کے خزانے اس صوبہ کی زمین میں پوشیدہ ہیں ۔ ہر قسم کی مٹی موجود ہے جو مٹی کے برتن، شیشہ اور سیمنٹ بنانے کے کام میں آسکتی ہے ۔ کسی زمانہ میں بہت سے مرکبات بنانے میں کام آتی تھی اور اب بھی آسکتی ہے ۔ لاکھ اور دیگر پیداوار کا بھی بڑا ذخیرہ ہے جنگلات وسیع ہیں اور لکڑی کا قیمتی سامان پیدا کرنے میں مدد ہو سکتے ہیں ۔

یہاں کے لوگ سادہ مزاج اور جفاکش ہیں ۔ اپنے چھوٹے چھوٹے قطعاتِ آراضی سے محنت کے ساتھ کئی کئی فصلیں پیدا کرتے ہیں ۔ کاشتکاری کے اصول اور آبپاشی کے فوائد سے بخوبی واقف ہیں ۔ کھاد، عمدہ بیج اور مختلف فصلوں کی پیداوار کے اوقات کو بھی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں ۔ آلات کشاورزی اگرچہ قدیم اور سادہ ہیں تاہم اُن کے محدود ذرائع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی پیداوار کے لئے فی الحال غنیمت ہیں ۔ عام طبقہ کے لوگ جنہوں نے مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم نہیں پائی اور جن میں نازک مزاجی اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ایک حد تک حوصلہ مند ہیں ۔ وہ بنگال، آسام، برہما، سیام ملایا اور ہندی چین میں نجی ملازم، مزدور، مالی، ملاح اور چھوٹے چھوٹے دوکانداروں کی حیثیت میں پائے جاتے ہیں ۔ وہ کثیر تعداد میں مختلف نوآبادیوں مثل ماریشش ۔ فجی ۔ ٹری نڈاڈ ۔ برطانوی گوائنا وغیرہ میں چلے گئے ہیں ۔

باوجود ان تمام امور کے صوبہ بہار کی حالت آج کل بہت خراب ہے ۔ حالانکہ زمین زرخیز ہے اور وہاں کے لوگ تیز فہم اور جفاکش ہیں لیکن صوبہ میں خوراک کی کمی نمایاں ہے ۔ سرکاری جنگلات سے باوجود تمام ماہرین ملازمین کے کوئی قابل ذکر مالگزاری حاصل نہیں ہوتی اور اس کو خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ یہ محکمہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہے ۔ زندگی بخش دریا ایک خوفناک شے بن گئے ہیں ۔ اور اُن کے طوفان کی دسترس تک جو لوگ آباد ہیں موسم برسات میں شب و روز نذرِ اجل ہونے سے ڈرتے رہتے ہیں ۔ یہ طغیانیاں ہر سال بڑھتی جاتی ہیں تعداد میں بھی اور زور و شور میں بھی کسانوں کی آراضی اس قدر کم ہے کہ اب اُس کو جوتنا اور بونا نقصان دہ

ہوگیا ہے لیکن زراعت کا کام محض اس خیال سے بدستور جاری ہے کہ بیکاری اور بھی تباہ کن ثابت ہوگی۔ اُن کے لئے ترقی یافتہ آلات عمدہ بیج اور کھاد کی خریداری تقریباً ناممکن ہے اور طریقۂ زراعت میں فی الحال کوئی ترقی ہوتی نظر نہیں آتی۔

صنعت و حرفت یا زراعت میں جو کہیں کہیں ترقی نظر آتی ہے وہ دوسرے صوبوں کی مالی امداد کی رہین منت ہے۔ اس صوبہ کے لوگ اتنا سرمایہ نہیں رکھتے جو ان کاموں میں لگائیں۔ علاوہ مالی مشکلات کے اُن میں تجربہ، حوصلہ مندی اور ضروری معاملہ فہمی کی بھی کمی ہے۔ الغرض یہ لوگ وسیع قدرتی ذخائر کو خواہ زرعی ہوں یا معدنی یا صنعتی یا کچھ اور ترقی دے کر اپنے کام میں نہیں لا سکتے اور ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس صوبہ کی آب و ہوا بھی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ آبادی روز بروز کمزور ہو رہی ہے اور کم عمری کا شکار بنتی جا رہی ہے۔ ملیریا۔ کالا آزار اور دیگر امراض یہاں کے لوگ دوسرے مقامات سے جہاں وہ معاش حاصل کرنے کیلئے جاتے ہیں لے آتے ہیں جو مقامات کبھی اپنی عمدہ آب و ہوا کیلئے مشہور تھے بیماریوں کا مسکن ہوتے جاتے ہیں۔

لہٰذا اس صوبہ کی ترقی و بہبودی کیلئے کسی تجویز پر غور کرنا نہایت ضروری اور لا بد ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد محمود سابق وزیر تعلیم نے اس کتاب میں اس صوبہ کی ترقی کی تجاویز کا ایک خاکہ کھینچا ہے انھوں نے دیہاتی قرضہ زرعی سرمایہ، نیا طریقۂ مالگزاری نو طرزِ آبپاشی صنعت و حرفت، طریقۂ تعلیم، عام سرمایہ اور دیگر امور پر وضاحت کیساتھ لکھا ہے۔ اعداد و شمار کے حاصل کرنے میں محنتِ شاقہ اٹھائی ہے۔ ماہرین سے صلاح و مشورہ کیا ہے اور اہل الرّائے سے امداد حاصل کی ہے۔ کسی تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے مضامین کو یہاں بیان کرنے کی کوشش فضول ہے۔ جب تک کل کتاب پڑھی نہ جائے اُس وقت تک ڈاکٹر صاحب موصوف کی تجاویزِ ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جو لوگ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کے خواہاں ہیں اُن کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ ازبس ناگزیر ہے تاکہ وہ غور کر سکیں کہ اپنے اپنے صوبوں میں کس طرح ترقی کی مختلف شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہاں یہ عرض کرنے کی اور جرأت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اپنے زمانۂ وزارت میں صوبۂ بہار کیلئے ایک قانون نافذ کرایا جس سے شکر سازی کو بہت فائدہ پہنچا۔ نیز انھوں نے عوام کی تعلیم کیلئے بھی جانبدار کوشش فرمائیں۔ مثلاً واردھا تعلیمی تجویز کو تجربہ کے طور پر جاری فرمایا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس صوبہ کی ترقی کی تجاویز پر موجودہ حکومت بھی کاربند ہوگی اور کانگریسی حکومتوں کو بحال ہونیکا موقع مل گیا تو وہ ان تجاویز پر ضرور عمل پیرا ہونگی اور صوبوں کی خراب حالت کو بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھیں گی۔

(م۔ ی۔ ت)

بہاراں

از مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔ اے۔ ایم
بی۔ ای۔ ڈپٹی کمشنر
نظامی پریس لکھنؤ۔ قیمت سے

147 } موجودہ زمانہ تمام دنیا کیلئے نہایت ہنگامہ خیز اور انقلابی زمانہ ہے۔ آج دنیا کے ہر ذرّہ میں عروج و ترقی کی تمنّائیں بجلی کی طرح مضطرب ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے رہنے والے ایک دوسرے سے اپنی قوّتوں کا لوہا منوانے میں سرگرم ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا ملک ان میں سے نہیں ہے لیکن یہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں بھی ارتقا کی خواہشیں کسی نہ کسی نوعیت سے کروٹیں لے رہی ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہماری سیاسی جد و جہد بلکہ ہماری علمی و ادبی صلاحیتیں بھی بیدار ہو رہی ہیں چنانچہ یہ اسی بیداری کا نتیجہ ہے کہ ہماری شاعری آج سے چند سال پہلے جس قنوطیت اور پستی فکر کا مظاہرہ کرتی تھی۔ آج اس کو کوئی سراہنے والا بھی نظر نہیں آتا۔ انتہا یہ ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کے معیار شاعری بدل گئے۔

"بہاراں"، لکھنوی شاعری کے "انقلاب ظاہری و باطنی" کی ایک مثال ہے۔ یہ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی

غزلیات کا مجموعہ ہے جو چار سو اٹھتر صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا صاحب ہندوستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا مذاق سخن نہایت ستھرا اور ان کی شعرگوئی کا ایک خاص انداز ہے جسے قدیم و جدید اردو شاعری کا "اتصال رنگیں" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لکھنوی حضرات میں ایسے شاعروں کی تعداد کم ہے جن کے کلام میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو۔ پھر زبان کی سلاست و روانی۔ محاوروں کا مناسب استعمال۔ مضامین کی چست بندش خیالات کی جدت۔ صنائع۔ بدائع۔ غرضکہ اس قسم کے سینکڑوں "رنگین پھول" ہیں جو "بہاراں" میں نظر آتے ہیں۔

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی — ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا
اے کہ ہر نقش قدم ہے ترا فردوس بہار — کاش سوئے دل ویراں بھی گذر ہو جائے

غالب نے بھی کہا ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

لیکن آثر کے دوسرے مصرعہ نے شعر میں "امید و یاس" کا ایک عجیب عالم پیدا کر دیا ہے۔

بہار آئینہ۔ رنگ شکست آئینہ — کہاں سے روز نیا اک دل نگار آئے

ہزار رنگ ہیں، ہر رنگ میں ہے بیرنگی — ہزار راز ہیں جو وہم رازداں میں نہیں
مجھے بتاؤ یہ سودائے جستجو کیوں ہے — اگر وہ یوسف گم گشتہ کارواں میں نہیں

وہ دزدیدہ نگہ، لب پہ ہنسی آنکھوں میں شوخی — پھر دیکھ لے مجھکو اسی انداز سے کوئی

حسن کے جس انداز کا ذکر ہے وہ اک مستقل "دعوت بیخودی" ہے اس پر یہ گذارش کہ "پھر دیکھ لے مجھکو اسی انداز سے کوئی" اپنے اندر شوق کا ایک جہاں رکھتی ہے۔

عرفاں میں ڈوبا ہوا انوار سے معمور — پلٹا ہے اثر جلوہ گہ ناز سے کوئی

بیتابیوں کی نذر ہوئی انتظار میں — وہ بیخودی کہ شوق کا پردا کہیں جسے
بسمل کہ نیاز میں وہ بھی گناہ ہے — اک اضطراب شرح تمنا کہیں جسے

اضطراب کو "شرح تمنا" ظاہر کرنا کتنا اچھوتا خیال ہے۔

اس طرح خاک اڑا ذوق طلبگاری میں — ذرہ ذرہ یہ پکار اٹھے کہ صحرا ہوں میں
دیکھ لینے دے ذرا بیخودی شوق مجھے — کوئی ہے بھی مرے پہلو میں کہ تنہا ہوں میں

"بیخودی شوق" کا یہ اثر کہ انسان کو اپنے تنہا ہونے کا بھی احساس نہ رہے۔ خیال کی رفعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شعر کا کچھ ایسا انداز بیان ہے کہ جس سے آثر صاحب کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

عدم میں اور ہستی میں بس اتنا سا تفاوت ہے
کہ محو خواب جیسے خواب میں بیدار ہو جائے

"خواب میں بیدار ہو جائے" کہہ کر گویا یہ ظاہر کر دیا کہ "ہستی" خود "عدم" ہی کا ایک جزو ہے۔

اس قسم کے متعدد اشعار دیوان میں موجود ہیں جن کو طوالت کے خیال سے نقل نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں آثر صاحب قدیم "لکھنوی رنگ" میں بھی نظر آتے ہیں اور یہ غالباً اس ماحول کا اثر ہے جو لکھنؤ میں اب بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے یا ممکن ہے کہ وہ اشعار اس زمانہ کی یادگار ہوں جب ہماری شاعری نے صحیح معنوں میں کوئی انقلابی کروٹ نہیں لی تھی

یاس روتی کہیں سر پیٹتی حسرت ہوگی — عبرت دہر کا مرکز مری تربت ہوگی
نیند آنکھوں میں بھری ہوگی یا انداز خمار — تیری بیماری کی یہ نزع میں حالت ہوگی

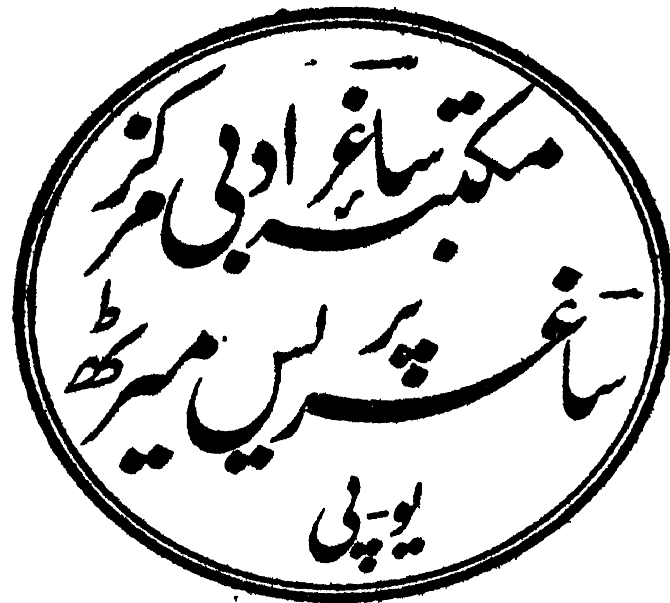
تیرے عارض کی چھوٹ کے آگے — مہر کا کب چراغ جلتا ہے
شب غم آنکھ میں نہیں آنسو — ہر پلک پر چراغ جلتا ہے

فاتحہ سے مجھے محروم نہ رکھ — مری تربت سے گذرنے والے

آپ کو مرگ اثر کا ہے ملال — قبر پر بھی گاہے ماہے جائیں گے؟

کوہ و صحرا میں جہاں بیٹھ کے روتا تھا میں — ان مقاموں سے سنا جاتا ہے دریا نکلے

"بہاراں" کی لکھائی چھپائی میں کافی احتیاط برتی گئی ہے کتابت نفیس۔ چھپائی خوشنما اور جلد خوبصورت ہے۔



Printed by Saghar Nizami at Saghar Press Kotla, Meerut.

ایشیا

ہندوستانی ادب مشرقی تہذیب کلچر اور مشرق کی انقلابی روح کا علمبردار

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی تماہی رسالہ

ایشیا

زیر سرپرستی

آنریبل ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا و وزیر تعلیمات صوبہ بہار

(بہار گورنمنٹ کی طرف سے اسکولوں کیلئے منظور شدہ)

اڈیٹر: ساغر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مجلّد ایشیا ۶ ؎
قیمت سالانہ غیر مجلّد ایشیا صہ

قیمت ایک نمبر مجلّد عہ علاوہ محصول
قیمت ایک نمبر غیر مجلّد عمہ علاوہ محصول

۱۵- مئی ۱۹۳۹ء
کو نہ بھولئے

۳۰- جون ۱۹۳۹ء
کو یاد رکھئے

ساغر کے مجموعۂ کلام

بادۂ مشرق کا نیا روپ

ساغر کوِتا

(ناگری ایڈیشن)

(مع تازہ گیتوں، غزلوں اور نئی قومی نظموں کے جو بادۂ مشرق میں نہیں چھپیں)

۱۹۳۵ء میں ادبی مرکز میرٹھ نے بادۂ مشرق کو اُردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی زبان میں شائع کرنیکا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بادہ کا اُردو ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور آج مکتبۂ ساغر میں اسکی ایک جلد بھی باقی نہیں ہے اُردو زبان میں طبع ثانی سے پہلے ادبی مرکز اس وعدہ کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اس نے پبلک سے ناگری ایڈیشن کے متعلق کیا تھا، چنانچہ ہم نہایت مسرت کے ساتھ ناگری پڑھنے والی پبلک کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ٹھیک

۳۱ مئی ۱۹۳۹ء

کو بادۂ مشرق ناگری رسم الخط میں شائع ہو جائیگا۔ تمام کتاب جوں کی توں اُردو حروف کے بجائے ناگری حروف میں چھپیگی۔ اور حاشیہ پر اُن الفاظ کے معنی آسان زبان میں لکھ دئے جائینگے جن کو سمجھنے میں کچھ دقت ہو سکتی ہے۔ قیمت کے متعلق ابھی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ لیکن جو صاحب ۳/- روپیہ بذریعہ منی آرڈر ۱۵ مئی تک بنام ساغر نظامی ارسال فرمائینگے ان کو بہر حال کتاب مع محصول تین روپیہ میں ۳۱ مئی ۱۹۳۹ء کو ارسال کر دی جائیگی۔

(۱۵ مئی ۱۹۳۹ء کے بعد رعایت نہیں دی جائیگی اس لئے کہ ۳۰ جون کو کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے)

۲

فہرست

قیمت سالانہ مجلّد ۶ ؍ غیر مجلّد ۵ ؍
قیمت ششماہی مجلّد ۳ ؍ غیر مجلّد ۳ ؍

قیمت ایک نمبر مجلّد عہ ؍
قیمت ایک نمبر غیر مجلّد عہ ؍ } علاوہ محصول

رسالۂ ایشیا (سہ ماہی) اکتوبر، نومبر و دسمبر ۱۹۳۸ء و جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۹ء
(مشترک نمبر)

اڈیٹر: ساغر نظامی

ادبی مرکز میرٹھ

غلطی

صفحہ ۹۹ پر "کاروانِ انقلاب" میں پنہاری کی جگہ "پسنہاری" ہے۔

ادبی مرکز کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

ایشیا

میرٹھ

جلد ۱ | اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء و جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۹ء | نمبر ۵ و ۶

ہندوستان اور اسکا تہذیبی مستقبل

ایک غلط تشخیص اور غلط نسخہ

عنوان بالا کے ماتحت ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ اِچ۔ ڈی (لندن) سابق پروفیسر ادبیات انگریزی، جامعۂ عثمانیہ۔ اعزازی معتمد مسلم کلچر سوسائٹی۔ حیدرآباد دکن، نائب صدر حیدرآباد اکاڈیمی نے ایک علمی مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ یہ مقالہ اُس "سلسلۂ تحقیقات تہذیبی" کا ایک نادر حصّہ ہے جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی کاوش کے بعد اور علم و بصیرت کی روشنی میں مرتب کیا ہے اس مقالہ کی محرک ہندوستان کی وہ مخصوص صورتِ حال ہے جس نے سینکڑوں قسم کے سیاسی اور جماعتی سوالات کو ایک مہیب شکل میں پیش کر رکھا ہے۔ اور باوجود متواتر کوششوں کے اس کا خاطر خواہ حل اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک حل پیش کیا ہے جو اگرچہ کوئی نیا خیال نہیں لیکن اس اعتبار سے کہ ہندوستان کی بیماری کا ایک علاج پیش کرتا ہے ضرور اس قابل ہے کہ گہری نظر سے اِس کا مطالعہ کیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے جس سوال پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ "کیا ہندوستان ایک واحد قومیت پیدا کرسکتا ہے؟"
اس سوال کا جواب دینے سے پہلے قدرتاً ان کا ذہن "قومیت" کی تعریف کی جانب منتقل ہوتا ہے۔ قومیت کی تعریفیں "اتنی کثیر او متضاد
ہیں کہ جی گھبرا اٹھتا ہے۔" اور اس لئے وہ قومیت کی بنیاد ایک "مشترک اخلاقی شعور" پر قائم کرتے ہیں "جس کا نفوذ ان سب افراد کی
زندگی میں ضروری ہے جو ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہنا چاہتے ہوں۔" آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اجزاء اتحاد کے فقدان" پر ایک
طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف نسلی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ہندوستان میں یکسانیت نہیں بلکہ تہذیبی اعتبار سے
بھی یہ ملک دو عظیم الشان تہذیبوں کا مجموعہ ہے یعنی " اسلام" اور "ہندومت"۔ اس استدلال کے بعد وہ اس منطقی نتیجہ پر پہنچتے ہیں
کہ ہندوستان کیلئے مشترکہ قومیت کا راگ الاپنا جبکہ وہ تمام عناصر جن سے قومیت کی سرشت ہوسکے مفقود ہوں ایک بڑی ہٹ دھرمی ہے۔"
اسکے بعد وہ کانگریس کے اس دعویٰ کی تغلیط کرتے ہیں کہ یہ ادارہ واحد قومیت بنانا چاہتا ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں واحد
قومیت کا پیدا ہونا بحالات موجودہ قریب قریب محال ہے۔ اس لئے "واحد قومیت کی بنیاد پر کسی پروگرام کے چالو رکھنے پر اگر اصرار کیا
گیا تو اسکے معنی یہی ہونگے کہ ہندو قومیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔" انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین جو واحد قومیت پیدا
کرنے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک "مسلمانوں کیلئے اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتا۔" ان کی رائے میں واقعات یہ بتاتے
ہیں کہ کانگریس ہندوستان میں "ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے۔" کانگریس کے پروگرام اور نصب العین کو لغو اور عبث ثابت کرنیکے لئے
ڈاکٹر صاحب نے "تہذیبی تحفظات" کے سلسلہ میں ایک قابل غور نکتہ پیش کیا ہے۔ مسلمانوں کے تحفظ کے یہ معنی ہونگے کہ شریعت اسلامیہ
کے مفادات کا بھی تحفظ کیا جائے۔" اگر ایسا ہوا اور زندگی ان سب شعبوں کو جن پر شریعت محیط ہے بلا شرکت غیرے مسلمانوں کے نرے
محفوظ رقبے قرار دیا جائے تو پھر نظم و نسق کے تمام اہم شعبوں میں جن میں عدالت، کوتوالی اور تعلیم بھی شامل ہونگے۔ مسلمانوں کیلئے متوازی
انتظامات کرنے پڑینگے اور اگر یہ انتظامات کردئے جائیں تو سوال یہ ہے کہ پھر حکومت کے پاس کیا رہ جائیگا جس کی بنیاد پر وہ سارے
ملک کیلئے متحدہ قومیت کے ڈھانچہ کو کھڑا کرسکے۔"

متحدہ قومیت کے امکانات کا بطلان کرنے کے بعد مقالہ زیرِ نظر میں ہندوستان کے مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اس "حل" کی بنیاد
دو اہم مسلمات پر رکھی گئی ہے۔ (۱) ہر قوم کی تہذیبی آزادی اور (۲) ہندوستان کا سیاسی اتحاد۔ تہذیبی آزادی کے معنی اس مقالہ میں "یہ
سمجھائے گئے ہیں کہ ہندوستان کو ایسی آزاد مملکتوں میں تقسیم کیا جائے جو یا تو خالص ہندو تہذیب کے زیر فرمان ہو یا خالص مسلم تہذیب کے"
اور ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی تشکیل ان آزاد مملکتوں کے ایک "عہدیہ" یا "وفاق" کے ذریعہ کی جائے اور ان تہذیبی منطقوں
کی تشکیل آبادی کے تبادلوں کے ذریعہ عمل میں لائی جائے یعنی تمام مسلمان سمٹ کر مسلم تہذیبی منطقوں میں آباد ہوجائیں اور اسی طرح
تمام ہندو اپنے تہذیبی منطقوں میں۔ اس تقسیم کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ نقشہ دیکھا جائے جو فاضل مفکر نے مرتب کیا ہے
قارئین کی دلچسپی اور آسانی کے لئے ہم دوسرے صفحہ پر اس نقشہ کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تہذیبی
حلقے یہ ہیں :- (۱) شمالی مغربی حلقہ (۲) شمالی مشرقی حلقہ (۳) دہلی اور لکھنؤ کا حلقہ (۴) دکن کا حلقہ (۵) مسلمانوں کے چھوٹے
منطقے جو راجپوتانہ، گجرات، مالوہ اور مغربی ہند کی دیسی ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے تجویز کئے گئے ہیں اور جو بھوپال
ٹونک، جوناگڑھ، جاورہ اور دوسری اسلامی ریاستوں پر مشتمل ہیں۔ اسکے علاوہ باقی تمام ہندوستان ہندو تہذیبی حلقوں کو دیدیا گیا۔

یہ ہے مجمل خاکہ اس اسکیم کا جو ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کے نزدیک موجودہ حالات میں ہندوستان کی سیاسی بیچینی کو دور کرسکتی ہے۔ قطع نظر اس واقعہ سے کہ یہ تعلقی اسکیم اپنے اندر کتنے قابلِ عمل امکانات رکھتی ہے ابتدا ہی میں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ اس اسکیم میں ہندوستان کے ان کروڑہا انسانوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے جو ہریجن، یا صحرائی، یا عیسائی، یہودی یا پارسی یا سکھ ناموں سے موسوم ہیں۔ یہ فروگذاشت اتفاقی نہیں بلکہ دانستہ ہے اس لئے کہ فاضل مفکر نے اسی مقالہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ "ہریجنوں کا مسئلہ ایک بالکل جداگانہ بنیاد پر قائم ہے۔ ان کا طبقہ کچھ چھوٹا نہیں ہے وہ کروڑہا کی تعداد میں سارے ملک میں منتشر ہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی پائے جاتے ہیں .... ان کی کوئی مشترکہ تہذیب بھی نہیں ہے "۔ .... انہیں اس امر کی کامل آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی جگہ ہندو قومیت یا کسی دوسری قومیت میں حاصل کرلیں"۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہریجن لوگوں کو یا تو ہندو مت اختیار کرنا ہوگا اور یا اسلام' اس لئے کہ ہندوستان صرف انہیں دو تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن بالفرض اگر ہریجن عیسوی مذہب میں ضم ہوجا نا طے کریں تو پھر ان کیلئے ہندوستان میں کون سی جگہ تجویز کی جائیگی آزادی فعل کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ آپ کسی پسماندہ طبقہ کو ہندو یا مسلمان بن جانے پر مجبور کریں

اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تہذیبی تقسیم میں ہندو یا مسلمان کے علاوہ کسی اور مذہب یا گروہ کو کوئی اور حصہ عطا نہیں کیا گیا۔ ایک یہی نقص اتنا عظیم الشان ہے کہ اس اسکیم کا بروئے کار لانا نہ صرف احمقانہ بلکہ شدید نا انصافی ہے۔ ہندوستان ہر اس فرد کا ملک ہے جو اس سرزمین پر پیدا ہوا ہے اس کے وہ پیدائشی حقوق جو بحیثیت انسان کے اسے حاصل ہونے چاہئیں بجز جبر و استبداد کے اس سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اگر اس تہذیبی تقسیم کا مآل کار یہ ہے کہ مسلمان اور اعلیٰ ذات کے ہندو تمام ہندوستان کو ہڑپ کرلیں تو اس اسکیم کو زمانہ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام سے سبق حاصل کرنا چاہیے جو محض اپنی حد بندیوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہو کر رہا۔ یہ کتنا بیرحمانہ فیصلہ ہے کہ چونکہ ہریجنوں کی کوئی مستقل تہذیب نہیں اس لئے انہیں ہندو یا مسلم قومیت اختیار کرلینی چاہئے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر انہیں مسلمان یا ہندو سماج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ انصاف پسندی کے یہ معنی تھے کہ ہریجنوں کے لئے بھی سرسبز و شاداب حلقے تجویز کئے جاتے جہاں وہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے۔ مذہبی تہذیب کی بنا پر ہندوستان کا تقسیم کرنا اور وہ بھی محض دو مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بانٹ لینا اعلیٰ درجہ کی ڈکیتی ہے۔

فاضل مفکرّ نے اس مقالہ کی ابتدا چند مفروضات سے کی ہے۔ پہلے انہوں نے ان مفروضات کو مسلمات کا درجہ دیا اور پھر بڑی پھرتی سے حسب دلخواہ نتائج برآمد کرلئے۔ اگر گہری نظر سے فاضل مفکرّ کے نفسیات کی تحلیل کی جائے تو یہ سمجھ لینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ انہوں نے پہلے نتیجہ سوچ لیا تھا اور پھر اسی کے مطابق صغریٰ و کبریٰ مرتب کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "قومیت" کی تعریف کرنے سے وہ گھبرا اٹھے۔ لیکن "اخلاقی شعور" کو بیدریغ استعمال کرتے چلے گئے ہیں اور اس اخلاقی شعور کو ہی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے لیکن یہ "اخلاقی شعور" کیا چیز ہے؟ کن موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے؟ اسکی وجہ صرف مذہب ہی مذہب ہوتا ہے یا زمانہ کے تقاضات ماحول کی کارفرمائیوں اور عقل انسانی کے ارتقار کا بھی اس میں کوئی دخل ہے؟ اس میں شک نہیں کہ کسی زمانہ میں "اخلاقی شعور" مختلف مذاہب کی تعلیمات کے زیر اثر نشو و نما پاتا تھا۔ اس وقت انسانی حیات میں مذہب سب سے زیادہ دخیل تھا لیکن ارتقار کے موجودہ درجہ پر مذہب ایک انفرادی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ امریکہ یا یورپ کا "اخلاقی شعور" "مسیحی شعور" ہے۔ حیرت ہے کہ ایسا فاضل اس قسم کی فاحش غلطی کا ارتکاب کرے۔ تاریخ یورپ کے معمولی طلبار اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یورپ کی "قومیت" کی ابتدار مذہبی عالمگیر استبدادیت کے خلاف بطور بغاوت ہوئی تھی اور یورپ و امریکہ کا موجودہ نظام سوسائٹی

"قومی نظام ریاست" (Nation State System) پر مبنی ہے۔ باوجود مذہب کی نام نہاد یکسانیت کے یورپ کے ہر ملک کا "اخلاقی شعور" قومی احساس کے ماتحت ہے۔ اور قومی احساس ذہنی ارتقاء کا براہِ راست نتیجہ ہے "اخلاقی شعور" کا سوال اُٹھانے کا راز شاید اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت بننے کے امکان سے انکار کیا جائے۔ یہ اعلیٰ طبقا کی نمائندگی ہے ورنہ مسلمان اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ مصر، ترکی، ایران، افغانستان اور دیگر اسلامی ریاستوں میں کوئی اسلامی شعور کارفرما نہیں ہے بلکہ خالص اور سیدھا سادا وطنی شعور ہے۔ یہ سب کے سب اپنے آپ کو مختلف قومیں کہتے ہیں اور ان کا "اخلاقی شعور" قومی احساس کے ماتحت ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جس طرح دوسرے ممالک میں اخلاقی شعور کی وجہ مذہب نہیں ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی "اخلاقی شعور کی بُنیاد مذہب کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسکی تازہ ترین مثال فلسطین میں موجود ہے۔ وہاں کے باشندے بحیثیت مسلمان کے آزادی طلب نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کا مطالبہ عرب قوم کی آزادی کا ہے۔ وہاں کا "اخلاقی شعور" مذہب کی بُنیادوں پر نہیں ورنہ عیسائی اور مسلمان جو مذہبی حیثیت سے دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں دوش بدوش تحریک آزادی میں حصّہ نہ لیتے۔

افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں واحد "اخلاقی شعور" کے موجود ہونے سے محض اس لئے انکار کیا ہے کہ انہیں دو تہذیبیں ثابت کرنی تھیں جو مذہب کے زیر اثر قائم ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ دو تہذیبیں کب تیار ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے مسلم فاتحین کی تہذیب کوئی اسلامی تہذیب نہ تھی۔ بلاشبہ عبادات کا طریقہ اسلامی تعلیم کے ماتحت تھا لیکن معاشرت حتیٰ کہ سیاسی قوانین اور جزاو سزا کے قوانین بھی اسلامی نہ تھے۔ اسلامی تہذیب جو حقیقتاً عرب کی ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ کچھ یونانی آمیزش اور زیادہ تر ایرانی آب و ہوا میں رہ کر اپنا چہرہ بدل چکی تھی اور اب اس میں نہ وہ سادگی تھی اور نہ وہ خلوص جو قرونِ اولیٰ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ترکی فاتحین آئے اور ایک مخلوط تہذیب ساتھ لائے جو نہ خالص ترکی تہذیب تھی اور نہ اسلامی۔ ہندوستان میں اس تہذیب نے یہاں کی دیسی تہذیب سے کافی اثرات قبول کئے اور خود ملکی تہذیب پر کافی حد تک اثر انداز ہوئی۔ خوراک، لباس، شادی موت کے رسم و رواج جو مسلمانوں کی حکمرانی کے دوران میں موجود تھے اور جو اب تک مغربی تہذیب کے کثیر اثرات کے باوجود بہت کچھ موجود ہیں ہرگز اسلامی تہذیب کے آئینہ دار نہیں کہے جاسکتے۔ بلاشبہ کلچر کی بعض فروع میں اختلافات موجود ہیں لیکن یہ اختلافات قومی زندگی میں حائل نہیں ہو سکتے۔ یہ مسئلہ فی نفسہٖ غور طلب ہے کہ آیا ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کلچر کا اختلاف مذہبی وجوہ کی بنا پر ہے یا مختلف صوبوں کے طبعی حالات، آب و ہوا طریق پیداوار اور ماحول پر مبنی ہے۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا کلچر ایک نہیں۔ یو۔ پی اور مدراس کے مسلمانوں کے طرزِ معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہے وعلیٰ ہذا۔ پھر مذہب کو ایک مشترک عنصر قرار دے کر کلچر کی غیر یکسانیت پر حجت لانا کہاں تک حق بجانب ہے یہ مسئلہ کلچر کا تجزیہ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی کیا جاسکتا ہے وہ زاویہ سوسائٹی کے مختلف طبقات کے کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ دربارِ میسور کا کلچر وہی ہے جو دربارِ نظام کا کلچر ہے۔ جو کلچر مسٹر محمد علی جناح کا ہے وہی کلچر بھولا بھائی ڈیسائی، جواہر لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کا ہے۔ اور جو کلچر ایک مسلمان مزدور یا کسان کا ہے وہی کلچر ایک ہندو مزدور یا کسان کا ہے۔ اس لئے کلچر کا نعرہ لگانا اور اس طریق پر کہ ہندو مسلمانوں کو دو جُدا جُدا قومیں ثابت کیا جائے ایک مجرمانہ فعل ہے جس کا مقصد فرقہ پرستی کی آگ کو مذہبی چنگاری کے ذریعہ بھڑکانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس مسئلہ پر اگر زیادہ قریب سے نگاہ ڈالی جائے تو روز روشن کی طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں دو تہذیبوں کو نمایاں

کر کے دکھانے کا مشغلہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور اصلیت سیاسی اغراض میں لپٹی ہوئی ملے گی۔ برطانی سامراج کے قیام اور کامیابی کا مدار ہی ان نوزائیدہ تہذیبوں کی ٹکر پر منحصر ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اس سے پہلے بھی ہندوستان میں رہتے تھے مسلمان حکمرانوں کے ماتحت ہندو رعایا بستی تھی اور ہندو حکمرانوں کے زیر نگین مسلم رعایا زندگی بسر کرتی تھی۔ ہر جگہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق و اتحاد سے رہا کرتے تھے۔ لڑائیاں ملک گیری کی ہوس کا نتیجہ ہوتی تھیں نہ کہ مذہب یا اختلاف تہذیب کی وجہ سے۔ اگر کسی نے صحیح تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے تو اسے یہ حقیقت معلوم کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگے گی کہ بیسویں صدی سے قبل تک ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار اور برادرانہ تھے۔ اب بھی وہی دو قومیں اس ملک میں آباد ہیں اور ظاہر ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے کی امداد کی محتاج ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے زیر سرپرستی دہل مل کر رہ سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں وہ کیوں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ باہمی بدگمانی اور گائے اور باجے کا سوال کوئی حقیقی سوال نہیں اور نہ اس کی زندگی کچھ زیادہ ہے۔ یہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک خارجی مفادات کا ہندوستان سے تعلق ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں اس وقت تک جان رہے گی جب تک ہمارے چند تعلیم یافتہ افراد اپنی ملازمتوں اور ممبریوں کی خاطر عوام کو بھڑکانا بند نہ کریں گے۔ متنازعہ فیہ مسائل جس قدر بھی ہیں عوام کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زہریلے مادہ کا سرچشمہ اعلیٰ طبقوں کے مفاد کے تحفظ کی جدوجہد میں ملے گا۔ اسی مفاد کی خاطر ہندوستان کے کلچر" میں فرق کیا جاتا ہے اور اسی مفاد کے تحفظ کے لئے دو تہذیبوں کے وجود کی نفیری بجائی جاتی ہے۔ ورنہ حقیقت میں تہذیب کا اختلاف ہندو اور مسلمان کی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ جغرافیائی خصوصیات سے وابستہ ہے۔ کسان اور مزدور خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی قسم کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور ان کا مفاد بھی ایک ہی ہے۔

---

۱۰ مقالہ زیر نظر میں یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت نہیں بنائی جا سکتی۔ اور اگرچہ فاضل مصنف نے قومیت کی تعریف سے گریز کیا ہے تاہم یکساں "اخلاقی شعور" کو واحد قومیت کا ایک ضروری عنصر قرار دے کر نہایت ہوشیاری سے "قومیت" کی تعریف بھی کر دی ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ خود "اخلاقی شعور" کی اصطلاح کی مصنف نے کوئی تعریف نہیں بتائی۔ ہمارے نزدیک "اخلاقی شعور" کی اصطلاح خود ایک معمہ ہے۔ تاہم ایک اچھا ہندو اور ایک اچھا مسلمان جس "اخلاقی شعور" کا حامل ہوتا ہے وہ ہرگز ہرگز قومیت کے منافی نہیں اور نہ کوئی علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ قومیت کے معنی نہ ہندو غلبہ کے ہیں نہ مسلم استیلاء کے۔ اس لئے ہندو اور مسلمانوں کا "اخلاقی شعور" اگر جدا جدا بھی ہے تو بھی اس کا قومیت کی تعمیر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لئے کہ "قومیت" کے مبادیات میں ہر فرد کے لئے آزادئ ضمیر اور آزادئ عمل داخل ہے۔ بشرطیکہ وہ دوسرے افراد کے حقوق پر دست اندازنہ ہو۔ انگلستان میں یہودی آباد ہیں اور ایک زمانہ تھا کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ تھا لیکن ان کا مذہب انگلستان کی "قومیت" کی تشکیل میں مانع نہ ہوا۔ امریکہ میں مذہب کی بنا پر قومی حقوق تقسیم نہیں کئے گئے۔ ہر وہ شخص جو امریکی قومیت میں داخل ہو چکا ہے اس نظام کا ایک رکن ہے اور تمام وسائل و ذرائع سے متمتع ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان کا اخلاقی شعور صرف قومی احساس کا پروردہ ہے۔ روس میں صدہا نسلیں اور سینکڑوں زبانیں بولنے والے انسان رہتے ہیں۔ مذاہب کا بھی کافی اختلاف ہے۔ بایں ہمہ یہ سب لوگ سنجوشی ایک نظام میں شامل ہیں۔ چین میں کتنے مذاہب ہیں لیکن ہر چینی قومیت کے سلسلہ میں منسلک ہے۔ ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب "قومیت" کا منافی نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو چین میں جہاں مسلمان، عیسائی، اور بودھ، کروڑہا کی تعداد میں ہیں جدا جدا تہذیبی حلقے قائم کر کے چین کے حصے بخرے کر لیتے۔ حقیقت میں اکثر افراد یہ غلطی کرنے کے عادی ہیں کہ وہ اصطلاحات رائج الوقت کی تعریفات، کتابوں میں تلاش کیا کرتے ہیں۔ "تعریفات" میں بھی

اسی عجلت کے ساتھ انقلاب ہوتا ہے جیسا کہ سیاسی دُنیا میں۔ "قومیت" کے اجزاء کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے بھی اسی قسم کی غلطی کی ہے۔ "قومیت" کے لئے جن اجزاءِ مشترک کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان میں سب سے بڑی چیز اقتصادی وحدت ہے۔ ہر شخص مذہب اور کلچر کی طرف دوڑ جاتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں کرتا کہ اس مشترک مفاد پر بھی ایک منٹ کے لئے غور کرے جو حقیقتاً کل مفادات کی جڑ ہے۔

ہندوستان صدیوں سے ایک قسم کی اقتصادی وحدت قائم کرتا چلا آیا ہے مسلم حکمرانوں نے اس وحدت کو اور بھی استوار کیا اور یہ "مشترک اقتصادی شعور" اب اس درجہ وسیع اور گہرا ہو چکا ہے کہ اسے تہذیبی تقسیم کے ذریعہ شکست نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہندوستان میں واحد قومیت کی تشکیل ارتقائی سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہے جو ہو کر رہے گی۔ "بدگمانیاں" اور تہذیب و کلچر کا شور صرف ایک محدود حلقہ میں گونج رہا ہے۔ کسان اور مزدور جو ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ہنوز بالکل گونگے اور بہرے ہیں۔ جس وقت انہیں یہ علم ہو جائے گا کہ کس طرح مذہب اور کلچر کا نام لیکر ان کے مفادات کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو انتشار پیدا کرنے والے تمام عناصر کو ایک ایک کر کے قومی جسم سے نکال باہر کر دینگے۔ اور ہندو مسلم ملاپ کی گتھی چشم زدن میں سلجھ جائیگی۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے سیاسی بازی گروں کے دلوں میں بدگمانیاں ہیں تو ہوا کریں لیکن فیکٹریوں کے مزدوروں اور گاؤں کے سیدھے سادے دہقانیوں میں اب بھی ملاپ ہے اور کوئی بدگمانی نہیں۔ ہندوستان میں آج کل جو ہلچل ہے اسکے اسباب پر ایمانداری سے غور کرنا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہلچل پیدا کرانے والے کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو برسرِ اقتدار رہنا چاہتا ہے اور جسے یہ خیال ہے کہ اگر متحدہ قومیت قائم ہو گئی تو ان جیسی ذہنیت کے انسانوں کو اس بلندی سے نیچے اُترنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت براجمان ہیں۔ جو لوگ فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا جھنڈا اُٹھائے پھرتے ہیں انکی یہ ذہنیت کچھ طبقاتی مفاد سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ انگریزی راج کے برکات کا نتیجہ ہے۔ ورنہ "قومیت" کی تشکیل دورِ حاضر کی ایک موجود حقیقت ہے اور ہیئت اجتماعیہ کے ارتقاء کی ایک ضروری کڑی ہے۔ قومیت کا نتیجہ "شہری حقوق" کی آزادی ہے اور شہری حقوق قریب قریب سب کے یکساں ہوتے ہیں۔ آزادیٔ ضمیر، شخصی قانون کا تحفظ اور اسی قسم کے دیگر مسائل "قومیت" کے مبادیات میں شامل ہیں اور ہندوستان کا کوئی دستور انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر غلامی کی حالت میں عبادات اور معاشرتی قوانین میں ایک غیر ملکی حکومت دست انداز نہیں ہوئی اور ہندو و مسلمان مسجدوں اور مندروں میں آزادی کے ساتھ عبادتیں کرتے ہیں۔ نیز معاشرتی معاملات میں اپنے اپنے مذاہب کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی انہیں آزادی حاصل ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک قومی جمہوری حکومت کے ماتحت یہ آزادی کس مصلحت کی بنا پر واپس کر لی جائے گی۔ کیا ہندو اس بات کو پسند کر سکتے ہیں اور اگر پسند بھی کریں تو کیا وہ حکومت کو ایک لمحہ کیلئے چلا سکتے ہیں جبکہ ہندوستان کے نو کروڑ باشندے تلملاتے رہیں۔ کوئی قوم اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ وہ قومیت کی تشکیل کی خواہشمند بھی ہو اور ساتھ ہی اس قومیت کے ایک زبردست حصّہ کو بیچین رکھے۔ بدگمانی ایک مصنوعی اور عارضی بات ہے اور قومی حکومت ہی اس کا علاج ہے۔ یہ بڑا زبردست فریب ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں ضم ہوئے بغیر متحدہ قومیّت کی بنا نہیں ڈال سکتے۔ چین اور یوگوسلاویہ میں مسلمان کسی دوسرے مذہب میں ضم نہیں ہوئے لیکن قومیت متحدہ کے ارکان ہیں۔ فلسطین، شام، عراق اور مصر کے عیسائیوں نے اپنے مذاہب کو خیرباد نہیں کیا اور اسکے باوجود وہ قومیت متحدہ میں شامل ہیں۔ یہ تمام نظائر اور حقائق اس بات کے سمجھنے کیلئے کافی ہیں کہ "قومیت متحدہ محض مذہب کی یکسانیت کی محتاج نہیں ہے۔ ان ممالک کے تمام عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی تہذیب اور بقول فاضل مصنف کے ان کا "اخلاقی شعور" یقیناً مذہبی روایات کے زیرِ اثر ہے لیکن بایں ہمہ ان کا "وطنی یا قومی شعور" اتنا ہی قوی ہے جتنا کہ مذہب سے پیدا شدہ "اخلاقی شعور"

اس اسکیم کے متعلق شروع میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ پست اقوام کا کوئی حل اس نے پیش نہیں کیا اور محض اس بنا پر بھی یہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں یا ہندوؤں کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ کروڑہا انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق دوسری قوموں میں ضم ہوجانیکا حکم دیں۔ یہ صاف اور صریح ہٹلریت ہے۔ اسکے علاوہ اس اسکیم کے اور گوشے بھی غور طلب ہیں۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان کو فاضل مقالہ نگار کی تجویز کے مطابق تہذیبی اصول پر خود مختار حکومتوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان جداگانہ تہذیبی حلقوں کو ایک مشترک سیاسی مرکز سے وابستہ بھی کردیا جائے تو مرکز اور ان خود مختار ریاستوں کے مابین رشتہ کیا ہوگا؟ آیا "مرکز" کوئی فرمانروا ادارہ ہوگا یا محض "نگران انجمن"۔ اگر فرمانروا ادارہ ہوگا تو اسکے لئے لازمی ہے کہ اسکے پاس اپنے احکام منوانے کیلئے کافی طاقت ہو یعنی یہ کہ فوج اسکے قبضے میں ہونی چاہئے۔ اس فرمانروا ادارہ میں اقلیت اور اکثریت کے سوال کو کیسے طے کیا جائیگا۔ فاضل مصنف کی بدگمانی کے مطابق ہندو یقیناً مرکز میں اپنی طاقت کو زیادہ رکھے گا اور جب مرکز میں ہندو طاقتور ہوگا اور ہندو ذہنیت "ہندو راج" (بقول مقالہ نگار) قائم کرنا چاہیگی تو اسے ایسا کرنے سے کونسی طاقت باز رکھے گی۔ برخلاف اسکے اگر مرکزی ادارہ محض ایک "نگران انجمن" ہوگا تو اسکی طاقت محض اخلاقی طاقت ہوگی اور اسکی پوزیشن بالکل وہی ہوگی جو یورپ میں لیگ آف نیشن کی ہے جس طرح یورپ میں ہر قوم اپنی برتری اور مفاد کی خاطر دیگر اقوام سے برسرِ پیکار رہتی ہے اسی طرح ہندوستان کی یہ خود مختار ریاستیں اپنے پڑوسیوں سے دست و گریباں ہونے میں پس و پیش نہ کرینگی۔ وہ کونسی ضمانت اور طاقت ہوگی جو ہندوستان کی ان متعدد فرمانروا جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف چیرہ دستی کرنے سے روک سکے گی۔ ظاہر ہے کہ مرکزی ادارہ بالکل بے بس ہوگا اس لئے کہ اسکے قبضہ میں نہ فوج ہوگی اور نہ پولیس۔ حشر وہی ہوگا جو اس وقت یورپ کا ہو رہا ہے یعنی بین الاقوامی انتشار اور بے آئینی۔ ممکن ہے کہ اس وقت واضعین دستور ولسن کی طرح "انجمن اقوام" پر بھروسہ کر بیٹھیں اور باوجود ان تمام بدگمانیوں کے جن کا ڈھول پیٹا جارہا ہے انسان کی فطری نیکی میں یقین کرکے بزعمِ خود یہ سمجھ لیں کہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل ہوگیا لیکن آئندہ نسلیں واضعین دستور کے منشاء کو نہیں دیکھیں گی بلکہ ان علیحدہ علیحدہ . . . . خود مختار حکومتوں میں پل پل کر جوان ہوں گی اور ان کے حوصلے وہی ہونگے جو ہٹلر یا مسولینی کے ہیں۔ یہ تمام حقائق ہیں اور کسی حل کو قبول کرنے سے پہلے ان پر غور کرنا ضروری ہے۔

اسکے ماسوا، یہ اسکیم ناقابلِ عمل بھی ہے۔ اسکیم زیرِ بحث کی بنیاد آبادی کے تبادلہ پر ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جبتک ہندو اور مسلمان دونوں اسے قبول نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ہندو، ہندوستان میں "ہندو راج" قائم کرنا چاہتا ہے اور یہ اسکیم ہندو راج کے قیام کے بالکل منافی ہے۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس آلہ کو بھی بتا دیتے جس کے ذریعہ سے ہندو کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس اسکیم کو قبول کرلے۔ ایک طرف یہ بدگمانی کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک جگہ زندگی بسر نہیں کرسکتے اور دوسری طرف یہ حسن ظن کہ ہندوؤں سے یہ توقع کہ وہ ایسی اسکیم کو منظور کرلیں جو ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے والی ہو۔ بلا شبہ ڈاکٹر عبداللطیف جیسا معصوم انسان ہی اس قسم کی جسارت کرسکتا ہے۔ مزید براں آبادیوں کا تبادلہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا کہ فاضل مقالہ نگار سمجھے ہوئے ہیں۔ کسی فرد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا اس وقت تک ممکن نہیں جبتک وجہ ترغیب کافی قوی اور دلکش نہ ہو۔ دو آبہ کے کروڑہا ہندوؤں کو ان کی ہزارہا سال کی جنم بھومی سے جدا کرنا اور یہاں کی اچھی آب و ہوا اور سرسبز و زرخیز میدانوں سے محروم کرکے پورب کی ناموافق آب و ہوا میں آباد کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ . . . . اسی طرح مالابار۔ بمبئی اور دیگر مقامات کے مسلمانوں کو راجپوتانہ کی مسلم ریاستوں یا حیدرآباد کی چٹیل سرزمین میں لاکر بسانا ان کے لئے کچھ کم اذیت رساں نہ ہوگا اور غالباً وہ اس تبادلہ کیلئے کسی قیمت پر بھی

تیار نہ ہونگے۔ پھر وہ کونسی طاقتور ایجنسی ہوگی جو عوام کو ان کی مرضی کے خلاف نامانوس علاقوں میں آباد ہوجانے پر مجبور کرے گی۔ کروڑہا انسانوں کا اِدھر اُدھر کرنا بغیر ان کی اپنی خواہش اور مرضی کے ممکن نہیں۔ دیگر ممالک کی مثالیں یہاں چسپاں نہیں کی جاسکتیں اس لئے کہ وہاں آبادی کا تبادلہ یا تو اقتصادی ضرورت کی بنا پر ہوا ہے اور یا اذیتوں سے بچنے کے لئے اور ان میں خود عوام کی مرضی کو زیادہ دخل تھا۔ اسکے علاوہ یہ تبادلے اتنی کثیر تعداد پر مشتمل نہ تھے جتنی کثیر تعداد اس تہذیبی تقسیم کی رو سے عمل میں آئے گی۔ ہندوستان میں تبادلہ آبادی نہ تو اقتصادی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آئے گا اور نہ اذیت سے بچنے کے لئے اور پھر یہ عوام کی مرضی کے خلاف بھی ہوگا ایسی صورت میں اسکے امکان کا تصور صرف ایسا ہی شخص کرسکتا ہے جو جنّت حمقا میں بیٹھ کر ناممکنات کا خواب دیکھنے کا عادی ہو۔

غرضیکہ جس پہلو سے بھی اس تجویز پر غور کیا جائے یہ قابلِ عمل معلوم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ متحدہ قومیت کی موافقت میں اتنے قوی دلائل ہیں کہ کسی مفکّر کے تصوّرات اور قلبی واردات اسکی نہ و رہت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ یہ ساری مصیبت اس لئے نازل ہوئی ہے کہ موجودہ فضا کو ایک مستقل حالت قرار دے کر اس پر نتائج اخذ کئے گئے ہیں حالانکہ قوموں کی زندگی میں ایسے حادثات ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جب کبھی کسی نئے نظام کی آمد ہوتی ہے تو پرانے نظامات مذہب اور کلچر کی دُہائی دے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ کا رجحان اور ارتقار کا مضبوط ہاتھ ہر بنیادی چیز کو پورا کر کے چھوڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اسکیم بھی اسی قسم کی فکری بے اعتدالی ہے۔ اور چونکہ انہوں نے ہندوستان کے مرض کی تشخیص غلط کی ہے اس لئے نسخہ بھی غلط ہی تجویز کردیا ہے۔

یحییٰ

۱۳

نیا ادب اور اسکے عناصر

سیاسی بیداری ملکوں اور قوموں کے ادب پر ہمیشہ اثر ڈالا کرتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بیداری نے پہلے پہل سماج میں اُن بنیادی تصوّرات کو شک کی نگاہ سے دیکھا جو قدامت سے اس کو ورثہ میں ملے تھے اور جن کو مٹانے یا جن کو سمجھنے کا خیال بھی کبھی کسی فرد کو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اپنے ماحول کو اس طرح سمجھنے کا خیال جب سماج میں زیادتی سے پیدا ہوا تو سب سے پہلے جس چیز پر نظر گئی وہ سیاسی تھی یعنی ملکی غلامی۔ مسلمان رہبر ہوں یا ہندو لیڈر، سب کے سب قدیم سماج اور پرانی سماج کے اخلاقی رنگوں میں رنگے ہوئے تھے لہذا انہیں اس ملکی غلامی کا علاج حال سے رجعت اور بغاوت میں نظر آیا۔ یعنی اگر محمد علی نے کہا کہ یہ تمام سماجی و سیاسی امراض محض اس لئے ہیں کہ "ہم سچے مسلمان نہیں ہیں"، تو دوسری طرف گاندھی جی نے ملک کی اکثریت رکھنے والی قوم کو بتایا کہ ہم نے اپنی قومی و مذہبی روایات کو چھوڑ دیا ہے اس لئے ملک غلام ہے اور اسی لئے ہم ترقی نہیں کرسکتے۔ اس غلامی کے علاج کیلئے جو نسخہ تجویز کیا اسکی روح "اہنسا" قرار دی، جو مہابیرازم اور بدھ ازم کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ملکی اور نفسیاتی تقاضوں کی بنا پر "اہنسا" کے مقابلے میں کوئی ایسا طریق کار نہیں ہوسکا جو گاندھی جی کے اس نسخے کو باطل کرسکتا اس لئے ملک کے جملہ سیاسی اداروں نے اس اصول کی بنا پر بنائے ہوئے ہر پروگرام پر عمل کیا اور اسکے بعد کیا ہوا۔ قومی ارتقار کے درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل سفر سے ہر شخص واقف ہے۔

سماج میں پیدا ہونے والے اس شعور کو ہم "نیم مذہبی سیاسی" شعور کہہ سکتے ہیں۔ اس شعور کے پیدا ہونے کے نتیجے میں تحریک ترکِ موالات اور خلافت کی تحریک کے زمانے میں جو ادب پیدا ہوا، وہ بڑی حد تک حالی کے نیم مذہبی قومی تخیل کی تکمیل تھا۔ ایک طرف بنگال نے ٹیگور کو نمایاں کیا اور دوسری طرف پنجاب نے "بانگِ درا" کے مصنف کو، یو، پی نے بھی چکبست کو پیدا کیا جس کی وطنیت کے نسخہ میں متحدہ قومیت کے پورے اجزا نہ تھے، مگر وطنیت کی ایک محدود اسپرٹ ضرور کارفرما تھی۔

پریم چند اس عہد کی خالص پیداوار تھے۔ ان کے ادب میں اپنے زمانے سے کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ سب لوگ اپنے عہد کے "نئے ادب" پیدا کرنے والے کہلائے، اور سماجی و سیاسی شعور کے لحاظ سے ان کے ادب کو ادبِ جدید سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسکے بعد ابھی اس ادب کی امکانی ترقیوں کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ زمانے کے عقاب نے اپنے شہپر زور سے پھڑپھڑائے اور اسکی پرواز تیز تر ہوگئی، سیاسی و ملکی شعور نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں، اور مفکرین کو یہ احساس ہوگیا کہ مرض کا علاج غلط تجویز کیا گیا ہے، ہم زمانے سے بہت پیچھے ہیں اور ملک کی مکمل نمائندگی نہیں ہوسکی ہے؛

سیاسی تجربات نے یہ بھی بتایا کہ ملک کا اصلی مرض اخلاقی نہیں اقتصادی ہے، اس مرض کو معلوم کرتے ہی، سوشلزم کے ابتدائی خیالات جنتا میں پیش کئے گئے اور گو ان کو پروان چڑھانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی مگر دہکتی ہوئی آگ تھی۔ روٹی کے مسئلہ نے بھوکی اور مفلس جنتا میں جلدی جگہ کرلی۔ اس نئے شعور کا اثر ہندوستانی ادب کے ہر گوشہ پر پڑا اور پڑ رہا ہے، اور شاید زیادہ پڑیگا؛

اس شعور کے بعد ادب میں ترقی پسندی، انقلاب اور ہمہ گیری کے خیال نے جگہ لی؛ جسکے معنی یہ تھے کہ زبان سے لیکر خیال تک میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ اور یہ شعور قدرتی طور پر اس نیم مذہبی سیاسی شعور کی ضد تھا جو اس سے پہلے سماج پر اپنا اثر جما چکا تھا۔

"نیم مذہبی سیاسی شعور" کو قبول کرنے کی وجہ در اصل یہ تھی کہ فرد اُن تمام پرانی اور دقیانوسی باتوں سے تنگ آچکا تھا جو ساونتی تمدن اور اسکے غلیظ رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں۔ اور اب اسکی روح چاہتی تھی کہ اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو۔ لیکن سماج اس پرانی افیون کی پینک میں تھی مسلمانوں میں کسی حد تک سرسید نے ذہنی آزادی کا پیغام دیا لیکن اسکی نوعیت بھی یہی تھی کہ جس طرح کونین پر شکر چڑھا کر مریض کو دیا جائے لیکن بہرحال سوشلزم کا محض ہلکا سا خیال، ادب پر گہرا اثر چھوڑ گیا اور اُس نے مطالبہ کیا کہ "ہمارے ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ آخر زندگی سے ہم آہنگی کے معنی کیا ہیں — !؟

یہ ایک سوال ہے جس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ ادب کیلئے مفید اور عام ہونا لازمی ہے۔ (Art for art) ادب برائے ادب کے نظریہ میں اب کوئی جان نہیں۔ ادب برائے خدمت انسان کے نظریہ کی کسوٹی پر جو نیا ادب ٹھیک اُترے گا وہی نیا ادب کہلانے کا مستحق ہے۔

ادب کو مفید اور عام بنانے کے لئے سب سے پہلے ٹیکنکس بدلنی پڑتی ہیں، اور اسکے ساتھ ہی ایسی زبان کو اختیار کرنا لازمی ہوجاتا ہے جسے عوام زیادہ سمجھ سکیں؛ اسکے ساتھ ہی بنیادی خیال کو بدل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ادب پر جن باتوں کا قبضہ ہے وہ وہی اخلاقیات ہیں جس میں انسانی ذہن ہزاروں سال سے اسیر ہے اور جو اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی ترقی میں بھی روڑہ بنے رہے مثلاً دنیا کا بڑے سے بڑا ادیب و شاعر فرد کو یہی تعلیم دیتا چلا آیا ہے کہ "اکتفا" بلندی ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہے۔ لیکن جو سنری سماج کی اخلاقی مشینری کے زنگ آلود پرزوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ تعلیمات کیوں دی جاتی تھیں یہ تعلیم طبقاتی مفاد کیلئے لازمی تھی کیونکہ اگر صبر کرنے والے عوام میں نہوتے تو صبر کرنے والوں کی زندگی خوشی اور اطمینان سے کیونکر گذرتی؛ !؟

ادیب اور ادب دونوں ماحول کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس شعور نے ادب میں واقعیت نگاری (Realism) کا باب کھولا، یہ چیز تو ٹھیک ہوئی مگر لکھنے والوں کی تمام توجہات رومانی واقعیت نگاری (Realism) ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ ترقی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ "کسان" اور "مزدور" کو ادب میں خاص مقامات مل گئے۔ کم از کم اردو شاعری "کسان" اور "مزدور" کی صدائے بازگشت معلوم ہونے لگی۔ اور تمام تر ترقی پسندی اور ادب کی جدت کی بنیاد رومانی واقعیت نگاری اور کسان اور مزدور پر چند نظموں پر قائم ہو کر رہ گئی حالانکہ نئے ادب کے عناصر میں، ہمہ گیری پیدا کرنے کے لئے ٹیکنکس بدلنے اور زیادہ سے زیادہ آفاقیت ( ) پیدا کرنا سب سے اول لازمی ہے یعنی خیالی انقلاب کے ساتھ ساتھ لسانی انقلاب نہایت لازم و ملزوم ہے ورنہ تخیلاتی انقلاب کے امکانات دھندلے پڑ جائیں گے۔ رومانی واقعیت نگاری کا بھی جہاں تک تعلق ہے اسکے یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ ادب میں کھردرا پن پیدا ہو جائے اور انقلابی گیتوں کا بھی یہ مفہوم ہرگز نہ ہونا چاہئے، کہ ان کو درباری زبانوں میں لکھ کر شائع کر دیا جائے۔

میرا خیال یہ ہے کہ نئے ادب کے عناصر میں، سب سے بڑا عنصر نفسیاتی انقلاب اور ہمہ گیری ہے۔ محض طبقاتی پروپگنڈا نیا ادب نہیں کہلایا جا سکتا، البتہ یہ ضروری ہے کہ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور سماج کی دہنی زندگی ہمارے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کا نمونہ ہو گی جنکی آج کوئی آواز نہیں۔ اس لئے نئے ادب میں ان کے احساسات، خیالات، اور جذبات کا عکس ہونا لازمی ہے۔ لیکن بہر حال رائے اور پروپگنڈے میں فرق لازمی ہے جیسے طرح سینما کے پوسٹر اور کسی مصور کے شاہکار میں ہوتا ہے۔ طبقاتی خیال کو اگر آپ نئے روپ کی زمین بنانا چاہتے ہیں تو اس کو وسیع نفسیاتی بنیادوں پر بنائیے۔ نئے ادب کو انسانی فطرت کے لطیف اور اچھوتے نفسیات اور ان کے گوشوں میں پڑی ہوئی حقیقتوں، دکھوں اور مسرتوں کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

نئے ادب کے عناصر میرے خیال سے یہ ہیں یا یہ ہو سکتے ہیں:۔

(۱) اخلاص۔
(۲) ہمہ گیری۔
(۳) لسانی انقلاب
(۴) فطرت انسان کی مصوری
(۵) زندگی۔
(۶) آزادی اور اسکے منتہا (عام انسانی مسرت) کی پیامبری۔
(۷) نفسیاتی مصوری
(۸) شگفتگی و تازگی۔
(۹) عام انقلاب۔

نئے ادب پر یوں تو سیاسی و سماجی شعور کے پرتو پڑتے اور پڑتے رہینگے لیکن نئے ادب کی پیدائش اگر ہوش و حواس اور غور و فکر کے ساتھ ہو تو وہ خود سیاسی انقلاب کا باعث ہو سکتا ہے جس کی نظیریں ہمیں تاریخ میں ملتی ہیں، لیکن افسوس کہ ملک میں ہر شخص اپنی ذات کو نئے ادب کا علمبردار تو سمجھتا ہے مگر اب تک کوئی روسو اور والٹیر پیدا نہیں ہوا۔

یورپ کا نقشہ بدل رہا ہے!!

سال بھر ہوا کہ آسٹریا پر یکایک حملہ ہوا اور آسٹریا کی آزادی ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی۔ یورپ کی جمہوری حکومتوں (برطانیہ، فرانس) کے ہزار وعدوں کے باوجود اور خود دہلر اور مسولینی کے متعدد بار یقین دلانے کے با۔ آسٹریا کی آزادی دیکھتے ہی دیکھتے چھن گئی۔ اور نتائج اس صورت میں ظاہر ہوئے کہ غریب چیکوسلاوکیا کو بھی نازی حرص و آز کیلئے راستہ کھول دینا پڑا۔ اور جرمنی کا اقتدار سارے یورپ پر قائم ہو گیا۔ شیر برطانیہ کی حیثیت عجائب گھروں کے

پامال جانوروں کی سی رہ گئی ؛ آسٹریا کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس سے وہ تیس سالہ جنگ یاد آجاتی ہے جبکہ اسی طرح جرمنی اور اٹلی کی حریف نظروں کا اسے شکار ہونا پڑا تھا، مگر اس وقت آسٹریا جمہوری حکومتوں کے بے عمل وعدوں میں اُلجھی ہوئی نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے طویل عرصے تک تن تنہا ان دو بڑی طاقتوں کی سیاسی چالبازیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

آج جو کچھ ہوا وہ ایسا اچانک ہوا۔ کہ نہ صرف آسٹریا کی آزادی گئی بلکہ چشم زدن میں آسٹریا کے آرٹ اور کلچر کی قبر بھی کھود گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ یہودی اکثریت آسٹریا کے آرٹ اور تمام کلچر کی خالق و کارساز تھی۔ ہٹلر اپنی کتاب (Mein Kampf) "میری جدوجہد" میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ :۔

"جب میں وائنا کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا مجھے اس احساس سے تکلیف ہوتی تھی کہ ذلیل اور ناپاک یہودی سارے آسٹریا پر اس طرح چھائے ہوئے تھے جیسے اس ملک پر ان کا پیدائشی حق ہو، فیکٹریوں، ہوٹلوں اور سڑکوں پر چلتے پھرتے ہمیشہ یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے۔ جب میں یہودی لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتا تھا مجھے بڑی گھن آتی تھی اور اُسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب مجھے طاقت حاصل ہوگی، میں آسٹریا کو انکے ناپاک وجود سے پاک کر دوں گا"

ہٹلر نے لفظ بہ لفظ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ لوٹ مار، بے عزتی، تکلیفیں، مصیبتیں، سب بیچارے یہودیوں پر ٹوٹیں اور یہاں تک کہ ان میں سے ہزارہا ان مصائب کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے خودکشی کر لی۔ لیکن آسٹریا کو یہودیوں کے وجود سے پاک کر کے ہٹلر نے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ ان نوجوانوں کو کہ جن کی رگوں میں یہودی خون نہ تھا مجبور کیا گیا کہ ہٹلر کی جرمن فوج میں بھرتی ہو جائیں اس طرح اُس نے جرمن فوج کو وسیع کیا اور ساتھ ہی نیشنل بینک پر قبضہ کر کے اسکا سرمایہ اسلحات اور جنگی تیاریوں پر صرف کیا، یہ یاد رہے کہ اس بینک میں جرمنوں کا سرمایہ زیادہ نہ تھا، یہ آسٹریا کا قومی بینک تھا جس میں آسٹرین حکومت کا سارا قومی اثاثہ جمع تھا، ساتھ ہی دوسرے ملکوں کے بھی کثیر حصے شامل تھے۔

ہٹلر کو اس پر بھی چین نہ آیا۔ آسٹریا کا نام تک لینا جرم عظیم قرار پایا۔ سالہا سال کے تاریخی کارنامے حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے وہ آسٹرین قوم ہی تھی جس نے ترکوں کے سیلاب کو بڑھنے سے روک دیا تھا۔ یہ آسٹریا ہی تھا جس نے مغربی موسیقی کے تین سب سے بڑے اُستاد بیتھوون۔ موزرٹ۔ شوبرٹ اپنی آغوش سے پیدا کئے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ جب ان تین موسیقاروں کے مجسموں کے سامنے سے نازی فوجیں گذریں تو اخلاقاً ٹوپیاں بھی نہ اُٹھیں۔

ہٹلر نے جرمنی کا قہارِ مطلق بن جانے کے بعد جرمن نوجوانوں سے ہمیشہ کیلئے بے روزگاری کو مٹا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ چونکہ انفرادی سرمایہ داری کے ماتحت وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا اور ملک میں بے اطمینانی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اب غالباً چھوٹے چھوٹے ملکوں پر اختیار کلّی حاصل کر لینے کے بعد جرمن نوجوانوں کی روزی کے لئے مواقع نکال سکے گا۔ آسٹریا میں اسکے طرزِ عمل نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی، دفتروں، فیکٹریوں اور تمام چھوٹی بڑی تجارتوں میں ذمہ دار جگہوں پر جرمن دیش کے نوجوان رکھے گئے۔ خود آسٹرین کو چھوٹی چھوٹی ایسی جگہیں دیدی گئیں جن میں نہ ذمہ داری کا پہلو تھا نہ طاقت کا امکان۔ ہٹلر کے اس طرزِ عمل سے آسٹرین نازیوں کو بھی حیرت ہوئی اس لئے کہ ان کو بھی جرمن نازیوں کے مقابلہ میں نظرانداز کیا گیا۔

جب سے یہ واقعہ ہوا ہے میں نے اکثر مغربی اور مشرقی مدبرین کے مضامین پڑھے اور مجھ کو ان کے فیصلے پر حیرت ہوئی اس لئے کہ وہ سب کے سب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ خود آسٹرین قوم چاہتی تھی کہ آسٹریا اور جرمنی ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائے اور نازی جھنڈے کے تلے

(بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۲۴۹ پر)

حکومت صوبجات متحدہ کا مسلمان اقلیت کیساتھ سلوک

۱۱ فروری ۱۹۳۹ء کو یو۔پی گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جسکے ضمنی عنوانات یہ ہیں۔

(۱) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(۲) مسلمانوں کی علمی ترقی میں حکومت صوبجات متحدہ کا حصہ

(۳) حکومت صوبجات متحدہ اور اردو و ہندی۔

(۴) چند اردو اخبارات کی غلط بیانیاں۔

جس دن سے کانگریسی صوبجاتی حکومتیں قائم ہوئی ہیں مخالف حلقوں کی طرف سے برابر کہا جارہا ہے کہ کانگریسی حکومتوں نے مسلمان اقلیت کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا۔ پڑھے لکھے احتجاج کرنیوالوں نے جاہل اور ناواقف مسلم عوام کے دلوں میں پختگی کے ساتھ یہ خیال پیدا کردیا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو مجموعی طور پر ہندوستان سے مٹا دینا چاہتی ہے اس خیال کو مذہب اور کلچر تمدن اور تہذیب کے نام پر نفرت کے مسالوں کے ساتھ دلوں میں مستحکم کیا گیا ہے۔ لیکن حکومت نے اپنے اعمال کو اعداد و شمار کے ساتھ شائع کرکے اس مسالہ کو پگھلا دیا ہے اور جو شخص عدل و انصاف کی معمولی سی اسپرٹ بھی رکھتا ہے وہ اس رپورٹ کو دیکھکر تسلیم کرے گا کہ کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف جو لوگ محاذ بنائے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُنکے بعض خیالات صحیح ہوں لیکن وہ مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔

کانگریسی حکومتوں کے مخالف حلقوں کی مخالفت ہرگز عوام کی نمائندگی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے زوال پر چراغ پا ہونا ہے۔ وہ مسلمان جو کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف ہیں اسلئے خلاف نہیں ہیں کہ وہ اسلام دوست ہیں اور مسلمانوں کی فلاح چاہتے ہیں بلکہ وہ ان قوم پرست مسلمانوں کے برسرکار آنے میں مستقلاً اپنا نقصان اور تباہی خیال کرتے ہیں جو کانگریس کے ساتھ ہیں اور کانگریس وزارتوں کی کرسیوں پر وزارت کے فرائض انتہائی قربانی و ایثار کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ وہ کسی نہ کسی مرکز پر کانگریس کے ساتھ صلح کیوں نہیں کرلیتے؟!

یہ ایک اہم سوال ہے اور ہر طبیعت اسکا جواب چاہتی ہے کہ اگر مسلم لیگ یا کوئی ایسی ہی مخالف جماعت ہندوستان کے قومی ارتقا کی موید ہے تو ملک کو جانبدارانہ جدوجہد سے تباہی اور بربادی کے غاروں کی طرف کیوں لئے جاتی ہے وہ...... باوجود امکانات صلح کے کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کیوں نہیں کرلیتی!؟

اس سوال میں وہ بھید چھپا ہوا ہے جو بنیاد ہے تمام تر مخالفانہ جدوجہد کی اور جس کے سہارے مخالفت کا تمام کاروبار چل رہا ہے۔

آئیے اس مسئلہ پر ذرا غور و فکر سے ایک لمحے کیلئے سوچیں اور معلوم کریں کہ وہ کون سے وجوہ و اسباب ہیں جو اسوقت تک فضا کو ابر آلود کئے ہوئے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ کانگریس کے برسر اقتدار آجانے کے بعد اُن تمام حلقوں کا قدرتی طور پر زوال ہوگیا ہے جو برٹش گورنمنٹ کے موید تھے۔ اور جن کی تائید ان حلقوں کو حکومت میں بلند مرتبہ بناتی تھی یعنی انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور کانگریس کے عہدہ قبول کرنے کے بعد منفرد طور پر ان لوگوں کے لئے کانگریس کے مقابلے میں گنجائش نہیں رہی خصوصاً رجعت پرست مسلمانوں کے لئے جنکے مزاج اور حالات یا جنکی نزاکتیں انقلاب و آزادی کی سختیوں کی تاب نہ لاسکیں اور نہ آئندہ لاسکتی ہیں قطعی ناممکن ہوگیا کہ وہ غیر کانگریسی رہتے ہوئے حکومت میں کوئی نمایاں جگہ حاصل کرسکیں۔ ہر دماغ اور ہر فرد ایک خاص ماحول اور ایک خاص فضا کا پروردہ ہوا کرتا ہے۔ کشمیر کے درختوں کو آپ ملتان اور سندھ کی ریتلی سرزمین میں پروان نہیں چڑھا سکتے اسی طرح سمندر کی تہ میں جو نباتات اُگتے ہیں وہ [illegible]

میں بیج ڈالکر بھی پیدا نہیں کرائی جا سکتیں۔
مجھے معاف کیا جائے، مسلم لیگ یا زمیندار کانفرنس میں جو حضرات برسر اقتدار ہیں اُن کا خمیر ایسی مٹی سے گوندھا ہی نہیں گیا ہے کہ وہ کبھی اور کسی شدید سے شدید عہد میں بھی انقلاب کے ابتدائی جھونکوں کو برداشت کر سکیں۔ ان کے حالات اُن کا تمدن ان کی رہائش ان کی زندگی سب نازک لطیف، حسین اور بالکل مختلف ہے۔ جس ظرف سے چراغ کے لئے تیل آتا ہے اگر چراغ کا تیل اُسی ظرف میں اُنڈیل دیا جائے تو چراغ کیونکر جل سکتا ہے!؟ سو اگر یہ حضرات عوام اور مزدور و کسان سے "زندگی" اور جان حاصل کرنا بند کر دیں تو خود "ذی روح" (یعنی صاحبِ ثروت) کیونکر رہ سکتے ہیں!؟
اسلئے سوال محض ہندوستان کی آزادی، مذہب اور جانبداری کا نہیں ہے بلکہ طبقاتی زندگی کا ہے، شخصیتوں کا ہے۔ اور فرقوں کی بقا و موت کا ہے۔
قوم پرست مسلم جنہوں نے وزارتوں کی گدیاں سنبھال لیں ہیں۔ محض پارٹی کے فیصلے اور پروگرام پر عمل کر رہے ہیں۔ ایک حیثیت میں وہ بھی معمولی قومی کارکن ہو سکتے ہیں لیکن سچ پوچھیئے تو مسلم لیگ کی لڑائی براہ راست انہیں "کافروں" سے ہے۔ اور کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ کی جدوجہد کے جاری رکھنے کا اولین منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے الیکشن تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ قوم پرست مسلمانوں میں سے ایک فردِ واحد بھی منتخب ہو کر اسمبلی اور کونسلوں میں نہ جا سکے۔ اس معمولی نکتہ کی بنا پر میں پُرزور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ کانگریس کی طرف سے ہزار سمجھوتہ کی کوشش ہو لیکن مسلم لیگ کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گی یہاں تک کہ "خزاں کا موسم" نہ گذر جائے اور موسمِ بہار آکر اُنکے اُمید کے پھولوں کو نہ کھلا دے۔!؟
لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس "خودغرضانہ جدوجہد" سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ ہر دل اور ہر دماغ تقسیم ہو گیا ہے۔ ہر طرف کفر و ایمان مولویت و سٹریت۔ مذہبیت ولا مذہبیت اور طرح طرح کی مزخرافات کا ایک خوفناک طوفان ہے، کہ ساری قوم کو اڑائے لئے جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اسکا انجام کیا ہوگا!؟..... جو کچھ بھی ہو لیکن انجام ظاہر ہے اور وہ یہی ہے کہ غلامی کی ایک صدی اور بڑھ جائے گی، مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن جو کچھ بھی ہو

مگر کانگریس اور ہندو قوم دونوں کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو شخص یہ خواب دیکھتا ہے کہ مستقبل میں سوائے ہندو قوم کے ہندوستان میں کوئی باقی نہ ہوگا وہ مرنے کے بعد خواب دیکھ رہا ہے اسکے یہ خواب اسی طرح پورے نہیں ہو سکتے جسطرح انسان فنا ہونے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔
اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ جان لینا چاہئے کہ وہ قدیم اور مُردہ ہندوستان کے سینے پر سانس نہیں لے رہے ہیں اب وہ ایسے ملک میں زندہ ہیں جسکے نفس کی آمد و شد میں بیداری، جدت اور انقلاب کی روح کارفرما ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں ان..... عناصر کی روح پیدا نہیں کرینگے تو وہ زمانہ کے ہاتھوں سلامت نہیں رہ سکتے۔ انکو یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ انگریزوں کی دوستی انکے کام نہیں آسکتی۔ قدرتی طور پر انگریز طاقت اور اکثریت سے متاثر ہونے والی قوم ہے۔ اور اپنے مصالح کو پیشِ نظر رکھکر قدم اُٹھاتی ہے۔ اور اُسکے مصالح اور منافع ہندو قوم کے ہاتھ میں ہیں۔ ہندوستان میں انکی قسمت کا فیصلہ کانگریس کی نوکِ قلم کرے گی اسلئے کبھی انگریز مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نہ دینگے وہ ہندوستان پر تسلط کی خاطر مسلمانوں کی خودغرض اور وطن فروش جماعتوں کو اُلو تو بناتے رہینگے لیکن مسلمانوں کی ترقی اور آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور کیوں کریں جبکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی وہ طاقتور اور شاندار قوم ہے جو اگر چاہے اور اُٹھ سکے تو ایشیا کو متحد کر کے مغرب کے استعمار کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔
ان حالات میں قدرتی و انسانی طور پر بھی مسلمانوں کے لئے

ایک ہی راہِ عمل ہے۔ اور وہ صرف یہ ہے کہ "وطنیت" کو اپنا
مقصدِ سیاست بنائیں ہندوستان سے محبت کریں ہندوستان
کو اپنا مولد خیال کریں (جیسا کہ بد قسمتی سے اسکو مسلمانوں
کے مولد ہونے کا شرف حاصل بھی ہے!) اور اتحاد و محبت کیساتھ
ہندوستان کی آزادی کے لئے ان طریقوں پر جنگ کریں جو
کانگریس نے بنائے ہیں۔ اور اگر ان طریقوں سے کچھ اختلاف ہو
تو کانگریس میں داخل ہو کر ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کریں۔ اپنی کثرت
سے اسکی موجودہ فضا کو تبدیل کر دیں۔ اور کانگریس کو اس
سانچے میں ڈھالیں جسے وہ مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید خیال
کرتے ہیں۔

اُن مسلمانوں کی جو "اپنی ڈفلی اپنا راگ" کے قائل ہیں یہ شدید
خام خیالی ہے کہ بغیر کسی تعمیری پروگرام اور خلوص عمل کے وہ
زیادہ دن تک اس کارواں کا جلوس نکال سکینگے جسکے سواروں
کے پاؤں سرکنڈوں پر قائم ہیں اور جسکے سامنے کوئی منزلِ مقصود
نہیں۔ نفرت کی آگ برسا کر پوری قوم اور اسکے تمام مستقبل
کو خطرہ میں ڈال دینا اسلام کی ہرگز کوئی خدمت نہیں۔ جو شخص
بھی مہاسبھائیوں کی طرح "مسلم راج" کے خواب ہندوستان
میں دیکھتا ہے یا ہندوستان کی قومی تقسیم کو ممکن خیال کرتا ہے
وہ احمقوں کی جنت کا باشندہ ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں
کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندو قوم سے ملکر رہنا پڑیگا
یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو کبھی باطل نہیں ہوسکتی۔ اور
جو جماعت اسکو باطل کرنے کی کوشش کرے گی وہ خود باطل
ہو جائے گی۔

مخالف جماعتوں کی طرف سے مسلمانوں میں کانگریسی حکومتوں
کے خلاف جو غلط پروپیگنڈا ہوا ہے اُسنے ضرورت پیدا کر دی کہ
حکومت عوام کی واقفیت کے لئے ان تمام باتوں کو شائع کر دے
جن سے ثابت ہوجائے کہ صوبہ کی حکومت نے کوئی قدم مسلمانوں
کے مفاد کے خلاف نہیں اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ کو پڑھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ یو۔پی میں مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فیصدی
ہے۔ لیکن سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ۴۴۔
۴۰-۴۸-۳۱-۲۶-۲۵-۲۷-۳۳-۲۹-۴۵-۵۳ اور
ایک موقع پر ۴۴ مسلمان ڈپٹی کلکٹروں کو سٹیڈ پوسٹ میں جگہ
دے کر صوبہ کی کانگریسی حکومت نے ۵، ۷ فیصدی ترقی دی ہے۔
صوبے کے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں صوبہ کی حکومت نے
کئی کمیٹیاں بنائی ہیں اور اسلامی اداروں کو مختلف قسم کے عطیات
بھی دیئے ہیں۔ مسلمانوں کے اسکولوں کے لئے ایک خاص افسر
مقرر کیا گیا ہے اور لوکل بورڈز کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خاص طور پر
مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل حکومت
نے ایک علیحدہ پمفلٹ میں شائع کی ہے۔

مذہبی جذبات کا احترام

کسی قوم یا فرقہ کے مذہبی جذبات کا احترام ہر حکومت پر اسنا ہی
فرض ہے جسقدر کہ اُسکے ذمہ دار افراد اپنے مذہب و اصول کا
احترام کرتے ہوں۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہمیشہ
ہندو قوم کے مذہبی جذبات کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ بابر نے ہمایوں
کو وصیت کی کہ گاؤکشی سے احتراز کیا جائے کیونکہ اس ملک کے
باشندوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی ملک میں ایک
طاقت بھی برسرِ کار ہو تو اس وقت بھی محکوم قوم یا کسی اقلیت کے
مذہبی جذبات کا احترام بمنزلہ فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی حالت میں
جبکہ موجودہ حکومت ہندو مسلمانوں کی ایک ملی جلی قومی حکومت
ہے تو اس فرض کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔
لیکن کیا بد قسمتی ہے کہ موجودہ حکومت پر جو سب سے بڑا چارج لگایا
جارہا ہے وہ یہی ہے کہ کانگریسی حکومتیں ہندوستان سے مسلمان
اور اسلام دونوں کو مٹا دینا چاہتی ہیں۔ پڑھے لکھے ایجیٹیٹروں نے
مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو حرکت دے کر اُس نفرت کو پروان چڑھایا
ہے جو ناواقفیت کی بنا پر ہمیشہ غیر مذہب والوں سے پیدا ہو جایا
کرتی ہے۔ اور یہ شدید طور پر افسوسناک ہے۔
اسلئے حکومت کو بھی ضرورت پڑی کہ وہ اپنے اعمال سے ثابت
کرے کہ اُسنے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا نہ صرف اپنے صوبے میں

احترام کیا بلکہ صوبہ بمبئی میں بھی جہاں کے متعلق اسکو کچھ اطلاعات ہوئیں۔ اوقاف کے متعلق ایک کمیٹی بنانا اس کا علیحدہ دفتر کھولنا اور دفتر کے اخراجات سرکاری آمدنی سے پورا کرنا۔ اخباروں اور رسالوں کی نگرانی و نسبلی مسلمان میلوں کو میلہ بل سے مستثنیٰ قرار دینا۔ بظاہر یہ تمام باتیں نیک اور خوش نیتی پر مبنی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ صوبہ کی حکومت مسلم اقلیت کے حقوق کی مکمل طور نگہبان ہے۔ اور اس کا ایمان ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام خود بھی کرے اور دوسروں سے اس احترام کا مطالبہ کرے۔

فرقہ وارانہ فسادات

ہم رپورٹ کے اس حصہ سے متفق نہیں جس میں دبے لفظوں میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ صوبہ میں ہونے والے فسادات مسلمانوں میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے کی وجہ سے ہوئے کہ "ہندو مسلمانوں کے دشمن ہیں" وہ ان کو غلام بنانا چاہتے ہیں اور ان کی تہذیب و معاشرت کو فنا کردینا چاہتے ہیں"

ملک کی فضا اس پروپیگنڈے سے پہلے بھی خراب تھی اور دونوں قوموں میں حائل ہونے والی اس خلیج کو جو مذہبی نفرت اور سیاسی اختلافات کی دلدل سے پڑھی پہلے ہی اسقدر وسیع کردیا گیا تھا کہ ہر وقت یہی صورت حال پیدا ہوسکتی تھی جو فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لیکن اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ صوبہ جاتی حکومتوں کے قیام کے بعد جو پروپیگنڈا کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں میں کیا گیا اس نے آگ پر تیل کا کام دیا۔ ان تمام فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری ان انجمنوں کے سر ہے جنھوں نے اس قسم کا پروپیگنڈا کیا اور کررہی ہیں۔ حکومت نے فرقہ وارانہ فسادات پر یقیناً بروقت قابو حاصل کیا اور فضا کو بدل دیا لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ بنیادی طور پر اس قسم کے خوفناک فسادات کو روکنے کی تدابیر فوری غور و عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان اپنے موجودہ مرکز ترقی سے مزید ترقی کرے گا۔

آج ہم نہتے سہی لیکن ہماری پہلی آرزو ہے کہ ہم صاحب اسلحہ ہوں اس صورت میں اگر باہمی قومی اختلافات رہے تو یہ فسادات "سول وار" کی صورت اختیار کرینگے۔ اسلئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان جراثیم کو ختم کیا جائے جو فسادات اور قومی نفرت کا اصلی سبب ہیں۔ صوبہ جاتی حکومتوں کے لئے اس باب میں دو ہی راستے ہوسکتے ہیں۔

(۱) آئینی (۲) اخلاقی۔ آئینی طرزِ عمل میں کم گنجائشیں ہیں صوبہ کی اسمبلی میں ایسے قانون بنائے جا سکتے ہیں جنکے ذریعہ بلوائیوں اور فسادات کا بیج بونے والوں کو شدید ترین سزائیں دی جائیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس آئینی طریق کار میں ردِ عمل کا بھی اتنا ہی اندیشہ رہیگا جسقدر کہ صحت و کامیابی کا تصور ہے مگر دوسرے طریق کار میں .... البتہ گنجائشیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی ذہنیت بدلنے کے لئے ایسا لٹریچر عام کیا جائے جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی محبت و عزت کے جذبات ترقی کریں۔ جلسے۔ جلوس تقریر و تحریر ہر ذریعہ سے بتایا جائے کہ فرقہ پرستی مستقل درندگی ہے اور اس درندگی سے ہر شریف شہری کو پرہیز کرنا چاہئے۔

ان دونوں راستوں کے علاوہ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ان مخالف انجمنوں سے کانگریس سمجھوتہ کرے جو اس قسم کی خراب فضا پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں لیکن میں خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ اس سمجھوتہ کے بعد بھی ایک پارٹی ملک میں ایسی ضرور باقی رہے گی جو اپنی فساد پرستی اور ملک دشمنی کا ثبوت دیتی رہیگی یہ پارٹی ان افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے ازل کے روز شیطان کی موجودگی میں انگریزی حکومت کے لئے حلف وفاداری اٹھایا ہے۔ اور جنکے دلوں سے انگریزوں کی محبت قیامت تک نہیں جاسکتی۔

آگے چل کر رپورٹ میں ٹانڈہ کے واقعات کی تصحیح ہے اور "ہندوؤں پر پابندیاں" کے عنوان سے مسٹر جناح کے سوال کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ کانگریسی حکومت کے عہد میں مسلمانوں پر کسی جگہ کوئی نئی

نگراں آنکھیں

ایشیا کا "مشترک نمبر"

ایشیا کا یہ نمبر "مشترک نمبر" کے نام سے شائع کیا جارہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تماہی نہیں بلکہ چھ ماہی پر مشتمل ہے اوراس میں اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء۔ اور جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۹ء کے دو نمبر یکجا شامل ہیں۔ یہ صورت محض اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اپنے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق ایشیا وقت پر شائع ہوتا رہے؛

اس سے پہلے جو نمبر شائع کیا گیا تھا وہ تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل تھا، اب جو نمبر آپ دیکھ رہے ہیں یہ بھی ۲۵۴ صفحات پر شائع کیا گیا ہے مگر اسکے بعد جو نمبر شائع کیا جائے گا اس کا وہی حجم ہوگا جو عام نمبروں کا ہوتا ہے

اس سے پہلا نمبر اپنے مضامین کی جدت اور افادیت اور تازگی و تکمیل کے لحاظ سے تمام ملک میں نہایت سراہا گیا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور ادبی مرکز کے وہ تمام کارکن ارکان جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، مخلصانہ طور پر اپنے کاموں کی اچھائی اور برائی کو معلوم کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایشیا کے پڑھنے والے بھی اچھائی اور برائی اور اسکے نقص و کمال پر آزادانہ رائے دینے میں بے باک واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ اندازہ کرکے بڑی مسرت ہے کہ مجموعی طور پر ناظرین ایشیا کو ترقی یافتہ اور نئے ادب کا علمبردار قرار دیتے ہیں اور اکثرین کی رائے یہ ہے کہ دن بدن اس کا ادبی معیار ترقی ہی کرتا جاتا ہے؛

گذشتہ نمبر عام طور پر نہایت مقبول ہوا لیکن موجودہ نمبر جسے پہلے نمبر سے کہیں غور و فکر کے بعد مرتب کرنے کی کوشش کیگئی ہے یقیناً اپنے گذشتہ نمبروں سے زیادہ مقبول و کامیاب ہوگا۔

آپ اس نمبر کے مضامین میں وہی رنگا رنگی، ترقی اور زندگی پائینگے جو کسی زبان کے اعلیٰ اور جدید ادب کی جان کہی جاسکتی ہے۔ ادبستان میں اڈیٹر کے مضامین کو نظر انداز کرکے جتنے مضامین ہیں وہ اپنا ایک مقصد اور اپنے اندر گہری فکر کی روح رکھتے ہیں؛

سیاسی مضامین میں "دنیا کو کیا ہوگیا؟" اور علمی و تنقیدی مضامین میں ابو نواس پر لائق علی صاحب شمیم قاسمی کا مضمون ایک نہایت جامع مضمون ہے؛ اسی طرح ترجموں میں "سرمایہ داری میں اصولی تضاد" اور "خطبات زرتشت" کوئی معمولی چیز نہیں؛

"خطبات زرتشت" مشہور المانوی فلسفی فریڈرک نیٹشے کی زبردست تصنیف کا ترجمہ ہے جس کو براہِ راست جرمنی سے محمد عبدالسلام صاحب رامپوری نے ہندوستانی کے قالب میں ڈھالا ہے؛ اور "سرمایہ داری میں اصولی تضاد" ایم، ایم جوہر میرٹھی کا ترجمہ ہے جو کارل مارکس کی مشہور تصنیف "کیپٹل" (   ) سے ماخوذ ہے۔

ہندوستان میں لوگ بے دینی، الحاد اور بے اصولی کو سوشلزم خیال کرتے ہیں اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو اصحاب سوشلزم کا پرچار

کرنا چاہتے ہیں وہ خود سوشلزم کی ابتدائی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے مگر اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کسی موضوع کے متعلق براہِ راست معلومات بہم پہنچانا اور بات ہے اور جماعتی پروپگنڈا دوسری چیز؛ جوہرؔ صاحب کا ایک اور زبردست مضمون اس نمبر کے بعد شائع ہونے والے نمبر میں آئے گا جو اس موضوع پر انکے تمام عمر کے مطالعہ اور سوچ وچار کا نتیجہ ہے -

---

"مشرق اور مغرب" کے عنوان سے ایک چینی پروفیسر کا مضمون ملک کے مشہور ادیب اسرائیل احمد خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے؛ یہ ایک دلچسپ اور اہم مضمون ہے - اس میں بظاہر مشرق ومغرب کی تہذیبی تحلیل کی گئی ہے، اور دلچسپ پیرایہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ گو مشرق ومغرب کی تہذیب اور معتقدات میں بنیادی اختلاف اور دوری ہے مگر دونوں میں اتحاد ناممکن نہیں، مقالہ نگار کا وہی اعلیٰ تصوّر ہے جو موجودہ عہد میں بڑے سے بڑے انسان کا ہو سکتا ہے - اور دُنیا کے امن کیلئے جس کی ضرورت ہے؛ اسکے ساتھ ہی طرزِ بیان دلچسپ اور بہت دلنواز ہے؛ لیکن اس مضمون کی زبان اس درجہ سخت ہے جو بجائے خود ایک موضوع ہے اور اسپر بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے؛

اسرائیل احمد خاں صاحب اور ان کا اسلوب تحریر؛ بہت ہی دلچسپ ہے، اور ایک طرح سے ان کو صاحب طرز رومیوں کی پہلی صف میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کے اسلوب میں لچک اور دلنوازی کافی سے زیادہ ہے - لیکن میرے دوست اگر مجھے معاف کردیں تو عرض کروں کہ بعض مضامین میں ان کی زبان اتنی سخت ہو جاتی ہے جسے عوام نہیں سمجھ سکتے - عوام ہی نہیں، بلکہ وہ شخص جو عربی وفارسی پر کافی قدرت نہیں رکھتا وہ بھی اکثر مواقع پر سٹ پٹا جاتا ہے -

ان کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ چند ہی برسوں میں؛ ادب اور زبان کے اسلوب اور معیار نے ایک بالکل نئی صورت اختیار کر لی ہے نئے ادب کا نیا نظریہ، ہر وقت لکھنے والوں سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ وہ بات کہیں جو زیادہ سے زیادہ سمجھی جائے اور اُسی زبان میں کہیں جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں؛

۴۲

کسی صاحب طرز سے کسی ادارہ کا یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنا اسلوب تبدیل کردے، ایک کھُلی ہوئی حماقت اور زیادتی ہے، لیکن ہم اتنا مطالبہ تو کر ہی سکتے کہ اسرائیل احمد خاں صاحب سے اعتدال کی درخواست کریں -

لیکن ان کے علاوہ میں آیشیا کے تمام کہنے والوں سے بہ ادب عرض کروں گا کہ آیشیا کسی قسم کی بے اعتدالی کا ناشر نہیں ہے؛ زبان کے معاملے میں اس کا مسلک کھُلا ہوا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اسکے مضامین ایسی زبان میں ہوں جن کو ہندو مسلمان سب آسانی سے سمجھ سکیں، اور اس میں غیر ضروری بلاغت اور ثقالت نہو؛ کیونکہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے شائع نہیں کیا جاتا اور نہ محض ادبِ لطیف کی اشاعت ہی اس کا مقصد ہے وہ خیالات اور عقائد کا رسالہ ہے اور موجودہ زمانے کی ساری دماغی وذہنی سیاسی وسماجی روح کو پیش کرنا اس کا سب سے اعلیٰ اور سب سے پہلا مقصد ہے -

میں یہ سطور اپنے دوست سیّد فرید جعفری کے مکان پر دہلی میں لکھ رہا ہوں جہاں آیشیا کے مطبوعہ اوراق میرے پاس نہیں ہیں لیکن ادبستان میں جس قدر مضامین شائع کئے گئے ہیں ان کو میں نے اچھا ہی سمجھا ہے تبھی شائع کیا ہے، اس لئے ان سب کے متعلق میری پسندیدگی اس لحاظ سے یکساں ہے کہ میں اُن سب کو آپ کی نگاہوں تک پہنچانا چاہتا تھا؛

"ہزار داستان"؛ - چند نمبر پہلے میں آیشیا میں چھپنے والے افسانوں اور ڈراموں کی طرف سے غیر مطمئن تھا - اکثر ایسا ہوتا رہا کہ ادبستان اپنی خصوصیت میں مکمل ہوگیا مگر ہزار داستان میں وہ تکمیل پیدا نہ ہو سکی جو میں چاہتا تھا لیکن مجھے اطمینان ہے کہ دو نمبروں سے ہزار داستان اپنے

افسانوی معیار میں ادبستان سے بازی لیجاتا ہے اور موجودہ نمبر میں تو اسکی تکمیل سے مجھے بیحد مسرّت ہے۔ اس مسرّت کے ساتھ ایک دلی رنج بھی ہے کہ اس نمبر میں ملک کے ترقی پسند چوٹی کے افسانہ نگار سید فرید جعفری مچھلی شہری کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ پہلے نمبر میں ان کے دو افسانہ، جوار بھاٹا اور دیمک شائع ہوئے تھے، جو اس قدر مقبول ہوئے کہ اطرافِ ملک سے تقریباً دو سو خطوط دفتر میں موصول ہوئے کہ ان کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اور محض ان کے افسانوں کی وجہ سے یہ نمبر خاص طور پر بڑی تعداد میں فروخت ہوا۔ اس مرتبہ بھی ان کی مصروفیت اور استغناء کے باوجود میں "سونے کے بٹن" ان کی قمیص سے چرا ہی لایا تھا، لیکن یہ چوری اس وقت ہوئی جب وقت کا قزاق بہت دور جا نکلا تھا اور ہزار داستان جھک کر اپنے گیتوں کی تکمیل کر چکی تھی۔ لیکن آپ کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ ان کا ایک لاجواب افسانہ "سونے کے بٹن" اور ایک ڈرامہ اپریل، مئی، جون نمبر کے لئے کاتب کو دیا جا چکا ہے۔

موجودہ ہزار داستان میں ٹالسٹائی کا مشہور افسانہ حملہ ختم ہوتا ہے۔ اس کو بہار کے ادیب وشاعر سہیل عظیم آبادی نے ترجمہ کیا اور یہ بھی بیحد مقبول ومشہور ہوا۔ سہیل صاحب ترجمہ ہی کرتے وہ خود ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی کہانی میں نئے افسانہ کے وہ تمام عناصر ہوتے ہیں، جن کی نئے ادب کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

اس باب میں کاؤنٹ ٹالسٹائی کی عالمگیر شہرت رکھنے والے ناول "اناکرینینا" کا ترجمہ شروع کیا گیا ہے۔ اسے ہمارے دوست محمود الحسن صدیقی بی۔ اے نے خاص میری درخواست پر ترجمہ کیا ہے۔

محمود خالص ادبی انسان ہیں، لیکن ان کے ساتھ قدرت نے جو ظلم کیا ہے اس کو میں جانتا ہوں، مگر کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال نامساعد حالات میں ان کا اتنا بڑا کام شروع کرنا ان کی ہمت اور قابلیت کی دلیل ہے۔

۲۴۳

دو جاذب شخصیتیں آپ کے لئے بالکل نئی ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہر نئی چیز اپنی جگہ زبردستی حاصل کر لیتی ہے۔ انسانی فطرت کی رنگارنگی اور انقلاب پسندی نئی شخصیتوں کی کامیابی کی خود ضامن ہوا کرتی ہے اور جب ان کے ساتھ ان کی منوہر خصوصیتیں بھی ہوں تو دُنیا کے محفوظ رہنے کی کونسی صورت ہے — !؟

ان دو منوہر شخصیتوں میں سے ایک نے روس کے زندۂ جاوید افسانہ نگار چخوف کا شاہکار "شہید" ترجمہ کیا ہے۔ محمد اطہر بی۔ اے بی ال بہار کے ان ذہین نوجوانوں میں سے ایک ہیں، جن کی ذات پر ادبی دُنیا فخر کر سکتی ہے۔ ایک عرصہ تک صحافتی دُنیا میں وہ بھی مجاہد کی طرح کام کرتے رہے ہیں۔ کئی سال ہوئے ان کی ادارت میں شمیم پٹنہ سے شائع ہوا تھا جو ایک اچھا رسالہ تھا۔ اطہر ہندوستان کے ترقی پسند لکھنے والوں میں سے ایک ہیں، اور دل سے لیکر دماغ تک بالکل جدید ہیں۔

ان کے علاوہ شاکر علی بھی آپ کے لئے بالکل نئے ہیں۔ جن کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "خانۂ خدا"، ہزار داستان میں شائع کیا جا رہا ہے، یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے لیکن اتنی بے ساختہ اور تخلیقی چیز ہے کہ میں نے اسکے نیچے "طبعزاد" خود اپنے قلم سے لکھ کر وہ مسرّت حاصل کی ہے جو شاکر علی کے تمام تر مستقبل کا پتہ دیتی ہے!

شاکر علی مولانا محمد علی کے قریبی عزیزوں میں سے ایک ہیں۔ لیکن دماغی طور پر وہ بالکل دوسری چیز ہیں، ان کے افسانوں اور ڈراموں میں زندگی کے اُن گوشوں سے پردہ اُٹھتا نظر آتا ہے جو اب تک نامعلوم تھے۔ وہ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو چھیڑتے ہیں اور انکا

انداز بیان اور زبان کی نزاکت ان کی کہانیوں میں وہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے جو کسی آرٹسٹ کا مقصود ہوا کرتی ہے۔

بعض لوگ ادب کے نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ ساتھ یہ خیال نہیں رکھتے کہ ترقی پسند ادب کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ادب میں کھردرا پن پیدا ہو جائے اور واقعیت نگاری (Realism) سے مطلب یہ نہیں ہے کہ تصور کے سامنے ایسے گھناؤنے مناظر آ جائیں جس کو ابھی انسانی ذہن برداشت نہیں کر سکتا۔

شاکر علی باوجود جدت اور انقلاب کے صناعانہ لوچ اور لچک کو اپنی کہانیوں میں خاص طور پر قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں آئندہ نمبر میں ان کے دو افسانے شائع کئے جائینگے جن کو پڑھ کر آپ یقینی محظوظ ہونگے۔

ل۔ احمد صاحب (زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔) کا ترجمہ کیا ہوا ایک ڈرامہ ہزار داستاں کی جان ہے۔ یہ چینی وطن پرستی کو پیش کرتا ہے اور ایسی حالت میں کہ جاپان و چین کی آویزش ابھی ختم نہیں ہوئی کافی برمحل ہے۔ لطیف احمد صاحب کو کوئی خراجِ عقیدت پیش کرنا گویا ان کی مسلّمہ شخصیت کے ساتھ ایک مذاق کرنا ہے۔ لطیف نے اُردو ادب کی جس سنجیدگی کے ساتھ خدمت کی ہے اس کی مثال نہیں، اور اس خدمت کے ساتھ اپنے تغیّر اور ترقی کا جو ثبوت دیا ہے وہ ان کے تدبّر اور ذہانت کی دلیل ہے۔

ان حضرات کے علاوہ وہ بھی ہزار داستاں کے جس قدر افسانہ نگار ہیں میں ان کی فرداً فرداً کیا تعریف کروں، کسی رسالے کے غریب اڈیٹر کا سب سے پہلا اعتراف تو وہ لمحۂ عمل ہوتا ہے جب وہ کسی مضمون کو چھاپنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسکے بعد کی باتیں محض ادبی رسم و رواج ہے۔ جواب زیادہ مرغوب طریقہ نہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ ان قدامتوں سے اب پرہیز ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

سب سے پہلی بات سب سے آخر میں جب کہی جائے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس بات کی تقدیم کا نمایاں طور پر اقرار کر رہے ہیں۔ اس نمبر میں "ایک بے نام آرٹسٹ" کا ایک پنسل اسکیچ بھی شائع ہو رہا ہے جو ہمارے دوست ضیاء الاسلام بی، اے کے دلکش گیت کے ایک بند کی تصویر ہے۔ مصوّر یا مصوّرہ بہرحال تصویر بنانے والا جس صنف سے بھی تعلّق رکھتا ہے۔ نہایت نازک نقاش ہے اور شاعر کے جذبات کو اپنے خطوط میں ظاہر کرنے کی ایسی اہلیت رکھتا ہے جو اس کو موضوع کا ماہر اور نبّاض ثابت کرتی ہے۔

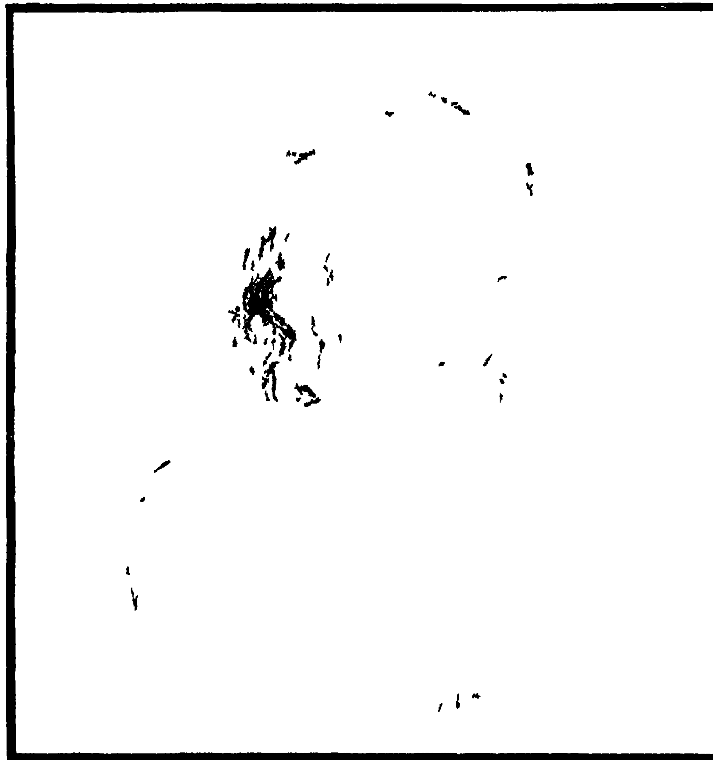
"میخانۂ الہام" میں ملک کے مشہور و غیر مشہور شعراء کا منتخب کلام ہے۔ غزل، انقلابی نظمیں، گیت اور رنگا رنگ نظمیں ہیں اور ہر نظم پڑھنے اور پڑھ کر جھومنے کے قابل ہے۔ سوائے ان نظموں کے جن کے نیچے یا اوپر "ساغر" لکھا ہوا ہے۔ میں نے بارہا ان نظموں کو پڑھا اور جھوما۔ میرے کیف کا حاصل اب آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ پڑھئے اور جھومئے۔

نظموں میں جنوبی ہند کی شاعرہ مس پاروکٹی اماّ کی ایک انگریزی نظم بھی کافی دلدوز ہے۔

آخر میں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا جنھوں نے اس شاندار نمبر کے لئے خاص طور پر اپنے نثر و نظم کے مضامین عنایت فرمائے۔ میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ میں ان کی پُرخلوص نوازشوں کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔

دہلی ۸ ۹/۴۳ء

ساغر



چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں
سو [illegible] ہیں
دل سے [illegible]



SAGHAR

His collection of Urdu Poems, 'Bada-i-Mashriq' was sold out in a short time. Now its Hindi Edition is in Press.

ادبستاں

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء
جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۳۹ء
(مشترک نمبر)



اردو ادب کی مقبول ترین کتاب
جسکا اردو اڈیشن [illegible] ہزار کی
تعداد میں فروخت ہوچکا
اور ہندی ایڈیشن زیرطبع ہے

دنیا کو کیا ہو گیا!؟

(از سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

دُنیا کی بدحالی کوئی معمہ نہیں۔ پھر بھی یہ سوال اُٹھتا ہی رہتا ہے کہ آخر جب سب لوگ امن اور سکون چاہتے ہیں تو پھر ہر قوم اپنی کمائی کا زیادہ سے زیادہ حصّہ، رائفلوں، مشین گنوں، ہوائی جہازوں، بحری بیڑوں، فوجی پلٹنوں، زہریلی گیسوں، اور طرح طرح کے دفاعی آلات جنگ پر کیوں صرف کر رہی ہے۔

پریشان حال دُنیا ایسے سینکڑوں سوال کرتی ہے۔ سوالوں کی شکلیں اگرچہ مختلف ہیں لیکن سب کی تہ میں سوال ایک ہی ہے۔ یعنی دُنیا کو کیا ہو گیا؟ یہ کس مرض میں گرفتار ہے۔ اس "کیا ہو گیا" کا جواب ہماری انسانی سوسائٹی کا سب سے اہم اور روزانی مسئلہ ہے۔ یہ سوال اس وقت سے چلا آتا ہے جبکہ پہلے پہل سوسائٹی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ "کیا ہو گیا" میں ہی "کیوں ہو گیا" بھی چھپا ہوا ہے۔ اس وقت مجھے پُرانے زمانہ کو بحث میں لانا مقصود نہیں ہے۔ پُرانی دُنیا کا زاویۂ نگاہ مختلف تھا۔ اگرچہ مرض اس کا بھی اسی طرح کا تھا لیکن اس نے روحانی فردوس میں پناہ تلاش کر لی تھی۔ ہماری دُنیا جسم اور روح کی بیماریوں کا علاج چاہتی ہے۔ تشخیص نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ تشخیص وہ خود کر چکی ہے۔

ہاں! تو اصل سوال یہ ہے کہ دُنیا پریشان کیوں ہے؟ وہ پریشان اس لئے ہے کہ وہ بھوکی ہے۔ پہلے وہ بھوکا رہنے پر قناعت کر سکتی تھی۔ لیکن اب تجربوں نے اسکی آنکھیں کھولدی ہیں۔ اب وہ قناعت نہیں کر سکتی۔ پہلے اس کا عقیدہ تھا کہ "حق طاقت ہے" جو بالآخر غالب ہوتا ہے۔ اب وہ سمجھ گئی ہے کہ دراصل "طاقت حق ہے" یہ فیصلہ سینکڑوں صدیوں کے تجربہ کا حاصل ہے۔

یوں تو ہر زمانہ انقلابی ہوتا ہے لیکن ہمارے زمانہ میں جو محرکات کام کر رہے ہیں ان سے ایک غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے مختلف اور متضاد فلسفوں کی ٹکر، نظریوں کا اُلٹ پھیر، اور ان سب سے زیادہ ہر معاملہ پر سائنٹفک انداز میں غور و فکر کرنے کی عادت نے مسائل کو صاف بھی کر دیا ہے اور اُلجھا بھی دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسکے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اور ہر قوم آزادی اور حقوق کے صحیح مفہوم سے واقف ہو چکی ہے۔ اس لئے حق تلفیوں کو مٹانا اور عدل قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک عام بیداری ہے۔ اس بیداری سے خوش حال بدحواس ہیں اور بدحالوں میں ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دُنیا میں ہیجان بپا ہے۔

اس وقت دُنیا کی نبض یورپ کے ہاتھ میں ہے۔ چند مستثنیات کے علاوہ چپہ چپہ دُنیا کا اسکے قبضہ میں ہے۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر یورپ کی سیاسیات پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔ کیونکہ یہی سیاسیات موجودہ عہد میں دُنیا کی بدحالی کی ذمّہ دار ہیں۔

یورپ کی بڑی جنگ ہوئی۔ سب لوگوں نے ایک جگہ اکٹھا ہو کر یہ سوچا کہ آئندہ خونریزی کیسے بند کی جائے۔ امریکی جمہوریت کے صدر "ولسن" نے اس کا علاج (Self Determination) یعنی (حکومت خود اختیاری) کے سنہری اصول میں پیش کیا۔ اصول تو اچھا تھا لیکن اس پر عملدرآمد کیسے ہوتا؟ جس کمرہ میں اس اصول کی آواز گونج رہی تھی وہاں سب کے سب "چودھری" تھے۔ ہر ایک کے حلقۂ ارادت میں غلاموں کی ایک دُنیا آباد تھی۔ اس لئے یہ اصول اپنی پیدائش سے قبل ہی موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ ایک نیا آلہ تیار کیا گیا جس کا ظاہری حُسن بلا شبہ دلفریب تھا لیکن اندر سے وہ کھوکھلا تھا۔ تشخیص صحیح تھی مگر نسخہ غلط لکھا گیا۔ "انجمن اقوام" یعنی (League of Nation) کے دعوے خواہ کچھ بھی ہوں، یہ واقعہ ہے کہ عدم مساوات نے بعض اقوام کے لئے دُنیا تنگ کر دی ہے اور بعض قومیں تمام قدرتی ذرائع کی مالک بن بیٹھی ہیں۔ یہ عدم مساوات اقتصادی ہے۔ اخلاقی یا نسلی نہیں۔ دُنیا کی محروم قومیں اس عدم مساوات کو زیادہ عرصہ تک برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم گھر میں بیٹھ کر امن و امان کا وعظ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ہمیں زندگی کی تمام ضروریات میسر ہیں۔ دن رات عیش و آرام سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ عالیشان محل اور ان کی پر تکلف آرائشیں۔ بنکوں میں موٹی موٹی رقمیں ہماری خوش حالی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ضمانتیں ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے آس پاس کوئی شورش نہ ہو۔ لیکن ہمارا پڑوسی جس کے پاس موسموں کے گرم و سرد سے اپنا بدن بچانے کے لئے نہ کپڑا ہے اور نہ مکان، اور جسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا، خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتا، جب وہ شور مچاتا ہے تو ہمارے آرام میں خلل پڑتا ہے اور ایسے شخص کو ہم امن شکن، غنڈا، اور بدمعاش کہنے لگتے ہیں گویا کہ امن کے معنی صرف ہماری عیش پسندانہ زندگی ہے اور سکون کا مطلب صرف ہماری طمانیت قلب میں پوشیدہ ہے۔ لیکن ذرا اصلیت کے کرخت چہرہ سے پردہ اُٹھا کر دیکھئے۔ حقیقت میں اس ہیجان اور شورش کا باعث خود ہم ہی ہیں اور دُنیا کا امن و امان ہماری ہی خود غرضی اور کم نگاہی کا شکار ہو رہا ہے۔

ولسن کی غلطی تھی کہ اس نے اصولِ حکومتِ خود اختیاری (Self Determination) کا صور پھونکا۔ آج وہ یا اسکے ماننے والے گہری نظر سے دیکھیں کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ انجمن اقوام نے جن ہاتھوں میں پرورش پائی وہ آزاد اور خودمختار ریاستیں تھیں۔ خود انجمن اقوام کو فرمانروائی کا حق حاصل نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خوش حال اور بدحال ریاستوں میں تصادم ہوا، جرمنی، اٹلی اور جاپان کا کھُلا ہوا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے بقا کے لئے زیادہ زمین اور منڈیاں لیکر ہٹینگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں بدامنی کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یورپ کی بدامنی کی وجہ سے تمام عالم کا امن و امان خطرہ میں ہے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس صدی میں جبکہ جمہوریت اپنے وسیع ترمعنوں میں دُنیا کے سامنے پیش کی جا رہی ہے مطلق العنان حکمراں اتنی بڑی آبادیوں کو اپنے قابو میں کیسے کئے ہوئے ہیں۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ان ممالک میں جمہوریتیں ناکام رہیں یہ ناکامی اس لئے نہیں تھی کہ عوام جمہوریت سے بیزار تھے بلکہ اسکی وجہ محض یہ تھی کہ وہاں کی جمہوریتیں عوام کی اقتصادی بدحالی کا کوئی علاج نہ کر سکیں۔ یہ کچھ جمہوری نظام پر ہی موقوف نہیں۔ اس سے پہلے شخصی حکومتیں بھی اسی مرض کا شکار ہو چکی ہیں۔ اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر دُنیا کے موجودہ ڈکٹیٹر اپنے اپنے حلقوں میں اقتصادی مسائل کا حل نہ کر سکے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو نا کام حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ "فاسزم" اور "نازی ازم" حقیقت میں "مسولینی" اور "ہٹلر" کا نام ہے۔ اور "مسولینی" اور "ہٹلر" اطالوی اور جرمن قوموں کی اقتصادی بدحالی کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ اُس عدم مساوات کا عملی اظہار ہیں جو صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اقتصادی ہے۔

جنگ کے ختم کرنے کا دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس کا علاج غلط کیا گیا۔ موجودہ حالات کی تحلیل کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام

قوموں کے لئے سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی تحفظ کی بھی ضمانت ہو۔ اگر دُنیا کی قومیں آزاد ہو کر اقتصادی بیچارگی سے نجات حاصل کر لینگی تو پھر کوئی ایسی بین الاقوامی انجمن آسانی کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہے جو امن عالم کی حفاظت کر سکے۔ جب دُنیا کا ایک ہی مفاد ہو گا تو پھر کسی بوالہوس قوم یا فرد کو یہ جرأت نہ ہو سکے گی کہ تمام دُنیا کا مقابلہ کر سکے۔ آج محروم قوموں کے بچوں کو گہوارہ سے ہی مارنے اور مرنے کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن جب سیاسی اور خصوصاً اقتصادی خوش حالی عام ہو جائیگی تو عالمِ انسانیت کے تمام بچے امن و امان کی فضا میں پرورش پا کر ایک بالکل نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ دُنیا کی عملی زندگی میں شریک ہونگے۔

مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ جمہوریت کے نام پر قوم پرستی اور قوم پروری کی جا رہی ہے، بلاشبہ قومی نظامِ ریاست (Nation State System) خطروں سے بھرا ہوا ہے کسی مضبوط ہمہ گیر قانون کی عدم موجودگی میں قوموں کے باہمی تعلقات، ان کی چیرہ دستیاں اور جارحانہ کارروائیاں انکی قومی پالیسی کے مطابق ہوتی ہیں۔ ہر حکمران قوم اپنی قوت کو بڑھانے کی غرض سے ان تمام ذرائع اور وسائل کو حاصل کرنا چاہتی ہے جو اُسکی قومی پالیسی کو کامیاب بنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں انہیں محکوم قوموں کے وسائل کو چھیننا پڑیگا اور اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ محکوم قومیں اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو کر نہ چین سے بیٹھیں گی اور نہ بیٹھنے دینگی۔

یہ مختصر داستان تو آزاد اور حکمران قوموں کی ہے اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ دُنیا کی ابتر حالت کی ذمہ داری سب سے زیادہ اُس جارحانہ قومیت پر ہے جو سینکڑوں برس سے یورپ کے دامن میں پرورش پا رہی ہے لیکن محکوم قوموں کی کہانی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ یورپ میں تو ذہنی انقلاب سے طوفان بپا ہے۔ لیکن محکوم اقوام خصوصاً ایشیا والوں کا دامن ابھی ابھی ذہنی انقلاب سے تر ہوا ہے۔ یوں تو آزادی کا جذبہ ہر شخص میں فطرتی ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایشیا نے "روسو" اور "والٹیر" کی آواز کو حال ہی میں سُنا ہے۔ آزادی، مساوات، اور بھائی چارہ کا نعرہ محکوم قوموں کو اُبھارتا چلا جارہا ہے۔ اگر یہ انقلابی ذہنیت کوئی اچھی چیز ہے تو یورپ قابلِ شکریہ ہے اس لئے کہ یہ اُسی کے خوانِ نعمت کے تبرکات ہیں جنہیں غلام قوموں نے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ اس جذبہ سے ایک طرف قوم اور قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے اور دوسری طرف سوشلزم کے فلسفہ نے گرے ہوئے طبقوں کو چونکا دیا ہے۔ اس طرح محکوم قوموں میں دو تحریکیں بڑی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہیں یعنی "قومی آزادی" اور "اقتصادی مساوات"۔ ان تحریکوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ حاکم اور محکوم، امیر اور غریب کے درمیان خلیج بڑھتی جاتی ہے اور امن و سکون کا سامان برہم ہو گیا ہے۔

"قوم" اور "قومیت" اس زمانہ کی سب سے بڑی حقیقت ہے لیکن اس سُنہری خول میں انسانی نامرادی کا زہریلا مادّہ پوشیدہ ہے "حکومتِ خود اختیاری" (Self Determination) کے اصول کا جوڑ قومیت سے ملایا جاتا ہے لیکن یہ نہ صرف غلط بلکہ کھلا ہوا فریب ہے۔ قومیت کے اصول ضرور چمکیلے ہیں لیکن اس کا منتہا آنکھوں کے سامنے ہے۔ دُنیا آگ اور خون کی بارش میں صرف قومیت کے نام پر نہا رہی ہے۔ سوچنے والا سوچتا ہے کہ آخر جب قومیت کی بڑائی اور خصوصیت اسی میں ہے کہ قومیں آپس میں ٹکرائیں اور کمزور قوموں کی گردنوں میں غلامی کا طوق بدستور پڑا رہے تو پھر "حکومت خود اختیاری" کے کیا معنی ہیں۔ اس کا فکر صرف ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ (Self Determination) انسانی زبان کا سب سے زیادہ مہمل لفظ ہے اور اس لئے قطعاً بے حقیقت ہے۔ "قومی برتری" اور اس "برتری" کو قائم رکھنے لئے دوڑ دھوپ دُنیا کو مصیبتوں کی طرف ڈھکیل رہی ہے کون نہیں جانتا کہ قومی برتری برقرار رکھنے کیلئے جو رقابتیں سیاسی مدبّروں کے سینوں میں مشتعل ہیں ان کا لازمی نتیجہ اقتصادی تباہ کاری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اقتصادی تباہ کاری میں ایک ہولناک مستقبل پوشیدہ ہوتا ہے۔ لوگ بھوکے مرتے ہیں۔ بیماریاں پھیلتی ہیں۔ تجارت ختم ہو جاتی ہے اور آخر میں انسانی آبادی گھٹنے لگتی ہے غور کیجئے کہ ہمارے ذہن کی یہ کتنی عجیب حالت ہے کہ ایک سانس میں دُنیا کے امن و امان اور خوشحالی کا وعظ کہتے ہیں اور دوسرے سانس میں اسی امن و امان اور خوش حالی کی جڑوں کو اُکھاڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

انسانی ترقی کے سفر میں ایک منزل راہ میں ملتی ہے۔ یہ منزل سوشلزم کی ہے۔ اسکے دعوے بہت بلند ہیں لیکن اس کی قسمیں اتنی مختلف کہ اسکی ہمہ گیری بھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اقتصادی بدحالی دور کرنے اور روندے ہوئے طبقوں کو فرمانروائی دلانے میں صرف یہی ایک پروگرام مفید اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نظریئے کے مفسروں میں بھی وہی جنگ و جدل ہے جو جماعتی لیڈروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ طاقتور سوشلسٹ یہ چاہتا ہے کہ سوشلزم کے معنی صرف اتنے ہی سمجھے جائیں جتنا وہ سمجھتا ہے اور جتنا سمجھنے کی وہ اجازت دیتا ہے۔ آج اگر سوشلزم کے ماننے والوں میں سے کسی ایک فرد یا جماعت کو عوام کی خوشنودی حاصل ہے تو وہ اپنے ان تمام رفیقوں کو مٹا دیتا ہے جنہوں نے سوشلزم کی بنیاد رکھنے اور اسکے پھیلانے میں بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ وہ بھی فاشسٹ ڈکٹیٹروں کی طرح جنگ کرتا ہے اور کراتا ہے اس کی جنگ بھی کسی کمزور کی حمایت میں نہیں بلکہ سیاسی چالوں میں الجھی اور جماعتی اغراض میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی سرحد کے لئے زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر اپنی توپوں کے آتشیں دہانے کھول سکتا ہے لیکن خون سے لتھڑی ہوئی چین کی مظلوم آبادی اس کے دل کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ سوشلزم بحیثیت فلسفہ اور چیز ہے اور بحیثیت عملی پروگرام ایک بالکل مختلف چیز۔ یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ تمام دُنیا کے خیالات یکساں ہو جائیں۔ اس لئے وہ تمام تحریکیں جو اپنے دائرۂ عمل میں مخالفوں کی گنجائش نہیں رکھتیں بلاشبہ لڑائی جھگڑے اور کشت و خون کا باعث ہونگی۔

میں نے کہا ہے کہ انسانی بدحالی میں اقتصادی ناانصافی کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ لیکن اسکے علاوہ ایک اور چیز ہے جو اگرچہ اسی ناانصافی کا براہِ راست نتیجہ ہے مگر علیحدہ اپنی مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یہ چیز زبردست نفسیاتی حقیقت ہے۔ اگر صنعتی اور تجارتی ٹھیکے رحم و کرم سے خالی ہیں تو کم شکستہ بیچارے بھی کچھ کم سنگدل نہیں۔ اگر ایک طرف دولتمند کا دل اُس مشین کی مانند ہے جو ہر اُس چیز کو پیس دیتی ہے جو اُس کے دباؤ میں آ جائے تو دوسری طرف غریب طبقہ بھی وقت کا منتظر رہتا ہے اور گلوٹین کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ مزاجوں میں تلخی، طبیعتوں میں انتقام کا تلاطم، اور اپنے اپنے مخالفوں کے نام و نشان کو مٹا دینے کا ارادہ، انسانی سوسائٹی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ڈر معلوم ہوتا ہے کہ علمی ترقی کی حشر سامانیوں کی طرف کوئی اشارہ کیا جائے۔ گذرا ہوا زمانہ روحانی تحریکوں کی عبرت آموز تصویر پیش کرتا ہے۔ مذہب اور روحانیت کے نام پر لاکھوں انسانوں کی بھینٹ چڑھائی جا چکی ہے اور آج تک اس مقدس دائرہ کے تعصبات سیدھے سادے لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ روحانی تعلیم دوسری زندگی میں فردوس پیش کرتی ہے مگر اس دُنیا کی زندگی کو اس نے جہنم زار بنا دیا ہے۔ بڑے ادب اور احترام کے ساتھ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ دُنیا کی بدحالی کی ذمہ داری کافی حد تک اس مقدس طبقہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

تہذیبِ جدید کو علمی ترقی پر ناز ہے اور بلاشبہ بجا طور پر ناز ہے لیکن نتائج کی کسوٹی پر علم کی ترقی کو پرکھا جائے تو ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ سائنس نے قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں کو معلوم کیا۔ یہ مانا کہ تحقیق کرنے والوں کی نیت اچھی تھی۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نسل انسانی کو اس سے بڑے بڑے فائدے ہوئے۔ علم انسانی وہم و گمان سے نکل کر تجربہ اور مشاہدے کے میدان میں آ گیا۔ ریل، ہوائی جہاز، لاسلکی ٹیلیفون ٹیلیگراف، اور ریڈیو نے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا۔ طب نے ایسے ایسے بیمار اچھے کر دئیے جو موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ درست مگر انسان نے انسانیت کو قوموں، طبقوں، برّاعظموں، مشرقیوں اور مغربیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ تقسیم برابر جاری ہے۔ سائنس نے ان ٹکڑیوں کے ہاتھوں میں کیسے کیسے ہلاک کرنے والے ہتھیار دیدئے ہیں۔ جو سائنس ایک بیمار کو اچھا کرنے میں کچھ وقت مانگتی ہے وہی سائنس پلک جھپکنے میں سینکڑوں بے گناہ جانوں کو بھک سے اُڑا دیتی ہے۔ سائنس کے بے پناہ ہاتھ سول آبادیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں مصروف ہیں۔

جو دولت انسانی بستیوں کو خوش حال بنانے کے لئے پیدا کی جاتی ہے اُس کا سب سے بڑا حصّہ سائنس کے بتائے ہوئے اُس سامان پر صرف کیا جا رہا ہے جس کا رزق بے گناہ انسانوں کا گوشت اور ہڈیاں ہیں۔ اس میں شک نہیں سائنس نے ریگستانوں کو گلزار بنایا۔ بیابانوں کو سرسبزی شادابی بخشی، بنجر زمینوں میں پھل اور پھول لگائے، غلہ پیدا کیا، لیکن ! دل کی بستی سونی کر دی۔ انسانوں کو درندہ بنا دیا۔

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

کہا جا سکتا ہے کہ علم کا اس میں کیا قصور ہے۔ لیکن کاش علم مادّی شکل اختیار کر سکے تو اُس سے پوچھوں کہ جب تجھے اپنے جائز استعمال پر قدرت حاصل نہیں تو پھر کیوں نا اہل دماغوں میں داخل ہو کر بھولے بھالے انسانوں کی بستیوں کو ویران کراتا ہے۔ ہماری بدحالی میں سائنس کا بھی اچھا خاصہ حصّہ ہے۔

دُنیا کی تباہ حالی پر یہ مختصر تبصرہ ہے۔ واقعات ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو "حیوانِ ناطق" کہا جائے یا "حیوانِ خوں آشام"۔ درندوں نے جو کام پنجوں اور جبڑوں سے لیا ہے انسان وہی کام "عقل" سے لیتا چلا آیا ہے نقطۂ آغاز سے ابتک انسانی تہذیب نے سینکڑوں نظام بنائے اور بگاڑ دئیے۔ ہر تہذیب نورانی چہرہ لیکر نازل ہوئی انسان کی بیماری کا نسخہ اسکے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ لیکن بیماری دور نہ کر سکی۔ اور بیماری دور ہوتی بھی کیوں؟ جتنی نئی تہذیبیں آئیں انہوں نے انسانیت کو نئے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ نئی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ محبت کا سبق بھی دیا مگر محدود حلقوں میں 'تعصب' جسے مٹنا چاہئیے تھا ہمہ گیر ہو گیا اور محبّت جسے ہمہ گیر ہونا چاہئیے تھا امتیازات کے دائروں میں مقیّد ہو گئی۔

۱۵۱

میرا نہ یہ منصب ہے اور نہ مجھ میں یہ اہلیت کہ اس عظیم الشان مسئلہ کا حل پیش کروں "دُنیا کو کیا ہو گیا" اور "کیوں ہو گیا" اسکے اسباب اور حالات ظاہر ہیں۔ بنیادی سبب کا یہ ہے کہ اقتصادی عدم مساوات نے دنیا میں بدامنی پھیلا رکھی ہے۔ اسی سے نفسیاتِ انسانی پر اثر پڑتا ہے اور موجودہ ہیئت اجتماعیہ میں جو اکثر و بیشتر سرمایہ داری کی بنیادوں پر قائم ہے، ہر فرد اور ہر ملّت نہ صرف اپنے تحفظ اور خوشحالی کی خاطر "قوم پرستانہ" نظامات کو زیادہ مضبوط اور مستحکم بنانے کی گھات میں ہے بلکہ قومی برتری اور سامراجی خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے کمزور اقوام کو اپنے پنجوں میں گرفتار کر کے تمام ذرائع پیداوار، رسل و رسائل، اور تجارت و صنعت پر اپنا قبضہ جمانا اور جو کچھ ابتک حاصل ہو چکا ہے اسے اور زیادہ بڑھانا چاہتی ہے۔ تو گویا نسل انسانی کا حقیقی مرض اقتصادی عدم مساوات ہے اور موجودہ بدامنی کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اقتصادی عدم مساوات کو دور کیا جائے۔ حقیقی سوشلزم (اگر وہ باہمی رقابتوں اور دماغی و ذہنی کشمکشوں سے پاک و صاف ہو) امن عالم کی بنیادوں کو قائم کر سکتا ہے کیونکہ سوشلزم کے امہات میں اقتصادی مساوات ایک رکن اعظم ہے۔ اس جگہ حقیقی کا لفظ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جس سوشلزم میں بدستور طبقاتی حد بندیاں قائم ہوں وہ حقیقی سوشلزم کہلانے کا مستحق نہیں۔ آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ روحانیت اور مادیت کو ہر سلسلہ میں ٹکرا دیا جاتا ہے۔ سوشلزم کے بہت سے مادی نظریات کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو کر ان لوگوں کے دلوں میں سوشلزم کے خلاف ایک زبردست مخالفانہ جذبہ پیدا کرا دیتے ہیں جو صحیح یا غلط طور پر 'روحانیات' پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ مادیت اور روحانیت کی اس مسلسل جنگ نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کائنات کی حقیقت کا مبدا ایک نامعلوم سبب کو تسلیم کر لیا جائے اور اسے خالق اور قادرِ مطلق "خدا" مان لیا جائے یا اسکے برخلاف یہ کلیۃً تسلیم کر لیا جائے کہ اسباب کا سلسلہ لامتناہی ہے اور وہ کسی ایک نقطہ پر ختم نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ ہر وجود کا ایک مادی سبب ہونا ضروری ہے تو اس تمام بحث کا انسان کی زندگی اور اسکے زندہ رہنے سے کیا تعلق ہے۔ خدا پر عقیدہ رکھنے والا

شخص بھی اشتراکی سوسائٹی کا اتنا ہی کار آمد رکن ہو سکتا ہے جتنا کہ خدا کا منکر۔ روٹی، مکان، لباس اور ضروری تفریحات کی ضرورت ہر شخص کو یکساں ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد کسی ایسے نظام میں شامل ہونے سے احتراز کرے گا جو اسے "زندہ رکھنے کا ضامن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری فلسفیانہ موشگافیوں نے ہماری زندگی کو اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ اور لڑائی درحقیقت مفکّرین کے درمیان ہے جو اپنے اپنے نظریّہ کو صحیح منوانے کی خاطر عوام میں معرکہ آرائی کراتے رہتے ہیں۔ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی ان تمام ذرائع سے مساوی طور پر فائدہ حاصل کرے جو اس کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہیں ان تمام ذرائع کے صحیح استعمال کیلئے ایک عملی پروگرام کی ضرورت ہے اور اس عملی پروگرام کو رائج کرنا ہر انصاف پسند شخص کا فرض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ابتک دوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھاکر آسودہ حال بنے بیٹھے ہیں وہ اس پروگرام کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرینگے لیکن بہرکیف دُنیا کی آبادی کا زبردست حصّہ بالآخر ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوگا جو مُٹھی بھر انسانوں کے مفاد کی خاطر عوام کے ناتراشیدہ جذبات سے کھیلتے اور انہیں افیون گھولکر پلاتے رہتے ہیں۔ لیکن سوشلسٹ پروگرام کی کامیابی کیلئے ایک شرط ضروری ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے عملی پروگرام کو فلسفوں اور نظریوں کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے اور لوگوں کو اس بات پر مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اشتراکی سوسائٹی میں داخل ہونے سے قبل کسی خاص فلسفہ یا نظریّہ کو قبول کرلیں۔ یہ ذہنی استبدادیت اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ حکمراں استبدادیت۔

کوئی پروگرام اٹل نہیں ہو سکتا اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سوشلزم کوئی اٹل قانون ہے ممکن ہے کہ انسان اپنے ارتقائی سفر میں اس سے بھی بہتر کوئی پروگرام بنائے۔ بہرطور وقت کی سب سے بڑی ضرورت اقتصادی مساوات کا قائم کرنا ہے۔ اقتصادی مساوات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سی خوبیاں خود بخود پیدا ہو جائینگی جو ایک مہذّب سوسائٹی کو ممتاز بناتی ہیں اور عالمگیر برادری بنا سکتی ہیں۔

جامِ خمار

(محترمہ جبین صاحبہ خمّار)

اُنہیں یاد ابھی تک ہے وہ زمانہ ترا — نظر بچا کے وہ آنا بصد بہانہ ترا

جبینِ شوق مری کس طرح نہ جُھک جائے — کہ سجدہ گاہِ محبت ہے آستانہ ترا

دلوں کو کیوں نہ ہلا دے کمالِ درد کے ساتھ — کہ میری آہ کے پردے میں ہے ترانہ ترا

خمّار کاش وہ خورشیدِ حُسن کہدیتا

کہ میرے نور سے چمکا سیاہ خانہ ترا

صدائے قوت وحیات

(شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

مسرّت کی تانیں اُڑاتا گذر جا — جہاں کو ترانے سُناتا گذر جا
بشاشت کے دریا بہاتا گذر جا — گذر جا زمانے سے گاتا گذر جا
گذر جا زمانے سے گاتا گذر جا

ہر اک دل نشانہ ہے خوف و خطر کا — ہر اک روح مسکن ہے برق و شرر کا
دھواں ہر نفس میں ہے سوزِ جگر کا — بھیانک ہے ہر ذرّہ اس رہ گذر کا
حسینوں سے آنکھیں لڑاتا گذر جا

مٹا ڈال احساسِ آزارِ غم کو — جو دانا ہے تو پھینک دے بارِ غم کو
جلا دے فرامینِ سرکارِ غم کو — جری ہے تو ہر اک دیوارِ غم کو
ہلاتا، بٹھاتا، گراتا گذر جا

صراحی میں بھر بادۂ سرخوشی کو — چڑھا بے خطر بادۂ سرخوشی کو
بنا ہم سفر بادۂ سرخوشی کو — جدھر سے گذر بادۂ سرخوشی کو
گراتا، بہاتا، لنڈھاتا گذر جا

فراغت ہی میں نورِ شمس و قمر ہے　　خوشا وہ فراغت سے جو بہرہ ور ہے
فراغت کا ہر لمحہ لعل و گہر ہے　　فراغت کی ہر سانس عمرِ خضر ہے
فراغت سے جیتا جلاتا گذر جا

حیاتِ دو روزہ کی نادانیوں پر　　خطا اور خطا کی پشیمانیوں پر
زمان و مکاں کی ستم رانیوں پر　　مصائب کی ہنگامہ سامانیوں پر
نظر ڈالتا مُسکراتا گذر جا

وغا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں　　وغا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں
بلا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں　　جفا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں
مسرّت کے پرچم اُڑاتا گذر جا

یہ مانا کہ یہ زندگی پُر الم ہے　　یہ مانا کہ یہ زندگی موجِ سم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی ایک ستم ہے　　یہ مانا کہ یہ زندگی غم ہی غم ہے
سرِ غم پہ ٹھوکر لگاتا گذر جا

مسافر کو ہے کب مفر گھاٹیوں سے　　جھجکتا ہے کیوں آ گذر گھاٹیوں سے
نہ ڈر وادیوں سے نہ ڈر گھاٹیوں سے　　زمانے کی پُر شور و شر گھاٹیوں سے
اگر مرد ہے گنگناتا گذر جا

بڑی پُر فسوں ہے حوادث کی دُنیا　　سراسر جنوں ہے حوادث کی دُنیا
طلبگارِ خوں ہے حوادث کی دُنیا　　یہ دُنیائے دُوں ہے حوادث کی دُنیا
حوادث کو نیچا دکھاتا گذر جا

حقائق بہت گرم و راحت شکن ہیں   حقائق بہت تند و عشرت شکن ہیں
حقائق بہت ترش و طاقت شکن ہیں   حقائق بہت تلخ و ہمت شکن ہیں

حقائق سے دامن بچاتا گذر جا

جہاں کی روش ہے بہت ظالمانہ   ریا ہر فسوں ہے دغا ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوۂ عامیانہ   کہ آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو زمانہ

زمانے کو آنکھیں دکھاتا گذر جا

اگر ہر نفس ہے ستانے پہ مائل   اگر زندگی ہے رُلانے پہ مائل
اگر آسماں ہے مٹانے پہ مائل   اگر دہر ہے رنگ اُڑانے پہ مائل

خود اس دہر کا رنگ اُڑاتا گذر جا

چلا چل فراغت کی تانیں اُڑاتا   گرجتا ہوا گونجتا دندناتا
مسرّت کی زنجیرِ در کھٹکھٹاتا   زمانے میں آیا تھا دھومیں مچاتا

زمانے سے دھومیں مچاتا گذر جا

خلافِ گنہ سب کا فتویٰ ہے لیکن   حرم میں بھی یہ شور برپا ہے لیکن
کلیسا بھی آنکھیں دکھاتا ہے لیکن   فریبِ مئے و نغمہ رسوا ہے لیکن

فریبِ مئے و نغمہ کھاتا گذر جا

مسطّح نہیں گو کہیں صحنِ ہستی   بڑھا چل، بڑھا چل بہ ایمائے مستی
کوئی شے نہیں راہ کی چیرہ دستی   ہر اک گام ہے گو بلندی و پستی

مگر نشے میں لڑکھڑاتا گذر جا

حسن ابنِ ہانی ابو نواس

دورِ مولّدین کا کامیاب ترین ہجو گو شاعر

دنیا کا دل و دماغ تغیّر و انقلاب پسند ہے یا یوں کہئے کہ پردۂ عالم پر اس رنگین اور متحرک تصویر کو دیکھتے دیکھتے انسان اس کا اس حد تک خوگر ہوگیا ہے کہ اب اسکے نزدیک تنوع و نیرنگی ایک دلچسپ مشغلۂ انسانیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزانہ کی چیزوں میں بھی یکسانیت اور پابندی وضع کو تنگ نظری اور تاریک خیالی قرار دے کر سماج کے واسطے معیوب اور نامانوس سمجھتے ہیں یہاں تک کہ خورونوش۔ بود و باش۔ آب وہوا۔ خیالات و جذبات مناظرِ قدرت طرزِ کلام۔ چال ڈھال غرضکہ ہر چیز میں ہم کو نئے رنگ ڈھنگ اور جدید اسلوب کی تلاش رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قدرت ہر حقیقت کی نبض شناس ہے اور اسی لئے اس نے انسانی تخیل کی جدت اور نیرنگی کو محسوس کر کے نظامِ عالم کا خمیر ہی اس مادہ سے کیا جسکی حقیقت میں انقلاب و تغیّر جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو یہ لمحۂ فکریہ بآسانی حل ہوسکتا ہے کہ عالمِ وجود کی دُنیا دیں اس مقدس سرزمین پر ہیں کہ جہاں انقلاب اور رنگ آمیزی کا ناپیداکنار سمندر ٹھاٹھیں مارتا عالم کو زیر و زبر کرتا ان گنت اسرار کو اپنی لہروں کے پردے میں چھپائے چلا جا رہا ہے ؎

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں (اقبالؔ)

یہ بات کس قدر واضح ہے کہ عالم کبھی اُلٹ پھیر اور ادل بدل انسان کی تمام و کمال دلچسپیوں اور دلگدازیوں کا سبب بھی ہے اگر اسی جزوِ رنگین کو حقیقت عالم سے خارج کر دیا تو دُنیا اور اسکی تمام چیزیں بے کیف اور بھونڈی معلوم ہوں۔

یہی واقعہ ہے کہ انقلاب و تغیّر کی خوش آئند ضیائیں کسی ایک چیز میں محصور نہیں ہو جاتی ہیں بلکہ قدرت نے انسان کے اس جدّت پسندی کے جذبہ کی آسودگی میں نہایت فیاضی اور فراخدلی سے کام لیا ہے اور فطرت کے ہر شعبہ میں یہ فیاضی کارفرما نظر آتی ہے شب کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی اور بادِ سموم کے جھلسا دینے والے جھونکوں کے بعد ابر و باد کی تیز دستیاں خزاں کی وحشت اور عبرت کے بین منظر بہار کی رنگ آفرینیاں ہماری انتہائی دلچسپیوں کا راز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں۔ پستی و بلندی ذلّت و عزّت نشاط و غم سرمایہ داری و بے مائگی قوت و ضعف طفلی و نوجوانی غرضکہ اسی قسم کے ہزارہا تغیّر پردۂ عالم پر متحرک تصویروں کی طرح ہر سمت نظر نواز ہیں اور یہی نیرنگیاں اس عالم ہست و بود میں ہماری زندگی کا سرمایہ راحت بھی ہیں اور فنا کا درس بھی۔

انسان کی شوق بھری نگاہیں نظام عالم پر اسی وقت تک لگی رہتی ہیں جبتک اس مرقع میں تغیّر کی رنگینیاں اور انقلاب کے بیل بوٹے

رونما ہیں ورنہ اس کی نظروں میں دنیا ایک نگاہ غلط انداز کی قیمت بھی نہیں رکھتی۔

عالم کا الٹ پھیر اگر کسی دوا میں کسی باکمال کو اہل عالم کے مستفید کرنے کیلئے ظاہر کر دیتا ہے تو وہ تمام بنی نوع انسان کا مرکز حسن نظر قرار پاتا ہے اور کل آدمزاد کی مشتاقانہ عقیدت اس کی طرف سمٹ آتی ہے اور بسا اوقات تو عقیدت کا رنگ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ صرف ایک متنفس کے کمال کے آئینہ خانہ میں جا کر انسان پر اتنی محویت طاری ہوتی ہے کہ اپنے پردۂ خیال سے نقوش گذشتہ اور خط و خال سابقہ سب کچھ محو کر کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی مجسمہ کا مرقع پاتا ہے اور ایک وارفتگی کے عالم میں اسکے آستانہ کے نور پاش ذرات پر سر نیاز خم کر دیتا ہے۔ لیکن تابکے۔ فطری تغیر پسندی میں پھر ابھار پیدا ہوتا ہے اور انسان کی جدت پسند نظریں پردۂ عالم پر کسی جدید شکل و صورت کی پردہ کشائی کی منتظر ہو کر جم جاتی ہیں اور نہایت بے تابی و بے صبری سے قدرت کے اس متصرف ہاتھ کی تلاش کرتی ہیں جو انسانی دلچسپیوں کی خاطر زمانہ کے ورق پلٹتا رہتا ہے۔

قدرت، فطرت کی نبض شناس انسانی طبیعت کے تقاضہ کے مطابق ایک فرد کامل کو الوداع کہتی ہے اور دوسرے تاجدار کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو بیٹھتی ہے۔ الغرض اسی طرح نظام چلا آ رہا ہے یہ سب کچھ کیوں ہے صرف اس لئے کہ انسانی دلچسپیوں کے سامان مختلف حصوں الگ الگ دوروں اور جدا جدا زمانوں میں منقسم ہو جائیں اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں کچھ نہ کچھ ایسے انداز دلربائی اور جاذبیت موجود ہیں کہ انسان کی نظریں اس طرف اٹھنے اور ایک مرتبہ اٹھ کر جم جانے پر مجبور ہو جائیں۔

بالفرض قدرت کی ہمہ بیں نگاہیں طبع انسانی کے مد و جزر پر نہ جمی رہتیں یا انسانی تخیل کی جدت طرازیوں کی قدرت کو مراعات منظور نہ ہوتی اور اپنے فضل و کمال کے انمول موتی اور بے بہا ہیرے ایک ہی دور کے گذرنے والوں پر نثار کر دیں تو قدرت کے معصوم دامن پر نہ صرف آئندہ نسلوں کو بدقسمت اور بدبخت بنانے کا بدنما داغ لگتا بلکہ قدرتی شاہکار کے اس جذبہ کی توہین کا الزام بھی قدرت اور صرف قدرت کے سر ہوتا جس پر عالم کی تمام نیرنگیوں کا نظام ہے۔

جب یہ بات مسلم ہے کہ انقلاب کی شعاعیں جس چیز پر بھی جلوہ ریز ہوتی ہیں اسی میں لطافت اور خوش رنگی پیدا کر دیتی ہیں تو قدرت کی طبع شناس نظریں فطرت انسانی کے شاہکار یعنی علم ادب کو جو عالی خیالی بلندیٔ فکر اور جوشش جذبات کی ایک جولانگاہ ہے کس طرح اس دیدہ زیب اور دلنواز رنگ سے محروم رکھ سکتی تھیں۔ ہر ایک زبان کی تاریخ اور اسکے دور بدور انقلابات پر نظر کرو تو درجہ بدرجہ کے تغیرات دیکھو۔ ہر تغیر کا پردہ ہمیشہ رنگ برنگ کے عنبر بیز پھول لایا ہے اور گلزار ادب کی سیر کرنے والوں کیلئے نہایت ہی دیدہ زیب اور دلربا سامان جمع کر گیا ہے اور ہر انقلاب کا دامن ہزارہا باکمال انسانوں کو اپنی آغوش نیرنگی میں چھپائے ہوئے لایا اور مشتاقوں اور نظر بازوں کی بھری محفل میں بے پردہ کر کے آگے بڑھ گیا ہے۔ اُردو زبان ہی پر نظر ڈالئے کہ اسکی اسکول سازی اور دردمندی نے اس کو کیسا سدابہار اور دلفریب بنا دیا ہے یہ تمام دلچسپیاں اور دلفریبیاں اسی ایک حقیقت کی رہین ہیں جس کو انقلاب کہتے ہیں۔

عربی ادب میں امرء القیس۔ نابغہ زبیانی۔ اعشیٰ اور زہیر کے خوشنما اور دلفریب گلزار ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین سالہاسال کی سیر و سیاحت کے بعد بھی سیر نہیں ہوتے لیکن حسّان۔ نابغہ۔ جعدی۔ فرزدق اور جریر کی شعر و سخن کی محفلیں بار بار دامن دل کھینچتی ہیں اور اس قدر محویت طاری کرتی ہیں کہ انسان اب مستقبل میں تغیر و انقلاب سے خود فراموشی کے عالم میں انکار کر بیٹھتا ہے قدرت سادہ لوح انسان کی اس طفلانہ شوخی کا جواب عملی انداز میں دینا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ایک ہلکے سے تغیر کا جھونکا عالم کے تمام اوراق کو پلٹ کر زمانے کے سامنے وہ صفحہ پیش کر دیتا ہے جس پر ندیم سلطان ابونواس اپنی تمام دکمال شان دلکشی اور دیدہ زیبی سے محو ترنم ہے۔ ابونواس وہ فطرت کے پس منظر اسرار کا محرم ایک طرف دنیائے عرب کو ایک خود فراموشی پر متنبہ کرتا ہے اور دوسری طرف عالم ادب کے جمود و سکوت کو ایک ہماہمی اور جوش و خروش میں بدل دیتا ہے۔

ابو نواس کی سوانح

کچھ دستور ہی یوں چلا آیا ہے کہ قدرت اس قسم کے دل و دماغ کی پرورش اور تربیت تیرہ خاکدانوں غمکدوں اور ویرانوں میں کیا کرتی ہے۔ باستان ماتارد (علاقہ خوزستان) میں ہانی بن عبدالاوّل ایک غریب دیہاتی اپنی زندگی کی گھڑیاں تلخکامی اور تنگی سے گذار رہا ہے اور دن بھر کی جفاکشی اور محنت ومشقت سے جو کچھ دانہ دُنکا میسّر آتا ہے وہی اسکی اور اسکے اہل وعیال کی اوقات بسری کا ساز و سامان ہے ۱۴۱ھ اپنے دامان رحمت کے کونے میں ایک انمول مگر گرد آلود ہیرا اس مصیبت زدہ کو نذر دینے لاتا ہے

وہ ہیرا ہے جوت سے جس کی چندرماں چھپ جائے (ساغر)

مگر اوّل تو ہانی کچھ نظر باز اور حقیقت شناس نہیں دوسرے اس ہیرے کی ساری چمک دمک ابھی صغرسنی اور طفولیت کے پردوں میں مستور ہے پہلے تو اسکی آمد کو تنگئ معیشت اور خرچ کی بڑھوار سمجھ کر پژمردہ ہو جاتا ہے لیکن ہانی کی پامال جفا نگاہیں جب اس نو شگفتہ پھول پر پڑتی ہیں تو ایک خود فراموشی کے عالم میں دل کنول کی طرح کھل جاتا ہے۔ شفقت بزرگانہ سے بے تاب ہو کر اس آنکھ کے تارے کو کلیجہ سے لگا کر دُعا دیتا ہے اور اپنی تہیدستی مفلسی اور بے سروسامانی کی زندگی کو یاد کرکے آہ بھرتا ہے اور ساتھ ہی اس روح فرسا اور جانگداز غم میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور بے اختیار ہو جاتا ہے۔ محبّت کے مارے باپ کی شفقت پدری سے یہ اشکباری قدرت ملاحظہ کرتی ہے ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور آئندہ زندگی میں یہی معصوم فطرت بچہ جلیل القدر خلیفۂ بغداد کی صف مصاحبین و مقربین میں جلوہ افروز نظر آتا ہے۔

ہانی نے اپنے لخت جگر کا نام حسن رکھا یہی حسن آئندہ ابوعلی کی کنیت اور ابو نواس کے تخلص سے دُنیا میں مشہور ہوا۔

لکل فن رجال۔ قدرت جس کسی کو جس خدمت کیلئے مخصوص کرتی ہے دوربین نگاہیں دور اوّل ہی میں اسکے آثار و قرائن سے نتائج نکال لیتی ہیں اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اس شخص کی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ اور راستوں کے پیچ و خم پیش نظر رکھتی ہیں کہ دیکھیں یہ کن گھاٹیوں اور راستوں سے گذر کر اس میدان تک پہنچتا ہے جہاں فرشتۂ رحمت خلعت امتیاز و شرف اس کے جسم موزوں کے واسطے لئے منتظر کھڑا ہے۔ اور اسی قسم کے رجحانات اس سے بے ساختہ عالم ظہور میں آنے لگتے ہیں اور وہ دُنیا کی تمام ہماہمی سے بے تعلق ہو کر اپنا مرکز خیال اسی بلندی و رفعت کو مقرر کر لیتا ہے جس کی اس کو قدرت راہنمائی کرتی ہے حسن غریب تنگدست اور غریب خاندان کا فرد تھا اور ساتھ ہی قیامت یہ ہوئی کہ ہوش سنبھالتے ہی شفیق باپ کے سہارا اور بے بدل سایۂ شفقت سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا گیا اب حسن کی ننھی سی جان تھی اور دنیاوی آلام و مصائب کا تسلسل۔ وقت آیا تھا کہ ہانی اپنے لخت جگر کو تعلیم و تربیت دیتا دیکھ بھال کرتا اور ابھی عالم کے نشیب و فراز کی کچھ خبر نہ ہونے دیتا۔ ہر عالم کے رنج والم کے دلدوز تیروں کو اپنے جگر پر لیتا اور حسن کو عالم طفلی بے فکری و عیش سے گزارنے دیتا۔ لیکن آہ ایک ذرا سا انقلاب کیا سے کیا کر گیا۔ حسن بے یار و مددگار بے مونس و غمگسار ایک ہولناک صحرا میں کھڑا تھا اور فکر معاش اور حصول رزق کے پُرخطر افکار وحشیوں اور درندوں کی طرح چہار طرف سے اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ کثرت غم سے ضبط گریہ مشکل تھا اور وہ رونا بھی کس قدر بے کسی کا رونا تھا کہ کوئی سر پر دست شفقت رکھ کر اپنے دامن رحمت سے غریب حسن کے خونیں آنسو پونچھنے والا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس قدر ہوشربا ہے یہ ماحول کہ بڑے بڑے مضبوط دل گردے والے اور شیر مرد میدان چھوڑ بھاگتے ہیں لیکن فطرت کا پیامی ان تمام مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کیلئے کمربستہ تھا۔

ابو نواس کی تعلیم و تربیت

کھوئے ہوئے حواس بجا کئے ہمّت و استقلال لیکر اُٹھا اور عطاری کی تعلیم کو انتخاب کیا، شگون نیک ہے حسن کو مستقبل قریب میں

شعر وسخن کے عطر سے دُنیائے عرب کی فضائیں عنبر بیز بنانی ہیں قدرت کو مشق کرانی منظور ہے۔ لیکن فطرت اس کو جس ماحول میں لیجانا چاہتی تھی وہ ابھی دور تھا آخرش اس فن سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی اور اس سے کنارہ کش ہوگیا حسن کی طبیعت جب اس نامانوس اُلجھاؤ سے فارغ ہوئی تو فطری رنگ اُبھرا اب وہی میدان سامنے تھا جس کا شہسوار تھا۔ اُٹھا اور اُستادِ عصر ابن حباب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابن حباب اپنے زمانہ کا جلیل القدر امام ادب اور مسلم الثبوت اُستاد تھا اور ساتھ ہی نظر باز بھی پہلی ہی نظر میں تاڑ گیا کہ جوہر قابل ہے لیکن سرپرستی چاہتا ہے کتنا خوش بخت ہے وہ اُستاد جس کو حسن جیسا شاگرد ہاتھ آئے اور کس قدر عالی نصیب ہے وہ شاگرد جس کو ابن حباب جیسے اُستاد کی سرپرستی نصیب ہو فخر زمانہ اُستاد نے اپنے سرمایۂ ناز شاگرد پر علم وفن کے وہ وہ جواہر ریزے نثار کئے کہ اسکے آس پاس بیٹھنے والے بھی مالا مال ہوگئے

ابن حباب کی طبیعت گریز پا اور سیلانی واقع ہوئی تھی سیر و سیاحت ان کی طبیعت ثانوی تھی انہیں ایک جگہ قیام کرنا بار تھا اس مرتبہ جب یمن میں رہتے رہتے دل گھبرایا اور آمادۂ سفر ہوا تو خوش بخت شاگرد ہم رکاب تھا اُستاد کے ہمراہ دیس بدیس مارا مارا پھرنا فطین شاگرد پر شاق ضرور گذرتا لیکن جس نے صعوبت و آلام کے تلاطم ہی میں آنکھ کھولی ہو اور مصائب و آفات کی غذائیں کھا کھا کر پرورش پائی ہو وہ ان معمولی تکالیف کو کیا خاطر میں لاسکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ سیاحت غیر اطمینانی شان اپنے اندر رکھتی تھی لیکن کسے محسوس ہوتا تھا کہ اس پریشان کن سیاحت کے پسِ منظر قدرت نے حسن کیلئے تاج شہرت اور لباس امتیاز رکھ چھوڑا ہے اس حیلہ سے حسن کو شعر و شاعری کے صدہا سرسبز و شاداب سبزہ زاروں اور گلستانوں کی گلچینی کا موقع نصیب ہوگیا اور اس سلسلۂ سیاحت میں کوفہ بغداد بصرہ اور دیگر بلاد عرب کے مشہور اور بے بدل اساتذہ کے حلقۂ درس میں زانوئے ادب طے کرتا بے بہا لعل اور انمول موتی اپنے کشکول گدائی میں بھرتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اساتذۂ کامل کی خدمت ذوق شوق محنت اور سب سے بڑھ کر ابن حباب کی سرپرستی اور نگاہداشت نے اس گرد آلود ہیرے پر ایسے دیدہ زیب طرز سے صیقل کی اور رنگ چڑھایا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور اپنے زمانے میں بے عدیل ومثیل قرار پایا۔

۳۹

آخر انہیں بلند خیالیوں موشگافیوں اور جدت طرازیوں نے اس کو سلاطین عباسیہ کے مرجع انام دربار تک جا پہنچایا اور پہلے محمد المہدی پھر موسیٰ الہادی اور ہارون رشید کی درباری مجالس ادب کا صدر اور مسند نشین قرار پایا اور ایک مدت تک اس خدمت جلیلہ پر فائز رہ کر اٹھاون برس کی عمر میں اس فطرت کے پیامی نے ۱۹۹ھ میں انتقال کیا آج بھی بغداد کی فضائیں اسکے دل نواز نغموں سے معمور ہیں۔ نیرنگیٔ تقدیر سے ابونواس نے اپنی رنگین طبعی کے انمول موتی صدہا مرتبہ شاہی درباروں میں پیش کئے اس نرالے انداز میں اپنی گلبار طبیعت کی نمائش کی کہ تاریخ کے وہ صفحات بھی ابھی تک مشک بو اور عنبر بیز ہیں جن میں ان مجالس کے تذکرے ہیں اسی دوران میں تغیرات نے حسن کو نئے نئے عالی خیالوں اور اجنبی معاصرین سے روشناس کرایا اور وقت پر جودتِ طبع بلندیٔ فکر اور بدیہہ نگاری میں مقابلہ بھی ہوا لیکن آپ دیکھیں گے کہ ابونواس کی البیلی طبیعت نے ہر میدان میں ان کو پسپا کیا اور وہ لوگ جو اپنے اپنے وقت میں شعر و شاعری کے دارومدار شمار ہوتے تھے جب کبھی مقدر سے اسکے مقابل ڈٹے ہمیشہ مُنہ کی کھائی۔

یوں تو تمام عباسی خلفاء اور خصوصاً محمد المہدی موسیٰ الہادی اور ہارون رشید جواہرات کے جوہری اور زرِ آدمیت و انسانیت کے معیار تھے اور دیگر علوم کے علاوہ ادب اور اسکے لوازمات پر عدیم المثال دستگاہ رکھتے تھے اس پر طرہ یہ کہ اہل زبان تھے اس لئے ادبی صحبتوں اور شعر و شاعری کی محفلوں میں نقد و تبصرہ کرنے محاسن و معائب پر نظر کرنے اور افضل و غیر افضل قرار دینے کیلئے نہ کوئی ادبی بورڈ طلب کرنا پڑتا نہ کتب لغت اور اشعار جاہلیت سے سند لانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی بلکہ ایسے تمام فیصلے وقتی طور پر سر بزم کئے جاتے تھے اور سب سے واضح ظاہر اور کُھلا ہوا فیصلہ وہ ہوتا جو ایسی محفلوں مقابلوں اور موازنوں کے وقت زر و جواہر اور خلعت و

نعمت کے دیدہ زیب اور خوشنما پردے ہیں ادیبوں کیلئے صادر ہوتا تھا آپ دیکھیں گے کہ ایسے مواقع پر ابو نواس نے اپنے ہمچشموں اور حریفوں سے دوگنا چوگنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ وصول کیا ہے۔

بے محل نہوگا اگر یہاں ادبی شاعری پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ ابو نواس کی شخصیت کو حسب مرتبہ سمجھ سکیں۔

عربی شاعری

دُنیا کا وہ خطہ جس کو جغرافیائی اصطلاح میں جزیرۃ العرب سے موسوم کرتے ہیں اگرچہ اسکی سرزمین فردوس مثال ایران اور بہشت نظیر کشمیر کی طرح رنگ برنگ کے پھولوں غنچوں سبزہ زاروں اور زیب وزینت سے بالکل خالی ہے بلکہ اسکے برخلاف وہاں ریگ اور سنگریزوں کا ایک موج انگیز سمندر ہے جو جزیرہ کے مختلف حصّوں میں لہریں مارتا کہیں سمٹتا اور کہیں پھیلتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود کس قدر معجز نما اور حیرت خیز ہیں وہ فضائیں کہ جو بھی متنفس اس ماحول میں پرورش پاتا ہے وہ گلزار شاعری میں وہ وہ نادیدہ راستے اور شاہراہیں معلوم کرتا ہے کہ دُنیا غرق حیرت ہوکر رہ جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غالباً مبالغہ نہوگا کہ جزیرۂ عرب کے سنگریزے اور ریگ کے ذرّات بھی شعروادب کی رنگ وبو اور نقش ونگار سے مزیّن ودلفریب ہیں۔

شاعری اور موزونیٔ طبع کوئی کسبی چیز نہیں، جزیرہ عرب کے گوشہ گوشہ کا ہر ذرّہ اس زبردست حقیقت کا آئینہ دار ہے سمندر سے صدہا سیپیں نکلتی ہیں۔ ان میں ہزارہا موتی ہوتے ہیں لیکن ان میں کا ہر ایک موتی کب اس قابل ہوتا ہے کہ اسکو سلاطینِ عظام کے تاجِ شرف اور خلعت فاخرہ کی زیب وزینت بڑھانے کا فخر نصیب ہو۔ گلشن میں روزانہ بے شمار خوشنما اور دیدہ زیب پھول کھلتے ہیں لیکن نازک خیالوں کی بزموں اور شیریں اداؤں کی محفلوں میں ان میں سے چند گنے چُنے پھول ہی بار پاتے ہیں۔ ہم کو بھی یہاں ادب کے ان خوشنما اور دلآویز پھولوں پر نظر کرنی ہے کہ جو گلستان عرب میں دلربائی کے انوکھے انداز اور دلکشی کے خوشنما طرز سے بلند ترین شاخوں پر جلوہ افروز ہوں۔ یہ تو مشکل ہے کہ عربی کے اس رستمِ داستاں کا پتہ لگایا جائے کہ جسکے دل ودماغ میں سب سے پہلے شعروشاعری کا تموّج وتلاطم اُٹھا اور شاید اسی خلفشار سے بچنے کے لئے مورخین نے طبقات تو ذکر کر دئے ہیں لیکن درازئ مدّت اور قدامت کے سبب پیشرو قافلہ کے نشانِ قدم کی تلاش اضاعت وقت تصوّر کرکے چھوڑ دیا ہے۔

عربی شاعری کے دور

جب جزیرہ عرب کے تمام سیاسی نظم ونسق اور معاشرتی تجارتی اور اقتصادی اصول وقواعد کی عنان اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو شعروشاعری اور ادب کی دُنیا پر بھی اہل اسلام ہی قابض ومتصرّف قرار پائے لہذا ادب عرب کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے دورِ جاہلیت اور زمانۂ اسلام۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں مشترک ایک اور دور شاعری ہے جس کو مخضرم کہتے ہیں۔

مخضرم میں وہ شعراء ہیں جنہوں نے دورِ جاہلیت میں بھی اپنی بلندی فکر کے نمونہ پیش کئے ہوں اور اسلام کے زمانہ میں بھی بزم ادب سجائی ہو۔

پھر زمانۂ اسلام کے شعراء کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک اسلامی کہلاتے ہیں اور دوسرے گروہ کو جو اس سے متاخر ہے مولدین کہتے ہیں ان تمام دوروں میں جو فصاحت وبلاغت بلندی اور شہرت دورِ جاہلیت کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے عہد کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ زمانہ فصاحت وبلاغت میں اس قدر بلندی اور رفعت کا دور ہے کہ عرب والے اپنے علاوہ دُنیا کی ساری آبادی کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔

مولدین کا دور ہی وہ حشر بداماں تموّج اپنے اندر رکھتا ہے جو ابونواس اور اسکے معاصرین کے دل ودماغ سے نکلا اور جس نے پرانے زمانے کے تمام نشانات اور بناؤں پر قبضہ کرلیا اسی بزم میں حسن میر مجلس اور صدر محفل بنایا گیا۔

حسن کی دربار تک رسائی

حسن کی ولادت کا ۱۴۱ھ وہ سال تھا جبکہ تختِ خلافت پر ابوجعفر منصور عباسی جلوہ افروز تھا۔ حسن نے تعلیم و تربیت کے بعد جب دُنیائے شعر و ادب میں قدم رکھا تو فضائیں ابوالعتاہیۃ اور دعبل کے دلنواز ترانوں سے معمور تھیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حسن نے کس وسیلہ سے دربارِ عباسی تک رسائی پائی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ منصور کے ایام خلافت ختم ہونے تک ابونواس کا دربار میں پتہ بھی نہیں ہے ہاں جب ۱۵۸ھ میں محمد المہدی سریر آرائے خلافت ہوا اور دنیا کو اپنی داد و دہش سے نوازا تو یہ فلک زدہ غم نصیب بھی اسکے کرم و فضل کا آوازہ سُن کر حاضرِ دربار ہو گیا اور یہیں سے اسکی عظمت و رفعت کا آغاز ہوتا ہے۔ ابونواس نے اپنی زندگی تین خلفائے عباسیہ کے سایۂ رحمت میں گذاری ہے مہدی کی خلافت سے اس کا دور شروع ہوتا ہے اور جب ۱۶۹ھ میں مہدی کے انتقال کے بعد اسی کا بیٹا موسیٰ ہادی خلیفہ بنتا ہے تب بھی ابونواس حاضرِ دربار ہے اور کچھ ماہ کے بعد جب ہادی کا انتقال ہو گیا اور خلافت عباسیہ کا درخشاں چاند پوری آب و تاب سے طلوع ہوا یعنی خلیفہ ہارون الرشید ۱۷۰ھ میں بر سرِ اقتدار آیا تو بھی ابونواس دربار میں موجود تھا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہارون کے سایۂ عاطفت میں ابونواس کو وہ بلندی اور رفعت حاصل ہوئی کہ آج بھی عربی شاعری کے آسمان پر سورج بن کر چمک رہا ہے۔

ابونواس کے معاصرین

خلفاء عباسیہ علم دوست اور قدر شناس تھے اور ڈھونڈھ کر باکمال لوگوں کو اپنے دربار کی زیب و زینت کیلئے بڑے بڑے ہدایا اور تحفے دے دے کر بلواتے تھے۔ ابونواس کے حاضرِ دربار ہونے سے پہلے ابوالعتاہیۃ دعبل عمرو اور ابوالاسود حمانی نے درباری فضاؤں پہ پورا قبضہ جما رکھا تھا یہانتک کہ خلیفہ ان میں سے ایک دو کو ضرور سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا اسکے ساتھ ہی بشار بن برد مروان بن ابی حفصہ ابو دلامہ صریع اور مسلم بن ولید کے اشعار و خیالات پر فن ادب کے متوالے مشتاقانہ نظریں جمائے بیٹھے رہتے تھے اب آپ غور کیجئے کہ ایک مفلس غمزدہ بےکس بچّہ ایسے ماحول میں سامنے آتا ہے اور اپنی خداداد فطانت اور فطری ملکہ سے اس نرالے انداز میں ارغنون شاعری چھیڑتا ہے کہ دُنیا ایک غیر معلوم جذبہ کے ساتھ اسکی طرف کھنچ جاتی ہے اور اس ادب نواز ملک کا ذرہ ذرہ ابونواس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے حسن کی یہ تمام کامیابی اور رفعت اسکی اپنی قوّتِ خیال اور دماغی خلاقیوں کا نتیجہ تھی نہ اس میں اس کو کسی کی مدد پہنچی اور نہ کسی نے اسکی سرپرستی کی۔ اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ترتیب دینے کے بعد ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ ابونواس سحر ساز دماغ اور معجز نما دل اپنے پہلو میں لیکر آیا اور زمانہ بھر کو اپنی شعبدہ بازیوں سے مسحور کر کے آگے بڑھ گیا۔

۱۴۱

ابونواس کی شاعری

خلافت راشدہ کے بعد سے ہی اسلامی حکمرانوں میں سلطنت اور ریاست مع اپنے تمام لوازم کے اثر انداز ہو چلی تھیں اور جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا یہ اثر زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ خلفاء عباسیہ کے درباروں میں تمام وہ تکلف زیب و زینت نام و نمود اور رنگ روپ پورا دخل پا گئے جو کبھی روم و ایران کے مزیّن درباروں کا طرۂ امتیاز تھے۔ عیش و عشرت عام ہو گئی اور ساتھ ہی اسکے تمام لوازمات درباروں محفلوں اور خلوتگاہوں میں آہستہ آہستہ قبضہ پا گئے لیکن یہ ضرور ہے کہ باوجود ان تمام عیش و عشرت اور شادی و فرصت کے معاملات سلطنت کی دیکھ بھال اور مظلوموں کی خبر گیری سے کوئی غافل نہ تھا۔

قاعدہ ہے کہ دربار سلطانی کا رنگ ڈھنگ رعیت کو بیحد مرغوب و دلپسند ہوتا ہے لہذا امراء وزراء شرفاء اور عوام میں حسب حیثیت عیش پسندی تھوڑے ہی دنوں میں عام ہو گئی۔ دربار کے اس عشرت خیز ماحول میں مصاحبین اور شعراء کا ظریف طبع اور بذلہ سنج ہونا خاصہ لازم ہے بغیر اسکے ہر چیز بے کیف اور بے مزا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ بڑی سعی اور کوششوں سے ہزار ہا تکلیفوں اور آفتوں کو برداشت کر کرا کے اس خوش گوار رنگ کو عالمِ وجود میں لایا گیا ہوگا لہذا اس کو اُتار دینا یا ختم کر دینا آسان کام نہ تھا۔ ابو نواس جب حاضرِ دربار ہوا تو اس نے وہاں کے ذرّہ ذرّہ پر عیش و عشرت کا آب و رنگ دیکھا اور ہر در و دیوار کو فرحت و انبساط کے نقش و نگار سے مزیّن پایا یہی نہیں بلکہ تمام قلمرو خلافت کو اسی ایک رنگ سے رنگین پایا۔ لہذا کیا کرتا خود بھی اسی رنگ میں غرق ہو گیا لیکن جب اُبھرا ہے تو اتنا گہرا اور چمکیلا رنگ لیکر اُٹھا کہ دوسرے لوگ حیرت کے عالم میں اسکا مُنہ تکتے تھے ۔

ابو نواس نے اب وہ تمام خصوصیات اپنے میں پیدا کیں جو ایک درباری شاعر کے واسطے لازم ہیں وہ لطیفہ گو بھی بنا ظریف بھی بدیہ گو بھی اور حاضر جواب بھی ۔ یہ حقیقت ہے کہ محض درباری شاعر جس میں صفات مذکورہ موجود ہوں مجموعی اعتبار سے ناقدین کی نظروں میں کسی خاص عزت و وقار کا مستحق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا درجہ ایسا باوقعت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ادبی دُنیا میں کوئی خاص مقام امتیاز حاصل کر سکے دُنیا میں صدہا باکمال آئے اور بہترین قوّتِ خلّاقی بھی اپنے اندر رکھتے تھے لیکن دربار کی لہو و لعب کی فضا میں ایسے پھنسے کہ اپنی ساری قابلیت اور بلند پروازی کھو بیٹھے ذوق اور انشا اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں ۔

اگر ابو نواس بھی درباری دُنیا اور بزمِ خلوت کی دلچسپیوں میں گھر کر اپنی گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا کمال شاعری ختم کر دیتا تو اس کو ادبی مذاکروں میں ہرگز کوئی درجہ نصیب نہ ہوتا اور بہت تھوڑی مدت میں اس کا نام صفحۂ عالم سے نیست و نابود ہو جاتا لیکن اس باکمال نے اس نقص کو محسوس کیا اور درباری جھمیلوں اور محفلوں کی ہاہا ہی میں گھر کر بھی اس نے رنگِ قدیم کو ترک نہیں کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ ایک طرف اس نے درباری فضاؤں اور محفلوں پر قبضہ جمائے رکھا اور دوسری طرف اپنی پُر گوئی اور فصاحت و بلاغت سے ناقدوں اور باریک بینوں کی نظروں میں وقعت پانے کا سامان جمع کرتا رہا ۔ اس لئے ابو نواس کی شاعری دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔

(۱) ابو نواس کا درباری رنگ ۔ (۲) ابو نواس کا آزاد رنگ ۔

ابو نواس کے متعلق ناقدین کے اقوال

قیروانی نے رسائل الانتقاد میں ابو نواس کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ "میرے نزدیک ابو نواس ایک مستقل طرز کا بانی ہے چونکہ اس نے شاعری کا قدیم رنگ اور متعارف طرز چھوڑ دیا ۔ اس نے (زمانۂ قدیم کے) کار آمد رنگ کو اپنے انداز بیان سے غیر مفید ثابت کر دیا اور جس کو لوگ مشکل سمجھتے تھے اسے آسان کر دکھایا (چونکہ لوگ اب رنگ قدیم کے خوگر نہ رہے تھے اس لئے) ان کو خیالات قدیم کی ہر سلسل اور مربوط لڑی منفصل اور بے میل نظر آنے لگی ۔ ابو نواس نے رنگ قدیم کے خیالات پروئے ہوئے موتی منتشر کر دئے ۔ پُرانی بُنیادوں کو چھوڑ کر اپنی عمارتوں کیلئے نئی نئی بُنیادیں ڈالیں (جب اس نے شاعری شروع کی ہے تو یہ حالت تھی) کہ لوگوں میں سے ادبی ذوق تقریباً معدوم ہو چکا تھا اور قصرِ عربیت کی بُنیادیں ہل چکی تھیں اور اصلی فصاحت و بلاغت بے قدر اور بے کیف ہو چکی تھی لوگ اپنے مذاق کے مطابق چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ان کو وہی چیزیں بھاتی تھیں جن کے وہ عادی تھے پس ابو نواس کے کلام کا چرچا ہونے لگا اور لوگ اسکو ہاتھوں ہاتھ لے جانے لگے اور (اسکے خیالات) گراں بہا اور بیش قیمت چیز سمجھے جانے لگے ۔ لوگ ابو نواس کے اسی ضعیف اور معمولی کلام پر شیفتہ و فریفتہ ہو گئے ۔ اگرچہ قدرت نے اسکی فطرت میں فصاحت و بلاغت کا جو ہر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور عربیت میں تخیل و محاکات کا آفتاب درخشاں بنایا تھا لیکن (کرتا کیا) اس نے بازاروں میں جس طرز کی چیزوں کا رواج دیکھا ویسی ہی پیش کیں اور لوگوں کو ان کے حسب منشا خیالات تحفہ بھیجے ۔

ابو نواس (چونکہ) متقدمین شعراء کے خلاف چلا اس لئے وہ (جلد) مشہور و معروف ہو گیا اور چونکہ وہ نئی نئی چیزیں لایا تھا اس لئے لوگوں نے ان کو پسند کیا اور خوب شہرت دی چونکہ عوام الناس کے بازار میں اچھی بری سب قسم کی چیزیں کھپ جاتی ہیں اس لئے وہ ابو نواس کے انہیں معمولی اور ضعیف شعروں کو موتیوں کی لڑیاں سمجھتے تھے لیکن ناقدین ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ابو نواس چونکہ یہ یقین رکھتا تھا کہ میرے یہ معمولی درجہ کے اشعار ناقدین کے نزدیک بے قدر ہونگے اور نکتہ چیں انپر گرفت کر کے ضعیف تر بنا دینگے اسی لئے وہ اسکے ساتھ ہی ساتھ اپنے اس انتہائی فصیح و بلیغ کلام سے اس کا تدارک کرتا رہا جس کے نقطہ نقطہ سے اسکا زور بیان مترشح ہوتا ہے۔

(کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ) ابو نواس اپنی خود بینی اور خفیف طبعی کی وجہ سے عوام کے نزدیک اپنے (اس قسم کے) کلام کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ناقدین کی اظہار نقائص سے چشم پوشی کو غلبہ اور کمال تصور کر بیٹھتا تھا۔

اوپر کے بیان سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ابو نواس ایک طرف عوام کی دلچسپی کے سامان مہیا کرتا تھا اور دوسری طرف طبقۂ شعراء میں اپنا وقار قائم رکھنے کی بھی فکر میں لگا رہتا تھا۔

ابن رشیق نے معتبر نقاد کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ لیس فی المولدین اشہر اسماً من الحسن ابو نواس۔ مولدین میں ابو نواس سے زیادہ کسی نے بھی شہرت نہیں پائی۔ پھر بھی ابن رشیق آگے چلکر ابو نواس کو مولدین کا امرء القیس کہتا ہے۔

علامہ جاحظ کا قول ہے کہ لیس یفضل علی الحسن مولدٌ سواء بشار بن برد کہ مولدین میں بشار بن برد کے علاوہ ابو نواس سے کوئی ایک بھی بڑھ کر نہیں ہے۔

آگے چلکر ابن رشیق نے ابو نواس کے زمانے کے دس شاعر جو مولدین میں بلند درجہ رکھتے ہیں اور عربی ادب میں ان میں سے ہر ایک ایک خاص امتیاز پائے ہوئے ہے شمار کر کے کہا ہے کہ لیس فیھم نظیر ابو نواس کہ ان میں کوئی ایک بھی ابو نواس کا ثانی نہیں ہے۔

یہ لوگ جو عربی تنقید میں بہت اونچا اور بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ کیسے گرانقدر الفاظ میں ابو نواس کے فضل و کمال کو تسلیم کر کے بے مثل قرار دے رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ناقدین کی نظروں میں یہ وقعت اور ادبی مذاکروں میں عظمت اکثر و بیشتر اس آزاد رنگ سے ابو نواس کو حاصل ہوئی جو درباری اُلجھنوں اور پسند عوام کے بندھنوں سے بچکر ادا کیا گیا۔

قیروانی نے کس صفائی سے کلام کے دونوں پہلوؤں پر نظر کی ہے کہ تصویر کے ہر دو رُخ سامنے آجاتے ہیں اور ہر شخص ابو نواس کے اصل خط و خال دیکھ لیتا ہے۔

ابو نواس دربار میں

جہاں ابو نواس ایک بے بدل شاعر تھا وہاں قدرت نے اس کو بلا کی ذکاوت اور ذہانت بھی عطا کی تھی۔ بسا اوقات تو اس عجیب انداز سے اور برموقت اس کا ظہور ہوتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔

لطیفہ

خالصہ۔ خلیفہ ہارون رشید کی ایک باندی تھی شکل و صورت کی کچھ زیادہ حسین نہ تھی لیکن ہارون کو اس سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ایک روز خالصہ نہایت عمدہ لباس اور زیورات پہنے اور گلے میں جواہرات کا ایک بیش قیمت ہار ڈالے خلیفہ کے ساتھ مشغول اختلاط تھی اسی دوران میں ابو نواس حاضر ہوا۔ خلیفہ نے ابو نواس کی حاضری کی خبر سُنی تو اس کو بلا تکلف خلوت میں بلا بھیجا۔

ابو نواس نے نہایت عمدہ اشعار اور لطیفہ پیش کئے لیکن خلیفہ خالصہ کے ساتھ کچھ ایسا مشغول تھا کہ ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ابو نواس کو یہ بات گراں گذری اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا جب خلوتکدہ کے دروازہ سے گذرا تو یہ شعر دروازہ پر لکھتا گیا ؎

لقد ضاع شعری علیٰ بابکم　　　کما ضاع عِقدٌ علیٰ خالصہ

تمہارے دروازہ پر آج میرے اشعار کی وہی توہین ہوئی ہے۔ جیسے خالصہ کے جسم پر بیش قیمت جواہرات کے ہار کی

ابو نواس کے مخالفین نے یہ سارا واقعہ خلیفہ سے جا کر عرض کیا اور اسکے خلاف بہت کچھ زہر اگلا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ فوراً ابو نواس کو حاضر کرو۔ ابو نواس کو بے وقت بُلائے جانے سے خدشہ پیدا ہو گیا۔ جب خلیفہ کی حضوری کیلئے جانے لگا تو دروازہ پر پہنچ کر اپنے لکھے ہوئے شعر پر نظر پڑی فوراً ضاع کی عین کا دائرہ مٹا دیا اور حاضر دربار ہو گیا۔ تم نے ابو نواس دروازہ پر کیا شعر لکھا ہے خلیفہ نے طیش میں آکر فرمایا۔

حضور یہ لکھا ہے ؎[1]

لقد ضاء شعری علیٰ بابکم　　　کما ضاء عقدٌ علیٰ خالصہ

تمہارے دروازہ پر آج میرے اشعار میں وہ چمک دمک آگئی جو خالصہ کے جسم سے جواہرات کے بیش قیمت ہار میں۔

خلیفہ کا غصہ جاتا رہا اور اس کو بہت سا انعام دیا۔

حاضر جوابی میں تو وہ کمال تھا کہ کبھی کسی سے زک نہ اُٹھائی وقت پر ایسی بات کہتا کہ مخاطب کو خاموشی کے علاوہ کوئی راہ نہ رہتی۔

لطیفہ

ابو نواس کو شراب پینے کی بہت عادت تھی۔ ایک روز ایک بزم میں آپ بُلائے گئے اور وہاں بے اندازہ پی گئے اور پھر اس تمام حالت کو ایک قصیدہ میں حکایت کر بیٹھے۔ وہ قصیدہ کسی کے ہاتھ لگ گیا اس نے ہارون خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ابو نواس اقراری مجرم تھا شاہد کی کیا حاجت تھی۔ خلیفہ ہارون نے طلب کیا۔ پوچھا تم نے شراب کیوں پی ابو نواس۔ جہاں پناہ غلام سے یہ قصور کبھی سرزد نہیں ہوا۔ خلیفہ تم نے خود اس قصیدہ میں اعتراف کیا ہے۔ قصیدہ دیکھ کر ابو نواس کے ہوش اُڑ گئے لیکن فوراً سنبھلکر کہا کہ حضور اللہ تعالیٰ نے شعراء کے متعلق فرمایا کہ (وانھم یقولون مالا یفعلون) (شاعر) وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو نہیں کرتے۔ تو پھر غلام مجرم کیسے ہوا۔

ابو نواس کی جدت پسند طبیعت نے اس درباری رنگ کو بھی عامیانہ انداز میں نہیں رہنے دیا بلکہ وہ اس سلسلہ میں بھی ایسی قوت کا مالک ہے کہ جس سے اس کو معاصرین کی صف میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ بلاشبہ اس طرزِ شاعری میں بھی ابو نواس نے اپنے متقدمین اور معاصرین دونوں سے قدم آگے بڑھایا ہے اور اس کو دُنیا کے سامنے ایک نرالے کیف سے پیش کیا ہے۔

عوام پسند شاعری میں ابو نواس کا کلام

اس سلسلہ میں جس چیز میں ابو نواس بلندی اور کمال کے آخری زینہ پر ہے وہ بدیہ گوئی ہے۔ بدیہ گو ہر زبان میں ہوتے ہیں اور عرب کی شاعری میں بدیہ گوئی تو بکثرت پائی جاتی ہے لیکن ابو نواس کی بدیہ گوئی کا طرز ہی نرالا اور انوکھا ہے۔

بدیہ گوئی کے درجات

پہلی قسم بدیہ گوئی کی یہ ہے کہ سرِ مشاعرہ کوئی مصرع دیا گیا اور اس پر غزلیں لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ حاضرین میں سے جو صاحب ذوق جس قسم کا مضمون چاہیں اپنے پسندیدہ الفاظ اور طرزِ ادا کے ساتھ مناسب بندش اور ترتیب میں ادا کر دیں۔ اس میں کوئی خاص محنت

[1] ۔ ضاع کے معنی ہیں خراب ہو گیا عین کا دائرہ مٹا دینے سے ہمزہ رہ جاتا ہے اب ضاء کے معنی چمکدار ہو جانا ہو گئے۔

نہیں ہوتی لیکن اس سے اوپر ایک دوسری قسم ہے جو پہلی قسم کی بہ نسبت دقت طلب اور مشکل ہے۔ وہ یہ کہ صرف ایک مصرع دیکر اس کا مصرع ثانی مطلوب ہو۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ مصرع مطلوبہ کی تلاش کس قدر صعب اور کٹھن ہے اور خصوصاً جب قید لگادی جائے کہ مصرع مطلوبہ کو شعر کا مصرع اولیٰ بنایا جائے۔ ایک تیسری قسم بدیہہ گوئی کی اور ہے جو نسبتہً پہلی دونوں قسموں سے مشکل ہے وہ یہ کہ ایک چیز سامنے رکھ دی جائے اور اس پر شعر کہنے کی فرمائش کی جائے۔

ابونواس نے ان متعارفہ اقسام کو یک طرف رکھ کر دنیا کو ایک اور قسم سے روشناس کرایا۔ یہ انوکھا انداز ابونواس کا ایجاد کردہ ہے دوسری زبانیں تو کیا خود عربی ادب بھی اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میں یہاں آپ کے سامنے اسکے اس انوکھے طرز کو اسی کے الفاظ میں پیش کئے دیتا ہوں لیکن ایک خاص فائدہ کے ماتحت میں نے ان کی تاریخی ترتیب بدل دی ہے۔

ایک ٹھنڈی سُہانی تاریک رات میں ہارون رشید پر بے خوابی غالب آگئی۔ بار بار کروٹیں بدلیں سنبھل سنبھل کر لیٹا لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ جب پڑے پڑے طبیعت گھبراگئی اور پریشان ہوگیا تو شبستان شاہی سے اُٹھا اور محلسرا کے صحن میں آگیا۔ یہاں آکر سوچنے لگا کہ نیند آتی نہیں طبیعت گھبراتی ہے کون سا شغل اختیار کروں کہ یہ پہاڑ سی کالی رات کٹ جائے۔ ٹہلتا جاتا تھا اور دماغ کسی مناسب شغل کی تلاش میں مشغول تھا۔ بہت دیر کے سوچ فکر کے بعد ایک بات ذہن میں آئی اور محلسرائے کے اس حصہ میں جا پہنچا جہاں ان دوشیزگان خوش منظر کی خوابگاہیں تھیں جو اسکی مملوک اور زرخرید تھیں یہ کمرے دور تک مسلسل چلے گئے اور ہر ایک میں ایک ایک مہ پارہ رہتی تھی۔ کس قدر حسین شغل تھا اور کیسا دلآویز مشغلہ۔ خلیفہ نے ایک کمرے کا پٹ کھولا۔ دروازہ کھولنا تھا کہ سامنے لانبی لانبی عنبریں زلفوں کی چلمن تاریکی میں لپٹی لپٹائی ایک ماہ وش اپنی تمام کرشمہ سازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے بے خبر دُنیا سے غافل خواب آور شباب کے کیف میں مست و مدہوش پڑی ہے۔

"جلوہ ہے یا رُخ میں گردش کر رہا ہے آفتاب"

بے خوابی کی تکلیف کا احساس تو کجا خلیفہ کے ہوش وحواس بھی بجا نہ رہے اور بے اختیارانہ اس کو ہوشیار کرنے کیلئے پیر ہلانا شروع کیا وہ ہوشیار ہوئی اور یہ دیکھ کر کہ امیرالمومنین تشریف فرما ہیں۔ صبر شکن انداز میں فرش سے اُٹھی اور مؤدبانہ عرض کیا کہ

یا امین اللہ ما ھذا الخبر۔ حضور، کیا معاملہ ہے

خلیفہ نے کہا:۔ ھو ضیفٌ طارق فی ارضکم ھل تضیفوہ الی وقت السّحر (معاملہ یہ ہے) کہ آج ایک مسافر اتنی کو قطع منزل کی مصیبتیں برداشت کرنے والا (اتفاقاً) تمہارے دیس میں آنکلا ہے کیا تم صبح ہونے تک اسکی میزبانی کرسکتی ہو۔

دوشیزہ نے عرض کیا:۔ بسرورسیدی اخدمہ ان رضی لی وبسمعی والبصر

آقا، اگر وہ میہمان مجھ سے راضی ہے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اس کی خدمت سر آنکھوں سے کروں گی۔

واقعہ گذر گیا جب خلیفہ صبح کو دربار میں جلوہ فرما ہوئے ابو نواس کو سامنے طلب کیا اور فرمایا کہ یا امین اللہ ماھذا الخبر پر مصرعے لگاؤ۔ اب آپ ابونواس کی باریک بینی بلند پروازی کو دیکھئے۔ پہلے ابونواس نے چند منٹ سوچا پھر سر اُٹھایا اور عرض کیا۔

طال لیلی حین وافانی السّھر فتفکرت فاحسنت الفکر

جب مجھ پر بے خوابی کا غلبہ ہوا تو مجھے رات پہاڑ معلوم ہونے لگی اور میں نے اپنی شب گذاری کیلئے کوئی تدبیر سوچنی شروع کی۔ (سوچتے سوچتے) نہایت حسین تدبیر سمجھ میں آئی (اور فوراً)

قمت امشی فی ھبالی ساعۃ ثم اخری فی مقاصیر الحجر

اپنی خوابگاہ سے اُٹھا پہلے تو باہر آکر محلسرائے کے صحن میں کچھ دیر ٹہلا اور پھر وہاں سے حجروں کی طرف چلا پھر میں نے ایک حجرہ کھولا تو

واذا وجہٌ جمیلٌ حسنٌ — زانہٗ الرحمٰن من بین البشر

دفعۃً میری نگاہ ایک نہایت حسین اور جمیل چہرے پر پڑی ۔ کہ اس کو خدا نے سارے آدمزاد سے زیادہ زیب و زینت اور حسن و خوبی عطا کی تھی ۔

فلمست الرجل منہا موقظًا — فرأت نحوی ومدّت لی البصر

میں نے اس حسینہ کا پاؤں اس کو جگانے کیلئے چھوا (وہ بیدار ہوگئی) اور نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا

واشارت وھی لی قائلۃ — یا امین اللہ ما ھذا الخبر

یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے کچھ اشارے کئے کہ یا امین اللہ ماہذا الخبر ۔

قلت ضیفٌ طارقٌ فی ارضکم — ھل تضیفوہٗ الی وقت السحر

فاجابت بسرورٍ سیدی — اخدم الضیف بسمعی والبصر

جب ابو نواس اس محاکات سے فارغ ہو چکا تو خلیفہ نے کہا واللہ کنت معنا ۔ واللہ تو اس وقت ہم دونوں کے ساتھ تھا ۔ ابو نواس نے کہا کہ حضور تخت خلافت کی قسم مجھے اس مصرع نے اس پورے واقعہ کی طرف راہ نمائی کی ہے میں حریم خلافت میں کیسے بار پا سکتا ہوں ۔

یہ بدیہہ گوئی کی ایسی حیرت انگیز شان ہے کہ اس سے آگے نہ عقل رہنمائی کرتی ہے اور نہ ذہن رسائی پاتا ہے ۔ اس قسم کے صدہا مواقع ابو نواس کی زندگی میں آئے اور ہر جگہ اسی انداز میں ابو نواس نے اپنا کمال دکھایا ۔ لیکن ابو نواس یہیں آکر نہیں رُک جاتا بلکہ اس کا دماغ اس سے آگے ایک اور دُنیا کا پتہ لگاتا ہے اور اپنی قوّت فکر سے اسکو بھی فتح کرتا ہے اور بلا شرکت غیر اس دُنیا پر بھی حکومت کرتا ہے ۔

بدیہہ گوئی میں ابو نواس کا اعجاز

محمد المہدی کا دربار

مہدی کے دربار میں بھی ابو نواس کو شرفِ عزّت کا بہت بڑا درجہ ملا ہوا تھا ۔ بشار بن برد ۔ جس کو جاحظ نے مولدین میں ابو نواس سے افضل قرار دیا ہے ۔ وہ مہدی کے دربار ہی میں ابو نواس کا مقابل بن چکا تھا ہم اس موقع پر دونوں کی رفعت خیال اور بلندیٔ فکر کی مثال پیش کئے دیتے ہیں ۔ اتفاق ایسا ہے کہ ایک موقع پر بشار اور ابو نواس دونوں نے ایک ہی چیز پر اظہار خیال کیا ہے

ایک روز ظہر کے وقت خلیفہ محمد المہدی ایک خیزرانی جاریہ کے مقصورہ کی طرف جا نکلا ۔ مہدی اسکی بے خبری میں گیا تھا دیکھا کہ وہ غسل کر رہی ہے ۔ جاریہ نے جیسے ہی دیکھا فوراً اس نے اپنے منوّر جسم کو اپنے سیاہ گیسوؤں کے پردے میں چھپا لیا اور زلفوں کو اس انداز سے بکھیر ڈالا کہ سارا بدن سیاہ پوش بن گیا ۔ مہدی اسکی اس شوخی کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا اور اس کی اس ادا کو بہت پسند کیا اور اپنے دولتکدہ میں پہنچکر حکم دیا کہ جو جو شاعر حاضر دربار ہوں ان کو یہاں طلب کرو ۔ چنانچہ بشار بن برد اور ابو نواس حاضر خدمت کئے گئے ۔

تم دونوں میرے واردات قلب کو اشعار میں بیان کرو خلیفہ نے فرمایا ۔

بشار ابن برد کی شعر گوئی

پہلے بشار بن برد نے کچھ غور و فکر کرنے کے بعد کہنا شروع کیا ۔

تجنبتکم والقلب صاب الیکمُ　　بنفسی ذاك المنزل المتجنبُ

مجھ کو تم سے زبردستی دور (تو) کر دیا گیا ہے (لیکن) میرا دل تمہارے لئے بیتاب ہے۔ اس منزل کے ذرات پر میری جان صدقہ جو مجھ سے زبردستی چھڑائی گئی۔

اذا ذکروا اعرضت لا عن ملالۃٍ　　وذکرا کمُ شئُ الیّ محببُ

جب میرے سامنے تمہارا ذکر کیا جاتا ہے تو میں اس سے بے توجہی کرتا ہوں لیکن یہ بے توجہی کسی ملال یا نفرت کے سبب سے نہیں (لے دے کے) ایک تمہارا ذکر ہی تو میری زیست کا سہارا ہے (پھر نفرت کے کیا معنی ہیں)

وقالوا تجنّبنا ولا تقرب بیننا　　فکیف وانتم حاجتی اتجنبُ

علی انّھم احلی من المنّ عندنا　　واطیب من ماء الحیوٰۃ واعذبُ

میرے لئے ان کا حکم ہے کہ ہم سے دور رہ اور ہرگز ہمارے قریب مت آ۔ (آہ) کیسے دور رہوں تم تو میری تمنا اور جانِ تمنا ہو مزید برآں یہ کہ میرے نزدیک وہ ترنجبین سے کہیں زیادہ شیریں ہیں۔ اور میں ان کو آبِ حیات سے خوشگوار تر اور پاکیزہ تر پاتا ہوں (پھر تم کو چھوڑ کر زندگی ہی کب رہے گی)

بشار شعر تو اچھے کہے ہیں خلیفہ نے فرمایا لیکن بخدا میرے قلبی تاثرات کی تشکیل نہیں ہے۔ اب ابو نواس کی باری تھی پہلے خلیفہ کے چہرہ پر نظریں جمائے کچھ دیکھتا رہا پھر کچھ سوچا اور کہنے لگا۔

ابو نواس کی محاکات

نضت عنھا القمیص لصبّ ماءٍ　　فورّد خدّھا فرط الحیاءٖ

اس نے غسل کرنے کے لئے اپنے جسم سے کپڑے اتارے (لیکن جب اس نے اپنے کو عریاں پایا تو حیا آگئی) اور فرطِ حیا سے اسکے رخسار گلابی ہو کر دمکنے لگے۔

وقابلت الھواء وقد تعرّت　　بمعتدل ارق من الھواءٖ

اس نے عریانی کے عالم میں اپنے ہوا سے زیادہ لطیف اور شفاف جسم کو چلتی ہوئی ہوا کے مقابل کر دیا۔

ومدّت راحۃً کالماءِ منھا　　الی ماءٍ معدٍّ فی الاناءٖ

اور پانی جیسی شفاف ہتیلی برتن میں رکھے ہوئے پانی کی طرف بڑھائی۔

فلمّا ان قضت وطراً وھمّت　　علی عجلٍ لاخذ بالرداءٖ

جب وہ غسل سے فارغ ہو چکی اور جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا۔

وقامت تشترا ب علی حذارٍ　　کشب الظبی افرد من ظباءٖ

(تو) کھڑی ہوئی اور خوفزدگی کے عالم میں گردن اٹھا اٹھا کر بنظر احتیاط (چاروں طرف) اس انداز سے دیکھنے لگی جیسے ہرنیوں کی ڈار سے بچھڑ کر کوئی ہرنی اپنے آس پاس کی چیزوں پر وحشت ریز نگاہیں ڈالتی ہے۔

رعت شخص الرقیب علی التدانی　　فاسبلت الظلام علی الضیاءٖ

اس کو قریب ہی اپنا شیدا نظر آیا (بس) فوراً اس نے روشنی پر تاریکیوں کو لٹکا دیا۔

فغاب الصبح منھا تحت لیلٍ　　وظلّ الماء یجری فوق ماءٖ

پس (اس عمل سے) اس ماہوش کے جسم کا وہ حصہ جو تا بانی میں صبح کے مشابہ تھا رات کے نیچے غائب ہو گیا۔ گویا پانی کے اوپر پانی بہنے لگا۔

فسبحان الالہ وقد براھا کاحسن ما یکون من النساء

پاک ہے وہ خدا جس نے اس حسینہ کو تمام نقائص سے پاک صاف پیدا کیا ہے اور تمام عورتوں میں زیادہ حسین وجمیل قرار دیا ہے
خلیفہ نے ابو نواس کی محاکات سن کر یقین کر لیا کہ اس خلوتکدہ کے کہیں آس پاس ابو نواس پوشیدہ کھڑا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن خلیفہ کو کیا خبر تھی کہ یہ خود اسکے اپنے چہرہ کے ان وقتی اثرات کی ایک دلکش تصویر ہے جن کو ابو نواس نے شاعرانہ نکتہ رسی اور باریک بینی سے معلوم کرکے رومانیت کے دلآویز رنگ میں پیش کر دیا ہے۔

خلیفہ مہدی ابو نواس کی محاکات سن کر زرد ہو گیا اور طیش میں آکر خدام کو حکم دیا کہ جلاد سے کہو وہ تلوار اور چمڑا[1] لیکر حاضر ہو ابو نواس کھٹک گیا اور بہ لجاجت تمام عرض کیا۔

حضور خلافت پناہ جلاد کی حاضری کا حکم کیوں صادر فرمایا۔

اس سرکش کے وجود سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے جو حریم خلافت میں پوشیدہ داخل ہو کر وہاں کے راز معلوم کرے خلیفہ نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

حضور ایسا خانماں برباد زندگی سے سیر کون اجل گرفتہ ہے ابو نواس نے زمین پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر عرض کیا۔

تو ...... ابو نواس ...... تو خلیفہ نے فرمایا۔

اس کا ثبوت ابو نواس نے پاکدامنی کے انداز میں عرض کیا۔

ثبوت ...... ابو نواس اس کا ثبوت ...... ہوں ...... ابھی ابھی جو واقعہ اشعار کے پیرایہ میں تو نے بیان کیا ......
اور اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہتا ہے ...... بتا کیا اور بھی کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔

حضور حریم خلافت میں پوشیدہ داخل ہونا تو کیا اجازت پاکر بھی داخلہ کی ہمت نہیں ابو نواس نے عرض کیا۔ حضور یہ تو صرف خلافت پناہی کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کی وساطت سے میرے دل و دماغ کی خلاقی تھی ورنہ کہاں میں اور کہاں حریم خلافت۔

آپ غور کیجئے اس شاعر کے کمال پر کہ اس نے خلیفہ کے چہرہ کے آثار سے کل واقعہ تک راہبری کرکے تغزل کے کیسے دلکش انداز میں پیش کیا۔ یہ ہے ابو نواس کا شاہکار اور اس منزل پر پہنچکر ابو نواس ہم کو رفعت کی اس چوٹی پر نظر آتا ہے جہاں اسکے معاصرین متقدمین تو کجا متاخرین بھی اس میں شرکت نہ کرسکے۔

---

[1] خلفاء عباسیہ سنگین جرم والے سرکش مجرموں کو اپنے روبرو دربار ہی میں قتل کراتے تھے اور اسی مقصد کے لئے دربار کرتے وقت جلاد برہنہ تلواریں کاندھوں پر رکھے مؤدب کھڑے رہتے تھے اور ساتھ ہی چمڑے کا ایک ٹکڑا جس پر چار چار چھ چھ انگل ریت بچھا رہتا تھا اور اسی پر مجرم کی گردن ماری جاتی تھی۔ ریت اس پر اس لئے بچھا رہتا تھا تاکہ مجرم کے خون سے دربار خلافت کی مقدس زمین آلودہ نہ ہو اور یہ ریت اس کو جذب کرلے۔

سرمایہ داری میں اصولی تضاد

کارل مارکس کا خیال تھا کہ :-

(۱) سماج کا دارومدار جنس پیدا کرنے کے طریقہ اور اس جنس کے طریقۂ تقسیم پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ ہر زمانہ کی سماج کا دوسرے زمانہ کی سماج سے اختلاف صرف اس وجہ سے رہا ہے کہ دونوں زمانوں کے طریق پیداوار اور تقسیم جدا جدا ہوتے تھے اور یہ کہ ہر سماجی تبدیلی خواہ معاشرتی ہو یا سیاسی اسی تحت میں آتی ہے۔

(۲) آجکل جو اس امر کا احساس بڑھ رہا ہے کہ موجودہ سماجی زندگی اور طریق معاشرت بے انصافی پر مبنی ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ موجودہ نسل زیادہ نیک اور پارسا بن گئی۔ بلکہ جنس کے طریق پیداوار اور تقسیم کے ساتھ ساتھ سماج نہیں بدلی۔ اگر طریق پیداوار وغیرہ ۷۵ فی صدی بدل گئے ہیں تو سماج صرف ۱۵ فی صدی بدلی ہے۔

(۳) موجودہ معاشرتی اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا نتیجہ ہے جسکی خصوصیت جنس کو نفع کے لئے پیدا کرنا ہے۔ اس طریق سے قبل جاگیردارانہ طریق پیداوار تھا لیکن چونکہ یہ ایک دوسرے کا رد تھے اس لئے دونوں میں جنگ ہونے لگی اب آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے کہ سماج اپنے سامنے وہی کام رکھتی ہے جس میں پورا ہونے کی اہلیت ہو اور یہ بھی کہ دوسرا طریق پیداوار اسی وقت نمودار ہوتا ہے۔ جب پہلے طریق میں پیداوار کی طاقتوں کے بڑھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ جاگیردارانہ طریق میں پیداوار کی طاقتیں نہیں بڑھ سکتی تھیں اس لئے سماج میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار جاری ہو گیا۔

(۴) موجودہ مزدوروں کے کاندھوں پر پڑے ہوئے طریق پیداوار کو جس کا مقصد صرف نفع حاصل کرنا ہے سرمایہ داری کہتے ہیں اور کیونکہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں آزادی کے ساتھ مقابلہ کرنے۔ خرید و فروخت والوں کو برابر کے حقوق رکھنے اور ہر شخص کو اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے کی ضرورت تھی اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ آزادی اور مساوات سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ہر طرف سے آزادی آزادی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہاں اس امر پر غور کیجئے کہ پیداوار کی طاقتوں اور طریق پیداوار نے کس طرح اس زمانے کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ آزادی اور مساوات کے راگ گائیں آزادی و مساوات کا خیال کسی کے دماغ کا اختراع نہیں تھا بلکہ یہ خیال طریق پیداوار کی ضرورتوں نے ان کے دماغ میں پیدا کیا تھا پہلے طریق پیداوار بدلا پھر اس نے انسانی تخیل کو بدلا۔ سرمایہ داری آزادی اور مساوات ساتھ ساتھ لائی۔

سرمایہ داری نے آزادی اور مساوات پیدا کی اور آزادی و مساوات نے سرمایہ داری کو ختم کیا

پیداوار کی طاقتوں کو شکست دیدی اور طریق زندگی کو اس تیزی سے بدلا کہ دُنیا دنگ رہ گئی کچھ عرصہ تک جاگیردارانہ طریق پیداوار جو دستکاری پر منحصر تھا اور جس کی نمایاں خصوصیت جنس کو استعمال کیلئے پیدا کرنا تھی چلتا رہا لیکن آخرکار تباہ ہوگیا جن وجوہ سے وہ تباہ ہوا تھا آج سرمایہ داری بھی انہیں وجوہات کی بنا پر تباہ ہو رہی ہے ۔

(۵) شروع شروع میں سرمایہ داری سے دُنیا کو بہت فائدہ پہنچا یہ اسی کا کام تھا کہ دُنیا نے چند صدیوں میں زبردست ترقی کرلی لیکن اب سرمایہ داری پیداوار کی طاقتوں کے پاؤں میں زنجیر ہوگئی ہے اور ان کو بڑھنے نہیں دیتی۔ پیداوار کی طاقتیں بڑھنا چاہتی ہیں طریق پیداوار پھیلنا چاہتا ہے اور طریق تقسیم وسیع ہونا چاہتا ہے لیکن یہ تمام رجحانات سرمایہ داری کیلئے نقصان دہ ہیں کیونکہ اگر ان کو پھیلنے دیا تو پیداوار کی طاقتیں سرمایہ دار کے ہاتھ سے نکل کر سماج کے ہاتھ میں آجائیں گی حالانکہ سائنس کی بدولت استعمالی اشیاء ضرورت سے زیادہ پیدا ہوسکتی اور ہوتی ہیں۔ لیکن ضرورت مند بدستور موجود رہتے ہیں کیونکہ نہ جنس ضرورت مند کے پاس جاسکتی ہے اور نہ ضرورت مند جنس کی جانب ہاتھ بڑھا سکتا ہے ۔

(۶) اگر سماج پیداوار کی طاقتوں سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکے اور پیدا کردہ جنس کو نہ استعمال کرسکے تو یہ اس سماج کا سب سے بڑا نقص ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ سماجی طریق کو بدل دیا جائے۔ آج کل جو لڑائی پیداوار کی طاقتوں طریق پیداوار اور طریق تقسیم میں ہو رہی ہے کسی کے خیال کی اُڑان نہیں بلکہ ایک الگ ہستی رکھتی ہے ۔ سوشلزم پیداوار کی طاقتوں طریق پیداوار اور تقسیم پیداوار کی لڑائی کا حل ہے۔

(۷) آٹھویں صدی سے پندرہویں صدی تک کام کاج چھوٹے پیمانے پر ہوتے تھے جن کے بنیادی اصول کے مطابق جنس بنانے والا ہی جنس کا مالک ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسان تھا تو زمین بیل اور ہل اسی کی ملکیت ہوتے تھے ۔ وہ اپنی محنت سے جنس پیدا کرتا تھا اس لئے پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔ شہروں میں بھی دستکاری چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ تنہا آدمی کام کرتا تھا وہ اپنی محنت سے جنس بناتا تھا اور قدرتی طور پر وہی اس کا مالک ہوتا تھا۔ شہروں میں بھی دستکاری چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ تنہا آدمی کام کرتا تھا وہ اپنی محنت سے جنس پیدا کرتا تھا اس لئے پیداوار کا مالک ہوتا تھا ۔ تنہا آدمی کی ضرورت کے مطابق اوزار بھی چھوٹے ہوتے تھے۔ ان چھوٹے اوزاروں کو بڑا اور تیز بنانا اور موجودہ کلوں میں تبدیل کرنا سرمایہ داری کا کارنامہ ہے۔ فیوڈل یا جاگیردارانہ طریق پیداوار اس قدرتی ترقی کو نہ روک سکا اور آخرکار تباہ و برباد ہوگیا۔

(۸) کارل مارکس نے اپنی مشہور تصنیف سرمایہ کے چوتھے باب میں اس امر کا مفصل ذکر کیا ہے کہ ۱۵ صدی سے سرمایہ داری نے کس طرح آسان اور سادہ طریق پیداوار کو موجودہ صنعت وحرفت میں تبدیل کردیا اور کس طرح سرمایہ داری نے اسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری گہری تبدیلی بھی پیدا کردی وہ یہ ہے کہ اس نے چھوٹے اور سادہ طریق پیداوار کو جو کمزور طاقت پیداوار کا نتیجہ تھا بڑا اور تیز بنا دیا لیکن اسکی نوعیت بھی بدل دی جو شروع شروع میں غیرارادی تھی سرمایہ داری نے انفرادی طریق پیداوار کو اجتماعی طریق پیداوار بنا دیا یعنی پہلے تنہا آدمی پورا کام کرتا تھا اور اب بہت سے آدمی مل کر وہ کام کرنے لگے۔ پُرانے چرخوں کھڈیوں اور ہتھوڑوں کو بدل دیا۔ اور بجلی یا بھاپ سے چلنے والی چیزیں بنادیں۔ لوہار کی دُکان جہاں وہ اکثر تنہا کام کیا کرتا تھا فیکٹری بن گئی اور وہاں پر بہت سے لوگ کام کرنے لگے۔ جنس کسی خاص دستکار کی محنت کا نتیجہ نہیں رہی بلکہ ان تمام دستکاروں کی محنت کا نتیجہ۔ یعنی طریق پیداوار انفرادی سے اجتماعی ہوگیا ۔

(۹) اب دیکھئے کہ طریق پیداوار تو تبدیل ہو کر انفرادی سے اجتماعی ہوگیا لیکن ملکیت بدستور انفرادی ہی رہا پُرانا زمانہ تو وہاں ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ دستکار اوّل سے آخر تک خود جنس بناتا تا اور قدرتی طور پر وہی اس جنس کا مالک ہوتا تھا۔ دستکار کی ملکیت اسکی محنت کا نتیجہ تھی۔ اگر اُس زمانے میں سب گھر والے جنس بناتے تو وہ جنس ان سب گھر والوں کی ملکیت ہوتی تھی لیکن اب جبکہ طریق پیداوار

انفرادی سے اجتماعی ہوگیا تو بھی ملکیت میں فرق نہ آیا بلکہ وہ انفرادی ہی رہی اور صنعت و حرفت پر سرمایہ دار کا قبضہ ہوگیا۔

(۱۰) پرانے زمانہ میں پیداوار ایک فرد یا گھر والوں کی ضرورت کو پورا کرتی تھی اور اگر کچھ ضرورت سے بچ رہتا تو اس کا تبادلہ کسی دوسری جنس سے ہو جایا کرتا تھا جہاں خدمتگاری کے تعلقات تھے وہاں پیداوار جاگیردار کی ضرورت کو بھی پورا کرتی تھی اب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ اس زمانہ میں جنس استعمال کے لئے پیدا کی جاتی تھی نہ کہ نفع کے لئے لیکن جب عام طریق پر کسان ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کرنے اور جاگیردار کو لگان ادا کرنے لگا تو اس وقت سے وہ پیداوار جو کہ ضرورت و استعمال کیلئے پیدا کی جاتی تھی پیداوار نہیں بلکہ جنس بن گئی جو نفع کیلئے پیدا کی جانے لگی۔ پہلے زمانہ میں کبھی کبھار طریق مزدوری دیکھنے میں آتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ لوہار وغیرہ کی دکان پر بیٹھتے بھی تھے تو ان کا مقصد مزدوری کرنا نہیں بلکہ کام سیکھنا ہوا کرتا تھا تاکہ آگے چل کر خود لوہار ہو جائیں اور یہی ہوتا بھی تھا۔ چند سال کام سیکھنے کے بعد وہ خود لوہار ہو جاتے تھے اور اپنا کام الگ شروع کر دیتے تھے دوران شاگردی میں اگر ایک لوہار ان کو کچھ دیتا بھی تھا تو وہ مزدوری نہ ہوتی تھی بلکہ ایک طرح کا وظیفہ ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں غریب کو مزدوری کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک مزدور ساری عمر کے لئے مزدور رہ گیا۔ جب اجتماعی طریق پیداوار سے جنس سستی ہوئی تو انفرادی طریق مقابلہ نہ کرسکا اور لاکھوں کیا کروڑوں دستکار جو چھوٹے چھوٹے اور سادہ اوزاروں سے کام کرتے تھے بیکار ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نواب راجہ اور جاگیردار بھی فنا ہو گئے اور ان کی فوج اور نوکر چاکر سب بیکار ہو گئے ان سے مزدوروں کی تعداد اور بھی بڑھی غرضکہ کچھ عرصہ میں سماج میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک وہ جس کے ہاتھ میں سماج کی ساری پیداوار آگئی دوسری وہ جسکے پاس سوائے کام کرنے کی طاقت کے اور کوئی سرمایہ نہ رہا۔

(۱۱) اب اجتماعی طریق پیداوار کے بڑھنے اور جنس کے بڑی تعداد میں تبادلہ کیلئے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس طریق کے نقائص صاف نظر آنے لگے یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ جس سماج میں جنس نفع کے لئے پیدا کی جاتی ہے اس میں کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ سماج کو کب اور کتنی جنس کی ضرورت ہے سرمایہ دار یہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح قدرت کا قانون کشش کام کرتا ہے اسی طرح ہر طرح ہر طریق پیداوار کے قوانین کام کرتے ہیں۔ اصل قیمت کے قانون مقابلہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور بجائے اسکے کہ سرمایہ دار کی مرضی پر چلیں سرمایہ دار کو اپنی مرضی پر چلاتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سماج کا طریق لین دین کسی خاص نظام کے مطابق نہیں بلکہ ہنگامی ہے بغیر سماج کی ضرورت معلوم کئے جنس کو نفع کیلئے بنانا سرمایہ داری کا پیدائشی نقص بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکے لئے جان کا حکم بھی رکھتا ہے۔

(۱۲) پیداوار کے اجتماعی اور ملکیت کے انفرادی ہونے کے اختلاف کی وجہ سے کارخانہ میں تو انتظام لیکن سماج میں بدانتظامی ہے دیکھئے کارخانہ میں یہ حساب تو ہو جاتا ہے کہ کتنی خام جنس درکار مشین ایک دن میں کتنا مال بناتی ہے اور کتنے مزدوروں کی ضرورت ہے وغیرہ۔ لیکن یہ حساب نہیں ہوتا کہ سماج کو کتنی جنس اور کب درکار ہے۔ یہی بدنظمی سرمایہ داری کو چلا رہی ہے۔ لین دین کا یہ اصول کہ جنس اپنی اصل قیمت پر فروخت ہونی چاہئے سرمایہ دارانہ نظام میں کمپیٹیشن یعنی مقابلہ کے ہاتھوں پورا ہوتا رہتا ہے اور اسی وجہ سے جنس اپنی اصل قیمت پر آکر رکتی ہے چاہے اسکی تبادلاتی قیمت کتنی ہی کم یا زیادہ کیوں نہ کر دی جائے۔ یہ تو بدنظمی کا پہلا نتیجہ ہوا۔ اب دوسرا سنئے؟

بدنظمی کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سرمایہ دار۔ دوسرے سرمایہ دار کے مقابلہ میں جب اپنی جنس کو دوسرے کی جنس سے سستا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسکے لئے نفع بخش کلیں بنوانا اور مزدور کی جنس بنانے کی استعداد بڑھانا ضروری ہو جاتا ہے اور اسکی مرضی کے مطابق کلیں بنانے والوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں یہ بدنظمی کا فیض ہے کو سرمایہ دار کلوں کی تکمیل پر مجبور ہی نہیں بلکہ اسکی زندگی اور طریق پیداوار کا دارومدار ہی ان کی تکمیل پر ہے۔ کیونکہ انسانی محنت قیمت پیدا کرتی ہے اس لئے جب مشین کم انسانی محنت

خرچ کرکے جنس بنانے لگی تو جنس سستی ہوگی۔ یہی وجہ سرمایہ دار کو مشین استعمال کراتی ہے۔ اگر مشین قیمت پیدا کرتی تو آج دنیا میں جنس بہت مہنگی ہوتی لیکن جنس سستی ہو رہی ہے کیونکہ قیمت پیدا کرنے والی شے جس کو انسان محنت کہتے ہیں وہ مشین کی ترقی کے ساتھ ساتھ جنس میں کم ہوتی جارہی ہے دوسرے الفاظ میں مشین کے ساتھ ساتھ مزدور بیکار ہو رہا ہے۔ مشین مزدور کی جگہ لے رہی اور بیکاروں کی فوج میں اضافہ کر رہی ہے۔

(۱۴) ایسے وقت میں جب سرمایہ دار کا جھگڑا اسکے مزدوروں سے جو کام کر رہے ہوں ہو جاتا ہے تو بیکاروں کی فوج سرمایہ دار کو بڑی مدد پہنچاتی ہے اور مزدور کو سرمایہ دار کے سامنے جھکنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار ہر وقت لڑنے والے کو نکال کر دوسرا مزدور بھرتی کر سکتا ہے۔ اور اس بیکار فوج کے بل بوتے ہی پر سرمایہ دار شرح مزدوری کم سے کم کر دیتا ہے اور مزدور چوں تک نہیں کر سکتا۔ اس لئے مشین سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک زبردست ہتھیار ہے جو اس کو ہر طرح سے فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔ بیکار مزدوروں کی فوج سرمایہ دار کو جھگڑے ہی کے موقع پر فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ (Boom.) میں جب نفع زیادہ ہو رہا ہو۔ اور (Crisis) میں جب نفع خطرے میں ہو تب بھی بہت فائدہ دیتی ہے (Boom.) بوم۔ میں مزدور فوراً کم مزدوری پر دستیاب ہو جاتے ہیں اور تعطل میں ان کی مزدوری فوراً گھٹا دی جاتی ہے۔

اب دیکھئے کہ مزدور خود ہی تو مشین بنائے اور پھر مشین ہی مزدور کو بیکار کر دے۔ لیکن مشین کی تکمیل اور پیداوار کی طاقتوں کا بڑھانا سرمایہ دار کے لئے قانون قدرت کا سا حکم رکھتے ہیں۔ سرمایہ دار کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ پہلا تو مشین کی تکمیل اور پیداوار کی طاقتیں کو قابو میں رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ بہت بڑھ جاتی ہیں تو سرمایہ دار کے قابو سے باہر ہو جاتی ہیں اور اب سرمایہ دار کو ان کی مرضی پر چلنا پڑتا ہے۔ اسکی مثال ایسے سمجھئے کہ موٹر چلانے والا موٹر چلا رہا ہے شروع شروع میں تو وہ موٹر کو قابو میں رکھتا ہے لیکن اگر اسکی رفتار بڑھتا جائے تو ایک درجہ وہ آئیگا کہ موٹر اسکے قبضہ سے باہر ہو جائے گی اور اب اس کو موٹر کی مرضی پر چلنا پڑے گا۔ اگر وہ درخت کی سمت جارہی ہے تو موٹر والا اس کو روک نہیں سکتا اور ٹکر کو بچا نہیں سکتا۔ پیداوار کی طاقتیں ایک بھری ہوئی روح کی طرح بڑھتی اور اس چیز کو جو ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہے روندتی چلی جاتی ہیں۔ اور اگر کوئی اٹل شے ان کے راستے میں آجائے تو وہ سیلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

(۱۵) اب جو مشکل آپڑتی ہے وہ یہ ہے کہ مشین اور سائنس کی برکت سے جنس کی پیداوار تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے لیکن اسی نسبت سے مانگ نہیں بڑھتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار آپس میں سخت مقابلہ کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اور بڑی بڑی کلیں تیار ہو جاتی ہیں یعنی جہاں پہلے دس چھوٹی مشینوں پر دس مزدور کام کرتے تھے وہاں پر اب ایک بڑی مشین رہ جاتی ہے اور اس پر صرف ایک مزدور اتنی ہی دی ہوئی جنس پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح سے جنس تو سستی ہو جاتی ہے لیکن مزدوروں میں بیکاری ہو جاتی ہے اور پھر ان میں اس سستی چیز کے خریدنے کی بھی طاقت نہیں رہتی اور جو سرمایہ دار سرمایہ کی کمی کی وجہ سے بڑی بڑی مشینیں نہیں لگا سکتے ان کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے اور دیوالہ نکل جاتا ہے اور ان کی کلوں کے مزدور بیکار ہو جاتے ہیں۔ اب سرمایہ دار بیکار مزدوروں کی زیادتی دیکھ کر برسرکار مزدوروں کی مزدوری گھٹا دیتا ہے بہانہ یہ ہوتا ہے کہ جنس سستی ہوگئی اور مزدور اب ان کو کم دام میں خرید سکتا ہے۔

اس طرح غریب اور انجان مزدور اس گھٹاؤ کو منظور کر لیتا ہے۔ جب خرید کی قوت کم ہو جاتی ہے تو جنس کا بکنا بند ہو جاتا ہے اور بازار میں جنس کا انبار لگ جاتا ہے پھر جنس کے سستا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ عوام اس کو خرید سکیں۔ قیمت کم ہونے کے ساتھ سرمایہ دار کے نفع میں بھی کمی واقع ہوتی ہے اور پھر اس نقصان کو دور کرنے کے لئے پہلی مشینوں سے بہتر اور خود بخود چلنے والی مشینیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن اس سب کا ردعمل دوسرے مزدوروں کی بیکاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس یہ مقابلہ اور نفع جس کو پہلے مساوات اور آزادی

سمجھا گیا تھا۔ ایک تباہی کا چکر ثابت ہوتا ہے جو سرمایہ داری کو اپنی مضبوط گرفت سے نہیں نکلنے دیتا۔

(۱۶) اب آپ دیکھئے کہ کس طرح یہ بڑی بڑی مشینیں جنگ کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں مشین مزدور کو بیکار کر دیتی ہے اور جنس کو سستا لیکن جب مزدور بیکار ہو جاتا ہے تو جنس بکنی بند ہو جاتی ہے اور سرمایہ دار نفع حاصل کرنے کیلئے دوسری تیز اور نفع بخش مشینیں بنوا کر جنس کو سستا کر دیتا ہے لیکن جنس پھر بھی نہیں بکتی اور جب خرچہ برداشت نہیں ہوتا تو کارخانوں کے دیوالے نکل جاتے ہیں اب بہت سے مزدور مع سرمایہ دار بیکار ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کا وقت تو اچھا گزرتا ہے لیکن مزدور پر فاقہ گزرنے لگتا ہے اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مزدوروں نے سماجی ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کر دی۔ روپیہ جو جنس کو چکر میں لاتا ہے اب لین دین کیلئے ایک روک ہو جاتا ہے خرید و فروخت کے قوانین الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ پیداوار کی طاقتیں طریق پیداوار کے خلاف بغاوت کرنے لگتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنس اونے پونے بکنے لگتی ہے۔ لیکن سرمایہ دار اپنی دولت اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس وقت وہ اپنے اثر سے کام لیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے بازاروں کو قابو میں لانے کے لئے اپنی حکومت کو جو کٹھ پتلی کی طرح ہوتی ہے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ممالک کے خلاف جنگ کرے اور ان کے لئے بازار مہیا کرے۔ اب جنگ کا سامان شروع ہو جاتا ہے۔ مزدور دن رات جنگی چیزیں بنانے کے کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں بہت سے لوگ فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیکاری کی وبا دور ہو گئی یہاں تک کہ جنگ کا گولہ پھٹتا ہے۔ اور وہی مزدور جن کا خون سرمایہ داروں نے پہلے ہی چوس لیا تھا اپنا آخری قطرہ تک اس سرمایہ داری کیلئے بہانے کو سربکف نکل پڑتے ہیں اور ملک کے نام پر سرمایہ داری کیلئے اپنی جانیں تک دے دیتے ہیں۔ اس طرح جنس اور مزدور تباہ ہو جاتے ہیں اور بازار خالی ہو جاتا ہے اب پھر وہی چکر شروع سے شروع ہوتا ہے۔ لوگ پہلے کی طرح مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ نفعے خوب ہونے لگتے ہیں۔ مزدوری اچھی ملنے لگتی ہے اور بوم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۴

یہاں تک کہ پندرہ سولہ سال بعد اوپر بیان کی ہوئی کیفیات پھر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پھر کمپٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جنس کو سستا بنانے کے لئے بڑی بڑی مشینیں بنتی ہیں۔ پھر مزدور بیکار ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ اجتماعی پیداوار انفرادی ملکیت کا اختلاف رنگ لائے بغیر نہیں رہتا اور برابر تصادم پیدا کرتا رہتا ہے۔

(۱۷) قدرت کا قانون کہ ہر شے اپنی فطرت کے مطابق گردوپیش کو اپنے رنگ پر لانا چاہتی ہے۔ طریق پیداوار یہیں بھی کام کرتا ہے اب جبکہ فیکٹری میں طریق پیداوار منظم ہو گیا۔ ایک جنس ایک مقررہ مقدار اور وقت میں بنی۔ تو یہ ضروری ہوا کہ سماج بھی اپنی تنظیم کرے یعنی جنس بنانے سے پہلے سماج یہ معلوم کر لے کہ کس اور کتنی جنس کی ضرورت ہے۔

(۱۸) کرائسس اور زمانہ گھٹاؤ کے دوران میں سرمایہ داری کے پیدائشی نقائص بہت نمایاں ہو جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جبتک پیداوار کا محرک نفع حاصل کرنا ہے اس وقت تک یہی خرابیاں پیدا ہونگی مشینیں۔ کلیں اور مزدور موجود ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال نفع پیدا نہیں کرتا مشینوں اور کلوں کی تعداد سرمایہ داری کے مانع ہو جاتی ہے۔ نفع غائب ہوتے ہی سرمایہ دار کو جنس پیدا کرنے کا لالچ بھی نہیں رہتا۔ اس لئے صنعت و حرفت سست ہو جاتی ہے۔ لیکن کیونکہ سرمایہ دار کے پاس کھانے کو کافی ہوتا ہے اس لئے اس کو کوئی فکر نہیں ہوتا۔ البتہ مزدور کے دم پر بن جاتی اور اسکے کام کرنے کی طاقت کی کوئی قیمت نہیں رہتی اس سے بھی سرمایہ دار ہی کو فائدہ پہنچتا ہے کسی نظام کا سماج کو ترقی دینا ہی اسکی زندگی ہے یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری جبتک سماج کی پیداوار بڑھانے کی ایک وجہ رہی دنیا میں اس کا دور دورہ رہا لیکن اب وہ سماج کی پیداوار پر بوجھ ہو گئی اس لئے اسکے خلاف زبردست جنگ ہو رہی ہے اور پیداوار کی طاقتیں مجبور کر رہی ہیں کہ انفرادی ملکیت کی بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے۔ جس حد تک ممکن ہے سرمایہ دار پیداوار کو اجتماعی شکل بھی دے رہا ہے لیکن وہ

سرمایہ داروں تک ہی محدود ہے۔ ایک کمپنی بنا کر اسکے حصے بیچنا سرمایہ داری کو اجتماعی شکل دینے کا ایک طریق ہے لیکن اس قسم کی اجتماعی شکل کام نہیں دیتی بہت سی ایسی کمپنیاں جاری ہو جاتی ہیں اور آپس میں شدید مقابلہ ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ پھر صنعت و حرفت کی حالت مذبذب ہو جاتی ہے اور کرائسس پیدا ہو جاتا ہے اب ٹرسٹ اور سنڈیکیٹ بنتے ہیں جس میں نہ صرف ایک ملک کے بڑے سرمایہ دار بلکہ بسا اوقات مختلف ملکوں اور قوموں کے سرمایہ دار شامل ہو جاتے اور بڑے پیمانے پر کام شروع کر دیتے ہیں یہ کوششیں اس لئے ہوتی ہیں کہ کسی طرح مقابلہ بند کیا جائے تاکہ نفع غائب نہ ہو نفع کا غائب ہونا ہی کرائسس کہلاتا ہے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مقابلہ کے بغیر سرمایہ داری چل ہی نہیں سکتی اب مونوپلی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑے سرمایہ دار مونوپلی پر قبضہ کر لیتے ہیں اس لئے چھوٹے سرمایہ دار بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں بڑے سرمایہ دار کھٹکنے لگتے ہیں چھوٹے بڑے سرمایہ داروں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

اب مقابلہ نہ ہونے سے جنس کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے اور سرمایہ دار کو فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ مونوپلی طریق بڑھتے بڑھتے ملک کی سب بڑی بڑی صنعتوں پر چھا جاتا ہے اور ان پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طریقہ کا عام ہونا سماج کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ ہو جاتا ہے۔ اسکی کیا وجہ کہ چند سرمایہ دار صنعت و حرفت پر قبضہ کر لیں؟ جنس کے دام مقرر کر دیں؟ جو شے اور جس تعداد میں وہ بنائیں اسی مقدار میں بنے اور سماج کو استعمال کرنی پڑے اور دوسرے ایسے سوالات سماج میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن حالات کے پیش نظر سماج مونوپلی توڑنے کیلئے مجبور ہو جاتی ہے سرمایہ داروں کی دوسری ٹولیاں جن کا مونوپلی میں ہاتھ نہیں ہوتا۔ عام پبلک کے ہم آواز ہو جاتی ہیں اور اپنے نمائندوں سے حکومت پر زور ڈلواتی ہیں کہ مونوپلی پیداوار اور جنس کے دام مقرر کرنے میں دخل دے حکومت اس امر پر مجبور ہو کر دخل دیتی ہے لیکن اس کو بڑے سرمایہ دار قبول نہیں کرتے اور اس طرح ایک کشمکش کی صورت نکل آتی ہے اور بہت بڑے کاموں مثلاً۔ ڈاکخانہ ریل وغیرہ پر حکومت قبضہ کر لیتی ہے۔

(۲۱) شروع شروع میں جس طرح سرمایہ داری نے مزدوروں کو بیکار کیا تھا اب سرمایہ داروں کو بھی بیکار کر دیا۔ کیونکہ سماج میں ضرورت سے زیادہ سرمایہ پیدا کر دیا اس لئے نفع غائب ہو گیا۔

(۲۲) فی زمانہ سرمایہ دار کے سب کام تنخواہ دار کرتے ہیں اس لئے سرمایہ دار سماج کے لئے ایک بیکار ہستی رہ گیا وہ نفع کو جیب میں ڈال لینے یا سٹہ کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔

(۲۳) آجکل کی حکومتیں تجارتی معاملات میں چاہے کتنا ہی دخل کیوں نہ دیں لیکن سرمایہ داری کا جزو ہوتے ہوئے وہ اصلیت کو نہیں بدل سکتیں اور سرمایہ دار کو نہ صرف غیر ممالک کے سیاسی یا تجارتی بلکہ اپنے ہی ملک کے مزدوروں کے حملوں سے بچانا اپنا اہم فرض سمجھتی ہیں۔

(۲۴) اگر حکومت سب طریق پیداوار اپنے قبضہ میں لے لے تو اسکے معنی یہ نہیں کہ سرمایہ داری ختم ہو گئی۔ اس حالت میں حکومت خود سرمایہ دار ہو کر خوب لوٹ کھسوٹ مچاتی ہے لیکن آخرکار وہ اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ چل نہیں سکتی اس طرح سرمایہ داری حکومت کیلئے بھی کوئی خاص فائدہ مند چیز ثابت نہیں ہوتی۔ بس اب تو سرمایہ داری کا حل اس امر کا عملی اقرار ہے کہ پیداوار کی طاقتیں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ انفرادی کوشش ان کو نہیں چلا سکتی۔ اور کیونکہ پیداوار اجتماعی عمل کا نتیجہ ہے اس لئے انفرادی ملکیت اور لین دین کو ختم کیا جائے طریق پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لایا جائے۔ اور طریق لین دین کو نفع کے اصول پر نہیں بلکہ ضرورت استعمال کے اصول پر رکھا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مزدور دلیری سے حکومت پر قبضہ کر لے اور طریق پیداوار و لین دین کے طریقے کو بدل دے۔

(۲۵) جس طرح اگر ہم قدرت کی طاقتوں کو غلط سمجھیں اور ان کا غلط استعمال کریں تو وہ ہمارے لئے نقصان اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں

بالکل اسی طرح طریق پیداوار کی طاقتوں کا حال ہے لیکن جب ہم ان کی اصلیت سمجھ جاتے ہیں تو وہی طاقتیں زندگی کو آسودہ بنا دیتی ہیں۔ پس جبتک سماج پیداوار کی طاقتوں اور طریق پیداوار اور تقسیم کی حقیقتوں پر غور نہیں کرے گی اور اصلیت کو نہ پہچانے گی اس وقت تک سرمایہ داری سماج پر قبضہ کیئے رہے گی۔ اسکی مثال بالکل بجلی کی سی ہے۔ جب بجلی کی نوعیت معلوم ہوگئی تو وہ ہماری زندگیوں کے لئے ایک نعمت ہوگئی لیکن پہلے وہی نعمت ایک خوفناک چیز سمجھی جاتی تھی۔ جب عمارت پر بجلی گرتی لوگ خوف و وہشت سے چلاّ اُٹھتے اور عمارت جل کر بھسم ہوجاتی لیکن اب جب لوہے کا تار لگا دیا جاتا ہے۔ تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہ سب ایک چیز کی اصلیت کے نہ پہچاننے کا نتیجہ تھا اور جب اسکی حقیقت واضح ہوگئی تو پھر اسی خوفناک شے سے زیادہ آرام دہ کوئی دوسری چیز نہ رہی کیونکہ اب سوشلزم نے مختلف طریق پیداوار کے اصول اور ان کے اثرات جو سماج پر ہوتے ہیں معلوم کر لئے اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے جو اثرات سماج پر ہو رہے ہیں اور ہوں گے ان کا علم ہوگیا۔ اس لئے اس وقت سماج ان قدرت کی طاقتوں اور طریق پیداوار کے قانونوں کی محکوم نہیں بلکہ حاکم ہوگئی۔ لیکن ان طاقتوں پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اس لئے سماج ان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ اگر یہ طاقتیں سماجی ملکیت میں آجائیں تو دنیا جنت ہو جائے۔

(۲۷) سرمایہ داری کے بیکار مزدور اور سرمایہ دار پیدا کرنے کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ دار۔ مزدور مزدور اور سرمایہ دار مزدور میں لڑائی ہونے لگتی ہے دوسری طرف سرمایہ داری اپنی پنچائتی، حکومت کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ غیر ملکوں کے مال پر ٹیکس لگائے اور اپنے ملک کے کارخانہ داروں کی مالی مدد کرے اس سے سرمایہ داری کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن مزدور اور غریب طبقے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ حکومت سرمایہ داروں کی ایک پنچائت ہے اور اگر اس کو ہرا دیا جائے تو سرمایہ داری ہاتھ میں آجائے گی۔

ریاست ہمیشہ کسی خاص جماعت کا نمائندہ ہوا کرتی ہے اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنی جماعت کا مفاد مدّنظر ہوتا ہے۔ اگر ملک میں کسی دوسری جماعت کا مفاد برسرِ حکومت جماعت کے مفاد کے خلاف ہے تو حکومت اس کو نہیں گردانتی جب سماج غلامی پر کھڑی تھی غلام کا مفاد حکومت کو مدّنظر نہ تھا۔ حکومت آزاد انسانوں کی تھی جب ملک اور قوم کی بہبودی کا سوال پیدا ہوتا تھا اس سے آزاد آدمی کی بہبودی مراد ہوتی تھی نہ کہ غلام کی۔ جاگیرداری کے زمانہ میں جاگیرداروں کے مفاد کے مطابق سماج چلتی تھی دراصل وہی چند انسان سماج تھے باقی ان کے نوکر چاکر تھے بیگار کرنے والا سماج کا فرد خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ آج کل سماج مزدور پر کھڑی ہوئی ہے مزدور غلام کی طرح سماج کا فرد خیال نہیں کیا جاتا۔ سرمایہ داروں کی جماعت ہی سماج ہے۔ باقی غلام ہیں جن کی زندگی سرمایہ داروں کی خدمت میں خرچ ہوتی ہے۔

۵۵

ریاست اس وقت تک ہی ریاست ہے جب تک کہ وہ کسی خاص جماعت کی نمائندہ ہے لیکن جب جماعتیں اور ان کے مفاد ختم ہو گئے اور سب ملک کے باشندے ایک جماعت کے فرد ہو گئے اور اس جماعت کے نمایندے حکومت کے کاروبار سنبھالنے لگے تو نہ جماعتی جھگڑے باقی رہے اور نہ انفرادی جدوجہد۔ لیکن مزدور کا حکومت پر قبضہ کرنا کافی نہیں جبتک کہ طریقِ پیداوار اور طریق لین دین نہ بدل دیا جائے جونہی کہ مزدوروں نے حکومت پہ قبضہ کر کے سماجی ملکیت قائم کی ریاست ختم ہو جاتی ہے۔ اب ریاست کا کام حکومت کرنا نہیں رہتا بلکہ اشیاء کا انتظام ہو جاتا ہے۔

جب سے کہ سرمایہ داری نے زور پکڑا ہے اور اسکے نقائص ظاہر ہوئے ہیں لوگوں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ طریقِ پیداوار کو فوراً انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لے آنا چاہئے۔ لیکن یہاں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں ایک کا مذہب ہے کہ جبتک سماج میں وہ حالات پیدا نہ ہوں جن کی بنا پر اجتماعی ملکیت قائم کی جائے اس وقت تک انفرادی ملکیت مٹا نہیں سکتے۔ فوری تبدیلی کے خیال کو وہ خواب سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ جبتک طریقِ پیداوار اور طریقِ تقسیم سماج کی پیداوار کی طاقتوں پر بار نہ ہو جائیں اس وقت

تک سماج کو سوشلسٹ اصولوں پر نہیں چلا سکتے۔ اجتماعی ملکیت کیلئے یہ ضروری ہے کہ سماج میں بڑے بڑے کارخانے ہوں جن میں ضرورت
سے زیادہ جنس بنتی ہو۔ سب کارخانے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوں۔ پیداوار کی طاقتیں پھیلنا چاہتی ہوں۔ لیکن سرمایہ داری انکو
پھیلنے نہ دیتی ہو۔ طریق پیداوار اور طریق تقسیم بجائے سماجی زندگی کو خوشحال بنانے کے اس میں جماعتی جھگڑے اور بے چینی پیدا کرتے
ہوں۔ جبتک سماج میں اس قسم کے حالات پیدا نہ ہوں اس وقت تک انفرادی ملکیت کو بدل کر سماجی ملکیت قائم نہیں کر سکتے۔ سرمایہ داری
نے اگر کسی سماج میں پیداوار کی طاقتوں کو اتنا بڑھا دیا کہ اب ان کی مدد سے سماج ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کر سکتی ہے تو گویا سرمایہ داری
نے اپنا مشن پورا کر دیا لیکن جب تک مشن پورا نہ ہو اس وقت تک سرمایہ داری کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ چند دماغوں کے یہ سمجھنے سے کہ اجتماعی
ملکیت کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے اور اس تبدیلی سے سماج کو کیا کیا فائدہ ہوگا انفرادی ملکیت ختم نہیں کی جا سکتی۔ انفرادی ملکیت ختم
کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سماج میں ایسے معاشرتی حالات پیدا ہوں جو سماج کو اس پر مجبور کریں کہ پیداوار کی طاقتوں کو اجتماعی ملکیت میں
لے آئے۔ اس خیال کے مطابق تجارتی ملکوں میں سماجی ملکیت بہ نسبت غیر تجارتی ملکوں کے جلد عمل میں آنی چاہئے تھی انگلستان۔ جرمنی۔ امریکہ
میں بہ نسبت روس اور مکزیکو کے سوشلسٹ طریق پیداوار جلدی ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ مکزیکو اور روس میں تو سوشلسٹ طریق پیداوار کا نام و نشان
بھی نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ جنگ عظیم کے بعد روس میں سماجی ملکیت عمل میں آگئی اور انگلستان جو تجارتی ملک ہے اور اصولاً
جس میں سماجی ملکیت روس سے پہلے ہونی چاہئے تھی۔ وہ ابھی تک سرمایہ داری کا شکار ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی ملک میں حالات
کا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ سوشلسٹ جماعت کا ہونا بھی ضروری ہے جو سماج کے معاشرتی حالات اور ان سیاسی حالات سے جو ان معاشرتی حالات
کا نتیجہ ہوتے ہیں فائدہ اٹھائے۔ معیشی حالات بذاتِ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ جرمنی سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے روس سے بہت آگے تھی۔ جنگ
کے بعد جرمنی میں بھی انقلاب ہوا۔ لیکن اس انقلاب نے سوشلسٹ انقلاب کی شکل اختیار نہیں کی کیونکہ وہاں مضبوط سوشلسٹ جماعت موجود
نہ تھی۔ حالات قدرتی رجحان کی طرف نہیں جا سکتے کیونکہ سرمایہ دار بیچ میں حائل ہے یہ سوشلسٹ جماعت کا کام ہے کہ حالات کو سرمایہ دار کے
پنجے سے نکالے تاکہ وہ اپنے طبعی رجحان کے مطابق بڑھیں۔ روس میں حالانکہ معاشرتی حالات موجود نہ تھے تاہم لینن اور اسکی جماعت نے روس
کی حکومت کو سوشلسٹ اصولوں پر چلایا اور اگرچہ وہ مکمل طریق پر اپنے معاشرتی حالات کو ان اصولوں کے ماتحت نہیں لا سکے لیکن مقابلتاً
روس دوسرے ممالک سے بہت زیادہ سوشلسٹ ہے اس سے ظاہر ہے کہ سب سے اہم ایک طاقتور سوشلسٹ جماعت کا قیام ہے جو
ملک کی حکومت پر قبضہ کرے اور اس کو اپنے اصولوں پر چلائے۔

کچھ دن کی بات ہے کہ حبش ایک غیر تجارتی ملک تھا وہاں کے حالات آٹھویں صدی کے حالات کے قریب تھے لیکن اٹلی کے قبضہ
کرتے ہی وہاں وہ حالات غائب ہو گئے۔ کیا اٹلی نے اس امر کا انتظار کیا کہ معاشرتی حالات پیدا ہونے دے جو غلامی کو خود بخود فنا کر دیں۔
کیا اس نے وہاں جاگیرداری طریق شروع کیا جو دورِ دنیا میں غلامی کے بعد آیا کرتا تھا۔ اٹلی نے آتے ہی سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی بنا ڈالدی
صنعت و حرفت بڑے پیمانے پر شروع کر دی۔ اگر اٹلی سوشلسٹ ہوتی تو کیا وہ اس امر کا انتظار کرتی کہ پہلے صدیوں میں غلامی ختم ہوگی پھر صدیوں
تک جاگیرداری طریقِ پیداوار کام کرے گا۔ پھر صدیوں تک سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کام کرے گا اور پھر سوشلسٹ طریقِ پیداوار شروع ہوگا
معاشرتی حالات میں اس قسم کا تسلسل ہونا ضروری نہیں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر روس چین پر قبضہ کر لے تو فوراً ہی اجتماعی ملکیت ہو جائے
اور سوشلسٹ طریق پیداوار اور تقسیم جاری کر دیا جائے۔

ایم۔ ایم۔ جوہر میرٹھی

آزادی

(حضرت نہال سیوہاروی)

رونق دہ مسجد و کنشت آزادی ہے جلوہ طرازِ سنگ و خشت آزادی

معلوم نہیں تجھ کو اگر کیا ہے بہشت تو مجھ سے یہ سُن کہ ہے بہشت آزادی

پردے میں سحر کے جلوہ بار آزادی خورشید کی ضو میں آشکار آزادی

پہنائے چمن تبسّم آزادی کا کھلتے ہوئے پھولوں کی بہار آزادی

سرمایۂ سوزشِ دروں آزادی خاموش رگوں میں جوشِ خوں آزادی

کیا خوب یہ تفسیر ہے آزادی کی ہے قصرِ حیات کا ستوں آزادی

آئینۂ احساسِ وطن آزادی اک معرکۂ دار و رسن آزادی

پل میں جو کرے کوہ غلامی کو کاہ وہ طاقتِ ضربِ کوہ کن آزادی

تہذیب کی معراجِ کمال آزادی | انسان کی عظمتِ خیال آزادی
کافور ہو ظلمتِ غلامی جس سے | وہ مہرِ درخشاں کا جلال آزادی

سرمایۂ عیش کائنات آزادی | ہر غم سے وسیلۂ نجات آزادی
یہ راز سکندر کو بھی معلوم نہ تھا | ہے خُم کدۂ آبِ حیات آزادی

اربابِ جہاں کی ہے ندیم آزادی | اقوام کا خطبۂ عظیم آزادی
کہتے ہیں جسے کاشفِ انوارِ حیات | وہ طورِ معانی کی کلیم آزادی

ہر موج کے لب پہ صبح و شام آزادی | بہتے ہوئے دریا کا خرام آزادی
زنہار یہ اے بندۂ آزاد نہ بھول | فطرت کا ہے اوّلیں پیام آزادی

سرچشمۂ انوارِ فراغ آزادی | مسرورکنِ دل و دماغ آزادی
ہے جس کی بہا خونِ شہیدانِ وفا | وہ دہر کا لعلِ شب چراغ آزادی

آئینۂ سعیِ نو بنو آزادی | اقوام کو درسِ تگ و دو آزادی
غرقاب ہو دُنیائے غلامی جس میں | وہ قلزمِ موّاج کی رَو آزادی

"مشرق" اور "مغرب"

مترجمہ اسرائیل احمد خاں صاحب

کیا مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی حقیقی اور قطعی فرق ہے؟ ہم اکثر لوگوں کو کہتے سُنا کرتے ہیں کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" اور پھر ایک سخت حکمِ ناطق کے لہجہ میں اس پر اس دعوی کو مستزاد کیا کرتے ہیں کہ "ہرگز یہ توام باہم ہمدم نہ بنیں گے!" ——— لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مشرق کہاں واقع ہے اور اس مغرب کا محلِ وقوع کس سرزمین پر ہے؟

بلاشبہ جغرافیائی بنا پر ایک مشرق اور ایک مغرب پایا جاتا ہے۔ لیکن کیا دوسرے ہی لمحے ہمارا خیال اس حقیقت کی طرف بھی منتقل نہیں ہو جاتا کہ یہ اصطلاحات بالآخر فرضی اور تحکمانہ ہی ہیں؟ کیا کرۂ ارض کے گرد بجز قیاسی خطوط و دوائر کے کسی اور ذریعہ سے بھی کوئی تقسیم و تفریق عمل میں لائی جا سکتی ہے؟ کیا "خطِ گرین" "یا بحر الکاہل والا بین الاقوامی "خطِ تاریخ" اپنے انتخاب و تقرر میں کوئی وجہ موجہ رکھتا ہے؟ ہم اہلِ مشرق جب امریکہ جاتے ہیں تو ہماری سمت سفر ٹھیک مشرق ہوتی ہے[1]! لیکن بوالعجبی دیکھئے کہ امریکن لوگ اس وقت کہا یہ کرتے ہیں کہ ہم "مغرب" کے علوم و تصوّرات کی تحصیل و آشنائی کے لئے اُن (اہل امریکا) کے ہاں حاضر ہوئے ہیں!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فرق و امتیاز کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم برّاعظمی پہلو کو لیا کرتے ہیں اور اس کی رعایت سے کہا کرتے ہیں کہ ایشیا مشرق ہے اور یورپ مغرب۔ لیکن اس "جدید جغرافیے" کی "قدیم تاریخ" آخر یہ بھی تو بتاتی ہے کہ کسی بعید ماضی میں یہاں ایک ہی برّاعظم پایا جاتا تھا جو "یوریشیا" کہلاتا تھا۔ اور یورپ و ایشیا دونوں پر مشتمل تھا!

اب قومیت اکثر اوقات وجہ امتیاز ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ہم چین و ہندوستان، ترکی، ایران کو "مشرقی ممالک" کی فہرست میں رکھتے ہیں۔ لیکن کیا اس میں ذرا بھی شبہ ہے کہ ہندوستان آج چین سے اُس سے زیادہ بیگانہ ہے جتنا کہ وہ دور و دراز سرزمین فرنگ انگلستان سے؟! دوسری طرف جاپانی ہیں جو ایک مشرقی قوم کہلاتے ہیں اور ایک مُستقل مشرقی تہذیب و مذہب کے حامل ہیں، لیکن پھر اپنی موجودہ ذہنیت و اسپرٹ میں مشرقیت سے زیادہ "مغربیت" کے آئینہ دار ہیں!

اسبابِ تقسیم میں اب مذہب کے اہم ترین عنصر کو لیجئے۔ عموماً جو قومیں مسیحی مذہب کی پیرو ہیں وہ مغربی کہلاتی ہیں۔ درانحالیکہ بدھیت کنفیوسیت، ہندویت اور اسلام کے حلقہ بگوش مشرقیوں کے ذیل میں داخل ہیں! یہاں ہم اس اصول کی بے اصولی کے، کہئے تو شاکوہ سنج نہ ہوں لیکن قصور معاف، کیا مسیحیت بھی کبھی اک "جنس مشرق" ہی نہ تھی؟!

مذکورہ بالا نقاط کی تنقیح سے میرا منشا یہ نہیں ہے کہ میں مشرق و مغرب کے درمیان کے فرق کے وجود ہی سے مُنکر ہوں میرا تو عرض صرف

---

[1] صاحبِ مضمون ایک چینی پروفیسر ہے! ——— "مترجم"

اس قدر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ہم کو جلد بازانہ اخذ نتائج سے پرہیز کرنا چاہیئے! ہمکو اک ایسا طریق نقد و نظر کام میں لانا چاہیئے کہ وہ ہمیں نفس موضوع کے عین قلب تک پہنچا دے! سابقہ ردّ و قدح سے ممکن ہے کہ قارئین یہ سمجھے ہوں کہ میرے عقیدے کی دُنیا میں نہ کوئی مشرق ہے نہ مغرب! ہرگز نہیں! میں ہر دو کی ہستی پر ایمان رکھتا ہوں صرف میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم کو الفاظ "مشرق و مغرب" کے ساتھ کچھ ایسے معانی وابستہ کرنے چاہئیں جو ہمارے مُتداول مدلوُل سے بالکل متغائر ہوں! یعنی مشرق و مغرب کے درمیان کے جغرافیائی، ملّی، نسلی اور مذہبی امتیازات کو ذرا اُن "پٹواریانہ میڈ بندیوں" اور "فرق امینانہ ٹپواروں" سے بالاتر ہونا چاہیئے جن سے عموماً ہم کام لیا کرتے ہیں! یہ چیزیں ایک حد تک قابلِ تاویل ہوں بھی تب بھی وہ ایک سطحی بصیرت سے آگے ہمیں نہیں لے جاتیں! وہ اس قدر تنویر افکار کا باعث نہیں ہوتیں جس قدر کہ خیرہ نظری کا! امریکا کا شہر بوسٹن بالکل اک غیر جغرافیائی مفہوم میں ایک خاص "ذہنیت" کا قائم مقام بن گیا ہے! میرے زاویۂ نگاہ میں مشرق و مغرب کی جداگانہ معنویت کی ماہیت کچھ ایسی ہی ہے! ——— مثلاً مشرق عبارت ہے اک ایسے عمران سے جس میں لوگ انفرادی تکمیل کے درپے رہتے ہیں۔ جہاں بہترین تعلقات بین النّاس، حقوق العباد، شخصی فرائض و واجبات، ذاتی سکینت قلب، نفسی نجات، روحانی کو بشری نصب العین قرار دیا گیا ہے! بخلاف اس کے اسم "مغرب" کا مسمیٰ اک ایسا تمدن ہے جس میں اشخاص و افراد پر اجتماعی اعمال فرمانروائی کیا کرتے ہیں اور سائنٹفک نظم و نسق، کاروباری ضبط و ربط، یورپین طرز کی مستعدی و کارکردگی، قوت آفرینی، مادّی تمتع اور راحت اندوزی وغیرہ جس کے حاصل زیست ہوتے ہیں! کہا جاسکتا ہے کہ اوّل الذکر میں ایک نوع کی "نسائیت" پائی جاتی ہے! اس کا مزاج جذباتی، سلبی، مجہولی، رجعت پرستانہ اور مقلّدانہ واقع ہوا ہے! آخر الذکر کے تیور مردانہ ہیں! وہ سائنٹفک ہے اور جارحانہ! اُس کا طغرائی امتیاز ہیں عزیمۃ و زعیمیۃ! اُس کے نشاناتِ خصوصی ہیں، تقدّم و ترقی، حوصلہ مندی و بلند آہنگی!

مشرق و مغرب کی یہی تعریف و تعبیر میرا خیال ہے کہ صحت سے قریب ترین ہوگی! البتہ یہاں میں ایک دفع دخل مقدر کرنا چاہونگا تاکہ لوگ میری تفسیر کی غرض و غایت کے متعلق غلط فہمی میں نہ پڑیں! مثلاً میں یہاں اس طرح کی کوئی بات کہنی نہیں چاہتا کہ دونوں میں سے یہ بہتر ہے یا وہ برتر! ترجیح و تفضیل کا کوئی سوال یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ مشرق و مغرب درحقیقت ایک دوسرے کے "متوازی" واقع ہوئے ہیں نہ کہ "محاذی"! رہی یہ بات کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ کریں گے یا تنازعہ للبقا میں ایک فنا ہو جائیگا اور ایک باقی رہیگا، تو اس کا انحصار حالات پر ہے! یا اُس پُرخلوص جد و جہد کے ظہور یا عدم ظہور پر جو اقوام عالم کی طرف سے مستقبل میں پیش آئے! اس پہلو سے بحث کرنے کیلئے مبحث کی خاطر خواہ تنقیح اُس وقت ہو سکے گی کہ اُسے مندرجۂ تحت چار مباحثِ ذیلی میں تقسیم کر لیا جائے۔

(۱) مشرق و مغرب کی انفرادی روحوں کا جداگانہ سرچشمہ کیا کیا ہے؟

(۲) دونوں تمدنوں کے خصائص خاصّہ کیا کیا ہیں؟

(۳) ہر دو کی الگ الگ قدر و قیمت ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟

(۴) مشرقیت و مغربیت کے سنگم کے بارے میں مستقبل کے امکانات و رجحانات کیا کیا ہیں؟

(۱) مشرق اور مغرب کے جداگانہ سرچشمے

مغرب کی تہذیب نے اک ساحل بحر پر جنم لیا۔ ہم یونان کو مغربی تہذیب کا مولد قرار دے سکتے ہیں! یونان قدیم کی ساری قومی عظمت بحری جہازرانی پر تعمیر ہوئی! نامورانِ یونان کے عظیم ترین کارناموں کی بازیگاہ بھی سطح بحر رہی ہے! ایک شخص صرف ہومر کے منظومات و رزمیات کا مطالعہ کرے اور پھر دیکھے کہ یونانی تخیّل کی دُنیا میں "اِلٰہ بحر" کو کیسی جلالت قدر حاصل ہے! یہ سمندر ہی تھا جس نے یونانی جنگ آزماؤں کے

نہنگ واژدر پیدا کئے! نیز یونانی شاعری کی بحروں کے لئے قوافی ومعانی کے سلکہائے جواہریں بہم پہنچائے!

سمندر اک عسیر المسلّط وجود فطرت ہے! اس کے ساتھ دست وگریبان ہونے میں غیر معمولی مشقت طلبی وابتلا انگیزی لازم آتی ہے جو کوئی اس قسم کی جدوجہد کا اقدام کرے گا اُسے اپنی طرف سے قوت ومقاومت کا انتہائی پیمانہ پیش کرنا ہوگا! فرد اس بیجد وحساب خزینۂ قوت کو "قلب جماعت" ہی سے فراہم کرسکتا ہے! اس طرح جماعتی عمل کی سلسلہ جنبانی ہوتی ہے اور اس کی جلو میں دلیرانہ جنگی مہارت اور حوصلہ مندانہ عزائم تجارت ظہور میں آتے ہیں! عظیم الشان رومن تمدّن اسی یونانی عمل اجتماعی کا تکملۂ آخریں اور ثمر شیریں تھا! یورپی تاریخ کے اسٹیج پر اس کے بعد ہم اطالیہ، ہسپانیہ اور فرانس کے جلوس ہائے نہضت کو جولاں دیکھتے ہیں! اور پھر مغرب کی یہی بحری گرم کاریاں تھیں جن سے نارمے، سویڈن اور جزائر برطانیہ کی تہذیبی تعمیرات نے تشکیل پائی! خود جرمن لوگ بھی اپنے آباؤاجداد کی بحر پیمائیوں ہی کا طبل تنگ بجاتے ہیں! یہ مغربی عمران قطع نظر اقبال وادبار کی پیہم افتادوں کے جن سے اس کو سابقہ پڑا۔ تقریباً اک مستقل ومسلسل عمل تھا سمندر کے دیوتا سے کشتی لڑنے کا! اسی اشتغال وانہماک نے اجتماعی روحِ اشتراکِ عمل کو پیدا کیا اور حرفتی وتجارتی عزیمتوں، سائنٹفک وعملی سرگرمیوں اور کارکردگی قوت آفرینی کی عرق ریزیوں سے یورپین تمدّن کو آباد وشاد کرڈالا!

دوسری طرف، مشرقی تہذیب اک ارضی واندرون مُلک کی تہذیب کی حیثیت سے وجود میں آئی! مصر نے اپنی عظمت وشوکت کا سفینۂ زرنگار دریائے نیل پر چلایا! آشوریا وبابل نے انہار دجلہ وفرآت کو اپنے تزک واحتشام کی جولانگاہ بنایا! چین نے دریائے ہوانگ ہو ویانگزے کی وادیوں میں اپنا چمنستانِ شائستگی سجایا!

مصر وبابل کے بارے میں ہمارے معلومات اُتنے ہی ہیں جو حال کی جزوی اثری تحقیقات وانکشافات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اور چونکہ وہ ابھی بہت کچھ تشنۂ تکمیل ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس وقت ہم اپنی بحث کے لئے عمرانِ مشرق کے دو زندہ نمونوں کو لیں۔ ہمارا روئے سخن اہلِ ہند اور اہل چین کی طرف ہے!

٦١

ہندو اپنے فلسفہ وفنون کے اعتبار سے ایک خالص واخلص مشرقی روح تہذیب کو پیش کرتے ہیں۔ اپنی زرخیز وزرریز زمین، گرم آب وہوا، اور نعائم فطرت کی فراوانی کے طفیل میں ہندوستان فارغ البالی، آرام طلبی، دماغی عیاشی اور روحانی شغل فلسفہ وتصوّف کا ایک قدرتی مسکن بن گیا! کثرت پیداوار اور فرصت اوقات انسان کو معاشی کشمکش سے فراغت دیدیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو اپنی رواداری انہ اور امن دوستانہ افتادِ طبیعہ کے لئے ساری دُنیا میں ضرب المثل رہے ہیں! نامور مورّخ ویلز اپنے "خاکہ تاریخ عالم" میں لکھتا ہے:۔

"صدیوں اور قرنوں تک ہندوستان کی تاریخ خوشحالی ومالداری، نقدان سختی ودرشتی، افراط معیشت وعشرت، اور ایک مذاقِ سکر وخواب کی ایسی سرگزشت رہی ہے جس کی کوئی نظیر صفحۂ عالم پر نہیں ملتی"!

عہد پاستانی کا بُدھ اور دور حاضرہ کا ٹیگور مشرقی ہندی روح کے یکساں عمدہ نمونے ہیں! ہندوستان ـــ قدیم نیز جدید ـــ کو ہم اُن تمام خصائص سے متصف دیکھتے ہیں جو "بھرے پیٹ" کی نمو خیز زمین میں "خودرو" پیدا ہوتے ہیں! اس تمام ذہنیت کا قلب تصوّف ہے مع اپنے دیگر لوازم ونتائج کے۔ یعنی عام رحیمانہ حسیّات غیر متشددانہ تصورّات اور وجود روح کا اعتراف جملہ مظاہر حیات حتیٰ کہ حیوانات کے اندر بھی! دُنیا بھر میں ہندو ہی تنہا وہ اُمت ہیں جس کی کتاب شریعت میں لحم حیوانی علی الاطلاق حرام ہے! اُن کا عقیدہ ہے کہ جاندار کو مارنا ناقابلِ معافی "درندگی" ہے، پھر بھلا وہ کس طرح جیتی جان کو اپنا لقمۂ تر بنا سکتے ہیں؟ پس کیا تعجب ہے کہ اس قسم کی روح قومی کی مسلسل نشو ونما نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کی تہذیب میں ایک نسوانی نرمی پیدا کردی اور جذبات نوازانہ، رحم پذیرانہ، درد آشنایانہ، اور قدامت پرستانہ ہو کر رہ گئی[1]!!

اَب قدیم چینی اپنی مرز بوم میں اپنے برادرانِ ہند کے مقابلہ میں فطرت کے کسی قدر کم منظورِ نظر تھے! اُن کی مدنیت وحضارت کا اوّلین مستقر وادیٔ ہوانگ ہو اک سنگستانی خطّہ واقع ہوا تھا۔ جہاں کی آب وہوا بھی گرما وسرما دونوں میں اشتداد پذیر نوعیت رکھتی تھی۔ تاہم اپنے

لے[1] جو فلسفۂ روحانی اہل ہند نے دُنیا کے سامنے .... پیش کیا وہ انسانی ذہن ودماغ کی آخری پرواز تھا لیکن وہ اس کے ذمہ دار نہیں تھے کہ انسان نے اپنی فطری درندگی کے مقابلہ میں "انسانیت" کو ہمیشہ ٹھکرایا۔ ساغر

وسیع وطن کے طول وعرض میں ان کو بہت سے ایسے علاقے مل گئے جو زراعت کے لئے موزوں تھے۔ ان مشاغل کے بطن سے باشندگانِ چین کے اندر اک کفایت شعارانہ طرزِ حیات نے ظہور پایا! اسی پر مشقت لیکن مکتفی بالذّات زندگی نے اک انفرادیت و رواداریت کا رنگ پیدا کر دیا ساتھ ہی فطرت کی بخشائشوں پر اعتماد کرنے نے پھر شکر و ثنا، صبر و توکل، مجہولیت و رجعت کی تخلیق کر دی!

مغربی تہذیب کی ولادت اور پرورش اک مشقت طلب آویزش کے نتیجہ میں عمل میں آئی جو فطرت اور انسان ہر دو کے ساتھ اُسے پیش آئی! درآنحالیکہ مشرق کی تمامی نشو و نما دایۂ قدرت کی کنارِ شفقت میں ہوئی، اور اسی دامنِ راحت و عشرت میں فلسفہ و مذہب نے اپنے لئے اک زرخیز کشت زار پایا! سرگرم اور قوت آفریں زندگی بیرونی ماحول کی مزاحمتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس زندگی کے دو بڑے میدان مہماتِ فطرت اور معاملاتِ بشریت ہیں۔ لیکن جس زندگی کی پیدائش و پرداخت مادرِ فطرت کی آغوش میں ہوا کرتی ہے وہ صرف دل و روح کی "دُنیائے صغیر" کے اندر زیادہ کامیاب رہا کرتی ہے جس کے طبعی آثار بس تصوف و تفلسُف اور مذہب و اخلاق ہی ہوتے ہیں! پس مشرق و مغرب کی متبائن تہذیبوں کے درمیان جو مابہ الامتیاز ہے وہ براہ راست زائیدۂ ماحول ہے —— نہ کہ متعلقہ قوموں کے اختلافِ فطرت و جبلت کا نتیجہ! اس لئے کہ سرشتِ انسانی تمام روئے زمین پر تقریباً یکساں ہی واقع ہوئی ہے! اور اسی ناموسِ تمدّن کی بنا پر بلا خوف تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تہذیبوں کیلئے دائماً مختلف یا متصادم رہنا بھی لازمی نہیں ہے! اس انقلاب انگیز امکان کی مثال میں جاپان کو پیش کیا جا سکتا ہے جو کلیتہً اک مشرق الاصل اور مشرقی المذاق قوم تھی۔ لیکن اپنے ماضیٔ قریب ہی میں مخصوص حالات کے اقتضا سے یکسر ایک رنگِ مغربیت میں غرق ہو گئی! ہندوستان اور چین بھی اگر اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے "دُوَلِ مغربی کے درمیان واقع ہو" یا اپنے جغرافیائی ماحول کی بنا پر سمندر سے دست و گریبان ہونے پر مجبور رہتے تو وہ بھی یقیناً عظیم الشان بحری بیڑوں کی تعمیر کرتے اور آج نام نہاد مشرقی تہذیب کے ان گہواروں کا وجود بھی نہ ہوتا!

(۲) ہر دو تہذیبوں کے خصائص

۶۲

جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے، مشرقی تہذیب ایک گونہ زنانہ واقع ہوئی ہے، اور مغربی تمدّن مردانہ! کیا ان دونوں کی جمالی اور جلالی طبیعت کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے؟

پہلے ہم مغرب کو لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت، اُمنگ و آہنگ، حوصلہ و ولولہ، تہوّر و نمائش، چیرہ دستی و سینہ زوری، جارحانہ انداز و غیر رواداری، سرگرمی و مشقت پسندی، اشتراکِ عمل و تنظیمِ جماعتی، چلبلا پن اور نچلا پن مغرب کی پیشانی پر بخطِ جلی لکھے ہوئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ اور صناعاتِ جمیلہ تک میں مغرب کے خط و خال مردانہ ہی ہیں! عہدِ قدیم کے یوروپ کو اپنی چشمِ تاریخی کے سامنے لائیے۔ یونان و روما کی بت تراشی و تصویر کشی کے بہترین شاہکار آپ کو دیوتاؤں کے پیکروں اور مشاہیر کے رُستمانہ مجسّموں ہی کی صورت میں نظر آئیں گے، نامور مغربی مصوّر مائکل اینجیلو کے فن پر یہ حرف گیری کی گئی ہے کہ اُس کے موقلم سے کھینچی ہوئی صنفِ نازک کی ساری شبیہیں اپنے اندر ایک جارحانہ "اندازِ ترکانہ" رکھتی ہیں! اور پھر اُستاد ریوبینس کے نگارخانہ کی "ڈانڈیل عورتوں" کا تو ذکر ہی تحصیلِ حاصل ہے! —— تاہم یہی پہلوانانہ مغربی آرٹ ہے جس کی مغربی مذاق داد دیتا ہے! بات یہ ہے کہ مغرب قوت و طاقت کا پرستار ہے! برعکس اس کے مشرق کسی اور ہی چیز کا دلدادہ ہے! مشرق کا مرقع نگاریں، جمالیت کی نقشبندیوں اور نسائیت کی صورت گریوں سے لبریز ہے! مغرب جسمانی طاقتوری اور حیوانی زور آزمائی چاہتا ہے جس کی تمثیل لباس عریانی میں کی گئی ہو! لیکن مشرقی چشم و نظر کے لئے ایسے مناظر غایت درجہ مکروہ ثابت ہوتے ہیں! مغرب کی یہی ذہنیت ہے جو اس کے جملہ شعبہ جاتِ حیات —— مذہب و اخلاق، حکومت و سیاست، صنعت و حرفت، کاروبارِ تجارت، حتیٰ کہ تعلیم و تربیت تک —— کے اندر جلوہ گر ہوئی ہے! جس وقت مشرقی پیغمبر، حضرت مسیحؑ کی سکینانہ و معصومانہ تعلیمات مغربی کلیسا کے قالب میں ڈھل گئیں تو پھر اس کے جلوس تبلیغ

دعوت میں ہم کو جہاں گشتیاں اور ارض پیمائیاں، قتل عام اور خوں ریزیاں ہی نظر آئیں! اِن کی بہترین یا بدترین مثال "حروب صلیبیہ" اور "ہسپانوی صیغۂ تفتیش و تعزیرِ جرائم" تھا! خود "پاپائیت" بھی "یوروپین عیسائیت" کا ایک قوی ترین مظہر شمار کیا جانا چاہیے! پامالی منصب دراصل مغرب کی تہذیب —— نہ کہ مشرق کے مذہب —— کی قوتِ تنظیم و مظاہرۂ شوکت کی اک نظیر تھا! کیا یہ ساری مشنری جہاں گردیاں اور روحانی فاتحکاریاں ایک قسم کی حملہ آوریاں نہیں ہیں۔ اقلیم دل کے حدودِ حرم کے اندر؟ اب رہی مغرب کی قومی زندگی تو وہ بھی جنگجوئیوں اور مبارزطلبیوں ہی کا اک معرکۂ خونیں ہے۔ جسے ہر مغربی حکومت نے اپنے فرائض عین بنا رکھا ہے! اگر ہم مغرب کی تاریخ کا جائزہ —— از سکندرِ اعظم تا قیصرولیم دوم لیں —— تو خدا کی زمین کے اس قابل رشک خطے کے اندر مشکل سے کوئی دَورِ امن ایسا نظر آئے گا جو "نصف صدی اور ایک عشرے" سے متجاوز ہو! یورپ کی بین الاقوامی جنگیں اور بین الاحزابی کشمکشیں اُسی جماعتی دستور کے مظاہر ہیں جو یورپی دنیا کا حاکم مطلق ہے! مغرب کا خلقی "چھلاوا پن" کبھی یورپ کے قرونِ پیشیں کے بحری اسفار میں نمایاں ہوا تھا لیکن یہی غیر فانی شے ہے جو دورِ حاضر میں سوشلزم و بالشوزم کے مہمات میں علم کشا ہوئی ہے!

یورپ کی دُنیائے "عقلیات" کی شورشیں تو ظاہر ہیں ہی، لُطف یہ ہے کہ مغرب کا عالمِ روحانیت بھی خیر سے سکون و سکوت سے ناآشنا ہے! پھر تعلیم عام کے عنوان کے تحت اس کا مطالعہ کیجئے! کیا یہ مغربی تنظیم مدارس و مکاتب، سررشتۂ جامعات و کلیات، اک وسیع "علمی لشکر آرائی" کی شان نہیں رکھتا؟! —— جس میں ٹیچروں اور پروفیسروں کی "فوجی بھرتی" سی کی جاتی ہے اور اک خاص قسم کی "ذہنی کارگاہوں" کے اندر خاص قامت و صورت کے "سانچوں" میں ڈھلے ہوئے طلبہ کی "برآورد" کی جاتی ہے! مغرب کے ذوق قوت افزائی و غارتگری اور اس کے غیر معمولی جوہرِ نظم و انضباط کی آخری قابلِ دید نمود یورپ کی موجودہ ہمہ گیر صنعت و حرفت اور عالم آشوب بحری و بین المللی تجارت ہے!

اب دوسری طرف جب ہم مشرق کی شائستگی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اُس کی تعلیم و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے عنوانات جلی ہم کو صرف اعتدال و اقتصاد، تہذیب نفس و تزکیۂ روح، حزم و احتیاط، قدامت و سلفیت، اقتداء و مقلدیت، شعورِ شخصیت و ارتقائے انفرادیت وغیرہ ہی نظر آتے ہیں! کوئی مغربی جو مشرق کے مزاج و مذاق اور اُس کی ادا و آداب کا کبھی ناظر بھی بنا ہے وہ اہل مشرق کی مخصوص شانِ سکوت و متانت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا! جب مشہور تاریخ وینسی سیاح، مارکوپولو چین آیا تو جس طرح وہ مشرق کی اس بزم مجلسی کی اداہائے جمال سے متاثر ہوا وہ اس کے سفرنامے کی ایک قابلِ ذکر چیز بنی! سکونِ طبیعت اور ضبط نفس کے مسلک میں ہند و اہل چین ہی کے "اخوان طریقت" ہیں! انفرادی زندگی کے ممکنات کے "جوہرِ مضمر" کے بروئے کار لانے کا خیال "بس یہی کلید ہے مشرق کے تمامی فلسفہ و مذہب کی! خود مسیحیت میں ابتدائی و اصلی تعلیم اسی کلمۂ اوّل پر مبنی تھی کہ "اَسْلِمْ نَفْسَکَ"! اور بلاشبہ یہ بات محض مغرب کے گرجاؤں کا مخصوص "مقامی رنگ" تھا کہ پادری حضرات نے "ہر ابنِ آدم" کی نجات کا بیڑا خواہ مخواہ اٹھا لیا! مشرق کے تو ہر مکتبِ حکمۃ اور ہر مشربِ حیات کا محور "ذات" ہی ہے! "کنفیوسیت" یکسر تربیتِ ذات ہے! "تادیت" (چین کا دوسرا اہم رُتبۂ مسلکِ دینی) انکشافِ ذات ہے! پھر "بدھیت" بھی بجز معرفتِ ذات کے کیا ہے؟!

تمدن کی عمرِ طبیعی کے بارے میں مشرق اور مغرب کی جداگانہ تاریخ، باہمی تفاوتِ راہ کی حیرت انگیز مثال پیش کرتی ہے! تاریخ ہند کے متعلق ہم نے قبل ازیں ایچ، جی ویلز (مورخ تاریخ عالم) کے ایک بیان کا اقتباس دیا ہے۔ چین کی تاریخی سرگزشت پر اس تقریب سے نظر ڈالئے مشرق کے اس ممتاز خطے کی "غیر تغیر پذیر" طبیعت نے جو تاریخی جریدہ چھوڑا ہے اُس کے افتتاحی صفحات ہی میں ہم تین شہنشاہوں کا ذکرِ خیر پاتے ہیں جنھوں نے "نیکو کاری اور سلیقہ مندی" کے ساتھ حکومت کی۔ وہ عوام النّاس کے گروہ سے بذریعہ انتخاب تختِ سلطنت پر پہنچے تھے، اور انھوں نے اپنے طریقِ جہانبانی میں خلق اللہ کا پورا اعتماد حاصل کیا! اَب سنئے کہ چین کا اوّلین خانوادۂ شاہی —— "شیا" —— پورے چار سو برس تک مسند حکومت پر متمکن رہا! (۲۲۰۵—۱۷۸۳ ق م)۔ دوسرے خاندان —— "شانگ" —— کی فرماں روائی کا دور بھی ساڑھے چھ

صدی تک ممتد رہا! (۱۷۸۳ء-۱۱۲۲ ق م)۔ تیسرے خاندان ــــ "چاؤ" ــــ کی شاہانہ زندگی پورے ۸۸۸ برس کی "عمر نوح" رکھتی ہے! (۱۱۲۴-۲۴۶ ق م)۔ چین کے آخری شاہی سلسلے ــــ "چنگ" ــــ کو بھی جو مانچو نسل سے تھا کوئی گردش ارضی تین صدی سے پہلے فنا نہ کر سکی! (۱۶۴۴-۱۹۱۲عیسوی) پس ہر دو کے درمیان موازنہ کے لحاظ سے مشرق کی تاریخ مغرب کے مقابلہ میں بمراحل زیادہ مستحکم پُرامن، کم خونریز، اور زیادہ مرفہ حال رہی ہے! اسی فوق العادۃ محکمی و دیرپائی نے مشرقی دُنیا کو اتنا قدامت پرست بنا دیا! مشرق کی وسیع سرزمین میں بہت سے دستور و آداب ایسے جاری رہے کہ قرنہا قرن تک متروک یا منسوخ نہ ہوئی! ــــ تا آنکہ دورِ جدید کی انقلاب بدوش جہانگیر بیداری نے ظہور کیا! چین کا توہم پرستانہ "فین ہوئی" مشرب، ذات پانت کی تفریق کا ہندی آئین مجلسی، مشرق بعید کے دونوں مشہور ملکوں کا مذہب پرستش آباء وغیرہ اسی "جامد واحدی ماضی نوازی" کی لے کی "بحر طویل" ہیں! دُنیا کے سائنٹفک دَور کے آغاز سے صدیوں قبل مشرقی لوگ سائنس کے تصرف کار کمالات حاصل کر چکے تھے۔ لیکن آج وہ ایوان سائنس میں اک "حلقۂ بیرونِ در" بنے ہوئے ہیں اس کا وبال بھی ان کی رجعت پسندی ہی کی گردن پر ہے! طویل قرون کے دوران میں مشرق مغرب کے سامنے یہ خاموش نعرۂ بے نیازی لگاتا رہا ہے کہ ؎

تو وُ قطعِ منازل ہا من و یک لغزش پائے!

مشرق کی ادا نسوانی ہے، اور چونکہ وہ نسائیت مآب واقع ہوا تھا اس لئے اُس کے فرزند کبھی سینہ زور نہ بن سکے! اگرچہ مشرق کے میگیار فاتحین تیرہویں صدی مسیحی میں یورپ پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ تاہم چونکہ وہ چین خاص کی اصل و نسل سے نہ تھے بلکہ منگولیا کے اُن سرچشمے کا طوفان تھے، اس لئے وہ اصیل و نجیب مشرقی نہیں کہے جا سکتے! ڈاکٹر نیوتین اپنی تصنیف ــــ "تصور جامعہ عالم" ــــ میں فرماتے ہیں "میگیار لوگوں کا یہ حملہ مغربی تہذیب کے مزاج کو چنداں متاثر نہ کر سکا!" تاریخ مشرق کے اس نادر جلالی مظہر کی وہ یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ "اپنی زندگی کے اس مرحلے پر اہل منگولیا شاید مشرقیت کی روح کے فیضان سے محروم تھے اور مشرق کا کوئی مستند سرچشمۂ تہذیب اس وقت تک ان کے پاس نہ پہنچا تھا کہ انھیں مشرق کا فرزند رشید بننے کی دعوت دے!" اگر میگیار لوگ صحیح النسل چینی ہوتے اور واقعتہً وہ یورپ کو مغلوب کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو لازمی طور پر یورپ کی زرعی زندگی اور عام طرز حیات میگیاری اثر کے آثار کا آئینہ دار ہوتا اور وہاں کی تاریخ میں حکومتی ادارات کے واسطے سے چینی روح تعلیم اور چینی حروف اک متمائز جگہ حاصل کر لیتے ــــ!

بلاشبہ مشرقی اقوام کے درمیان بھی جنگ و جدل رہا ہے لیکن عموماً یہ معرکہ آرائیاں بادشاہوں اور جنرلوں کی ذاتی قسمت آزمائیوں کی حیثیت رکھتی تھیں جن پر عام قومی و اجتماعی عزائم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا! ہم مشرق کی تاریخ میں بمشکل کسی ایسی عمومی و اجتماعی تحریک کا نشان پا ڈھونڈ سکتے ہیں جیسی کہ مغرب کی "حروبِ صلیبی" یا رومۃ الکبریٰ کی مذہبی فتوحات یا برطانیۂ عظمیٰ کی مستعمراتی مہمات!

(۳) ہر دو تمدنوں کی قدر و قیمت کا موازنہ

مشرقی تہذیب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے عملی کاروبار و معاملات کو قابلیت و مہارت سے انجام دینے کی صلاحیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مشرقی لوگ فطرت کے سامنے اک "سر تسلیم" رہے ہیں! فطرت کی رحمت و ربوبیت پر اُن کا تکیۂ اعتماد رہا ہے! قدرت اُن کے لئے اک قادر مطلق ذات ہے، لیکن ایسی کہ جس کی قدرت و جبروت اُس کے تلطف و نوازش سے لازم و ملزوم ہے! اہل مشرق کے تخیل کی رو سے ناموس فطرت اپنی ماہیت ذات میں قدرت مطلقہ اور رحمت کاملہ کا معجون مرکب واقع ہوا ہے! بس اُن کا خیال ہے کہ کارگاہِ فطرت میں کوئی تغیر و تصرف ــــ باستثنائے اس صورت کے کہ وہ فطرت کی مطابقت کی شرط کی بنا پر اک "بدعتِ حسنہ" ہو! ــــ نہ صرف ناجائز اور منافیٔ آئین فطرت ہے، بلکہ

شدید خطرات سے لبریز بھی ہے! ـــــ ظاہر ہے کہ قدامت پرستی اِس ذہنیت کا ثمرِ اولین بنے گی! اور یہی چیز آخر کار اہلِ مشرق کی اُس نااہلیت کی ذمہ دار رہی ہے جو اُنھیں جدید حالات و تغیرات کے ساتھ سازگار ہونے سے معذور رکھتی ہے! معمولی حالات میں تو اک مشرقی اپنی زندگی گزارتا رہتا ہے اور کافی اطمینان و سکون کے ساتھ۔ لیکن حوادث و مصائب کی اُفتاد کے اوقات میں قطعاً بیدست و پا اور حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ خاص کر اُس صورت میں وہ یکسر از کار رفتگی کا ثبوت دیتا ہے جبکہ متعلقہ حریف اس کا ہم نبرد ہو! چین دو مرتبہ شمالی وحشیوں ـــــ قبائل یوآن و چنگ ـــــ کے ہاتھوں مغلوب و مقہور ہو چکا ہے، اور ہندوستان نے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنیوں کے "نقرہ و طلا" سے بھی اپنے "آہن و فولاد" کو نرم تر ثابت کیا! چین کے حیوان صفت فاتحوں اور ہندوستان کے "دکانداز" کشور کشاؤں کے طریقوں سے کہیں زیادہ اب مغرب کے وسائل جبر و قہر اور ذرائع جلب و سلب ہولناک ہیں! یہ بات کہ مشرق کبھی مغرب کا مدّ مقابل بن سکے گا اس کا انحصار اس امید پر ہے کہ وہ قرار واقعی عزم و ہمت، فکر و تدبیر، باہمی تعاون تناصر سے کام لے!

چنانچہ اسی عمل ردِّ سحر کی بدولت بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر اس وقت تک جاپان نے محیر العقول کارنامے انجام دے ڈالے ہیں اگرچہ اُسے بکثرت مزاحمتوں کے درمیان یہ مہمات سر کرنی پڑ یں! جاپان کے متعلق صرف ایک نہایت افسوسناک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ مادّیات کے ساتھ اپنا مغربی طریق کار استعمال کرتے کرتے امتدادِ ایام سے وہ خود اپنے بھی بعض بیش بہا روحانی و اخلاقی اوصاف کو فراموش کر رہا ہے!

لیکن مشرق باوجود اپنے بہت سے کمزور نقاط کے، بعض نہایت ہی نغز و کامل العیار معنوی قوتوں کا حامل ہے! سب سے مقدم یہ کہ اُسکی تفسیر حیات مغرب کے فلسفۂ زندگی کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح و صالح عدل پرور و امن نواز ہے! البتّہ ہم کو یہاں اک جزوی استثناء تسلیم کرنا چاہیئے کہ مغرب میں حقیقی جلیل القدر فلاسفہ کی جو اک مختصر بزم خاص پیدا ہوئی ہے اُن کا راسخ مسلک بھی باصرار یہی رہا ہے کہ آخری منزل مقصود و مقامِ محمود انسانیت کا یہی ہے کہ "انفرادی ہستی" کے ممکناتِ داخلی کو بروئے کار لایا جائے! خود سلسلۂ تشکیل قوانین فطرت کی رو سے بھی اساسی عناصر ہیئتِ اجتماعیہ کے افراد ہی ٹھہرتے ہیں! ـــــ جو نہ صرف اپنی ماہیتِ تخلیق ہی میں مساوی واقع ہوئے ہیں، بلکہ مساوی ہی مواقع انھیں اپنی اپنی شخصی نشوونما کے ملنے چاہئیں! جماعت فرد کے لئے ہے، اور اسے فرد ہی کے لئے ہونا بھی چاہیئے! افراد کے انفرادی جواہرِ مضمر جماعت کی "پنچائتی مصلحتوں" پر قربان کرنا فطرت کی ودیعت میں خیانت کے ہم معنی ہے۔ مذہب انسان کو اسی ارتقائے ذات کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن فلسفہ ہر شخص کو یہ صلائے عام سناتا ہے کہ وہ اپنی اپنی ذات کے متعلقہ حقائق کی دریافت خود ہی کرے! روحانیت کا عمق زور دیتا ہے ذاتی کشف و انکشاف" پر، لیکن مادیت کی سفلگی سارا ناز وابستہ کرتی ہے انفرادی "جدوجہد" کے ساتھ! تاہم قول فیصل اس نزاع میں یہ ہے کہ بشری تعلیم و تربیت اپنا اصول کار اس طریق کو بنائے کہ افراد کو اُن کی زندگی کی منزل اول سے ساتھ لے اور اس آخری ساحل مراد پر اُتار دے جس کیلئے وہ مخلوق ہوئے ہیں!

۶۵

آئیے ہم اس نقطۂ نظر کی تحقیق و تطبیق کے لئے مغربی حکمت و ادب کے بعض "میران کاروان" کی طرف رجوع کریں! انگلستان کا متی آرنلڈ ایسا سلف پرست، برٹرینڈ رسل ایسا انقلابی مفکر، جرمنی کا گوئٹے ایسا جمہوریت نواز، اور نیٹشا ایسا دلدادۂ امارت ـــــ اسی طرح فرانس کا برگساں، نارویے کا آبسن، امریکا کا ایمرسن، نیز وہیں کا جیمز، ڈیوے اور ہیک حتیٰ کہ ماضیٔ قریب کا امریکن پریزیڈنٹ مائکل جان، یہ سارے اقطاب مغرب انسان کے "نفس شخصی" ہی کے نصب العین کے بلند بانگ داعی رہے ہیں! اِن سب نے جماعت اور جماعت بندی کے "اسٹیم رولر" سے بشریت کے مختلف و ممتاز یکدگر نمونوں کے ہموار و پامال ہونے پر شدید صدا ہائے احتجاج بلند کی ہیں!

مشرقی تہذیب اپنے مخصوص معائب رکھتی ہے، لیکن اسی طرح فضائل سے بھی اس کا دامن خالی نہیں۔ تجدید و تجدّد فی زمانناً دُنیا کے انجن کی سیٹی کی آواز بنے ہیں۔ لیکن آخر کار قدامت و رجعت ہی اُسے ایندھن بہم پہنچاتی ہیں! بلاشبہ فینِ ہسوئی فلسفے کی ضعیف الاعتقادی چین کی

پسماندگی و بیچارگی کی اک اہم علّت ہے، لیکن پھر یہی سرِ مسلکِ حیات ہے جس نے سو پشتوں سے زیادہ عرصہ تک چین کے مادّی وسائل اور طبعی خزائن کو تقریباً مامون و مصئون رکھا ہے! اگر فنِّ کان کنی اور علم فلزات سے آشنا ہونے کے بعد ہی سے ــــــ جو اب تین ہزار سال قبل کے ماضیٔ بعید کی بات ہے! ــــــ اہلِ چین نے اپنے معاون کی خانہ تلاشی لینی شروع کر دی ہوتی، مثل باشندگانِ یورپ کے تو دھاتوں کے چینی سرچشمے کبھی کے سوختت ہو چکے ہوتے! پروفیسر ڈیوے نے اس سلسلہ میں ایک سوال پیش کیا ہے۔ "چینی قوم نے مسلسل چار ہزار سال کی پیہم کشاورزی کے باوجود اپنی زمین کی بارآوری کو کس طرح باقی رکھا؟!" ــــــ اس سوال کا جواب میں دیتا ہوں "صرف اس طرح کہ خوش قسمتی سے وہ سخت قدامت پرست واقع ہوئے تھے!"

مشرقی لوگوں نے کسی وسیع پیمانے پر بحر پیمائی نہیں کی۔ "نئی دُنیا" کا اکتشاف اُن کی فہرست مفاخر کا کوئی کارنامہ نہیں ہے! اسی بنا پر اُن کی یہ نکوہش کی گئی ہے کہ وہ بزدل و نااہل ہیں، اور جذبۂ عزیمت و اقدام سے عاری واقع ہوئے ہیں! ــــــ لیکن ساتھ ہی چونکہ وہ حزم و احتیاط کے مالک تھے، نیز اپنے اندر ایک شانِ مجہولیت و عدم تعرض رکھتے تھے، اس لئے اُن سے فاش غلطیوں اور سنگین جرائم کا ارتکاب بھی شاذ و نادر ہی ہوا! اسی نوع کی صفات اگر مغرب میں ہوتیں تو وہ یورپ کو "حروبِ صلیبیہ" کی سی گمراہی اور حبشی تجارتِ بردہ جیسی شنیع معصیت سے بچا لیتیں! قومی سیرت کے فقدان کا نتیجہ اکثر قومی پسماندگی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے، لیکن یہ مشرق کا استحکام سیرت تھا جس نے مشرقی تہذیبوں کو تقریباً اتنا ہی دیرپا اور طویل العمر بنا دیا جتنے کہ "اہرام مصر" ہیں، یا "ہمالہ کی چوٹیاں"! ــــــ درآنحالیکہ یونان و روما ایطالیہ و ہسپانیہ اک "دولتِ مستعجل" بن بن کر چمکے اور غروب ہو ہو گئے! خود فرانس اور جرمنی کو دیکھئے کہ کتنا مختصر العمر اُن کا دورِ شوکت رہا! انگلستان تمام فرزندانِ یورپ میں سب سے زیادہ قدامت پسند سمجھا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اوج و عروج سے نسبتہً "زیادہ عرصہ تک متمتع رہا!

۶۶

مشرق میں اپنی مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ اک فضیلت اور ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے مقابلہ میں فی الجملہ زیادہ صابح اور زیادہ بشریت نواز ہے۔ مثلاً چین کو دیکھئے کہ اُس نے کتنی قوموں کو اپنے بڑے معدے کے قعر میں ڈال لیا! لیکن پھر اس پر غور کیجئے کہ ان جذب شدہ نسلوں میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچا؟ چین کے اندر نہ کوئی نسلی منافرت ہے نہ اغیار کے متعلق کوئی معاندانہ احساس! میو اور آیو نام کے دو قدیم چینی قبائل ہیں، جو چالیس صدیوں سے قلبِ ملک کے اندر رہتے چلے آ رہے ہیں، اور بایں ہمہ اُن کی انفرادیت الآن کما کان ہے! اس تمام دوران میں وہ اپنی خود مختار "ریاست اندرون ریاست" کے مالک رہے ہیں! صورت اور سیرت، نیز رسم و رواج کا جو اختلاف و اجنبیت ان قبیلوں اور چینی قوم کے درمیان پایا جاتا ہے وہ اُس دوری و ناآشنائی سے کسی طرح کم نہیں جو ہندوستانیوں اور امریکنوں کے درمیان موجود ہے لیکن کچھ معلوم ہے کہ امریکا کی "سرزمین باآئین" میں آج ہندوستانیوں کی کیا قدر و منزلت ہے؟!

مغربی تمدّن بھی اس میں شک نہیں کہ بہت سی عمدگیاں اور ہنرمندیاں رکھتا ہے، اُس کی مشق و مہارت طبعی نیز انسانی معاملات کے طے کرنے میں، اُس کی قوّت و قابلیت اپنے اثر و نفوذ کی توسیع میں، ــــــ بس یہی اُس کی ناصیۂ جلال کے دو عنوانات جلی ہیں! اسیا رمذہبیت بہ مسیحیت کسی طرح بُدھیت سے برتر نہیں، تاہم غور کیجئے کہ کتنی سُرعت و سبقت کے ساتھ عیسائی مبلغین فرنگستان سے چہار دانگ عالم میں اپنی تبلیغی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے! حتّٰی کہ خود بدھ مت نے ــــــ جو مشرقی حرم مذاہب کا قبلہ و کعبہ ہے ــــــ مسیحیت کے مغربی نقیبوں اور علمبرداروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے!

مغربی رنگ کا ڈھنگ یہ ہے کہ وہ لوگوں پر آناً فاناً چڑھا کرتا ہے! اُس کی غیر معمولی قوت نفوذ کو ساری دُنیا نے محسوس کیا ہے۔ اُس نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں اک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اُس نے بشریت کی شاہراہِ خیال و فکر میں تصرّفِ عظیم کر ڈالا ہے! اُس نے حیات بشری کے احوال و

لوازم کو بہت کچھ بلند و بالا کر دیا۔ اُس نے انسانی محنت کے عرقِ پیشانی میں غیر معمولی کفایت پیدا کر دی ہے! انواعِ انسانی کے افراد کی عمرِ اوسط میں اُس نے معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ اُس نے عام طور پر انسان کے اقتدار و تسلّط کو بہت وسیع کر دیا ہے! انسانی سرگرمی و فعّالی کے نئے نئے میدان اُس نے کھول دئے ہیں۔ وہ دُنیا کے دور اُفتادہ بلاد و امصار کو ایک دوسرے سے بمراحل قریب تر لے آیا ہے! عالمِ بشری کے اسبابِ معیشت آج بہت اعلیٰ معیارِ خوبی پر نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اک مشرقی ناظر بھی بشرطیکہ وہ کچھ متعصب اور خود بیں نہ ہو، اس عجیب و غریب تمدّنِ مغربی کی ان تمام مساعئ حسنہ و خدماتِ جلیلہ سے مجالِ انکار نہ پائیگا! آج اس کا آفتابِ عالمتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے! یونان و روما کے افسانہائے عظمت و شوکت اُس کے سامنے اک تقویمِ پارینہ ہیں! اُس کا جلوسِ تزک و احتشام دور دور تک اقطاعِ زمین کو پامال کر چکا ہے! مشرق تو مشرق وہ تو مغرب کی مخلوق کو بھی اپنی شان شتابکاری، خیرہ کن جلوہ گری، اور بے پناہ قوت آفرینی و زور آزمائی سے مبہوت کئے ہوئے ہے! طغرائے مردانگی اُس کی پیشانیٔ جلال پر بخطِ جلی لکھا ہوا ہے! اک فوق البشر ہنگامۂ و ولولۂ عمل سے اُس کی ایک ایک شریانِ بدن برق تاب ہے!

لیکن مغربی تمدن کا مرضِ مضمر اور ماؤف حالت کے علامات بھی اب بے نقاب ہونے لگے ہیں! اُس کی عظمت و دولت کا انحصار جبر و قہر پر ہے لیکن جبر و قہر جس طرح بکثرت موقعوں پر فاتحکار ہوا کرتا ہے بعض حالات میں موجبِ آزار بھی بن جاتا ہے! لیکن مغرب، مشرق کی اس مصلحت اندیشی کا خوگر نہیں کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن!

مغرب کی اسی بے لگام بگٹّہ تازی و تیز خرامی کا خمیازہ ہے کہ سرمایہ و محنت آج باہم متصادم قوتیں بنگئی ہیں! مختلف سیاسی احزاب اور پارلیمانی پارٹیاں انہی دو جنگجو عناصر کے کیمپ بن گئے ہیں! حکومتوں کے صیغہائے حرفت و تجارت دیگر اقوام سے جلبِ منفعت کی کارگاہیں ہیں! حد یہ ہے کہ "سائنس" اور "تعلیم" بھی دولت کے دیوتا کی مرید بنادی گئی ہیں! لوگ اپنے نفوس کے تزکیہ کے قدیم و دائمی نصب العین کو فراموش کر چکے ہیں۔ خواص بھی عوام کالانعام کی طرح ہوائے نفس کے صیدِ زبوں بن گئے ہیں! سب اک تند طوفان کے دھارے پر پڑ چکے ہیں، اور نہ معلوم کس ورطۂ ہلاکت کی سمت میں رواں دواں ہیں! اجتماعی عمل، جو مغرب کا خاص انداز ہے، بڑی بے بہا چیز ہے۔ لیکن اس ناگزیر شرط کے ساتھ کہ وہ عام پبلک اور تمامی خلق اللہ کے مفاد کے لئے تحصیلِ دولت و طیاریٔ اسبابِ معیشت کی خدمت انجام دے! لیکن جب وہ عظیم اکثریت کو قلّاش بنا کر گرفتارِ فلاکت و نکبت کر دیتا ہے اور معدودے چند اربابِ دولت و خداوندانِ سرمایہ، عمومی سوسائٹی کے جسمِ ناتواں کا بھاری سر بنکر اُس کے بارِ دوش ہو جاتے ہیں تو پھر یہ آئینِ حیات ذلّت آفریں بھی بن جاتا ہے اور حادثہ انگیز بھی! قوت و شوکت بھی اہم چیزیں ہیں، لیکن ان کی غرض محمود ہونی چاہیئے اور کم سے کم مقدار و مدّت کے لئے اُن کے استعمال کو روا رکھنا چاہیئے! اس لئے کہ آخر میں جاکر یہ عناصر برہم زنِ محفل ہی ہوا کرتے ہیں!

٦٧

—— نپولین اعظم اور قیصر ولیم (دوم) اپنے اپنے وطن فرانس و جرمنی کے لئے بڑے بڑے معجزاتِ ترقی انجام دیسکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ اپنی نادر شاہی کو قیدِ ضبط میں رکھتے!

جب ہیئتِ اجتماعیہ کے ایوان میں تجارت و جلبِ منفعت ہی عصائے حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو قوم میں "پُر چھمی دیوی" ہی کی گادی نشینی عمل میں آتی ہے! اِس وادیٔ زندگی میں حیاتِ انسانی کا سارا جمالِ شرافت پامال ہو جاتا ہے! مذہب، ادب، موسیقی، اور تمام فنونِ لطیفہ پسِ پشت پڑ جاتے ہیں! آج دورِ حاضر کے آشوبِ عظیم میں وہ اسی گردش میں آچکے ہیں! وہ ابھی سے کافی مسخ ہو چکے ہیں۔ جب ڈرامہ مسخرگی بنجائے۔ موسیقی سامعہ خراشی، اور رقص حرکاتِ مذبوحی، تو اُس وقت بہتر یہ ہے کہ تہذیب اپنی رفتار کو معطّل کر دے اور اپنی ثقافت نوازی کو ختم! ع

مرا بخیر تو اُمید نیست، شر مرساں!

آج سارے لطیف حسیاتِ قلبِ انسانی، اور سارے محاسن و محامدِ بشری ـــ عشقِ صادق، وفائے خالص، ایثار و قربانی، فدائیت و شیدائیت، اُلفت و رفاقت، شرافت و شجاعت ـــ سب اک داستانِ پاستان اور اک تقویمِ پارینہ بنکر رہ گئی ہیں! گویا وہ ؏

رسمے کہنے بود در عہدِ تو بر اُفتاد!

شادی کی محفل میں آج لوگ بس اِک طلعتِ حسین کو انتخاب کر لیتے ہیں یا اک گراں بہا حقِ شوہری کو! ـــ اور دوسری طرف صنفِ لطیف کی نگاہِ التفات کا مورد کوئی بطلِ تجارت و حرفت ہوتا ہے یا کوئی قارونِ وقت! ہیہات کہ انسان آج انسان کے پاس بس اس لئے آتا ہے کہ حیوانی زندگی کے بعض مطلوباتِ گوشت و پوست حاصل کرے! پھر جوں ہی کہ حُسنِ بُت کا گُل جمال مرجھانے لگتا ہے یا فریقِ ثانی کے آثارِ تجارت اُدبار میں آنے لگتے ہیں تو مقدس گرجاؤں کے والہانہ عقدہائے نکاح بازاری عدالتگاہوں کے شرمناک طلاق بن جاتے ہیں! وہ محبتیں جن پر بقائے دوام کی مہریں ثبت ہوئی تھیں اک پُر فریب نیرنگِ روزگار ثابت ہوتی ہیں! آہ کہ انسان کو خمیرِ انسانی صفات نے اپنا مرکب بنالیا اور "اقارب" کی بھی "عقارب" کی صورت میں قلب ماہیئت ہو گئی! آج "سینۂ بے کینہ" اور "دل صورتِ مینا" عنقا ہے! موجودہ انسانی داعیات و فسادات کے غولِ بیابانی کی سرگردگی میں وصولِ حق کا امکان تو اک مہمل خیال ہے! خدا حملاً ہمارے روزمرّہ کی زندگی سے اک بعد المشرقین کی دوری پر پہنچ گیا ہے! مختلف قوموں کے درمیان عصبیت ہے اور منافرت غلامیاں ہیں اور "زندہ سوزیاں" (phenomena) حکومتوں کے درمیان پالیسیاں ہیں اور ڈپلومیسیاں، چالاکیاں ہیں اور عیاریاں، ریشہ دوانیاں ہیں اور کارستانیاں انصاف کشیاں ہیں اور اخلاق فراموشیاں ـــ پھر نظامِ اجتماعی میں طبقاتی امتیازات ہیں اور مجلسی دامن کشیاں، ہڑتالیں ہیں، اور انقلاب کوشیاں، ملکوں کے درمیان سیاست بازیاں ہیں اور معرکہ آرائیاں ـــ کاروبار میں تجارتی مسابقت ہے اور طلبِ منفعت، مذہب میں الحاد ہے اور تشکک! ـــ الغرض ؏

ناچ ہے مغرب کا بزمِ دہر میں

اِس ساعتِ موجود پر ساری مغربی خلقت اک ہجومِ مجانین کی طرح بے تحاشا دوڑی چلی جا رہی ہے! ؎

خبر نہیں ہے کدھر جاؤں گا چلا ہوں کہاں؟ مثالِ ریگِ پریدہ ہوں پر اُڑا جاتا!

اِک طوفانِ بلاخیز ہے جس کے درمیان ناخدا کی ضعیف و خفیف صدائے المدد بمشکل گوش زد ہوتی ہے! وہ طوفان کی شورش میں تقریباً غرق ہو گئی ہے! ـــ اور اگرچہ ناخدا نے گردابِ ہلاکت کو اپنے سامنے صاف صاف دیکھ لیا ہے لیکن وہ اک فردِ واحد سارے بیڑے کی تنبیہ و بیداری سے عاجز ہے جو سرشار و بدحواس ڈگمگ دوڑ غرقابی کی طرف افتاں و خیزاں رواں ہے! ـــ عالمِ بشری کا یہ منظرِ عبرت بھی کیسا دیدنی ہے!!

پروفیسر برٹرینڈ رسیل اپنے اک مقالے ـــ "شائع شدہ رسالہ "جمہوریۂ جدیدہ" ـــ کے دوران میں فرماتے ہیں: "اگر یورپ اپنے کو اس اختلالِ دماغی اور اس تمدّنی زیاں کاری سے باز نہ رکھ سکا تو شاید ضرورت اس بات کی پیش آئے گی کہ چین کا حرمِ سکینت اپنے بعض واعظین ممالکِ مغرب کو بھیجے جو حیوانیت و وحشت کے اس نیستاں میں انسانیت کی صدا بلند کریں!" ـــ اس میں شک نہیں کہ اس قول میں اک رنگِ طعن کی آمیزش ہے۔ مگر جو حقیقت اس کی پس منظر میں موجود ہے وہ اک درسِ عبرت ہے!

سچ یہ ہے کہ مغربی تمدن اب زیادہ دن جی نہیں سکتا! اگر وہ اپنے انہی احوال و اعمال کے ساتھ جاری رہنے دیا گیا اور کوئی تدارک عمل میں نہ آیا تو وہ اپنا قاتل آپ بن جائے گا! اس طرح اس بے نظیر تمدّن کی بے نظیر زندگی کے ساتھ اُس کی موت بھی بے نظیر ہی ثابت ہو گی ـــ یعنی خودکشی! پس تہذیبِ مغربی کی آئندہ منزل بلافصل یہ ہے کہ ؏ ایک "مرگِ ناگہانی" اور ہے!

۶۸

ہم کو ضرورت نہیں کہ مغرب کی تباہی کے لئے ہم دوسروں کی طرح اک اور "جنگِ عظیم" کی وعید سنائیں! اس لئے کہ آج تو اس کی پُر امن زندگی کے میدان ہی میں اُس کے انہدام کا تخم تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ میدان صنعت و حرفت و تجارت کا میدان ہے، مغربی دُول عظمیٰ میں سے ہر ایک اپنے لئے عالمگیر بازارِ تجارت کا تسلّط چاہتا ہے! مغرب کے ملوک التجار اور عظیم تجارتی تنظیمات صرف مقامی یا ملکی ترکتازِ تاجرانہ پر قانع نہیں! کسی کا منصوبہ بین الاقوامی اجارۂ تجارت سے کم تر کوئی چیز نہیں! اب مصنوعات کی موجودہ رفتارِ پیدائش ہوشربا ہے۔ پھر جس سرعت سے مختلف سرزمینوں کے طبعی ذخائر اخراج و صرف ہو رہے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ دہشتناک ہے۔ اگر ہم صرف کی عالیہ مقداروں کو بغیر کسی اضافہ کی رعایت کے مستقل فرض کر لیں تو آئندہ سو برس کے اندر اقطاعِ عالم کی لکڑی، تیل، ربڑ اور خود کوئلہ قریب قریب سوخت ہو جائے گا! کیا اکیسویں صدی کے انسانوں کے لئے یہ کوئی معمولی حادثہ ہوگا؟! پھر اگر اس قیاس کو بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دُنیا کے طبعی ذخائر کشت زار و جنگلات اور دفائن کان و معدن تا قیامت جاری و باقی رہیں گے۔ تب بھی ممالکِ عالم کی حرفتی کارگاہوں کی موجودہ رفتار کا برابر مزاحمت قائم نہیں رہنے دی جا سکتی! اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً برطانیہ کی شکارگاہیں ہندوستان، مصر اور بعض دوسری نوآبادیات ہیں۔ اب جب ہندوستان، انگلستان کے اسباب کا مقاطعہ کر دیتا ہے تو برطانوی مزدور و کاریگر اپنے اوپر عرصۂ حیات تنگ پاتا ہے! اسی طرح جاپان کی بڑی کمین گاہ چین ہے۔ چنانچہ جب چینی آبادی جاپانی مصنوعات کی خریداری سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے تو معاً جاپان اس اقتصادی شکنجے کے فشار کو محسوس کرنے لگتا ہے! تیسری طرف ریاستہائے متحدۂ امریکا اپنی دولتِ قارون پر نازاں ہیں، اس لئے کہ یورپ اور باقی دُنیا کا بیشتر حصہ بھی آج اسکی مالی دستگیری کا محتاج ہے۔ لیکن اگر یورپ ہی گردش میں آ جائے تو امریکن سرمایہ معرضِ تلف میں آ جائے گا! مغربی تمدّن کی تو بنیاد اساسی ہی اس اصول پر واقع ہوئی ہے کہ زور و زر بیک وقت آلۂ کار ہوں! اور قومیں، نسلیں، اور سوسائٹی کے مختلف داخلی طبقے یکساں مواقعِ معیشت سے مساویانہ متمتع نہ ہونے پائیں، غریب و نادار، کمزور و ناقابلِ مقاومت عناصر یا تو پیس ڈالے جائیں، یا تا زیست اُن کی خون آشامی کی جاتی ہے!

دُنیا کے ترقی پذیر حرفتی مستقبل میں اِس احتمال کو فرض کیجیے کہ ہر مُلک، برطانیہ و امریکا ہو گیا ہے! اب اپنی وطنی ضروریات کی بہم رسانی کے بعد ہر قوم اپنے اسباب و اجناس کی نکاسی کے لئے کسی بیرونی بازار کے ڈھونڈنے پر مجبور ہوگی، مان لیجیے کہ ہندوستان کے پاس انگلستان کو برآمد کرنے کے لئے سوتی مصنوعات پیدا ہو گئیں اور علیٰ ہذا القیاس چین اپنے ہمسایہ جاپان کا عام حرفتی ہم رساں بننے پر تیار ہو گیا تو ایسی صورتِ حالات میں کیا "کثرتِ پیداوار کا قحط" نہ پڑ جائے گا؟

الغرض آپ اپنے استدلال و نظر کے لئے کوئی بھی راہ اختیار کریں اس نتیجے سے مفر نہیں کہ موجودہ مغربی تمدّن میں اگر کوئی اساسی تبدیلی عمل میں نہ آئی تو اپنی آئندہ رفتار میں وہ اپنے لئے آپ ہی زنجیر پا بن جائے گا! آخری انجام اُس کے سامنے یہی ہے کہ اپنے مادّی ساز و برگ کے ختم ہو جانے کے بعد اک فاقہ زدگی کی موت مر جائے! شکم زمین کے طبعی ذخائر جب اک وقت جا کر بالکل خرچ ہو چکیں گے تو بجز اس حشر کے کیا چارہ ہے؟ اور یا پھر یہ ہوگا کہ تمام اقوامِ عالم کی علمی و فنّی و حرفتی خلّاقیاں جب دُنیا کے بازار کو اپنے مصنوعات و اسباب و اجناس سے پاٹ دیں گی تو یہی مہیب انبارِ عظیم بین الاقوامی معیشت و معاشرت کی رفتار کو مسدود و معطل کر دے گا! ــــ اور یہ تو صرف مادّی اسباب مصیبت و زحمت ہیں، جن کے ساتھ اس اخلاقی انحطاط اور روحانی گمگشتگی کو سر دست نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مستقبل کی مغربی زندگی اپنی جلو میں لائے گی اور اک روز افزوں شدّت و قباحت کے ساتھ! ع

ہُشدار کہ سیلابِ فنا در پیش است!

(۴) مشرق و مغرب کا وصال و وفاق

مشرقی اور مغربی تہذیب کی جو جو صفات و خصوصیات گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہیں وہ شاید ہماری بحث کی بازگشت اُس فیصلے

کی طرف کرائیں گی جو اس مضمون کی افتتاحی سطور میں نقل کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ ؎

مشرق ہے مشرق، مغرب ہے مغرب

دونوں کا ملنا ہے غیر اغلب!

اچھا تو کیا مشرق اور مغرب کبھی باہم نہ ملیں گے؟ اِس کی نسبت کچھ بھی کہا جائے لیکن میرے ذاتی خیالات اور قلبی معتقدات کا حکم ناطق تو یہی ہے کہ یہ دونوں تمدّن ابدی طور پر بیگانہ بلکہ گریزنہ رہیں گے! میری محبّت کا اجتہادی نکتہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب اگرچہ بلا شُبہ ایک دوسرے سے "مختلف" واقع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے "مخالف" نہیں ہیں! اُن کے درمیان اک اجنبیت ضرور ہے لیکن صرف "اجنبیت" نکہ "منافات"! اُن کا ملنا دو نا آشنا چیزوں کا سنگم ہوگا، نکہ اک "اجتماع ضدّین"! میرے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی تہذیبیں اک دوسرے کا تکملہ کرتی ہیں، نکہ اک "انمل بے جوڑ سنجوگ بناتی ہیں! مشرق و مغرب کی مغائرت کے بارے میں کپلنگ کا جو ضرب المثل (یا بدنام عام!) فقرہ ہے اُس سے تو یہ یاس خیز خیال ٹپکتا ہے کہ دونوں تمدّنوں کا مصافحہ دُنیائے ممکنات ہی کی کوئی چیز نہیں! لیکن میں ان تہذیبوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ ایک دوسری کا "عکس" نہ ہوئیں! اُن کا یہ تبائن ہی اُن کے درمیان جذب و انجذاب کا طبعی داعیہ پیدا کرے گا! کیا مرد و عورت بھی بعینہ اسی طرح خلقاً مختلف نہیں ہوتے؟! اور کیا یہی تفریق اُن کے درمیان رشتۂ مواصلت نہیں بنجاتی؟! ؎

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ است

تو زباں فہم نۂ ورنہ خموشی سخن است!

پس نسائیت مآب مشرق، مردانہ صفت مغرب کا دلدادہ ہو جاتا ہے اُس کی قوت آفرینی اور کارفرمائی کی کارناموں سے! "جدید جاپان" اس "نذرِ دل" کی دلچسپ مثال ہے جو اُس نے مغرب کے مظاہرۂ جلال کے سامنے پیش کی ہے! گویا مشرقِ بعید کے اس خطے اور دور دراز مغرب کے درمیان اک "عقدِ زوجیت" عمل میں آیا ہے! ___ تاکہ اوّل الذکر کی نسائیت آخر الذکر کی رجولیت سے آمیز ہو کر اک متوازن الامتزاج نعومت و خشونت پیدا کرے! ہند و چین کی سرزمینوں میں بھی اسی تخم کی کاشت ہو رہی ہے! ماضیٔ قریب میں ان ہر دو مشرقی ملکوں کے اندر اجتماعی شعور، تنظیم کار، اور اشتراکِ عمل وغیرہ کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ہیں وہ تمدّنی مناکحت کے آخری قیام کے ابتدائی "پیام و سلام" ہیں! ع

اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں!

مشرق کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور عالمِ اسباب کی آزمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنی زنانہ پردہ نشینی اور اپنی دوشیزگانہ حیا پروری کو خیرباد کہے! دوسری طرف مغرب کی حالت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ اپنی گرنیز اگرنیز رفتار ہلاکت کے نتائج سے بچنے کے لئے مشرق کی شانِ سکون اور ادائے جمال کو تھوڑا اپنے سینے کے اندر اتارے! ___ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عام طور پر مشرق کی نفیہ حیات پر ایمان لانے کیلئے اپنا شرح صدر کرے!

اگر مشرق سے فرمائش کی جائے تو یقیناً اُس میں یہ اہلیت بھی ہے اور یہ آمادگی بھی کہ وہ مغرب کو اک نیا جلوۂ زندگی دکھائے اور ایک جدید مقصدِ حیات بخشے! خاتونِ مشرق مردِ مغرب کے لئے ایک نشیمنِ دلنشیں بنائے گی۔ جو آخر الذکر کا روحانی مامن بھی بنجائے گا! اپنے پہلوئے ناز کی درسگاہ میں وہ اس کو فرصت و فراغت، سکینت و متانت، تخیّل و تصوّر، شب خواب اور صبح انکشاف کے ابواب پڑھائیگی! یہ "خاتونِ جمیل" (مشرقیت) اس "مردِ ثقیل" (مغرب) کو حفظ و ضبط، سکون و اطمینان، کیف و لطف، محبّت و الفت کی ورزش کا فنِ لطیف سکھائے گی!

۷۰

مشرقیت کو اک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اُس کے لئے مہماتِ زندگی کے اہتمام و انصرام کے بارِ گراں کو اپنے دوشِ قوی پر اٹھالے! اسی طرح مغرب اک مجسمۂ نسائیت کا محتاج ہے جو اُسے اک خانۂ عافیت اور اک خلوتِ روحانیت بہم پہنچائے! مشرق کے کان کو میدانِ عمل کے "بگل" کی ضرورت ہے، اور مغرب کے سامعے کو حرمِ سکینت کی "نوائے اذاں" کی! مغرب مشرق کے ساتھ اس ریشمی رشتۂ زوجیت کے ذریعے شیرینیٔ حیات اور نرمیٔ حسیات کے نوشدارو کا سُراغ پاسکتا ہے، اور مشرق مغرب کے ساتھ اسی حبالۂ عقد کے بل پر کارزارِ زندگی میں فاتحانہ قدم زن ہوسکتا ہے!

الغرض "خاتونِ مشرق" اور "مردِ مغرب" کی یہی "تمدّنی شادی" ہے جو تہذیبِ بشری کے ان ہر دو گھرانوں کی "خانہ آبادی" بنے گی، اور اک جامع و متوازن تمدّن کا مولودِ قوی تولّد پذیر ہوگا جو مشرق و مغرب کی مجموعی ثقافتی وراثت کا لائق و فائق وارث ہوگا!

گویا شراب

(حضرت عمر انصاری لکھنوی)

بے ربط سا وہ خواب دکھا کر چلے گئے — ماضی کو جزوِ حال بنا کر چلے گئے

مضمر تھیں بے حجابیوں میں پردہ داریاں — آتی ہوئی ہنسی کو دبا کر چلے گئے

اب ذرّہ ذرّہ دل کا ہے مخمورِ اشتیاق — تم کونسی شراب پلا کر چلے گئے

مرگ و حیات دونوں سے ہوں دور دور سا — کیا جانے کیا مجھے وہ بنا کر چلے گئے

روکا ہزار بُتکدے جانے سے شیخ نے — ہم واسطہ خدا کا دلا کر چلے گئے

کچھ ہم بھی حرفِ شکوہ نہ لائے زبان پہ — کچھ وہ بھی آج سر کو جھکا کر چلے گئے

پاکیزگی کی شرط تھی پیشِ خدا عمر
ہم اپنے آنسوؤں میں نہا کر چلے گئے

جمہوریۂ ترکی کا نیا صدر

(از کیپٹن جے آر ایس لیڈون برن)

مترجمہ :۔ "عزت"

اپنی زندگی میں کمال اتاترک نے وہ کمال حاصل کیا جس نے سیاست دانوں کو تحیّر میں ڈال دیا۔ وہ زمانہ مابعد از جنگ کا پہلا آمر تھا اسے اتنی شہرت نصیب ہوئی جس نے دیگر آمران قوم کو گویا قعر گمنامی میں پھینک دیا۔ تمام دُنیا اس کو ترکیٔ جدید کے بانی، اس کی ڈوبتی کشتی کے ناخدا کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی تھی۔ اب کہ اس کی وفات حیات جاوداں کے نام زندگی کا قیمتی ترین تحفہ بن چکی، کون ہے جو اس کے جانشین کا نام جانتا اور اس کے کارناموں سے واقفیت رکھتا ہے؛ چند گنتی کے افراد اس کی بابت مفصل معلومات رکھتے ہوں گے۔ میں ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

بہرکیف اب ترکی کی زمام حکومت ایک ایسے مخلص انسان کے ہاتھوں میں ہے، جو غازی مرحوم کا سایہ بنا رہا جس نے اس کی معیت میں بیس سال تک کام کیا۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جس میں ترکی کو ایسے مراحل سے گزرنا ہے جنہوں نے کمال کو اگر وہ زندہ ہوتا کسی حد تک پریشان کر دیا ہوتا۔ حملہ آور یونانیوں کو اپنے ایشیائی حصّہ سے نکالنے کے بعد کمال کے لئے صرف اندرون ملک کے معاملات کا سنبھالنا رہ گیا تھا لیکن اس کے منتخب جانشین کو خارجی گتھیاں سلجھانی ہیں، اسے ایک طرف روس سے توازن قائم رکھنا ہے۔ مشرق کی جانب بڑھنے والی جرمن قوم کی روک تھام کا انتظام الگ رہا۔ اور پھر دول انگلستان و فرانس کے متحدہ محاذ سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یہی دونوں ملک اس کے برّی و بحری ہمسایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برطانیہ ترکی سے معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے درّۂ دانیال کو آزادی دلائی؛ یہی بحیرۂ اسود کی راہ ہے۔ جس کے ساحل کی طرف جرمن بڑھ رہے ہیں۔

جنرل عصمت انونو مختصر قد کے ہنس مکھ انسان ہیں۔ وہ Benes[1] سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ترکی کا بچّہ بچّہ ان کو جانتا ہے اتاترک تک پہنچنا اک مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے برخلاف انونو اکثر کہیں نہ کہیں نظر آجاتے ہیں؛ وہ کمال کے دست راست تھے، اخبارات میں ان کا ذکر آمر سے زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ان ہی کی تصاویر سے وہ اکثر و بیشتر مزیّن رہا کئے ہیں، اتاترک تنہا تھے ان کی کوئی گھریلو زندگی نہ تھی۔ لیکن جمہوریۂ ترکیہ کے نئے صدر کی ایک جوان بیوی ہے اور اولاد بھی، وہ عوامی ملاپ کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ اس زمانہ میں پروان چڑھا جب وہ باشندگان اور آمر کے درمیان پیامبر کا کام کرتے تھے، کمال فیصلہ کرنا جانتے تھے، یہ فرض عصمت کا تھا کہ ان کے فیصلوں کو جامہ عمل پہنائیں۔ طاقت کے خلاف اٹھتی ہوئی آوازوں کو دبانا انھیں پسند تھا۔

---

[1] بینز۔ چیکوسلاویکیہ کا صدر جسے ہٹلر نے جلاوطن کر دیا۔

دو سال ہوئے انگورہ میں مجھے اتاترک سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا' دوران گفتگو میں عصمت انونو آ گئے۔ جب میرا ان سے تعارف کرایا گیا تو غازی نے فرمایا "ہز اکسیلنسی وزیر اعظم اس رقم کا بندوبست کریں گے' آپ دیکھ لیجئے گا"۔ عصمت ہی اس زمانہ میں وزیر اعظم کا اہم کام انجام دیتے تھے۔

۱۹۱۸ء میں (Caucasus) کوہ قاف کے محاذ پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی' کرنل عصمت اور جرنل مصطفیٰ کمال کی حیثیت سے۔ کمال تدابیر بتایا کرتے تھے۔ انھیں پورا کرنا عصمت کے ذمہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد جب کمال کے دماغ میں سلطان اور پرانی طرز حکومت سے بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ ان کو سلطان نے اناطولیہ بھیجا کہ اس ترکی فوج کو غیر مسلح کریں' جو دول متحدہ کے خیال میں (جس نے سلطان و خلیفہ کو سخت خوف میں مبتلا کر رکھا تھا) صلحنامہ کی دفعات کے خلاف اس وقت ہتھیار بند تھی۔ جاتے کو کمال گئے لیکن اس مرکز سیاست پر اک معتمد معاون کو چھوڑ گئے۔ دفتر جنگ میں انھوں نے نائب معتمد کی جگہ پر عصمت کو فائز کرا دیا تھا۔

بجائے اس کے کہ فوج کے اس دستہ کو غیر مسلح کریں انھوں نے وہاں جا کر ایک منظم بغاوت کی' قسطنطنیہ میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے ان سے عصمت ایک خاص زبان کے ذریعے کمال کو مطلع کرتے رہے۔ اور اس ہوشیاری کے ساتھ کہ کمال نے اک سال تک خفیہ طور سے اپنی تدابیر پر عمل کیا۔ جب دول متحدہ کو ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوجی دستے بھیجے۔ عصمت فوراً کمال سے جا ملے' یہ ۱۹۲۰ء کی بہار کا زمانہ تھا۔

انگورہ میں کمال نے اک باغی سلطنت قائم کر لی تھی' اس میں عصمت کو اک وزیر کا عہدہ مل گیا۔ اتنے میں ہی یونانیوں نے حملہ کر دیا۔ کمال نے مغربی حصۂ فوج کی کمان ان کے سپرد کر دی۔ انونو کے مقام پر عصمت کو فتح حاصل ہوئی' اس طرح یونانیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ عصمت نے ابھی اپنے نام کے ساتھ انونو کا اضافہ کیا ہے' جبکہ اہل ترک نے اپنے ناموں کے ساتھ لقب (Surname) ایزاد کیے' یوں کمال کمال اتاترک ہوئے اور عصمت — عصمت انونو۔

جب ان کو کمان حاصل تھی انھوں نے مندرونیا کے مقام پر اہل برطانیہ سے صلح کی بات چیت کی' لائڈ جارج کی ہمدرد یونان پالیسی نے آخر اس کیلئے اہل برطانیہ کو تقریباً مجبور کر ہی دیا۔ ازاں بعد انھوں نے دول مغرب سے اک نئی صلحنامہ کی گفت و شنید کی جس سے صلحنامہ سیورے کی بیخ کنی مقصود تھی' جس کی سلطان کی جانب سے منظوری نے ترکی قوم پرستوں کی بغاوت کو بھڑکایا تھا۔

جب اس گفت و شنید کے لئے وہ لاسین پہونچے تو انھیں لارڈ کرزن سے سابقہ پڑا جو اس زمانہ میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ مسولینی کے اطالیہ' اور پون کیر کے فرانس کے نمائندگان کرزن کی ہمراہی میں تھے۔ عصمت کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان لوگوں کے لئے بیٹھنے کی کرسیاں خالی پڑی تھیں حالانکہ سیاست دان مغرب ہتھے دار کرسیوں پر آرام سے تشریف فرما تھے۔ عصمت اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے اور گفت و شنید جاری کرنے سے اس وقت تک انکار کر دیا۔ جب تک ویسی ہی کرسیاں ترکی وفد کے اراکین کیلئے مہیا نہ کر دی جائیں۔ اس کانفرنس میں انھوں نے آبنائے کی آزادی طلب کی۔ اس معاہدہ کی تنسیخ چاہی جس کی رو سے ترکی کے غیر ملکی باشندے وہاں کے قانون و قواعد سے بری کر دیے گئے تھے۔ جب کانفرنس میں انھوں نے یہ جتایا کہ وہ ترکی کے حصے بخرے کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو کرزن نے ان مطالبات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا' اور کانفرنس اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

کرزن کو یوں اپنی ذلت ناگوار گزری' اس نے جل کر کہا "تمہیں دولت کی ضرورت ہے' دولت میرے ملک میں ہے' جب بھی تم اس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پھیلاؤ گے' میں ان اقرارناموں میں سے ایک تمہارے حوالے کر دیا کروں گا جن کو اس وقت تم نہیں مانتے"۔ یہ ایک خاصی دھمکی تھی لیکن عصمت کا مشرقی وقار آڑے آیا۔ انھوں نے نرمی سے کہا "مجھے اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں' وقت اس کا جواب دیگا"

اور زمانہ نے ہی اس کا جواب دیا۔ کرزن جو لائڈ جارج سے ملی بھگت رکھتے تھے اپنی طاقت کھو بیٹھے۔ ترکی سے پھر معاہدہ کے فکرمند نئے سیاسی رہنماؤں نے ازسرِ نو عصمت سے ناتہ جوڑا۔ اور جو انھوں نے لاسین پر طلب کیا تھا اس کو اس بار پا لیا۔ اتفاق دیکھئے ان ہی کی کوشش سے ابھی برطانیہ نے سولہ لاکھ پونڈ کا قرضہ ترکی کو دیا لیکن قدیم اقرارناموں میں سے ایک بھی اس قرضہ کی بنیاد نہ بنا۔

تین جمہوری کامرانیوں کے بعد جب اتاترک کی اصلاحات کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ اور اُن کو ترکی کی تعمیرِ نو پر اپنی تمام توجہ مرکوز کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا تو عصمت کے سپرد صلحناموں پر عمل درآمد اور گفت و شنید کا کام کردیا گیا وہ وزیرِ اعظم بھی تھے اور وزیرِ خارجہ بھی، معاہدۂ بلقان ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ترکی کی صنعتی و حرفتی ترقی کے لئے دو پنجسالہ اسکیموں کی نگرانی ان ہی کے سپرد رہی ہے۔ آجکل اِن کے معاون بیئر وزیرِ اعظم ہیں اس عہدہ پر کمال کے زمانہ میں عصمت خود فائز تھے۔

یہ دونوں (کمال اور عصمت) ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ انقرہ اور تکوا میں دونوں کے مکانات پاس پاس تھے (ہندوستانی اصطلاح میں دیوار بیچ رہتے تھے) صبح ہی صبح دونوں مل کر وہ قانون سمجھ لیا کرتے تھے جن پر اس دن مجلس کو غور کرنا اور فیصلہ دینا ہوتا تھا۔ اتاترک برانڈی اور شمپین کے جرعات لیا کرتے اور عصمت قہوہ پر اکتفا کرتے۔ وہ شاذ و نادر ہی شوق کرتے ہیں۔ اک بار اتاترک نے ان کی اس پرہیزگاری کا مذاق اڑایا تو عصمت نے مسکرا کر کہا "میں اپنی مونچھوں کی بڑی وقعت رکھتا ہوں" یہ جواب پس منظر میں ایک واقعہ پیش کردیتا ہے۔

اک بار رات کے کھانے پر اتاترک کے ایک کامریڈ نے بہت پی لی تھی۔ اپنا چرٹ سلگاتے وقت اس کے ہاتھ سے دیا سلائی چھوٹ کر عصمت کی مونچھوں پر جاگری۔ ان کی خیر ہوگئی کہ عصمت نے جو قریب ہی بیٹھے تھے فوراً ہی اپنی جلتی ہوئی مونچھوں کو اپنے گلاس میں ڈالدیا۔ اس وقت وہاں صرف ان ہی کے گلاس میں پانی تھا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد پھر اک ڈنر پر، دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اتاترک نے مذاقاً ان سے کہا "تمہارے ہاتھ ٹھیک سے نہیں چل رہے، کیا شوق کرنے لگے؟" "میں نے تو پانی بھی نہیں پیا" یہ عصمت کا جواب تھا۔ "لیکن تمہارے پاس مٹر کا شوربہ تو تھا" کمال نے اپنے جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس سالن میں شیری خوب ملادی گئی تھی ــــــ بیچارے عصمت کو اس کا کیا علم تھا!!

یورپ اور دُنیا کے پیچیدہ حالات سے فائدہ اٹھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہ تمام ترکیبوں اور چالاکیوں سے واقف ہیں سولہ لاکھ کا قرض انگلستان سے لینے کے بعد ابھی انھوں نے بارہ لاکھ جرمنی سے اسی مد میں حاصل کئے ہیں۔ وہ طاقتور اقوام کے درمیان بہت خوب توازن قائم رکھتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ گزشتہ بار ترکی کا پانسہ اُلٹا پڑا اور اس نے ایک سلطنت کھودی۔ اب کی بار اس کا ردِّ عمل ممکن ہے۔ انونو فیصلہ کن دماغ رکھتے ہیں، مظاہرات سے وہ نہ جلد متاثر ہوتے ہیں نہ پریشان۔

انھیں اپنے رہنما سے زیادہ سخت کام انجام دینے ہیں، ان کے بال کھچڑی ہو رہے ہیں لیکن ان کی مونچھیں سیاہ ہیں اور گھنی، وہ روزانہ بارہ گھنٹہ کام کرتے ہیں، سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اک لائحہ عمل کے مطابق کام کرتے ہیں، عجلت نہیں برتتے اور نہ وقت بیکار کھوتے ہیں۔

عزّت

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا مرثیہ شاعری

(ایک علمی و فنّی موازنہ)

(جو سیّد محمد یحییٰ میرٹھی اور ساغرؔ نظامی کے مابین آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء کو ۸ بجکر ۱۵ منٹ پر براڈکاسٹ کیا گیا)

ساغر (عالمِ انتظار میں) گیارہ بج گئے اور آج یحییٰ صاحب ابھی تک نہیں آئے ! ؟

(یحییٰ کی آواز) حاضر ہو سکتا ہوں !

ساغر آئیے، بھئی بڑی عمر ہے۔ ابھی ابھی میں آپ ہی کا تصور کر رہا تھا ——— کہاں تھے ! ؟

یحییٰ رات کو دو تین بجے تک جاگا تھا، دن چڑھے تک سوتا رہا۔ آپ تو جانتے ہیں، سیّد صفدر علی خاں کو، ہمارے دوست ان کے یہاں شب کو مجلس تھی۔ ایک صاحب نے مرزا دبیر کا اک لاجواب مرثیہ اس انداز سے پڑھا کہ حاضرین جھوم جھوم گئے۔ ہر شخص بے تاب ہو گیا، کوئی سخت دل ہی ہو گا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ گئے ہوں ! ؟

ساغر خوب دبیر کی شاعری بھی یہ طاقت رکھتی ہے، میر انیس کے متعلق آپ ایسا کہتے تو میں تسلیم بھی کر لیتا ۔

یحییٰ ساغر صاحب معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انیس و دبیر لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ ایک کا نام لیتے ہی دوسرا سامنے آ جاتا ہے۔ جس چیز پر ادب کے بڑے بڑے پہلوانوں میں رسّہ کشی ہو چکی ہے اس پر آپ بحث کرنی چاہتے ہیں۔ مجھے آپ کے زبردست نفسیاتی انسان ہونے میں شک نہیں، لیکن دوست موضوع کسی قدر خطرناک ہے۔ اور اس تفریحی صحبت میں بحث ناتمام رہ جائیگی۔ میرے نزدیک اُردو کے شعراء علم کلام کے مطابق کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہوں۔ لیکن انسانی زندگی سے ان کی شاعری کا کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ اور اگر ہے بھی تو صرف اس قدر جیسے آر دپر سفیدی ۔

یہ میری ذاتی رائے ہے، اب رہا آپ کے سوال کا جواب، سو اگرچہ میں انیس کو ایک قادر الکلام شاعر سمجھتا ہوں، تاہم مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں نہ صرف انیس کے ہم پلّہ ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان سے زیادہ کامیاب شاعر ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ انیس اور دبیر کا مقابلہ غلط طریقے پر کیا جاتا ہے۔ آپ خود شاعر ہیں اس لئے میرے اشارے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔

ساغر اُردو شاعری اور شعراء اور ان کی زندگی سے کم ربطی، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا بڑا تعلق سماج اور اسکے برتاوں سے بھی ہوتا ہے، زندگی سے ربط ہونے کا خیال بالکل نیا خیال ہے اور اس نئے خیال کی جھلک موجودہ زمانے کے شاعروں میں پائی جاتی ہے،

پُرانے شاعر قدیم سماج کی آواز تھے، نئے شاعر نئی دُنیا کے نمائندے ہیں۔ رہے انیس و دبیر اور ان کی شاعری تو میرے خیال میں انیس بہرحال مرزا دبیر سے بہتر اور برتر شاعر ہیں۔

حسن تناسب (   ) سلاست، فصاحت، شاعرانہ تراش، زور، جوش اور موضوع کے متعلقات کو مناسبت کے ساتھ نظم کرنا، یہ خصوصیتیں انیس کی شاعری کے ترکیبی عناصر ہیں۔ وہ جس ماحول کی تصویر کھینچتا ہے اس سے تعلق رکھنے والی نازک سے نازک چیز کو موضوع کی کامل مناسبت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اتنا کامل اور خلاق آرٹسٹ اُردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کے سوائے کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ انیس کی شاعری دبیر کی شاعری کے مقابلہ میں، غرابت، ثقالت اور آورد و تعقید سے قطعاً پاک ہے۔

انیس کی نظم میں الفاظ بھی رقص کرتے، کبھی جھومتے، کبھی سر دُھنتے اور کبھی سینہ تانے ہوئے آتے ہیں۔ اور نگاہ کے سامنے منظر کی مکمل تصویر کھنچ جاتی ہے ؎

نکلا یہ سُن کے غیض میں اک پہلوانِ روم   گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
سرِ ننگ و پُرغرور و سیہ قلب و نحس و شوم   لنگر سے جس کے ہل گئے مقتل کے مرز و بوم
مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

دوسری جگہ "ذوالفقار" کی تعریف و تصویر ملاحظہ کیجئے ؎

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا   جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جُدا
مہتاب سے شعاع جدا، گل سے بو جُدا   سینہ سے دم جدا، رگِ جاں سے لہو جُدا
گرجا جو رعد، ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

اور جب صبح کی تصویر کشی کرتا ہے تو الفاظ صبیح، رنگین، پاکیزہ، اور شاداب استعمال کرتا ہے۔ سُنئے ؎

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا   درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

انیس نہ صرف منظر نگاری میں کمال رکھتا ہے بلکہ مناظر کے جو اثرات انسانی جسم و روح پر ہوتے ہیں ان کو بھی جنچے تُلے الفاظ میں نہایت فصاحت کے ساتھ نظم کرنے میں حیرت انگیز کمال رکھتا ہے!!

یحییٰ   بجا ہے لیکن کلام کے اجزا کو اگر نکھارا جائے۔ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک کلام پر دوسرے کلام کی فضیلت الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی، بلکہ جب ترتیبِ الفاظ معانی کے لحاظ سے ہوتی ہے تو خوبی اور خصوصیت کہلاتی ہے۔

ساغر   خیر آپ علمِ معانی پر روشنی ڈالئے میں سُننا چاہتا ہوں کہ آپ انیس کے متعلق کیا کہنا چاہتے ہیں؟

یحییٰ   انیس ہو یا روح الامین! بے خوف نقاد کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتے۔ علمِ معانی سے مراد وہ مقاصد ہیں جو مرکب الفاظ کو ایک

دوسرے کے ساتھ ترکیب دینے سے سمجھے جاتے ہیں۔ گویا علمِ معانی ہی حقیقۃً بلاغت ہے جس میں مرکب کلموں سے بحث ہوتی ہے اسکے برخلاف فصاحت کا تعلق مفرد الفاظ سے ہوتا ہے۔ ان مفرد الفاظ پر علم بیان کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ بھئی واقعہ یہ ہے فصاحت اور بلاغت ذوق سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا احساس رومانی (   ) ہے انیس بلا شبہ مرزا دبیر کے مقابلے میں فصیح ترین ہیں۔ لیکن فصاحت میں اگر معنوی خوبیاں نہوں تو علم کلام کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ گھٹ جاتا ہے۔ الفاظ تو محض خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس لئے خیالات ہی اصلی چیز ہیں۔ الفاظ کے مقابلے میں خیالات پر غور کرنا چاہئے۔ مرزا دبیر کی بلاغت، بلند پروازی سیر گوئی ان کے کلام کو زیادہ ٹھوس اور بلند پایہ کر دیتی ہے۔ رہی روانی و سلاست تو دبیر کے کلام میں اسکی کمی نہیں۔ حضرت اصغر کی شہادت پر مرثیہ کے شروع میں جناب اماؑم کی خودداری کی تصویر کھینچتا ہے ؎

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے   چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چاہا ردا پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ساغر: بہت خوب، یحییٰ صاحب خیال کو میں بھی بنیادی حیثیت دیتا ہوں، لیکن شاعر کا رنگ و روغن محض الفاظ ہیں۔ تناسب، توازن، اور سلیقے کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہی شاعر کو ممتاز کرتا ہے، حسین اسلوب الفاظ کے نادر طریقۂ استعمال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی میں اس شاعر کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جو الفاظ کے گورکھ دھندے ہی میں الجھا رہے اور کوئی اچھوتا خیال یا جذبہ پیش کر سکے۔

انیس ہمیشہ اپنے موضوع اور بنیادی تخیل کے ماتحت الفاظ کو استعمال کرتا ہے۔ تراکیب و بندش کی چستی و پختگی اور ترتیب الفاظ سے جو ترنم پیدا ہوتا ہے وہی اسکی کامیابی کا ضامن ہے، شعر کا اصلی جوہر یہی ترنم لفظی ہے جو انیس کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ الفاظ کا ترنم انسانی شعور کو متوالا بنا دیتا ہے، سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیتا ہے۔ یعنی انیس کے کلام میں "آہنگ" ہے، جو حرکت و حرارت پیدا کرتی ہے۔ آپ خود غور فرمائیے مرثیہ نگاری غزل گوئی سے کتنی مختلف چیز ہے، غزل متفرق مضامین اور مختلف جذبات کا آئینہ ہوتی ہے مگر نظم میں ایک ہی عنوان اور ایک ہی موضوع کی مطابقت و مناسبت سے تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے، نظم مطلقاً جذبات، محسوسات یا مناظر اور چیزوں کی تصویر کشی کو کہتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تصویر میں اسکی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک برش، اچٹا یا رپٹا ہوا پڑا اور تصویر غلط، اسی لئے میرا دعویٰ ہے کہ انیس کا ہر نقش اپنے موضوع کے جزو و کل کا حقیقی اور مکمل مظہر ہوتا ہے۔

یحییٰ: میں اس کو تسلیم نہیں کرتا ـــــ اور

ساغر: (بات کاٹ کر) سنئیے۔ میں آپ کو انیس کے ایک مرثیہ میں صبح کے منظر کی مثال سناتا ہوں، وہ نہ صرف مشاہدات اور مناظر کی سچی تصویریں کھینچنے پر قادر ہے بلکہ انسانی نفسیات کے قدرتی تقاضات کا کامل ماہر ہے۔ دیکھئے اس سے تو آپ کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان کی قوتِ شامہ آنکھ سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔ اب سنئیے انیس کہتا ہے ؎

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار

سب سے پہلے اس نے ماحول کی طرف ایک عام اشارہ کیا؛ "وہ دشت" پھر نسیم کے جھونکوں کا ذکر کیا "وہ نسیم کے جھونکے" اسکے بعد وہ منظر کی چھوٹی باتوں کی طرف متوجہ ہوا "وہ سبزہ زار"

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں میں جابجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار.

چوتھے مصرع میں ایسا منظر نظم کرتا ہے جس پر نگاہ جم کر رہ جاتی ہے ؎

بالائے نخل ایک جو بُلبُل، تو گل ہزار

تجنیس لفظی صنعتِ تضاد، صنائع بدائع اور اسی قسم کے محاسنِ کلام خود بخود اسکے قلم سے ضمنی طور پر برس پڑتے ہیں پھر اس ٹیپ میں مرثیہ سے ربط یوں پیدا کرتا ہے ؎

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے — شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یحییٰ: فریب خوردۂ رنگینئ طلسمِ بہار — تجھے خبر بھی ہے کچھ اپنے آشیانے کی —!

میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ آپ بحث میں بیحد انتہا پسند ہو جاتے ہیں، خدا کے لئے یہ تو سوچئے کہ انیس جس صبح کی تصویر کشی کر رہا ہے وہ کشمیر کی صبح نہیں ہے کربلا کی صبح ہے جہاں ایک مظلوم کارواں، ایک بلازدہ قافلہ مصیبت میں گھرا ہوا ہے، تیروں کی بارش ہو رہی ہے، بھوک اور پیاس فضا پر چھائی ہوئی ہے، موت سر پر منڈلا رہی ہے، یہ کسی بہاریہ قصیدہ کی تشبیب ہے مرثیہ کی صبح ہرگز نہیں کربلا کی صبح کا نام لے کر سامعین کے دماغ پر کشمیر کی صبح کو منڈھ دینا شاعر کا نقص اور عجز ہے مگر میں ثابت کر سکتا ہوں کہ دبیر اپنے ماحول کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ وہ محل اور موقع کے لحاظ سے صبح کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو فطری اور قدرتی ہے؛ ؎

صبحِ [illegible] کا وہ جیبِ دریدہ تھا — یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا — یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہئے نہ مہر، صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

ساغر: بجا فرمایا، لیکن آپ نے ٹیپ کے پہلے مصرع میں اس گریز پر غور نہیں فرمایا ؎

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے

کربلا کی سرزمین پر ظلم و ستم کا منظر دن بدن وسیع اور خونیں ہوا ہے، انیس تو انیس کسی معمولی شاعر سے اتنی عظیم فنی غلطی نہیں ہوسکتی، یہ منظرِ صبح جس مرثیہ کا جزو ہے اس کا محل ...... ایسی ہی صبح دکھانا مقصود ہے، ورنہ انیس کا فکر و قلم کہیں عاجز نہیں۔ نظم کی محدود صنف مرثیہ کو انیس نے جو ہمہ گیری اور وسعت بخشی اس میں، ہرگز اس کا کوئی شریک نہیں۔ اچھا ذرا مرزا دبیر کا پہلا بند تو سنائیے

یحییٰ: سُنئے ؎

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازئ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک جب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

ساغر — خوب اسی پر آپ کا دعویٰ ہے کہ مرزا دبیر ماحول کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں صبح کا حسین و لطیف منظر، اور مقراض ابنہ صرف قیاس اور تصور سے بعید ہے بلکہ اس کا کوئی تعلق موضوع سے نہیں، تشبیہ و استعارہ جائز مگر ہر سچا شاعر وہ استعارات و تشبیہات سوچتا ہے جو اسکے عنوانِ نظم سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں کسی شہزادی کو جنگلی عورت کا لباس اور کسی جنگلی عورت کو شہزادی کی پوشاک پہنا دینا کسی شاعر کے لئے ہرگز ماحول کی نمائندگی کرنے کے ہم معنیٰ نہیں ۔

یحییٰ — (بات کاٹ کر) ساغر صاحب ذرا سنبھل کر فرمائیے ۔ اس فقرہ نے میر انیس کی تمام منظر نگاری اور نفسیات کی ترجمانی کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ اب صبح کی لذت، اہلِ بیت کے حرم کا طریقِ شیون، کربلا کی سرزمین سے منتقل ہو کر شاہانِ اودھ کی محل سرا اور بنارس کی گنگا کے کنارے میں تبدیل ہو گیا ہے ۔

ساغر — جی نہیں، انیس اپنی جگہ اٹل ہے شاعر کو ہر قسم کی جائز اور مناسب خلاقی کا حق حاصل ہے لیکن انیس کی شاعرانہ خلاقی بھی کبھی ماحول کیخلاف نہیں ہوتی، شاعر کا کام در اصل جذبات پیدا کرنا ہوتا ہے انسانی روح کبھی گرم نہیں ہوتی جبتک وہ کامل طور پر متاثر نہو جائے اور ہرگز متاثر نہیں ہو سکتی جبتک اس کو مشاہدہ نہ ہو جائے انیس روحِ انسانی کے سامنے اپنے موضوع و مقصد کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے جس میں تصویر اور خود انیس کی شاعرانہ جادوگری کارفرما ہوتی ہے، مگر مرزا دبیر موضوع کی صحیح نمائندگی پُر جوش الفاظ میں نہیں کرتے ۔ موضوع کے ساز و سامان کو ہاتھ نہیں لگاتے اور اپنے دماغ سے دور از کار تشبیہات و استعارات پیدا کرتے ہیں ۔ اس کا نام آپ نے بلاغت اور علم بدیع رکھا ہے ۔

یحییٰ — سُنئے ساغر صاحب علمِ کلام میں انیس کا مرتبہ فصاحت پر پوری قدرت رکھنے تک محدود ہے ۔ تاہم دبیر جب سلیس ہو جاتا ہے تو اپنا جواب نہیں رکھتا ۔ بے ساختگی، سلاست اور روانی ملاحظہ ہو ۔ ایک سلام میں کہتا ہے کہ ؎

خدا بھی ملا، پنجتن بھی ملے — پھر اب اور بندہ کو کیا چاہئے

ایک دوسری جگہ کہتا ہے ؎

ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا — ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا — آئینہ گر اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشہ کا ہُما ہو نہیں سکتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں سکتا

حقیقتاً میں نے جو ابتدا میں عرض کیا تھا اس پر آپ نے غور نہیں فرمایا ۔ انیس و دبیر کا موازنہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ غالب و داغ کا مقابلہ !

ساغر — (بات کاٹ کر) غالب ان دونوں میں کون ہے ؟

یحییٰ — یہ خود ظاہر ہو جائیگا ۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ موازنہ صحیح نہیں ہے، ظاہر ہے کہ زبان کی چاشنی دیکھنا ہو تو داغ کے ہر مصرع سے آپ لذت حاصل کر سکتے ہیں ۔ لیکن مضمون آفرینی دقیق فکر، اور رہوس خیالات کو آپ غالب کے کلام ہی میں پا سکتے ہیں صبح سے شام تک آپ غالب کی زبان پر اعتراض کرتے رہئے لیکن داغ کو غالب کا ہم پلّہ کہنے کی جرأت نہیں فرما سکتے ۔ انیس روحِ انسانی کو اپنی سلاستِ منظر نگاری اور حُسنِ بیان کے ذریعہ مسحور کر لیتا ہے، مگر یہ اثر کچھ دیرپا نہیں ہوتا ۔ مگر دبیر مرثیہ کے

مفہوم کو سمجھتے ہوئے منظر نگاری، سلاست کو مرثیہ میں اتنی ہی جگہ دیتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکے نزدیک اہلِ بیت کے مصائب زیادہ اہم ہیں۔ شاعرانہ مصوّری اتنی اہمیت نہیں رکھتی، محاورات نگاری اور زبان کی صحت دبیر کا حصّہ ہے۔ عبدالغفور نسّاخ نے انیس کے کلام میں محاورات کی جو غلطیاں ثابت کی ہیں وہ آپ نے پڑھی ہیں۔ مرثیہ کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں دبیر کی بلند خیالی پر کبھی آپ نے توجہ نہیں کی۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے تصوّف کے میدان میں بھی جو فارسی و اُردو شعراء کی جولانگاہ رہا ہے اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ میر انیس کہتے ہیں کہ ؎

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں | یا معدن و کوہ و دشت وصحرا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے | حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دبیر کہتے ہیں ؎

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے | بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا | جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

آپ نے دیکھا انیس کا عجز، مقامِ حیرت میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے دبیر کی سرمستی اور عرفان اسکی رباعی کے حرف حرف سے ٹپک رہا ہے مقصد یہ ہے کہ دبیر فصاحت اور موسیقی ہی پر زور نہیں دیتا، وہ مقصد اور مدعا کو بلاغت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور یہی اس کے کلام کی خوبی ہے۔

ساغر میں جانتا ہوں یہ ہرگز کلام کی خوبی نہیں، سرمستی دوسری بات ہے مگر عرفان کا کس کو دعویٰ ہو سکتا ہے "جلوہ" کہکر حیرت نہ کہنا شعریت کے قطعی منافی ہے۔ جلوہ اگر حیرت نہ پیدا کرے تو جلوہ کہاں رہا۔ انیس اس ربطِ معنوی کو اپنی رباعی میں پیش نظر رکھتا ہے مگر دبیر کی فکر بلیغ بے حسوں کی طرح گذر جاتی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ ہر صنفِ کلام پر انیس یکساں قادر ہے۔ رباعی، مرثیہ، غزل، رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ اور سلام میں اسکی زبان کی سادگی، سلاست، فصاحت، سوز و گداز، مصوّری، روزمرہ اور خاص طور پر محاورات غرضکہ اس کی جملہ خصوصیات کا ثبات مستقل طور پر قائم رہتا ہے۔ افسوس وقت نہیں ورنہ نسّاخ کے رسالے اور اعتراض کا مفصّل ذکر کرتا مگر واقعہ یہ ہے کہ انیس الفاظ و تخیل، بیان و معانی، جذبات و محسوسات، ہر نقدِ سخن کا گوہر شناس جوہری ہے۔ آپ کہتے ہیں شاعرانہ مصوّری، انیس کے کلام میں مرثیہ کی اہمیت کو کم کر دیتی ہے، کیا خوب، تو پھر شاعری ہی کی کیا ضرورت ہے، فنِ خطابت کے جملہ محاسن اور آرٹ کے تمام شعبے فنا کر دینے چاہئیں۔ غالب و داغ سے انیس و دبیر کی مثال آپ نے خوب پیش کی، مرزا داغ کا تو ذکر ہی کیا ایک بلند مرتبہ آرٹسٹ کی حیثیت میں غالب بھی انیس کے ساتھ نہیں بٹھائے جا سکتے، وہ اپنی مملکتِ ادب کا بلا شرکت غیرے آزاد بادشاہ ہے، یحییٰ صاحب اس کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور قیامت تک بولتا رہے گا: بہت ممکن ہے اس کے موضوع میں کشش نہ رہے مگر اس کا آرٹ فنا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اسکے آرٹ کے ترکیبی اجزا و عناصر معیار و صحت پر مبنی ہیں۔

یحییٰ مگر دبیر بھی زندہ رہے گا۔

ساغر اس کی خبر آپ کو ہوگی۔ مگر مرزا دبیر کو انکی جگہ میں ایک بڑا شاعر ضرور مانتا ہوں۔

کارسازیاں

بربطِ اشک پر اُنہیں نغمۂ غم سُنا دیا — جو نہ زبان سے گا سکے اسکو نظر سے گا دیا

پھر تو کہو کہ کیا تجھے ہم نے یہ کم صلہ دیا — پیکرِ کیف کر دیا، صاحبِ غم بنا دیا

اُس نے جو زعمِ حسن میں رُخ سے نقاب اُٹھا دیا — ہم نے بھی شوقِ دید میں دل کو نظر بنا دیا

پھول نے صبحدم بہت درسِ غمِ فنا دیا — کیفِ شگفت نے مگر کلیوں کو گُدگُدا دیا

سنگ کو بُت کی شکل دی صنعتِ بُت تراش نے — میں نے مگر تراش کر بُت کو خدا بنا دیا

یادِ غریب جرم تھی کفر تھی دینِ حسن میں
اب ہیں یہ کیوں صفائیاں خوب کیا بھلا دیا

ساغر

مشرقی کتب خانہ بانکی پور پٹنہ

اور

اسکے چند لوازمات

(مختار الدین احمد آرزو فاضل شمسی)

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ شاہانِ مغلیہ کو علم و ادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ، اور قرطبہ کے حکمرانوں کی طرح عظمت و شہرت حاصل نہیں ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو انہوں نے علماء کی ہمت افزائی میں نمایاں حصہ لیا، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علماء اسی مغلیہ دورِ حکومت میں آسمانِ علم پر مہرِ درخشاں ہو کر چمکے اور مغل تاجداروں کی فیاضیوں سے مالامال ہوئے، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی، بانیٔ سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا اسکے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، ہمایوں بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علماء کی قدر افزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگرچہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اسکی علم برداری دیکھنا ہو تو آئین اکبری کے آخری ابواب پڑھو، جہانگیر اپنے توزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف و زلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا، صرف اسی ایک واقعہ سے تم اسکی علمی قدردانی کا اندازہ کرو، کتب خانۂ مشرق، نیز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہجہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہدِ طفولیت ہی سے بادۂ علم میں سرشار تھا، اورنگ زیب عالمگیر خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا۔ اسکے رقعات میں علمی قدردانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہانِ مغلیہ کی نوازش و کرم گستری سے دہلی علم و ہنر کا مرکز بن گئی تھی۔ دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں خطاطی و مصوری کے بہترین نمونے تیار کئے گئے اور چونکہ ان دنوں وسط ایشیا و ایران اور عرب میں طوائف الملوکی اور خونریز لڑائیاں غیر منتہی سلسلہ قائم کئے ہوئے تھیں اس لئے وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی منتقل ہو گئے۔ پھر دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست و نابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہو گئے امراء و اہالیانِ منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہو کر شہنشاہی کتب خانہ سے ضم ہو جاتے تھے۔ چنانچہ دربار اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے وفات پائی تو ان کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہو گئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت و ندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا، اٹھارویں

صدی میں نوابانِ اودھ نے بھی قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی، ریزیڈنٹ کی ایما سے مشہور جرمن مستشرق مسٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کے اُردو اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کُتب خانوں کے علاوہ اطراف و اکناف ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور غدر کی ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانوں کے تمام قابلِ ذکر علمی خزانے غارتگروں کے دستِ تظلّم سے تباہ برباد ہو گئے۔

غدر کے موقعہ پر نواب رامپور نے انگریزوں کا ساتھ دیا اس لئے لوٹ کا ایک معتد بہ حصّہ انہیں دستیاب ہوا۔ انہوں نے انگریزی فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دے گا اسے ہر قلمی نسخہ کے معاوضہ میں ایک روپیہ ملیگا۔

بہرکیف یہ تو سلف کی باتیں تھیں لیکن خلف میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوئے جن سے سلف کی یاد تازہ تھی۔

بہار کے ایک شہر چھپرہ میں ایک وکیل محمد بخش تھے جنہیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا اور اس شوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرتے وقت حالتِ نزع میں بھی کتابیں ہی ان کے پیش نظر رہیں۔ اپنے لائق فرزند خدا بخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کُتب خانہ کو ترقی دیکر رفاہ عام کے لئے وقف کر دیا جائے۔

خدا بخش مرحوم ۲ اگست ۱۸۴۲ء میں چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں کلکتہ تعلیم کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کی سرٹیفکٹ حاصل کی۔ میٹرک پاس کر نیکے بعد ڈسٹرکٹ جج کے پیشکار ہوئے لیکن کسی مجبوری سے اسے چھوڑنا پڑا۔ اسکے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے لیکن آخر اس سے بھی الگ ہونا پڑا۔ آخرکار ۱۸۶۶ء میں وکالت شروع کی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ ملا۔ ۱۸۹۱ء میں مشرقی کُتب خانہ کی بُنیاد ڈالی اور ۲۹ راکتوبر کو پورا کُتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامہ کی رو سے حکومتِ وقت کی سرپرستی میں قوم و ملک کے حوالہ کر دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں نظام حیدرآباد میں چیف جسٹس مقرر ہوئے اور تین برس کی مدت ختم ہو جانیکے بعد ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے پٹنہ آکر پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۳ء میں سی آئی آئی کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دوسو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر کتب خانہ کی نظامت تفویض ہوئی۔ لیکن افسوس کہ کتب خانہ کے ناظم کی حیثیت سے ابھی پانچ ہی سال رہے تھے کہ ۳ راگست ۱۹۰۸ء کی ایک بجے شب کو ۶۲ برس کی عمر میں پٹنہ میں انتقال کر گئے۔ لائبریری کی دونوں عمارتوں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی حسبِ وصیت وہیں دفن کئے گئے۔

۸۳

کتابوں کے جمع کرنے میں کہا جاتا ہے کہ خدا بخش مرحوم کو فرشتوں سے بڑی مدد ملی، یہ فسانہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کتب خانہ کو محمد مکّی (عرب) سے بڑی مدد ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا بخش مرحوم نے انہیں پچاس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا تھا۔ انہوں نے عرب، شام، مصر، ایران کی نادر نادر قلمی کتابوں کا کافی ذخیرہ لاکر ڈھیر کر دیا۔ اور خود خدا بخش مرحوم نے دورانِ قیام حیدرآباد میں اپنے کتب خانہ کیلئے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت بھی خدا بخش مرحوم کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کتب خانہ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کر کے کتب خانہ کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انہیں لاہور لیجا کر ایک کتب فروش کے حوالہ کیا۔ مؤخر الذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کر کے خدا بخش خاں سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدرداں، اور کون ہو سکتا ہے انہیں کے پاس بغرض فروخت پیش کیا۔ اس طرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدائی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنو۔ ایک مرتبہ پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے، بی، ایلیٹ نے محمد بخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا، صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اس کو واپس دینے کے بجائے ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے محمد بخش مرحوم نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے، صبر کر کے خاموش ہو رہے۔ مسٹر ایلیٹ مخطوطات کے

۸۳؎ ندیم جلد ۵ نمبر ۲ و ۳ -

جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے انہوں نے "بوڈلین لائبریری" میں بہت سی کتابیں دیں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر پٹنہ سے جانے لگے تو انہوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لیجانے کے لئے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کراکے ہدایت کی کہ انہیں اسی طرح سربمہر نیلام کردیا جائے مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردّی کتابوں کا صندوق ایلیٹ صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہوجاتا ہے، محمد بخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اسمیں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سی نادرونایاب جوہرگراں مایہ پاتے ہیں۔ چنانچہ "مجالس خمسہ" کا وہ نسخہ جسپر شاہ جہاں کے دستخط ہیں اسی میں ملتا ہے۔ خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً ازراہِ تشکر سربسجود ہوجاتے ہیں، دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہنچ کر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں تو فرطِ غم سے دم بخود ہوجاتے ہیں۔

ایک دن خدابخش مرحوم حیدرآباد میں ہائی کورٹ سے واپس آرہے تھے مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دکانوں پر اِدھر اُدھر پڑ رہی تھیں، ایک دکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا فوراً گاڑی رکواکر اُتر پڑے۔ اس کوڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور دکاندار سے قیمت دریافت کی اس نے کہا حضور! اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھ کر اس کو تین روپے میں دیدیتا مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہے تو اس میں یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لونگا۔ پورا انبار خرید کر ساتھ لائے، اس میں چند نہایت نادرونایاب کتابیں نکلیں۔ بعد کو صرف ایک کتاب کیلئے نظام حیدرآباد کی طرف سے چارسو روپیہ پیش کئے گئے مگر انہوں نے دینے سے انکار کردیا۔ اسی طرح "برٹش میوزیم" کسی کتاب کی ایک گراں قدر رقم دے رہی تھی لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا کہ میں اپنے لالچ کا شکار ہوکر اپنے والد کی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتا۔

خدابخش مرحوم کو کتب خانہ سے جو انہماک تھا اس کے بیان کیلئے تو ایک دفتر چاہیئے لیکن اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وفات سے دو دن پہلے جبکہ مرض نہایت شدت پر تھا اور حواس خمسہ جواب دے رہے تھے انہوں نے صحیح طور پر بتادیا کہ سنن ابوداؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانہ میں فلاں کتاب کے بعد ہے۔

کتابوں کی تعداد محمد بخش مرحوم کے انتقال کے وقت پندرہ سو تھی۔ بارہ سو (۱۲۰۰) محمد بخش مرحوم کی حاصل کردہ تھیں اور تین سو انہیں وراثت میں ملی تھیں۔ خدابخش مرحوم نے ترقی دیکر پانچہزار تک پہنچادیا۔

تفصیل حسب ذیل ہے: —

نسخ خط عربی	۲۹۵۱
نسخ خط فارسی	۲۵۰۰ (تقریباً)
نسخ خط اردو	۵۶
نسخ خط ترکی	۱۵

مجموعہ پانچہزار پانچ سو بائیس (۵۵۲۲)

۱۸۹۱ء میں جبکہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھی، سر الفریڈ کرافٹ (Sir Alfred Croft) کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اسکی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کیا تھا، قلمی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو، اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتد بہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا ہے جس کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

لیکن یہ اعداد و شمار خدابخش مرحوم کی وفات کے وقت کی تھی مگر اب اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت

کے مطابق ان کی سات ہزار تین سو (۷۳۰۰) کتابیں بھی اس کتب خانہ میں منتقل ہو گئی ہیں اور اس طرح عربی فارسی اُردو اور انگریزی مطبوعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، سر دست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) ہے۔

مشرقی کتب خانہ (بانکی پور) کی کتابوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ اگر دنیا کے دوسرے اہم کتب خانوں کے اعداد و شمار بھی لکھ دوں تو مناسب ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس	۲۹۸۸
موزیۂ برطانیہ لندن	۲۹۶۱
کتب خانہ بودلین	۲۰۲۰
کتب خانہ برلن	۱۰۹۸
کتب خانہ پارس	۱۱۶۰
کتب خانہ سعیدیہ حیدر آباد دکن	۳۰۵۲

نقشۂ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں ان تمام کتب خانوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اب میں قارئین "ایشیا" کی ضیافت طبع کیلئے چند اہم اور نادر کتابوں کا ذکر کرتا ہوں امید کہ یہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

اس کتب خانہ میں عربی کتابوں کا بہت ہی کافی ذخیرہ ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ان کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے "مشتے نمونہ از خروارے" چند عربی کتابوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن شریف۔ اس کتب خانہ میں قرآن پاک کے کئی قیمتی نسخے موجود ہیں، ایک حمائل خط کوفی میں لکھا ہوا ہے خیال کیا جاتا ہے چوتھی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، اعراب کیلئے سرخ نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔

ایک قرآن شریف جمال الدین یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قرآن خطاطی کا بہترین نمونہ ہے یہ ۶۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک مصحف میر علی تبریزی کا لکھا ہوا ہے، اس نسخہ کی خطاطی، طلاکاری، منقش حواشی اور زرنگار بین السطور کو دیکھ کر زمانہ ماضیہ کی صناعی پر انسان محو حیرت ہوتا ہے۔

ایک مصحف عبد الباقی حداد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عبد الباقی فن خطاطی میں یگانۂ روزگار تھے شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور یہیں انہیں "یاقوت رقم" کا خطاب ملا۔ اس مصحف کے علاوہ اور مصاحف اور پنجسورے اس کتب خانہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں

"تفسیر" فن تفسیر میں بھی بیشمار قیمتی ذخیرے موجود ہیں جار اللہ زمخشری کی مشہور آفاق تصنیف "کشاف" کا ایک قلمی نسخہ ہے جو سلطان شاہ رخ کے کتب خانہ کیلئے لکھا گیا تھا، ابو بکر محمد بن احمد سمرقندی کی شرح التاویلات بھی یہاں موجود ہے۔ سیوطی کی اتقان کا یہاں ایک نسخہ ان کے شاگرد محمد بن علی الداؤدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

"حدیث شریف" فن حدیث میں خطیب بغدادی کی الکفایۃ کا وہ قیمتی نسخہ ہے جس میں شاہزادہ ابو العباس احمد نے درس لیا ہے "کتاب المشیخۃ" دنیا میں اس کا کوئی نسخہ نہیں لیکن یہاں اس کا نہایت قدیم اور مکمل نسخہ موجود ہے۔

متعلقات حدیث میں ایک نادر کتاب بہت زیادہ قابل ذکر ہے، اس کا نام کتاب الاغتباط بمن رمی بالاختلاط ہے اسکے مصنف امام برہان الدین ابراہیم ابن محمد سبط ابن العجمی الحلبی ہیں۔ یہ چھوٹا سا اک مختصر رسالہ ہے جس میں اُن ۱۰۴ راویوں کا بیان ہے جن سے اختلاط ثابت ہے۔ کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

اس میں صرف جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکبر و جہانگیر دونوں کی حالت بسط کے ساتھ موجود ہے، ہاں کتاب کا نام اقبال نامۂ جہانگیری لکھنے کی وجہ مصنّف کے زبانِ قلم سے سُنیئے :۔

"چوں این تالیف بنام نامی آں حضرت زیب دفتر یافتہ بہ اقبال نامۂ جہانگیری موسوم گشت"۔ دیباچہ ص۳

اس کتاب کی تین جلدیں ہیں پہلی جلد میں اکبر کے آباؤ اجداد کی تاریخ ہے جو اکبر نامہ سے کچھ تصرف کر کے لکھی گئی ہے اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے "طلوع کوکب بیاں افروز یعنی ولادت باسعادت حضرت خاقانی" الخ

دوسری جلد میں اکبر کے آغاز جلوس سے سنہ وفات تک کے حالات درج ہیں اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے "سلسلۂ انتظام کارگاہ آفرینش کہ مظاہر حقیقت نمائی" الخ

تیسری جلد میں جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ ہے اور یہ یوں شروع ہوتا ہے "شائستہ سریر سلطنت و فرماں روائی و زیبندہ افسر" الخ

اقبال نامہ کی تینوں جلدوں میں سے جلد سوئم جس کا تعلق جہانگیر کے ایام حکومت سے ہے عام طور پر ملتی ہے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں اسکے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں لیکن اقبال نامہ کی پہلی اور دوسری جلد بے حد نادر اور کمیاب ہے۔ ریو نے پہلی جلد اقبال نامہ کو بہت کمیاب لکھا ہے، پروفیسر بینی پرشاد نے بھی اپنی کتاب (History of Jahangeer) میں پہلی دو جلدوں کی کمیابی کی تصریح کی ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر کیٹیلاگ مشرقی کتب خانہ پٹنہ نے بھی لکھا ہے کہ اسکی پہلی دو جلدیں بہت کمیاب ہیں۔

بوڈلین، کیمبرج، اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں صرف جلد سوئم کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں اقبال نامہ کا ایک مکمل نسخہ موجود ہے، جس کا نمبر ۱۰۹ ہے۔

اقبال نامہ جلد اوّل و دوم کے کئی نسخے دُنیا میں اور بھی ہیں[۵] لیکن مشرقی کتب خانہ کے نسخہ کو اس بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ تقریبًا سبھوں میں سب سے زیادہ صحیح لکھا ہوا ہے۔

اقبال نامۂ جہانگیری کے سال کتابت کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ بعض مخطوطے ایسے ہیں جن پر سرے سے سنہ کتابت ہی درج نہیں، جس پر ہے بھی تو وہ اتنا مبہم ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

"انڈیا آفس" میں بھی جلد اوّل و دوم کے مکمل نسخے پر سنہ ہجری یا عیسوی درج نہیں بلکہ دس ربیع الاوّل ۱۹ سال جلوس رقم ہے اس سے "ایتھے" نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ غالبًا جلوس عالمگیری ہوگا، اس حساب سے سنہ کتابت ۱۰۸۶ھ قرار پاتا ہے مگر ممکن ہے کہ یہ سنہ جلوس محمد شاہ یا شاہ عالمگیر ثانی کا ہو جنہوں نے ۱۹ سال سے زیادہ حکمرانی کی ہے۔ اس بنا پر ۱۰۸۶ھ یقینی طور پر سنہ کتابت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انڈیا آفس کی جلد دوئم پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے[۶]۔

مشرقی کتب خانہ بانکی پور کے مکمل نسخہ پر بھی سنہ کتابت درج نہیں، اس کتب خانہ میں جلد اوّل کا بھی ایک مکمل نسخہ ہے لیکن افسوس کہ سال کتابت اس پر بھی درج نہیں ہے[۷]۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڈھ لائبریری میں اقبال نامہ کے بعض نسخے ہیں جن پر سال کتابت ۱۱۰۳ھ مطابق ۳۵ سنہ جلوس عالمگیری لکھا ہے۔

---

[۵] اس کا ایک مکمل نسخہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں بھی ہے۔ یہ نسخہ خوشخط فارسی جلی قلم سے لکھا گیا ہے، عنوان مطلا و لاجوردی اوّل سے آخر تک تمام اوراق سنہری جدولوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ابتدائی ورق تو بالکل مطلا ہیں ہر ہر سطر کو سونے سے معمور کیا گیا ہے اسکی تذہیب و آرائش شاندار اور عظیم القدر ہے اس نسخہ کی ایک خاص چیز جو دوسرے نسخوں میں نہیں پائی جاتی شجرہ سلاطین مغلیہ ہے۔ جو قبل آغاز کتاب لکھا ہوا ہے ہر ایک نام زریں حلقے میں ہے حاشیہ کے نام بھی حلقہ نوریں میں تحریر کئے گئے ہیں۔

[۶] فہرست انڈیا آفس لائبریری کالم ۱۲۱ تا ۱۲۳۔ [۷] ریو جلد سوم صفحہ ۹۲۲ تا ۹۲۳ (مختار الدین آرزو)

مشرقی کتب خانہ کا مکمل مخطوطہ جس کا نمبر ۱۰۹ ہے اس کتاب کے پہلے صفحہ پر جسے ٹائٹل پیج سمجھئے اسپر چند اصحاب کے دستخط ہیں ایک جگہ لکھا ہوا ہے: "مالک این کتاب مرزا امداد علی" دوسری جگہ ذرا ہٹکر لکھا ہوا ہے: "سید ولایت علی خاں" دوسرے صفحہ پر سید خورشید علی صاحب کے دستخط ہیں۔ دستخط کے اوپر لکھا ہوا ہے "وقف عوام" کتاب کی ابتدا میں خورشید علی اور ولایت علی دونوں صاحبوں کی مہریں بھی ہیں۔ بسم اللہ کے بعد یہ عبارت ہے:۔

"منتہائے حمد ما منتہا خدا یا بے ہمتا کہ ما را خلعت وجود کرامت فرمود، در عہد بادشاہ عادل کامل حکیم کریم کہ روزگار را او عروسی را ماند آراستہ وچار چمن ملک ہوشیار عدالت او پیراستہ، و درود نا محدود بر سپہ سالار جہان ہستی کہ ما را از پستی جہالت بفراز ایمان برآورد و سلام و اخلاص بر آل و اصحاب واجمعین"۔

صفحات کی تعداد ۶۸۰ ہے کتاب معمولی نستعلیق میں لکھی گئی ہے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کئی کاتبوں نے مل کر لکھی ہے اس لئے کہ حروف میں جا بجا بہت فرق نظر آتا ہے۔

"کلیات جامی"۔ مشرقی کتب خانہ میں کلیات جامی کا جو نسخہ ہے اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی پہلی جلد خود مؤلف (جامیؒ) کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ اسکی دوسری جلد سینٹ پیٹرسبرگ کے کتب خانہ میں تھی معلوم نہیں جنگ عظیم کے بعد اسکا کیا حشر ہوا۔

اس کتاب کی دو ضخیم جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۹ رسالوں کا مجموعہ ہے۔ (۱) سلسلۃ الذہب (۲) سلامان والبیان (۳) تحفۃ الاحرار۔ (۴) لیلیٰ مجنوں۔ (۵) خردنامہ اسکندری۔ (۶) دیوان اوّل (۷) دیوان دوم۔ (۸) دیوان سوم (۹) معمائے کبیر (۱۰) معمائے متوسط۔ (۱۱) معمائے صغیر۔ (۱۲) معمائے تصغر۔ (۱۳) رسالہ عروض (۱۴) رسالہ قافیہ۔ (۱۵) بہارستان۔ (۱۶) رسالہ منشیات۔ (۱۷) سبحۃ الابرار۔ (۱۸) رسالۂ موسیقی۔ (۱۹) یوسف و زلیخا۔

دوسری جلد میں ۱۸ رسالے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) فاتحۃ الباب۔ (۲) چہل حدیث (۳) مسالک الحج۔ (۴) شواہد النبوۃ۔ (۵) نفحات الانس۔ (۶) لمعات۔ (۷) شرح قصیدہ میمیہ خمریہ۔ (۸) شرح رباعیات۔ (۹) لوائح۔ (۱۰) شرح بیتین، مثنوی۔ (۱۱) شرح بیت امیر خسرو۔ (۱۲) شرح حدیث۔ (۱۳) رسالہ ہدایۃ النہایہ۔ (۱۴) رسالہ طریق توجہ۔ (۱۵) رسالہ وجودیہ۔ (۱۶) رسالہ شرح کافیہ۔ (۱۷) رسالہ صرف۔

پہلی جلد میں زیادہ تر نظمیں ہیں، تعداد صفحات ۹۸۴ ہے۔ اسکی کتابت بہت پاکیزہ ہے۔ دوسری جلد میں ۷۹۶ صفحات ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق غائب معلوم ہوتے ہیں۔ جس صفحہ سے کوئی رسالہ شروع ہوتا ہے وہ مزیّن و مذہب ہوتا ہے۔

کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

"حمد الرب جلیل من عبد ذلیل، وسلاما علی حبیب فائق من محب صادق وعلی صحبہ و آلہ المہتدین"۔

عــ۵ عبد الغفور صاحب ایم۔ اے ایس سی علیگ معارف ج میں فرماتے ہیں:۔ جلد اول در ذکر اجداد خاقان گیتی ستاں صـ۳ سے صـ۱۲۴ تک۔ جلد دوم ۱۲۵ سے ۵۱۰ تک۔ اور جلد سوم ۵۱۱ سے ۶۱۸ تک چھپی ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ ان فاضل علمائے تاریخ پروفیسر راس، ریو، بینی پرشاد نے کیوں اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ راس صاحب نے تو فہرست مشرقی کتب خانہ میں یہ جملہ ایزاد بھی کیا ہے کہ جلد سوم عام طور سے ملتی ہے اور یہ لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء میں چھپ چکی ہے فاضل مستشرق کا اشارہ نولکشور پریس کے مطبوعہ نسخہ کی طرف ہے مگر یہ محض جلد سوم ہی نہیں بلکہ تینوں جلدوں کا مکمل مطبوعہ نسخہ ہے ۱۲ (مختار الدین احمد آرزو)

سلسلۃ الذہب کی ابتدا یوں ہے :۔

بسم الله الحمد قبل کل کلام
بصفات الجلال والاکرام

پہلی جلد ان سطروں پر ختم ہوتی ہے :۔

"والله سبحانه ملهم الصّواب ومنه المبدا والیه المآب وتیسر بذلك
الحمد لله رب العٰلمین والصّلوٰة والسّلام علی محمد وعلی آله واصحابه"

کلیات کے علاوہ جامی رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان بھی اکثر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ دیوان جامیؒ کا ایک نادر قلمی[1] نسخہ لافیٹ کالج پنسلونیا (امریکہ) کے کتب خانہ میں بھی محفوظ ہے۔ یہ دیوان جامی کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جامی کی ولادت جام (خراسان) میں ۷ رنومبر ۱۴۱۴ء کو ہوئی تھی اور وفات ہرات کے مقام میں ۹ رنومبر ۱۴۹۲ء کو پیش آئی، یہ نسخہ وفات کے صرف بتّیس سال بعد لکھا گیا اور اسے اس زمانہ کے دو مشہور ماہر فن نے تیار کیا یعنی مشہدی خوشنویس اور محمود مذہب طلاکار۔

اس دیوان میں قصیدے، غزلیں اور رباعیاں ہیں صفحات کی تعداد ۳۵۱ ہے، چار تصویریں بھی ہیں، پہلی تصویر میں جامی ایک فلسفی سے باتیں کررہے ہیں۔ زاویہ میں مصوّر کا دستخط اور یہ عبارت ہے :۔ "اسے محمود مذہب نے بنایا" دوسری تصویر میں ملازمین باغ میں ایک دعوت کا سامان کررہے ہیں اور ایک فقیر بچّہ کو لئے ہوئے ان کو دیکھ رہا ہے۔ تیسری تصویر میں ایران کا سلطانؒ حسین بایقرا اپنے درباریوں اور بعض علماء کے حلقہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ چوتھی تصویر میں ایک اُستاد اپنے شاگردوں کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ تحریر ہے :۔

"اس مخطوط کو سلطان علی مشہدی نے بمقام ہرات ۹۲۱ھ مطابق ۱۵۱۵ء میں ختم کیا"

یہ مخطوط اوّل بابر کیلئے تیار کیا گیا تھا اسکی وفات کے بعد اسکے جانشینوں کے شاہی کتب خانہ میں رہا۔ اس پر جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب کے دستخط ثبت ہیں۔ پھر ایک عطیہ شاہی کی حیثیت سے بعض صوبوں کے حکمرانوں کے پاس رہا اور ان میں سے ایک کے کتب خانہ میں ۱۸۵۷ء تک محفوظ رہا اس وقت دوسرے سامانوں کے ساتھ یہ بھی ضبط کرلیا گیا۔ اور جیمس اسکاٹ (James Long Scott) نام ایک امریکن مشنری نے اس کو نیلام میں خرید لیا اور لافیٹ کالج میں یہ نسخہ اسی کا عطیہ ہے۔

"یوسف وزلیخا" جامی کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ ۹۳۰ھ کا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اسکی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے ہیں، خان خاناں عبدالرحیم نے اس کو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی اسکی قیمت ایک ہزار سنہری سکّے تھی۔

اس کتاب کا دوسرا نسخہ مورخہ ۱۰۱۰ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو شاہ عباس بادشاہ ایران کے زمانہ میں کافی مشہور ہوچکا ہے، اس نسخہ کی تکمیل کے سات سال بعد وہ ۱۶۱۵ء میں قتل کردیا گیا۔ اس نسخہ کی اعلیٰ خطاطی مصوّری اور مطلا اور مذہب نقاشی دیکھ کر عقل انسانی متحیّر ہوجاتی ہے۔

"تاریخ خاندان تیموریہ" مصنف کا نام صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب اکبر اعظم کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تیمور سے اکبر اعظم کی حکومت کے اُنیسویں سال تک کے واقعات مندرج ہیں، تاریخی حیثیت سے تو شاید نہیں لیکن آرٹ کے لحاظ سے اس کتاب کا پلّہ بہت بلند ہے۔ پوری کتاب میں ۱۱۷ تصویریں ہیں اور ہر تصویر میں مصوّر نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ جس میں تیرہ تو آگرے کے دربار کے مصوّرین ہیں اور بقیہ دوسرے۔ ان تصویروں میں بساؤں اور مسکین تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابل فکر ہیں

[1] معارف ج ۳۵ ص

ابتدائے کتاب میں شاہجہاں کے ہاتھ کی ایک تحریر اور کئی مہریں بھی ہیں، اسی کے ایک گوشہ میں "وارن ہیسٹنگس" کے زمانہ کے مشہور مورخ فرانسیسی گلیڈوین کی دستخط ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے قبضہ میں بھی یہ کتاب رہی ہے، اسی صفحہ پر ایک اور مختصر سی تحریر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔

"شہنشاہ نامہ" اس کا مصنف حسینی ہے۔ یہ ترکوں کی تاریخ میں سولہویں صدی میں لکھی گئی، یہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے، یہ نسخہ سلطان محمد ثالث کیلئے مصنف نے خود مرتب کیا، سلطان کے نام سے معنون کیا اور شاہی کتب خانہ میں داخل رہا، کچھ عرصہ تک قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانہ میں رہنے کے بعد شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پہنچا، اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اس کا پہلا صفحہ دستخط اور مہروں سے بھرا پڑا ہے، سب میں نایاب دستخط ممتاز محل کی لاڈلی بیٹی جہاں آرا کے ہیں۔ اس نسخہ کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل جداگانہ ہیں ان میں بازنطینی اثر نمایاں ہے۔ شہنشاہ نامہ مشرقی کتب خانہ کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

"دیوان حافظ" اس کتب خانہ میں دیوان حافظ کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ مشہور نسخہ ہے جسے ہمایوں جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں نے بارہا فال کھولنے کے لئے استعمال کیا ہے اور جابجا حاشیہ پر حسب حال اشعار کو اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا ہے ابتدائے کتاب میں سلطان حسین بیقرہ اور دوسرے سلاطین و امرا کے دستخط ہیں۔ دیوان حافظ کے یہاں اور بھی متعدد نسخے موجود ہیں ایک نسخہ مورخہ ۹۵۱ھ ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ سنہ ۱۰۳۳ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانہ کیلئے محمد محسن خوشنویس نے لکھا تھا، یہ نسخہ فتح گولکنڈہ کے بعد اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا، اس کا تیسرا نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو مطلا ہے اور زریں عنوان اور پاکیزہ تصویر سے آراستہ ہے۔؎

۹۱

"جہانگیر نامہ" یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جہانگیر نے توزک جہانگیر کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ بھی لکھی ہے۔ اسکے نسخے بہت ہی کمیاب ہیں۔ اس کتب خانہ میں اس کا وہ نسخہ ہے جس کو سنہ ۱۰۲۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہ گولکنڈہ کے پاس بھیجا تھا۔ گولکنڈہ کے مفتوح ہونے کے بعد سلطان محمد کے قبضہ میں آیا۔ چنانچہ اسکے اول صفحہ پر شہزادہ موصوف کے دستخط بھی ہیں۔

اس نام کی ایک کتاب اور بھی یہاں موجود ہے۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

اے نام تو سر دفتر اسرارِ وجود — نقش صنعت بر در و دیوار وجود

در پردہ کبریا نہاں گشتہ زخلق — بے خود عیاں بر سر بازار وجود

"کلیات سعدی" کلیات کے بھی کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ ایک نسخہ پندرہویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے ایک نسخہ کسی شیرازی خوشنویس نے لکھا ہے۔ یہ کلیات سعدی کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا ہے۔

کلیات سعدی کا ایک نادر الوجود مخطوط حضرت مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری پروفیسر ہیئت و حدیث جامعہ شمس الہدیٰ پٹنہ

ملسہ؎ ان نسخوں کے علاوہ ایک نسخہ ابھی حال میں خدا بخش مرحوم کے صاحبزادے مسٹر شہاب الدین خدا بخش لندن سے لائے ہیں۔ یہ نفیس خوبصورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ حاشیہ مذہب ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ شہاب الدین صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ نسخہ ۱۵ اشرفیوں کو لندن میں نیلام میں لیا تھا۔ (مختار الدین)

کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ کتابت نستعلیق ہے۔ حروف بہت واضح اور خوشخط ہیں۔ کلیات میں غزل، قطعہ، رباعی سبھی کچھ ہے
کتاب کے پہلے صفحہ پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے "دو صد و سی ورق است" نیچے دو دستخط بھی ہیں۔ ایک حسین خاں گرامی کا اور دوسرا
عبدالحسین کا، ایک گوشہ میں وارن ہیسٹنگس کے عہد کا مشہور فرانسیسی مورخ گلیڈوین کے دستخط ہیں،
انگریزی میں ایک دستخط اور ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔

اس کتاب پر امجد علی شاہ، شاہ نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کی بھی مہریں ہیں۔ امجد علی شاہ کی مہر میں یہ شعر پڑھا جاتا ہے[۵]

ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہِ زماں عالی جناب

انگریزی دستخط صاف پڑھا نہیں جاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ جارج ہیلی کا ہو۔

ان کتابوں کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی، سہ دیوان خسرو، دیوان امیر خسرو، مطلع الانوار۔ ہفت بند کاشی۔ بادشاہنامہ۔ سیرتِ فیروز شاہی۔ دیوان رکن صائن، دیوان اثیر اومانی۔ تاریخ ابوالخیر خانی۔ عرفات العاشقین خلاصۃ الاشعار۔ دیوان علی نقی کرد مکاتبات علامی، جواہر العلوم وغیرہ بھی بہت زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔

جذبۂ عیاںؔ

۹۲

ہنگامۂ عالم ہمہ ممنونِ ادا ہے
کوئی پسِ آئینہ ہے آئینہ میں کیا ہے

اس طرح سے ٹھکرا نہ مرے داغِ جبیں کو
ظالم یہ تو خود تیرا ہی نقشِ کفِ پا ہے

بے کیف گُل و غنچہ ہیں بے نور ستارے
آغوشِ محبّت سے مرے کون اُٹھا ہے

دل میں ہو اگر شائبۂ شکوہ تو کافر
ظالم مری آہوں میں محبّت کی صدا ہے

اس بے پر و بالی پہ عیاںؔ جذبۂ شبنم
احساسِ فنا ہے نہ تمنّائے بقا ہے

عباس حیدر عیاںؔ کانپوری

کاروانِ انقلاب

(ایک مسلسل طویل نظم کی پہلی قسط)

یہ نظم ایک طویل تصنیف کا پہلا حصہ ہے، جو ۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ اسکی بُنیاد زمانے کے اُن تقاضوں اور تصوّرات پر قائم کی گئی ہے جو دُنیا میں نئی اقتصادی اور سماجی روح کی پیداوار ہیں۔ ذہنی بیداری اور سیاسی شعور نے سماج کے جن دبے ہوئے طبقوں میں بیداری کا احساس پیدا کیا ہے ان تمام طبقوں کو ایک کارواں کی صورت میں دکھایا گیا ہے اور انہیں کی زبان سے ان کی نمائندگی کی گئی ہے کارواں کے ایک عام خاکے کے بعد سب سے پہلے "سُندری" نیچ ذات کی ایک عورت اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوسری قسطوں میں دوسرے کیریکٹرز آئینگے اور ان کیریکٹرز کے علاوہ اعلیٰ طبقے کے افراد بھی مستقبل کے انقلابی نقطۂ نظر کی نمائندگی وقت کے تقاضے کے مطابق کرینگے اور نظم کے ختم پر شاعر کی طرف سے ایک باب میں اُن خدشوں سے مطلع کیا جائیگا جو مستقبل میں انسانی سوسائٹی کو گھیر سکتے ہیں۔

اگر آپ کا تقاضہ ہوا تو ایشیا میں اس کی دوسری قسط بھی شائع کی جائیگی ورنہ اس نظم کو کتابی شکل میں نفیس و اعلیٰ صورت میں علیحدہ شائع کر دیا جائیگا۔

ساغر

(تاریخ تحریر مارچ ۱۹۳۹ء)

۹۴

کاروانِ انقلاب

(۱)

مرحبا! ہے غیض میں روحِ بنی نوعِ بشر
انقلاب آیا زمانہ کا دریچہ کھول کر

زلزلہ بن کر وہ آیا کاروانِ انقلاب
جاگ اُٹھا ذرّہ ذرّہ میں جہانِ انقلاب

مفلسوں اور بدنصیبوں کا یہ بیکس کارواں
پھر بھی اپنی طاقتوں میں ہے فلک رس کارواں

جنکے رُخ ہیں دھوپ کی سختی سے کمہلائے ہوئے
ہوں کنول جیسے کنارِ آب مرجھائے ہوئے

جسمِ عریاں پر حجابِ بیکسی کی دھجّیاں
سخت و ناہموار چہروں پہ مشقّت کے نشاں

چیتھڑوں کا اک چھپڑ گاؤن سا پہنے ہوئے
زندگی ہے فاقہ مستی کی عبا پہنے ہوئے

۹۴

مو پریشاں، خاک آلودہ، عرق ریز و نحیف — جنکے چہروں کی غلاظت سے نگاہیں تک کثیف

یہ جبیں پر موٹی موٹی دھاریاں تیور پہ بل — دل میں طوفانِ بغاوت آنکھ میں سوزِ عمل

پنجہ کش ہاتھوں میں بھاری پھاوڑے اعلانِ جدال — یہ کلہاڑی یہ بسولے یہ ہتوڑے یہ کدال

بوسہ دیتی ہے جوانی سجدہ کرتا ہے شباب

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!

(۲)

دیو پیکر اُس بہادر کا بھلا کیا ہے جواب — بیلچہ ہے جسکے ہاتھوں میں بہ اندازِ شباب

نیزۂ چشم و نظر کو بے گماں تانے ہوئے — بھوک ہے قلبِ امارت پر سناں تانے ہوئے

وہ جوانِ پیل تن وہ انقلابی سورما! — بھیڑ سے نکلا وہ ڈنڈے کو گھماتا جھومتا

یہ درانتی، یہ گنڈاسے، لاٹھیاں، تیغ و تفنگ — مرحبا صد مرحبا یہ جنگ یہ سامانِ جنگ

بد دعائیں، بیکسی کی آہ، اور فاقوں کا زہر! — انتڑیوں کی تلملاہٹ، حسرتِ کشتہ کا قہر

عصرِ نو کے اسلحاتِ جنگ کا مسکت جواب

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(۳)

وہ علمدارِ تغیّر جھوم کر آگے بڑھا — نعرۂ "یا انقلاب" اُسنے وہ مستی میں کہا

ضرب سے جسکی دو عالم کا کلیجہ ہل گیا — دیکھ کر پرچم کو خونِ زندگی گرما گیا

خود بخود اُٹھنے لگے روئے مشیّت سے نقاب

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!

(۴)

۹۶

وہ دلیر آئے تغیّر کا رجز گاتے ہوئے — صورِ اسرافیل کو نعروں سے شرماتے ہوئے

"ہم تغیّر کا ہیں اک زندہ نمونہ دہر میں — ہم تجدّد کا ہیں بامعنی خُلاصہ دہر میں

ہے ارادوں کا ہماری ذات سرچشمہ سنو — مرکزِ ہر ساز ہے جو ہم ہیں وہ نغمہ سُنو

ثقل کا مرکز ہیں ہم جمہور کی منزل ہیں ہم — جسم ہے جنتا تو جنتا کے دماغ و دل ہیں ہم

ہم خیال و ذہن ہیں جمہورِ عالم کے سُنو — معنی و تفسیر ہیں دستورِ عالم کے سُنو

بخشتے ہیں ہم نو اختہ حلق کے واسطے	بخشتے ہیں ہم صدا اعلان حق کیواسطے
ایک مجموعہ ہیں کُل مخلوق کی طاقت کا ہم	رُخ بدل دینگے نظامِ شعبۂ قدرت کا ہم
موڑ کر رکھ دینگے خنجر ہر کسی جلاّد کا	تنگ چھلاّ ہیں ہمارے ہاتھ بھی فولاد کا
ہم بڑے ہیں سخت ہیں حیران کن ہیں ہیت ہیں	ہم اَمر ہیں، کارکن ہیں رُوح ہُو دوہست ہیں
ہم نڈر ہیں، مرد ہیں، مغرور ہیں، ذیشان ہیں	ہم شرر ہیں برق ہیں سیلاب ہیں طوفان ہیں
ہم اٹل ہیں دہر میں اہرام مصری کی طرح!	مستقل دنیا میں ہیں قدرت کی شکتی کی طرح

ہم ہیں اس دنیائے آب و گل میں قدرت کا جواب،

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(۵)

دیکھنا وہ آئیں اُن کی عورتیں با حالِ زار	زندگانی کا جنازہ نوجوانی کا مزار
جن کی دوشیزہ تمنّاؤں کو فاقہ کھا گیا	بھوک کے شعلوں سے جنکا گلستاں مرجھا گیا

جن کی آنکھیں کاسۂ سائل نگاہیں دکھ بھری ... ہر نظر میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے کمتری

جنکی آنکھیں نور سے خالی ہیں اور بیٹھی ہوئی ... موت کے خونخوار شعلوں سے مگر دُکھی ہوئی

خوف آگیں سُرخ لرزہ آفریں وحشت زدہ ... موت کے تاریک غاروں کی طرح دہشت زدہ

جنکے بالوں کی لٹیں اُلجھی ہوئی چکٹی ہوئی ... جس طرح بیمار ناگن دکھ سے ہو سمٹی ہوئی

جنکے رُخ آلام کی شدت سے ہیں سرسوں کے پھول ... اور ان پھولوں پہ بیدادِ زمانہ کی ہے دھول

جن کی سوجی پنڈلیوں میں خیر سے زیور یہ ہیں ... خوں زدہ چھالوں کے گھونگرو آبلوں کی چھاگلیں

۹۸

جنکے کولھوں پر گھڑوں اور بوریوں کے ہیں نشاں ... ان نشانوں سے بھی سنئے نازکی کی داستاں

مست ہو سکتے تھے شاعر ان کے ہر انداز سے ... یہ بھی چل سکتی تھیں سو سو لوچ سو سو ناز سے

آہ لیکن بھوک نے اُن کی نزاکت لوٹ لی ... قدرتِ فیاض نے دی تھی جو دولت لوٹ لی

جنکے سینوں پر ہے عریانی کی چادر تار تار ... بھوک میں ملفوف جوبن، پیاس میں لپٹی بہار

دربدر سائل جوانی، سربسر مفلس شباب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!!

(۶)

دیکھئے وہ چھٹتا جاتا ہے غبارِ کارواں
قربِ منزل سے نمایاں مشعلوں کا ہے دھواں
اپنی اپنی شکل خود ہر شخص سمجھانے لگا
صاف منظر کا ہر اک پہلو نظر آنے لگا

بھیڑ میں اک سمت کنکر کوٹنے والی بھی ہے
ہاتھ میں ڈنڈا لئے بوڑھی پنہاری بھی ہے
ناگ پھن ہیں مالنوں کے پاس پھولوں کے عوض
جھاڑ ہیں ہاتھوں میں گلشن کے رسولوں کے عوض
دیدنی ہے آج تو کم عمر ماما کا سہاگ
ادھ جلی چولھے کی لکڑی ہاتھ میں اور منہ میں جھاگ
رسیاں ڈولوں کی ہاتھوں میں ہیں اور پنہاریاں
ساریوں کے چیتھڑے ہیں چیتھڑوں کی ساریاں
تیز کھرپے ہیں انہیں گھسیارنوں کے ہاتھ میں
شہر کے بانکے رہا کرتے تھے جنگی گھات میں
اس تباہی خستگی اور بھوک میں یہ ان کا حال
آنکھ سے شعلے برستے ہیں نگاہوں سے جلال
سندری کے ہاتھ میں دیکھو وہ رزق کے کا علم
تیغ کو شرما رہا ہے آج تو پنجے کا خم

"مرحبا اے دورِ عشرت مرحبا صد مرحبا
"بابوؤں" اور "صنا لوگوں" سے مرا پیچھا چھٹا"

(ہائیں یہ کیسی صدا ہے چپ رہو ٹھہرو رُکو — چھپ کے اس ٹیلے کے پیچھے اسکی باتیں بھی سُنو
مہترانی رانیوں سے ویرہ بالا ہوگئی — خاک جستِ شوق میں اُڑ کر ستارا ہوگئی)

سُندری کا خطبہ

(۷)

مرحبا اے دورِ عشرت مرحبا صد مرحبا — "بابوؤں" اور "صنا لوگوں" سے مرا پیچھا چھٹا
لاؤ مجھ کو بھی شرابِ ارغواں کا ایک جام — اے رفیقو! میں تھی صدیوں اور قرنوں کی غلام
دانے کی امید میں شامیں سحر ہوتی رہیں — عید کے انعام میں عمریں بسر ہوتی رہیں
یوں تو میں یکسر نجاست تھی غلاظت کا نشاں — مجھ سے چھو جانا قیامت تھا قیامت الاماں
ہاں مگر دستِ ہوس کو شرم و غیرت کچھ نہ تھی — مجھ کو سینے سے لگانے میں کراہت کچھ نہ تھی

میرے بھنگی نے نہیں لوٹی جوانی کی بہا
خان صاحب کا ہدف تھی سیٹھ صاحب کا شکار

آہ وہ اُترن کے کپڑے وہ پُرانی صدریاں
میل سے معمور وہ چیتھڑے وہ جوؤں کے مکاں

شہر میں ہر رات وہ دورِ شراب ارغواں
صبح کو دو پائی پر اشراف کی وہ جھڑکیاں

وہ ڈپٹ وہ ڈانٹ، وہ ہنکار اور وہ جھڑکیاں
خشک باسی روٹیوں کے ساتھ تازہ گالیاں

وہ سڑے سالن وہ جھوٹی پتلیں وہ دال بھات
اَن گِنت نسلوں نے جھوٹن کھا کے کاٹی ہے حیات

فاتحہ کی روٹیاں بھوسے بھی ملتی نہ تھیں
میری پرچھائیں جو پڑ جاتی تو دھلتی تھی زمیں

لیکن اب تیار ہو جائیں خدایانِ سماج
ایک ایک جلاّد سے بدلا لیا جائیگا آج

آج گھونگھٹ ہے، نہ سوکھی روٹیوں کا انتظار
گالیاں دیتا نہیں اب طفلکِ سرمایہ دار

پیٹ سے بندھتی نہیں اب روٹیاں سوکھی ہوئی
مرحبا ہے روحِ انساں قیدِ انساں سے بری

جگمگائیگا جہاں میں اب ہمارا آفتاب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(باقی)

ساغر

سوویٹ روس پر جاپان کی للچائی نظریں

(سیّد عقیل جعفری مچھلی شہری)

کچھ دنوں سے براعظم ایشیا کے شمالی علاقے میں جہاں دریائے آمور (Amoor) اور لیوری ایک حدِ فاصل مانچو کو اور سائبیریا کے درمیان بناتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، وہاں دو زبردست فوجیں دورِ جدید کے تمام مہلک آلاتِ حرب سے لیس ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں جن کے مطمحِ خیال سے تہذیب و تمدّن دور بھاگتا نظر آتا ہے اور ان کی خوفناک "مڈبھیڑ" نے ٹوکیو اور ماسکو جیسے مرکزِ تہذیب و فن شہر کے باشندوں کو بھی سراپا "انتقام" بنا دیا ہے اور آج دونوں قوموں کے سینوں میں انتقام کی آگ اس قدر بھڑک رہی ہے کہ مانچوکو کی سرحد پر ایک ہزار میل کے احاطہ میں کم و بیش پچاس لاکھ روسی اور جاپانی سپاہی دن رات بیٹھے ہوئے صرف اس بات کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

روس اور جاپان کی یہ دشمنی بہت پرانی ہے۔ سوویٹ روس جاپان کا اس وقت سے شدید مخالف ہے جبکہ سنہ ۱۹۲۳ء میں امریکہ کی مداخلت سے جاپان کی فوجوں کو مجبوراً سائبیریا سے واپس آجانا پڑا تھا۔ اب سے کچھ عرصہ پیشتر جاپانیوں کا خیال تھا کہ مشرق بعید میں سوویٹ روس کا یہ علاقہ ایک لقمۂ تر ہے جسے وہ بآسانی ہضم کر لینگے لیکن گذشتہ چند سال کے تلخ تجربات نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ وہی "لقمۂ تر" قدرت کی کارفرما قوتوں سے ایک ہیبتناک دیو کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کی ہیبت نے ٹوکیو کے اربابِ سیاست کی نیندوں کو بھی حرام کر دیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہوگا جو اتنی وسعت اور اہمیت رکھنے کے باوجود سیاحوں کے نزدیک اس قدر غیر مانوس اور غیر دلچسپ ہو جس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہماری ناقص تعلیم نے ہمیں صرف یہی بتایا ہے کہ منچوریا کا علاقہ ویران اور بیکار علاقہ ہے اسکے نام کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں ایک لمبے چوڑے بے آب و گیاہ صحرا کا نقشہ پھر جاتا ہے جہاں سیاحوں کیلئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ منچوریا کے وسیع علاقے میں کثرت کے ساتھ جنگل پائے جاتے ہیں اور پہاڑوں کے دو خوشنما وسیع سلسلے ملک کے اس پار سے اُس پار تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں جگہ جگہ خوشنما جھرنے اور خوبصورت مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں اسی طرح سائبیریا کا نام سنتے ہی ہمارے سامنے برف سے ڈھکے ہوئے بیکار علاقہ کی تصویر پھر جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائبیریا کے بیشتر علاقے کی آب و ہوا صحت و تندرستی کیلئے دنیا میں بہترین تسلیم کی جاتی ہے۔ یہاں آبادی بھی کافی ہے اور لوگ تیزی کے ساتھ

آباد بھی ہوتے جا رہے ہیں۔

سائبیریا اور منچوکو کے علاقے ابھی تک انسانی ضروریات کیلئے بالکل بیکار خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اب یہ خیال بدلتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے قدرتی چیزوں سے فائدہ اُٹھانے کے ذریعے دریافت ہوتے جا رہے ہیں ان علاقوں کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں کیسے کچھ انقلابات نمودار ہو جائینگے۔ لیکن جہانتک قدرتی ذریعوں سے فائدہ اُٹھانے کا سوال ہے۔ روس اور جاپان دونوں کی ایک ہی صورت ہے اور بظاہر کوئی سبقت کرتا نظر نہیں آتا۔ مگر جہاں آبادی کا سوال ہے مانچوکو میں اس کی طرف مطلق کوئی خیال نہیں کیا جا رہا ہے۔ برخلاف اسکے سائبیریا میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور سرعت کے ساتھ لوگ آباد ہوتے جا رہے ہیں اور بہت باقاعدگی سے شہر بستے جا رہے ہیں۔

متنازعہ علاقہ سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان کشیدگی کا جو سبب ہے وہ دراصل وہ علاقہ ہے جو جھیل بیاکل سے لیکر ساحل سمندر تک ایک پتلی جھٹ کی شکل میں چلا گیا ہے جس کے ہوائی راستہ کی لمبائی تقریباً ۱۵۰۰ میل ہے یہ دریائے آمور ( ) کے منبع سے شروع ہو کر بتدریج شمال کی جانب پھیلتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اس جگہ پہنچ کر جو مانچوکو کی "کوہان" کہلاتا ہے بہت وسیع ہو جاتا ہے اور پھر بتدریج جنوب کی جانب تنگ ہوتا ہوا خبراوسک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ درحقیقت اسکی طوالت اس قدر خطرناک نہ ہوتی اگر دریائے یسوری اور ساحل بحر کے مابین سوویٹ روس کے بحری علاقے حائل نہ ہوتے جو ۷۰۰ میل کی لمبائی اور تقریباً ۴۰۰ میل کی چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس طرح شمالی امریکہ میں مین ( ) کی ریاست کوئیبک ( ) اور نیو برانسویک ( ) سے گھری ہوئی ہے ٹھیک اسی طرح مانچوکو شمال اور مشرق کی طرف سے سوویٹ روس کی سرحد سے گھرا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایشیا کے ان ملکوں کی سرحدیں محفوظ اور قلعہ بند ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلح سپاہی جنگ کیلئے ہروقت تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

اس متنازعہ علاقہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اور یہ سمجھنے کیلئے کہ جاپان کیلئے "یہ لقمۂ تر" کیوں اس قدر مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے اگر ہم جھیل بیاکل سے مغرب کی جانب سفر کرنا شروع کریں اور آرکٹک ( ) سے دُنیا کی سب سے لمبی ریلوے لائن ٹرانس سائبیرین اکسپریس پر سوار ہو کر بحر اوقیانوس کی جانب روانہ ہوں تو سارے دن ریل جھیل کی جنوبی سمت چلتی رہے گی جس کی لمبائی ۴۰۰ میل ہے اور جو کسی جگہ ۴۵ میل تک چوڑی بھی ہو گئی ہے۔ یہ سارا علاقہ سوویٹ روس کے زیرنگین ہے۔ اس حصے کے جنوبی سمت میں منگولیا کا وہ وسیع علاقہ پھیلا ہوا ہے جو مدتوں روس اور منگولیا کے درمیان نزاع کا باعث بنا رہا۔ اس سارے سفر میں کوئی بھی شہر یا گاؤں ایسا نہیں ملے گا جو قابل ذکر ہو اور کچھ بھی تاریخی یا جغرافیائی اہمیت رکھتا ہو سوائے ایک سلی اوڈینسکا ( ) کے جو ایک پرانی وضع کا روسی شہر ہے اور ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں سے گاڑی روانہ ہو کر اور گھنے جنگلوں سے گذرتی ہوئی بولن باٹور ( ) پہنچتی ہے۔ تقریباً چار۔ چھ گھنٹے جنگلوں میں سفر کرنے کے بعد میدانی علاقے شروع ہو جاتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی سفر کرنیوالا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ روسی علاقے سے گذر رہا ہے۔ ہر چیز میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑتی نظر آتی ہے۔ چاروں طرف جدید وضع کی خوشنما عمارتیں دور تک نگاہوں کو متوجہ کئے رہتی ہیں۔ ہر چیز سے زندگی اور جوانی ابلتی دکھائی پڑتی ہے یہانتک کہ چیتہ جنکشن پر گاڑی آ کر رک جاتی ہے اور آنکھوں کے سامنے سے روسی علاقے کا سارا منظر ہٹ جاتا ہے۔

چیتہ وہ جگہ ہے جہاں سے ٹرانسی سائبیرین ریلوے لائن کی ایک شاخ جنوب کی جانب میکڈن ( ) مڑ جاتی ہے جو مانچوکو ہوتے ہوئے سیدھی چین تک چلی جاتی ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو عام طور سے خشکی کے راستے یورپ سے آنیوالے سیاح

ایشیائی ممالک کیلئے اختیار کرتے ہیں۔ چیتہ سے لیکر مانچو کو تک کل مسافت تقریبًا ۰۰ میل ہے لیکن ریلوے لائن بدستور ۰۰ امیل تک مغرب کی جانب چلی جاتی ہے اور در اصل یہی وہ علاقہ ہے جو سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان نزاع کا باعث ہے۔

چیتہ کے آگے ایک چھوٹی سی یہودی عملداری پڑتی ہے جس کا نام کیو بشہفتہ ( ) ہے اس حصہ زمین پر زراعت بہت اعلیٰ پیمانہ پر کی جاتی ہے اور ملک کا زیادہ تر حصہ وادیوں میں آباد ہے۔

کہتے ہیں کہ روئے زمین پر یہی وہ ملک ہے جو اصلی معنیٰ میں نوجوانوں کا ملک کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہاں نوجوانوں کو ہر بات میں دخل ہے اور ان کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اس ملک کی ہر بات میں شباب کا رنگ اور جوانی کی امنگ جھلکتی نظر آتی ہے۔

روس اپنی روایات کے لحاظ سے دُنیا میں عجیب ملک ہے۔ روس میں لوگ چالیس سال کی عمر میں اتنے سنجیدہ اور بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں جتنا دراصل ان کے والدین کو بھی نہ ہونا چاہئے اسکی وجہ یہ ہے کہ روسی لوگ بہت ہی مجاہدانہ اور جفاکشی کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی جفاکشی دُنیا میں ضرب المثل ہے۔ روس کے لوگ بہت محتاط، خائف اور ہر چیز سے "پرہیز" کرنیوالے نظر آئینگے۔ اس لئے کہ ان پر بہت بڑے بڑے انقلابات آئے ہیں اور اب ان کی آنکھیں کُھل گئی ہیں۔ وہ قول سے زیادہ فعل کے قائل ہو گئے ہیں مگر برخلاف اسکے روسی نوجوانوں کا رنگ ہی نرالا ہے۔ وہ سراپا "آگ" اور مجسم زندگی نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جوانی کی حقیقت اور اس عمر کی اہمیت روس ہی میں انسان پر منکشف ہوتی ہے۔ یہاں کے نوجوانوں میں بڑی بیداری پھیل گئی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں مشرق بعید کا یہ ملک دُنیا کی سیاسیات میں ایک بڑی جگہ حاصل کرے گا۔

واضح رہے کہ وہ عظیم الشان ریلوے لائن جو اس وسیع ملک کے اس پار سے اُس پار تک چلی گئی ہے۔ مانچو کو کی سرحد کے متوازی برابر چلی جاتی ہے اور خبر او سک ( ) جو مشرق بعید میں سُرخ پوشوں کا مرکزی مقام ہے پہنچ جاتی ہے۔ اسی جگہ دریائے اسوری جنوب کی طرف سے آکر دریائے آمور سے مل جاتا ہے۔ یہاں سے جب ریل چلتی ہے تو دو میل کا ایک لمبا پل پڑتا ہے جس کے اُس پار روس کے بحری علاقے کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور اس جگہ سے ریلوے لائن جنوب کی طرف مُڑ جاتی ہے اور پھر سیدھے ویلاریو وسٹک تک چلی جاتی ہے۔

سوویٹ روس کے بحری مربع میں جب ہمارا گذر ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں کہ لوگ یہاں کس قدر مصروف اور مشغول نظر آتے ہیں۔ ہزاروں مرد و عورت کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں سڑکیں بن رہی ہیں تو کسی جگہ پُل تعمیر کیا جا رہا ہے کسی جانب ریلوے لائن نکالی جا رہی ہے تو دوسری طرف کارخانے قائم ہو رہے ہیں غرضیکہ چاروں طرف چہل پہل اور کام کی افراط نظر آتی ہے۔ ہندوستان کی طرح بے روزگاری اور بیکاری کے دل ہلا دینے والے مناظر کہیں دیکھنے میں نہیں آتے۔

۱۰۴

"اخلاق" و "مذہب"

کیا اخلاقی زندگی بغیر مذہب کے بن سکتی ہے؟

(ایک فلسفیانہ علمی مباحثہ)

(جو مابین پنڈت گوپی ناتھ سنہا و ساغر نظامی ..... ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کیا گیا)

۵۰

سنہا:۔ (کمرہ میں داخل ہوکر) آداب عرض

. . . . . (صدائے برنخاست)

—— اللہ اکبر، بڑی محویت ہے! ؟

ساغر:۔ (چونک کر اور کھڑے ہو کر) ارے! آپ ہیں؟ آداب عرض، آپ کب تشریف لائے!؟

سنہا:۔ بیٹھے بیٹھے، آپ تو مطالعہ میں بالکل کھوئے ہوئے تھے!

ساغر:۔ جی ہاں، کتاب سے زیادہ میں اسکے موضوع میں ڈوب گیا تھا۔ مصنف کا خیال ہے کہ بغیر مذہب کے انسانی اخلاق باقی نہیں رہ سکتا۔

سنہا:۔ اور آپ کا ——؟

ساغر:۔ میرے خیال میں اخلاق کے لئے مذہب کی قید بالکل غیر ضروری ہے۔

سنہا:۔ مجھے بھی اس بحث سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو اخلاقیات کے لئے مذہب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

ساغر:۔ بہت خوب، مگر آپ کے ہم خیال ابتک اپنے دعویٰ کی کوئی ایسی گہری اور زبردست دلیل پیش نہیں کر سکے جس سے دماغی انسان کی تسکین ہو سکے (کتاب سنہا صاحب کے سامنے پھینک کر) یہ کتاب دیکھئے، چارسو صفحے اس شخص نے سیاہ کرڈالے مگر میرے خیال کو بدل نہیں سکا۔

سنہا:۔ ساغر صاحب! ایسی باتوں سے تو ہم قیامت تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ پہلے آپ "مذہب" کی تعریف فرما دیجئے۔

ساغر:۔ زندگی کا لائحہ عمل!

سنہا:۔ اس لائحہ عمل کا بنانے والا کون ہے؟

ساغر:۔ خود انسان!

سنہا:۔ تو میں سمجھوں کہ مذہب سے خدا کا کوئی تعلق نہیں۔

ساغر:۔ آپ کو اختیار ہے!

سنہا:۔ میں مذہب کو خدا کا قانون مانتا ہوں ۔۔۔ آپ اس سے انکار کرتے ہیں؟

ساغر:۔ بحث اُلجھ جائیگی اس لئے کہ ایک خدا سے مختلف و متضاد مذاہب پیدا کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

سنہا:۔ تو میں یہ سمجھوں کہ ہر اک مذہب کا خدا جداگانہ ہے اور اگر آپ کا مفہوم یہی ہے تو اس بحث میں جس مذہب کا ذکر ہے وہ کون سے خدا کا مذہب ہے؟

ساغر:۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ کیا سمجھیں، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے مذاہب جن میں اصولی اختلافات موجود ہوں کسی ایک خدا سے منسوب نہیں کئے جاسکتے۔ غالباً اب سوال کے دوسرے حصّے کا جواب میرے لئے ضروری نہیں ہے۔

سنہا:۔ میں سمجھا! آپ سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے۔ مہربانی فرما کر "اخلاقیات" کی تعریف کر دیجئے اور یہ بھی فرما دیجئے کہ اخلاقیات کو بھی آپ کسی دستور العمل کے تابع سمجھتے ہیں یا نہیں؟

ساغر:۔ "اخلاقیات" انسانوں کی مختلف سوسائٹیوں کے ان مقررہ اوصاف کو کہتے ہیں جن کی پابندی سوسائٹیوں

....

نے اپنے ہر فرد پر لازم کر دی ہو۔ اور یہ "اخلاقیات" اُس دستور العمل کے ماتحت ہوتے ہیں جو سماج اپنے لئے بنائے، خواہ اس سماجی قانون کی کچھ ہی نوعیت کیوں نہ ہو۔

سنہا:۔ "مذہب" کی تعریف آپ نے یہ فرمائی کہ مذہب انسان کا بنایا ہوا لائحہ عمل ہے۔ اور "اخلاقیات" کی تعریف بھی آپ یہی فرماتے ہیں کہ یہ سوسائٹی کا بنایا ہوا دستور العمل ہے۔ تو پھر مذہب اور اخلاقیات میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟!

ساغر:۔ کچھ نہیں۔

سنہا:۔ گویا مذہب اور اخلاقیات آپ کے نزدیک ایک ہی چیز ہیں تو پھر آپ کو اس موضوع سے کیا اختلاف ہے۔

ساغر:۔ موضوع سے اختلاف کی وجہ مذہب کی تعریف ہے میرے نزدیک مذہب اور اخلاقیات کا کام اس دُنیا تک محدود ہے۔

سنہا:۔ اگر سوسائٹی کا کوئی فرد کوئی اخلاقی جُرم کرے اسکی سزا اس فرد کو کون دیگا۔؟

ساغر:۔ حکومت۔

سنہا:۔ اور اگر کوئی مذہب کی خلاف ورزی کرے تو اُس کی سزا کون دے گا؟

ساغر:۔ مذہبی حکومت ۔۔۔ اگر وہ موجود ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے ذہن میں مذہب کی کوئی مخصوص تعریف ہے، ذرا آپ تو مذہب کی تعریف فرمائیے۔

سنہا:۔ میں سمجھا، آپ اخلاقیات کی تعریف فرمانے سے بھی گریز فرماتے ہیں۔ اس لئے الزامی جواب دے رہے ہیں، میں تعمیل ارشاد کروں گا۔

میں مذہب کو خدا کا بنایا ہوا قانون اور لائحہ عمل سمجھتا ہوں، جو خدا نے وقتاً فوقتاً انسان کی رہنمائی کے لئے پیغمبروں اور رشیوں کے ذریعہ دُنیا کو عطا فرمایا میرا یہ عقیدہ ہے کہ دُنیا میں نیکی اور بدی کے درمیان متواتر اور مسلسل جنگ ہوتی رہتی ہے، اور جس وقت بھی بدی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا انسان کی رہنمائی فرماتا ہے اور ایک نیا مذہب وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں مختلف مذہب ہیں لیکن تمام مذاہب کا بُنیادی اصول ایک ہے، جس کو "موکش" یا "نجات" کہتے ہیں۔

ساغر:۔ اچھا ہوا، بحث ایک نقطے پر سمٹ آئی۔ شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ اخلاقیات کی میں مفصّل تعریف پہلے کر چکا ہوں۔ اب مذہب کی تعریف آپ نے فرما دی،

میں غالباً آپ سے مذہب کی تعریف نہ کراتا، اگر مذہب کے
متعلق میرے خیال اور آپ کی رائے میں اختلاف نہ ہوتا،
اب یہاں سے اصل بحث شروع ہوتی ہے!
میں کہتا ہوں اخلاق کو برقرار رکھنے کے لئے کسی ایسے
آسمانی مذہب کی ضرورت نہیں ہے جس کی آپ نے ابھی
تعریف فرمائی ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو کسی آسمانی مذہب
کے پیرو نہیں ہیں ان کے بھی اخلاقیات ہیں، اور ان کا
مروّجہ قانون ان سے ان اخلاقیات کی پابندی کراتا ہے،
خود مذہبی طرزِ حکومت میں بھی برائیوں سے بچانا اور بھلائیوں
پر عمل درآمد، قانون اور اسکی عدالتوں کے ذریعہ ہی کرایا
جاتا ہے، فرض کیجئے کہ آپ کا بتایا ہوا کوئی مذہب موجود
نہ ہو تو ایسی حالت میں انسانی سوسائٹی کا کوئی اخلاق ضرور
ہوگا، اور اس پر عملدرآمد بھی ہوگا، اس میں مذہب کی
کیا شرط ہے۔

تنہا۔ جناب یہ مذہبی حکومت کیا چیز ہے؟ اور اگر کوئی مذہبی
حکومت ہے جس نے مذہبی احکام کی پابندی کا فرض اپنے
ذمہ لیا ہے، تو یہ مذہبی حکومت داورِ محشر کو برطرف نہیں
کرسکتی، انسان خدا کے سامنے اپنے افعال کا جوابدہ
ہے اور اس جواب دہی سے کوئی دُنیاوی حکومت انسان
کو عہدہ برآ نہیں کرا سکتی۔

ساغر۔ مذہبی حکومت اس حکومت کو کہتے ہیں جو کسی مذہبی شریعت
کے ماتحت چلائی جائے۔ میں نے کب انکار کیا ہے
کہ مذہب داورِ محشر کے تخیّل کو دماغ سے نکال سکتا ہے
میرا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ داورِ محشر کو نہ ماننے والی
سوسائٹی کے افراد کو اخلاقی برائیوں سے کونسی طاقت
روکتی ہے؟

تنہا بجا ہے، مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی بحث میں ضد کا
زیادہ حصّہ ہے، بہرحال میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ
بغیر سوالات کئے ہوئے اپنا مفہوم آپ پر واضح کردوں

میں پھر آپ کو موضوع کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور
یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موضوع کے ہر لفظ سے ظاہر ہے
کہ مذہب جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس کا مطلب خدا
کے بنائے ہوئے قانون سے ہے اور اخلاق جس معنی
میں استعمال ہوا ہے اس کا تعلق انسانی دستورالعمل سے
ہے اور مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ اخلاق کی پابندی کے لئے
مذہب ایک ضروری چیز ہے یا نہیں؟

"اخلاقیات" کی ضرورت انسانی سوسائٹی کو کیوں محسوس
ہوئی، اسکی وجہ بالکل ظاہر ہے، انسان فطرۃً خودغرض
واقع ہوا ہے اور ہر قوی انسان ہر کمزور ہم جنس پر ظلم و جَور
کر کے اپنا فائدہ اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرنی چاہتا
ہے، انسان کی اس فطرت کو روکنا انسانی سوسائٹی کے
نظام کے لئے نہایت ضروری محسوس ہوا، اور یہی وجہ ہے
کہ انسانی سوسائٹی نے اپنے ماحول کی مطابقت میں دستورالعمل
مرتب کیا اور سوسائٹی کے ہر فرد پر اسکی پابندی لازم قرار
دی، میں اس سلسلے میں ایک بات اور بھی عرض کردوں،
اور وہ یہ ہے کہ کسی قانون یا کسی پروگرام پر عمل درآمد
نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس قانون یا اس پروگرام کی پشت
پر ایک ایسی قوّت نہ ہو جو سوسائٹی کے افراد کو مجبور کرسکے
کہ وہ قانون کی پابندی کریں، اور سوسائٹی کے ہر فرد کو
یہ خوف ہو کہ وہ اگر قانون کی خلاف ورزی کرے گا، تو وہ
قوّت جو اس قانون کی پُشت پر ہے اس سے باز پرس
کریگی، اخلاقیات کی پُشت پر اخلاقیات کا اجتماعی ضمیر
ہوتا ہے جو افراد کو دستورالعمل کے مطابق عمل کرنے پر
مجبور کرتا ہے، میں اخلاقیات کے یہی معنی سمجھتا ہوں اور
اسکے بعد آپ کو یہ غور کرنا ہے کہ انسان کو راہِ راست پر
رکھنے کیلئے سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کافی ہے یا اسکو
علاوہ اسکے کسی اور طاقت کی بھی ضرورت ہے، میں سمجھتا
ہوں کہ سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اسکے لئے ہرگز کافی نہیں ہے

انسانی افعال ہمیشہ کھلم کھلا اور روز روشن ہی میں سرزد نہیں ہوتے۔ اور خاصکر ایسے افعال جو اخلاق کے خلاف ہوتے ہیں قدرۃً انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کے افعال کو عوام کی نگاہ سے بچا کر کرے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانی سوسائٹی کے لئے جس قدر یہ ضروری ہے کہ اخلاقی قانون کے ذریعہ اسکے ان افعال پر پابندی عائد کی جائے جو علانیہ سرزد ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کے ان افعال پر بھی پابندی عائد کی جائے جو رات کی تاریکی اور مضبوط چار دیواریوں کے اندر کئے جاتے ہیں اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان افعال کی روک تھام کیلئے سوسائٹی کا مجموعی ضمیر قطعی ناکافی ہے لہذا ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جس کی نگاہوں سے بچنا ان کیلئے قطعی ناممکن ہو جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کے بغیر یہ ناممکن ہے۔

ساغر شکریہ، میری ضد نے کم از کم اتنا تو کیا کہ آپ نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا، آپ کی تمام تقریر میں ایک استدلال یقینی وزنی ہے کہ جب قانون کی آنکھ انسان کے اعمال کی نگراں نہیں ہوتی تو وہ کونسی طاقت ہے جو تاریکی میں انسان کو گناہوں سے بچاتی ہے۔!؟

تنہا شکر ہے کہ آپ کو ایک استدلال تو وزنی معلوم ہوا۔

ساغر مگر اس وزنی استدلال کے جواب میں ایک ہلکے سے جواب پر بھی غور فرما لیجئے۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کونسی طاقت انسانوں کو تاریکی میں بھی گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

یہ ایک نفسیاتی چیز ہے، اور اس کا تعلق ہر شخص کی ذاتی نفسیات سے ہے، ظاہر ہے کہ انفرادی نفسیات زیادہ تر ماحول و وراثت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے والا ضمیر بھی بچپن ہی سے ایک خاص ماحول میں پرورش پاتا ہے اور اسکی بری یا بھلی سیرۃ اسی ماحول کے اثر سے بنتی ہے۔

آپ کہتے ہیں، رات کی تاریکی میں مذہب انسان کو گناہوں سے باز رکھتا ہے، میں کہتا ہوں یہ غلط ہے حقیقت میں نفسیاتی ضمیر ہی ہر انسان کو نیک و بد کا احساس کراتا ہے۔ مذہب کی اس میں کوئی قید نہیں بچپن ہی سے دماغوں میں برائی اور بھلائی کے فرق کا گہرا اثر موجود ہوتا ہے۔ جو نتیجہ ہوتا ہے ماحول کا مگر ماحول ہی اس اثر کو مٹا بھی دیتا ہے یعنی اچھے ماں باپ اور اچھی سوسائٹی کے اثرات ایک شخص کو برائی سے محفوظ رکھتے ہیں اور بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر برے لوگوں کی سوسائٹی میں پھنس کر وہی شخص برائی کو بھلائی سمجھنے لگتا ہے۔

تنہا مگر بہت سے لوگ بری سوسائٹی کے باوجود بھلے رہتے ہیں

ساغر صرف مستثنیات! اور اگر بھلے رہتے ہیں تو یہ دلیل ہے اس پختہ سیرت کی جس کی جڑیں ماحول اور تربیت میں مضبوط ہو چکی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہائی اور تاریکی میں گناہوں سے بچتا ہے تو اسکی حقیقی وجہ اس کا ذاتی چال چلن ہوتا ہے جو ایک مخصوص ماحول میں بنتا ہے مذہب کے خوف سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ورنہ محض خوف کی بنیاد پر برائی سے بچنا اور بھلائی کرنا یہ انسانی فطرت کی بڑی توہین ہے، اور بالواسطہ تشدد، یہ کوئی قابلِ تعریف بات بھی نہیں۔

میں آپکے سامنے ایک اور مثال پیش کرتا ہوں، شاید اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا، کہ دنیا کے ہر شہر اور ہر قصبے میں مضبوط چار دیواریوں سے گھرے ہوئے بدکاریوں کے اڈے موجود ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں نہیں جاتے۔ جانیوالے اس لئے جاتے ہیں کہ رائج الوقت قانون انہیں نہیں روکتا اور نہ جانے والے اس لئے نہیں جاتے کہ سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر ان کے خلاف ہے۔ جانے والے اور نہ جانے والوں پر مذہب کا کوئی اثر نہیں۔

آپ کی رائے میں اجتماعی ضمیر بد اخلاقیوں کو نہیں روکتا
میں کہتا ہوں کہ اجتماعی ضمیر روکتا بھی ہے اور نہیں بھی
روکتا۔ جس طرح مذہب کا خوف ہوتا ہے اور جس حد تک
مذہب بد اخلاقی کا سدِ باب کرتا ہے۔ اسی حد تک
اجتماعی ضمیر بھی کرتا ہے اس لئے کہ ان دونوں کی بنیاد
خوف پر ہے۔ جہاں اجتماعی ضمیر نہیں روکتا وہاں مذہب
بھی نہیں روک سکتا، تو نتیجہ یہ نکلا کہ علانیہ بد اخلاقیوں
کو وہ دُنیاوی قانون روک سکتا ہے جو یا مذہب کا
آلۂ کار ہو یا اجتماعی ضمیر کا اور پوشیدہ بد اخلاقیوں کو
اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف انسان کا انفرادی
ضمیر ہے، نہ کہ مذہب یا اجتماعی ضمیر!؟

ایک بنیادی بات اس سلسلے میں اور کہنا چاہتا ہوں
جیسا کہ آپ نے کہا کہ خوفِ خدا لوگوں کو بد اخلاقی سے
روکتا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مذاہب کو قانونِ
تعزیرات بنانے کی کیوں ضرورت پڑی!؟ ظاہر ہے کہ
خود اہلِ مذہب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اخلاق کا قیام
محض روحانی دباؤ سے ممکن نہیں، اس کے لئے مضبوط
اور ٹھوس شکنجے کی ضرورت ہے۔

تنہا: ساغر صاحب! معاف فرمائیے، میں نے کب کہا ہے کہ
مذہب کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی یا نہیں ہوتی۔
بھلائی اور برائی کی مسلسل جنگ سے بھی آپ انکار
نہیں فرمائینگے۔ تو سوال یہ ہے کہ جب شیطان جس کا
دوسرا نام انسانی خود غرضی ہے مذہب اور اخلاق کے
خلاف بغاوت کی متواتر ترغیب دیتا ہے تو کونسی طاقت
ہے جو انسان کو معصیتوں سے بچاتی ہے۔؟

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ خوفِ تعزیر سے
متاثر ہو کر برائیوں سے بچ سکتا ہے کیا آپ بتا سکتے
ہیں کہ "انفرادی ضمیر" کی پشت پر کونسا خوف
کار فرما ہے؟

ساغر: برائی اور بھلائی کی مسلسل جنگ ابتک ایک معمّہ ہے،
بحث طویل ہو جائیگی اس لئے میں اس میں پڑنا نہیں
چاہتا۔ مجھے یہ تسلیم نہیں کہ محض خوفِ تعزیر ہی انسان
کے اعمال کا محرک ہوتا ہے۔ اسکے اعمال کا محرک ایک
خاص جذبہ ہوتا ہے، جو اگر عقلِ تمیزی پر غالب
آجائیگا تو خلافِ عقل باتیں سرزد کرا دیتا ہے قتل
کی سزا موت ہے، پھر بھی انسان کسی جذبہ سے مشتعل
ہو کر دوسرے انسان کو قتل کر بیٹھتا ہے۔

تاریکی میں گناہ کا بھی یہی حال ہے، معصیت کا
ارتکاب ایک خاص جذبہ کے ماتحت ہوتا ہے اگر
وہ جذبہ عقل پر غالب ہو گیا تو انفرادی ضمیر اس کو
روک سکتا ہے اور نہ مذہب، تو ظاہر ہوا کہ خوفِ تعزیر
بحیثیت مجموعی انسان کے اعمال کا محرک قرار
نہیں دیا جا سکتا۔

درحقیقت انسان کی عقلِ تمیزی اور اسکی مضبوط سیرت
ہی حتی الامکان اس کو برائی سے روکتی ہے، مذہب
کا اثر کوئی بنیادی اثر نہیں محض ایسا ہی اثر ہے جیسا
کسی قانونی تعزیرات کا۔

انسانی جذبات اسکے اعمال کے محرک ہیں جیسا
کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان میں اعتدال اور توازن
قائم رکھنا عقلِ تمیزی کا کام ہے اور عقلِ تمیزی کا نشوونما
تعلیم و تربیت پر موقوف ہے، اس تعلیم و تربیت کا
نظام سماج کا کوئی بھی ادارہ بنا سکتا ہے اسکے
لئے مذہب ضروری نہیں۔

سب سے بڑی دانشمندی یہ ہے کہ انسان
بے غرضی سے اچھے کام کرے۔

کب آؤ گی تم!؟

(”اُن کے“ انتظار میں)

(محمد ضیاء الاسلام صاحب۔ بی۔ ایس سی۔ پی سی۔ ایس)

(نظم تصویر کے متعلق)

کب تک یوں ترساؤ گی تم؟
کب تک دل برماؤ گی تم؟
جلوہ کب دکھلاؤ گی تم؟
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

پیاری پیاری باتیں ہے ہے
رنگین رنگین گھاتیں ہے ہے
اُف وہ مہکتی راتیں ہے ہے
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

کالی کالی گھٹائیں آئیں
دل پر غم بن بن کر چھائیں
ذوقِ نغمہ و مستی لائیں
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

کھوئی ہوئی سی باتیں میری[1]
سونی سونی راتیں میری
دل سے ہردم باتیں میری
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

آہ وہ کافر مست نگاہیں
آہ وہ گوری گوری باہیں
آہ وہ میرے دل میں راہیں
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

موجیں لینا وہ ساری کا
طوفاں سا اک گل کاری کا
حکمِ رنگیں مے خواری کا
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

---

[1] اس بند کی تصویر آتشیا کے اسی نمبر میں شائع کی جارہی ہے۔ میں ضیا صاحب کے ذریعہ اُس آرٹسٹ کی بارگاہ میں اس لطیف نقش کے لئے شکریہ پیش کرتا ہوں۔ جنکے کمال کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دُنیا کو اپنا نام بھی نہیں بتانا چاہتے۔
ساغر

آؤ، آؤ، جلدی آؤ
آکر اپنا روپ دکھاؤ
روپ دکھا کر دل لے جاؤ
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

تم کو میں دل میں بٹھلاؤں!
تم کو سُندر گیت سُناؤں
خود روؤں تم کو بھی رُلاؤں
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

یاد تمہاری آفتِ جاں ہے
نام تمہارا لب پہ رواں ہے
یہ ہی وظیفہ وِردِ زباں ہے
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی!؟

خطبات زرتشت

حصّہ اوّل

باب (۱)

تینوں جنم

(از فریڈرک نٹشے مترجمہ عبدالسلام صاحب رامپوری)

روح کے تین جنم میں تمہیں بتاتا ہوں۔ روح اونٹ اور اونٹ سے شیر اور شیر سے آخر کار بچہ بنتی ہے۔

روح کے لئے، قوی اور باربردار روح کے لئے جو ادب و احترام کا مسکن ہے بہت سی بھاری چیزیں ہیں۔ اُسکی طاقت گراں اور گراں ترین کی متقاضی ہے۔

"گراں کیا ہے"؟ باربردار روح سوال کرتی ہے۔ اور اونٹ کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ کر خوب لدنا چاہتی ہے۔

"سورماؤ! گراں ترین چیز کیا ہے" باربردار روح دریافت کرتی ہے "تاکہ میں اُس کو اُٹھا کر اپنی طاقت سے لطف اندوز ہوؤں"

کیا وہ یہ نہیں ہے؟ غرور کو ٹھیس لگانے کیلئے اپنے آپ کو ذلیل کر لینا؟ عقل کی تضحیک کیلئے حماقت کا مظاہرہ کرنا؟

یا یہ ہے:- جب فتح منانے کا وقت آئے تو مقصد سے دست بردار ہو جانا، ورغلانیوالے کی ترغیب کیلئے پہاڑ پر چڑھنا۔

یا یہ ہے:- علم کے برگ و ثمر پر بسر کرنا، صداقت کی جستجو میں روح کی بھوک برداشت کرنا۔

یا یہ ہے:- بیمار ہونے پر دلاسہ دینے والوں کو رخصت کر دینا اور اُن بہروں سے دوستی گانٹھنا جو مطلقاً التجا نہ سُن سکیں۔

یا یہ ہے:- صداقت کے گندے پانی میں گھُس جانا اور سرد و گرم کی پروا نہ کرنا۔

یا یہ ہے:- نفرت کرنے والوں سے محبّت کرنا، جس وقت بھوت ڈرانا چاہے تو اُسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینا۔

باربردار روح ان سب گراں ترین چیزوں کو برداشت کرتی ہے، جیسے اونٹ لد چکنے کے بعد سیدھا ویرانے کی طرف بڑھتا ہے ویسے ہی روح اپنے ویرانے کی طرف تیز گام ہو جاتی ہے۔ اس انتہائی سنسان ویرانے میں دوسرا جنم بدلتا ہے۔ یہاں روح شیر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے لئے ویرانے میں آزادی اور خداوندی کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ وہ یہاں اپنے پچھلے خداوند کی تلاش کرتی ہے۔ اُسکی

اور پچھلے خدا کی دشمن بننے کیلئے وہ اسی بڑے اژدھے پر فتح یابی کی جدوجہد کرنا چاہتی ہے۔

وہ بڑا اژدہا جسے اب روح خدا اور خداوند کہنے پر مائل نہیں کیا ہے؟ اس بڑے اژدھے کا نام ہے "تجھے کرنا ہوگا"، لیکن شیر کی روح کا تقاضا ہے "میں چاہتا ہوں"۔

"تجھے کرنا ہوگا" سونے سے جگمگاتا اُس کے راستہ میں پڑا ہے۔ ایک سفنہ دار جانور جس کے ہر ہر سفنہ پر "تجھے کرنا ہوگا" سنہری حرفوں میں چمک رہا ہے۔ ہزار سالہ قدریں ان سفنوں پر چمک رہی ہیں اور عظیم ترین اژدھے کا یہ کہنا ہے "اشیاء کی تمام قدریں —— وہ مجھ پر چمکتی ہیں تمام قدریں پیدا کی جا چکیں اور تمام پیدا کی ہوئی قدریں وہ میری ذات ہے۔ یقیناً اب "میں چاہتا ہوں" کی گنجائش نہیں" اژدہا کہتا ہے۔

برادران! روح کو شیر کی کس لئے ضرورت ہے؟ باربرداری کا باادب جانور جو دست بردار ہو جاتا ہے، کیوں کافی نہیں؟

جدید قدروں کو پیدا کرنا —— گو یہ شیر بھی نہیں کرسکتا، مگر جدید تخلیق کیلئے آزادی پیدا کرنا — شیر کی طاقت یہ کرسکتی ہے۔

آزادی پیدا کرنے کے لئے اور فریضے میں بھی ایک مقدس "نہیں" کردینے کے لئے بھائیو! شیر درکار ہے۔

جدید قدروں کا حق خود حاصل کرلینا، باربرداری اور باادب روح کے لئے بہت ہولناک ذمہ داری ہے۔ حقیقۃً یہ صید افگنی ہے اور کام ہے درندہ کا۔

"تجھے کرنا ہوگا" کو مقدس ترین چیز سمجھ کر وہ ایک زمانہ میں محبت کرتی تھی، مگر اب وہ مقدس ترین چیزوں میں بھی فریب اور مطلق العنانی کے احساس پر مجبور ہے۔ وہ اس محبت سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے، اسکے حاصل کرنیکے لئے شیر کی ضرورت ہے۔

لیکن میرے بھائیو! مجھے بتاؤ کہ ایک بچہ وہ کون سی چیز کرسکتا ہے جس کو شیر نہیں کرسکتا؟ شکاری شیر کو بچہ بننے کی بھی کیوں ضرورت ہے؟

بچہ ایک معصومیت ہے، بھول ہے، ایک نئی ابتدا ہے، ایک کھیل ہے، ایک پہیا ہے خود گردان، ایک پہلی حرکت ہے اور ایک مقدس "ہاں" ہے۔

ہاں آفرینش کے کھیل کیلئے بھائیو! زندگی کو مقدس "ہاں" کی ضرورت ہے:- روح اب اپنا عزم چاہتی ہے، دُنیا کی راندہ اپنی دُنیا جیتنا چاہتی ہے:-

روح کے تینوں جنم میں نے تمہیں بتا دئے:- روح، اونٹ، اونٹ سے شیر اور آخر میں بچہ کیسے ہوئی۔

زرتشت نے یہ تقریر کی اور وہ اس وقت ایک شہر میں سکونت رکھتا تھا جس کو بقر ابلق کہتے ہیں۔

باب (۲)

خوبی کی علمی مسندیں

لوگوں نے زرتشت سے ایک شخص کی تعریف کی کہ وہ نیند اور خوبی پر اچھا خطبہ دینا جانتا ہے لوگ اُس کا اسی وجہ سے احترام کرتے ہیں اور انعام سے نوازتے ہیں جوان اسکی مسند کے سامنے بیٹھتے ہیں۔

زرتشت گیا اور جوانوں کے حلقہ میں اسکی مسند کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس دانشمند نے کہا۔

"احترام اور حیا نیند کے حضور میں پہلی چیز ہے، بدخوابوں اور شب بیداروں کا راستہ چھوڑ دینا چاہئے۔

چور تک نیند سے شرم کرتا ہے، رات میں ہمیشہ دبے پاؤں چوری کرتا ہے۔ مگر رات کا چوکیدار بے حیا ہے جو بے حیائی سے

سنکھ لئے پھرتا ہے ۔ سونا کوئی حقیر فن نہیں ۔ اسکے انتظار میں دن بھر جاگنا ضروری ہے ۔

دن میں دس مرتبہ تمہیں اپنے اوپر غالب آنا چاہئے اس سے اچھی تکان پیدا ہو جاتی ہے جو جان کیلئے افیون کا پھول ہے ۔

پھر دس ہی مرتبہ صلح کرنا چاہئے کیونکہ غالب آنا تلخی ہے، جو صلح نہیں کرتے بُری طرح سوتے ہیں ۔

دن بھر میں دس صداقتوں کو دریافت کر لینا چاہئے ورنہ تو رات میں دریافت کریگا تیری جان بھوکی ہوگی ۔

دن بھر میں دس مرتبہ ہنسنا اور خوش ہونا چاہئے ورنہ تکلیف کی جڑ تیرا معدہ تجھے رات میں بےچین کرے گا ۔

بہت کم لوگ واقف ہیں (لیکن یہ حقیقت ہے) کہ میٹھی نیند کے لئے ہر قسم کی خوبیوں کی ضرورت ہے ۔ کیا میں دروغ بیانی کرونگا؟ ناجائز تعلق کا مرتکب ہوؤں گا؟ ہمسایہ کی خادمہ کی خواہش کرونگا؟ یہ سب چیزیں میٹھی نیند کی ضد ہیں ۔

باوجود ہر قسم کی خوبیوں کے ایک چیز کی پھر بھی ضرورت ہے یعنی صحیح وقت پر خوبیوں کو بھی سُلا دینا ۔

تاکہ کہیں یہ نیک بختیں باہم جنگ نہ شروع کردیں! اور اے افسردہ انسان وہ بھی تیرے لئے!

میٹھی نیند خدا اور ہمسایہ سے امن و آشتی کی متمنی ہے، نیز ہمسایہ کے شیطان سے بھی آشتی، ورنہ رات کو وہ تجھ پر مسلط ہوگا ۔

میٹھی نیند کے لئے ضرورت ہے کہ حکومت کا احترام اور اُس کی اطاعت کی جائے ۔ حتّٰی کہ کج حکومت کی بھی، میٹھی نیند کا یہ تقاضا ہے ۔ میں کیا کروں کہ طاقت کو کج پاؤں پر چلنے کا شوق ہے ۔

۱۵۱

میرے نزدیک بہترین چرواہا وہ ہے جو اپنی بھیڑیں شاداب ترین چراگاہ میں لیجاتا ہے، یہی میٹھی نیند کے موافق ہے نہ میں بہت سے اعزاز چاہتا ہوں نہ بڑے خزانے، یہ چیزیں مزاج کو بگاڑتی ہیں ۔ مگر نیک نامی اور معمولی دولت کے بغیر نیند خراب ہوتی ہے ۔

میں احباب کی ایک چھوٹی سی صحبت کو بڑی صحبت سے زیادہ خوش آیند سمجھتا ہوں، مگر اُن کی آمد و رفت صحیح اوقات پر ہونی چاہئے ۔ میٹھی نیند کے یہ موافق ہے ۔

ہاں! کم عقل بھی مجھے بہت پسند ہیں، وہ نیند کو تقویت دیتے ہیں، یہ لوگ بابرکت ہیں، خصوصاً اگر بالالتزام اُن کی تائید کی جائے اس طریقہ سے نیک آدمی کا دن گزر جاتا ہے ۔ پھر رات کے وقت میں اچھی طرح اُس کا لحاظ رکھتا ہوں کہ نیند کو طلب نہ کیا جائے نیند خوبیوں کی سرتاج طلب کئے جانے کو ناپسند کرتی ہے ۔ بلکہ میں جائزہ لیتا ہوں کہ دن بھر میں نے کیا کیا، اور کیا سوچا، میں گائے کی طرح جگالی کرنے میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں "تیری دس فتحیابیاں کیا تھیں؟ تیری دس صلحیں کیا تھیں؟ دس صداقتیں اور دس ہنسیاں کیا تھیں جن سے میں لطف اندوز ہوا؟"

چالیس خیالوں کے غور و فکر کے گہوارے میں خوبیوں کی سرتاج، نیند دفعتاً بلاطلب مجھ پر طاری ہو جاتی ہے ۔ نیند میری آنکھیں تھپکتی ہے ۔ اور وہ بھاری ہو جاتی ہے، نیند ہمارے مُنہ کو سہلاتی ہے، اور وہ کھُلا رہ جاتا ہے ۔ دبے پاؤں یہ محبوب ترین چور آتا ہے اور میرے خیالات چُرا لیجاتا ہے ۔ میں اس علمی مسند کی طرح بالکل احمق رہجاتا ہوں ۔ میں زیادہ دیر اس حالت میں نہیں رہتا، میں اسی وقت لیٹ جاتا ہوں ۔

زرتشت اُس عقلمند کی یہ تقریر سُن کر دل میں ہنسا، کیونکہ اس کی وجہ سے ایک (نئی حقیقت) اس پر روشن ہو گئی۔ اُس نے دل میں کہا یہ عقلمند مجھے اپنے چالیس خیالوں کے احمق معلوم ہوتا ہے۔ مگر مجھے یہ یقین ہے کہ سونا خوب جانتا ہے۔

مسرور وہی ہے جو اس عقلمند کی صحبت میں رہے، ایسی نیند متعدی ہوتی ہے، یہ موٹی دیواروں کے پار بھی اثر کر جاتی ہے۔

اسکی منبر میں بھی جادو ہے۔ خوبی کے داعی کے پاس جوانوں کی نشست بیکار نہیں۔

جیسی طرح سونے کی خاطر بیدار رہنا اس کی عقلمندی ہے، واقعی اگر زندگی میں کوئی معنی نہ ہوں اور مجھے بھی مہملیت کا انتخاب کرنا پڑے تو سب سے زیادہ پسندیدہ میرے لئے بھی یہی مہملیت ہوگی۔

اب صاف صاف میری سمجھ میں آیا کہ داعیانِ خوبی کی تلاش میں لوگ سب سے زیادہ کس چیز کی تلاش کرتے تھے۔ اُنہیں میٹھی نیند کی تلاش ہوتی تھی، اور اسکی تقویت کے لئے افیونی خوبیوں کی اُن سب لوگوں کیلئے جنہوں نے علمی مسندوں کے مقلد کی تحسین کی ہے، عقلمندی نام ہے بغیر رویا کی نیند کا۔ اُنہیں زندگی کا اس سے بہتر کوئی مقصد معلوم نہیں تھا۔ گو اس خوبی کے داعی جیسے کچھ لوگ ابھی تک باقی ہیں۔ اگرچہ سب اتنے ایماندار نہیں، ان کا دور گذر چکا، وہ زیادہ دنوں تک کھڑے نہیں رہ سکتے، وہ فوراً ہی لیٹ جائینگے۔

مبارک ہیں اونگھتے ہوئے لوگ، اس لئے کہ یہی بہت جلد جھونکا کھا جائینگے۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۳)

مردانِ آخرت

زرتشت نے مردانِ آخرت کی طرح ایک مرتبہ انسان کی ذات سے بلند خیال دوڑایا، مجھے دُنیا ایک مصیبت زدہ، درد رسیدہ خدا کی صنعت معلوم ہوتی۔ اُس وقت دُنیا، خدائی ——— خواب ——— اور افسانہ معلوم ہوئی۔ ایک الوہی غیر مطمئن ذات کی آنکھوں کے سامنے رنگین بخارات۔

یہ خیر و شر، شادی و غم، من و تو ——— خلّاق آنکھوں کے سامنے مجھے رنگین بخارات نظر آئے۔

جوں ہی خالق نے نظریں اپنے آپ سے ہٹانا چاہیں۔ اُس نے دُنیا پیدا کر دی۔

درد سے نظریں اُٹھا لینا، اپنے آپ کو کھو دینا درد رسیدہ کیلئے نشہ آور شادمانی ہے۔ ایک زمانہ میں مجھے دُنیا مست کر دینے والی شادمانی خود فراموشی نظر آئی تھی۔ دائمی غیر مکمل، دائمی تناقض کی مجسمہ مورت، اور غیر مکمل مورت، اپنے غیر مکمل خالق کیلئے نشہ آور شادمانی۔ ایک زمانہ میں مجھے دنیا اس طرح کی معلوم ہوئی تھی ایک مرتبہ میں نے بھی انسان کی ذات سے بلند خیال دوڑایا تھا۔ تمام مردانِ آخرت کی طرح یقیناً انسان سے بلند۔

بھائیو! خدا جس کو میں نے ہی پیدا کیا تھا، دوسرے تمام دیوتاؤں کی طرح انسانی عمل اور انسانی جنون تھا۔ وہ ایک انسان تھا اور محض "انسان" اور "من" کا ایک حقیر ٹکڑا وہ بھوت میری ہی راکھ اور تپش میں سے نکل کر میرے پاس آیا تھا اور یقیناً دوسری دُنیا سے نہیں آیا تھا

بھائیو! کیا ہوا؟ میں نے آپ پر، ایک دردمند پر غالب آ گیا، میں اپنی راکھ پہاڑ پر لے گیا، میں نے دہکتے ہوئے شعلہ کیلئے جدوجہد کی اور لو! فوراً ہی بھوت میرے پاس سے کھسک گیا۔

میرے لئے جو صحت پا چکا ہے ایسے بھوت پر اب بھی عقیدہ رکھنا درد اور تکلیف ہے۔ اب یہ میرے لئے غم ہے اور ذلّت ہے۔ مردانِ آخرت سے میں نے کہا وہ تکلیف اور ناقابلیت تھی جس نے مردانِ آخرت کو پیدا کیا۔ وہ مسرّت کا مختصر جنون تھا جس کا تجربہ فقط انتہائی

دردمند ہی بکتا ہے۔

ماندگی کی ایک ہی جست سے، موت کی جست سے، منتہیٰ پر پہنچنے کی خواہشمند۔۔۔۔ بے کس، جاہل، ماندگی نے جس کو ایک بار بھی اب عزم کی خواہش نہیں۔ تمام دیوتاؤں اور تمام مردانِ آخرت کو پیدا کیا ہے۔

بھائیو! یقین کرو، وہ جسم تھا جو جسم سے مایوس ہوگیا۔ اُس نے دیوانی روح کی انگلیوں سے آخری دیواریں ٹٹولیں۔

بھائیو! یقین کرو، وہ جسم تھا جو زمین سے مایوس ہوگیا —— اُس نے ہستی کے بطن کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سُنا۔ اور پھر وہ سر کے بل —— بس سر کے ہی بغیر —— آخری دیواروں میں سے اُس دُنیا میں داخل ہوجانا چاہتا تھا۔ مگر وہ دُنیا، انسانیت سے خارج دُنیا، غیر انسانی دُنیا، ایک سماوی لاشئے۔ انسانوں سے اچھّی طرح چھپی ہے۔ اور ہستی کا بطن انسان سے بجز انسان ہونے کے بالکل مخاطبہ نہیں کرتا حقیقۃً پوری ہستی کو ثابت کرنا مشکل ہے، اُس سے بات کرالینا سخت ہے، بھائیو! بتاؤ کیا سب سے زیادہ ثابت، سب سے زیادہ عجیب چیز نہیں؟ ہاں، یہ "من" خلاق باعزم، اشیاء کی قدریں معین کرنے والا "من"، جو تمام چیزوں کا پیمانہ ہے ہر چیز کی قدر ہے؛ بایں تناقض و ابہام اپنی ہستی کے متعلق پھر بھی سب سے زیادہ راستبازانہ گفتگو کرتا ہے۔ یہ بہت ہی راست باز ہستی "من" —— جسم کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اور ابھی تک جسم پر ہی دلالت کرتا ہے۔ حتّٰی کہ اس وقت بھی جب وہ محو ہوتا ہے، ہذیان بکتا ہے، اور شکستہ بازوؤں سے پھڑ پھڑاتا ہے۔

"من" پیہم زیادہ ایماندارانہ گفتگو سیکھتا رہتا ہے، اور جتنا سیکھتا ہے، اُتنے ہی زمین کے القاب اور اعزاز اُس پر منکشف ہوتے ہیں۔ میرے "من" نے مجھے ایک نئی خودداری سکھائی ہے۔ وہی میں لوگوں کو سکھاتا ہوں۔ اب اپنا سر سماویات کے ریگ میں مت گاڑو اور اُس کو، ایک ارضی سر کو جو زمین میں معنیٰ پیدا کرتا ہے بالکل آزاد لئے پھرو۔

میں ایک نیا عزم سکھاتا ہوں اُس پگڈنڈی کو اختیار کرو جس پر انسان آنکھیں بند کئے چلا ہے اور اُسی کو اچھّا سمجھو۔ اور اب بیماروں اور فنا ہونیوالوں کی طرح اُس سے مت بھٹکو۔

117

وہ بیمار اور فنا ہونے والے ہی تھے جنہوں نے جسم اور زمین سے نفرت کی، سماوی دنیا اور کفارہ کے قطرات لہو کو اختراع کیا مگر یہ شیریں اور المناک زہر بھی اُنہوں نے جسم اور زمین ہی سے حاصل کیا۔

انہوں نے اپنی بدبختی سے نکل بھاگنا چاہا، ستارے دور تھے، چنانچہ انہوں نے آہ سرد بھر کر کہا، کاش سماوی راستے ہوتے جن سے وہ چُپکے سے دوسری ہستی اور دوسری مسرت میں چلے جاتے۔ اور انہوں نے اپنے لئے غیر معروف راستے اور قطراتِ لہو ایجاد کئے۔

انہوں نے، اِن ناشکر گزار لوگوں نے اپنے آپ کو جسم اور زمین کی فضا سے علیحدہ تصوّر کیا، مگر اس علیحدگی کے کیف اور جذبہ میں بھی وہ کس کے مشکور ہیں؟ اپنے اور اسی جسم اور زمین کے۔

زرتشت ناتوانوں کے ساتھ نرم ہے، وہ اُن کی تسکین اور ناسپاسی کے طریقوں پر ناراض نہیں۔ کاش وہ صحتیاب اور فاتح ہو سکیں اور اپنے لئے بلند تر اجسام پیدا کرسکیں۔

زرتشت اُس صحتیاب شخص پر ناراض ہے، جو خود فریبیوں کو شفقت سے دیکھے اور آدھی رات کو اپنے خدا کی قبر پر چُپکے سے جائے ہاں اُسکے آنسو ابھی تک میری نظر میں بیماری اور ایک بیمار قالب ہیں۔

اُن لوگوں میں ہمیشہ بہت سے ناتواں ہیں جو محو رہتے ہیں اور خدا کے لئے فنا ہوئے جاتے ہیں، وہ اہلِ بصیرت سے اور جدید ترین خوبی سے جس کا نام ہے راستبازی، سخت بغض رکھتے ہیں۔

وہ ہمیشہ پیچھے، تاریک دور کی طرف ٹکٹکی لگائے رہتے ہیں۔ اُس دور میں حقیقۃً خود فریبی اور عقیدہ دو مختلف چیزیں تھیں۔ دماغی ہذیان تشبّہ

باللہ تھا اور شک و شبہ گناہ ۔

ان مشابہ باللہ لوگوں کو میں خوب جانتا ہوں ۔ اُنہیں اپنے اوپر عقیدہ رکھے جانے کا اصرار ہے، اور شک و شبہ گناہ ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ خود سب سے زیادہ کس چیز کے معتقد ہیں ۔ وہ حقیقۃً آخرت اور قطرات لہو کے معتقد نہیں، بلکہ جسم کے ہی سب سے زیادہ معتقد ہیں خود اُن کا جسم اُن کے لئے فی نفسہٖ شئی ہے ۔ مگر یہ اُن کیلئے ایک بیمار چیز ہے ۔ اور وہ اپنی کھالوں سے بخوشی نکلنے کیلئے تیار ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موت کے داعیوں کا وعظ سُنتے ہیں اور خود آخرت کی دعوت دیتے ہیں ۔

بھائیو! بہتر ہے کہ تندرست جسم کی آواز سُنو ۔ یہ زیادہ سچّی اور صاف آواز ہے ۔ صحیح، مکمل اور تندرست و توانا جسم سچّی اور صاف آواز میں بولتا ہے ۔ یہ زمین کے معنی کو بتاتا ہے ۔

زرتشت نے یہ تقریر کی ۔

باب (۴)

جسم کی تحقیر کرنیوالے

مجھے اُن لوگوں سے بات کرنا ہے جو جسم کی تحقیر کرتے ہیں ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ از سرِ نو کوئی چیز سیکھیں ۔ یا کوئی نئی چیز سکھائیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے جسموں کو الوداع کہیں —— اور ساکت ہو جائیں ۔

"میں جسم و جان ہوں" بچہ کہتا ہے اور آدمی بچّوں کی سی باتیں کیوں نہ کرے ۔

مگر ایک ذی ہوش اور ذی فہم شخص کہتا ہے "میں جسم ہی ہوں اور اسکے علاوہ کچھ نہیں ۔ جان صرف جسم سے متعلق کسی چیز کا نام ہے جسم ایک عظیم شعور ہے ۔ ایک کثرت ہے بسیط حاسہ کے ساتھ، ایک جنگ و صلح، ایک گلہ اور گلہ بان ۔

تیرا چھوٹا شعور بھی جس کو تو روح کہتا ہے، برادر! ایک آلہ ہے تیرے ہی جسم کا ۔ تیرے بڑے شعور کا ایک چھوٹا سا آلہ اور کھلونا تو کہتا ہے "من" اور تجھے اس لفظ پر فخر ہے ۔ مگر وہ عظیم ترین چیز جس کا تو یقین نہیں کرنا چاہتا ۔ تیرا جسم ہے اور اُسکا عظیم شعور ۔ جو "من" کہتا نہیں بلکہ کرتا ہے ۔

حاسہ جن چیزوں کا احساس کرتا ہے روح جن چیزوں کا ادراک کرتی ہے اُنکا فی نفسہٖ کوئی مقصد اور منتہٰی نہیں ۔ مگر حاسہ اور روح بہت شوق سے تجھے (یہ سمجھنے کی) ترغیب دیتے ہیں کہ تمام چیزوں کا منتہٰی . . . . . . وہ ہیں ۔ یہ اس قدر بر خود غلط ہیں ۔

حاسہ اور روح آلات اور کھلونے ہیں ۔ اُن کے عقب میں بہر کیف خودی ہے ۔ یہی خودی حواس کی آنکھوں سے تلاش کرتی ہے اور روح کے کانوں سے سُنتی ہے ۔ یہی موازنہ کرتی ہے، قابو پاتی ہے، فتح کرتی ہے، اور برباد کرتی ہے، یہی حکومت کرتی ہے اور یہی "من" پر حکمراں ہے ۔ برادر! تیرے خیالات اور تیرے احساسات کے عقب میں ایک طاقت ور آقا ہے ۔ ایک نامعلوم عاقل ہے اس کو خودی کہا جاتا ہے ۔ وہ اس جسم میں ہے ۔ وہ تیرا جسم ہے ۔

تیرے جسم میں تیری بہترین دانش سے زیادہ شعور ہے پھر معلوم نہیں کہ تیرے جسم کو خاص طور سے بہترین دانش ہی کی کیوں ضرورت ہے؟ خودی تیرے "من" اور اُسکی فخریہ جست و خیز پر ہنستی ہے "میرے سامنے ان جولانیوں کی اور خیالات کی ان روانیوں کی کیا ہستی ہے؟" وہ اپنے آپ ہی کہتی ہے "میرے مقصد کا ایک غیر معروف راستہ ہے "من" کی مہار اور اُسکے خیالات کی محرک میں ہوں ۔"

خودی "من" سے کہتی ہے "یہاں درد محسوس کر" وہ اسی وقت مبتلا ہو جاتا ہے اور غور کرتا ہے کہ کس طرح نجات پائے۔ اور اُس کے غور و فکر کا یہی مقصد ہے۔ خودی کہتی ہے "لذّت اندوز ہو" من اُسی وقت خوش ہونا شروع کر دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کون سے طریقے ہیں جن سے وہ اکثر خوشی حاصل کرے اور اُسکے غور و فکر کا یہی مقصد ہے۔

میں ان لوگوں سے جو جسم کی تحقیر کرتے ہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کی تحقیر کا سبب توقیر ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس نے توقیر، تحقیر، قدر اور عزم پیدا کیئے؟ خلاق خودی نے ہی اپنے لئے تحقیر اور توقیر پیدا کی۔ اُس نے اپنے واسطے رنج و راحت بنائے۔ اور جس کو بطور آلۂ عزم، خلاق جسم نے اپنے لئے پیدا کیا۔

جسم کی تحقیر کرنے والو! تم تحقیر اور حماقت میں بھی خودی کے ہی خادم ہو۔ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ مرنا اور زندگی سے مُنہ موڑنا تمہاری اس خودی ہی کی خواہش ہے۔

اب تمہاری خودی اپنے محبوب ترین کام کے۔ اپنے آپ سے ماورا کسی تخلیق کے قابل نہیں۔ اُسکی سب سے بڑی خواہش یہی ہے۔ اُس کی پوری سرگرمی یہی ہے۔

مگر اس کے لئے اب ایسا کرنا بعد از وقت ہے:۔ جسم کی تحقیر کرنیوالو! اس طرح تمہاری خودی فنا ہونا چاہتی ہے۔

تمہاری خودی فنا ہونا چاہتی ہے اور یہ وجہ ہے تمہارے جسم کی تحقیر کرنے کی۔ کیونکہ اب تم اپنے سے برتر کی تخلیق کے قابل نہیں رہے زندگی اور زمین سے تمہاری ناراضگی کی یہی وجہ ہے، تمہاری نفرت کی انعطافی نظر ایک غیر شعوری رشک کی حامل ہے۔

جسم کی تحقیر کرنیوالو! مجھے تمہارا راستہ چلنا نہیں۔ مافوق البشر کیلئے تم میر اُپل نہیں۔

زرتشت نے یہ تقریر کی:۔

119

باب (۵)

شادمانیاں اور ولولے

بھائی! تجھ میں کوئی خوبی ہے اور وہ تیری ذاتی ہی ہے۔ تو پھر وہ تجھ میں اور کسی دوسرے میں عام نہیں۔

تو یقیناً اُسے کسی نام سے موسوم کرے گا، پیار کرے گا اور کھیل میں اُسکے کان کھینچے گا اور اُس سے دل بہلائے گا۔

اور دیکھ! کہ نام رکھنے میں ہی تیرا عوام سے اشتراک ہو گیا اور تو عوام کے گلّے کا فرد بن گیا۔

تیرے لئے یہ کہنا بہتر ہوتا جو میری جان کیلئے الم اور حلاوت ہے، میرے احشاء کی اشتہا ہے، ناقابل بیان اور بے نام ہے، تیری خوبی ناموں کے اختلاط سے کہیں برتر ہونی چاہیئے، اگر اُسکے متعلق کچھ کہنا پڑے تو لکنت سے شرم نہ کرنی چاہیئے۔

اس طرح کہو اور لکنت کرو "یہ میری خوبی ہے، مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ اس حیثیت میں مجھے کلیۃً پسند ہے۔

مجھے فضیلت اسی حیثیت میں مرغوب ہے۔

خدائی قانون کے ماتحت مجھے اُس کی خواہش نہیں نہ میں انسانی قانون یا انسانی ضرورت کے ماتحت اُس کا خواہشمند ہوں۔ مجھے یہ بطور عالم بالا کی یا بہشت کی راہنما کے درکار نہیں۔

جس سے میں محبت کرتا ہوں ارضی خوبی ہے۔ اس میں دُور اندیشی کم ہے اور عام سمجھ سب سے کم۔
چونکہ اس پرندنے میرے قریب اپنا نشیمن بنایا ہے؛ لہذا مجھے اس سے محبت ہے اور میں اُسے دل سے لگائے رکھتا ہوں۔
اب وہ میرے قریب ہی اپنے زرّیں انڈوں پر بیٹھتی ہے۔
اس طرح تمہیں لکنت کرنا چاہئیے اور اپنی خوبی کی تحسین کرنی چاہئیے۔
ایک زمانے میں تجھ میں ولولے تھے جنہیں تو رذیل کہتا تھا۔ مگر اب تجھ میں صرف خوبیاں ہیں جو تیرے ولولوں میں سے ہی پھوٹ نکلی ہیں۔
تو نے انہیں کے قلب میں بلند نصب العین رکھا اور وہ خوبیاں اور شادمانیاں بن گئیں ہیں۔
اگرچہ تو نسلاً گرم مزاج، نفس پرست، متعصب یا کینہ پرور تھا؟
مگر آخر میں تیرے تمام ولولے خوبیاں اور تیرے تمام شیاطین فرشتے ہو گئے۔
ایک زمانہ میں تیری کوٹھری میں وحشی کُتّے تھے لیکن آخر میں وہ چڑیاں اور دلکش گائیں بن گئے۔
زہر کو تو نے بلسان بنا لیا۔ تیری افسردگی کی گائے جسے تو دوہتا تھا، اب اُسکے تھنوں کا تو شیریں دودھ پیتا ہے۔
خوبیوں کی کشمکش سے پیدا ہونیوالی بدی کے علاوہ تجھ میں بدی پیدا نہیں ہوتی۔
برادرِ من! اگر تو خوش نصیب ہے تو بس ایک خوبی رکھے گا، ایسی صورت میں پُل سے بہ سہولت گذر جائیگا۔
بہت سی خوبیاں بیان کر لینا تابناک سہی، لیکن ایک سخت قسمت ہیں۔ بہت سے لوگ خوبیوں کی جنگ اور اُن کے میدان جنگ بننے سے تنگ آکر صحرا میں نکل گئے اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا!
برادرِ من! کیا جنگ اور معرکے بدیاں ہیں؟ بہرکیف یہ بدی ضرور ہے۔ حسد، بے اعتمادی اور چغلخوری خوبیوں میں ناگزیر ہے۔
دیکھ! تیری ہر خوبی بلند ترین مقام کی کیسی حریص ہے۔ وہ تیری پوری روح کو اپنا ہراول بنانا چاہتی ہے۔ وہ غضب، کینہ اور محبت میں (بلا شرکت غیر) تیری پوری طاقت چاہتی ہے۔
ہر خوبی دوسری خوبیوں سے رشک کرتی ہے اور رشک خوفناک چیز ہے۔ خوبیاں بھی رشک کے ہاتھوں فنا ہو سکتی ہیں۔
جب رقابت کا شعلہ کسی پر محیط ہو جاتا ہے تو آخر میں بچھو کی طرح زہر کا بھرا ڈنک خود اپنے ہی مار لیتا ہے۔
برادر! کیا تو نے خوبی کو کبھی اپنی ہی چغلی کھاتے اور اپنے ہی ڈنک مارتے نہیں دیکھا؟
انسان ایسی چیز ہے جس سے ترقی کرتا ہے اور اسی وجہ سے تجھ کو اپنی خوبیوں سے محبت کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ تو ان کی خاطر فنا ہوگا۔
زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۶)

زرد رو مجرم

ججو! اور قربانی کرنے والو! تم اس وقت تک قتل کرنا نہیں چاہتے جبتک جانور اپنا سر نہ جھکا دے؟ لو! زرد رو مجرم نے اپنا سر جھکا دیا:۔ اُسکی حقارت بھری آنکھ کہتی ہے "میرا "من" یہ ایسی چیز ہے جس سے ترقی کرتا ہے، انسان سے میری بڑی حقارت میرا "من"

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس آنکھ کے ذریعہ سے وہ یہ کہتا ہے ۔

"وہ اس کا اعلیٰ ترین لمحہ تھا جب اُس نے خود فیصلہ کیا تھا کہ اُس کو پھر پستی میں نہ جانے دو"

اُس آدمی کو جو خود اپنی ذات سے تکلیف اُٹھا رہا ہو، ایک تیز گام موت کے سوا نجات نہیں۔

جج! تمہارا قتل رحم ہونا چاہیئے، نہ کہ انتقام، اور قتل کرو تو اس کا اطمینان کر لو کہ تم خود بھی زندگی کو حق بجانب ثابت کرتے ہو۔

محض اُس سے مصالحت ہی کافی نہیں۔ جیسے تم قتل کر رہے ہو۔ تمہارے تاسف کو مافوق البشر کی محبت ہونا چاہیئے۔ تم اس طرح خود اپنی محبت کو جائز بنا سکو گے۔

"دشمن" کہو "بدمعاش" نہیں "مریض" کہو، لیکن "مردود" نہیں "احمق" کہو، لیکن "گنہگار" نہیں۔

اور اے سُرخ جج! اگر تو وہ سب کچھ آواز سے کہدے جس کا تو تخیل میں ارتکاب کر چکا ہے تو ہر شخص چلّا اُٹھے گا "اس نجاست اور زہریلے کیڑے کو دور کرو"

لیکن خیال ایک چیز ہے، عمل دوسری چیز اور عمل کا تصوّر ایک علیحدہ چیز ہے۔ ان میں علّت و معلول کا چکر نہیں گھومتا۔ تصوّر اُس زرد شخص کو زرد بناتا ہے۔ عمل کرتے وقت تو وہ عمل کیلئے موزوں تھا۔ لیکن ہو چکنے کے بعد اُسکے تصوّر کو برداشت نہ کر سکا۔

اب وہ متواتر اپنے آپ کو مرتکب جرم سمجھتا ہے۔ میں اس کو جنونی کہتا ہوں۔ استثنا اُسکے لئے اُلٹا قانون بن گیا۔

لکیر مرغی کو مسحور کرتی ہے۔ اُس کی لگائی ہوئی ضرب نے اُسکی کمزور سمجھ کو مسحور کر دیا۔ میں اس کو جنون بعد از عمل کہتا ہوں۔

جج! سُنو، علاوہ ازیں ایک جنون اور بھی ہوتا ہے اور یہ قبل از عمل ہے۔ آہ! تم جان کی گہرائیوں میں کافی حد تک نہیں پہنچے۔

سُرخ جج کہتا ہے "اس مجرم نے قتل کیوں کیا؟ یہ تو لوٹنا چاہتا تھا" میں تم سے کہتا ہوں اسکی جان خون کی پیاسی تھی نہ کہ غنیمت کی۔ وہ خنجر زنی کی مسرت کا پیاسا تھا۔ لیکن اُس کی کمزور فہم اُس جنون کو نہ سمجھی اور اس کو ترغیب دی۔

"خون میں کیا اہمیت ہے" اُس نے کہا "کم از کم تم اس سے مال غنیمت کا انتقام لینے کے تو خواہاں نہیں؟"

اُس نے اپنے کمزور فہم کی بات مان لی۔ یہ الفاظ اُسکے لئے سیسہ کی طرح وزنی تھے۔ قتل کر چکنے کے بعد اُس نے فوراً لوٹ لیا۔ وہ اپنے جنون پر نادم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اب پھر اُس پر اُسکے جُرم کا بار ہے۔ اور پھر اُسکی فہم ٹھٹھرائی ہوئی، مفلوج اور موٹی ہو گئی ہے۔

وہ اپنے سر کو فقط ہلا سکتا تو اُسکا بوجھ لڑھک جاتا، لیکن سر ہلائے کون؟

یہ آدمی کیا ہے؟ بیماریوں کی ایک پوٹ، جو روح کے ذریعہ دُنیا میں پہنچتی ہے اور یہاں اپنا شکار کرتی پھرتی ہے۔ یہ آدمی کیا ہے، جنگلی سانپوں کی ایک ڈھیری، جو بہت ہی کم آشتی سے رہتے ہیں، وہ متفرق طور پر نکل پڑتے ہیں اور دُنیا میں شکار تلاش کرتے ہیں۔ اسی بیچارہ جسم کو دیکھو۔ اس نے جو تکلیف برداشت کی اور جو آرزو کی جان نے خود بخود اُسکی ترجمانی کی۔ اُس نے قاتلانہ خواہش اور شوق خنجر زنی کے بھیس میں ترجمانی کی۔ اُس شخص پر جواب نڈھال ہوا چاہتا ہے، اُس بدی کا غلبہ ہے جو اب بدی ہے۔ وہ اُسی چیز سے تکلیف دینا چاہتا ہے، جو اُسے تکلیف دیتی ہے۔ لیکن دوسرے دور بھی گزر چکے اور دوسری قسم کے خیر و شر بھی۔

ایک زمانہ میں شک اور عزم للنفس شر تھا۔ اس زمانہ میں مریض ملحد یا ساحر کہلائے جاتے تھے اور ملحد یا ساحر کی حیثیت میں تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اور تکلیفیں پہنچانا چاہتے تھے۔

لیکن یہ تمہارے کانوں میں نہیں پہنچے گا "یہ تمہارے نیک لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے" تم کہتے ہو، مگر مجھے تمہارے نیک لوگوں سے کیا سروکار۔

تمہارے نیک لوگوں کی بہت سی باتوں سے مجھے گھن آتی ہے۔لیکن وہ باتیں اُن کی بدیاں تھیں، کاش اُن میں ایک جنون ہوتا جس کے ہاتھوں وہ اُس زرد مجرم کی طرح فنا ہو جاتے۔

میری تمنا ہے کہ کاش اُن میں صداقت، وفاداری، یا انصاف کا جنون ہوتا۔لیکن اُن کی خوبی کا مدار تو زیادہ زندہ رہنے پر اور منحوس خاطر جمعی پر ہے۔میں سیلاب کے کنارہ ایک بارجہ ہوں جو پکڑ سکتا ہے پکڑے، میں تمہاری بیساکھی نہیں۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۷)

نوشت و خواند

تمام لکھی ہوئی چیزوں میں مجھے صرف وہ پسند ہیں جنہیں کوئی اپنے خون سے لکھتا ہے، خون سے لکھ اور تجھے تجربہ ہو جائیگا کہ خون روح ہے۔

غیر مانوس خون کو بسہولت سمجھنا ممکن نہیں۔مجھے آرام طلب پڑھنے والوں سے نفرت ہے۔

جو پڑھنے والے کو جانتا ہے۔پڑھنے والے کیلئے کچھ اور نہیں کرتا۔پڑھنے والوں کی ایک صدی اور ——
اور خود روح میں سے تعفّن اُٹھنے لگے گا۔

ہر شخص کو پڑھنا سیکھنے کی اجازت آخر میں نہ صرف تحریر کو بلکہ تفکّر کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔

ایک زمانہ میں روح خدا تھی پھر انسان ہو گئی۔اور اب یہ عامی تک ہوئی جاتی ہے۔

خون سے تمثیلیں لکھنے والا یہ نہیں چاہتا کہ اُن کو پڑھا جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُن کو حفظ کیا جائے۔

پہاڑوں میں قریب ترین راستہ چوٹی چوٹی ہے۔لیکن اسکے لئے لانبے لانبے پاؤں چاہئیں۔تمثیلیں چوٹیاں ہونی چاہئیں اور مخاطبین بڑے اور لانبے۔

فضا نادرا اور صاف، خطرہ قریب۔اور روح، پُر لطف شرارت سے پُر چیزیں اس طرح خوب میل کھاتی ہیں۔میں اپنے گرد خبیث روحیں چاہتا ہوں، کیونکہ میں جری ہوں۔جو جرأت بھوتوں کو ڈرا بھگاتی ہے وہ اپنے لئے خبیث ارواح پیدا کر لیتی ہے۔وہ ہنسنا چاہتی ہے۔

اب میرا تمہارا ساتھ نہیں، یہ کالے کالے، بھاری بادل جنہیں میں اپنے نیچے دیکھتا ہوں اور جن پر میں ہنستا ہوں، تمہارے لئے وہ طوفانی بادل ہیں۔جب تمہیں رفعت کی خواہش ہوتی ہے تم اوپر دیکھتے ہو اور میں نیچے۔اس لئے کہ میں ارفع ہوں۔

تم میں کون بیک وقت ہنس سکتا ہے اور بلند ہو سکتا ہے؟

جو سب سے اونچے پہاڑوں پر چڑھ جاتا ہے وہ ہر قسم کے المناک کھیلوں اور المناک حقائق پر ہنستا ہے، بے دھڑک، پُر تحقیر، شدید عقل تمہیں ایسا چاہتی ہے۔وہ عورت ہے اور ہمیشہ جنگجو سے محبت کرتی ہے۔

تم مجھ سے کہتے ہو "زندگی برداشت کرنا مشکل ہے" لیکن تمہاری صبح کی خودداریاں اور شام کی دست برداریاں کس کام کی ہیں؟

زندگی برداشت کرنا سخت ہے۔میرے سامنے اتنی نزاکت مت جتاؤ۔ہم سب اچھے خاصے باربرداری کے گدھے اور گدھیاں ہیں، ہم میں اور گلاب کی اُس کلی میں کیا مناسبت، جو شبنم کے ایک ہی قطرہ سے لرزنے لگتی ہے؟

جوانی سے بیعت کریں اہلِ پیری
جوانی زمانہ، زمانہ جوانی

گر زبانِ پیری کے ٹکڑے اڑا دے
جو گستاخ ہو جائے دستِ جوانی

یہ پندارِ پیری کو تنبیہ کر دو
بہت سخت ہے انتقامِ جوانی

ابھی نذر کر دیں جو مانگو دل و جاں
کہ پیری بھکاری ہے سخی ہے جوانی

تڑپ جائے پیری مچل جائے پیری
جو میں چھیڑ دوں اٹھ کے سازِ جوانی

دو عالم کا حاصل دو عالم کا مطلب
جوانی ہماری، تمہاری جوانی

مرادِ دین و دنیا، مرادِ دین و ایماں
محبّت محبّت، جوانی، جوانی

بغاوت جوانوں کا مذہب ہے ساغر
غلامی ہے پیری، بغاوت جوانی

ساغر

(مارچ سنہ ۱۹۳۹ء)

نعرۂ شباب

پئیں ساقیا! کیا جوانی میں پانی — مے ارغوانی! مے ارغوانی!!

زہے فیضِ کیفِ نسیمِ جوانی — یہ راتیں گلابی، یہ صبحیں سہانی

محبت[1] حقیقت، نہ نفرت حقیقت — نہ یہ جاودانی، نہ وہ جاودانی

نہ رہبر، نہ مشعل، نہ جادہ، نہ منزل — چلی جا رہی ہے جوانی دوانی

بڑھاپا جوانی کا مُنہ تک رہا ہے — اُڑی جا رہی ہے، فلک پر جوانی

---

[1] اس "کلمۂ کفر" سے آپ شاعر کی من بیتی کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

WAIT.

The rippling sound of waves,
The soft cool breeze that blows
The bright red sun that sets,
The fading twilight veil,
The deep dense gloom of dusk
That keeps each soul spell bound,
Tne warbling cry of birds,
The calm of blooming buds,
Teaches each this soul to wait,
Wait till death for love,
From there where first I laid,
My true but silent love.

P. R. Paru Kutty Amma.

(۲)

(ترجمہ)

انتظار

سمندر کی موجوں کی سرسراہٹ، بادِ نسیم کا
تموّج، غروب ہونے والا روشن سُرخ آفتاب،
غائب ہو جانے والی نقاب شفق، جھٹ پٹے کی
مسحور کن تاریکیاں، طیور کی زمزمہ سنجی اور
شگفتہ کلیوں کا سکوت ان میں سے ہر ایک
انتظار کی تلقین کرتا ہے تاکہ انتظار کئے جائیں۔
محبّت کیلئے موت تک اس جگہ سے جہاں میں نے
اپنی سچّی مگر خاموش محبّت کی ابتدا کی۔

بادِ جنوب

جنوبی ہند کی ایک شاعرہ کے لطیف جذبات

FRIENDSHIP

(For Asia)

The sacred flame of friendship
lights
Life's lovely darkend deapths,
T'is the vital spark of life
That shines in life's eternal
strife.
How deep and sweet a friends caress,
A balm to those who face distress
Each kindly word a ray of hope.
To those whose hands in darkness
grope,
T'is again a friend's true love,
That lifts our souls to God above,
To tune our lives to friend's
concord
The greatest blessing of the Lord
Scorn not therefore a loyal heart
That nobly loves its friend
throughout.

2nd November 36
P. R. Paru Kutty Amma.

(از محترمہ مس پاروکٹی اماں)

(ترجمہ)

دوستی

دوستی کا مقدس شعلہ حیات کی تاریک گہرائیوں
کو روشن کردیتا ہے۔ یہ زندگی کی قومی چنگاری ہے
جو حیات کی ابدی کشمکشوں میں چمکتی ہے۔ دوست
کی محبت کس قدر اثر پذیر اور لطیف ہوتی ہے۔ یہ مرہم
ہے اُن دلوں کا جو مصیبت سے مجروح ہوں۔ ہر
مہر آگیں لفظ اُن لوگوں کیلئے جو تاریکیوں میں غلطاں
ہوں امید کی ایک کرن ہے۔ یہ محض دوست کی سچّی
محبت ہے جو ہماری روح کو خدا سے ملا دیتی ہے
دوست سے زندگی کی ہم آہنگی خدا کی عظیم ترین
قسمت ہے۔ اس لئے اس وفا پرور دل کی تحقیر
نہ کرو جو اپنے دوست سے محبت کرتا ہے -

(یحییٰ)

'9 ۱۲۷

محبّت کے نامے

بنامِ محبت!؟

زہے فیضِ کیفِ تمامِ محبّت
عداوت ہے مجھ کو پیامِ محبّت

یہ دُنیا زمانوں کی قیدی نہیں ہے
نہ صبحِ محبّت، نہ شامِ محبّت

نگاہیں پیامی، ادائیں ہیں قاصد
دیئے جارہے ہیں پیامِ محبّت

یہ کس کی نگاہوں سے جنّت سی برسی
مہک دے رہا ہے مشامِ محبّت

کلیمِ محبّت ہیں نمناک آنکھیں
ہیں نازک سے آنسو کلامِ محبّت

مری آرزوئیں وفا کی شکاری
پرستاریاں میری دامِ محبّت

محبّت ہمیشہ محبّت رہے گی
نہ بدلا، نہ بدلے نظامِ محبّت

خدا کیلئے آؤ، گھل مل بھی جاؤ
عداوت نہیں انتقامِ محبّت

وہ لغزیدہ لغزیدہ آنا کسی کا
بہکتا ہوا سا خرامِ محبّت

کنکھیوں سے تجدیدِ پیمانِ الفت
وہ نیچی نظر سے سلامِ محبّت

شرابی تبسّم، چھلکتی سی آنکھیں
مجسّم ہیں ساغر وہ جامِ محبّت

(مارچ ۱۹۳۹ء)

ساغر

نیک آدمی قدیم چیزوں کا تحفظ چاہتا ہے۔
شریف آدمی کا نیک ہو جانا خطرہ نہیں بلکہ گستاخ، طعنہ زن اور تباہ کن ہو جانا خطرہ ہے۔
آہ! میں ایسے شریف آدمیوں سے بھی واقف ہوں جو اپنی اعلیٰ آرزوؤں کو ضائع کر کے تمام بلند امیدوں کو بدنام کرنے لگے اور وقتی لذت میں بے شرمی سے بسر کرنے لگے۔ "امروز" سے آگے مشکل سے ہی اُن کا کوئی نصب العین ہوتا ہے۔"
"روح بھی نفس پرستی ہے" یہ کہکر انہوں نے اپنی روح کے بازو توڑ ڈالے۔ وہ اب رینگتی پھرتی ہے اور جس پر دانت لگاتی ہے نجس کر دیتی ہے۔ کسی زمانہ میں اُن کو سورما بن جانے کا خیال تھا لیکن آج وہ نفس پرست ہیں اور وہی سورما اُن کیلئے تکلیف اور دہشت ہے۔
لیکن تجھے میری محبت اور امید کا واسطہ، اپنی روح کے سورما کو علیحدہ مت کر۔ اپنی اعلیٰ امید کو مقدس سمجھ۔
زرتشت نے یہ تقریر کی۔

(باقی) (جملہ حقوق محفوظ)

کیفِ ابدی

(شیخ حسام الدین صاحب حسام لکھنوی)

نہ خطائے دیدۂ شوق ہے نہ دخیل کوئی نقاب ہے — سببِ قصورِ مشاہدہ فقط اعتبارِ حجاب ہے

میں اگر ہوں چپ تو ہے کیا برا مری خامشی کو ہو کیوں گلہ — مری بے نیازیٔ مدعا تری غفلتوں کا جواب ہے

غم یاس دہر کی تلخیاں، گئیں جوشِ عشق میں رائگاں — جو خمار سے نہ ہو آشنا، مرے جام میں وہ شراب ہے

جو شبابِ حسن ہو مضطرب، تو ہے پردہ کوشش رائگاں — جو عیاں رہا وہ جمال ہے جو ہٹا رہا وہ نقاب ہے

غمِ ہجر و عشق کی کشمکش کہ خلش ہے موت و حیات کی — مری صبح روزِ الست ہے، مری شام روزِ حساب ہے

وہ حسام وحشیٔ باوفا کبھی جس سے تم کو بھی انس تھا
تمہیں یاد تک جو نہیں رہا یہ وہی تو خانہ خراب ہے

میں بہت تیزی سے بدل رہا ہوں میرا "امروز" "دیروز" کی تردید ہے۔ میں اکثر چڑھنے میں سیڑھیاں پھلانگ جاتا ہوں۔ اور اس کو کوئی سیڑھی معاف نہیں کرتی۔

میں اونچا ہوتا ہوں تو ہمیشہ اپنے آپ کو یکہ و تنہا پاتا ہوں۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ تنہائی کا پالا مجھے کپکپا دیتا ہے۔ آخر اوپر میرا کیا کام؟

میری تحقیر اور آرزو ساتھ ساتھ بڑھتی ہیں میں جتنا اونچا چڑھتا ہوں اُتنا ہی چڑھنے والے کی تحقیر کرتا ہوں۔ آخر اوپر اُسکا کیا کام؟؟؟

میں اپنے چڑھنے اور ٹھوکر کھانے سے کتنا شرمندہ ہوں، میں بُری طرح سانس پھول جانے کا کس قدر مضحکہ اُڑاتا ہوں۔ میں اُڑنے والے سے کتنا جلتا ہوں۔ میں بلندی پر کس قدر ماندہ ہوں"

یہاں جوان خاموش ہو گیا، زرتشت نے اُس درخت کا دھیان کر کے جس کے قریب وہ کھڑے تھے کہا:۔

"یہ درخت یہاں پہاڑی پر یکہ و تنہا کھڑا ہے۔ یہ انسان اور جانوروں سے بہت اونچا اُگا ہوا ہے۔

اور اگر یہ بات کرنا چاہے تو بھی یہاں اُسکی بات سمجھنے والا کوئی نہیں۔ یہ اتنا اونچا اُگا ہے:۔

اب یہ پیہم انتظار کرتا ہے۔ کس کا انتظار؟ یہ بادلوں کے مستقر سے بہت ہی قریب رہتا ہے۔ غالبًا یہ پہلی برق کا منتظر ہے؟"

زرتشت یہ کہہ چکا تو وہ جوان بھڑک کر چلا اُٹھا "ہاں زرتشت تو سچ کہتا ہے۔ میری خواہش عروج، خواہش تھی میری تباہی کی اور جس برق کا مجھے انتظار تھا وہ تو ہے۔

دیکھ جب سے تو نے ہم میں ظہور کیا ہے میں کیا ہو گیا؟ یہ تجھ سے میرا رشک ہے جس نے مجھے برباد کر دیا"

جوان یہ کہہ کر زار زار رونے لگا، زرتشت نے اپنا بازو اُس کے گرد ڈال دیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔

اور جب وہ کچھ دیر ساتھ ساتھ چل چکے۔ زرتشت نے کہنا شروع کیا۔

یہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ تیری آنکھیں تیرے خطروں کا الفاظ سے بہتر اظہار کرتی ہیں۔

ابھی تو آزاد نہیں۔ تجھے ابتک آزادی کی تلاش ہے۔ تیری جستجو نے تجھے بہت بے خواب اور شب بیدار بنا دیا ہے تو کھلی بلندی پر ہونا چاہتا ہے، بلکہ تیری جان ستاروں کی پیاسی ہے، لیکن تیرے بُرے میلانات بھی آزادی کے پیاسے ہیں۔

تیرے وحشی کتے آزادی چاہتے ہیں۔ تیری روح تمام قیدیں توڑنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنی کوٹھریوں میں خوشی سے بھونکنے لگتے ہیں

میرے نزدیک تو اب تک قیدی ہے۔ جو آزادی کی تدبیر سوچتا ہے آہ! ایسے قیدیوں کی جان تیز ہو جاتی ہے لیکن مکّار اور شریر بھی

جس کی روح رہا ہو چکی ہے اس کو بھی اپنا تزکیہ ضروری ہے۔ اُس میں ابھی تک قید خانے کا بہت کچھ اثر اور بھدّا پن باقی ہے، اُسکی آنکھ ابھی تک صفائی کی محتاج ہے۔

ہاں! میں تیرا خطرہ سمجھتا ہوں، لیکن تجھے میری محبت اور امید کا واسطہ، محبّت اور امید کو مت چھوڑ۔ اب تک تو اپنے آپ کو شریف معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی جو تجھ سے عداوت رکھتے ہیں اور قدسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب تک تجھے شریف سمجھتے ہیں۔ یاد رکھ کہ شریف ہر ایک کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔

یاد رکھ کہ شریف ہر ایک کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔

شریف آدمی نیکوں کے راستے میں بھی حائل ہوتا ہے اور وہ اس کو نیک کہتے بھی ہیں تو اُن کا مقصد اُس کو ایک طرف کرنا ہوتا ہے۔

شریف آدمی جدید چیزوں کی اور جدید خوبی کی تخلیق کرتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہم زندگی سے محبت کرتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ ہم زندہ رہنے کے عادی ہیں بلکہ اس لئے کہ محبت کے عادی ہیں محبت میں عموماً کچھ نہ کچھ جنون ہوتا ہے۔ لیکن جنون میں بھی عموماً کچھ نہ کچھ ہوشیاری ہوتی ہے۔
اور مجھے بھی جو زندگی کا قدر شناس ہے تیتلیاں، صابون کے بلبلے، اور ہم میں کی ان جیسی چیزیں سب سے زیادہ مسرت ہی سے لطف اندوز معلوم ہوتی ہیں۔ ان سبک، سادہ لوح، نازک اور زندہ دل، ننھی ننھی روحوں کی ادھر اُدھر چہل پہل زرتشت کو گریہ و نغمہ پہ مائل کرتی ہے۔
میں تو صرف ایسے خدا کا قائل ہونگا جو رقص کرنا جانتا ہو۔
اور جب میں نے اپنے شیطان کو دیکھا اُسکو سنجیدہ، کامل گہرا، رسم پرست پایا، وہ روح متانت کی۔
اُسکی وجہ سے ہر چیز گر جاتی ہے۔ غصہ نہیں بلکہ مضحکہ قتل کرتا ہے۔ آؤ متانت کی روح کو قتل کر دیں۔
میں نے جب سے چلنا سیکھا، دوڑتا رہا، جب سے اُڑنا سیکھا۔ حرکت میں دوسروں کے ڈھکیلنے کا محتاج رہا۔
اب میں سبک ہوں۔ اب میں دوڑتا ہوں۔ اب میں اپنے آپ سے نیچا معلوم ہوتا ہوں۔ اب میرے اندر ایک خدا رقصاں ہے۔
زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۸)

پہاڑی کا درخت

زرتشت کی آنکھ نے تاڑ لیا تھا کہ ایک جوان اس سے اپنی جان چھپا رہا ہے۔ ایک روز شام کو وہ یکہ و تنہا "مقبرا بلق" کو محیط پہاڑیوں پر جا رہا تھا کہ دفعۃً راہ میں وہ جوان ایک درخت کے سہارے بیٹھا تھکی نظروں سے وادی کو تکتا ہوا نظر پڑا۔
زرتشت نے اُس درخت کو پکڑ کر جسکے پاس وہ جوان بیٹھا تھا کہا "میں اپنے ہاتھوں سے اس درخت کو ہلا دوں، ممکن نہیں لیکن ہوا جسے ہم نہیں دیکھنے اس کو پریشان کرتی ہے اور جدھر چاہتی ہے جُھکا دیتی ہے۔ ہم غیر مرئی ہاتھوں سے بہت بُری طرح جُھکائے جاتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں۔
وہ جوان گھبرا کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا "مجھے زرتشت کی آواز آرہی ہے اور ابھی ابھی میں اُسی کا خیال کر رہا تھا۔"
زرتشت نے جواب دیا:۔
"اس سے ڈرتا کیوں ہے ؟ مگر انسان کی حالت بھی درخت کی سی ہے۔
جتنا زیادہ وہ بلندی اور روشنی میں اُٹھنا چاہتا ہے، اُتنی ہی زیادہ شدت سے اُس کی جڑیں زمین کی طرف جد و جہد کرتی ہیں۔
پستی کی طرف، تاریکی اور گہرائی میں۔ بدی میں"
"ہائیں، بدی میں" جوان چلا اُٹھا "یہ کیسے ممکن ہے کہ تو میرے نفس کو پا گیا ؟"
زرتشت مسکرا کر بولا "انسان اکثر نفوس کو تخلیق کئے بغیر دریافت نہیں کر سکتا"
"ہائیں، بدی میں" جوان پھر چلا اُٹھا۔
"زرتشت تو نے سچ کہا" جب سے میں نے بلندی پر پہنچنا چاہا۔ نہ خود مجھے اپنے اوپر اعتماد رہا اور نہ دوسروں کو یہ کیوں ؟

هزار داستان

ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء
جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۳۹ء
(مشترک نمبر)

مایا

(از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

(بطور خاص "ایشیا" کیلئے)

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ نر گباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ بی۔اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ رادھا جو پرانے خیال کی ماں تھی اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی۔ جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو کہتی "دونوں ابھی ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہیں۔ بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ عیش و آرام کیلئے ابھی ساری عمر پڑی ہے"۔ چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام سکھا رہی تھی اور پاروتی کا سارا دن رسوئی اور ٹھاکر جی ہی کے گھر میں گزرتا تھا۔ رات کو بھی رادھا اپنی بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی جیسے کوئی لاپرواہ مالی گنے کا رس خوب چوس چوس کر پیئے اور بچہ دور سے دیکھ کر للچائے۔ وہی حال بسنت کا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی بیوی کا رس گرہستی کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ سعادتمندی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی۔ آخر ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ بسنت اپنے کمرہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یکبارگی اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"گیاں برجائے ایسی ہوری اُن بن دیہے جبرت موری"

گاؤں میں اُس نے اکثر لوگوں کو پھگوا گاتے سنا تھا۔ مگر اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت ۔۔ "گیاں برجائے ایسی ہوری ان بن دیہے جبرت موری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا گیت میں لڑکیاں اُس کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ پھر دوسری ہولی شروع ہوئی۔

"ہوری آئی سجن نا ہیں آئے دیکھو شیام ہمارے بدیسوا میں چھائے رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیا سنگ ہنس ہنس گروا لگائے
موہے نہ آوے یاد بلم کی عبیر و گلال نہ بھائے ہوری آئی سجن"

اب وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا لیکن اُسے پینے کی اجازت نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہ کر سکتا تھا۔ ماں تو پُرانے خیال کی ہے لیکن وہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اُس کی ماں سو رہی تھی بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں۔ وہ رسوئی گھر میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اُس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بُلایا۔ اُس نے سوچا" پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے" مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی۔ لیکن آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی ——— " آج ان کو کیا ہو گیا ہے ——— مجھے کیوں بُلاتے ہیں ——— ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں ——— اگر میں ان کا حکم نہ مانوں گی تو وہ ناراض ہو جائیں گے ——— اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اُٹھیں تو ——— پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا۔ اُس نے کہا" اجی سُنتی ہو یا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ ———" یہ کہتا ہوا بسنت چھت پر چلا گیا ——— پاروتی سہمی ہوئی اٹھی اور ساس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہنچ گئی۔

"کھڑی کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ"

"جی ———"

"میں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم جی! جی! کی رٹ لگا رہی ہو"

"اگر ماں جی جاگ اُٹھیں اور انھوں نے مجھ کو یہاں دیکھ لیا تو بڑی بُری بات ہوگی"

"یعنی مجھ سے ملنا بُری بات ہے۔ کیا خوب کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہو نا آخر دیہاتن؟"

"لیکن اب تک نہ ملے یہ کس کی بیوقوفی تھی۔ میں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا"

بات معقول تھی۔ لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے انھوں نے کہا" خیر فضول بحث کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ سُنو اور غور سے سُنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا۔ لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب میں چاہتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو اور میرا دل بہلاؤ" اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھا لیا۔

گونا ہونے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو۔ شرم و لجاجت کے ڈر سے وہ کانپنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا ——— ٹھیک اُسی وقت رادھا جو جاگ اٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اوپر پہنچی۔ کمرے کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی رادھا کچھ اس طرح چونک اٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو ——— دوپہر کو روشنی میں یہ نظارہ دیکھ کر نئی روشنی سے متنفر خیالات پر جان دینے والی ماں سناٹے میں آگئی۔ اور چپ چاپ اُلٹے پاؤں نیچے اُتر گئی ——— وہ دل میں سوچ رہی تھی ——— " رام! رام! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی۔ مگر میں نے تو ایسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا۔ کلجگ کا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے"

(۲)

ہوا اور آگ کا میل ہو گیا۔ ادب اور لحاظ سب کچھ محبت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ بیوی کی تربیت ہی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا۔ لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی۔ اب پاروتی دن رات بسنت کے کمرے میں رہنے لگی۔ پاروتی یتیم تھی۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ خیال تھا کہ سسرال میں اُسے آرام ملے گا۔ مگر یہاں آتے ہی رادھا نے اُسے گرہستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا۔ اُس کا حسن و شباب مٹی میں ملنے والا تھا مگر بسنت نے ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو محبت کی آبیاری سے شاداب کر دیا۔ اس کی ناز برداریوں سے پاروتی کے

دل کا باغ لہلہانے لگتا۔

پاروتی حسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو دیہاتی لڑکی پڑھنے سے گھبرائی مگر پھر مجبوراً اُس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا۔ جب دیکھئے کمرے میں سر ہلا ہلا کر پڑھتی رہتی تھی۔ اور ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔ بیچ بیچ میں ترچھی نظروں سے شاگرد کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی کتاب بند کر کے یکبارگی پکار اُٹھتے ——— "پاروتی" ——— پاروتی چونک اُٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس وقت اسکی ہرنی کی سی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوتیں کہ بسنت بے تاب ہو جاتا اور کہتا ——— "اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس...... تو لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو"؟ پاروتی گھبرا جاتی کہ کہیں ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں۔ کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم اُمید ہوا کرتی تھی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی اتنا ہی کالے کالے حروف چیونٹیوں کی قطار کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے نکلتے جاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کے بُلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لیکر جاتی۔ بسنت ایک ہاتھ اس کی کمر میں اس طرح ڈالدیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے پھر دوسرے ہاتھ میں کتاب لیکر کہتا .... "اچھا بتاؤ آج کتنا پڑھا ہے"۔ پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی اُنگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ "اوہو بہت پڑھ ڈالا مجھ کو دیکھو میں تو کچھ نہیں پڑھ سکا"۔

بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی: "تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے"۔

بسنت اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ——— "میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا اور وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی ———"

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی۔ مگر لاج کے مارے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی۔ کبھی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو موقع پاکر پاروتی پڑھتے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آکر پیچھے سے اُس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا ——— "اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟" اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی ——— "واہ جی! واہ۔ میں جان گئی۔ بس اب آنکھیں کھولدو۔ آپ میرے ہردیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چٹکیاں لینے لگتی۔ اور کوشش کر کے یکبارگی کھڑی ہو جاتی۔ اس طرح سے اُس کی آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اس "جنگ عظیم" میں پاروتی کے رخسار بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہو جاتے۔ کتاب دور گر جاتی اور ساڑھی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گزر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آجاتا اور وہ روٹھتی۔ یہ "جنگ عظیم" فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔ پاروتی کے پڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کر کے کہتی ——— "تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں" ———۔ "تو تمہاری کرپا سے میں ہی کون پنڈت ہوا جاتا ہوں"۔ یہ سنکر پاروتی اُٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی۔ "اچھا اب میں سمجھ گئی۔ میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے اب میں یہاں نہ بیٹھو نگی لو جاتی ہوں ———"

بسنت اُس کا ہاتھ تھام کر بٹھا لیتا اور کہتا ——— "اس کا حال تم کیا جانو۔ مجھ کو چھیڑ کر تو تم باسانی پڑھنے لگتی ہو مگر تم کو چھیڑ کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے ———"

"اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی۔"

"یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہارا جی پڑھنے میں لگ جائیگا تو پھر تم مجھے بھول جایا کرو گی۔"

"واہ! واہ! کیا بات بنائی ہے۔"

اسی قسم کی نوک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی۔ اس کے بعد کنوار کی ہلکی بارش کی طرح رونا دھونا شروع ہو جاتا تھا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر بند ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا۔ روتی بھی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا۔ اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی۔

(۳)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلا میں پھنسے تھے۔ اور رادھا گرہستی کے کاموں میں پسی جا رہی تھی۔ اس کو کسی وقت آرام نہ ملتا تھا۔ اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی —— "رہنے دو بہو رانی! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو۔ بسنت دیکھ لیگا تو خفا ہوگا جاؤ جاؤ آرام کرو۔ پڑھو لکھو۔ پنڈتائن بن جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ بڑھی ہوں تو کیا میں اب بھی گرہستی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں جیتے جی بھگوان مجھ کو تمہارا محتاج نہ بنائے۔" یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح لگتے۔ ان الفاظ میں کتنا زہر بھرا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی مگر سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اس کے اشارے پر چلے۔ مگر اب یہ محال تھا۔ پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی۔ وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام دیتا۔ بوڑھی اور کمزور رادھا محنت رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی۔ شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مہلک بیماری کی شکل اختیار کر لی۔ اور رادھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرلوک سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دور ہو گیا۔ اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ دقت پیش آئی کہ گرہستی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی۔ چوکا برتن تو کہاری کر دیتی تھی لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا۔ کچھ دن تک اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا لیکن پھر بیمار پڑ گئی۔ اب بسنت گھبرا گئے اُن کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے بیرٹھی میں اس کی ایک چچیری بال ودھوا بہن مایا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بیرٹھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اُسی گاؤں میں مایا ناامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اُس بیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی۔ ماں لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو یاد کیا اور بسنت سے کہا کہ اگر کہو تو مایا کو میں یہاں بلا لوں۔ بڑی نیک لڑکی ہے اُس سے مجھ کو بڑی مدد مل جائے گی۔"

بسنت: "بھلا تمہارے چچا اُس کو یہاں آنے کی اجازت کیوں دیں گے؟"

پاروتی: "میری بیماری کا حال سُن کر وہ مایا کو ضرور بھیج دیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اُس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائیگی۔"

بسنت نے دوسرے دن ہی مایا کو بلوا بھیجا اور وہ زنانی پور آ گئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اُتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اُس وقت بسنت کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پاروتی پلنگ پر پڑی تھی۔ مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر اٹھ بیٹھی —— آؤ جیجی! اچھی تو رہیں۔ تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی۔

مایا: "بس رہنے دے باتیں نہ بنا یہ تو کہتی نہیں کہ سسرال میں آکر ہم غریبوں کو بھول گئی۔ اُلٹا مجھے الزام دیتی ہے —— خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی یہ تو بتا کہ تیرا کیا حال ہو گیا۔ جیجا سے اچھی طرح بنتی ہے نہ؟

"پاروتی نے مسکرا کر کہا" ہاں خوب یہ ماتما کا ہزار شکر ہے "وہ" مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ نہ کوئی میری بیماری تو یہ بات یہ ہے کہ ساس جی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد سے گھر کا کام مجھ کو سنبھالنا پڑا۔ کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑ گئی۔" جیجی! میں نے اس وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے کہ تم میرا گھر سنبھال لو۔ مجھ اکیلی جان سے گھرہستی کا کام نہیں سنبھل سکتا۔ اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی ـــــ مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو بُرا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلایا ہے کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا ـــــ"

مایا نے منہ بنا کر کہا ـــــ" واہ ری پگلی! بھلا اس میں کون بُرا ماننے کی بات ہے کسی غیر کا تو کام ہے نہیں یہ تو اپنا کام ہے۔

دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آ گئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہو گئی ـــــ"

پاروتی نے بسنت سے کہا ـــــ" یہ لو میری جیجی آ گئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی۔"

بسنت نے مسکرا کر کہا ـــــ" ضرور ـــــ کہو جیجی اچھی تو رہیں؟"

مایا نے کچھ شرما کر جواب دیا۔" ہاں بھیا!"

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو اُن کے کمرے سے کچھ دور پر تھا، رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی ہوئی مایا بہت جلد نندیا دیوی کی گود میں سو گئی۔

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح موقع نہ ملا تھا۔ صبح کو اس نے دیکھا کہ گھر بہت ردّی حالت میں ہے۔ صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے۔ سونے گھر میں کوئی چیز سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی۔ بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی۔ پاروتی بھی بہن کی تعریف سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ پھر آزاد ہو گئی اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ اس نے بھنڈار خانہ کی کنجی مایا کو دیتے ہوئے کہا ـــــ" جیجی! اب میں بے فکر ہو گئی۔ اب تم میرا گھر سنبھال لو گی ـــــ"

مایا نے کنجی واپس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے"

پاروتی:" بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ کنجی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مجھ کو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو ـــــ"

مجبوراً مایا نے کنجی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی۔ اس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا۔ وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے لیکن مایا صبح سویرے ہی اُٹھ کر اُن کے کمروں کو صاف کر آتی۔ بسنت کی کتابیں جو اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے پڑی رہتی تھیں اُن کو ٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی۔ ایک دن پاروتی نے مایا سے کہا" جیجی تم اُن سے شرماتی کیوں ہو۔ اُن سے خوب کھل کر باتیں کیا کرو ـــــ"

مایا اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آ گئے۔ اور انہوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا اُن سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بے تکلف ہو گئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں پاروتی اور بسنت ہنستے بولتے تھے۔ روکنے سے بھی نہ ٹھہرتی تھی۔ لیکن اب وہ اُن کے ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا برائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بسنت کی نگاہوں میں مایا کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ اب اسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن ایسا پھول جو عموماً دوپہر کے وقت کھلتا ہے اور دھوپ سے مرجھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرے پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہوتی ہے۔ جن پر صبح کی شبنم سے نہائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مایا کی آنکھوں میں نشۂ شباب سے سُرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سہاگ کی لکیر نہ تھی۔ اب وہ بیوہ تھی۔ اور ایسی بدنصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے حُسن و شباب پر خزاں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس طرح پودا مرجھانے لگتا ہے لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اُٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہوا۔ جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہوئی تو اس کا غنچۂ دل کھل اُٹھا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی۔ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اُڑا دی اور پھول نکھر کر خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برکھا رت کی اندھیری رات تھی۔ زمینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ واپس ہونے میں اُسے بہت دیر ہوئی مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ پاروتی نے کہا "رات زیادہ ہوگئی ہے۔ آسمان گھرا ہے۔ پانی برسنے والا ہے۔ مگر وہ اب تک واپس نہیں آئے۔"

مایا: "آتے ہی ہوں گے۔"

پاروتی: "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں تو اب سوتی ہوں۔ وہ آئیں تو بھوجن پروس دینا۔ تکلیف تو ہوگی۔"

"نہیں نہیں تکلیف کس بات کی ہے اچھا تم آرام کرو۔" یہ کہکر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب پاروتی تھوڑی دیر میں خرّاٹے لینے لگی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا۔ اب پانی بھی برسنے لگا تھا۔ مایا نے رسوئی گھر سے نکل کر کہا "پارو" (پاروتی) کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر کے سوگئی۔ کہئے بھوجن پروس دوں۔" "او ہو تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو۔" مایا کے رنگیلے رسیلے ہونٹ اس کا جواب دینے کیلئے پھڑک اُٹھے لیکن وہ صرف "جی ہاں" کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر چمکی۔ سفید دھوتی میں مایا کا چہرا جگمگا اُٹھا۔ بسنت کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بسنت نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں وہیں بھوجن کروں گا۔ کمرے میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں۔"

بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس عرصہ میں جلدی جلدی مایا نے آگ جلا کر گرم گرم پوریاں تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اُس نے آسن بچھا کر بھوجن پروسا۔ اور بسنت کے سامنے رکھدیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "مایا! اُف مایا! کتنی ہُنرمند، سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو جادو بھرا ہے۔"

بسنت نے نظر اُٹھا کر مایا کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بسنت کی زبان سے بیخودی میں نکل گیا ——— "مایا!"
مایا نے سر اُٹھایا۔ بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں لڑ گئیں۔ مایا کانپ اُٹھی۔ بسنت کا دل مچل اُٹھا۔ اس کی زبان سے نکل گیا
"آہ! تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو۔ اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمہاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ———"
مایا نے شرما کر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کر سکی۔ "اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ———" یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے اُس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اُس کے لئے معیوب تھیں ——— مگر اس وقت مایا کا جی چاہتا تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت منہ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس کی انگلی کو دبا دیا۔ مایا کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا بچھو نے ڈنک مار دیا اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور رسوئی گھر سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی۔ تمام صحن میں پانی بھرا تھا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ بسنت نے جلدی سے دوڑ کر اُسے اٹھا لیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے لگیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بسنت نے کہا "کہیں چوٹ تو نہیں لگی" "نہیں" کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی غیرت۔ شرم و لحاظ۔ ڈر۔ رسوائی یا اپنی بے کسی پر؟ یہ معلوم نہیں۔ اُدھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی سے گزری۔ "کیا میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ ــــــ؟ وہ گر پڑی تھی اُس کو اُٹھانا کیا میرا فرض نہ تھا ــــــ؟ ــــــ مگر کیا میں پاروتی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں ــــــ کہیں مایا میری شکایت پاروتی سے نہ کر دے ــــــ اُف! پھر تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گا ــــــ مگر اُونہہ شکایت بھی کر دیگی تو میرا کیا ہوگا ــــــ" بسنت کی ساری رات اِسی اُدھیڑبُن میں گزری۔

(۵)

اِس کے بعد کئی دن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے پاروتی سے اس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی لیکن جتنا وہ مایا کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا مایا اُتنی ہی اُس سے دور بھاگتی۔ مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں جب ندی جوش پر آتی ہے تو اس کی تھاہ نہیں ملتی۔ پھر بھی ملاح تھاہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھاہ لے رہی تھی۔ وہ عورت تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ جو سماج کی ستائی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دل میں محبت کے جذبات نہ تھے یا اُس کا دل محبت سے خالی تھا۔ وہ پریم کی پیاسی تھی اُس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے۔ لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اس کا موقع ہی نہ ملتا تھا وہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا تو اس کے دل سے محبت کا دریا پھوٹ نکلا۔ اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہنچی جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شراب محبت کا پیالہ پیش کیا۔ وہ انکار نہ کر سکی۔ جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمک اٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و لحاظ اور خوف و رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا۔

بسنت کا عجیب حال تھا۔ اب اس کو مایا کا لب و لہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اس پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی مایا کے ایک ایک لفظ میں بسنت نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھالی پاروتی کی پریم رس میں بھری ہوئی باتیں اسے پھیکی معلوم ہونے لگیں۔ سچے موتی کی آب و تاب کو جھوٹے موتی کی چمک نے ماند کر دیا۔ شرابی نشہ کے درمیان خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے تاکہ رنگ جما رہے۔ مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی۔ بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا۔ اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا عین اس خمار کی حالت میں جب مایا نے پُرانی شراب نئے رنگین پیالے میں بھر کر ایک عجیب انداز سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہو گیا اس کا سر ساقی کے قدموں پر جھک گیا۔ مگر بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈگمگا دیا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ نہ سنبھل سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہو گئی۔ سرد رُت تھی۔ صاف شفاف دن تھا۔ آسمان نیلگوں تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں پاروتی سو رہی تھی۔ مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی۔ اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے سر پر کوئی کپڑا ابھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک نیم آستین اور ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی۔ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی

اور نیمہ اُستیبن بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرہ کی طرف نکل گیا۔ سوا نتی کو دیکھ کر متوالا پپیہا آپے میں رہے یہ محال ہے۔ مایا کے پلنگ سے دو قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ سب بناؤ اِسی کے تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اِس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "اُف! مایا اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو" یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے۔ مایا گھبرا کر اُٹھی اور بسنت سے دور ہٹکر کھڑی ہو گئی خوف اور شرم سے اُس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ اس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا "مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھہر جاؤ۔ صرف تھوڑی سی دیر کے لئے ٹھہر جاؤ۔ مایا کے قدموں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈالدی۔ بسنت کی محبت آمیز آواز سن کر پاؤں ہی نہیں بلکہ سارے جسم نے ایک بُت کی سی شکل اختیار کر لی۔ بسنت نے جرأت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کانپتے ہوئے دونوں ہاتھ رکھ دئے۔ بسنت کے چھونے سے مایا کے دونوں گال سُرخ اور پیشانی پسینہ سے ہو گئی۔ اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلابی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "کیا مجھ سے خفا ہو۔؟"

"نہیں ـــــ"

"تو پھر مجھ سے کیوں دور بھاگتی ہو مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو"

"مجھ سے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجھ کو میرے حال پر پڑا رہنے دیجئے۔ اگر آپ کا یہ منشا ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے میں کل بسیرے ہی چلی جاؤں گی اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"میں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور ہوں مایا"

"ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لیجا رہا ہو" یہ کہکر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا۔ اور کسی قدر ہٹ کر بولی۔ آپ کا کیا بگڑے گا۔ آپ مرد ہیں مگر میں دُکھیا تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ سماج میں کہیں مجھے جگہ نہ ملے گی"

اونہہ" سماج کا کیا ذکر سماج کو میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس کو ہمارے تعلقات کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا ـــــ"

"جی ہاں پتہ نہ چلنے پائیگا۔ یہ خوب کہی۔ آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں۔ مگر میرے حال پر کرپا کیجئے۔ اور فوراً یہاں سے چلے جائیے کہیں پاروتی آ گئی تو میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں گی"

بسنت نے گویا کچھ سُنا ہی نہیں۔ اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو ـــــ"

زور سے جھٹکا دیکر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(٦)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا۔ وہی پاروتی جس کو وہ کسی وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا وہی پاروتی جس کے لئے اُس نے اپنی ماں کی بھی پرواہ نہ کی تھی اب وہ دن رات اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اُس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت پاروتی سے اب بہت کم بولتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا لیکن پھر اُس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گزرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف

سُنکر خوش ہوا کرتی تھی وہی اب مایا کی تعریف سُنکر جلنے لگی۔ اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہوگئی۔ مرد کے دل کو کس طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کئے بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔ اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا بلکہ اس کی ناتجربہ کاری نے اُسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔ بسنت کو سنبھالنے کے بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہوگئی۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنہ دینے لگی۔ لیکن مایا نے کچھ بُرا نہ مانا۔ اُس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سُنا اور خاموش رہی پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بُری معلوم ہوئی اور اُس نے پاروتی کو بہت لعنت ملامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔ اب وہ ہر کام مایا ہی کے اشارے پر کرتا۔ مایا ہی کی خاطر داری اور ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہو گیا۔ اب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا ہی ہوتا۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سُنائیں۔ مایا جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سُنکر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکی اُس نے کہا۔

"زبان سنبھال کر بات کر"

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔" پاروتی نے مُنہ بنا کر کہا۔

"کیسی؟"

"خود اپنے دل سے پوچھ لو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھی۔"

"سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے۔"

141

"تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ۔ میں تو تمہاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی۔ اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بسیر طمی بھیجدو۔ یہ روز روز کے طعنے شکوے اب مجھ سے نہیں سُنے جاتے۔"

"میں نہ کہوں مگر دُنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے صلہ میں تم میرے پتی کو مجھ سے چھین لوگی اگر مجھے یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بُلاتی۔"

"مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "پاروتی تمہارا خیال غلط ہے پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل اب تک پاک ہے تمہارا سوامی تمکو مبارک ہے۔"

"جیسی باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہاری چال کو خوب سمجھتی ہوں، پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمہارا سوامی تم کو مبارک ہے۔ واہ ری مایا!"

مایا کی بھویں تن گئیں۔ اس نے تڑپ کر کہا۔" پارو! سچ کہتی ہو عورتوں کی ذات ہی مایا وی ہوتی ہے مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں مگر میں واقف ہوگئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی۔ میں نے کچھ جان کر اور کچھ بن جان کر پھندا ڈالا ہے مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا۔ ہماری جاتی کا دھرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا اچھی بات ہے اب ہوشیار ہو جاؤ۔ میں اب بتا دوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے ———"

اتنا کہہ کر عزور، غصہ، اور نفرت کی شکست سے مایا رو پڑی۔ وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی۔ جلدی سے اٹھی اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اس کے سامنے آئے اُسے کاٹ کھاتی ہے اس طرح غصہ سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اگر اُسے سُکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کو جو اُس کی راہ میں کانٹا ثابت ہوگا جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔

اس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کہارن سے دریافت کیا اس نے پہلے تو چھپانا چاہا لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا "وہ اپنی کوٹھری میں ہیں ملکن سے کچھ بات ہوگئی ہے مگر کون بات ہوئی ہے یہ مجھ کو نہیں معلوم رام جانیں۔"

بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے پاروتی سے جاکر غصہ میں پوچھا "مایا کہاں ہے؟"

"واہ ری مایا! مایا ہی سب کچھ ہے۔ میں کچھ نہیں۔ بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر! سچ ہے مرد کی ذات بڑی بیوفا ہوتی ہے ـــــ" یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے تڑپ کر جواب دیا "میں کیا مایا کے پیچھے پھرا کرتی ہوں تمہارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی رہتی ہے اُسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے؟"

غصہ کے مارے بسنت کا بُرا حال ہوگیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ مرد ہوکر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کیلئے تیار نہ تھا اس نے بھی جل کر کہا ـــــ "مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پرماتما جانتا ہے۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جارہی ہو۔ اس کی خوبیاں تمہاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچّی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کرسکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو ـــــ رانی رُوٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی اس کے سوا اور کیا ہوگا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہوگیا۔ یاد رکھنا اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا ـــــ" اتنا کہکر بسنت مایا کے کمرہ میں پہنچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھل گئیں۔ نتیجہ کا خیال کرکے وہ کانپ اٹھی۔ بات اتنی بڑھ جائے گی یہ اُس نے نہ سوچا تھا۔ اس وقت بسنت کی دھمکی سُنکر وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا۔ اُس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچ کر مایا کے کمرہ کی طرف چلی۔ فتح ہوگی یا شکست یہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ مگر مایا کی یہ بات کہ "ہم عورتوں کی ذات ہی مایاوِنی ہوتی ہے" اُسے یاد آگئی۔ پاروتی بھی عورت تھی اُس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہوگی۔ پاروتی بھی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہوگئی۔ مایا کے کمرہ کا دروازہ کھُلا تھا اور وہ پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھی۔ پاروتی دروازہ ہی پر چھپ کر کھڑی ہوگئی کہ بسنت اُسے نہ دیکھ سکے۔ مایا نے کروٹ لی۔ بسنت نے کہا "مایا" محبت بھری آواز سُنکر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا۔

وہ لہریں لطیف تھیں۔ ان سے رگوں میں محبت کا رس دوڑ گیا۔ مایا نے سر اٹھاکر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اور مُنہ چھُپا لیا۔

بسنت نے عاجزانہ لہجے میں کہا ـــــ "مایا سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ کیا پاروتی نے تم کو کچھ کہا ہے؟" مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر رو پڑی۔ بسنت نے بیتاب ہوکر کہا "مایا! مایا! مت روؤ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا۔ میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سُننی پڑتی ہیں۔ لیکن اب آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ پاروتی بیوقوف ہے نالائق ہے میں اس کو ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی۔ تم کو رنج کرنے کی ضرورت نہیں ہے لوبس اُٹھو! میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے . . . ." اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا۔ پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی۔ وہ بڑی مشکل سے اتنا رُک رُک کر کہہ سکی "جیجی! مجھے معاف کردو۔ اب میں تمہارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی . . . . مجھ سے غلطی ہوئی . . . . تم میری بڑی بہن ہو میری رکھشا کرو۔"

مایا گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ پتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دُکھ کی جلتی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک جھگتی پیدا ہوگئی یا رنج و غم کے

۱۴۲

ملے ہوئے پانی میں نہائی ہوئی۔ بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانہ کی دیویوں کی طرح اپنے من کو مار دیا۔ اب وہ معمولی عورت نہیں تھی۔ بلکہ ستی ساوتری عورتوں کی طرح ہو گئی تھی۔ وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی۔ جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ پاروتی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ مایا نے اُسے زور سے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ مایا کا جال آناً فاناً ٹوٹ گیا۔ یہ مؤثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھہرا گیا۔ وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ مایا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں پاروتی کے کمرہ میں پہنچی۔ وہاں پہنچکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے دل کو سنبھالا۔ اور بھنڈار خانہ کی کنجی پاروتی کے آنچل میں باندھ دی۔ ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر دروازہ کھولا اور گھر سے باہر ہو گئی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غیر مانوس تاریکی میں صرف سیاہ رنگ کا پردہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ عجیب و غریب اسرار سے بھی بھرا رہتا ہے۔ اس کے اندر جتنی چمک نظر آتی ہے وہ ایک اجنبی اور غیر مفہوم زبان میں ہمکلام ہوتی ہے جس سے نہ کوئی بولتا ہے نہ جانتا ہے۔ باغ کی گھنی پتیوں سے لدے ہوئے درختوں کی خاموشی اور چٹیل میدان کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں نے بھادوں کی اندھیری رات میں دھندلی سی شکلیں اختیار کر کے مایا کو چاروں طرف سے گھیر لیا ـــــ وہ بسنت کے یہاں بڑے آرام میں تھی۔ اچھے سے اچھا کھانا اور عمدہ کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ وہ بے فکر تھی آزاد تھی۔ لیکن اس کی قسمت میں عیش نہ لکھا تھا۔ پرائے مال پر اس کا کیا اختیار۔ مالک کے سوا کسی غیر کو باغ میں پھول توڑنے کی اجازت نہیں ہوتی جو غیروں کے باغ میں گھس کر رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے دیکھ کر للچا اٹھتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے اسی قسم کی غلطی یا بھول مایا سے بھی ہوئی۔ وہ بھی بسنت کے گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی۔ اُسے گھر کی اصلی ملکہ کا خیال ہی نہ رہا لیکن جب وہ اس بھید کو سمجھ گئی تو پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بسنت کے گھر کو چھوڑ دے۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچ کر وہ اس تاریک رات میں بسنت کے گھر سے نکل پڑی۔ لیکن اَب جائے کہاں؟ یہ اُس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ زمانہ کی ستائی اور سماج کی ٹھکرائی عورت کو کون پناہ دے سکتا ہے اس وقت اس کو اپنے وطن کا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا یاد آیا ـــــ گھر کے سامنے کا پرانا تالاب جس میں بکثرت کائی جمی ہوئی تھی ـــــ وہ نیم کا پیڑ جس میں وہ جھولا جھولا کرتی تھی ـــــ بوڑھے باپ کی شکل ـــــ بچپن کی سہیلیاں ـــــ سب یاد آگئیں ـــــ اپنی شادی کا سماں آنکھوں کے سامنے۔ پھر گیا ـــــ سہاگ اُجڑنے کی منحوس ساعت یاد آگئی ـــــ وہ ایک بیخودی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام کی جانب قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی کہ یکبارگی بادل گرجا بجلی چمکی اُس کا سر چکرایا۔ کسی چیز کی ٹھوکر لگی ـــــ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گری۔ قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے قید ہستی سے آزاد ہو گئی۔ تمام رات پانی برستا رہا۔ رات کی تاریکی ماں کے آنچل کی طرح مایا کے جسم کو ڈھانپے رہی۔ صبح کو جب مایا کی لاش جنگل میں ملی تو تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ وہی بسنت جو کبھی مایا کے لئے اپنی جان قربان کرنے کیلئے تیار رہتا تھا اب اس کو مایا کی کریا کرم کرنے میں بھی غیرت معلوم ہوئی۔ مگر اندر سے اس کا دل ملامت کر رہا تھا ـــــ سماج نے بھی مایا ہی کو قصوروار سمجھا کسی نے اصلیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ـــــ سماج کی نظروں میں ایک بیکس بیوہ عورت کی ہستی وقعت ہی کیا رکھتی ہے وہ تو ایک بیکار شے سمجھی جاتی ہے۔ پھر کسی کو کیا ضرورت تھی کہ بیکس بیوہ کی موت پر کوئی آنسو بہائے یا ہمدردی کا اظہار کرے۔ بیوہ کا فنا ہو جانا ہی سماج کے ٹھیکیداروں کے لئے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اعظم کریوی

ہوا اور احساس

جس طرح ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چراغ کو بُجھا دیتی ہے۔ اُس کا دوسرا فعل یہ بھی ہے کہ چراغ کو بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے شعلوں کو تیز اور بلند کر دیتی ہے۔

اسی طرح انسان کے قلب کی آگ اور اس کی حرارت صحیح کو سرد اور گرم کرنے کے لئے ——— قلب کے پردے احساس کے پنکھے ہوا کا کام دیتے ہیں۔ جس طرح ہوا عفونت اور گندگی کو اڑا کے پھینک دیتی ہے۔ خود پاک اور ذات پاک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح احساس اس کام کو انجام دیتا ہے۔ اسی سے جذبات کی دُنیا میں آگ لگتی ہے اور یہی مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ ذہنیت کی گندگی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ خیالات کی پاکیزگی کو یہی جلا دیتا ہے۔ اور اب ہم اس کو "احساس لطیف" کہیں گے۔ اور اسی کو "جذبہ صادق"۔

....

صادق جذبہ کا کام یہ ہے کہ وہ جذبِ حرارت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ اور گندہ ذہنیت کے ناپاک جراثیم کو مار کر دماغ سے کثافت کو دور کر کے احساس میں لطافت کی قوّت بخشے۔ اور طلب صادق کا حقیقی جذبہ پیدا کرے۔

اِس چیز کے حاصل ہونے کے بعد اب آپ کام کیجئے۔ اُس میں مضبوطی ہوگی۔ استحکام ہوگا۔ اثر ہوگا۔ اثر اور استحکام کا نام ہی اصل میں کام ہے۔ اسی کو کام سمجھئے یا کام کا اچھا انجام۔

عبد الحلیم انصاری

آرٹسٹ سرکارِ عالی

وطن پرستی

(لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی)

افرادِ ڈرامہ

مقام ——— پیپنگ
زمانہ ——— آخر جولائی ۳۷ء

لی شوئنگ (عمر ۲۰ سال)	ایک آزاد سیرت کی بلند حوصلہ لڑکی
لی شوچنگ (لی شوئنگ کی چھوٹی بہن)	ایک نہایت ذہین اور ذرا کمزور کردار لڑکی
مسز لی (عمر تقریباً ۴۰ سال)	ان لڑکیوں کی سوتیلی ماں جو گھر ڈال لی گئی تھی
چنانگ چن (عمر تقریباً ۲۰ سال)	یونیورسٹی کا طالب علم جو پیپنگ کی مغربی پہاڑیوں کی گوریلا جنگ میں شامل ہے
سن چے یوان (عمر تقریباً ۵۰ سال)	ایک غدّار وطن
دونگ ما	خادمہ
جاپانی سپاہی	ایک فوجی افسر
الف	ایک چینی
ب	دوسرا چینی

سین

جس گھر میں مسز لی اور اس کی دونوں سوتیلی لڑکیاں رہتی ہیں اس کا ایک بڑا کمرہ ہے۔ بائیں جانب ایک میز پر کشیدہ کا میز پوش پڑا اور اس پر چند مختلف چیزیں چنی ہیں۔ ایک ٹیبل لمپ ہے ایک ٹائم پیس ہے، ایک چینی کا گلدان ہے، ایک دوات ہے۔ فرش پر پیپنگ کا بنا ہوا ایک قیمتی قالین بچھا ہے اور جا بجا آرام دہ کوچ اور کرسیاں لگی ہیں۔ کمرہ میں آنے کا دروازہ داہنی طرف ہے اور بائیں طرف سونے کے کمرے میں جانے کا دروازہ ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو مس لی شوچنگ بیٹھی خط لکھ رہی ہے، اور مسز لی کرسی پر اُداس بیٹھی ہے۔ دور توپوں کی دھوں دھاں سُنائی دیتی ہے۔ لی شوچنگ قلم رکھ دیتی ہے اور مسز لی سراسیمہ ہو کر کھڑی

ہو جاتی ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔

مسزلی۔ یہ کیا؟ پھر گولہ باری ہونے لگی؟

لی شوچنگ۔ اور کہیں پاس ہی معلوم ہوتی ہے!

مسزلی۔ سن چے یو آنگ، پیپنگ سے چلے گئے ہیں؟ اب جنگ جاری رہنے کے کیا معنی؟ (بیٹھ جاتی ہے) چچا آسن یہاں نہیں آئے وہ آتے تو ٹھیک خبر ملتی!

لی شوچنگ۔ ان کو تو میں نے تیسرے پہر موٹر میں جاتے دیکھا تھا بہت ہی اہم شخص نظر آرہے تھے، ان کی موٹر پر جاپانی جھنڈا لگا تھا اور قنصل خانے کی طرف جارہے تھے۔ ان سے بھلا کیا خبر ملیگی!

مسزلی۔ موٹر پر جاپانی جھنڈا لگا ہونا کوئی بات نہیں۔ کوئی مصلحت ہوگی۔ اور جب تک کوئی سچ مچ غداری نہ کرے ——

لی شوچنگ۔ تو وہ غدار نہیں؟ معلوم ہو جائے گا!

مسزلی۔ (کھڑی ہو جاتی اور خفا نظر آتی ہے) تم طالب علموں میں یہی تو خرابی ہے۔ ہر آدمی کو غدار اور وطن فروش سمجھ لیتے ہو۔ چچا آسن سے ہمارے خاندان کے پرانے تعلقات ہیں؛ تمھارے باپ ان کو بھروسہ کا آدمی سمجھتے تھے، اور میں بھی ان سے خوب واقف ہوں۔ وہ کسی دن بڑا کام کر دکھائینگے

لی شوچنگ۔ بڑا کام! بہن (شوئنگ) کہتی تھی کہ وہ ہر وقت متسوئی کے پیچھے کتے کی طرح پھرا کرتے ہیں۔ انھیں بس ایک کام یعنی جاپانیوں کو ''کاؤٹاؤ'' (چینی زمین بوسی کا طریقہ) کرنا خوب آتا ہے!

مسزلی۔ یہ متسوئی کیا جاپانی سفیر ہے؟

لی شوچنگ۔ نہیں، ملٹری اٹاچی!

مسزلی۔ شوئنگ کا کہنا اعتبار کے قابل نہیں۔ چچا آسن ایک ملٹری اٹاچی کو ''کاؤٹاؤ'' کرسکتے ہیں؟ سفیر کی بات دوسری ہوتی! (اچانک چپ ہو جاتی ہے)

لی شوچنگ۔ تمھیں شاید خبر نہیں۔ جاپان فاشیت کا ملک ہے جہاں سفیر کو بھی ملٹری اٹاچی کا حکم ماننا پڑتا ہے!

مسزلی۔ نہ جانے شوئنگ یہ سب ہفوات کہاں سے سن آتی اور تمھیں سناتی ہے، وہ سخت لیفٹ (LEFT) ہے!

لی شوچنگ۔ (تمسخرانہ) معلوم نہیں ——

مسزلی۔ (شوچنگ کے شانے کو تھپک کر نرم لہجے میں) ننھی اپنی بہن کی ذرا دیکھ بھال رکھو، صبح سے نکلی ہے اور ابھی تک نہیں پلٹی۔ اس زمانہ کے طلبا سیاست میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں! حالانکہ طالبعلموں کے لئے —— کیا کہوں —— امتیاز کرنا بہت ضروری ہے!

لی شوچنگ (کچھ بیتابی سے گردن کو ہلاکر) میں اسے سمجھتی ہوں، مگر شوئنگ ——

(وونگ ما خادمہ ترے میں چائے کی دو پیالیاں لیکر آتی ہے)

وونگ ما۔ اللہ! ابھی ابھی گلی میں کیسی گڑبڑ تھی! لوگ کہہ رہے تھے کہ جاپانی فوج شہر میں گھس آئی ہے! سارا بازار بند ہے، چاروں طرف رکشائیں اور موٹریں بھاگی پھر رہی ہیں!... ......مس شوئنگ ابھی نہیں پلٹی...... خدا خیر رکھے! کھانا تیار پڑا ہے!

مسزلی۔ (دروازہ کی گھنٹی سنکر) یہ کون آیا؟

وونگ ما۔ (ترے میز پہ رکھ کر) مس شوئنگ ہوں گی، دیکھتی ہوں۔

(وونگ ما جاتی ہے پھر مس شوئنگ داخل ہوتی ہے)

لی شوئنگ۔ اوہو! (کوچ پر بیٹھتے ہوئے) تم کیا جانو مجھ پر کیا گزر گئی! سر پھٹا جارہا ہے!

مسزلی۔ اتنی دیر کہاں لگائی، شوئنگ؟ تم نے مناہی کے دکرفیو آرڈر) حکم کا بھی خیال نہ کیا؟

لی شوئنگ۔ (طنز کے لہجے میں) مناہی کا حکم! کیسی مناہی؟ کس بات کی مناہی؟ پیپنگ اب بالکل محفوظ مقام ہے! تم نے سنا نہیں؟ گلیوں کے موڑوں پر بالو کی بوریاں ہٹادی اور خندقیں بھر دی گئی ہیں؟ اب مناہی جاری رکھنے سے فائدہ؟ ....شوچنگ، میری جو حالت ہے تم جان نہیں سکتیں!

لی شوچنگ۔ چپ ہو جاؤ شوئنگ، بک بک کے اور جان ہلکان کررہی ہو!

آج جو کچھ ہوا، اس سے ہر شخص متاثر ہے، پر اب کیا
ہو سکتا ہے!

لی شوئنگ۔ سچ ہے، اب کیا فائدہ ہوگا! ...... یہ تم کیا لکھ رہی تھیں
...... تعجب ہے، یہاں بیٹھی تم لکھ کیسے سکتی ہو۔ گویا بڑے
امن و امان کا وقت ہے!

لی شوچنگ۔ میں بھیّا کو خط لکھ رہی تھی ......

لی شوئنگ۔ سمجھتی ہو تانکنگ خط پہنچ جائے گا؟ ہوش میں آجاؤ! تمام
رسل و رسائل موقوف ہو گئے! پیپنگ ہانکو اور پیپنگ
سوئیاں لائنیں بند ہو گئیں، اور یہ اب ایک مُردہ شہر ہے
اب تو قتل عام کا انتظار کرو!

لی شوچنگ۔ خدا کے لئے بہن غصّے سے جی نہ جلاؤ (توپوں کی دھوں
دھاں پھر سُنائی دیتی ہے) وہ دیکھو پھر گولے برسے!

لی شوئنگ۔ (ایک دم سے کھڑی ہو کر) ٹھیک کہتی ہو! مگر موقع آگیا ہے
کہ جاپانی فوجوں پر حملہ کر دیا جائے۔ گولہ باری بھی زیادہ
قریب ہوتی جارہی ہے۔ مجھے پورا الیقین ہے کہ اس وقت
ہزاروں جاپانی سپاہی کھونے جارہے ہیں......
کم از کم میری خواہش یہ ہے!

وونگ ما۔ (چائے کی ایک اور پیالی لاتی اور شوئنگ کو دیتی ہے)
مس شوئنگ اب تم ذرا لیٹ رہو۔ کوئی کام نہ ہو تو آپ
بھلے اور اپنا گھر! باہر بڑا خطرہ ہے۔ ابھی ابھی ......

لی شوئنگ۔ بس چُپ رہو، میں کچھ سُننا نہیں چاہتی!

مسز لی۔ (سخت لہجے میں) کرم کر کے وونگ ما کو اس طرح تو نہ جھڑکو
وہ تو تمہارے بھلے ہی کی کہہ رہی ہے، اور بازاروں
میں جا کر چندہ اکٹھا کرنا اور کیمپوں میں جا کر سپاہیوں کی
دیکھ بھال اور ان کے آرام کی فکریں کرنا...... میں
پوچھتی ہوں، اس سے ہوگا کیا؟ پیپنگ ہاتھ سے گیا،
اب تم کر بھی کیا سکتی ہو؟ کچھ بھی نہیں! پھر تمہاری اکیلی
وطن پرستی سے کیا کام بنے گا۔ تم گھومتی پھرتی ہو...
...... کوئی گولی آلگی تو؟ ......

لی شوئنگ۔ (سوتیلی ماں کی باتوں پر دھیان نہ دھرتے ہوئے چھوٹی
بہن سے) کیا بجا ہوگا؟

لی شوچنگ۔ آٹھ بجکر دس منٹ ہوئے ہیں۔

لی شوئنگ (اپنی گھڑی کو کوکتے ہوئے) گھڑی بھی بند ہو گئی۔ (وقت
گزرنے ہی میں نہیں آتا دکھڑی ہو جاتی ہے اور بے خیالی
کی حالت میں سگرٹ سلگاتی ہے) توبہ! کتنا بُرا مزا ہے!

لی شوچنگ۔ تمہارے سر میں تو درد ہے! سر کے درد میں سگرٹ مفید
نہ ہوگا!

لی شوئنگ۔ سگرٹ نہ پیوں تو درد بڑھ جائے گا (ماں سے) کیا تم
مجھے ایک چینی نہیں سمجھتیں جو یہ اُمید کرتی ہو کہ جاپانی
ہمارے ہزاروں بھائیوں کو ذبح کر رہے ہوں، اور
میں گھر میں بیٹھی رہوں؟ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا! میں الگ
تھلگ بیٹھی رہوں تو پاگل ہو جاؤں گی! جاپانیوں کا
غلام بنجانے کے بدلے مجھے جان دیدینا پسند ہے!

مسز لی۔ (نہایت سکون اور شانتی سے) جاپانی اب اور ظلم نہ کریں گے
ہم اگر چُپ چاپ بیٹھے رہیں تو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔
(پھر گھنٹی بجتی ہے اور مسز لی اُٹھتی ہے)

مسز لی۔ اب کے تو چچا سَن معلوم ہوتے ہیں۔
(وونگ ما داخل ہوتی ہے)

وونگ ما۔ کوئی مسٹر چنانگ آتے ہیں، کہتے ہیں رشتہ دار ہیں۔

مسز لی۔ (مایوسی سے) مسٹر چنانگ! چنانگ کیا؟ کیا رشتہ ہے
بتایا نہیں؟ (وونگ ما چپ رہتی ہے) پوچھا نہیں؟

لی شوئنگ۔ ان سے ہم خود پوچھیں تو زیادہ مناسب ہوگا (وونگ ما سے)
جاؤ بُلا لاؤ۔
(شوئنگ سگرٹ بجھا دیتی ہے۔ وونگ ما جاتی
اور چنانگ چن کے ساتھ آتی ہے)

چنانگ چن۔ مس لی شوئنگ؟

لی شوئنگ۔ میرا نام ہے ——

چنانگ چن (بہت نرم لہجے میں) اوہ! آپ شاید مجھے نہ پہچانیں میں

نام چنانگ چن ہے، میرے والد چانگ ٹینگ چن ہیں۔۔۔۔
۔۔۔۔ آپ کی ماں میری خالہ تھیں۔۔۔۔۔۔

لی شوئنگ۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔۔۔ نانکنگ میں بھیا نے تمہارا ذکر تو کیا تھا۔ بیٹھئے بھائی! (مسز لی سے تعارف کراتے ہوئے) یہ ہماری دوسری ماں ہیں (چنانگ چن گردن خم کرتا ہے) یہ میری بہن لی شوچنگ ہے (چنانگ چن دوبارہ گردن خم کرتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے) (مسز لی سے) چیانگ بھائی نانکنگ میں رہتے ہیں۔

مسز لی۔ اوہ! ۔۔۔۔۔۔

لی شوئنگ۔ گھر پر تو سب خیریت ہے؟ وہ لوگ تو پیپنگ آچکے ہیں؟

چنانگ۔ سب اچھے ہیں، شکریہ۔ حال میں والد آنے والے تھے۔ پر والدہ کی تندرستی خراب رہتی ہے اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔

لی شوئنگ۔ تم یہاں کب آئے؟

چنانگ۔ کچھ دن ہو گئے۔۔۔۔۔۔ نیشنل پیکن یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ جب یہاں پہنچا تو سنا کہ خالو کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ آپ لوگ دکن چلے گئے ہوں گے اور پڑھائی میں بھی لگا رہا۔ میرے دریافت نہ کر سکنے اور اب سے پہلے نہ آنے کی یہ وجہ ہو گئی۔ مجھے امید ہے کہ میری اس غلطی کو معاف کر دیا جائیگا۔

مسز لی۔ یونیورسٹی تو یہاں سے بہت قریب ہے نا؟

چنانگ۔ جی ہاں، دور نہیں!

لی شوئنگ۔ یونیورسٹی میں، بھائی کوئی خاص خبر آئی؟

چنانگ۔ نہیں کوئی خاص خبر تو نہیں ملی۔ رات واقعات اچانک رونما ہوئے۔ ہلوگ تو آج صبح سے پہلے بالکل بے خبر تھے اطلبا، چلے جانے کی فکروں میں ہیں ــــــ

لی شوئنگ۔ تو کیا ریلیں چل رہی ہیں؟

چنانگ۔ پہلے سنا گیا تھا کہ سوئیاں لائن مانگٹو تک جاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بھی بند ہو گئی۔

مسز لی۔ (بیچ میں دخل دیکر) شہر کے دروازے تو سب بند ہیں۔۔۔۔۔ کیوں نا؟ پیپنگ سے جانے کی تو اب صورت ہی نہیں!

لی شوئنگ۔ بھائی تمہارا یونیورسٹی میں رہنا خطرے کی بات تو نہیں؟

چنانگ۔ کہا نہیں جا سکتا ــــ آج صبح حکام یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ سب اپنی واپسی کی جلد تیاری کر لیں اور یونیورسٹی طلبا کی سلامتی کی ذمہ دار نہیں! اسی لئے میں یہاں آیا کہ اگر دو دن کیلئے یہاں ٹھہر سکوں تو ــــ ریل کھل گئی تو میں چلا جانا چاہتا ہوں۔

لی شوئنگ۔ (مسز لی سے) ہمارا خالہ زاد بھائی یہاں نہ ٹھہریگا تو اور کہاں ٹھہرے گا! میں شوچنگ کے کمرہ میں اٹھ جاؤں گی یہ میرا کمرہ لے سکتے ہیں ــــ حالات ہی ایسے ہیں!

لی شوچنگ۔ ایسے حالات میں یونیورسٹی میں رہنا خطرناک ہوگا؟ بھائی جلدی کرو اور یہاں اٹھ آؤ۔

چنانگ۔ شکریہ، بہن بہت بہت شکریہ! مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے سبب آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، اور کمرے کی تو مجھے ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ کسی جگہ بھی سو رہونگا ۔۔۔۔۔۔ فرش پر سو رہوں گا!

لی شوچنگ۔ تم فکر نہ کرو بھائی، سب ٹھیک ہے، آج ہی آجاؤ گے نا؟

چنانگ۔ (اٹھتے ہوئے) جی ہاں، اب میں جا کر سامان لے آتا ہوں۔

لی شوئنگ۔ ٹھیک ہے، جلدی آنا، اندھیرا ہو چکا ہے اور مناہی کا گھنٹہ قریب ہے۔

چنانگ۔ مجھے معلوم ہے، لیکن میں نے آپ سب کو پریشان کیا، خدا حافظ!

(چنانگ جاتا ہے)

مسز لی۔ (خفگی کے لہجے میں) تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟ اس لڑکے کو ایسے وقت میں بلا رہی ہو! خدا خیر ہی کرے۔۔۔۔ پہلے ہی کیا کم پریشانی ہے!

لی شوئنگ۔ ہے تو خالہ کا بیٹا، ایسے وقت پناہ نہ دینا برا ہوگا اور

کس مُنہ سے انکار کیا جاتا!

مسز لی۔ میں بُرائی کب کہتی ہوں، یہ زمانہ نہ ہوتا تو کوئی بُرائی نہ تھی، پر آج کل...... مشکلات کو خود دعوت نہ دینا چاہیئے۔

لی شوئنگ کیا وہ کوئی ڈاکو ہے؟...... (بلند آواز کرکے) یا اُسے کوئی غدّار سمجھتی ہو؟

لی شوچنگ۔ خدا کے لئے لڑو تو ہو مت، وہ زیادہ دن تو ٹھہرنے والا بھی نہیں، جیسے ہی ریلیں چلنے لگیں، رخصت ہو جائے گا۔ اُس نے خود ہی کہا ہے۔

مسز لی۔ (بہت خفا ہو کر) تم بکواس کر رہی ہو، آخر اس گھر کی مالک کون ہے؟ کوئی آکر گھر کی تلاشی لے تو کیا کروگی؟ تمہیں جو اپنی سی کرنا ہے اور اُسے یہاں ٹھہرانا ہے تو میں چلی جاؤنگی تمہیں جو دیکھے سو کرنا (کھڑی ہو جاتی ہے گویا سچ مچ اپنے کہے پر عمل کرنا چاہتی ہے) لیکن ٹھیک اسی گھڑی میں سن ہیچے یونگ ایک اہم شخصیت بنائے، اٹاچی کیس ہاتھ میں لئے داخل ہوتا ہے۔ مسز لی اسے دیکھ کر مُسکرانے لگتی ہے)

سن۔ او ہو، یہاں کتنا سکون ہے! میں تو سمجھا تم لوگ گھر میں نہیں، ہا! ہا! ہا!

مسز لی۔ چچا سن، آپ آئے تو، کہاں رہے، ہم ہر وقت راستہ دیکھتے رہتے تھے!

سن۔ ہا! ہا! شکریہ! میں خوش ہوں کہ مجھ سا بوڑھا ابھی تک خوش آمدی سُن سکتا ہے۔

لی شوئنگ۔ (مصنوعی زور کی ہنسی ہنسکر) چچا آج تو بہت مصروف رہے ہوگے؟

سن۔ (بیٹھتے ہوئے) ہاں، یوں ہی سا، حالت یہ ہے کہ کوئی آدمی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں، میرے اوپر زبردستی بوجھ ڈالا گیا ہے۔ پندرہ لاکھ پیپنگ نواسیوں کی بھلائی کے خیال سے میں اپنی جان تو بچا نہیں سکتا تھا، ہا! ہا! ہا!

لی شوئنگ۔ ان پندرہ لاکھ پیپنگ والوں کا جو ذبح ہونے والے تھے

اب کیا ہوگا؟

مسز لی۔ شوئنگ، چچا کو ذرا دم تو لینے دو...... ملکی باتیں چھیڑ کر انھیں پریشان نہ کرو۔

سن۔ کوئی حرج نہیں، سب ٹھیک ہے، بعض وقت خیالات کا ظاہر ہو جانا نتیجہ خیز ہوتا ہے، اب ضروری سوال تو یہ ہے کہ تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟

مسز لی۔ (سن کے قریب پہنچکر اور اس کے شانے پر ہات رکھکر) تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ تازہ خبر کیا ہے؟

سن۔ خبر؟...... صبح تڑکے جاپانی فوجیں شہر میں داخل ہو جائیں گی، اور رات میں گڑبڑ کا بڑا امکان ہے۔ تم یہاں سب عورتیں ہو اس لئے چند روز کے لئے میرے یہاں چلی چلو، موقعہ خطرے کا ہے، جاپانی سپاہی تند مزاج ہوتے ہیں، ان کا کوئی کام خلاف اُمید نہ ہوگا!

(وونگ ما چائے لیکر آتی ہے)

وونگ ما۔ یہ بہت اچھی بات ہے (سن سے) مسٹر سن ہم لوگوں کو آپ کا بڑا سہارا ہے، ہم اگر نانکنگ پہلے جاتے تو——

سن۔ آخر خاندانی تعلقات ہیں، میرا فرض ہے کہ ہر ممکن امداد کروں! مس شوئنگ میری تجویز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

شوئنگ۔ شکریہ چچا سن، لیکن میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو یہیں ٹھہرنا چاہیئے——

سن۔ مس شوئنگ، شاید تم نے موقعہ کی نزاکت کو نہیں سمجھا چینی پولس خالی بندوقیں لئے پھر رہی ہے، چینی فوج شہر چھوڑ کر گئی تو ساری گولی بارود بھی ساتھ لے گئی، اور باتیں تو کیا بتاؤں—— اگر چوریاں ہی ہونے لگیں؟

لی شوئنگ۔ میں یہیں رہوں گی، شوچنگ تم چلی جاؤ۔

لی شوچنگ۔ اس محلہ میں ہم اکیلے تو ہیں نہیں اور پھر یہ کیسے یقین ہے کہ چچا کے یہاں محفوظ ہوں گے؟

سن۔ اوہ...... تم نے میرا مطلب ہی نہیں سمجھا (دُھنٹی بجتی ہے) یہ کون آیا؟

(دونگ ما جاتی اور پھر چیانگ چن کیساتھ واپس آتی ہے)

لی شونگ۔ میں تعارف کرادوں۔ یہ چچا سن چے یوانگ ہیں، والد کے پُرانے دوست، یہ ہمارے خالہ زاد چیانگ چن ہیں۔

چیانگ۔ (گردن کو خم کر کے اور سامان رکھ کر) چچا سن .....

سن۔ بیٹھیئے، مسٹر چیانگ کہاں سے آرہے ہو؟

چیانگ۔ یونیورسٹی سے ...... دو دن یہاں ٹھیروں گا۔

سن۔ (گردن سے اشارہ کرکے) تمہاری یونیورسٹی .....

چیانگ۔ نیشنل پیکن یونیورسٹی!

سن۔ (چیانگ کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) اس زمانہ میں طلبا کو بہت شانت رہنا اور راستے آپ پر قابو رکھنا چاہیئے۔

لی شونگ۔ بھائی چچا سن امن سبھا کے ممبر بھی ہیں!

چیانگ۔ او ہو، مجھے کیا خبر تھی کہ میں ایک بڑی اور اہم ہستی سے مخاطب ہوں! پھر بھی، چچا سن میں جاننا چاہتا ہوں، کہ پیپنگ نواسیوں کو آپ کیسے امن میں رکھ سکیں گے؟

سن۔ بیشک، بیشک (گلا صاف کرتے ہوئے) شہر کو پُرامن رکھنے کے لئے پلی کرتی اور کمیونسٹوں سے شہر کو پہلے پاک کرنا ہے!

چیانگ۔ جاپانیوں سے نہیں؟

سن۔ اوہ! اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ جو کام ہوپی چہار پولیٹکل کونسل نہ کرسکی وہ ہم کر دکھائیں گے! (توپوں کی دھوں دھاں پھر سنائی دیتی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتا اور سب چپ رہتے ہیں)

لی شونگ (خموشی دور کرتے ہوئے) کتنے زور کی آواز ہے.....

لی شو چینگ (ہیجانی حالت میں) جتنی زور کی ہو اتنا ہی اچھا ہے!

لی شونگ۔ چچا سن یہ تو ہماری توپیں جاپانیوں پر چل رہی ہیں نا؟

سن۔ ہا! ہا! ہا! سچ مچ بچہ ہو! چینی جاپانیوں کو روک کیسے سکتے ہیں؟ ایک جاپانی افسر نے مجھے بتایا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ چینیوں کو ہوانگھو کے جنوب تک دھکیل دیں گے۔ ہا! ہا! ہا! تم افواہوں پر یقین نہ لایا کرو۔ کل اخباروں میں تم نے بھی پڑھا ہوگا کہ چینیوں نے فینگ ٹائی، منگفان، اور ٹنگ چاؤ چھین لئے، یہ چینی پروپیگنڈا ہے اور کچھ بھی نہیں!

چیانگ۔ چچا سن، آپ کی امن سبھا اس بارے میں کیا کرنے والی ہے کہ جاپانیوں نے چین کا بڑا علاقہ لے لیا ہے اور ہزاروں چینیوں کو آج بھی ذبح کر رہے ہیں؟

سن۔ (فخریہ) تم نے بہت بڑا سوال کر دیا! تم تو جانتے ہو گے کہ نانکنگ گورنمنٹ نے ہوپی کو فوج بھیج کر ہوامیٹسو کا معاہدہ باطل کر دیا قصور نانکنگ گورنمنٹ کا ہے اور ہم جاپانیوں کو الزام نہیں دے سکتے۔ درحقیقت امن سبھا اس حالت میں کچھ نہ کر سکے گی۔

لی شونگ (بے چینی سے ہاتھ مل کر) چچا سن، آج مٹسوئی سے ملاقات کا نتیجہ تو اطمینان بخش ہوگا؟

سن۔ (ٹالنے کے طور پر) میری ملاقات ڈپلومیٹک اغراض سے تھی، میں پھر سمجھتا ہوں کہ افواہوں پر یقین نہ کیا کرو۔

لی شونگ۔ میں نے افواہ تو کوئی سُنی نہیں، البتہ اکثر لوگ چرچا کر رہے تھے کہ بعض چینی مٹسوئی کی دُم سے لگے پھرتے اور اُسے کاؤتاؤ (زمین بوسی) کرتے پھر رہے ہیں، اور وطن فروشی میں اوّل نمبر رہنا چاہتے ہیں! ایسے غدّار چینیوں کو چچا آپ نے مٹسوئی کے پاس ضرور دیکھا ہوگا؟

سن۔ ایسی کوئی بات میں نے نہیں سُنی (اور مصنوعی حیرت ظاہر کرتے ہوئے) کیا طلبا کو معلوم ہو گیا ہے کہ جاپانی فوجیں صبح شہر میں داخل ہوں گی؟

لی شونگ (بہت نرم اور ٹھنڈے لہجے میں) چچا، سب ہی چینی غدّار نہیں!

لی شو چینگ (پر ہیجان آواز میں) غدّار تو ایک دو ہی بہت ہوتے ہیں! زیادہ ہوتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔

سن۔ (اُٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہے ــــ اوہو میں بھول ہی

گیا تھا۔ ایک نہایت ضروری کام رہ گیا ـــــ اب میں جاؤں گا!
آپ لوگ معاف کریں، اور چونکہ مکان تبدیل کرنے کا مسئلہ
طے نہیں ہوا ہے، دوسرے وقت گفتگو کرلیں گے (مسز لی سے)
مسز لی آپ شو ننگ اور شو چنگ کو سمجھائیے کہ ضد چھوڑ دیں

مسز لی۔ چچا سن، میں نے طے کر لیا ہے (کھڑی ہوتے ہوئے) میں
آپ کے آنے سے پہلے ان سے یہی کہہ رہی تھی کہ یہ جو چاہیں
کریں، میں یہاں نہ ٹھہروں گی، مہربانی کر کے ذرا ٹھہریئے۔ میں
آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔

سن۔ (بہت خوش ہو کر) بہت خوب، تم میرے ساتھ چلو اور ان
کے لئے کل موٹر بھیج دوں گا۔

لی شو ننگ۔ چچا میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا کروں گی!

(مسز لی اور سن چلے جاتے ہیں)

لی شو چنگ (تیز اور بلند آواز سے) غدّار! غدّار!! غدّار!!!

چنانگ۔ (چپ کرنے کی کوشش میں) بہن وہ ابھی گئے نہیں ـــــ
سُن لیں گے!

لی شو ننگ (دانت پیس کر) ایسے غدّار ایک کتّے سے بھی بُرے ہیں!

لی شو چنگ۔ اوہ، بہن! مجھے نہیں برداشت ہوتا! میں ـــــ

(چیخ چیخ کر رونے لگتی ہے)

چنانگ۔ شو چنگ، غریب! اسے کیا الزام دیا جا سکتا ہے ـــــ
کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا، آج شام کو میں نے ہی
شمین کے دروازے پر جاپانی جھنڈے اُڑتے دیکھے تو
مکڈین میں ۱۸ ردسمبر کا دن یاد آ گیا اور مجھ سے بھی اس وقت
ضبط نہ ہو سکا۔

لی شو ننگ۔ خالی رنج کرنے سے کچھ کام نہیں بنتا، ہمیں کچھ کرنا ہے سہی
کہ ہم کوئی بڑی خدمت نہیں بجا لا سکتے، لیکن وطن کی چھوٹی
خدمت بھی بڑی خدمت ہے! (شو چنگ کو بیچ پر بیٹھ کر
سر کو دونوں ہاتھوں میں رکھ لیتی ہے، پھر ذرا چپ رہنے
کے بعد ہینڈ بیگ سے سگرٹ کی ڈبیا نکال کر چنانگ کی
طرف بڑھاتی ہے) پیتے ہو؟ (چنانگ سر ہلا دیتا ہے)
میں تو پیونگی! (دیا سلائی کے لئے کھڑی ہوتی ہے تو
سن کا اٹاچی کیس دیکھ کر جھلا جاتی ہے اور غصّہ میں اُٹھا کر
سونے کے کمرے میں پھینک دیتی ہے) غدّار کا اٹاچی کیس!۔
ـــــ مجھے اس کی صورت زہر لگتی ہے!

لی شو چنگ۔ بہن، اب رہنے دو، تم نے بہت سگرٹیں پی ہیں! یہ شاید
بارہویں ہوگی! سو نہ سکو گی۔

چنانگ۔ ہاں، اب ہمیں بہت ٹھنڈے مزاج رکھنے کی ضرورت ہے،
جذبات کو ذرا دبانا چاہئے، اور سوچ کر کوئی راستہ
نکالنا چاہئے!

لی شو ننگ۔ ٹھیک ہے، مگر میں ـــــ

(اسٹیج سے الگ زور کا شور غل سُنائی دیتا
ہے اور یہ تینوں گھبرا کر ایک دوسرے کو
دیکھتے ہیں)

لی شو ننگ۔ سنو! کون ہے؟

لی شو چنگ۔ وونگ ماں نے دروازہ کھلا تو نہیں چھوڑ دیا ـــــ

چنانگ۔ مہربانی کر کے چپ ہو رہو (دروازے تک جا کر پکارتا ہے)
کون ہے؟ کون ہے؟

(ایک جاپانی فوجی افسر نشے سے ڈگمگاتا ہوا
بڑھتا ہے جس کے پیچھے دو چینی غدّار بھی ہیں،
افسر چنانگ کو بُری نظر سے دیکھتا ہے)

جاپانی افسر (چنانگ کے مُونھ پر تماچہ رسید کر کے) گھناؤنے سور!
(چنانگ پیچھے کی طرف ڈگمگا جاتا ہے) کیا چیخ رہا ہے؟
(پھر پستول نکال لیتا ہے، مگر لڑکیوں کو دیکھ کر بدنیتی سے
دانت بھینچ لیتا ہے) ہا! ہا! کیسی پیاری صورتیں ہیں!
(بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لینا چاہتا ہے۔ چنانگ روکنا چاہتا
ہے، مگر دونوں چینی اُسے پکڑ لیتے ہیں)

چینی الف۔ خبردار سور، جو قدم بڑھایا!

چنانگ۔ (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) تم کون ہو؟ کیا
چاہتے ہو؟

جاپانی افسر۔ (دونوں چینیوں سے) اسے پکڑ کے تلاشی لو!
(چنانگ کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لیجایا جاتا ہے جاپانی افسر لڑکیوں سے دست درازی کرتا ہے)
جاپانی افسر۔ (شوئنگ سے) آؤ، میری چینی گڑیا! (شوئنگ اس کے منہ پر تھپڑ لگاتی ہے اور وہ غصہ میں اسے مارنے کو لپکتا ہے)
لی شوچنگ۔ دوڑو! بچاؤ! بھائی!
جاپانی افسر۔ (ہنسی میں دانت دکھاتے ہوئے) تم کیا چیختی ہو؟ (شوچنگ کو چمٹا لینا چاہتا ہے)
شوچنگ۔ (ہاتا پائی کرتے اور چیختے ہوئے) تم ـــ تم ـــ
(دوسرے کمرے سے چنانگ نکل کر آتا ہے۔ ایک چینی غدار کے ہاتھ میں سن کا اٹاچی کیس ہے)
جاپانی افسر۔ (دونوں چینیوں کو غصے کی نظر سے دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟
چینی الف۔ کپتان صاحب، یہ شخص جاپان کا دشمن ہے! اس کے پاس ایسے بہت سے کاغذ ہیں!
جاپانی افسر۔ دکھاؤ! (چینی اس اٹاچی کیس سے کاغذ نکالتا ہے تو کچھ نام کے کارڈ گر پڑتے ہیں)
چینی الف۔ (ایک کارڈ اٹھا کر پڑھتا ہے) مسٹر سن چے یوانگ ممبر انجمن سبھا (پھر حیرت سے) اوہ، یہ کیس بوڑھے سن کا ہے! (چنانگ کی طرف دیکھ کر) تم اُسے جانتے ہو؟
چنانگ۔ میرے رشتہ دار ہیں!
غدار الف۔ اوہ! (جاپانی افسر سے) کپتان صاحب ہم سے بھول ہوئی یہ لوگ مسٹر سن چے یوانگ کے دوست ہیں!
جاپانی افسر۔ (غصہ سے جل کر) سن چے یوانگ کون ہے؟ (غدار الف کے طمانچہ مار کر)
غدار الف۔ زیادہ عاجزی کرتے اور مسکراتے ہوئے) کپتان صاحب مسٹر سن کرنل مٹسوئی کے گہرے دوست ہیں! اس کارڈ کو دیکھئے!
جاپانی افسر۔ اوہ! مٹسوئی کے! اچھا، مٹسوئی کے صدقے میں ـــ آؤ چلیں!

(جاپانی فوجی افسر اور اس کے چینی ساتھی چلے جاتے ہیں۔ لی شوچنگ ابھی تک رو رہی ہے، چنانگ اس کے پاس کھڑا ہے مگر نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں میں اُسے سمجھائے)
لی شوئنگ۔ اب بس موت ہی کا انتظار ہے!
چنانگ۔ نا شوئنگ، اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو!
لی شوئنگ (بہن سے لپٹ کر) نا بہن روؤ مت! اکیلے ہماری ہی توہین نہیں کی گئی ہے۔ شہر میں ہم سے ہزاروں کو ان ظالم جاپانیوں نے ذلیل کیا ہوگا۔ ہمیں اس توہین کا بدلہ لینا ہے
(چنانگ سے) سنو، رات بہت جا چکی ـــ بارہ بج گئے ہوں گے ـــ
چنانگ۔ اوہو! اب مجھے جانا چاہیئے!
لی شوئنگ۔ ٹھیرو، میں ساتھ چلتی ہوں!
لی شوچنگ (بہن کا بازو پکڑ کر) بہن تم کہاں چلیں؟ (چنانگ کی طرف دیکھتی اور پھر اپنی بہن کو دیکھتی ہے) شوئنگ کیا تم بھائی سے پہلے کبھی مل چکی ہو؟
لی شوئنگ (کچھ پریشان ہو کر) بہن، تم ـــ
چنانگ۔ شوچنگ، میں اصلی بھید بتاتا ہوں، میرا نام تو چنانگ ہی ہے پر میں تمہارا رشتہ دار نہیں، شوئنگ کو البتہ میں بہت دن سے جانتا ہوں۔ آج جب یہ خبر ملی کہ جاپانی یونیورسٹی کی تلاشی لیں گے تو میں نے رشتہ داری کا حیلہ تراش کر یہاں چھپ رہنا چاہا۔ بہن...... اصل میں پیچھان کی پہاڑیوں میں گریلا فوج میں داخل ہوں، جیسے ہی جاپانی فوجیں شہر میں داخل ہوں گی ہم حملہ کردیں گے۔ اس وقت ایک بجے ہمارے بہت سے ساتھی شہر سے نکل جانے کی صورتیں اختیار کریں گے اور اپنی گریلا فوج میں جاملیں گے (اپنی گھڑی دیکھ کر شوئنگ سے) اب مجھے جانا چاہیئے۔ بارہ بجکر چالیس منٹ ہو گئے!
لی شوئنگ۔ چنانگ، میں تمہارے ساتھ چلوں گی!

چنانگ۔ نہیں، شوئنگ، تم نہیں جاسکتیں!
لی شوئنگ (ہیجانی حالت میں) کیوں نہیں؟ تم نے کہا تھا، تمہارے پاس دو پستول ہیں ـــــ ایک مجھے دے سکتے ہو، میں لڑکی ہوں، مگر میں موت سے نہیں ڈرتی!
چنانگ۔ شوئنگ تم....... (بندوقوں کے کئی فیر سُنائی دیتے ہیں) اوہ، خدا جانے کیا واقعہ ہوا؟ تم..... یقین کرتی ہو کہ میرے ساتھ جانے کے لئے دل بیتاب ہے؟ جان کو وطن پر قربان کر دینے کے لئے تیار ہو؟
لی شوئنگ۔ وطن پر جان کی قربانی؟ بڑی آسانی سے! خوشی خوشی!
چنانگ۔ خوب! (اپنا سوٹ کیس کھول کر دو پستول نکالتا ہے)
لی شوچِنگ (بہن کو روک رکھنے کی کوشش میں) کیا کرنا چاہتی ہو بہن؟ کہاں جاؤ گی؟
لی شوئنگ (تسلّی دیتے ہوئے) شوچِنگ، ڈرو مت، تمہیں ہمارے جانے پر خوش ہونا چاہئے کہ ہم چین کے دشمنوں کو فنا کرنے جا رہے ہیں! چاہتی ہو تو تم بھی چلو۔
لی شوچِنگ۔ بہن، میں بھی چلوں؟
لی شوئنگ۔ کیوں، تم کیا چینی نہیں! چلو! ہماری توہین آنسوؤں سے نہیں دھوئی جاسکتی! وہ جاپانیوں کے خون سے دُھلیگی!
لی شوچِنگ۔ بہن.......
چنانگ۔ شوچِنگ، اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا، حرکت کرنے کا وقت ہے!
لی شوئنگ۔ بولو شوچِنگ، چلو گی؟
لی شوچِنگ۔ شوئنگ...... (کانپتی ہوئی آواز میں) اچھا سوچ لوں (بندوقوں کے فیر پھر سُنائی دیتے ہیں)
چنانگ۔ شوئنگ، جلدی! وہ لوگ انتظار نہ کریں گے! (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)
لی شوئنگ (بہن کو پیار سے چمٹاتے ہوئے) خدا حافظ، پیاری شوچِنگ! جاپانیوں کو شکست دیکر پھر آملیں گے، خدا حافظ۔
چنانگ۔ (دروازہ پر پہونچ کر شوئنگ کا منتظر ہے) شوچِنگ خدا نے چاہا تو جنگ کے بعد آملیں گے!
لی شوئنگ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) خبرداری سے رہنا، شوچِنگ، خدا حافظ!
(چنانگ اور لی شوئنگ چلے جاتے اور شوچِنگ تذبذب کی حالت میں دو چار قدم ٹہلتی ہے، پھر یکا یک دور سے بندوقوں کے فیر سُنکر)
لی شوچِنگ۔ (دروازہ کی طرف پکارتی ہوئی لپکتی ہے) بہن ٹھہرو، میں بھی چلتی ہوں ـــــ وطن پر میں بھی قربانی چڑھاؤں گی!

(پردہ)

(ماخوذ)

ل۔ احمد

"سروہی"

ایک شاہکار مزاحیہ شذرہ

(جناب مظہر تھانوی)

عرصہ ہوا کسی شاعر کا یہ شعر نظر سے گزرا تھا ؎

ذرا تو اے شوقِ کشتنی تھم ٭ ذرا تو لیلے چھری تلے دم
ابھی وہ دامن اُٹھا رہے ہیں ٭ ابھی سروہی سنبھل رہی ہے

شعر کا مطلب صاف تھا۔ عاشق صاحب بہ رضا و رغبت خود قتل ہونے پر آمادہ ہیں، اور ذبح ہونے سے قبل بہ ثباتِ ہوش و حواس "شوقِ کشتنی" کو بطور وصیت تلقینِ صبر و ضبط فرما رہے ہیں۔ "ذرا تو لیلے چھری تلے دم" ایک محاورہ ہے اور اس مقام پر برائے بیت جہاں تک نفسِ قتل کا سوال ہے یہ امر خلافِ واقعہ بھی ہے، اور قانونِ شہادت کی رو سے ایک امرِ غیر متعلقہ بھی۔

قاتل کوئی کم سن چھوکرا ہے، اور آلۂ قتل "سروہی" نامی کوئی وزنی ہتھیار ہے جو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ وجہ قتل غالباً عاشق صاحب کی کوئی والہانہ لیکن غیر فطری حرکت، دامن چونکہ عبا قبا اور شیروانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ کرتہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اور کرتہ ایک لباسِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، لہذا ہو سکتا ہے کہ "ابھی وہ دامن اٹھا رہے ہیں" کتابت کی غلطی ہو، اور دراصل "ابھی وہ دامن اُٹھا رہی ہیں" ہو۔ ایسی صورت میں قاتلہ ایک کم سن چھوکری ہوگی، اور وجہ قتل ظاہر ہے کہ شاردہ ایکٹ کی خلاف ورزی۔

اِس شعر میں میرے لئے جو عجیب اور انوکھی شے تھی۔ وہ "سروہی" تھی۔ عشاق جن اشیاء سے عموماً قتل ہونے کے عادی ہیں وہ یہ ہیں:۔ ابروئے خمدار، نگاہِ ناز، جُنبشِ لب، انکارِ وصل کبک رفتاری، محشر خرامی، وغیرہ وغیرہ۔ پولیس کی اکتیس ۳۱ سالہ ملازمت کے دوران میں مجھے ایسے آلاتِ قتل دیکھنے کا بھی اتفاق ہُوا جن سے ایک غیر عاشق بھی قتل کیا جا سکتا ہے، مثلاً ریوالور، طمنچہ رائفل، بندوق، چھُری، چھُرا، چاقو، پیش قبض، خنجر، کرپان، تلوار لاٹھی، لٹھ، گنڈاسہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے انتہائی ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ "سروہی" میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ حال میں مجھے ریاست سروہی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں یہ معلوم ہوا کہ سروہی کی تلوار مشہور ہے، اور سروہی اُسی تلوار کو کہتے ہیں جو سروہی میں تیّار ہوئی ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سروہی میں اب بھی ایسی تلواریں بنتی ہیں جو لوہا کاٹ سکتی ہیں اور اس درجہ لچکدار ہوتی ہیں کہ پیٹی کی طرح کمر سے لپیٹی جا سکتی ہیں۔ اس سے نہ صرف سروہی کی حقیقت منکشف ہوگئی بلکہ یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت عاشق علیہ الرحمۃ نے تکمیلِ شوقِ شہادت کے لئے سروہی ہی کو کیوں منتخب فرمایا تھا۔ ہر ایک عاشق سمجھ کا پُتلا ہوتا ہے۔ جانہار بھی ایک سمجھدار شخص تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ چونکہ وہ عاشق ہے لہذا سخت جان بھی ضرور ہو گا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ آلور، جے پور، جودھپور یا اودے پور کی تلوار سے کام نہ چلے گا۔ اور ممکن ہے کہ معمولی تلوار اُس کے گلے پر پڑے اور اُچٹ کر کم سن قاتل یا قاتلہ کی پیشانی چوم لے۔ اُف۔ رشک نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔

ہمارے شعرا نے معشوقوں کو بلا کسی فیس کے اکثر یہ قانونی مشورہ دیا ہے کہ وہ قتل عشاق پر ہمیشہ کمربستہ رہیں۔ میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ "کمربستہ" ایک استعارہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ غریب عاشق کو قتل کرنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ رہنا چاہئے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ "کمربستہ" کے لغوی معنی مراد ہیں، اور شعرا یہ چاہتے ہیں کہ "سروہی" پیٹی کی طرح ہر ایک معشوق کی کمر سے ہر وقت لپٹی رہے۔

اللہ! اللہ!! ہمارے شعرا کا کلام بھی کس قدر حقائق و معارف سے لبریز ہے لیکن اپنی کوتاہ فہمی کو کیا کہا جائے ؎

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

غیرتِ بہار

آہ اُس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں

جذبۂ محبّت میں کیا طلسم ہے یارب
ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں

جس کو ایک اِک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اُس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں؟

دل میں عیش رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجئے حرماںؔ
آپ کی کہانی ہے، آپ ہی سناتے ہیں

حرماںؔ خیرآبادی

ٹالسٹائی کا سب سے پہلا افسانہ

حملہ

(مترجمہ جناب سہیل عظیم آبادی)

مسلسل

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں اپنے ایک ملاقاتی اڈجوٹنٹ کو یہ کہنے گیا کہ وہ جنرل کو میرے ارادوں کی خبر کر دے۔ راستہ میں میں نے بہت سی ایسی چیزیں دیکھیں جن کے قلعہ ن ـــ میں دیکھنے کی اُمید نہ تھی۔ ایک پُر شوکت فٹن پیچھے سے آئی اور میرے پاس سے گزر گئی۔ اس کے اندر میں نے ایک ہیٹ دیکھا اور فرانسیسی زبان میں خوش گپیوں کی آواز سُنی۔ کمانڈر کے مکان کی کھلی ہوئی کھڑکی سے پیانو کے نہایت ہی بے سُرے راگ کے ساتھ گانے کی آواز آ رہی تھی۔ شراب خانہ میں جس کے پاس سے میں گزرا، میں نے چند کلرکوں کو دیکھا جو سامنے بیر کے گلاس رکھے اور ہاتھوں میں سگرٹ لئے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کو یہ کہتے سُنا "معاف کیجیئے گا۔ ...... لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے میریا گریگو ریونا ہمارے لیڈر رہیں۔" ایک یہودی جس کی کمر جھک گئی تھی اور چہرہ پر مردنی چھائی تھی پھٹا پُرانا کوٹ پہنے ایک خالی ٹوٹا ہوا پیپا لڑھکائے لئے جا رہا تھا اور اس کی گھڑگھڑاہٹ تمام مکانوں سے ٹکرا کے زور سے گونج رہی تھی، دو عورتیں سر میں ریشمی رومال باندھے ہاتھوں میں شوخ رنگ کے تھیلے لئے سرسر کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ ایک نیچے چھوٹے سے گھر کے دروازے کے سامنے دو لڑکیاں ننگے سر کھڑی تھیں۔ ایک کا ملبوس گلابی رنگ کا تھا اور دوسرے کا نیلا بناوٹی ہنسی ہنس کے وہ کھلکھلا رہی تھیں۔ غالباً ادھر سے گزرتے ہوئے فوجی افسروں کو لبھانے کے لئے۔ فوجی افسر نئے کوٹ، اُجلے دستانے اور زرق برق لباس پہنے بانکی چالوں سے سڑکوں پر اور گلیوں میں اٹھلا رہے تھے۔

میرا ملاقاتی جرنیل کے مکان کی نچلی ہی منزل میں مل گیا۔ میں جو کچھ چاہتا تھا صرف وہی سمجھانے پایا تھا اور وہ جواب میں اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ یہ بڑی آسانی سے ہو جائے گا۔ کہ ایک شاندار گاڑی جسے میں پھاٹک پر دیکھ چکا تھا اس کھڑکی کے نیچے سے گزری جس کے پاس ہم بیٹھے تھے۔ ایک لمبا قدآور آدمی پیدل فوج کا یونیفورم پہنے اور میجر کا تمغہ لگائے گاڑی سے اُترا اور جرنیل کی طرف گیا۔

"اچھا ذرا معاف کرنا" اڈجوٹنٹ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں جنرل کو خبر کردوں۔"

"کون آیا ہے؟" میں نے پوچھا

"کاؤنٹس" اس نے جواب دیا اور اپنے کوٹ کا بٹن لگاتا ہوا اوپر کی منزل پر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک پست قد لیکن نہایت ہی خوبصورت آدمی بغیر تمغے کا کوٹ پہنے صلیب کاج میں لگائے باہر نکل کے سیڑھی پر آیا، اس کے پیچھے میجر، اڈجوٹنٹ اور دو دوسرے افسر آئے۔ جنرل کی چال ڈھال، آواز اور ہر انداز سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو اپنی بڑی اور اہم شخصیت کا احساس ہے۔

"آداب عرض ہے مادام کاؤنٹس" اس نے گاڑی کی کھڑکی میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

نہایت نفیس نرم چمڑے کے دستانہ سے ڈھکا ہوا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس ہوا اور پیلے ہیٹ کے سایہ میں دمکتا ہوا ایک حسین متبسم چہرہ گاڑی کی کھڑکی پر نظر آیا۔

بات چیت کئی منٹ تک ہوتی رہی لیکن میں جنرل کو مسکراتے صرف یہی کہتے ہوئے سُن سکا!

"واؤسیوز کوئی جینی فے داؤدی کتیبری لا انفادلس پہ نز دونک کاردی دے لا دیو بنیر"

گاڑی میں نرم قہقہوں کے ہچکولے سے پیدا ہوئے۔

"خدا حافظ جنرل"

"ہاں خدا حافظ دوسری ملاقات تک" جرنیل نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کہا۔

گاڑی چلی گئی۔

گھر واپس جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا "اس آدمی کو بھی وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جن کی ایک روسی کو تمنا ہو سکتی ہے مرتبہ دولت، عزت ـــ اور اس لڑائی کے شروع ہونے کے وقت جو خدا ہی جانتا ہے کس طرح ختم ہوگی، وہ ایک حسین عورت سے مذاق کر رہا ہے" اور دوسرے دن اس کے ساتھ چائے پینے کا وعدہ کر رہا ہے جیسے کہ وہ اس سے کسی رقص گاہ میں ملا ہو!"

اڈجوٹنٹ کے گھر پر میری ایک اور آدمی سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے اور زیادہ حیران کر دیا۔ وہ ک رجمنٹ میں لفٹننٹ تھا وہ بالکل ہی نوجوان تھا اور اس میں عورتوں جیسی نرمی اور شرمیلا پن تھا۔ وہ اڈجوٹنٹ کے پاس ان لوگوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے آیا تھا، جنھوں نے اس کے خیال میں آنے والے معرکہ میں اس کو کوئی حکم ملنے کے خلاف سازش کی تھی، اس نے کہا کہ اس طرح کی حرکت قابلِ نفرت ہے۔ اس سے ساتھیوں کا یہ کمینہ پن تھا وہ اسے کبھی نہیں بھولیگا وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کے چہرہ پر آتے اور جاتے ہوئے رنگ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور آواز خوب دھیان سے سُن رہا تھا۔ اور میں یہ یقین کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ یہ سب کچھ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ سرکشیوں پر گولی چلانے اور اپنے آپ کو ان کی گولیوں کا نشانہ بنانے کا حکم نہ پا کے وہ بیحد مایوس ہوا تھا اور اسے دلی تکلیف پہنچی تھی، وہ اس لڑکے کی طرح تلملایا ہوا تھا، جیسے بے قصور سزا دی گئی ہو..... میں یہ سب بالکل نہ سمجھ سکا۔

157

فوجیں رات کو دس بجے روانہ ہو جانے کو تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کے جنرل کے گھر پر گیا لیکن چونکہ میں نے خیال کیا کہ وہ اور اڈجوٹینٹ مشغول ہوں گے اس لئے سڑک پر انتظار کرنے لگا۔ میں نے گھوڑے کو احاطہ کی دیوار سے باندھ دیا اور خود اسی پر بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ جیسے ہی جنرل باہر نکلے میں اس کے پیچھے ہو لوں۔

دھوپ کی گرمی اور تیزی کے بدلے اب رات کی ٹھنڈک اور نئے چاند کی دھیمی روشنی تھی۔ چاند ستاروں بھرے گہرے نیلے آسمان پر روشنی کے پیلے نصف دائرے میں جڑا ہوا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں اور مٹی کے گھروں کے شگافوں سے روشنی چھن چھن کے باہر آنے لگی تھی۔ اُجلے اُجلے گھروں کے چھپروں پر چاندنی کھیل رہی تھی اور یہ پس منظر باغ میں کھڑے ہوئے پُرشوکت شیشم کے درختوں کو اور زیادہ لانبا اور کالا دکھلا رہا تھا، مکانوں، درختوں اور احاطہ کے لمبے سائے روشن گرد بھری سڑک پر عجیب عجیب طرح سے پڑ رہے

تھے...... دریا کے کنارے مینڈک مسلسل ٹرّا رہے تھے۔ سڑکوں پر
تیز تیز قدم اور سرگوشیوں کی آہٹ مل رہی تھی کبھی گھوڑے کے ٹاپ
کی آواز یا دور سے کسی لڑھکتے ہوئے خالی پیپے کی گھڑگھڑاہٹ سنائی
دے جاتی اور پھر پیانو کی دلدوز موسیقی کے ساتھ مہین اور بھاری بھدّی
اور نازک آوازیں گاتی ہوئی!

میرے تخیلات اس وقت کیا تھے یہ میں نہیں لکھوں گا سب
سے پہلے تو اس لئے کہ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم معلوم ہوگی
کہ باوجود اس کے کہ میرے چاروں طرف ہنسی خوشی، قہقہے اور ننھے
ننھے میرے دل پر عجیب اداس اور بھیانک باتیں لگاتار اپنا سایہ
ڈال رہی تھیں۔ دوسرے اس لئے کہ ان کا میری اس کہانی سے کوئی
لگاؤ نہیں۔ میں اپنے خیالات میں اتنا گم تھا کہ میں نے یہ بھی نہ محسوس کیا
کہ گھنٹے نے گیارہ بجا دئے۔ اور یہ بھی نہ دیکھا کہ جنرل مع اپنے اسٹاف
کے میرے پاس سے گزر گئے۔ صف کا پچھلا سپاہی قلعہ کے دروازہ پر
تھا۔ توپ، بندوق، سامان، اور راشنوں کی بھیڑ کے درمیان میں بڑی
مشکل سے پل پر راستہ پا سکا۔

فوج سڑک پر ایک لمبی قطار بنائے اندھیرے میں آہستہ
آہستہ بڑھ رہی تھی۔ پھاٹک سے باہر ہوتے ہی میں نے گھوڑا دوڑا دیا
اور جنرل کو جا لیا۔ مسلح تیر اندازوں اور سواروں کی لمبی قطار کے اوپر
توپوں، بندوقوں، افسروں اور سپاہیوں کے اوپر اس گمبھیر وحشی
یکسانیت کو چیرتی ہوئی ایک جرمن آواز بلند ہوئی۔

"انٹی کرائسٹ مجھے مشعل دو!" اور ایک سپاہی نے جلدی
سے پکارا "شیو چنکو! لفٹنٹ صاحب روشنی مانگ رہے ہیں!"

آسمان کا زیادہ حصہ لمبی لمبی ٹیالی بدلیوں سے ڈھکا ہوا تھا
بیچ بیچ میں سے اِکّا دُکّا ستارے جھانک رہے تھے۔ داہنی طرف
کالے پہاڑوں کے اُفق میں چاند ڈوب چکا تھا اور ان کی چوٹیوں
پر ہلکی تھرتھراتی روشنی ڈال رہا تھا جو ان کے دامن پر چھائے ہوئے
گھرے اندھیرے کے مقابلہ میں ایک عجیب تضاد پیدا کر رہا تھا، ہوا
گرم تھی اور بالکل تھمی ہوئی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھاس کی ایک پتی
بھی بدلی کا ایک ٹکڑا ابھی نہیں ہل رہا ہے، اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو
ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، سڑک کے کنارے مجھے چٹان، جانور، اور
آدمیوں کی عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتیں لیکن جب ان کی
سرسراہٹ سنتا اور ان پر تازہ جمی ہوئی اوس کو محسوس کرتا۔ تب
مجھے معلوم ہوتا کہ یہ جھاڑیاں ہیں، میرے سامنے گھرے اندھیرے
کا ایک ٹکڑا تھا اور اس کے پیچھے چند ایک دھبّے۔ یہ سواروں کا دستہ
تھا۔ جن کے پیچھے جنرل مع اپنے اسٹاف کے چل رہے تھے، اسی
طرح کا ایک اور کالا ٹکڑا ہمارے بیچ میں چل رہا تھا، لیکن پہلے ٹکڑے
سے کچھ نیچا تھا، یہ پیدل فوج تھی۔ پوری فوج پر ایسی مکمل خاموشی
چھائی ہوئی تھی کہ آدمی رات تمام ملی جلی آوازیں ان کی پُراسرار
دلکشیوں کے ساتھ صاف سن سکتا تھا۔ دور سے آتی ہوئی گیدڑوں
کی رونی چیخیں، جو کبھی مایوسی کی دلدوز آہ کی طرح ہوتیں، اور کبھی
گھٹتے ہوئے قہقہہ جیسی، جھینگر، مینڈک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں
کی تیز بے کیف یکساں پکار، ایک مبہم نزدیک آتی ہوئی بھنبھناہٹ
جس کی وجہ سمجھ میں نہ آسکتی تھی۔ اور فطرت کی وہ سب محسوس کی جانے
والی رات کی چالیں جنھیں سمجھنا یا جن کی تشریح کرنا ناممکن ہے یہ سب
چیزیں مل جُل کر ایک پُرموسیقی آواز بن گئی تھی جسے ہم رات کا سنّاٹا
کہتے ہیں۔ صرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی ٹپ ٹپ اور بھاری فوجی قدموں
تلے مسلاتی ہوئی گھاس کی سرسراہٹ اس سنّاٹا کو توڑ رہی تھی
نہیں بلکہ اس سنّاٹے میں ملی جا رہی تھی۔

صرف رہ رہ کے بھاری توپوں کی گھڑگھڑاہٹ، سنگینوں کی
کھڑکھڑاہٹ دبی دبی آوازیں یا گھوڑوں کے نتھنوں کی فرفراہٹ
کی آواز سُنی جا رہی تھی۔

ساری فطرت پرسکون وہ طاقت اور حُسن چھایا ہوا تھا۔

کیا اس سندر سنسار میں اس لاانتہا ستاروں بھرے آکاش
کے نیچے امن سے رہنے کے لئے انسان کو کافی جگہ نہیں؟ اس مست
کر دینے والی فطرت کے سایہ کے نیچے بھی غصہ، انتقام یا اپنے
ہم جنسوں کو قتل کرنے کی خواہش انسان کے دل میں کیسے بچ رہی
ہے؟ آدمی تو یہ خیال کرنے پر مجبور ہے کہ اس فطرت کے اثر سے
جس میں نیکی اور حُسن کا براہ راست اور پُرزور اظہار ہوتا ہے انسان

کی روح کی تمام برائیاں دور ہو جانی چاہئے تھیں۔

ہم دو گھنٹے سے زیادہ چلتے رہے تھے۔ مجھے جاڑا لگ رہا تھا اور نیند آرہی تھی۔ وہی غیر واضح اور مبہم چیزیں اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگیں تھوڑی دور پر وہی کالی دیوار انھیں حرکت کرنے والے دھبوں کے ساتھ میرے نزدیک ہی ایک اُجلا گھوڑا اپنی دُم تیزی سے گھماتا چل رہا تھا۔ ایک کالا سایہ اُجلا کوٹ پہنے جس سے کالی رائفل اور پستول کی اُجلی نال لگی ہوئی صاف نظر آرہا تھا۔ سگریٹ کی روشنی میں ریشمی مونچھیں رواں دار کالر اور اُجلے دستانہ سے ڈھکا ہوا ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔

آنکھیں بند کئے میں اپنے گھوڑے کی گردن پر جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لئے اپنے کو بالکل کھو دیتا یہاں تک کہ کوئی مانوس سرسراہٹ یا ٹپ ٹپ یکایک چونکا دیتی۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے میں چُپ چاپ کھڑا تھا اور کالی دیوار جو میرے سامنے تھی میرے اوپر چلی آرہی تھی یا یہ کہ وہ دیوار چپ چاپ کھڑی تھی اور اب میں اس سے ٹکرا جانے والا ہی تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ جاگنے پر وہ سمجھ میں نہ آسکتے۔ مسلسل بھنبھناہٹ جو اب نزدیک تر آتی جارہی تھی بہت ہی زور سے سُنائی دی، یہ پانی کی آواز تھی۔ ہم ایک گہرے نالے میں داخل ہو گئے تھے اور اس وقت ایک پہاڑی ندی کے نزدیک تھے جو اپنے ساحلوں سے اوپر ہو کے زور و شور سے بہہ رہی تھی۔ آواز تیز ہوتی گئی۔ بھیگی گھاس گھنی اور اونچی تھی، جھاڑیاں اور گنجان تھیں اور افق اور زیادہ تنگ ہو رہا تھا ادھر ادھر پہاڑوں کے اندھیرے پس منظر پر تیز آگ یکایک بھڑک اٹھتی اور فوراً ہی غائب ہو جاتی۔

"یہ روشنی کیا ہے، تم جانتے ہو؟" میں نے ایک تاتاری سے دھیرے سے پوچھا جو میرے برابر ہی چل رہا تھا۔

"کیوں؟ تم نہیں جانتے؟" اس نے دریافت کیا

"نہیں، میں نہیں جانتا۔"

"یہ پہاڑی کا کام ہے۔ اس نے ایک کھمبے میں پیال باندھ رکھا ہے اور چاروں طرف آگ گھما دیگا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں جواب دیا۔

"آخر کس لئے؟"

"تاکہ ہر شخص جان لے کہ روسی آرہے ہیں۔ دیہاتوں میں" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "عجیب گڑبڑ مچ جائے گی۔ ہر شخص اپنی اپنی چیزیں چھپانے لگے گا۔"

"ایں! تو کیا پہاڑیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ فوج آرہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، بے شک وہ جانتا ہے! وہ ہمیشہ جانتا ہے! ہمارے لوگ ایسے ہی ہیں!"

"کیا شامیل بھی لڑنے کی تیاری کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "شامیل لڑنے کے لئے سامنے نہیں آئے گا۔ شامیل اپنے سرداروں کو بھیجے گا۔ اور خود اوپر سے بیٹھا دیکھتا رہے گا۔"

"کیا وہ بہت دور رہتا ہے؟"

"نہیں، دور نہیں، سامنے بائیں ہاتھ کو یہاں سے صرف چند میل"

"تم کیسے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم وہاں گئے ہو؟"

"میں گیا ہوں، ہم میں سے ہر شخص پہاڑوں میں گیا ہے۔"

"اور کیا تم نے شامیل کو دیکھا ہے؟"

"ش! شامیل کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ سینکڑوں ہزاروں سپاہیوں کا پہرہ اس کے چاروں طرف رہتا ہے اور شامیل بالکل بیچ میں کھڑا رہتا ہے!" اس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شامیل کا رعب اس کے دل پر بیٹھا تھا، اور اس کے سامنے وہ اپنی کمتری محسوس کرتا ہے۔

آسمان صاف ہو چلا تھا، نگاہیں اوپر اٹھا کے دیکھنے سے پورب کی طرف روشنی معلوم ہو رہی تھی۔ ستارے جھلملا کے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن اس نالے کی گہرائی جہاں ہم چلے جا رہے تھے اندھیرا تھا اور نمی۔

یکایک ہمارے تھوڑا آگے کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں جھلملانے

لگیں، اور ساتھ ہی ساتھ بندوق کی گولیاں تیزی سے بھنبھناتی ہمارے
پاس سے گزریں اور اپنے چاروں طرف کے سناٹے میں ہم نے
دور پر بندوقوں کی آوازیں سنی اور ایک دلدوز چیخ۔ یہ دشمن کی
فوج کا اگلا دستہ تھا۔ اس دستہ میں تاتاری تھے۔ وہ چیختے اور
یوں ہی بلانشانہ کئے بندوقیں چلاتے اور ہر طرف منتشر ہو جاتے۔

تمام خاموشی تھی۔ جنرل نے ترجمان کو بلایا۔ ایک تاتاری
اجلا کوٹ پہنے گھوڑے پر سوار آیا اور آہستہ آہستہ طرح طرح سے
اشارے کر کر کے بہت دیر تک کسی چیز کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

"کرنیل ہسنو۔ اسکاؤٹوں کے دستہ کو حکم دو کہ او کھلی صف
بنا کے آگے بڑھیں"، جنرل نے دھیمی لیکن بہت ہی صاف آواز
میں کہا۔

فوج دریا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ کالے پہاڑ جو نالے میں دونوں
طرف سے گھیرے ہوئے پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ روشنی ہونے لگی، آسمان
جس پر پہلے دھندلے ستاروں کا نقش بھی مٹتا جا رہا تھا۔ اب اونچا
ہو گیا تھا۔ صبح کی لال دمک پورب کے آسمان پر کانپ رہی تھی
چبھتی ہوئی ہوا پچھم سے چلنے لگی اور کانپتا ہوا کہاسا پر شور دریا کے
اوپر بھاپ کی طرح اٹھ رہا تھا۔

راہنما نے گھاٹ بتلایا۔ سوار اور جنرل مع اپنے ہمرکابوں کے
آگے بڑھے۔ پانی گھوڑوں کی چھاتی تک آگیا، اجلے پتھروں میں سے
ہو کے جو کہیں کہیں سطح سے اوپر نمایاں تھے، پانی اتنے زور سے بہا
تھا کہ گھوڑوں کے پیروں کے چاروں طرف جھاگ دار بھنور سا بنجا رہا
تھا۔ پانی کی آواز سے گھوڑے چونک کر سر اونچا کرتے اور کان کھڑے
کرتے لیکن دھارے کے خلاف ناہموار سطح پر آہستہ آہستہ قدم
جمائے آگے بڑھ رہے تھے۔ سواروں نے اپنے پیر اور رائفلیں اوپر
اٹھالیں۔ پیدل سپاہی جو سوائے قمیص کے تقریباً کچھ نہیں پہنے تھے
اپنی بندوقوں پر اپنے کپڑے رکھ کے انھیں اوپر اٹھائے تھے میں میں
آدمیوں کی قطار بنائے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ چل رہے تھے
اور ان کے چہروں کے رنگ سے اس محنت اور مشقت کا پتہ لگ رہا
تھا جو دھارے کے خلاف چلنے میں انھیں کرنی پڑ رہی تھی، سواروں نے
چیخ کے اپنے گھوڑوں کو پانی میں دوڑانا چاہا۔ بھاری توپیں جن سے
پانی ٹکرا رہا تھا پتھریلی تہ پر گھڑگھڑا رہی تھیں لیکن مضبوط کوسپک
گھوڑے زور لگا کے پانی میں جھاگ بناتے بھیگی دُمیں اور ایال لئے
دوسرے کنارے پر نکل آئے۔

دریا کے اس پار ہوتے ہی یکایک جنرل کے چہرہ پر سنجیدگی اور
سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے اپنا گھوڑا گھمایا اور سواروں
کے دستہ کے ساتھ ایک کھلے میدان میں چلا جو ہمارے سامنے پھیلے
ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ کاسک رسالہ کے جاسوس جنگل کے کنارے
کنارے منتشر ہو گئے۔ ہم نے جنگل میں ایک آدمی کو دیکھا جو سرکیشین
کوٹ اور ٹوپی پہنے تھا اور پیدل تھا پھر ایک دوسرا بھی دیکھا۔۔۔
۔۔۔ اور تیسرا۔ ایک افسر نے کہا۔

"وہ تاتاری ہیں"۔ تب ایک درخت کے پیچھے سے دھواں
کا بھبکا اٹھا۔۔۔۔۔ بندوق چلائی گئی۔۔۔۔۔ اور پھر ایک اور
ہماری بندوقوں کی باڑ نے دشمن کی بندوق کی آواز دبا دی
صرف رہ رہ کے کوئی گولی زنزناتی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز
پیدا کرتی ہمارے پاس سے گزر جاتی جس سے پتہ چلتا کہ صرف ہماری
طرف سے بندوقیں نہیں چل رہی ہیں۔ تب پیدل سپاہی دوڑتے
ہوئے اور توپخانہ تیزی سے مخبروں کی صف سے آگے گزر گیا ہم نے
توپوں کی بھاری گڑگڑاہٹ کارتوسوں کے نکال کر پھینکے جانے
کی جھنجھناہٹ، گولوں کی سنسناہٹ اور بندوقوں کی تڑاتڑ سنی
سوار، پیدل، اور توپخانہ اس میدان کے ہر طرف دکھائی دے رہا تھا
توپوں، گولوں، اور بندوقوں کا دھواں درختوں کی سبزی میں پھیل
کے کہاسے مل رہا تھا۔ کرنل ہسنو جنرل کے پاس گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا
اور تیزی سے رک کے سلام کرتے ہوئے بولا۔

"حضور والا، سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دیجئے جھنڈے
دکھائی دے رہے ہیں"، اور اس نے اپنے ہنٹر سے چند تاتاریوں کی
طرف اشارہ کیا جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے آگے دو آدمی گھوڑوں
پر سوار ڈنڈوں میں لال اور نیلے جھنڈے لئے ہوئے تھے۔

"بہت اچھا ایوان میہائیلووچ" جنرل نے کہا
کرنل نے فوراً اپنا گھوڑا گھما لیا اور تلوار ہوا میں ہلاتے ہوئے چلایا۔

"ہُرّا!"

"ہُرّا! ہُرّا! ہُرّا!" ہر طرف سے گونج اٹھا اور رسالہ اس کے پیچھے دوڑا۔

ہر شخص بڑی بے قراری اور اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ ایک جھنڈا دکھائی دیا پھر ایک اور، پھر تیسرا، چوتھا......

دشمن نے حملہ کا انتظار نہیں کیا وہ جنگل میں غائب ہو گئے اور وہیں سے بندوقیں چلانے لگے، گولیاں اور تیزی سے آنے لگیں۔

"کوئل شارمانت کو دو دل!" اپنے کالے۔ پتلے پیروں والے گھوڑے کی زین پر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"شارمانت" میجر نے جواب دیا اور اپنے گھوڑے کو ہنٹر سے مار کے جنرل کے قریب لایا۔ "سئت اوں ورائی بلیسیر کوئی لاگیری داں اوں اوسی بو پیئز" اس نے کہا۔

"اے سرتاؤ ایں بونی کمپین" جنرل نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

میجر نے سر جھکا یا۔

اس وقت ایک تیز ڈرا دینے والی سنسناہٹ کے ساتھ دشمن کی طرف سے ایک گولی آئی اور کسی چیز میں لگی۔ پیچھے کی صف سے ایک آدمی کی کراہ سُنائی دی۔ اس کا مجھ پر ایسا عجیب اثر ہوا کہ یکبارگی اس جنگ کے منظر کی ساری دلکشی میرے لئے ختم ہو گئی لیکن میرے سوا اس کا کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔ میجر اور زیادہ زور سے ہنسنے لگا ایک دوسرے افسر نے جو کچھ بول رہا تھا اپنا جملہ بڑے اطمینان سے ختم کیا۔ جنرل نے دوسری جانب دیکھا اور نہایت ہی پُرسکون تبسّم کے ساتھ فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔

"کیا ہمیں بھی ان کی گولیوں کا جواب دینے کا حکم ملتا ہے؟" توپخانہ کے افسر نے جنرل کے پاس آکے پوچھا۔

"ہاں انھیں تھوڑا ڈرا دو" جنرل نے سگریٹ جلاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

توپخانہ درست کیا گیا اور گولے چلنا شروع ہوئے۔ زمین کراہ اٹھی روشنی بجلی کی طرح مسلسل چمکنے لگی اور دھواں جس میں توپ چلانے والے چھپ گئے تھے آنکھوں کو دھندلی بنانے لگا۔

تاتاری گاؤں پر گولہ باری ہوئی۔ کرنل ہسنو پھر جنرل کے پاس آیا اور اس کا حکم لے کے گاؤں میں گھس پڑا۔ جنگ کی پکاریں گونج رہی تھیں۔ اور رسالہ اپنے پیچھے گرد کا ایک بادل اٹھاتا غائب ہو گیا۔

منظر بلاشبہ شاندار تھا میں جنگ میں کوئی حصّہ نہ لے رہا تھا ایسی چیزوں کا عادی نہ تھا، لیکن میرے نزدیک ان تمام اثرات کو ایک بات زائل کر رہی تھی۔ بھاگ دوڑ، چیخیں اور کھلبلی مجھے بالکل بیکار معلوم ہو رہی تھیں۔ میں بے اختیار ایک آدمی کا خیال کرنے لگا جو ہاتھ میں کلھاڑا لئے ہوا میں وار کر رہا ہو۔

تاتاری گاؤں پر ہماری فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اور جب جنرل معہ اپنے ہمرکابوں کے (جن میں میں نے بھی اپنے کو شامل کر لیا تھا) گاؤں میں داخل ہوا تو دشمنوں کا ایک آدمی بھی اس میں نہ تھا۔

لمبی ستھری جھونپڑیاں جن کی مسطح چھتیں مٹی کی تھیں اور جن میں خوبصورت چمنیاں لگی تھیں ناہموار چٹانوں پر بنی ہوئی تھیں۔ اِن چٹانوں کے بیچ سے ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی۔ ایک طرف ناشپاتی اور بیر کے سرسبز اور شاداب باغ تھے جو روشن دھوپ میں چمک رہے تھے دوسری طرف عجیب عجیب سایے تھے قبرستان کے لمبے عمودی پتھر اور لکڑی کے لمبے کھمبے جن کے سروں پر گنبد اور مختلف قسم کے رنگین جھنڈے لگے تھے (یہ جیگیتوں کی قبریں تھیں)

پھاٹک کے پاس فوج صف بنا کے کھڑی ہو گئی اور پھر سوار کاسک اور پیدل سپاہی گلیوں اور تنگ راستہ میں منتشر ہو گئے اور فوراً ہی خالی گاؤں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کہیں پر چھپر توڑی جا رہی ہے، کہیں پر سے کلہاڑی سے کواڑ توڑنے کی آواز آرہی ہے دوسری جگہ پر پیالوں کے ڈھیر میں آگ لگی ہوئی ہے کوئی جھونپڑی جل رہی ہے اور دھواں کے گہرے بادل صاف ہوا میں اٹھ رہے تھے

کہیں کوئی کاسک ایک بوری آٹے کی اور ایک کمبل اُٹھائے لا رہا تھا۔ کوئی سپاہی کسی جھونپڑی سے چیزیں نکال رہا ہے دوسرا ہاتھ پھیلا کے دو مرغیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو زور زور سے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ تیسرے نے کہیں سے دودھ بھرا ہوا ایک بڑا سا جگ پا لیا تھا۔ اس نے اس میں سے تھوڑا پیا اور پھر برتن کو زمین پر پٹک دیا۔

جس دستہ کے ساتھ میں قلعہ ن ــــ سے آیا تھا وہ بھی گاؤں میں موجود تھا۔ کپتان ایک جھونپڑے کے چھپّر پر بیٹھا ایک چھوٹی سی پائپ پی رہا تھا۔ وہ ایسے لاپرواہ اور بےخود انداز میں بیٹھا تھا کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میں بھول گیا کہ میں دشمن کے گاؤں میں تھا بلکہ ایسا محسوس کیا کہ اپنے گھر میں ہوں۔

"ارے تم بھی یہاں ہو!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

طویل القامت لفٹنٹ روسنکرانز گاؤں میں تیزی سے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ وہ لگاتار چیخ چیخ کے حکم دئے جا رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بات کے لئے بےحد پریشان ہو۔

میں نے اسے ایک جھونپڑی سے فاتحانہ انداز سے نکلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے دو سپاہی ایک بوڑھے تاتاری کو لئے ہوئے تھے جس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ بوڑھا آدمی پھٹی چٹی قمیص اور گدڑی بنتا ہوا پاجامہ پہنے تھا۔ اس کے کاندھے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ نکلے پڑ رہے ہیں، اس کے ننگے مڑے ہوئے پیر بڑی مشکل سے حرکت بھی کر سکتے تھے۔ اس کے چہرہ اور اس کے گھٹے ہوئے سر پر بھی جھریاں پڑ گئیں تھیں۔ اس کا منہ جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کھونٹی جیسے بال تھے مسلسل حرکت کر رہا تھا جیسے وہ کچھ چبا رہا ہو۔ لیکن اس کی سُرخ بے پلک کی آنکھوں میں اب تک ایک چمک تھی جن سے ایک بوڑھے آدمی کی زندگی سے نفرت کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔

روسنکرانز نے ترجمان کے ذریعہ سے اس سے پوچھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ گاؤں چھوڑ کے کیوں نہیں گیا۔

"میں جاتا کہاں؟" اس نے بڑے اطمینان سے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کے کہا۔

"وہاں دوسرے گئے،" کسی نے جواب دیا۔

"جیگیت روسیوں سے لڑنے گئے ہیں لیکن میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں۔"

"کیوں تمہیں روسیوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

"روسی میرا کیا کریں گے؟ میں بوڑھا ہوں،" اِس نے کہا اور اپنے چاروں طرف لاپرواہی سے نگاہ ڈالی۔

واپس جاتے ہوئے میں نے اسی بوڑھے کو دیکھا ایک کاسک کی زین کے پیچھے جھٹکے کھاتا جا رہا ہے، سر پر ٹوپی ندارد تھی، دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اسی بے پروایانہ انداز سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے قیدیوں کے تبادلہ کے لئے رکھ لیا گیا تھا۔

میں چھپّر پر چڑھ کے کپتان کے نزدیک بیٹھ گیا

"معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی تعداد بہت تھوڑی تھی،" میں نے اس سے کہا۔ میں ان سب واقعات کے بارے میں اس کا خیال معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"دشمن؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "نہیں تو۔ ایک بھی نہیں تھا کیا انھیں تم دشمن کہو گے؟ شام تک انتظار کرو اور دیکھو کہ ہم یہاں سے کیسے چلے جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ وہ کیسے ہمیں گھر تک پہنچائیں گے کسی وہ تمام سے ابل پڑیں گے!" اس نے اپنی پائپ سے اِس جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے نزدیک سے ہو کر صبح ہم گزرے تھے

"وہ کیا ہے؟" میں نے گھبرا کر کپتان کا قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا اور چند ڈان کاسک کی طرف اشارہ کیا جو ہم لوگوں سے تھوڑی دور پر کسی چیز کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

ان کے درمیان میں سے کسی بچّہ کے رونے کی سی آواز آئی اور یہ باتیں سُنائی دیں۔

"چھرا مت مارو! ٹھہرو ...... وہ دیکھ لیں گے ...... تمہارے پاس چاقو ہے، ایوستیگنیچ؟ لاؤ چاقو دو۔"

"ارے یہ بدمعاش کچھ کر رہے ہیں!" کپتان نے بڑے اطمینان

سے کہا۔

لیکن اسی وقت علم بردار خوفزدہ تمتمایا ہوا چہرہ کیساتھ دوڑا آیا۔ اور ہاتھ ہلاتا ہوا کاسکوں کی طرف دوڑا۔

"اسے مت چھوؤ؟ اسے مت مارو!" وہ بچوں جیسی آواز میں چیخا۔

ایک افسر کو دیکھ کے کاسک الگ ہو گئے اور ایک چھوٹا سا ابکری کا بچہ دکھائی دیا۔ نوجوان علمبردار ہکا بکا رہ گیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بولا اور شرمایا ہوا وہیں پر رک گیا

کپتان کو اور مجھے چھپّر پر دیکھ کے اس کا چہرہ شرم سے اور سُرخ ہو گیا اور وہ ہماری طرف دوڑا آیا۔

"میں نے سمجھا وہ کسی بچّہ کو قتل کئے ڈال رہے ہیں" اس نے شرمیلی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جنرل رسالہ کے ساتھ آگے جا چکے تھے۔ جس بلٹن کے ساتھ میں قلعہ ن ــــــ سے آیا تھا وہ اس وقت موخر الجیش تھی۔ کپتان لوپودا اور لفٹنٹ روسنکرانز کے فوجی دستے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

کپتان کی پیش گوئی بالکل ٹھیک ثابت ہوئی۔ جیسے ہم لوگ اس جھاڑی میں داخل ہوئے جس کا تذکرہ کپتان نے کیا تھا سڑک کے دونوں طرف سوار اور پیدل پہاڑی بار بار دکھائی دینے لگے۔ وہ اتنے نزدیک آجاتے کہ میں ان میں سے بعض کو بالکل صاف صاف ہاتھ میں بندوق لئے جھک کے ایک درخت سے درخت کی اوٹ میں جاتے دیکھتا۔ کپتان نے اپنی ٹوپی اُتاری اور بڑے احترام سے صلیب کا نشان بنایا۔ بہت سے پُرانے سپاہیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہم نے جنگل میں چیخیں اور نام لے لے کے پکارنے کی آوازیں سُنیں۔ بندوق کی تڑا تڑ بھی سُنائی دی اور گولیاں دونوں طرف سے سنسناتی ہوئی آنے لگیں۔ ہمارے آدمی بھی بالکل خاموشی سے گولیاں چلا رہے تھے۔ صرف کبھی صف میں سے کوئی بول اٹھتا۔ "وہ کدھر سے گولیاں چلا رہے ہیں؟" جنگل میں انھیں بڑا اطمینان ہے!" "ہمیں توپیں چلانی چاہئیں!" ــــ وغیرہ وغیرہ

توپیں صف میں درست کی گئیں اور دو ہی تین گولے کے بعد معلوم ہوا جیسے دشمن کمزور پڑ رہے ہیں۔ لیکن فوراً ہر ہر قدم پر چیخیں اور گولیاں اور تیزی سے اور مسلسل آنے لگیں۔

ہم لوگ گاؤں سے سو گز سے زیادہ نہ گئے ہوں گے کہ دشمن کی توپ کے گولے ہمارے سروں پر سیٹیاں بجانے لگے۔ میں نے ایک سپاہی کو زخمی ہو کے مرجاتے دیکھا..... لیکن اس بھیانک منظر کی تفصیل کیوں لکھوں۔ جب کہ میں خود اس کے بھولنے کے لئے کیا کچھ نہیں دیسکتا؟

لفٹنٹ راسنکرانز اپنی بندوق چلا رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چپ نہ ہوئے۔ بھاری پھنسی ہوئی آواز میں چیخ چیخ کے سپاہیوں کو حکم دیتے اور بے تحاشہ ایک صف سے دوسری صف میں گھوڑا دوڑاتے پھرتے۔ ان کا چہرہ کچھ پھیکا معلوم ہو رہا تھا۔

خوبصورت علمبردار عجیب طرح کے جوش میں تھا۔ اس کی حسین کالی آنکھوں میں ہمت کی چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسّم تھا وہ مسلسل کپتان کے پاس جا جا کے جنگل میں گھس پڑنے کی اجازت مانگ رہا تھا

۱۶۳

"ہم لوگ انھیں مار بھگائیں گے،" وہ کہے جا رہا تھا: "یقینی ہم انھیں بھگا دیں گے!"

"اس کی ضرورت ہی نہیں،" کپتان نے کہا "ہمیں پیچھے ہٹنا ہے۔"

کپتان کے دستے نے جنگل کے کنارے مورچہ قائم کر لیا اور لیٹ کر گولیاں چلانے لگے۔ کپتان لٹکتی ہوئی ٹوپی اور فرسودہ کوٹ پہنے لگام ڈھیلی کئے اپنے اُجلے گھوڑے پر چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ رکاب چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کا پاؤں مڑا ہوا تھا (سپاہی اپنا کام اتنا اچھّی طرح جانتے اور کرتے تھے کہ انھیں حکم دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی) صرف کبھی کبھی وہ زور سے ان آدمیوں کو پکار دیتا تھا جو اپنا سر اٹھا دیتے تھے۔ کپتان کی وضع قطع فوجی نہ تھی لیکن اتنا کھرا پن اور اتنی سادگی تھی کہ مجھ پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا۔

یکایک میرے دل میں خیال ہوا "یہ ہے سچی بہادری!"
وہی بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں اسے برابر دیکھتا رہا تھا۔ نقل و حرکت کا وہی مطمئن انداز، وہی دھیمی پُرسکون آواز، اس کے سادہ لیکن کھلے ہوئے چہرہ پر وہی بھولا پن صرف اس کی نگاہوں کے غیر معمولی چوکنا پن سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ اپنے کام میں چُپ چاپ مستعدی سے مشغول ہے "ہمیشہ جیسا" کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن دوسرے لوگوں میں کتنی ہی تبدیلیاں میں نے دیکھی اور محسوس کی ہیں کوئی معمول سے زیادہ پُرسکون ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے کوئی زیادہ درشت ہونے کی، اور کوئی بہت ہشاش بشاش معلوم ہونے کی لیکن کپتان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ کیوں کوئی کچھ اور ظاہر ہونے کی کوشش کرے۔
تاریخ میں کتنے ہی بہادروں کے قصّے ہیں۔ انھوں نے ایسی ایسی باتیں کہیں ہیں جو رہتی دُنیا تک انسانوں کے لئے مشعل راہ رہیں گی لیکن ان کی بہادری اور کپتان کی بہادری میں یہ فرق تھا۔ اگر کسی موقع پر کوئی قول زرّیں میرے ہیرو کی روح کو ابھارتا بھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ اُسے زبان پر نہ لاتا۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ ڈرتا کہ کہیں اس قول زرّیں کو زبان پر لا کے وہ اس عظیم الشان کارنامہ کی اہمیت کم نہ کر دے۔ دوسرے جب کوئی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی بڑا کام کرنے کی طاقت اس میں موجود ہے تو پھر الفاظ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں یہ روسی شجاعت کی عجیب اور بُلند خصوصیت ہے اور پھر جب یہ حالت ہو تو اپنے نوجوان افسروں کی زبان سے تاریخ کے فرسودہ واقعات اور گزرے ہوئے ہیروؤں کے پامال جملے سُن کے کوئی روسی دل میں بغیر ایک چبھن محسوس کئے کیسے رہ سکتا ہے؟
یکایک اس طرف جدھر خوبصورت علمبردار کھڑا تھا خوشی اور جوش کی ایک چیخ کی آواز آئی۔ اس طرف مڑ کے دیکھا تو تقریباً تیس سپاہی نئے جُتتے ہوئے کھیت میں ہاتھوں میں بندوقیں اور کاندھوں پر تھیلے لئے بڑی مشکل سے دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن پھر بھی چیختے ہوئے آگے بڑھے جا رہے تھے ان کے آگے نوجوان علمبردار تلوار گھماتا گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔

وہ سب جنگل میں غائب ہو گئے۔
چند لمحے کی چیخوں اور بندوقوں کے چلنے کے بعد ایک خوفزدہ گھوڑا نکلا اور پھر سپاہی بھی مرے ہوؤں اور زخمیوں کو لئے ہوئے جنگل میں سے باہر آئے۔ زخمیوں میں علمبردار بھی تھا۔ دو سپاہی اس کے بازو پکڑے ہوئے اٹھائے لئے آرہے تھے۔ اس کا چہرہ رومال کی طرح اُجلا ہو رہا تھا اور اس کا حسین چہرہ جس پر اب جنگی جوش کا محض ایک سایہ سا جھلملاتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے کاندھوں پر ھنس کے سینہ پر جھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی اجلی قمیص پر کھلے ہوئے کوٹ کے نیچے ایک چھوٹا سُرخ داغ نظر آ رہا تھا۔
"آہ! صد افسوس!" میں نے کہا۔ خود بخود میری نگاہیں اس طرف سے ہٹ گئیں۔ میں اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکا۔
"ہاں بیشک صد افسوس" میرے نزدیک کے کھڑے ہوئے ایک اداس سپاہی نے کہا۔ "وہ کسی چیز سے نہ ڈرتا تھا، کیسے کوئی بھی ایسا کر سکتا ہے؟" وہ زخمی لڑکے کی طرف غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ "اتنا کمسن اور بیوقوف ــــــ اور اسی کی سزا اسے ملی"
"کیوں، تم ڈرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"بلاشبہ!"

چار سپاہی علمبردار کو اسٹریچر پر لئے ہوئے تھے۔ قلعہ کا ایک سپاہی پیچھے پیچھے ایک دُبلے خستہ حال گھوڑے کو لئے ہوئے تھا جس پر دو بڑے بڑے ہرے بکس تھے جن میں دوائیں اور جرّاحی کے سامان تھے۔ ڈاکٹر کا انتظار تھا۔ افسر اسٹریچر کے پاس آئے اور زخمی نوجوان کو ہمّت دلاتے اور تسلّی دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تسلی اور تشفی کے جملے خوبصورت علمبردار کی ہمت بڑھائیں گے اور اس کو سنبھالیں گے لیکن اس کے سرد اور مغموم چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے۔
کپتان بھی اس کے پاس گیا۔ وہ غور سے زخمی نوجوان کو دیکھتا رہا اور اس کے عام طور سے مطمئن پرسکون چہرہ پر بھی سچی ہمدردی کی جھلک تھی۔

"عزیز اناتول ایوانووچ" اس نے ایسی نرم اور محبت بھری آواز میں کہنا شروع کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہی خدا کی مرضی تھی۔"

زخمی نوجوان نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرہ پر تبسم کی روشنی جھلملائی۔

"ہاں میں نے آپ کا حکم نہیں مانا۔"

"بہتر ہے کہ اسے مشیت ایزدی کہو۔" کپتان نے پھر کہا۔

ڈاکٹر آ گیا۔ اپنے ماتحت سے پٹیاں اور دوسرا سامان لیا۔ اور آستین چڑھا کے مسکراتا ہوا زخمی کی طرف بڑھا۔

"اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مضبوط جسم میں دشمنوں نے سوراخ کر دیا ہے۔" اس نے مذاقاً کہا۔ "دیکھیں۔"

علمبردار نے دکھلایا۔ لیکن جس نظر سے اس نے پُر مذاق ڈاکٹر کی طرف دیکھا اس میں حیرت اور ملامت جھلک رہی تھی لیکن ڈاکٹر نے اُسے نہ دیکھا۔ اس نے زخم کو تمام ہر طرف سے دیکھا بھالا لیکن آخر کار بے صبر ہو کر زخمی نوجوان کراہا اور اس کا ہاتھ دھکیل کر ہٹا دیا۔

"چھوڑ دیجئے" اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے مرنا ہی ہے۔"

یہ کہہ کے وہ لیٹ گیا۔ اور پانچ منٹ بعد جب اس جماعت کے پاس پہنچا جو اس کے چاروں طرف جمع تھی اور ایک سپاہی سے اس کی حالت پوچھی تو اس نے جواب دیا۔

"وہ گزر گیا۔"

دن ڈھلنے پر فوج چوڑی صف بنائے گاتی ہوئی قلعہ کی طرف چلی۔ برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سورج ڈوب گیا تھا اور اپنا آخری گلابی کرنیں پتلی ہلکی بدلیوں پر ڈال رہا تھا جو صاف نتھرے ہوئے افق سے لپٹی ہوئی تھیں۔ برفیلے پہاڑوں پر بیگنی پردہ پڑتا جا رہا تھا۔ غروب آفتاب کی سُرخ چمک کے پس منظر پر صرف ان کی انتہائی بلندی عجیب شاندار صفائی سے سر اونچا کئے ہوئے تھی۔ شفاف چاند جو دیر سے نکلا ہوا تھا آسمان کی گہری نیلاہٹ کے سامنے اجلا ہوتا جا رہا تھا۔ گھاس اور درختوں کی سبزی سیاہ اور شبنم کی نمی سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

سرسبز چراگاہ سے ہوتی ہوئی فوج مستقل قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ ڈھول، چھانجھ، قرنا اور گانے کی آواز ہر طرف سے آ رہی تھی۔ چھٹے دستہ کا گانے والا اپنی پوری آواز سے گا رہا تھا اور اس کی گہری بھاری آواز جوش اور جذبات سے پُر شام کی لطیف نتھری ہوا میں دور دور تک تیر رہی تھی۔

(ختم)

دعوتِ عمل

محروم ہے عینِ باریابی ہوجا — آزادِ صراحی و گلابی ہوجا

ہو ولولۂ عمل سے اتنا سرشار — بے منّتِ جام و مے شرابی ہوجا

"عسکری"

خانۂ خدا

افراد

ایک سرمایہ دار	اس کی بیوی
تعلیم یافتہ نوجوان	بوڑھا بھکاری

(طبعزاد از شاکر علی)

(منظر) بازار، دونوں طرف کپڑے، جوتوں، اور کھانے پینے کی دوکانیں ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک کشادہ سڑک ہے جس پر موٹر، ٹرام، تانگے اور سائکلوں کا تانتا بندھا ہے۔ فٹ پاتھ پر گاہکوں اور تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ اس بھیڑ میں ننگے اور بھوکے گداگروں، بے روزگار نوجوان بھی روٹی اور کپڑے کی تلاش میں ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں۔ ایک نوجوان ایک دوکان سے سر ڈالے آہستہ آہستہ قدموں سے نکلتا ہے اور باہر آکر ایک طرف لوگوں کے اس سیلاب سے بچکر کھڑا ہوجاتا ہے)

(موسم نے ایک دم رُخ بدلا۔ کالے کالے بادل اُمڈ آئے، بجلی کی چمک اور سرد ہوا کی شائیں شائیں گاہکوں اور تماشائیوں نے گھروں کی راہ لی۔ رات بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ دوکانیں بھی بڑھنا شروع ہوگئیں لیکن وہ نوجوان اور اس جیسے اور بھی وہیں موجود تھے۔ ایک بڑھا بھکاری سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کمبل کے ٹکڑے سے جسم کو چھپاتا لکڑی ٹیکتا نوجوان کے سامنے سے گزرتا ہے)

نوجوان اس کو سر اُٹھا کر دیکھتا ہے۔

بھکاری۔ ایک پیسہ بابوجی!

نوجوان مُسکرا کر سر جھکا لیتا ہے۔

بھکاری۔ (جل کر) غریب کی مدد سے رہے اور اس کی حالت پر ہنستے ہو بابا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔

نوجوان۔ بڑے میاں، تم پر نہیں زندگی کی ستم ظریفی پر ہنستا ہوں کہ مفلس خود مفلس سے بھیک مانگ رہا ہے۔

بھکاری۔ (اس کا مُنہ حیرت سے تکتا ہے) تمہاری وضع قطع سے تو میں سمجھا بابوجی! کہ تم اُن میں سے ہو جو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے اپنی دولت تجوری میں بند رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ میری طرح تم بھی قسمت کے ستائے ہوئے ہو۔

نوجوان۔ قسمت کا ستایا ہوا؟ میں سماج کا ستایا ہوا ہوں، اُن سرمایہ داروں کا ستایا ہوا ہوں (اونچی اونچی دوکانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) جنھوں نے اپنی گردن بچانے کے لئے تقدیر کا ڈھونگ کھڑا کیا۔ اور دُنیا کے ہر اچھے بُرے کے لئے اس کو ذمہ دار ٹھیرایا تاکہ ہم سب اپنی حالت پر مطمئن رہیں اور وہ ٹٹی کی آڑ میں ہمیں پیسا کریں۔

بھکاری۔ بیٹا صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ہماری پکار ایک دن
ضرور رنگ لائے گی۔!

نوجوان۔ صبر! — یہ سبق بھی سرمایہ داری کا پڑھایا ہوا ہے۔ جب وہ
دھن دولت کے ہوتے ہوئے بھی صبر نہیں کرتے اور غریبوں
کا خون چوسنے کے لئے طرح طرح سے ستم ایجاد کرتے ہیں تو
پھر ہم اپنی روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر کیوں قناعت کریں؟
تقدیر، قناعت، صبر، یہ سب الفاظ ہمیں بہلانے کے لئے
ہیں، ہمیں دھوکہ دینے کے لئے گھڑے گئے ہیں، ان کی کوئی
حقیقت نہیں۔

بڈھا خاموش کھڑا نوجوان کی باتیں سُن رہا تھا۔ جب
نوجوان خاموش ہوا تو جدھر جا رہا تھا چل دیا۔ نوجوان بھی
اس کے پیچھے ہولیا۔

بھکاری۔ تم کدھر جا رہے ہو؟!

نوجوان۔ جاتا کہاں تمہارے ساتھ ہوں، ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں!

بھکاری۔ (حیرت سے) میرے ساتھ! میرا نہ گھر دا نہ در دا۔ تمہارا میرا
کیا ساتھ؟!

نوجوان۔ (مسکرا کر) اگر تم بے گھرے ہو تو میں کون سا محل رکھتا ہوں
جب تک جیب میں پیسے تھے تو دن میں روزگار کی دُھن میں
چکر لگاتا اور رات کو سرائے میں پڑ رہتا۔ جیب کے سارے
پیسے بھٹیارے کی نذر ہو گئے مگر نوکری نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اب
کیا کیا جائے؟ خودکشی کر لیتے لیکن (ہنس کر) وہ بھی تو
مذہب میں حرام اور قانون میں جرم ہے!

بھکاری۔ (آہ بھر کر) دُنیا بڑی ظالم ہے!

(یہ دونوں کشادہ سڑکوں اور پھر تنگ گلیوں میں سے
گزرتے ہیں جہاں اعلیٰ اور متوسط طبقے کی اونچی نیچی
حویلیاں ہیں، دروازے اور کھڑکیاں سردی اور پانی کے
خیال سے بند ہیں۔ چلتے چلتے بڈھا ایک دو منزلہ حویلی
کے سامنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

نوجوان۔ (تعجب سے) کیوں بڑے میاں رُک کیوں گئے؟ کیا تھک گئے؟!

بھکاری۔ نہیں تھکا تو نہیں ہوں (ٹھنڈی سانس لیکر) اس مکان کو
دیکھتا ہوں! جب میں جوان تھا تو راج گیری کیا کرتا تھا۔ بہت
سے مکان بنائے، یہ سامنے والا مکان بھی میرا ہی بنایا ہوا ہے
جب میں ان مکانوں کے سامنے سے گزرتا ہوں تو اس بے فکری
کے زمانہ کی یاد سے میرا دل بھر آتا ہے۔ جب کھانے پینے
کی کمی نہ تھی اور اب یہ بوڑھی ہڈیاں اور یہ جاڑے کی راتیں!!"

نوجوان۔ "تو تم کبھی راجگیری بھی کرتے تھے۔ اُس پر یہ حالت! ظلم ہے
سراسر ظلم۔ تمہاری محنت سے دوسرے آرام پا رہے ہیں اور
خود تم......؟ اندھیر ہے، اندھیر"

بھکاری۔ "اندھیر اور ظلم کیا میاں؟ میں نے جو محنت کی تھی اسکی مزدوری
حاصل کر کے خرچ بھی کر چکا۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟"

نوجوان۔ "مزدوری تمہیں دی تو گئی تھی لیکن اوّل تو وہ تمہاری محنت
کی نسبت بہت کم تھی دوسرے وہ برائے نام مزدوری بھی
جس ہاتھ سے تمہیں دی گئی تھی پھر لے لی گئی۔ تمہاری محنت کی
وہ قیمت آج تمہارے پاس موجود نہیں لیکن وہ تمہاری اور
تمہارے جیسے اور مزدوروں کی محنت سے ابھی تک آرام
پا رہے ہیں اور اس کے بعد ان کی اولاد ——"

اتنے میں ایک موٹر اس مکان کے سامنے آکر رُکتی ہے
جس میں سے ایک عورت اور ایک مرد اُترتے ہیں۔

مرد۔ (آسمان کی طرف دیکھ کر) "کیسی تاریکی ہے؟"

عورت۔ "بجلی کی کڑک اور ہوا کی شائیں شائیں سے دل ہلا جاتا ہے
ایسے جاڑے پالے میں بھلا انسان کے باہر نکلنے کا کیا کام ہے!"

(یہ کہتے اور ان مصیبت زدہ ہستیوں پر ایک نظر ڈالتے
ہوئے وہ دونوں اپنی محل سرا میں گھس جاتے ہیں)

(بڈھا اور نوجوان ساتھی ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگتے
ہیں، اور پھر چل پڑتے ہیں)

بھکاری۔ (کوئی دس قدم چلنے کے بعد) "یہ سب کچھ میرے کئے کا بھگتان
ہے۔ اگر میں اپنی کمائی میں سے تھوڑا بہت بھی رکھتا تو آج
بڑھاپے میں یہ حالت نہ ہوتی"

نوجوان:" اچھا ہوا جو تم نے یہ بُری عادت اختیار نہ کی۔ اسی کا تو سارا فتنہ
ہے۔ ہم اس طرح دربدر پھر رہے ہیں، اور کہیں سر چھپانے
کو جگہ نہیں ملتی۔ ساری دُنیا کی دولت چند لوگوں کے ہاتھ
میں جمع ہو گئی ہے۔"
بھکاری۔ (حیرت سے اس کا مُنہ تکنے لگتا ہے) "ہماری اتنی عمر ہونے
کو آئی ہم نے تو یہی دیکھا اور سُنا کہ جو کوئی اس بات کا خیال
رکھتا ہے کبھی ننگا بھوکا نہیں رہتا۔"
نوجوان۔ تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے بڑے میاں اس کے تو حلوے
مانڈے کہیں نہیں گئے لیکن اپنے بھائیوں کو ننگا اور بھوکا
بنا دیتا ہے۔"

بھکاری سر جھکا لیتا ہے

بھکاری۔ (تھوڑی دیر کے بعد) "بھئی ہماری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں"

نوجوان مسکرانے لگتا ہے

(تنگ گلی میں سے ہو کر یہ دونوں ایک کشادہ سڑک
پر نکلے۔ دوکانیں بند ہیں، پان سگریٹ والوں کی
دوکانیں کہیں کہیں کھلی نظر آتی ہیں فٹ پاتھ پر کہیں
کہیں لوگ ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں، ایک آدھ
تانگہ اِدھر اُدھر آجا رہا ہے، بالاخانوں پر روشنیاں
چمک رہی ہیں (یہ تیز تیز قدم رکھ کر یہ اس سڑک سے
گزر جاتے ہیں)
بھکاری۔" خدا انھیں غارت کرے، خدا کی مخلوق کو پھانسنے کیلئے کیسے
کیسے جال پھیلائے ہیں؟"
نوجوان۔" خدا اور خدا کی مخلوق!۔۔۔ خدا اس مخلوق کو غارت نہ کرے
جس کی ہوس کاریوں کا وہ شکار ہوئی۔ جنھوں نے ان کے
حُسن پر ان کی جوانی پر ڈاکے ڈالے اور پھر خود ہی منصف بنکر
ان کو سماج کا مجرم قرار دیا۔ مذہب نے بھی اُلٹا ان ہی کو جہنمی
ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ جب وہ بھوکی مر رہی تھیں تو کیا کرتیں
مجبور ہو کر اسی لٹی ہوئی دولت سے پیٹ پالنا شروع کر دیا
پیٹ بُری بلا ہے جب اس کو نہیں بھرتا تو پھر خدا اور سماج کا بھی
خوف جاتا رہتا ہے (تھوڑی دیر کے بعد) یہ تو سوچو وہ کیسے پھانسیں گی
جو ایک کے جال میں خود پھنسی ہوئی ہیں۔ وہ کیسے شکار کریں گی جو خود
مذہب اور سماج کی بے رُخی کا شکار ہیں ان میں سے اگر کوئی اس
گڑھے سے نکلنا بھی چاہتی ہے تو سماج کے وہی اجارہ دار جنھوں نے
ان کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔ راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"
بھکاری۔ (کئی مرتبہ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے) "خدا مجھے معاف کرے۔
اپنی جوانی میں میں نے بھی اس کوچے کی بہت خاک چھانی ہے"
(کالے بادل گھرے ہیں، بجلی کڑک رہی ہے۔ بہت
تاریکی ہے، اندھیرے میں یہ دونوں سردی سے کپکپاتے
قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے جا رہے ہیں دونوں کی کسی
چیز سے ٹھوکر لگی اور اسی کے ساتھ کسی کے کراہنے کی
آواز آئی)
آواز۔ ہائے نصیبا! کبھی وہ دن تھا کہ میں پھولوں
کی سیجوں پر سویا کرتی اور لوگوں کی گودوں میں لوٹا کرتی
تھی مگر آج جاڑے کی اس اندھیری رات میں بھوکی پیاسی
سڑک کے سرد پتھر پر پڑی ہوں، اس پر بھی راہ گیر چین نہیں
لینے دیتے ٹھوکریں مارتے چلتے ہیں۔"
(وہ دونوں رُک جاتے ہیں جھک کر دیکھا تو ایک بھکارن
ایک دوکان کے آگے فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ جسم سے کوڑھ
چو رہا ہے، ہاتھ پاؤں کی اُنگلیوں پر دھجیاں لپٹی ہوئی
ہیں اور بدن پر چیتھڑے لگے ہوئے ہیں، سردی سے ٹھٹھر
رہی ہے)۔
نوجوان۔ معاف کرنا مائی ہم نے دیکھا نہیں تھا۔"
بھکاری۔" ارے تم سردی میں اس طرح پڑی ہو (اپنے کمبل کا ٹکڑا اُتارتے
ہوئے) لو یہ کمبل کا ٹکڑا اپنے اوپر ڈال لو کچھ تو گرمی آئے گی
اور یہ کچھ روٹی کے ٹکڑے لو انہیں بھی کھا لو۔"
بھکارن۔" کمبل کا پھٹا ہوا ٹکڑا اس وقت میرے لئے ریشمی لحافوں سے
بڑھ کر ہے اور یہ روٹی کے سوکھے ٹکڑے لذیذ غذاؤں سے بہتر
ہیں (کچھ دیر سوچ کر) لیکن میں ان کی قیمت کس طرح ادا کر سکتی ہوں

اب نہ تو میرے پاس حسن ہے اور نہ جوانی کی گرمی، تمہیں دعائیں
دیدیتی لیکن آسمان بہت اونچا ہے"

(وہ ہنستی ہے)

بھکاری اور نوجوان (ایک زبان ہوکر) "نہیں ہمیں کچھ نہیں چاہیئے"

بھکارن - (کمبل کے ٹکڑے اپنے گرد لپیٹتی ہوئی کھڑی ہو جاتی ہے)
"جاؤں اپنے گناہوں کی اُس یادگار کو بھی دیکھوں کہاں رہ گیا
ان ظالموں نے میرے بھیک کے ٹکڑوں میں بھی تو ایک ننھی
سی جان کو شریک بنا دیا۔ یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ خود کھاؤں
اور وہ بھوکوں مرے۔ آخر ہے تو میرا ہی لخت جگر"

بھکارن کراہتی ہوئی گرتی پڑتی تاریکی میں ایک طرف
چل دیتی ہے۔

نوجوان: "رات کہاں بسر کروگے"؟

بھکاری: "کسی دوکان کے آگے پڑ رہیں گے"

نوجوان: "مگر سردی تو غضب ڈھا رہی ہے، رات کیسے کٹے گی"!؟

بھکاری: "تو پھر بتاؤ کیا کریں"!

نوجوان - (دوسری طرف رُخ بدل کر) سامنے وہ عالیشان مسجد ہے
چلو وہیں چلیں۔

بھکاری - (حیرت سے) مسجد میں!

نوجوان - (تیزی سے) "ہاں مسجد میں، جب اُس میں کھجور کی چٹائیوں
مٹی کے بدھنے اور استنجے کے بے شمار ڈھیلے سما سکتے
ہیں تو کیا ہم اللہ کے دو بندے نہیں سما سکتے"

بھکاری: "خیال تو مجھے بھی کئی بار ہوا مگر ہمت نہ پڑی"

نوجوان: "مگر ہمت نہ پڑی"!

(نوجوان اور کچھ کہے بغیر بڈھے کا ہاتھ پکڑ کر مسجد
کی طرف چل دیتا ہے، سیڑھیاں طے کرنے کے
بعد جب یہ دونوں اس کے دروازہ پر پہنچتے
ہیں تو اس کا پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ بجلی کی چمک
اور بادل کی گرج اور تیز ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ
پانی کی موٹی موٹی بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ یہ
دونوں پانی اور سردی میں مسجد کے پھاٹک
کے آگے اسی طرح سر ڈالے کھڑے بھیگ
رہے تھے۔

کھڑے کھڑے بڈھے بھکاری کا چہرہ ایکدم
سُرخ ہو جاتا ہے۔ اس کی گردن کی رگیں
اُبھر آئیں، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ لکڑی
پھینک کر وہ سرو قد کھڑا ہو جاتا اور آگے
دوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مسجد کے پھاٹک
کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ کر کہتا ہے۔

"یہ اور خانۂ خدا!"

پھر دونوں ایک دوسرے پر حسرت بھری
نگاہیں ڈال کر سر جھکا لیتے ہیں۔ بادل اور
تیزی سے کڑکتا ہے۔

شہد

ایک ایکٹ کا مزاحیہ

(ترجمہ از چیخوف)

کردار

مرشکن ــــــــــــ ٹالکشوو کا دوست
ٹالکشوو ــــــــــــ ایک بال بچوں والا آدمی

(مرشکن کے مطالعہ کا کمرہ گدّے دار فرنیچر سے آراستہ مرشکن لکھنے کی میز پر بیٹھا ہے۔ ٹالکشوو داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھوں میں لیمپ کا گلوب، ایک کھلونا بائیسکل تین ٹوپی کے ڈبے، کپڑوں کا ایک بڑا بنڈل، ایک مچھلی نما بکس جس میں بیئر کی بوتلیں ہیں اور کئی چھوٹے چھوٹے بنڈل ہیں، وہ اپنے چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے اور ایک صوفہ پر اس طرح گر جاتا ہے جیسے تھک کر چور ہو رہا ہو)

مرشکن۔ ہلو، ٹالکشوو، بڑی خوشی ہوئی، کہاں سے آرہے ہو؟

ٹالکشوو۔ (لمبی سانس لیتے ہوئے) پیارے دوست ..... مجھے تم سے ایک عنایت کی درخواست کرنی ہے ..... میں تم سے التجا کرتا ہوں ...... مجھے کل تک کے لئے ایک ریوالور عاریتہً دیدو ...... اتنا تو حق دوستی ادا کرو!

مرشکن۔ ایں؟ ریوالور کی تم کو کیا ضرورت پڑ گئی؟

ٹالکشوو۔ ہے ایک ضرورت ...... یا اللہ ..... ذرا پانی پلواؤ .... جلدی کرو، پانی! ہاں مجھے ضرورت ہے ..... آج رات کو مجھے ایک تاریک جنگل سے گزرنا ہے اور اس لئے ...... ہر خطرہ کے لئے تیار رہنا ہے، بھئی تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ بس ریوالور دیدو!

مرشکن۔ اُف یہ کیا بیہودہ باتیں ہیں ٹالکشوو۔ یہ تاریک جنگل کی کیا بکواس ہے؟ معلوم ہوتا ہے تمہارے سر پر کچھ سوار ہے کیوں؟ تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت نیک نہیں، لیکن آخر بات کیا ہے بھئی؟ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟

ٹالکشوو۔ ذرا ٹھہرو، مجھے سانس لینے دو ..... یا خدا۔ اتنا تھکا ہوا ہوں جیسے ایک کتا، سر اور پورے جسم میں ایسی سنسنی ہے جیسے مجھے خوب پیٹا گیا ہے۔ اب زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ دوست ہو تو سوالات مت کرو۔ تفصیل

مت پوچھو..... بس ایک ریوالور دیدو! میں منت کرتا ہوں!

مرشیکن۔ ارے رے، ٹالکشو دیہ کیسی کمزوری ہے، تم بال بچوں والے
آدمی ہو، کونسل کے ممبر ہو! تمھیں شرم آنی چاہیئے!

ٹالکشو د۔ میں بال بچوں والا آدمی ہوں! میں شہید ہوں، شہید، میں
یار برداری کا جانور ہوں، غلام ہوں، بزدل ہوں کہ بجائے
ہمت کے ساتھ دوسری دُنیا کی راہ لینے کے موت کے انتظار
میں بیٹھا ہوں۔ میں ایک چیتھڑا ہوں، کُڑھ مغزا ہوں،
احمق ہوں، میں آخر کیوں زندہ ہوں؟ میری زندگی کا
مقصد کیا ہے؟ (اچک کر کھڑا ہوجاتا ہے) بتائیے جناب
والا میں کس لئے جیئے جارہا ہوں؟ دماغی اور جسمانی
مصائب کا یہ سلسلہ کیوں برداشت کررہا ہوں؟ ایک
عقیدہ کی خاطر جان دیدینا میری سمجھ میں آتا ہے لیکن اپنی
جان کو گھلائے جانا خدا جانے کس مقصد کے لئے لیمپ
کے گلوب کیلئے یا عورتوں کے پیٹی کوٹ کے لئے۔ نہیں یہ
مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ نہیں ہوسکتا ہرگز نہیں۔ بہ کافی
کرچکا! کافی!

مرشیکن:۔ اتنی زور سے مت بولو۔ پڑوس کے لوگ سُننگے!

ٹالکشو د۔ پڑوس کے لوگ سُنا کریں مجھے کچھ پروا نہیں۔ اگر تم مجھے
ریوالور نہیں دوگے تو کسی اور سے مل جائیگا۔ کسی نہ کسی طرح
میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہونگا یہ تو طے ہے۔

مرشیکن۔ ٹھہرو۔ تم نے میرا بٹن توڑ ڈالا۔ سکون کے ساتھ باتیں کرو۔
میں ابتک نہیں سمجھ سکا کہ تمہاری مصیبت کیا ہے؟

ٹالکشو د۔ مصیبت کیا ہے؟ تم پوچھتے ہو مصیبت کیا ہے؟ میں
تمہیں بتاتا ہوں۔ ضرور بتاؤں گا ممکن ہے کہدینے سے
کچھ طبیعت ہلکی ہو...... آؤ بیٹھ جائیں۔ تو سُنو......
اُف سانس لینا مشکل ہورہا ہے...... مثال کے لئے
آج ہی کو لو۔ تم جانتے ہو کہ دس بجے صبح سے ۴ بجے شام
تک دفتر میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ دفتر کمبخت گرمی سے تنور
بنا رہتا ہے، حبس، مکھیوں کی بھنبھناہٹ، ایک عجیب

انتشار اور اُلجھن رہتی ہے، اس پر طرّہ یہ کہ سکریٹری
صاحب چھٹی پر ہیں، ہارلو بیاہ کرنے گئے ہوئے ہیں
ماتحت ملازمین ہفتوں سے ڈھیلے پڑے ہیں کسی پر محبّت
کا بھوت سوار ہے، کسی کو تھیٹر کا شوق چرّا یا ہے
...... سب پژمردہ ہیں، اونگھتے رہتے ہیں اور اتنے
مضمحل کہ ان سے عقل سے کام کرنے کی امید ہی نہیں
کی جاسکتی۔ سکریٹری کے فرائض ایک ایسے بزرگ انجام
دیرہے ہیں جو محبّت میں بائیں کان سے بہرے ہوگئے ہیں
جو لوگ دفتر میں تشریف لاتے ہیں معلوم ہوتا ہے حواس
کہیں گم کر آئے ہیں۔ ہمیشہ جلدی میں رہتے ہیں اور
بے چین —— کبھی غصّہ کرتے ہیں۔ کبھی دھمکی دیتے
ہیں۔ الغرض دفتر ایسا مچھوا بازار بنا رہتا ہے کہ جی چاہتا
ہے مدد کے لئے چیخیں۔ انتشار اور اُلجھن۔ اور کام بھی
عجیب جہنمی قسم کا ہے۔ روز ایک ہی قسم کا۔ وہی انکوائیریاں
وہی حوالے۔ ایسے یکساں جیسے سمندر کی لہریں۔ جانتے
ہو آنکھیں سر سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ ذرا پانی دو......
دفتر سے باہر آئیے تو چولیں ڈھیلی ہوچکی ہوتی ہیں اور جسم
چور...... اب چاہیئے تو یہ تھا کہ کھا پی کر اچھی طرح
آرام کرتے لیکن جی نہیں، یاد رہے آج کل گرمی کی چھٹیاں
ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک غلام ہیں، چیتھڑے
ہیں، جانور ہیں، آپ کو فرمائشوں کی تعمیل میں چوزوں کی
طرح دوڑتے رہنا ہے۔ ہماری دیہاتی سوسٹی میں ایک
نہایت ہی عمدہ رواج ہے، اگر کوئی بیچارا شہر کی طرف جارہا
ہو تو نہ صرف اس کی بیوی کو بلکہ ہر مردود چھٹی منانیوالے کو
یہ حق ہوتا ہے کہ اسکے سر پر فرمائشوں کا انبار رکھ دے،
بیگم صاحبہ کا اصرار ہے کہ درزی کے ہاں جا کر اسے خوب
ڈانٹوں کیونکہ اس نے بلاؤز کا باڈس بہت ڈھیلا اور
کندھے بہت تنگ بنائے ہیں۔ سونیچکا کے جوتے بدلنا،
سالی صاحبہ کو ۵ ر کا گہرے سُرخ رنگ کا ریشم درکار ہے

جو نمونہ کے مطابق ہو اور ڈھائی گز لیں ...... بلکہ
ٹھہرو میں تمہیں پڑھ کر ہی سنائے دیتا ہوں (اپنی جیب سے
ایک پرزہ نکالتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے) لیمپ کے لئے
ایک گلوب، آدھا سیر سموسہ، ۵ آنہ کا لونگ اور جائفل،
مشّا کے لئے ریڈی کا تیل، دس سیر دانہ دار چینی، مکان
سے تانبے کی پتیلی، اور چینی باریک کرنے کے لئے کھرل،
کاربالک ایسڈ، کیڑے مارنے کا سفوف، ۱۰ ارکا چہرے
کا پاؤڈر۔ ۲۰ بوتل بیئر، سرکہ، میڈم موائیزل۔ شانتنو کے
لئے ۸۲ نمبر کا انگیہ ...... افوہ، اور مکان سے مشّا
کا لمبا کوٹ اور برساتی جوتہ، یہ تو میری بیگم صاحبہ اور
خاندان والوں کی فرمائشیں ہیں اب ذرا میرے پیارے
دوستوں اور عزیز پڑوسیوں (خدا ان سے سمجھے) کی فرمائشیں
بھی سنئے، واسّل کے گھر والے کل وولوڈیا کی نام کھائی
منا رہے ہیں، اسکے لئے ایک بائیسکل لانی ہے، لفٹنٹ
کرنل صاحب کی بیگم صاحبہ آج کل بڑی دلچسپ حالت
میں ہیں اور اس لئے اس خاکسار کو روزانہ دایہ کے گھر
جاکر تشریف لے چلنے کے لئے خوشامد کرنی ہے وغیرہ
وغیرہ۔ میری جیب میں پانچ فہرستیں ہیں اور رومال میں
یہاں سے وہاں تک صرف گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس
طرح جناب والا دفتر کے بعد سے ٹرین کے وقت تک اس
خاکسار کو شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک زبان
نکالے ہوئے کتے کی طرح دوڑتے پھرنا ـــــ دوڑتے پھرنا
اور اپنی زندگی کو کوسنا۔ بزاز کے یہاں سے دواخانہ،
دواخانہ سے درزی کے یہاں۔ درزی کے یہاں سے
قصائی کی دکان پر اور وہاں سے پھر واپس دواخانہ،
کہیں گرتے گرتے بچتا ہوں، کہیں روپیہ گم ہو جاتا ہے
کہیں قیمت ادا کرنی بھول جاتا ہوں اور دکان والے
گالیاں دیتے ہوئے پیچھا کرتے ہیں اور چوتھی جگہ کسی
خاتون کی ساری پر پیر پڑ جاتا ہے ....

افوہ ـــــ اس قسم کی ورزش آدمی کو نکما اور اتنا
چور کر دیتی ہے کہ رات بھر ایک ایک ہڈی دکھتی ہے اور
خواب میں مگر مچھ دکھائی دیتے ہیں۔ خیر کسی طرح کام ختم ہوا
اور تمام چیزیں خریدی جا چکیں ...... تو جناب والا
ذرا یہ بتائیے کہ ان تمام خرافات کو پیک کیسے کیا جائے؟
مثلاً آپ ایک بھاری تانبے کی پتیلی اور وزنی کھرل کو
لیمپ کے گلوب کے ساتھ یا کاربالک ایسڈ کو چائے کے
ساتھ کس طرح باندھینگے؟ بیئر کی بوتلوں اور بائیسکل کا
کس طرح جوڑ بیٹھے گا؟ اس محنت کیلئے تو رستم کی ضرورت
ہے، یہ ایک مسئلہ ہے ایک معمہ۔ اپنے دماغ کو جتنا
چاہو ٹٹولو نتیجہ صرف اتنا ہو گا کہ یا تو کوئی چیز ٹوٹ
جائیگی یا کوئی چیز چھلک کر گر جائیگی اور اسٹیشن پر اور
گاڑی میں اس طرح کھڑا رہنا ہو گا کہ ٹانگیں پھیلی ہوئی بازو
نکلے ہوئے، کسی گٹھری کو ٹھڈی سے سنبھالے ہوئے
کسی طرف مچھلی نما ٹوکری لٹک رہی ہے اور کہیں گتے
کے ڈبے ہوا میں ڈول رہے ہیں اور جب گاڑی چلنے
لگے تو مسافر گٹھریوں کو اپنی جگہوں سے کھسکانا شروع
کرتے ہیں اس لئے کہ بیٹھنے کی تمام جگہوں پر گٹھریاں
چھپکے رہتی ہیں۔ کوئی شور مچاتا ہے کوئی گارڈ کو پکارنے
لگتا ہے، کوئی ڈبہ سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتا ہے
لیکن میں کر ہی کیا سکتا ہوں، صرف کھڑا ہوا پٹتے ہوئے
گدھے کی طرح کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتا ہوں۔
اب سنئے کہ اسکے بعد کیا ہوتا ہے۔ گھر پہنچتا ہوں۔ اب
تمہیں بتاؤں دن بھر کی محنت کے بعد اتنا تو مجھے حق پہنچتا
ہے کہ پیٹ بھر کے کھانا کھاؤں اور جی بھر کے کچھ پیوں
دم بھر کے لئے ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ سچ کہتا ہوں لیکن
ان میں سے ایک کام بھی نہیں کر سکتا۔ بیگم صاحبہ کی
نظر عنایت اس خاکسار پر ذرا زیادہ رہتی ہے۔ آپ نے
ابھی ایک لقمہ بھی نہیں نگلا ہو گا کہ ایک مرتبہ بیگم صاحبہ

۱۶۲

آپ پر چھبتیں گی اور بس آپ کو چپکے سے کسی تھیٹر یا
ناچ گھر کی طرف چل پڑنا ہوگا۔ کیا مجال کہ آپ چوں بھی کر بیٹھیں
آپ تو شوہر ہیں اور بیگموں کی لغت میں شوہر کے معنی
ایسے بے زبان جانور کے ہوتے ہیں جس کو جس طرح چاہے
ہنکائے اور جتنا چاہے اس پر بوجھ لادنے کے لئے انجمن
انسداد مظالم جانوران کی جانب سے کسی مداخلت کا کوئی
خطرہ نہیں ہو سکتا۔ آپ تھیٹر میں جاکر شریف خاندان
کے ساز، یا موٹیا، ملاحظہ فرمائیں اور اگرچہ آپ کی کمزوری اتنی
بڑھتی جارہی ہے کہ سانس اکھڑ جانے کا خطرہ محسوس ہوتا
ہے لیکن بیگم صاحبہ کے اشارہ پر تالیاں بجانا بھی بالکل
ضروری ہے۔ اسکے بعد کلب جاکر ناچ میں شرکت کیجئے
بیگم صاحبہ کیلئے ایک مناسب رفیق تلاش کیجئے اور کوئی
نہ ملے تو خود ناچئے۔ آدھی رات کو ایسی حالت میں کہ آپ
بجائے انسان کے مری ہوئی بھیڑ ہو رہے ہوں مکان واپس
آئیے لیکن خیر۔ بالآخر وہ وقت آہی پہنچا جس کا بڑی
دیر سے آپ کو انتظار تھا۔ اب آپ کپڑے بدل کر بستر
میں گھستے ہیں۔ بہت خوب۔ اطمینان سے آنکھیں بند
کرکے میٹھی میٹھی نیند کے مزے لے سکتے ہیں۔ آہا۔
جانتے ہو یہ کتنی پرسکون کیفیت ہے۔ نہایت شاعرانہ
اور سکون بخش۔ نہ تو ساتھ کے کمرے سے بچوں کے
چیخنے کی آواز آتی ہے نہ بیگم صاحبہ وہاں تشریف رکھتی
ہیں اور آپ کی روح کو پورا اطمینان حاصل ہے کہ اس سے
بہتر حالت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔ نیند آجاتی ہے کہ
یکایک ۔ ۔ ۔ ۔ بھن بھن بھن مچھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(کود پڑتا ہے) خدا کی پناہ مچھر۔ خدا ان کو غارت کرے
(مٹھی ہلاتا ہے) مچھر۔ یہ موذی پلیگ کو بھی مات کرتے
ہیں۔ زمانہ وسطیٰ کی مذہبی عدالتوں کے مظالم سے بھی
ان کی تکلیف بڑھی ہوئی ہے۔ یہ حضرات مچھر ان اتنی درد
بھری آواز میں اتنے پرسوز غمگین لہجے میں اپنے راگ الاپتے
ہیں گویا آپ مداخلت کی معافی مانگ رہے ہیں لیکن مردود
اس بری طرح کاٹتے ہیں کہ آپ گھٹنوں کھجلاتے ہی رہ جائیں
نیند تو ہوا ہو گئی۔ اب آپ سگریٹ سلگائیے، مچھر مار دیئے
سر کو چادر کے اندر گھسا کر سونے کی کوشش کیجئے لیکن
نیند کہاں۔ ابھی مچھروں کے کاٹے پر صبر بھی نہیں آیا ہوگا
کہ ایک دوسری مصیبت سر پر نازل ہو جاتی ہے۔ بیگم
صاحبہ ڈرائنگ روم میں گانے کی مشق شروع کر دیتی ہیں
دن بھر آرام فرماتی ہیں اور رات کو محفل سرود گرم کرتی ہیں
معاذاللہ یہ راگ کچھ کے ہوتے ہیں۔ مچھر بھی ان کا مقابلہ
نہیں کر سکتے۔ (گاتا ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظالم یہ راگ میرے
جسم سے روح کھینچ نکالتے ہیں۔ آواز کی گنگناہٹ کم کرنے
کے لئے میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ کنپٹی پر اپنی انگلیوں
سے ٹھوکے دیتا ہوں اور اسی طرح اس وقت تک دئے
چلا جاتا ہوں جبتک کہ بیگم صاحبہ ۴ بجے صبح چلی نہ جائیں
اخ۔ ارے بھائی ذرا ایک گلاس پانی اور منگاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر رات بھر آنکھ
جھپکائے بغیر صبح چھ بجے بستر سے اٹھ جانا پڑتا ہے
—— اور بس فوراً اسٹیشن چلے جائیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوڑتا
ہوں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ راستہ بھر کیچڑ ملتا ہے،
سردی —— برسات —— شہر پہنچتا ہوں تو پھر وہی رفتار
بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ یہ میری زندگی ہے
میں کہتا ہوں یہ زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے میں
اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے لئے بھی ایسی زندگی کی
خواہش نہیں کر سکتا۔ جانتے ہو، ان پریشانیوں نے مجھے
بیمار کر ڈالا ہے۔ دمہ، اختلاج، ہر چیز کے متعلق ایک دہشت
معدہ کام نہیں کرتا، آنکھیں دھندلی ہو گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تم یقین نہیں کرو گے کہ میں مستقل طور پر کمزوری اعصاب کا
مریض ہوں (اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے) لیکن یہ میں
صرف تم سے کہہ رہا ہوں، ارادہ ہے کہ ڈاکٹر سینیشوٹ یا

رزہوسکی سے مشورہ کروں ۔ 'بھائی اکثر ایک قسم کا
خوف طاری ہو جاتا ہے جب بھی ذرا طبیعت جھنجلاتی ہے
مچھروں کے کاٹنے یا راگ کی تکلیف دہ آواز سے غصہ آتا
ہے تو اچانک آنکھوں کے سامنے دھندلکا ہو جاتا ہے
میں کود پڑتا ہوں، گھر میں چاروں طرف خون، خون خون'
میں خون کا پیاسا ہوں، چلاتا ہوا دوڑنے لگتا ہوں، گویا
میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور ایسے موقع پر سچ مچ جی چاہتا
ہے کہ کسی کو چھری بھونک دوں یا کرسی سے کسی کا سر
توڑ دوں۔ دیکھو بھلا یہ چھٹیاں کیا کیا مصیبتیں ساتھ لاتی
ہیں اور میری حالت پر کسی کو رحم نہیں آتا، میرے دردِ دل
کو کوئی محسوس نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب لوگ اس کو روز
مرہ کا معمول سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو ہنستے ہیں لیکن خیال
کرو کہ میں ایک جاندار مخلوق ہوں اور زندہ رہنا چاہتا
ہوں، یہ مذاق نہیں بلکہ ٹریجیڈی ہے۔ خیر اگر تم ریوالور
نہیں دو گے تو کم از کم تھوڑی سی ہمدردی تو کر سکتے ہو۔

مرشکن۔ مجھے واقعی تم سے ہمدردی ہے۔

ٹالکشود۔ میں جانتا ہوں تم کو کتنی ہمدردی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ
اب چلنا چاہیئے۔ سمو سے لے آؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی
ٹوتھ پاؤڈر بھی لانا باقی ہے۔ پھر اسٹیشن بھی جانا ہے۔

مرشکن۔ چھٹیوں میں تم رہتے کہاں ہو ؟

ٹالکشود۔ پیوٹر دبوریں۔

مرشکن۔ (خوش خوش) واقعی ؟ ارے بھئی تم اولگا پیو لو و
نا فنبرگ کو جانتے ہو ؟ وہ بھی وہیں رہتی ہیں۔

ٹالکشود۔ ہاں ہاں میں اُن کو جانتا ہوں وہ تو ہماری دوست ہیں۔

مرشکن۔ سچ کہو! کیا حسن اتفاق ہے۔ بڑی خوش قسمتی ہے۔ ارے بھئی
بڑی مہربانی ہو گی ۔ ۔ ۔

ٹالکشود۔ کیا ؟

مرشکن۔ پیارے دوست کیا تم ایک مہربانی کر سکتے ہو ؟ دیکھو خفا
نہ ہو۔ وعدہ کرو کہ کرو گے۔

ٹالکشود۔ ارے بات کیا ہے۔

مرشکن۔ دیکھو دوست کی حیثیت سے میں تم سے ایک درخواست
کرتا ہوں، لجاجت کرتا ہوں۔ پہلے تو اولگا کو میری طرف
سے سلام کہنا اور کہنا میں زندہ ہوں اور اچھا اور اسکے
ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ اسکے لئے
ایک چیز لیتے جاؤ۔ اس نے مجھ سے سینے کی دستی مشین کی
فرمائش کی تھی لیکن کوئی لے جانے والا ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بھئی ذرا لیتے جاؤ۔ اور جب وہاں جا ہی رہے ہو تو یہ پنجرا
اور لال بھی لیتے جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ذرا احتیاط سے
لے جانا ورنہ پنجرے کا دروازہ ٹوٹ جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔
ارے تم مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو ؟

ٹالکشود۔ سینے کی ایک مشین۔ پنجرہ اور لال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(بے موقع اشعار گانے لگتا ہے)۔

مرشکن۔ ٹالکشود تم کو ہو کیا گیا ہے ؟ تمہارا چہرہ اتنا سُرخ
کیوں ہے ؟

ٹالکشود۔ (پیر پٹکتے ہوئے) لاؤ دو مجھے سینے کی مشین، کہاں
ہے پنجرہ ؟ تم خود بھی میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میری بوٹیاں
نوچ لو۔ کھا جاؤ مجھے۔ مار ڈالو (مٹھیاں بند کر لیتا ہے)
خون۔ خون۔ میں خون کا پیاسا ہوں۔

مرشکن۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔

ٹالکشود۔ (اس پر جھپٹتے ہوئے) خون۔ خون۔ میں خون کا
پیاسا ہوں۔

مرشکن۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) اس کا دماغ خراب ہو گیا
(چلاتا ہے) پیٹروشا، میریا، کہاں ہو تم سب۔ مجھے
بچاؤ۔

ٹالکشود۔ (کمرے میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے) میں خون کا
پیاسا ہوں، خون کا

پردہ

انّا کریننا

"تلافیٔ مافات"

(ٹالسٹائی کا مشہور ادبی شاہکار اُردو میں)

(مترجمہ جناب محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)

باب اوّل

(۱)

خوش و خورم خاندان تو قریب قریب سب خوش و خورّم نظر آتے ہیں، لیکن وہ بدقسمت گھرانے جو رنج و غم میں مبتلا ہیں، اپنی جداجدا خصوصیات رکھتے ہیں۔ "ابلانسکی" کے گھرانے میں عجیب گڑبڑ پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کی مالک یعنی "ابلانسکی" کی بیوی نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ان کی فرانسیسی گورنس سے اسکے شوہر کے پوشیدہ ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ طے کرلیا تھا کہ اب وہ اس گھر میں اسکے ساتھ نہ رہے گی۔ یہ کشاکش تین دن سے جاری تھی اور شوہر، بیوی، بچے اور تمام گھر والے اس سے یکساں متاثر تھے، اور محسوس کر رہے تھے کہ اب ان کے ایک ساتھ رہنے کے کوئی معنی نہیں، اگر چند مسافر بھی اک سرائے میں ٹھہرے ہوئے آپس میں ایک جماعت سی بنالیں، تو وہ بھی اپنی بہت سی مشترک دلچسپیاں رکھتے ہوں گے۔ لیکن اس گھر کے مکینوں کیلئے کوئی مشترک دلچسپی نہ تھی۔ بیوی صاحبہ اپنے کمرہ سے نہیں نکلتی تھیں شوہر صاحب تین روز سے گھر سے غائب تھے، بچے گھر میں اِدھراُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ انہیں اپنا کام معلوم نہ تھا۔ گورنس نے اپنی ایک دوست کو خط لکھ رکھا تھا کہ وہ اسکے لئے دوسری ملازمت تلاش کرے۔ باورچی صاحب شام سے غائب تھے۔ باورچی کے مددگار اور گاڑیبان اپنی اپنی تنخواہ کے متقاضی تھے۔

اس جھگڑے سے تیسرے روز "پرنس اسٹیفن آرکیڈوِچ ابلانسکی"، جس کو اسکے دوست بلاتکلفی میں "اسٹوا" کے نام سے پکارتے تھے، حسب معمول ۸ بجے صبح اُٹھا، اپنی خوابگاہ میں نہیں، بلکہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں، ایک چمڑے سے منڈھی ہوئی کوچ پر، اسپرنگ دار

کوچ پر کروٹ بدلی، تکیہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں دبایا، اور اپنا منہ اس پر رکھ کر اس نے پھر سونے کا قصد کیا، پھر معاً آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔
ہائیں، میں نے کیا خواب دیکھا، اور خواب کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا "ڈرامسٹٹ" میں ایک ڈنر اور "ایلیبین" کی طرف سے بالکل امریکن قسم کا ڈنر، گویا معلوم ہوتا تھا کہ "ڈرامسٹٹ" امریکہ میں ہے۔ کانچ کی میزوں پر ڈنر چنا ہوا تھا، عجیب و غریب نغمے نکل رہے تھے، شاید "سیونی سرو" کا گیت تھا۔ نہیں اس سے بھی دلکش کوئی چیز تھی۔ خوبصورت عورتیں ساقی گری کر رہی تھیں۔

اسٹیفن آرکیڈوچ کی آنکھوں میں اس خیال سے چمک پیدا ہوگئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنے خیال کے سلسلہ کو جاری رکھا۔
"واہ کتنا پُرلطف، کتنا پُرمسرت، اپنی خصوصیات میں کیسا نرالا، الفاظ میں اسکے لطف کو ادا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کا پورے طور پر خیال میں لانا بھی مشکل ہے۔" بھاری بھاری پردوں کے کناروں سے روشنی کی کرن کو کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنے سُنہری خوبصورت منقش سلیپر میں پاؤں ڈالے۔ یہ سلیپر اس کی پچھلی سالگرہ پر اس کی بیوی نے ہدیۃً دیئے تھے۔ اور عادت کے موافق جو نو برس سے متواتر چلی آرہی تھی اس نے اپنا ہاتھ خوابگاہ کی کھونٹی کی طرف بڑھانا چاہا۔ جہاں اس کا گاؤن ٹنگا رہتا تھا۔ یکایک اس کو پورا واقعہ یاد آگیا کہ وہ کیوں وہاں سویا اور اپنی خوابگاہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ نہیں سویا۔ مسکراہٹ اسکے چہرہ سے غائب ہوگئی۔ اور کدورت اور غصّہ کے آثار پیدا ہوگئے۔

واقعہ کی تمام تفصیلات پر اس نے خیال دوڑاتے ہوئے کہا "خدایا! آخر اب کیا ہو۔ معاملہ بالکل بے قابو ہے۔ اور میرا قصور بالکل ظاہر اور مسلّم۔

نہیں۔ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ اور کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ سب میرا قصور ہے۔ یقیناً میرا قصور ہے لیکن میں قابلِ ملامت نہیں ہوں۔ اس ساری مصیبت کا سبب وہی واقعہ تھا۔ خدایا! اس نے مایوسانہ طور پر کہا۔ اور اس جھگڑے کی تمام ناخوشگوار روداد اس کے سامنے آگئی۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ناخوشگوار، اور تکلیف دہ لمحات اس وقت تھے جبکہ وہ تھیٹر سے واپس آکر نہایت خوش خوش اپنی بیوی کے لئے ایک سیب ہاتھ میں لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، اور وہاں نہ پاکر مطالعہ کے کمرہ میں دیکھا۔ اس کو وہاں بھی نہ پاکر بالآخر اپنی خوابگاہ میں اس نے اپنی بیوی کو پایا اور وہی منحوس خط ہاتھ میں لئے ہوئے جس نے کل واقعہ اس پر ظاہر کر دیا۔

وہ ہمیشہ مضمحل، متفکر اور مصروف رہنے والی "ڈوالی" جو وہ اس کو عموماً سمجھا کرتا تھا ایک بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت خوفناک اور غضبناک نظروں سے اس کو گھور رہی تھی۔

یہ کیا ہے؟ اس نے درشتی کے ساتھ خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جب یہ منظر اسٹیفن کے خیال میں آیا تو اس واقعہ سے زیادہ تکلیف دہ۔ اصل اسکے جواب کے خیال نے اسے دی جو اس نے اپنی بیوی کو اس موقع پر دیا تھا۔ اس موقع پر اس کا احساس وہی احساس تھا جو عموماً ایسے لوگوں کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی رکیک کام میں یکایک پکڑے جائیں۔ اس موقع کے مطابق اثرات وہ اپنے چہرہ سے ظاہر نہ کرسکا۔ بجائے بہت زیادہ ناراض ہوجانے۔ انکار کرنے۔ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے۔ یا معافی کی التجا کرنے یا بالکل غیر متعلق نظر آنے (ان میں ہر صورت اس سے بہتر ہوتی جو اس نے اختیار کی) بے اختیاری کے ساتھ (غالباً یہ اسکے دماغ کا ایک اضطراری فعل تھا) وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ جس کا وہ عادی تھا۔ اُس موقع پر انتہائی احمقانہ مسکراہٹ تھی۔

اس مسکراہٹ پر وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ "ڈوالی" یہ اس کی (بیوی کا پیارا نام تھا) نے جس وقت اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ بالکل آگ بگولہ ہوگئی۔ ایک سخت جسمانی اذیت سے کانپتے ہوئے وہ اپنے مزاج کے مطابق انتہائی طور پر مشتعل ہوگئی اور جو کچھ مُنہ

میں آیا، کہتی ہوئی اس کمرہ سے بھاگ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سے اس نے اپنے شوہر سے ملنا بالکل ترک کر دیا۔
اگر میں اس وقت احمقانہ طور پر نہ مسکرایا ہوتا۔ اسٹیفن آرکیڈی وچ نے سوچا۔ لیکن۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔
اس نے مایوسانہ انداز میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ لیکن اسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

(۲)

اسٹیفن آرکیڈی وچ ایک نہایت ایماندار اور باضمیر انسان تھا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ منفعل ہے، حالانکہ وہ منفعل نہیں تھا۔ اسے اس پر کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ ایک چونتیس سال کا شکیل نوجوان اپنی بیوی سے حقیقی محبت نہیں کرتا جو اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی ہے۔ اور اب تک سات بچوں کی ماں ہو چکی ہے۔ جن میں سے پانچ بچے زندہ ہیں۔ اس کو محض اس کا افسوس تھا کہ وہ اپنی حرکتوں کو اپنی بیوی سے چھپا نہ سکا۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا تمام وجود اس واقعہ کے بعد، بیوی، بچوں اور خود اس کی حالت پر ترس کھا رہا ہے۔ اگر اس کو یہ علم ہوتا۔ کہ اس کا بیوی پر کتنا تباہ کن اثر پڑے گا۔ تو وہ اس واقعہ کو اس سے چھپانے کی اور زیادہ کوشش کرتا۔ اس نے اسپر کبھی غور نہیں کیا تھا بلکہ اس کو کچھ خفیف سا گمان یہ بھی تھا کہ اس کی بیوی اسکی بے وفائی سے واقف ہے اور اُس کو اس کی زیادہ پروا نہیں۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اپنی موجودہ حالت میں جبکہ وہ نوجوان ہے نہ دلکش ہے نہ اور کوئی مخصوص قابلیت رکھتی ہے بلکہ محض اپنے بچوں کی سیدھی سادھی ماں ہے۔ انصافاً وہ اس معاملہ میں درگذر سے کام لے گی۔ لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس ثابت ہوئے۔

"مہیب اور کس قدر مہیب" اسٹیفن نے خیال کیا "اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں" "آہ اس واقعہ سے قبل حالات کتنے بہتر تھے وہ اپنے بچوں میں کتنی مسرور و مطمئن تھی، میں اسکے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتا تھا، وہ بچوں کی تربیت اور گھر کے انتظام کے معاملہ میں بالکل آزاد تھی۔ بیشک یہ کس قدر بدنما ہے کہ میرا تعلق گھر کی خادمہ (گورنس) کے ساتھ ہو۔ کتنا نامناسب ہے۔ خادمہ کے ساتھ محبت کرنے میں کتنی ونائیت اور ذلت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن انسانی کمزوریاں "مل رولنڈ" کی شرارت سے بھری ہوئی آنکھیں، اور دلکش مسکراہٹ، ہاں! جبتک وہ ہمارے یہاں ملازم رہی ہمارے تعلقات میں آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کا سب سے برا پہلو تو یہ ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا، ہر چیز میرے ساتھ نفرت میں اضافہ کرتی ہے۔ آخر میں کیا کروں گا۔ میں کیا کروں گا۔

لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ سوائے اس ایک جواب کے جو زندگی خود تمام پیچیدہ، اور لاینحل مشکلات کیلئے رکھتی ہے یعنی موجودہ حالات کے ساتھ ساتھ چلے چلو، یا بھول جاؤ۔

خیر دیکھا جائیگا۔ اسٹیفن آرکیڈی وچ نے اپنے دل میں کہا۔ اور کوچ سے اُٹھتے ہوئے، اس نے اپنا فاختئی رنگ کا لبادہ پہنا، جسپر ریشمیں دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور پیٹی کی گرہ لگا کر اس نے، ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ پھر اپنے مستحکم قدموں کے ساتھ وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی تک گیا۔ پردہ ایک طرف کھینچا اور زور سے گھنٹی بجائی۔ جس کی تعمیل اسکے ایک پرانے خادم میٹوے نے کی اور اسکے کپڑے، بوٹ اور ساتھ ہی ایک تار لیکر حاضر ہوا۔ میٹوے کے پیچھے ہی نائی مع اپنے سامان کے داخل ہوا۔

"کیا دفتر سے کچھ کاغذات آئے ہیں؟" اسٹیفن نے دریافت کیا۔ اور تار لیکر آئینہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

سب لوگ میز پر آ گئے ہیں۔ میٹوے نے اپنے مالک پر ایک متجسسانہ ہمدردی سے بھری ہوئی نگاہ ڈالی، اور تھوڑی دیر رک کر اس نے کسی قدر مسکراہٹ کے ساتھ جس سے چالاکی ظاہر ہوتی تھی کہا۔ ابھی ابھی ایک شخص اصطبل سے آیا تھا جہاں گھوڑے کرایہ پر ملتے ہیں۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس نے آئینہ میں میٹوے کی طرف دیکھا اور ان دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے

۱۷۷

کو سمجھتی ہوئی آپس میں ملیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسٹیفن اپنی نگاہوں ہی اسی سے کہہ رہا ہے "تم یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا تمہیں حالات معلوم نہیں ہیں۔
میٹوے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنے مالک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکے چہرہ پر جس سے اس کی نیک طینتی ظاہر ہوتی تھی بہت ہی خفیف مسکراہٹ تھی۔

"میں نے اس سے کہدیا ہے کہ، اتوار کے دن آئے، اور آپ کو بار بار پریشان نہ کرے۔"

بظاہر اس کا یہ جواب پہلے سے سوچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسٹیفن محسوس کر رہا تھا کہ میٹوے کسی قدر مذاق کے ساتھ اس کی توجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تار کا لفافہ پھاڑا۔ اور تار کو نہایت تیزی سے پڑھ گیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اس لئے میٹوے سے کہا۔

میٹوے، میری بہن آنا آرکیڈ یناکل آرہی ہیں۔

خدا کا شکر ہے۔ میٹوے نے کہا۔ صاف طور سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے مالک کی طرح اس موقع پر آنا آرکیڈ ینا کے آنے کی اہمیت کو سمجھ رہا ہے اسکے معنیٰ یہ ہیں کہ اسٹیفن آرکیڈی وچ کی نہایت عزیز بہن ہیں۔ دونوں میاں بیوی میں صفائی کرا سکیں گی۔

کیا وہ تنہا آرہی ہیں یا ان کے شوہر بھی ساتھ ہیں۔ میٹوے نے دریافت کیا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ، اس کا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ نائی اسکی مونچھوں کے بال صاف کر رہا تھا۔ اس نے ایک انگلی اٹھادی۔

میٹوے نے اپنے سر کو جنبش دی اور کہا، تنہا تو میں ان کے قیام کے لئے کمرہ کو درست کروں۔

ڈاریہ الیگزنڈرونہ سے دریافت کرو۔ وہ تمہیں بتائیں گی۔

میٹوے نے تعجب سے یہ نام دُہرایا۔

ہاں، ان سے کہو، یہ تار لیجاؤ۔ اور مجھ سے آکر کہو کہ، انہوں نے کیا کہا۔

میٹوے نے خیال کیا کہ اس سے ان کی آزمائش مقصود معلوم ہوتی ہے لیکن جواب میں اس نے صرف "بہت اچھا کہا، اور چلا گیا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ اس عرصہ میں اپنا مُنہ دھوکر بال درست کر رہا تھا اور کپڑے پہننے ہی والا تھا کہ میٹوے اپنے جوتے کی چرچراہٹ کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا۔ تار اسکے ہاتھ میں تھا۔ نائی کمرہ سے جاچکا تھا۔

ڈیریا الیگزنڈرونہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے کہدوں کہ وہ جارہی ہیں۔ اور جو آپ چاہیں کریں۔ یہ کہکر وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال کر اور اپنا سر ایک طرف کو جھکا کر اپنے مالک کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ بالکل خاموش تھا۔ تھوڑی دیر بعد تفنن آمیز لیکن متاسفانہ مسکراہٹ اسکے خوبصورت چہرے سے ظاہر ہوئی۔ اچھا میٹوے، اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے، جناب، وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائینگی۔"

ٹھیک ہو جائیں گی؟

"میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔"

"حقیقۃً۔"

اتنے میں دروازہ کے باہر ایک عورت کے کپڑوں کی سرسراہٹ سُن کر اس نے کہا یہ کون ہے؟

"میں ہوں" ایک مضبوط، لیکن خوشگوار عورت کی آواز نے جواب دیا، اور انا میٹریانہ نے اپنا چیچک زدہ چہرہ کواڑوں

میں سے نکالا۔

اچھا۔ میٹریشیا۔ کیا بات ہے اسٹیفن نے اسکی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

باوجودیکہ اسٹیفن آرکیڈی وچ جیسا کہ وہ خود تسلیم کر چکا تھا غلط راستہ پر تھا۔ لیکن گھر کا ہر آدمی یہاں تک بچّوں کی انّا بھی جو اسکی بیوی کی بہترین دوست تھی اس کی طرفدار تھی۔

کہو؟ اس نے مایوسانہ طور پر پوچھا۔

جناب اسکے پاس جائیے، اور معافی چاہئیے۔ پھر سب خدا کے اختیار میں ہے۔ اُس نے اپنی حالت تباہ کر رکھی ہے۔ اسے دیکھ کر ترس آتا ہے، گھر میں عجیب ہل چل مچی ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ آپ کو اپنے بچّوں کا خیال ہونا چاہیئے۔ اُس سے معافی مانگنے کے سوا آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

"لیکن وہ مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتیں"۔

"بہت اچھا تم جا سکتی ہو" اسٹیفن نے کسی قدر جھینپ کر کہا۔ اپنا لبادہ اُتار کر پھینکتے ہوئے اس نے کہا "میرے کپڑے لاؤ"

میٹوے نے ایک سخت کالر اُٹھایا۔ اور اسپر سے نہ نظر آنے والی گرد کو پھونکتے ہوئے، اور ایک ظاہری اطمینان کے ساتھ وہ اپنے شکیل اور جسیم مالک کو کپڑے پہنانے لگا۔

(۳)

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کپڑے پہن کر، سینٹ لگایا۔ اپنی قمیص کے کفوں کو ٹھیک کیا۔ اور اپنی پاکٹ بک، سگرٹ کیس دیا سلائی کی ڈبیا، اور گھڑی اپنی جیب میں ڈالی، اپنے جیبی رومال کو جھٹکتے ہوئے وہ اپنے کمرہ سے باہر نکلا، باوجود خلفشار کے وہ جسمانی، اور دماغی اعتبار سے بالکل تندرست معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے کھانے کے کمرہ میں گیا۔ جہاں اسکے لئے قہوہ تیار تھا۔ اسکے خطوط اور دفتر کے کاغذ اسکے انتظار میں میز پر رکھے ہوئے تھے۔

اُس نے اپنے خطوں کو پڑھنا شروع۔ ایک خط ایک سوداگر نے بھیجا تھا جس سے وہ ایک جنگلی رقبہ کی فروخت کے متعلق خط و کتابت کر رہا تھا جو اسکی بیوی کی ملک تھا۔ اس رقبہ کا فروخت کر دینا نہایت ضروری تھا لیکن ظاہر ہے کہ جبتک بیوی سے اسکی صفائی نہو جائے، اس معاملہ کا اُٹھانا ہی ناممکن تھا۔ اسکے لئے یہ خیال نہایت رنجدہ تھا کہ مالی معاملات سے صفائی کی ابتدا کی جائے۔ کیونکہ ذاتی غرض کو شامل کر کے صفائی کی کوشش کرنا اسکے خیال میں نہایت شرمناک بات تھی۔

اس خط کو چھوڑ کر، اس نے دفتر کے کاغذات کو لیا۔ سرسری طور پر ان کو دیکھا اور بڑی پنسل سے متعدد نشانات کئے، پھر ان کو ایک طرف ڈال کر قہوہ کی طرف متوجہ ہوا، قہوہ پیتے ہوئے اس نے ایک "روزنامہ" کو کھولا، یہ اسی وقت چھپ کر نکلا تھا، اور اتنا تازہ تھا کہ اسکی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ ہمیشہ آزاد خیال اخبارات پڑھتا تھا، یہ پرچہ بھی انتہا پسند پرچہ نہ تھا۔ بلکہ ان خیالات کی نمائندگی کرتا تھا جو لوگوں کی اکثریت کے خیالات تھے۔ خود اسٹیفن آرکیڈی وچ کو حالانکہ سائنس، آرٹ، اور پالیٹکس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ تاہم ان مباحث پر بھی وہ اکثریت کے خیال کا تابع تھا۔ اس پرچہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اکثریت کے خیال کے مطابق اپنے نقطۂ نظر میں تغیر اور تبدیل کرتا رہتا ہے جب اکثریت کسی خیال کو بدل دیتی تھی تو پرچہ بھی اس خیال کو تبدیل کر دیتا تھا۔

۱۷۹

اسٹیفن آرکیڈی وچ کو اپنے خیال کے تبدیل کرنے میں کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی بلکہ بالکل غیر فطری طور پر وہ خود بخود تبدیل ہو جاتے تھے۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ کا نقطۂ نظر آراء کے انتخاب کے متعلق بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ اپنے ہیٹ اور کوٹ کی وضع کے انتخاب کے متعلق ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی وضع کو اختیار کرتا تھا جو تازہ ترین فیشن سے متعلق تھی اور اسٹیفن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ وہ تمام لوگ جو سوسائٹی کے لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ مجبوراً کسی نہ کسی نقطۂ نظر کو انتخاب کرنے پر اسی طرح مجبور رہیں جس طرح ہیٹ پہننے پر۔ فی الواقع اگر کوئی وجہ اس کو معتدل نقطۂ نظر اختیار کرنے کی ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ قدامت پسندی کے برخلاف یہ اسکے حالات اور کیرکٹر سے زیادہ قریب تھا۔ لبرل پارٹی کا خیال تھا کہ روس کی مالی حالت بہت خراب ہے اور یہ بھی واقعہ تھا کہ اسٹیفن آرکیڈی وچ اس زمانہ میں بہت مقروض تھا اور قرض کو ادا کرنے کے لئے اسکے پاس کافی روپیہ نہ تھا۔

اس جماعت کا خیال تھا کہ "شادی ایک بہت ہی کمزور اور فضول سی رسم رہ گئی ہے، اور اسکی اصلاح کرنا ضروری ہے، اسٹیفن بھی اسی مناسبت سے اپنی گھریلو زندگی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا اس کو ہمیشہ اس سلسلہ میں جھوٹ اور بہانہ سازی سے کام لینا پڑتا تھا اور یہ باتیں اسکی فطرت کے بالکل منافی تھیں۔

اس جماعت کا خیال تھا کہ "مذہب صرف وحشی اور غیر متمدن انسانی جماعتوں کیلئے ضروری ہے" اور خود اسٹیفن بھی شاید ہی کبھی گرجا میں نماز کے وقت پہنچتا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "کیوں حیات بعد از موت کے متعلق لوگ اپنی فصاحت و بلاغت صرف کرتے ہیں" اسکے خیال میں تو "اسی دُنیا کی مسرتیں جینے کے لئے کافی ہیں"

اسٹیفن آرکیڈی وچ کبھی کبھی "ڈارون" کے نظریّہ کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کا مذاق اُڑاتا تھا جو اپنے حسب و نسب پر فخر کرتے ہیں، انہیں وجوہ سے آزاد خیالی اس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ وہ اس اخبار کو پڑھ کر اتنا ہی لطف اُٹھاتا تھا، جتنا کہ سگار پینے یا ایک اچھے ڈنر پر اُٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اخبار اس کے دماغ پر ایک ابر کی طرح محیط ہو گیا تھا اس نے اس اخبار کا "افتتاحیہ" پڑھا، جس میں تذکرہ تھا کہ قدامت پسندوں نے انقلاب پسندوں کے خلاف بڑا شور و غوغا مچا رکھا ہے اور وہ گورنمنٹ کو مجبور کر رہے ہیں کہ انقلاب کے "بھوت" کا انسداد کرے۔

"یہ کتنی غلطی ہے" اسٹیفن نے خیال کیا "دراصل انقلاب کا بھوت کوئی خوفناک چیز نہیں بلکہ وہ پُرانی، اور فرسودہ روایات زیادہ خطرناک ہیں جو ملک کی ترقی روک رہی ہیں۔

اسکے بعد اس نے دوسرا مضمون پڑھا جو "مالیات" پر تھا جس میں بڑے بڑے ماہرین مالیات مِل اور بنتھم کے نظریّات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ وزارت پر دلچسپ چوٹیں تھیں۔ اپنی ذہانت سے اُس نے ان تمام اشارات کو سمجھ لیا کہ وہ مضمون کس نے لکھا تھا۔ اور کون کون اس سے متعلق تھے۔ اور اس مضمون کو پڑھ کر اسے حسب معمول بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی "نرس میٹریانہ فیلیمونہ" کی باتیں یاد آگئیں، وہ سب جو اس نے نصیحۃً کہا تھا اور گھر کی بے لطف حالت کا نقشہ اسکی نظروں میں کھچ گیا۔

اس اثناء میں اس نے اس خبر کو پڑھا کہ "کاؤنٹ واؤن بسٹ" "ویسہ بدن" کو چلے گئے اور ان کی جگہ کسی پُرانے آدمی کی توقع نہیں پھر ایک سبک رفتار گاڑی کی فروخت کے متعلق۔ اسکے بعد ایک نوجوان عورت کے متلاشی ملازمت ہونے کی خبر، ان سب سے اس نے معمول کے مطابق کوئی دلچسپی نہیں لی۔

باقی

میخانۂ الہامُ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

جنوری فروری مارچ ۱۹۳۹ء

(مشترکہ نمبر)



تصویرِ جگر

(از حضرت جگر مرادآبادی)

(خاص ایشیا کیلئے)

محبّت کارفرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے

ہراک صورت ہراک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصّے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ اے حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی شورش ہے لیکن جیسے موجِ تہ نشیں کوئی
وہی دل ہے مگر آواز مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانہ و ساقی وہی شیشہ وہی صہبا
مگر آوازِ نوشانوش مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن کچھ ایسا حال ہے دل کا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

جہانتک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

جہانتک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مِل مِل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اُٹھتی جاتی ہیں
مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

سازِ مشرق

(از حضرت جگر مرادآبادی)

خاص ایشیا کے لئے

نہیں ہے نہیں ہے، جوانی نہیں ہے — جوانی اگر جاودانی نہیں ہے

مقامِ تحیّر، زمانی نہیں ہے — یہاں کوئی شے آنی جانی نہیں ہے

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے — ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

یہ کیا ہے جو سحرِ جوانی نہیں ہے — کہ ہے اور پھر بدگمانی نہیں ہے

مرا قصۂ عشق فانی نہیں ہے — یہ مُردہ دلوں کی کہانی نہیں ہے

حریفانہ رکھتا ہوں رسمِ محبّت — رگوں میں مری خون پانی نہیں ہے

مرا عشق زندہ، مرا عزم راسخ — مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے

مجھے اُن سے مطلب انہیں مجھ سے مطلب — کوئی واسطہ درمیانی نہیں ہے

جہاں وہ چھُٹے کاش چھٹ جائے یہ بھی — مرے کام کی اب جوانی نہیں ہے

نہ سُنئے نہ سنئے غم و درد میرا — یہ ہے آپ بیتی کہانی نہیں ہے

خجل جس سے ہونا پڑے دل ہی دل میں — وہ کچھ اور ہے مہربانی نہیں ہے

محبّت ازل سے مقدّر پڑی تھی — یہ افتادِ غم ناگہانی نہیں ہے

خطائیں جوانی کی یاد آچلی ہیں — جوانی مگر اب جوانی نہیں ہے

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا — حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

یہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی — کہ طوفاں ہے برپا روانی نہیں ہے

زمانے کی چھانی تو کیا خاک چھانی — جگر خاک دل کی تو چھانی نہیں ہے

جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق — یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

جنونِ بہار

(نواب جعفر علی خاں صاحب آثرؔ بی، اے لکھنوی)

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن | خونیں جگرانِ چاک دامن
پیغام بہار دے رہی ہے | داغوں کی جھلک دلوں کی الجھن
پھولوں سے لچک رہی ہیں شاخیں | خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن
رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر | شبنم میں ہے گھونگروؤں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے | مستی میں چھوا صبا نے دامن
کیا سیرِ چمن کو تم گئے تھے | ہے بلبل و گل میں آج اَن بَن
غصّے میں بھرا ہے چپ ہے کوئی | یہ اس سے خفا وہ اس سے بدظن
مانوسِ قفس ہو اے اسیرو | منزل گہہِ برق ہے نشیمن

ایک تصویر

نرگسِ مست خواب آلودہ | لبِ لعلیں شراب آلودہ
دوش پر زلفِ عنبریں بکھری | اور گریباں گلاب آلودہ
پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا | اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ
مجھ کو دیکھا تو دیکھئے قسمت | تھی جبیں پیچ و تاب آلودہ
یاد ہے یاد ہے آثرؔ اب تک | وہ نگاہِ عتاب آلودہ

یہ رِم جھم رِم جھم برساتیں

(از سید محمد محی الدین رنجور عظیم آبادی)

سرشار جوانی کیا کہئے، خاموش محبت کیا کہئے
یہ رِم جھم رِم جھم برساتیں اللہ یہ فرقت کیا کہئے

بدمست گھٹائیں پھر اٹھیں مخمور ہوائیں پھر آئیں
قدرت بہکی، فطرت جھومی، اب دل کی حالت کیا کہئے

ہے ایک کہانی بلبل کا خوں ریز نگاہوں سے تکنا
پھولوں کی شکایت کیا کیجئے کلیوں کی حکایت کیا کہئے

وہ تیکھی تیکھی سی چتون، وہ نیچی نیچی سی نظریں
وہ مدھ میں ڈوبی سی آنکھیں اور ان میں شرارت کیا کہئے

وہ الجھی الجھی سی زلفیں، وہ پھیلا پھیلا سا کاجل
وہ چاند سا مکھڑا ہائے غضب، وہ چال قیامت کیا کہئے

اک زیبِ چمن، اک زیبِ گلو، اور اک پر شبنم کے موتی
صحرا میں جو کھل کر مرجھائے اس پھول کی قسمت کیا کہئے

طوفان و تلاطم کا عالم، ڈھلتا ہوا دن، ٹوٹی نیّا
تکنا وہ مسافر کا ہر سو، ساحل کی وہ حسرت کیا کہئے

ٹوٹا ہوا دل پہلو میں لئے ساری دنیا کا ٹھکرایا
اک دردِ مجسم ہے گویا رنجور کی حالت کیا کہئے

سوزِ ناتمام

برسات کا آگیا مہینہ
لانا مرا سرخ آبگینہ

موجوں کی کوئی خطا نہیں ہے
خود میں نے ڈبو دیا سفینہ

یہ کس نے نقابِ رُخ الٹ دی
کلیوں کو بھی آگیا پسینہ

رسوا ہوا ہے دردِ محبت کہاں کہاں
ثابت ہوئی ہے اُن کی ضرورت کہاں کہاں

آنکھیں اداس، رُوح پریشان، دل نڈھال
برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں

ماہر القادری

برہ کی رات

(از سید محمد عسکری طبا طبائی بی، اے)

یاد ہے ہاں یاد ہے ابتک وہ منظر ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ سکوتِ گریہ پرور ہائے ہائے

وہ فضا پر ہر طرف اک بیکسی چھائی ہوئی
وہ ہوائیں اضطرابِ شوق مضمر ہائے ہائے

چودھویں کے چاند کا وہ زرد چہرہ الاماں!
چاندنی تھی یا تمنا خاک بر سر ہائے ہائے

ڈوبتی امید، بڑھتی یاس کی آغوش میں
جھلملاتی شمع اور پامالِ صرصر ہائے ہائے

میری شوریدہ محبت اور کبیدہ آہ آہ !
تیری سرخوش نوجوانی اور مکدر ہائے ہائے

یاں اُلجھ کر ٹوٹنے کو تار و پودِ زندگی
واں بکھرنے کو وہ گیسوئے معنبر ہائے ہائے

اس طرف بجھتا ہوا ارماں بھرے دل کا کنول
اُس طرف چھلکے ہوئے آنکھوں کے ساغر ہائے ہائے

تیرے ماتھے کی شکن غماز میرے درد کی
میری بیتابی میں تیرا سوز مضمر ہائے ہائے

میری آہیں پھونک دیں جو خرمنوں کو برق کے
تیرے آنسو جنسے گھونگٹ کھائیں اختر ہائے ہائے

پرتوِ رخ سے ترے سینے میں میرے جوشِ عشق!
ایک سیلِ نور اور دل کا سمندر ہائے ہائے

میری خاموشی جراحت ریز تیرے ضبط پر
تیرے اشکوں سے مرے سینے میں محشر ہائے ہائے

میری نظروں کے دھندلکے میں ترے رخ کی دمک
خاک کی آغوش میں موجِ گلِ تر ہائے ہائے

تیری ایک اک سانس میں فرطِ الم سے جزر و مد
وہ تلاطم میں ترے کانوں کے گوہر ہائے ہائے

وہ مرے سینے میں جوشانِ التہابِ صد جحیم — وہ ترے ہونٹوں پہ لرزاں موجِ کوثر ہائے ہائے

میری گردن تیری بانہیں، میرا آغوش اور تو! — تا گلو پہنچا ہوا وہ آبِ خنجر ہائے ہائے

تیری چتون میں جفاکاری سے توبہ کا غرور! — میری نظروں میں وفاداری کے جوہر ہائے ہائے

عشق اور آنکھوں سے دیکھے حسن کو مجبورِ غم! — وائے بدحالی و شومیِ مقدر ہائے ہائے

دردافزا، لرزشِ لبہائے لعلیں حیف حیف! — روح فرسا جنبشِ چشمِ سخنور ہائے ہائے

گرم گرم، اشکِ شفق آلود و غلطاں آہ آہ! — سرد سرد انفاسِ رنگین و معطر ہائے ہائے

وہ لبِ نازک پہ موجِ نطق گھبرائی ہوئی — کرب میں الجھے ہوئے وہ مصرعِ تر ہائے ہائے

وہ محبت کے پیاپے دعویِ بے اختیار — وہ وفا کے عہد و پیمانِ مکرر ہائے ہائے

بار بار انجمن میں لینا چپکے چپکے میرا نام!! — وہ زباں کو خشک ہونٹوں پر پھرا کر ہائے ہائے

آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کہہ کر "خدا حافظ" ترا — جاتے جاتے دیکھ لینا مجھ کو مڑ کر ہائے ہائے

تجھ کو پا لینے کی میں سرتا قدم اک آرزو! — آرزو کا میری تو نقشِ مکرر ہائے ہائے

دل کے خوں ہونے کی راہیں دل کو دکھلاتی ہوئی — خاک پر وہ لوٹتی رنگین چادر ہائے ہائے

چھٹنے ہی کو نبضِ ہستی و عنانِ کائنات! — رکنے ہی کو گردشِ افلاک و اختر ہائے ہائے

اس طرح تیری تمنائیں مرے دل میں اسیر — جیسے آئینے میں آئینے کے جوہر ہائے ہائے

عکسِ آئینہ جدا ہو آئینے سے یا نصیب!
جان تن سے دور، دم سینے کے باہر ہائے ہائے

فردوسِ معصیت

تجلّیاتِ شرارِ پا کو اسیرِ دامِ نگاہ کیجے
پناہ لے آفتابِ محشر فضائیں اتنی سیاہ کیجے
غریقِ موجِ شراب بھی ہے خیالِ روزِ حساب بھی ہے
گناہ کیجے تو صدقِ دل سے کوئی مکمّل گناہ کیجے

اک انجمن کیا یک جنبشِ یک نظر دو عالم تباہ ہونگے
نہ یہ نشیب و فراز ہونگے نہ یہ سپید و سیاہ ہونگے
یہ جامِ صد پاش پاش کیسا یہ تھر تھراہٹ کیسی
وہ جب حضورِ نگاہ ہونگے گناہ پھر بھی گناہ ہونگے؟

یہ میکدہ ہے تباہ کر کے تو اس کو خود بھی تباہ ہوگا
طلوع جب آفتابِ ساغر نہ ہوگا، عالم سیاہ ہوگا
یہ زعم کارِ ثوابِ زاہد، یہ شدّتِ احتسابِ زاہد
شکستِ جامِ شرابِ زاہد شکستِ دل ہے گناہ ہوگا

بلند جامِ شراب کیجے، طلوع سو آفتاب کیجے
حقیقتیں بے حجاب کیجے، مشیّتیں بے نقاب کیجے
یہ فکرِ انجامِ کار توبہ! گنہ بحدِّ شمار توبہ!
گناہ کیجے تو ضد پہ روزِ حساب کی بے حساب کیجے

بہار نکہت بدوش ہوگی ہزار نغمہ فروش ہوگی
چٹک چمن میں کلی کلی کی صدائے سازِ سروش ہوگی

کوئی جب آتش بجام ہوگا، نہ پوچھ کیا اہتمام ہوگا
زمانہ حیرت فروش ہوگا، خدائی آئینہ پوش ہوگی

جو رقص میں موجِ نور ہوگی، تو وجد میں پھول پھول ہوگا
فروغِ جامِ شرابِ رنگیں، فروغِ قلبِ ملول ہوگا

ہر ایک شے دلنواز ہوگی، تمام دنیا حسین ہوگی
وہ وقت ہوگا گناہ کا جب ہمارے دل پہ نزول ہوگا

جو لطف اندوزِ میکدہ ہیں جھکینگے جاکر وہ کیا حرم میں
یہی تو وہ ہیں قدم سے جنکے ہیں وسعتیں دامنِ کرم میں

ہماری تر دامنی سے زاہد! ہے زہدِ خشک آب آب تیرا
ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں ہماری اک لغزشِ قدم میں

نگاہ ملتے ہی چشمِ ساقی سے اے دلِ ناصبور پی جا
ضرور پی جا، شرابِ رنگیں میں گھول کر برقِ طور پی جا

یہ شکوۂ اذنِ عام کب تک، یہ جذبۂ تشنہ کام کب تک
نظر جو بہکی ہوئی ہے اس سے جبینِ فطرت کا نور پی جا

ہمیں سے رندانہ جرأتیں ہیں کہ بے نیازِ حساب کر دیں
کہیں وہ فردِ عمل کو لیکر نہ غرق جامِ شراب کر دیں

فسانۂ یوسف و زلیخا، کرشمۂ بے مثال، توبہ!
ہم ایک چھینٹے سے مے کے واعظ اعادۂ صد شباب کر دیں

سزا جزا پستیاں ہیں ان سے بلند تر ہے نگاہِ آدم
مقامِ روح الامیں سے بچکر گذر رہی ہے شاہراہِ آدم

خیال رنگیں، جمال رنگیں، نگاہ رنگیں، گناہ رنگیں
یہی وہ فردوسِ معصیت ہے، بہار جس کی نگاہِ آدم

فیض جھنجانوی

محبّت کی تقسیم

(حضرت حمیدؔ لکھنوی)

نگاہوں سے لیکر بلائیں تمہاری — میں خود بھول بیٹھا جفائیں تمہاری
اگر انقلاب آئے تو ایسا آئے — تغافل مرا، التجائیں تمہاری
پلٹ جائے خود کفران زاہدوں پر — اگر اک جھلک دیکھ پائیں تمہاری
جفا جو کا ہر اک جفا پر یہ کہنا — وفائیں ذرا آزمائیں تمہاری
نگاہوں میں میخانے کُھلوا رہی ہیں — یہ گیسو کی کالی گھٹائیں تمہاری
ہم اپنے کو بھی بھول جائیں یہ سچ ہے — مگر یاد کیونکر بُھلائیں تمہاری
بنا لو بنا لو مجھے بھی تم اپنا — یہ دُنیا اور اسکی فضائیں تمہاری
محبّت نے کیا خوب تقسیم کی ہے — وفائیں ہماری جفائیں تمہاری

حضرت شرف زیدی رامپوری

اب دل کا حال نہ پوچھو کچھ غم سہتا ہوں غم سہنے دو — چھڑ جائینگے پھر لاکھوں قصّے یہ بات یہیں تک رہنے دو
الفت میں تو یہ بھی ہوتا ہے پتھر بھی لگیں کپڑے بھی پھٹیں — میں پاگل بھی سودائی بھی کہتی ہے جو دُنیا کہنے دو
زلفیں رُخِ روشن پر چھوٹیں اندھیر نہ ہو پردہ بھی رہے — چھنتے جو رہیں کچھ کچھ جلوے یوں چاند گہے تو گہنے دو
حالِ غمِ دل کہتے کہتے رونا جو مجھے یک دم آیا — بولے مجھے اب نیند آتی ہے کچھ کل کیلئے بھی رہنے دو
دریائے محبت میں ڈوبا جو کوئی یہ سمجھو پار ہوا — ساحل سے نہ کچھ ہاتھ آئیگا منجدھار میں کشتی بہنے دو
ان قہر کی نظروں سے منہ پر کیوں مُہر لگائی جاتی ہے — شکووں کا مزا تو اس میں ہے کچھ سننے دو کچھ کہنے دو
جاتا ہی رہے گا دردِ جگر اے چارہ گرو گھبراؤ نہیں — روکو نہ مجھے اب رونے سے کچھ خون کے آنسو بہنے دو

اچھوت

(حضرت رضا نقوی)

ہنگامِ سحر میں جو وہاں سیر کو پہنچا — اک جلوۂ صد رنگ تھا گنگا کا کنارا
ہر شے میں نظر آتی تھی فطرت متبسّم — ہر شے تھی کسی شوخ کا رنگین اشارا
تکمہ تھا قبائے فلکِ نیلوفری پہ یا — یا چرخ پہ تھا نور فشاں صبح کا تارا
گردوں پہ شفق تیر رہی تھی کہ رواں تھا — پھولوں کو لئے گود میں سیلاب کا دھارا
نکلا تھا نہ سورج ابھی گنگا سے نہا کر — منظر کو شعاعوں نے ابھی تھا نہ سنوارا
اشنان کا تھا وقت سمٹ آئی تھی خلقت — اک سیلِ عقیدت تھا وہ دریا کا کنارا
آئی تھیں پئے غسل بہ رعنائی و مستی — نازک بدناں، سیمبراں، انجمن آرا
کہتی تھیں ادائیں کہ ہے بیچین رگوں میں — سیلاب جوانی کا مچلتا ہوا دھارا
یوں گود میں دریا کی اچھلتی تھیں وہ پریاں — "جس طرح ہرن دشت میں بھرتے ہیں طرارا"
اتنے میں دکھائی دیا اک پیکرِ افلاس — غمّاز تھی صورت کہ ہے تقدیر کا مارا
اوروں کی طرح دل میں جو تھی غسل کی نیّت — اک گھاٹ سے کچھ دور ہی کپڑوں کو اتارا
بچتا ہوا نظروں سے بڑھا جانبِ ساحل — کھولے ہوئے آغوش تھا گنگا کا کنارا
ڈالا تھا ابھی پاؤں بھی دریا میں جو اس نے — دیکھا اسے خلقت کی نگاہوں نے فقط نا را
اک شور اٹھا ایک تلاطم ہوا برپا — "پانی ہوا ناپاک" زمانہ یہ پکارا
مجمع میں شریفوں کے اچھوت آئیں نہانے — غیرت کی نظر کر نہیں سکتی یہ گوارا
پیدا ہوا سینوں میں جو غیرت کا تموّج — دو چار جوانوں نے پکڑ کر اسے مارا
اک دیش کے سیوک بھی تھے اس غول میں شامل — تھا تیز بہت آپ کے غصّہ کا بھی پارا
اک مولوی صاحب بھی بڑھے گالیاں دیتے — گنگا سے کہیں تیز تھا دشنام کا دھارا
یہ وہ ہیں جو منبر پہ سکھاتے ہیں شب و روز — اسلام کی تعلیم مساوات و مدارا
جس ملک میں یہ روح کی لعنت ہو دوامی — اس ملک کو تا حشر مبارک ہو غلامی

معلوم نہیں کیوں؟

(حضرت جگرؔ مراد آبادی)

بے تاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہئ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و اصرار
وہ جرعہ بھی زہراب ہے معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہو دل کو
اک شعلۂ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

جو ساز کہ خود نغمۂ عریاں تھا اُسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینہ میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی
بے وجہ تبِ تاب ہے معلوم نہیں کیوں

کل تک یہی دُنیا سبدِ گل تھی مگر آج
بے رنگ ہے بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
ابتک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

دبی چنگاریاں

(نواب احسان علی خاں احسانؔ (باندہ)

بڑھ رہی ہیں عشق کی دشواریاں
ہیں دل آزاری میں بھی دلداریاں

پھر بھڑک اُٹھیں گے شعلے ایک دن
کہتی ہیں دل کی دبی چنگاریاں

سہل ہو جانے سے مشکل عشق کی
بڑھ گئیں کچھ اور بھی دشواریاں

اُف رے حسن و عشق کے راز و نیاز
ہائے رے اُلفت کی پردہ داریاں

حُسن کو بھی کس قدر منظور ہیں
اپنے دیوانے کی خاطر داریاں

پھر ہے شورِ آمدِ فصلِ بہار
پھر دہی وحشت کی ہیں تیاریاں

چاہیئے احسانؔ پر تو لطفِ خاص
کیجئے غیروں سے دُنیا داریاں

تین دور

(پروفیسر گھوپت سہائے فراق ایم - اے گورکھپوری)

پہلا دور

دلوں کو چارۂ دردِ محبّت بھول جاتا ہے
وہاں ہر ایک شخص اپنی ضرورت بھول جاتا ہے

حیاتِ محض ہو جاتا ہے ناکامِ محبت بھی
اذیّت سے گذر جاتا ہے راحت بھول جاتا ہے

اسی سے گرم بازاری بھی قائم ہے دو عالم کی
مگر انسان اپنی قدر و قیمت بھول جاتا ہے

وہ کیفیت نگاہِ مست میں ہے دیکھ کر جس کو
ہر اک رندِ بلا نوش اپنی نیّت بھول جاتا ہے

یہ کیسی دلدہی ہے حُسن کی کیسی دل افزائی
گناہِ عشق کچھ اپنی ندامت بھول جاتا ہے

جسے ہے باعثِ تکلیف ہمدردی زمانے کی
وہی دل تیرے جورِ بے نہایت بھول جاتا ہے

دلِ مایوس پر آتا ہے ایسا وقت بھی جس میں
محبّت کو سوادِ شامِ فرقت بھول جاتا ہے

دلِ وارفتۂ دیدار کی اللہ ری محویّت
تصوّر میں ترے وہ تیری صورت بھول جاتا ہے

اک ایسا دردِ فرقت بھی ہے اے دل جسکے اُٹھتے ہی
جنونِ عشق کو بھی جوشِ وحشت بھول جاتا ہے

بسا اوقات دل کے ساتھ بارِ غم اُٹھانے میں
سُنا ہے حُسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

کہاں کا ہوش کیسی بیخودی اس بزم میں اکثر
خود اپنے عشق کو رنگِ طبیعت بھول جاتا ہے

فراقؔ اس درجہ کھو جانا شبِ فرقت بجا لیکن
کوئی اس طرح بھی اپنی حقیقت بھول جاتا ہے

دوسرا دور

وہ آشنا درد ہنگامِ فغاں تک یاد آتا ہے
محبت کا فسانہ درمیاں تک یاد آتا ہے

وجودِ عشق مرگِ ناگہاں تک یاد آتا ہے
عدم بھی اس نگاہِ جانستاں تک یاد آتا ہے

فسانہ ہو چکا ہے واقعہ آغازِ الفت کا
مگر تیری نگاہِ بدگماں تک یاد آتا ہے

نگاہِ اولیں یکسر پیامِ راز تھی لیکن
کچھ اندازِ اشاراتِ نہاں تک یاد آتا ہے

لبِ نازک کی جنبش جانِ پیمانِ محبت تھی
یہ قصہ بھی ترے حسنِ بیاں تک یاد آتا ہے

نہ وہ منزل نہ اب وہ رہروانِ عشق ہیں لیکن
وہ بڑھ جانا غبارِ کارواں تک یاد آتا ہے

زبانِ شعلۂ گل پر بھی پیغامِ اسیری تھا
یہ بجلی آ چکی تھی آشیاں تک یاد آتا ہے

خوشی کیا، چند موجیں تھیں تبسمہائے پنہاں کی
یہ افسانہ بھی حسنِ شادماں تک یاد آتا ہے

وہ سوز و سازِ بزمِ ناز اب اک خواب ہے لیکن
دلِ پروانۂ آتش بجاں تک یاد آتا ہے

یہ تو نے ذکر بازیٔ محبت کا کہاں چھیڑا
ہوس کو یہ سبق سود و زیاں تک یاد آتا ہے

کبھی باتوں میں چھیڑو ذکرِ آغازِ محبت بھی
یہ افسانہ تمہیں دیکھیں کہاں تک یاد آتا ہے

وہ آثارِ انقلابِ عشق کے اب تک نہیں بھولے
تری نظروں سے دورِ آسماں تک یاد آتا ہے

سرِ بزمِ محبت اہلِ دل کا سوزِ پنہاں بھی
گدازِ قلبِ شمعِ بے زباں تک یاد آتا ہے

حیاتِ عشق عمرِ جاوداں سے بڑھ گئی لیکن
یہ افسانہ بھی حسنِ مہرباں تک یاد آتا ہے

چمن اک خواب تھا حسنِ چمن بھی اک فسانہ تھا
وہ رنگا رنگ عالم بھی خزاں تک یاد آتا ہے

بہت پیچھے محبت میں مکان و لامکاں چھوٹے
مگر کچھ کچھ نشانِ بے نشاں تک یاد آتا ہے

کہاں اتنی خبر عمرِ محبت کس طرح گذری
ترا ہی درد تھا دل میں جہاں تک یاد آتا ہے

فراق اب کیا ہے لیکن کاٹنے کو شامِ مہجوری
نہ تھی تیار عمرِ جاوداں تک یاد آتا ہے

تیسرا دور

ہجومِ یاس میں سوزِ نہاں بھی یاد آتا ہے
سوادِ شام کا اُٹھنا دھواں بھی یاد آتا ہے

دیا تھا جیتے جی درسِ فنا ورد محبّت نے
وہ اندازِ فراقِ جسم و جاں بھی یاد آتا ہے

ترے لطف و ستم کے نقش دھندلے ہو چلے دل میں
یونہی ہر مہرباں نامہرباں بھی یاد آتا ہے

وفا نا آشنا اتنی نہ تھی گردش نگاہوں کی
وہ کچھ بدلا سا دورِ آسماں بھی یاد آتا ہے

وہ ارمانوں کا محشر وہ بھری دُنیا محبّت کی
وہ عالم کارواں در کارواں بھی یاد آتا ہے

عدم ہو، بزمِ امکاں ہو، گلستاں ہو کہ صحرا ہو
بدل جاتی ہے دُنیا تو جہاں بھی یاد آتا ہے

نہ بھولیں داستانیں انجمن کی سوزِ پنہاں کو
مگر اندازِ شمعِ بے زباں بھی یاد آتا ہے

فسانہ عشق کا کہنا نہ کہنا ایک ہے اب تو
وہ ہونا تیرا محوِ داستاں بھی یاد آتا ہے

وہ جلوہ حُسن کا ہو یا وہ شعلہ ہو محبّت کا
دلوں کو ایک شورِ الاماں بھی یاد آتا ہے

ازل کے قبل سے چونکی ہوئی ہے عشق کی دنیا
مگر اک عالمِ خوابِ گراں بھی یاد آتا ہے

خبر اپنی بیاباں کو بھی مدّت سے نہیں آتی
دلِ وحشی کو لیکن تو یہاں بھی یاد آتا ہے

غبارِ کارواں کو دیکھتے رہ جاتے تھے پہروں
وہ رنگِ حسرتِ پسماندگاں بھی یاد آتا ہے

کبھی کامل بھی ہوتی ہے فراموشی محبّت کی
کبھی تو دل کو بے شان و گماں بھی یاد آتا ہے

نہ کھونا ہے نہ پانا ہے خبر اسکی بھی تھی لیکن
فریبِ کاوشِ سود و زیاں بھی یاد آتا ہے

زمانے کی کشاکش میں کوئی اہلِ محبت کو
خوشی کے اور غم کے درمیاں بھی یاد آتا ہے

نصیبِ عشق کے جو دل ہی دل میں رہ گیا شاید
تجھے کچھ وہ حسابِ دوستاں بھی یاد آتا ہے

نہ تھی جب صحبتِ احباب پر افسردگی طاری!
فراق اس انجمن کا وہ سماں بھی یاد آتا ہے

چھوٹی سی کُٹیا

(محترمہ محبوب صاحبہ)

اس شہر سے، گلشن سے آفات کے مسکن سے
اس عالمِ رہزن سے
ہاں دُور کہیں ہوتی!
چھوٹی سی مری کُٹیا

ہنگامۂ دوراں سے اُس فتنۂ پنہاں سے
اُس دشمنِ ایماں سے
ہاں دُور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کُٹیا

١٩٧

اس شور سے اور غل سے　　ہنگاموں کی محفل سے
اور درد بھرے دل سے
ہاں دُور کہیں ہوتی !
چھوٹی سی مری کٹیا

دُزدیدہ نگاہوں سے　　ہر وقت کی آہوں سے
ان عشق کی راہوں سے
ہاں دُور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا

اس دردِ محبّت سے　　اس حُسنِ پُر آفت سے
اُس رشکِ قیامت سے
ہاں دُور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا

ہر دل کی بُرائی سی　　اور غم کی خدائی سی
انسان کی رسائی سی
ہاں دُور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا

سرسبز فضاؤں میں گھنگھور گھٹاؤں میں

اور مست ہواؤں میں

ہاں دُور کہیں ہوتی

چھوٹی سی مری کُٹیا

تنہائی کے مسکن میں کہسار کے دامن میں

اور دور کسی بن میں

ہاں دُور کہیں ہوتی

چھوٹی سی مری کُٹیا

تابندہ ستاروں میں پرکیف نظاروں میں

جاوید بہاروں میں

ہاں دُور کہیں ہوتی

چھوٹی سی مری کُٹیا

محبوب جہاں غم کے قصّے نہ کہے جاتے

رنج و غم و آفت کے چرچے نہ سُنے جاتے

ہم نغمۂ الفت سے دل کو یونہیں بہلاتے

ہاں دُور کہیں ہوتی

چھوٹی سی مری کُٹیا

نازک حقیقت

(حضرت اصغر شعری بھوپالی)

کسی جلوے، کسی پردے سے بہلائی نہیں جاتی — طبیعت ایسی اُلجھی ہے کہ سُلجھائی نہیں جاتی

محبّت معنیٔ و الفاظ میں لائی نہیں جاتی — یہ وہ نازک حقیقت ہے، جو سمجھائی نہیں جاتی

ترا ممنون ہوں اے حُسنِ خلوت آشنا لیکن — کسی کی التجا اس طرح ٹھکرائی نہیں جاتی

خطائے حُسن بھی پامالیٔ دل میں یقیناً ہے — محبّت ہی محبت جُرم ٹھہرائی نہیں جاتی

سرِ محفل کچھ اس انداز سے لوٹا گیا ہوں میں — ہجومِ عام میں بھی میری تنہائی نہیں جاتی

بہت نقشے بہت خاکے مرتب ہو چکے اب تک — مگر اُس شانِ یکتائی کی یکتائی نہیں جاتی

تحیّر سا تحیّر ہے، تماشا سا تماشا ہے — نظر جلووں میں خاطر خواہ ٹھہرائی نہیں جاتی

سمجھ لیں آج ہی میری حقیقت دیکھنے والے — میں وہ روداد ہوں جو پھر سے دُہرائی نہیں جاتی

محبّت مرتعش ہستی، محبت مضطرب فطرت، — یہ ظالم خود تڑپ لیتی ہے تڑپائی نہیں جاتی

جفائے دوست بھی منظور ہے مجھ کو سر آنکھوں پر — محبّت کی کوئی نعمت بھی ٹھکرائی نہیں جاتی

کسی کے آستانِ ناز سے کیا اُٹھ گیا ہوں میں — یہ دُنیا کل جہاں تھی اُس جگہ پائی نہیں جاتی

بہا لیتا ہوں آنسو دل ہی دل میں مطمئن ہو کر — فغاں کرتا ہوں اور طرزِ شکیبائی نہیں جاتی

لگی ہیں طور کی جانب نگاہیں اہلِ عالم کی
بہت مدت سے کوئی برق لہرائی نہیں جاتی

مکمل ہو گئی دُنیا، منظّم ہو گیا عالم
مگر اُن کی ابھی تک بزم آرائی نہیں جاتی

جہانِ عشق کی رنگینیوں پر جان و دل صدقے
یہاں کی زندگی جنت میں بھی پائی نہیں جاتی

کسی حسن سے مانوس ہونا بھی قیامت ہے
طبیعت لاکھ بہلاتا ہوں بہلائی نہیں جاتی

محبت اصل میں بے اختیاری چیز ہے شعری
یہ آگ اپنی طرف سے آپ بھڑکائی نہیں جاتی

میخانۂ الہام

(حضرت میکش اکبرآبادی)

جام لا جام کہ عالم گزراں ہے ساقی
کیا غمِ حشر کہ یاں ہے سو وہاں ہے ساقی

کل سُنوں گا غمِ فردا کا فسانہ تجھ سے
لا مرا ساغرِ امروز کہاں ہے ساقی

یہ حقیقت کی جوانی یہ مے حُسنِ مجاز
آ یہاں آ کہ یہاں ہے سو کہاں ہے ساقی

پی کے جب گر نے لگوں میں تو ذرا دھیان رہے
سر یہ خو کردۂ آغوشِ بُتاں ہے ساقی

تیرے میکش کو نہیں خواہشِ عیشِ دو جہاں
بادہ خود مایۂ عیشِ دو جہاں ہے ساقی

خواب میں آنیوالی سے!

(پروفیسر سیّد احتشام حسین رضوی۔ لکھنؤ یونیورسٹی)

چھاؤں تھی تاروں کی، ہیں تھا اور تمہاری یاد تھی
ہر طرح کی کوشش صبر و سکوں برباد تھی

رات آئی روح پر غم کا اندھیرا چھا گیا
ایک مدّت سے نہ ملنے کا الم تڑپا گیا

ذہن میں کوئی تصوّر اور آتا ہی نہ تھا
دوسری جانب خیال اُس وقت جاتا ہی نہ تھا

دور تک پھیلی ہوئی تخئیل کی زنجیر تھی
دل کے آئینے میں دُھندلی سی تری تصویر تھی

اور دل کہتا تھا یہ بھی ایک دن مٹ جائیگی
کچھ دنوں تک اور اسی صورت سے گردو رہی ہی

گو یقیں تھا ہے ترا عہدِ محبّت استوار
لب تک آجاتے تھے لیکن پھر بھی شکوے باربار

تھا تقاضا دل کا مِل جاؤ تو تڑپائیں تمہیں
تم نے جو حالت بنائی ہے وہ دکھلائیں تمہیں

یک بیک ٹھنڈی ہوا کی زلف لہرانے لگی
رات کی ساکن فضا میں مجھ کو نیند آنے لگی

جس کو چین آتا نہ تھا دم بھر میں غافل ہو گیا
محوِ غم آغوشِ فطرت میں پہنچ کر سو گیا

روح تک احساسِ الفت سے مری سرشار تھی — سو رہا تھا میں مگر قسمت مری بیدار تھی
خواب کے ظلمات میں پہنچا مجھے آبِ حیات — یہ مرا جذبِ محبت تھا کہ تیرا التفات
آج بیداری بھی میری روح سے شرما گئی — تو جھجکتی مسکراتی غمکدے میں آ گئی
پھر تو ظلمت خانۂ دل میں تجلّی ہو گئی — مدّتوں کے تشنۂ غم کو تسلّی ہو گئی
تھا تبسّم یا مداوا تھا وہ دل کے درد کا — جیسے گرمی میں کوئی جھونکا ہوائے سرد کا

چھپ کے مجھ سے مل رہی ہو اس قرینے کے نثار — خواب میں آنے کے اور تسکین دینے[1] کے نثار
تھا لبِ تصویر تیرے قرب کا یہ پاس تھا — تھی کچھ ایسی بیخودی جس کا مجھے احساس تھا
لب تک آ کر سارے شکوے دل کے زائل ہو گئے — تیرے بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے
ایک بوسے میں ترے مجھ کو حیاتِ نو ملی — یوں شگفتہ ہو گیا دل جیسے کھلتی ہے کلی
بڑھ گئی تیری نظر میں روشنی میرے لئے — تیری آغوشِ محبّت وا ہوئی میرے لئے
مل گئے چھوٹے ہوئے دو تشنہ کامانِ وفا — عشق کی تاریک دُنیا میں اُجالا ہو گیا

عالمِ الفت میں ایسی زندگی نایاب ہے — دل یہ کہتا تھا کہ بیداری سے بہتر خواب ہے
کاش رہ جاتا اسی صورت نہ آتا ہوش میں — اور وہیں سے جا پہنچتا موت کی آغوش میں

---

[1] یہ شعر بے ساختہ ہوا تھا اس لئے ایطاء کے باوجود مجھ سے نکالا نہ جا سکا ۔

افسردہ گلاب

ہے تصور میں ایک خواب ہنوز — یاد ہے عالمِ شباب ہنوز

جن سے رفتارِ حسن رسوا ہے — وہی فتنے ہیں ہمرکاب ہنوز

دل میں محسوس کر رہا ہوں خلش — ناوکِ غم ہے کامیاب ہنوز

دور دُنیا نے سینکڑوں بدلے — نہیں ممکن ترا جواب ہنوز

قافلے منزلوں پہ جا پہنچے — میں ہوں اور اہتمامِ خواب ہنوز

چارۂ دردِ لادوا معلوم! — ہوں گلہ سنجِ اضطراب ہنوز

بادہ کش ہیں شکارِ تشنہ لبی[1] — میرے ساغر میں ہے شراب ہنوز

عرقِ روئے حسن میں ہے نذیرؔ
بوئے افسردۂ گلاب ہنوز

نذیر شیرکوٹی

---

[1] حیرت ہے کہ آپ "قصر الادب" کے فرمان مذہبی کے خلاف شعر میں "جام و شراب" کے ذکر سے باز نہیں آتے! ؟ ساغر

کیفیاتِ وجدی

(انصار الحق صاحب وجدی الہ آبادی)

مجھے کیوں بے محل کرتا ہے مجبور سخن کوئی
حدیث عشق سے شایاں نہیں ہے انجمن کوئی

ابھی ہے آتشِ نمرود و خونِ کربلا باقی
کرے اے کاش زندہ پھر وہ آئین کہن کوئی

یکایک قلب مضطر میں سکوں کیوں ہو گیا پیدا
سکوتِ شب میں شاید ہو گیا ہے نغمہ زن کوئی

نوید اے ذوق نظّارہ مبارک شوق بے پایاں
لئے ہے اپنے دامن میں بہار صد چمن کوئی

نیازِ عشق سے ہے حسن سرگرم جفا کوشی
مٹا دے کاش اس دنیا سے یہ رسم کہن کوئی

بہار آتے ہی چھڑ جاتے ہیں نغمے زندگانی کے
قیامت ہے کہ سمجھا ہی نہیں رازِ چمن کوئی

پڑیں ہنگامۂ ہستی میں جانے اُلجھنیں کتنی
جو رہنے دے شکن ہائے جبینِ پُر شکن کوئی

یہ عالم ہے کہ دُنیا غرق موجِ نور ہے یکسر
ہوا ہے آج اس عنوان سے پرتو فگن کوئی

فضا مسحور ہو جاتی ہے وجدی تیرے نغموں سے
ہوا کرتا ہے سازِ دل پہ جب مضراب زن کوئی

غزل نمبر۱

فریبوں ہی سے بہلایا گیا ہوں — میں وہ دل ہوں جو ٹھکرایا گیا ہوں

مذاقِ رقصِ بسمل مجھ سے پوچھو — ہزاروں بار تڑپایا گیا ہوں

تم اپنے گیسوئے پُر خم سے پوچھو — میں کس اُلجھن میں اُلجھایا گیا ہوں

کہاں دُنیا کہاں محفل ازل کی — کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

نہیں نا آشنائے محفلِ ناز — میں ہر ہر سانس پر آیا گیا ہوں

مجھے طعنے نہ دیں آلامِ ہستی — میں آیا کب ہوں بُلوایا گیا ہوں

مری تقدیر تھی وابستہ جن سے — انہیں قدموں سے ٹھکرایا گیا ہوں

جہاں کو لاؤں گا لرزش میں وجدیؔ — بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

غزل نمبر۲

ہم سے جو کچھ ہو سکا تا حدِ امکاں کر دیا — یعنی خود کھو کر محبّت کو نمایاں کر دیا

تو نے یہ کیا اے نگاہِ مست جاناں کر دیا — یعنی مجھ کو بے نیازِ کفر و ایماں کر دیا

اللہ اللہ ڈال کر اک پر توِ حُسنِ لطیف — خود مری نظروں سے تو نے مجھ کو پنہاں کر دیا

آج اک ہچکی نے وجدیؔ توڑ کر تارِ نفس — مرحلۂ زندانِ آب و گِل کا آساں کر دیا

نگاہیں

جناب حبیب صدیقی

"آئیے آج میں آپ کو ایسے آتش نفس مغنّی سے ملاؤں، جسنے اپنے دل کو سرمدی گیتوں کا جھولا بنایا ہے اور اپنی پاکیزہ شعریت کو اظہار و رسوائی سے کوشش کر کے محفوظ رکھا ہے؛ میں تو اس انتظام اور احتیاط سے بھی بے خبر ہی رہتا اگر فروری ۱۹۳۹ء میں یکایک فتحپور جانا نہ ہو جاتا ۔!!

کامل ۱۵ سال دو مہینے ہوئے کہ پہلے پہل سرسید کورٹ میں "یارانِ کالج" کے ساتھ حبیب کو پوری محبوبیت کے عالم میں مَیں نے دیکھا، شعر و ادب کی مجلسوں میں وہ ایک خاموش محبوب ادا کے ساتھ بیٹھے رہتے، ان کا یہ عالم دیکھ کر ہم سب یہ تو بجا طور پر سمجھتے تھے کہ ان کا مستقبل "ڈپٹی صاحب قسم" کا ہے مگر یہ تصوّر بھی نہ تھا (کم از کم مجھے) یہ خموشی ایک ہنگامہ خیز شاعری کا دیباچہ ہے!؟ یہی نہیں ——— بلکہ دونوں طرف "محبوبیت" کی سرشاری (اپنی محبوبیت کا کُھلّم کُھلّا اعلان اس لئے کر رہا ہوں کہ اب مجھ میں "محبوبیت" کی ہلکی سی جھلک بھی باقی نہیں لیکن حبیب، حبیب تھے، حبیب ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ حبیب رہینگے) تھی؛ ـنے ایک دوسرے سے لاپرواہ رکھا، انجان رکھا، اور بھلا دیا۔ یکایک ۱۵ سال کے بعد میں اپنی محبوبیت کی دولت کو لٹا مٹا، اور گم کر کے فتحپور میں جب ان سے ملا، تو حبیب کو پہلے سے زیادہ حبیب دیکھا بلکہ محبوبیت کے جوہر میں ایسا اضافہ دیکھا جو میرے تصوّر میں بھی نہ تھا،

ایک طرف وہ "ڈپٹی صاحب" تھے، دوسری طرف مشاعرہ کے صدر، خیر، ڈپٹی صاحب ہونا تو کوئی بات نہیں، مگر صدر وہ اس لئے ہوئے کہ لوگوں کے علم میں وہ "ڈپٹی صاحب" تھے مگر آخر میں جب انھوں نے یہ غزل سُنائی تو ان کی محبوبیت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے اور روح و دل کو نمایاں بنا گئے ؎

طلسمِ نوازش کسی کا تبسّم　　فسونِ محبّت کسی کی نگاہیں

جس وقت یہ شعر محبوبیت کی زبان سے ادا ہو رہا تھا، ماضی کے تمام خط و خال ذی حیات ہو گئے تھے۔ حبیب کی شاعری میں وہ صحیح رومانیت ہے جس سے عام طور پر ہندوستان کا شاعر محروم ہے۔

ساغر

نِگاہیں

جناب حبیب صدیقی

قیامت کی چتون قیامت نگاہیں — نہ چاہیں الٰہی تو کیسے نہ چاہیں

طلسمِ نوازش کسی کا تبسّم — فسونِ محبّت کسی کی نِگاہیں

رگِ جاں میں پیوست پنہاں جگر میں — حقیقت میں نشتر بظاہر نگاہیں

چھپائے ہوئے ہوں بلا کی حقیقت — نگاہوں کو میں کہہ رہا ہوں نگاہیں

سمجھنے میں کوشاں سمجھنے سے قاصر — محبّت کی تفسیر یعنی نگاہیں

طرب ریز گاہے غضبناک گاہے — میری زندگی کا معمّہ نگاہیں

نظارے میں شامل ہے میری نظر بھی — حقیقت سے ناآشنا ہیں نگاہیں

نہیں بھول سکتا نہیں بھولتی ہیں — محبّت پہ کچھ کچھ سی مائل نگاہیں

خرابِ محبّت کو سمجھانے والو — محبّت کی دیکھی نہیں ہیں نگاہیں

کسی کی نظر سے نظر جا ملی ہے — کسی کی نگاہوں میں گُم ہیں نگاہیں

متاعِ محبّت ہے اک داغِ حسرت

نہ اپنا ہے دل ہی نہ اپنی نگاہیں

بہاراں

(...... کے نام!)

ساغرِ مستِ عشق کو درگہِ حُسن سے ملیں

فکر کی یہ بلندیاں نظم کی یہ روانیاں!

تو نہیں بہار کا رازداں، تجھے کب وقوفِ بہار ہے
جسے کہ رہا ہے شمیم تو یہ چمن کا گرد و غبار ہے

یہ بجا کہ دورِ بہار ہے، یہ بجا کہ فصلِ بہار ہے
جو بکھر کے دوش پہ آ پڑے تو یہ ابرِ گیسوئے یار ہے

وہ چمن میں آئے ہیں جھومتے اسے توڑتے اسے چومتے
جسے پھول کہتے ہیں فصلِ گل اسی کارواں کا غبار ہے

یہ خرام ان کا چمن چمن، یہ تبسم ان کا سمن سمن
یہ سکوت ان کا روش روش کہ بہار محوِ بہار ہے

وہ صباحتیں وہ ملاحتیں وہ نزاکتیں وہ لطافتیں
وہ نظر میں جب سے سما ہیں مجھے آنکھ اُٹھانا بھی بار ہے

مجھے یاد ہیں وہ خرابیاں، وہ نظر نظر میں گلابیاں
وہ کسی کی زمزمہ خوابیاں مجھے اس گھڑی بھی خمار ہے

یہ بلند قامتِ فتنہ گر، یہ لٹیں جبیں پہ اِدھر اُدھر
کہ حسین سرو کی اوٹ سے یہ طلوعِ ماہِ بہار ہے

وہ جہاں جھجک کے ٹھہر گئے ہیں فضائیں غرقِ بہار ہیں
وہ جدھر مچل کے گذر گئے ہیں وہیں ہجومِ بہار ہے

یہ فلک پہ برقِ شرر فشاں، سرِ ارض اسکی یہ شوخیاں
کبھی اصلِ قامتِ یار ہے کبھی عکسِ قامتِ یار ہے

مری بیقراریٔ عشق ہی کو شکیب کہتے ہیں دیدہ ور
مری بے سکونیٔ شوق ہی کا لطیف نام قرار ہے

مری شاعری مری زندگی، مری زندگی مری شاعری
دل و جان تو کیا ترے لطف پر مری شاعری بھی نثار ہے

ساغر

الہامات

(افکارِ عالیہ جنرل والاشان نواب معظم جاہ بہادر شہزادۂ دکن دام اقبالہٗ)

جذبات عالیہ کی ان سرمدی چنگاریوں کی تعریف کیا کی جائے جن کا رشتہ خود ملہم غیب کے لبوں سے ہے اور جن کا تعلق قلب معظم سے ہے! شاید گرم گرم ایک بے اختیار آنسو اور ایک بیہوش خاموشی اسکی ادنیٰ ترین داد ہو سکتی ہے! ؟ —— ساغر

جبتک نہ تڑپتا رہوں راحت ہی نہیں ہے
شاید کہ سکون عشق کی فطرت ہی نہیں ہے

کیا پوچھتے ہو درد کی تم مجھ سے حقیقت
اک دل کے سوا اور حقیقت ہی نہیں ہے

جب دل ہے تو پھر دل میں محبّت ہے بہرحال
جس حال میں رکھیں وہ شکایت ہی نہیں ہے

یہ کہکے مٹایا مرا دل نیچی نظر سے
کیا آنکھ اُٹھاؤں مجھے فرصت ہی نہیں ہے

میں پرسشِ مقصودِ محبت پہ کہوں کیا
کوئی میرا مقصودِ محبّت ہی نہیں ہے

کیوں اُن سے کریں ذکرِ وفا اہل محبّت
یہ شیوۂ اربابِ محبّت ہی نہیں ہے

ہم آج یہ سمجھے ہیں کہ تو خود ہے قیامت
سب ہیں تری محفل میں قیامت ہی نہیں ہے

اب پوچھنے کیا آئے ہیں بیمار کی حالت
اب آپ کے بیمار میں حالت ہی نہیں ہے

لائے ہیں فنا بھی وہ بقا بھی مری خاطر
جی میں ہے یہ کہدوں کہ ضرورت ہی نہیں ہے

یوں پھیری ہیں دل لیکے شجیع اُس نے نگاہیں
جیسے کہ ہمیں اُس سے محبّت ہی نہیں ہے

پریتم تم نہیں آئے!

ایک گیت

(کرشن مکٹ صاحب میرٹھی)

نئے نئے پتّے بھی آئے   کلیاں کھلیں پھول مسکائے
بوَر بھی آیا آم بھی آئے
پریتم تم نہیں آئے!

گرمی آئی ہے جھلساتی   کلی، پھول، پتّے مرجھاتی
کرشی کارنے کنوئیں چلائے
پریتم تم نہیں آئے

ساون آیا، ساون آیا   رِم جھِم رِم جھِم مینہ برسایا
جھولے پڑے گیت بھی گائے
پریتم تم نہیں آئے

دِن کو تکیں تمہاری راہیں   راتوں کو میں تھی اور آہیں
رین بِتائیں دیوسی بِتائے
پریتم تم نہیں آئے

بیٹھے بیٹھے مَن گھبرایا   ڈیوڑھی لیپی دُوار سجایا
بیت گئے جگ آس لگائے
پریتم تم نہیں آئے

آشا گئی، نراشا آئی   بدلی سی پرکاشش پہ چھائی
بیت گئے جگ تم بن ہائے
پریتم تم نہیں آئے

ساغر

یہ ظالم ہوائیں، یہ کافر گھٹائیں — چلی آئیں تنہا انھیں بھی تو لائیں
ضرور اُن سے مس ہو گیا کوئی جھونکا — مہکتی ہوئی آ رہی ہیں ہوائیں
نہیں کوئی بابِ قبول آسماں پر — بھٹک کر کدھر جا رہی ہیں دُعائیں
ہماری عبادت تو ہے یاد اُن کی — وہ معبود ہو کر ہمیں بھول جائیں
اِسی آرزو میں بسر ہو رہی ہے — پھر اک بار تم کو کہیں دیکھ پائیں

چلو اُن کے در پر پھر اک روز ساغر
مقدر کو اک بار پھر آزمائیں

خالق و کارساز تھا جذب و جنونِ بندگی
جس پہ نگاہ ڈال دی اُس کو خدا بنا دیا

ساغر (نظامی)

۲۱۴

بدائی

(حضرت نواب غازی آف گوردھاسی۔ یو۔پی)

پیت نبھانا پردیسی

چھوڑ کے مجھ کو جاتے ہو — من کو من سے ترساتے ہو
جیسے بیٹھے دکھاتے ہو — روپ دکھانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

بھوا ربیج جب تم کر لو — ہتھیلی پیسوں سے بھر لو
گٹھری کاندھے پر دھر لو — گھر لوٹ آنا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

چھجے پر چنچل ناری — تن من دھن لوٹن ہاری
نینن ہیں مدھ پچکاری — من نہ لگانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

گاؤں کی میں رادھا بھولی — ساڑھی مانگوں نا چولی
بیت نہ جائے ہولی — نا ترسانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

مدھ میں ڈوبی وہ راتیں — رم جھم رم جھم برساتیں
امبوا نیچے کی باتیں — بھول نہ جانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

بھگوان تم کو پھر لائیں — ہم تم پھر برہا گائیں
غازی جی کی کبتائیں — مل مل گانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

نقد و نظر



ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء
جنوری۔ فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء
(مشترک نمبر)

نقد و نظر

کتابوں رسائل اور اخبارات پر تبصرہ

مکتوبِ فرید

ساغر! ابھی چند دن ہوئے ایک دوست نے مجھے "اُردو کے سو شعر" کا سیٹ مطبوعہ مکتبۂ جامعہ مرتّبہ مولوی محمود علیخاں دکھایا۔ اسکو دیکھکر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ تو طے ہے کہ محمود علیخاں صاحب اپنے ذوق اور نقطۂ نظر کے لحاظ سے قدامت پرست ہیں۔ اور بُرا نہ مانو تو صاف کہوں کہ وہ شعراء کے معاملے میں جانبدار بھی ہیں۔ البتہ اُنکا جو قدم اُٹھتا ہے وہ دانائی کے ساتھ نفسیات کے مطابق اٹھتا ہے۔ چنانچہ اس سیٹ کا وہ دیباچہ جو ہر کتاب چہ میں شائع کیا گیا ہے یہ اثر رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں سو فیصدی ان کے لئے رحم اور نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں تک "اپنے کارنامہ" کی دہاک بٹھلانے کا تعلق ہے وہ اس دیباچہ میں صفحہ ۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

سو شعر منتخب کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن کئی ماہ کی
مسلسل محنت مختلف تذکروں انتخابوں دیوانوں اور
رسالوں کے مطالعہ اور متعدد احباب کی امداد کے
بعد ہم اس اہم خدمت کو انجام تک پہنچا سکے ہیں۔

ان سطور کا اثر انسانی طبیعت کو عام طور پر مرعوب کرتا ہے۔ اور فوراً ترغیب ہوتی ہے کہ دیکھا جائے۔ انتخاب میں کیا کمال دکھایا گیا ہے۔ بڑی محنت کا نتیجہ ہو گا جو کچھ ہو گا۔ لیکن مولوی محمود علی خانصاحب جانتے ہیں کہ انکا ذوق انکا ذوق اور انکا انتخاب انکا انتخاب ہے۔ اسلئے حفظ ما تقدم کے طور پر فرماتے ہیں۔

"ذوق کا معاملہ بہت عجیب ہے نہ صرف یہ کہ ایک شخص
کا مذاق دوسرے سے نہیں ملتا بلکہ خود ایک شخص کا
مذاق مختلف عمر یا مختلف ماحول کے ساتھ بدلتا
رہتا ہے ـــــ اسلئے یہ دعویٰ کرنا بالکل غلط ہے
کہ جو اشعار ہم پیش کر رہے ہیں وہ بہترین ہیں"

ان سطور کے بعد لامحالہ یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ جب خود ہی اعتراف ہے تو کیا انکے کام پر رائے زنی کی جائے۔ ہٹاؤ وقت کو کسی مفید کام ہی میں صرف کریں۔ لیکن اس خط کے ذریعہ میں ناظرین پر یہ حقیقت منکشف کرنا چاہتا ہوں کہ مؤلف نے اپنے دعووں کے خلاف انتخاب کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"لیکن یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ہر دور کے جتنے
زیادہ سے زیادہ شعراء کی نمائندگی ہو سکے وہ اچھا
ہے۔ اسکے ساتھ یہ لحاظ بھی رکھا ہے کہ کسی ایک
شاعر کے اتنے زیادہ شعر نہ آجائیں کہ وہ اپنے دور
پر چھا جائے"

اس دعوے کے ابطال میں آگے چل کر میں ثابت کروں گا کہ انھوں نے بالکل اپنے مخصوص ذوق کی بنا پر ہر دور پر ایک شاعر کو منڈھ دیا ہے۔ حالانکہ اس دور میں دوسرے شعراء کے اشعار لئے جا سکتے تھے مگر آخر میں یہ کہہ کر کہ۔

"لیکن یہ ہم پھر کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی ہے۔"

وہ پھر نفسیاتی طور پر ہر معترض کے ذہن و دماغ کو منتقل کر دیتے ہیں اسی لئے میں نے یہ رائے غلط قائم نہیں کی ہے کہ شوسے ان کا ذوق ناقص اور ناممکن سہی مگر ہوشیاری ان کی کنیز ہے۔ اور "یہ گھمبیر پروپیگنڈسٹ" کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اشعار کے ۵ انتخابات کا یہ سیٹ ۵ کتابچوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ پانچوں کتابچے ۵ ادوار پر مشتمل ہیں:

(۱) دورِ موجدین سنہ ۱۶۰۰ء سے ۱۶۷۵ء تک
(۲) دورِ متقدمین ۱۶۷۵ء سے ۱۷۵۰ء تک
(۳) دورِ متوسطین ۱۷۵۰ء سے ۱۸۲۵ء تک
(۴) دورِ متاخرین ۱۸۲۵ء سے ۱۹۰۰ء تک
(۵) دورِ حاضر ۱۹۰۰ء سے اسوقت تک

دورِ متقدمین

عام دیباچہ کے علاوہ اس میں اس دور کے بارے میں ایک دیباچہ ہے۔ جس میں اسکی مختصر تاریخ و تنقید ہے لیکن بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ولی دکنی وغیرہ کے کلام میں منتخب شدہ اشعار سے بہتر اشعار موجود ہیں جن میں آگ ہے اب تم ہی کہو کہ امیر خاں انجام کا یہ شعر انتخاب کے قابل تھا ؎

دُور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

یا آصف الدولہ کا یہ شعر کہ ؎

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو
میں ہوں اور رات ہے اور بستر تنہائی ہے

انتخاب کی ایک اصولی غلطی یہ بھی ہے کہ بعض جگہ مرتب نے ایک ہی غزل سے شاعر کے دو دو شعر منتخب کرلئے مثلاً صفحہ ۴ پر مرزا مظہر جانِ جاناں کا یہ شعر انتخاب کیا گیا ہے کہ ؎

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

غنیمت شعر ہے لیکن اسی زمین میں صفحہ ۱۲ پر ایسا معمولی شعر نظر آتا ہے جسکو پڑھ کر محمود علی خاں صاحب کی ذوقِ شعری کی صحت پر شک ہونے لگتا ہے ؎

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں آشیاں اپنا

اس اعتراض کا یہ جواب ضرور ہو سکتا ہے کہ متقدمین کی زبان کی زبان کی صفائی اور تکمیل کا اس سے اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ عنصر انتخاب کے بنیادی عناصر سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور پھر اس شعر میں بہ حیثیت شعر کے کوئی خاص بات نہیں۔ ہر کتابچہ کے آخر میں شعراء کے مختصر حالات درج ہیں۔

متوسطین

چند دن تو مجھے دھوکا رہا لیکن ان انتخابات نے مجھے یقین دلا دیا کہ محمود علی خاں صاحب شاعری کو اسی طرح اور اسی حد تک پسند کرتے ہیں جس حد تک ایک عام مسلمان پسند کر سکتا ہے۔ "دورِ متوسطین" کے دیباچہ دوئم میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

پھول کے ساتھ ہمیشہ کانٹے بھی ہوتے ہیں چنانچہ اس دور کی خوبیوں کے ساتھ اس میں دو مضر رجحانات بھی صاف نظر آتے ہیں ابتک اُردو شاعری میں محبوب کی صنف کا تعین نہ تھا بلکہ کبھی کبھی تو امرد پرستی کا صاف صاف مظاہرہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ نے اسمیں قابلِ قدر اصلاح کی یعنی مرزا جعفر علی حسرت نے پہلے پہل "واضح طور پر عورت" کو محبوب قرار دیا۔ بات تو اچھی تھی (یہاں پھر آپ انکی ہوشیاری کا لطف اُٹھا سکتے ہیں) لیکن لکھنؤ کے ماحول نے اسے ایسا بگاڑا کہ اُردو شاعری میں بوالہوسی حتیٰ کہ ابتذال پیدا ہو گیا۔

حسرت کے شاگرد جراءت کا اسمیں بہت بڑا ہاتھ
ہے۔ یہ رنگ داغ اور امیر کے زمانے تک قائم رہا
لیکن اب دورِ حاضر میں معیوب اور متروک سمجھا جانے
لگا ہے"۔

یعنی یہ مُضر رجحان تھا کہ عورت کو "واضح طور پر" محبوب قرار دیا جاتا؟
حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا جعفر علی حسرت نے یہ اقدام کرکے ہم
لوگوں کے دل میں گھر بنا لیا۔ کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں
اردو ادب میں اسکی ترقی یافتہ تحریک کا جہاں تک تعلق ہے
وہ سراہنے کے قابل ہے۔ میرے نزدیک یہ مُضر رجحان نہیں تھا
بلکہ مضر رجحان یہ تھا کہ آگے چل کر اردو شاعری پر تصوف کا
غلبہ ہوگیا جس نے شاعری کو "خلائی" بنا دیا۔

کسی تحریک کے نذرِ ابتذال ہو جانے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ بجائے
خود تحریک مبتذل تھی اسمیں فضا کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن جہاں تک
ابتذال کا تعلق ہے اردو شاعری میں "ضمیرِ تذکیری" نے مستقل طور پر
ابتذال پیدا کیا نہ اس سے میر خالی ہیں نہ سودا اور نہ کوئی دوسرا شاعر
لیکن محمود علی خاں صاحب کے نزدیک ابتذال اور بوالہوسی "صرف مرد"
سے تعلق نہیں رکھتی۔ عورت اس کی ضامن ہے! سبحان اللہ
یہ وہی استبداد دیت ہے جو ان دماغوں میں آرام کرتی ہے جو مذہبی
سنجیوں کے زیرِ اثر ہوتے ہیں

داغ اور امیر آزاد حالی اور اقبال کے بعد میں کہتا ہوں کہ قطعی
طور پر عورت کو محبوب تسلیم کیا جاچکا جسکا ثبوت دورِ حاضر کے ان
شعراء کے دواین ہیں جن سے بجا طور پر یہ دور منسوب کیا جاتا ہے
اور سینکڑوں نظمیں صرف عورت کے عنوان پر موجودہ ادب سے
پیش کی جاسکتی ہیں اسلئے یہ قطعی غلط ہے کہ دورِ حاضر میں یہ رنگ
معیوب اور متروک سمجھا جانے لگا ہے۔

حیرت ہے کہ بیسویں صدی کے انسان ہوکر موجودہ زمانے
کے شاعر ضمائر کا صحیح محل استعمال قائم نہ کرسکیں اور غزل و نظم
میں ضمیرِ تانیثی کے استعمال کو ایک نزاعی چیز بنائیں۔ واقعی بات
یہ ہے کہ محمود علی خاں صاحب جس غزل کے مداح ہیں اسکی چولیں

ہل چکی ہیں اور ہر غزل گو کسی نہ کسی فارم میں نظم کی طرف رجوع
ہو رہا ہے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر
میرے لئے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

اس شعر کا شاعر اپنے مقام پر نہیں ہے وہ اس شعر میں ماورائے
غزل نکل چکا ہے اور شعر کی یہ کامیابی اسلئے نہیں ہے کہ وہ متغزل
ہے بلکہ اسلئے ہے کہ نظم اور نظم گو شعرا سے متاثر ہے۔

اچھا اب سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لٹریچر کی اشاعت سے
مراد محض تفریح نہیں ہوتی اور نہ قوم کو رجعت و انفعال کی طرف
لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ خاصکر ہندوستان کی موجودہ حالت اسکی
متقاضی ہے کہ اسکے باشندوں کو ذی حیات اور بیدار کیا جائے
اور ایسے لٹریچر کی اشاعت کی جائے جس سے رگوں میں خون گرما
جائے۔ محمود علی خاں کا انتخاب کے متعلق نقطۂ نظر قطعی (..........
..........) انفعالی ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ لکھنؤ اسکول کی
متصنع شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ رسیلی شاعری کے دلدادہ
ہیں۔ لیکن متوسطین کا اہم دور "موت" سے شروع ہوتا ہے۔

سر زانو پہ ہو اسکے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

کل سو اشعار میں ۲۶ شعر ایسے ہیں جن میں نمایاں طور پر مرنے
ہی کا ذکر ہے۔ ان اشعار کو میں نظرانداز کرتا ہوں جن میں المناکی
اور تباہی کی داستانیں ہیں۔ اب تم ہی کہو کہ انسانی دماغ پر ان موت
کے گانوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ میں محمود علی خانصاحب سے دریافت
کرتا ہوں کہ آخر ہمارے سر پہ گڑھے مردے کیوں ڈالے جاتے ہیں ہم
مڑ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں آگے جانا ہے۔ ہمیں ایسا زادِ راہ
دو جو ہمیں ہمارے سفر میں مدد دے۔ ہماری بزم میں اجڑ چکیں
ہماری تجوریاں نہ جانے کون لے گیا۔ ہماری زمینیں قرض اور
کاہلی کی نذر ہوگئیں۔ یہی لوگ جب زندہ تھے تو انہوں نے ہمیں
افیون کے اتنے پنڈے اشعار کی صورت میں دیئے کہ ہم آجتک
انکی پینک میں ہیں۔ اب وہی گولیاں جن میں افیون کی طاقت

بھی باقی نہیں رہی کیوں ہم کو دی جا رہی ہیں۔
میں مکتبہ کے اراکین سے دریافت کرتا ہوں کہ انہوں نے جوش صاحب سے کم سے کم یا کسی اور شاعرِ حیات سے کوئی ایسا مجموعہ لکھوا کر شائع کیا جو مسلمانوں یا ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے فرض کو پورا کرتا!؟

یقیناً اس سوال کا جواب ان کے پاس "ہاں" میں نہیں ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک شخص کا ذاتی نقطۂ نظر ساری قوم کے سر تھوپا جائے۔ اگر محمود علی صاحب غم کے اشعار پسند کرتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ عام آدمی بھی غم کے اشعار پسند کرے اسلئے محمود صاحب کو انتخاب میں رنگا رنگی قائم رکھنی چاہیے تھی۔

دورِ متاخرین

اس دور کے دیباچہ میں مرتب نے لکھا ہے کہ
" اس دور کے تین رجحان قابل لحاظ ہیں
پہلا رجحان بوالہوسی کا تھا جس کی ابتدا دورِ متوسطین
میں جرأت نے کی تھی اور جسکی تکمیل داغ نے کر دی"

مرزا داغ پر یہ زبردست بہتان ہے کہ انکی شاعری بوالہوسی کی آئینہ دار ہے شاعری تو سماج کی پیداوار ہوتی ہے کہنا یہ چاہیے تھا کہ ایک محدود حد تک داغ نے زمانے کے مطابق شاعری کو چلایا۔ ورنہ زبان کی سادگی کے ساتھ ان کا کلام بلندی اور نفاست سے خالی نہیں۔ ان کے کلام پر اس اتہام کی اصلی وجہ انتخاب کا نہ ہونا ہے۔ اگر انکے کلام کا ایک بہتر ایڈیشن شائع ہو تو محمود علیخاں کو اسقدر آزادی سے یہ اتہام لگانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مرزا داغ کو اگر زمانہ انصاف کی نظر سے دیکھیے تو موجودہ غزل محض داغ کی شاعری کا پرتو ہے۔ بڑے بڑے متغزل مرزا داغ کے ہی معتقد ہیں۔ غالب کے انداز بیان کی جن لوگوں نے تقلید کی وہ کامیاب نہیں ہوئے اور عمل کے طور پر جو اسلوب ان کا بن سکا وہ جاذبیت نہیں رکھتا۔ البتہ اقبال نے جو راہ نکالی وہ کشش رکھتی ہے۔ لیکن باقی متغزلین کے تغزل کی بنیادیں غالب کی اساس پر نہیں داغ کے رنگ ہی کی اساس پر مبنی ہیں
ایک پہلو بحث کا نفسیاتی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا

کس شے کو بوالہوسی کہتے ہیں۔ جہاں تک جنسیات کی ہم ربطی کا تعلق ہے جس شاعری کے نمونے پیش کئے جا رہے ہیں وہ شاعری تو محض جنسی جذبات پر مبنی تھی۔ ایسے بھی محبت کی بنیاد جنسی جذبہ پر ہے۔ لہذا غزل کی تمام شاعری بوالہوسی قرار دی جائے گی!؟ داغ ہی کو کیوں کوسا جائے۔ فرق صرف اسقدر ثابت ہو سکیگا کہ بعض جگہ انہوں نے الفاظ کو آزادانہ استعمال کیا ہے اور دوسروں نے احتیاط کے ساتھ۔ بہر حال کسی لحاظ سے بھی مرزا داغ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں انہوں نے بوالہوسی کی تکمیل کی
دیباچہ کے بعد اشعار کا عنوان "بادۂ دوشینہ" ہے اور اسکے نیچے صف ماتم بچھی ہوئی ہے ؎

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

دورِ متاخرین اور دورِ حاضر میں تو مرتب کو کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی موت کے خوب خوب شعر ہیں۔ داغ کے تین دیوانوں میں سے محمود علیخاں صاحب کو یہ شعر پسند آیا ؎

سرادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

مومن کے کلام میں سے یہ شعر ہی ملسکے ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

حالانکہ مومن کے اس شعر کو انتخاب میں آنا چاہیے جب کہ مؤلف کو دعویٰ یہ ہے کہ ہر شاعر کے اشعار اسکے رنگ و اسلوب کے لحاظ سے دیئے گئے ہیں۔

بتخانۂ چیں ہو گر ترا گھر   مومن ہیں تو اب نہ آئینگے ہم

اس شعر میں مومن کی انفرادیت شاید جھلکتی ہے۔
ریاض کا یہ شعر غلط چھاپا گیا ہے ؎

مرے ساقی ذرا میری شراب تلخ تو لانا

مرے کی جگہ آرے" ہے۔ نظام رامپوری کا یہ شعر کہ ؎

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

انتخاب کے قابل نہیں ہے۔ ادا نگاری میں وہ ماہر ہے۔ اگر ایسا ہی شعر دینا مقصود تھا تو اسکے ہاں کمی نہیں تھی۔ یہ کسقدر حیرت کی بات ہے کہ اس انتخاب میں شاد عظیم آبادی کے اشعار کا انتخاب کیا جائے اور یہ اشعار انتخاب میں نہ آئیں ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ہر دل کی حکایت جلئے عجیب کیا اول آخر اسکا کہیں
اک خاک کا تودہ لائے تھے ہم۔ صحرا لئے قیامت تک چلے

مگر شعر کونسا انتخاب کیا جاتا ہے ؎

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

نظم طباطبائی کا یہ شعر کسطرح انتخاب کے قابل ہے!؟

نہ آنا اے اجل تجھکو قسم ہے وقت آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائگاں کر لیں

غالب کا یہ شعر مولوی صاحب کو بہت پسند معلوم ہوتا ہے کہ ؎

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی
وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

انتخاب کرنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اسکو اپنے دل میں رکھتے اور اگر جلنے مرنے ناکامی نامرادی، تباہی بربادی آہ، نالے اسی سے انکو دلچسپی ہے تو یہ شعر انتخاب میں آسکتا تھا ؎

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
میں بھی ہوں اک عنایت کی نظر ہونے تک

کیا کیا اور کب تک میں تم کو لکھے چلا جاؤں ایسی تکلیف اس سیٹ کو دیکھکر ہوئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ذوق کا یہ رسوائے عام شعر جو ہر بازاری ناول میں موجود ہے۔ انتخاب میں آیا ہے ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

صفحہ ۳۸ پر تینوں شعر غالب کے وہ انتخاب کئے گئے ہیں جنکی عمومیت مسلم ہے خیر میں اسپر معترض نہیں۔ شہرت و عمومیت بھی معیار انتخاب قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن بھائی بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے جب مندرجۂ ذیل شعر پر نظر پڑتی ہے کہ ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

البتہ ان کتابچوں میں ایک ہی چیز تعریف کے قابل ہے اور وہ شعراء کے حالات اختصار کے ساتھ۔

دورِ حاضر دور حاضر کے دیباچہ میں غزل کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"(دور حاضر کو) دراصل نظم کا دور کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اسکے متعدد وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے تو غزل کی پچھلی کج روی نے حالی کی قیادت میں، لوگوں کو اس سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اسکے علاوہ دور حال کے شعراء نے غزل کے میدان کی تنگی کو محسوس کیا۔ انہوں نے سمجھا کہ غزل کے اعتبار سے غزل میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا قدما اُسے ختم کر چکے ہیں۔

....

اور خارجی طور پر "مغرب کی مادیت" کا سیلاب بڑھتا چلا آرہا تھا جو غزل جیسی نازک چیز کو برداشت نہ کر سکتا تھا"

اس سے آگے بھی خدا معلوم کیا کیا ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ جسقدر نظم گو شاعر ہیں وہ مہمل اور احمق ہیں اور دور جدید کی غزل "الہام" ہے اور غزل گو ملہم۔

اس دیباچہ کے تمام خیالات ہمارے ایک مشہور شاعر دوست کے ارشادات کا پرتو ہیں۔ یہ دیباچہ بجائے خود تنقید چاہتا ہے

نہیں اور جوش کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

پنجاب کی وطن پرستی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ پنجابی مسافر کی راہ کا روڑا نہیں بنتے۔ اور یو۔ پی میں راہ چلتے راستے کا پتھر بن جاتے ہیں اور حتی الامکان سفر کو ناممکن کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاعری کے ترقی یافتہ ذوق میں پنجاب یو۔ پی سے زیادہ آگے ہے۔ بس بھی محمود علی خانصاحب کی طرح سے شاعر نہیں ہوں اسلئے اس دیباچہ پر اس تکمیل کے ساتھ تنقید نہیں کر سکتا جس تکمیل سے تم اور شاعر انقلاب کر سکتے ہو دورِ حاضر کے اشعار کا عنوان صہبائے نو ہے اور یہ خوب ہے سب سے پہلا شعر اقبال کا ہے اسکے بعد جگر صاحب کا شعر اسی زمین میں ہے جو یقیناً اچھا ہے مگر اس سے بہتر انکے دوسرے شعر ہیں۔

ایک بڑے تعجب کی بات اسی انتخاب میں نظر پڑی یعنی سوالیہ نشان کسی صاحب نے اپنا تخلص رکھ لیا ہے۔ محمود علی خاں صاحب نے سوالیہ نشان صاحب کے بھی کئی شعر انتخاب کئے ہیں مگر اس دور میں بھی محمود علی خاں صاحب کا ذوق ماتم مسرت ونشاط سے نہیں بدلا ہے انتہا ہو گئی کہ شاعر انقلاب جیسے نشاطی شاعر کے بھی المناک شعر انتخاب کئے ہیں ؎

اس قدر یاس بھی دیکھی ہے کہیں دنیا میں
رو دیے ہم جو تری چشمِ عنایت دیکھی

دورِ حاضر میں مولوی صاحب جو دورِ جدید کی غزل کے رسیا ہیں یہ شعر انتخاب فرماتے ہیں۔

اس طرف کچھ دیکھکر رونے لگے تیماردار
اس طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے غافل ہو گیا!!

بہر حال دورِ حاضر کے انتخابات میں بھی وہ محض لکھنوی ذوق کے ایک غزل پرست معلوم ہوتے ہیں اور زیادہ اشعار یاسیہ ہی انتخاب کئے ہیں۔ اول تو ہندوستان کے مردہ دل شعرا ہی سوائے رونے دھونے کے کوئی تخلیق نہیں کر سکتے۔ دوسرے سننے والے یہاں رونا ہی سننا چاہتے ہیں۔ ایک غلام مفلس بھوکی قوم سے ذلتوں اور گراوٹوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز پسند نہیں کرتے۔

مکتبہ کو کوئی آئیڈیل تو قائم کرنا نہیں ہے۔ کتاب بیچنی ہے اسلئے وہ ماحول اور فضا کے مطابق چیز دینا چاہتا ہے کوئی مجتہدانہ قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ پھر اسکے منتظم اور کارکن سب شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسلئے ہمیں ان مشکلوں کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔

ان حالات میں بہتر ہے کہ وہ نثر کی کتابیں شائع کرے اور تراجم چھاپے اس نے اردو پبلک کے نثری مطالعہ کے لئے معیاری سامان فراہم کیا ہے۔ جو بات دل لگتی ہوتی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ اچھا خدا حافظ دہلی جب آؤ گے اس بحث پر باقی گفتگو کروں گا۔"

ایشیا تمہارے اور محمود علی خانصاحب کے خیال میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو کچھ تم نے اپنے خط میں ریویو کیا وہ اگر درست بھی مان لیا جائے تب بھی میں یہی کہونگا کہ کام کرنے والوں کے لئے بڑی مصیبتیں ہیں اور آجکل جو شخص بھی اردو کی خدمت کر رہا ہے غنیمت ہے۔

مگر تمہاری ایک رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ جس شخص کو جس کام میں مہارت نہ ہو اسے اس کام میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیئے۔

مولوی محمود علی خانصاحب کو میں جانتا ہوں وہ بیچارے شعر سے ذوق رکھتے ہیں مگر شعر کو سمجھتے نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں اشعار کا انتخاب ان کو نہیں کرنا چاہیئے۔ دورِ حاضر کے انتخاب میں انہوں نے فراق، لطیف احمد، مجنوں اور مجید ملک صاحب سے مدد لی ہے اسلئے گذشتہ دوروں سے اس دور کا انتخاب بہتر ہے۔

اس سلسلے میں معذوری اور کامیابی دونوں کا اندازہ "ضرب الامثال" دیکھکر ہو جاتا ہے جس میں محمود علیخانصاحب نے محض ایسے اشعار جمع کئے ہیں جو قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں

اور اتنے مشہور و بے ساختہ ہیں کہ ضرب الامثال بن گئے ہیں۔

بسط کا یہ کتابچہ کم از کم مجھے پسند آیا۔ حالانکہ اسمیں شدید عمومیت ہے مگر وہ چیز ہی عمومیت کی ہے۔ اور اس کی ترتیب میں مؤلف کو دقت نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس معذوری کی بنا پر کہ مؤلف کو شاعری سے فطری لگاؤ نہیں ہے انکو اشعار کی عام شہرت نے مدد دی ہے اور کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس کتابچہ کو ترتیب دیا ہے۔

اگر ہم بنیادی طور پر یہ معلوم کر لیتے کہ قدرتی مجبوریاں ہیں تو ہمیں اتنا دکھ نہ ہوتا۔ بہر حال دورِ حاضر میں نظم گو شعراء کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تمام خیالات وہی ہیں جو ہمارے دوست حضرت جگر مرادآبادی کہا کرتے ہیں۔ سیر طریقت سے جو کچھ مولوی صاحب نے سنا وہی لکھدیا۔

نظم نے تھوڑے ہی عرصہ میں کسقدر شاندار ترقی کی ہے اسکا ثبوت یہ ہے کہ ملک میں تقریباً نصف درجن شعراء ایسے موجود ہیں جنکو صاحب طرز کہا جا سکتا ہے اور جو اردو شاعری میں بذات خود اپنی ایک جگہ رکھتے ہیں۔ اور ان سب کی انفرادیت ہے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ غزل کے دیوانوں سے زیادہ نظم کے مجموعوں کی فروخت بازار میں ہے۔ تیسرا ثبوت نظم کی کامیابی کا یہ بھی ہے کہ ہر غزل گو کسی نہ کسی حد تک نظم کی طرف رجوع ہے

ان مخصوص اور مشہور شعراء کے علاوہ ملک میں جو مقلد اور مبتدی شعراء ہیں۔ ان پر مولوی محمود علی خاں صاحب کا یہ اعتراض کہ "رنگین الفاظ اور ترکیبوں کی آڑ لے کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انکا مفہوم پوری طرح ادا ہو گیا حالانکہ حقیقتہً وہ نہایت تشنہ اور نامکمل رہ جاتا ہے" قطعی صادق آتا ہے آگے چلکر وہ لکھتے ہیں۔

"چنانچہ موجودہ دور کے ایک چوتھائی اشعار
بالکل چیستاں ہوتے ہیں اور نصف ایسے ہوتے
ہیں جنکے الفاظ کا سحر نہایت کامیاب ہوتا ہے
رنگین ترکیبیں وقتی طور پر مزہ بھی دے جاتی
ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو یا وہ کھوکھلے
ثابت ہوتے ہیں یا انہیں معنے پہنانے کی خدمت
پڑھنے کے لئے مذاقِ سلیم کے سپرد کر دیجاتی ہے"

یہ تمام سطریں دراصل موجودہ تقلید غزل گویوں پر صادق آتی ہیں۔ اتنا تو میرے دوست جانتے ہی ہونگے غزل کا شاعر ساری عمر عوام کو دھوکا دے سکتا ہے۔ لیکن نظم کا شاعر اپنی ایک نظم سے بھی فریب نہیں دے سکتا۔ غزل میں یاوہ گوئی کر جائیے۔ تصوّف اور فلسفۂ الہیات قرار دی جائے گی۔ لیکن نظم جو ایک عنوان کے تحت لکھی جاتی ہے اور جسکی تصویر اسکے مقررہ ماحول کے مطابق کھینچنی پڑتی ہے۔ اگر وہ غلط ہو جاتی ہے تو نظم کو کوئی اچھا تو اچھا درست بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک متفرق خیال اور جذبہ کا حامل ہوتا ہے اسلئے اتنی دقت نہیں ہوتی۔ ارے تذرہے۔ حذر (اور بقول محمود علی خاں صاحب کے ۵۰ فیصدی رنگین محدود الفاظ) اِدھر اُدھر سے جمع کئے اور "تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں" کہدیا۔ اسطرح تین خدمتیں ہو گئیں (۱) شاعری، تصوّف اور مرشد کی مدح۔ کیونکہ اردو غزل گو کا محبوب ڈاڑھی والا مرشد ہوتا ہے جس سے اُسکو فیض پہنچتا ہے۔ دس گیارہ عنوانات غزل کے مضامین کے ذخیرے ہیں۔ کہیں آشیاں سلگ گیا۔ کہیں نغمۂ بلبل بلند ہو گیا۔ کہیں ایک آہ۔ کہیں ایک واہ۔ کہیں دم نکل گیا (ان غزل گویوں پر زیادہ تر نزع کا عالم طاری رہتا ہے) بہر حال محمود علی خانصاحب نے غیر واقعاتی بات لکھی اور ہم غلط سمجھے۔ یہ حالت دراصل غزل گویوں کی ہے جو اردو شاعری اور ہندوستانی قوم اور ذہن و دماغ حیات اور ترقی تمام چیزوں کے لئے ایک مصیبت ہیں۔ اور نہیں معلوم کہ قوم کا یہ کیا حشر کر کے رہینگے اب؟

رباعیاتِ عرشؔ فاروقی

سائز ۲۰×۲۶/۱۶ چھپائی کتابت کاغذ متوسط اور نظر کش مرتبہ سید الطاف علی صاحب بریلوی بی اے (علیگ) قیمت ۸ ملنے کا پتہ مینجر صاحب کا نفرنس بکڈپو علی گڈھ ۔

یہ مجموعہ ہمارے دوست سید الطاف علی صاحب بریلوی نے مرتب کیا ہے۔ جو عرش صاحب فاروقی مرحوم کی رباعیات شباب پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے الطاف صاحب کا "تعارف" ہے جسمیں عرش صاحب کے خاندانی حالات لکھے گئے ہیں جو عجیب دردناک ہیں۔ اعتماد الدین احمد صاحب عرش ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو جوانی ہی میں ۲۴ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے ۔

تعارف کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی کی تحسین کلام کے عنوان سے چند سطور ہیں۔ نواب صاحب امور مذہبی پر تو ممکن ہے درک رکھتے ہوں لیکن میں اُسدن سے انکی شعر فہمی کے متعلق کوئی حسن ظن نہیں رکھتا جس دن اپنی کوٹھی میں ٹہلتے ہوئے غالب اور اقبال کے شاعر ہونے ہی سے انہوں نے انکار فرمادیا۔ اور اقبال کو تو سرے ہی سے شاعر ماننے سے انکار کردیا۔ شعر کا ذوق اور اسکو سمجھنے کی فہم ایسی عام دولت نہیں ہے کہ دولتمندوں اور زمینداروں کو بھی ودلیعت ہو جائے ۔ اسلئے اس تحسینِ کلام کے متعلق کیا لکھوں اسکے بعد جوانی کے عنوان سے تقریباً ۳۰۷ رباعیاں ہیں۔

جن لوگوں نے شبابیات (مطبوعہ ۱۹۲۵ء) میرا مجموعۂ رباعیات دیکھا ہے اسکو مجبوراً کہنا پڑیگا کہ رباعیات عرش مرحوم کوئی طبعزاد چیز نہیں ہے ۔

آیئے رباعیات عرش سے پہلے میں اپنی رباعیات ہی پر ایک نظر ڈالوں کہ بنیادی خیال بھی درست اور متناسب ہے یا نہیں۔ یاد ش بخیر وہ عہد کہ جب شعر و شاعری کا شوق جنون اور مالیخولیا کی حد سے بھی گذرا ہوا تھا اس زمانے میں جوانی پر میں نے تقریباً ایک سو رباعیاں کہی تھیں اور انکو مشاعروں میں عجیب رنگ و ادا سے پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے کہ جو تصویر رباعی میں ہوتی تھی اسکا بہت کچھ اثر خود میرے خط و خال میں موجود تھا۔ ہر جلسہ میں یہ رباعیاں بہت کامیاب ہوتی تھیں ۔ ذات و صفات کی یہ ہم رنگی ایک عجیب عالم پیدا کردیتی تھی اور مشاعروں میں جب میں غزل پڑھنے کے لئے بیٹھتا تھا تو اُنکے سنانے کی فرمائش ضرور ہوتی تھی۔

ان رباعیات کی کامیابی نے ہر نوجوان کے دل میں تقلید و نقل کی آرزو پیدا کردی اور متعدد حضرات نے اس قافیہ و ردیف میں جوانی کی رباعیاں کہیں جس قافیہ و ردیف میں میں نے رباعیاں تخلیق کی تھیں اسوقت مجھے بد قسمتی سے ماحول کے اثرات نے خود انتقادی کی دولت نہیں بخشی تھی اسلئے میں جہاں اپنے بہت سے معائب کو نہ سمجھ سکا اس عیب کی طرف بھی نگاہ نہ جاسکی کہ اُن رباعیوں میں ایک قسم کا ناقابل برداشت ابداع تھا اور گذری ہوئی سی خودستائی اور عدم تناسب پایا جاتا تھا۔ سنانے تک یہ محدود رہتیں تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن سنانے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ انکو "شبابیات" کے عنوان سے شائع بھی کردیا گیا تو جوانی کے جوش اور ناعاقبت اندیش مزاج نے اس مجموعہ میں اس قسم کی رباعیاں بھی شائع ہوجانے دیں جنھیں آج میں دیکھتا ہوں تو دل ہی دل میں ہنستا ہوں ؎

کیلے کی شراب ہے جوانی میری — جاڑوں کا گلاب ہے جوانی میری
برکھا کی گھٹائیں ہیں امنگیں ساغر — بوندوں کا شباب ہے جوانی میری
پیغمبر ہوں سے ہے زندگانی میری — پھولوں میں سنی گئی کہانی میری
ہر سانس میں الہام کی آوازیں ہیں — جبریل کی نیند ہے جوانی میری

لیکن اس قسم کی رباعیات کے ساتھ ساتھ اس مجموعہ میں زیادہ تر رباعیات ایسی بھی ہیں جنکو سن کر انسان تڑپ جا سکتا ہے ؎

عید آئی گئی وہ سرگرانی میری — ہنسنے لگی صبح شادمانی میری
شیشے ہوئے ہمکنارِ ساغر ساغر — اور مجھ سے گلے ملی جوانی میری

بہرحال کہنا یہ ہے کہ رباعیات عرش کا اصلی ماخذ تو "شبابیات" ہے شباب پر تقریباً ۴۷ رباعیات اور گیارہ دوسرے موضوعات

پرہیں، جس طرح "شبابیات" میں شدید ترین ابداع موجود ہے، ان رباعیات میں بھی صفحہ صفحہ پر وہی رنگ ہے ؎

مستی کا پیام ہے جوانی میری جمشید کا جام ہے جوانی میری
آئینۂ اسرارِ معارف ہوں میں حافظ کا کلام ہے جوانی میری

بعض جگہ اس درجہ توارد خیال ہے کہ حیرت ہوتی ہے؛ کیونکہ اب عرشؔ دُنیا میں باقی نہیں ہیں، اور خود ان کے اہتمام میں یہ مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے اس لئے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن اپنے دوست الطافؔ صاحب پر حیرت کرنیکا مجھے حق ہے کہ ایک مطبوعہ اور قدیم کتاب (شبابیات) کو انہوں نے دیکھ کر اس کی ترتیب نہیں کی۔ عرشؔ کی رباعی کا آخری مصرعہ ہے کہ ؎

اک شاعرِ فطرت ہے جوانی میری

میرا مصرع ہے کہ ؎

اک شاعرِ مست ہے جوانی میری

لیکن اسکے باوجود مجموعی طور پر اس موضوع پر یہ مجموعہ بھی بہت دلنواز اور پڑھنے کے قابل ہے۔ یقیناً اگر عرشؔ زندہ رہتے تو قوم میں شاید ایک اچھے شاعر کا اضافہ ہوتا۔ بعض مصرع اور رباعیاں اس قدر پُر کیف ہیں کہ بے ساختہ مرحوم کی روح کو داد دینی پڑتی ہے۔ ایک مصرع ہے ؎

"مفلس کا چراغ ہے جوانی میری"

اور خصوصاً یہ رباعی کہ ؎

خود بینیٔ فطرت ہے جوانی میری آئینۂ حیرت ہے جوانی میری
جو میرے سوا کسی سے اُٹھ ہی نہ سکا وہ بارِ امانت ہے جوانی میری

بہر حال، میں الطاف صاحب کو ان کے اس حقِ دوستی ادا کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھیں، وہ ضرور محظوظ ہونگے۔

ہماری زبان اور اسکے مشاعرے

خطبۂ صدارت آل انڈیا مشاعرہ مچھلی شہر منعقدہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء از ڈاکٹر نجم الدین احمد صاحب جعفری بار ایٹ لا، ملنے کا پتہ اُردو لٹریچر کمپنی حویلی اعظم خاں دہلی۔ قیمت سہ ر

یہ اُردو زبان کے متبحر ادیب ڈاکٹر نجم الدین احمد کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے اپنے ہی وطن میں ایک آل انڈیا مشاعرہ میں دیا۔ سب سے اوّل، مشاعروں کی تاریخ انکے عروج اور پھیلاؤ کو نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا ہے اسکے بعد مشاعروں کے انعقاد اور انکے نفع و ضرر پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اسکے بعد اُردو شاعری کی ان رگوں پر نشتر زنی کی گئی ہے جن میں فاسد خون بھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ قطعی صحیح لکھا ہے کہ ایران کی تقلید کرنے کے بعد جو چیز ہم کو حاصل ہوئی، اس نے 'یعنی ایرانی محبوب کے تخیّل' اور 'ایرانی ہندوستانی مخلوط محبوب' کے تخیّل نے ایک عجیب و غریب ہیبت ناک اور مخنّث محبوب کا تصوّر اُردو شاعری میں پیدا کر دیا، جس کے اثرات گو اب باقی نہیں ہیں لیکن جس کی یادگار کے طور پر ابھی ضمائر کا منافقانہ استعمال ضرور باقی ہے۔

اسکے بعد اُردو شاعری کی بتدریج ترقی کی تاریخ اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کی ہے مگر پنجاب اور یو پی کے جن شعراء نے شاعری کو بامِ ارتقا تک پہنچایا، ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے اصحاب کا نام بھی لکھ دیا ہے، جن کو ابھی یہ کریڈیٹ نہیں دیا جاسکتا گو یہ ممکن ہے کہ آج سے دس پندرہ سال بعد وہ اسکے مستحق ہو جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کا بھی اصرار ہے کہ شاعری کو بنی نوع انسان کی مسرت ہی کا ذریعہ نہیں بننا چاہیئے بلکہ انسانیت کی تعمیر میں اسی طرح حصہ لینا چاہیئے، جس کی مثال تاریخ میں اکثر ملتی ہے، بنی نوع انسان کی تعمیر و ترقی کا پہلا ذریعہ، جذبات عالیہ ہی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تمام خطبۂ صدارت کا نچوڑ یہ ہے کہ ملک کے شعراء کا مقصد اعلیٰ شاعری ہونا چاہیئے نہ کہ صرف رواجی غزل۔

لیکن میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ بہ حیثیت ایک تماشائی کے میں یہ تماشہ روزانہ دیکھ رہا ہوں کہ ان آوازوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اور اعلیٰ شاعری کی تخلیق کے باوجود اُردو شاعری میں شدید قسم کا ردِّ عمل بھی شروع ہو گیا ہے اور ایک بے روح اور کمزور رواجی غزل کا پھیلاؤ ہوتا جاتا ہے۔ اس ردِ عمل کے ذمّہ دار ہمارے دوست حضرت جگر مرادآبادی کے نقال اور عکّاس ہیں۔ جہاں تک جگر کی غزل کا تعلق ہے وہ دلنواز اور گہری ہے۔ لیکن جو لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں ان میں زیادہ تر مہمل اور بے روح ہیں۔ یو۔ پی سے لیکر پنجاب تک میں اس رَو کو دیکھ رہا ہوں، کیونکہ اوّل تو رومانس (Romance) ہی افیون ہے، پھر غزل جو انسان کے جنسی جذبات کی پیاس بجھاتی یا دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتی ہے، اور بھی افیون ہے، موجودہ مسلمان قوم جو مفلوج و کسل مند ہونے کی وجہ سے عارضی مسرت و طاقت کی خواہشمند ہے ایسی افیون اور ایسی شراب کو پسند کرتی ہے جو اس کو ایک ہی گھونٹ میں دُنیا جہان کی تکلیفوں سے نجات دلا دے۔

مگر یاد رکھیئے کہ آج شاعر، امتحان کے نہایت اہم اور خطرناک مرکز پر ہے۔ یوں تو اس کو حق حاصل ہے کہ وہ وقتی تحسین و ستائش سے مست ہو جائے اور خود کو شاعرِ کامیاب تصوّر کر لے، لیکن کل کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے شعر کی جگہ قوم کے زبان و دل ہونگے یا انگیٹھیاں اور دہکتے ہوئے چولھے!؟ یاد رکھیئے کہ ہر وہ شخص مٹا دیا جائیگا، جو زندگی اور حقیقت کو چھپائیگا۔ اور وہ زندہ رہیگا جو حق کیلئے خود مٹ جائیگا۔ مستقبل میں وہی شاعر اپنی زندگی کا خود ضامن ہوگا جو حقائق کا ساتھ دے گا، جو قومی ارتقاء کا ساتھ دیگا، جو ہندوستانی قوم کا ساتھ دیگا۔ یعنی جو زندگی اور زندگی کے حرکتی پہلو کا ساتھ دیگا۔

آج شاعر کیلئے یہ بڑا سوال ہے کہ وہ کیا سوچے اور کیا کہے!؟ زندگی اپنے اصلی مقصد کی تلاش میں ہے۔ اس جستجو میں تم اسکی کس قدر مدد کر سکتے ہو، یہ سوال ہے جو وقت کی طرف سے برابر کیا جا رہا ہے اور بنی نوع انسان کی ہستی کا دارومدار اس سوال کے جواب میں پوشیدہ ہے!؟ آخر شعراء کا احساس اور تاثر محض فطرت کے خوشگوار اور حسین پہلوؤں تک کیوں محدود ہے، ان کی محبت، انکے وجود تک محدود کیوں ہے؟ اگر وہ وسیع دل کے مالک ہیں، تو لچکتی ہوئی کمریں، اور ہنستے ہوئے چہرہ ہی ان کو دعوتِ شعر و نغمہ کیوں دیتے ہیں۔ ایک لامحدود کراہتی ہوئی دُنیا سے وہ کیوں آنکھ بند کئے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ وہ روشنی کے رسیا ہیں، تو آخر تاریکی نے کیا گناہ کیا ہے!؟

تاریکی بھی روشنی ہی کی طرح ایک روشن حقیقت ہے۔ رسمی غم، اور رواجی واویلا سے وہ دُنیا اور انسان کو کیونکر بلند کر سکتے ہیں۔ آرٹ کا اگر ان کے نزدیک کوئی مقصد بھی نہ ہو، تب بھی ان کے تخیل کو عام دماغوں اور ذہنوں سے بڑھ کر کوئی بات کہنی چاہیئے۔

قدیم شعراء پرانے ماحول اور ساونتی تمدّن و تہذیب کی پیداوار تھے اور ان کی شاعری کی آماجگاہ امارت اور سرمایہ داری تھی۔ ایک عام ذوق تھا، ایک وسیع ماحول تھا وہ نوابوں اور امراء کے ان تقاضوں کی نمائندگی کرتے تھے جو امراء کے چونچلوں اور شوقوں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب وہ ذوق ہے نہ ماحول، مگر عوام میں بیٹھ کر شعراء وہی رٹ رٹے جاتے ہیں، جو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مثلاً رندی و سرمستی بھی زندگی کا ایک راستہ ہے لیکن کیا سماج میں ہم اس راستہ کو وسیع و عام کر سکتے ہیں!؟ ظاہر ہے کہ نہیں، تو پھر جو شخص آج اپنے شعر میں بغیر کسی بنیادی خیال کے رندی و سرمستی کی تعلیم دیتا ہے اُس سے ہر شخص دریافت کرنے کا حق رکھتا ہے کہ کیا محض رندی سے دُنیا چل سکتی ہے!؟ اگر چل سکتی ہے تو پھر وہ اپنے فلسفہ کو وضاحت سے بیان کرے۔ اور اگر وہ اپنے خیال میں ذرا بھی متزلزل اور غیر مخلص ہے تو اس کو اپنے خیالات پر غور کرنا چاہیئے۔ یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شاعری سے رندی و سرمستی کے خیالات کو

نکال دینا چاہیئے۔ زندگی میں جس قدر رندانہ عناصر کی ضرورت ہے وہ ضرور باقی رہنے چاہئیں"۔ دراصل آج محض آرٹ کا سوال نہیں ہے ہر شخص سے سماج ایک راستہ پیدا کرنے کی آرزومند ہے"! (پیام کا لفظ بیحد فرسودہ ہوگیا ہے، لیکن اس لفظ کے کہنے کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں ہے) یعنی ہر شاعر سے سماج ایک پیغام چاہتی ہے، گویا شاعر اسکی ملک ہے اور وہ اپنی ملک سے اپنی ضرورت کے مطابق مطالبہ کرتی ہے، ان حالات میں آپ خود خیال فرماسکتے ہیں کہ شاعر کی حیثیت کس قدر معرضِ امتحان میں پڑجاتی ہے"!؟

ہماری دُنیا برباد اور تباہ ہوکر از سرِ نو تعمیر ہورہی ہے"۔ اس دُنیا کے لئے فلسفی، شاعر، آرٹسٹ، اور ہر طبقے سے رنگارنگ تعمیری سامانوں کی ضرورت ہے"۔ جب گھر بنایا جاتا ہے تو محفوظ دولت بھی صرف کردی جاتی ہے"۔ اس لئے شاعر کو آج صرف دل کا منتظر نہیں رہنا ہے بلکہ دل اور دماغ اور روح کو ہم آہنگ کرکے وہ تخلیق کرنی ہے جس سے نئی دُنیا تعمیر کی جاسکے"۔

یاد رکھئے، وہ سب پیدا ہونے سے پہلے مرچکے جو شاعری کو عامی سے عامی بنائے چلے جارہے ہیں اور محض اس لئے کہ مشاعروں کے ہنگاموں کے "ہیرو" کہلائے جاسکیں، بلند، زندہ اور پُرجوش باتیں کہنے سے احتراز کرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں جن کو عوام پسند کرتے ہیں۔ وہ عوام جن کے نزدیک شاعر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بناوٹی اور بازاری عشق و عاشقی کی کہانیاں نظم کردے اور بس"

ڈاکٹر نجم الدین جعفری نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں وہی باتیں کہی ہیں جو حالی کا معہود و مقصود تھیں، لیکن میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ شاعر واعظ بن جائے۔ میں تو شاعر سے ایک ایسی تخلیق چاہتا ہوں جو، تاثیر، کشش، سادگی، بلندی اور افادیت کے اجزا اور عناصر سے مرکب ہو، اور نئی چیز ہو جس کی بنا پر اُردو زبان کی شاعری، دُنیا کی بڑی سے بڑی شاعری کے مقابلے میں رکھی جاسکے۔ میں عاشقانہ شاعری کا مخالف نہیں۔ لیکن اُس میں واقعیت ہونی چاہیئے، میری آزادانہ رائے ہے کہ اُردو زبان کی عاشقانہ شاعری تو انسان کے جنسی جذبات کو بھی نہیں اُبھارتی، اس میں ایک سخت قسم کا مصنوعی الم پایا جاتا ہے"۔ جوانی نہیں"۔ اور عمق بھی نہیں، میں پھر عرض کرونگا کہ اُردو شاعری خلاقی سے عاجز ہے تو اس کو شاعری چھوڑ کر فنِ رقص میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے، گو اس میں بھی اسی قسم کی ضرورتیں پیش ہوں گی"۔ مگر شاعرانہ خلاقی کے مقابلے میں رقاصانہ خلاقی میں کامیابی نسبتہً ممکن ہے ——— !؟

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زبان کے مسئلہ پر نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے آج ہر شخص کو اتفاق ہے۔ اسکے بعد مچھلی شہر کی ادبی اور شاعرانہ افضلیت پر روشنی ڈالی ہے اور آخر یہ چھوٹی سی کتاب ایک نظم پر ختم ہوتی ہے جس کا عنوان "اتحادِ عمل" ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جعفری صاحب اور سب کچھ ہوتے ہوئے شاعر بھی ہیں ——— !؟

"اخلاق" و "مذہب"

صفحہ ۱۰۵ پر "اخلاق و مذہب" کے عنوان سے جو فلسفیانہ مباحثہ اس نمبر میں شائع کیا جارہا ہے اسکے بالکل آخر میں صفحہ ۱۰۹ پر یہ سطور لکھنے سے باقی رہ گئی ہیں"

سہیلا: ۔ انسان فطرتاً جزا اور سزا کے خیال سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

شاعر: ۔ تو پھر وہ سچا اخلاقی بھی نہیں بن سکتا ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ۔۔۔ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

(اڈیٹر)

عطرِ عروض

مؤلفہ نواب احسان علی بہادر آف باندہ منور گنج اندور (اسٹیٹ) قیمت ۴ر علاوہ محصول۔

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت اور جامع رسالہ ہے جس میں فنِ عروض کی ابتدائی باتوں کو نہایت عام فہم زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف میں نواب صاحب نے جس جامعیت اور اختصار سے کام لیا ہے وہ ایسے وسیع اور نہ سمجھ میں آنے والے موضوع پر کتاب لکھتے ہوئے ناممکن ہی ہے۔ اپنی جامعیت اور تکمیل کے لحاظ سے یہ ضرور اس قابل ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں میں درسی کتابوں میں اس کو داخلِ نصاب کر لیا جائے۔

یہ رسالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) پہلے باب میں علمِ عروض، اصطلاحاتِ عروض، وزن، بحر، رکن، اصول، تقطیع، زحاف، سالم، غیر سالم، تعریف شعر، معشر، صدر، عروض، ابتدا، ضرب، حشو، اصول، سبب، وتد، فاصلہ، ارکان، وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے۔

(۲) دوسرا باب زحاف، ازالہ، حب، شکل، وقف، اضمار، جدع، طے، تخنیق، حذف، قبض، تسبیغ، قصر، تسکینِ اوسط، خرب، تشعیث، خرم، ثرم، کف، ثلم، شتر، نحر، وغیرہ کی تعریف پر مشتمل ہے۔

اور اسی طرح باقی تین ابواب میں بھی عروض کے ضروری مبادیات نہایت قابلیت کے ساتھ اختصار کے ساتھ درج ہیں۔

آئیے میں آپ کو نواب احسان علی بہادر سے ملاؤں۔ احسان صاحب باجی راؤ پیشوا کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور نواب آف باندہ کے پوتے ہیں۔ لیکن اندور ہی میں پیدا ہوئے اور اندور ہی میں قیام فرما ہیں۔ تمام خاندان کو شعر و ادب سے گہرا ذوق ہے۔ شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ اسی نمبر میں کسی جگہ آپ ان کے ارشادات سے مستفید ہوں گے، عام طور پر غزل فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی کہتے ہیں لیکن ان کا اصلی میدان غزل ہی ہے۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ غزل میں تصوف اور فلسفہ نہیں کہتے۔ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

ان کی شاعری کا تمدن قدیم ہے، جس طرح ان کے اخلاق و اطوار اور زندگی میں قدیم وضعداری کی شان ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری قدیم شاعرانہ وضعداریوں کی آئینہ ہے۔ اس سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ خصوصیات بلند اور ناپسندیدہ ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ باتیں نئے آدمیوں میں نہیں ہیں جو بیحد قدر کے قابل ہیں۔ اگر نواب صاحب قدامت کے بعض اصولوں کو نہ مانتے ہوتے تو فنِ عروض پر رسالہ لکھنے کی کوشش کیوں فرماتے!؟ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ شاعری کیلئے ہرگز عروض سے واقف ہونے کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص اس کھیڑے میں پڑے گا اس کو کبھی شعر کہنا نہیں آئے گا۔ یہ تمام باتیں ایسی تو ضرور ہیں کہ شاعر ان سے واقف ہو، مگر ایسی ہرگز نہیں کہ ان کو شاعری کی بنیاد قرار دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی علم اور فن سے واقف ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے، وقوف تو جہل کے مقابلے میں بہر حال مبارک ہے۔ لیکن میں اُن حضرات سے قطعی اتفاق نہیں رکھتا جو شاعری کی بنیاد علمِ عروض کے جاننے پر قائم کرتے ہیں، اور اس نظریہ پر مصر ہیں کہ جو شاعر عروض نہیں جانتا وہ شاعر ہی نہیں ہے۔ ایک حقیقی شاعر کیلئے عروض جاننے کی مطلق ضرورت نہیں، اسکی روح کا فطری ترنم اُسے وزن و بحر سے واقف کرا دے سکتا ہے۔ بلکہ حقیقی شاعر نئے اوزان اور نئی بحریں ایجاد کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اسکی قدرتی دلیل یہ ہے کہ جھرنوں، چڑیوں، ہواؤں اور جھینگروں کو کس نے فنِ عروض سکھایا ہے۔ کہ ان شعرائے فطرت کے اشعار میں آجتک سکتہ اور ایطا واقع نہیں ہوا!؟

ہاؤ کو چناروں کے درختوں میں گو نجتا ہوا سُنئے۔ اسکے نغمہ میں ایک بحر ہے، ایک وزن ہے۔ ایک دُھن ہے اور ازل سے اس وقت تک وہ بغیر عروض جانے ہوئے موزوں گائے جا رہا ہے۔ اس کی آتش نفسی بغیر کسی اُستاد اور بغیر کسی عروض کے جاری و ساری ہے۔!؟

ان دلائل کی بنا پر دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ حقیقی شاعر کیلئے عروض کا ماہر ہونا کوئی شرط لازمی نہیں۔

قطع نظر اسکے "عطرِ عروض" اپنے موضوع پر اُردو زبان میں سب سے مکمل اور جامع مختصر اور سمجھ میں آنے والی کتاب ہے، اس لئے جو حضرات

عروض کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہیئے۔ یقیناً یہ "رازِ عروض" وغیرہ کتابوں سے بہت مفید اور کہیں بلند ہے۔

کُشتگانِ فریب

مصنفہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی، ملنے کا پتہ درزی چوک بریلی۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶۸ صفحے۔ کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت مجلد ۱۰/ غیر مجلد ۸/

یہ ایک ناول ہے جس میں ایک پیری کی داستانِ ظلم تحریر کی گئی ہے۔ قتل، تباہی، غارتگری کے واقعات سے اس کو "سنسنی خیز" بنایا گیا ہے۔ پلاٹ عبرتناک ضرور ہے۔ زبان بھی پُر جوش اور زوردار ہے، لیکن لوچ نہیں ہے۔ اور ساری کتاب کو تحلیل نفسی سے کوئی تعلق نہیں ظاہر ہے کہ اب اُردو ناول نگاری، ان منازل سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ ادب میں واقعیت نگاری اور نفسیاتی تحلیل کا دور دورہ ہے۔ اب ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نئے ادب کو پیشِ نظر رکھ کر قلم اُٹھائے۔ ورنہ محض طباعت کی آسانیوں سے فائدہ اُٹھانا تو ادب کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ پھر ہر افسانہ کے سازوبرگ کی قدامت اور جدت کا خیال رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کتاب میں زورِ بیان اور شیرئی زبان تو موجود ہے، مگر خیالات تمام کے تمام پُرانے ہیں، اگر ہمیں پیری ومریدی کے خلاف آواز بلند کرنی ہے تو اسکی جڑوں پر ضرب لگانی چاہیئے۔ محض ایک پیر کی سیہ کارانہ سیرت نگاری سے مرض دور نہیں ہو سکتا۔ اسکے علاج کے لئے اس سسٹم کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی جس کی ایک شاخ پیری مریدی بھی ہے۔

درسِ عمل

ایک مختصر مسدّس ہے جس کے ناظم میرے قدیم دوست ہادی صاحب مچھلی شہری ہیں۔ نظم کی اساس وہی خیالات ہیں جو حالی اور پیروانِ حالی کے تھے، ماضی کی کہانیوں کو دہرا کر مسلمانوں کو گرمانا اور حال کی تباہیوں کی تصویر کھینچ کر قلب ودماغ کو متاثر کرنا۔ مگر حال یہ ہے کہ ایک طرف مسلمان پہلے سے زیادہ غافل ہو گئے ہیں اور پھر اس "بانگِ درا" کا گلا بھی بیٹھ گیا ہے، بہتر ہے کہ کوئی نیا طرز ایجاد کیا جائے، جدت اور رنگارنگی بہرحال جاذب ہوتی ہے۔ جہاں تک ہادی صاحب کی شاعری کا تعلق ہے تو اس باب میں کچھ عرض کرنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

یہ نظم ہادی صاحب سے الٰہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ حضرت ہادی مچھلی شہری، وکیل الٰہ آباد

سرورِ کونین

مصنفہ مؤلفہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۶ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ چوک درزی بریلی۔ قیمت نامعلوم۔ کتابت وطباعت معمولی۔

یہ کتاب بھی حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کی تصنیف وتالیف ہے۔ سب سے اول بعثت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قبل کی حالت دکھائی گئی ہے، اسکے بعد دوسری قوموں اور مذہبی کتب میں رسول اکرم کی پیدائش وظہور کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں، ان کو یکجا کر دیا ہے اور اسکے بعد پیغمبر اسلام کی سیرت سے بحث کی گئی ہے۔ سب سے آخر میں ہر قوم اور ہر مذہب کے مخصوص افراد کی آرائے اور اعترافات جمع کر دئے ہیں، گو چھوٹی سی کتاب ہے مگر کاوش سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس کو سیرت کمیٹی بریلی نے شائع کیا ہے۔

یادگارِ محشر

کلامِ محشر تمیمی مرحوم۔ مرتبہ اشفاق حسین خاں صاحب گورکھپوری۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۳ صفحے۔ کاغذ، لکھائی چھپائی تمام اجزا اعلیٰ اور نفیس جلد خوبصورت ومضبوط اور سنہری ڈائی سے مزین۔ مصنف کی دو تصویریں بھی زینت کتاب ہیں۔

سب سے اول ہمارے دوست حضرت مجنوں گورکھپوری نے "مرنے والے کی یاد" کے عنوان سے چند صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ اسکے بعد حضرت محشر مرحوم کی مختصر سوانح حیات ان کے باپ غلام مرتضیٰ صاحب نے سپرد قلم کئے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۳۰ تک احباب اور متعلقین کے وہ مضامین اور نظمیں ہیں جو مرحوم کی ذات سے گہری محبت اور عقیدت کو واضح کرتی ہیں، ان نظموں کے بعد ۳۲ سے ۸۴ صفحے تک محشر مرحوم کا کلام ہے، جس کے متعلق اپنے دیباچہ میں مجنوں صاحب فرماتے ہیں :-

"محشر نہ صرف ایک ہونہار طالب علم تھے بلکہ شاعری کا پورا ذوق اپنے اندر رکھتے تھے اور اگر ان کی عمر ان کو فرصت دیتی اور زمانہ ان کی صلاحیتوں کی یاوری کرتا اور وہ خود اپنے ذوق اور صلاحیتوں کی تہذیب و تکمیل کی طرف اسی طرح متوجہ رہتے تو وہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے۔ اس وقت بھی جو مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے اس میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جو نہ صرف بے عیب ہیں بلکہ ایک خاص شاعرانہ اُپج کا پتہ دیتے ہیں . . . .

. . . .

اس کا ماتم جس قدر کیا جائے کم ہے کہ محشر کو زندگی نے اتنا موقع نہیں دیا، کہ وہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو پوری تربیت دے کر ہمارے سامنے لاتے، پھر بھی اتنا بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کر سکے اور ان سے جو کچھ یادگار باقی ہے اسکی عام خصوصیت خلوص اور تاثیر ہے ان کا کوئی شعر صداقت اور اثر سے خالی نہیں ہے۔ ان کے ہر شعر میں کچھ نہ کچھ ندرت و تازگی کے ساتھ ساتھ ایک وہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جو کبھی ریا اور تصنع سے نہیں پیدا ہو سکتی۔"

بلاشک جب اس شعر پر نظر پڑتی ہے کہ

برسے گی آسمان سے فصلِ بہار میں — ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

تو مجنوں کے الفاظ کی زبردست تائید ہوتی ہے۔

یہ بزمِ حسنِ دوست ہے یا تابشِ تمام — ہر ذرّہ آفتاب ہے اس بارگاہ کا

اللہ رے فریبِ تماشائے رنگ و بو — دُنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا

زندگانی ہے ازل کی اک صدائے بازگشت — سُن رہا ہوں میں جیسے وہ دور کی آواز ہے

کچھ احترامِ شیشہ و پیمانہ کیجئے — کہتا ہے چھا کے ابر سیہ خانقاہ پر

ان اشعار کو پڑھ کر جن میں ترقی اور فروغ کے تمام امکانات نظر آتے ہیں، دلی رنج ہوتا ہے۔ اگر ان اشعار کا کہنے والا زندہ رہتا تو دنیائے شاعری میں ایک نہایت اچھے شاعر کا اضافہ ہوتا اور دُنیا جذبات و خیالات سے مستفید ہو سکتی، مگر افسوس کہ وہ ہم میں نہیں ہے اور اب ہمارے لئے صرف یہی چارہ کار ہے کہ اسکی یادگار کو غنیمت جانیں۔ محشر کے کلام پر اصغر گونڈوی کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔

بادۂ فطرت

مصنفہ ابوالفطرت میر زیدی جسے اشرف بکڈپو لاہور نے دو حصّوں میں شائع کیا ہے۔ پہلے حصّہ کا حجم ۱۴۴ صفحات ہے اور دوسرے کا بھی ۱۴۴ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہر حصّہ کی قیمت ۶ر علاوہ محصول۔ کاغذ لکھائی چھپائی معمولی۔

مجھے اپنے دوست زیدی صاحب کی خدمت میں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کو شائع کرنے میں عجلت اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے۔ اگر وہ انتخابِ کلام ایک جلد میں خوبصورتی کے ساتھ شائع کرتے تو اس کا اثر دنیائے شعر و ادب پر اس سے قطعی مختلف پڑتا۔ لیکن اپنا تمام و کمال کلام شائع کر کے انہوں نے اپنی ترقی کو ۱۵ برس پیچھے ڈال دیا ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے۔ اس نمبر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنا مشکل بھی ہے اور غلط بھی، مگر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری میں ترقی اور فروغ کے امکانات ضرور ہیں، لیکن اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ آج ہر شاعر کو سخت احتساب اور فکر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ سامعین اور ناظرین کا مذاقِ شعری، بہت نازک اور ناقدانہ ہو گیا ہے اور کوئی جوہری پرکھ کی اہلیت سے خالی نہیں ہے۔ بازار میں اہلِ نگاہ چل پھر رہے ہیں اور وہ جنس کا مول تول مقابلہ اور ذوق کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔

بادۂ فطرت میں ہر قسم کے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ وطن پرستی، اسلامی خیالات، رومانی تاثرات، غرضکہ شاعر نے کوشش کی ہے کہ کوئی صنف اس سے چھوٹ نہ جائے۔ مزدوری، اور مزدور پر بھی نظمیں ہیں، شاعر اور شاعروں پر بھی نظمیں ہیں، بعض موسموں اور تہواروں پر بھی نظمیں ہیں۔ اور جوانی کے تاثرات بھی بہ حیثیت ایک نوجوان کے مصنّف نے نظم کئے ہیں۔

اکثر نظمیں، موجودہ شعراء کے اندازِ بیان کی تقلید کے طور پر بھی نظر آتی ہیں، مثلاً "نوجوانانِ وطن سے خطاب" میں روشؔ صدیقی کی ایک نظم کا اسلوب پایا جاتا ہے، اگرچہ یہ نظم اس کتاب کی چند اچھی نظموں میں سے ایک اچھی نظم ہے۔

زیدی صاحب کو اپنی ان تمام نظموں پر نظرِ ثانی لازمی تھی۔ کیونکہ اکثر جگہ اغلاط پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

وطن آزاد نہیں ہے، وطن آزاد کریں

"وطن کو آزاد کریں" ہونا چاہیئے۔ لیکن ان اغلاط کے ساتھ ہی اس نظم میں اس قسم کے نادر اور زوردار بند بھی ہیں جن کی تعریف نہ کرنا یقیناً ہٹ دھرمی ہو گی ؎

ہم اگر چاہیں تو گلزار پہ چھا سکتے ہیں
اپنے رستے سے پہاڑوں کو ہٹا سکتے ہیں
اپنے قدموں پہ مقدّر کو جھکا سکتے ہیں
ہم اگر چاہیں تو مزدور کو سلطاں کر دیں

"افسوس تم نہیں ہو" "بھادوں کی برسات میں آجا" قسم کی رومانی نظمیں کافی جاندار ہیں۔ اور میرا ناچیز مشورہ زیدی صاحب کے لئے یہی ہے کہ وہ ابھی رومانی نظمیں ہی لکھا کریں۔ "قومیات" بغیر فکر کے محض بے روح رہتی ہیں، قومی نظمیں کہنے کے لئے جبتک شاعر کی فکر مکمل نہ ہو، ناممکن ہے کہ کوئی تخلیق ہو سکے۔

بہرحال، بہ حیثیت ایک نوجوان شاعر کے ہمارا فرض ہے کہ ہم زیدی کا خیر مقدم کریں اور ان کی ذات سے وہ نیک توقعات قائم کریں جو ایک ہونہار شاعر سے قائم کی جا سکتی ہیں۔

نغمۂ بیداری از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی، قیمت فی جلد ۱۲ آنے۔

یہ ایک مسدس ہے جس میں بہ لحاظ خیالات و شاعری حالی اسکول کا تتبع کیا گیا ہے، لیکن آج بڑا سوال یہ ہے کہ کیا "حالی کا قومی تخیل" کوئی نوعیت رکھتا ہے۔ اور محض مذہب، ماضی یا اسی قسم کے اخلاقی سہاروں پہ مسلمانوں کو میدانِ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ

کئے اسلاف نے جو کام وہی کر تو بھی
ہے مسلمان تو بن خالد و بوذر تو بھی

تو یہ بھی تو سوچئے کہ خالد و بوذر بننے کے لئے کوئی ماحول بھی موجود ہے۔!؟ ایک فوج کو آپ کسی نہ کسی طرح لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں تو اس جنگ کے مقصد سے بھی تو آگاہ کیجئے۔ حاجی صاحب نے یہ تو کہہ دیا کہ

قافلے والوں سے پہلے ترا محمل پہونچے
وہ دن آئیں کہ مسلماں "سرِ منزل" پہنچے

لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ "منزل" مقصود کونسی ہے کیا ہے اور کدھر ہے ——— !!؟
آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ مسلمان کی منزل مقصود کیا ہے، اور کیا ہو سکتی ہے !؟

اسلام نے دنیا میں آکر سب سے بڑا جو اعجاز دکھایا، وہ انسانی آزادی کی بحالی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں۔ توحید کے معنی مسلمان صرف یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ایک ہے، نہیں، انسان بھی ایک ہے، یہ تھا وہ درس جو اسلام نے دیا، اور دنیا میں بڑی حد تک انسانی مساوات قائم کر کے اس نے دکھا دیا کہ وہ کتنے بڑے پیغام کا حامل ہے۔ ہر قسم کی غلامی کو اس نے مٹا دیا۔ اور عالمگیر اخوت انسانی کی تعلیم دی۔ دوسری تعلیم تھی جہاد، یہ روحِ جہاد، صرف جہاد فی سبیل اللہ سے ہی تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس کا بہت بڑا تعلق انسانی دنیا سے ہے۔ ظلم، غلامی، سامراج اور اسی قسم کی قیدوں کے خلاف اسلام نے جہاد کی تعلیم دی۔ اور موقع موقع سے اس کو محدود بھی کیا۔ اسلامی تعلیمات کی یہ دو اہم شقیں تھیں جنھیں مسلمانوں نے خود اپنے ہاتھ سے سپرد زمین کر دیا۔ اور آج کوئی شاعر یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کا سب سے پہلا فرض اس غلامی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے جس نے صدیوں سے ان کو گھیر کر مفلوج و مقید کر دیا ہے اور اس طاقت کے خلاف جہاد کرنا ہے جس نے اس کو غلام بنایا ہے، اسلام کو سب سے بڑا نقصان سرمایہ داری اور غلامی نے پہنچایا۔ آج ضرورت آپڑی ہے کہ مسلمان اگر اسلام کو پھر اسکی اصلی صورت میں زندہ اور بحال کرنا چاہتے ہیں تو وہ اول اپنی اجتماعیت کے رگ و ریشے سے سرمایہ داری کے فاسد خون کو نچوڑیں اور اس کے ساتھ سامراجی قوتوں کو فنا کرنے کے لئے اٹھیں۔

اس جد و جہد میں ان کو جس کی امداد کی ضرورت ہو، اس کی امداد حاصل کریں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے راہِ عمل بالکل کھلی ہوئی ہے اور وہ صاف و روشن راہِ عمل صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نڈر ہو کر کانگریس سے متحد ہو کر دنیا میں انگریز کی قوت کو مٹا دیں، تاکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی یورپ کے سامراجی پنجہ سے آزاد ہو جائے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ مسدس اچھا ہے، مگر اب اس قسم کی نظمیں اگر فکر سے خالی ہوں گی تو اپنا اثر قائم نہیں کر سکتیں۔ نعض اوٹ پٹانگ توعیظ کا زمانہ بیت گیا۔

التحقیق الجدید علیٰ تصنیف الشہید

مصنفہ حافظ حکیم عبدالشکور صاحب مرزا پوری۔ ناشر سید اشارت علی صاحب مالک دارالتالیف والاشاعت اندرکوٹ شہر میرٹھ۔

پختہ قیمت ایک روپیہ۔ چھپائی۔ کاغذ۔ کتابت۔ خوبصورت و متوسط۔

یہ ۲۰ × ۲۶ سائز پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" مولانا محمد اسمٰعیل شہید حنفی محدث دہلویؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ اور نہ صرف یہ انکار ہے۔ بلکہ محرّف و غیر معتبر بھی ہے۔

دیباچہ کے بعد حضرت شہید کی تصانیف کی فہرست ہے۔ بعدہٗ ان میں سے بعض کا اجمالی تذکرہ، اور اسکے بعد جن چار کتابوں پر شبہ ہے ان کا تذکرہ ہے۔ اور مؤلف کا دعویٰ ہے کہ صراطِ مستقیم۔ تنویر العینین۔ ایضاح الحق اور تقویۃ الایمان مولانا شہید کی تصنیف نہیں ہیں۔

مذہبی مباحث مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب دلچسپ ثابت ہو سکتی ہے۔

جوئبار

مصنفہ بھیم سین صاحب ظفر ادیب ناظم انجمن اربابِ ادب ملتان (چھاؤنی)

کاغذ۔ کتابت۔ طباعت نفیس و اعلیٰ۔ ملنے کا پتہ۔ قصر اردو ملتان (چھاؤنی) قیمت ایک روپیہ۔

جوئبار ظفر صاحب کی نظموں۔ گیتوں۔ اور غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے سب سے اوّل انتساب ہے۔ اس کے بعد مصنف کی تصویر۔ تصویر کے بعد اعتراف۔ اعتراف کے بعد ہمارے ایک ماہر اقتصادیات دوست ق۔ م راشد ایم۔اے کا مقدمہ ہے۔ اور اس کے بعد احسان دانش صاحب کا تعارف نامہ۔

سب سے پہلے جو چیز ظفر صاحب کی شعریت پر دلالت کرتی ہے۔ وہ انتساب ہے جو انکی صحیح نسبت کا پتہ دیتا ہے۔ اور جسے اُنہوں نے اپنی شاعری کے موضوع کے نام معنون کیا ہے۔

اعتراف بھی ظفر کے مشتعل احساس پر دلالت کرتا ہے۔ اور نہایت برمحل ہے۔ ہم ہر شخص سے لامحدود توقعات قایم کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی غور نہیں کرتے کہ وہ جو کچھ اور جتنا کر رہا ہے۔ وہ کس ماحول میں کر رہا ہے۔؟ ظفر کا اعتراف اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ نہایت نامساعد حالات میں انہوں نے اپنے ذوقِ شاعری کو جاری رکھا ہے۔ اور ہمیں ان کی شاعری میں ان اثرات کو دیکھنا چاہیئے۔ جو انکے ماحول کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔

آخر میں ظفر صاحب نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے جوئبار کی نظموں پر اصلاح دی ہے۔ لیکن خدا معلوم ان کو معنی آفرین الفاظ کیوں نہ ملسکے۔ ان سطور سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے حالانکہ مطلب کچھ اور نہیں ہے۔

ہمارے دُور افتادہ اور فراموش کار دوست راشد صاحب گو ماہر اقتصادیات ہیں۔ لیکن حقیقی طور پر وہ اقتصادی ہی نہیں شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ اور جوئبار پر جو سطور بطورِ مقدمہ راشد صاحب نے سپرد قلم فرمائی ہیں۔ وہ نہایت قیمتی ہیں۔ اور ان کے بلند و نازک ذوقِ تنقید پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ظفر کی نظموں کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس مجموعہ میں اوّل الذکر قسم کے خیالات کا ہلکا ہلکا اثر بھی ہے۔ اور قدیم غزل گوئی کسی قدر اپنا چولا بدلکر بھی اپنا حسن دکھا رہی ہے۔ بیشک ظفر کی شاعری میں مقصد کی وحدت نہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ آنے والی نسلوں کی نسبت اپنے

پیشروؤں سے زیادہ قریب ہیں۔ پھر بھی ایک قسم کا وجدان انکی ہر نظم کا محرک ہے۔ ان کی ہر نظم میں زندگی کے ساتھ وسیع عشق کا ثبوت ملتا ہے۔ جو خود کہیں منہ چھپائے آہنگ و ترنم کے تاروں کو لرزا رہا ہے۔"

میں راشد کے لفظ لفظ سے متفق ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلقی طور پر ظفر کا مزاج رومانی واقع ہوا ہے۔ ان کا تمام مجموعہ دیکھنے کے بعد میری رائے یہی ہے۔ کہ "وہ خیالات اور عقائد" کے شاعر نہیں۔ بلکہ عشق و محبت کے شاعر ہیں۔ اور رومانیت سے انکے مزاج شاعرانہ کا خاص تعلق معلوم ہوتا ہے۔ راشد نے بالکل بجا لکھا ہے۔ کہ:-

"فکر کا ارتقا ان کی شاعری کے لائحہ عمل میں نہیں ہے۔ وہ چند تصویریں پیدا کر کے ایک لرزتا ہوا تار۔ ایک مجموعی تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔"

اسکے علاوہ ایسا نہیں ہے۔ کہ انکی نظموں میں خلوص نہیں پایا جاتا۔ آگے چل کر راشد صاحب کہتے ہیں۔ کہ:-

"اس مجموعہ میں غزلیات کی بھی کمی نہیں۔" ظفر صاحب نے بھی اپنے پیشروؤں سے اپنی غزلوں کا مخصوص نظام ورثے میں پایا ہے لیکن انکی غزل میں محبسوں کی سی سختی نہیں۔ بے شک وہ اپنے محدود چوکھٹے سے باہر نکلنا چاہتی۔ دوڑتی نظر نہیں آتیں لیکن جھانکتی اور زندگی پر مسکراتی اور لسیورتی ضرور ہیں۔

انکی غزلوں میں ان ذہنی بیماریوں کا پتہ نہیں۔ جو داغ سے پہلے کی نسل کے شاعروں کے جنسی انحرافات نے ہمارے ادب میں پھیلا رکھی تھیں۔ ان کا ذہن جوانوں کی طرح توانا ہے۔"

راشد نے ان کے مختصر سے مجموعہ پر کافی گہری نظر ڈالی ہے۔ خود میری رائے یہ ہے کہ ظفر کا تخیل بیحد غزل پسند ہے اور اسکی وجہ غالباً ان کی "فطری رومانیت" ہے۔ وہ اگر غزل کی شاعری کی طرف توجہ کریں۔ تو اس میں شاید نظموں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں

مری رندی کا مقصد بیخودی ہے ۔۔۔۔ پلا دے یا یونہی مدہوش کر دے

ہر ذرہ ہے جہانِ تماشا لئے ہوئے ۔۔۔۔ چشم حجاب سوز ہے درکار اے ظفر

عاشقی اب گراں نہ ہو جائے ۔۔۔۔ زندگی ہو چکی تباہ ظفر

مگر اک نغمۂ نو کو ڈھونڈتا ہوں ۔۔۔۔ دبا ہے دل میں نغموں کا تلاطم

الٰہی حسن کو بھی عشق کے قرینے دے ۔۔۔۔ بدل رہی ہیں امیدیں تصورات کا رنگ

ان اشعار میں کافی جان اور کافی کیف ہے۔ یہ روح اور یہ کیف انکی غزل کے مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ رومانی نظموں میں صفحہ ۶۱ پر "وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے" کا اسلوب نہایت مترنم اور دلنواز ہے۔ یہ نظم بہت خوب ہے۔

بہر حال ظفر صاحب اس درجہ کے شاعر نہیں ہیں کہ ہم ان سے مایوس ہو جائیں۔ ان کی شاعری کی موجودہ روش جو زمانے کے تقاضات سے متاثر ہے۔ ہمیں توقعات قائم کرنے کا حق دیتی ہے۔

راشد صاحب کے مقدمہ کے بعد احسان دانش صاحب کا تعارف نامہ ہے اس میں وہ صفحہ ۲۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ جناب ساغر سیمابی (۱۹!) نے جناب جوش ملیح آبادی اور جوش ملسیانی اور دیگر حضرات کی موجودگی میں بسلسلۂ گفتگو فرمایا تھا۔ کہ شاعر بطنِ مادر سے شاعر پیدا ہوتا ہے اور اُسے اُستاد کی ضرورت نہیں ہوتی"

مجھے ان کے پہلے فقرہ سے اتفاق ہے۔ اور دوسرے سے اختلاف ہے۔ کیوں کہ میں نے کئی حضرات کو ایسا پایا ہے کہ انہیں فطرت کی طرف سے ذوقِ شعری عطا ہونے کے باوجود شاعر بننا نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ اپنے محدود حلقے تک "ہم چو ما دیگرے نیست" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ لیکن وہ حقیقی شعراء کی صف میں شامل ہونے کے اہل نہیں۔

جوئبار پر اظہار رائے کرنے کے سلسلے میں یہ بڑی دلچسپ بحث پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس ذکر کا محل کیا تھا۔ اور جناب احسان نے اس کو کیوں چھیڑا۔ ۱۹۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔

"بہم سین ظفر میں فطری شاعری کے آثار کی فراوانی دیکھکر میں نے پوچھا کہ تم اصلاح کس سے لیتے ہو۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے۔ پھر دبی زبان سے فرمایا۔ کہ اول تو کسی سے اصلاح لی نہیں۔ اور اگر ایک دو حضرات سے مشورہ لیا بھی تو میرے ذوق کی تشنگی بجھ نہیں سکی۔ آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ ازراہِ ادب نوازی میری رہنمائی فرمائیں"

آخر میں تعارف نامہ "اب دعا کے لئے اُٹھاؤ ہاتھ" پر اس طرح ختم ہوتا ہے کہ:۔

"میری دُعا ہے کہ خدا اس نوجوان کی اس ادبی کاوش کو اہلِ نظر طبقے میں مقبول کرے۔

والسلام"

۳۵

یعنی اس تعارف نامہ سے صرف مقصود یہ تھا کہ ظفر صاحب احسان دانش صاحب کے شاگرد ہیں۔ بجائے اس کے کہ جس طرح راشد نے نہایت قابلیت کے ساتھ بحیثیت نقاد اس کی شاعری کی زرّین اور کامیاب الفاظ میں تحلیل و تنقید کی تھی۔ احسان صاحب نے صرف یہ کافی سمجھا کہ اپنی نسبت کا اظہار کر دیں۔

شاعری میں شاگردی اور اُستادی کے متعلق میں نے تو صرف ایک فقرہ ہی کہا تھا۔ لیکن اس جلسے کے ایک حاضر شاعر و ادیب جناب جوش ملیح آبادی نے دیوانگانِ شاعری کے حملوں سے متاثر ہو کر۔ کلیم میں کئی صفحے اس موضوع پر تحریر کئے ہیں۔ یہاں ان کو نقل کرنا یقیناً برمحل ہوگا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا ذاتی تجربہ کی بنا پر کہا تھا اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ شاگردی و اُستادی کا مسئلہ اعتقادی نہیں بلکہ "اقتصادی" ہے۔ (ماہرِ اقتصادیات داد دیں!) ہندوستان میں جو شاعر یہ ڈھونگ رچائے ہوئے ہے وہ اپنی ٹولی بنانے اور جلبِ منفعت کے اس ذریعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کا قائل ہے ورنہ شعر میں کوئی کسی کا اُستاد نہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے "کلیم" مطبوعہ جنوری ۱۹۳۹ء میں اس مسئلے پر تحریر فرمایا ہے کہ:۔

(۱) میرا کوئی "حلقۂ تلامذہ" نہیں ہے۔ شاگرد بنانے کی طرح میں نے اب تک کسی کو بھی شاگرد نہیں بنایا ہے۔

شاگردی اور اُستادی اپنی مروّج اور معروف حیثیت سے، میرے نزدیک، ایک قابلِ مضحکہ حد تک مہمل بات ہے۔

شاعر پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا — شاعری وہبی چیز ہے۔ اکتسابی نہیں — اور جو شے ناممکن الاکتساب ہے، اُس کے کسب کرنے کی خاطر کسی قسم کی سعی، یا کسی اُستاد کی خدمات حاصل کرنا ایک بے معنی سی بات ہے — یہی وجہ ہے کہ ہمارے بھولے ہندوستان کے علاوہ یہ شاگردی اور اُستادی کی ناکارہ رسم، دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائی جاتی ہے۔

وہ شخص جسے عظیم قدرت نے شاعر بناکر نہیں پیدا کیا ہے، اگر تمام عالم کے سرمایہ داروں کے خزانوں کا ایک سکّہ سکّہ اور تمام روئے زمین کے اُستادوں کے قوائے شاعری کی ایک ایک قوّت اس پر صرف کر دی جائے، پھر بھی قطعی طور پر امکان سے خارج ہے کہ وہ شخص شاعر بنا دیا جاسکے جب صورتِ حال اس حد تک یاس انگیز ہے، تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ لوگ کسی کی شاگردی کیوں قبول کرتے ہیں — اور اس سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ اُن "شعرائے کرام" پر جو اپنے ناتجربہ کار نوخیزوں کو اپنے "حلقۂ تلامذہ" کے فریب میں داخل کرکے، اپنے "جہاں استاد" اور "جگت گرو" ہونے کا ڈھول پیٹا کرتے ہیں۔

"استاد" بننا اور اپنی استادی کے ڈھول پیٹتے پھرنا کیسی عامیانہ بےشعوری ہے — کیا بےشعور آدمی، شاعر ہوسکتا ہے؟ بہت ممکن ہے بعض قدامت نواز احباب جو شاگردی، اُستادی کی رسم سے بہت مانوس ہوچکے ہیں۔ اور جو، ہر قدیم شے کو کلیجے سے لگائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس رسم کہن کو بحال رکھنے کی خاطر یہ ارشاد فرمائیں کہ اس میں تو ہمیں بھی شک نہیں کہ اُستاد کسی غیر شاعر کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ لیکن اتنا تو ضرور کرسکتا ہے۔ کہ شاگرد کو فنّی اور لسانی نکات سے بہرہ ور کرکے اُس کے طرزِ بیان کو پختگی و شیرینی سے ہم آغوش کردے۔

بیشک میں اسے تسلیم کرتا ہوں، اور اس بات کو مانتا ہوں، کہ اگر کسی شاگرد کو ایک ایسا معقول اُستاد مل جائے۔ جو زبان و فن پر کامل دستگاہ رکھتا ہو۔ تو وہ فنّی اور لسانی امور پر، دوسروں کی بہ نسبت، جلد عبور حاصل کرسکتا ہے — لیکن افسوس کہ متذکرۂ بالا امر کے تسلیم کرلینے کے بعد بھی میں کسی کو کسی کا شاگرد ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ اس فنّی ولسانی لیاقت حاصل کرنے میں شاگرد کو جو نقصان پہونچتا ہے، مرتے دم تک اس کی تلافی نہیں کی جاسکتی۔ وہ نقصان کیا ہے میں عرض کرتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ ہر شاعر، خصوصیت کے ساتھ، ایک انفرادی تخیّل، ایک انفرادی تفکّر، ایک انفرادی سیرت و شخصیت، ایک انفرادی طرزِ بیان و طرزِ فکر، اور ایک انفرادی مزاج لیکر اس دنیا کے مطلع پر طالع ہوتا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی و اساسی اہم ترین شے ہے۔ کہ اگر اسے درمیان میں چھیڑا اور چھوا نہ جائے۔ تو یہی شے، یعنی شاعر کی یہی انفرادیت آہستہ آہستہ کمانی کی طرح کھُلکر، اُسے شاعرانہ مجلس میں ایک امتیازی مقام اور ایک منوّر شخصیت کا مالک بنا دیتی ہے — لیکن نہایت قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ شاگردی استادی کی رسم سے شاگرد کی اسی بنیادی خصوصیت کو شدید ترین اور ناقابلِ تلافی نقصان پہونچتا ہے۔ اور "استاد" "شاگرد" کی اس انفرادی روح کو ایک نامعلوم و ہیبتناک تسلسل کے ساتھ ہمیشہ چھیڑتا، چھوتا، کاٹتا، چھانٹتا اور توڑتا مروڑتا رہتا ہے۔

شاگرد کی انفرادی روح کو چھیڑنا قتلِ عمد کے برابر جرم ہے۔ لیکن ہم اس مجرمانہ مشق پیہم کے باوجود استاد پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، کیوں کہ اس مجرمانہ مشق پیہم پر وہ فطرت کے قوانین کی بنا پر مجبور و مامور ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ شاگرد کی طرح اُستاد بھی قدرت کی طرف سے ایک خاص انفرادی تخیّل، ایک خاص انفرادی تفکّر، اور ایک خاص انفرادی طرزِ بیان وغیرہ لیکر پیدا ہوتا ہے، اور جب وہ شاگرد کو اصلاح دینے بیٹھتا ہے۔ تو یہ ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادی روح ہی کے تحت اصلاح دیتا ہے، کیوں کہ صرف وہی نہیں، بلکہ دنیا کا کوئی شخص بھی اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنی ذات کو اپنی انفرادیت سے علیٰحدہ کرسکے — جس کے یہ معنی ہیں کہ اُستاد جس وقت شاگرد کے کلام پر اصلاح دیتا اُس کے مصرعے یا شعر کاٹ کر، اپنے مصرعے اور اپنے اشعار و الفاظ داخل کرتا ہے۔ تو وہی ایک ایسا بظاہر دل خوش کُن اور بباطن خطرناک لمحہ ہوتا ہے، جس وقت استاد کی انفرادی روح، شاگرد کی انفرادی روح پر ابرِ غلیظ کی طرح مسلّط ہوکر اُسے دُھندلا کرتی ہوتی ہے۔ اور انہیں لمحوں کی تکرار آخر کار وہ منحوس گھڑی لے آتی ہے۔ کہ استاد کی انفرادیت کی مسلسل و مستقل یورشوں سے پامال ہوکر،

شاگرد کی انفرادیت قطعی طور پر مفقود و معدوم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی انفرادیت کی دولت سے محروم ہو کر ایک طرف تو شاگرد استاد ہی کے دماغ سے سوچتا، استاد ہی کے قلم سے لکھتا۔ اور اُستاد ہی کی زبان سے بولنے لگتا ہے —— اور دوسری طرف استاد شاگرد کی انفرادیت کی لاش کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔ اور اُس لاش کی نمائش کر کر کے مخلوق سے داد کا خراج حاصل کرتا رہتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی اچھا سودا ہے؟ میں دریافت کرتا ہوں۔ کیا یہ کوئی مفید کاروبار ہے۔ کیا واقعی چند فنّی و لسانی قواعد کو حاصل کرکے اپنی عظیم الشان انفرادیت سے دستبردار ہو جانا کوئی عاقلانہ تجارت ہے۔

ممکن ہے اس موقع پر کوئی اُکتا کر یہ پوچھ بیٹھے کہ پھر کیا کیا جائے۔ اس "پھر کیا کیا جائے" کا جواب سُننے سے پیشتر پہلے ایک خاص علمی مسئلے کو سمجھ لیجئے۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری اس حیرتناک دنیا میں کوئی ایک شے بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کا صرف ایک ہی رُخ ہو۔ بلکہ اس کے برخلاف اس دنیا کی ہر شے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اور ہر شے کے اندر بوقت واحد خیر و شر اور سُود و زیاں دونوں کے عناصر موجود ہوتے ہیں —— یعنی ہماری اس عجیب و غریب دنیا میں ایک شے بھی ایسی نہیں پائی جاتی۔ جو سراسر خیر یا سراسر شر پر مبنی ہو۔ اور ایک چیز بھی ایسی موجود نہیں ہے، جو سراسر سُود یا سراسر زیاں کی حامل ہو۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہر چیز میں کچھ خیر کا عنصر ہوتا ہے، کچھ شر کا۔ کچھ سُود کے عناصر ہوتے ہیں۔ کچھ زیاں کے۔

بہ الفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ اشیائے عالم کے رحم میں کبھی اور کسی حالت میں بھی ایک نہیں، بلکہ دو بچے ہیں۔ جن میں سے ایک کو خیر یا سُود کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو شر یا زیاں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اور اسی کے دوش بدوش اس بات کو بھی ذہن کی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجئے، کہ اشیائے عالم کی متذکرہ صورت حال کے باوجود اس کارخانۂ عالم میں "زشت و خوب" اور "مفید و مضر" کے امتیازی الفاظ بھی موجود ہیں۔ اور اسی زشت و خوب اور مفید و مضر کی نسبت سے بعض چیزوں کو بعض پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اور بعض چیزوں کو اچھا اور بعض چیزوں کو بُرا کہا جاتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اشیائے عالم میں سے ایک شے بھی خالصتہً مفید اور خالصتہً مضر نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم ان حاملِ اضداد اشیا میں سے بعض کے اختیار و انتخاب پر اپنے کو مجبور بھی پاتے ہیں۔ تو اس وقت ہمارے واسطے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔ کہ ہم تمام اشیا پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالیں اور ہر شے کو انتہائی دیدہ دری کے ساتھ ادراک کے کانٹے پر تول کر یہ پتا چلائیں۔ کہ کس چیز میں خیر کا عنصر زیادہ ہے۔ اور کس میں شر کا —— اور اس تحلیل و تحقیقات کے سلسلے میں جن اشیاء کے متعلق ہمیں یہ علم ہو جائے۔ کہ ان میں خیر یا سُود کا عنصر نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ اُنہیں کو آخر کار اختیار کرلیں۔

اگر یہ سلسلۂ عمل صحیح ہے۔ تو اسی کی روشنی میں استادی اور شاگردی کی رسم پر نگاہ ڈالئے، اور خود ہی فیصلہ کیجئے، کہ اس میں فائدہ زیادہ ہے کہ نقصان؟

فائدہ تو اس رسم میں، جیسا کہ ہر بُری سے بُری شے میں بھی ہوا کرتا ہے۔ صرف اس قدر ہے کہ اُستاد کی امداد سے بشرطیکہ اُستاد معقول و متبحر بھی ہو، شاگرد، دوسروں کے مقابلے میں فنّی و لسانی نکات پر جلد عادی ہو جاتا ہے۔

اور نقصان اس رسم میں یہ ہے کہ شاگرد اپنی انفرادی شخصیت و حیثیت، اپنے انفرادی تفکّر و تخیّل، اپنے انفرادی رنگ، اور اپنے انفرادی طرزِ کلام سے کلیتہً محروم ہو کر استاد کی ایک ایسی تربیت یافتہ سواری بن جاتا ہے۔ جس پر ذہنی و جسمانی دونوں حیثیتوں سے اُستاد چڑھا

چڑھا پھرتا ہے۔

میں دوبارہ پوچھتا ہوں۔ کیا یہ کوئی مفید تجارت ہے۔ کیا یہ کوئی عاقلانہ کاروبار ہے؟

جو شخص کندن دیکر پیتل اور موتی دیکر مونگا خریدتا ہے۔ کیا کوئی ذی عقل انسان اُسے ایک ہوشیار تاجر کا خطاب دے سکتا ہے اور کیا غریب شاگرد، اسی قسم کا تاجر نہیں ہوتا۔

اب رہی یہ بات کہ اگر کسی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ نہ کیا جائے، تو پھر زبان اور فن کی باریکیاں کیونکر معلوم کی جائیں۔

اس کا ایک، کسی حد تک باغیانہ، جواب تو یہ ہے کہ شاعر پہلے پیدا ہوا ہے۔ اور زبان و فن بعد کو ــــ اگر کوئی شخص حقیقی شاعر ہے تو اُسے نہ تو فن کی پروا کرنا چاہیئے، نہ زبان کی۔ جب وہ مرجائے گا۔ تو وہی غلطیاں جو اُس نے کی ہیں۔ ایک دن خود فن اور زبان کا خطاب حاصل کرلیں گی۔

اور دوسرا کسی حد تک مصالحانہ جواب یہ ہے۔ کہ ہر نوعمر کو، جسے شعر کہنے کا شوق ہے، ایسے حلقوں میں نشست و برخاست کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ جہاں اربابِ زبان وفن کا اجتماع اور جہاں فنّی ولسانی مباحث پر اظہار خیال ہوتا رہتا ہو ــــ اور اسی کے ساتھ ساتھ علی الاتصال ایسے لٹریچر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جن سے فنّی ولسانی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح ایک طرف تو فنی ولسانی بصیرت بے منتِ غیرے پیدا ہوجائے گی۔ اور دوسری طرف اس عظیم الشان انفرادیت کا بھی خون نہیں ہوسکیگا۔ جو شاعر کی تنہا بنیاد، بلکہ اُس کی جان ہے۔ ("اشارات" مطبوعہ کلیم جنوری ۱۹۳۹ء)

از حضرت جوش ملیح آبادی

شاعری میں استادی وشاگردی کی تکذیب اور تردید کے لئے یہ سطور میرے خیال میں کافی ہیں۔ لیکن اس پر بھی اگر استاد کی ضرورت احسان صاحب کو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ تو مجھے اصرار نہیں۔ البتہ نوجوان نسل اور جدید شاعری کا نیا تقاضہ و نظریہ تو یہی ہے۔ جسے اوپر نقل کیا گیا۔

لیکن بہرحال ظفر صاحب کی نظم وغزل میں کافی جان ہے۔ اگر انہوں نے خوداعتقادی وخوداعتمادی کو مشعلِ راہ بنایا، اور اپنی رُوح وُدل کو خود ہی تیار کیا، اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کو خود ہی وسیع کیا تو مجھے یقین ہے کہ منزلِ مقصود ان سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔

اربعہ عناصر

بہ سلسلۂ تصانیف ناہر نمبر ۲۳ مصنفہ حکیم محمود علی خاں ناہر اکبرآبادی سائز $\frac{18 \times 22}{32}$ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ فراش خانہ دہلی۔ مجلد۔

یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے۔ جو ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس میں ۱۸۴ رباعیات مختلف مضامین اور عنوانات پر ہیں۔ حمد، نعت، مناجات، خوفِ الٰہی، حقائق و معارف، عبرت و موعظت، درس و پیام، پند و نصائح دنیا۔ زندگی، خدمتِ خلق، جذبات، رندی وسرمستی، وطنیت، طلبا کے نام، طب وحکمت، سرمایہ ومزدور، کسان ومزدور۔

آخر میں متفرقات کے عنوان سے بھی کچھ رُباعیاں ہیں۔ اس کے بعد مصنف کی تصویر ہے۔ تصویر کے نیچے جو رُباعی ہے۔ اس قسم کی غیر جذباتی تعلّی کی رُباعی نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ "۸۶" کے بعد ایک رباعی ہے۔ جس میں بیک وقت حمد اور منقبت دونوں ہیں۔ اور ایک قسم کے سجع کے ساتھ ہیں۔ مگر جذبہ نہیں ہے۔ رُباعی فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے ایک خاص صنفِ کلام ہے۔ اور جب اسکے خلاف اس کا استعمال ہوتاہے۔ سماعت کو گراں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد چار دیباچہ ہیں۔ سب سے اوّل مولانا سیماب اکبرآبادی کا دیباچہ ہے۔ اس کے

بعد حکیم آزاد انصاری کا دیباچہ پھر حضرت جوش کا دیباچہ اور سب سے آخر میں قابل صاحب گلاوٹھی کا دیباچہ ہے۔

سیماب صاحب نے رباعی کے موضوع پر اختصار کے ساتھ فنی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن غالباً وہ یہ بھول گئے کہ قاآنی اور خواجہ حافظ کے مقابلے میں ابن یمین رُباعی میں زیادہ مشہور ہے۔ ماہر صاحب کی رباعیات کے متعلق انکی رائے ہے کہ:

"ماہر صاحب کی رُباعیات میں وہی برجستگی پائی جاتی ہے۔ جو صنفِ رُباعی کے لئے ضروری ہے۔"

حکیم آزاد انصاری صاحب کا دیباچہ خالص مدح گوئی ہے۔ البتہ یہ مدح ماہر صاحب کے کل شعروادب سے ضرور تعلق رکھتی ہے مگر رُباعی اور اس کے متعلقات پر کم روشنی ڈالتی ہے۔ جوش صاحب نے بطور "تبرک" چند سطور تحریر فرمائی ہیں۔ جنکا لب لُباب یہ ہے کہ:

"حکیم صاحب کی رُباعیوں کا یہ مختصر سا مجموعہ میں نے جستہ جستہ پڑھا۔ اور یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے جس رُباعی پر نظر ڈالی اسے مطبوع و دلپذیر پایا۔"

ان آراء کے نقل کردینے کے بعد کوئی گنجائش رہ نہیں جاتی ہے۔ جس قدر یہ حضرات ماہر صاحب کے کلام کے فریفتہ ہیں میں بھی ہوں۔ اربعۂ عناصر میں جو رُباعیات ہیں وہ اپنے موضوع اور عنوان کی مکمل نمایندگی کرتی ہیں۔ زندگی اور معاملاتِ زندگی کے متعلق ماہر صاحب کا نقطۂ نگاہ بالکل قدیم اور روحانی ہے۔ اسی کے لحاظ سے ان کے خیالات انہیں اخلاقیات کی صدائے بازگشت ہیں جنہیں ساونتی تمدن و تہذیب کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔

ان اخلاقی رُباعیات کے ساتھ ساتھ "رندی و سرمستی" کے باب میں ماہر صاحب نے جن "حقایق" کو نظم کیا ہے۔ وہ ان "اخلاقیات" سے بالکل مختلف شے ہیں۔ جو دوسرے ابواب میں پائے جاتے ہیں۔ گویا اس طرح ایک "تضاد" پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "اربعۂ عناصر" میں سب بابوں سے زیادہ گرم یہی باب ہے۔ اس کے بعد "سرمایہ داری و مزدور" کے موضوع پر رباعیاں ہیں جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مختلف ابواب سے چند رُباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

حقایق و معارف

مایوس نہ ہو شکستہ کاشانوں سے — مغموم نہ ہو کھلے بیابانوں سے
ایسے بھی کچھ انقلاب آجاتے ہیں — ویرانے بدل جاتے ہیں ایوانوں سے

میں کیا اثرِ نیم نگاہی لے لوں — یا لذتِ کیفِ بیگناہی لے لوں
فرصت مجھے اس کسل کدے میں ماہر — اتنی بھی نہیں کہ اک جماہی لے لوں

جذبات

خضر اپنی مجھے حیات بھی دے تو نہ لوں — فطرت سندِ نجات بھی دے تو نہ لوں
اک دردِ محبت کے عوض میں ماہر — کوئی مجھے کائنات بھی دے تو نہ لوں

رندی و سرمستی

صوفی نے تمام خانقاہیں لے لیں | منعم نے تمام بارگاہیں لے لیں
دنیا میں ہمارے لئے جب کچھ نہ بچا | ہم نے بھی گناہوں کی پناہیں لے لیں

"وطنیت" کے عنوان سے جو رُباعیاں ہیں۔ ان کا عنوان محض "وطن" ہونا چاہیئے تھا۔ یا "حُبّ وطن" اس لئے کہ وہ تمام صنائع کے وطن محض اگرچہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ نفس وطنیت سے نہیں۔

سرمایہ داری کے باب میں "خان صاحب" قطعی اشتراکی معلوم ہوتے ہیں۔

باقی رہے اُمید نہ لاحق ہے بیم | سائل کوئی کہلائے جہاں میں نہ کریم
تخصیص کو تعمیم کی صورت بخشو | کردو زر و سیم سب مساوی تقسیم

قدرِ اہلِ زماں برابر کردو | حالِ شاہ و گداں برابر کردو
پستی نظر آئے نہ کسی جا رفعت | اُٹھو سطحِ جہاں برابر کردو

ہو عقدہ کوئی، عقدہ کشا ہے مزدور | ہو کام کوئی کا مروا ہے مزدور
اسے ایک خدا کا نام جپنے والو | اس دہر کا دوسرا خدا ہے مزدور

ان رُباعیوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانہ کے تقاضات کس قدر وسیع ہوگئے ہیں۔ اور کوئی ذی حس شخص ان سے انکار کرنے کی جرأت کر نہیں سکتا۔ خواہ وہ دارالسلطنت کا خان صاحب ہی کیوں نہ ہو۔ ان دونوں ابواب میں تقریباً تمام رباعیاں خوب ہیں۔ اور ان اخلاقیات کی کافی تلافی کردیتی ہیں۔ جو صدیوں کے فرسودہ ہیں۔ اور جن پر اب کم از کم نظرِ ثانی کی تو ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔

لیکن بہر حال رُباعیات کا یہ مجموعہ ہر لحاظ سے پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ اور میں اپنے دوست کو اسکی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ساغر

مولویت اور اسلام

از حاجی نبی احمد بریلوی - قیمت ۴ر

یہ ایک رسالہ ہے جس میں مصنف نے مولویت کے خطرات عظیم سے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے - طرزِ تحریر نہایت خوشگوار اور مدلل ہے - یوں تو آج کل ہر ذی ہوش اور تعلیم یافتہ شخص مولویوں کے فتووں سے آگاہ ہو چکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض طبقوں میں ابھی تک مولویت کی تجارت کا بازار گرم ہے - اس فریب کو دور کرنا قومی خدمت ہے اور حاجی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب ہوئے ہیں - کاش اس رسالہ کی ایک کاپی ہر مولوی کی نظر سے گذرتی تاکہ وہ اس طبقہ کو جس کو مولانا نیاز فتحپوری نے سانپ سے مشابہت دی تھی واضح ہو جائے کہ ان کے زہر کا اثر اب نہیں رہ سکتا - کیونکہ عقل اور خوش مذاقی کا تریاق اس زہر کیلئے کافی ہے -

واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مولویت منافی ہیں - اسلام نے توہمات .... کے خلاف علم بلند کیا - لیکن جس وقت سے کہ مادّیت کا اسلام میں اثر شروع ہوا اسلام پر ترقی کے دروازے بند ہو گئے - موجودہ دور میں ترکی نے اس وقت تک ترقی نہیں کی جبتک مولویت کو داستانِ پارینہ نہیں بنا لیا گیا -

کیا ہندوستان کے مسلمان سبق سیکھیں گے -

ہم حاجی نبی احمد صاحب سے درخواست کرینگے کہ وہ بجائے "گائے کانفرنس" کی قسم کے رسالہ میں تضیع اوقات کر کے مولویت اور اسلام کی قسم کے رسائل و کتب لکھیں تاکہ ان کی تصانیف سے قومی و معاشرتی فائدے کی صورت نمودار ہو -

---

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل

از میاں بشیر احمد بی-اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا مدیر ہمایوں لاہور -

کتابت و طباعت نہایت نفیس - حجم ۷۶ صفحات - قیمت ۴ر

یہ ایک مقالہ ہے جو میاں بشیر احمد صاحب نے لکھا ہے - مقالہ کی ماہیت نام سے ظاہر ہے اور اس کا منتہا جاننے کیلئے غالباً یہ کافی ہے کہ موصوف مسلم لیگ کے حامی اور علمبردار ہیں - ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ وہ مسلمان جو کام کرنے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہیں مسلم لیگ میں شریک ہو کر اپنے کو کسی کام کا باقی نہیں رکھتے -

مقالہ میں مسلمانوں کی ۱۳ صد سالہ تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے - اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ریگستانِ عرب سے نکل کر اسلام نے ایک عالمگیر انقلاب کی بنا ڈالی اور دُنیا کا ہر ذی ہوش شخص جس نے تاریخ کا ذرا سا بھی مطالعہ کیا ہے ایم این رائے کے الفاظ میں یہ ماننے کے لئے مجبور ہے کہ "اسلام کے انقلاب نے نوع انسان کو بچا لیا" جناب بشیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی سے اس امر کو واضح کیا ہے کہ دُنیا کے تہذیبی ارتقا میں اسلام کا حصّہ نہایت مہتم بالشان اور دور رس رہا ہے -

مقالہ کا وہ حصّہ جو اسلامی تاریخ سے متعلق ہے نہایت غور و خوض، وسعتِ نظر اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ زیرِ نظر مقالہ کا یہ حصّہ جو تقریباً نصف کتاب پر مشتمل ہے ہر شخص کے لئے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا

لیکن حیرت ہے کہ مصنف موصوف جیسے ہی ہندوستان کے "سیاسی مدّ و جزر" کا قصّہ بیان کرنے لگتے ہیں تو داخلی اثرات کے تحت عصبیت اور تنگ نظری کے شکار ہو جاتے ہیں - یہیں سے ان کی نصیحتیں اور ان کی رائیں بے روح ، بیکار نظر آتی ہیں - دیکھئے کہ مسلم لیگ کا ایک اعلیٰ سیاسی دماغ کتنی معرکۃ الآرا نصیحت دیتا ہے : "جمہوریت ، اشتراکیت ، قومیت ، ہندوستانیت ان کی بحثیں اور پروپگنڈا تو جاری ہے اور برابر جاری رہیگا - ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ بغیر اپنا وقت یا توانائی ضائع کئے چند اہم باتوں کو

تو اس شغل میں لگے رہنے دیں لیکن خود اپنے نصب العین کی طرف رُخ کئے وہ راہِ عمل اختیار کریں جس سے ان کی موجودہ ضروریات
پوری ہوں"۔ یہ تو ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ موصوف اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ کسی قوم کا نصب العین نتیجہ ہوتا ہے داخلی اور خارجی
اثرات کا، اسکی سیاسی ضروریات کا، اقتصادی و معاشی پابندیوں کا، معاشرتی رجحانات کا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ قوم کا
سیاسی شعور اتنا تیز کر دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کا احساس خود کر سکے نہ کہ صرف چند "اہل دماغ" اس "شغل" میں لگے رہیں اور
"قوم" مسلم لیگ کی خواب آور کہانی کو سُن کر اپنے نصب العین کا تجزیہ کرے۔

پھر اس کی شکایت فعل عبث ہے کہ "بحیثیت قوم ہمارے سامنے ایک عرصے سے کوئی مخصوص نصب العین نہیں رہا"۔ رہے
کیسے؟ مسلم لیگ کا نصب العین عملی اور نظری دونوں حیثیت سے محض کانگریس کی مخالفت ہے۔ کانگریس اور لیگ کی سیاسی اہمیت
میں بنیادی فرق ہے۔ کانگریس کے افراد جب اپنے بلند سیاسی مقصد سے وقتی طور پر اور انفرادی حیثیت سے گر جاتے ہیں یا راستہ
بھول جاتے ہیں تو بھی کانگریس موردِ الزام نہیں قرار دی جا سکتی۔ اگر جماعتی حیثیت سے بھی کانگریس کبھی غلطی کرے تو زیادہ تشویش
کی بات نہیں کیونکہ لازمی ہے کہ کانگریس کو یا اسکے افراد کو جلد یا بدیر اپنی غلطی کا احساس ہوگا کہ کانگریس کے نصب العین سے بھٹکنا
قوم کے مفاد کے منافی ہے۔ یا ایک لفظ میں یوں کہئے کہ کانگریس کی بنیادی حیثیت مثبت ہے اور لیگ کی منفی۔ اس لئے لیگ
اگر کبھی صحیح راستہ پر ہوتی ہے یا لیگ کے ارکان کسی معاملے میں قومی مفاد کے موافق ہوں تو وہ اتفاقیہ امر ہے۔ کسی قوم کی سیاست میں
مذہبی جماعت کا وجود ہمیشہ رخنہ اندازی کا کام کرے گا خواہ نیّت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو۔ ایسی جماعت ہمیشہ بدترین صورت میں ایک
منفی حیثیت رکھتی ہے اور بہترین حالت میں (Nationalism.) اس کا ثبوت اسمبلی میں مسلم لیگ کی پالیسی ہے جہاں اس کا موجودہ طرزِ عمل
اسکی بیکاری اور فضول وجود کا مظہر ہے۔

سیاست میں دلچسپی لینے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ لیگ کی ——— حکمت عملی کا لازمی نتیجہ پاکستان کی تحریک
کا فروغ ہوگا اور اس بات کا ادّعا کہ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں بلکہ یہاں کے مسلمان ایک علٰحدہ اگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت موقعہ
نہیں کہ لفظ قوم کی تشریح کی جائے لیکن چند الفاظ اس موضوع پر کہنا ضروری ہیں کیونکہ لیگ کے مبلغین چلّا چلّا کر کہہ رہے ہیں کہ اسلامی
تہذیب و ثقافت و تمدن خطرے میں ہے اس سلسلے میں لیگ کے ارکان کا یہ شیوہ ہو گیا ہے کہ جواہرلال کو مطعون کیا جائے کیونکہ وہ
مسلم تہذیب کے وجود کے منکر ہیں۔ لیکن کیا اچھا ہوتا کہ یہی کام اور صفائی سے کیا جاتا اور دانستہ غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا۔ بشیر احمد
صاحب نے بھی اس عام روایت کو نشر کیا ہے جس کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ جواہرلال نے کہا ہے کہ مسلم تہذیب محض نام ہے ایک خاص
قسم کی ڈاڑھی کا، ایک خاص قسم کے پائجامہ کا اور ٹونٹی دار لوٹے کا۔ کسی بیان کو اسکے (Context) سے جدا کرنا غلط بیانی کا
عام طریقہ ہے۔ جواہرلال نے جہاں یہ کہا وہاں یہ بھی کہا کہ اس طرح ہندو تہذیب نام ہے محض چوٹی کا اور گول لٹیا کا۔ ایسے تو جواہرلال
ایسی عظیم الشان شخصیت کیلئے تہذیب کا یہ سطحی تصور رکھنا خواہ وہ "ہندو تہذیب" کے متعلق ہو یا "مسلم تہذیب" کے حیرت انگیز ہے۔
لیکن اس خیال کا اظہار جس ذیل میں کیا ہے بالکل درست اور روا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر اتنا بخوبی یاد ہے کہ جس سلسلہ میں انہوں
نے ایسا کہا وہ یہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ ایک چیز ہندو تہذیب ہے اور ایک شئے مسلم تہذیب لیکن جب
وہ گاؤں میں جاتے ہیں تو جو چیزیں ہندو اور مسلم کسانوں میں مابہ الامتیاز ہیں وہ ایک جانب ڈاڑھی پائجامہ اور ٹونٹی دار لوٹا اور دوسری
جانب چوٹی اور لٹیا ہیں"۔ ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ شخص اس بیان کو قابلِ اعتراض نہیں کہہ سکتا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں موجودہ دور میں ہندو اور مسلم دو ایسی تہذیبیں ہیں جو ایک دوسرے کے منافی ہوتے ہوئے

۲۴۴

دست و گریباں ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جہاں تک بالائی طبقوں کا تعلق ہے علم کی روشنی میں اور مغربی اثرات کے توسط سے ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے تمدّنی و تہذیبی حیثیت سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ سوال "ایک دوسرے پر زبردستی اثر ڈالنے، ایک دوسرے کو خاموشی سے اپنے میں جذب کرنے" کا نہیں ہے۔ آج کئی صدیوں کے تاثرات سے ایک "ہندو مسلم" تہذیب وجود میں آرہی ہے جس کا ڈھانچہ مغلوں کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس امتزاج و تخریب میں بہت سی قوتیں عمل پیرا ہیں۔ ایک تو وہ ہندو جذبہ ہے جو اپنے نشاۃ الثانیہ کے زعم میں ہندوستان کو کئی ہزار سال پیچھے گھسیٹ لینا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ خالص اسلامی جذبہ ہے جو دُنیا میں کہیں بھی اسلامی حکومت نہ دیکھ کر (واضح ہو کہ ترکی وغیرہ سیاسی حیثیت سے مذہبی حکومتیں نہیں ہیں) ہندوستان میں ۸ کروڑ افراد کے زعم میں اسلامی حکومت کا خواہشمند ہے لیکن یہ دونوں جذبے ناکام ثابت ہونگے۔ کیونکہ وقت کی ضرورت، وقت کا مطالبہ ان کے خلاف ہے۔ لیکن اس ہندو مسلم تہذیب کو خطرہ ہے مغربی تہذیب سے۔ اور یہ ٹکّر عام ٹکّر ہے جو ایشیا کے ہر ملک میں ہو چکی ہے، ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے اور جس کا فیصلہ چند قومیں مثلاً ترکی و ایران وغیرہ اپنے اپنے طرز پر کر چکی ہیں۔ یہ ہے صحیح تجزیّہ ہمارے تہذیبی "امکانات" کا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہندو مسلم تہذیب کی تشکیل ابھی تک مکمل نہیں ہوئی ہے ورنہ مسلم لیگ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی۔ میرٹھ میں سکرٹری مسلم لیگ کی تقریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج سے کھلم کھلا مسلم لیگ کا نصب العین وہ ہو گیا ہے جس کا اندازہ آجتک محض مسلم لیگ کی حرکات مذبوحی سے ہوتا تھا۔ یعنی "ہندوستانی قومیت سے انکار"۔

مقالہ کے دوسرے حصّہ میں یہی راگ الاپا گیا ہے کہ مسلمان الگ ایک قوم ہیں۔ پھر اس نکتۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے اِن مذہبی، تمدّنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو مصنّف کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو من حیث القوم درپیش ہیں

۲۴۴

ہمیں اکثر تعجّب ہوتا ہے کہ اس ادّعا کا کیا مطلب ہے کہ ہم ایسی حکومت کی بُنیاد ڈالیں جس کے مسائل خالص اسلامی نکتۂ نظر سے حل کئے جائیں۔ اسلام کی تاریخ خود اس بات کی تردید کرتی ہے۔ جغرافیائی اور قومی حیثیت سے انکار کرنا دلچسپ مشغلہ تو ہو سکتا ہے لیکن غلط ہونے کی وجہ سے فضول ضرور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی فضا اس وقت بہت تاریک ہے لیکن اس کا یہ حل نہیں جو مصنّف نے پیش کیا ہے یعنی ایک الگ جماعت، ایک الگ حکومت قائم کرنا۔ یہ راستہ تباہی اور بربادی کا ہے کیونکہ ناقابلِ عمل ہے۔

مسلم لیگ کے دفاع میں فاضل مصنّف فرماتے ہیں۔ بجائے باہر سے نکتہ چینی کرنے کے ایسی جماعتوں کے اندر داخل ہو کر ان کی حتی المقدور اصلاح کرنی چاہیئے۔ اس نازک وقت میں غیروں کے پروپگنڈا یا اپنی تنگ خیالی یا مفروضہ بلند نظری سے متاثر ہو کر اپنے ہی قومی اداروں سے علیحدہ رہنا قومی غدّاری سے کم نہیں۔" ہم اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتے کہ کانگریس کے متعلق یہی رائے مصنّف اور ان کے سیاسی ہمنواؤں کو دیں۔ آج اگر مسلمان کانگریس میں جوق درجوق شریک ہوتے تو کانگریس مہاسبھائی اثرات سے قطعاً خالی ہوتی۔ مسلمانوں کی فلاح ہندوستان کی فلاح میں مضمر ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہر شخص خواہ مخالف یا موافق رائے کا ہو اس مقالہ کو پڑھ کر محظوظ ہو گا۔ مصنّف کا طرزِ بیان نہایت ہی خوشگوار اور سنجیدہ بحث کیلئے نہایت ہی موزوں ہے۔ کاش یہ زورِ بیان کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا!

بیمار

از سجّاد ظہیر - مطبوعہ جامعہ پریس دہلی -
کتابت وطباعت نفیس - قیمت درج نہیں -

ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے - قصّہ کا ماحصل یہ ہے کہ عزیز اور سلمہ میاں بیوی ہیں - عزیز کا ایک دوست بشیر بیمار ہو جاتا ہے اور عزیز اس کو اپنے گھر مہمان کی حیثیت سے بلا لیتا ہے - سلیمہ بشیر کی مہمان نوازی اور تیمارداری میں اتنی منہمک ہو جاتی ہے کہ گھر کا سارا انتظام ابتر ہو جاتا ہے - میاں بیوی میں رنجش پیدا ہوتی ہے - عزیز بشیر کو تنبیہ کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ ہسپتال میں چلا جائے - دونوں میں بحث ہوتی ہے اور غالبًا جذبات کی شدّت کی وجہ سے بشیر مر جاتا ہے - ڈرامہ کا مقصد خانگی زندگی پر سرسری نظر ڈالنا ہے اور عزیز اور بشیر کی گفتگو کے دوران میں سماج کی ہیئت پر بحث کرنا ہے -

مصنف اپنے مقصد میں کافی کامیاب ہوئے ہیں لیکن چند باتیں بحث طلب ہیں - عزیز کہتا ہے "ہر شخص کو سب سے پہلے اپنا پیٹ پالنے کی فکر کرنا چاہئے - تو تم نے پھر اس اصول پر عمل کیوں نہیں کیا ؟"

محض لفظ اصول کے ذکر سے بشیر برافروختہ ہو جاتا ہے اور "اصول" کے خلاف ایک لیکچر دے ڈالتا ہے - یہ درست ہے کہ ہماری موجودہ سماج کے اصول انسانیت کے خلاف جرم ہیں - لیکن بہرحال دُنیا کا ہر نظام اصول پر مبنی ہے - اشتراکیت کے اصول البتہ جداگانہ ہیں - لیکن بے اصولی اشتراکیت کی بُنیاد نہیں ہو سکتی - کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ قابل مصنّف کو اس بات کا احساس نہیں تھا لیکن اشتراکی ادیبوں کو اس بات کی کافی کوشش کرنی چاہئے کہ اس عام خیال کو جس کے مطابق اشتراکیت اور بے اصولی مترادف ہیں جُھٹلایا جائے -

اسی طرح افسانہ کا منتہا بیمار کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنا ہے تاکہ اسکے عقائد سے ناظرین ہمنوا ہو جائیں - لیکن سلیمہ اور عزیز کی بحث میں عزیز کی زمین زیادہ مضبوط ہے - جو مقصد کو فوت کرتی ہے -

ڈرامہ دلچسپ ہے - زبان سلیس اور خوشگوار استعمال کی گئی ہے - ناظرین اسکے مطالعہ سے ضرور لطف اندوز ہونگے - سجّاد ظہیر صاحب ترقی پسند ادب کے علمبرداروں میں اوّل الذکر ہیں ان کی تحریر میں جدّت اور ترقی پسندی نمایاں ہوتی ہے -

شاہ حبشہ - ایک المیہ

از اختر ارینوی -
مطبوعہ مکتبۂ اُردو - لاہور -

اُردو ادب میں ڈرامہ کا عنصر بہت کم ہے - اُردو ادب کے معمار فارسی کے نام لیوا تھے - ایران میں ڈرامہ کا وجود نہ تھا ہماری بدقسمتی تھی کہ سنسکرت سے اُردو ادب زیادہ بہرہ اندوز نہ ہوا ورنہ ممکن تھا کہ ابتک ہمارے ادب میں ڈرامہ کا حصّہ نہایت لطیف اور نہایت بلند ہو جاتا - بہرحال یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب انگریزی ادب کی تقلید میں ڈرامہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کر رہے ہیں - جن لوگوں نے ڈرامہ کے فن کا مطالعہ کیا ہے - ان کو احساس ہوگا کہ تاریخی ڈرامہ لکھنا جتنا مقبول ہے اتنا ہی مشکل بھی - مقبولیت کی غالبًا وجہ یہ کہ بنا بنایا پلاٹ موجود ہوتا ہے اور تخیّل کو حرکت دینے کی ضرورت کم ہوتی ہے - اگرچہ اصل واقعہ یہ ہے کہ تاریخی فسانہ یا ڈرامہ لکھنے میں تخیّل کو نہایت ہی وسیع، وقیع اور بلند ہونا پڑتا ہے کیونکہ ڈرامہ نگار پر یہ فرض ہوتا ہے کہ قصّہ کی دلچسپی کے خیال میں تاریخ کی اصلیت سے دور نہ جا پڑے -

زیر نظر ڈرامہ متعلق ہے اس حادثہ سے جس نے ۱۹۳۵ء میں دُنیا کے امن کو ختم کر دیا - مسولینی کا حبش پر حملہ بہت ہی اہم واقعہ ہے

مجلس اقوام کی بے بسی، سیاستِ عالم کی ابتری کا صحیح اندازہ اسی واقعہ سے ہوا۔ شاہ حبشہ اور ان کے نمائندوں کے احتجاج نے اس تلخ حقیقت کو آشکارا کردیا۔ کہ دُنیا میں جسکی لاٹھی اسکی بھینس کے اُصول پر پھر عمل شروع ہوگیا۔ اگرچہ ہم لوگ اپنے زعم میں یہ سمجھنے لگے تھے۔ کہ بیسویں صدی انسانیت اور بین الاقوامیت کے سُنہرے خواب کو سچّا ثابت کرے گی۔ مجلس اقوام کے آخری اجلاس میں جب شہنشاہِ حبش سوال کرتا ہے۔ "کیا دنیا پر شیطان کی حکومت کا اعلان عام ہوگیا؟ کیا مجلسِ اقوام بھی فرزندانِ تاریکی کے حریص و ظالم چنگل میں ایک دم توڑتا، سسکتا ہوا آخری چراغ ہے۔" تو مجلسِ اقوام بلکہ موجودہ مہذب دُنیا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اس تقریر کے جواب میں محض مرحبا مرحبا کہنا اور چیرز دینا ثبوت ہے۔ اس بات کا کہ دنیا کو اپنی کمزوری کا احساس ضرور ہے۔ مگر اسکے دفعیہ کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

ڈرامہ کافی غیر جانبداری سے لکھا گیا ہے۔ اور تمام افراد و تمثیل کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے طالب علموں کیلئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ زبان صاف اور سلیس ہے اطالوی مدبرین کے ناموں کے ہجے میں کئی جگہ ترمیم کی گنجائش ہے۔ مثلاً کونٹ چیانی کو سیانی لکھا گیا ہے۔ شہزادی قلورا (شاہِ حبش کی مُنہ بولی بیٹی) اور شاہ سماج محمّد (ایک فوجی افسر) کے ذکر سے حسن و عشق کا عنصر پیدا کیا گیا ہے جس سے ڈرامہ میں چاشنی آگئی ہے۔ شاہ سماج کی موت کے منظر میں جذبات نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ڈرامہ کامیاب ہے اور نوجوان مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

درسِ قرآن

یہ ضمیمہ ہے۔ سیرت کمپنی لاہور کے رسالہ ایمان کا جو رسالہ کی صوُرت میں ہر ماہ شائع ہوا کرے گا۔ سیرت کمپنی اپنے جد و جہد اور عمل کے لئے مشہوُر ہو چکی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں علم و مذہب کی روشنی پہنچانا۔ اس کا نصب العین ہے۔ یہ ضمیمہ درسِ قرآن بھی تبلیغی مقصد رکھتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس چھوٹے سے رسالہ میں قرآن کی روشنی میں تمیں سبق دیئے گئے ہیں جو جاہل طبقوں کی اخلاقی سطح کو اُبھارنے میں کافی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

گائے کانفرنس کا خطبۂ صدارت

از حاجی نبی احمد بریلوی

قیمت ۳ر کتابت و طباعت ادنیٰ۔ حجم ۳۲ صفحات

زیر نظر رسالہ میں مُصنف نے گوشت خوری، جیو ہتیا، گاؤ پرستی اور دیگر متعلق مسائل پر دلائل و واقعات سے بحث کی ہے لیکن ان موضوعات کے ذکر کے لئے انہوں نے ایک اپج پیدا کی ہے۔ جو مستحسن نہیں قرار دی جاسکتی۔ ایک گائے کے مُنہ سے خطبۂ صدارت دیا گیا ہے۔ جسمیں گائے موصوف گوشت خوری کی تلقین کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے کافی محنت سے اشلوک اور شاستروں سے گوشت خوری کی حمایت میں ثبوت پیش کئے ہیں۔ گایوں کے مُنہ سے قربانی کی تعریف کرانا، بحث کو زیادہ صاف نہیں بناتا۔ بعض باتیں اگر صحیح بھی ہوں تو ان کا ذکر بدذوقی کی دلیل ہے۔ مثلاً مصنف نے ان نفس پرست برہمنوں کے واقع دیئے ہیں۔ جو گائے کے ساتھ فعلِ شنیع کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

بہرحال مجموعی حیثیت سے رسالہ میں دلچسپ معلومات کا ذخیرہ ہے جو اس موضوع کے سمجھنے میں کافی مدد دے گا۔ بعض جگہ طرز تحریر جارحانہ ہے۔ جس سے ہمارے ہندو بھائیوں کو دُکھ پہونچنے کا احتمال ہے۔ اور ہم کسی ایسی تصنیف کو مستحسن قرار نہیں دے سکتے جس سے کسی کو تکلیف پہونچے۔

ساغر

"نیو انڈین لٹریچر" (لکھنؤ)

"New Indian Literature"

ناشر انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ سائز ۲۲×۱۸/۸ (ناول) سالانہ قیمت صہ

کئی ماہ سے (New Indian Literature) کے اجراء کی خبر گرم تھی۔

ہندوستان کے اکثر ادبی حلقے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس انتظار کے دو وجوہ تھے (۱) پہلی تو یہ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنیادی مقاصد کی پسندیدگی اور امتیازی کشش اسکے ارکان کی بیدار مغزی بلندی اور بلند ہو کر کام کرنے کی چیلنج کی بنا پر ادبی حلقوں کو یہ امید تھی کہ یہ لوگ جو قدم اٹھائیں گے وہ صحیح اور مخلصانہ ہوگا۔ اور جو کام کریں گے خلوص اور شوق کے جذبے سے کریں گے۔ جماعتی پروپگنڈے اور جماعت بندی سے اُن سنجیدہ حضرات کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک اس تعمیری دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے امتیازی اور تعمیری مقاصد دیکھ کر یہ توقع رکھتا تھا کہ اسکی کوششیں نئے ادب کی تخلیق اور تعمیر میں امداد دیں گی۔ کیونکہ کم و بیش ہر دیسی زبان کا ادب تعمیری منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اور گو میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حقیقی شاعر اور ادیب کو رہبری اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اس کا احساس اور اس کا تخیل خود اس کا رہبر ہوتا ہے۔ تاہم اس کی تراش کی ذمہ داری بہت کچھ ماحول کے سنگتراش پر بھی ہوتی ہے۔ بہرحال سادہ لوحی یا خوش فہمی کی بنا پر ملک نے "انجمن ترقی پسند مصنفین" سے یہ توقع قائم کر لی تھی۔ کہ وہ اس تعمیر میں اخلاص کے ساتھ امداد کرے گی۔ اور ان ہستیوں کو پیش کریگی۔ جو دیسی زبانوں کے جدید ادب کے ہیرو ہیں۔

لیکن "نیو انڈین لٹریچر" کو دیکھنے کے بعد ان تمام نیک توقعات پر پانی پھر گیا۔ جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی ذات سے وابستہ کی گئی تھیں اور مجموعی طور پر اُسے دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

آپ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کسی رسالہ یا کتاب کو خوبصورت اور دلکش بنانا ہی "مقابلہ" کا ایک نہایت ضروری جزو ہے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے جمالیاتی خصوصیات پیدا کرنا ایسا ہی لازم ہو گیا ہے جسطرح رسالہ کو کامیاب بنانے کے لئے مغز اور روح کی ضرورت ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم نیو انڈین لٹریچر کو دیکھتے ہیں۔ تو بیک نظر اس کا سائز ہی اس کے مقصد کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور مقابلاتی طور پر وہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) اور انڈین ریویو (مدراس) کے مقابلے میں نگاہوں میں نہیں کھپتا۔

اسکے بعد ہمیں ادارہ تحریر ایڈیٹوریل بورڈ میں بہت سے نام نظر آتے ہیں جنھیں اردو زبان سے لیکر تامل اور تلنگو زبان کے ماہر تک موجود ہیں۔ لیکن جب مضامین پر نگاہ جاتی ہے۔ تو اور بھی افسوس ہوتا ہے۔ کہ اتنے ماہرین ادب کی پشت پناہی جس رسالہ کو میسر ہو اس کا کوئی ادبی معیار نہیں۔

اتنے شاندار ایڈیٹوریل بورڈ ہونے کے باوجود نیو انڈین لٹریچر میں ہندوستان کے جدید ادب کی ٹھیک نمائندگی بھی نہیں کیگئی ہے اردو اور ہندی کے ان شاعروں کے ذکر سے بھی یہ خالی ہے۔ جو واقعی "نئے ادب" کے خالق و کارساز ہیں۔ صوبۂ بہار میں مشہور ہندی شاعر "دنکر" کا ذکر نئے ادب میں نہ کرنا کوئی انصاف اور بلندی ہے؟ خیال یہ تھا کہ اگر نیو انڈین لٹریچر شائع ہوا تو امریکہ سے شائع ہونے والے ایشیا اور کلکتہ کے ماڈرن ریویو سے تو کسی طرح کم درجہ نہ ہوگا۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ صورت و سیرت کے لحاظ سے خود ان لوگوں کی توہین ہے جو "نئے ادب" کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔ !؟

ملک راج آنند صاحب کے "ترقی پسند تحریک" والے مضمون میں ہندوستان کے مشہور اور ترقی پسند شعرا اور نثر نگاروں کا ذکر تک نہیں احمد عباس صاحب نثر نگاروں کی پہلی صف میں بٹھا دیئے گئے ہیں۔ اور مجاز صاحب کے لئے فاضل مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں۔

"One of the most important revo-
lutionary poets writing
Hindustani today"

جہاں تک مجاز صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ہونہار نوجوان شاعر ہیں - اور اگر انہوں نے فکر و احتساب سے کام لیا تو ممکن ہے کہ کبھی دس پندرہ برس کے بعد اپنی انفرادیت قائم کرسکیں۔ "آہنگ" میں تو وہ صرف جوش ملیح آبادی کا ہلکا سا پرتو ہیں - انکی شاعری کلیتہً جوش کی تقلید ہے اور کسی نوخیز مقلد کیلئے یہ الفاظ نہیں کہے جاسکتے - جو ملک راج آنند نے لکھے ہیں - دوستی اور جانبداری کا ہرگز یہ فرض نہیں ہے کہ غلط مداحی کی صورت میں دوست کیساتھ کھلی دشمنی کی جائے - اس قسم کی مداحی کے اثرات مجاز کو تباہ کردینگے - اور وہ اپنی شاعرانہ تخلیق کی قوت کو ترقی دینے سے عاری ہوجائیں گے - اپنی پارٹی کے افراد کی ثنا خوانی اور چیز ہے - اور تنقید دوسری چیز - غلط اور گمراہ کن بیانات مداحیات اور غلط ثنا خوانیاں ادب اور ادیبوں پر نہایت برا اثر ڈالتی ہیں - اور اس ترقی و تخلیق کا دروازہ بند کردیتی ہیں - جس کو زمانہ کے تقاضات اور شاعر کے مخلصانہ احساسات اپنے ہاتھوں سے کھولا کرتے ہیں -

آئیے اب آپ کو ذرا یہ بھی بتائیں کہ ترقی پسند مصنفین کون کون ہیں !؟ میں 'تم' میرا دوست تمہارا دوست اور "وہ" بس !!؟ سجاد ظہیر علی سردار جعفری، آنند، عبدالعلیم، احمد علی، احمد عباس، رشید جہاں،

عبدالعلیم صاحب "زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" نیو انڈین لٹریچر کے ایڈیٹر ہیں - آپ نے زبان کے مسئلہ پر ایک مضمون پچھلے ہی نمبر میں سپردِ قلم فرمایا ہے - آپ نے تو ان لسانی تحریکات کا ذکر کیا ہے - جو ہندوستانی زبان میں ہوئیں - اور نہ کوئی دوسری بات قابلِ غور ہے - نہ آئندہ کیلئے کوئی حل ہی پیش فرمایا گیا ہے - غرضکہ مضمون قطعی تشنہ ہے - اور کوئی فرض ادا نہیں کرتا -

ریویوز میں اقبال پر علی سردار جعفری کا ریویو ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے - کہ جعفری نے اقبال کو پڑھا ہی نہیں - نہایت مضحکہ انگیز ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ انہوں نے کبھی اقبال کو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی - محض مسولینی پر ایک نظم کہنے سے اقبال فسطائی Fascist نہیں ہوسکتا -

سیدین ہمارے ملک کے ایک بڑے ماہر تعلیم ہیں - واردھا اسکیم کے معاونین میں سے ایک ہیں لیکن جعفری کو انکی کتاب Iqbal's Educational Philosophy) میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی - اقبال پر اظہار رائے کرتے وقت اس کی تمام روح کو سامنے رکھنا پڑے گا - یہاں ——— ایک خاص گوشہ یہ پیدا ہوتا ہے - کہ نئے ادب سے آخر آپ کی مراد کیا ہے - !؟

کیا وہ ادب جو محض اشتراکی ہو یا محض سوشلسٹک لٹریچر (Socialistic literature) اگر نئے ادب کی یہ تعریف ہے تو آپ گویا ادب ہی کو ختم کئے دیتے ہیں - ادب تو ہر اصول اور ہر فلسفہ و اعتقاد سے بلند ایک چیز ہے - اقبال کی شاعری "نئے ادب" کے ماتحت آتی ہے - دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو کلی طور پر بدلدیا یا نہیں - اگر اس سوال کا جواب خود ہمارے دل اثبات میں دیتے ہیں تو وہ ترقی یافتہ اور ایک عظیم الشان شاعر ہے اس کو فسطائی کہکر آپ گویا اسکی شاعری کو ساونتی تمدن کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں جو نہایت تنگدلانہ اور غیر منصفانہ طرزِ عمل ہے -

لطف یہ ہے کہ یہ سلوک جعفری صاحب کرتے ہیں جنکے لئے اقبال کو سمجھنا اور سمجھانا شاید ابھی قبل از وقت ہے - یاد رکھئے اقبال پر رائے زنی کرنے کے اوقات میں اسکی شاعری کے اس حصہ کو نظر انداز کرنے کا ہرگز حق نہیں ہے، جو اسکے کلام کا تیز و تند حصہ ہے اور جس میں وہ انسان سے لیکر قدرت تک دونوں کا باغی ہے ؎

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگۂ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ عطا رخصتِ تنویر ہو مجھ کو
جبتک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب
چھوڑونگی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

جس طرح لوگ پارٹیاں بنا کر شخصی طور پر انگلستان کا سفر کرتے ہیں اور خود محظوظ ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ اسی طرح آنند صاحب کو بھی "نیو انڈین لٹریچر" کی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھکر اپنے دوستوں کو لندن پہونچانے اور پہنچنے کا حق حاصل ہے۔ مگر اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کرسکتے۔ کہ انگلستان کا راستہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے۔ جو تین ہزار روپیہ خرچ کرسکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر "نیو انڈین لٹریچر" نے وہ فرض ادا نہیں کیا۔ جس کا دعویدار اس کا تصور تھا۔ تو مجبوراً آئندہ ہندوستانی ادب کو مغرب سے واقف کرانے کے لئے کوئی "موسیٰ" اٹھ سکتا ہے۔ اور نیو انڈین لٹریچر کے طلسم سامری کو توڑ دے سکتا ہے کیونکہ اسباب اور نتائج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

"نیو انڈین لٹریچر" کے مجتہد العصر حضرات کو تو یہ غور کرنا ہی چاہیئے تھا۔ کہ تنقید کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے تنقید کرنا ادب کی کوئی خدمت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ آہنگ (از مجاز) اور آہنگِ رزم (از وقار) کافی پرانی کتابیں ہوچکیں۔ وقار کی کتاب تو تقریباً دو سال کی پرانی کتاب ہے۔ اس لئے ان قدیم الاشاعت کتابوں پر نہیں۔ بلکہ تازہ مطبوعات پر تنقید ہونی چاہیئے تھی۔ یعنی نیو انڈین لٹریچر کو اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے کم از کم نیا ادب تو پیش کرنا چاہیئے تھا۔ !؟

آیئے ایک دلچسپ بات آپکو اور سنائیں۔ ہمارے دوست سجاد ظہیر کے نزدیک انقلابی شاعر مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔ مجاز۔ جعفری۔ شہاب۔ رضی۔ وقار۔ مطلبی اور جذبی۔

!!؟!

جعفری، شہاب مطلبی اور جذبی صاحبان کی شاعری سے مستفید ہونے کا اتفاق کم از کم شاعر حلقوں کو نہیں ہوا۔ شاید یہ حضرات کہہ کہہ کر صرف ترقی پسند مصنفین کے ارکان ہی کو اس "ایوانِ انقلابی" میں اپنی انقلابی شاعری سناتے ہیں جس میں ۲۶ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد داخل ہونا پڑتا ہے۔ رضی سے مراد اگر رضی عظیم آبادی ہیں۔ تو ان کی چند نظمیں ضرور میں نے سنی ہیں۔ رہے مجاز صاحب سو انکے متعلق زبان کھولنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ اسلئے کہ وہ آنند اور سجاد صاحب کی عدالت انقلاب کے "ملک الشعراء" ہیں۔ اب ہمارے دوست جوش ملیح آبادی کو فوراً شاعرِ انقلاب ہونے سے دست بردار ہو جانا چاہیئے کہ اب ع

"آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"

یہ بھی غالباً ترقی پسندی ہے اور "نیا ادب" کہ جو لوگ کچھ نہوں اُن کو بڑا بنا کر پیش کیا جائے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ "نیو انڈین لٹریچر" پائنیر پریس میں چھپا ہے۔

"ز خاک کعبہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است"

آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ "ترقی پسند مصنفین" نے ملک کو ایک نیا خیال ضرور دیا ہے۔ اور اسکے افراد اگر اپنی ادبی انانیت اور خود پرستی کو ترک کر دیں تو انہیں سے ہر شخص اپنی علمی قابلیت سے ملک کو فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ اور ان میں سے ہر شخص میں یہ اہلیت موجود ہے کہ اپنے اعمال کا احتساب کرکے "نیو انڈین لٹریچر" کو بلند سے بلند درجہ تک پہونچادے۔ زیر نظر نمبر کو دیکھکر گو انتہائی تکلیف ہوئی لیکن مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُن حضرات نے چاہا تو وہ جلد ہی نیو انڈین لٹریچر کو ایک معیاری رسالہ بنا دینگے۔

"عین الملک"

آجائے۔ ٹائمس اور ڈیلی میل ایسے اخباروں نے یہ پیشنگوئی کی ہے کہ اب آسٹریا تاریخ کے لئے خاص مسئلہ نہیں رہا۔ میری رائے میں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہٹلر کے قبضۂ غاصبانہ کے بعد عام رائے کا ہٹلر آسٹرین جرمن اتحاد کے لئے فیصلہ کردینا صرف اس ڈر سے ہوا کہ نازی فوجیں مع اپنے تمام مہلک سامان تباہی و بربادی کے آسٹریا پر چھائی ہوئی تھیں اور آسٹریا کے لیڈر جمہوری حکومتوں سے مایوس ہو کر ہر طرح ہمت ہار بیٹھے تھے۔ وقتی ہنگامے نے نت نئی پارٹیاں پیدا کردی تھیں ملک چوندھیا گیا تھا۔ ورنہ یہ بالکل واقعہ ہے کہ اگر ڈاکٹر شُشنگ کی اُمیدوں کے مطابق عام رائے لی جاتی تو دو تہائی سے زیادہ اکثریت کے ساتھ شُشنگ کو کامیابی ہوئی ہوتی۔

پہلی جنگ کے مہلک نتیجے لوگوں کے سامنے تھے۔ بیرونی امداد کی اُمیدیں منقطع ہو جانے کے بعد اور حالات کی انتہائی تیز رفتاری کی وجہ سے کوئی دم نہ رہ سکا غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زبان رسم و رواج اور خون کے قربت کی وجہ سے بھی کسی نے دم نہ مارا۔ اور مشیت میں چارہ کیا ہے کہکر ہتھیار ڈالدیئے۔

آسٹریا کی آبادی ستر لاکھ ہے ان میں سے اگر تیس لاکھ انسان بھی خیر مقدم کے ترانے جرمن قوم کے لئے گائیں تو بڑا شور معلوم ہو سکتا ہے اور برلن ریڈیو اسٹیشن کے طاقتور پیمانوں سے شور و شغب کی یہ لہریں وائٹ ہال میں عظیم الشان گونج پیدا کرسکتی ہیں۔ خاصکر جبکہ یہ شور غیر ذمہ دار نافہم ہنگاموں سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کی مضبوط چھاتیوں سے بلند ہوا ہو۔ اب بوڑھے اور سنجیدہ لوگ اسی طرح ڈر کر چپ ہو رہے تھے۔ جسطرح ایک خونخوار بلّی سے چوہوں کی ایک کثیر فوج بھی لرز جایا کرتی ہے۔ خود میرا ایک شعر ہے ؎

بڑھاپا تحیّر سے منہ تک رہا ہے اُڑی جارہی ہے فلک پر جوانی

لوگوں کے سامنے خود جرمنی کے وہ واقعات تھے جبکہ ہٹلر نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تھی اور اپنے مدہوش نوجوان ساتھیوں کی مدد سے اقلیت کو بھی اکثریت پر غالب کردیا تھا آپ اُسے ساحرانہ کرشمہ کہیئے یا شیطانی حرکتیں کہ جس نے ذرا سی ہٹلر کی مخالفت میں آواز بلند کی اُسے سیاسی قیدخانوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ درگور کردیا گیا۔ اسمیں صرف یہودی ہی نہیں تھے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں خالص آرین نسل کے بہترین دست و بازو بھی تھے۔

حال میں ابھی مینے مسٹر لوا ینڈ کی کتاب (
"میں ہٹلر کا قیدی تھا" پڑھی۔ اس کتاب کا خلاصہ میرے ایک دوست کر رہے ہیں۔ جو ایشیا کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔ اسکے مطالعے سے آپ بھی اس نتیجے پر پہونچینگے جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں۔

ڈیلی میل جیسا قدامت پرست اور فسطائی پرچہ بھی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "نازی جرمنی کے متعلق اس سے زیادہ تاثرانگیز کتاب نظر سے نہیں گذری" مسٹر لورینڈ ایک ہنگرین صحافی ہیں جو جرمن میں ایک مشہور ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اس وقت وہ انگلستان میں "پکچر پوسٹ" اور "للی پٹ" کے ایڈیٹر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ذمہ دار شخص خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بول سکتا کتاب میں انہوں نے اپنے اور جرمن کے چند دوسرے منتخب رہنماؤں کا جن میں اکثر کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا ذکر کیا ہے۔ بعض ڈاکٹر تھے بعض سائنسدان تھے اور بعض آرٹسٹ۔ ہٹلر کی نازی فوج نے ان لوگوں کے ساتھ صرف اس بنا پر سخت مظالم کئے کہ اُن کی جگہوں پر نازی نوجوان قائم مقام ہو سکیں۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آسٹرین قوم نے جرمنی کو سامانِ جنگ کے طوفان میں اپنی زندگی کے بیڑے کو گھبرا کر ڈالدیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آسٹریا کی دولت پر قبضہ کرتے ہی جرمنی نے غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی سے بھی انکار کردیا جنکے سہارے پر آسٹریا کا قومی بنک بن سکتا تھا۔

تیسرے سال بمبئی میں ایک آسٹرین صحافی لڑکی سے میری ملاقات ہوئی تھی اُن کا تازہ خط آسٹریا کے مستقبل پر روشنی ڈالتا ہے کا تن میں

وہ خط شائع کر سکتا۔ بیچاری ابھی نازی چنگل سے آزاد نہیں ہوئی
ہے۔ وہ خط ختم کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "آسٹریا اپنی موجودہ غلامی
سے خوش نہیں ہے"۔ وہ خود کو ایک اُس زخمی کبوتر کی طرح سمجھ
رہا ہے جس کی صحت صیاد کے ہاتھوں ہو رہی ہو اور جب دھیرے
دھیرے زخم مندمل ہو جائینگے تو وہ پھر آزاد ہو جائے گا۔ آپ دیکھینگے
عالمگیر جنگ کے موقع پر آسٹریا پھر انگڑائی لے گا اور نہ صرف
آسٹریا بلکہ زیکوسلاویکیا اور ہنگری بھی یہ تینوں ملک متحد ہو کر
جرمنی کو ایک بار پھر زبردست چوٹ لگا ئینگے"۔

چیکوسلاویکیا

سہ ماہی رسالہ کے لئے جو نیم سیاسی بھی ہو یہ بڑی دقت کی بات ہے کہ جب واقعات
اس قدر تیزی سے کروٹیں لے رہے ہوں واقعات کے ساتھ ہم
آہنگ نہیں ہو سکتا ابھی میں نے آسٹریا کے متعلق آخری سطور
لکھی ہی تھیں کہ چیکوسلوویکیا پوری طرح ہڑپ کر لیا گیا ہے۔ پھر
یہ بھی دنیا کی تاریخ میں عجیب وغریب کہانی کا اضافہ ہوا ہے۔
ہٹلر غالباً پہلا حکمران ہے جس نے دو ملک آسٹریا پھر چیکوسلاویکیا
خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر فتح کر لیئے۔ اس سے پہلے نپولین
نے تیمور ...... اور چنگیز نے صلاح الدین نے
بڑی بڑی فتوحات کی تھیں۔ لیکن خون کی ندیاں بہا کر اپنا
خون پانی ایک کردینے کے بعد۔
ڈاکٹر ہاشا (Dr. Hacha) چیکوسلوویکیا کے صدر اور انکے
وزیر خارجہ مسٹر (   ) نے کسطرح
مجبور ہو کر آسانی کے ساتھ اپنا ملک نازی جرمنی کو سونپ دیا
۱۴ مارچ کی سہ پہر کو پراگ کے جرمن وزیر نے چیک حکومت کے
ذمہ دار افراد سے ملاقات کی اور ان کو ہٹلر کا یہ معنے خیز پیام دیا کہ
چیک لوگوں کے لئے یہ نہایت مفید بات ہوگی کہ صدر اور وزیر
خارجہ برلن آکر کچھ مشورے کرلیں۔ جسوقت وہ برلن پہونچے اُنکا
زبردست استقبال ہوا۔ فوج کا مکمل اور شاندار مظاہرہ کیا گیا۔
ہزاروں انسانوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے اور انکو فوراً ریش
چانسلری میں لے جایا گیا۔ جہاں ہر ہٹلر فیلڈ مارشل گورنگ اور
ہر خان ربن ٹراپ پہلے سے موجود تھے۔ کمرہ کے بیچ میں ایک
گول میز رکھی ہوئی تھی جس پر چیکوسلاویکیا کی قسمت کا آخری فیصلہ
پہلے سے لکھا ہوا محفوظ تھا۔ جس پر چیک صدر اور وزیر خارجہ
کے دستخط ہو جانے کے بعد حکومت کا چیکوسلوویکیا پر بغیر کسی جنگ
وجدل کے قبضہ ہو جانا باقی تھا۔ ساتھ ہی بوہیمیا اور مورویا
کے مستقبل کا آئین بھی مدّون تھا۔
کانفرنس کا آغاز ہٹلر نے ایک مختصر تقریر سے کیا اُسنے کہا کہ "اب وقت
بات چیت کا نہیں رہا بلکہ چیک قوم کو اب یہ بتا دینے کا وقت
آگیا ہے کہ جرمن حکومت کا فیصلہ اٹل ہے اور اُسے سر تسلیم
خم کردینا ہی پڑے گا۔ چیک نمائندوں کی طرف مخاطب ہوتے
ہوئے ہٹلر نے گرج کر کہا "کل صبح نو بجے جرمن فوجیں پراگ
(دارالسلطنت چیکوسلاویکیا) میں ہونگی۔ بھوہیا
(   ) اور (   ) اور موریا
ریس کے سایۂ عاطفت میں لے لئے جائینگے۔ اور جو کوئی بھی مقابلہ
کی کوشش کریگا اُسے نازی سپاہیوں کے بھاری بھاری بوٹوں
سے پیس دیا جائے گا۔ اس کے بعد نمائندگان چیک کے جواب
کا انتظار کئے بغیر ہٹلر نے فیصلہ پر اپنے آخری دستخط کردیئے
اور کمرہ سے چلا گیا۔ اسوقت رات کے ڈیڑھ بجے تھے۔ پریسیڈنٹ
ہاشا اور وزیر خارجہ نے سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند
کی اور کہا کہ وہ اپنے ملک کو کس منہ سے جا ئینگے!؟ اس سے
پہلے کبھی کوئی سفید قوم اسطرح ذلیل نہیں کی گئی تھی۔ اور خود
دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ جرمن وفد اراکین نے انہیں گھیر لیا۔ قلم
ان کے ہاتھوں میں زبردستی دیدیئے اور دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ
اگر تم اب بھی دستخط نہ کروگے تو دو گھنٹے کے اندر اندر تمام پراگ
کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کردیا جائے گا"۔
انہوں نے بتایا کہ ۸۰ جنگی طیارے ہوائی جہاز اسٹیشن پر بالکل
تیار کھڑے ہیں اور ایک منٹ کے نوٹس پر وہ پراگ کے لئے
اُڑ سکتے ہیں ۶ بجے صبح تک اگر دستخط نہ ہوئے تو پراگ کا نام ونشان
یورپ کی تاریخ سے مٹا دیا جائے گا۔

بیچارے ڈاکٹر ہاشا کی عجیب حالت تھی۔ اختلاجی دورے ہونے شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ ڈاکٹر ہاشا نے آخر تنگ آکر کہا کہ وہ اسوقت تک دستخط نہیں کر سکتے جب تک کہ چیک حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد سے مشورہ نہ کرلیں جرمن وزراء نے کہا کہ ہم نے اس ہفتے چیک سے براہِ راست ٹیلیفون کا سلسلہ سرحدی علاقوں کی مدد سے ملالیا ہے۔ اور تم جس سے چاہو اسی وقت ٹیلیفون پر بات کر سکتے ہو۔ اب صبح کے ۵ بج چکے تھے۔ صرف ۳ منٹ باقی تھے جن میں چیک قوم کو خانماں برباد ہونے سے بچایا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر ہاشا بے ہوش ہو گئے نبضیں چھوٹ گئیں تازی ڈاکٹران نے انجکشن دیئے۔ ہوش میں آکر انہوں نے آخر ہمت ہار ہی دی اور اپنے ساتھ چیک قوم کی قسمت کے فیصلے پر بہ جبر دستخط کر دیئے۔

ہم نے امریکن شریف ڈاکوؤں کے کارنامے پڑھے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ آرٹ اور کلچر شعر و ادب کی علمبردار ایسی عظیم الشان قوم جس نے نیٹشے گئٹے اور شلر جیسے پیغمبران ادب پیدا کئے وہ اس بیسویں صدی میں جبکہ تہذیب و تمدن کو اپنے پورے اوج پر ہونا چاہئے تھا۔ ایک مہذب ڈاکو بنکر رہ گئی ہے آج اگر ایشیا کی کسی قوم نے ایسی دنی اور قزاقانہ حرکت کی ہوتی تو سارا یورپ چیخ پڑتا کہ ایشیا مہذب نہیں ہے۔ افسوس

لامکاں ٹھوکر میں ہے ہفت آسماں ٹھوکر میں ہیں
اللہ اللہ یہ غرور انبساطِ سروری !؟

اسکے بعد ابھی چیکوسلوویکیا کا واقعہ تازہ ہی تھا اور دنیا کی خیرہ کن نگاہیں اٹھیں بھی نہ تھیں کہ ہٹلر نے رات کے رات میمل پر قبضہ کرلیا۔ یہ کوئی طویل کہانی نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے ملک کو بھی ہٹلر نے خون کی ایک بوند گرائے بغیر حاصل کیا لیکن انداز وہی مہذب ڈاکے کے سے تھے۔ وہی دھمکی اور دنیا کے سامنے وہی وجہ کہ میمل قوم خود ہی جرمن کی آغوش میں آنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے اس میں ہٹلر حق بجانب بھی ہو اسلئے کہ میمل کی نوے فیصدی آبادی جو نسلی طور پر جرمن ہی ہے۔

ہٹلر نے آسٹریلیا کو فتح کرنے کے بعد کہا تھا کہ اب اسکے بعد یورپ میں اسے کوئی حصہ ملک نہیں چاہیئے۔ ۶ مہینے کے بعد چیکوسلوویکیا کا مطالبہ کیا گیا تھوڑے دنوں بعد ہی میمل کی خواہش پوری کی گئی اور اب ہٹلر رومانیہ پولینڈ اور یوگوسلاویا کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا ہے۔ میونخ کے مقام پر برطانیہ اور فرانس سے جو معاہدہ ہوا اسکو ہٹلر نے ذرا سا خیال کئے بغیر ٹھکرا دیا۔ چیکوسلوویکیا بوہیمیہ۔ موریویا۔ اور میمل میں جو کچھ ہوا اسکے ذمہ دار صرف فرانس اور برطانیہ ہیں۔ چیمبرلین اور ڈلیڈیر نے جیسی منہ کی کھائی ہے اسکا احساس آج انہیں نہیں ہو سکتا لیکن وہ وقت دور نہیں ہے کہ انکی غفلتوں اور بہانہ سازیوں کا انجام ایسا خطرناک اور ایسا دردناک سا ہوگا کہ تمام انسانی ارتقاء خاکستر ہو کے رہ جائیگا۔

شکر کا مقام ہے کہ رومانیہ اور پولینڈ کی طرف جرمنی کی حریفانہ نگاہیں دیکھتے ہوئے چیمبرلین نے تھوڑی سی جو تقریری جوانمردی دکھائی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ بوڑھے شیر برطانیہ کو اوکلسا کی گولیاں کھلا دی گئیں ہیں وہ اب نئے سرے سے جوان ہو چلا ہے اور اگر ہٹلر کی جوانی نے زیادہ طلاطم دکھایا تو وہ اپنے دوسرے بوڑھے ساتھی فرانس کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ ہٹلر اور اسکی قوم کی جوانی موسم بہار کی سی جوانی ہے۔ کیونکہ اسمیں ابھی اقتصادیات کا جوبن نہیں ہے۔ ہٹلر نے یکایک خاموشی اختیار کرلی اور وہ ہٹلر جو تقریر سے زیادہ عمل کا قائل ہے صرف یہ کہکر کم از کم وقتی طور پر خاموش ہو گیا کہ برطانیہ کی ۳۰۰ برس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جو کام بھی اس نے کیا وہ اپنی عصمت اخلاق کو داغدار بنا کر کیا۔ لیکن آج بوڑھاپے میں وہ باعصمت اور پاکیزہ ہونے کی ڈینگیں مارتا ہے۔ ہٹلر نے یہ بڑی حد تک جھوٹ نہیں کہا۔ ۳۰۰ برس کی ہندوستان کی تاریخ ۱۸۵۷ء اور جلیانوالے باغ کی خونی کارنامے صوبہ سرحد پر مسلسل بمباری افغانستان سے دھوکے اور چالبازی کے ساتھ امان اللہ کا تخلیہ اور فلسطین کے مسلمانوں کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھنسا لیا کیسے معلوم نہیں ہے !؟ برطانیہ کی اس کھوکھلی تاریخ کی روشنی میں ہٹلر سست رفتار

سارس جیسی چال چلنے والے مسٹر چیمبرلین کو کیا ہمت دے سکتا ہے
لیکن ہٹلر غالباً دنیا کی تاریخ میں جس نے چنگیز، تیمور اور نپولین
جیسے حکمران پیدا کئے اک نئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور وہ یہ ہے
کہ جہاں تک ممکن ہو اور جب تک ممکن ہو۔ خون خرابے سے بچے جیسے
سینمائی سنگدل ایکٹرس اپنے ناقابل برداشت عشووں سے چاہنے
اور نہ چاہنے والوں کی جیبوں پر پوری طرح قبضہ کر لیتی ہے۔ تھوڑی
دیر کے لئے دم لینے کو بیٹھ گیا ہے۔ دوسری طرف اس ڈرامے کی
دوسری ہیرو سینور مسولینی کو لباس بازی گری کے کرتب دکھانے
کے لئے اشارہ کرتا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ بوڑھا دماغ
سیاسیات کے لئے کتنا ناموزوں ہے ——— !؟ اور جوان
دل و دماغ میں کتنے داؤں پیچ بوڑھوں سے کھیلنے کے لئے محفوظ ہوتے
ہیں۔ سود و زیان اور ہار جیت کے خیال سے قطعاً آزاد ؎

نہ رہبر نہ مشعل نہ جادہ نہ منزل ؛ چلی جا رہی ہے جوانی دوانی۔ ساغر

ایشیا کی آخری کاپی پریس کو جا چکی تھی کہ ریڈیو خبر ملی اٹلی نے
البانیہ پر دھاوا بول دیا اور ننھا سا البانیہ فسطائی عسکریت کا شکار بن گیا
"البانیہ کی آزادی ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ وزیر خارجہ (لارڈ ہیلی فیکس)
نے یہ فرمایا کہ" ہمیں البانیہ پر اطالوی حملے سے ذرا بھی تعجب نہ ہوا ہمکو
یہ ایک مہینے پہلے سے معلوم تھا کہ ایسا ہونے والا ہے اور صرف
ہمیں نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو بھی معلوم تھا۔ (غالباً مراد فرانس سے ہے)
البانیہ میں ہمارا کوئی مفاد نہیں ہے اسلئے ہمیں پریشان ہونیکی ضرورت
نہیں ہے چھوٹا سا ملک تھا۔ نو دس ہزار سے زیادہ باقاعدہ فوج
نہ تھی یوں بھی اٹلی کے اثر میں تھا بہر صورت ہمیں تشویش ضرور ہے اور ہم
بہت جلد —— اُن قوموں سے اپنے اتحاد کا فیصلہ کر دینگے جنکو ہم
غاصبوں کے مقابلے کے لئے تیار کر رہے ہیں"
یورپ میں یہ ایک آخری چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی جو خود "محافظ اسلام"
(مسولینی !؟) کے ہاتھوں غلام بنا دی گئی اور عیسائیوں کے زیر پناہ
لے لی گئی۔ رونے کی بات ہے کہ "پاکستانی" مسلمانوں نے دو چار
ریزولیوشن پاس کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے نظر آتے۔ بنگال اور نیشنل
مسلم لیگ کی طرف سے اور دوسرا لندن کی اسلامی انجمن کیطرف سے

یاد رکھئے کہ البانیہ پچھلے سال تک اتنا قدامت پرست اسلامی ملک تھا
کہ سو فیصدی مسلمان عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ
دورِ اسلامی سے ماسور مسلم لیگی حضرات کے نزدیک البانیہ میں اسلام خطرہ
میں ہوا یا نہیں !؟۔

البانیہ اور تین مہینے کے اندر اندر یورپ کا نقشہ جسقدر بھی بدلیگا
اسپر تفصیلی تبصرہ ایشیا کی آیندہ اشاعت میں ہو سکے گا۔
اسپین کے متعلق ہم ایک تفصیلی مضمون پہلی اشاعت میں شائع
کر چکے ہیں جس سے زیادہ لکھنے کی غالباً گنجائش بھی نہیں ہے۔ اسوقت
صرف اتنا لکھنا ہے کہ اسپین کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ فرانکو کی فتح ہو گئی
اور برطانوی شاطروں کو ایک زبردست مات ہوئی۔
بوڑھے برطانوی سیاست دانوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسپین اور
البانیہ کے فتح ہونے کے بعد (میڈیٹرینین سی)
کے دو تہائی حصہ پر فسطائی اثر و اقتدار قایم ہوا جاتا ہے۔ جس
وقت صلح کے لئے مسٹر چیمبرلین اپنی ذات کو دوسرا "حضرت عیسیٰ" بنا
رہے ہیں اس کی بنیاد سے آئندہ کی ہلاکت و تباہی کے آتش فشاں
پہاڑ پھوٹ کر رہینگے۔
صرف ایک صورت ہے جس سے دنیا میں اب بھی امن قائم
ہو سکتا ہے۔ نازی زہر یوروپ کے جسم کی رگوں سے کھینچا جا سکتا
ہے اگر برطانیہ اور فرانس فوراً گفت و شنید میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر
بلقان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں کو ایمانداری کے ساتھ
یقین دلا دیں کہ نازی اور فسطائی حملے کے موقع پر وہ بغیر کسی
لحاظ کے اپنی پوری جنگی قوت کے ساتھ میدان میں آ جائینگے
یاد رکھئے کہ ملتوں کے فنا ہونے کے بعد ہی قومیں بنتی ہیں۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

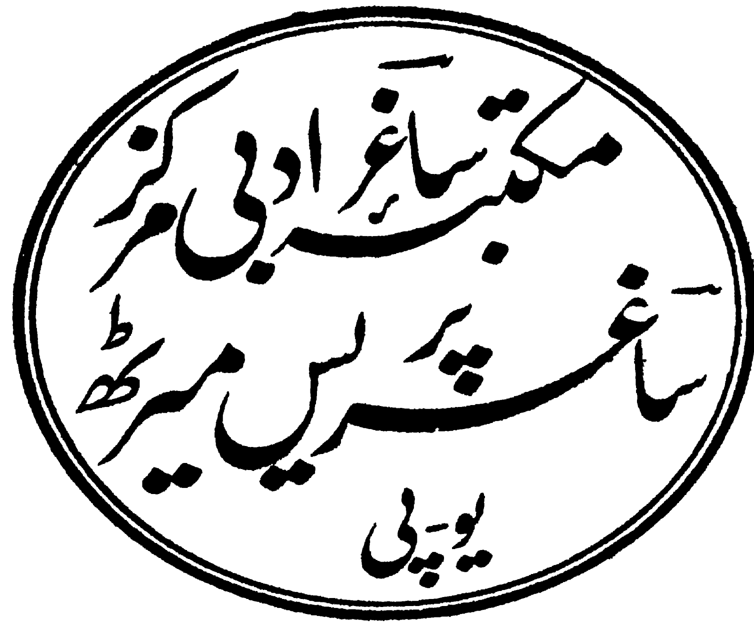
اور قوموں کی قربانی سے عالمگیر امن کی بنیاد پڑ سکتی ہے فسطائیت
پر اشتراکیت کو ترجیح دینی زیادہ مناسب ہے کیونکہ اشتراکیت
میں کم از کم عالمگیریت تو ہے۔ یعنی اسوقت روس کے جذبۂ اشتراکیت
اور امریکہ کی بے انتہا دولت سے یورپ کی دوسری جمہوری حکومتوں
(برطانیہ فرانس !؟) کو فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

موسم خزاں تک آپ دیکھینگے کہ ہٹلر یوگوسلویکیا پر قبضہ کرچکا ہوگا۔ اسکے بعد گریس پر قبضہ کرے اور گریس کے بعد مشرق قریب میں آنے کے راستے کھل جائینگے۔ اسوقت ہندوستان پر بھی سخت وقت آئے گا۔ صدر کانگریس سوبھاش چندر بوس کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ہمیں غیر ملکی خطروں سے بے خبر رہنا چاہئے" یہی وہ وقت ہوگا کہ جب ہندوستان کو برطانیہ کی شاطرانہ چالوں کے سامنے نہ صرف ٹھیرنا ہوگا بلکہ اُسے پوری مات دینی ہوگی۔ اروِن گاندھی پیکٹ" کے مہلک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے رہنما پچھلی غلطیوں کے تجربوں سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ ذراسی لغزش سے ہماری پچاس سالہ جدوجہد بے معنی ہوجاسکتی ہے۔ ہندوستان کو اپنی آزادی بہرصورت حاصل کرنی ہے۔ اور برطانیہ سے آزاد ہوکر دوسرے ملکوں کے زیر نگیں ہرگز نہیں ہونا ہے۔ اسلئے اور بھی ہوشیاری سے چلنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیڈروں کو ایک ہوکر کام کرنا چاہئے۔ ہندوستان بھوکا اور جاہل ہی لیکن اسلئے نہیں کہ اسکی بھوک اور جہل سے لیڈروں کو بقائے دوام ملے۔ تری پورہ میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد بوڑھے اور جوان لیڈروں کے جو بیانات میری نظر سے گذرے اسکو پڑھکر میں نے خون کے آنسو گرائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے کرتادھرتاؤں میں بھی وہ اعتماد واتحاد کی روح نہیں ہے جو ایسی اہم جماعت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم کانگریس سے ایسے تمام افراد کو وہ چاہے بوڑھے ہوں چاہے جوان ہٹادیں جو اپنے نفس کو جنتا کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

ساغر

نوٹ جگہ کی تنگی کی وجہ سے دو نہایت ضروری نوٹ "چین وجاپان" اور "سویٹ روس کی جمہوریت" اور "مسئلہ فلسطین کا حل" شائع ہونے سے رہ گئے جنکا افسوس ہے۔


مکتبہ ساغر ادبی مرکز
ساغر پریس میرٹھ
یو-پی